آجکل

برسمہ ۱۹۵۶ء



ھ آنے

ہماری کتابیں

پہلا پنج سالہ پلان

جنتا ایڈیشن

[illegible] تفصیلات [illegible] زبان سادہ [illegible] قیمت -/۲

مستقبل کی تعمیر

ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آرہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھیے۔
قیمت ۔۔ /۴/

آسان پنج سالہ پلان

[illegible] جو نوجوانوں کے لئے تیار کیا گیا ہے زبان نہایت آسان ہے تصویروں اور خاکوں سے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/۰

سماجی بہبود

پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے
/۴/-

ہمارا پلان

پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزل مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے
قیمت ۰ /۴/

ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان

پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
/۴/-

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- مُظفّر شاہ

جلد ۱۵ —— نمبر ۲

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے
غیر ممالک سے نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے

ستمبر ۱۹۵۶ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق: شیلانگ کا ایک منظر
(عمل - بی این جیجا)

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ادارہ

مُلاحظات

"سیاسی رجحانات بڑی تیز رفتاری سے واقعاتِ عالم پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ آزادی پسند اقوام امنِ عالم کے لئے کوشاں ہیں۔ حال ہی میں وزیرِ اعظم ہندوستان جب کامن ویلتھ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو واپسی پر انھوں نے مختلف یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ اس دوران میں مارشل ٹیٹو، کرنل ناصر اور پنڈت نہرو نے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔ امنِ عالم کے لئے ان کی کوششوں کو آزادی پسند ممالک نے بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے

امریکہ نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر مصر کی مالی امداد بند کر دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ امداد اسوان بند تعمیر کرنے کے سلسلے میں تھی۔ مصر نے امریکہ کے اس اقدام کو جارحانہ تصور کیا اور سویز کمپنی کو قومی ملکیت قرار دے دیا۔ کرنل جمال عبدالناصر نے جب یہ تاریخی اعلان کیا تو مصری خوشی سے ناچنے لگے۔ اس سے مصر کے عوام کے جذبات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ برطانیہ اور فرانس نے مصر کے اس اقدام کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس پر مالی احتساب کے حکم صادر کر دئے ہیں۔ یہ کشمکش [illegible] اختیار کر رہی ہے

کرنل ناصر نے کہا ہے کہ کمپنی سے دس کروڑ ڈالر سالانہ کی جو آمدنی ہوتی ہے اب اُسے اسوان بند کی تعمیر میں استعمال کیا جائے گا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ مدتوں غلامی کی زنجیروں میں گرفتار رہنے والے ممالک اب اپنی تقدیر بنانے کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ یہ ان کا قدرتی حق ہے اور اس حق سے انہیں محروم کرنا مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے باوجود فریقین کو صبر و تحمل سے اپنے اختلافات کو دور کر کے امن کی عالمگیر فضا پیدا کرنا چاہیئے۔

۲۳۔ جولائی کو بال گنگا دھر تلک کی جنم شتابدی سارے ملک میں بڑے خلوص اور اہتمام سے منائی گئی۔ آزادی کے اس مردِ مجاہد نے برطانوی سامراج کے خلاف اس وقت آواز اُٹھائی جب آزادی کا نام لینا بہت بڑا جرم تھا۔ قید و بند اور جلاوطنی کے مصائب نے اس کے ارادے کو اور استقامت بخشی۔ "سوراجیہ میرا پیدائشی حق ہے۔" یہ نعرہ سب سے پہلے تلک نے لگایا اس کے بعد یہ ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ ایک دوررس سیاست دان، ایک شفیق بزرگ، ایک اٹل ارادے کے مالک اور ایک عالمِ باعمل کی حیثیت سے تلک کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اردو مصنفین کا رونا حقیقت پر مبنی ہے کہ انھیں اچھے پبلشر نہیں ملتے پبلشر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اردو کی کتابیں بکتی کم ہیں۔ ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت ہے جو کو اپریٹو بنیادوں پر قائم ہو اور اردو کی اچھی کتابوں کی اشاعت اپنے ذمے لے۔ اب بھی اچھی کتاب بازار میں آتی ہے تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے۔ یہ شکایت کہ اچھی کتابیں بکتی نہیں قرینِ قیاس نہیں۔ صالح طبقہ اب بھی خدا کے فضل سے موجود ہے اور شستہ اور شائستہ ادب کا ہمیشہ متلاشی رہتا ہے۔

انجمن ترقی اردو کا اخبار ہماری زبان ہفتہ وار ہونے والا ہے۔ اردو دوستوں کے لئے یہ خبر مسرت کا موجب ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اخبار اردو کے نئے مطبوعات کے باب میں بھی اپنے ناظرین کو معلومات بہم پہنچائے گا اور صرف انجمن ہی کی کتابوں کے اشتہار پر اکتفا نہیں کرے گا۔

پبلیکیشنز ڈویژن کے تمام رسالوں کے ادارتی بورڈ مقرر ہوئے ہیں۔ ناظرین یہ جان کر خوش ہوں گے کہ اردو آج کل کے لئے بھی ایک ادارتی بورڈ کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس کے اراکین کے نام یہ ہیں۔ پروفیسر ایم مجیب جامعہ نگر، شری گوپی ناتھ امن ایم ایل اے دہلی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور حیدرآباد دکن، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی، پروفیسر رحمان راہی سری نگر کشمیر، ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، ڈپٹی ڈائرکٹر ایڈیٹوریل، ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن، ایڈیٹر آج کل۔

حسبِ دستور مضامین وغیرہ کے سلسلے میں تمام خط و کتابت ایڈیٹر آج کل اردو کے پتے سے ہی ہونا چاہیے۔

یحییٰ اعظمی

اے جنتِ کشمیر

اے شہرِ گل و لالہ و اے وادیٔ گل پوش اے خاکِ ارم و دیدۂ فردوس در آغوش
ہے تیری ہواؤں میں اثرِ بادۂ سرجوش ہے تیری فضا مے کدۂ و گل کدۂ بردوش
زیبا ہے جو کرتے ہیں تجھے خلد سے تعبیر
اے جنتِ کشمیر

ہر رنگ کے پھولوں سے مزین ہے تری خاک سبزے ہیں کہ دیبائے مشجر کی ہے پوشاک
گُل ریز ہیں نسرین و سمن بادہ فشاں تاک برپا سرِ ہر شاخ ہے اک بزمِ طرب ناک
طائر ہیں نوا سنج کہ بجتے ہیں مزامیر
اے جنتِ کشمیر

پھولوں کی ہے وادی کہ سجی محفلِ رنگیں جھیلوں کا ہے پانی کہ بچھی چادرِ سیمیں
ہر جیبہ پہ اللہ ہے توأمِ گل و نسریں ہے سنبل و ریحاں سے تری خاک کی تزئیں
ان تازہ عناصر سے ہوئی ہے تری تعمیر
اے جنتِ کشمیر

جھرنوں کے پہاڑوں کے درختوں کے مناظر ہر سمت وہ رعنائیٔ فطرت کے مظاہر
وہ زمزمۂ آبِ رواں چشمۂ طاہر ہیں ڈھیر تری خاک پہ قدرت کے نوادر
جھوم اٹھے جنھیں دیکھ کے ہر شاعرِ دلگیر
اے جنتِ کشمیر

ہیں خلدِ نظر سرو و صنوبر کی بہاریں ہیں جنتِ نظارہ چناروں کی قطاریں
ہم خلدِ زمیں کہہ کے تجھے کیوں نہ پکاریں قدرت کے حسیں ہاتھ تجھے کیوں نہ سنواریں
ہے معجزۂ خامۂ فطرت تری تصویر
اے جنتِ کشمیر

یہ حسن و جمال اور یہ رنگینی و نزہت یہ رنگ یہ آب اور یہ گل کاریٔ قدرت
سبزوں کی یہ بہتات شگوفوں کی یہ کثرت ہے خاک پہ آراستہ پھولوں کی یہ جنت
ہر قلب و نظر ہے ترے فتراک کا نخچیر
اے جنتِ کشمیر

ہے فرق پہ جو برف کے تودوں کا حسیں تاج — چوٹی ترے کہسار کی فطرت کی ہے معراج
تو مشرق و مغرب کا ہے مسجودِ نظر آج — کر سکتا نہیں دہر ترے نقش کو تاراج
ہے شرق سے تا غرب ترے حسن کی تشہیر
اے جنتِ کشمیر

فطرت ہے فدا خود ترے اس نقشِ حسیں پر — ہے جلوہ گر اک قوسِ قزح روئے زمیں پر
اللہ رے خطِ سبزہ وہ رخسار و جبیں پر — دنیا کے جو دل ہیں کہ ہے نقشِ نگیں پر
ہے صفحۂ ایام کی زینت تری تحریر
اے جنتِ کشمیر

وہ بارشِ گل ترے تل و کوہ و دمن کی — آرائشِ گل صحن و خیابانِ چمن کی
پھولوں سے معنبر وہ فضائیں ترے بن کی — مہکی ہوئی وادی تری وادی ہے ختن کی
ہے جس کی ہواؤں میں مئے ناب کی تاثیر
اے جنتِ کشمیر

پھر کیف سے مجموم اٹھے تری وادئ گلزار — سرگرمِ نوازش ہوا ابرِ سرِ کہسار
ہر نخل ہے وادی کا مئے ناب سے سرشار — ہر قطرۂ نیساں سے گہر خیز و گہربار
ہے تزکیہ پھولوں کا شگوفوں کی ہے تطہیر
اے جنتِ کشمیر

ہے ربط ہمیشہ سے ہمیں تیرے چمن سے — تیرے گل و ریحاں ترے سرو و سمن سے
صدیوں کا تعلق ہے ترے کوہ و دمن سے — ہے نسبتِ دیرینہ تجھے گنگ و جمن سے
وابستہ وطن سے ہے ازل سے تری تقدیر
اے جنتِ کشمیر

ہے خاکِ وطن اور تری وادئ رنگیں — جزوِ چمنِ ہند ہیں تیرے گل و نسریں
چل سکتے نہیں اب ستم و جور کے آئیں — ہے مائلِ تاراج عبث کوششِ گلچیں
یہ خاکِ گل و لالہ ہے ناقابلِ تسخیر
اے جنتِ کشمیر

پوشیدہ نہیں ہیں تری تاریخ کے احوال — شاہد تری عظمت کے ہیں ماضی کے مہ و سال
کیا کم ہے ترے فخر کو یہ عظمت و اجلال — دنیا میں مسلّم ہے تری خاک کا اقبال
اٹھے ہیں تری خاک سے دنیا کے مشاہیر
اے جنتِ کشمیر

مٹی تری آب و گلِ ریحاں سے بنی ہے — جانِ چمنستاں تری گل پیرہنی ہے
فطرت کے تقاضوں سے تری خاک دھنی ہے — آسودہ تری خاک میں تیرا وہ غنی ہے
ہے جس کی نوا سوزِ غمِ عشق کی تفسیر
اے جنتِ کشمیر

○ غنی کاشمیری

نیاز فتحپوری

مُطالعۂ کائنات

اور

فلکیات کے بعض دلچسپ حقائق

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس میں شک نہیں کہ اہل سائنس کی ترقیاں حیرت ناک ہیں اور مادی حقائق کی دریافت کا سلسلہ بدستور جاری ہے لیکن [illegible] ہیں ترقی کیا [illegible] ہیں اور جب "کیوں" کا سوال سامنے آتا ہے تو سب دم بخود رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ جب دو مادی چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو اس سے ایک تیسری [illegible] اور پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے اس کا جواب ان کے پاس [illegible] سب سے زیادہ اور اہم دریافت [illegible] ایٹم ہے جس کی بے پناہ قوت [illegible] دنیا کو [illegible] کر سکتا ہے۔ لیکن اس میں اتنی زبردست قوت کہاں [illegible] اس کا علم کسی کو نہیں اور نہ آئندہ اس راز کے انکشاف [illegible] ہے

اس میں شک نہیں [illegible] انسان [illegible] کیا ہے لیکن [illegible] حقیقت تک انسان کی دسترس [illegible] نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ عرفی نے اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

> [illegible] ذات تو بہ ادراک نہ شاید دانست
> ایں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من است

اور یہاں [illegible] مطالعۂ کائنات کے سلسلے میں انسانی عجز و نارسائی کو محسوس کرتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے

> بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست
> چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست
> دیر زیں غصہ کہ آں نقش کہ چو رنگ ست صنم
> کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

خیر یہ باتیں تو اس عالم کی ہیں جس سے مادیین کو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے۔ جب ہم مادی نقطۂ نظر سے کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو بھی اخیر میں ہمیں اسی امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ

> کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

آئیے ہم آپ بھی اسی حیرت آباد کی سیر کریں اور خود مادیین کے انکشافات کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ کائنات کے چہرے سے جو گوشۂ نقاب انھوں نے اٹھایا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔

مطالعۂ قدرت کے سلسلے میں سب سے پہلی چیز جس نے انسان کو حیرت میں ڈالا ہوگا غالباً آسمان ہے۔ انسان نے اوّل اوّل جب ستاروں کو دیکھا ہوگا تو وہ حیران رہ گیا ہوگا کہ فضا میں یہ بے شمار بکھرے ہوئے روشن نقطے کیا ہیں اور معلوم نہیں اس نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا، لیکن اب کہ ان کی حقیقت بہت کچھ ہمیں معلوم ہو گئی ہے انسان کی حیرانی کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ کیونکہ یہ بے شمار ستارے جو ہمیں رات کو چمکاتے نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر ہمارے [illegible]ی

نظامِ شمسی کے آفتاب کی طرح، بجائے خود آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے گرد خدا جانے اور کتنے ماتحت ستارے یا کُرے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ حال تو اُن ستاروں کا ہے جو ہمیں نظر آتے ہیں، لیکن وہ ستارے یا کُرے جو انتہائی دُوری کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے، ان کی تعداد کا اندازہ تو ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ انسان اب تک کوئی ذریعہ ایسا دریافت نہیں کر سکا ہے جو اس پردۂ حجاب کے دُور کرنے میں اس کی مدد کر سکے۔

جب ہم ان ستاروں کو دیکھتے ہیں تو دوسرا سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ یہ کیونکر عالمِ وجود میں آئے، یعنی کائنات کی تخلیق کب اور کیونکر ہوئی۔ اس میں شک نہیں یہ اس سے زیادہ اہم سوال ہے، لیکن صدیوں کی کاوش و جستجو کے بعد حکماء نے چند نظریے ضرور ایسے پیش کئے ہیں جن سے ہم کو اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔

(۱) پہلا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق جس میں ہماری زمین بھی شامل ہے، مادہ Matter کے اُن دقیق ذرات سے ہوئی ہے جنھیں ہم آٹم Atom یا "جوہر فرد" کہتے ہیں اور وہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ ہم قوی ترین خردبین کے ذریعے سے بھی انھیں نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ان آٹم یا جواہر فرد یا اجزاء لا تتجزیٰ کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ ان میں ایک مرکزی یا بنیادی حصہ ہوتا ہے جسے اصطلاح میں پروٹن Proton یا مرکزی سالمہ کہتے ہیں اور جس سے ہر وقت مثبت Positive بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا بیرونی حصہ برقپاروں Electrons کا ہے جو ہر وقت پروٹن (مرکزی سالمہ) کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اور جن سے ہر وقت منفی Negative بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

ہر عنصر یا مادہ جس سے کائنات کی تعمیر ہوئی ہے مجموعہ ہے انھیں سالموں اور برقپاروں کا، جن کی تعداد مختلف عناصر میں مختلف ہوتی ہے اور جن میں کمی بیشی ممکن نہیں۔ مثلاً ہائڈروجن کو لیجئے کہ وہ مرکب ہے ایک سالمہ اور ایک برقپارے سے۔ یا ہیلیم Helum جو مرکب ہے چار سالموں اور دو برقپاروں سے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فطرت کا نظام یہ ہے کہ جس مادہ یا عنصر کے جتنے سالمے اور برقپارے مقرر ہیں وہ ہمیشہ اُتنے ہی رہیں گے اور ان میں کمی زیادتی ممکن نہیں۔

(۳) تیسرا نظریہ یہ ہے کہ جس چیز کو ہم خلا سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل خلا نہیں ہے جس وقت ہم روشن ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ان کے درمیان کوئی شے ایسی حائل نہیں ہے جو ان کی روشنی کو ہم تک نہ پہنچنے دے اور ہم اسی کو خلا یا فضائے بسیط کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فضائے بسیط لبریز ہے ایک تیز شفاف مادے سے جو آفتاب اور دوسرے بے شمار ستاروں سے نکل کر ہر وقت منتشر ہوتا رہتا ہے۔

(۴) چوتھا نظریہ یہ ہے کہ جب دو آٹم یا ذرے یا بہت زیادہ قریب آجاتے ہیں تو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، اس صدمہ سے گرمی یا حدت پیدا ہوتی ہے اور بڑا آٹم چھوٹے آٹم کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فضا میں ایک گرم و روشن بادل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جسے اصطلاح میں نیولا Nebula یا سحابیہ کہتے ہیں اور اس کی صورت ایک روشن لیس کی سی ہوتی ہے۔

اب ان چاروں نظریوں کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو تخلیق کائنات کے تدریجی عمل کی صورت یہ قرار پائے گی کہ اب سے اربوں سال پہلے فضا میں ایک بہت بڑا نیولا پیدا ہوا جس کے اندر بے شمار آٹم ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور پھر زیادہ حجم رکھنے والے آٹموں کے بعض حصے دورانِ گردش میں ان سے ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہوتے گئے اور اپنی دُنیا الگ بناتے رہے جنھیں ہم ستارے کہتے ہیں۔ ان پیدا ہونے والے ستاروں میں بہت سے آفتاب بھی تھے اور انھیں میں سے ایک ہمارا آفتاب[1] بھی ہے۔

جب ہمارا آفتاب بن گیا تو وہ اپنے نیولا کے اندر اربوں سال تک چکر کھاتا رہا اور اس دوران میں بارہا ایسا ہوا کہ بڑے بڑے دوسرے ستارے گردش کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے، جن میں بعض اتنے بڑے تھے کہ ان کی کشش سے آفتاب کے بعض ٹکڑے علیحدہ ہو گئے۔ مگر یہ کشش اتنی قوی نہ تھی کہ وہ آفتاب کی کشش سے بالکل علیحدہ ہو جاتے اس لئے وہ آفتاب سے جدا ہونے کے بعد بھی اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ یہی وہ سیارے اور توابع ہیں جن سے ہمارا نظامِ شمسی بنا ہے اور جن میں ایک تابع سیارہ ہمارا کرۂ زمین

---

[1] جس نیولا کے اندر ہمارا آفتاب بنا ہے اسے کہکشاں Milky Way کہتے ہیں

آفتاب و زمین کا یہ فاصلہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن دوسرے سیاروں کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ثریا کے ستارے ہماری زمین سے ۰۰۰۰۰۰۲۹۱۸۵۶۵۹۹۰۲ میل دور ہیں اور انگستان کی دوری ۰۰۰۰۰۰۳۲۲۳۳۴۳۲۱۳ میل قیاس کی گئی ہے۔

چونکہ اس قسم کے فاصلے اور ہندسے ظاہر کرنے کے لئے ہندسے کافی نہیں ہوتے اس لئے سہولت کی غرض سے یہ فاصلے روشنی کی رفتار سے متعین کئے جاتے ہیں، جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے

آفتاب کی سطح ہموار نہیں ہے بلکہ اس میں بڑے بڑے گہرے غار پائے جاتے ہیں جن سے ہر وقت لوہا، سوڈیم اور نیکل وغیرہ کی مشتعل گیس شعلوں کی صورت میں بلند ہوتی رہتی ہے۔ آفتاب ایک آتشیں کرہ ہے اور اس کے التہاب کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کے شعلے ۲۰ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اوپر کو چڑھتے ہیں اور ان میں سے بعض ۸۰ ہزار میل بلکہ اس سے زیادہ بلندی تک پہونچ جاتے ہیں۔ ۷۔ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں ایسے ایک شعلے کا مشاہدہ کیا گیا جو پہلے ۴۰ ہزار میل کی بلندی تک پہونچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ بلندی ۸۰ ہزار میل تک پہونچ گئی اور دوسرے گھنٹے میں وہ ۳ لاکھ ۵۰ ہزار میل بلند ہو گیا۔

آفتاب کی اتنی زبردست حرارت کا سبب یہ ہے کہ اس کے مادہ کے ایٹم اور برقیارے ہر وقت ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں اور اس ٹکراؤ سے غیر معمولی حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے۔

یوں اگر آپ دیکھیں تو آفتاب ایک صاف و روشن کرہ نظر آئے گا لیکن دوربین سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سے سیاہ داغ بھی ہیں۔ داغوں کی دریافت کا فخر گیلیلو اور فیبریشیوس کو حاصل ہے جنھوں نے سب سے پہلے ۱۶۱۱ء میں انھیں دریافت کیا۔

یہ داغ دراصل وہاں کے آتش فشاں پہاڑ ہیں جن کے آتشیں مادے ہر وقت نہایت تیز آندھیوں کی صورت میں نکلتے رہتے ہیں۔ آفتاب کے داغ ایک حالت پر نہیں رہتے بلکہ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات دو تین یا اس سے زیادہ داغ مل کر ایک داغ بن جاتا ہے اور کبھی ایک ہی داغ تقسیم ہو کر متعدد داغوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

بعض وقت داغ اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ خالی آنکھ سے نظر آنے لگتے ہیں چنانچہ جون ۱۸۴۳ء میں ایک عظیم الشان داغ نظر آیا جس کا عرض ۷۷ ہزار میل سے زیادہ تھا۔ اس سے قبل ۱۸۳۶ء میں جو داغ نظر آئے ان کی مجموعی پیمائش تین ارب ۸۷ کروڑ میل تھی۔ ۱۸۹۲ء میں داغوں کا ایک مجموعہ دکھائی دیا جس میں تنہا ایک داغ دو ارب چوراسی کروڑ میل کا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں آفتاب کے ایک کنارے پر ایک داغ نظر آیا جس کا طول چند دنوں کے بعد ۲ لاکھ ۴۵ ہزار میل ہو گیا اور عرض ۷۴ ہزار میل۔ یہ داغ ۴۰ دن تک قائم رہا۔ بعض وقت داغوں میں اس قدر جلد تغیر پیدا ہو جاتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شکل کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سطح آفتاب پر آگ کا جو تلاطم برپا رہتا ہے اس کی صورت بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔

آفتاب کے داغوں کا زمین پر بھی خاص اثر پڑتا ہے، چنانچہ جب آفتاب کی سطح پر زیادہ داغ پائے جاتے ہیں تو قطب نما کی سوئی ٹھیک شمال کی طرف نہیں رہتی بلکہ بعض ممالک میں مشرق کی طرف اور بعض ممالک میں مغرب کی طرف ہٹ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سوئی کا اضطراب بھی بڑھ جاتا ہے۔ جب فروری ۱۹۴۶ء میں عظیم الشان داغ نظر آیا تو اس وقت کچھ دیر کے لئے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تاروں نے بھی کام دینا چھوڑ دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آفتاب کائنات میں کوئی اہمیت رکھے یا نہ رکھے لیکن ہمارے لئے وہ بڑی اہم چیز ہے۔ اسی کی روشنی اور حرارت کی وجہ سے زمین کے تمام جاندار زندہ ہیں اور اسی کی بدولت ہمارے باغ اور کھیتیاں بارآور ہوتی ہیں۔

زمین کو جتنی حرارت آفتاب سے پہونچتی ہے اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر زمین کے گرد ۸۰ گز موٹی تہ برف کی جم جائے تو آفتاب کی حرارت ایک پل میں اس کو گھلا کر رکھ دے یا ایک منٹ میں ۷۳ ہزار ٹن پانی کو کھولا دے۔

نظام شمسی سے ہماری زمین کے علاوہ آٹھ سیارے اور متعلق ہیں، پہلے انھیں صرف سات (سبع سیارہ) سمجھا جاتا تھا لیکن اب ان میں دو کا اضافہ اور ہو گیا ہے۔ جن دو سیاروں کا اضافہ ہوا ہے، ان کے نام یورانوس Uranus اور پلوٹو Pluto ہیں۔

یورانوس، آفتاب سے ۱۷۸۳ میل دور ہے اور پلوٹو اس سے بھی زیادہ بعید فاصلے پر واقع ہے۔ نظام شمسی کے باقی چھ سیاروں کے نام یہ ہیں:-

مریخ Mars مشتری Jupiter زحل Saturn

زہرہ Venus نیپچون Neptune عطارد Mercury

جن کے دلچسپ حالات آپ پھر کبھی سنیں گے۔

جمیل مظہری

تلاش

بہلا نہ جی عدم میں تو رختِ سفر بدوش — نکلے رفیقِ عشق کو اپنے پکارنے

پہونچے جو اس دیارِ مسافر فریب میں — گھیرا مجھے زمان و مکاں کے حصار نے

دیوارِ ماہ و سال کھڑی کردی وقت نے — پردے گرا گرا دئے لیل و نہار نے

سارا غبار اپنے بیابانِ شوق کا — آنکھوں میں میری جھونک دیا اس دیار نے

جب دامنِ شعور نے پونچھی نظر کی گرد — دیکھا اِدھر اُدھر نگہِ اعتبار نے

ہر عارضِ حسیں سے اُلٹ کر نقابِ رنگ — ڈھونڈھا کسی کو دیدۂ حیرت شعار نے

دیکھی جہاں کسی کے خد و خال کی جھلک — نظریں نثار کیں مری آنکھوں کے پیار نے

کتنی حسین باہوں نے ڈالے گلے میں ہار — پہنا مگر نہ طبعِ تلوّن شعار نے

صید افگنوں نے بڑھ کے جو پھینکی کمندِ زلف — کچھ دیر اس سے کھیل کے توڑا شکار نے

سینوں پہ سر کو رکھ کے دلوں کی صدا سُنی — نغمہ دیا مگر نہ کسی کے ستار نے

اس نے تبسم اس نے خلش دے تو دی مگر — سمجھا نظر کا درد نہ گل نے نہ خار نے

اس جستجو میں ہو گئی زندگی کی شام — مانگا خراج اپنا غمِ روزگار نے

اُترا خمارِ بادۂ ذوقِ نظر جمیل — ساغر دئے جو مے کدۂ اعتبار نے

آئے تھے کس تلاش میں یہ بھی رہا نہ یاد — اس طرح گم کیا مجھے لیل و نہار نے

اب دل میں شوق ہے نہ طبیعت میں ولولے — جو کچھ تھا پاس چھین لیا اس دیار نے

خالی نہ کس طرح سے ہو جھولی شعور کی

لُوٹا ہے مجھ کو مل کے خزاں اور بہار نے

علی عباس حسینی

مُردار چمڑا

سیمیں شاعرہ تھی، ادیبہ تھی، فن کار تھی، نازک مزاج تھی، صاحبِ ذوق تھی، دولتِ حسن و جمال سے آراستہ تھی۔ اس کی حساس طبیعت پہ ادب و فن، علم و ہنر کا رنگ چڑھا تھا۔ اس کا سیلون اور اس کی لائبریری دیکھنے کی چیزیں تھیں۔ سیلون ایک ہشت پہل بڑا سا ہال تھا۔ سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کے فرش پہ اتنا موٹا ایرانی قالین کہ چلنے والوں کے ٹخنوں تک پاؤں چھپ جائیں۔ دیواروں پہ قدِ آدم حلبی شیشے اور ان پر مینا کا کام، نازک بیلوں میں مختلف رنگوں کے اسٹیشن چھوٹے بڑے نگ۔ ان سے اوپر یورپ اور ایشیا کے کلاسیکی مصوروں کے تیار کردہ مرقعے۔ چھت پہ پوری بہار آئی ہوئی۔ ثمردار درختوں سے خوشۂ انگور کی طرح ہزار بتی لٹکتے جھاڑ۔ کوئی فرانس کی شاہی کی یادگار، کوئی چیک صنعت کا نمونہ۔ صوفے، کرسیاں، کوچ مختلف صدیوں کی نایاب یادگاریں تھیں [illegible] بغلوں میں، اطالوی فن کاروں کے بنائے ہوئے مجسمے تھے۔ آٹھوں کونوں پہ منگ خاندان کے زمانے کے چینی مرتبان رکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی میزیں، اسٹول جو کاؤچ کرسیوں کے سامنے تھے، وہ روس، مصر اور جاپان کی یاد دلاتے تھے۔ غرض سیلون کیا تھا خاصا نمائش کا کمرہ تھا، جہاں کی ہر چیز دیدہ زیب بھی تھی اور تاریخی بھی۔

سیمیں کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا یہ سیلون ہر وقت تازہ بہ تازہ نو بہ نو ادیبوں، مصوروں اور فن کاروں سے بھرا رہے اور ہر وقت شعر و ادب، آرٹ اور جمالیات پر گفتگو ہوتی رہے۔ یہی اس کی جنت تھی، یہی اس کے لئے فردوس کی آخری منزل ——

اور بے چارے مصنف، شاعر، فن کار اس کے ہاں آنے میں پس و پیش ہی کیوں کرتے؟ اسٹوڈی بیکر چھ سیٹر موٹر ان کے لانے اور گھر چھوڑنے کے لئے موجود رہتی۔ شربت، چائے، کافی سے ضیافت کی جاتی۔ بنارسی سفید پان کی گوریاں، چاندی سونے کے ورق میں لپٹی ہوئی بنارس کی پتی، مشکی تمباکو، قوام کے ساتھ چبانے کے لئے، اچھی سے اچھی سگریٹیں، قیمتی سے قیمتی ہوانا سگار پینے کو۔ کیک، بسکٹ، پیسٹری، تازہ تازہ پھل کھانے کے لئے ملتے۔ بس اتنا ہی تو ہوتا کہ اپنا ہی کلام نہ سنانا پڑتا بلکہ سیمیں کے سڑے گلے اشعار بھی سننا پڑتے اور اس کی خالص رومانی کہانیوں پر بھی جھوم جھوم کر واہ وا کرنا پڑتی۔ لو اتنی خاطر مدارات، تواضع و تکریم کے بعد تعریف کے دو چار کلمے کہہ دینے میں زبان تو نہ گھستی تھی؟ مصنف و فن کار فرض شناس ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کو ادائے فرض کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ وہ خود ہی فرض ادا کرنے سے کیسے غافل رہ سکتے تھے؟ جھوٹ موٹ کی تعریف بھی تو ایک قسم کا فرض ہے اور وہ بھی جبکہ اس کے دام میں موٹر کی سواری بھی ملتی ہو، خاطر تواضع بھی کی جاتی ہو، اور اپنے "دردِ زہ" کا مفت علاج بھی ہوتا ہو۔

سیمیں خوش تھی، بہت خوش تھی۔ وہ ہر ہفتہ ایک غزل، ایک نظم کہہ لیتی یا ایک کہانی لکھ ڈالتی۔ تعریف ہمیشہ تخلیق کی رفتار کو بڑھا دیتی ہے اور تعریف ہمیشہ خریدی جا سکتی ہے۔ دام میں کبھی کبھی خونِ دل دینا پڑتا ہے مگر اکثر سیم و زر کے سکوں ہی سے کام نکل جاتا ہے۔ اسی لئے صاحبانِ فن ہم عصر بھی کبھی تعریفوں کے پھول سیمیں کے صندلی قدموں کے نیچے بچھاتے، کبھی تعریفوں کے تاج اس کے سر پر پہناتے، اور کبھی تعریفوں کے ہار اس کے نازک گلے میں ڈال دیتے۔ ذہنی حیثیت سے نہ سہی مگر صورت شکل کے لحاظ سے سیمیں اس قصیدہ خوانی کی مستحق بھی تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ قد، متناسب اعضا، گورا رنگ، آفتابی چہرہ، لمبے لمبے کالے بال، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی غزالی آنکھیں، ستواں

ناک، پتلے عنابی ہونٹ، موتی کی طرح چمکتے ہوئے دانت اور چھوٹی پتلی ٹھوڑی پر ایک سیاہ تل۔ جب وہ براکیڈ کے غرارے، ڈری کے جمپر اور قوسِ قزح کی رنگ کے کامدانی کے دوپٹے میں ملبوس ہو کر مہمانوں کی پذیرائی کے لئے تیز قدم کمرے میں چلتی تو محسوس ہوتا مورناچ رہا ہے۔ تتلی اُڑ رہی ہے اور ڈوبتا سورج بھاگتے ہوئے لکۂ ابر کو مختلف رنگوں میں ڈوب دے رہا ہے۔

سیدہ کی آواز بھی سُریلی تھی اور اس کے بات کرنے اور کلام سُنانے کا انداز بھی پیارا تھا۔ لوگ پیٹھ پیچھے جو چاہیں کہیں مگر سیدہ کا سامنا ہوتے ہی ہر ایک کا جی یہی چاہتا کہ وہ اسی سے مخاطب رہے، اسی سے باتیں کرتی رہے اور اسی سے مسکرا کر کہے۔ "آپ نے بڑی زحمت کی۔ مجھے بڑا ڈر تھا کہ آپ مجھ ناچیز کے ہاں آنے کے لئے شاید وقت نہ نکال سکیں گے۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر میری بڑی سرفرازی بھی!"

سیدہ ہر چھوٹے بڑے مصنف، شاعر اور فن کار سے یہی کہتی۔ یہ اس کا روزمرہ تھا، مگر اس میں آورد کم اور آمد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں، اس کی آنکھوں سے خوشی ٹپکی پڑتی تھی اور اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ مہمان کو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے آتے ہی سیدہ کو سارے جہان کی نعمتیں مل گئیں اور وہ خوشی میں جامے سے باہر ہُوا چاہتی ہے۔

لیکن سیدہ کی خوشیوں اور مسرتوں کے ہرے بھرے باغ میں ایک جھلسا، سوکھا ہُوا ٹھونٹھ بھی تھا اور وہ تھی اس کے شوہر اشرف کی ذات۔ اشرف کوئی کم رُو جوان نہ تھا۔ وہ چھ فٹ کا چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں والا مرد تھا۔ سیدہ کی ساری سہیلیاں سیدہ کی نظر بچا کر اسے دو ایک بار گھُور لیتیں ضرور، مگر اشرف کی نظر میں تو صرف سیدہ ہی سیدہ تھی۔ اس کی موجودگی میں دوسروں کا وجود و عدم سب برابر۔ بس وہ بیوی ہی کو آنکھوں سے پئے جاتا، کھائے جاتا، شربت کی طرح، شراب کی طرح، کتاب کی طرح۔

اشرف چمڑے کا بہت بڑا تاجر تھا۔ مختلف شہروں میں اس کے گودام تھے، خود بمبئی میں اس کی ٹینری تھی۔ صبح آٹھ بجے سے دس بجے رات تک وہ کھالیں خریدتا، ان کی دباغت کا کام دیکھتا، تیار کھال مختلف کمپنیوں کے لئے لدواتا اور بھجواتا رہتا تھا۔ اگر اسے ان کاموں سے آدھ گھنٹے کی بھی فرصت مل جاتی تو وہ موٹر تیز بھگاتا ہوا سیدہ کے سیلون میں ضرور آتا۔ اسے ادیبوں کے مجمع میں دیکھ کر سیدہ کے چہرے پر سراسیمگی اور آزردگی کی لہر ضرور دوڑ جاتی۔ وہ جو پہلے موم کی بنی ہوئی تھی یک لخت پتھر کی بن جاتی تھی۔ اس کی آمد ہمیشہ محفل کا رنگ بدل دیتی تھی۔ وہ آتے ہی کہتا:

"ہلو! ہلو! ہلو! ارے میاں کچھ کھانے کو بھی ملا کہ محض شاعری ہی سے پیٹ بھر رہے ہو تم لوگ؟"

اب آپ ہی بتائیے کہ کسی غزل کے درمیان یا کسی کہانی کے بیچ میں کھانے پینے کا ذکر کرنا کتنی مہمل سی بات ہے۔ پیٹ تو ہر وقت بھرا جا سکتا ہے۔ پلاؤ قورمہ نہ سہی سادا کھانا تو سب ہی کو مل جاتا ہے، لیکن رُوح کی پیاس مٹانے اور بجھانے کے لئے تو مخصوص ساعتیں ہیں۔ جہاں وہ گھڑی گزر گئی روح ہمیشہ کے لئے پیاسی بھوکی رہ گئی۔ یہ نازک سی بات، جو سیدہ کا جزوِ زندگی بن چکی تھی، چمڑے کے تاجر کے دماغ میں کیسے آتی۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ اپنے سوال کے بعد ہی خود ہی قہقہہ بھی لگایا جاتا۔ گویا اپنے اوچھے پن پر ڈھول پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار بھی ضروری تھا۔

اس قہقہے میں دوسرے سننے والوں کو کتنی ہی آسودگی، کتنا ہی اطمینان اور کتنی ہی دل نواز موسیقیت محسوس ہوتی ہو مگر سیدہ کے روحانی انبساط کے لئے تو وہ صورِ اسرافیل کا کام دیتا۔ سیدہ کو محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم و جاں کا ہر تار جھنجھنا اُٹھتا۔ وہ "شی ——— شی" یا "ہش ——— ہش" کہہ کر اُوپر پھڑکتے ہوں پر اُنگلی رکھ کر اشرف کو خاموش تو کر دیتی تھی مگر محفل کی فضا بالکل برباد اور خراب ہو جاتی۔ اب ہر دماغ میں منثور نغمہ کی جگہ میز پر چُنی ہوئی نعمتیں ہوتیں اور ہر نظر میں معشوق و محبوبِ خیالی کی جگہ کیک اور پیسٹری گھومنے لگتی۔ سیدہ کو ادبی جلسہ جلد سے جلد ختم کر کے اس نشست کو کھانے پینے کی پارٹی میں تبدیل کر دینا پڑتا اور سیدہ کی جگہ اشرف اس جلسے کی جان بن جاتا۔

مگر اشرف سیدہ کی آزردگی محسوس کر لیتا اور کسی نہ کسی شاعر یا ادیب سے حسنِ تدبیر سے اس پر اصرار کرا دیتا کہ چائے کا دَور ختم ہوتے ہی سیدہ اپنی نئی تخلیق ضرور سنائے اور ہر سننے والا حق نمک ضرور ادا کرے۔ سیدہ اس حسنِ اخلاق کا بھرا ورک کے سر باندھتی، خاموش اشرف اس سے بھی محروم رہتا۔ بلکہ جب وہ بے اعتنائی سے اُکتا کر کام کا بہانہ کر کے سیلون سے نکل جاتا تو سیدہ یہی کہتی —— "انھیں نہ تو ادب سے کوئی لگاؤ اور نہ ان کے لئے شعر میں کوئی مزہ۔ بس کھانا پینا ہو یا مُردار چمڑے کا کام ——! توبہ!"

نوجوان ادیب ایسے مواقع پر اظہارِ ہمدردی کر کے مخصوص نوازشوں سے سرفراز کئے جاتے، ان کو سعیدہ کے ساتھ سینما، ڈانس اور دوسری تفریحوں میں مفت شرکت کی عزت ملتی اور وہ "دوست" کے مخصوص لقب سے پکارے جاتے۔ وہ اپنے طور پر بڑبڑاتی — "کیا ضرورت ہے ایسے جلسوں میں ان کے تشریف لانے کی! پھر آتے ہیں تو دس منٹ کے لئے، اپنے کمرے میں جا کر نہا دھو کر کپڑے بدل کر کیوں نہیں آتے۔ جس مصنف اور شاعر کو دیکھو بن ٹھن کر آتا ہے۔ سر میں خوشبودار تیل، کپڑے صاف ستھرے، سُرمہ لگائے ہوئے، عطر ملے ہوئے، تازہ شیو بنائے ہوئے اور یہ ہیں کہ نہ ڈھنگ کے کپڑے نہ بال میں کنگھا، نہ... کی تو، بالکل حیوان صورت، حیوان سیرت!"

یہی رونا وہ سہیلیوں سے روتی۔ جب وہ اس کے سیلون، اس کی محل نما کوٹھی، اس کے سازوسامان، اس کی نصف درجن موٹروں کا ذکر کرتیں تو وہ مُسکرا مُسکرا کر اُن کی باتیں سنتی، مگر جب وہ اسے اتنے دولت مند اور چاہنے والے میاں کے ملنے پر مبارک باد دیتیں تو اس کے ہلالی ابرو تلواروں کی طرح کھنچ جاتے۔ وہ کہتی۔ "ہے ہے بی بی، یہ نہ کہو، دیکھتیں نہیں کہ میں کتنی پیلی پڑ گئی ہوں، کیسی گھلی جا رہی ہوں، ہر روز میری روح تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ تم کو کیا معلوم کہ اللہ نے مجھ کو کیسا جوڑ دیا ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں ہیں، گورا چِٹّا رنگ ہے تو بس وہ سب کچھ ہو گئے —— ارے اُن میں آدمیت چھو تک نہیں گئی ہے۔ ایک شعر بھی تو موزوں نہیں پڑھ سکتے تشبیہ، استعارہ، صنعتیں، تلمیحیں، زبان و بیان کی باریکیاں، لطافتیں، روزمرّہ و محاورہ، کچھ بھی تو ان کے پلّے نہیں پڑتا۔ کبھی کوئی بات شاعرانہ انداز سے نہ کہیں گے۔ کسی مجسمے، کسی تصویر کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر انبساط کی لہر نہ دوڑے گی۔ مُنہ سے واہ نہ نکلے گی —— !"

سہیلی کہتی — "ارے نہ مُسکراتے ہوں گے ان مردانہ تصویروں اور ننگی مجسموں پر۔ تم کو تو دیکھ کر ہنس جاتے ہیں تمہاری ادنیٰ مسکراہٹ حاصل کرنے کے لئے لمبی لمبی چکیں تو کاٹتے ہیں۔ مٹھی بھر بھر کر سونا تو تمہارے قدموں تلے ڈال دیتے ہیں...... !"

سعیدہ اور بھی جِز بِز یا ہو جاتی۔ وہ کہتی۔ "ارے تم کیا جانو، یہ سب کا بیکے لئے کرتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مجھے سمیٹ کر اپنے سینے میں بھر لیں۔ میری ہڈیاں پسلیاں بھینچ بھینچ کر توڑ ڈالیں۔ جب اکیلے ہوں گے تو مجھے بس اس طرح گھوریں گے کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ چیخ کر بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ پھر گھر میں رہیں گے تو ہر وقت بنیائن تہمد کھینچے رہیں گے۔ لاکھ صبح شام بنیائن بدلواتی ہوں مگر جہاں جسم پر پڑی اور سڑی ہوئی مچھلی کا جال بن گئی —— معلوم ہوتا ہے مردار چمڑے کی ساری بُو ان کے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ بس وہ قریب آئے اور ناک سڑنے لگی! ——"

ایک سہیلی بولی۔ "مجھے تو مردانی بنیائن کی وہی کھٹی کھٹی بُو پسند ہے۔"

سعیدہ نے اس کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ وہ صوفے سے اُچک کر سنگار میز کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے کپڑوں میں بہت سا سینٹ لگایا اور لیونڈر کی شیشی لے کر سہیلیوں تک آئی۔ ہر ایک کے جسم ہی پہ نہیں بلکہ ہوا پر بھی بہت سا لیونڈر انڈیلا جب جا کر اسے تسکین ہوئی۔ وہ کیا کرے "مردار چمڑے" کی بُو سے اسے ہمیشہ متلی سی ہونے لگتی تھی۔

ان دنوں اشرف سے سعیدہ کی ناخوشی ایک خاص وجہ سے اور بڑھ گئی تھی۔ اسے ایک "دوست" نے اطلاع دی تھی کہ ایک ہز ہائینس چغتائی کی تصویروں کا ایک سٹ نکالنا چاہتے ہیں۔ ہز ہائینس نے اسے لیا تھا پچاس ہزار میں، لیکن اب جو ریاست کے نکل جانے سے تنگی محسوس ہوئی تھی تو وہ اسے پچیس ہی ہزار میں نکالنے کے لئے تیار تھے۔ سعیدہ ان کے اس سٹ کی تعریفیں مختلف لوگوں سے سُن چکی تھی۔ وہ ایسے زرّیں موقع کو ہاتھ سے نکل جانے دینا نہ چاہتی تھی۔ وہ اشرف سے مُصر تھی کہ اس پچیس ہزار کا بندوبست فوراً ہونا چاہیئے۔ یہ تصویریں ضرور لے لی جائیں، مگر اشرف برابر ٹالتا رہا۔ کہتا تھا آج کل پیسوں کی کمی ہے پچیس ہزار کی رقم تفریحی کاموں میں نہیں لگائی جا سکتی۔ سعیدہ اشرف کا یہ عذر روپیہ نہ دینے کا بہانہ سمجھتی تھی، مگر تھی یہی حقیقت اشرف اس وقت بالکل کنگال ہو رہا تھا۔ وہ سعیدہ پر دل و جان سے عاشق تھا وہ اس کی خوشی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے اپنی بساط سے کہیں زیادہ سعیدہ کی خوشی پر صرف کیا تھا۔ تین برس کی شادی شدہ زندگی میں وہ سعیدہ کو پچیس تیس لاکھ روپے دے چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اپنی ہی پُونجی سے کام چلا تھا۔ پھر اُسے قرض اُدھار بھی لینا پڑا اور وہ ہر طرف سے ہار کر اسی سفینا تھی کا بوجھ اُٹھانے کے لئے تجارتی جوا کھیلنے لگا۔ اس نے گھوڑ دوڑوں میں بازی لگائی، اُس نے سٹا کھیلا اور وہ شیئر مارکٹ کا کھلاڑی بن گیا۔ یہ تجارتی جوا ایسا روگ ہے جسے پال کر کبھی کوئی پروان

نہیں چڑھ سکتا۔ اس کے لئے کروڑوں کا سرمایہ ہونا چاہیئے۔ اور سیکڑوں کی تعداد میں بے ایمانیاں کرنے والے خفیہ ساتھی اور مددگار۔

اس زہریلی شراب کا چسکا لگایا اشرف کے اس سیٹھ دوست نے جو اس کے کارخانوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ شروع شروع میں اس نے اشرف کو چھوٹی چھوٹی ٹپس دیں، ان میں اسے پچیس تیس ہزار کا فائدہ ہوگیا۔ یہ سمجھا سیٹھ کے خوش رکھنے کا ڈھنگ آ گیا۔ سیٹھ کی گھر پر دعوت کی۔ سعیدہ سے ملاقات کرادوں تو یہ اور بھی خیال رکھے گا۔ وہاں سعیدہ کو اپنی تفریح سے کہاں فرصت نہ اس نے دعوت کا کوئی انتظام کیا اور نہ میز پر وہ ساتھ بیٹھی۔ اس کا اپنا پہلے سے ہی پروگرام بن چکا تھا۔ وہ کچھ نوجوان ادیبوں اور فنکاروں کو ساتھ لے کر سینما دیکھنے چلی گئی۔ سیٹھ نے اس بے اعتنائی کو اپنی انتہائی ذلت سمجھا۔ اسے اشرف سے اور کد پیدا ہوگئی۔ خود غرضی میں بدلہ لینے کے خیال نے نمک مرچ کا اضافہ کیا۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا کا مصداق بنا۔ اس نے مخلص بن کر ایک دیوالیہ کمپنی میں لاکھوں روپے اشرف سے لگوا دئے۔ دو ایک دن تو اس کے حصّوں کا بھاؤ خود ہی بڑھاتا رہا۔ جب اشرف پوری طرح پھنس گیا تو اس نے سارے حصّے کوڑیوں کے مول بکوانا شروع کر دئے۔ کمپنی ٹوٹ گئی اور اشرف کا دیوالہ نکل گیا۔

اشرف جانتا تھا بیوی کو تجارتی کاروبار کے ذکر ہی سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ وہ سعیدہ سے کیا کہتا۔ وہ اسے بہانہ سمجھ کر اور ناخوش ہو جاتی۔ اس کا دماغ پھٹا جاتا تھا، اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، مگر اس نے لب سی لئے، اس نے کچھ نہ کہا۔ اتفاق یہ کہ اسی شام کو راجہ کا پیغام آیا — "اگر آپ تصویروں کا سٹ لینا چاہتی ہیں تو بارہ گھنٹے کے اندر لے لیجئے ورنہ مجبوراً دوسرے گاہک کو دے دینا پڑے گا۔ بس صبح اٹھتے ہی سعیدہ نے حکم جاری کر دیا "جس طرح بنے مجھے آج پچیس ہزار مل جانا چاہئیں۔ فوراً چیک کاٹ کر مجھے دو!"

اشرف نے کہا — "بیگم چیک کاٹ کر کیا کروں گا۔ بنک میں ایک پیسہ نہیں!"

سعیدہ پاؤں پٹک کر بولی۔ "میں کچھ نہیں جانتی! قرض اُدھار لو کارخانہ بیچو، اپنے کو بیچو مگر مجھے روپے لا کر دو!"

اشرف گھبرا کر باہر جانے لگا۔ وہ بولی "گھر پلٹنا تو روپے کر آنا، خالی ہاتھ ہرگز نہ آنا!"

اشرف نے سعیدہ کو حسرت بھری نظر سے دیکھا اور گردن جھکائے نکل گیا۔ کارخانے پہنچا تو وہاں قرض خواہوں کا پورا گروہ منتظر ملا۔ سب کا تقاضا کہ روپے ادا کرو ورنہ قرقی لاتے ہیں۔ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ وعدہ کرکے ٹالا۔ مگر کرے تو کیا کرے۔ روپیوں کا بندوبست تو کرنا ہی تھا۔ مختلف جگہوں پر ٹیلیفون کیا، جن سے لین دین بیوپار تھا اُن سے قرض مانگا، ٹکا سا جواب ملا۔ بنکوں کے منیجروں اور ایجنٹوں سے ملاقات کی، سب نے قرض دینے سے انکار کیا۔ سب کو جیسے یقین تھا کہ اس ڈوبتے کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتے ہی وہ خود بھی ڈوب جائیں گے۔

شام کو تھکا ماندہ وہ اِدھر اُدھر گھومتا پھرا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ گیٹ وے آف انڈیا کی طرف جا نکلا۔ برسات کا زمانہ تھا، پانی برس چکا تھا، مگر ہوا تیز تھی اور سمندر کا مد پورے زور پر تھا۔ وہ سمندر کے کنارے والی دیوار پر کہنیاں رکھ کر بپھرے ہوئے بحر کے سماں سے لطف لینے لگا۔ خود اس کے دل و دماغ میں کچھ اسی طرح کا تموج تھا۔ زندگی میں کبھی سکون نہ پیدا ہوا۔ خود سے چھوٹے پیمانے کی تجارت کو بڑھا کر سرمایہ داروں کی ٹولی میں گھسا۔ نہ جانے کتنی دشوار گزار منزلوں کو پار کرنا پڑا۔ کیسے کیسے ہفتخواں طے کئے۔ ابھی فروغ حاصل ہو چکا تھا کہ سعیدہ کے عشق نے دیوانہ بنایا۔ کوششیں کیں، تدبیریں کیں، اُس بُت کو رام کیا، بیوی بنا کر گھر لایا۔ مگر وہ معشوقہ کی معشوقہ ہی رہی۔ اس کی خوشی کے لئے اچھے خاصے چلتے ہوئے دھندے کو لگا ڈالا۔ اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلایا، سعیدہ کی فرمائشیں پوری کرنے میں بال بال مقروض ہوا اور سب کچھ داؤں پر لگا کر ہار گیا۔ اس قربانی کے بدلے میں ہاتھ کیا آیا۔ کچھ بھی نہیں۔ نہ رفاقت ملی، نہ خدمت کرنے اور دکھ بٹانے کی خواہش۔ وہی تنہائی، وہی اکیلا پن۔ سعیدہ نے نہ تو اس کی روح کی تڑپ کو پہچانا، نہ اس کے بلکتے ہوئے جذبات کی گرمی بٹائی۔ دونوں کے جسم یقیناً ملے مگر کبھی ایک نہ ہوئے، کھانے کو ٹکڑا ملا ضرور مگر اسی انداز سے جیسے بھوکے کتّے کے سامنے ہڈی پھینک دی جائے۔ جیسے بھکاری کے چمٹے میں چٹکی بھر آٹا ڈال دیا جائے، جیسے دہکتے تنور میں چلو بھر پانی کا چھینٹا مارا جائے۔

اشرف کے گھومتے ہوئے دماغ میں کچھ اس طرح کے خیالات اُبھرتے اور مٹتے تھے کہ دفعتہً اُبلتی، بل کھاتی، اُچھلتی موج آئی اور پشتے سے ٹکرا کر وہ فوّارہ اٹھایا کہ اشرف کے کپڑے بھیگ گئے۔ ساتھ ہی میٹھی سُریلی آوازوں میں بچوں اور عورتوں کی ہلکی ہلکی چیخیں سُنائی دیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا

اسی کی طرح اس طوفانی منظر سے لطف لینے والے بچے، عورتیں، جوان، بوڑھے سب موج کے اس آبشار سے بچنے کے لئے سڑک تک پیچھے بھاگتے دکھائی دیئے۔ اسے تعجب بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی، غصّہ بھی آیا، جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ واہ یہ لوگ بھی کچھ سعیدہ ہی کے سے ہیں۔ سمندر کی جھپک جھڑک سے لطف اندوز تو ہونا چاہتے ہیں، اونچی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس اُس کے سینے میں جو سنہری دئے جلاتا ہے اس سے آنکھ تو سینک سکتے ہیں مگر اس کی آغوش میں جا کر اس کے دل کے داغ کو نہیں مٹا سکتے۔ اس کے مُنہ سے غم و غصّہ کا کف نہیں پونچھ سکتے۔۔۔۔۔ اور ویسے ہی اس کے کان بجنے لگے "گھر آنا تو خالی ہاتھ نہ آنا! خالی ہاتھ ہرگز ہرگز گھر نہ آنا! ہرگز ہرگز نہ آنا!" ۔۔ اور اس کے پاس خالی ہاتھوں کے سوا اب اور کیا تھا۔ نہ کارخانہ نہ گودام، نہ دکان، نہ ملازم نہ دوست، اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور نہ بیوی!

ویسے ہی سمندر دونوں ہاتھ پھیلائے آواز دیتا ہوا بڑھا۔ "آ، میرے پاس چلا آ! تیرا گھر یہاں ہے! تیری جگہ میرے دل میں ہے۔ ہر قطرے کو ایک نہ ایک دن یہیں آنا ہے۔ تو کیوں بھٹکا پھرتا ہے۔ کیوں نا قدروں میں گھرا کھڑا ہے، کیوں اجنبیوں سے آسرا لگائے بیٹھا ہے، آ، جلد آ، میری گود میں آ!"

اشرف کھِل کھِلا کر ہنسا اور پُشتے پر چڑھ کر لپٹتی موجوں کے ساتھ ہو لیا۔ سعیدہ کو غش پر غش آتے رہے، مگر کوٹھی بھی بکی اور سیلون کا پورا عجائب خانہ بھی، نہ کوئی مجسمہ بچا، نہ کوئی تصویر، نہ فرنیچر، نہ قالین، نہ جھاڑ، نہ فانوس۔ سب کچھ کوڑیوں کے مول نیلام ہو گیا اور اب سعیدہ ایک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر آرٹ مسٹرس ہے۔ اور وہ ایک ایسے مکان کی پہلی منزل پر رہتی ہے جس کے صحن اور نچلے حصّے میں دباغت کا کام ہوتا ہے اور اسے اس کی بو سے نہ تو قے آتی ہے نہ چکّر آتا ہے اور نہ دردِ سر ہوتا ہے ___ شاید وہ اب خود ہی مُردار چمڑا ہے!

جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

رضا علی وحشت کا انتقال

عید الاضحیٰ کے دوسرے دن خان بہادر رضا علی وحشت ڈھاکے میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم اُردو کے پُرانے اساتذہ میں سے تھے۔ غزل میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ دل کی بات کہتے تھے ؎

خدا گواہ کہ ہوں ترجمانِ دلِ وحشت
کہے ہیں شعر نہیں کی ہے شاعری میں نے

کلکتہ اور اس کے نواح میں آپ سے فیضِ سخن حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ آپ نے اُردو ادب اور اُردو شاعری کی گراں بہا خدمات کی ہیں لیکن ناقدر شناس زمانے نے آپ کو آپ کا حق بھی نہ دیا۔ خود موصوف ہی کا شعر ہے ؎

خیالِ تنگ نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمعِ انجمن کے لئے

کرشن چندر

رُوس میں اُردو

ماسکو کے ہوائی اڈّے پر سب سے پہلی آواز جو مجھے سُنائی دی۔ وُہ تھی — "آداب عرض، کرشن جی!" یہ آواز ادیبوں کی یونین کے مترجم کی تھی۔ اس آواز کو سُن کر میں ایک لمحے کے لئے چونک گیا۔ کیونکہ بیروت سے یہاں تک اب تک نامانوس اور اجنبی آوازوں سے واسطہ پڑا تھا جن کے سمجھنے میں بے حد دشواری ہوتی تھی۔ یہاں جو یہ آواز کانوں میں پڑی تو ایک عجیب قربت سی محسوس ہوئی۔ یوں معلوم ہُوا جیسے ہمارے وطن کا اک تازہ جھونکا رخساروں کو مس کر گیا۔

بعد میں یہ آواز اور دُوسری بہت سی آوازیں، شُستہ و رفتہ اُردو میں گفتگو کرنے والی آوازیں بہت مانوس ہو گئیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے معلوم ہُوا کہ نہ صرف ماسکو میں بلکہ رُوس کے دوسرے حصّوں میں بھی جہاں جہاں میں گیا اُردو زبان بہت مقبول اور معروف ہے۔ نہ صرف ماسکو یونیورسٹی میں اردو پڑھائی جاتی ہے بلکہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی سینکڑوں طلبا اور اساتذہ اردو زبان سے اپنی گہری دل چسپی اور شغف کا ثبوت دے رہے ہیں۔ تاشقند میں، تبلیسی میں، سیریوان میں، لینن گراڈ میں بہت سے اُردو جاننے والے اور بولنے والے ملے جو اُردو زبان سے، اُردو ادیبوں سے، مختلف اُردو ادیبوں کے مختلف شعری اور نثری انداز بیاں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں سے کئی بار گفتگو، بات چیت ہوتی رہی اور میں نے یہ دیکھا کہ زبان و بیان اور تلفظ کی دقتوں کے باوجود اور اس امر کے باوجود کہ یہ لوگ کبھی ہندوستان نہیں آئے تھے یہ لوگ اپنا مافی الضمیر اُردو زبان میں بخوبی ادا کر لیتے تھے۔ اور چند ایک کا لب و لہجہ تو اس قدر صاف تھا کہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ کبھی ہندوستان نہیں گئے اور پھر بھی اس قدر عمدہ اُردو کیسے بول لیتے ہیں۔ اگر میں انھیں خود اپنی آنکھوں سے اُردو میں گفتگو کرتے ہوئے نہ دیکھ لیتا تو کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لوگ دہلی اور لکھنؤ کے قرب و جوار میں کبھی نہیں رہے۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جن کا تلفظ اتنا عمدہ رہا ہو۔ عام طور پر رُوسی اردو کو اس طرح بولتے ہیں جس طرح ہم میں سے بہت سے لوگ انگریزی بولتے ہیں۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے لیکن پھر بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ ماسکو یونیورسٹی کو اور دوسری یونیورسٹیوں کو اور فارن لینگوئج انسٹی ٹیوٹ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے اردو اساتذہ مستعار لینے چاہئیں۔

ماسکو ریڈیو سے جو ایشیائی پروگرام نشر ہوتے ہیں ان میں اردو، ہندی اور بنگالی کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ شروع میں ان تینوں زبانوں کے لئے ایک ہی شعبہ تھا لیکن اب تین مختلف شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ اردو کا ایک الگ شعبہ ہے اور اس میں بڑے سلیقے سے کام ہوتا ہے۔ اور اس کے پروگرام سوویت دیس کے باہر اور خود سوویت دیس کے اندر بڑی دل چسپی سے سُنے جاتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی خبروں کے علاوہ ادبی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ اُردو شاعری، اُردو افسانہ اور اردو تنقید پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن اُردو ڈراموں کا فقدان ہے ہاں اردو افسانوں کو "سنگیت ریڈیک" میں ڈھال کے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ریڈیک اُردو ڈرامے کا بدل نہیں ہو سکتے۔ مگر شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ماسکو میں ہندوستانی آبادی بہت کم ہے اور ریڈیائی ڈراموں کے لئے اچھی آوازوں کا ملنا بہت مشکل ہے۔ شاید مستقبل قریب میں جب ہندوستان اور سوویت دیس میں کلچری تال میل زیادہ گہرا ہونے لگے گا تو یہ مشکل پیش نہ آ سکے گی۔

اُردو کی ترویج و اشاعت میں ہندوستانی موسیقی اور خاص طور پر فلمی موسیقی کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ ہندوستان میں رہ کر اس بات کا

احساس نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی فلمی موسیقی اپنی جاذبیت، رس اور لوچ کے باعث، ہندوستان سے باہر کس قدر مقبول ہے۔ عرب ممالک میں، اطالیہ میں اور خود سوویت وطن میں ہمارا فلمی سنگیت بہت مقبول ہے۔ ماسکو ریڈیو کے نہ صرف ایشیائی پروگراموں میں بلکہ گھریلو پروگرام میں بھی میں نے ہندستانی فلمی موسیقی کے ریکارڈ سُنے ہیں۔ وہ روسی لڑکیاں جو اُردو کا ایک لفظ نہیں جانتیں، ساحر لدھیانوی کا گیت "سُن جا زندگی کی داستان" مہینوں کوشش کرکے سیکھتی ہیں اور ماسکو ریڈیو پر کورس کی صورت میں گاتی ہیں۔ میرے وطن کے شہر کے چوک میں اور اس کی تفریح گاہوں میں میں نے "ہنستا ہے قرار ہے" کو مقبول دیکھا ہے۔ کرسمس کے دنوں میں تاشقند کے قومی تھیٹر کے باہر ازبکی اور روسی دھنوں کے علاوہ نو شادی کی دعوتوں پر اُردو گیتوں کو پاپولر ہوتے دیکھا ہے۔

ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری کو روس کے لوگ نہ صرف اردو شاعروں کی حیثیت سے جانتے ہیں بلکہ فلمی گیت لکھنے والوں کی حیثیت سے بھی۔ اور اُن کی غنائیت کی تعریف کرتے ہیں۔ چلتے چلتے یہ بھی کہہ دوں کہ لتا منگیشکر یونیورسٹی کے طلباء میں بے حد مقبول ہے۔ اور طالب علموں کی اکثر ایسی مجلسوں میں جہاں اُردو جاننے والا میرے مترجم کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، لتا کے اُردو گیت گا کے مجھے سُنائے گئے، اور مجھے بتایا گیا کہ وہ لوگ لتا منگیشکر کو روس میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ سوویت وطن میں دو بار میں نے ریل کا سفر کیا اور دونوں بار ملک کے مختلف حصوں میں، ایک بار آرمینیا جاتے ہوئے، دوسری بار لینن گراڈ جاتے ہوئے، لیکن دونوں بار ریل گاڑی کے لوکل ریڈیو پر اُردو گانے سُننے کو ملے۔ دوسرے گیت بھی تھے، کوریائی، چینی، انڈونیشی، روسی، یوکرینی، لیکن ان کے ساتھ اُردو کے گیت بھی سُننے کو ملے۔ مجھے یاد ہے صبح کا وقت تھا لینن گراڈ ابھی آیا نہ تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ چاروں طرف برف کا پھیلا اندھیرا تھا۔ سپاٹ میدان، سپاٹ آسمان کہیں کہیں فر کے جنگل نظر آ جاتے مگر وہ بھی برف پوش۔ میں گاڑی کے ریشمی پردے ہٹا کر کھڑکی سے باہر اس منظر کو دیکھ رہا تھا جس میں ساری کائنات یخ بستہ اور منجمد معلوم ہوتی تھی کہ دفعتاً ریڈیو بجنے لگا "جاگ سوزِ عشق جاگ"

میں یکایک چونک گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے وطن نے مجھے دُور سے پکارا۔ جیسے نئی نویلی صبح میں چنبیلی کے لاکھوں گجرے چمک اُٹھے۔ جیسے اس یخ بستہ منظر پر لاکھوں آفتاب اُتر آئے۔ یوں پردیس میں وطن کی میٹھی بولی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔ جب میں نے کنڈکٹر کا شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا "مگر ہم تو اکثر آپ کے ملک کے گیت اس ریڈیو پر سُناتے ہیں۔ لوگ سمجھیں نہ سمجھیں۔ ان کے اندر ایک پکار ہوتی ہے جو دل پر اثر کرتی ہے۔"

اُردو کا چرچا سوویت ادیبوں کی انجمن کے ذریعے سے خاص طور پر ہو رہا ہے۔ یوں تو ہندوستان کی سبھی زبانوں سے سوویت دیس کی زبانوں میں تراجم منتقل کئے جا رہے ہیں لیکن ان میں اُردو کو ایک مؤقر اور ممتاز جگہ حاصل ہے۔ اس وقت تک ہندوستان کی مختلف زبانوں سے ۱۱۶ ادیبوں کی تخلیقات کو ترجمے کے ذریعے سے روسی زبان میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان میں ٹیگور کو چھوڑ کے پھر اُردو ادیبوں ہی کا نمبر آتا ہے جن کی کتابیں وہاں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور ہاتوں ہات فروخت ہو جاتی ہیں۔ اس وقت اردو نثر سے زیادہ ترجمے کئے گئے تھے۔ کیونکہ شعری مواد کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا اور شروع شروع میں اس کام کے لئے موزوں مترجم بھی دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ اب یہ کمی ایک حد تک پوری ہو چکی ہے اور اب اقبال، جوش، فراق، فیض، سردار، مجاز، ندیم، ساحر، مجروح اور دیگر شعراء کے کلام کا روسی ترجمہ شروع ہو چکا ہے اور اس طرح سے یہ خوبصورت زبان جسے آج تک کسی دربار نے نہیں نوازا اپنی عوامی بولی کا مزا اور اپنے میٹھے مشترکہ کلچر کا ورثہ لے کر باہر جاتی ہے اور مختلف ملکوں اور مختلف عوام کے درمیان محبت کا پُل بناتی ہے ٭

اثر لکھنوی

کیا سمجھے

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی کتاب "غزل اور مطالعۂ غزل" میں لکھنوی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ناسخ، آتش اور ان کے شاگردوں کی شاعری کی خوب مٹی پلید کی ہے۔ آتش کی غزلوں میں ان کے نزدیک اچھے اشعار بہت ہی کم ہیں۔ ایک رمق اور ناسخ کا کلام تو ابتدا تا انتہا رکاکت، ابتذال اور رعایتِ لفظی کا بدترین نمونہ ہے۔ ترکیبیں شاندار لیکن ان کے اندر کچھ نہیں۔ کوئی بڑا خیال، کوئی پُرخلوص جذبہ، کوئی واضح نظریۂ حیات، کسی طرح کا اوج اور بانکپن نہیں۔ یہی حال ان دونوں استادوں کے شاگردوں کا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس قول میں حقیقت کم اور مبالغہ بہت زیادہ ہے۔ میں فی الحال آتش کے کلام سے بحث نہیں کروں گا کیونکہ اس کا منتخب کلام مع مقدمہ شائع کرنے کا قصد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ امر قطعاً نظر انداز کر دیا کہ اس دور میں صرف لکھنؤ ہی بدمذاقی کا شکار نہیں تھا۔ دہلی میں بھی یہی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ نصیر اور ایک حد تک ذوق کی شاعری لکھنوی شاعری کی آوازِ بازگشت ہے غالب اور مومن دونوں نے ناسخ کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو مومن جرأت کی طرف جھکے اور غالب نے میر کا دامن تھاما۔ شیفتہ جن کی سخن فہمی کے غالب مداح تھے اپنے تذکرۂ گلشنِ بے خار میں ناسخ کی تعریف کے پُل باندھ دیتے ہیں اور آتش کو ناسخ کا ہم پایہ ماننے کی قباحت کا اظہار کر کے ناسخ کے، ایسے اشعار بھی انتخاب میں شامل کرتے ہیں کہ ان کی خوش فہمی پر شک ہونے لگتا ہے۔ مثلاً

ہم نے جو تیغ بنائی ہے ترے موباف کی   نافۂ مشکیں بنا ہے منہ ہرا کس ناسور کا

لاغر ایسا ہوں کہ میں اکثر ہوا سے اڑ گیا

میرے پیکر میں ہے عالم کا عنصری تصویر کا

کی ہے یاں شدت سے شدتِ بے شگالِ اشک نے

کیوں نہ واں آجائے عالم سبزے کے آغاز کا

اپنے ہمدم کو لے کے شبِ وصل باغ میں   جاگا میں آشیانۂ مرغِ سحر سے دور

وہ ادھر رخصت ہوا اُٹھا ادھر طوفانِ اشک

تیرتا جاتا ہے اس قاتل کا توسن آب میں

(شیفتہ کے انتخاب میں ایسے بے ہودہ اشعار کم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے بھی کان کاٹے ہیں)

سب تو سب ناسخ اور آتش کی مقبولیت دیکھ کر بوڑھے مصحفی کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اپنے دیوانِ ششم کے دیباچے میں لکھا ہے:

"غزلیات این دیوانِ ششم را اکثرے بروشِ ایشاں (یعنی آتش) گفته ..... (ناسخ) بر طرزِ ریختہ گویاں سادہ در عرصۂ قیس خطِ نسخ کشیدہ و از فضایش بر قدم او خواجہ آتش ہم سلمہ سمندِ تیز گامِ خیال را از دائرہ جہتِ شعر بیروں برد۔ عاصی ہم از گروہِ سادہ گویاں بود ..... "

غالب ناسخ و آتش کے دواوین میں تیر و نشتر پاتے ہیں۔ ناسخ کے یہاں آتش سے نسبتاً کم۔

ظاہر ہے کہ محض پیچ اور لچر اشعار کی بنا پر ناسخ کی شہرت نہیں تھی۔ اس کے دواوین میں اچھے اشعار بھی ہیں اور معقول تعداد میں ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کے مبتذل اشعار ہی کو ناسخ کی کل کائنات سمجھا ہے۔ کسی کے کلام سے محض بے وقر اشعار کا انتخاب کرنا اور اچھے اشعار کو نظر انداز کر دینا کہاں کا انصاف ہے اور کس حد تک مستحسن ہو سکتا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو آتا ہے نہ چنا الفاظ میں

بیان کر دی :

"(ناسخ کی) غزلوں میں شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی
بہت ہے اور تاثیر کم۔"

"ڈاکٹر صاحب نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے مگر ذہنِ نقاد بات کی تہ کو نہ پہنچا
تھا نہ پہنچا۔ بے اختیار میر کا یہ شعر یاد آتا ہے ؂

نعمت زنگارِ رنگِ حق سے بہرہ بختِ سیہ کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

پہلے میں ناسخ کی انھیں غزلوں میں سے چند غزلوں کے اشعار بطور نمونے
کے جن سے ڈاکٹر صاحب نے لئے ہیں اُن کی خوش فہمی و خوش سلیقگی ثابت کروں گا
بعد ازاں کلامِ ناسخ سے اپنا انتخاب الانتخاب اختصار کے ساتھ پیش کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب کا انتخاب	اسی غزل سے اثر کا انتخاب
۱۔ اپنے ہم یار کے پرسوں سے نہ ملتی فرصت گردشِ دیدۂ عالم سے نہ پنہاں ہوتا	۱۔ اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے آہ آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا
۲۔ سفر ہم نے کیا یادِ لبِ جاناں میں دنیا سے چراغ اپنی لحد پہ چاہیے لعلِ بدخشاں کا	۲۔ مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا ۳۔ ترا دیوانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے یقیں ہر روزنِ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا ۴۔ کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا نہ اُلجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا
۳۔ تو نے جو پانی پیا ہے اے بتِ شیریں دہن آبخورے میں ہے عالم کوزۂ فصّاد کا	۵۔ سب سے ہے طرزِ وفا اک مجھ سے انداز جفا کس سے جا کر میں کروں شکوہ تری بیداد کا ۶۔ کوئی غنچہ ہے کوئی گل ہے کوئی پژمردہ ہے دیکھتے ہیں ہم تماشا گلشنِ ایجاد کا ۷۔ محوِ عشق ایسا ہوں کرتے ہیں اگر اعدا بھی ظلم شبہ ہوتا ہے اسی محبوب کی بیداد کا ۸۔ رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں گل کو گلچیں کا خطر، بلبل کو غم صیاد کا

ڈاکٹر صاحب کا انتخاب	اسی غزل سے اثر کا انتخاب
۴۔ آبلے چیچک کے جب نکلے عذارِ یار پر بلبلوں کو برگِ گل پہ شبہۂ شبنم ہوا	۹۔ خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سربلند آسماں پیشِ زمیں ہمیشہ تا صبح خم ہوا (غمِ دوراں کو غمِ جاناں سے متحد کرنے کو حال کے ایک شاعر سے منسوب کرنے والے سنیں) ۱۰۔ جوشِ پر طوفانِ اشک اے دیدۂ پُرنم ہوا آگے تھا اک ہجر کا غم اب غمِ ہمدم ہوا
۵۔ دلِ رقیب میں سامانِ روسیاہی ہے کہ جس طرح کوئی رکھے خضاب شیشے میں	۱۱۔ بہار آئی بھروں اب شراب شیشے میں اُتاروں شکلِ پری آفتاب شیشے میں
۶۔ رفتارِ ناز میں یہ لچک جاتی ہے کہ بس گویا تری کمر میں صنم استخواں نہیں	۱۲۔ دو روز ایک رنگ پہ وضعِ جہاں نہیں وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں ۱۳۔ آنکھوں سے فائدہ جو نہیں تیری گرد راہ حاصل جبیں سے کیا جو ترا آستاں نہیں ۱۴۔ حاصل تجھے بصارتِ یعقوب ہو، اگر یوسف بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں ۱۵۔ منہ کے تشکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں ۱۶۔ پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

اور اب ناسخ کے عمدہ اشعار میں سے چند شعر سنیئے، جو باعثِ ننگ نہیں بلکہ
قابلِ رشک ہیں جن کی بنا پر اُس کے معاصرین کو لالچ آیا کہ ہم بھی ایسے
شعر کہیں۔

۱۔ نام رکھت ہے کہیں شورش مستانہ کہیں
نہیں شغلِ حرم و خانۂ خمار جدا

۲۔ جب تصورِ یار کا باندھا ہم آپ آئے نظر
سامنے آنکھوں کے آئینہ ہمارا دل ہوا

۳۔ مست بکتے ہیں جس کو ابرِ بہار
گوشہ ہے میرے دامنِ تر کا

۴۔ عمرِ جاوید یہ چھوڑ کر لی موت ۔۔۔ دیکھنا حوصلہ سکندر کا

۵۔ تماشائے جہاں ہم دیکھتے ہیں کنجِ عزلت میں
ہمارے بوریئے کا نقش خط ہے ساغرِ جم کا

۶۔ صحرا ایسا چاہیئے عاشق خیالِ وحشت میں ۔۔۔ بگولا گر بولے یقیں ہو یا لیلی آواز کا

۷۔ کھینچ لائی وادیٔ ہستی میں بے تابی مجھے ۔۔۔ رہ گیا پیچھے عدم میں قافلہ آرام کا

۸۔ آرہی ہے حق پرستی حق پرستی کے عوض ۔۔۔ رہ گیا ہے کیسی خواری سے نشان اسلام کا

۹۔ رات بھر جو سامنے آنکھوں کے وہ مہ پارہ تھا ۔۔۔ غیرتِ مہتاب اپنا دامنِ نظارہ تھا

۱۰۔ نگہ ٹھہرتی نہیں اپنے حسن پر اس کی ۔۔۔ شعاع نور سے آئینہ آفتاب ہوا

۱۱۔ بات جن نازک مزاجوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی
وہ جہاں سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اٹھا

۱۲۔ مانعِ صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں ۔۔۔ دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

۱۳۔ ملاقاتِ دو روزہ کو یہاں آتے ہیں ہم لیکن
سرائے دہر نے سب کو مقامِ جنگ ٹھہرایا

۱۴۔ ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں ۔۔۔ اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

۱۵۔ آتی ہے عالمِ بالا سے صدا مانگ سو دوں
امتحاں کر بھی میں لیکن کبھی سائل نہ ہوا

۱۶۔ ہوں چراغ اس بزم کا ناسخ کہ جس میں لاکھ بار
پتلیوں کا عالمِ مستی تماشا کر گیا

۱۷۔ خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں ۔۔۔ سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

۱۸۔ وصفِ جنت جب کئے واعظ نے منبر پر شروع
صاف میں سمجھا کر کرتا ہے بیانِ کوئے دوست

۱۹۔ جو وہاں پہنچا وہی آگاہ اس عالم سے ہے
اور ہی کچھ ہیں زمین و آسمانِ کوئے دوست

۲۰۔ وصل میں تھا صبح سے بیزار میں ۔۔۔ ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

۲۱۔ مجھی سے عشق ہے سو دیکھتا ہے تیری صورت کو
عبث باندھی ہے تہمت بت پرستی کی برہمن پر

۲۲۔ تاسخ ہے آپ تھوں پر مشقِ تصورِ اس قدر ۔۔۔ جس سمت کرتا ہوں نظر دلدار آتا ہے نظر

۲۳۔ سر پہ سوزاں داغِ سودا پاؤں میں زنجیرِ اشک
تیری محفل میں کھڑی ہے صورتِ دیوار شمع

۲۴۔ ماہِ نو ہے مثلِ ابرو لیکن اس کا رو نہیں ۔۔۔ ماہِ کامل صورت رو ہے مگر ابرو نہیں

۲۵۔ رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی
دل ہی دل میں ہم اُسے یاد کیا کرتے ہیں

۲۶۔ گر سکھ ہے تو باطنِ انساں کی سیر کر ۔۔۔ کیا کیا طلسم دفن ہیں مشتِ غبار میں

۲۷۔ ہمیشہ نشۂ ایجاد سے بے ہوش ہوں میں
خمِ گردوں بھی نہ تھا جب سے کہ مے نوش ہوں میں

۲۸۔ نہیں ممکن خمِ گردوں میں ٹھہرنا میرا
مستیٔ عشق سے وہ بادۂ سر جوش ہوں میں

۲۹۔ تری آنکھیں نہیں یہ دونوں پلے ہیں ترازو کے
ہمیشہ نیک و بد کو تول ناسخ اس ترازو میں

۳۰۔ ایک کو عالمِ حیرت میں نہیں ایک سے کام
شمع تصویر سے روشن شبِ تصویر نہیں

۳۱۔ کیونکر کہوں عارفِ خدا ہوں ۔۔۔ معلوم نہیں کہ آپ کیا ہوں

۳۲۔ اُمیدِ وصال اب کہاں ہے ۔۔۔ اُس گل سے برنگِ بو جدا ہوں

۳۳۔ کس نے چہرے سے اُٹھائی ہے لبِ دریا نقاب
کوندتی ہیں بجلیاں لہروں کے بدلے آب میں

۳۴۔ رہنمائی میری کرتی ہے مجھے پامالِ خلق ۔۔۔ خضرِ راہِ منزلِ مقصود مثلِ جادہ ہوں

۳۵۔ دیکھنا کل آپ سے کوئی نہ رکھے گا قدم
آج جانے کی اجازت جس گلستاں میں نہیں

۳۶۔ گاؤ خوری سود خوری ایک سی دونوں میں ہے
کچھ تفاوت ان دنوں ہندو مسلماں میں نہیں

۳۷۔ زندگی زندہ دلی کا ہے نام ۔۔۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

۳۸۔ وصل میں جستجوئے یار یاں غفلت سے ہے
عین دریا میں ہے گردش جس طرح گرداب کی

۳۹۔ کب سبکدوش ہے قیدیٔ زندانِ وطن ۔۔۔ بوئے گل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

۴۰۔ جو ضعیفوں کو ستائے گا سزا پائے گا ۔۔۔ آپ دُکھ پاتے ہیں جو روندتے ہیں خاک کو

۴۱۔ چھپے ہے اس کے جو ہو نشہ وہ ہو اس کے دیکھے سے
نہ جام بادہ پہنچے گا تمہاری چشمِ میگوں سے

؂ سلطنتِ اودھ کی تباہی کی پیش گوئی۔

۴۲۔ چھوڑوں گی صالِ یار میں کیا اضطراب کو — دریا میں ہے قرار کہاں موجِ آب کو

۴۳۔ سو رمز کی کرتا ہے اشارے میں وہ باتیں — ہے لطف خموشی میں تکلم سے زیادہ

۴۴۔ آئینہ خانہ ہے عالم، عکس افگن ہے وہی
ہے فروغِ مہر و ذرات ایک ہی تنویر سے

۴۵۔ پھر بہار آئی کہ ہر شاخ پہ پیمانہ ہے
ہر روش باغ میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

۴۶۔ لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے
فصلِ بہار جوش ہے موسمِ ناؤ نوش ہے

۴۷۔ صدقے ہوتی ہے چال پہ کیوں نہ نسیمِ سحر
نقشِ قدم سے رشکِ دامنِ گل فروش ہے

۴۸۔ منعم سوزی کے گھر کو بھی حاجت اٹھ نہیں
مانگتا ہے کب، کوئی جاکر عسل زنبور سے

۴۹۔ رکھو کسی طرح تو سرو کار جبرِ یار — کرتے رہو جفا ہی وفا کر نہ ہو سکے

۵۰۔ تو وہ ماہِ مصرِ خوبی ہے کہ تیرے عشق میں
مدتوں سے اخوان دل کا کارواں گردش میں ہے

۵۱۔ کس کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

۵۲۔ ساکنِ دل آ ہوا آنکھوں کو ترساتا ہے کیوں
جس قدر دل صاف ہے ویسی نگہ بھی پاک ہے

۵۳۔ چھلکاتے ہیں جو ساقی شیشے ہنس ہنس کے جام سے
یہ سمجھو کہ مقام نہیں ہے غرور کا

۵۴۔ کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے — نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

۵۵۔ دمِ بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا — جھونکا جو ہی نسیم کا گلشن سے نکل گیا

۵۶۔ چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر — جہاں میں پڑنے کو کچھ اختیار دیتا جا

۵۷۔ رہتا ہے ہمیں دھیان تمہارا ہی ہمیشہ — تم کو نہیں آتا ہے کبھی دھیان ہمارا

۵۸۔ انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا — جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

۵۹ مری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ آبِ نیساں کا
گُہر تو بن بھی سکتا ہے آنسو بن نہیں سکتا

۶۰۔ مزرعِ امید ناسخ خشک ہے — الغیاث اے ابرِ احساں الغیاث

۶۱۔ عین دریا میں بھی گردش سے نہیں دم بھر قرار
سعی کرنا ختم ہے اے سالکو گرداب پر

۶۲۔ کیا بنیں تنکے سے سائیں کو ندی سوتا چھوڑ کر
پاس ہے اکسیر کی بوٹی نہیں پروائے زر

۶۳۔ مُردوں کو جِلاتی ہے تری ناز کی آواز — اعجاز کا اعجاز ہے آواز کی آواز

۶۴۔ تو ہے گلدستۂ گلزارِ نزاکت اے گل — چاہیئے تیرے لئے تارِ نظر کی بندش

۶۵۔ طورِ موسیٰ ذرۂ صحرائے عشق — نوح و طوفاں قطرۂ دریائے عشق

۶۶۔ گورا گورا بدن سفید لباس — یہ لطافت تو نسترن میں نہیں

۶۷۔ عالم ہے محو آئینہ خانے کی سیر میں — اپنے سوا کسی کے کوئی مدِ نظر نہیں

۶۸۔ وہ نہیں چھوڑتا جہاں جاؤں — ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

۶۹۔ آنکھ کی پتلی بت ہوا موجود — کوئی مجھ سا بھی بت تراش نہیں

۷۰۔ آنکھ کیا دل کیا حرم کیا دیر کیا بت خانہ کیا
کون سی جا ہے وہ ہرجائی جہاں ملتا نہیں

۷۱۔ بے تیرے مجھے نظر نہیں آتا وجودِ غیر
عالم تمام ایک ہیولیٰ ہے میں دیدہ ہوں

۷۲۔ سودائے عشق پیر کہاں ہے برنگِ گل
اپنے ہی حسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

۷۳۔ یوں خیالِ روئے جاناں ہے دلِ بے تاب میں
جس طرح سے عکس ہو مہتاب کا گرداب میں

۷۴۔ دولتِ بیدار جائے پر ادب جانے نہ پائے
بہرِ تعظیم اٹھ کھڑا ہوں تم جو آؤ خواب میں

۷۵۔ عشق کو کس کے دل سے لاگ نہیں — کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

۷۶۔ میخانۂ خراب یہ عالم اگر نہیں — پھر کس لئے کسی کو کسی کی خبر نہیں

۷۷۔ دل دوڑتا ہے کوچۂ دلدار کی طرف
عیب سے نہیں ہے طاقتِ رفتار پاؤں میں

۷۸۔ نورِ عرفاں جو نہ ہو جہل کی ظلمت میں نہاں
ایک ہی تجھکو نظر آئے سراپا مظہر اللہ کا

۷۹۔ دل تھا عاشقی میں خود مختار — اور مجبور کر دیا ہم کو

---

* یہ عارکس ست بھی پہلے لکھنؤ کا ایک بے نام شاعر کہتا ہے! اثر

۸۰۔ سب برگِ گُل کتر کے زمیں پہ گرا دئے
بلبل نے باغ میں جو ترے دیکھ پائے ہونٹھ

۸۱۔ وہی عاشق ہے جو عالم کو مرقّع سمجھے
ہر طرف پیشِ نظر یار کی تصویر ہے

۸۲۔ یہ بھی اُس ماہ کے کیا میری طرح عاشق ہیں
جو ستارا ہے وہ بیدار نظر آتا ہے

۸۳۔ کیا نظر میں سما گیا وہ گُل — پردۂ چشم بھی گلابی ہے
۸۴۔ عشق جب کامل ہوا ہے عینِ حسن — آگ میں پڑ جائیے جو شے آگ ہے
۸۵۔ جو ترا نقشِ قدم ہے پھول ہے — نکہتِ گل رہ گزر کی دھول ہے
۸۶۔ ہے مرا مقصود حاصل ہر جگہ — ہر مقام اب منزلِ مقصود ہے

۸۷۔ میں کیا کہ پائے نکہتِ گل میں بھی ان دنوں
بیڑی پڑی ہے موجِ نسیمِ بہار کی

۸۸۔ پہروں پھر بات مرے منھ سے نکلتی ہی نہیں
یاد آجاتی ہے تیری جو کوئی بات مجھے

۸۹۔ جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

۹۰۔ بلائے جاں ہے نظر سے اگر نظر مل جائے
مگر ہے لطف بڑا دل سے دل اگر مل جائے

۹۱۔ پُر ہیں شیشے تو جام خالی ہے — گردشِ آسماں نرالی ہے[سه]

۹۲۔ دمبدم اٹھتے چلے جاتے ہیں لوگ — دہر گویا بزمِ برہم خوردہ ہے
۹۳۔ جوشِ حباب بادہ نہیں خم میں ساقیا — مینائے آسماں میں ہیں اختر بھرے ہوئے

۹۴۔ خاکساری بھی نہ چھوڑے دے خدا جس کو عروج
آسماں پر ماہِ تاباں ہے زمیں پر چاندنی

۹۵۔ سیرِ چمن کو تو نہیں جاتا تو رنگِ گل — اڑ کر غبارِ گیسوئے موجِ نسیم ہے
۹۶۔ آتی جاتی ہے جا بجا بدلی — ساقیا جلد آ ہوا بدلی

۹۷۔ آج تک مشہور ہے قصہ جو برقِ طور کا
جا پڑا تھا اک شرر تیری تجلی گاہ سے

۹۸۔ سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا
جس کی خواہش تھی وہی ہر سو نظر آیا مجھے

۹۹۔ اس ماہ کی فرقت میں جو تارے نکل آئے
تاروں سے سوا اشک ہمارے نکل آئے

۱۰۰۔ تو کسی سے نہیں ہے بیگانہ — پر کوئی آشنا نہیں تجھ سے

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ مگر فاضلِ ادب ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ناسخ کے کلام میں ابتذال اور رکاکتِ لفظی کے سوا کچھ نہیں نظر آتا!
وائے برحالِ سخن . . .

سه سرمایہ دار اور مزدور کا فرق۔ ایک اس قدر دولت مند ایک اس قدر نادار۔ — اثر

کلامِ وحشت مرحوم

یہ کچھ سمجھ کے ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف — ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

ہنسا ہوں حال پہ اپنے جہاں رونے کا موقع تھا — کیا ہے شکر کے پردے میں قسمت کا گلہ میں نے

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی — کہ یہ بھی چاہیئے رنگینیِ چمن کے لئے

کیوں مجھ کو زخود رفتہ کئے دیتی ہے یارب — وہ بوئے دلآویز کہ ہمدوشِ صبا ہے

قمر مراد آبادی

لمعات

یہ مقامِ زندگی بھی بڑا عبرت آفریں ہے
جہاں شمع جل رہی ہے وہیں روشنی نہیں ہے

مری زندگی میں تم ہو مجھے کوئی غم نہیں ہے
مری صبح بھی حسیں ہے مری شام بھی حسیں ہے

وہ حرم ہو یا کلیسا کوئی معتبر نہیں ہے
جہاں قلبِ مطمئن ہو وہی منزلِ یقیں ہے

جو نظر نظر گراں ہے جو نفس نفس حزیں ہے
وہی آرزو جواں ہے وہی زندگی حسیں ہے

مری آرزو کا مقصد ترا لطف ہی نہیں ہے
جو نظر کہ ہے گریزاں وہ نظر بھی دل نشیں ہے

یہ طلسمِ رنگ و بو ہے تو یہاں نہ ڈھونڈ ان کو
وہ جہاں نظر پڑے تھے یہ مقام وہ نہیں ہے

تری بزمِ ناز میں ہو جسے اذنِ باریابی
وہ خطا بھی دل کشا ہے وہ گناہ بھی حسیں ہے

مرے اشک کیوں اٹھائیں ترے دامنوں کے احساں
ابھی اپنا پیرہن ہے ابھی اپنی آستیں ہے

مرے ذوقِ جستجو کی ہے تمہی کو شرم رکھنا
مرے ساتھ بے خودی ہے کوئی کارواں نہیں ہے

مری زندگی چمن ہے میں چمن کی زندگی ہوں
مجھے فکرِ گلستاں ہے غمِ آشیاں نہیں ہے

قمر اس کے پوچھنے کو سبھی پوچھتے ہیں لیکن
جسے ذوقِ خود رسی ہو وہی صاحبِ یقیں ہے

فرید عارفی

مکالمات

شبِ سیاہ نے چھیڑی سحر کے نور کی بات
بہت قریب ہوئی جا رہی ہے صور کی بات

ہمیں مٹانے کا دعویٰ بجا سہی لیکن
کسی کو راس بھی آئی کبھی غرور کی بات

سنا رہے ہیں وہ عرشِ بریں کے افسانے
زمیں کی بات ہی جن کے لئے ہے دور کی بات

غمِ حیات کی تلخی سے دل نہ گھبرائے
ذرا تو چھیڑیئے کیفیتِ سرور کی بات

جو تیرے مستوں سے نظریں ملا نہیں سکتے
وہ خاک سوچ سکیں گے ترے حضور کی بات

رخِ حسیں پہ حجابوں نے ڈال دی ہے نقاب
کسی نے چھیڑ دی شاید کلیم و طور کی بات

فرید نام پہ میرے کساں نہیں ہوتی
نئے جہاں، نئے آدم، نئے شعور کی بات

طرز قریشی

باقیات

زندگی کے بعد بھی کچھ زندگی باقی رہے
آدمی مٹ جائے قدرِ آدمی باقی رہے

قحط میں بھی فارغ البالی ہو مرہونِ خیال
خشک آنکھوں پر بھی ایقانِ نمی باقی رہے

ہے وہی تکمیل گاہِ علم و عرفانِ جمال
جس جگہ حرف ان کے جلوے کی کمی باقی رہے

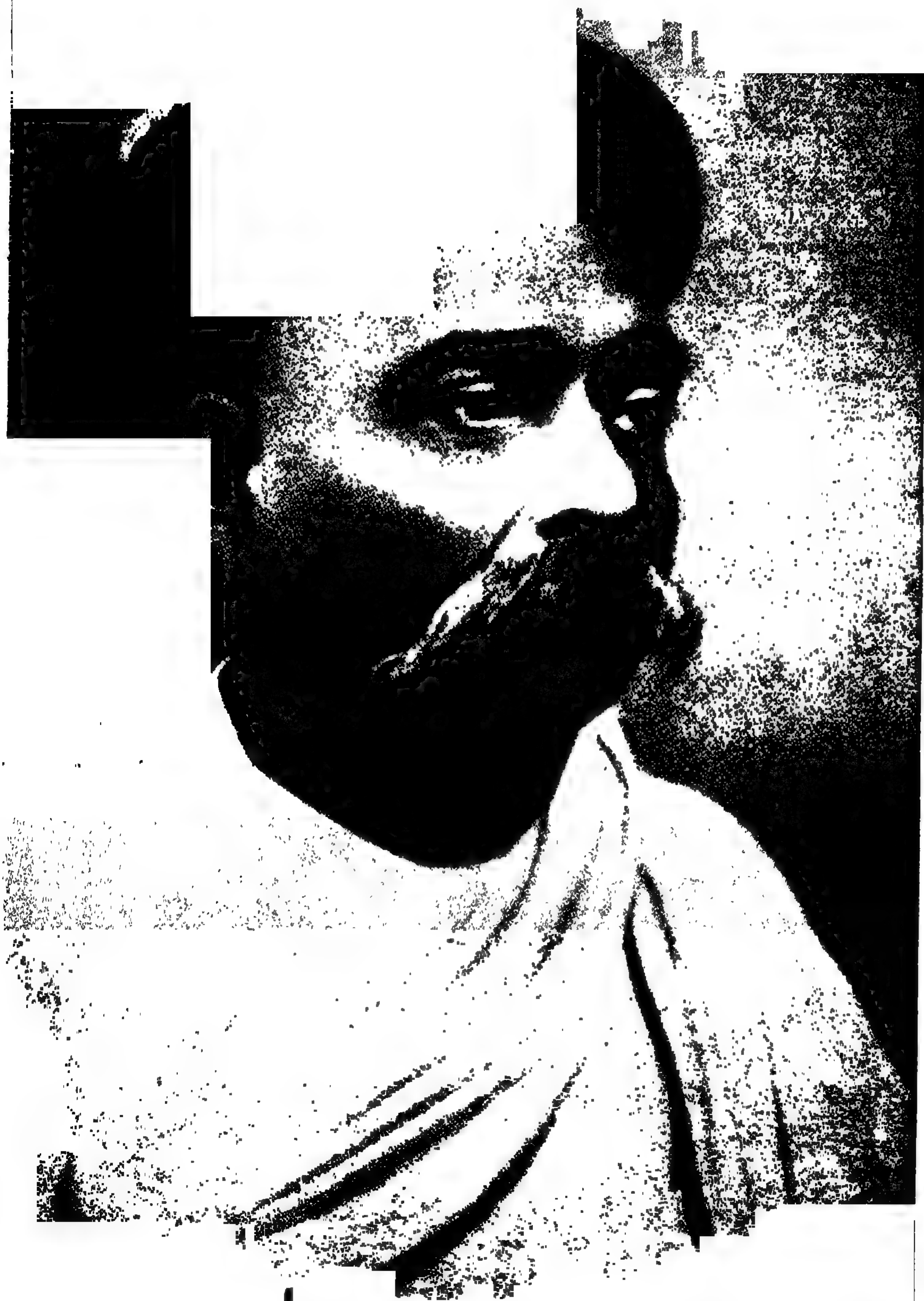
تیرگی عشق میں بھی مسکرا سکتا ہوں میں
دل میں لیکن تیرے غم کی روشنی باقی رہے

عشق غیر آسودہ تلخیٔ دوراں ہو جائے
ے مزاجِ حسن تھوڑی برہمی باقی رہے

اہلِ ہمت کے لئے ہر مرحلہ آساں ہے
شرط یہ ہے جذبۂ منزل رسی باقی رہے

شاعری تخیل کی انگڑائیوں کا نام ہے
فکر کی پرواز و وجدانِ آگہی باقی رہے

سینۂ نے سے نوائے دل نشیں پیدا تو ہے
کاش اے طرزؔ مذاقِ نغمگی باقی رہے



لوکمانیہ بال
گنگا دھر تلک









شملے کي

اوتا کمند کي جهيل

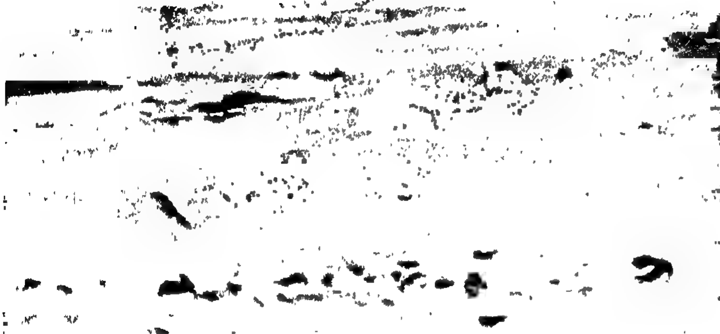
نيلي

دارجولنگ کا خوبصورت نظارہ





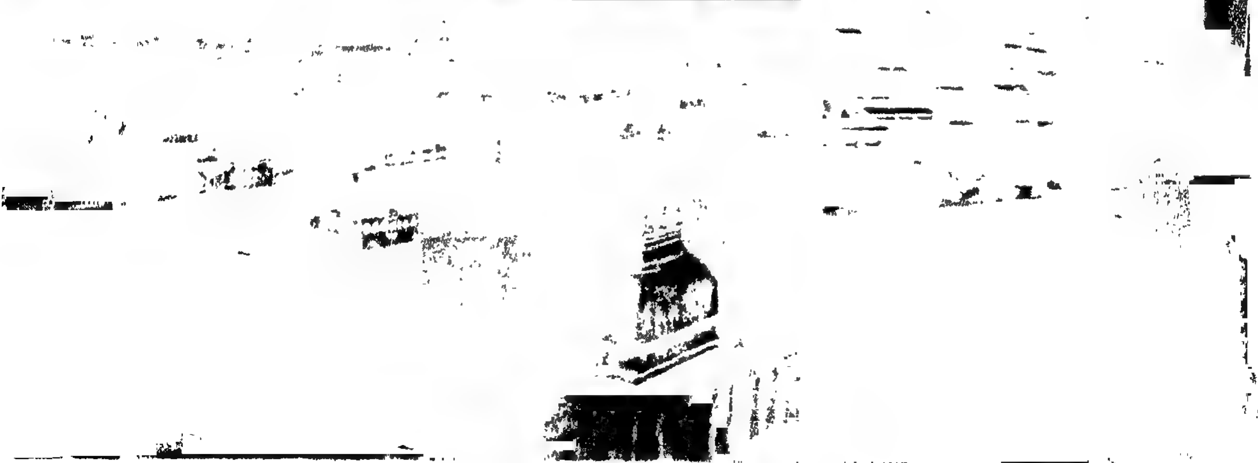




وادی گل مرگ (کشمیر)

اودے پور کا جل محل اور پچھولا جھیل





ڈت جواہر لعل نہرو کے
الیہ غیر ملکی دورے کی
چند تصاویر

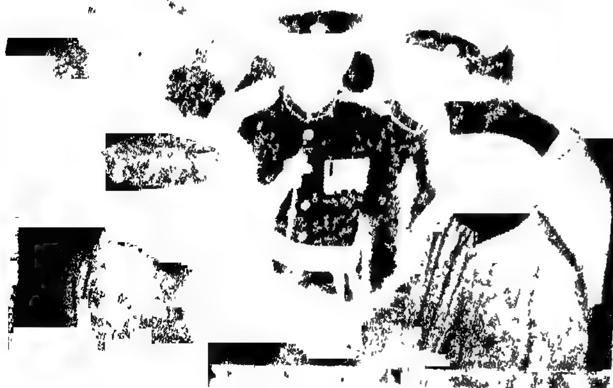


آئرلینڈ کی راجدھانی ڈبلن کے ہوائی اڈے پر
پنڈت نہرو گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہے ہیں



لندن کے گلڈ ہال میں پنڈت نہرو کو لندن شہر کی
آزادی کا اعزاز دیئے جانے کی تقریب

پالم ہوائی اڈے پر راشٹرپتی
پنڈت نہرو کو الوداع کہ رہے ہیں



پنڈت نہرو سیریا کے وزیر اعظم کے ساتھ



هری چند اختر

مولانا گرامیؒ

۱۹۱۷ء کی گرمیوں کا ذکر ہے، میں گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر میں پڑھتا تھا۔ ایک دن چھٹی ہونے پر سکول سے بورڈنگ ہاؤس کو آ رہا تھا۔ رستے میں حضرتِ حفیظ جالندھری ملے۔ کہنے لگے۔ چار بجے تیار رہو، مولانا گرامی آئے ہیں۔ ایک مخصوص صحبت میں اپنا کلام سنائیں گے۔

اُس روز گرامی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ موٹے موٹے خد و خال، مسکراتا ہوا چہرہ، چمکتی ہوئی آنکھیں، بھری بھری داڑھی۔ پگڑی کی بندش اور حرکات و سکنات سے یہ اندازہ کر لینا ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ دوآبہ بست جالندھر کے رہنے والے ہیں شیروانی البتہ حیدرآبادی تھی اور اس کے ساتھ اٹھنگا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ میں اور حفیظ صاحب پہنچے تو مولانا یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

گفت کاسے پادشہِ ملکِ سخن　　　شاعرِ خاص شہنشاہِ دکن

بڑی پاٹ دار آواز تھی۔ شعر خوب جوش سے پڑھتے تھے۔ انگشتِ شہادت کو آگے بڑھا کر ایک ایک رکن کو پورے ہاتھ کا زور دے دے کر ادا کرتے اور مصرع کے آخری حرف کو خاصا طویل کر دیتے تھے۔ آواز حلق کی بجائے سینے کی گہرائیوں سے نکلتی معلوم ہوتی اور سننے والے کو گرج اور گونج کے ایک دل چسپ امتزاج کا احساس ہوتا تھا۔

بڑے اصرار کے ساتھ ایک نعت، ایک منقبت اور کئی غزلیں سنی گئیں۔ میں سوچ رہا تھا، ایسے شخص کی صحبت سال دو سال بھی میسر آ جائے تو آدمی کندن ہو جائے۔

یہ صورت بہت جلد نکل آئی۔ مولانا گرامی نظامِ دکن میر محبوب علی خاں بہادر کے اُستاد اور شاعرِ دربار تھے۔ موصوف کے انتقال کے بعد مولانا کا دل حیدرآباد سے ایسا اُچاٹ ہوا کہ بوریا بندھنا اُٹھا کر جالندھر چلے آئے اور پھر حیدرآباد کا رُخ نہیں کیا۔

اب مولانا کی زیارت ہر روز نصیب ہونے لگی اور شیخ غلام قادر گرامی کی عجیب و غریب شخصیت کے بے تکلف مطالعے کا موقع ملا۔ ہر روز شام کو حفیظ صاحب کے ہاں دو ڈیڑھ گھنٹہ صحبت رہتی اور یہ سلسلہ سکول یا دفتر کی حاضری کی طرح قریباً دو سال جاری رہا۔ شاذ و نادر ہی کبھی ناغہ ہوتا تھا۔ یہ مختصر سی بزمِ احباب کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ نفوس پر مشتمل ہوتی تھی۔ حضرتِ حفیظ غازی رحمت اللہ مرحوم اور میں مستقل حاضرین تھے۔ ہمارے علاوہ کسی دن حافظ صاحب (حضرت حفیظ کے والدِ محترم) موجود ہوتے اور کسی روز مولوی اصغر علی احسن آ نکلتے۔ مولانا گرامی اگرچہ ہر روز موجود ہوتے تھے لیکن انہیں مستقل حاضرین میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اکثر بیٹھے بیٹھے غیر حاضر رہتے تھے۔ صورت یہ تھی کہ میں سکول سے چھٹی ہوتے ہی کتابیں ایک دوست کے حوالے کر کے سیدھا حفیظ صاحب کے ہاں پہنچ جاتا اور تھوڑی دیر بعد حضرت مولانا لااُبالیانہ سی چال چلتے غازی رحمت اللہ کے ساتھ تشریف لے آتے۔ ہم دونوں بڑے ادب سے سلام کرتے لیکن جواب سے اکثر محروم رہتے کیونکہ مولانا کو ہمارے سلام سے زیادہ حقے کی فکر ہوتی تھی جو اُن کے لئے پہلے سے تیار رکھا جاتا تھا جب تک بیٹھے رہتے یہ حقہ اُن کی غیر منقولہ جائداد بنا رہتا۔ کسی اور کو ضرورت ہو تو دوسرا حقہ ڈھونڈتا پھرے یا سگرٹ سے کام چلائے۔

سروش کی رضا جوئی

خیر مولانا صاحب تشریف لائے۔ جہاں جی چاہا بیٹھ گئے۔ حقہ اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس کے متعلق اطمینان ہو جانے پر مولانا نے بڑے محبت بھرے لہجے میں ہمارا حال پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر اچھا اچھا

کہہ کر حقہ پینے لگے۔ اس کے بعد ہم آپس میں باتیں کرنے لگتے اور مولانا اپنے "سروش" کے ساتھ خاموش مکالمہ شروع کر دیتے۔ انھیں سروش کی رضا جوئی کا بڑا خیال رہتا تھا اور اس کی نازک مزاجی سے بہت ڈرتے تھے۔ ان کا خیال نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ شاعر کی ذرا سی غیر پسندیدہ حرکت اور غیر شاعرانہ لغزش سروش سے تعلق ٹوٹ جانے کا باعث بن جایا کرتی ہے۔ "ہاں میاں سروش سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔" یہ فقرہ مولانا نے اس وقت بھی کہا تھا جب ڈاکٹر اقبال نے حافظ شیراز کے متعلق چند اشعار اپنی مثنوی میں لکھے اور اس کے بعد بھی ہم نے کئی ہزار مرتبہ انہی کے منہ سے سنا۔ بہر حال ہم باتیں کرتے رہتے یکایک مولانا کو کچھ خیال آتا یا کوئی نیا شعر ہو جاتا تو دھم سے ہماری بزم گفتگو میں آ کودتے اور وہ شعر سنا کر ہماری داد یا بیداد پر توجہ کئے بغیر پھر اپنے سروش کے پاس چلے جاتے۔ ہم اپنی گفتگو کے سلسلے کو دوبارہ برہم ہونے کے انتظار میں پھر شروع کر دیتے اور یہ چکر یونہیں چلتا رہتا۔

اصلاح کا ڈھنگ

نیا شعر سناتے وقت مولانا نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ تازہ اور نو وارد ہے ارشاد ہوتا "کیا شعر یاد آیا ہے" اور اس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ ہمسایہ شعر ہے اور ابھی ابھی ہوا ہے۔ ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے اور مولانا شعر سنا کر ذہنی طور پر پھر روپوش ہو جاتے۔ کبھی کبھی ہماری بحث میں دخل دے کر کچھ ادبی نکتے بھی بیان کرنے لگتے، مگر بہت ہی مختصر طور پر۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا نے سروش کو چھٹی دے کر بہت سا وقت ہمارے ساتھ بات چیت میں صرف کر دیا۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی ہم لوگوں سے بھی شعر کی فرمائش ہو جاتی۔ شروع شروع میں تو ہم مبتدیوں کی طرح گھبرا بھی جاتے تھے لیکن مولانا اس توجہ اور شفقت سے سنتے کہ چند ملاقاتوں کے بعد ساری جھجک جاتی رہی۔ مولانا ہر شعر پر کچھ نہ کچھ داد دیتے اور جب ہم سنا چکتے تو اور باتیں کرنے لگتے۔ (حقیقت سے اس دوران میں بھی تغافل نہیں برتا جاتا تھا) اب مولانا ہمارے ساتھ باتیں کر رہے ہیں اور ہماری غزلوں کے قابل اصلاح اشعار ان کے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ اچھے شعر تو داد دے کر رخصت کر دئے جاتے اور جو اصلاح کے قابل ہوتے وہ سب کے سب محفوظ رہتے۔ باتیں کرتے کرتے یکایک کسی سے ارشاد ہوتا۔ "ہاں بھئی ذرا اپنا وہ شعر تو پڑھو جس میں......" شعر پڑھ دیا جاتا۔ مولانا فرماتے "واہ بھئی واہ۔ بہت اچھا شعر ہے۔ حد ہو گئی۔ اچھا بھلا اگر یہ ایک لفظ یوں کر دیا جائے۔ ہاں میاں خوب شعر ہے تمہارا۔ واہ بھئی واہ!" پورا مصرع شاذ و نادر ہی بدلتے تھے۔ بس ایک آدھ لفظ یا جملے پر اکتفا کرتے اور اتنی ہی تبدیلی سے شعر ہیچ پوچ آسمان پر پہنچ جاتا۔ جس شعر میں زیادہ تبدیلی کی ضرورت ہو یا نقص مضمون میں خامی نظر آتی اس کے متعلق صاف کہہ دیتے "اسے جانے دو۔" لیکن ایسا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ شعر کی نبض و رگ پر انگلی رکھ کر اسے خون صالح سے بھر دینے کا فن مولانا کو خوب آتا تھا اور اس فن میں ان کا ثانی میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔ حفیظ صاحب تو مولانا کے شاگرد ہی تھے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ حفیظ صاحب کے شاگرد کو بھی کئی بار اس تبرک سے نوازا گیا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اس دوران میں مولانا کو قریب سے دیکھنے اور ان کے عادات و خصائل کے مطالعے کا موقع نصیب ہوا۔ اس مطالعے کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مولانا کے واحد حقیقی شغل یعنی شاعری کو ان کی زندگی تصور کریں تو یہ ایک فرزانۂ روزگار کی قابل رشک حد تک مربوط اور معقول زندگی تھی۔ لیکن اگر زندگی عام عادات و خصائل، حرکات و سکنات اور روزمرہ کے اقوال و افعال کا نام ہے تو ہمارے زمانے کے بہترین فارسی شاعر اور ایک مجذوب کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ گرامی پیچ پوچ فنافی الشعر تھے۔ شعر میں استغراق کا یہ عالم تھا کہ کسی مصرع پر مصرع لگانے کو کہہ دیا جائے تو دنیا بھر کے ضروری سے ضروری کاموں سے فراغت ہو جاتی تھی۔ کسی کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس بیسویں صدی میں ایک پڑھے لکھے آدمی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ریل کا ٹکٹ کہاں سے اور کیونکر لیا جاتا ہے۔ اگر جالندھر سے لاہور جانے کے لئے ریل گاڑی میں بٹھا دیا جائے اور کوئی شخص منزل مقصود پر اتارنے والا نہ ہو تو بڑے اطمینان سے راولپنڈی، پشاور بلکہ قطب شمالی تک چلے جائیں اور شاید ایک مرتبہ بھی نہ پوچھیں کہ اب لاہور کتنی دور رہ گیا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر اقبال فرمایا کرتے تھے کہ "گرامی شعر میں تمیز روح الامین ہے اور باقی تمام معاملات میں....."

غرض یہ کہ عام حرکات و سکنات میں مولانا کی زندگی ان لوگوں سے بہت مختلف تھی جنہیں عقل انسانی سے بہرہ ور سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک طرف تو یہ عالم کہ جس شعر میں ایک آدھ جملے سے زیادہ تبدیلی کی ضرورت ہو اسے فوراً عاق کر دیا جاتا اور دوسری جانب یہ عالم کہ اگر ہم نے کسی شاعر کی تعریف شروع کر دی تو مولانا بھی اس کے گن گانے لگے اور تھوڑی دیر کچھ اور باتیں کرنے کے بعد ہم

ہیں سے کسی شاعر کی بُرائی کی تو مولانا نے پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ ہاں ہیں ہاں ملادی اور شاعر بیچارے کے بخئے اُدھیڑ کے رکھ دئے۔ ایک مرتبہ داغ کے اچھے اچھے شعر پڑھ کر تعریف کی جا رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا۔۔ "بھئی کیا بات ہے داغ کی۔ زبان کا بادشاہ، بندش کا استاد، سچ مچ فصیح الملک تھا حضور نظام نے جہانِ استاد کا خطاب یونہیں نہیں دے دیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں وہ دو جہاں اُستاد تھا۔ ہاں میاں کیا بات ہے داغ کی۔" مجھے شرارت سُوجھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو چکیں تو حفیظ صاحب کو مخاطب کر کے داغ کا یہ شعر پڑھا ؎

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار   اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا

قاضی رحمت اللہ بھانپ گئے۔ کہنے لگے " لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول شعر کہتا تھا داغ بھی۔" مولانا خدا جانے کہاں پہنچے ہوئے تھے۔ یہ سُن کر فوراً حاضر ہو گئے۔۔ " بازاری اوباشوں کا شاعر تھا۔ ساری عمر جھک مارتا رہا۔ ہمارے سامنے جھک مارتا تھا۔" (اس قسم کی حرکتیں ہمیشہ مولانا کے سامنے ہی ہوا کرتی تھیں) اس قسم کی گفتگو میں انھیں ہمیشہ مرحوم یا غائب شاعر کی روح کو ثواب پہنچانے سے زیادہ ہم لوگوں کی دلداری کی فکر رہتی تھی جنھیں ان کا حقیقی محبت اور شفقت سے لبریز دل اپنے "احباب" کہا کرتا تھا۔ لیکن آبگینوں کو یوں ٹھیس سے بچانے میں کسی تکلّف یا کوشش کو ذرا بھی دخل نہ ہوتا تھا۔ بس مولانا کی عادت سی ہو گئی تھی اور اس عادت کے حُسن و قبح پر غور کرنے کی نہ کبھی فرصت ملی نہ ضرورت محسوس کی گئی۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ ظرف کے معاملے میں بھی کوئی اللہ کا بندہ گرامی کو گمراہ کر سکتا تھا۔ یہی تو ایک دُنیا تھی جس کے متعلق بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جو گرامی سے سیانا وہ دیوانہ!

اکبر الٰہ آبادی

ایک دن اکبر الٰہ آبادی کے مختلف اشعار پڑھے جا رہے تھے۔ ہم سب خوب تعریفیں کر رہے تھے۔ یکایک مولانا کو ایک شعر "یاد آ گیا" بڑے جوش اور خلوص سے فرمایا ؎

بلاغت کیمیہ معنی است مضمر
کلامِ اکبر است اللہ اکبر!

ہم پھڑک گئے۔ قاضی رحمت اللہ نے تجویز کیا کہ یہ شعر اکبر کو لکھ بھیجیں۔ مولانا فوراً منع کرنے لگے۔" نہ نہ۔ بالکل نہ بھیجنا۔ وہ مغرور ہو جائے گا کہ گرامی نے میری تعریف کی ہے۔ غرور آ جائے تو سروش سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ ہاں میاں مت بھیجیو یہ شعر!" ہم نے تعمیلِ ارشاد کا وعدہ کیا۔ اور کچھ اور باتیں ہونے لگیں۔ آخر مجلس برخاست ہوئی۔ تو جاتے جاتے فرمانے لگے " ہاں بھئی وہ شعر ضرور بھیج دینا اکبر کو۔ کہنا تمھارے خادم گرامی نے لکھا ہے۔ بہت بڑا شاعر ہے اکبر۔ اس کے دل میں قوم کا بڑا درد ہے۔ واہ بھئی واہ!" سبحان اللہ۔ کہاں تو یہ خوف کہ گرامی سے اپنی تعریف سُن کر اکبر مغرور ہو جائے گا اور کہاں " تمھارے خادم گرامی!"

پُرانے اُستادوں کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔ اکثر اُستادوں کی غزلوں پر بڑی کامیاب غزلیں لکھیں۔ لیکن سُناتے وقت ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ آج ہم نے فلاں استاد کا مُنہ چِڑایا ہے۔ ساتھ ہی اُنگشتِ شہادت ہونٹوں پر مار مار کر توبہ توبہ کہتے جاتے۔ ایک دن آتے ہی فرمایا۔ " آج ہم نے خواجہ کمال خجندی کا مُنہ چڑایا ہے۔ وہ تو حافظ کے بھی اُستاد تھے میاں۔ توبہ توبہ! ذرا اُن کا مطلع تو سُنو ؎

گفت یار از غیرِ ما پوشاں نظر۔ گفتم بہ چشم
وانگہے دُزدیدہ در ما می نگر۔ گفتم بہ چشم

دوسرا شعر خوب جھوم کے پڑھا ؎

گفت اگر سر در بیابانِ غمم خواہی نہاد
تشنگاں را مژدۂ از ما ببر۔ گفتم بہ چشم

اس کے بعد اپنی غزل سنائی۔ اس وقت تین شعر یاد ہیں ؎

گفت می خور غوطہ در خونِ جگر، گفتم بہ چشم
ریز خونابِ جگر از چشمِ تر، گفتم بہ چشم

گفت شب بر بست رخت آمد گرامی بوالفضول
داستانِ شکوہ کم کم۔ مختصر، گفتم بہ چشم

گفت اے حسرت نصیب آبوالہوس آہر زہ گرد
دامنِ جاں ہر طرف تار نظر، گفتم بہ چشم

اسی طرح ایک دن صائب کے مشہور کرتب کا جواب پیش کیا۔ دونوں کے شعر حاضر ہیں

صائب ؎   بہ قدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن اُستادن نشستن خفتن و مُردن

گرامی ؎ مروت ایں چنیں عاشق نوازی ایں چنیں باید
زدی، کشتی، شکستی، سوختی، انداختی، رفتی

پھر اس پر ایک بہت ہی پیاری غزل کہی۔ لیکن جب وہ چھپی۔ تو یہ شعر اس میں شامل نہ تھا۔

حفیظ کا سجع

ایک دن حفیظ صاحب کے والد شمس الدین مرحوم شریکِ صحبت تھے۔ دونوں ہم عمر اور ہم وطن۔ چناں چہ مولانا نے اپنے مستقل ذہنی اور دماغی رفیق سروش کو چھٹی دے دی اور دونوں بزرگوں میں بے تکلف باتیں ہونے لگیں۔ اس روز مولانا کو ہماری منقل دُنیا سے کچھ غیر معمولی محبت ہو گئی تھی جس کے باعث ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ ہم سب کچھ دیر کے لئے مبہوت سے ہو گئے۔ یعنی مولانا نے اپنا حقہ چند منٹ کے لئے حافظ صاحب کو عنایت کر دیا۔ مولانا کو حفیظ صاحب سے ملی محبت تھی۔ حافظ صاحب سے گفتگو ہونے لگی تو جام چھلک پڑا اور مولانا کو سجع پر سجع "یاد" آنے لگا۔ مجھے اس وقت صرف ایک شعر اور ایک مصرع یاد ہے۔ شعر میں باپ بیٹا دونوں موجود ہیں۔ جس پُرجوش محبت سے مولانا نے یہ شعر پڑھا وہ میری دسترس سے باہر ہے صرف الفاظ حاضر کر سکتا ہوں ؎

آفات و بلا زخویش رانیم یا حافظ و یا حفیظ خوانیم

حفیظ صاحب کا پورا نام محمد حفیظ ہے۔ "ابو الاثر" شفیق اُستاد کا عطیہ تھا۔ مصرع سنیئے ؎

اللہ مستعان و محمد حفیظ یاد

مجموعۂ کلام

مولانا کو سارا کلام زبانی یاد تھا۔ ہمیں خیال آیا کہ یہ قیمتی سرمایہ اُن کے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ ایک دن تجویز پیش کی گئی کہ مولانا ہر روز کچھ نہ کچھ ہمیں لکھوا دیا کریں۔ صاف انکار کر دیا۔ فضول محنت ہے۔ خواہ مخواہ کا دردِ سر۔ آخر اس کی ضرورت کیا ہے۔ میں نے تو کبھی حضور نظام کو لکھ کر نہیں دیا وغیرہ وغیرہ ہم نے اشاروں اشاروں میں خاموش ہو جانے کی سازش کر لی۔ پھر دو چار دن کے بعد شاعری اور شعر کو قومی سرمایہ بنا کر اس کی اہمیت پر باہمی لکچربازی شروع کر دی۔ کسی نے کہا شکسپیئر کے ڈرامائی کلام کے بغیر انگریز قوم کی حکومت و سطوت کا یہ عالم ہرگز نہ ہوتا۔ کوئی بولا۔ فردوسی اور سعدی نہ ہوتے تو آج دنیا میں ایران کا وجود تک نہ ہوتا۔ پھر نہایت ہی عجیب و غریب دلائل سے مولانا پر یہ ثابت کر دیا کہ ان کا کلام قوم کا سرمایہ ہے اور اگر انھوں نے اسے یوں چھپائے رکھا تو قوم کو شدید نقصان پہنچے گا اور وہ قیامت کے دن اللہ اور رسولؐ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

تیر نشانے پر بیٹھا۔ قوم کی امانت میں خیانت کے تصور اور اللہ رسولؐ کے نام نے مولانا کو ایک لمحے کے لئے تو لرزہ براندام کر دیا۔ چناں چہ ایک مقفل صندوقچی اور لکھنے کا سامان اسی وقت خرید کر مولانا کے گھر پہنچا دیا گیا اور دوسرے ہی دن سے کلام پوری باقاعدگی کے ساتھ ضبطِ تحریر میں آنے لگا۔ مگر اس میں بھی ایک مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی۔ یعنی کسی روز ہم صبح نو دس بجے کے قریب مولانا کے ہاں چلے جائیں تو مولانا سلام کا جواب دینا تو درکنار جلد جلد کاغذ سمیٹنے لگتے۔ جو کچھ لکھا ہو صندوقچی میں رکھ کر بڑی احتیاط سے قفل لگاتے اور کنجی جیب میں ڈال لیتے۔ اس کے بعد بڑے تپاک سے ہماری مزاج پُرسی ہوتی۔ بعض اوقات یہ مرحلے اتنی دیر میں طے ہوتے کہ اس دوران میں مولانا کا ملازم غلام محمد ہمیں چائے بھی پلا دیتا۔ اب مولانا آواز دیتے۔ ارے بھئی غازی صاحب آئے ہیں پنڈت جی آئے ہیں انھیں چائے پلاؤ۔ غلام محمد کہتا۔ "وہ تو پی چکے!" ارشاد ہوتا۔ "تو پھر پان وسگرٹ پلاؤ۔" وہ کہتا۔ "پان سگرٹ بھی پیش کر چکا ہوں۔" اس پر بگڑ جاتے۔ "ارے تو پھر انھیں چائے ہی پلا دے، کچھ کرے گا بھی۔" پھر دس پندرہ منٹ باتیں ہوتیں اور اس کے بعد مولانا جیب سے کنجی نکالتے اور صبح سے اب تک لکھے ہوئے سب کاغذ نکال کر ہمارے حوالے کر دیتے۔ "دیکھو لو کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی۔ گرامی اب آفتاب برلبِ بام ہے۔ ستر بہترا ہو گیا اور آپ لوگوں نے بڈھے کو با مشقت قیدی بنا دیا ہے۔" اب وہ قومی سرمایہ جس کی حفاظت کے بارے میں پہلے اس قدر احتیاط کی گئی تھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتا اور رخصت ہوتے وقت اگر ہم صندوقچی میں رکھ کر نہ جائیں تو عین ممکن ہے اُڑ اُڑا کر گلی میں چلا جائے۔ کیونکہ مولانا تو یہ امانت ہمارے سپرد کر کے گویا سرخرو ہو چکے تھے۔

افسوس کہ یہ صحبت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ میں کالج کی تعلیم حاصل کرنے لاہور چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد حفیظ صاحب کو بھی غمِ روزگار لاہور لے آیا۔ اس دوران میں رباعیوں کی خاصی تعداد جمع ہو چکی تھی مگر دوسرا کلام بہت تھوڑا ہے۔ اس کا معتدبہ حصہ اپنے خالق کے ساتھ ہی چلا گیا طباعتِ کلام کی سعادت مولانا کے ایک فاضل شاگرد مولانا عظامی اور اُن کے ساتھیوں کو حاصل ہوئی۔

مہاتما جی کا قصیدہ

۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کے حادثے اور مارشل لاء کی ابتلا کے بعد کانگرس کا اجلاس امرت سر میں ہوا۔ کانگرس میں مہاتما گاندھی کے اقتدار کا آغاز یہیں سے ہوا تھا اجلاس کے بعد مہاتما جی نے جالندھر آنے کا وعدہ فرمایا تھا آٹھ دن شہر میں ایک میلا سا لگا رہا۔ اس وقت مولانا نے گاندھی جی کی شان میں ایک دھڑتے کا قصیدہ لکھا۔ افسوس کہ اب ذہن سے اُتر چکا ہے۔ ایک مصرع میں گاندھی کی بوریا نشینی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

شناخت بوئے ریا را ز بوریا گاندھی

اور مقطع یوں تھا ؎

جناح، مالوی، اجملو، گرامی، انصاری زدند نعرہ کہ آمد مہاتما گاندھی

پھر جب عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا اور کانگرس کارکنوں پر حکومت کا تشدد بڑھنے لگا تو مولانا کا وتیرہ ہو گیا کہ کسی معمولی والنیٹر کے جیل جانے کی اطلاع بھی ملتی تو اس کے لئے ایک دو دو رباعیاں کہہ دیتے۔ یہ کلام ضبطِ تحریر میں لانے کا اس وقت سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ مولانا ریاست حیدرآباد کے منصب دار تھے۔ پس یہ سرمایہ مولانا کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

مولانا کے حافظے اور سرورش سے ان کے "انہماک" کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان دونوں کے تصادم سے بعض اوقات عجیب وغریب واقعات پیش آجاتے تھے۔ ایک دن باتیں کرتے کرتے مولانا نے چلم بھرنے کے لئے اپنے ملازم غلام محمدؐ کو آواز دی۔ بیگم نے فرمایا نماز پڑھنے گیا ہے۔ غالب کی طرح گرامی بھی ہمسایۂ خدا تھے، یعنی مسجد اور مولانا کا مکان دیوار بدیوار تھے۔ پس مولانا مطمئن ہو گئے کہ ابھی آجائے گا اور پھر چونکہ چلم بھر دی گئی اس لئے معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ لیکن ہونی شدنی۔ عصر کے وقت مولانا کو پھر ملازم کی ضرورت پڑ گئی اور اندر سے پھر وہی جواب ملا۔ لیکن مولانا کی چلم بھر دی گئی اور بظاہر قصہ ختم۔ اس کے بعد مولانا آرام فرمانے لگے اور ملازم کم بخت ان کے دماغ کے کسی گوشے میں کبھی نہ ختم ہونے والی نماز میں مشغول ہو گیا۔ اب گرامی کی جانے بلا کہ اس دوران میں وہ بے چارہ واپس بھی آسکتا ہے اور گھر کے کئی دھندے ٹھیک کر کے ظہر کے بعد عصر اور عصر کے بعد مغرب کی نماز پڑھنے بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ خوابِ استراحت سے جاگ کر جب تیسری مرتبہ غلام محمدؐ کو پکارا تو وہ پھر مسجد میں تھا۔ ایک ہی دن میں تیسری مرتبہ خدائے کائنات سے اپنے تنخواہ دار ملازم کے اس ناقابلِ فہم اختلاط کا ذکر سن کر جلائے سخن آپے سے باہر ہو گیا۔ چنانچہ بیگم کے منہ سے ابھی نماز کا لفظ نکلا ہی تھا کہ مولانا کڑک کر بولے۔ "یہ کیا لغویت ہے؟ جب پوچھو نماز جب بلاؤ نماز۔ نمک حرام کام چور، قربِ مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

لاہور میں مولانا کا قیام ڈاکٹر اقبال کے مکان پر ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی مہمان داری اور دیکھ بھال ڈاکٹر صاحب کا خادمِ خاص علی بخش ہی کر سکتا تھا۔ علی بخش کو مولانا سے عقیدت بھی تھی اور محبت بھی۔ اس لئے اکثر و بیشتر مولانا کی بدحواسیوں کا شکار ہوتا تھا۔ ایک دن کھانے پر بیٹھے تو علی بخش سے کہا۔ "بھئی آج کل گوبھی نہیں ملتی؟" اس نے کہا۔ "آج کل تو گوبھی کا موسم ہے، بہت ملتی ہے آپ شام کو کھانا کھائیں تو آج ہی پکا لی جائے۔" (مولانا رات کا کھانا شاذ و نادر ہی کھاتے تھے) شام کو کھانا آیا تو پوچھنے لگے یہ کیا ہے۔ عرض کیا گوبھی۔ بس بگڑ گئے۔ "لاحول ولاقوۃ۔ صبح گوبھی، شام گوبھی، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ بڈھے آدمی کو بادی سے مار ڈالو گے تم! لے جاؤ میں نہیں کھاتا!" علی بخش کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر منع کر دیا۔ اب چپ رہو۔ یہ بے چارے صبح کو گوبھی کی فرمائش کرنے کے بعد اجانے اپنے تصور میں اب تک کتنی بار اور کتنے من گوبھی کھا چکے ہیں۔

مولانا عبدالمجید سالک کو گرامی سے جتنی عقیدت تھی گرامی کو سالک صاحب سے اتنی ہی محبت تھی۔ لیکن سالک کی زندہ دلی تو ایک بلائے بے درماں ہے چنانچہ مولانا گرامی کی بہت سی بدحواسیوں کی ذمہ دار یہی زندہ دلی تھی۔ نمونے کے طور پر ایک واقعہ خود سالک صاحب کی زبانی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

ایک دن تیسرے پہر ڈاکٹر صاحب کے گھر گیا باہر مولانا کرسی پر بیٹھے تھے اور دوسری کرسی پر آٹھ دس سنترے پڑے تھے۔ میں نے کہا۔ مولانا سنترے منگائے ہیں؟ کہنے لگے ہاں۔ ابھی علی بخش بازار سے لایا ہے۔ اب میری رگِ شرارت پھڑکی۔ میں نے کہا مولانا یہ تو کھٹے معلوم ہوتے ہیں۔ کہنے لگے اچھا؟ آپ کہتے ہیں تو ضرور کھٹے ہوں گے۔ یہ علی بخش بڑا ہی احمق ہے۔ اسے کیا معلوم سنترہ کس کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد علی بخش کو بلا کر کہا۔ یہ کھٹے سنترے کیوں اٹھا لائے؟ وہ کہنے لگا۔ مولوی صاحب میٹھے ہیں۔ اس پر بگڑ کر کہا۔ واہ میٹھے ہیں۔ سالک صاحب جیسا معتبر آدمی تو کہہ رہا ہے کھٹے ہیں اور یہ میٹھے بتا رہا ہے۔ علی بخش سمجھ گیا۔ ایک طرف ہو کر میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ میں نے سنتروں کو ٹٹول کر دیکھا اور کہا۔ مولانا غلطی ہو گئی۔ یہ تو ناگپوری ہیں ضرور میٹھے ہوں گے۔ یہ سن کر شگفتہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ جی ہاں ضرور میٹھے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ سارے شمالی ہندوستان میں علی بخش جیسا "سنترہ فہم" آدمی موجود نہیں۔

اور یہ سب کچھ جان لینے کے بعد جب بدحواس گرامی کا الہامی کلام دیکھتے ہیں تو مولانا ہی کا یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے ؎ کہ دیوانہ بکار خویش ہشیار این چنیں باید

جی۔ ایل۔ ادیب لکھنوی

لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک

قوموں کی زندگی میں واقعات دفعتاً ظہور پذیر نہیں ہوتے بلکہ ان کے سامان رفتہ رفتہ صدیوں سے فراہم ہوتے رہتے ہیں۔ تعمیر پر تعمیر ہوتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اسی سلسلے میں ہر دور اپنی یادگار چھوڑتا ہے۔ ایک یا چند عظیم شخصیتوں کا ظہور ہوتا ہے جن سے لاکھوں تقاضائے وقت کی تکمیل ہوتی ہے۔ آزادیٔ ہند کی داستان میں بال گنگا دھر تلک کی ایسی ہستی ہے۔ یہ شمع آزادی کا وہ پروانہ تھا جس کے سوز نے فروغ عشق پیدا کیا۔ وہ ایک جادو بیان مقرر تھا جس کے قول نے لوگوں کے دل مضبوط کئے۔ وہ مرد میدان تھا جس کے اعمال نے قوت عمل بڑھائی۔

بال گنگا دھر تلک کی ولادت ۲۳۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو رتناگری میں ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ وہ معرکہ آرا سال تھا جب اس جنگ آزادی کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی جس کا بعد میں فوجی غدر نام رکھا گیا۔ ان کے والد ایک معلم تھے جو بعد کو ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ تلک کا نام بلونت راؤ رکھا گیا جو کثرت استعمال سے بال ہو گیا۔

بال گنگا دھر تلک کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ ان کے والد انھیں سنسکرت کے شلوک، حساب اور گرامر کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ کم عمری ہی میں بہت بڑا علمی ذخیرہ ان کے دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ دس برس کی عمر میں پونا کے ایک مدرسے میں داخل کرائے گئے۔ ان کے ذہن کی رسائی اور حافظے کی طاقت پر اکثر معلمین تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ ریاضی سے خاص دلچسپی تھی اور ورزش سے خاص رغبت تھی۔ آپس میں اکثر صلح اور جنگ کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اس وقت یہ خیال کس کو تھا کہ ایک روز انھیں دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے مقابلہ کرنا ہوگا جس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ انھیں ایسے طلبا کے چھیڑنے میں خاص لطف آتا تھا جو ہندوستان سے نفرت کرتے تھے یا شان دکھاتے تھے۔

انھوں نے ۱۸۷۶ء میں بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اس کے بعد ایل ایل بی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانے میں ان کا رجحان قومی خدمت کی طرف ہو گیا اور اپنے ایک دوست شری آگرکر کے ساتھ تعمیری کاموں کی طرف توجہ دینے لگے۔ یہ انہماک اس درجہ عملی صورت اختیار کر گیا کہ انھوں نے وکالت کا خیال چھوڑ دیا۔ وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ بغیر معقول تعلیم کے اجتماعی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مختلف قوموں میں مختلف وقتوں میں بڑے بڑے قومی مصلح اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔ چین میں سن یات سین اور روس میں ٹالسٹائی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ شری تلک نے اپنے دوستوں اور ملکی کارکنوں کا تعاون حاصل کیا اور ایک مدرسہ جاری کیا۔ ان کی پرجوش مخلصانہ کوششوں سے یہ مدرسہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ صرف تین ماہ کی مختصر مدت میں طلبا کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچ گئی۔ آخر ۱۸۸۴ء میں جب طلباء کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو دکن ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی۔ اسی سوسائٹی نے فرگوسن کالج قائم کیا۔

۱۸۸۱ء میں تلک مہاراج اور شری آگرکر نے عوام میں تعلیمی اور سیاسی واقفیت پیدا کرنے کے لئے دو اخبار 'کیسری' اور 'مرہٹہ' جاری کئے۔ کیسری کی ادارت کے فرائض شری آگرکر کے سپرد ہوئے اور مرہٹہ کے مدیر تلک مہاراج خود ہوئے۔ اسی سال کچھ مضامین کی بنا پر حکومت نے دونوں مدیروں کو گرفتار کر لیا اور چار چار ماہ قید کی سزا دی۔ حکومت کے اس رویے نے تلک کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے۔ رائے عامہ کی زبردست اکثریت ان کو حاصل ہو گئی۔ جب ان کو جیل

سے رہا کیا گیا تو تلک اور آگرکر کی جے کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ ہزاروں آوازیں ایک ساتھ دلوں سے نکل کر زبانوں پر آتی تھیں۔ اتنے بڑے مجمع نے جیل کے دروازے پر ان کا خیر مقدم کیا کہ حکامِ وقت کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

۱۸۹۵ء میں تلک مہاراج کو بمبئی کی مجلسِ قانون ساز کا ممبر چنا گیا۔ یہاں آزادی کے ساتھ آپ نے اہلِ وطن کے جذبات کی ترجمانی کی اور اظہارِ خیالات میں اتنی ہمّت اور جوش سے کام لیا کہ عوام پر آپ کا اثر اور بھی بڑھ گیا۔ ۱۸۹۶ء میں جب مہاراشٹر میں زبردست قحط پڑا تو حکام کی بے پرواہی کی بدولت عوام کی نگاہیں تلک مہاراج کی طرف اُٹھیں اور عوام کی امیدیں انھیں سے وابستہ ہو گئیں۔ انھوں نے اخبارات کے ذریعے سے حکومت پر صرف نکتہ چینی کرنا ہی اپنا فرض نہیں سمجھا بلکہ گاؤں گاؤں میں جانے والی ٹولیاں بنائیں۔ کھانے اور رسد کی بہم رسانی کا انتظام کیا۔ متعدد امدادی انجمنیں قائم کیں۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تلک مہاراج کی رہنمائی مسلّم ہو گئی اور ہزاروں دلوں پر ان کی بادشاہت ہو گئی۔

۱۸۹۶ء میں ہی طاعون کی وبا بہت زور سے پھیلی۔ سرکاری ملازمین بالعموم اور انگریز فوجی بالخصوص، بجائے مدد پہنچانے کے عوام کو طرح طرح کی اذیّت دینے لگے، حتیٰ کہ عورتوں کی عصمت پر بھی حملے کئے گئے۔ لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے۔ آپے کر نامی ایک پُر جوش نوجوان نے پلیگ کمیٹی کے صدر مسٹر رینڈ کو قتل کر ڈالا۔ حکومت نے انتقامی جذبے کے تحت بہت سے معصوم اور بے گناہوں کو گرفتار کر لیا۔ چونکہ آزاد خیالی کی بنا پر حکومت تلک مہاراج کو ہمیشہ اشتباہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی اسی لئے انھیں بھی اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ ان کے اخبار کے ذریعے سے حکومت کے خلاف جذبۂ بغاوت کو فروغ دیا گیا۔ چنانچہ تلک مہاراج کو ڈیڑھ سال کی سزا دی گئی۔ اس وقت عدالتوں میں انتظامی افسروں کا اس قدر اثر تھا کہ انصاف کا بسا اوقات خون ہو جایا کرتا تھا۔ اپیل کی گئی مگر اعلیٰ عدالتوں نے ماتحت عدالت کے فیصلے کو بحال رکھا۔

جس طرح ایران کے قومی شاعر کو قید سے رہا کرانے کے لئے پروفیسر براؤن مصنّف "ادبیاتِ ایران" نے کوشش کی اور کامیاب ہوئے، اسی طرح تلک مہاراج کو رہا کرانے کے لئے با اثر ہندوستانیوں اور ادب نواز یورپین حضرات نے کوشش کی۔ پروفیسر میکس میولر جیسے افراد نے اثر ڈالا اور میعاد سے چھ ماہ قبل ہی انھیں رہا کر دیا گیا۔ غیر ممالک میں تلک مہاراج کی شہرت کا بہت کچھ سبب ان کا ایک بلند پایہ مضمون تھا جو انھوں نے علمِ نجوم کی بنا پر ویدوں کی قدامت ثابت کرنے کے لئے لکھا تھا۔

تقسیمِ بنگال کے موقعے پر آپ نے حکومت پر سخت نکتہ چینی کی۔ عوام میں ان کا اقتدار بڑھتا ہوا دیکھ کر حکومت نے محسوس کیا کہ تلک مہاراج کا عوام سے رابطہ خطرناک ہے اور انھیں آزاد نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں اُن پر غدّاری کا الزام لگایا گیا اور ان کو ۶ سال کے لئے مانڈلے جیل میں بھیج دیا گیا۔ اسیری کے زمانے میں آپ نے وہ عظیم الشّان کتاب لکھی جس کو "گیتا رہسیہ" کہتے ہیں۔ یہ فلسفۂ عمل پر بہترین کتاب ہے۔ اصل کتاب بھگوت گیتا ہے۔ مگر اس پر جو فاضلانہ تنقید کی گئی ہے۔ وہ بجائے خود ایک تصنیف بن گئی ہے۔ اسی قید کے دوران میں ان کی شریکِ زندگی نے رحلت کی۔ اسی زمانے میں سر والنٹائن شرول نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "انڈین اَن ریسٹ" تھا۔ اس کتاب میں ہندوستان اور یہاں کی سیاسی تحریکوں کو جی کھول کر بُرا بھلا کہا گیا تھا۔ تلک مہاراج کے لئے یہ قومی توہین ناقابلِ برداشت تھی۔ انگلستان جا کر انھوں نے سر والنٹائن شرول پر مقدمہ دائر کیا۔ حکومتِ ہند نے مسٹر شرول کے حق میں پورا زور لگایا۔ آخر وہی ہُوا جو ان حالات میں اکثر ہوتا ہے۔ مقدمے کا فیصلہ تلک مہاراج کے خلاف ہُوا لیکن انگلستان میں ان کو ہندوستان کی موافقت میں پروپیگنڈا کرنے کا موقعہ مل گیا۔ لیبر پارٹی خاص طور پر اس سے متاثر ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم شروع ہوئی اس وقت شری تلک نے کہا کہ ہمیں حکومت کی اسی حد تک مدد کرنی چاہیئے جہاں تک حکومت ہمارے ساتھ ہمدردی کرے۔ اس وقت ان کا یہ اعلان "سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے" آج ایک زرّیں حقیقت بن گیا ہے۔

۱۹۱۶ء میں آپ کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر آپ کو ایک لاکھ روپیہ نذر کیا گیا۔ آپ نے یہ تمام رقم ہوم رول لیگ کو دے دی۔ ۱۹۱۸ء میں آپ کانگریس کے صدر چنے گئے لیکن انگلستان چلے جانے کی وجہ سے صدارت نہ کر سکے۔

۱۹۲۰ء میں مانٹیگو اصلاحات کی عملی مخالفت کرنے کے لئے آپ نے ڈیموکریٹک سوراجیہ پارٹی بنائی لیکن آپ کی عمر نے وفا نہ کی۔ اسی سال ۳۱ جولائی کی رات کو فلکِ سیاست کا یہ درخشندہ ستارہ غروب ہُوا۔ شاعرِ قوم حضرت چکبست لکھنوی نے آپ کی وفات کے موقعہ پر وہ مرثیہ کہا تھا جس کا مشہور مصرعہ ہے

قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

آپ کی زندگی کا ایک واقعہ جس سے آپ کے عالم باعمل ہونے پر روشنی پڑتی ہے، یوں منقول ہے: مشہور قومی کارکن پنڈت سندرلال جی تلک مہاراج سے کچھ ہدایات لینے کے لئے پہلی بار گئے تو انھوں نے دیکھا کہ آپ صبح سے شام تک کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن کو حیرت ہوئی کہ وہ سندھیا پوجا کچھ نہیں کرتے۔ پنڈت سندرلال جی نے ان سے دریافت کیا تو جواب ملا کہ صبح سے شام تک میری مصروفیت عبادت نہیں تو اور کیا ہے۔

غرض تلک مہاراج نے اعلیٰ دماغ، دردمند دل، قوی حافظہ اور زبردست قوتِ عمل پائی تھی، ان کی کشادہ پیشانی، دل کی گہرائیوں تک اُتر جانے والی نظر، جاذبِ توجہ تھی۔ ان کی ساری زندگی قوم و ملک کی خدمت میں گزر دی۔ انھوں نے اپنے قول و فعل سے لوگوں میں آزادی کی روح پھونک دی جس کی وجہ سے آج بھی ہر دل میں اُن کی یاد تازہ ہے ؎

تو نہیں آج مگر فیض ترا جاری ہے

"گرام راج" کا راستہ

"دیہی صنعت کی بربادی گاؤں والوں کی موجودہ خستہ حالی کی ذمہ دار ہے۔ آج گاؤں والوں کو خوراک کے علاوہ اپنی تمام ضروریات شہر سے خرید کر لانا پڑتی ہیں۔ گاؤں والے تمام خام اشیا مثلاً روئی، تلہن اور گنّا پیدا کرتے ہیں، مگر انھیں تیار شدہ سامان حاصل کرنے کے لئے یہ چیزیں شہر والوں کے ہاتھ فروخت کرنا پڑتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گاؤں والے قطعی طور پر شہروں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔

گاؤں والے اپنی قیمتی چیزیں دودھ اور مکھن اسی لئے فروخت کرتے ہیں کہ انھیں کپڑا وغیرہ خریدنے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ روپیہ پیسہ ایک ایسی بلا ہے جس کی قیمت برابر بدلتی رہتی ہے۔ روپے پیسے کے چلن نے سماج میں جھوٹی قدریں پیدا کر دی ہیں۔ اگرچہ گاؤں والا حقیقتاً امیر ہے کیونکہ وہ اناج، ترکاریاں اور دودھ وغیرہ پیدا کرتا ہے، پھر بھی وہ اپنے آپ کو غریب سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس شہر والے کے پاس کاغذی نوٹ اور چند سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں، مگر وہ خود کو امیر سمجھتا ہے۔

گاؤں والوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ سچ مچ امیر ہیں اور انھیں اپنا دودھ اور مکھن بازار میں لے جا کر شہر والوں کے مقرر کردہ داموں پر نہیں فروخت کرنا چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شہر والے یہ چیزیں خریدنے کے لئے گاؤں میں آئیں گے اور تب گاؤں والے اپنی مرضی کے مطابق سودا کر سکیں گے۔"

(آچاریہ ونوبا بھاوے)



رتن پنڈوروی

ادبیاتِ سنسکرت

سنسکرت جسے دیو بانی یا دیوتاؤں کی زبان کہا جاتا ہے "سنس" اور "کرت" سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی مکمل، مزیّن، آراستہ، پیراستہ، پختہ، پاک، مقدس اور عمدہ کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر ہندوستان قدیم کی وہ پاک زبان ہے جس میں فصاحتِ اکمل و بلاغتِ ارفع کے نازک ترین معانی پوشیدہ ہیں۔

تاریخ تمدّن کا دورِ جدید اور انکشافِ سنسکرت

انکشافِ سنسکرت کے انقلاب خیز نتائج و عواقب پر غور کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اسلافِ ہند کے جملہ علوم و فنون کا گنجینہ اور ہنود کی کتبِ مقدسہ کا مصدر یہی زبان ہے۔ اربابِ تحقیق کے ہزاروں سال کے تصوّرات اسی کی بدولت تہ و بالا ہو گئے ہیں اور اسی کے فیض سے علوم جدیدہ معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ امریکن سوسائٹی کے پریذیڈنٹ پروفیسر ایم بلوم فیلڈ انکشافِ علوم سنسکرت سے متعلق یوں رقم طراز ہیں :-

"جب سے یونانی اور لاطینی کے مطالعے کا رواج ہے۔ تاریخ تمدّن میں ایسا کوئی انقلاب آفریں واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا جیسا اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں سنسکرت کا انکشاف ہے۔"

لسانیات و تاریخیات کی تحقیقات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر علوم سنسکرت کا معرکۃ آلارا اثر نہ پڑا ہو۔ اس کے مطالعے سے ہند کے ابتدائی زمانے پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ السنہ اضافی کا علم اسی کی برکت سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ لسانیات اور اضافیات مذاہب، نسبتی قوانین، مختلف شعبہائے تاریخ و فلسفہ یا تو اس کے حسبِ ہدایت وجود پذیر ہوئے یا اس کی تحقیقات کے نتائج سے ان کی قلبِ ماہیت ہوئی۔

انگلستان کے ایک سربرآوردہ ماہرِ علومِ سنسکرت پروفیسر وی جے راپسن اسی ضمن میں فرماتے ہیں :

"انیسویں صدی کے اربابِ تحقیق و تفحص نے زبانِ سنسکرت کو یونانی، لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں کا منبع قرار دیا ہے۔ اس کی بدولت ہند اور یورپی قوموں (جو چینی ترکستان سے آئرلینڈ تک آباد ہیں) کے نہایت پرانے زمانے پر بہت گہری روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ زبان کی مشابہت سے ان کے تمدن، معاشرت اور مذہبی عقائد کی اصلیت ظاہر ہوتی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ سنسکرت کے مطالعے سے انسان کی زبان کا تصوّر کلیتہً بدل گیا ہے۔ اسی کے فیض سے اربابِ علم پر انتہائی قدیم زمانے کے حالات منکشف ہوئے ہیں۔ اس کا اثر اہلِ مغرب کی حیاتِ عقلی و مشاغل ذہنی پر بھی بہت گہرا پڑا ہے۔ چنانچہ دورِ حاضرہ کے بلند پایہ ماہرِ سنسکرت پروفیسر اے اے میکڈانل اس امر کی تصدیق یوں فرماتے ہیں :

"احیاءُ العلوم کے بعد تاریخ تمدّن میں عالمگیر اہمیت کا ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جیسا علومِ سنسکرت کا انکشاف ہے۔ السنہ، مذاہب، مشاغل عقلیہ کے کوائف اور یہاں کے کارنامے اسی پرانی زبان میں محفوظ پڑے ہیں۔ ہندوؤں کا سارا تمدّن کلیتاً اسی میں بند ہے۔"

گو اس انقلاب کا اثر علم کے تمام شعبوں میں رونما ہے مگر سب سے بڑا اثر مذہب اور فلسفے پر پڑا ہے۔ ڈاکٹر ونٹرنیٹس پراگ (زیکوسلواکیہ) یونیورسٹی کے بلند پایہ ماہرِ ادبیاتِ سنسکرت اس انقلاب کی نسبت جو علم سنسکرت کے رواج سے

دُنیائے علوم میں واقع ہوا ہے۔ یوں لکھتے ہیں:-

"ملک ہند کے قدیم ادبیات کی چھان بین سے پرانی اور نئی زبانوں
کی باہمی مناسبت واضح ہو کر تاریخ تمدن میں ایک نئے دَور کی
ابتدا ہوتی ہے۔ اس کی بدولت زمانہ قبل التاریخ کی قوموں کے
تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔"

یہ معتبر اقتباسات ظاہر کرتے ہیں کہ علم سنسکرت کے مغرب میں رواج
پذیر ہونے سے اربابِ تحقیق کے علمی تصورات میں عظیم ترین تغیرات واقع ہوئے
ہیں۔

سنسکرت کا چرچا اور مغرب

سکندر کے حملے کے بعد یونانیوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون سے
کچھ واقفیت پیدا کی تھی جیسا کہ اسلافِ یونان کی تصنیفات سے عیاں ہوتا ہے۔
قرونِ وسطیٰ میں عربوں کی مساعیِ حسنہ کی بدولت اہلِ یورپ کو بھی ہندو علوم سے
متعلق قدرے واقفیت ہو چکی تھی۔ سولھویں صدی کے بعد جو پادری ہندوستان
میں تبلیغ کرنے کے لئے آئے تھے انھوں نے سنسکرت زبان کی تحصیلِ علم شروع
کی اور اس میں معقول دستگاہ پیدا کر کے پہلے بھرتری ہری کے اقوال کا ترجمہ
کیا پھر سنسکرت کی گرامر مرتب کی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ہندو دھرم کی مقدس
کتابوں سے واقفیت حاصل کر لی۔

گو انگریز سترھویں صدی کے شروع سے ہندوستان میں تجارت کر رہے
تھے مگر سنسکرت کی ترقی کا خیال وارن ہسٹنگز سے پہلے کسی کو نہ آیا۔ وہ فارسی
اور بنگالی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ علوم و فنون اور ادبیات میں اس کا شوق
بدرجہ اتم تھا۔ سنسکرت زبان کے مطالعے اور تحقیق کے لئے اس نے انگریزوں
کی حوصلہ افزائی کی۔ کلکتے میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ علماء کی ایک مجلس
رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نام سے قائم کی جس میں ادبیاتِ مختلفہ کی تحقیق
و تدقیق کا کام شروع ہوا۔ اہلِ ہند پر ان کے رسم و رواج اور دھرم شاستر
کے اصول پر حکومت کرنے کے مقصد سے دھرم شاستر کے مطابق ایک ضابطہ
مرتب کرایا جس کا ترجمہ پہلے فارسی میں پھر فارسی سے انگریزی میں ہوا۔ مگر
بلادِ مغرب میں علومِ سنسکرت سے دلچسپی پیدا کرنے کی لاثانی شہرت کے مالک
سر ولیم جونز تھے جنھوں نے سنسکرت میں مہارتِ تامہ پیدا کر کے ۱۷۸۹ء میں
شکنتلا کا کامیاب ترجمہ شائع کیا۔ یہی کتاب بعد میں جرمن زبان میں
طبع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن علماء بھی سنسکرت کی طرف مائل ہو گئے۔

ولیم جونز وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سنسکرت، یونانی اور لاطینی
زبانوں کی باہم موافقتِ بے حد کا دعویٰ کیا۔ مسٹر میکس مولر نے مزید جستجو کر کے
اسی قول کا اعادہ کیا۔ کول بروک کی تحقیقات سے سنسکرت کے علوم اہلِ مغرب پر
روشن ہوئے۔ اس نے سنسکرت کی متعدد مشہور کتابیں اپنی زیرِ نگرانی طبع
کرائیں۔ ان میں سنسکرت کا لغت "امرکوش" پانِنی کی گرامر اور ہتوپدیش
خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جرمن زبان میں شلیگے وغیرہ کی کوشش سے رامائن
منوسمرتی، بھاگوت پران، گیتا اور شکنتلا کا ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے بعد
نل دمن کے ترجمے نے تو جرمنوں کو سنسکرت کا شیدا بنا دیا۔ جرمن شعراء مثلاً
روکراٹ وغیرہ نے سنسکرت کے بہترین منظومات اپنی زبان میں منتقل کر کے
تمام روشن خیال جرمنوں میں ہندو قوم اور اس کے عدیم النظیر علوم و فنون کے
لئے جذبۂ احترام پیدا کر دیا۔ ۱۸۳۰ء میں ایک فرانسیسی ادیب نے داراشکوہ
کے فارسی اپنشدوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں شائع کیا۔ جس سے فرانس
اور جرمنی کے اربابِ ذوق میں ہندو فلسفہ کے مطالعے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔
اس سے چند سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بھی انگریزی زبان میں چند
اپنشدوں کا ترجمہ شائع کرایا تھا۔ سنسکرت کے فرانسیسی فاضل برنوف کے
زمانے میں یورپ میں ویدوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ میکس مولر اور راٹ
ایسے ادیب اسی کے تلامذہ میں تھے۔ اُن کا یہ کارنامہ لائقِ صد ہزار تحسین و آفرین
ہے کہ انھوں نے چوتھائی صدی کی سعیِ بلیغ کے بعد ویدوں کا ترجمہ انگریزی
میں شائع کیا۔

اسی زمانے میں دو جرمن محققوں نے سنسکرت کا ایک مستند لغت سات
جلدوں میں مرتب کیا۔ ایک جرمن عالم نے ۱۸۵۲ء میں ادبیاتِ سنسکرت کی
ایک جامع و مبسوط تاریخ شائع کی۔ یہاں سے سنسکرت کی داستان کا دوسرا
دَور شروع ہوتا ہے جس میں چالیس سال کی وسیع و معنی خیز تحقیق کے جامع
نتائج شامل ہیں۔

۱۸۹۱ء میں ایک ممتاز جرمن محقق نے سنسکرت کتب کی جامع فہرست
مرتب کرنی شروع کی جس میں ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں کے تمام
قلمی سنسکرت نسخے بالترتیب درج تھے۔ پورے بارہ سال کے بعد ۱۹۰۳ء
میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۱۸۹۶ء میں جرمن محقق بیولر کے زیر اہتمام قاموسِ سنسکرت مرتب ہونی شروع ہوئی۔ ۱۹۲۵ء تک اس کے بائیس حصے شائع ہو چکے تھے۔ اس میں مشرق و مغرب کے تیس اُستادانِ سنسکرت بیولر کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ یہ جامع اور اکمل کتاب ڈیڑھ سو سال کی تحقیق کا نچوڑ ہے۔ علماء کا خیال ہے کہ چالیس حصوں میں یہ کتاب مکمل ہو گی۔ یورپ اور امریکہ میں علم سنسکرت کی فروعاتِ مختلفہ کے صدہا عالم موجود ہیں۔ اس جامع و دیرینہ تحقیق سے ہندو تہذیب و تمدن کی تین ہزار سال کی صحیح اور معتبر تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔

تاریخِ ہند کی تدوین

اس ضمن میں ہندی تہذیب کی قدامت کا ذکر بھی فائدے سے خالی نہیں۔ موہنجو دارو (ضلع لڑکانہ صوبہ سندھ) اور ہڑپہ (ضلع منٹگمری مغربی پنجاب) کی کھدائی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندی تہذیب مصر اور میسوپوٹیمیا کی قدیم ترین تہذیب سے بھی قدیم ہے۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ میسوپوٹیمیا کی سُمیرین، اسیرین، بیبلونی آن، خالدی وغیرہ کے علاوہ مصر، ایران، یونان اور روم کی تہذیبیں حوادثِ زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں لیکن ہندی تہذیب ہزاروں سال سے گردشِ ایّام کے بحرِ بیکراں میں تلاطم خیز امواج کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتی ہوئی ہنوز زندہ ہی نہیں بلکہ جہاں استاد ہونے کا فخر رکھتی ہے۔ اس نے ہندوستان کے باہر بھی دوسرے ممالک کی جنگلی اقوام کو مہذّب بنایا۔ سر آرل سٹائن نے تبّت اور وسط ایشیا کے علاقے میں ایسے کھنڈرات دریافت کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب اپنے ملک سے باہر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف سائبیریا سے سنگل دیپ تک اور دوسری طرف ایران اور افغانستان سے مجمع الجزائر مشرق الہند کا وسیع خطّہ اسی کے زیرِ اثر تھا۔

ٹیکسلا اور پاٹلی پتر کی کھدائی، میگستھنز، فاہیان ہیون سانگ کے سفرناموں، ایڈیلیکا، راج ترنگنی، ہرش چرتر، پرتھوی راج راسا، چانکیہ نیتی، ملاراکشس ایسی مستند کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندی تہذیب ایک عالم گیر تہذیب تھی اور سنسکرت زبان دنیا کے ہر حصّے پر چھائی ہوئی تھی چنانچہ عہدِ محمود کے مشہور ہیئت دان البیرونی نے اپنی کتاب تحقیقِ ہند (جو ہندوؤں کے مذہب اور تمدن پر حقیقی روشنی ڈالتی ہے) میں صاف لکھا ہے کہ ہندی تہذیب مرجع خلائق تھی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قدیم ہند میں تاریخ نویسی کا رواج نہ تھا اور ہماری تاریخ کے ماخذ تسلّی بخش نہیں ہیں وہ یا یورپین جنہوں نے بنگالی عالم

کی رائے پر غور کریں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "قدیم ہندو تاریخ کے ماخذوں سے بہت تاریخی مسالہ دنیا کے کسی اور ملک کی تاریخ کے لئے دستیاب نہیں ہوتا۔"

اس سے آگے بڑھ کر مغرب میں سنسکرت کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو جانے سے ملک ہند کی پُرانی تاریخ میں ایک نیا باب کھُل گیا ہے۔ آج سے پہلے معتبر تاریخ ہند کا آغاز سکندر کے حملے سے ہوتا تھا مگر سنسکرت اور پالی گرنتھوں کی چھان بین کی بنا پر اربابِ تحقیق نے معتبر زمانۂ تاریخ عیسوی سے ایک ہزار سال قبل قرار دیا ہے۔

کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول مطبوعہ ۱۹۲۲ء میں مستشرقین نے ہندوستان کے ملکی اور تمدنی حالات پر محققانہ مضامین لکھے ہیں جن کی معلومات ویدک لٹریچر، برہمن گرنتھوں، اپنشدوں، وید سُوتروں اور بدھ مت کی پالی کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ مغربی ماہرین سے قطعِ نظر ہندو محققین نے بھی ہندوستان کے زمانۂ قدیم کے اصولِ حکمت، لوکل سیلف گورنمنٹ، کشتری قبائل، ازمانۂ سلف کے اقتصادی حالات، آئینِ حکومت، ہندو نظام اور محاصلات پر عالمانہ بحث کی ہے۔

لوازمِ تمدن سے ادبیاتِ سنسکرت کا تعلق

لفظِ تمدن کا اطلاق علوم و فنون، طرزِ حکومت، نظامِ معاشرت اور باہمی مشارکتِ عمل پر ہوتا ہے۔ تہذیب اور تعلیم بھی اسی ضمن میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے وہ لوازم مراد ہیں جن کی وجہ سے انسان وحوش سے ممتاز و ارفع شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ علمِ تمدن کے نامور محقق پروفیسر جے ایس میکنزی صاحب لکھتے ہیں:

"تعلیم کے جامع ترین معنی فطرتِ انسان کی تکمیل ہیں۔ ادبیات میں سائنس اور آرٹ کی انتہائی اغراض ہی شامل ہیں۔ شاعری مذہب اور سائنس کا سرتاج فلسفہ ہے جو دنیا پر عمیق نگاہ ڈالتا ہے۔"

ایک اور محقق کا قول ہے:

"تمدن فطرتِ انسان کی تکمیل کا ثمر ہے، عقل ارادت سے، ارادت تصوّر سے اور تصوّر خواہشات و جذبات سے مربوط ہے۔ تمدن میں نہ صرف مذہب اور فنونِ حکمرانی شامل ہیں بلکہ سائنس بھی اس کا جزوِ لاینفک ہے۔ اور یہی نہیں ان تینوں کا جو اثر

معاشرت پر پڑتا ہے وہ بھی اسی ذیل میں شمار ہوتا ہے۔

آرائے محققین کے مطابق ادبیاتِ سنسکرت پر نگاہ ڈالی جائے تو ان کی وقعت اور قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے تمدن کی اغراض خاطر خواہ طریق پر انجام پذیر ہو سکتی ہیں۔ پروفیسر جی جائلڈ کی رائے میں سنسکرت زبان کی شستگی و لطافت میں لوگوں کی ترقی کا معیار پوشیدہ ہے۔ اسی سے اسلافِ ہند کی تہذیب و ترقی پر روشنی پڑتی ہے۔ سنسکرت ایک ایسا آسمان ہے جس پر معاشیات، سیاسیات، ادبیات، دینیات، سخن وری، علوم طبعی، فنونِ لطیفہ، حکمت اور فلسفے کے ستارے لازوال آب و تاب کے ساتھ درخشاں نظر آتے ہیں۔ المختصر یہ کہنا بے جا نہیں کہ سنسکرت کا علمی سرمایہ لامتناہی ہے۔

سنسکرت کی خصوصیات

سنسکرت دُنیا بھر کی زبانوں سے قدیم ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت لطافت و شیرینی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ تمدن اور معاشرت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس سے چھوٹا ہو۔ یونانی و لاطینی جو اس کی بیٹیاں ہیں مدت ہوئی اس دُنیا سے محو ہو چکی ہیں مگر سنسکرت ازل سے زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گی۔ اس کے جاننے اور بولنے والے ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ اور دیگر حصوں میں بھی ہیں۔ ذیل میں مغربی محققین کی آرا نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا سرمایۂ الفاظ دنیا کی تمام زندہ و مُردہ زبانوں کے سرمایے سے افضل و برتر ہے۔

۱۔ سر ولیم جونز جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے زبان دان تھے لکھتے ہیں:-

"اگر سنسکرت کی قدامت سے چشم پوشی کر کے فقط اس کی ترکیب و بندش پر غور کیا جائے جب بھی یہ زبان سب سے عجیب نظر آتی ہے۔ یونانی سے بلحاظ رفعت و جلالت اور لاطینی سے باعتبار کثرتِ الفاظ یہ بدرجہا بہتر و افضل ہے۔ لطافت اور شیرینی میں بھی ان دونوں سے فائق ہے۔"

۲۔ مسٹر میکس مولر رقم طراز ہیں:-

"سنسکرت زبانوں کی زبان ہے۔ اسے لسانیات سے وہی نسبت ہے جو ریاضیات کو فلکیات سے ہے۔"

۳۔ جرمن محقق بیپاخ کی رائے ہے:-

"لہجے کی شستگی اور الفاظ کے سرمایے کے لحاظ سے سنسکرت دُنیا کی تمام زبانوں سے افضل ہے۔ اس کے فلسفیانہ خیالات کی رفعت و عمق اور شعراء کے تخیلات و تخلیقات کی نزاکت کسی صورت میں بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ اس کے بانیوں نے جو فلسفیانہ اصطلاحات اختراع کی ہیں ان کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ مسائل کی تشریح آسان ہو گئی ہے۔"

۴۔ جرمنی کا نامور عالم شلیگل جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ علم سنسکرت کی تحقیقات کی نذر کر دیا ہے۔ یوں لکھتا ہے۔

"اس کا نام سنسکرت یعنی کامل اور تراشیدہ نہایت موزوں ہے۔ اس کی ترکیب اور گرامر یونانی سے بہت مشابہ ہے مگر اس سے بدرجہا منظم ہے۔ علاوہ ازیں جو خواص اور زبانوں میں فرداً فرداً پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اس میں بہ یک وقت نظر آتے ہیں مثلاً یونانی کی جامعیت، لاطینی کی قوتِ بیانیہ اور عبرانی کا عرفان سنسکرت میں ایک ہی جگہ ملتا ہے۔ اگر محض علم السنہ کے اصول کے مطابق دیکھا جائے تو سنسکرت گرامر کی ترکیب سب سے افضل اور منزہ ہے۔ اس کا ہر انداز تلفظ، تراوش ترکیب دیگر جملہ زبانوں سے فصیح ہے۔"

۵۔ ڈبلیو اے امثال بائمنز لکھتا ہے:

"یہ وہ زبان ہے جس کی ابتدا تاریخ دنیا کے سب سے پرانے کُتُب سے بھی بہت مدت پہلے ہوئی تھی۔ اس میں الٰہیات، شاعری، سائنس اور فلسفے پر قابلِ قدر کتابیں پائی جاتی ہیں جو کروڑوں سال سے کروڑوں آدمیوں پر اپنا اثر ڈال رہی ہیں۔"

۶۔ سنسکرت کے مشہور محقق ڈاکٹر ونیٹس رقم طراز ہیں:-

"زمانۂ قدیم سے سنسکرت لٹریچر کا جو اثر دیگر اقوام کی ذہنی زندگی پر پڑا ہے وہ حدودِ ہند سے آگے تبت، چین، جاپان، کوریا، لنکا، جزیرہ نما ملایا اور جزائر شرق الہند تک نمودار ہوا ہے اور مغرب میں وسط ایشیا، چینی ترکستان تک پہنچا ہے۔ یہاں ریت کے ٹیلوں کے نیچے سے ہندی کتبے اور سنسکرت نسخے برآمد ہوئے ہیں جن سے ہندو خیالات کا اثر ظاہر ہے۔"

ادبیاتِ سنسکرت کی ہمہ گیری - دورِ حاضرہ کی تحقیق و تلاش سے ثابت

ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کا اثر صرف ہندوستان ہی میں محدود نہیں رہا بلکہ ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک اس سے مستفید ہوئے۔ ہندوستانی تہذیب لنکا، نیپال، برما، چین، جاپان، کوریا، تبت، ختن تک پھیلی ہوئی تھی۔ کنشک نے چینی ترکستان بھی اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ حال ہی میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کو وہاں کی کھدائی سے ہندو تہذیب کا بہت بڑا ذخیرہ ملا ہے۔ سنسکرت، پراکرت اور کھروشٹی زبانوں میں کئی مسودے بھوج پتروں، ریشمی کپڑوں اور لکڑی کی تختیوں پر لکھے ہوئے ملے ہیں نیز بدھ کے بت، پتھر کے کتبے اور سکے بھی ملے ہیں جن پر سنسکرت عبارت کھدی ہوئی ہے۔ لنکا تو رام چندر جی کے وقت ہی سے ہندو شائستگی کا دلدادہ تھا پھر اشوک نے وہاں بدھ مت پھیلایا جو آج تک جاری ہے۔ برہما کا لفظ ہی ہندوستان سے اپنا تعلق ظاہر کر رہا ہے۔ سیام سنسکرت کے لفظ شیام سے بگڑ کر بنا ہے۔ یہ ملک سولھویں صدی تک ہندوؤں کے زیر اثر رہا۔ جاوا کو سنسکرت میں یَودیپ اور سماٹرا کو سورن دیپ کہتے ہیں۔ پانچویں صدی میں جب فاہیان جزیرہ جاوا میں گیا تو اُس وقت وہاں ہندو مت زوروں پر تھا۔ جزیرہ بالی میں اب بھی ہندو مت جاری ہے۔ لوگ رامائن اور مہابھارت کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ ان کتب کی زبان سنسکرت ہے لیکن حروف اُن کے اپنے ہیں۔ کمبوڈیا میں پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک ہندی تہذیب اور سنسکرت زبان کا دور دورہ رہا۔ کمبوڈیا کے شمال میں چمپا کی ریاست پندرھویں صدی تک ہندوؤں کے زیر اثر رہی۔ سر آرل سٹائن نے ختن اور صحرائے گوبی میں دریافت کا کام کیا تھا۔ وہاں سے ہندوستانی سکے، دستاویزات، گنیش کی مورتیاں، بدھ کے قدآدم بت۔ رام چندر جی کے بیٹے لَو اور کُش کے نام کے سکے اور برتن برآمد ہوئے تھے جو ظاہر کرتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں سنسکرت کہاں کہاں پھیلی ہوئی تھی۔ گپت خاندان کے عہدِ حکومت میں ٹیکسلا، سارناتھ، اجنتا اور نالندہ میں عظیم الشان یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ یہاں ہر علم اور ہر فن کی تعلیم کا بندوبست تھا مذہبی علوم، فلسفہ، قانون، سائنس، طب، فنونِ لطیفہ وغیرہ سب کی تعلیم سنسکرت زبان میں دی جاتی تھی۔ کتابوں کا خرچ حکومت دیتی تھی۔ پال سلطنت کے زمانے میں وکرم شلا کی یونیورسٹی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ پرانوں، اتہاس اور کہانیوں کے مطالعے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ جنگِ مہابھارت ختم ہونے پر پانڈوؤں نے اشومیدھ یگیہ کیا اور وہ دنیا کے ہر گوشے میں گھومے یہاں تک کہ آبنائے بیرنگ کی راہ جو ان دنوں خاک نائے تھی، امریکا پہنچے اور وہاں ہندو تہذیب اور سنسکرت پھیلائی۔ چنانچہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی معرفت امریکا سے پانڈوؤں کے کئی جنگی ہتھیار برآمد ہو چکے ہیں۔ جنگِ مہابھارت میں شامل ہونے والا بہادر راجہ ببرباہن امریکا ہی سے آیا تھا۔ مہابھارت اور کلکی پران کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بھگوان کرشن نے ایران پر بھی حملہ کیا تھا اور اسے اپنی عمل داری میں شامل کیا تھا۔ اور افغانستان میں ہندوؤں کی حکومت تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ مہرشی بیاس خود وہاں گھومتے رہے ہیں۔ اس کے بعد کالی داس، بھوبھوتی، شنکر آچاریہ، کماریل بھٹ، چانکیہ، بان بھٹ، چندکوی، چرک، اشوگھوش، دسومتر، ناگارجن، امر سنگھ مصنف امرکوش، راجہ ہرش، راجہ بھوج، راجہ بکرم دتیہ، رامانج، شری ہرش، منو، نرہری، وراہ مہر، آریہ بھٹ، برہم گپت جیسے شہرۂ آفاق علماء کے احسان سے سنسکرت زبان تا ابد سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ عہدِ ماضی کو چھوڑ کر زمانۂ حال پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں میں صدہا پروفیسر اس کی تعلیم و تربیت اور تحقیقات میں مصروف ہیں۔ ایشیا میں ہندوستان سے قطع نظر چین، جاپان اور سیام وغیرہ کی تعلیم گاہوں میں بھی اس کا چرچا ہے۔ قلمی نسخوں کی نقل کا کام بیسیوں مغربی کتب خانوں میں ہو رہا ہے۔ اس کی تحقیقات کے نتائج کی اشاعت کے لئے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں کئی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ اس کی قدیم کتابیں کئی مقامات پر ترجمہ کی جا رہی ہیں۔ پرانے نسخوں کی تلاش میں بیش از بیش سرگرمی کا اظہار ہو رہا ہے۔ مہذب دنیا کے جتنے اربابِ علم ادبیاتِ سنسکرت کے تجسس اور تحصیل میں مصروف نظر آتے ہیں اتنے نہ تو یونانی اور لاطینی کی تحقیق میں مشغول ہیں اور نہ کسی مردہ زبان کی ادبیات کی چھان بین میں اتنی دلچسپی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان خیالات کو دیکھ کر کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ سنسکرت مردہ زبان ہے۔ ذیل کے اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ بلادِ مغرب کے علماء سنسکرت کو متروک نہیں کہتے۔ پروفیسر اے۔ اے میکڈانل رقم طراز ہیں:-

> "سنسکرت آج کل ہزاروں برہمنوں کی زبان ہے۔ وہ اس سے اظہارِ خیال کا کام لیتے ہیں۔ علمی مقاصد میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ کتابیں اور رسالے اب بھی اس میں شائع ہو رہے ہیں۔ ہزارہا کتب خانوں میں قدیم قلمی نسخوں کی نقل ہو رہی ہے۔ پرانے زمانے کے دستور کے مطابق وید اب بھی از بر کئے جاتے ہیں۔ مہابھارت، بھگوت گیتا، بھاگوت پران بر سرِ عام باواز بلند پڑھے جاتے ہیں۔ جو اس امر پہ دال ہیں کہ سننے والے

اسے ملتزا جہت نہ دیکھتے ہیں۔ جب میں شانتی نکیتن میں "مدرا راکشس" اور "رام چرت" کے سنسکرت ڈرامے دیکھے جو طلبا نے مردوں اور عورتوں کے مجمع کے سامنے کئے تھے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ناظرین سنسکرت بات چیت سے لطف اندوز ہوتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اب بھی سنسکرت میں شعر کہے جاتے ہیں، کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ہندو علما روحانی مسائل پر اسی زبان میں بحث کرتے ہیں۔"

پروفیسر ونٹرنیٹس کی رائے ہے :-

"ادبیاتِ سنسکرت میں وہ تمام علوم و فنون شامل ہیں جو بلحاظ ادب وسیع ترین معنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دینی اور دُنیوی علوم، رزمیہ کتابیں، ڈرامے، اخلاقی نظمیں، گیت، افسانے اور سائنس کی تصنیفات بھی موجود ہیں۔ برہمنوں اور بدھ مت کے مقلدوں کی دینی کتابوں میں ہر مسئلہ اور موضوع پر بحثیں پائی جاتی ہیں جیسے مناجات، یگیہ کے بھجن، منتر، دیوتاؤں کے قصے، واعظ، الٰہیات و دینیات کی کتابیں۔ فنِ مناظرہ کی تصنیفات ایسی بیش بہا چیزیں ہیں جن سے محققینِ مذاہب کسی صورت میں چشم پوشی نہیں کر سکتے۔"

مدت ہوئی۔ ڈبلیو سی ٹیلر نے کلکتہ میں سنسکرت لٹریچر پر ایک عالمانہ لیکچر دیا تھا جس کے دوران میں انھوں نے کہا تھا کہ :-

"یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ باوجود صدہا سال کے تغیرات کے ہندوستان میں ایک ایسی زبان ابھی تک موجود ہے جو لطافت و جامعیت میں بے نظیر اور یورپ کی السنۂ قدیم کی ماخذ ہے۔"

تجلیاتِ عقلی میں سنسکرت نظم سب سے فائق ہے۔ اس کے علوم، سائنس کی قدامت کا یقین علمی حساب سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصنام کی وسعت کا تصور انسانی ادراک سے بعید ہے۔ فیثا غورث کے مسائل اور افلاطون کی خیال آرائیاں اسی کے فلسفے کا نتیجہ ہیں۔ اس کا دھرم شاستر ایسا گوناگوں ہے کہ رہتی دُنیا تک اس کا اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ میکس مولر لکھتا ہے

"ہندو دُنیا کی ادبیات اور الٰہیات کے موجد ہیں۔ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر ادبیاتِ ہند کی تحقیقات سے مفید روشنی نہ پڑی ہو۔ یا اسے نئی تحریک نصیب نہ ہوئی ہو۔ ملکِ ہند سے جو روشنی حاصل ہوئی ہے اس کی بدولت دینیات و اصنامیات کی کما حقہٗ وضاحت ہوتی ہے۔"

مسٹر الیگزینڈر کننگھم جو سنسکرت کے نامور عالم تھے رقم طراز ہیں :-

"تاریخِ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ واضح ہو کہ چند برگزیدہ فلاسفروں کے خیالات اور جمہور کی دینیات آپس میں شیر و شکر ہو جائیں۔ برہمن مت کے عقائد، خدا کی وحدانیت، آفرینشِ عالم اور بقائے روح کے دل چسپ کرشمے سنسکرت میں نظر آتے ہیں۔"

پادری وارڈ نے اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے :-

"جن گوناگوں مباحث و مسائل پر ہندوؤں نے خامہ فرسائی کی ہے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شعبۂ علم اُن کی جستجو اور غور و فکر سے نہیں چھوٹنے پایا۔ ان کی فلسفیانہ تصنیفات اور دھرم شاستر کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین عجیب و غریب حکمت اور ہمہ گیر صلاحیتِ عقلی سے آراستہ تھے۔"

ان ممتاز اور معتبر آرا سے صاف ظاہر ہے کہ ادبیاتِ سنسکرت کی جامعیت بے نظیر ہے۔ انسان نے جن علوم کو ترقی دی ہے وہ سب کے سب سنسکرت میں بھرے پڑے ہیں جس سے ہندو لٹریچر کی ہمہ گیری اور بے پایاں تخیل کی داد دینی پڑتی ہے۔ نیز یہ کہنا پڑتا ہے کہ سنسکرت ہندوستان میں اب تک زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ چناں چہ بنارس اور گورکھ پور کو دورِ حاضرہ میں بھی سنسکرت جرائد و رسائل شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ مثلاً "منجو بھاشنی" ہفتہ وار "سوریہ اُدے" پندرہ روزہ اور "سوپربھات" ماہوار — ان رسائل میں ادبیات کے مختلف پہلوؤں پر مختلف مضامین شائع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں الٰہ آباد، بنارس، گورکھ پور، بمبئی، کلکتہ، متھرا، آگرہ، مدراس، پونا، بڑودہ اور لکھنؤ وغیرہ شہروں میں سینکڑوں نئی نئی کتابیں آئے دن سنسکرت میں چھپتی ہیں۔

سنسکرت گرنتھوں کے قلمی نسخے

اس واقفیت کا بہم پہنچانا بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ مہذب دُنیا میں سنسکرت زبان کی قلمی کتابیں کس قدر موجود ہیں۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا بھی

لاثانات سے ہے کہ ذیل میں صرف قلمی مسودات کا ذکر ہوگا۔ زیورِ طباعت سے آراستہ کتب اس مجموعے سے علیحدہ سمجھنی چاہئیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ وسط ایشیا کے وحشی اور شریر حملہ آوروں نے (جن میں ہُن سب پر سبقت لے گئے تھے) ہندوستان کے سینکڑوں شاندار مندر، حویلیاں، تاریخی عمارتیں، کتب خانے نہایت بے دردی سے برباد کر دئیے تھے۔ اس کے باوجود اب تک لاکھوں نسخے دستیاب ہو چکے ہیں اور ابھی بے شمار زیرِ حجاب ہیں (جو کسی ملک کے کتب خانوں کی فہرست میں شامل نہیں ہیں)۔ اغیار بھی یہاں سے بے شمار قیمتی اور کارآمد نسخے ہتیا لے گئے جو ایک صورت میں دستیاب نہیں ہو سکتے۔ بایں ہمہ ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں جو قلمی کتابیں موجود ہیں اُن کی فہرستیں کئی ایڈیشنوں کا بوجھ ہیں۔

۱۸۹۵ء میں میکس مولر نے قلمی نسخوں کا شمار دس ہزار بیان کیا تھا۔ اس کے بعد لاکھوں نسخے اور برآمد ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کتب خانۂ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ سنسکرت میں ۱۹۳۸ء تک ۸۰۰۰ قلمی نسخے موجود تھے اور ڈی اے وی کالج لاہور کی سنسکرت لائبریری میں ۹۴۰۰، گورنمنٹ کالج بنارس میں ۴۵۰۰۰، ایشیاٹک کلکتہ سوسائٹی کے کتب خانے میں ۲۵ ہزار قلمی کتابیں۔ سنسکرت ساہتیہ پریشد کلکتہ کے پاس ۵ ہزار، راج شاہی کی ورندری سرچ سوسائٹی کے قبضے میں ۵ ہزار۔ اورینٹل لائبریری مدراس میں ۳۰ ہزار، تنجور کے شاہی کتب خانے میں ۱۲ ہزار، تری وندرم کے شاہی کتب خانے میں دس ہزار، میسور کے کتب خانے میں ۱۶ ہزار، بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونہ میں ۲۰ ہزار، آنند آشرم پونا میں ۸ ہزار، یونیورسٹی بمبئی کے شعبۂ سنسکرت میں ۲ ہزار، ایشیاٹک سوسائٹی کی بمبئی برانچ کے پاس ۴ ہزار۔ بڑودہ کے کتب خانے میں ۱۶ ہزار، دربار لائبریری بیکانیر میں ۵ ہزار، دربار لائبریری الور میں چھ ہزار، اور دربار لائبریری جموں میں ۱۲ ہزار ان سب کی میزان تین لاکھ تریسٹھ ہزار ہے۔ مگر شاہی کتب خانۂ نیپال اور کئی ریاستوں کے کتب خانوں میں ہزاروں قلمی کتابیں محفوظ ہیں وہ اس سے خارج ہیں اسی طرح پنڈتوں اور بعض دیگر اصحاب کے پاس مختلف مقامات میں جو نسخے موجود ہیں وہ بھی اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ اب ممالکِ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں کی فہرست ملاحظہ ہو:

عجائب خانۂ برطانیہ کے شعبۂ سنسکرت میں ۴ ہزار، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۸ ہزار۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۰۵ء میں وزیرِ اعظم نیپال نے ۶ ہزار کے قریب قلمی نسخے آکسفورڈ یونیورسٹی کو بطور تحفہ دئیے تھے ان میں بیسیوں بالکل نایاب ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ۵ ہزار، پیرس کے کتب خانے میں دس ہزار نسخے ہیں۔ مگر یورپ میں سنسکرت کی قلمی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ برلن میں ہے۔ یہاں تیس ہزار نسخے موجود ہیں۔ میونخ اور کوپن ہیگن کی یونیورسٹیوں میں دو دو قلمی کتابیں موجود ہیں۔ پایۂ تخت روس کے کتب خانے میں دس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ آسٹریا کے صدر مقام وائنا میں چار ہزار۔ گویا یورپ میں ایک لاکھ کے قریب سنسکرت کی کتابیں موجود ہیں۔ ۱۹۳۸ء تک ساڑھے چار لاکھ قلمی کتابیں معلوم ہو چکی ہیں۔ ناظرین اندازہ لگائیں کہ آج تک ان اعداد و شمار میں کتنا معتدبہ اضافہ ہو چکا ہوگا۔

فنِ تحریر کا مسئلہ

ادبیاتِ سنسکرت کی قدامت سے وابستہ فنِ تحریر کا نازک سوال بھی ہے۔ وید، برہمن، اپنشد، فلسفہ، سائنس، اور ادب کی کتابیں جس خط میں بند ہیں وہ براہمی یعنی دیوناگری کہلاتا ہے۔ جس میں ۳۴ حروفِ صحیح اور ۱۲ حروفِ علت ہیں۔ بلادِ مغرب کے اربابِ تحقیق مدت سے سنسکرت کا مقابلہ دوسری زبانوں سے کرتے چلے آئے ہیں اور اس موضوع پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اور دیگر مغربی زبانوں میں صدہا کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں چینی زبان میں "سنسکرت کی ابتدا" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف ہوئی تھی اور ۱۹۲۹ء میں شاہِ چین نے بھی اس مسئلے پر ایک کتاب لکھی تھی۔ میکس مولر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ سنہ قبل مسیح تک ہندو فنِ تحریر سے سراسر نابلد تھے۔ مگر کئی سال بعد پروفیسر لیس ڈیوس اور پارمیم مورز نے پالی زبان کے کتبوں سے یہ ثابت کر دیا کہ مہاتما بدھ سے پہلے فنِ تحریر رائج تھا۔ رائے بہادر پنڈت گوری شنکر اوجھا اجمیری نے تیس سال ہوئے ایک کتاب ہندی میں تصنیف کر کے میکس مولر کو دندان شکن جواب دیا تھا۔ پروفیسر ڈی آر بھنڈارکر نے اپنی تحقیقات سے پنڈت گوری شنکر کے جواب میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔ راقم نے آپ ہی کے ایک عالمانہ مضمون سے ضروری معلومات اخذ کی ہیں۔ پروفیسر گولڈ کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف و نحو اور لغات بغیر تحریر کے ناممکن ہے اور ان دونوں فنون کی کتب ہیں ویدوں کے بعد معرضِ وجود میں آئی ہیں اور ان سے بھی پہلے چھندو دیا یعنی علمِ عروض آشکارا ہوا تھا۔ کیونکہ وید منتروں کا صحتِ تلفظ، صحتِ لحن اور صحتِ ترنم سے پڑھنا پروہتوں کا سب سے مقدس اور مقدم فرض تھا۔ غلط قرأت سے

پیاتسا کی ناراضی کا اندیشہ لاحق تھا۔ پروفیسر موصوف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تحریر میں حروف اور ہندسے لازمی چیزیں ہیں۔ بعض رچاؤں میں دس ہزار اور ایک لاکھ کا ذکر ملتا ہے۔ یجروید میں پچیس ہزار، ایک لاکھ، دس لاکھ ایک کروڑ، دس کروڑ، ایک ارب اور ایک کھرب یا دس کھرب وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ رگ وید میں ایسے منتر ملتے ہیں جن میں مختلف پہاڑے دہرائے گئے ہیں۔ اگر فنِ تحریر مروج نہ ہوتا تو ہندسے، پہاڑے اور رقمیں کس طرح وجود میں آ سکتی تھیں۔ اس لئے صاف عیاں ہے کہ ویدوں کے ظہور کے زمانے ہی میں فنِ تحریر رائج ہو گیا تھا۔

سر ولیم جونز نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ براہمی حروف جن میں اشوک کے کتبے کندہ ہیں سامی حروف سے ماخوذ ہیں۔ کئی محقق اسی خیال کے حامی ہیں۔ ایک جرمن ماہر ادب لاژن نے پہلے پہل یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دیوناگری حروف غیر قوم سے مستعار نہیں لئے گئے۔ اے ٹامس نے بھی اسی نظریے سے اتفاق کیا ہے۔

سر الگزنڈر کننگھم نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ دیوناگری اسی ملک کی پرانی زبان سے بگڑ کر تیار ہوئی ہے۔ اب تازہ ترین تحقیقات کی بنا پر پروفیسر بھنڈارکر بھی اسی خیال کی حمایت کرتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد سے پرانے زمانے کے برتن برآمد ہوئے تھے جن پر کچھ نشان نظر آتے تھے۔ صاف کئے گئے تو وہ حروف نکلے۔

اس قسم کے ۱۳۱ نشان مولوی یزدانی صاحب مہتمم محکمہ اثریات حیدرآباد نے نقل کئے ہیں۔ مدراس کے عجائب خانے میں بھی اس قسم کے باسن پائے گئے ہیں۔ ان میں سے پانچ حروف پروفیسر صاحب مذکور نے شناخت کر لئے ہیں جو دیوناگری سے ملتے ہیں۔ اس بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ قدیم ہندوؤں میں فنِ تحریر رائج نہ تھا۔

ہنومان ناٹک جو کہ زمانہ متبرک سمجھ کر پڑھا جاتا ہے ہنومان جی نے پتھر کی سلوں پر لکھا تھا۔ اور بالمیک جی کے پاس ادب کے خیال سے وہ سلیں سمندر میں پھینک دی تھیں۔ بعد میں راجہ ہرش نے سمندر سے نکلوائی تھیں۔ اگر فنِ تحریر رائج نہ تھا تو یہ ناٹک کس طرح لکھا گیا۔

امثلہ مذکورہ بالا سے صاف عیاں ہے کہ زمانہ قدیم ہی میں فنِ تحریر رائج تھا۔

سی۔ راجگوپال اچاری

روشنی آئی!

(تامل کہانی)

ہری پورہ دُلھن کی طرح سجا ہُوا تھا۔

گاؤں کے اسکولوں کی سفیدی اُجالے کو شرما رہی تھی۔ کئی سالوں سے بے توجہی کا شکار کالی دیوی کے مندر کا جوبن آج دیکھنے کا تھا، کوئی رخنہ کسی دیوار سے مُنہ نہیں چڑا رہا تھا۔ چھت کو ایک نئے انداز سے آراستہ کیا گیا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے تالاب کی سطح پر آج گندگی کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ — لوگ خوشی سے بے سُدھ ہوکر جھوم رہے تھے — سامنے پٹواری تیزی کے ساتھ دھوبی کی کٹیا کی جانب سے آرہا تھا۔ اس کے صاف ستھرے لباس اور سر پر سجی پگڑی سے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کی ساری خوشیاں اسی کی دین ہیں — چاروں طرف عورتوں اور بچوں کے جھمگھٹ لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کی دوشیزائیں ایسی اِترارہی تھیں، جیسے آج کسی نے ان کی گود چاند تاروں سے بھر کر انھیں نہال کردیا ہو۔

نئے سال کا پہلا دن ہری پورہ کے لوگوں کے لئے روشنی کی نویدلے کر آیا تھا۔ آج سے ان کا گاؤں بھی قومی توسیعی سروس کے تحت آگیا تھا بڑی دھوم دھام سے اس کی افتتاحی تقریبات منائی گئیں۔ یہاں کے ایم، ایل، اے جناب اساری کی ان تھک کوششوں کے طفیل ہری پورہ کے باسیوں کو یہ دن دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ضلع کے کلکٹر کے ہاتھوں افتتاح کی کارروائی عمل میں لائی گئی اور گاؤں والوں نے اظہارِ تشکر کے طور پر دیہاتی ترقیاتی کمیٹی کی قیادت کے لئے رکن اسمبلی اساری جی کو منتخب کرکے کام آگے بڑھانے کا جتن کیا۔

سب سے پہلے گاؤں میں بجلی کے تار اُجالے کے نقیب بن کر آئے۔ سڑک کا اندھیرا دُھندلکوں میں کھوگیا — لیکن ایک عجیب مصیبت تھی۔ بجلی کے کھمبے صرف چار مقامات پر نصب کئے جاسکتے تھے۔ اس مسئلے کا حل نکالنے کے لئے کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا اور اس میں ڈپٹی کلکٹر کی یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرلیے کا رجحان پایا جا رہا تھا کہ ایک کھمبا کالی دیوی کے مندر کے سامنے نصب کیا جائے، دوسرا تالاب پر اور تیسرا ہری جن بستی میں، اور چوتھا کھمبا اساری جی کے گھر کے سامنے۔

"میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے سامنے بجلی لگائی جائے۔" اساری کی آواز گونجی۔ "اس کے بجائے اگر کھمبا مدالیار اسٹریٹ پر لگایا جائے تو مناسب رہے گا۔"

"یہ ہے خدمت کا سچا جذبہ۔" ڈپٹی کلکٹر داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر روشنی نے گاؤں کو جگمگا دیا۔

روشنی کی سُرخ کرنیں رات کی تاریکیوں کا جگر چیر کر اپنی تُند پاشی سے آنکھوں کو خیرہ کرنے لگیں۔ — راتیں، جو اُجالے اور سنسان بن کر رہ گئی تھیں اُجالے کی چمک پاکر نکھر گئیں۔ رات گئے تک بچوں کی آنکھ مچولی کا کھیل جاری رہتا، خوب دھومیں مچائی جاتیں۔

ہری پورہ کے باسی فخر سے سینہ تان کر چلتے — اور اس طرح ہری پور پورے تعلقے کے لئے اپنی ضیا باری کی وجہ سے مثالی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔

"ہماری باری کب آئے گی۔"

یہ سوال تعلقے کے ہر گاؤں کے مُنہ پر تھا۔ خصوصاً نشاط پور کے لوگ بہت زیادہ بے چین تھے۔ کیونکہ یہ گاؤں ہری پورہ سے بالکل لگا ہُوا تھا۔ نشاط پورہ کی جنتا نے جب اپنی مانگ رکن اسمبلی اساری جی کے سامنے رکھی تو انھوں نے مبہم سا یقین دلایا جو لوگوں کو مطمئن نہ کرسکا۔

"ہری پورہ تمھارے سسر کا گاؤں ہے جو ہر جگہ سے پہلے تم نے وہاں بجلی

گنوادی۔" جھنجھلا کر نشاط پورہ والوں نے طعنے دینا شروع کر دیئے۔

"یہ بات نہیں"۔ اساری نے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "ہمارے گاؤں نے ضروری رقم فراہم کی تب کہیں جا کر یہ انعام ہمیں مل سکا۔ اگر آپ بھی مطلوبہ نقد جمع کر لیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ کی فضاؤں میں بھی اُجالا نہ پھیل جائے۔"

"آپ کا چلن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے اساری جی۔" کمار گونڈر نے جس کی کچھ زمینیں ہری پورہ میں اساری کی زمین سے ملحقہ تھیں، طنزاً کہا۔

اساری اور کمار کی زمینیں ایک ہی تالاب سے سیراب کی جاتی تھیں۔ یہ تالاب تین سال میں صرف ایک بار پانی سے فیض یاب ہوتا تھا۔ اس لئے اساری کا کنواں ہی ان زمینوں کی سیرابی کا واحد ذریعہ تھا۔ بدقسمتی سے کمار کے پاس کوئی کنواں نہ تھا۔ چناں چہ جب تالاب خشک ہو جاتا تو اس کی فصلوں پر سوکھا پڑ جاتا۔ اس کے برعکس اساری کا مزارع سامی ہمیشہ ان کھیتوں سے اپنے مالک کی جھولیاں بھر دیتا۔

ایک رات کنوئیں پر سے پانی کھینچنے کا سامان کسی نے چُرا لیا۔ سامی نے اپنے مالک کو اس کی اطلاع دی :

"یہ یقیناً اُس موچی کی حرکت ہے جو کمار کا مزارع ہے۔ ہر ایک یہی کہہ رہا ہے۔"

اساری کی سمجھ اندھیروں میں بھٹکنے لگی۔ اس نے سوچا۔ اگر سامی صحیح کہتا ہے تو مجھے پولیس میں رپورٹ کرنا چاہیئے۔ مگر پھر خود ہی سوچا کہ پولیس میرے نقصان کی تلافی کیا کر سکے گی۔ لہٰذا کمار سے گفتگو کرنے کی ٹھان کر وہ اس کے گھر پہنچا۔ اور اس سے کہا سامی غریب آدمی ہے اور اُسے اس طرح نقصان پہنچانا کسی طرح بھی زیبا نہیں۔

اس پر کمار بھڑک اُٹھا : "کون کہتا ہے کہ سامان میرے چکیلی (موچی) نے چرایا ہے یہ سراسر بکواس ہے۔"

"اگر چکیلی مندر میں دیوی کی قسم کھائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا۔"

"منظور۔" کمار گونڈر نے کہا۔

ہری پور کا کالی کا مندر پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اور اس قسم کے تمام تنازعات وہاں دیوی کی قسم کھا کر طے کئے جاتے تھے۔

جس دن اساڑھ کے مہینے کا نیا چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا۔ تب چکیلی اپنی بے گناہی کا یقین دلانے مندر میں آیا۔ دونوں گاؤں کے کسان جمع تھے۔ پجاری نے ملزم کے ہاتھ میں مقدس راکھ دے کر قسم کھانے کو کہا۔

"یہ چوری"۔

اس سے زیادہ وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ پلک جھپکتے ہی وہ نظروں سے اوجھل تھا۔ مجمع نے چکیلی کا تعاقب کیا مگر وہ اسے پکڑنے میں ناکام رہا۔

"وہ کانڈ کیا ہوگا۔ کیونکہ پچھلے ماہ سے وہ اپنی بیوی سے یہی کہہ رہا تھا۔" کچھ دیہاتی بولے

"یہ اساری کی چال ہے۔" کمار گونڈر بڑبڑایا۔

بہرحال بات کچھ بھی ہو اساری اپنے گمشدہ سامان کو پھر نہ پا سکا۔ رہی کمار گونڈر کی بات تو اس کا بھرم اب پوری طرح کھل گیا تھا۔

اگلے سال ہری پورہ میں مزید ترقیاتی کام ہوئے۔ مندر میں مذہبی کھڑکیوں کا اضافہ کیا گیا اور بجلی کا ایک بڑا بلب کالی کے چرنوں میں بھی جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

اساری نے انسانیت کی خدمت کے لئے جو بیج بوئے تھے وہ پھول بن کر مہکنے لگے۔ اور اس کی لگاتار کوششوں اور لگن کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی تجویز گاؤں کی بہبودی کے لئے رکھتا ڈپٹی کلکٹر کی منظوری اس کے لئے یقینی ہو جاتی۔ ہری پورہ والوں کے لئے اساری کا نام خوش حالی کی ضمانت بن گیا۔

اساری کی نانی اس کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ خدا کا کرنا ایک دن کیا ہُوا کہ اچانک اُس پہ دیوتاؤں کا اثر ہو گیا۔ اس نے اپنے بال بکھیر لئے۔ اور دیوانوں کی طرح اُچھل اُچھل کر گانے لگی :

"میرے بیٹے پرہیز کر — پرہیز
تیرا فعل تقدس کا منہ چڑا رہا ہے
بجلی کی روشنی اچھوت ہے
تیل ہی میری روشنی ہے — سچی روشنی
باز رہ میرے بیٹے، باز رہ !"

"میری پُشت پہ لگے گھاؤ کے لئے

مجھے کسی نئے علاقے کی ضرورت نہیں
تم نے دیوار میں جو سوراخ کیا ہے وہ مجھے مطلق پسند نہیں
باز رہ میرے بیٹے — اس گناہ سے باز رہ۔"

اساری کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس کی تائی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چڑھے دیوتا نہ اُترے ——— یہ اساری کے امتحان کا وقت تھا۔ مگر وہ اس میں کامیاب رہا۔ اس نے ترقیاتی کاموں سے ہاتھ نہ اُٹھایا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جوں ہی کھڑکیوں کی تکمیل ہوئی اور بجلی نے نور پھیلایا، مندر میں ایک بڑا تہوار منایا گیا۔ مندر کی نئی "چھب دیکھنے" کی تھی۔ چاروں طرف اجالے کی برکھا ہو رہی تھی اور سب ہی اس "نورانی رم جھم" سے مگن تھے۔

دوسری صبح گاؤں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔
"ہمارے لئے کتنی ان ہونی ہوئی ہے یہ ——— کاش ہم نے تائی جی کے کہے پر عمل کیا ہوتا۔"
ہر گاؤں والے کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔

پچھلی رات جب تہوار اپنی پوری شان سے خاتمے کو پہنچا تو کسی چور نے وہ تمام جواہرات چرا لئے جس سے کالی کی تزئین کی گئی تھی۔ پولیس نے چوری کا پتہ چلانے کی پوری کوشش کی۔ کئی گھروں کی تلاشیاں ہیں لیکن نتیجے کے اعتبار سے یہ سب بے سود رہا۔

دیہاتیوں نے خواہ مخواہ کی تاویلات سے آسمان سر پہ اُٹھا لیا تھا!
بجلی نے مندر میں ایک بڑی عجیب مزدوری اکٹھی کر دی تھی۔ لیکن سچے پرستاروں کے لئے اب وہاں کیا جگہ تھی — ورنہ کون تھا جو کالی کے مندر میں داخل ہو کر مقدس چڑھاوے کی چوری کر سکتا؟ بھلا کوئی سچا بھگت دیوی کی بے حرمتی کا ہے کو کرنے لگا؟
روشنی آئی تو اعتقاد جاتا رہا — قرنہا قرن کی مندر کی عظمت کا اب کوئی دھندلا نقش بھی کسی دل پر نہ تھا۔
بھلائی کے کچھ منصوبوں میں ایسا بھی ہوتا ہے!!

(کرو کشینز انگریزی سے ترجمہ - مترجم - آفاق احمد)

نئے عشری سکے

یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے جب نئے عشری سکے چلیں گے تو اوسط درجے کے آدمی کا سب سے بڑا تردد یہ ہوگا کہ آنوں اور پائیوں کے تبادلے میں اسے کتنے نئے پیسے ملیں گے۔ لیکن یہ کوئی فکر و پریشانی کی بات نہیں کیونکہ نئے سکے رائج ہونے کے بعد بھی نئے اور پرانے دونوں ہی سکے کافی مدت تک چلتے رہیں گے۔

نئے نظام کے تحت روپیہ کو نئے پیسوں کی ۱۰۰ اکائیوں میں منقسم کیا جائے گا جبکہ موجودہ نظام کے تحت روپیہ ۱۹۲ پائیوں یا ۶۴ پیسوں میں منقسم ہے۔ ذیل کے گوشوارے میں نئے سکوں کے مقابلے میں موجودہ سکوں کی اکائی ظاہر کی گئی ہے لیکن ان کا مساوی ہونا ضروری نہیں ہے۔

نیا پیسہ	موجودہ سکہ
۱ نیا پیسہ	ایک پیسہ
۲ نئے پیسے	۲ پیسے
۵ نئے پیسے	ایک آنہ
۱۰ نئے پیسے	۲ آنے
۲۵ نئے پیسے	۴ آنے
۵۰ نئے پیسے	۸ آنے
۱۰۰ نئے پیسے (ایک روپیہ)	۱۶ آنے (ایک روپیہ)

مذکورہ گوشوارے سے ظاہر ہے کہ ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ نئے پیسے (ایک روپیہ) کے متوازی موجودہ سکوں میں علی الترتیب چونی، اٹھنی اور ایک روپیہ ہے۔ لیکن پرانے سکوں میں نئے سکوں کے ایک نیا پیسہ، ۲، ۵ اور ۱۰ نئے پیسے کے متوازی کوئی سکہ نہیں ہے۔ بہرحال یہ نئے سکے ایک پیسہ، ۲ پیسہ، ایک آنہ اور دونی کے قائم مقام ہو جائیں گے۔

یکم اپریل ۱۹۵۷ء کو اس نظام کے تمام سکے رائج نہیں کئے جائیں گے بلکہ ایک نیا پیسہ اور ۲، ۵ اور ۱۰ نئے پیسے جاری کئے جائیں گے اور ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ نئے پیسے یعنی نیا روپیہ بعد میں کسی تاریخ کو رائج کئے جائیں گے۔ جوں جوں نئے سکے زیادہ تعداد میں رائج ہوتے جائیں گے موجودہ سکے بتدریج واپس لے جائیں گے اور توقع ہے کہ واپسی کا یہ سلسلہ تین سال کی مدت میں مکمل ہو جائے گا لیکن عبوری دور میں نئے اور پرانے سکوں کے تبادلے کی شرحوں کا جاننا ضروری ہے۔

حساب کی تیار جدول

مرکزی وزارتِ مالیات نے لوگوں کو تبادلے کی شرحیں سمجھانے کی غرض سے دو ریڈی ریکنر (حساب کی تیار جدولیں) مرتب کئے ہیں جو رقموں کے لین دین کے اہم مقامات پر بکثرت دستیاب ہوں گے

ریڈی ریکنر نمبر ۱ میں ایک پائی سے ایک روپے تک کی شرح تبادلہ دی گئی ہے جس کا خاص مقصد یکم اپریل ۱۹۵۷ء کو کتابوں کے باقیات کا تبادلہ ہے۔

ریڈی ریکنر نمبر ۲ عام لوگوں کے استعمال کے لئے ہوگا۔ اس میں آنوں اور پیسے کی اصطلاحات میں تبادلے کی شرح دی گئی ہے جو صرف ۳، ۶ اور ۹ پائیوں میں ظاہر کی گئی ہے۔

تبادلے کی جدول صرف اسی وقت استعمال کی جائے جب لین دین میں حقیقتاً سکے استعمال کئے جائیں۔

ریڈی ریکنر نمبر ۱

ریڈی ریکنر نمبر ۱ بنیادی طور پر کتابوں کے باقیات کے تبادلے کے لئے ہے۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ بعض معاملات میں کچھ دشواریاں پیش آئیں لیکن موجودہ سکوں کی مختلف رقوم نئے پیسے کی اتنی ہی رقوم سے قابلِ تبادلہ ہوں گی۔

ابتدائی مرحلوں پر تھوڑے سے نقصان کا امکان ہے۔ لیکن نئے رائج سکوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی ساتھ نقصان بھی کم سے کم رہ جائے گا۔ علاوہ ازیں لین دین کے دوران میں نقدی پیش کرنے سے حساب ہموار ہوگا۔ یہ بہت مشکل ہے کہ اس ہمواری کے وقت کوئی شخص فائدہ اٹھانے کی غرض سے پیسے ہی پیسے یا دوسرے کم قیمت کے سکے پیش کرے لیکن بڑی رقوم کے پیش کرنے سے نقصان کا تناسب کم سے کم ہو جائے گا۔ بہرکیف عبوری دور کے بعد اس نوعیت کی کوئی دشواری باقی نہ رہے گی۔

آنے پائیوں کو نئے پیسوں میں بدلنے کا آسان طریقہ

یہ جدول فقط کسی واحد لین دین کے معاملے میں مقررہ قیمت کے موجودہ سکوں کی حقیقی چکوتی رقم کے موقعے پر ہی استعمال کی جائے۔

(جب کسی بھی لین دین کے معاملے میں حقیقی چکوتی رقم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے موجودہ پرانے سکے کی قیمت کو کسی دوسرے سکے میں بدلنا مطلوب ہو تو سو نئے پیسوں کو ایک روپیہ یا سولہ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے برابر ہی ماننا چاہیئے)

۱ پائی	۱ نیا پیسہ
۲ پائی	۱ نیا پیسہ
۳ پائی	۲ نئے پیسے
۴ پائی	۲ نئے پیسے
۵ پائی	۳ نئے پیسے
۶ پائی	۳ نئے پیسے
۷ پائی	۴ نئے پیسے
۸ پائی	۴ نئے پیسے
۹ پائی	۵ نئے پیسے
۱۰ پائی	۵ نئے پیسے
۱۱ پائی	۶ نئے پیسے
——ایک آنہ	۶ نئے پیسے
۱ آنہ ۱ پائی	۷ نئے پیسے
۱ آنہ ۲ پائی	۷ نئے پیسے
۱ آنہ ۳ پائی	۸ نئے پیسے
۱ آنہ ۴ پائی	۸ نئے پیسے
۱ آنہ ۵ پائی	۹ نئے پیسے
۱ آنہ ۶ پائی	۹ نئے پیسے
۱ آنہ ۷ پائی	۱۰ نئے پیسے
۱ آنہ ۸ پائی	۱۰ نئے پیسے
۱ آنہ ۹ پائی	۱۱ نئے پیسے
۱ آنہ ۱۰ پائی	۱۱ نئے پیسے
۱ آنہ ۱۱ پائی	۱۲ نئے پیسے
——دو آنے	۱۲ نئے پیسے
۲ آنے ۱ پائی	۱۳ نئے پیسے
۲ آنے ۲ پائی	۱۴ نئے پیسے
۲ آنے ۳ پائی	۱۴ نئے پیسے
۲ آنے ۴ پائی	۱۵ نئے پیسے
۲ آنے ۵ پائی	۱۵ نئے پیسے
۲ آنے ۶ پائی	۱۶ نئے پیسے
۲ آنے ۷ پائی	۱۶ نئے پیسے
۲ آنے ۸ پائی	۱۷ نئے پیسے
۲ آنے ۹ پائی	۱۷ نئے پیسے
۲ آنے ۱۰ پائی	۱۸ نئے پیسے
۲ آنے ۱۱ پائی	۱۸ نئے پیسے
——تین آنے	۱۹ نئے پیسے
۳ آنے ۱ پائی	۱۹ نئے پیسے
۳ آنے ۲ پائی	۲۰ نئے پیسے
۳ آنے ۳ پائی	۲۰ نئے پیسے
۳ آنے ۴ پائی	۲۱ نئے پیسے
۳ آنے ۵ پائی	۲۱ نئے پیسے
۳ آنے ۶ پائی	۲۲ نئے پیسے
۳ آنے ۷ پائی	۲۲ نئے پیسے

آنے پائی	نئے پیسے
۳ آنے ۸ پائی	۲۳ نئے پیسے
۳ آنے ۹ پائی	۲۳ نئے پیسے
۳ آنے ۱۰ پائی	۲۴ نئے پیسے
۳ آنے ۱۱ پائی	۲۴ نئے پیسے
— چار آنے	۲۵ نئے پیسے
۴ آنے ۱ پائی	۲۵ نئے پیسے
۴ آنے ۲ پائی	۲۶ نئے پیسے
۴ آنے ۳ پائی	۲۷ نئے پیسے
۴ آنے ۴ پائی	۲۷ نئے پیسے
۴ آنے ۵ پائی	۲۸ نئے پیسے
۴ آنے ۶ پائی	۲۸ نئے پیسے
۴ آنے ۷ پائی	۲۹ نئے پیسے
۴ آنے ۸ پائی	۲۹ نئے پیسے
۴ آنے ۹ پائی	۳۰ نئے پیسے
۴ آنے ۱۰ پائی	۳۰ نئے پیسے
۴ آنے ۱۱ پائی	۳۱ نئے پیسے
— پانچ آنے	۳۱ نئے پیسے
۵ آنے ۱ پائی	۳۲ نئے پیسے
۵ آنے ۲ پائی	۳۲ نئے پیسے
۵ آنے ۳ پائی	۳۳ نئے پیسے
۵ آنے ۴ پائی	۳۳ نئے پیسے
۵ آنے ۵ پائی	۳۴ نئے پیسے
۵ آنے ۶ پائی	۳۴ نئے پیسے
۵ آنے ۷ پائی	۳۵ نئے پیسے
۵ آنے ۸ پائی	۳۵ نئے پیسے
۵ آنے ۹ پائی	۳۶ نئے پیسے
۵ آنے ۱۰ پائی	۳۶ نئے پیسے
۵ آنے ۱۱ پائی	۳۷ نئے پیسے
— چھ آنے	۳۷ نئے پیسے

آنے پائی	نئے پیسے
۶ آنے ۱ پائی	۳۸ نئے پیسے
۶ آنے ۲ پائی	۳۹ نئے پیسے
۶ آنے ۳ پائی	۳۹ نئے پیسے
۶ آنے ۴ پائی	۴۰ نئے پیسے
۶ آنے ۵ پائی	۴۰ نئے پیسے
۶ آنے ۶ پائی	۴۱ نئے پیسے
۶ آنے ۷ پائی	۴۱ نئے پیسے
۶ آنے ۸ پائی	۴۲ نئے پیسے
۶ آنے ۹ پائی	۴۲ نئے پیسے
۶ آنے ۱۰ پائی	۴۳ نئے پیسے
۶ آنے ۱۱ پائی	۴۳ نئے پیسے
— سات آنے	۴۴ نئے پیسے
۷ آنے ۱ پائی	۴۴ نئے پیسے
۷ آنے ۲ پائی	۴۵ نئے پیسے
۷ آنے ۳ پائی	۴۵ نئے پیسے
۷ آنے ۴ پائی	۴۶ نئے پیسے
۷ آنے ۵ پائی	۴۶ نئے پیسے
۷ آنے ۶ پائی	۴۷ نئے پیسے
۷ آنے ۷ پائی	۴۷ نئے پیسے
۷ آنے ۸ پائی	۴۸ نئے پیسے
۷ آنے ۹ پائی	۴۸ نئے پیسے
۷ آنے ۱۰ پائی	۴۹ نئے پیسے
۷ آنے ۱۱ پائی	۴۹ نئے پیسے
— آٹھ آنے	۵۰ نئے پیسے
۸ آنے ۱ پائی	۵۱ نئے پیسے
۸ آنے ۲ پائی	۵۱ نئے پیسے
۸ آنے ۳ پائی	۵۲ نئے پیسے
۸ آنے ۴ پائی	۵۲ نئے پیسے
۸ آنے ۵ پائی	۵۳ نئے پیسے

آنے پائی	نئے پیسے
۸ آنے ۶ پائی	۵۳ نئے پیسے
۸ آنے ۷ پائی	۵۴ نئے پیسے
۸ آنے ۸ پائی	۵۴ نئے پیسے
۸ آنے ۹ پائی	۵۵ نئے پیسے
۸ آنے ۱۰ پائی	۵۵ نئے پیسے
۸ آنے ۱۱ پائی	۵۶ نئے پیسے
— نو آنے	۵۶ نئے پیسے
۹ آنے ۱ پائی	۵۷ نئے پیسے
۹ آنے ۲ پائی	۵۷ نئے پیسے
۹ آنے ۳ پائی	۵۸ نئے پیسے
۹ آنے ۴ پائی	۵۸ نئے پیسے
۹ آنے ۵ پائی	۵۹ نئے پیسے
۹ آنے ۶ پائی	۵۹ نئے پیسے
۹ آنے ۷ پائی	۶۰ نئے پیسے
۹ آنے ۸ پائی	۶۰ نئے پیسے
۹ آنے ۹ پائی	۶۱ نئے پیسے
۹ آنے ۱۰ پائی	۶۱ نئے پیسے
۹ آنے ۱۱ پائی	۶۲ نئے پیسے
— دس آنے	۶۲ نئے پیسے
۱۰ آنے ۱ پائی	۶۳ نئے پیسے
۱۰ آنے ۲ پائی	۶۴ نئے پیسے
۱۰ آنے ۳ پائی	۶۴ نئے پیسے
۱۰ آنے ۴ پائی	۶۵ نئے پیسے
۱۰ آنے ۵ پائی	۶۵ نئے پیسے
۱۰ آنے ۶ پائی	۶۶ نئے پیسے
۱۰ آنے ۷ پائی	۶۶ نئے پیسے
۱۰ آنے ۸ پائی	۶۷ نئے پیسے
۱۰ آنے ۹ پائی	۶۷ نئے پیسے
۱۰ آنے ۱۰ پائی	۶۸ نئے پیسے
۱۰ آنے ۱۱ پائی	۶۸ نئے پیسے
— گیارہ آنے	۶۹ نئے پیسے
۱۱ آنے ۱ پائی	۶۹ نئے پیسے
۱۱ آنے ۲ پائی	۷۰ نئے پیسے
۱۱ آنے ۳ پائی	۷۰ نئے پیسے
۱۱ آنے ۴ پائی	۷۱ نئے پیسے
۱۱ آنے ۵ پائی	۷۱ نئے پیسے
۱۱ آنے ۶ پائی	۷۲ نئے پیسے
۱۱ آنے ۷ پائی	۷۲ نئے پیسے
۱۱ آنے ۸ پائی	۷۳ نئے پیسے
۱۱ آنے ۹ پائی	۷۳ نئے پیسے
۱۱ آنے ۱۰ پائی	۷۴ نئے پیسے
۱۱ آنے ۱۱ پائی	۷۴ نئے پیسے
— بارہ آنے	۷۵ نئے پیسے
۱۲ آنے ۱ پائی	۷۶ نئے پیسے
۱۲ آنے ۲ پائی	۷۶ نئے پیسے
۱۲ آنے ۳ پائی	۷۷ نئے پیسے
۱۲ آنے ۴ پائی	۷۷ نئے پیسے
۱۲ آنے ۵ پائی	۷۸ نئے پیسے
۱۲ آنے ۶ پائی	۷۸ نئے پیسے
۱۲ آنے ۷ پائی	۷۹ نئے پیسے
۱۲ آنے ۸ پائی	۷۹ نئے پیسے
۱۲ آنے ۹ پائی	۸۰ نئے پیسے
۱۲ آنے ۱۰ پائی	۸۰ نئے پیسے
۱۲ آنے ۱۱ پائی	۸۱ نئے پیسے
— تیرہ آنے	۸۱ نئے پیسے
۱۳ آنے ۱ پائی	۸۱ نئے پیسے
۱۳ آنے ۲ پائی	۸۲ نئے پیسے
۱۳ آنے ۳ پائی	۸۳ نئے پیسے

۱۳ آنے ۴ پائی ۸۳ نئے پیسے
۱۳ آنے ۵ پائی ۸۴ نئے پیسے
۱۳ آنے ۶ پائی ۸۴ نئے پیسے
۱۳ آنے ۷ پائی ۸۵ نئے پیسے
۱۳ آنے ۸ پائی ۸۵ نئے پیسے
۱۳ آنے ۹ پائی ۸۶ نئے پیسے
۱۳ آنے ۱۰ پائی ۸۶ نئے پیسے
۱۳ آنے ۱۱ پائی ۸۷ نئے پیسے
—— چودہ آنے ۸۷ نئے پیسے
۱۴ آنے ۱ پائی ۸۸ نئے پیسے
۱۴ آنے ۲ پائی ۸۹ نئے پیسے
۱۴ آنے ۳ پائی ۸۹ نئے پیسے
۱۴ آنے ۴ پائی ۹۰ نئے پیسے
۱۴ آنے ۵ پائی ۹۰ نئے پیسے
۱۴ آنے ۶ پائی ۹۱ نئے پیسے
۱۴ آنے ۷ پائی ۹۱ نئے پیسے
۱۴ آنے ۸ پائی ۹۲ نئے پیسے
۱۴ آنے ۹ پائی ۹۲ نئے پیسے
۱۴ آنے ۱۰ پائی ۹۳ نئے پیسے
۱۴ آنے ۱۱ پائی ۹۳ نئے پیسے
—— پندرہ آنے ۹۴ نئے پیسے
۱۵ آنے ۱ پائی ۹۴ نئے پیسے
۱۵ آنے ۲ پائی ۹۵ نئے پیسے
۱۵ آنے ۳ پائی ۹۵ نئے پیسے
۱۵ آنے ۴ پائی ۹۶ نئے پیسے
۱۵ آنے ۵ پائی ۹۶ نئے پیسے
۱۵ آنے ۶ پائی ۹۷ نئے پیسے
۱۵ آنے ۷ پائی ۹۷ نئے پیسے
۱۵ آنے ۸ پائی ۹۸ نئے پیسے
۱۵ آنے ۹ پائی ۹۸ نئے پیسے
۱۵ آنے ۱۰ پائی ۹۹ نئے پیسے
۱۵ آنے ۱۱ پائی ۹۹ نئے پیسے
—— ایک روپیہ ۱۰۰ نئے پیسے

ریڈی ریکنر نمبر ۲

سادہ ہماز حساب کی جدول آنے پائیوں کو نئے پیسے میں بدلنے کے لئے

یہ جدول فقط کسی واحد لین دین کے معاملے میں مقررہ قیمت کے موجودہ سکوں کی حقیقی چکوتی رقم کے مطابق ہی استعمال کی جائے۔

کسی بھی لین دین کے معاملے میں حقیقی چکوتی رقم کے علاوہ کسی دوسرے موجودہ سکے کی قیمت کو کسی دوسرے سکے میں بدلنا مطلوب ہو تو ۱۰۰ نئے پیسوں کو ایک روپیہ یا سولہ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے برابر ماننا چاہیئے۔

آنے اور پائیوں کے ہم پلہ نئے پیسے کو معلوم کرنے کے لئے جدول کو استعمال کرنے کے متعلق ہدایات

اول افقی کالم کو دریافت کریں جو آنوں کی دی گئی تعداد کے مساوی ہے۔ پھر عمودی کالم کو دریافت کریں جو پائیوں کی دی گئی تعداد کے مساوی ہے۔ جہاں پر یہ دونو کالم باہم منطبق ہو جائیں وہی مقام یا نمبر نئے پیسوں کے مساوی ہے

آنے / پائیاں	۰	۳	۶	۹
۰	۰۰	۲	۳	۵
۱	۶	۸	۹	۱۱
۲	۱۳	۱۴	۱۶	۱۷
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳
۴	۲۵	۲۷	۲۸	۳۰
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶
۶	۳۸	۳۹	۴۱	۴۲
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵
۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱۰	۶۳	۶۴	۶۶	۶۷
۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۱۵	۹۴	۹۵	۹۷	۹۸
۱۶	۱۰۰	۰۰	۰۰	۰۰



سیدہ فرحت

ننھی چڑیا اور منی بچی

آجا آجا چڑیا آ جا — میٹھا سا اک گیت سنا جا

پیار سے میں ہوں تجھے بلاتی — پاس مرے تو کیوں نہیں آتی

تیری ادا یہ مجھے نہ بھائے — آئے اور پھر سے اڑ جائے

پیڑ کے اوپر پھدک رہی ہے — کرسی پر اب اچک رہی ہے

آجا میری گود میں آ جا — لے یہ میٹھا بسکٹ کھا جا

میری تو بن جا ہم جولی — مل کر کھیلیں آنکھ مچولی

بھائی بہن بھی گھر پہ نہیں ہیں — وہ دونوں اسکول گئے ہیں

کب سے میں بیٹھی ہوں اکیلی — تو بھی تو میرے ساتھ نہ کھیلی

روٹھ کے تجھ سے اب روؤں گی

روتے روتے میں سوؤں گی



حامد اللہ افسر

سنگیت

بہت دن کی بات ہے۔ ہمارے دیش میں ایک راجہ تھا جس کے دان پُن کا بڑا چرچا تھا۔ یہ راجا جنتا کو سکھ پہنچانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کے لئے دُور دُور تک مشہور تھا۔ راجہ کے دربار میں ہر فن کے بڑے بڑے ہوشیار اور قابل لوگ موجود تھے، انھیں میں راجہ کا درباری گویّا شنکر بھی تھا۔ یہ گویّا اتنا اچھا گاتا تھا کہ سارے دیش میں اس کی شہرت تھی، جب کبھی وہ گاتا تو سننے والے محو ہو جاتے اور انھیں ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے کوئی چیز انھیں آسمان کی طرف اُٹھائے لئے جا رہی ہے۔



اکثر ایسا ہوتا کہ راجا راج کاج سے تھک کر آتے اور شنکر کو بلوا کر اس کا گانا سنتے، اس کی رسیلی اور دل لبھانے والی آواز راجہ کا دل خوش کر دیتی۔ ان کی تھکان دُور ہو جاتی اور ان کی طبیعت میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی۔

راجہ ہر ایک سے اپنے درباری گویّے کی تعریف کیا کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ کسی راجہ کے دربار میں اتنا اچھا گویّا نہیں ہے۔

ایک دن راجہ نے شنکر کا گانا سن کر اس سے کہا۔ "شنکر! تمھارے رسیلے راگ سن کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ شاید ہی سارے سنسار میں کوئی اتنا اچھا گاتا ہو جتنا اچھا تم گاتے ہو۔"

جب کبھی راجہ اس قسم کی باتیں کرتا تو شنکر خاموش اور اداس سا ہو جاتا۔ ایک دن راجہ نے اس سے پوچھا۔ "شنکر کیا بات ہے، تم اداس کیوں ہو گئے؟ کیا سوچنے لگے۔ کیا سنسار میں کوئی تم سے بھی اچھا گانے والا موجود ہے؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "مہاراج! میرا اُستاد مجھ سے بھی اچھا گاتا ہے۔"

راجہ۔ "تمھارا اُستاد کون ہے، کہاں ہے، اُسے بلاؤ، ہم اس کا گانا ضرور سنیں گے۔"

شنکر: مہاراج! میرا اُستاد ایک جوگی ہے، ایک سادھو ہے۔ وہ کہیں آتا جاتا نہیں۔ اس کا استھان یہاں سے بہت دُور ہے۔ وہ اپنا سارا وقت دھیان گیان میں صرف کرتا ہے۔ مہاراج! اس کی آواز ایسی مدھر اور ایسی سریلی ہے کہ سنسار بھر میں اس کا جواب نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیونکر آپ کو اس کا گانا سنواؤں۔

راجہ: شنکر! ہم تمہارے اُستاد کا گانا ضرور سُنیں گے، وہ یہاں نہیں آ سکتے تو ہم خود اُن کے استھان پر چل کر ان کا گانا سُنیں گے۔

شنکر: مگر مہاراج! وہ کسی کو اپنا گانا نہیں سناتے۔ کبھی کبھی اپنی موج میں گانے لگتے ہیں۔ اس وقت کوئی سن لے تو سن لے۔

راجہ: ہم اُن کی کٹیا پر ضرور جائیں گے کیا عجب ہے کہ اس وقت اپنی موج میں ہوں اور ہمیں ان کا گانا سننے کا موقع مل جائے۔

آخر ایک دن راجہ شنکر کے ساتھ سادھو جی کی کٹیا کی طرف روانہ ہوئے۔ دو دن اور دو رات یہ قافلہ چلتا رہا۔ تیسرے دن صبح کو درختوں کے جھنڈ میں راجہ کو ایک چھوٹی سی جھونپڑی نظر آئی۔ یہی سادھو جی کی کٹیا تھی۔ اُس وقت سادھو جی اپنی کٹیا کے سامنے آسن جمائے آنکھیں بند کئے تپسیا میں مصروف تھے اور پورب سے نکلتے ہوئے سورج کی کرنیں ان کے چہرے کی چمک کو اور بڑھا رہی تھیں۔

شنکر نے راجہ کو اشارہ کیا کہ اب آپ آگے نہ بڑھئے اور جہاں ہیں وہیں خاموشی سے کھڑے رہیئے۔ اس کے بعد وہ کٹیا کے پیچھے والی جھاڑیوں میں بیٹھ کر گانے لگا اور جان بوجھ کر غلط سُر نکالے، جیسے ہی سادھو جی کے کان میں شنکر کی آواز پہنچی ---- وہ ایک دم بولے ــ "بے سُرا ہو گیا، بیٹیا، بے سرا۔"

بس اسی کا شنکر کو انتظار تھا۔ یہی سوچ کر وہ بے سُرا ہوا تھا کہ سادھو جی مجھے ضرور ٹوکیں گے، اس نے سادھو جی کی بات سن کر جواب دیا۔

"مہاراج! آپ خود ایک دفعہ گا دیجئے تاکہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہو جائے۔"

اب کیا تھا، سادھو جی نے گانا شروع کر دیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی رسیلی اور مدھر آواز سے ساری فضا جھومنے لگی، جیسے ان کے گلے سے ایک نور کی ندی بہہ رہی ہو جنگل کی خاموشی میں بہشت کا سماں بندھ گیا۔

راجہ سادھو جی کے سنگیت میں ایسا کھویا کہ اسے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ میں کہاں ہوں اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

جب شنکر آیا تو راجہ نے اس سے کہا: "سادھو جی کے سنگیت کے متعلق جو کچھ تم نے مجھ سے کہا تھا وہ تو اس سے زیادہ مدھر نکلا۔ آخر تمہارے گانے میں یہ کیفیت کیوں نہیں ہے، تم ان کے ہی تو چیلے ہو، پھر تم ان کی



طرح کیوں نہیں گاتے۔"

شنکر نے جواب دیا۔ "مہاراج! میرے گانے میں وہ کیفیت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے، میں تو آپ کو ـــ ایک دنیا کے راجہ کو ـــ خوش کرنے کے لئے گاتا ہوں اور سادھو جی بھگوان کو خوش کرنے کے لئے گاتے ہیں۔"

سید شاہد حسین



شریر کی غزل

بجی گھنٹی جو چھٹی کی تو ہنستے گاتے ہم نکلے
کسی موٹے سے مولا بخش کے سہہ کر ستم نکلے

بتاؤ ہاتھ پر پڑنے سے اس کے حال کیا ہوگا
نظر آجاتے ہی جس بید کے ہم سب کا دم نکلے

کبھی جب بھول کر بستے کو اپنے کھول بیٹھے ہم
پھٹی نکلیں کتابیں اور سب ٹوٹے قلم نکلے

نتیجہ گاہ سے نکلے تو اس حالت میں نکلے ہم
کہ لے کر اپنے دل میں فیل ہو جانے کا غم نکلے

بہانہ ٹانگ کی تکلیف کا ایسا کیا ہم نے
کہ لنگڑاتے چلے اور گر پڑے جب دو قدم نکلے

نکالا ممتحن نے نقل کرنے پر تو بولے ہم
"بہت بے آبرو ہو کر ترے کمرے سے ہم نکلے"

قومی آواز - ۳-جولائی ۱۹۵۶ء

وِدّیاوتی

لوک مانیہ بال گنگادھر تلک

"سوراجیہ سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ملک میں ایسا رہوں جیسا کہ ایک انگریز انگلینڈ میں۔"



ہندوستان کے مغربی گھاٹ پہ واقع رتناگیری میں ۲۳ جولائی ۱۸۵۶ء کو گنگادھر تلک جی نے جنم لیا۔ ان کا اصلی نام کیشو تھا۔ برہمنوں میں جنم لینے کی وجہ سے اپنے حلقے میں کافی عزت اور تعظیم سے دیکھے جاتے تھے۔ جوانی کی حدوں کے پار کرنے کے بعد وہ ایک آزادی پسند اور بلند خیال نوجوان ثابت ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں انھوں نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری لینے کے بعد انھوں نے عہد کیا کہ وہ سرکاری نوکری نہیں کریں گے اور اپنی زندگی کا بیشتر وقت آزادی کی لڑائی کے لئے دیں گے۔ تلک جی نے اپنے دوستوں کی مدد سے پریس قائم کرکے دو اخبار نکالے جن میں ایک انگریزی کا "مراٹھا" تھا اور دوسرا مراٹھی زبان میں "کیسری" تھا۔ ان اخبارات کی اشاعت اور ان کے جاری ہونے سے ان کے مقاصد کو پھیلانے اور لوگوں کو اپنے ساتھ لانے میں بہت مدد دی۔ ان دنوں تلک کے پُر مغز مضامین کا کیسری میں بہت چرچا تھا۔ وہ سرکار کی خامیوں کو اپنے قلم سے منظرِ عام پہ لاتے رہے۔

کچھ مدت بعد وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ انھیں کانگریس دکن اسٹینڈنگ کمیٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ دو بار بمبئی ودھان سبھا کے ممبر ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں صوبہ بمبئی اور بھارت کے دوسرے حصوں میں ایک مہلک قحط پڑا۔ اس قحط میں انھوں نے عوامی بھلائی کے بہت سے اہم کام کئے۔ بازاروں میں اناج کی دوکانیں کھلوائیں اور ضرورت مندوں کو اناج حاصل کرنے میں مدد دی۔

"کیسری" میں تلک جی کے مضامین پر بغاوت کا الزام لگا کر اُن کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کو ضمانت پر بھی رہا نہ کیا گیا۔ لیکن بہت لمبی مدت کے بعد دو مرتبہ ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کے بعد ان کو ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی۔ اس مقدمے کے فیصلے کے لئے ایک جیوری مقرر کی گئی جس میں چھ انگریز اور تین ہندوستانی جج شامل تھے اور فیصلے میں تلک جی کو اٹھارہ ماہ قید با مشقت کا حکم سنا دیا گیا۔

جیل میں انھوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ بالآخر وہ کانگریس کے نیتا بن گئے جو مکمل آزادی کی متمنی تھی۔ اس پارٹی کو تشدد والی پارٹی کہا جانے لگا اور تلک جی پر الزام لگایا جانے لگا کہ وہ ملک میں بغاوت

اور بدنظمی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس دور میں ہندوستان میں فسادات شروع ہو گئے۔ انھوں نے "کیسری" میں لکھا کہ "بھارت کو سوراجیہ ملنے پر ہی لوگوں کو قتل و خون اور غارت گری سے روکا جا سکتا ہے۔" ان کے مضامین کو اس زمانے میں زبردست شرانگیز اور قابلِ اعتراض گردانا گیا اور ایک بار پھر انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں



زوردار بحث کی۔ پانچ روز تک مقدمہ چلتا رہا اور آخر کار انھیں چھ سال کے لیے جلاوطن کر کے مانڈلے (برما) جیل میں بھیج دیا گیا۔ ان کے جیل جاتے ہی ملک بھر میں بے چینی پھیل گئی اور بمبئی میں عام ہڑتال ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں جب جلاوطنی کی مدت ختم ہوئی تو آپ ہندوستان آئے اور اپنے اخبارات میں دوبارہ مضامین لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۱۵ء کے بعد انھوں نے جو کام کیے ان سے ان کی اپنے ملک سے بے پناہ محبت اور ایثار کا پتہ چلتا ہے۔ تلک جی نے ۱۹۱۶ء میں کانگریس کانفرنس میں حصہ لیا اور اپنی تقریر میں کہا: "سوراجیہ سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دیش میں ایسا ہوں جیسا کہ ایک انگریز انگلینڈ میں۔"

مہاراشٹر کی جنتا نے ان کی ۶۱ویں سال گرہ پر ایک لاکھ روپے کی تھیلی پیش کی اور انھیں مہاراشٹر کا بے تاج بادشاہ تسلیم کیا جانے لگا۔ آپ ۱۹۱۹ء میں جب انگلینڈ کے دورے سے واپس آئے تو صحت اُن کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ پھر بھی انھوں نے کام کو مقدم سمجھا۔ اور بالآخر دیش کا ان تھک محنتی اور آزادی کا متوالا ۳۱ جولائی ۱۹۲۰ء کو اپنے ملک کی آزادی کا ارمان لے کر چل بسا اور ملک کے ہزاروں لوگوں کی جے کار کے نعروں کے درمیان ان کا انتم سنسکار سمندر تٹ پر کیا گیا۔

ایک مُفت خورے نے اپنے کسی واقف کو مٹھائی کھاتے دیکھ کر پوچھا "کیا کھا رہے ہو؟" اُس نے آزردگی سے جواب دیا "زہر۔" مُفت خورے نے فوراً اپنا ہاتھ طشت میں ڈال دیا اور یہ کہہ کر کھانے لگ گیا کہ "تمھارے بعد ہمیں بھی جینا حرام ہے۔"

یوسف شاہ کرنولی

سانپ

شاہدہ .... سعید کی بڑی بہن
سعید .... شاہدہ کا چھوٹا بھائی
بلقیس جہاں ..... شوکت علی کی بیوی
شوکت علی ...... سعید اور شاہدہ کے ابا جان
محمود صاحب .... شاہدہ اور سعید کے چچا جان
رحیم خاں ...... گھر کا ملازم۔

(پردہ اُٹھتا ہے)

ایک کمرے میں چند کرسیاں اور دو صوفے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے جس میں محمود صاحب میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ اتنے میں شاہدہ اور سعید اندر داخل ہوتے ہیں۔

شاہدہ۔ (سعید سے) چچا جان تو آرام فرما رہے ہیں۔

سعید۔ ٹھہرو تو میں قریب سے دیکھ آؤں۔

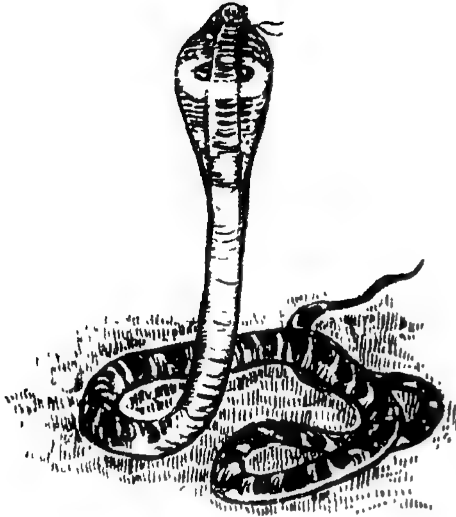
شاہدہ۔ اچھا دیکھو تو سہی

سعید۔ (پلنگ کے پاس جا کر آہستہ سے) سچ مچ چچا جان تو مزے کی نیند سو رہے ہیں۔

شاہدہ۔ (سعید سے) سعید میرے قریب آؤ۔

سعید۔ کیوں؟

شاہدہ۔ ارے آؤ بھی۔ . .



سعید شاہدہ کے قریب جاتا ہے۔ شاہدہ اُس کے کان میں کچھ کہتی ہے اور دونوں مسکراتے ہوئے کمرے کے باہر چلے جاتے ہیں۔

(تھوڑا وقفہ)

شاہدہ اور سعید دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کمرے میں دونوں چیختے ہیں اور چیخوں کی آواز سے محمود صاحب کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ محمود صاحب گھبرا کر اُٹھتے ہیں اور چاروں طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔

سعید۔ چچا جان جلد اُٹھئے وہ دیکھئے سانپ اس دیوار کے بازو میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے (سعید ہاتھ سے سانپ کی طرف اشارہ کرتا ہے)

محمود صاحب گھبرا کر دروازے کے پاس چلے جاتے ہیں اور ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔

سعید۔ چچا صاحب! سانپ کے مارنے کے لئے کچھ تو کیجیے نا۔

شاہدہ۔ ہاں چچا جان! آپ تو بہت دلیر ہیں۔ کچھ تو کیجیے نا۔

محمود صاحب - نہیں... میں نہیں ماروں گا (گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہیں)

شاہدہ - کیوں چچا جان آپ نے تو کئی شیر ہاتھی پچھاڑے ہیں۔ اور اب ایک معمولی سانپ مارنے میں پس و پیش کر رہے ہیں۔

محمود صاحب — ارے کیوں بک بک کر رہے ہو۔ جاؤ جلدی سے حیدر خاں کو بلا لاؤ وہ مار دے گا۔

(سعید اور شاہدہ دونوں حیدر خاں کو بلانے چلے جاتے ہیں۔ اور محمود صاحب ڈر کے مارے کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں —)

(تھوڑا وقفہ)

شوکت علی، بلقیس جہاں، شاہدہ اور سعید تمام کمرے کے اندر داخل ہوتے ہیں اور اُن کے پیچھے محمود صاحب چوروں کی طرح دبے پاؤں داخل ہوتے ہیں۔

شوکت علی - (سانپ کو دیکھ کر) ارے یہ تو کالا ناگ ہے۔

محمود صاحب - (ہکلاتے ہوئے)۔ ہاں ہاں ہاں بھائی جان یہ کالا ناگ ہے۔

شاہدہ - ابا جان! چچا جان تو سانپ کو مارنے سے ڈرتے ہیں۔

محمود صاحب - (سینہ تان کر) واہ بھلا ہم ڈرنے والے ہیں۔ دیکھو ابھی مارے دیتے ہیں۔

محمود صاحب ہاتھ میں ایک موٹی لاٹھی لے کر سانپ کے قریب جاتے ہیں۔ جوں ہی قریب پہنچتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں اور لاٹھی چھوٹ جاتی ہے۔ لاٹھی گرنے کی آواز سے سانپ سرسرانے لگتا ہے اور ایک کونے میں جا کر رُک جاتا ہے۔ محمود صاحب کی "بہادری" پر سب ہنس دیتے ہیں۔

شوکت علی (ہنسی کو روکتے ہوئے) کیوں محمود صاحب تم تو مارنے گئے تھے نا

(محمود صاحب جواب دینے کی بجائے خاموش کھڑے رہتے ہیں)

شاہدہ - ابا جان! میں سانپ کو مارے دیتی ہوں۔

بلقیس جہاں ہائے اللہ! یہ تم کیا کرتی ہو۔ میری بچی! یہ کالا ناگ ہے۔ اگر مار نشانے پہ نہ پڑے تو وہ تمہارا جانی دشمن بن جائے گا۔

سعید - (لاٹھی اُٹھاتے ہوئے) آپ تمام ہٹ جائیے میں مارے دیتا ہوں۔

شوکت علی (سعید کے ہاتھ سے لاٹھی چھینتے ہوئے) اچھا تو آج کل تمہیں بھی سانپ کو مارنے لگے۔

سعید - دیکھئے مارتا ہوں یا نہیں

(حیدر خاں کمرے میں داخل ہوتا ہے)

شوکت علی - ارے تو کہاں مر گیا تھا کم بخت دیکھ تو سہی کمرے میں سانپ آ گیا ہے۔

حیدر خاں سانپ کے قریب جاتا ہے اور لاٹھی لے کر نشانہ جماتے ہوئے مارتا ہے۔ لاٹھی کی آواز ہوتے ہی سانپ آگے نکل جاتا ہے اور وار خالی جاتا ہے۔ حیدر خاں دوبارہ لاٹھی اُٹھا کر مارتا ہے مگر وہ وار بھی چُوک جاتا ہے)

شوکت علی اور بلقیس جہاں اور بھی پریشان ہیں اور محمود صاحب تو بس وہیں دروازے کے پاس ٹھہرے ہوئے کانپ رہے ہیں۔

شوکت علی (حیدر خاں سے) یہ تم سے نہیں ہوگا۔ باہر جا کے کسی کو بلا لاؤ

(حیدر خاں باہر چلا جاتا ہے)

(تھوڑا وقفہ)

حیدر خاں کمرے میں داخل ہوتا ہے

حیدر خاں - سرکار باہر تو کوئی نہیں ہے۔

(یہ سن کر سعید سانپ کی طرف بڑھتا ہے اور سانپ کو اُٹھا لیتا ہے اور تمام چیختے ہیں)

شاہدہ - ارے آپ لوگ کیوں چیخ رہے ہیں یہ ڈرامہ تو چچا جان کی بہادری کا اندازہ لگانے کے لئے کھیلا گیا تھا۔ یہ تو مصنوعی سانپ ہے یہ دیکھئے اس کا برقی پلگ — جو اس مصنوعی سانپ سے لگا ہے۔ (سوئچ بورڈ کے پاس برقی پلگ دکھلاتے ہوئے)

تمام ہنس دیتے ہیں اور محمود صاحب شرمندگی سے پانی پانی ہوئے جا رہے ہیں

(پردہ گرتا ہے)

ستمبر ۱۹۵۶ء

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو کی علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراقؔ گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوشؔ ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین



"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو [illegible] اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اسی سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنہوں نے اس کو سنجیدہ اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer.
United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd No D—[illegible]



آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک اہم ادبی رسالے [illegible] اس کی اہمیت میں بڑا [illegible] دوسرے ادبی رسالے [illegible] ہوتے ہیں۔ جہاں تک [illegible] کے منظومات [illegible] پہچھے ٹھیک ادیبوں سے [illegible] آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین [illegible]"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ [illegible] آئینہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو [illegible] اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری [illegible] کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنہوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے "نئے لکھنے" والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

بیماریوں سے شفا پانے کی نئی اُمیدیں

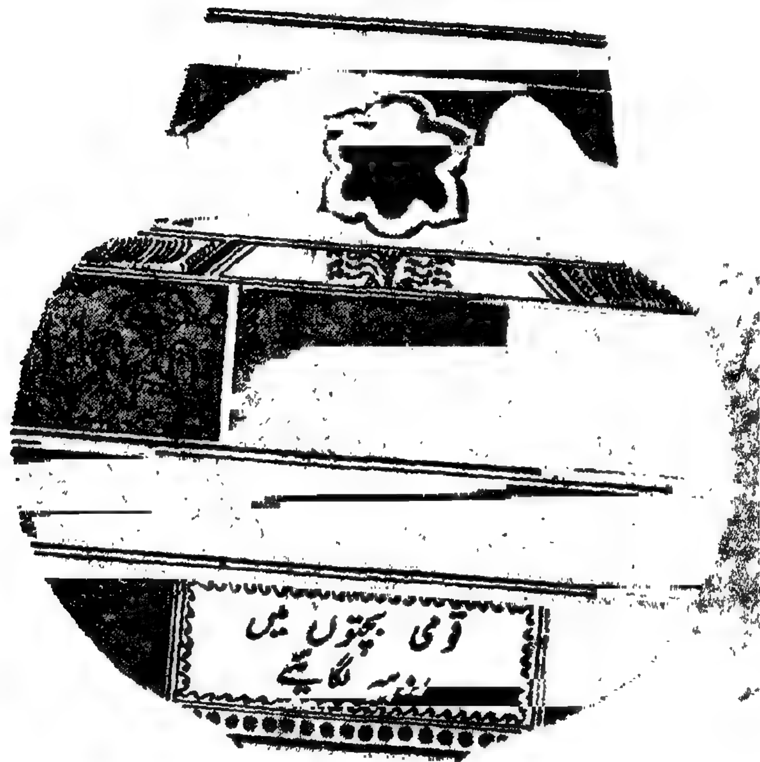
اِس وقت ہندوستان میں ڈاکٹروں کی بڑی
کمی ہے۔ اتنے ڈاکٹر اور نرسیں نہیں ہیں کہ
تمام ضرورت مند مریضوں کی پوری طرح خبرگیری
ہو سکے۔ دیہاتوں میں یہ کمی خاص کر پائی جاتی ہے۔
لیکن دوسرے پنج سالہ پلان میں دیہاتوں میں
علاج و معالجہ اور صحت عامہ کے لئے ۵۶-۱۹۵۱
کی بہ نسبت دوگنی رقم منظور کی گئی ہے
اور یہ تجویز ہو چکی ہے کہ ۱۹۶۱ تک تمام ان مقامات پر
جہاں جماعتی منصوبے اور قومی توسیعات وغیرہ
ہو رہی ہیں موجودہ حالت سے ۳۰۰۰ سے زائد
صحت کے مرکز قائم کئے جائیں گے
اسپتالوں میں اِنڈور علاج کا ۲۶ فیصدی
اضافہ ہوگا، اور سارے ملک کے اسپتالوں
میں ۳۰،۰۰۰ سے زائد بستر
بڑھائے جائیں گے۔



برماشیل ملک کے ملیریا
اور فلیریا کنٹرول پروگرام کے لئے
لاروی سائیڈل تیل اور ریز ڈویل کے چھڑکاؤ
کے تیل بڑی تعداد میں مہیا کر رہی ہے
ہم پیٹرولیم سے تیار کئے ہوئے
کیڑے مارنے والے تیل ملک بھر
میں پہونچا رہے ہیں۔ شیل پیٹرولیم
کی کیمیاوی مصنوعات الڈرین۔ ڈائلڈرین
اور اینڈرین ملک کے اناج کے
ذخیروں کی حفاظت کرتی ہیں
پیٹرولیم سے بنائی ہوئی
دوسری مصنوعات انٹی بیوٹکس
کے تیار کرنے میں بھی
استعمال کی جاتی ہیں

برماشیل ... ہندوستان کی زندگی کا ایک حصہ ہے

چھوٹی چھوٹی بچتوں سے بڑے بڑے کام





اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- مظفر شاہ

جلد ۱۵ —— نمبر ۳

سالانہ چندہ:- ہندستان میں چھ روپیہ / پاکستان میں چھ روپیہ

غیر ممالک سے:- ۱۰ شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں۔ آٹھ آنے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

اکتوبر ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس

ترتیب

بچوں کا آج کل

مُلاحظات

ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا مقصد بقائے امن ہے۔ لادینی اور غیر مذہبی بنیادوں پر اس کا دستور قائم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امن اور آزادی چاہنے والے ممالک اس کی دوستی کا دم بھر رہے ہیں۔ اسلامی ممالک بالخصوص ہندوستان کے ساتھ ہوا خواہی اور محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ ایشیائی اور افریقی ممالک میں ہندوستان کو ایک خاص عزت اور وقار مل رہا ہے۔ انڈونیشیا [illegible] اس کی حصولِ آزادی کی مہم میں ہندوستان نے اس کا ساتھ دیا اور [illegible] دونوں ملکوں میں محبت اور آشتی کا رابطہ و تعلق بہت استوار ہے۔ محافظِ حرمین [illegible] والیٔ سعودی عرب ہندوستان میں بہ نفسِ نفیس تشریف لا چکے [illegible] کی دعوت پر بھارت کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سعودی عرب [illegible] ہیں۔ ملکِ شام کی جمہوریہ کے صدر ہندوستان آ رہے ہیں۔ شاہِ ایران [illegible] کا دورہ کر گئے تو انھوں نے دونوں ملکوں کی ثقافتی ہم آہنگی کو تسلیم کیا [illegible] ساتھ بھارت کے تعلقات، تہذیبی اور سیاسی ہر اعتبار سے مضبوط ہیں۔ صدر [illegible] کرنل ناصر خود بھارت کا دورہ کر چکے ہیں اور حال ہی میں پنڈت جواہر لال [illegible] نہرو نے ان کے سفرِ یورپ کے دوران میں بھی ملاقات کی تھی۔ آزاد اور [illegible] امن پسند ممالک میں یہ یکجہتی اور راست روی امنِ عالم کے لئے ایک خوش آئند فال ہے۔ ایشیائی اور افریقی ممالک اسی راہ پہ گام زن ہو کر دوسرے ممالک کے ہم دوش ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔

سویز کا قضیہ ابھی طے نہیں ہوا۔ لندن میں ۲۲ ممالک کی جو کانفرنس ہوئی [illegible] میں سے ۱۸ ممالک نے کثرتِ آراء سے ایک کمیشن صدر جمہوریۂ مصر کے پاس بھیجنا منظور کیا تھا جو اُن سے گفت و شنید کرے اور اس بات پر زور دے کہ سویز کے انتظامات ایک بین الاقوامی بورڈ کے سپرد کر دئے جائیں۔ آسٹریلیا کے وزیرِ اعظم مسٹر منیزز اس کمیشن کے قائد تھے۔ امریکہ، حبشہ، ایران اور سویڈن اس کمیشن کے ممبر تھے۔ پریزیڈنٹ ناصر اس کمیشن سے بات چیت کر چکے ہیں۔ ادھر ناٹو Nato کی ایک میٹنگ پیرس میں ہو رہی ہے۔ برطانوی بیڑا تیار کھڑا ہے۔ فرانسیسی فوجیں قبرص میں پہنچ گئی ہیں لیکن تمام باتوں کو محض دھمکی سمجھ لیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ معاملہ زیادہ نہیں بڑھے گا اور کوئی خاطر خواہ تصفیہ ہو جائے گا۔

احمد آباد میں پچھلے دنوں "دو زبانی" صوبۂ بمبئی بننے کی تجویز کے خلاف جو مظاہرے ہوئے وہ بہت افسوس ناک تھے۔ جس دھرتی سے گاندھی اور پٹیل اُٹھے اور جس شہر پر اُنھیں ہمیشہ ناز رہا وہیں تشدد کا دھواں اُٹھے یہ عبرت ناک بات نہیں تو اور کیا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ گجرات اور بمبئی کے مضبوط کردار نے مرارجی ڈیسائی کے بروقت انتباہ اور تدبر سے صورتِ حال بہتر ہو گئی بلکہ سنور گئی۔ مہاراشٹر پردیش کانگریس کمیٹی نے اتفاقِ رائے سے بھارتی پارلیمنٹ کے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے کہ بمبئی کا بڑا "دو زبانی" صوبہ بنایا جائے۔ امید ہے کہ اس فیصلے کے بعد ہندوستان کے صوبوں کی نئی تشکیل بہ وجوہِ احسن عمل پذیر ہو جائے گی۔

۲۹ اگست کی شب کو مسٹر غلام محمد سابق گورنر جنرل پاکستان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ موصوف ایک قابل منتظم، ہر دل عزیز دوست اور علم پرور انسان تھے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان آپ بزمِ اُردو شملہ کے صدر تھے اور آپ کے اہتمام سے پانچ مشاعرے شملے میں اس نوعیت کے ہوئے کہ اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ شعر و ادب کے آپ بڑے دلدادہ تھے۔ تقسیم کے بعد آپ کا یہ ایمان تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں مستقل اور پائدار دوستی کا قائم ہونا ضروری ہے۔ آپ کی صحت ایک مدت سے خراب چلی آتی تھی۔ اپنی ۶۱ ویں سالگرہ کے دو دن بعد آپ راہیِ عالمِ بقا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

طپش صدیقی

حدیثِ وطن

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
مرے وطن کی سرزمیں جمیل و دلکش و حسیں
مرے وطن کا آسماں، عظیم و عزم آفریں
یہ پُرخلوص بستیاں، فلاح و خیر کی امیں
سکوں پسند و صلح جو، بلند ظرف و پاک بیں
یہ زرفروش کھیتیاں، ستارہ خیز و خوبیں
شگوفہ بار و گل چکاں، نظر نواز و نازنیں
رواں دواں ہے چارسو، فضا میں روحِ انگبیں
مذاقِ دید چاہیئے، تجلیاں کہاں نہیں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
مٹا مٹا سا ہے شبِ سیاہ کا ہر اک سماں
اُڑی اُڑی سی ہیں اجل کی قوتوں کی دھجیاں
اُفق اُفق ہیں مریمِ سحر کی دلستانیاں
جہاں جہاں ہے زندگی کی دلبری کی داستاں
جفاکشی و تن دہی کی معترف ہیں کھیتیاں
خلوصِ کار کی گواہ ہیں ملوں کی چمنیاں
اُچھل رہے ہیں دیوتا، مچل رہی ہیں دیویاں
اُبل رہے ہیں زمزمے، بہک رہی ہیں مستیاں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
یہیں پہ رام و لکشمن پلے بڑھے جواں ہوئے
یہیں پہ نانک و کرشن و بُدھ گہر فشاں ہوئے
یہیں پہ سُور و تُلسی و کبیر نغمہ خواں ہوئے
یہیں معین و وارث و نظام حق بیاں ہوئے
یہیں سلیم و صابر و کلیمِ نکتہ داں ہوئے
یہیں نظیر و میر و میرزا ربابِ جاں ہوئے
حقائق و بصائر و نظر کے ترجماں ہوئے
رسولِ زندگی ہوئے، پیمبرِ زماں ہوئے
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
یہ سادھوؤں کی جنم بھوم صوفیوں کا یہ وطن
تمدنوں کا مدرسہ، ثقافتوں کی انجمن
یہ سبز پوش وادیاں حریفِ خطۂ ختن
یہ چشمہ ہائے جاں فزا یہ گنگ اور یہ جمن
کہیں بہارِ مضطرب کہیں شرابِ موجزن
لطافتیں روش روش نفاستیں چمن چمن
یہ دلبرانِ شعلہ رُو سحر جمال و سیم تن
اشارتیں ادا ادا، عبارتیں سخن سخن
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
یہ کاشمر کی نزہتیں، ہمالیہ کی رفعتیں
یہ صبح و شام کاشی و اودھ کی جاذبیتیں
یہ دہلی اور لکھنؤ کی یادگار عظمتیں
یہ ارضِ تاج کا علو، یہ سیکری کی شوکتیں
یہ پُر شکوہ مقبرے، یہ ذی وقار تربتیں
یہ دیدہ زیب باغیچے یہ دل کشا عمارتیں
یہ سیم و زر کی بخششیں، یہ فکر و فن کی برکتیں
یہ عاشقی کے معجزے یہ حسن کی کرامتیں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
یہ امن کا پیامبر، یہ آشتی کا دیوتا
موافقت کا راہبر، مصالحت کا رہنما
یہ بے بسوں کا خیر خواہ، بیکسوں کا ہمنوا
رفیقِ اہلِ یورپ و انیسِ آلِ ایشیا
اُٹھا تو لے کے جوشِ نشاط و خرمی اُٹھا
بڑھا تو بے سپر انتقامِ صلح و دوستی بڑھا
ملا تو سب سے عاجزی و انکسار سے ملا
رہا تو سب میں ہو کے سرفراز و سرخرو رہا
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
یہ فلسفے کا آستاں، حریمِ دانش و خبر
یہ گیانیوں کا آشرم، یہ عارفانِ حق کا گھر
کہیں یہ اجتماعِ شب، کہیں یہ محفلِ سحر
تلاوتیں نفس نفس، عبادتیں نظر نظر
جنوں یہاں کا محترم، خرد یہاں کی معتبر
یہاں کی خاکِ راہ بھی ہے طپش! کیمیا اثر
یہ باغ و بن[1]، یہ بحر و بر، یہ کاخ و کوہ و دشت و در
یہ لالہ زارِ بیکراں، یہ ایک خلدِ مختصر
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

[1] یہ عطف جائز نہیں

ڈاکٹر ذاکر حسین

گاندھی جی

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ۳۰ جنوری ۱۹۵۶ء کو اس پُراثر تقریب میں بچوں کے ایک مجمع کو مخاطب کیا تھا۔ موصوف کے شکریے کے ساتھ یہ تقریر ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

دیس کے نونہالو! جانتے ہو کہ آج تم سب کیوں جمع ہوئے ہو؟ آج ایک ایسے دن کی یاد تمہیں یہاں لائی ہے جس کا خیال کر کے ہم سب ہمیشہ اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں صدیوں تک نہیں، رہتی دنیا تک سر دھنتی رہیں گی اور دکھ سے آنکھیں نم کرتی رہیں گی۔ آج ہی کی تاریخ تھی ۸ برس پہلے جب ہمارے ہی ایک نادان بدنصیب بھائی نے ایک ایسی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا جس سے ہماری غلامی کے اندھیارے میں آزادی کی روشنی آئی تھی۔ اس زندگی کو ختم کر دیا تھا جس سے ہم، ہمارا دیش، ساری دنیا کے بچے اور اچھے زندگی کی گندگیوں میں نیکی اور سچائی کو سمونے کا ڈھنگ سیکھ رہے تھے، جس نے بزدلوں کو بہادر سورما بنا دیا تھا، جس نے نہتوں کو توپ اور مشین گن سے، غریب، بے سروسامان محکوموں کو ایک مہا سامراج کی طاقت سے ٹکرا دیا تھا، ممولے کو شہباز سے لڑایا تھا۔ اور سچ میں محکوموں غریبوں کو فتح یابی تک پہنچایا تھا، ممولے کو شہباز پہ جتایا تھا۔

کیسی شاندار موت تھی یہ اس مردِ خدا کی! اس شہید کی جس نے محبت اور سیوا سے بھری ہوئی زندگی کو یوں پورا کیا، جان دے کر اپنی ساری زندگی کی سچائیوں پہ تصدیق کی مہر لگائی، جو اسے اپنا دشمن بتاتے تھے ان کو ہلاکت سے بچانے کی خاطر اپنی جان دی اور اپنے خون سے، اپنے محبت بھرے خون سے نفرت اور دیوانگی کی اس آگ کو بجھایا جو دیس میں بھڑک اٹھی تھی۔ کوئی کیسے بھولے کہ اس پاک زندگی کو آج کی تاریخ میں ۸ برس پہلے ہم نے اپنے ہاتھوں کھویا۔ وہ ہمیں معاف کر چکا ہوگا، اس لئے کہ اس نے کسے معاف نہیں کیا؟ پر آنکھیں تو نم ہی رہیں گی اور وہ خود بھی پیارے، جنھیں پوچھے گا تو بھی آنسو تو نہ سوکھیں گے۔

یہ سچ ہے! اور دکھ تو ہمارے حصے میں لکھ ہی گیا ہے۔ پر یہ شہید کی موت محترم اور رنج کے ساتھ ساتھ ہماری اکیلی زندگیوں کا سہارا بھی ہے اور ہماری قومی زندگی کا سرمایہ بھی۔ اس شہادت کی یاد سے، اس شہید کے نام سے، اس کے کام سے، جیون کتھا سے ہمارے دل میں اور رہتی دنیا تک آنے والوں کے دل میں امید کا ایک چراغ روشن رہے گا۔ بے لاگ سچائی اور بے غرض سیوا کا ایک تقاضا اٹھتا رہے گا، لغزشوں پر، گمراہیوں پر ندامت کا ایک کانٹا دل میں کھٹکتا رہے گا جس کی یاد سے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا ملے گا۔ بھٹکے ہوؤں کو راہ ملے گی، جب جی چھوٹیں گے تو اس کی یاد ہمت بندھائے گی، جب دل ڈوبیں گے تو یہ طاقت اور توانائی بخشے گی۔

یہ کون آدمی تھا؟ نرالا انوکھا آدمی۔ پیارے بچو! یہ آدمی آج سے ۸۷ سال پہلے تم ہی جیسا ایک نونہال تھا۔ خاندانی نام گاندھی، باپ کا نام کرم چند، خود بچے کو موہن داس نام دیا گیا۔ موہن داس کرم چند گاندھی پورا نام پڑا۔ پوربندر کی ریاست میں ۱۸۶۹ء میں جنم لیا۔ ایک کم ۸۰ برس کی عمر پائی۔ تمھاری ہی طرح کا ایک نونہال تھا یہ، ایک شرمیلا سا لڑکا، ذرا الگ الگ رہنے والا، نہ کھیل کود میں لڑکوں کے بہت ساتھ، نہ ان کی شرارتوں میں۔ ایسا بھی نہ تھا کہ پڑھنے لکھنے میں سب سے آگے ہو۔ اور دیکھو یہ شرمیلا لڑکا کس بلندی پر پہنچا! کوئی چیز ایسی نہ تھی اس میں جو دوسرے معمولی لڑکوں میں نہیں پائی جاتی۔ تم سب اس بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ اور یہی اس مہاتما، مہا پرش کا خاص وصف ہے کہ ایک معمولی لڑکا ہو کر اس نے اپنی سچائی سے، سچائی پر اڑنے کی عادت سے، اپنی محنت سے، جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کا حق ادا

کرنے سے یہ درجہ حاصل کیا۔ ادب سے، ہمیشہ اچھائی کی تلاش سے، دوسروں کی نیکیاں اور خوبیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے سے، ان کی کمزوریوں سے درگزر کر کے اپنی کمزوریوں پر کڑی پکڑ کر کے، اس نے اپنے جیون کی گود نیکیوں سے مالا مال کر لی، اپنی کمیوں کو ایک ایک کر کے چھانٹ ڈالا اور اپنے کو اس اونچے مرتبے پر پہنچا دیا۔ اس کی بڑائی کچھ پیدائش کے اتفاق پر زیر نہ تھی۔ قدرت کی بے حساب دین نہ تھی۔ یہ ایک ہمت والے محنتی آدمی کی عمر بھر کی کوشش کا نتیجہ تھی، اپنے ہاتھوں اپنی تعلیم کا پھل تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی کچی دھات کو محبت کی بھٹی میں تپا تپا کر، سچائی کے نکھرے پانی میں بجھا بجھا کر، اور بے غرض سیوا اور محنت کے ہتھوڑے سے پیٹ پیٹ کر ایک ایسی کھری، ایسی پکی، ایسی وزن دار، ایسی حسین، ایسی دلکش زندگی بنائی تھی جو صدیوں میں کسی کو نصیب ہوتی ہے مگر جس کی ریس کا حوصلہ ہر سچا اور نیک اور محنتی آدمی کر سکتا ہے۔ پیارے بچو! تمھاری سب کی زندگیاں تمھارے سامنے ہیں۔ انھیں بنانے کی ذمہ داری تمھاری اپنی ذمہ داری ہے۔ زندگی کی کچی دھات تمھارے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ کر لو کہ اس کا کیا بناؤ گے زندگی کے اس بڑے کاریگر کی جیون کہانی پڑھو اور سمجھو، اس کا انمول ہنر سیکھو اور اپنی زندگیاں بناؤ۔

زندگی بنانے کے اس گمبھیر کام میں گاندھی جی کے جیون سے بہت کچھ سبق ملتے ہیں۔ انھیں سیکھو۔ یہ وقت بات بڑھانے کا نہیں ہے۔ پر دو ایک باتیں کہے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی بنانے میں سب سے پہلے ارادے کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گاندھی جی کے جیون سے سبق ملتا ہے کہ ارادے کو آزاد ہونا چاہیئے۔ آدمی ارادہ آپ کرے، یہ نہ ہو کہ دوسرے کر کر کے اس کے سر تھوپ دیں۔ گاندھی جی ارادہ کرنے میں دوسروں کا منہ نہیں تکتے تھے۔ خود سوچتے تھے، فیصلہ کرتے تھے اور اس کا پورا بوجھ اپنے اوپر رکھتے تھے۔ وہ جلد فیصلہ کر سکتے تھے۔ اگر مگر میں فیصلے کو ٹالنے والا ارادہ نہیں کر پاتا اور زندگی نہیں بنا پاتا۔ گاندھی جی کا ارادہ مضبوط ہوتا تھا۔ جب کر لیتے تھے تو نہ ان کے اندر سے کوئی چیز اسے آسانی سے ہلا پاتی تھی نہ باہر سے۔ گاندھی جی اپنے ارادے پر جمتے تھے اور مدت تک جم سکتے تھے۔ اس لئے کہ ہر ارادے کے پورا ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی طرح نہ تھے جو کسی کام کو بڑے زور سے اور اس سے زیادہ شور سے اُٹھاتے ہیں اور چند دن میں ہی کڑھی کا یہ اُبال ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے، گاندھی جی جانتے تھے کہ کسی بڑے کام کی سرسوں ہتھیلی پر نہیں جمتی۔

دوسری چیز جو مجھے گاندھی جی کے جیون میں دکھائی دیتی ہے وہ اُن کی ٹھیک سوجھ بوجھ ہے، ان کی چترائی ہے۔ زندگی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ٹھیک سوچ سکے، ٹھیک سمجھ سکے۔ زندگی کے سفر میں یہ سوجھ بوجھ راستے کا اونچ نیچ بتاتی ہے، نظر کو دُور تک لے جاتی ہے، اور آدمی اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر نہیں چلتا۔ ٹھیک سوجھ بوجھ کی عادت ڈالنے سے پڑتی ہے اپنے آپ نہیں پڑ جاتی۔ طرح طرح کی چیزیں اس میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ کہیں خود غرضی فریب دیتی ہے، کہیں غصّے کا طوفان دھیان کو اِدھر سے اُدھر کر دیتا ہے۔ کہیں لالچ دھوکے دیتی ہے، کہیں جلد بازی قدم کو پھسلاتی ہے، کہیں تعصب اندھا کرتا ہے۔ نجات کے رستے نہ سمجھنے والے، وقت کی سہانی راگنیاں گانے والے بہکاتے ہیں، ضدیں اور ہٹ دھرمیاں ٹھوکریں کھلاتی ہیں۔ گاندھی جی نے اپنے جیون میں ان رکاوٹوں سے بچنے اور صحیح سوجھ بوجھ کی عادت کی مشق کے بے شمار سبق دیئے ہیں۔

زندگی کے بنانے میں ایک اور چیز جو بہت کام آتی ہے وہ آدمیوں کی پہچان ہے۔ یہ خاص سمجھ ہوتی ہے، جس سے آدمی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کے دل میں پہنچ گیا، دوسروں کو جھٹ بھانپ لیتا ہے۔ ان کی بات کی تہ کو پہنچ جاتا ہے، ان سے ہمدردی کر سکتا ہے۔ ان کو سمجھ سکتا ہے۔ لکھے پڑھے لوگوں میں یہ صفت بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ کتابی کیڑے اصلی آدمیوں کی دنیا سے اتنے الگ رہتے ہیں کہ اس کو برتنے کے قابل نہیں رہتے۔ جن کا دھیان اپنی غرض پر جما ہوتا ہے وہ بھی اس سے محروم ہوتے ہیں۔ گاندھی جی نے زندگی کی ریل پیل میں، سچے میل ملاپ سے، بے غرض سیوا سے یہ ہنر حاصل کیا تھا۔ تمھارے لئے بھی اس کے حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے۔

زندگی کے بنانے میں ایک چیز اور بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آس پاس کے واقعات سے آدمی کے دل میں جو اثر ہوتا ہے وہ کس قسم کا ہوتا ہے۔ ٹھہرتا ہے یا بہ جاتا ہے۔ پھیلتا ہے یا مُرجھا کر ختم ہو جاتا ہے۔ گاندھی جی جس چیز کا اثر لیتے تھے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی تھی۔ عمر بھر کے کام کا سامان بن جاتی تھی۔ ہم وطنوں کی بے بسی کا تجربہ جو کبھی افریقہ میں ہوا اس کی تان دیکھو کتنے عرصے بعد ۱۹۴۸ء میں دہلی میں ٹوٹی۔ اور ساری عمر اسی ایک غم کے دُور کرنے کی تدبیروں میں بیت گئی۔ اپنی جذباتی زندگی میں یہ گہرائی اور ٹھہراؤ بھی ہمیں گاندھی جی سے سیکھنا چاہیئے۔ بچو! گاندھی جی کو اپنے دیس کے سب بچوں سے یہ اُمید تھی کہ وہ اپنا جیون

اچھا بنا دیں گے۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ آسانی سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ بیچ کے
بیوک ذرا مشکل سے ہی مایوس ہوتے ہیں۔ تمہارے سامنے ان کی ایک تصویر ہے
جس میں وہ کہہ رہے ہیں کہ "میری کون سنے گا؟" بچو! یہ مایوسی کا سوال نہیں
ہے؛ یہ ان کی للکار ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ تم میں کون ہے جو میری سنے؟ یہ
ہم سے تم سے ان کا سوال ہے۔ اپنے نا تمام کام کے متعلق ان کا سوال ہے۔ ان
کا کام ایسا بڑا کام تھا، ایسا ہمیشہ چلنے والا کام تھا کہ اس کا پورا کرنا ان جیسے
بڑے آدمی کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ اچھے آدمی بننا اور اچھا سماج بنانا، اچھے
آدمیوں کو اچھے سماج کی سیوا میں لگانا، اچھے سماج کو سارے سنسار کی سیوا میں
لگانا، یہ کچھ ایک دو کی زندگیوں میں پورا ہونے والا کام نہیں ہے، بلکہ سچ تو
یہ کہ کبھی بھی ختم ہونے والا کام نہیں ہے۔ یہ تو برابر کئے جانے اور برابر ہوتے
جانے والا کام ہے۔ ہمیں اس کام کے کرنے کا موقع دینے کے لئے گاندھی جی
نے ہمارے دیس کی آزادی چاہی تھی۔ آزادی ہوتی ہے بندھنوں سے، بیڑیوں سے
پابندیوں سے۔ مگر بندھن ٹوٹ جائیں، بیڑیاں کٹ جائیں، پابندیاں ہٹ
جائیں مگر یہ پتہ نہ ہو کہ جانا کدھر ہے یا پتہ ہو تو سستی اور کاہلی قدم نہ اٹھانے
دیں کہ ہم تو آزاد ہیں جب چاہیں چل کھڑے ہوں گے تو یہ آزادی اکارت ہے۔
آزادی ہوتی ہے کسی کام کے لئے، کسی مقصد کے لئے۔ گاندھی جی نے ہمیں
آزادی کس لئے دلائی تھی۔ اس لئے کہ ہمارا ارادہ آزاد ہو، ہم جو بن سکتے ہیں
وہ بنیں۔ اچھے آدمی بن سکیں، اچھا سماج بنا سکیں۔ اچھا آدمی بننے اور اچھا سماج
بنانے کا جو راستہ انھوں نے بتایا ہے وہ میں سمجھتا ہوں تین لفظوں میں بیان ہو
سکتا ہے: اہنسا، وگیان اور کام

ہماری غلامی سے بگڑے ہوئے اور کھوکھلے لفظوں کے الجھاووں میں
پھنسے ہوئے دماغ نے اہنسا کو بھی ایک معمہ بنا دیا ہے۔ اہنسا کے اہم مسئلے یہ
نہیں ہیں کہ ملیریا کے مچھروں کو مارا جائے یا نہ مارا جائے، یا جب کوئی تمہارے
بھائی کو تمہارے سامنے ذبح کرے تو تم اسے روکو یا نہ روکو۔ جو لوگ ہر بڑے
سے بڑے میدان میں بھی حاشیہ ہی پر رہنا پسند کرتے ہیں، انھیں یہ سوال مبارک
ہوں۔ اہنسا کا راستہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں محبت کا راستہ ہے، رواداری کا
راستہ ہے، آدمیت کے احترام کا راستہ ہے، آدمی کو آدمی کے ظلم سے بچانے
کا راستہ ہے، امداد باہمی کا راستہ ہے، سماجی ناانصافیوں کو مٹانے کا راستہ
ہے، سمجھ کا راستہ ہے، سیوا کا راستہ ہے، دلوں کی صفائی کا راستہ ہے، بھائی
کو بھائی سے ملانے کا راستہ ہے، دشمن کو دوست بنانے کا راستہ ہے، پریم
پر بھروسہ کا راستہ ہے، امن کا صلح و آشتی کا راستہ ہے۔

بچو! تمہیں اس راستے پر چل کر ایک نیا دیس، ایک نیا سماج بنانا ہے۔
جب تک اس دیس میں آدمی پر آدمی ظلم کرتا ہے، جب تک اس دیس میں بسنے
والے ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے، جب تک یہاں کے بسنے والے ہندو
مسلمان، سکھ، عیسائی اپنے کو بھائی بھائی نہیں جانتے اور نہیں مانتے، جب
تک یہاں امیر غریب کو اور طاقت ور کمزور کو ابھرنے نہیں دیتا، جب تک یہاں
کسی کی محنت مشقت سے کوئی دوسرا بے جا لابھ اٹھاتا ہے، اس وقت تک یہ
دیس گاندھی جی کے وچاروں کا دیس نہیں ہے۔ ان کا کام باقی ہے اور تمہیں پورا
کرنا ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لئے تمہیں آزادی ملی ہے۔

پھر دوسرا راستہ وگیان کا ہے۔ گاندھی جی کا سچ پیار نا سماجی اخلاقی
معاملوں میں بھی تھا اور قدرت سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں بھی۔ دونوں میدانوں
میں سچ کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ ایک جگہ اخلاق کا راستہ ہے دوسری جگہ
سائنس کا راستہ ہے۔ جب تک ہمارے دیس میں کروڑوں آدمیوں کو [illegible]
پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا، جب تک کروڑوں آدمیوں کو دودھ میں [illegible] نصیب
نہیں ہوتی، جب تک ہمارے دیس میں آدمی کی جان مکھی اور بھنگوں کی طرح سستی
ہے۔ جب تک ہمارے دیس میں کروڑوں آدمی ان پڑھ ہیں اور کروڑوں بچوں
کو مدرسے میں جانا نصیب نہیں ہوتا اس وقت تک انگریزوں کے راج سے
آزاد ہو جانا کافی نہیں۔ بچو! تم اس دیس کے پہاڑ کاٹو گے، سمندر پاٹو گے
اس کے دریاؤں کو موڑو گے، اس کے ریگستانوں کو گلزار بناؤ گے، اس کے
پیٹ میں جو دولت بھری پڑی ہے اسے نکال کر اس کے باسیوں میں بانٹو گے
جب یہاں سے جہالت کو ختم کر دو گے، غریبی کو مٹا دو گے، بیماری کو دور کر دو گے
سب کے لئے امن چین سے رہنے کا سامان کر دو گے، اور ایک کو دوسرے
پر شیر نہ ہونے دو گے، تب یہ دیس گاندھی جی کی آشاؤں کو پورا کرنے والا
دیس ہوگا۔

مگر بچو، اہنسا اور وگیان خالی خیالی باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ کتابی
چیزیں بھی ہو سکتی ہیں اور بہتوں کے لئے ہیں۔ گاندھی جی کا اہنسا اور گاندھی جی
کا وگیان خیالی اور کتابی نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے جو تیسرا راستہ بتایا ہے وہ
کام کا راستہ ہے۔ اہنسا کو بھی جیون میں برتنا، وگیان کو بھی جیون کے ہر کام

بیں بیٹا۔ انھوں نے آخری عمر میں بنیادی تعلیم کی یوجنا میں اسی خیال کو پیش کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مدرسوں میں کام کو بیچ کی جگہ دی جائے اور جہاں تک ہو سکے اسی کے ذریعے دوسری سکھانے اور بتانے کی چیزیں سکھائی اور بتائی جائیں۔ انھیں امید تھی کہ ہمارے سب مدرسے کام کے مدرسے بن جائیں گے۔ جہاں بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد اسے جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالی جائے گی تاکہ وہ جو کام کریں ہاتھ کا یا دماغ کا اس کا پورا پورا حق ادا کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کام کو کبھی اکیلے کی خودغرضی نہ بننے دیا جائے بلکہ سارا مدرسہ ایک کام میں لگی ہوئی بستی بن جائے جس میں سب مل کر کام کرتے ہوں اور سب کے کام میں سے سب کا کام پورا ہوتا ہو۔ گاندھی جی کے اس تیسرے راستے کو اپناؤ۔ سب مدرسوں کو ایسے کام کا مدرسہ بناؤ اور یہی رنگ پھر ساری سماج پر چڑھاؤ تو وہ صفتیں پیدا ہوں جن کی ہمارے دیس میں بڑی کمی ہے، یعنی آدمی کا آدمی سے نباہ، اور وہ ذمہ داری جس میں سماج کا ہر کام ہر ایک کا کام بن جاتا ہے۔

ہاں، آج گاندھی جی کا یہ سوال کہ "میری کون سُنے گا؟" تم سب سے ہے۔ اُن کے کام کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اور پیارے بچو! یاد رکھو کہ گاندھی جی کی زندگی کو ہم نے ختم کیا ہے، اس لئے کہ ہمارے ہی ایک نادان بھائی نے ختم کیا ہے۔ ہم پر ان کی زندگی اور ان کا کام قرض ہے۔ ان کے اس سوال کے جواب میں اپنے دل کی زبان سے کہو کہ ہم آپ کے کام کو انجام کو پہنچائیں گے۔ اپنی زندگیاں اسی میں لگائیں گے، اس کے لئے جئیں گے، ضرورت ہوگی تو اس کے لئے مریں گے۔ ہم آپ کو زندہ رکھیں گے، اپنے خون کے ہر ہر قطرے میں، اپنی بے غرض سیوا کی مشقت کے پسینے کی ہر ہر بوند میں، آپ کو زندہ رکھیں گے۔ اپنی محبتوں میں اپنی محنتوں میں آپ کو زندہ رکھیں گے، اپنے وچاروں اور اپنے کاموں میں آپ کو زندہ رکھیں گے۔ ہم اپنی زندگی کو اور اپنی سماج کی زندگی کو ایسا بنائیں گے اور اس میں ان کے وچاروں اور ان کی روح کو ایسا رچائیں گے کہ ہماری زندگی اور ہمارے دیس کی زندگی گاندھی جی کی زندگی بن جائے۔ اس کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، ان کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ یہ دیس گاندھی جی کے جیون کی تفسیر بن جائے، گاندھی جی ہمارا دیس ہو جائیں۔

شفیع جاوید

بات کا رُوپ

جیون کی پھلواری میں جب آشاؤں کے پھول کھلے
من کی بگیا مہک اُٹھی اور پریم کے پگ پگ دیپ جلے

چندا کے اُجیارے ہیں بھی ڈگر ڈگر اندھیارا ہے
نگر نگر ڈاکو پھرتے ہیں من موہن کا سوانگ بھرے

پریت کی ریت نرالی ہے دل روتا ہے لب سلتے ہیں
نیر بہیں تو انکھیاں پھوٹیں آہ کریں تو سیس کٹے

آنسو شبنم کا ہو یا آنکھوں کا رہنے پاتا نہیں
مٹ ہی جاتا ہے دھرتی پر جب سورج کی جوت جگے

چپ بھی رہو جاوید کہاں تک بات کا روپ نکھارو گے
کیان کے موتی رولی کے جگ میں کوئی کہاں تک بھوکوں مرے

(گل فروش کراچی)

گوپی ناتھ امن

ہمہ گیر ہستی

"سیاست گندہ کھیل ہے" یہ انگریزی کا مقولہ ہے جسے موہن داس کرم چند گاندھی نے نہ صرف اپنی دلیلوں بلکہ اپنے عمل سے جھوٹا ثابت کر دیا۔ وجہ یہ ہے کہ گاندھی جی زندگی میں الگ الگ خانے نہیں ملتے تھے بلکہ اسے مسلسل بہاؤ مانتے تھے۔ سیاست، اخلاق، ان کے نزدیک زندگی میں اس طرح پروئے ہوئے تھے کہ انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بار گاندھی جی نے پرارتھنا کے بعد لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں ابھی پرارتھنا کر رہا تھا، اب جو آپ سے بات کر رہا ہوں یہ بھی پرارتھنا ہے۔ یہ بات ہمیں کبیر کے اس مقولے کی یاد دلاتی ہے کہ

جو کچھ کروں سو پوجا

ہندوستان کی سیاست گاندھی جی کے آنے سے پہلے مغربی سانچے میں ڈھلی تھی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کو الگ الگ دیکھا جاتا تھا۔ تقریر و تحریر کی خوبیاں کیرکٹر کی بلندی پر فوقیت رکھتی تھیں۔ گاندھی جی نے یہ نقشہ بدلا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا فرق دُور ہوا اور ہندوستانی سیاست ایک نئے دَور میں داخل ہو گئی۔ لوگ مذاق اُڑاتے تھے کہ یہ سچائی اور محبت کا اُپدیش سیاست میں کیسے نبھے گا۔ یہ مہاتمائی سیاست ملک کو کیسے آزاد کرائے گی۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں ملک آزاد ہوا۔ سچائی اور اہنسا کے علم بردار نے ملک کو آزاد کرایا اور خود محبت کے نام پر قربان ہو گیا۔ جوش اور جذبے کے عالم میں جان دے دینا پھر آسان ہے لیکن قربان گاہِ محبت پہ جان دینا گنے چنے مردانِ حق کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

آخر گاندھی کی شہرت کا راز کیا تھا۔ علمی اعتبار سے وہ خود کہتے تھے کہ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ مُقرر ہونے کے اعتبار سے بھی انھیں صفِ اوّل میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ چہرے مہرے کے بھی ایسے وجیہہ نہ تھے۔ پھر وہ اپنے زمانے کے مردِ اعظم کیوں کہلائے۔ اس سوال کے جواب میں ہمیں اس ماحول پر نظر ڈالنی ہو گی جس میں سے وہ گزرے۔ غدر کے بعد جب ہندوستان پر انگریزی راج مستحکم ہوا تو انگریز مدبروں کا یہ خیال تھا کہ اب اس صدی کے آخر تک انقلابی قوتیں ہندوستان میں پنپ نہ سکیں گی۔ اگرچہ ان کا خیال بالکل درست تو نہیں ثابت ہوا کیونکہ چودہ پندرہ سال بعد ہی پنجاب میں بغاوت ہو گئی لیکن یہ ضرور ہے کہ کوئی ایسی تحریک شروع نہ ہو سکی جو تمام ہندوستان پر چھا جاتی۔ انڈین نیشنل کانگریس جس صورت میں قائم ہوئی انقلابی جماعت نہ تھی بلکہ اصلاحی نوعیت رکھتی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی طفلی کا زمانہ گاندھی جی کی نوجوانی کا زمانہ تھا لیکن پچھلی صدی تک گاندھی اور کانگریس میں کوئی تعلق نہ قائم ہوا تھا۔ گاندھی کی سیاست کی بنا ہندوستان میں نہیں بلکہ افریقہ میں پڑی، جہاں وہ گجرات کے ایک مسلمان تاجر کے مقدمے میں بیرسٹر کی حیثیت سے پیروکار ہو کر گئے تھے۔ مقدمے میں تو انھوں نے باہمی تصفیہ کرا دیا لیکن ساتھ ہی دکنی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کی حالت سدھارنے کے لئے کام بھی شروع کر دیا۔ اسی کام سے اُن کی سیاسی زندگی شروع ہو گئی۔ اُن کی سیاسی سرگرمی کا میدان دوسرے ہندوستانی لیڈروں سے بہتر تھا۔ ایک ملک کے رہنے والے جب دوسرے ملک میں ملتے ہیں تو اُن میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ افریقہ میں ہندوستانی ہندو اور مسلمان زیادہ مل کر رہتے تھے۔ اس ماحول میں کام شروع کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مہاتما گاندھی کا ذہن ہمیشہ فرقہ وارانہ معاملوں میں نہایت صاف رہا۔ اُن کی زندگی باہمی اتحاد کے لئے وقف رہی اور ان کی موت بھی اسی مشن کی تکمیل کے لئے ہوئی۔

گاندھی جی کی خود نوشتہ جیونی پڑھ لیجئے، تجزیہ کر لیجئے، پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ ایک معمولی گھرانے کے آدمی نے، جس نے اپنی زندگی بیرسٹری سے شروع کی ہو اتنی اخلاقی بلندی کیسے حاصل کر لی۔ مشرق و مغرب کا جو امتزاج

اُن کی ذات میں پایا جاتا تھا اس کا صحیح اندازہ بعض لوگوں کو اُن کی لنگوٹی اور نیم برہنگی کی وجہ سے نہیں ہُوا۔ اکثر غیر ملکی مبصروں نے یہی دھوکا کھایا کہ اُن کی عظمت اُن کے سادھو ہونے کی وجہ سے ہے۔ لیکن دراصل گاندھی جی اپنے دَور کی ارتقائی منزل کا مظہر تھے جس طرح انسان تہذیب کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا جمہوریت کی منزل تک پہنچا۔ گاندھی جی نے ایک قدم اور بہت بڑا قدم آگے رکھا کہ یہ جمہوریت اہنسا (عدم تشدد) پر مبنی ہو۔ اہنسا کا اصول گوتم بدھ یا بانیانِ دین نے دنیا کے سامنے رکھا تھا۔ لیکن گاندھی جی نے اسے اجتماعی شکل دے کر لڑائی کا ایک ہتھیار بنا دیا۔ لارڈ اکرڈنگ نے گاندھی جی کے متعلق لکھا تھا کہ سیاست دان بھی دنیا میں اُن سے بڑے ہُوئے ہیں اور سنت بھی لیکن اتنا بڑا سنت سیاست دان کوئی نہیں گذرا۔ دراصل یہی گاندھی جی کی عظمت کا راز ہے۔ جو لوگ ذرا بھی عملی سیاست کی راہوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ راہیں کتنی پُرپیچ ہیں، کتنے نشیب و فراز ہیں۔ ان راہوں میں اخلاق کا بار لے کر چلنا کتنا مشکل ہے۔ گاندھی یہ بار لے کر اس منزل سے گزرا۔ منزل تو کامیابی سے طے ہو گئی لیکن بارِ اہنسا کے لئے جان لیوا ثابت ہُوا۔ منزل پر پہنچ کر اس نے دم توڑا۔ اب یہ بار دو حصوں میں تقسیم ہُوا۔ ایک حصہ نہرو نے سنبھالا اور دوسرا ونوبھاوے نے۔

دنیا کی بڑی ہستیاں بجائے خود انجمن ہوتی ہیں۔ گاندھی جی بھی ایک فرد نہیں بلکہ انجمن تھے۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس پر انھوں نے اثر نہ ڈالا ہو۔ مذہب، اخلاق، سیاست، معاشرت، معاشیات، جنسیات، غذا، لباس ہر معاملے پر انھوں نے اظہارِ رائے کیا اور ہر معاملے میں وہی کسوٹیاں تھیں، ستیہ اور اہنسا (سچائی اور محبت) انھوں نے اپنے آپ کو کبھی حق شناس نہیں کہا ہمیشہ جویائے حق کہتے رہے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ جو اپنے کو جویائے حق کہتے ہیں آپ یہ کب سمجھیں گے کہ آپ نے سچائی کو پا لیا ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ جب میرے سامنے کوئی جھوٹ نہ بول سکے۔ کتنا اونچا آدرش ہے، اتنا اونچا کہ زندگی میں اسے حاصل کرنا غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ سچائی کا معیار اُن کی نظر میں کیا تھا یہ ایک واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی نے ایک شخص سے پوچھا کہ "جاڑے میں رنگین کپڑا کیوں پہنتے ہو سفید کیوں نہیں پہنتے"؟ اس نے کہا کہ جاڑے کا کوٹ روز روز تو بدلا نہیں جاتا اس لئے سیاہ رنگ بہتر ہوتا ہے۔ سفید کپڑا تو دوسرے ہی دن مَیلا معلوم ہونے لگتا ہے۔ گاندھی جی نے کہا "یہ تو جھوٹ ہے کہ مَیلا ہو مگر مَیلا معلوم نہ ہو۔"

رنگِ مزاح

ہندوستان میں جن سنتوں نے اصلاحِ قوم کا کام ہاتھ میں لیا۔ اُن میں سے بیشتر خوش مزاج بھی تھے۔ اس ضمن میں کبیر صاحب کا نام اور اُن کے لطیفے بہت مشہور ہیں۔ گاندھی جی کے بھی لطیفے بہت ہیں۔ اُن کے ہفتہ وار اخبار میں مختلف قسم کے سوال بھی شائع ہوتے تھے اور گاندھی جی اُن کے جواب لکھا کرتے تھے۔ کالج کے ایک طالب علم نے لکھا کہ میں کیا کروں جب میں پارک میں ٹہلنے جاتا ہوں تو میری نظر خوبصورت لڑکیوں کے چہروں کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ گاندھی جی نے اسے بہت مختصر سا مشورہ دیا:۔

"کالی عینک لگا کر جایا کرو۔"

جس زمانے میں گاندھی جی دکھنی افریقہ میں بیرسٹری کرتے تھے ایک برہمن اُن کا کھانا پکایا کرتا تھا۔ اس کے نہانے کا حال انھوں نے خود نوشت سوانح عمری میں یوں لکھا ہے کہ "وہ پانی تو اپنے اوپر رونڈیلتا تھا مگر بدن کبھی نہیں دھوتا تھا۔"

گاندھی جی ہری جن فنڈ کے لئے چندہ کر رہے تھے کہ ایک مدراسی نامہ نگار نے اُن سے دستخط دینے کو کہا۔ گاندھی جی نے دستخط کئے۔ اُس نے حسبِ معمول انھیں دس روپے دئے۔ گاندھی جی نے کہا کہ دیکھو میں نے تامل زبان میں دستخط کئے ہیں۔ اس نے دس روپے اور دئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے بالکل صحیح دستخط کئے ہیں اس نے دس روپے اور دے دئے۔

۱۹۲۵ء میں جب کان پور میں کانگریس کا اجلاس ہُوا تو کچھ لوگ پنڈال جلانے پر آمادہ تھے ننگے، منتظم بہت پریشان تھے۔ جب یہ خبر گاندھی جی تک پہنچی تو انھوں نے مسکرا کر کہا کہ "ہمارے اور آسمان کے درمیان جتنا بھی پردہ ہٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

۱۹۴۶ء میں جب برطانیہ کے کیبنٹ مشن سے لیڈروں کی بات چیت ہو رہی تھی تو پنڈت مدن موہن مالوی بھی دہلی آئے۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ گاندھی جی نے اُن سے کہا کہ آپ بزرگ ہیں کیوں زحمت کرتے ہیں۔ یہ کام تو ہم نوجوانوں پر چھوڑئیے۔ اس وقت مالوی جی کی عمر ۸۵ سال اور گاندھی جی کی عمر ۷۷ سال تھی۔

اور یہ سنجیدگی

اور یہی گاندھی جب عبادت میں غرق ہو جاتا تھا تو اس کی سنجیدگی کی بھی انتہا نہ تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وقتِ آخر میری زبان پر خدا کا نام ہو۔ اور یہ حق ہو اور یہی ہُوا۔ جب قاتل نے اُن پر گولیاں چلائیں تو ان کی زبان پر آخری الفاظ "ہے رام" تھے۔ اور یہ تو وہ بہت پہلے کہہ چکے تھے۔ "ایشور اللہ تیرے نام سب کو سنمتی دے بھگوان" لیکن اُن کی شہادت کے بعد بھی یہ بات ابھی پوری طرح لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

گرندیال ملک

گاندھی جی کے ساتھ ایک سُنہری صُبح

برسوں پہلے کی بات ہے ایک دن صبح سویرے میں گاندھی جی کو پرنام کرنے گیا۔ اس وقت وہ بمبئی میں کچھ دنوں کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان کا قیام "برلا بھون" میں تھا۔ جب میں وہاں پہونچا تو اُس وقت گاندھی جی باغ میں سیر کر رہے تھے۔ میں نے انھیں پرنام کیا۔ انھوں نے میری پیٹھ پر اپنے شفقت بھرے ہاتھ سے ایسی زور سے ایک تھاپ ماری جس سے میرے سارے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ پھر اُن کی اجازت سے میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ سیر کرنے لگا۔

گاندھی جی کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے۔ پھر یکایک انھوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھا:۔ "گرندیال! کیا تم نے کبھی پتنجلی کا یوگ شاستر پڑھا ہے؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے اُسے ایک بار پڑھا تھا۔ مگر اُس میں سے سمجھا بہت ہی کم۔"

"مگر جتنا بھی تم سمجھے ہو مجھے بتلاؤ۔" گاندھی جی نے پھر کہا۔

"میں صرف اتنا ہی سمجھا ہوں کہ من کی دوڑ دھوپ جو دن رات رہتی ہے اس کے روکنے کو 'یوگ' کہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

گاندھی جی: "مگر یہ گیان صرف تمہارا ذاتی گیان ہی رہا۔ کیا تم نے اس پر کبھی عمل کرنے کی بھی کوشش کی؟"

میں نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا۔ کہ "میں نے ایسی کوشش تو ضرور کئی بار کی تھی۔ مگر یوگیوں کو جو تجربے ہوتے ہیں اُن میں سے مجھے ایک بھی نہیں ہوا۔"

گاندھی جی: "تم کیا کہتے ہو۔ تمہیں کسی قسم کا کوئی بھی تجربہ نہیں ہوا۔"

میں نے کہا۔ "شاید جو کچھ میں نے دو چار بار محسوس کیا ہے اُسے تجربہ کہا جا سکتا ہے۔"

گاندھی جی: "تم نے جو کچھ محسوس کیا ہو وہ مجھے بتاؤ۔"

پھر میں نے بڑے انکسار سے انھیں بتلایا کہ "خیالات کی لہروں کو جب کبھی ایک لمحہ کے لئے میں نے روکا ہے مجھے ایک گہری شانتی محسوس ہوئی۔ اس شانتی میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بُلاوا ہے مگر کس کی طرف سے۔ جو لامحدود ہے اُس کی طرف سے؟ پھر ہر قسم کی تنگ نظری یا تناؤ پیدا کرنے والا خیال کافور ہو جاتا ہے۔ اور پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں روشنی سے معمور ایک آسمان میں مسرت کے ساتھ اُڑ رہا ہوں۔ اس وقت میں اپنی مشکل کو اسی روشنی میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس مشکل کو حل کرنے کا راستہ بھی مل جاتا ہے۔ اس حالت میں میں اسے پربھو کی کرپا ہی سمجھتا ہوں۔"

یہاں گاندھی جی بیچ میں بول اُٹھے۔ "میں اسے اندرونی آواز کہتا ہوں۔"

اس پر میں نے اُن سے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ "مہاتما جی، تو کیا آپ مہربانی کر کے مجھے یہ بتلائیں گے کہ آپ یہ اندرونی یا غیبی آواز کیسے سُن پاتے ہیں؟"

گاندھی جی۔ "میرے لئے یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ مگر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب بھی کبھی میں نے اس اندرونی آواز کو سُنا ہے اُس وقت میرے اندر کسی قسم کا کوئی اپنا خیال، کوئی اپنی خواہش موجود نہیں ہوتی اور وہ آواز ایسی آسانی سے میرے دل کے کانوں تک پہونچتی ہے جیسے سورج کی روشنی زمین پر براہِ راست اور سیدھی پڑتی ہے۔" (اُن کے کہنے کا مطلب مجھے ایسا معلوم ہوا)

میں نے پھر پوچھا۔ "مگر مہاتما جی، اس اندرونی آواز کا کچھ تو رشتہ آپ کے کسی نہ کسی خیال یا سوال سے تو ضرور ہوگا ہی، اگرچہ آپ جب اُسے سنتے ہیں اُس وقت ایسا آپ کو کچھ بھی یاد نہ پڑتا ہو۔"

گاندھی جی۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔ مجھے خود بھی کبھی کبھی ایسا خیال آیا ہے میں

فطری طور پر سوچ بچار کا عادی ہوں۔ اسی لئے ہر ایک بات کا پورا پورا اور ہر پہلو سے خیال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر اس طرح خیال کرنے کے بعد میں کچھ وقت کے لئے ہر ایک قسم کے خیال سے خالی ہو جاتا ہوں۔ پھر مجھے عجیب قسم کی خاموشی محسوس ہوتی ہے اور اس خاموشی میں مجھے جیسے میں اندرونی آواز کہتا ہوں سُنائی دیتی ہے۔"

اسی وقت کوئی برلا بھون سے وہاں آیا اور اس نے گاندھی جی کو اطلاع دی کہ ایک صاحب ان سے ملنے کے لئے اندر آئے ہوئے ہیں۔ اس لئے گاندھی جی نے اپنی سیر ختم کر دی اور مکان کے اندر چلے گئے۔ میں نے انھیں پرنام کیا۔ ایک بار پھر اُن کا دستِ کرم میری پیٹھ پر پڑا۔ اُس تھاپ کی یاد اب تک بھی تازہ ہے۔ اور ہے بھی کیوں نہ؟

اس سنہری صبح کو گاندھی جی کی بات چیت سے جو جھلک مجھے ملی اس سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ گاندھی جی ایک ولی بھی تھے۔

خالدِ کشمیر کی رائے

آپ کے خط مورخہ ۲۳۔ اگست اور آج کل کے موسیقی نمبر کے لئے شکریہ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ یہ نمبر اس مضمون پر ایک معیاری کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یقیناً یہ ہندوستانی موسیقی کے شیدائیوں میں بہت مقبول ہوگا۔

(غلام محمد بخشی)

کشمیر میں اناج کی پیداوار

سید میر قاسم وزیر مال حکومت کشمیر نے ایک بیان میں بتایا کہ اگلے پانچ سال میں ریاست کشمیر اناج کے معاملے میں خود کفیل ہو جائے گی۔ ریاستی سرکار نے اناج کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے ایک جامع منصوبہ مرتب کر لیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت آب پاشی کے سسٹم میں توسیع کی جا رہی ہے۔ مزید غیر آباد زمین زیر کاشت لائی جا رہی ہے۔ کیمیائی کھاد کا استعمال بڑھایا جا رہا ہے اور زیادہ بہتر قسم کے بیج کسانوں میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ دوسرے پنج سالہ پلان کے پورا ہو جانے تک ریاست میں اناج کی پیداوار میں چالیس لاکھ من کا اضافہ ہو جائے گا اور اناج باہر سے منگوانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

مختارالدین احمد

فیضی کی دو تحریریں

ملا فیضی کی صرف دو خود نوشت تحریروں کا اب تک راقم کو علم ہو سکا ہے۔ ایک ذخیرۂ برلین میں اور دوسری جامعۂ علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ دونوں تحریریں دو قلمی کتابوں پر ثبت ہیں جو کبھی فیضی کے کتب خانے میں یکجا رہ چکی ہیں اور اب حوادثِ زمانہ نے انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ہے ایک مشرق میں ہے تو دوسری مغرب میں۔

۱۔ موارد الکلم، فیضی کی مشہور تصنیف ہے جو صنعتِ غیر منقوط کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا ایک بہت اچھا نسخہ کتب خانۂ برلین کے اُس ذخیرے میں جو اب ماربرگ میں محفوظ ہے دیکھنے میں آیا۔ نمبر ۳۹۴۲ ، ۵ اوراق ۱۱۹ سطور ۱۱ تقطیع خرد۔ خط نسخ

کاتب کا نام اور ترقیمہ درج نہیں۔ پوری کتاب فیضی نے خود پڑھی ہے اور جا بجا اغلاط کی تصحیح کی ہے۔ مقدمہ کی پہلی سطر: "قال العبد المفتقر ابو الفیض بن مبارک بن خضر" کو قلم زد کر کے فیضی نے: "قال المستفیض المستفی ابو الفیض فیضی" بنا دیا ہے۔

موارد الکلم کا یہ نسخہ فیضی نے مولانا صدرالدین شیرازی کو پیش کیا ہے اور سرورق پر اس نے اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی ہے:

هو الفیاض

"جعلت هذه الرسالة تذكرة للأخ الأعز الاجل
صاحب النثر الفائق والنظم الرائق الفائز بالسلوک
التحقیقی والمجازی مولانا صدر الدین محمد العیدی الشیرازی
سلمه الله وأبقاه۔

نمقه العبد ابو الفیض فیضی فی ربیع الأول لا زال
معفراً کاول الربیع سنة ثمان وثمانین وتسع
مائة"

ایک دوسری جگہ یہ عبارت ملتی ہے:

"منقه العبد الاقل ابو الفیض فیضی افاض الله
علیه فیوضه۔"

نسخے کا سال کتابت معلوم نہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس کی کتابت ۹۸۸ھ سے پہلے ہوئی ہے۔

یہ نسخہ مخطوطات کے ایک بڑے قدردان ابوبکر بن رستم بن احمد الشروانی کے کتب خانے میں رہ چکا ہے۔ جن کے کتب خانے کی بہت سی کتابیں بشمول مشرق اوسط اور یورپ کے کتب خانوں میں راقم کی نظر سے گذری ہیں۔

۲۔ دوسری کتاب، خواجہ حمد اللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ ہے جس کے سرورق پر فیضی کی تحریر، دستخط اور مہر موجود ہے۔ تحریر یہ ہے۔

"مالک هذا التاریخ النجیب العجیب بالمبتة الصحیحة۔
الشرعیة ابو الفیض فیضی"

اسی صفحے پر دوسری جگہ اس کے دستخط ہیں۔ "ابو الفیض فیضی" مہر میں بھی "ابو الفیض فیضی" صاف پڑھا جاتا ہے۔ یہ نسخہ سرسید[۲] کے کتب خانے کا ہے اور اب جامعۂ علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

فیضی کی اہمیت کے پیش نظر اس کی تحریروں کے عکس شائع کئے جا رہے ہیں۔

ماربرگ، جرمنی — ۵ر جنوری ۱۹۵۵ء

فراق گورکھپوری

نیا ہندستانی کلچر اور اُردو ادب

قدیم ہندستان کے مختلف ادوار یا جگوں کا تمام کلچر وسطی دَور یا منجھلے زمانے کے ہندستان کا تمام کلچر پھر پچھلے سو برسوں کا یا ہندجدید کا کلچری سرمایہ ابھی تک اردو ادب میں کسی تخلیقی حد تک سمویا نہیں جا سکا ہے۔ اردو زبان و ادب کے آغاز سے اب تک ہندستان کی تاریخ کو اطمینان کی سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ اور ہماری سماجی، اقتصادی، سیاسی، ذہنی و علمی زندگی اپنے تاریخی ورثوں کو لے کر اُبھرنے نہیں پائی تھی۔ پھر یہ حقیقت بھی بڑی اہم ہے کہ صرف ہندستان کے مختلف جگوں یا زمانوں کے کلچر سے نیا ہندستانی کلچر مرتب نہیں ہو سکے گا۔ نئے ہندستانی کلچر میں قدیم و جدید آفاقی کلچر کے عناصر کو بھی سمونا ہوگا جس میں یورپ کے کلچر کو اپنانے بغیر نئے ہندستانی کلچر کی تعمیر ناممکن ہوگی۔

ان پڑھوں ہی میں تو سب عوام ہی عوام ہوتے ہیں لیکن پڑھے لکھوں میں بھی عوام و خواص ہوتے ہیں۔ اور خواص میں بھی دماغ و مزاج و مذاق کے لحاظ سے کئی طبقے ہوتے ہیں۔ غالب و ذوق اس لحاظ سے ایک طبقے کے افراد نہیں تھے نہ پریم چند و رتن ناتھ سرشار، نہ شبلی و محمد حسین آزاد، نہ امیر مینائی و شاد عظیم آبادی۔ لیکن اس تفاوت سے یہ ضروری نہیں کہ کام بگڑنے لیکن جن لوگوں کے نام مثالاً میں نے گنوائے ان میں سے ہر ایک کا کلچری سرمایہ اُس کے مقابلے میں ناکافی تھا۔ جس کلچری سرمائے کی ضرورت آج ہے یا جس کلچری سرمائے کا مطالبہ نیا ہندستان کرے گا۔

اُردو ادب نئے ہندستانی کلچر کی تخلیق و تعمیر میں جبھی نمایاں اور بھر پور حصہ لے سکیں گے جب ہماری زندگی میں کچھ حالات رُونما ہوں۔ مثلاً لگ بھگ دو کروڑ آدمی اردو میں خاصی قابلیت پیدا کریں۔ اس دو کروڑ کی تعداد میں بہت بھاری اکثریت یعنی پچانوے فی صدی اس قابل ہو کر پریم چند، آزاد شبلی، عصمت چغتائی، چکبست، میر، نظیر اکبرآبادی، رتن ناتھ سرشار، انیس اکبر الٰہ آبادی، جوش ملیح آبادی، داغ و امیر اور اسی طرح کے دوسرے لکھنے والوں کی تصنیفوں کو سمجھ سکیں یا جیسے اچھے رسالے اُردو میں آج کل ہند و پاک سے نکل رہے ہیں انھیں سمجھ سکے۔ دو کروڑ آدمیوں میں اندازاً پانچ فیصدی دُنیا بھر کے قدیم و جدید ادبیات و علوم سے اچھی خاصی واقفیت رکھیں سنسکرت یونانی، لاطینی زبانوں کے بھی کچھ جاننے والے ہوں۔ یورپ کے گزشتہ پانچ سو برس کا فکری، علمی، ادبی سرمایہ جن کے پلّے پڑ چکا ہو۔

اس طرح کا جب ایک اردو داں و اردو خواں سماج وجود میں آ چکے گا تو اسی سماج سے سو ڈیڑھ سو ایسے افراد اُٹھیں گے جن کے ادبی و تخلیقی کارنامے اس ٹکر کے ہوں گے کہ ہندستان، ایران، روم، فرانس، انگلستان، جرمنی، روس یعنی ایشیا اور یورپ کے بڑے سے بڑے علمی و ادبی امر شاہکاروں کی ڈبلیری کر سکیں گے۔ وہ وزن اور گمبھیرتا جو قدیم یونانی ڈراموں، نظموں، افلاطون و ارسطو کی تصنیفوں میں موجود ہے۔ جو ورجل، والمیک، فردوسی، دانتے، گیٹے، کالی داس، بھو بھوتی، ویاس، شکسپیر، ملٹن، ورڈ سورتھ اور انگلستان و دیگر ممالک کے دوسرے عظیم شعرا و یا اس پایہ کے نثر نگار جیسے پلوٹارک، اسپنسر، بیکن، ہیزلٹ، رسکن، وکٹر ہیوگو، بالزاک، تالستائی گورکی، ترگنیف، برنارڈ شا، ایچ جی ویلس، اڈورڈ کارپنٹر میں پائی جاتی ہے۔

تاریخ، سماجیات، سیاسیات، فلسفہ، سائنس کی عظیم ترین کتابوں سے ٹکّا کھانے والا ادب اور ان کی تمام خوبیاں اور روشنیاں دینے والا ادب اسی حالت میں پیدا ہو سکے گا جب اردو داں و اردو خواں سماج

میں پانچ فی صدی اتنی ہی بلند تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں جیسے آج ترقی یافتہ ممالک میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم سمجھا جاتا ہے۔

جب ہم اب تک کے اردو ادب کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہ سوال ہمارے دلوں میں اُٹھے بغیر نہیں رہتا کہ میر، غالب، اقبال، جوش اور ایک آدھ دوسرے اُدبا کو چھوڑ کر ہمارے اُدبا کا عقلی و جمالیاتی شعور، اور ان کے محسوسات، پھر اُن کی فنی صلاحیتیں ان کے یہاں یہ سب باتیں کیوں اتنی سکڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے اردو ادیب بہت کم ایسے گزرے ہیں۔ جن کا نام شرقی، مولانا روم، تلسی داس، ٹیگور، سورداس، کبیر یا پھر برک، امرسن، ٹامس ہارڈی، ہیگل، کانٹ، برگساں، کروچے، ہیولاک ایلیس، آئن شٹائن، ٹامس مان، برٹرنڈ رسل یا پھر ہمارے ہی ملک کے بلند ترین علماء، سائنس دانوں، فلاسفروں اور دیگر برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ لیا جا سکے۔ ہم اتنے چھوٹے کیوں ہیں۔ ہمارے قابلِ عزّت ادیبوں کو بھی قد آور بننے کی ضرورت ہے ورنہ نیا اردو ادب نیا ہندستانی کلچر بنانے میں بہت کم مدد ہو سکے گا۔

خود رو درخت کی طرح اگر ہمارے صفِ اوّل کے ادیب نشو و نما حاصل کرنے کا خواب دیکھیں گے اور ہندستان میں جسے آج اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بدنصیبی سے سمجھا جا رہا ہے۔ اگر وہی سستی اور نکمّی تعلیم ہمارے ذہین سے ذہین دماغوں کو ملتی رہی تو ہمارے کلچر کا مستقبل بہت دھندلا رہے گا۔ ہمیں علماء ادب Humanists کے اسکواڈوں Squads کی ضرورت ہے۔ ہمیں اہلِ بصیرت پڑھنے والوں، بلند نقّادوں اور اس سے وسیع تر بلند تر و مختلف معنوں میں عظیم شاعروں اور تخلیقی مزاج کے فن کاروں کی ضرورت ہے جنھیں ہم اب تک پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ ہم کو اپنے گھٹیا پن کا خاتمہ کرنا ہے۔ یہ مسئلہ صرف اردو ادب کو درپیش نہیں ہے ہندستان کی ہر زبان کے ادب کو درپیش ہے۔ ہم کب شدت سے اس امر اور اس حقیقت کو محسوس کریں گے کہ ہماری اعلیٰ ترین تعلیم گھٹیا ہے۔

اُردو میں یا ہندستان کی کسی زبان میں جنھیں بلند ترین ادب کی تخلیق کرنا ہے۔ ان بلند فن کار ادیبوں کی زندگی قوم کی سب سے قیمتی امانت ہے۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنا چاہئیے کہ جن لوگوں میں بلند ادب تخلیق کرنے یا اہم علمی کتابیں لکھنے کی صلاحیت ہے وہ ناموافق حالات کے شکار ہو کر نہ رہ جائیں۔ انھیں یکسوئی کے ساتھ مشاہدہ، مطالعہ، غور و فکر کرنے کی سہولتیں ہوں۔ انھیں نیا ہندستان یا مستقبل قریب کا ہندستان وہ تمام تعلیمی و اقتصادی مواقع فراہم کرے جو مثلاً انگلستان میں نیوٹن، ڈارون، شیکسپیئر، ملٹن، ٹامس وردی

اور دیگر اکابرِ علم و ادب کو نصیب تھے۔ ہندستان میں ایک فرصت یافتہ طبقہ Leisured Class رہا ضرور ہے لیکن علم دوستی اور کلچر سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہمیں ایک ایسا نیا فرصت یافتہ طبقہ پیدا کرنا ہے جو علمی و ادبی تحقیق میں زندگی بھر لگا رہے۔ ایسا طبقہ ہزارہا افراد پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ یہ بلند ادب کے پڑھنے اور سمجھنے والوں کا طبقہ ہوگا اور عموماً انھیں ہزارہا افراد میں سے دو چار بلند ادب کے خلّاق و مصنفین ہوں گے۔ اس طبقے کے شعور کا افق وسیع، بلند اور تابناک ہوگا۔ ان کے مغزوں اور روحوں کے کیمیاوی عناصر بیش بہا ہوں گے۔ ہر دور کے آفاقی ادب اور آفاقی کلچر کو ہضم کرنے کی اس طبقے کے افراد میں صلاحیت ہوگی۔ ان کے محسوسات و وجدانیات مشاہیرِ عالم کے محسوسات و وجدانیات کے ہم پلہ ہوں گے۔ اس طبقہ کے افراد قوم کی دماغی زندگی کی پستی کو دور کر سکیں گے۔

جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے لکھنے والوں کی ایک خاصی تعداد اُمید افزا کوششوں کی مثالیں پیش کر رہی ہے۔ ہندستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان میں بھی کئی شعراء اور افسانہ نگار ایک ایسے Humanism یعنی انسانی تہذیب کی مثالیں اپنی تخلیقوں میں پیش کر رہے ہیں یا ایسا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں ہندستانی اور آفاقی کلچر، رجائی اور انقلابی کلچر، قدیم و جدید کلچر کا سنگم نظر آتا ہے۔ یہ ادیب اقبال کی ملّت پرستی سے بے نیاز ہیں۔ ٹیگور اور پریم چند گپتا اور مولانا روم اور جدید عالمی ادب کی پاکیزہ لامذہبیت Secularism سے ان کے دل و دماغ ہم آہنگ ہیں۔ ان کا شعوری عنصر، ان کا فنی ضمیر، ان کا نظریۂ زندگی ہندستانیت اور آفاقیت کے صحیح امتزاج کا حامل ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہزارہا پڑھنے والے بھی اپنے دل کی باتوں اور اپنے رجحانات اور آہستہ آہستہ جنم لینے والے نئے ہندستان کی روحانی و نفسیاتی تحریکات کی ترجمانی اردو کے نئے ادیبوں کی آواز میں سن لیتے ہیں۔ ہماری تعلیم کی کمیوں، خرابیوں، لاپروائیوں اور کس مپرسی کے باوجود یہ حالات رونما ہو رہے ہیں۔ اگر ہماری اعلیٰ تعلیم کی کمزوریاں دور ہو جائیں اور متوسط طبقے کے مالی حالات ذرا بہتر ہو جائیں ہماری اقتصادی زندگی صحت مند ہو جائے تو اردو ادیب جو اچھا کام کر رہے ہیں اس سے بھی بلند و بہتر کام کریں گے اور ہندستان کے نئے کلچر کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے۔

اُردو زبان و ادب میں فطری طور پر اچھی روایتوں کے احترام کے ساتھ ساتھ ہماری بدلتی ہوئی تاریخ کو اپنانے اور اسے آگے بڑھانے کی خاص صلاحیت

یہی اُردو کا اصل مواج ہے۔ اُردو کا شعورِ حیات و کائنات بہت جاندار و مہذب ہے۔ اردو دورِ حاضر میں ہماری متحرک اور بدلتی ہوئی زندگی میں ایک اہم تاریخی قوت بن سکتی ہے۔ اُردو ادب ہندستان کے دوسرے ادبوں کی کارواں سالاری کر سکتا ہے اُردو ادب نئے ہندستان کا صحیح ترین ترجمان بن سکتا ہے۔ اُردو کے اسلوبہائے بیان میں حیات اور بہتی قوتیں ہیں۔ اردو الفاظ میں ایک چوکنا پن ہے۔ ان میں ہوشیاری کے جیتے جاگتے عناصر ہیں۔ ان میں عطارد کے پر لگے ہوئے پاؤں کی سبکی ہے ان میں وزن کے ساتھ ساتھ لمس کا ایسا ہلکا پن Lightness of Touch ہے کہ ملک کی دوسری زبانیں بولنے والے ٹوٹے پھوٹے طور سے بھی اُردو فقرے سن کر پھڑک جاتے ہیں۔

مستقبل قریب کے اردو ادب میں اردو ادب کے ہونہار پھول اور بھی چمک اُٹھیں گے۔ کچھ پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ آج کے اردو ادب میں ایک پاکیزہ مہذب اور سہانی ارضیت Earthiness آ چلی ہے۔ اُردو کی شعوری گرفت ہمارے بدلتے ہوئے ماحول پر روز بروز مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ اردو کی آواز میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہو چلی ہے۔ اُردو داں طبقہ ایک عارضی یاسیت کے دھندلکوں کے آر پار دیکھنے لگا ہے۔ کہر چھٹتا چلا جا رہا ہے۔ اردو ادب نے ہندوستان کی زنگارنگ زندگی کو اپنے آغوش میں بھینچنا شروع کر دیا ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر کچھ لوگ یہ دکھ بیٹھیں کہ آج کا یا مستقبل کا بلند ترین اردو ادب صرف بلند طبقہ یا اعلیٰ تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی وراثت و ملکیت ہوگی۔ شیکسپیئر، برنارڈ شا، ابسن، ٹامس وردی، ایچ جی ویلس، اسکاٹ ڈکنس، حافظ، تلسی داس، ٹیگور، وکٹر ہیوگو، ایٹس، فردوسی ان سب کا ادب بہت بڑی حد تک عوام کی بھی ملکیت ہے۔ لیکن ان کے ادب کی تخلیق کے لئے غیر معمولی علمی تبحر لازمی چیز ہے۔ عوام اپنی لامحدود لیاقت سے ان کے ادب کو سمجھ سکتے ہیں اور اس سے روشنی و زندگی حاصل کر سکتے ہیں لیکن عوام اپنی محدود لیاقت سے ایسا ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ پھر صرف مطالعۂ ادب کرنے والوں کا بھی ایک ایسا گروہ ہونا چاہیئے جو بلند ترین ادب کو عوام کے مقابلے میں زیادہ روشن طریقے پر سمجھے اور ایسا مطالعہ کرنے والے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جیسے شکسپیئر کے بلند تعلیم یافتہ مطالعہ کرنے والوں میں بریڈلے یا شکسپیئر کے دوسرے بصیرت افروز تنقیدیں لکھنے والے شارحین و مفسرین۔ بلند ترین خلاقانہ ادب پیدا کرنے والے اور اس ادب پر بلند ترین عالمانہ و خلاقانہ تنقیدیں و شرحیں لکھنے والے بھی کافی تعداد میں پیدا ہو سکیں گے۔ جب ہمارے ملک کی ابتدائی تعلیم اور تعلیمات عالیہ دونوں کی سطحیں جیسی آج ہیں اس سے بہت زیادہ بلند ہو جائیں۔

عبدالباری آسی مرحوم

غزل

نظر میں، دل میں، تخیّل میں جگمگائے جا
چراغِ خانۂ آشفتگی جلائے جا

جنونِ شوق کو اک راستہ بتائے جا
فریبِ وعدۂ فردا سے مسکرائے جا

کرم بشکلِ ستم یا ستم بشکلِ کرم
وہ کوئی رنگ سہی دل کو دل بنائے جا

شراب آگ ہے ساقی یہ جانتا ہوں مگر
بنا کے آگ کو پانی مجھے پلائے جا

سکون جس کا لیا نام ہمنشیں تو نے
کہاں ہے، کون ہے، کیا ہے ذرا بتائے جا

زمیں فریبِ تماشا فلک فریبِ نظر
فریب ہی کی ہے دنیا فریب کھائے جا

کہیں شکیب، کہیں حسرتیں کہیں آنسو
وفا کی راہ میں جو کچھ ملے لٹائے جا

فنا مآلِ بقا ہے بقا مآلِ فنا
سمجھ سے کام لے اور فائدہ اٹھائے جا

یہ میرا فرض کہ میں تجھ کو ڈھونڈنے نکلوں
یہ تیرا کام کہ رستہ مجھے بتائے جا

فریبِ وعدۂ مبہم کا واسطہ تجھ کو
کہ انتظارِ تمنا کو آزمائے جا

سفر لیا ہے تو ہمت نہ ہار تھک کے نہ بیٹھ
بہت قریب ہے منزل قدم بڑھائے جا

نگاہ منتظرِ اُس مَے کدہ کی ہے اے آسی
کہ وہ پلائے مجھے میں کہوں پلائے جا

باسط بھوپالی

غزل

مشاہدات کی منزل ہے تا حدِ ادراک
خرد سکوت میں ہے مصلحت گریباں چاک

سوادِ شامِ الم اور رات ہیبت ناک
رُکی رُکی نظر آتی ہے گردشِ افلاک

فلک تو کیا سرِ عرشِ عظیم بھی نہ ملے
ستارے ڈھال رہا ہے جو دیدۂ نمناک

جہانِ نور کو دیکھا ہے جس نے سر بسجود
جہاں جہاں کہ نمایاں ہوئی حقیقتِ خاک

تمہارے حسنِ تمنا طلب نے کیا پایا
اگر نگاہِ محبت نہ ہو سکی بیباک

ابھی تلک اُس کو سرِ شکِ حیا دھو نہ سکے
کبھی خوشی نے ملی تھی جو میرے منہ پہ خاک

نہ پی سکیں تو بہارِ چمن پہ کیا الزام
مئے حیات تو ڈھلتی رہی ہے تاک بہ تاک

وہ زندگی نہیں جو جس کو زندگی سے گریز
وہ دل ہی کیا جو ہے لوثِ آرزو سے پاک

خزاں سے شکوۂ بربادیٔ چمن بھی درست
مگر بہار نے گلشن میں جو اڑائی خاک

چمن میں ہم نے بنایا ہے آشیاں باسط
ہمیں سمجھتے ہیں کچھ قیمتِ خس و خاشاک

کی طرف سے شائع کرنے کا امتیاز بخشا گیا ہے۔ آج کل (اُردو) واحد غیر ریاستی رسالہ ہے، جس نے کشمیر کے اُردو ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت میں دلچسپی دکھائی ہے۔[1]

اسی طرح آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس اور اُردو مجلس میں نہایت ہی شاذ و نادر ہی کشمیری ادیب کی کوئی تخلیق نشر کی جاتی ہے۔

اُردو اصولی طور پر ریاست میں ذریعۂ تعلیم تو ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ وزارت تعلیم ہائی سکولوں تک ٹیچر بھرتی کرتے وقت یہ بات کو یقینی بنائے کہ وہ اُردو رسم الخط سے واقف ہیں اور دوسرے یہ کہ واقعی سکولوں میں اُردو کو اس کے منظور شدہ رسم الخط میں ہی پڑھایا جاتا ہے۔

اُردو کیلئے اچھی درسی کتابوں کی دستیابی ایک مسئلہ ہے۔ خاص طور پر معلومات عامہ، جغرافیہ، تاریخ، سائنس، ریاضی اور اسی قسم کے مضامین میں۔ اکثر صورتوں میں جب بچوں اور استادوں کو اردو میں اس قسم کی کتابیں نہیں ملتیں تو وہ انگریزی یا ہندی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کا تدارک اُردو میں بہتر اور با تصویر درسی کتابوں کی طباعت سے ہو سکتا ہے اور امید ہے کہ مرکزی اُردو بورڈ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں نبھائے گا۔

اسی طرح اُردو اصولی طور پر دفتروں کی زبان ہے لیکن عملی طور پر یہ دفتروں کے ایک فی صدی سے زیادہ کام کے لئے استعمال نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں گوال کمیٹی کے سامنے تجویز پیش ہوئی تھی کہ وزیر اعلیٰ کے سکریٹریٹ میں ایک اعلیٰ سطح کے افسر کی اسامی وجود میں لائی جائے جس کا کام موجودہ دفاتر میں اُردو کے استعمال کے بارے میں ہدایات دے اور ان کی تعمیل کی نگرانی کرے۔

دفاتر میں اردو کے استعمال اور ترویج میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ابھی تک اُردو ٹائپ رائٹر آسان نہیں بنایا گیا۔ کاش ضرورت یہ ہے کہ اُردو کے مرکزی ادارے ایک ایسا ٹائپ رائٹر اختراع کرنے کی طرف توجہ دیں۔ اس کے بعد مقامی کلرکوں کو اس کے استعمال کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ یہ بڑی حد تک دفاتر کا مسئلہ حل کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

محکمۂ اطلاعات کے لئے اُردو میں کام کاج کرنا اشد ضروری ہے۔ اس محکمے میں انگریزی کی بجائے اُردو میں اشاعت کو اولین ترجیح دی جانی چاہئے اور اُردو میں پریس ریلیز، کتابچے وغیرہ شائع کرنے کو لازمی بنا دیا جانا چاہیئے۔ محکمہ میں اُردو کا ایک الگ شعبہ منظم ہونا چاہئے جس میں اعلیٰ صلاحیت کے ایڈیٹر، مترجم، مصور اور خوش نویس بھرتی کئے جائیں۔ ماہنامہ "تعمیر" کی تجدید بھی ضروری ہے۔

ریاست میں اُردو اخبارات کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی اپیل ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود ہے جو بڑے سرمایہ کاروں اور کارخانوں سے تقریباً خالی ہے۔ لہٰذا انہیں نفع بخش اشتہارات نہیں ملتے۔ ضرورت یہ ہے کہ مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات ان چھوٹے اخبارات کو پروان چڑھانے کے لئے انہیں زیادہ اشتہارات دے اور مقامی معاملات میں ان میں شائع شدہ مراسلوں اور آراء کو زیادہ سنجیدگی سے وزن و وقار عطا کرے۔

اُردو اخبارات کو عموماً اور اُردو لکھنے والوں کو ریاست میں اب ایک اور مسئلے کا سامنا ہو رہا ہے۔ یہاں اچھے خوش نویسوں کا فقدان ہے۔ ثقافی کلچرل اکادمی نے کچھ عرصہ پہلے خوشنویسی کے لئے ایک تربیتی کورس منعقد کیا تھا اور لکھنؤ کے بعض ماہر فن خوشنویسوں کے علاوہ کشمیر کے چند پرانے سال خوشنویسوں سے تیس چالیس نوجوانوں کو تین چار مہینے تک اس فن میں تربیت دلوائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ اچھے کاتب میدان میں آگئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اکادمی فن خوش نویسی کا ایک سکول شروع کرے جو اُردو کی کل ضرورت کو بھی پورا کر سکتا ہے۔ اسی طرح ریاست میں ابھی تک لیتھو میں طباعت کا کام ہوتا ہے لیکن یہاں کے کارکنوں کو سنگ سازی کی کوئی مہارت نہیں ہے نتیجہ یہ ہے کہ مقامی طور پر اُردو کی چھپائی بھدی اور بدنما ہوتی ہے بہتر ہوتا اگر حکومت تمام مطابع کے لیے یہ لازمی قرار دے کہ وہ تربیت یافتہ سنگ ساز ملازم رکھیں۔

ریڈیو کشمیر سے اُردو میں اگرچہ کچھ پروگرام نشر ہوتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں ریاست کے واقعی اچھے اُردو ادیبوں کو شاذ ہی شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیشن میں اس وقت اُردو کے پروڈیوسر کا عہدہ خالی پڑا ہوا ہے۔

کشمیر میں اُردو کو جائز مقام دلانے اور اس کی ترویج کا کام انجام دینے کیلئے مقامی اُردو ادیبوں کی ذمہ داریاں بھی کچھ کم نہیں ہیں اور ان کے مسائل اور جذباتی کیفیت سے قطع نظر انھوں نے یہ ذمہ داریاں انجام دینے میں زیادہ سرگرمی بھی نہیں دکھائی ہے۔ اگر ریاست میں اُردو کی کوئی ترجمان منظم ہوتی تو حکومت کی کوتاہیوں پر بھی گرفت کر سکتی تھی اور مختلف اداروں کو بھی جواب دہ بنا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ریاستی اور مرکزی ادارے ایسی تنظیموں کو جو گرانٹ دے رہے ہیں ان سے بھی یہ تنظیم فائدہ اٹھا کر اُردو کا کاز آگے بڑھا سکتی تھی۔ وہ یہاں پہ غیر کشمیری اُردو ادیبوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ اس مسئلے میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) ریاست میں اپنی شاخ منظم کرنے کی طرف توجہ دے۔

[1] آجکل میں وقتاً فوقتاً کشمیری قلموں کے منظومات بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آجکل کے جون ۱۹۹۹ء اور فروری ۲۰۰۰ء میں کشمیر سے متعلق خصوصی شمارے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ ادارہ

بقیہ: گجرات میں اُردو

کہ کوئی کوشش نہیں کی۔

آزادی سے قبل گجرات کے مختلف شہروں میں ہی نہیں بلکہ مختلف دیہاتوں میں اُردو کی لائبریریاں قائم تھیں اور پبلک لائبریریوں میں اُردو کا سیکشن بھرا پُرا نظر آتا تھا۔ بڑودے کے مہاراجہ سیاجی راؤ نے اپنی ریاست میں بنیادی تعلیم کو فرض قرار دیا تھا اور ریاست کے ہر گاؤں میں لائبریریوں کا جال پھیلا دیا تھا بڑودے کی سینٹرل لائبریری کا اُردو سیکشن پورے گجرات میں سب سے زیادہ متموّل مانا جاتا تھا لیکن یہ سب گئے گزرے زمانے کی باتیں ہیں۔ پبلک لائبریریوں میں اُردو سیکشن یا تو بند ہو گئے ہیں۔ یا سوکھتے جا رہے ہیں۔ لائبریری اس لئے اُردو کتابیں نہیں خریدتی کہ اس کے پڑھنے والے نہیں۔ اُردو پڑھنے والے لائبریری کے ممبر اس لئے نہیں ہوتے کہ وہاں اُردو کتابیں نہیں ملتیں۔ احمد آباد کی پبلک لائبریری نے اپنے دیرینہ جمود کو حال ہی میں توڑا ہے اور نئی اُردو کتابوں کا معتدبہ ذخیرہ خریدا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُردو داں طبقہ اُردو کی کتنی سرپرستی کرتا ہے۔ سب سے خستہ حالت تو خود گجرات یونی ورسٹی کی لائبریری کے اُردو سیکشن کی ہے یونی ورسٹی کے کتب خانے میں جتنی اُردو کتابیں ہیں اس سے کہیں زیادہ اور کہیں بہتر ذخیرہ تو احمد آباد کے بعض لکھنے والوں کے شخصی کتب خانوں میں مل جائے گا۔

ریاست گجرات میں اُردو محض ایک اقلیت کی زبان ہے۔ ریاست کے کسی محکمہ میں اُردو میں کوئی کام کاج نہیں ہوتا۔ ریاست کی طرف سے اُردو میں کوئی خبرنامے اور رسائل شائع نہیں ہوتے۔

گجرات میں اُردو پھلے پھولے اُس کے لئے سب سے پہلا کام تو یہ کرنا ہے کہ اُردو داں طبقے میں اُردو پڑھنے سے ملازمت نہ ملنے کا جو خوف پیدا ہو گیا ہے اسے دور کیا جائے۔

اُردو کی ترقی کے لئے دوسرا کام ادبی اور تہذیبی محاذ پر یہ کرنا چاہئے جب تک اُردو داں طبقے کو اُردو کی معیاری کتابیں سستے داموں فراہم نہیں کی جاتیں تب تک لوگ اُردو ٹھیک سے نہ تو بول سکیں گے اور نہ لکھ سکیں گے۔ پیپر بیک سے کتابوں کی دُنیا میں جو انقلاب آیا ہے اُسے زیادہ وسیع پیمانے پر اُردو میں روشناس کرنے کی ضرورت ہے۔ اُردو کی ترقی کے لئے نہ تو سرکاری وظیفوں کی ضرورت ہے نہ انعامات اور اعزازات کی، بلکہ عوام کی سرپرستی کی۔

●●


حامد حسین


محمد مجیب


ساغر نظامی


منوہر سہائے انور


گوپی ناتھ امن لکھنوی


غلام ربانی تاباں


عرش ملسیانی


شمیم کرہانی


جگن ناتھ آزاد


ہنسراج رہبر


گوپال متل


محمد حسن


حمیدہ سلطان


صالحہ عابد حسین


سلام مچھلی شہری


خواجہ احمد فاروقی

دہلی میں اردو


قمر رئیس


گوپی چند نارنگ


بلراج کومل


راج نرائن راز


مائی


شارب ردولوی

اُردو دہلی اور اس کے نواح میں بولی جانے والی کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ اور دہلی ہی اس اُردوئے نصرت شعار کا گھر ہے۔ ممکن ہے بعض ماہرین لسانیات کے نزدیک یہ امر نزاعی ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہوگا کہ اُردو ادب کی ابتدا، نشو ونما اور بلوغ کی تاریخ کی بیشتر کڑیاں دہلی ہی سے منسلک ہیں۔ طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو دہلوی (تیرھویں صدی عیسوی) اردو کے پہلے شاعر ہی نہیں بلکہ انہیں اس کے مخترع کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔ ان کی پہیلیاں، مکرنیاں، انملیاں اور دوہرے آج بھی مشہور ہیں۔ حضرت امیر خسرو اور دہلی کے قدیم شعرائے اُردو کے درمیان تین صدیوں کا فصل ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے، جس میں زبان نیز شعر وادب کا مرکز دکن رہا۔ ولی دکنی کے کلام کی اشاعت سے مرکز شاعری دہلی کو منتقل ہوگیا۔ ولی کا سادہ، صاف اور فصیح کلام قدیم شعرائے دہلی کے لئے نمونہ بنا۔ شاہ حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) شاہ مبارک آبرو (متوفی ۱۷۵۰ء) سید محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون (متوفی ۱۷۴۵ء) نے ولی کے تتبع سے شاعری کی۔ اس دور کے دوسرے شعرا جان جاناں، مصطفےٰ خاں یک رنگ، میر عبدالحیٔ تاباں، اشرف علی فغاں وغیرہ ہیں۔ اسی دور ارتقا نے دیکھا کہ دکنی کے اثرات دھیرے دھیرے کم اور پھر ختم ہو رہے ہیں۔ زبان صاف ہو رہی ہے۔ فارسی ترکیبیں اور خیالات شاعری میں جگہ پا رہے ہیں۔

تدریجی ترقی کا ایک اور مرحلہ شروع ہوا مطلع ادب پر میر تقی میر اور سودا نمودار ہوئے۔ ان شعرا نے شاعری کو درجۂ اعتبار بخشا۔ زبان نے بیان کو وسعت دی۔ اسے حسن ادا، جدت خیال، حلاوت زبان اور قدرتِ الفاظ سے روشناس کرایا۔ ان کے ہم عصر مرزا مظہر جان جاناں، میر درد، سوز، یقین، قائم، بیان، قدرت، ضیا اور دوسرے شعرا تھے۔ اس عرصے میں نئی نئی تشبیہوں، صنائع بدائع اور استعاروں نے اشعار میں راہ پائی۔ غزل اور قصیدے کا سکہ رواں ہوا۔

اُردو شاعری کا ایک دوسرا دور انشا، مصحفی کے ساتھ شروع ہوا۔ اس دور میں شاعری معاملہ بندی بنی، ریختہ ریختی ہوئی۔ غزل کے ساتھ مثنوی اور قصیدے کا چلن عام رہا۔ اگلا دور ذوق، غالب، مومن اور ظفر سے موسوم اور متمیز ہے نیز انتہائی سیاسی وسماجی انتشار کا ہے۔ شعرائے دہلی نے فرخ آباد، عظیم آباد، مرشد آباد، حیدر آباد کا رُخ کیا۔ تاہم انیسویں صدی کے اواخر سے ۱۹۴۷ء تک دلی جن دوسرے نامور شعرا اور ادبا کا مرکز ومسکن رہا۔ ان میں داغ دہلوی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، میر مہدی مجروح، میر محمد حسن دہلوی، بیان، بےملال آشوب، سر سید احمد خاں، مولوی سید احمد، لالہ سری رام، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، جوالا پرشاد برق، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، مخمور دہلوی، آغا شاعر قزلباش، حسن نظامی، ابتدا یعنی وغیرہ شامل ہیں۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں اُردو ہندی اور پنجابی سبھی کو ہندستانی کا نام دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے کسی بھی زبان کے بولنے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دہلی میں اُردو مادری زبان والوں کی تعداد ۱۵۲۲۴۰ تھی جو کل آبادی کا ۶ء۵ فیصدی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اردو مادری زبان والوں کی تعداد اضافہ کے بعد ۲۰۰۱۳۲ ہوئی تھی جو دہلی کی کل آبادی یعنی ۴۰۶۶۰۰۰ کا ۵ء۰۴ فیصدی ہے۔ لیکن مرکزی نظم ونسق والے علاقے دہلی میں اردو بول، لکھ اور پڑھ سکنے والوں کی تعداد مذکورہ تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس علاقہ میں پنجابیوں کی آبادی کافی ہے اور پنجابی بالعموم اُردو لکھ پڑھ اور بول سکتے ہیں۔

تعلیمی سہولتیں

اس وقت دہلی میں پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کا میڈیم ہندی، اُردو، بنگالی، پنجابی وغیرہ ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی بارھویں رپورٹ (برائے جولائی ۱۹۶۹ء تا جون ۱۹۷۰ء) کے مطابق دہلی میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں بارہ پرائمری اسکول ایسے تھے جن میں بچوں کو اُن کی مادری زبان یعنی اردو میں تعلیم دی جارہی تھی۔ اُس برس ان اسکولوں میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد ۴۱۰۴ اور معلموں کی تعداد ۲۶۷ تھی۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں اسکولوں کی تعداد حسب سابق رہی جبکہ طلبا اور معلموں کی تعداد اضافے کے بعد بالترتیب ۴۷۶۲ اور ۲۶۹ ہوگئی۔

اسی طرح اضافے کی صورت ہمیں سیکنڈری اسکولوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء اور ۶۹-۱۹۶۸ء میں مادری زبان اُردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اسکول ۹ تھے۔

۶۸-۱۹۶۷ء میں، ان اسکولوں میں اُردو کے ذریعے تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد ۴۷۸۲ تھی جو اضافے کے بعد ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۴۹۴۹ ہوگئی۔ ان اسکولوں میں، ۶۸-۱۹۶۷ء میں اُردو بحیثیت ایک مضمون پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد ۲۱۵۴ تھی۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۲۶۵۴ طالب علم بحیثیت ایک مضمون کے اُردو پڑھ رہے تھے۔ ان اسکولوں میں معلموں کی تعداد ۱۶۱ تھی جبکہ گزشتہ برس ۱۵۰ معلم ان اسکولوں میں پڑھا رہے تھے۔

دہلی یونیورسٹی کے پندرہ کالجوں میں اردو بی۔ اے تک بحیثیت

ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ دلی کالج اور کروڑی مل کالج میں اُردو آنرز کا انتظام بھی ہے۔ بی اے اور بی اے آنرز کے اُردو طالب علموں کی مجموعی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ ایم اے کے داخلے دلی کالج اور پوسٹ گریجویٹ ایوننگ کالج میں ہوتے ہیں اس برس یعنی ۷۴-۱۹۷۳ء میں ایم اے اُردو کے طالب علموں کی تعداد ۷۵ ہے۔ پی - ایچ - ڈی ۱۱۰ کے طلبا دلی یونیورسٹی میں براہِ راست داخلہ لیتے ہیں۔ اس وقت مختلف موضوعات پر اندازاً پچاس اسکالر کام کر رہے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ایم لٹ مخطوطہ شناسی، اُردو میں سرٹیفکٹ اور ڈپلومہ کورسوں کا بھی انتظام ہے۔ اس برس یعنی ۷۴-۱۹۷۳ء ان کورسوں میں ۶۵ طالب علم ہیں۔[1]



ڈاکٹر ظہیر صدیقی
صدر شعبۂ اُردو
دلی یونیورسٹی

اردو اخبارات و رسائل

دلی ہندوستان کا دل ہی نہیں اس کا دماغ بھی ہے۔ یہاں اردو صحافت کی روایت بھی بڑی پرانی ہے۔ مولانا محمد باقر کے ہفتہ وار "دہلی اُردو اخبار" (۱۸۳۶ء) اور ماسٹر رام چندر کے ماہانہ و پندرہ روزہ "فوائد الناظرین" سے لے کر عہدِ حاضر تک دلی اردو صحافت کا ایک مرکز رہا ہے تاہم آزادی کے بعد پنجاب سے اخبارات اور اخبار نویسوں کی ہجرت کے بعد یہاں صحافت کو خصوصی فروغ حاصل ہوا ہے۔

پریس رجسٹرار کی حالیہ رپورٹ (۱۹۷۱) کے مطابق ۱۹۷۰ء میں دلی سے ۹ روزانہ اخبار شائع ہوتے تھے "وطن" (۱۹۴۰ء) کو چھوڑ کر بقیہ سبھی اخبار آزادی کے بعد دلی سے شائع ہونا شروع ہوئے ہیں۔ روزانہ "ملاپ" جس کے ایڈیٹر جناب رنبیر ہیں دلی کا کثیر الاشاعت روزنامہ ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ دہلی کے علاوہ جالندھر و حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔ ایک دوسرا کثیر الاشاعت روزنامہ "پرتاپ" ہے۔ دلی کے علاوہ یہ جالندھر سے بھی نکلتا ہے "پرتاپ" دلی کے ایڈیٹر جناب نریندر ہیں۔ یہ لگ بھگ تیس ہزار شائع ہوتا ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند

[1] ایک اطلاع کے مطابق اس وقت دلی میں اُردو میڈیم پرائمری، مڈل اور سکنڈری اسکولوں کی تعداد بالترتیب ۱۰۰، ۵۰ اور ۴۰ سے زیادہ ہے۔
اس کے علاوہ کچھ اسکول ایسے بھی ہیں جہاں اردو بحیثیت مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ ان اعداد و شمار کے پیشِ نظر یہ بات بہ سہولت کہی جا سکتی ہے کہ اُردو کے تعلق سے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ (ادارہ)

کا ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط ہیں۔ یہ ۵۰۰،۴ شائع ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کے اخبار "دعوت" کی تعدادِ اشاعت ۳۱۹۰ ہے اس کے ایڈیٹر محمد مسلم صاحب ہیں یہ ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا تھا۔ دوسرے روزانہ اخبار "ملک و ملت" (مدیر سید انیس الرحمٰن تعداد اشاعت ۵۱۶۸)، "تیج" (ایڈیٹر وشو بندھو گپتا و دھرم پال گپتا وشا تعداد اشاعت ۳۵ ہزار)، "سویرا" (ایڈیٹر جسنا داس اختر تعداد اشاعت ۲۰۷۸) اور "وطن" (ایڈیٹر شو نرائن بھٹناگر، تعداد اشاعت: ۱۹۹۰) ہیں۔

پریس رجسٹرار کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۰ء میں ۳۱ ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے تھے۔ ابتداءً لاہور سے نکلنے اور آزادی کے بعد دلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبارات "شیر پنجاب" (ایڈیٹر سودارشن بہادر سنگھ) اور "اتالیق" (ایڈیٹر ہنس راج وہبر۔ تعدادِ اشاعت ۱۶۰۰۰) سے قطع نظر ہفتہ وار اخبار "الجمعیۃ" دلی سے شائع ہونے والا سب سے پرانا ہفتہ وار ہے۔ یہ ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت ۶۰۱۱ ہے۔ ایسا دوسرا ہفتہ وار "ریفارمر" ۱۹۲۶ء ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب امرناتھ ہیں۔ یہ تین ہزار شائع ہوتا ہے۔ دلی کے دوسرے اہم ہفتہ وار "ایشیا" (ایڈیٹر مشتاق احمد)، "پیامِ مشرق"، "حیات" (ایڈیٹر اسد جعفری)، "پرچمِ ہند" (ایڈیٹر سید انیس الرحمٰن) اور فلمی رسالہ "چترا" (ایڈیٹر دھرم ویر) ہیں۔ نظامتِ تعلقاتِ عامہ، وزارتِ دفاع کا "سینک سماچار" اور وزارتِ اطلاعات و نشریات کا دیواری اخبار "اپنا دیش" بھی قابلِ ذکر ہفتہ وار ہیں۔ دلی کے ہفتہ وار اخبارات میں قابلِ ذکر اضافہ "نئی دنیا" کا ہوا ہے۔ یہ اخبار مولانا عبدالوحید صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

اس وقت دلی سے سولہ پندرہ روزہ اخبار شائع ہوتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے رسالہ "آواز" سے قطع نظر باقی سبھی پندرہ روزہ اخبار آزادی کے بعد سے شائع ہونا شروع ہوئے ہیں۔ ان اخبارات کی تعدادِ اشاعت بڑی محدود ہے۔ ان میں "ہمدرد"، "ندائے اتحاد"، "پیغام"، "ہند سندیش" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا عبدالوحید صدیقی کا پندرہ روزہ اخبار "واقعات" اب ماہانہ شائع ہونے لگا ہے۔ یہ ڈائجسٹ ہے۔ دلی سے شائع ہونے والے دوسرے اہم ڈائجسٹ "شبستان" (ایڈیٹر یونس دہلوی)، "ہما" (ایڈیٹر عبدالوحید صدیقی)، "ہدیٰ" (ایڈیٹر ایم۔ اے صدیقی)، "عرب" (ایڈیٹر ایس ایس اشرف) "مدینہ ڈائجسٹ" (ایڈیٹر امین حسن) ہیں۔ یہ سبھی ڈائجسٹ ماہانہ ہیں۔ ان کے

[2] پریس رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی رپورٹ (۱۹۷۲ء) کے مطابق ۱۹۷۱ء میں دلی سے ۱۰ روزانہ، ۴۲ ہفتہ وار، ۱۸ پندرہ روزہ اخبار، ۸۸ ماہانہ، ۳ سہ ماہی رسالے شائع ہوتے تھے۔

علاوہ دہلی سے لگ بھگ ستر ماہانہ رسائل شائع ہوتے ہیں۔ فلمی رسالوں میں شمع (ایڈیٹر یونس دہلوی) اور "روبی" (ایڈیٹر رحمان نیّر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہنامہ شمع دہلی ہی کا نہیں، ہندوستان کا سب سے کثیرالاشاعت ماہنامہ ہے۔ شمع ۱۹۳۹ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس کی تعداد اشاعت ۱۴۴۸۰۰ ہے۔

دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسائل میں "بیسویں صدی"، "تحریک" "آج کل" سرِفہرست ہیں۔ بیسویں صدی خوشتر گرامی کی ادارت میں ۱۹۳۷ء سے شائع ہو رہا ہے۔ تحریک کا ادارۂ تحریر گوپال متل، پریم گوپال متل اور مخمور سعیدی پر مشتمل ہے۔ "آج کل" وزارت اطلاعات و نشریات کا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ اپنے اچھے ادبی معیار اور اعلیٰ خصوصی نمبروں کے لئے عمدہ کتابت و طباعت کے لئے مشہور ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب مہدی عباس حسینی ہیں۔ ماہانہ رسائل میں عورتوں کا ماہنامہ "بانو" (ایڈیٹر زینت کوثر) اور بچوں کے رسالے "کھلونا" (ایڈیٹر الیاس دہلوی) اور "پیامِ تعلیم" (ایڈیٹر محمد حسین حسّان ندوی) ہیں۔ مذہبی رسالوں میں "آستانہ"، "مولوی"، "منادی" "ہدیٰ"، "مدینہ ڈائجسٹ" "اِدم" پیش پیش ہیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ماہانہ رسائل میں ادھر ایک اضافہ ہوا ہے اور وہ رسالہ ہے "سیکولر ڈیموکریسی"۔ یہ رسالہ ڈاکٹر خلیق انجم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ تحقیقی رسائل میں سہ ماہی "تحریر" (ایڈیٹر مالک رام) "اردوئے معلیٰ" سرفہرست ہیں۔ تعلیمی اداروں کے رسالوں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب ضیاءالحسن فاروقی ہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۶۰ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔

علمی ادبی سرگرمیاں

کوئی ادبی رسالہ اٹھائیے، کوئی انتخاب دیکھئے۔ ہندستان کے کسی شہر کسی گوشے میں ہونے والے مشاعرے کی روداد پڑھئے، دہلی کے متعدد ادیبوں، شاعروں، محققین اور نقادوں کے نام سرِفہرست نظر آئیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ دہلی جو ہندوستان بھر سے آئے ہوئے شعرا اور ادیبوں کا مسکن ہے ادبی طور پر بڑا فعال مرکز ہے۔

دہلی کے شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں کی صحیح تعداد کا صحیح صحیح اندازہ دشوار ہے لیکن جب ہم دہلی کے ادیبوں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں دہلی ہی اردو ادیبوں اور شاعروں کا سب سے بڑا مرکز ہے (یہی نہیں)، ان میں سے بیشتر ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ کسی تخصیص یا تقدیم و تاخیر کو ملحوظِ خاطر رکھے بغیر دہلی کے ادیب و شاعر حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مالک رام، ایم ایم جیگ، ضیاءالحسن فاروقی، ڈاکٹر سلامت اللہ، عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر تنویر احمد، ڈاکٹر محمد عمر، ڈاکٹر انور صدیقی، عنوان چشتی، قیصر زیدی، اجمل اجملی، انور عظیم، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر شمیم نکہت، شاہدہ، غفران زیدی، ڈاکٹر اسلم پرویز، شہاب جعفری، سید ضمیر حسن، راجندر ناتھ شیدا، جاوید وششٹ، ڈاکٹر کامل قریشی، رشید حسن خاں، آنند نرائن مُلّا، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، گوپی ناتھ امن، ساغر نظامی، سید علی جواد زیدی، گربچن چندن، شہریار، پرواز، گوپال متل، بہادر لی، عمیق حنفی، سلام مچھلی شہری، رفعت سروش، کمال احمد صدیقی، زبیر رضوی، محمود ہاشمی، نثار احمد فاروقی، شہباز حسین، پریم ناتھ در، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، م۔م۔ راجندر، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، غلام ربانی تاباں، ساحر ہوشیارپوری، درشن سنگھ دُگل، گلزار دہلوی، خار دہلوی، ذکیہ سلطانہ نیّر، ممتاز مرزا، حمیدہ سلطان، بشیر جھنجھانوی، رام کرشن مضطر، کرشن موہن، کرشن مراری، بسمل شاہجہانپوری، رعنا جگی، حسن نعیم، دیویندر ستیارتھی، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، ہنس راج رہبر، تاجور سامری، سنتوش صحرائی، ظفر ادیب، اظہار اثر، سلامت علی مہدی، سید سجاد ظہیر، ریوتی سرن شرما، شاہد ماہلی، عتیق احمد صدیقی، حیات اللہ انصاری، بلراج کومل، کمار پاشی، مخمور سعیدی، بانی، دوارکا داس شعلہ، کیلاش ماہر، محسن زیدی، صغیر احمد صوفی، افسر آذری، بلراج مینرا، چندر پرکاش شاد، پریم پال اشک، کوثر چاندپوری، بسمل سعیدی، طالب چکوالی، ضیا فتح آبادی، خزاں چند نسیم، طالب دہلوی، انور صابری، شمیم کرہانی، اثر دہلوی، فیاض رفعت، ستیش بترا، قمر احسن، دیویندر اسر، وشوا ناتھ درد، سکندر علی وجد، حبیب تنویر، بلراج حیرت، رام پرکاش راہی، ست پرکاش شوق، مہیش چندر نقش، نقش صحرائی، عزیز وارثی، صغریٰ مہدی، راج نرائن راز۔

دہلی ہمیشہ سے اردو کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہ سرگرمیاں بڑی متنوع اور گوناگوں ہوتی ہیں۔ کتابوں کی عالمی نمائش اور ایشیائی مصنفین کی کانفرنس سے لے کر محلہ جاتی انجمنوں کی ادبی نشستیں اس سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ دہلی میں مشاعرے بڑے پایہ کے ہوتے ہیں۔ دہلی میں مشاعروں کا آغاز شروع سال میں ہو جاتا ہے۔ اولیت یوم جمہوریہ کے مشاعرے کو حاصل ہے۔ یہ مشاعرہ ہر برس ۲۶ جنوری کے آس پاس منعقد ہوتا ہے اس میں ہندوستان بھر سے اردو کے ممتاز شعرا کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہونہار نوجوان شاعروں کو بھی خاطر خواہ نمائندگی دی جاتی ہے۔ دوسرا اہم مشاعرہ شنکر لال شنکر اور مرلی دھر شاد میموریل کمیٹی کی طرف سے ماہ فروری یا مارچ میں ہوتا ہے

ن۔ شکیب

حاجی دَولت

ایک زمانہ تھا جب حاجی دولت صرف دولت تھے۔ ان کے سیٹھ بننے کا وقت نہیں آیا تھا۔ غریب تو وہ کبھی نہیں تھے۔ ان کے باپ ثروت ہی کے زمانے سے ان کے گھر میں ہُن برستا تھا لیکن سونے چاندی کے کلس حاجی صاحب نے اُٹھائے۔ پہلے وہ سیٹھ دولت ہوئے پھر حاجی دولت صاحب اور اب تو وہ صرف حاجی صاحب قبلہ ہیں۔ وہ اپنے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھتے وقت انتہائی خاکساری برتتے ہیں۔ دولت نے اُن کو جتنا بھاری بھرکم بنا دیا ہے وہ اپنے خط میں اتنا ہی سمٹ کر صرف "عاصی حاجی" رہ جاتے ہیں۔ ان کے بیٹوں اور پوتوں کو یہ انکسار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جب کبھی وہ لوگ ان کی طرف سے خط لکھتے ہیں تو آخر میں تھوڑا سا بڑھا کر "الحاج سیٹھ دولت" لکھ دیتے ہیں۔ یہ تو خط و کتابت کی بات ہے۔ عام طور سے لوگ اب یہ بھی بھول چکے ہیں کہ حاجی صاحب کا "حاجی صاحب قبلہ" کے سوا اب اور بھی کوئی نام ہے۔ نیا پوسٹ مین جب کبھی بدل کر آتا ہے تو بہت کم لوگ ملتے ہیں جو اتنے مشہور اور بڑے آدمی کا پتہ اس کے نام سے بتا سکیں۔ اور یوں تو حاجی صاحب کو سب ہی جانتے ہیں۔

حاجی صاحب خوبصورت نہ رہے ہوں لیکن ان پر بدصورتی کا الزام بھی کسی نے نہیں لگایا۔ حج کے بعد سے پیشانی پر نشان سجدہ نے اُبھر کر نُور کا ایک منارا تیار کر دیا ہے اور اب تو جھتوں کو یہ نور برستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جن سیاہ بختوں پر اس نور کی چھینٹیں بھی نہیں پڑتیں وہ بھی چاہے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن تکذیب کی ہمت نہیں کر سکتے۔ حاجی صاحب کو کالا تو کوئی کہہ نہیں سکتا لیکن ان کے گورے ہونے کا بھی کوئی مدعی نہیں۔ نشانِ سجدہ پیشانی پر ذرا اُبھر آیا ہے اس لئے جسم کی عام جلد سے اس کی تمیز قریب آ کر کچھ آسان ہو جاتی۔ عمر ساٹھ سال کے قریب پہونچ چکی ہے لیکن بال ابھی تک سیاہ ہیں۔ دانتوں نے بے وفائی ضرور کی لیکن حاجی صاحب نے پوری بتیسی لگا کر یہ خلا بھی پاٹ لیا۔ یہ بتیسی انھوں نے مکہ میں لگائی تھی اس لئے معتقدین رنج و مسرت اور غم و غصہ ہر حالت میں حاجی صاحب کے ان دانتوں کی زیارت سے ثواب کی اُمید رکھتے ہیں۔ اگر حاجی صاحب کبھی چُپ ہو جاتے ہیں لوگ ان کو چھیڑ چھیڑ کر بولنے، ہنسنے یا کم سے کم غصہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں تاکہ سفید چمکیلے دانتوں کی زیارت سے ثواب حاصل کر سکیں۔

تجارت حاجی صاحب کے یہاں کئی پشتوں سے ہوتی ہے۔ ان کی نیک نیتی نے اس پیشے کو ان کے لئے دائمی "فضل اللہ" بنا دیا ہے۔ وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو سونا ہو جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر آدمی نیت ٹھیک رکھے تو اللہ ضرور برکت دیتا ہے۔ غریبوں کی خدمت اور خبرگیری کا انھیں ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ ان کے شہر میں بہت سے غریب اور بے یار و مددگار لڑکے مختلف دکانوں پر نوکر ہیں۔ ان میں سے اکثر مالک کی دکانوں سے کچھ سامان چُرا لاتے ہیں۔ حاجی صاحب اس حرکت کو کبھی پسند نہیں کرتے لیکن دیندار طبیعت رکھنے کی وجہ سے کسی گنہگار کا راز بھی افشا نہیں کرنا چاہتے۔ وہ سامان ان لڑکوں کے لئے بیکار بھی ہوتا ہے۔ اگر کبھی شبہ ہو جائے اور تحقیقات کی نوبت آئے تو سرقے کا مال برآمد ہونے سے ان غریب بچوں کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اندیشے بھی حاجی صاحب کو پریشان کر دیتے ہیں۔ رانڈ بیواؤں کے لڑکے اگر پکڑے جائیں تو ان کا یہ ٹوٹا پھوٹا سہارا بھی جاتا رہے۔ حاجی صاحب ایسے موقعوں پر یہ سامان ان بچوں سے اونے پونے خرید کر اپنی دوکان میں رکھ لیتے ہیں۔ حاجی صاحب دولتمند آدمی ہیں انھیں مال کی کمی نہیں۔ یہ جرأت تو وہ صرف اپنے کلمہ گو بھائی کا عیب چھپانے کے لئے کرتے ہیں۔ اللہ کی ایک صفت ستاری بھی ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ میں سے ایک صفت پیدا کرنے کی سعی بلیغ کرتے ہیں۔ ان کے لئے ایسے سامان کی پوری قیمت ادا

کرنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن وہ اس طرح چوری کی بُری عادت کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے اس کے وہ کم سے کم دام ادا کرتے ہیں تاکہ یہ چور لڑکے اس پیشے کو غیر نفع بخش سمجھ کر چھوڑ دیں۔ لیکن زمانہ اتنا خراب ہو گیا ہے کہ اب نیکی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کو حیرت ہے کہ ایسی نفسیاتی تدبیریں اختیار کرنے کے بعد بھی مجرمین کا یہ گروہ بڑھ رہا ہے۔

حاجی صاحب بڑے صابر اور رحم خوار بزرگ ہیں۔ کوئی کتنی ہی بڑی غلطی کیوں نہ کرے ان کو غصہ بہت کم آتا ہے خشیتِ الٰہی ان کی روحانی غذا ہے غصہ آتے ہی ان کو غضبِ الٰہی کا خیال آ جاتا ہے اور وہ پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک دن ایک لڑکے نے جو ان کے یہاں ملازم تھا ایسی شرمناک غلطی کی کہ ان کا سا صابر آدمی بھی غصہ ضبط نہ کر سکا۔

انھوں نے محلے کے ایک بچے کو فاقوں میں گرفتار دیکھ کر کھانے کپڑے پر نوکر رکھ لیا تھا۔ لڑکا یتیم تھا اس لئے اس کی تربیت اور نگرانی میں، حاجی صاحب وہی توجہ کرتے تھے جو کسی باپ کو اپنے بچے کے لئے کرنی چاہیئے تھی سو دولت آتی جاتی ہے۔ دو تین پُشتوں سے دولت مند ہونے کے باوجود حاجی صاحب اس حقیقت سے صدقِ دل سے قائل ہیں۔ اس لئے تربیت کے معاملے میں مستقبل کی "عدم یقینیت" ہمیشہ ان کے سامنے رہتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ بچہ لڑکپن ہی میں ہر طرح کی سختی جھیلنے کا عادی ہو جائے تاکہ زمانے کی ناسازگاری اس کو پریشان نہ کر سکے۔

حاجی صاحب کھانے پینے کے زیادہ شوقین نہیں ہیں لیکن کفرانِ نعمت سے بہت ڈرتے ہیں اللہ نے دیا ہے اس لئے دسترخوان پر دو چار طرح کے سالن، مٹھائیاں، چٹنیاں اور مربّے ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن اس امر کا وہ خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کے متعلقین ان تکلفات کے عادی نہ ہونے پائیں۔ وہ خود یہ تمام چیزیں شوقیہ استعمال نہیں کرتے ہیں صرف اظہارِ نعمت کے طور پر، محض جذبۂ تشکر و احسان مندی کے تحت یہ سب کچھ کر لیتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص کو، جب تک نفس پر پورا قابو نہ ہو جائے، ان تعیشات میں نہ پڑنا چاہیئے ورنہ اندیشہ ہے کہ نفس موٹا ہو جائے گا اور یہ لت رفتہ رفتہ اسراف کے گناہِ کبیرہ تک گھسیٹ لے جائے گی۔

اسی نازک خیال کے تحت حاجی صاحب اس یتیم بچے کی بھی پرورش کرتے تھے۔ لیکن یہ بدبخت جب موقع پاتا ان کے عبادت کے کمرے میں رکھے ہوئے اچاروں چٹنیوں، مربّوں اور مٹھائیوں پر ہاتھ صاف کرتا رہتا۔ اتنے دولت مند گھر میں ان چیزوں کی کیا قیمت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سے عادت بگڑنے اور اسراف بے جا تک پہونچنے کا احتمال تھا اس لئے حاجی صاحب کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزرتی۔ جب کبھی وہ پوچھتے یہ ظالم صاف مُکر جاتا۔

ایک دن جب حاجی صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ دبے پاؤں ان کے کمرے میں پہنچا۔ جب حاجی صاحب سجدے میں گئے یہ چپکے سے مُربّے نکال کر کھانے لگا۔ عجیب اتفاق اُسی وقت ایک فقہی مجبوری کی وجہ سے وضو کے لئے نماز ادھوری چھوڑنا پڑی۔ اس نے حاجی صاحب کو مڑتے دیکھ کر ہونٹ بند کر لئے۔ حاجی صاحب نے بہت پوچھا اس نے ہوں ہاں میں ٹالا۔ جب تک حاجی صاحب نے کھینچ کر طمانچہ نہیں مارا اُس نے منہ نہیں کھولا۔ تھپڑ پڑتے ہی مُربّہ منہ سے اُچھل کر جانماز پر جا گرا۔ مُربّے کی کوئی بات نہ تھی لیکن دروغ گو کے لعابِ دہن میں لتھڑی ہوئی آملے کی گٹھلی اس مصلے پر جا گری تھی جو حاجی صاحب نے مدینے میں خریدا تھا۔ مدنی تبرک کی یہ توہین ایک عاشقِ رسول کیسے برداشت کرتا! اس عالمِ جنون میں جو شدید جذبۂ محبت سے پیدا ہوا تھا، حاجی صاحب نے اس لڑکے کو بہت مارا۔ اور اُس کی صورت سے اتنے بیزار ہوئے کہ اس خبیث روح کو جو یقیناً آگے چل کر جہنم کا کُندہ ہوتی، فوراً نکال باہر کیا اور پھر اس کو اپنے یہاں کبھی نہیں رکھا۔

ایسے شدید جذبۂ نفرت پر قابو پانا بھی حاجی صاحب ہی جیسے خدا ترس آدمی کا کام تھا۔ یہ لڑکا دوسری جگہ نوکر تھا۔ اس نے اپنی کاٹ پیٹ کی عادت نہیں چھوڑی۔ اُس کی بے شرمی اور دیدہ دلیری دیکھنے کے لائق ہے کہ وہ دوسری جگہ سے چیزیں چُرا چُرا کر حاجی صاحب کی دوکان پر بیچنے کے لئے لانے لگا۔ جب وہ آتا حاجی صاحب چشم پوشی کی نیت سے آنکھیں بند کر لیتے۔ ان کے منیم نے حاجی صاحب کی ناگواری سے واقف ہونے کی وجہ سے، خریداری سے پرہیز کرنا چاہا لیکن حاجی صاحب نے ازراہِ نیتِ کرم و عیب پوشی اشارہ کر دیا تاکہ وہ بدنصیب کہیں اور جا کر پکڑا نہ جائے اور بیٹھے بٹھائے اس بدخصلت کے ہاتھوں غریب بیوہ کے ایک ٹکڑے روٹی پر آفت آ جائے۔

حاجی صاحب جوانی میں بھی جوانِ صالح تھے۔ اب پیری میں تو ان کی معصومیت نابالغوں کے لئے بھی رشک کا موجب بنی ہوئی ہے۔ لہو و لعب میں وہ کبھی نہیں پڑے۔ روپیہ پیسہ کی افراط ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی تھیٹر سینما کا شوق نہیں کیا۔ ہاں دیہاتی ٹھاں ناچ گا کر حاجی صاحب سے کچھ نہ کچھ ضرور اینٹھ لے جاتی ہیں۔ ظاہر ہے اس میں اعتراض اور شبہ کی کیا بات

ہے؛ ایک غریب قوم، جو روزی کے ہر ذریعے سے محروم ہے، ایک ڈھولک، گلٹ کے بچھوے اور بے تال تُمری کی چینیں جس کا کل سرمایۂ تجارت ہیں، بہرحال رحم کی مستحق ہے۔ ان تینوں میں حُسن کا کوئی سوال نہیں رہا۔ اب رہا شباب، وہ شکیں اُس کے لئے ہوگا جو پتھروں میں جونک لگانے کی نیت رکھتا ہو، حاجی صاحب کو تو اس سنگلاخ میں بھی صانعِ قدرت کی صنعت ہی نظر آتی ہے۔ اس احساس کے باوجود انھوں نے تینوں کے ناچ کے وقت کبھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ سر گردن جھکائے "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

اچھے لوگوں کو بھی بعض وقت کچھ بندگانِ غرض بدنام کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی نیت جو کچھ بھی ہو اللہ اس طرح نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے اور ان کے تحمل و برداشت کے درجات بلند کرتا ہے۔ حاجی صاحب کو بھی بعض اوقات بڑی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان بعضوں میں اکثر جان طوائف کے اُٹھائے ہوئے فتنوں کو یاد کیجئے تو رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ اس مردود نے ایک مرتبہ میلاد اور دعوت میں قصبے کے بڑے آدمیوں کے ساتھ حاجی صاحب کو بھی بُلایا۔ ظاہر ہے اس کے یہاں رزقِ حلال کے شبہ کے لئے بھی کیا گنجائش تھی! حاجی صاحب نے پیغام سنتے ہی انکار کر دیا۔ وہ ظالمہ جس کا دماغ بعض شریفوں کی کمینہ حرکتوں نے خراب کر دیا تھا اس صاف اور دوٹوک جواب سے چڑھ گئی اور فوراً ساری کے پلو کو ڈھلکاتی اور سرکاتی ہوئی حاجی صاحب پر چڑھ دوڑی۔ حاجی صاحب بے چارے بزرگ آدمی اس بیسوا کے منہ کیا لگتے! لاحول پڑھتے ہوئے اندر گودام میں جا گھسے۔ وہ بڑی دیر تک کھڑی بڑبڑایا کی کہ "میرا پیسہ حرام ہے اور میں حلال ہوں، کیوں حاجی! یہ وہی تو دولت ہے جو میں نے تیرے جیسے ولیوں کی جیب کاٹ کر جمع کی ہے، اس میں حرام کیا ہے؟ اگر میری کمائی حرام ہے تو تیری پونجی بھی حرام ہے۔ تو دنیا کو فریب دے میں تیری ریاکاری سے خوب واقف ہوں۔ میں گنہگار ہوں لیکن ریاکار نہیں — تو گنہگار بھی ہے اور ریاکار بھی۔ . . . . . " وہ دَراتی ہوئی گودام میں جا گھسی حاجی صاحب گھبرائے ہوئے تو تھے ہی، اس بلا کو آتے ہوئے دیکھ کر بالکل ہی بوکھلا گئے۔ جیب میں جو کچھ تھا اپنی عزت و آبرو پر صدقے کیا۔ وہ ستم ظریف یا کو آگ کے گھوڑے پر سوار آئی تھی یا جُھک جُھک کر روپے اور نوٹ چننے لگی۔ اس پر بھی صبر نہ ہوا۔ بڑی ادا سے ٹھمک کر آگے بڑھی اور حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چلو یار نہ چلو آج دعوت اور میلاد کا خرچ دے دو۔" حاجی صاحب نے منیم جی سے پکار کر کہا۔ "دے دو جو کچھ مانگے —— یا اللہ رحم!

یا اللہ رحم!"

دنیا میں نیکی کی جگہ نہیں۔ حاجی صاحب اس ناشدنی مصیبت میں گرفتار تھے اور منیم جی جو اُن کے قدیم نمک خوار ہیں، چپکے چپکے بیٹھے مُسکرا رہے تھے جیسے یہ حاجی صاحب کا گھریلو معاملہ ہو۔ بغیر کچھ جرح کئے جو اُس نے مانگا انھوں نے دے دیا۔ شام کو حساب چڑھاتے وقت انھوں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔ "یہ خرچ کس مد میں لکھوں؟" حاجی صاحب تھوڑی دیر گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر بولے "میاں خیرات میں لکھ دو۔ سوال کے جواب میں جو کچھ دیا جائے وہ خیرات ہی ہے۔"

بعض نیک گھروں کے نمک میں "اچھو" ہونے کی خاصیت ہوتی ہے۔ حاجی صاحب کا نمک بھی ایسا ہی تھا جس نے کھایا جھلانے لگا۔ رگ رگ میں ان کا احسان دوڑا لیکن رودھتیں ہے ان کی ناشکری کی۔ کریمن نوجوانی میں بیوہ ہوگئی۔ کوئی پرورش کرنے والا نہ تھا۔ حاجی صاحب کے ٹکڑوں پر پلتی اور اُن کی بیویوں کے اُتاروں سے تن ڈھانکتی رہی۔ حاجی صاحب "غضِّ بصر" پر بہت سختی سے عمل کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ بدقماش ادبدا کر اُن کی راہ میں آنے کی کوشش کرتی۔ ایک دن ان کی نگاہ بھی پڑ گئی۔

"ارے بیٹی کریمن! ابھی تو بچہ ہے۔ تیرے کھانے پہننے کے دن تھے۔ مگر جو اللہ کو منظور وہ ہو۔ تیرے پاس کپڑے نہیں ہیں کیا؟ . . . . . اچھا . . اچھا . . . . یہ لے . . . . دو جوڑے ڈھنگ کے کپڑے بنالے . . . . . اچھا . . . . . . پھر . . . اچھا جاؤ . . . . جاؤ۔"

کریمن کی نوجوانی پیاس پڑی ہوئی تھی۔ حاجی کی ذرا سی نیکی نے سوئی ناگن جگا دی۔ وہ جب نیا جوڑا چمک کر نکلی منیم جی، چھوٹے حاجی، مرزا حاجی نما سبھی اس کو کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔ اگر حاجی صاحب کا خوف نہ ہوتا تو اپنی نگاہوں کو زبان بنا کر یہ سب اُسے چاٹ جاتے۔ کریمن ظرف کی چھچھلی تھی۔ حاجی صاحب کی مہربانی نے اُسے اِتانا کر دیا۔ اب وہ چپکے اور اِترانے بھی لگی۔ ستم یہ کہ اب وہ حاجی صاحب کے نام سے دوسروں کو دھونسیں بھی دینے لگی۔ منیم جی پر تو جب دیکھئے وہ غرایا ہی کرتی تھی۔ مرزا حاجی نما سے تو پہلے اس کی خوب چھنتی تھی لیکن اب وہ اُس کے سامنے تو چپ رہتے تھے لیکن چپکے چپکے منیم جی سے کہتے تھے۔ "بھائی اسے بھگاؤ، نہیں تو یہ سب چاٹ جائے گی۔"

گھر کا بڑا، جس کے ہاتھ میں کمائی کی باگ ڈور بھی ہو، جب کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے تو دوسرے لوگ خواہ مخواہ اس سے جلنے لگتے ہیں۔ حاجی صاحب

کا پورا کنبہ اب کریمن سے جلنے لگا تھا۔ مرزا حاجی نما تو حاجی صاحب کی محلسرا میں بھی دخیل تھے۔ انھوں نے معلوم نہیں کیا جڑا کہ ایک دن بارہ بجے رات کو بڑی بھی نے ڈیوڑھی میں کریمن کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ حاجی صاحب بھی کہیں پاس ہی تھے۔ غریب بچوں پر یہ ظلم برداشت نہ کر پائے۔ چھڑانے لگے۔ لیکن بڑی بھی نے دو چار ایسی بے شرمی کی باتیں کہیں کہ حاجی صاحب لاحول پڑھتے ہوئے اپنے عبادت والے کمرے میں آ کر بیٹھ رہے۔ کریمن پٹ پٹا کر باہر نکلی۔ جاڑے کے دن تھے۔ سب لوگ دبکے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر پڑے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب کے سوا اس غریب کا اور کون ہمدرد تھا! وہ ان کے عبادت خانے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حاجی صاحب بھی اب صبر کی تلقین کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ وہ غریب بھوکی بھی تھی۔ اب اتنی رات گئے کیا ہوتا وہ تو کہئے کہ اچاریوں میں کچھ نہ کچھ رہتا تھا ورنہ غریب کو مار کھانے کے علاوہ بھوکا بھی رہنا پڑتا! فرش فروش جو کچھ تھا حاجی صاحب نے اس کے اوپر ڈال دیا اور مصلا بچھا کر رو رو کر اپنے پیدا کرنے والے سے شکوہ کرنے لگے۔ لوگ ان کی فریاد سنتے سنتے غافل ہو گئے۔

دوسرے دن خیر آلو جو حاجی صاحب کا ہے پالک تھا کریمن کو لے اڑا۔ حاجی صاحب سے کیا مطلب؟ دونوں جہنم کے کندے ہیں جیسا کریں گے ویسا بھریں گے۔ لیکن جائے عبرت یہ ہے کہ اب وہ نمک حرام طرح طرح کی باتیں بناتی پھرتی ہے ...... ———— !" بڑی ناشکری ہے حرامزادی کہیں کی۔

حاجی صاحب ملک التجار تو تھے ہی۔ سبھی طرح کا مال ان کے گودام میں بھرا رہتا تھا۔ بیکس چائے اور سگرٹ کے بنڈلوں سے تو مال کے مال بھرے رہتے تھے۔ کمال تو یہ ہے بعض وقت کمپنی کی تھوک شرح سے بھی کم نرخ پر یہ چیزیں سپلائی کر دیتے تھے۔ بقول حاجی صاحب جب وہ کھری کراچیاں چکا کر خرید لیتے تھے تو ان کو سستا بیچنے میں کیا عذر ہو سکتا تھا! وہ تاجر تھے گنگا نہ تھے۔ ان کا نفع دال کا نمک تھا۔ اس نمک میں اللہ نے اتنی برکت دی تھی کہ دوسرے حسد کرنے لگے تھے۔

کچھ دنوں سے اخباروں میں خبریں اڑنے لگیں کہ ٹھگوں کا کوئی گروہ ریل میں لاکھوں کی چوریاں کر رہا ہے۔ پولیس حیران ہے۔ کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لوگ تو دشمن تھے ہی سے اڑنے کر ہو نہ ہو حاجی صاحب اس سازباز میں شریک ہیں۔ کمبخت سازشی خدا سے بھی نہیں ڈرتے۔ ایک دن کپتان صاحب پولیس کی دوڑ لے کر آ دھمکے۔ وہ تو کہئے مرزا حاجی نما کو پہلے ہی سن گن مل گئی تھی اور مقامی تھانے والے نے ان کو بھید بتا دیا

تھا نہیں تو حاجی صاحب کو بڑی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ حاجی صاحب دوڑ آنے سے پندرہ منٹ پہلے مرزا حاجی نما کے ساتھ اندھیاں کے کوٹھے پر جا چھپے۔ اچھوتے حاجی بھاگتے ہوئے پکڑے گئے اور پولیس کی دھر پکڑ میں ان کا عضو عضو ڈھیلا ہو گیا۔ کونے کونے کی تلاشی ہوئی۔ لوگ اڑاتے ہیں کہ ایک لاکھ کا مال پکڑا گیا۔ جھوٹی گواہیوں کی یہاں کیا کمی ہے! حاجی صاحب پر مقدمہ چلا۔ ہزاروں کے وارے نیارے ہوئے لیکن قابلِ تعریف ہیں مرزا حاجی نما کہ سچ کو سچ ثابت کر کے ہی دم لیا۔ واقعی اعلاء کلمۃ الحق بھی بڑی بات ہے میں سے بن آئے! دھوم سے دعوتیں ہوئیں۔ ہزاروں آدمیوں نے شکرانے کے چاول کھائے ان حالات میں پتھر کا کلیجہ ہوتا تو شق ہو جاتا۔ حاجی صاحب تو نہایت نرم دل اور پرگداز طبیعت رکھنے والے آدمی تھے۔ اگر توفیق الٰہی شامل نہ ہوتی تو یہ ذلت ہرگز برداشت نہ کر پاتے۔ پوری دنیا خوش تھی کہ حاجی صاحب جیت گئے۔ لیکن حاجی صاحب کو ملال تھا کہ "دنیا اب ایسی بگڑ گئی ہے کہ حق کو حق ثابت کرنے کے لئے ہزاروں خرچ کرنے پڑتے ہیں۔"

اب حاجی صاحب کا دل اس ملک سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب ان کو دیارِ حبیب کی یاد ستا رہی تھی۔ انھوں نے حج کے لئے رختِ سفر باندھا۔ ہندوستان میں وہ کیا کم نیکی کرتے تھے جو حجاز میں اٹھا رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ روپیہ لے کر چلے رفاقت کے لئے صرف مرزا حاجی نما ساتھ چلے۔ چلتے وقت حاجی صاحب نے بڑی دھوم سے رخصتی کا کھانا کیا۔ سیکڑوں آدمیوں نے ان کی بخیریت واپسی کے لئے دعائیں کیں۔ حاجی صاحب کو تو نمود و نمائش سے سخت نفرت ہے لیکن دنیا والوں سے کس کا زور چلتا ہے۔ زبردستی لوگوں نے پھولوں اور گجروں کے ہار پہنائے۔ حاجی صاحب محض سب کا دل رکھنے کے لئے سر جھکائے کھڑے "ھل یلتبت آدر کہ پہ اکبرا" پڑھتے رہے۔ گاڑی چلی اور انجن کی چھک چھک اور وداع کرنے والوں کے نعروں میں حاجی صاحب کا درود اچھی طرح سنائی نہیں پڑا۔

حاجی صاحب نے دھوم دھام سے حج کیا۔ مرزا حاجی نما تمام تفصیلات معتقدین کو لکھتے رہے۔ واپسی بھی بہت شان سے ہوئی۔ حاجی صاحب بے شمار تحائف اپنے ساتھ لائے۔ ان تحائف میں سونے کے ڈلے بھی تھے۔ قرآن میں آیا ہے۔ "زمین اور آسمان کے خزانے اللہ کے لئے ہیں۔" اگر کوئی حکومت سونے اور چاندی پر پابندی لگاتی ہے تو وہ مجرم ہے۔ کوئی دین دار آدمی ان دنیوی قواعد کے آگے گردن نہیں جھکا سکتا۔ حاجی صاحب سے یہ توقع کہ وہ فرمانِ خدا کے آگے ان طاغوتوں

کے اسلام کی عزت کرتے، بھلا نہیں کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے سونا خریدا اور جی بھر کر خریدا۔ حجاز کا سونا ہر ہندستانی کو کہاں نصیب!

معلوم نہیں کس نے دیوں نے مخبری کر دی اور ساحل پر تلاشی لی گئی۔ کپڑوں کی تہوں، بوتوں کے استروں اور تلووں، دگلوں اور عباؤں کے جوڑوں میں سونے کے ٹکڑے سلے ہوئے نکلے۔ تمام سونا کوئی پچاس ہزار کی مالیت کا اندازا گیا۔ حاجی صاحب جب سونا لائے تھے تو چھپانے کی بھی کوئی بات نہ تھی۔ کپڑے ادھیڑ ادھیڑ کر ٹکڑے نکالے جاتے۔ وہ بے تکلف اقبال کرتے کہ "ہاں یہ سونا ہے۔"

پوچھا گیا۔ "یہ آپ کیوں لائے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں یہ جرم ہے؟"

حاجی صاحب نے تیور بدل کر کہا۔ "تم دنیا والوں کی نگاہ میں یہ جرم ہوگا۔ میں تو اللہ کے گھر سے اللہ کا فضل اس لئے لایا ہوں کہ اس کے نفع سے اپنے دیس میں مسجد نبوی کے نمونے پر ایک مسجد بنواؤں اور اسی کے ایک حجرے میں اپنی باقی عمر اعتکاف میں بسر کروں۔"

بات بڑھی اور گھٹی۔ معلوم نہیں کیسے کیا ہوا لوگوں کو حاجی صاحب کی نیک نیتی اور خلوص کا یقین آگیا۔ حاجی صاحب نے بھی سونے کا تبرک بانٹنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ حبیب اللہ سے تو بخل سے کام لینا گناہ ہے۔

مرزا حاجی نما بمبئی کا معرکہ جیت کر حاجی صاحب کے ساتھ لوٹے۔ حاجی صاحب تو نہیں چاہتے تھے کہ ان کی حرمین شریفین سے مراجعت کی خبر عوام تک پہنچا یا جائے، لیکن مرزا حاجی نما ان بندگان خلوص کی تشنہ لبئ اشتیاق کو کیا جواب دیتے جو حاجی صاحب کے انتظار میں مہینوں سے سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔ اس لئے انھوں نے پورے پروگرام کا تذکرہ نامے میں کر ڈالا اور جب حاجی صاحب وطن پہنچے تو اسٹیشن پر زائروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ نعرۂ تکبیر اور حاجی صاحب قبلہ زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ دوسرا ہوتا تو استقبال کی یہ شان دیکھ کر آپے میں نہ رہتا اور گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی پھاند پڑتا۔ مرزا حاجی نما بھی کچھ کم برگزیدہ آدمی نہ تھے لیکن ان سے دیکھا گیا کہ سب کھڑکی سے کھیسیں نکال کر جھانکنے لگے۔ جیسے یہ سارے ہار انھیں کے لئے آئے ہوں۔ لیکن حاجی صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے بلکہ بڑے سکون وقار سے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے۔ وہ تو کہئے زائرین صبر نہ کرسکے اور ڈبے میں گھس کر زبردستی حاجی صاحب کے گلے میں ہار ڈالنے لگے ورنہ ریل چھوٹ بھی جاتی اور ان کے استغراق میں فرق نہ آتا۔ دعا کے اس پر کیف عالم میں حاجی صاحب کو ان بدتمیزوں کی مداخلت بہت کھلی لیکن محبت کا مارے کر بیگلے کا ہار ہوئے تھے اس لئے حاجی صاحب ٹھکرا نہ سکے اور بادلِ ناخواستہ اٹھ کر بغلگیر ہوئے۔ اب سیٹی بھی ہو رہی تھی اس لئے حاجی صاحب مریدوں کے دوشِ عقیدت پر سہارا دیئے ہوئے نیچے اترے اور چشم زدن میں معتقدوں کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے لگے۔

ہفتوں مریدوں نے جشن منایا۔ دعوتیں ہوئیں، قوالیوں کی محفلیں گرمائی گئیں۔ حاجی صاحب سماع کو جائز تو نہیں سمجھتے تھے لیکن دلِ دوستاں کے احترام کے قائل تھے اس لئے اس زہر کو قند سمجھ کر پیتے رہتے تھے۔ پھر قوالی اسی لئے بُری ہو سکتی ہے جبکہ جذبات کا ہیجان نفسی ہو۔ حاجی صاحب کا ذہن اس گندگی سے پاک تھا اس لئے نالۂ مجاز بھی ان کے لئے نوائے معرفت بن جاتا تھا۔

اب مسجد نبوی کے نمونے پر ایک مسجد بنوانے کی مہم تھی۔ لیکن حجازی سونے کی اچھی خاصی مقدار تبرک ہو کر بمبئی ہی میں رہ گئی تھی۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس سونے کو تجارت میں لاکر مزید رزقِ حلال کا انتظام کرلیا جائے۔ حجاز کا سونا جب تجارت میں لگ کر "فضل اللہ" کی شکل اختیار کرلے گا تو اور بھی خیر و برکت کا موجب ہوگا۔ اس نیت کی نیکی میں کیا شبہ ہو سکتا تھا۔ مرزا حاجی نما نے کاروبار میں یہ سرمایہ بھی لگا دیا۔ حاجی صاحب تو دنیوی کاروبار سے سبکدوش ہونے کا پورا ارادہ کرکے آئے تھے۔ لیکن اب کیا کرتے؟ مسجد کی مہم اتنی اہم تھی کہ اب تجارت کو کارِ خیر کی نیت سے چلانا ہی تھا۔ مجبوراً حاجی صاحب اسی آبائی پیشے میں نیت خیر کا پیوند لگا کر گم ہوگئے۔

پروفیسر اکبرالدین صدیقی شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن حضرت بے نظیر شاہ کا کلام اور زندگی کے حالات مرتب فرمارہے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی مواد کسی صاحب کے پاس ہو تو موصوف سے خط و کتابت فرمائیں۔ (ادارہ)

دیویندر اسّر

دُنیائے افسانہ کے باشندے

(کردار نگاری میں ایک مطالعہ)

جب بھی کوئی افسانے کے مستقبل سے مایوسی کا اظہار کرتا ہے تو اُس کی شکایت عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ افسانے کے دو اہم عنصر، پلاٹ اور کردار آہستہ آہستہ شعور کے بہاؤ میں بہتے جا رہے ہیں۔ اسٹروڈ اینڈرسن نے تو پلاٹ کو افسانے کا زہر قرار دے دیا ہے۔ لیکن کردار کے بارے میں اتنا فیصلہ کن ردِّ عمل سامنے نہیں آیا۔ کیونکہ جب تک افسانہ نگار پھر سے چرند و پرند اور سنگ و خشت کے بارے میں قصے کہانی لکھنا شروع نہیں کر دیتا بلکہ انسانوں کی زندگی کے گرد ہی کہانی کا تانا بانا بُنتا رہتا ہے، کردار نگاری کی نوعیت اور اہمیت پر بحث ضرور ہوتی رہے گی۔ چاہے وہ کردار، بے کردار یا بدکردار ہی کیوں نہ ہو جائے یا یونگ کا آرکی ٹائپ بن جائے کیونکہ بے کرداری یا بدکرداری سے بھی کردار کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔

کچھ افسانہ نگاروں کے لئے کردار پلاٹ کا ہی ایک جزو ہوتا ہے اور اس کی نشو و نما میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ لیکن بعض افسانہ نگار پلاٹ کو بنیادی اہمیت نہ دے کر کردار نگاری کو ہی اہم ترین جزو سمجھتے ہیں۔ جب بھی اُن کے سامنے کسی افسانے کا خاکہ آتا ہے تو وہ پلاٹ کی صورت میں نہیں بلکہ کرداروں کے باہمی ربط کی صورت میں ہوتا ہے۔ ان کرداروں کی کوئی نہ کوئی آن خاص ہوتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے خیال میں ایسے کردار کوئی ایسا عمل ضرور کریں گے جو دوسروں سے مختلف اور دل چسپ ہوگا۔ افسانہ نگار کا مقصد اسی عمل کی اہمیت کو افسانوی شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اسی نقطے سے کردار نگاری کے ایک اہم پہلو پر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ کیا افسانہ نگار کردار کے نمائندہ پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے یا منفرد پہلو کی؟ کیا اس کے نمائندہ پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے منفرد پہلوؤں کی ترجمانی ہو سکتی ہے؟ اس صورت میں کیا وہ کردار اپنی نمائندگی کے علاوہ دوسروں کی نمائندگی بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کی نمائندگی بھی کر سکتا ہے تو اس کی منفرد حیثیت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ یا پھر اس کے منفرد پہلوؤں کو پیش کر کے اُسے نمائندہ کردار کا روپ دینا ممکن ہے؟ بنیادی بات تو یہ ہے کہ کیا کردار کے خصوصی اور عمومی پہلوؤں میں تصادم ناگزیر ہے یا ان کا امتزاج ممکن ہے۔ بحث کردار اور شخصیت کے فرق پر بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ نقاد تو مثبت[1] اور منفی کردار قسم کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں مثبت کردار پیش کرنے چاہئیں۔ اس بحث کو آگے بڑھانے والے کرداروں کے کئی ٹائپ مقرر کرتے ہیں۔ بحث کردار کی خارجیت اور داخلیت، دونوں کی علیحدگی، تصادم، یگانگی اور امتزاج پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس مضمون میں ان تمام اہم سوالات میں سے کسی ایک پر بھی بحث مقصود نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی بات پیش نظر ہے جس کا براہ راست تعلق افسانوی کردار نگاری سے ہے اور وہ بات یہ ہے کہ حقیقی کردار اور افسانوی کردار پر اکثر جو بحث ہوتی ہے اس کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے اور یہ بحث یہاں بھی ضروری ہے کہ ایک اچھے بھلے افسانے پر اعتراض کرتے ہوئے فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں کردار حقیقی نہیں (حالانکہ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ماورائی ہے)

یہ بات تو ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ افسانے میں جب بھی کوئی واقعہ رونما

---

[1] مثبت: سے عام طور پر صحت مند کردار مراد لی جاتی ہے صحت مند کس نقطۂ نظر سے جسمانی، ذہنی یا روحانی؟ اس گروہ کے نقادوں کے لئے یہ بات سمجھنا انتہائی دشوار ہے کہ جسے عام طور پر اخلاقی مجرم کہا جاتا ہے وہ بھی روحانی طور پر صحت مند ہو سکتا ہے لہٰذا وہ بھی مثبت کردار ہے۔

ہوتا ہے تو ہم یہ ضرور پوچھتے ہیں کہ یہ سب کچھ کس پر بیت رہی ہے یا کس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا؟ ذہین قاری اس سوال میں ایک بنیادی سوال بھی شامل کر لیتا ہے کہ پھر اس سب کچھ ہونے کی اہمیت کیا ہے؟ درحقیقت وہ اس کردار کی اس مخصوص شکل میں پیش کرنے کی اہمیت معلوم کرنا چاہتا ہے اور پھر عمومی طور پر اس سب کچھ کی جسے ہم افسانہ کہتے ہیں، قدر معین کرنا چاہتا ہے۔ میں نے یہاں "اہمیت" کی بات کی ہے۔ کیونکہ ادب اور غیر ادب میں اسی اہمیت کا فرق ہے ورنہ پلاٹ، کردار، داستان گوئی، واقعات، موضوع، مواد، الفاظ اور اسلوب بیان تو ہر افسانے میں شامل ہوتے ہی ہیں چاہے وہ ادبی ہو یا غیر ادبی۔

یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ کردار نگاری کا ذکر کرتے ہوئے قدر کی بات کہاں سے آگئی؟ درحقیقت مجھے اس قدر کی بات سے یہ سہولت حاصل ہے کہ میں بغیر کسی مزید بحث کے یہ فقرہ لکھنے کے قابل ہو جاتا ہوں کہ سڑک پر چلتے پھرتے افراد اور افسانوی کرداروں میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے بحث اب ادبی افسانے میں کردار کی نوعیت اور قدر پر مرکوز ہو جاتی ہے اور کردار سے مراد افسانوی کردار ہو جاتی ہے۔ جب ہم افسانوی کردار کی بات کرتے ہیں تو بعض نقاد فوراً اسے حقیقی کے مقابلے میں "خیالی" سمجھ لیتے ہیں یا الف لیلوی قرار دے دیتے ہیں۔ اس وقت میرا مطلب ان کرداروں سے ہے جو افسانے یا ناول میں پیش کئے جاتے ہیں اور جو روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر نظر آنے والے کرداروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ افسانہ نگار کا مقصد کردار کی چھپی ہوئی زندگی کو عیاں کرنا ہے۔ انسانی کردار کا یہ خاصہ ہے کہ وہ افسانے میں ہو یا زندگی میں' تلاشِ مسرت کی پیہم کوشش اس کی زندگی کی ساخت کو متعین کرتی ہے۔ مسرت اور غم انسان کی چھپی ہوئی زندگی سے وابستہ ہے۔ افسانہ نگار کا کام اس چھپی ہوئی زندگی کو پیش کرنا ہے۔ چھپی ہوئی زندگی سے مسرت کی وابستگی پر بھی بحث کی گنجائش ہے۔ بکیٹ کے خیال میں خوشی یا تو حیوانی سطح پر یا عرفانی سطح پر ممکن ہے۔ لیکن اگر ہم اس خیال کو تسلیم کر کے کردار کو تخلیق کریں گے تو ماسوائے سپاٹ کردار نگاری کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ (حالانکہ بکیٹ کے کردار سپاٹ نہیں ہیں) لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم یہ انکشاف کرنے بیٹھے ہیں کہ اچھے آدمی کے دل میں کتنی برائی ہوتی ہے یا برے آدمی میں بھی کتنی اچھائی ہوتی ہے اور پھر افسانے میں چھپی ہوئی زندگی پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں افسانے میں اخلاق کے بجائے نفسیات کی مدد کی ضرورت ہے۔

بہر صورت افسانے میں کردار کی چھپی ہوئی زندگی ہی اہم ہے۔ اس کی عیاں زندگی کم دل چسپ اور کم اہم ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی کردار کی ایک حرکت یا ادا اس کی چھپی ہوئی زندگی کو عیاں کر دے جو کہ اس کی روزمرہ کی حرکات و سکنات یا اس کی زندگی کے کارہائے نمایاں اور واقعات پیش نہ کر سکیں۔ اس کی روزمرہ کی زندگی میں اس کی معمولی حرکت کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ہاتھوں سے واردات قتل کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کئی افراد اور سماج متاثر ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار اس واقعہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کرے گا۔ اگر یہ واردات اس کی چھپی ہوئی زندگی سے ہمیں آگاہ نہیں کرتی۔ ایسے سنسنی خیز واقعات سے وابستہ کردار جاسوسی ناولوں کے ہی کردار بن سکتے ہیں ادب کے نہیں۔ اس لئے وہ قارئین جن کی نگاہ ظاہر پر ہے باطن پر نہیں یہ سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں کہ حقیقی کردار اور افسانوی کردار میں فرق ہے۔ اس قسم کے حقیقت پرست قارئین کا یہ مطالبہ عام طور پر نا جائز ہوتا ہے کہ فلاں کردار غیر فطری ہے۔ ویسے بھی اگر آپ افسانے میں بعینہٖ اسی کردار کو دیکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ آپ نے اسے حقیقی زندگی میں دیکھا ہے۔ ان کے ان احساسات و جذبات کی عکاسی چاہتے ہیں جن سے آپ کو روزمرہ واسطہ پڑتا ہے تو پھر آپ افسانہ پڑھنے کے بجائے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالیں اور مشاہدہ کریں۔ احساسات و جذبات نئے یا اچھوتے نہیں ہوتے بلکہ ایک نئے انداز میں اُن کی قدر و اہمیت معین کرنا ہی افسانہ نگار کا کام ہے۔

افسانہ نگار کا یہ فریضہ ہے کہ جس کردار کو آپ برسوں سے جانتے ہیں جس کی زندگی کے حالات اور واقعات سے آپ واقف ہیں اُس کے بارے میں ایسی بصیرت عطا کرے جو اُس کی زندگی کا اصلی جوہر ہے۔ لیکن جو کسی نفسیاتی یا خارجی وجہ سے عیاں نہیں ہوتا جسے آپ حقیقی سمجھ رہے ہیں۔ کیونکہ وہ آپ کی نظروں کے سامنے روزمرہ آتا رہتا ہے' درحقیقت مصنوعی اور غیر حقیقی ہے۔ ان کی حقیقت محض اتنی ہے کہ آدمی فطری حالات میں زندہ نہیں رہتا بلکہ سماجی بندھنوں میں گرفتار رہتا ہے۔ اس لئے جب قاری کسی افسانہ نگار کے کردار کو خیالی اور غیر فطری قرار دیتا ہے تو اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) کہ افسانہ نگار یقین آمیز طریقے سے کردار کی حقیقی زندگی کو عیاں نہیں کر سکا۔

(۲) کہ قاری کی بصیرت اتنی کمزور ہے کہ جسے وہ حقیقی سمجھتا ہے اُسے وہ غیر حقیقی سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔

ادب میں تو اپنی رضا سے غیر یقینی کیفیت کو تیاگنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

لہٰذا افسانوی کردار کے بارے میں نقاد اور قاری ہمیشہ اس بحث کو جاری رکھیں گے کہ کیا حقیقی ہے؟ جسے افسانہ نگار حقیقی سمجھتا ہے وہ قاری کے نزدیک غیر فطری ہے اور جسے قاری حقیقی سمجھتا ہے وہ افسانہ نگار کے لئے سطحی ہے۔ ویسے بھی بیچارے ادیب سے ہر قسم کے مطالبے کئے جاتے ہیں۔ کچھ مطالبے تو اب ادیب کو اپنے پڑھنے والوں سے بھی کرنے چاہئیں۔ موسیقی، رقص اور مصوری سے لطف اندوز ہونے کے لئے کچھ باتوں کا علم ضروری ہے۔ لیکن ادب سے محظوظ ہونے کے لئے صرف الفاظ کا پڑھ لینا ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواندہ مگر غیر تربیت یافتہ پڑھنے والوں کی تسلی کے لئے افسانہ نگار کبھی بھی کوئی کردار مکمل پیش نہیں کر سکتا۔ کردار نگاری کو کامیاب بنانے کے لئے افسانہ نگار کچھ تو قاری کے تصورِ حقیقت کو قبول کرے گا تاکہ وہ افسانے کو پڑھ سکے اور کچھ اپنا تصور پیش کرے تاکہ کرداروں میں بصیرت ملے۔ اس بات میں خطرہ یہ ہے کہ کردار مسخ نہ ہو جائے اور مسخ شدہ کردار در حقیقت نامکمل ہے اور نامکمل کردار زندگی اور افسانہ دونوں کے نقطۂ نظر سے غیر حقیقی ہوتے ہیں۔

سومرسٹ ماہم نے لکھا ہے:۔

"ادیب اصل کی نقل نہیں کرتا۔ وہ اس سے جو لینا چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ کچھ خصوصیات ہیں جنہوں نے اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کی۔ ذہن کا موڑ ہے جس نے اس کے تخیل کو متحرک کیا ہے افسانہ نگار ان سے کردار کی تشکیل کرتا ہے۔ اس سے اُسے کوئی سروکار نہیں کہ کردار اصل سے صحیح مماثلت رکھتا ہے یا نہیں، وہ صرف اپنے مقصد کو بآسانی پورا کرنے کے لئے امکانی یگانگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔"

اس مقام پر ایلین کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں:۔

"ہر انسان کے دو پہلو ہوتے ہیں جو تاریخ اور افسانے کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ وہ سب کچھ جس کا کہ آدمی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے یعنی اس کے اعمال اور اس کا روحانی وجود جو کہ اس کے اعمال سے اخذ کیا جا سکتا ہے، تواریخ کے شعبے میں شامل ہے۔ لیکن اس کا رومانی پہلو خالص جذبات کا حامل ہے یعنی خواب، شدتِ غم اور خود کلامی جن کا بیان شرم کے باعث نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت کے اس پہلو کو پیش کرنا ناول نگار کے اہم ترین فرائض میں سے ایک ہے۔ تواریخ نگار قلمبند کرتا ہے جب کہ ناول نگار کے لئے تخلیق کرنا ضروری ہے۔"

افسانوی کردار روزمرہ کی زندگی سے مکمل اور مجموعی طور پر مماثلت نہیں رکھتا بلکہ وہ اُن سے محض مناسبت رکھتا ہے۔ جس طرح عام زندگی میں افراد کے باہمی رشتے اور تصادم ہوتے ہیں اسی طرح افسانے اور ناول میں کرداروں کی اپنی دنیا اور اپنی زندگی جنم لے چکی ہوتی ہے۔ اُن کا باہمی رشتہ اور تصادم، پلاٹ، ماحول اور دوسرے کرداروں کی باہمی آمیزش اور آویزش سے متعین ہوتا ہے اس لئے روزمرہ کی زندگی میں چلتے پھرتے افراد کی کسوٹی پر افسانوی کردار کی حقیقت کو پرکھنا صحیح نہیں۔ فارسٹر نے ہوموسیپینز اور ہوموفکٹس کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہوموفکٹس یعنی افسانوی کردار پیدا ہوتا ہے، مر سکتا ہے، وہ کچھ خوراک اور نیند چاہتا ہے، وہ انسانی رشتوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہم اس کے بارے میں اپنے کسی بھی دوسرے فرد سے زیادہ جان سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے خالق اور راوی ایک ہی ہیں۔

فارسٹر نے ایک اہم حقیقت کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے کہ افسانہ ایک فنی پارہ ہے جس کے اصول روزمرہ کی زندگی کی مانند نہیں ہوتے۔ اس لئے اگر کردار اصلی ہے تو اس کو پرکھنے کا معیار روزمرہ کی زندگی نہیں ہو سکتا بلکہ کہانی کی وہ دنیا ہے جس میں کہ وہ پیدا ہوا ہے اور نشوونما پا رہا ہے۔ افسانے میں کردار نگاری کی کامیابی افسانے کے ماحول کی مناسبت سے متعین کی جا سکتی ہے جو کہ اُس روزمرہ کی زندگی سے مختلف ہے جو ہم عام طور پر بسر کرتے ہیں۔ اس لئے جب افسانے پر بحث ہوتی ہے تو اس بات کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ افسانہ زندگی نہیں اور نہ ہی زندگی کا نعم البدل ہے بلکہ زندگی کی صداقت کی بنیاد پر ایک نئی زندگی کی تخلیق ہے، ایک نئی دنیا کی تعمیر ہے جس کے اپنے بھی کچھ اصول ہیں جو کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جن سے کرداروں کی زندگی متعین ہوتی ہے اور ان اصولوں کی بنا پر ہی کردار کی حقیقت کی پرکھ کی جا سکتی ہے۔ افسانوی کردار پر روزمرہ کی زندگی کے اصول منطبق کر کے اُسے غیر فطری قرار دے دینا ظاہر کرتا ہے کہ قاری کو نہ تو زندگی سے آگہی ہے اور نہ فن سے آشنائی۔ ورنہ وہ اس کردار کی اصلیت کو جاننے میں غلطی نہ کرتا۔ زندگی کے کردار اور افسانے کے کردار میں فن کی ایک خلیج ہے جو دیوارِ چین نہیں۔ لیکن زندگی سے منسلک ہوتے ہوئے بھی اُسے زندگی کی ریاست سے فن کی عملداری میں لے آتی ہے جس کے باعث کردار، اس کا طرزِ زندگی

اور حقوق شہریت بدل جاتے ہیں جبکہ بہت سے بنیادی حقوق مشترک رہتے ہیں عام طور پر قاری ایک ریاست سے دوسری ریاست میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتا رہتا ہے۔ جس کے باعث فن کے لئے ضابطے کے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی کردار ہم سے مماثلت رکھتا ہو۔ لیکن اگر وہ مماثلت نہیں رکھتا تو اس بنا پر اس کی شخصیت چھین نہیں جاتی۔ افسانہ نگار کو اپنے تخلیق کردہ کردار کی مکمل زندگی کا شعور لازمی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کو بیان کرے۔ اگر افسانہ نگار اپنے کردار کی مکمل زندگی سے آگاہی کے بغیر کسی ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو وہ نہ صرف نامکمل ہوگا بلکہ اس کی اصلی زندگی کی نمائندگی بھی نہیں کر سکتا۔ کردار کی منقسم شخصیت کو بھی پیش کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ ترگنیف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کردار کا علم حاصل کرنے کے لئے اس کی سوانح حیات تیار کرتا تھا۔ ہر وہ عمل جو اس نے کیا ہے اور کہانی کے شروع ہونے تک اس کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے، جس طرح کہ پولیس کسی عادی مجرم کا ریکارڈ تیار کرتی ہے۔ اس لئے وہ افسانہ نگار جو اپنے کردار کا مکمل اور جامع شعور رکھتا ہے وہ ہی اس کے اصلی خاصہ کو بیان کر سکتا ہے جو عام طور پر ہماری نظر سے پوشیدہ رہتا ہے، کیونکہ وہ ہمارے اس مشاہدے سے باہر ہے جو آنکھ نے کیا ہے اس لئے غیر حقیقی ہے۔ افسانہ نگار کی آنکھ میں وہ آنکھ تو شامل ہے ہی جو ہم سب کے پاس ہے لیکن اس کی بصارت میں تخیل کی پرواز اور وجدان کی گہرائی بھی ہے۔ فطری کردار پیدا ہوتا ہے۔ کھانا کھاتا ہے سوتا ہے، جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں اور پیش کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اعمال کسی حد تک اور کبھی کبھی اس کی اصلی زندگی کو عیاں کر سکتے ہیں۔

فارسٹر کے خیال میں صرف پیچیدہ کردار ہی کچھ عرصے کے لئے المناک طور پر چل سکتے ہیں اور ہمارے احساسات کو تحریک دے سکتے ہیں کیونکہ ایسے کردار کی یہ کسوٹی ہے کہ وہ ہمیں یقین آمیز طریقے سے متحیر کرنے کی قوت رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ کبھی بھی متحیر نہیں کرتا تو وہ سپاٹ ہے۔ اگر وہ یقین آمیز نہیں تو بھی وہ سپاٹ ہے جو پیچیدہ بننے کا فریب دے رہا ہے۔

کردار نگاری کی یہ بحث کہ کردار فطری ہے یا اصلی، حقیقی ہے یا خیالی مثبت ہے یا منفی، سپاٹ ہے یا مرکب وغیرہ اس پر منحصر ہے کہ افسانہ نگار کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ کردار نگاری کے لئے نقطۂ نظر بڑی اہم چیز ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ افسانہ نگار اس کردار کو کیسے پیش کرتا ہے۔ فن کے علاوہ اس کا انحصار بھی نقطۂ نظر پر ہے۔ افسانہ نگار کردار کو بے لاگ خارجیت سے اس کی زندگی میں بصیرت حاصل کر کے یا اپنے آپ کو اس میں شامل کر کے پیش کرتا ہے۔ کردار نگاری کے اس پہلو پر غور کرنے کے لئے کردار کی زندگی سے آگہی ضروری ہے۔ کردار کا سماجی پس منظر کیا ہے؟ کردار کی نفسیاتی ساخت کیا ہے؟ اس کردار سے متعلق اصلی اخلاق کیا ہے؟ افسانہ نگار کی اپنی شخصیت کیا ہے؟ کردار نگاری کے سلسلے میں یہ سوالات کافی اہم ہیں۔

افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ کردار کے سماجی پس منظر کا شعور حاصل کرے۔ سماجی پس منظر ایک وسیع بات ہے جس میں ہم کردار کی پرورش، تربیت، خاندانی حالات، ماحول اور معاشرتی بنیادوں کو جاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے افسانے میں ان میں سے کسی چیز کا ذکر نہ آئے اور عام طور پر ان کا بیان کرنا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ لیکن کردار سے ملتے ہی ہم اس کے سماجی پس منظر سے واقف ہو جاتے ہیں۔ سماجی پس منظر کی بات میں کسی ترقی پسند نظریے کے تحت نہیں کر رہا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کردار کی ایک بنیاد ہوتی ہے جس پر وہ استوار کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی کردار خلا سے پیدا نہیں ہوتا اور اسے ہوا میں معلق پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی پس منظر کو سماجی حقیقت نگاری سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

دوسری بات کردار کی نفسیاتی ساخت ہے۔ اس ساخت میں اس کی عمیق نفسیات کو گہرا دخل ہے۔ یعنی وہ زندگی نہیں جو وہ بسر کرتا نظر آتا ہے۔ وہ حرکات و سکنات نہیں جو بظاہر نظر آتے ہیں بلکہ اس کی وہ پوشیدہ زندگی جس سے وہ غم اور مسرت اخذ کرتا ہے۔ جو عیاں ہونے کے لئے ہماری نظر سے پرے چشم بینا کے منتظر رہتے ہیں۔ ہم افسانے میں چہرے نہیں شخصیت چاہتے ہیں۔ ہمیں کردار کی کیس ہسٹری نہیں چاہیئے اور نہ اس کے علاج کے لئے مشورے کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس کی اصلی پوشیدہ زندگی میں بصارت لازمی ہے جس میں ایک فرد شخصیت بنتا ہے اور ایک شخصیت افسانوی کردار بنتی ہے۔ اس لئے اسے نفسیاتی حقیقت نگاری کا نعم البدل نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔

تیسری بات اس کردار کی قدر اور اہمیت ہے۔ اس قدر یا اہمیت کا تعین کسی مخصوص روایتی اخلاقی اصول کے مطابق نہیں بلکہ اصلی اخلاق سے کرنا چاہیئے جو اخلاق اس کے کردار کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لئے یہ بحث کہ کردار مثبت ہے یا منفی بے سود ہے۔ جسے ہم منفی کردار کہتے ہیں اگر اس میں اصلی اخلاق کا جوہر

موجود ہے تو وہ چور، لٹیرا اور رہزن ہونے کے باوجود ہمت کر دار ہے۔

آخری بات افسانہ نگار کی اپنی شخصیت کی ہے جو سماجی پس منظر، عمیق نفسیات اور اصل اخلاق میں ایک رابطہ اور وحدت پیدا کرتی ہے۔ اس میں افسانہ نگار کا فن اور اس کا مزاج شامل ہے۔ ان تمام چیزوں کی امتزاج کے بغیر کسی اعلیٰ افسانے کی تخلیق ممکن نہیں۔ خارجیت کے فریب میں ہمیں افسانہ نگار کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے۔ ہنری جیمز نے درست کہا ہے کہ دوسرے لوگوں کے بارے میں ہمارا علم اپنے بارے میں ہمارے علم سے اخذ کیا ہوا ہوتا ہے۔ فلابیر نے کیا خوب کہا ہے کہ میں ہر وقت دوسرے لوگوں کے جسم میں شامل ہوں جو مجھ سے مختلف ہیں۔ بارہا افسانہ نگار یا ناول نگار اپنی شخصیت کے مختلف اجزا مختلف کرداروں میں شامل کر دیتا ہے۔ اس لئے کسی ایک کردار میں افسانہ نگار کی شخصیت تلاش کرنا لاحاصل ہے۔ فلابیر حقیقی شخصیت ہے اور اس کا تخلیق کردہ کردار "ایما" (مادام بوواری) افسانوی کردار ہے۔ لیکن فلابیر نے لکھا ہے کہ "میں ایما ہوں"۔ اور فلابیر نے اپنے جسم میں زہر کے اثرات محسوس کئے۔ اس کے باوجود فلابیر نے اس کی خودکشی کا واقعہ حقیقی زندگی سے لیا تھا۔ ترگنیف کا خیال تھا کہ وہ کردار کو تخلیق نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ اپنے تخیل کو کسی زندہ آدمی پر مرکوز نہ کر دے۔ بغیر کسی خاص آدمی کے وہ اپنی تخلیق کو زندگی اور دائرہ خاص نہیں دے سکتا تھا۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ کردار کی تشکیل میں ادیب کی ذاتی شخصیت اور فنکارانہ شخصیت شامل رہتی ہے۔ بہت سے آدمی ایک کردار میں شامل ہو جاتے ہیں جسے امتزاج کہتے ہیں۔ ہنری جیمز نے لکھا ہے "ذاتی حالات کی کسی تصویر کا مواد زیادہ تر ڈیمز نر کے اپنے ذہن کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے۔" اور یہی بات کردار نگاری میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔

ایک حقیقی کردار کا افسانوی کردار بننا اور ایک افسانوی کردار کا حقیقی شکل اختیار کر لینا ہی کردار نگاری کے فن کا کرشمہ ہے۔ زندگی کے حقیقی کرداروں کو فن کے افسانوی کرداروں میں ڈھونڈنے کی کوشش میں ہم زندگی اور فن دونوں کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر حقیقی کردار کی روح کو افسانوی پیکر عطا کر کے اُسے پھر حقیقی کردار بنا دینے میں ہم زندگی اور فن دونوں حاصل کر لیتے ہیں۔

شعر و سخن

ابو محمد سحر

عشق کی سعیٔ بد انجام سے ڈر بھی نہ سکے
ہم تری چشمِ مروّت سے اُتر بھی نہ سکے

تو نہ ملتا مگر اللہ رے محرومیٔ شوق
جینے والے تری امید میں مر بھی نہ سکے

برق سے کھیلنے طوفان پہ ہنسنے والے
ایسے ڈوبے ترے غم میں کہ اُبھر بھی نہ سکے

حسن خود حسنِ مجسم سے پشیمان اُٹھا
آئینہ لے کے وہ بیٹھے تو سنور بھی نہ سکے

تشنہ لب بیٹھے ہیں میخانۂ ہستی میں سحرؔ
دل وہ ٹوٹا ہوا پیمانہ کہ بھر بھی نہ سکے

پُورن سنگھ ہنرؔ

جس گھر میں کبھی عیش کی بہتات ہوئی ہے
برسوں ہی وہاں بارشِ آفات ہوئی ہے

انداز یہ کہتا ہے ترے لطف و کرم کا
پہلے بھی کبھی تجھ سے ملاقات ہوئی ہے

ہر عہد میں گھٹتی رہی تقدیس حرم کی
ہر دور میں تکریمِ خرابات ہوئی ہے

محتاجِ ملاقات رہا ہے وہ ہمیشہ
اک بار تری جس سے ملاقات ہوئی ہے

مطلب کی تو ہوتی ہی نہیں تم سے کوئی بات
یہ بات ہوئی ہے کبھی وہ بات ہوئی ہے

سنتے ہیں ہنرؔ آج گئے اُس کی گلی میں
حضرت کی وہاں خوب مدارات ہوئی ہے

زیبؔ بریلوی

غم کے شعلوں سے پُر نور ہوتی گئی
منزلِ آرزو طور ہوتی گئی

جو کہانی چھپائی گئی ہم نشیں
وہ زمانے میں مشہور ہوتی گئی

جتنی ملتی گئیں زیبؔ آسانیاں
عاشقی اتنی مجبور ہوتی گئی

کاش وہ منظر کرم سے میری جانب دیکھتے
کاش اس مضراب سے بجتا ربابِ زندگی

ساری دنیا جس کو پی کر آج تک بدمست ہے
کس قدر پُر کیف ہے جامِ شرابِ زندگی

دورانِ اسیری نظروں میں ہر وقت نشیمن رہتا تھا
جب چھوٹ کے آئے گلشن میں ہم اپنا ٹھکانا بھول گئے

یہ کیفِ نظر کے عالم میں سرشارِ جمالِ مستی تھے
جب سامنے جامِ مے آیا ہم جام اُٹھانا بھول گئے

پریم وار برٹنی

ابھی واقف نہیں اس راز سے وہ دبانِ غزل
اس کے جلووں سے منوّر ہے شبستانِ غزل

شاعری ہے بہاروں کا تقاضہ جب تک
اسی انداز سے مہکے گا خیابانِ غزل

زلف ہے، پھول، شفق، جام، ستارے، رنگیت
ایک سے ایک دل آویز ہے عنوانِ غزل

اتنا گستاخ نہ ہو دستِ جنوں دیکھ ذرا
پھول کی رگ سے بھی نازک ہے گریبانِ غزل

زندگی تھک گئی حالات سے لڑتے لڑتے
حوصلہ پھر بھی محبت میں نہ ہارا میں نے

منزلِ زیست مجھے مل نہ سکی تیرے بغیر
ہر قدم پر تجھے رک رک کے پکارا میں نے

محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی

مکتوبِ اقبالؒ

بنام

مولوی انشاء اللہ خاں

مولوی انشاء اللہ خاں لاہور کے مشہور ہفتہ وار اخبار وطن (مرحوم) کے ایڈیٹر تھے۔ مندرجہ ذیل "مکتوب اقبال" ان ہی کے نام ہے جو وطن کے فائل ۱۹۰۵ء میں ملا ہے۔

شیخ محمد اقبال جو بعد میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام سے چار دانگِ عالم میں مشہور ہوئے جب بغرض تعلیم علوم و فنون یکم ستمبر ۱۹۰۵ء براہ دہلی و بمبئی ولایت روانہ ہوئے تو میر نیرنگ انبالوی اور شیخ محمد اکرام صاحب نائب ایڈیٹر رسالہ مخزن بھی دہلی تک اُن کے ساتھ رہے۔ تینوں بزرگ ۲ ستمبر کی صبح میں ۶ بجے میل سے دہلی پہنچے وہاں خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی، منشی نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ دہلی، منشی نور الدین ڈرائنگ ماسٹر نارمل اسکول دہلی وغیرہ موجود تھے۔ پہلے تو اسٹیشن سے یہ جماعت نذر محمد صاحب کے دولت کدے پر پہنچی وہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سب لوگ درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر درگاہ تک پہنچے۔ اوّل اقبال نے عالمِ تنہائی میں خواجہ علیہ الرحمۃ کے مزارِ مبارک کے سرہانے بیٹھ کر اپنی مشہور نظم "التجائے مسافر" پڑھی اور اُن کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں بیٹھے رہے۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے "التجائے مسافر" کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزارِ اقدس کی طرف مُنہ کر کے دوبارہ درد انگیز اور دلنشین لہجے میں پڑھا۔ درگاہ کی زیارت سے فارغ ہو کر وہ خشک روٹی جو حضرت محبوب الٰہی کے توشہ خانے کی جانب سے فقراء اور درویشوں کو دی جاتی ہے ان سب گریجویٹ درویشوں نے خوشی خوشی مزے سے کھائی۔ پھر سماع کا دور چلتا رہا۔ ولایت نامی قوال نے خوب رنگ جمایا۔ اس نوجوان قوال کو بھی حضرت محبوب الٰہی سے خاص واسطہ تھا کیوں کہ وہ حضرت صاحب کی اولاد میں تھا جو حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کے خاص اور پسندیدہ قوال تھے۔ جب درگاہ سے یہ جماعت رخصت اور روانہ ہوئی تو واپسی میں چلتے چلتے مرزا غالب کے مزار پر بھی گذر ہو گیا۔ مرزا غالب کے مزار کا آدھا چبوترہ مٹی میں پوشیدہ تھا۔ خواجہ سید حسن نظامی اُسی رُخ ایک کچی دیوار کا تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ یہ چھوٹی دیوار مزارِ غالب کے دائیں پہلو میں کھڑی تھی۔ نیرنگ اور اقبال پر اس سین کا اتنا اثر تھا کہ افسردگی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اکرام، نذر محمد، نور الدین کی حالت بھی ایسی ہی تھی اور مزارِ غالب کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ ولایت قوال نے لوگوں کی اجازت سے غالب کی مشہور غزل ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

گانا شروع کیا۔ جب سُریلی اور مہین آواز میں غالب کا یہ شعر

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

گایا تو سب پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اقبالؒ جھوم جھوم کر شعر کی تکرار کراتے تھے۔ اس پُر عبرت و پُر حسرت سین کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور جب سب لوگ چلنے کو اُٹھے تو اقبال نے جوشِ محویت میں غالب کے مزار کو بوسہ دیا اور سب لوگ شہر کو روانہ ہوئے۔ شب مولوی نذر محمد کے مکان پر بسر ہوئی اور ۳ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح میں ۸ بجے بمبئی میل سے اقبال بمبئی ہوتے ہوئے ولایت

روانہ ہوئے۔ ۳ ستمبر کو بمبئی پہنچے ایک انگلش ہوٹل میں قیام کیا۔ جہاں ۷ ستمبر کو دو بجے وکٹوریہ ڈاک پر پہنچے۔ طبی معائنے کے بعد اپنے جہاز "تیرا" پر سوار ہوئے اور کوئی تین بجے جہاز نے حرکت کی۔

(محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی)

نامۂ اقبال از عدن

(وطن لاہور نمبر ۳۹ جلد ۵ - مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

مخدوم و مکرم مولوی صاحب۔ السلام علیکم

آپ سے رخصت ہو کر سلامی نشانِ وشوکت کے اس قبرستان میں پہونچا جس کو دہلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا۔ بعد ازاں حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور تمام دن وہیں بسر کیا۔

اللہ اللہ۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ مرزا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران گوشہ میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے۔ جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا۔ اس ظالم نے مرزا کے مزار کے قریب بیٹھ کر ع دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی۔ کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں۔ بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنکھیں پر نم ہو گئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے دل کو تڑپا جاتا ہے۔

اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھا۔ دارا شکوہ کے مزار کی تاریکی اور خاموشی میں دل کے کانوں سے ہوا موجود کی آواز سنی۔ اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔

۲ ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۳ کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل پر پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں۔ مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلباء کے لئے جو ولایت جا رہے ہوں، نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے۔ گھاٹ یہاں سے قریب ہیں۔ ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب۔ غرض کہ ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے۔ صرف تین روپیہ یومیہ دو اور ہر قسم کا آرام حاصل کر لو۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے۔ جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آ جاتے ہیں۔ دکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علما میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ "محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے۔" میرے دل پر اس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہو گئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی۔ اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو۔ خوشی سے اس کا شوق کرو۔ ذرا مسکرایا اور کچھ پئے ہوئے بھی تھا، بولا

ع شرابِ شوق پینے سے سبھی غم دور ہو جائے[1]

---

[1] پارسی بڈھے نے اس مصرع میں شرابِ شوق اور غم کی مٹی پلید کی ہے (وطن)

میں نے سن کے کہا۔ وا رے بڈھے۔ خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کیسنٹ باڑی میں بکتا پھرے۔

اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو۔ بولا چین سے آیا ہوں۔ اب ٹرانسوال جاؤں گا۔ میں نے پوچھا چین میں تم کیا کام کرتے تھے۔ کہنے لگا سوداگری کرتا تھا۔ لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ میں نے سن کر دل میں کہا ہم ہندیوں سے تو یہ چینی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں شاباش چینیو، شاباش نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اسی سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سر نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔ مولوی صاحب! معاف کیجئے گا میں بے اختیار ہوں۔ لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں۔ اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رکھا ہے۔

ایک شب میں کھانے کے کمرہ میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یوروپین ہیں۔ فرانسیسی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یوروپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو۔ بولا بہت کم۔ پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی لیکن وہ نہ سمجھتا تھا۔ آخر مجبوری میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔

یہ نوجوان ترک ینگ ٹرکی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا میں کمال بے (ترکی کا سب سے مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے نہایت عمدہ تھے لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں ؎

ظلم و جورِ تو سفو جیہ ملت محو ابلیود
آدمیت ملک و ملت دشمن عبدالحمید

(یعنی ظلم و جور نے تمام قوم کو مٹا دیا ہے عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے)

اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ جس طریق سے رعایائے انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کئے ہیں وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت و خون کے ہو جانا یہ کرہ خاک انگلستان ہی کا حصہ ہے۔ ایک روز سر شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکول کی گراؤنڈ میں چند مسلمان طلبا کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور سکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس سکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی؟ کیا فنڈ نہیں ہے۔ یا اور کوئی وجہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبا پڑھنے کے لئے نہیں آتے اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ویسی ہم سر دست یہاں دے بھی نہیں سکتے۔ یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا۔ کیونکہ یہاں کے مسلمان تمول میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ ان میں عقل بھی ہے۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں۔

غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجیب شہر ہے۔ بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی

ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ یا امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو، فوراً ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔

یہاں پارسیوں کی آبادی اسی نوے ہزار کے قریب ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابلِ تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ۔ مگر میں اس قوم کے لئے کسی اچھے فیوچر کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرّہ یہ کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں۔ ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ و ریشہ میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دارومدار ہے۔ میں نے سکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔ چستی کی مورتیں تھیں۔ مگر تعجب ہے کہ ان کی خوب صورت آنکھیں ۸۰ فی صدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف کیوں توجہ نہیں کرتے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ اردوجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا لورڈ جی انگلستان میں کیا کرتا ہے۔ بولا "مجور کا لوگوں کے لئے لڑتا ہے"۔ ہوٹل کے نیچے مسلمان مزدور کا ندار ہیں۔ میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔ میں نے ایک روز ان سے پوچھا تم اُردو پڑھ سکتے ہو کہنے لگے نہیں۔ سمجھ سکتے ہیں پڑھنا نہیں جانتے۔ میں نے پوچھا کہ جب مولوی تمہارا نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے۔ مُسکرا کر بولا "اُردو"۔ یہاں پر ہر کوئی اُردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (وہی ہوٹل والا پیر مرد) کبھی ہندوستان میں نہیں گیا مگر اُردو خاصی بولتا تھا۔

میں بمبئی یعنی بابِ لنڈن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں۔ خدا جانے لنڈن کیسا ہوگا جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔ اچھا دیدہ خواہد شد۔ ۔ ستمبر کو ۲ بجے ہم وکٹوریہ ڈاک (گھاٹ) پر پہنچے۔ جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سیکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر یہ کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈرو۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح و سلامت منزلِ مقصود پر پہنچا دیں گے۔ غیر طبی معائنہ کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا۔ لالہ حنیت رام وکیل لاہور اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اوس روز حسنِ اتفاق سے بمبئی میں تھے۔ میں ان کا نہایت سپاس گذار ہوں کہ یہ دونوں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لئے ڈاک پر تشریف لائے۔ بہت سے اور لوگ بھی اس جہاز پر سوار ہوئے اور ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک ہجوم ڈاک پر تھا۔ کوئی تین بجے جہاز نے حرکت کی اور ہم اپنے دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے۔ یہاں تک کہ موجیں ادھر اُدھر سے آ آ کر ہمارے جہاز کو چومنے لگیں۔ فرانسیسی قوم کا مذاق اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے۔ ہر روز صبح کو کئی آدمی جہاز کی صفائی میں مصروف ہوتے ہیں اور ایسی خوبی سے صفائی کرتے ہیں کہ ایک تنکا تک جہاز پر نہیں رہنے دیتے۔ ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور عربی بولتے ہیں۔ جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں۔ اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آ جاتا ہے۔ ایک روز ایک افسر تختہ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا ادھر سے گذر ہوا۔ اتفاق سے یا غالباً ارادتاً یہ عورت اوس افسر کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہوئی گذری۔ ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اس کی نقل نہیں اُتار سکتے۔

کھانے کا انتظام بھی نہایت قابلِ تعریف ہے۔ میز بھی فرانسیسی تکلف کی گواہی دے رہا ہے۔ مگر اس جہاز پر ہم ہندوستانیوں کے لئے ایک بڑی دقت ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاز کے قریباً سب مسافر فرانسیسی ہیں۔ انگریزی کوئی نہیں بولتا جہاز کے تمام ملازم فرانسیسی بولتے ہیں اور بعض اوقات ان کو اپنا مطلب سمجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اگرچہ فرانسیسی جہازوں میں ہر طرح کی آسائش ہے تاہم میری رائے یہی ہے کہ ہم لوگوں کو انگریزی کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کرنا چاہیئے۔ اُن کے مسافر سب کے سب انگریزی داں ہوتے ہیں اور علاوہ اس کے مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جہاز پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ ہمارے اس جہاز میں ۷۰ مسافروں سے زیادہ نہیں ہیں۔

ہم لوگ رات کو اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور صبح سے شام تک تختۂ جہاز پر کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی پڑھتا ہے۔ کوئی باتیں کرتا ہے

کئی پھرتا ہے۔ کیبن میں جہاز کی جُنبش کی وجہ سے طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر تختۂ جہاز پر بہت آرام رہتا ہے۔ میرے تمام ساتھی دو تیسری روز "مرضِ بحری" میں مبتلا ہو گئے۔ مگر الحمدللہ کہ میں محفوظ رہا۔ مجھ سے اکثروں نے دریافت کیا کیا تم نے کبھی پہلے بھی بحری سفر کیا ہے؟ جب میں نے جواب دیا کہ نہیں تو وہ حیران ہوئے اور کہا کہ تم بڑے مضبوط آدمی ہو۔ بمبئی سے ذرا آگے نکل کر سمندر کی حالت کسی قدر متلاطم تھی۔ خواجہ خضر صاحب کچھ خفا سے معلوم ہوتے تھے۔ اتنی اتنی اونچی موجیں آتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ ایک شب ہم کھانا کھا کر تختۂ جہاز پر آ بیٹھے۔ کچھ عرصہ کے بعد سمندر کی سرد ہوا نے ہم سب کو سُلا دیا۔ مگر دفعتہً ایک خوفناک موج نے اُچھل کر ہم پر حملہ کیا اور تمام مسافروں کے کپڑے بھیگ گئے۔ عورتیں بچے اور مرد نیچے بھاگ کر اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے اور ہم تھوڑی دیر کے لئے جہاز کے ملازموں اور افسروں کے تمسخر کا باعث بنے رہے۔ سُنتے ہیں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اس نظارے کی یک نیتی سے اُکتانے لگی۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں جو زور سے اٹھتی ہیں۔ ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہے اور حدِ نظر تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطحِ سمندر پر روئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت دل فریب ہے اگر اس میں موجوں کی دہشت ناک کشاکش کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی قوت سے جہاز ایک معمولی کشتی کی طرح جنبش کرتا ہے۔ اُٹھتا اور نیچے ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر چونکہ آنکھیں اس نظارے سے کسی قدر مانوس ہو گئی ہیں اور نیز جہاز والوں کے چہروں کا اطمینان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک معمولی بات ہے اس واسطے ہم کو بھی خوف کا احساس نہیں ہوتا۔ یورپین لڑکے لڑکیاں تختۂ جہاز پر دوڑتے پھرتے ہیں اور یہ محسوس بھی نہیں کرتے کہ جہاز میں ہیں۔

ہمارا ہم سفر ایک پادری ہے جو جنوبی ہندوستان سے آیا ہے اور اب اٹلی کو جا رہا ہے۔ گذشتہ رات مجھ سے کسی نے کہا کہ یہ فرانسیسی پادری بہت سی زبانیں جانتا ہے اور روسی زبان خوب بولتا ہے۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے میرے سوال پر نہایت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کون ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ جہاز پر دیا سلائی استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تختۂ جہاز کی ایک طرف ایک کمرے کی دیوار پر پیتل کی ایک انگیٹھی سی لگا رکھی ہے جس میں چند لکڑیاں آگ لگا کر رکھ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو سگرٹ یا سگار شروع کرنا ہو اس انگیٹھی سے ایک لکڑی اُٹھا لیں۔

جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوتِ لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارعِ اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے۔

بابی انت وامی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آج ۱۲- ستمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اُٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمۂ آب میں سے اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسے ہمارا دریائے راوی۔ شاید صبح کے پُرتاثیر نظارے نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ سکونِ قلب بھی ایک نایاب شے ہے۔ ہر وقت کی اُلجھن اور بے تابی اچھی نہیں۔ طلوعِ آفتاب کا نظارہ ایک درد مند دل کے لئے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی آفتاب ہے جس کے طلوع و غروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں سمندر میں اس کی کیفیت ایسی ہے کہ

ع نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے میں تو ان کو قابلِ معذوری سمجھتا ہوں۔ ناسخ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھئے تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب جو ۲ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے ہیں اور وہ پادری صاحب جو ٹالسٹائی کے نام سے ناواقف معلوم ہوتے تھے، اس وقت جہاز کی اوپر کی چھت پر کھڑے اسی نظارے کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ یہ پادری صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان میں ایک خاص ہنر ہے اور وہ یہ کہ ہر کسی کو باتوں میں لگا لیتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں مگر بہت شکستہ اور مجھ کو جب بلاتے ہیں ٹالسٹائی کے نام سے۔ کل مجھ سے پوچھتے تھے تم ہندوستان کا ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر کھاتی ہے تب جا کے کہیں ایک ٹالسٹائی

پیدا ہوتا ہے۔

کونسٹ صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کل رات ان سے ہندوستان کے پولیٹیکل معاملات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ عربی اور فارسی جانتے ہیں۔ سر ولیم میور کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی تو کہنے لگے کاش یہ شخص ذرا کم متعصب ہوتا۔ عمر خیام کے بڑے مداح ہیں۔ مگر میں نے ان سے کہا کہ اہل یورپ نے ابو معانی بجنی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ عمر خیام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے

اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس یہی دل چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں۔

اللہ رے خاکِ پاک مدینہ کی آبرو

خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی! باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا۔ لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی۔ آہ! اے پاک سرزمین تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی سیاہ خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو! کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

از عدن مورخہ ۱۲ ستمبر

راقم محمد اقبال

بانہال سُرنگ

نئی بانہال سرنگ کی ایک گزرگاہ مکمل ہو گئی ہے۔ دونوں طرف سے پہاڑ کو اندر ہی اندر سے کاٹا جا رہا تھا۔ دونوں سروں کے درمیان آخری چٹان کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا ہے اور راستہ مکمل ہو گیا ہے۔ نئی سرنگ ۱½ میل سے زائد لمبی ہوگی اور ۱۹۵۶ء کے آخر تک مکمل ہو جائے گی۔ اس کی دو گزرگاہیں ہوں گی۔ دونوں ۱۲ فٹ چوڑی اور ۱۴ فٹ بلند ہوں گی۔ دونوں گزرگاہوں میں یک طرفہ ٹریفک ہوگا۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سرنگ کی تعمیر کا کام بہت زیادہ تیزی سے ہوا ہے اور یہ سرنگ دنیا کی نصف درجن بہترین اور بڑی سرنگوں میں سے ہوگی۔ سرنگ مکمل ہو جانے پر یہ دنیا کی جدید ترین سرنگ ہوگی۔ اس میں ٹریفک پر کنٹرول، گاڑیوں کی گنتی وغیرہ سب کام آٹومیٹک ہوگا۔ نئی گزرگاہ کو اس سال کے آخر تک ٹریفک کے لئے کھول دیا جائے گا۔ اس سے جموں و سری نگر کے درمیان ۸ میل کا دشوار گزار فاصلہ کم ہو جائے گا۔ اس سرنگ میں سے دونوں طرف نارمل طور پر اڑھائی اڑھائی سو موٹریں ایک گھنٹے میں گزر سکیں گی۔ سرنگ میں تازہ ہوا پہنچانے کے لئے مناسب طریق انتظام کیا جائے گا۔ ہوا کی رفتار ۸ فٹ فی سیکنڈ تک محدود ہوگی، کیونکہ ہوا کی رفتار اس سے زیادہ ہو تو پیدل چلنے والوں کو دقت کا سامنا ہوگا۔ تازہ ہوا سرنگ میں داخل کرنے کے لئے مشینری سرنگ کے داخلی دروازے کے قریب نصب کی جائے گی اور یہ گول دائروں کی شکل میں ہوگی۔ سرنگ کے اکثر حصوں میں اسی اسی فٹ کے فاصلے پر روشنی کا انتظام ہوگا تاہم دروازوں کے نزدیک دس دس فٹ کے فاصلے پر روشنی ہوگی۔ سرنگ میں چار چار سو فٹ کے فاصلے پر فائر سٹیشن ہوں گے جہاں پانی، آگ بجھانے والی کیمیائی اشیاء کے آلات۔ ریت کے بورے، ٹیلیفون اور خطرے کے سگنلوں کا انتظام ہوگا۔

کاربن مونو آکسائیڈ گیس کو ماپنے والے آلات کا بھی انتظام ہوگا۔ تمام فائر سٹیشنوں، گیس ماپنے والے آلات، ٹریفک سگنلوں اور ہوا کا انتظام کرنے والی مشینری کا کنکشن کنٹرول روم سے ہوگا۔ گیس ماپنے والے آلات کا تعلق خطرے کی گھنٹیوں سے ہوگا۔ جونہی گیس بڑھ جائے گی خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں گی۔ الیکٹرک ٹریفک کاونٹر، ہوا کی رفتار اور رُخ کو ماپنے والے میٹر، سڑک کو برف سے صاف کرنے کے لئے نمک اور ریت کے گودام ہوں گے۔

ڈال ڈال کے پات

زندگی بے لُطف ہو جائے اگر ۔ ۔ ۔ ۔

بے قاعدگی نہ ہو

کنہیا لال کپور

ڈاکٹر، حکیم اور فلسفی کہتے ہیں کہ اگر زندگی میں باقاعدگی نہ ہو تو انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ خدا جانے ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ ڈاکٹر، حکیم اور فلسفی جو بھی کہیں ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ اگر زندگی میں باقاعدگی آ جائے تو زندگی، زندگی نہیں ہوتی یعنی زندگی کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ آخر یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی ہر صبح ایک مقررہ وقت پہ اُٹھے۔ ہر روز ایک ہی سڑک پر سیر کرنے جائے۔ سیر سے واپس آ کر غسل کرے۔ مقررہ وقت پہ چائے پیئے۔ چائے میں نپی تُلی چینی ڈالے۔ شام کے پانچ بجے کلب میں پہنچ جائے۔ کبھی نہ ملنگے، ٹینس یا برج کھیلے اور رات کے دس بجے بستر پہ دراز ہو جائے۔ آدمی نہ ہوا ٹِک ٹِک کرنے والا کلاک یا کلاک کے پُرزے بنانے والی مشین ہوا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

سچ پوچھئے تو زندگی کو پُرلطف بنانے کا راز علامہ کے اس شعر میں مضمر ہے۔ در اصل جو مزہ بے قاعدگی میں ہے وہ باقاعدگی میں کہاں۔ مثال کے طور پر ہمیں ہر روز شیو بنانے کی عادت ہے۔ لیکن آج صبح بارش ہو رہی ہے اور دل شیو کرنے کو نہیں چاہ رہا تو بھئی ہم شیو نہیں کریں گے۔ آخر کون سی آفت آ جائے گی جو ایک دن شیو نہیں کیا۔ مزے سے بستر میں بیٹھیں گے۔ اخبار پڑھیں گے یا گرم گرم چائے پئیں گے۔ یہی ہوگا نا جب آئینے میں اپنی صورت دیکھیں گے تو چہرہ کچھ غیر مانوس سا دکھائی دے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں ہم اس چہرے کی اجنبیت سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کریں گے۔ اس کے باوجود اگر وحشت محسوس ہوئی

عرفانِ عشق

حسرت موہانی

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا
حامل ہوں کس کے نغمۂ نَے کے پیام کا

منظر اسے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے انس
دنیائے جاں میں شور ہے اس کے دوام کا

مخلوق اک نگاہِ کرم کی اُمیدوار
مستانہ کر رہی ہے جوگن رادھے شیام کا

محبوب کی تلاش ہوئی رہبرِ عجب
بر سطنے سے جو قصد کیا نند گام کا

گوکل کی سرزمیں بھی عزیزِ جہاں ہی
کلمہ پڑھا جو اُن کی محبت کے نام کا

برندا کا بن بھی رَوِشِ جنّت بنا کے تھا
پامالِ نازِ انھیں کی بہارِ خرام کا

لبریز نور ہے دلِ حسرت زہے نصیب
اک عشقِ مشک نام کے شوقِ تمام کا

(قومی آواز)

تو لاحول پڑھ کر آئینہ پٹک دیں گے لیکن شیو کرنے کے مخمصے میں نہیں پھنسیں گے۔ لو اگر موسم چار پانچ دن خراب رہا تو داڑھی اچھی ہے۔ داڑھی بڑھنے دیں گے۔ ممکن ہے بڑھی ہوئی داڑھی اتنی اچھی لگے کہ ہم داڑھی رکھ لیں اور یوں شیو کرنے کی زحمت سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔

روزانہ غسل کرنا اچھی عادت ہے۔ لیکن جنوری کے مہینے میں جب پانی کے تصور سے روح لرزنے لگتی ہے یہ کیا ضروری ہے کہ ہم غسل خانے کا رُخ کریں۔ ہم تب تک انتظار کریں گے جب تک گلابی جاڑے کا موسم نہیں آتا اور پھر نہایت اطمینان سے غسل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جسم سے کافی غلاظت اُترے گی۔ اس شخص کے حق میں دعا کریں گے جس نے صابن ایسی مفید چیز ایجاد کی اور غسل کرنے کے بعد محسوس کریں گے کہ یہ عمل جسم کی صفائی کے لئے کتنا ضروری ہے۔ اب آپ ہی کہئے کہ روزانہ غسل کرنے میں وہ لطف کہاں جو ایک لمبے عرصے کے بعد غسل کرنے میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (آواز دہلی)

موسیقی نمبر کے باب میں

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی :۔

اُردو رسالوں میں "آج کل" ہر حیثیت سے ممتاز رہا ہے۔ اس کے خاص نمبر عموماً قابلِ قدر ہوتے ہیں اور اس سال کا "موسیقی نمبر" مجموعی حیثیت سے سب پر سبقت لے گیا۔ "آج کل" کا ادارہ اس شاندار کارگزاری پر مبارک باد کا اور شکریے کا مستحق ہے۔

میرے مخدوم اور مکرم،

۱۷۔ اگست کا خط ملا۔ میں نے اس شمارے کے مقالوں کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔ موسیقی کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہوں لیکن موسیقی کم بخت ایسی چیز ہے کہ اس کے اثر سے کوئی نہیں بچا۔ اس لیے تعجب کی بات نہیں کہ مجھ پر بھی اس کا جادو کارگر ہوتا ہے۔ میری رائے مشکل ہی سے وزن رکھ سکتی ہے۔ مگر آپ کی فرمائش کو کیسے بجا نہ لاتا۔ یہ چند سطور جو اوپر لکھ آیا ہوں، حاضر ہیں۔

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

"آج کل" کا موسیقی نمبر فقط دیدہ زیب ہی نہیں دلچسپ اور مفید معلومات سے لبریز ہے گویا موسیقی کی ایک مختصر مگر جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔

مکرمی تسلیم،

موسیقی نمبر کے متعلق میری ناچیز رائے حاضر ہے۔ اس نمبر کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

کاش لکھنؤ کے ماہرینِ موسیقی خصوصاً نواب منیر مرزا صاحب قدر کے متعلق جو ماہرِ موسیقی ہونے کے علاوہ ہندی کے بہت اچھے شاعر تھے اس نمبر میں کچھ ہوتا۔

اُن کی ٹھمریاں خصوصاً ہولیاں صرف لکھنؤ میں نہیں دور دور مشہور ہیں

پھول گیندوا نہ مارو بہراج

لگت کرجوا میں چوٹ

ایسے برج کے کیا تمہیں ہوا جار سے دار

مو پے رنگ بھی نہ ڈارو سیاں بار بار

اور نہ معلوم کیا کیا جواہر پارے ہیں۔

موسیقی میں ان کے شاگرد نواب صادق علی خاں تھے اور اُن کی شاگرد اُس زمانے کی تمام طوائفیں اور گویئے۔

جوشش ملسیانی

رسالہ 'آج کل' اردو کا موسیقی نمبر بابت ماہ اگست ۱۹۵۶ء نادر اور جدت آمیز تحفہ ہے جو ادارے نے فنونِ لطیفہ کی خدمت کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔ یہ خاص نمبر اپنے متنوع مضامین کی وجہ سے بہت دلکش، بہت جامع اور بہت قابلِ قدر ہے۔ اس میں زندہ و مرحوم سازندوں اور نوازندوں کی ۹۰ تصاویر بھی ہیں۔ ان میں چار پانچ تصاویر رنگین بھی ہیں۔ مختلف ماہرانِ موسیقی نے بحیثیت مضمون نگار اس فن کے ہر ایک پہلو پر بحث کی ہے۔ یہاں تک کہ راگ کی تخلیق اور اقسام پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ مختلف قسم کے ساز بھی تصویروں کے ذریعے منظر نواز ہیں۔ اس فن کے بڑے بڑے مشاہیر اور ان کے کمالاتِ سازندگی و نوازندگی پر سیر حاصل تبصرے کیے گئے ہیں۔ ادارہ نے جس محنت اور جس حُسن و سلیقے سے کام لے کر یہ خاص نمبر مرتب کیا ہے۔ اس کے لئے وہ بہت کچھ داد اور تحسین کا مستحق ہے۔ یہ خاص نمبر بلاشبہ دیکھنے اور پڑھنے

کے قابل ہے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ طویل اور کامیاب محنت کے ذریعے ہندوستان بھر کے مشاہیرِ موسیقی اور ان کے کمالات کو زندۂ جاوید رکھنے کی کوشش کی گئی ہے

تلوک چند محروم

تمام عمر میں دیکھی سُنی نہ تھی ہم نے — جو "آج کل" نے دکھادی ہے شانِ موسیقی
ہزار نغمۂ خاموش گوشِ دل نے سُنے — ہے صفحہ صفحہ میں اس کے بیانِ موسیقی
نظرنواز تصاویر سے مزین ہے — ہر ایک نقش ہے شرحِ بیانِ موسیقی
ستائش اس کی کریں گے فن آشنا محروم
جناب کب سے ہوئے نکتہ دانِ موسیقی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

جب سے رسالہ "آج کل" نکلنا شروع ہوا ہے، میں اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک اونچے درجے کا رسالہ ہے۔ عرش ملسیانی صاحب کے زیرِ ادارت اس نے ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے۔ "آج کل" کے علاوہ ہندوستان میں کسی دوسرے رسالے نے ایسے نئے نئے دل چسپ سالانہ نمبر نہیں نکالے۔ "آج کل" کا موسیقی نمبر تو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے لئے "آج کل" کا ادارہ محبانِ اردو کی طرف سے مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہے۔ میری دُعا ہے کہ "آج کل" روز افزوں ترقی کرتا جائے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

موسیقی نمبر موصول ہوا۔ دل کا سرور اور آنکھوں کا نُور بڑھ گیا ہے۔ آپ نے بڑی محنت کی ہے اور اسے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ اس موضوع سے متعلق اتنا سامان شاید ہی اُردو میں کہیں یک جا ہو۔

ملک رام

"آج کل" کا موسیقی نمبر ملا۔ آپ کی محنت کی داد نہیں دے سکتا۔ کہاں کہاں سے مضامین جمع کئے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ سب مضمون اُردو میں نہیں لکھے گئے ہوں گے لیکن ترجمے میں بھی اصل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس ایک پرچے ہی سے ہندوستان کی موسیقی، اس کے مختلف مرکزوں، مشہور گانے والوں (والیوں) وغیرہ سے متعلق اتنی معلومات مل جاتی ہیں کہ انسان بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ ایسے کامیاب نمبر کی ترتیب و اشاعت کے لئے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

امتیاز علی عرشی

"آج کل" کا موسیقی نمبر ملا۔ دیکھ کر اور پھر پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ بعض مقالے (جن میں خود میرا اعتماد شامل نہیں) بہت ہی معلومات افزا ہیں۔ راگ اور راگنیوں کی تصاویر بھی بہت خوب ہیں۔ ہمارے یہاں بھی راگ مالا کا ایک بہت عمدہ مخطوطہ تھا۔ وہ آج کل دہلی ہی میں ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ تصاویر بھی دیں گے، تو اس کی نشان دہی کر دیتا۔ بہرحال، یہ شمارہ ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ برابر ترقی کرتا رہے گا۔
مختلف اساتذہ کے موسیقی سے متعلق شعروں کے انتخاب کی بھی داد دیتا ہوں

معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر معارف

"آج کل" کے ہر نمبر کو میں شوق اور دل چسپی سے پڑھتا ہوں، اگرچہ فنِ موسیقی سے نابلد ہونے کی وجہ سے بعض مضامین میری فہم سے باہر تھے۔ پھر بھی قریب قریب کل مضامین پڑھے۔ میرے خیال میں اُردو میں اس موضوع پر اتنے معلومات یکجا نہیں مل سکتے اور آپ نے یہ نمبر نکال کر نہایت مفید کام انجام دیا ہے۔ اس کی حیثیت تو مستقل تصنیف کی ہے اُردو لٹریچر میں یہ نمبر یادگار رہے گا۔

سکندر علی وجد

میں نے "آج کل" کا موسیقی نمبر بڑے شوق اور توجہ سے پڑھ لیا ہے۔ آپ نے یہ دل کش گلدستہ شائع کر کے اُردو اور موسیقی دونوں کی صحیح خدمت انجام دی ہے۔ میں اس کارنامے پر آپ اور آپ کے ساتھیوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ تصاویر اور مضامین کے سلسلے میں آپ کا حسنِ انتخاب لائقِ ستائش ہے تمام مضامین کی زبان نہایت فصیح اور رواں ہے اور اسے میں آپ کا "تصرف" سمجھتا ہوں۔ ان مضامین کے ترجمے اور تصحیح میں آپ لوگوں کو کتنی محنت اور دیدہ ریزی کرنی پڑی ہوگی۔ اگر آپ اسی طرح جنوری ۵۷ء میں آرٹ نمبر یا رقص نمبر شائع کریں تو کتنا اچھا ہوگا۔ میں اس کارِ خیر میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کرنے کا وعدہ کرتا ہوں کیونکہ مجھے اس دنیا سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء

قاضی معراج دھولپوری

نمکدانِ تاریخ

۷۶، ہجری ۱۳

از منشآتِ [illegible] ہندوستانی

۷۶ ہجری ۱۳

طلوعِ مرتبت "موسیقی نمبر" سال نامہ "آج کل" دہلی

۵۶ عیسوی ۱۹

آویزۂ تاریخ و فن

۷۶ ہجری ۱۳

رفیع قدر، مشہور خلایق

۵۶ عیسوی ۱۹

مظہرِ نو، عرشِ حدیقہ - فرخندہ کمالِ باغ

۱۳ ہجری ۲۰ ۱۳ بکرمی ۲۰

اُردو کا مقبولِ عوام، محسنِ ہند، مصوّر رسالہ

۷۶ ہجری ۱۳

(۱)

حسن آرا، ماہ پیکر، دیدہ زیب، دل پذیر
خامۂ مستِ برجستہ عیسوی سال گفت

خوش بیانِ خوش لسانِ خوش نظامِ خوش بیاں
تحفۂ موسیقیٔ ہندوستان شیریں کلام

۵۶ عیسوی ۱۹

(۲)

نشرِ عالم ہو گیا ہے "آج کل" کی معرفت
لکھ دو ہجری سالِ معراج بہرِ یادگار

صورتِ راز سراپا تھا ابھی تک جو نہاں
مستند آوازۂ موسیقیٔ ہندوستاں

۷۶ ہجری ۱۳

(۳)

در جہانِ ادب آراستہ گلزارِ نو
مصرعِ تاریخِ ہجری ہاتفِ معراج گفت

عرضِ کردہ شوکتِ ہندوستاں مستزاد
اے خوشا موسیقیٔ نازک زبانِ طوطیٔ نہاں

۷۶ ہجری ۱۳

(۴)

"آج کل" کا سال نامہ دل پسند دل فریب
مصرعِ سالِ عیسوی خامۂ معراج لکھ

حسن بنیۂ طلعت، سربلند و سرفراز
نوبہارِ دل ارضِ ہند موسیقی نواز

۵۶ عیسوی ۱۹

شمس کنولی

سرگم کے سات سُروں میں اُن کو یک جا کرنے کے لئے جتنے بڑے ظرف کی ضرورت ہے اس کا تصور میں آنا بھی محال ہے۔ مگر آپ نے نہ صرف دریا کو کوزے میں بند کیا ہے بلکہ سات بحر کو ایک کتاب بنا دیا ہے۔ "آج کل" کا موسیقی نمبر دیکھنے کے بعد بس یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نمبر نہیں ہے بلکہ ایک قیمتی اور مفید کتاب ہے جس کو ہر صاحبِ ذوق کی لائبریری کی زینت ہونا چاہیئے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کو تصنیف کرنے والے بھارت کے وہ مانے ہوئے موسیقار اور گائک ہیں جن پر بھارتیہ سنگیت ناز کرتا ہے۔ حسنِ باطنی اور حسنِ ظاہر دونوں خوبیوں نے "موسیقی نمبر" کو ممتاز بنا دیا ہے۔ جہاں تک میری یاد اور معلومات کا تعلق ہے یہ "موسیقی نمبر" اردو ادب میں پہلا نمبر ہے۔

عصرِ جدید کلکتہ

آج کل کا موسیقی نمبر مضامین اور تصاویر کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا پہلا نمبر ہے۔ ادارے نے یہ نمبر نکال کر ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ ویسے تو فنِ موسیقی پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ "آج کل" کے اس شمارے میں جس قسم کے مضامین پیش کئے گئے ہیں اس کے ذریعے دنیا کو ہندوستانی موسیقی کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ فنِ موسیقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا تذکرہ اس شمارے کے اندر موجود نہ ہو۔

اس نمبر کی ترتیب میں جس قدر محنت ہوئی ہے اس کا اندازہ پرچہ دیکھنے کے بعد آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ موسیقی کے مختلف موضوعات پر مضامین حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں، اس کے لئے ادارے کو کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی محنتوں سے آج یہ شمارہ ہمارے اور آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ علمِ موسیقی پر اتنا بہتر شمارہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ فخر ادارہ آج کل ہی کو حاصل ہے۔ اس شمارے میں فنِ موسیقی پر مضامین کے ساتھ ساتھ جتنی بھی فلمی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں فنِ مصوری نے بھی کافی ترقی کی ہے۔ اس شمارے میں ہمارے مستند مصوروں نے جو تصویریں پیش کی ہیں وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس میں کتابت و طباعت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ نمبر ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ امید ہے کہ اہلِ طبقہ میں بے حد پسند کیا جائے گا۔

ترقی کے لئے یوجنا

سوشلسٹ سماج کی طرف



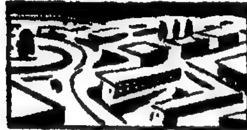


ہمارے ملک میں پلاننگ کا اہم ترین مدعا عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا اور لوگوں کو خوشحال و بھرپور زندگی کے لئے مواقع مہیا کرنا ہے۔



پہلے پانچسالہ پلان ۵۶-۱۹۵۱ء کی کامیابیاں:۔

- مزید خوراک
- مزید اشیاء
- بہتر سماجی خدمات
- مزید روزگار
- بہتر معیار زندگی

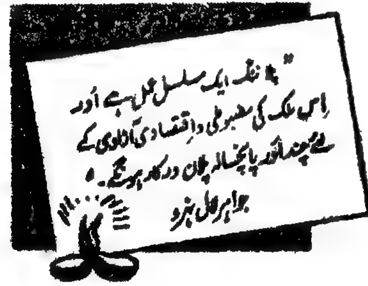


دُوسرے پانچسالہ پلان ۶۱-۱۹۵۶ء کے نشانے:۔

- قومی آمدنی میں مزید اضافہ
- صنعتی پھیلاؤ کی رفتار میں تیزی
- روزگار کی سہولتوں میں اضافہ
- لوگوں کی آمدنی و دولت کے فرق میں کمی لانا
- اقتصادی طاقت کی مساوی تقسیم



قومی خوشحالی کیلئے



ہمارا دُوسرا پانچسالہ پلان

OA 86/62



باپُو

بچو۔ ۲۔ اکتوبر کو باپو کا جنم دن ہے۔ تم جانتے ہو باپُو کی اس قدر عزّت دنیا میں عام طور پر اور

بھارت میں خاص طور پر کیوں ہوتی ہے، ہم سب انھیں باپو کیوں کہتے ہیں

وہ دیش باسیوں کو اپنی سنتان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے اس لئے مہاتما گاندھی کی جے کا نعرہ

لگانے والے 'باپُو کی جے' کا نعرہ لگانے لگے۔ وہ نڈر تھے، بہادر تھے اور سچّے تھے۔

سچّائی کی خاطر وہ جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ کتنی ہی مصیبت ہو وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

وہ کسی سے دشمنی اور کینہ نہیں رکھتے تھے۔ اپنے سیاسی مخالفوں سے بھی دوستوں السا برتاؤ کرتے تھے۔

۲۔ اکتوبر کو ہم ان کی سالگرہ کے دن یہ پرن کریں کہ ہم کبھی

جھوٹ نہیں بولیں گے اور باپو کے نقشِ قدم پر چلیں گے

(ادارہ)

ظفر علی سید

رُوپ رنگ

جب دیوتا سب پرندوں کو بنا چکا تو اس نے ان کو جلدی جلدی خوبصورت رنگوں سے رنگنا شروع کیا۔ کئی پرندوں کے بعد مور کی باری آئی۔ دیوتا نے سب سے پہلے مور کے سر کے تاج کو رنگا۔ بازوؤں پر خوش نما رنگ دیئے اور دُم کے پروں پر بڑے بڑے رنگین حلقے بنائے۔ مور یہ دیکھ کر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے اپنے رنگ روپ پر گھمنڈ ہونے لگا۔ اُس نے سوچا کیوں نہ یہ خوبصورتی دوسروں کو بتاؤں۔ ابھی دیوتا اُس کے پیروں کو رنگنے ہی والا تھا کہ مور نے کہا۔ "میں ذرا گھوم کر ابھی آتا ہوں اب تو صرف میرے پاؤں ہی رہ گئے ہیں۔" یہ سُن کر دیوتا اُس کو چھوڑ کر دوسرے پرندوں کو رنگنے میں لگ گیا۔

مور اُڑ کر اُن پرندوں کے پاس پہنچا جو رنگے جا چکے تھے۔ سب پرندے مور کی خوبصورتی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ غرور سے سینہ تان کر چلنے لگا اور اُن پرندوں کا مذاق اڑانے لگا۔ پہلے وہ کوّے کے پاس آیا اور کہا "اے کالے کلوٹے! تیرا رنگ کتنا خراب ہے۔"

کوّے نے جواب دیا۔ "بھائی مجھے یہی رنگ پسند ہے۔"

مور نے ہنس کر کہا۔ "میری طرف دیکھو، رنگ رُوپ ہو تو ایسا ہو۔"

پھر وہ چیل کے پاس آیا اور کہا۔ "بڑی بی! تمھارا رنگ کتنا بھدا ہے۔" چیل نے جواب دیا۔ "بھائی مجھے یہی رنگ پسند ہے۔"

مور نے کہا۔ "میری طرف دیکھو، رنگ روپ ہو تو ایسا ہو۔"

پھر وہ اُلّو کے پاس آیا۔ اور بولا۔ "میاں فلسفی! واہ کیا رنگ



ہے تمھارا بھی۔"

اُلّو نے جواب دیا۔ "بھائی مجھے یہی رنگ اچھا لگتا ہے۔"

مور نے کہا۔ "میری طرف دیکھو، رنگ روپ ہو تو ایسا ہو۔"

سامنے طوطا، کبوتر اور دوسرے پرندے تھے۔ وہ ابھی اُن کے پاس جانے ہی والا تھا کہ مینا چلاتی ہوئی آئی۔ "بھائیو، اب تھوڑا سا رنگ رہ گیا ہے جس کو جانا ہو جلدی جاؤ۔" حسن علی

مور نے یہ سنا تو گھبرا کر بھاگا۔ لیکن جب وہاں پہنچتے پہنچتے دیوتا کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا۔ کہ تمام رنگ ختم ہو چکا ہے۔

مور نے کہا: "میرا جسم کس قدر خوبصورت ہے لیکن میرے پاؤں تو ایسے ہی رہ گئے۔"

دیوتا نے کہا۔ "افسوس تم نے بہت دیر کر دی۔"

مور نے یہ سُنا تو مایوس ہو کر اڑ گیا۔

کہتے ہیں جب میگھ برستا ہے تو سارے پرندے خوش ہوتے ہیں۔ مور بھی اپنے خوبصورت جسم کو دیکھ کر ناچتا ہے مگر جب وہ اپنے پاؤں دیکھتا ہے تو اس کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

احمد جمال پاشا

دُنیا کا پہلا اخبار



دُنیا کا سب سے پہلا اخبار آج سے دو ہزار برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اخبار کی ایجاد کا سہرا رومیوں کے سر ہے۔

روم کی حکومت آج سے دو ہزار برس پہلے اپنے زمانے کی سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ حکومت تھی۔ دُنیا کا سب سے پہلا ایڈیٹر جولیس سیزر تھا جس نے دنیا میں سب سے پہلا اخبار ایجاد کیا۔ اس اخبار کا نام "ایر" تھا۔

اس زمانے میں لکھائی کا کام مٹی کے کتبوں، پتھر، بھوج پتر، چمڑے درختوں کی چھال اور پتوں وغیرہ پر ہوتا تھا۔ کاغذ کی ایجاد تو بہت بعد کی بات ہے۔ وہ عرب ہی تھے جنھوں نے کپڑے کے چیتھڑوں سے پہلے پہل کاغذ ایجاد کیا اس کے بعد ریشم سے چینیوں نے کاغذ بنایا۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے بیان کے مطابق جولیس سیزر روزانہ بڑی محنت سے دن بھر لکھ لکھ کر ایسے کتبے تیار کرتا اور صبح سویرے شہر کے چوک پر اس کتبے کا چربہ آویزاں کر دیتا۔

اس کا ثبوت مٹی کے اُن پکے ہوئے کتبوں سے ملتا ہے جو روم کی پُرانی بستی "سیٹا ڈیلا" کی کھدائی کے وقت برآمد ہوئے۔ ان مٹی کے کتبوں میں جولیس سیزر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خبریں ملتی ہیں۔

رومیوں کو اپنے ملک اور باہر کی خبریں پڑھنے کا اس قدر انتظار اور اشتیاق رہتا تھا کہ ہر شخص صبح اُٹھتے ہی یہی کوشش کرتا کہ سب سے پہلے میں اخبار پڑھنے پہنچوں۔ ایسا کچھ تو شوق کی خاطر ہوتا اور کچھ بھیڑ بھاڑ سے بچنے کی خاطر۔ مگر پھر بھی بھیڑ اس قدر ہو جاتی کہ لوگ جب پڑھنے کے لئے جمع ہوتے تو اُن کی ایک قطار بنا دی جاتی اور ہر شخص اپنی باری کا انتظار کرتا۔ جس طرح آج ہم لوگ اسکول بس، پوسٹ آفس اور سنیما کے ٹکٹ وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کیو (لائن) لگاتے ہیں۔ کیا عجب کہ کیو لگانے کی ایجاد اسی زمانے کی دریافت ہو۔

اکثر لوگ اخبار پڑھنے اس قدر جلدی آجاتے کہ ابھی اندھیرا ہوتا اور وہ یا تو پہلی صبح کی روشنی کا انتظار کرتے یا پچھلے پہر کی مدھم چاندنی یا مشعل کی مدد سے خبریں پڑھنے کی کوشش کرتے اور اگر اخبار آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو لوگ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتے۔

جولیس سیزر کا یہ اخبار جس کے کاتب سے لے کر مدیر اور نگراں تک وہ خود ہی تھے بہت جلد روم اور باہر کے ملکوں میں مشہور ہو گیا۔

اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شہر کے ایک ہی مقام پر پڑھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ تمام خبریں اور اہم اعلانات وغیرہ پکی ہوئی مٹی کے کتبے پر کھود کر اس کا نقش ایک خاص مقام پر آتار دیا جاتا تھا جہاں روم کے لوگ بآسانی جمع ہو کر اس کو پڑھ سکتے تھے۔

یہ اخبار آج کل کے چھپنے والے اخباروں سے بالکل مختلف تھا۔ آج کل اخبار خریدنا اور اُس کا پڑھنا ہر شخص کے لئے بہت آسان اور ضروری ہے۔ اُس وقت تک چونکہ کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اخبار مٹی کے پکائے ہوئے کتبوں پر ہی تیار ہوتا تھا۔ پھر اس اخبار نے بڑی ترقی کی اور امیر اور بڑے بڑے کاروباری لوگوں نے اپنے غلاموں کے ذریعے سے جولیس سیزر کے کتبے کی نقلیں ایک خاص قسم کے کپڑے پر اُتروا کر فروخت کرنا شروع کر دیں۔ ایک غلام دن بھر میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ تک نقلیں اُتار لیتا تھا مگر ان نقلوں کا خریدنا بھی عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کو بھی صرف بڑے بڑے دولت مند ہی خرید سکتے تھے۔

مگر ان نقلوں سے نہ صرف اخبار کو مالی فائدہ ہوا بلکہ اس طرح اخبار ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جانے لگا اور دوسرے مقامات پر بھی یہ خبریں پڑھی جانے لگیں۔

اس اخبار کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور وہ تقریباً نیم سرکاری اخبار تھا۔ جولیس سیزر کے اس اخبار کی خبروں میں بہت اختصار سے کام لیا جاتا تھا۔ عام طور پر انتہائی ضروری اور دلچسپ خبریں اور نہایت اہم اعلانات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ یہی اخبار تھا۔ اس اخبار کی تمام خبروں پر پورا پورا اعتبار کیا جاتا تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ خبریں تازہ اور دلچسپ ہوں۔ اس اعتبار سے اخبار نویسی (صحافت) کی تاریخ میں جولیس سیزر کا نام بہت اہم اور نہ بھولنے والا ہے کہ وہ دنیا کے سب سے پہلے اخبار کا ایڈیٹر تھا۔



انور برہان پوری

ترکیب فیل ہو گئی

ایک دن امّی نے گاجر کا حلوہ بنایا اور مجھے اور خورشید کو ہمارا حصّہ دینے کے بعد سب کا سب جو کہ قریب آدھا سیر تھا۔ ابّا جان، نانی جان، آپا جان اور خود اپنے لئے المساری میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا۔ کیوں کہ اس دن چاروں روزہ دار تھے اور ہم روزہ چور! اس میں شک نہیں کہ حلوہ بے حد لذیذ اور مزے دار تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میں خورشید سے باہر ملا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "خورشید حلوہ کیسا تھا؟" "بہت مزے دار!" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "پھر کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔ "خیال تو ٹھیک ہے، لیکن حلوہ کس طرح حاصل کیا جائے؟"

اس نے زمین پر سوالیہ نشان بناتے ہوئے کہا۔ "یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا "پھر کوئی ترکیب سوچو!"

اب مسئلہ یہ تھا کہ حلوہ کس طرح حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ہم دونوں کے دماغ میں ہر طرح کی کھچڑی پکنے لگی۔ آخر کار میں نے ایک ترکیب نکال ہی لی۔ اور جب میں نے وہ ترکیب خورشید کو بتائی



تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

تقریباً دو بجے میں نے امّی سے کہا۔ "امّی تھوڑا سا حلوہ دیجیے نا!" "نہیں بیٹا وہ اب ہمارا حصّہ ہے تم تو اپنا حصّہ کھا چکے۔" انھوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بس تھوڑا سا۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔" میں نے منّت کی۔ آخر بڑی منّت وسماجت کے بعد امّی نے مجھے تھوڑا سا حلوہ دے ہی دیا کیونکہ ہماری امّی جان ہماری خوش قسمتی سے بڑی رحمدل واقع ہوئی ہیں۔

حلوے کا پہلا نوالہ لیتے ہی میں نے امّی سے کہا۔ "امّی حلوہ تو کچھ کچھ کڑوا لگ رہا ہے۔" "کیا کہا۔ کڑوا لگ رہا ہے؟" انھوں نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں" میں نے کہا۔ "اگر آپ کو یقین نہ ہو تو خورشید کو چکھا کر پوچھ لیجئے۔"

اور جب امّی نے خورشید کو بلا کر حلوہ چکھایا تو اس نے بھی منہ بناتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں امّی جان۔ انور بھائی سچ کہہ رہے ہیں۔"

جب یہ خبر نانی جان اور آپا جان کے کانوں سے ہوتی ہوئی ابّا جان تک پہنچی تو انھیں بڑا تعجب ہوا۔ لیکن پھر انھوں نے امّی سے مشورہ

کے طور پر کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ حلوہ دونوں بچوں کو دے دیا جائے کیونکہ شام تک تو اور زیادہ خراب ہو جائے گا جس سے نہ ہمارے کام کا رہے گا نہ بچوں کے۔"

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" امی نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "کم از کم بچے تو کھا لیں گے۔"

اور پھر سارا حلوہ ہم دونوں کے سپرد کر دیا گیا اور ہم کڑوا منہ بناتے ہوئے اسے جلدی جلدی صاف کرنے لگے۔

لیکن اسے اتفاق کہیئے یا ہماری بدقسمتی کہ ابھی ہم آدھا حلوہ بھی نہ کھا پائے تھے کہ میرا ہم جماعت دوست اظہر آ دھمکا۔ جسے دیکھتے ہی ہم دونوں کی روح فنا ہو گئی۔ کیونکہ ہمارے ہاں جب بھی کوئی مٹھائی وغیرہ آتا اسے ضرور دیتے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ہمیں خطرہ تھا۔ ابا نے اسے کہا۔ "آؤ بیٹا اظہر تم بھی تھوڑا سا حلوہ کھا لو۔"

پہلے تو اس نے انکار کیا اور ہماری جان میں جان آ گئی۔ لیکن جب ابا جان نے اسے مجبور کیا اور وہ کھانے بیٹھ گیا تو ہماری حالت اس چور کی مانند ہو گئی جو چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اسے اشاروں سے کچھ سمجھاؤں۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور خورشید ایسی ہو گئی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

ادھر تو اظہر حلوہ کھا رہا تھا اور ادھر ہم یہ دعا کر رہے تھے کہ کاش ابا اظہر سے حلوے کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ لیکن کہیں چھوٹوں کی بھی دعا قبول ہوتی ہے!

جب اظہر نے منہ پونچھتے ہوئے اور بغیر منہ بنائے آدھا حلوہ صاف کر دیا تو ابا نے امی سے کہا۔ "بیٹا اظہر تم تو حلوہ اس طرح کھا رہے ہو جیسے اس میں کچھ بھی نہ ہو۔" "کڑواہٹ؟" امی نے ابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون کہتا ہے کہ اس میں کڑواہٹ ہے؟" "یہ انور اور خورشید۔" ابا نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہمارے دل دھڑکنے لگے۔ "تو کیا واقعی حلوہ بالکل کڑوا نہیں لگ رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ خود شام کو روزہ کھولنے کے بعد چکھ کر دیکھ لیجئے گا کہ آیا کڑوا ہے یا نہیں۔۔۔!" "ہاں یہ ٹھیک ہے" امی نے بقیہ حلوہ الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔ اور ہم شام نہ ہونے کی دعا کرنے لگے!۔ لیکن کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

اور جب شام کو ابا نے روزہ کھولنے کے بعد حلوہ چکھا اور ہمارا جھوٹ پکڑا گیا تو وہ سخت خفا ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ اور ہم دونوں کی وہ مرمت کی کہ جلدی ہی چونا لگانے کی نوبت آئی اور ہم تین دن تک ایک لمحے



بھی بستر کو نہ چھوڑ سکے۔

لیکن آج تک ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہم کو اپنی چالاکی پر اتنا ملال نہیں تھا جتنا اپنی ترکیب فیل ہونے پر۔ •

سوم دت

اصلیت نہیں جاتی



شام کا وقت تھا۔ ایک بڑا نامی جادوگر گنگا کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اوپر سے ایک اُلو اڑتا ہوا گذرا۔ اُلو کے منہ میں ایک چوہیا تھی۔ اس سنسان جگہ میں انسان کو دیکھ کر اُلو ڈر گیا اور گھبراہٹ میں چوہیا اس کے منہ سے نکل کر زمین پر جا گری۔

جادوگر نے بڑھ کر دیکھا تو چوہیا ابھی تک زندہ تھی۔ جادوگر رحم دل تھا اس نے چوہیا کو اُٹھا لیا اور اپنے گھر لے آیا۔ گھر آ کر اس کی مرہم پٹی کی جس سے چوہیا بہت جلد تندرست ہو گئی۔ جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے اسے خوبصورت لڑکی میں بدل دیا۔

اب جادوگر نے اس لڑکی سے کہا۔ "میں اب تمھاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک بڑا جادوگر ہوں۔ تم جس سے بھی شادی کرنا چاہو اُسی سے تمھاری شادی کرا دوں گا۔"

جادوگر کی منہ بولی بیٹی یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ بولی۔ "اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میری شادی میری اپنی مرضی سے ہو تو میں اس سے شادی کروں گی جو اس دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوگا۔"

جادوگر نے کہا۔ "سورج سے زیادہ طاقت ور اس دنیا میں اور کون ہوگا میں اسی سے تمھاری شادی کئے دیتا ہوں۔" چنانچہ جادوگر نے سورج سے شادی کرنے کے لئے کہا۔

سورج بولا۔ "بھلا میں سب سے زیادہ طاقت ور کہاں۔ بادلوں کو ہی دیکھو۔ جب چاہتے ہیں مجھے ڈھانپ لیتے ہیں اور میری روشنی کو چھپا لیتے ہیں۔ مجھ سے تو وہ کہیں زیادہ طاقت ور ہیں۔"

جادوگر نے بادلوں سے کہا۔ "تم کو میری منہ بولی بیٹی سے شادی کرنا ہوگی"

بادل بولے۔ "ارے بھائی دنیا میں ہم سے بھی زیادہ طاقتور موجود ہیں۔ اس ہوا ہی کو دیکھو۔ جہاں جی چاہتا ہے ہمیں پہنچا دیتی ہے۔ ہم سے زیادہ طاقت تو اس میں ہے۔"

جب ہوا سے کہا گیا تو اس نے بتلایا کہ پہاڑ اس سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور ہوا کے طوفان اور تھپیڑوں کو بھی روک لیتے ہیں۔

جب جادوگر نے پہاڑوں سے کہا تو انھوں نے جواب دیا۔ "بھائی دنیا میں ہم سے بھی زیادہ طاقت ور موجود ہیں۔ ذرا ان چوہوں ہی کو دیکھو جہاں چاہتے ہیں ہمارا اندر بل بنا لیتے ہیں۔ میری مرضی ہو نہ ہو ان بلوں میں بڑے مزے سے رہتے ہیں۔ ان کو میری طاقت سے ذرا بھی خوف نہیں۔"

اپنی محنت کا یہ نتیجہ دیکھ کر جادوگر کو بہت افسوس تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کی منہ بولی بیٹی یہ ذلت کبھی برداشت نہیں کرے گی کہ چوہے جیسے ذلیل اور ناچیز جانور سے شادی کرے۔ لیکن جادوگر یہ دیکھ کر بہت حیران تھا کہ اس کی منہ بولی بیٹی یہ سن کر بہت خوش ہوئی کہ چوہا دنیا میں سب سے طاقتور ہے۔

ناچار جادوگر پھر اُسے اسی روپ میں لے آیا جس میں اُسے پایا تھا۔ اور اس کی شادی ایک چوہے سے کر دی۔ دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

کسی نے سچ کہا ہے صورت شکل تو بدلی جا سکتی ہے مگر اس کی عادتیں نہیں بدلا کرتیں۔

ماسٹر تاجی

بوڑھے کی دانائی

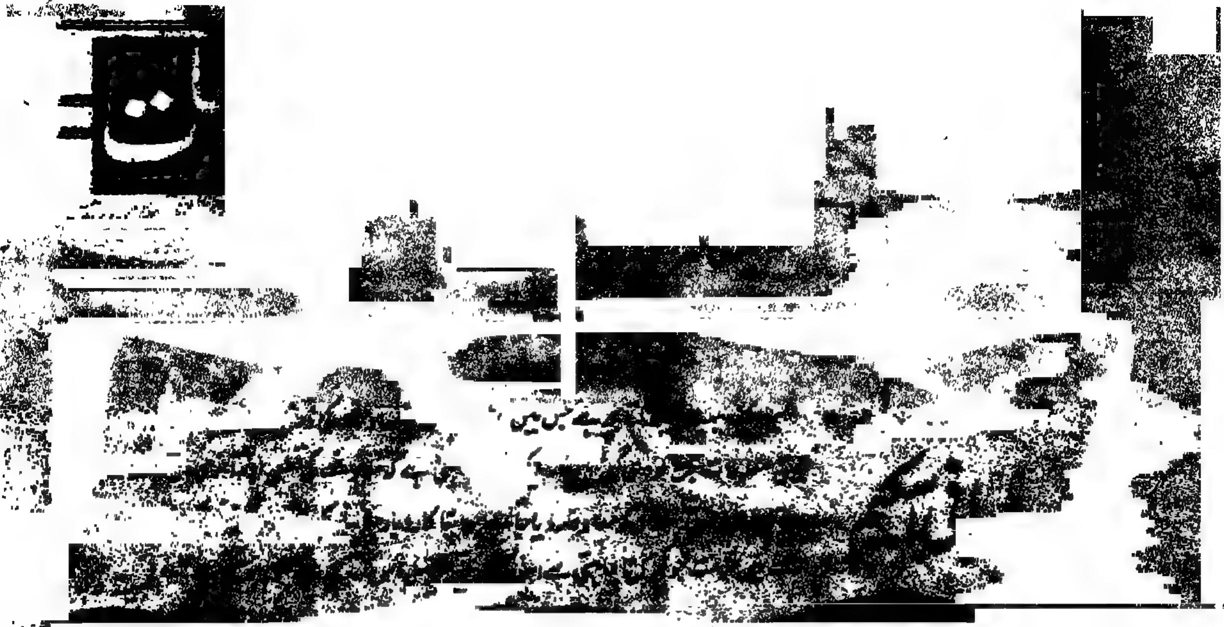
کسی گاؤں میں ایک بوڑھا اور بڑھیا رہتے تھے۔ ایک دن بوڑھا بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے جنگل کی طرف گیا۔ جب وہ بھیڑ بکریاں چرا [illegible] تو ایک خرگوش جھاڑیوں میں سے نکلا اور اس کے قریب [illegible] گیا۔ بوڑھے نے سوچا کئی دنوں سے [illegible] گوشت نہیں [illegible] اس خرگوش کو پکڑ لوں۔ یہ سوچ [illegible] خرگوش بہت آگے نکل گیا اور اس [illegible] طرف [illegible] [illegible] نزدیک [illegible] اور آخرکار وہاں پہنچ گیا جہاں خرگوش سو رہا تھا۔ اس نے دبے پاؤں آکر خرگوش کو پکڑ لیا [illegible] اور بڑھیا سے کہا۔ "دیکھو میں ایک خرگوش پکڑ لایا ہوں [illegible] دنوں سے گوشت نہیں کھایا تھا۔ ایک بڑا برتن لاؤ تاکہ اس میں خرگوش کو بند کر دیں۔" بڑھیا بہت خوش ہوئی اور جلدی سے برتن لائی اور اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ جوں ہی بوڑھے نے خرگوش کو برتن میں ڈالا۔ خرگوش نے ایک چھلانگ لگائی اور باہر نکل بھاگا۔ بڑھیا اور بوڑھا دونوں ہاتھ ملتے رہ گئے۔

دوسرے دن بوڑھا بکریاں چرانے جنگل کی طرف گیا۔ وہاں اس کو پھر وہی خرگوش مل گیا۔ اب کے بوڑھے نے پکا ارادہ کر لیا کہ اس کو [illegible] نہیں چھوڑوں گا۔ آخر تجربہ کار تھا۔ خرگوش کو پکڑ کر دم لیا اور [illegible] گھر لے آیا۔ اب کے بوڑھے اور بڑھیا نے ایک ترکیب سوچی کہ جیسے ہی خرگوش بھاگنے کی کوشش کرے ایک طرف سے بوڑھا اس پر کلہاڑی [illegible] وار کرے اور دوسری طرف بڑھیا ایک تیز چاقو لے کر بیٹھے اور اس پر جھپٹ پڑے۔ یہ سوچ کر خرگوش کو اس بڑے برتن میں ڈالا گیا جوں ہی بوڑھے نے اوپر سے ڈھکنا رکھنا چاہا۔ خرگوش اوپر کو اچھلا۔ سوچی ہوئی ترکیب کے مطابق ایک طرف سے خرگوش پر بوڑھے نے کلہاڑی [illegible] وار کیا اور دوسری طرف بڑھیا نے



تیز چاقو سے اس پر حملہ [illegible] نکل بھاگا اور [illegible] کے جسم میں پیوست ہو گئی [illegible]

بے چارا بوڑھا [illegible] وہ بڑھیا اس وار [illegible] پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا۔







... and printed by the Production Officer, ... of India, Old Secretariat, Delhi.



ہماری کتابیں

مستقبل کی تعمیر

ہماری آج کی کوشش
سے ایک نیا مستقبل
عالم وجود میں آرہا ہے۔
اس تابناک مستقبل کی جھلک
اس مختصر سے کتابچے میں دیکھئے
قیمت ۔ -/۴/۰

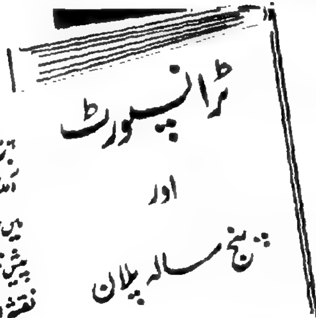


اس ایڈیشن میں
پنج سالہ پلان کے بارے
میں ہر قسم کی تفصیلات
درج ہیں۔ زبان سادہ
و دل کش ہے۔ قیمت -/۲



پنج سالہ پلان کے تحت
ہم سماجی بہبود کے
میدان میں کیا کر رہے
ہیں اس کی جھلک اس
پمفلٹ میں ملاحظہ فرمایئے
-/۴/۰

یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار
کیا گیا ہے۔ زبان نہایت
آسان ہے۔ تصویروں کو
خاکوں سے اس کی دل کشی میں
اور اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/۰



پنج سالہ پلان کے تحت
آمد و رفت اور رسل و رسائل
میں جو بہتریاں ہمارے
پیش نظر ہیں اس کا مفصل
نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
-/۴/۰

ہمارا پلان

پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا
کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود
کیا ہے اس کتابچے میں جامع
اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا
ہے۔ قیمت -/۴/۰

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

ترتیب

سرورق:- بدھ کا مجسمہ - متھرا

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

اردو کا مقبولِ عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- مہدی عباس حسینی

جلد ۱۵ —— نمبر ۴

سالانہ چندہ:- { ہندوستان میں۔ چھ روپے / پاکستان میں۔ چھ روپے (پاک) }

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- { ہندوستان میں:- آٹھ آنے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک) }

بدھ نمبر

نومبر ۱۹۵۶ء

مُلاحظات

اردو ادب کی بدنصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس کی محفلِ یاراں کس سے خالی ہو رہی ہے۔ ابھی وحشت کا غم تازہ تھا کہ کیفی چریا کوٹی، اعظم حسین اعظم اور عبدالسلام ندوی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا انتقال ۴۔ اکتوبر کو حرکتِ قلب بند ہونے کی بنا پر ہوا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔ آپ شبلی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ آپ نے الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ اسوۂ صحابہ، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، شعر الہند اور اقبالِ کامل کے علاوہ دوسری بہت سی تصانیف کی بدولت آپ کا نام علم و ادب کی دنیا میں زندہ و پائندہ رہے گا

جناب کیفی چریا کوٹی ہمہ رنگ قسم کے ادیب و شاعر تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مختلف رسائل و جرائد کے مدیر کی حیثیت سے آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء کو خناق اور ملیریا کے مرض سے جان بتمام آمادہ جان آفریں کے سپرد کی۔
آپ کی عمر انتقال کے وقت ۷۵ سال کی تھی۔

سید اعظم حسین اعظم بڑے پرانے صحافی، ادیب اور شاعر تھے۔ آپ [illegible] لکھنوی کے شاگرد تھے۔ برسوں سرفراز لکھنؤ کے اڈیٹر رہے۔ حال ہی میں ہفتہ وار 'وطن' کا اجراء کیا تھا۔ بڑا پاکیزہ مذاقِ شعر رکھتے تھے۔ جوش نے ایک دفعہ اپنی مشہور غزل نما نظم "کہاں ہے ساقی" "جہاں ہے ساقی" کا مقطع پڑھا

جوش کی بحثِ صلوٰۃ میں پس و پیش نہ کر
جوش تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

اعظم صاحب نے پہلے مصرعے پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ 'بحث' کا لفظ نامشہور، مفہوم اُلٹا ہو جاتا ہے۔ جوش نے غلطی کا اعتراف کیا اور اعظم صاحب کا شکریہ ادا کرکے 'بحث' اصلاح میں انھیں سے منسوب کر دی اور مصرعے کو یوں تبدیل کر دیا

جوش اعظم کی صدارت میں پس و پیش نہ کر

دعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحومین کی روحوں کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پس ماندگان کو صبر کی نعمت بخشیں

پھر کیا لطف یہاں اب یار گئے غم خوار گئے
جو درد کا رشتہ تھے وہ بھی تیرِ جگر کے پار گئے

ریاست جموں و کشمیر تعمیر و ترقی کی منازل بہت تیزی سے طے کر رہی ہے سری نگر اور لیہہ لداخ کے درمیان ایک سڑک کی تعمیر جاری ہے جو ماہ جون ۱۹۵۷ء میں اس قابل ہو جائے گی کہ اس پر جیپ گاڑی چل سکے۔ اس سڑک کی تعمیر کے لئے تین ہزار مزدور کام کر رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۵۹ء میں اس سڑک پر عام موٹر گاڑیاں چل سکیں گی۔ یہ سطح سمندر سے ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس لحاظ سے یہ سڑک دنیا کی سب سے اونچی سڑک ہوگی۔ رسل و رسائل کے ذرائع میں دوسری ترقی بانہال سرنگ کی تکمیل ہے۔ چنانچہ اسی ترقی و توسیع کی تصدیق پارلیمنٹ کے ۱۲ مسلمان ممبروں نے حال ہی کے ایک بیان میں کی ہے۔

ماہ ستمبر ۱۹۵۶ء میں پورا ایک مہینہ جشنِ کشمیر ریاست کے مختلف مقامات پر منایا گیا سری نگر میں سیاحوں کے لئے ایک نہایت معقول ٹورسٹ ریسپشن سنٹر تعمیر ہوا ہے اور وہاں کے لئے سہولتیں پہلے سے دہ چند ہو گئی ہیں۔ اس خوش انتظامی پر ریاست کے منتظمینِ اعلیٰ وادی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جشنِ کشمیر کی مختلف تقریبات میں جھانکیوں کا دریائی جلوس اور شبِ شالامار قابلِ دید تھے۔ شالامار باغ میں شب کو چراغاں اور آبِ رواں میں اس کا عکس قابلِ دید منظر تھا۔ جگہ جگہ کشمیری لوک گیت گائے جا رہے تھے۔ لوک ناچ اور بھی دلچسپ تھے۔ پنڈت گووند ولبھ پنت ہوم منسٹر حکومتِ ہند کا سری نگر میں شاندار استقبال کیا گیا۔ "کشمیر بھارت کا ایک حصہ ہے۔" اس صداقت پر اہلِ کشمیر نے ایک اور مہر ثبت کی۔

طلباء میں نظم و ضبط کی کمی بہت ہی افسوسناک ہے۔ حال ہی میں کشمیر یونیورسٹی میں کانووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے جناب ہومی مودی سابق گورنر یوپی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یہی ذکر شری ہرے کرشنا مہتاب نے گجرات یونیورسٹی کے ایڈریس میں کیا۔ غالباً طلباء نے بعض مقامات پر پچھلے دنوں جو غیر منظم طریقہ اختیار کیا تھا اسی کی طرف ان بزرگوں نے اشارہ کیا ہے۔ طلبا قوم کا مستقبل ہیں۔ انکی تعلیم اور فراست سے ہمیں کئی امیدیں ہیں۔ ہم یہی امید رکھیں گے کہ وہ اپنے دامن پر کوئی وقتی داغ بھی نہیں آنے دیں گے اور واقعی قوم کا صحیح مستقبل بن کر دکھا دیں گے۔

ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن

گوتم بدھ

دنیا کے کئی ملکوں میں چھٹی صدی قبل مسیح روحانی بے چینی اور ذہنی جوش و خروش کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ چین میں لاؤتزو اور کنفیوشس، یونان میں پارمی نائڈس اور ایمپی ڈوکلس، ہندوستان میں مہاویر اور بدھ اسی صدی میں پیدا ہوئے۔ اسی زمانے میں بہت سے معلموں اور مفکروں نے اپنے ورثہ علم و فکر پر غور و خوض کر کے نئے نئے نکتے پیش کیے۔

بیساکھ کی پورن ماشی مہاتما بدھ کی زندگی کے تین اہم واقعات سے وابستہ ہے۔ ان کی پیدائش، ان کا گیان اور پری نروان یعنی نجات آخر اسی روز واقع ہوئی۔ بدھوں کی جنتری میں یہ سال کا مقدس ترین دن ہے۔ تھیرا وادا بدھ فرقے کے مطابق ۵۴۴ ق م میں بدھ کو نجات آخر حاصل ہوئی۔ اگرچہ بدھ مت کے مختلف مکاتب خیال الگ الگ تاریخیں مانتے ہیں مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ گوتم بدھ کے مہا پری نروان کی ڈھائی ہزارویں سالانہ یادگار مئی ۱۹۵۶ء کی پورن ماشی میں منائی جائے۔

بدھ کی زندگی کے خاص خاص واقعات سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔ وہ کپل وستو کے راجہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے عیش و عشرت کی آغوش میں پرورش پائی۔ یشودھرا سے شادی کی، راہل نامی ایک بیٹا ہوا اور شروع میں ایسی زندگی گزاری جس میں دنیاوی غم و آلام کا گزر تک نہ ہو سکتا تھا۔ روایت ہے کہ وہ چار مرتبہ اپنے محل سے باہر نکلے۔ پہلی بار انھیں ایک بڈھا ملا جسے دیکھ کر انھیں خیال آیا۔ میں بھی ضعیف ہو سکتا ہوں۔ دوسری بار ایک بیمار ملا اور بدھ نے سوچا اسی طرح بیماری مجھ پر بھی تسلط کر سکتی ہے۔ ایک لاش نظر پڑی اور ان کو احساس ہوا کہ موت مجھ کو بھی شکست دے سکتی ہے۔ آخر میں ایک راہب کا پرسکون چہرہ نظر آیا جس نے روایتی انداز سے تلاش حق کی راہ اختیار کی تھی۔

بدھ نے اس اعلیٰ ضمیر راہب کی مثال سامنے رکھ کر بیماری، ضعیفی اور موت سے نجات کا راستہ ڈھونڈنے کا تہیہ کر لیا۔ راہب نے ان سے کہا "میں ایک شرمان ایک سنیاسی ہوں جس نے پیدائش اور موت کے خوف سے مکتی یا نجات حاصل کرنے کے لئے گرہست جیون چھوڑ دیا ہے۔"

اس مرد بزرگ کو دیکھ کر جو دنیاوی آرام و آسائش میسر نہ ہونے کے باوجود تندرستی اور خوش دلی کی دولت سے مالا مال تھا، بدھ بہت متاثر ہوئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ مذہبی جستجو ہی انسان کے لئے کوئی قابل قدر مقصد بن سکتی ہے۔ یہی دنیا کی وقتی آزمائشوں اور گزراں مسرتوں سے بے نیاز کر سکتی ہے لہذا انھوں نے دنیا کو تج کر اپنی زندگی کو تلاش حق کے لئے وقف کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے گھر بار، بیوی بچے کو چھوڑا، درویشانہ لباس پہنا اور جنگل کی راہ لی تاکہ گیان دھیان کی مدد سے مصیبتوں کے اسباب اور انھیں دور کرنے کے طریقے معلوم کر سکیں۔

بدھ نے چھ سال تک مذہب کے نہایت دقیق اصول اور قوانین کا مطالعہ کیا، سخت سے سخت ریاضت اور نفس کشی کی اور اس امید میں فاقے کر کر کے اپنے جسم کو گھلا ڈالا کہ شاید اذیتیں اور سختیاں اٹھا کر ہی عرفان اور نور حق حاصل ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود موت کے منہ تک پہنچ گئے، لیکن جس سچائی کی تلاش میں سرگرداں تھے اسے حاصل نہ کر سکے۔ اس پر انھوں نے ریاضت چھوڑ کر عام آدمیوں کی طرح رہنا سہنا شروع کیا۔ نرنجنا ندی کے پانی سے اپنے آپ کو پاک و صاف اور تر و تازہ کیا اور سجاتا کی نذر کردہ کھیر کھائی۔ رفتہ رفتہ جب جسم میں توانائی اور ذہن میں پاکیزگی عود کر آئی تو وہ گیا میں بدھی پیڑ کے سائے میں آسن لگا کر بیٹھ گئے اور سات ہفتے تک انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ

مراقبے میں ڈوبے رہے، حتی کہ ایک رات طلوعِ سحر کے قریب ان پر دفعتاً عرفان کے دروازے کھل گئے اور نورِ معرفت حاصل ہو گیا۔ اس عرفان کے بعد سے بدھ نے اپنے لئے واحد متکلم کی جگہ واحد غائب کا صیغہ استعمال کرنا شروع کیا۔ وہ اپنے آپ کو "تتھاگت" کہنے لگے۔ جس کے معنی ہیں — وہ جس نے سچائی کو پا لیا ہو۔ بدھ اس سچائی کو سارے عالم میں پھیلانا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے کہا: "میں بنارس جاؤں گا اور وہاں وہ دیپ جلاؤں گا جو ساری دنیا کو منور کر دے گا، میں بنارس جاؤں گا اور وہاں وہ نقارہ بجاؤں گا جو بنی نوعِ انسان کو بیدار کر دے گا، میں بنارس جاؤں گا اور قانونِ شریعت تعلیم کروں گا۔" دوسروں سے "بھکشوؤ میں نے امرت پا لیا ہے اور اب میں ہر ایک کو یہ امرت پانے کا طریقہ بتاؤں گا یعنی میں دھرم کی تبلیغ کروں گا۔"

اس کے بعد انھوں نے جگہ جگہ گھومنا شروع کیا اور سینکڑوں آدمیوں کو جن میں چھوٹے اور بڑے، راجا اور پرجا سبھی شامل تھے، فیض پہنچایا۔ وہ سب کے سب اس عظیم شخصیت کے سحر سے مسحور ہو گئے، جو پینتالیس برس تک سخاوت کے حسن، تیاگ کی مسرت اور سادگی اور مساوات کی ضرورت کا سبق پڑھاتی رہی۔ بدھ نے ۸۰ سال کی عمر میں کوسی نگر کی طرف کوچ کیا جہاں انھیں پری نروان یا مسرت ابدی حاصل ہونی تھی۔ وہ ویشالی کے خوبصورت شہر سے رخصت ہوتے وقت اپنے شاگرد آنند کے ساتھ قریب ہی ایک پہاڑی پر تھوڑی دیر سستانے کے لئے رکے۔ انھوں نے اس خوبصورت شہر پر نگاہ ڈالی جس کے دامن میں بہت سے مندروں اور خانقاہوں کے کلس جگمگا رہے تھے۔ تب انھوں نے آنند سے کہا "کتنا رنگین اور مالامال ہے ہندوستان اور کتنی پیاری اور دل کش ہے حیاتِ انسانی۔ پھر انھوں نے ہیرنیاوتی ندی کے کنارے پر سال کے درختوں کے جھنڈ میں دو پیڑوں کے درمیان اپنے لئے ایک بستر تیار کرایا اور آنند کو جو شدید آہ و زاری کر رہا تھا بڑی نرمی سے یوں تسلی دی "روؤ مت، مایوس نہ ہو آنند، انسان کو اپنی ہر محبوب شے سے جدا ہونا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شے پیدا ہوئی ہے جو ناپائیدار ہے، وہ فنا نہ ہو۔ شاید تم سوچتے ہو اب ہمارا کوئی گرو نہیں رہا۔ اے آنند! ایسا ہرگز نہیں سوچنا۔ جو اصول میں نے تمھیں تعلیم کئے ہیں وہی تمھارے معلم ہیں۔" اس کے بعد بدھ نے پھر کہا "اے بھکشوؤ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ ہر شے فانی ہے اس لئے خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے لئے راہ نجات تلاش کرو۔"

یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد ان کی روح تصوف کے نہاں خانوں میں ڈوب گئی اور جب وہ اس مقام پر پہنچے جہاں ہر خیال، ہر تصور ختم ہو جاتا ہے جہاں انفرادی شخصیت کا گمان تک نیست و نابود ہو جاتا ہے، تو وہ نروان یا نجاتِ کلی کی منزل میں داخل ہو گئے۔

بدھ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک انفرادی اور دوسرا سماجی۔ عام اور جانا بوجھا تصور یہ ہے کہ وہ گیان اور دھیان میں ڈوبا ہوا کوئی عالم و عارف جوگی تھا دنیا سے کنارہ کش، اپنے خیالات میں مستغرق، اور اپنے اندرونی غور و فکر کے سرچشمے سے مسرور۔ ہنیان یا تھیرواد بدھ مت اور اشوک کے مشن سے بدھ کا یہی تصور وابستہ ہے۔ ان کی نظر میں بدھ خدا نہیں انسان ہے، نجات دہندہ نہیں گرو ہے۔ لیکن دوسرا پہلو وہ ہے جس میں بدھ غمِ انسانی سے تعلق ظاہر کرتے ہیں، عام انسانوں کی زندگی میں گھل مل کر ان کے دکھ درد کا مداوا کرنا چاہتے ہیں اور جمہور و عامہ کی خاطر اپنا پیغام پھیلانا چاہتے ہیں۔ انسان دوستی کے اس مسلک کے پیشِ نظر شمالی ہند میں کشن (۷۰ء تا ۲۰۰ء) اور گپت خاندانوں (۳۲۰ء تا ۶۵۰ء) کے عہد میں بدھ کا دوسرا روایتی تصور قائم ہوا تھا جس نے ہر شخص کیلئے نجات کا نصب العین، دھرم کی لگن اور خدمتِ عامہ کی راہ دکھائی۔ بدھ کا پہلا تصور لنکا، برما اور تھائی لینڈ میں پھیلا ہوا ہے اور دوسرا نیپال، تبت، کوریا، چین اور جاپان میں پایا جاتا ہے۔

لیکن بدھ مت کے سبھی فرقے اس بارے میں متفق ہیں کہ اس مت کے بانی کا نام بدھ تھا جس نے بودھی پیڑ کے نیچے دھیان لگا کر گیان حاصل کیا اور اس خطرناک دنیا سے پرے ابدیت کی راہ دکھائی اور یہ بتایا کہ جو لوگ راہِ نجات پر چلتے ہیں وہ بھی گیان حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی بدھ مت کی تعلیم کا جوہر ہے۔ یہی وہ رشتۂ وحدت ہے جو ہندوستان سے دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیلنے والے بدھ مت کے بدلتے ہوئے نظریوں اور آئین کو آپس میں منسلک کرتا ہے۔

دراصل مذہب کا جوہر یہی ہے کہ فطرتِ انسانی میں ایک انقلاب پیدا کیا جائے۔ دوسرے جنم کا تصور ہندو اور بدھ دھرموں کا مرکزی اصول ہے۔ انسان کی ذات وحدت نہیں بلکہ کثرت ہے۔ وہ خوابیدہ ہے اور بلا ارادہ و اختیار متحرک ہے، اس میں اندرونی انتشار ہے۔ اسے بیدار ہونا ہے، اپنی ذات میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرنا اور آزاد و خود مختار رہنا ہے۔ یونانی اسراریوں میں انسانی فطرت کی اس تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ نیٹشے انسان کی ایک ماورا تصور

کیا گیا ہے جو دانے کی حیثیت سے فنا ہو سکتا ہے، لیکن یہی دانہ ایک مختلف صورت یعنی پودے کے روپ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ گیہوں کے انجام کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں وہ یا تو پیس کر آٹا اور روٹی بن جاتا ہے یا زمین میں بو یا جاتا ہے اور پھوٹ کر پودا بن جاتا ہے اور اس طرح ایک دانے سے ہزار ہو جاتے ہیں۔ سینٹ پال نے مسیح کے دوبارہ ظہور کا حال بیان کرتے ہوئے اسی خیال کو مستعار لے کر کہا تھا۔ "او نادان تو جو کچھ بوتا ہے وہ مرنے کے بعد ہی زندہ ہو سکتا ہے۔" "وہ ہماری مادی شکل میں بویا جاتا ہے اور روحانی شکل میں ابھرتا ہے۔" یہ تبدیلی اس مادے کی ہی قلب ماہیت ہے۔ حیاتِ انسانی کو وجودِ انسانی کا حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ انسان خود کو نئے سانچوں میں ڈھال سکتا ہے اور دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ تبدیلی لانا، دوبارہ پیدا ہونا اور غفلت سے بیدار ہونا نہ صرف بدھ مذہب کا بلکہ ہر مذہب کا نصب العین ہے۔ ہم اپنی اودّیا یعنی جہل و غفلت کے باعث زمان و مکان کی قید میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جو ہمیں حماقت اور فسق و فجور کی طرف لے جاتی ہے۔ دراصل جہل اور خواہش ہی وہ بنیاد ہے جس پر جہانِ رنگ و بو استادہ ہے۔ ہمیں اودّیا کی سطح سے ابھر کر ودّیا، معرفت اور تجلی کی منزل تک پہنچنا ہے۔ جب ہمیں دیا ستایل مشاہدات کے ذریعے بصیرت حاصل ہو جائے گی تب ہمیں سمتا یعنی ابدی سکون بھی حاصل ہو جائے گا جسے کوئی نہ ہلا سکے گا۔ بدھ نے یہ تعلیمات دیتے وقت ویدوں کے اصولِ تحقیق کی پیروی کی ہے جو مشاہداتی علم، ذاتی تجربے اور حقیقت کے براہِ راست وجدان سے حاصل ہوتا ہے۔

بدھ مت کسی نئے خود ساختہ مذہب کی طرح نہیں شروع ہوا۔ وہ قدیم تر ہندو عقاید ہی کی ایک شاخ تھا بلکہ ایک اختلافی یا باغی فرقہ کہا جا سکتا تھا۔ گوتم بدھ ہندو دھرم کی بنیادی اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات سے متفق تھے اگرچہ انھوں نے اس زمانے کے رواجوں کے خلاف احتجاج کیا اور ویدوں میں درج مذہبی رسومات ماننے سے انکار کر دیا۔ جب ان سے یہ رسومات انجام دینے کو کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا "تم کہتے ہو کہ میں دھرم کی خاطر وہ یگیہ کروں جو میرے خاندان میں ہوتا آیا ہے اور جس سے مرادیں بر آتی ہیں۔ لیکن میں قربانیوں کے حق میں نہیں ہوں کیوں کہ مجھے اس خوشی سے کوئی خوشی نہیں ہوتی جو دوسروں کو تکلیف دے کر حاصل کی جائے۔"

یہ سچ ہے کہ اپنشدوں میں بھی یگیہ اور قربانیوں کو مذہب کے روحانی پہلو سے کمتر درجے پر رکھا گیا ہے، لیکن اپنشدوں میں قربانیوں پر اس شدت سے حملہ نہیں کیا گیا جیسا کہ بدھ نے کیا۔ بدھ کا مقصد اولیں یہی تھا کہ مذہبی رسوم کی اصلاح کر کے مذہب کے بنیادی اصولوں کو پھر سے مرکزِ توجہ بنایا جائے۔ جو لوگ مذہب کے بنیادی ڈھانچے اور اصلی جوہر کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ضمیر کی بیدار آواز سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اوتار مانے جاتے ہیں۔ وشنو نے انسانیت کی بہبودی کی خاطر مختلف پیکروں میں جنم لیا ہے۔ بدھ کو ایک ایسا اوتار مانا گیا ہے جس نے ہندوؤں کو غلط اور خونریز رسومات سے نجات دلائی اور ان کے مذہب کو بہتیری خامیوں سے پاک کیا۔ ہم اوتار کے نظریے کی بدولت قدیم ہندو عقاید کو برقرار اور ان میں ترمیم و اصلاح کی گنجائش باقی رکھ سکتے ہیں۔ پرانوں میں بدھ کو وشنو کا نواں اوتار مانا گیا ہے۔

گوتم بدھ نے ہندو مذہب کے برے اثرات دور کرنے کے لئے اسی کے ورثے کو استعمال کیا۔ وہ کچھ بنانے کے لیے آئے تھے بگاڑنے کے لئے نہیں۔ بدھ اپنے ملک کے رہنے والوں کے لئے ان کی مذہبی روایات کے ایک ممتاز ترجمان تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنا نقش اور اس ملک کی روح پر جس میں اس کے عادات و عقاید شامل ہیں اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ بدھ کی تعلیم نے دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں کی روایات کے مطابق الگ الگ امتیازی روپ دھارے، لیکن ان کی تعلیمات خود اپنے وطن میں یہاں کی تہذیب اور کلچر کا جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ وہ برہمنوں اور سرامانوں سے یکساں سلوک کرتے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ دونوں کی روایتیں قریب آ کر ایک دوسرے میں ضم ہو گئیں۔ بدھ ایک طور سے جدید ہندو دھرم کے بانی ہیں۔

کبھی کبھی انسانیت ہزاروں برس اندھیرے میں بھٹکنے کے بعد کسی عظیم شخصیت میں اپنے وجود کا مقصد پا لیتی ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد پھر اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے تند و تیز دھارے پر چھوڑ دیتی ہے۔ بدھ ایک نئے قسم کا آزاد انسان پیدا کرنا چاہتے تھے جو ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو اور خود اپنی ذات کو مشعلِ راہ (آتما دیپ) بنا کر اپنا مستقبل سنوارنے میں لگ جائے۔

بُدھ کی اس انسان دوستی کے سامنے نسلی اور قومی دیواریں گر گئیں، لیکن آج دنیا میں پھر ابتری اور انتشار پایا جاتا ہے جو انسانی روح کی ابتری اور انتشار کی غمازی کرتا ہے۔ اب تاریخ بین الاقوامی نقطۂ نظر سے لکھی جاتی ہے۔ اس کا موضوع یورپ ہے نہ ایشیا، مشرق ہے نہ مغرب، بلکہ بنی نوعِ انسان، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان۔ خواہ ہم پسند کریں یا نہ کریں، سیاسی تقسیم کے باوجود دنیا ایک ہے۔ ہر ایک کا نفع نقصان دوسرے کے سود و زیاں سے وابستہ ہے۔ لیکن ہم روحانی طور پر تھک چکے ہیں، ہم میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے زبردست "انا" پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ایک عالمی سماج کی آرزو تک گناہ شوار معلوم ہوتا ہے۔ آج ہمیں دنیا کو روحانی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک بہت سی غلطیوں اور خامیوں کے باوجود ہمیشہ اسی نقطۂ نظر کا علمبردار رہا ہے۔ ممکن ہے ایک بار پھر یہی نظر ہماری رگ و پے میں جان ڈال دے اور زندگی کے مقفل دروازوں کو توڑ کر اس کے روشن دریچے کھول دے۔ اس کے لئے ہمیں روحانی آزادی کے گم شدہ نصب العین کو پھر تلاش کرنا ہوگا۔ اگر ہمیں امن قائم کرنا ہے تو پہلے اندرونی ہم آہنگی اور روحانی توازن پیدا کرنا ہوگا جو امن اور شانتی کے لازمی عنصر ہیں۔ چاہے سب کچھ لٹ جائے ضبطِ نفس ضرور قائم رہنا چاہیئے۔ آزاد روح کی محبت لامحدود ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک میں ابدی حقیقت کا جلوہ دیکھتی اور پہچانتی ہے اور انسانیت کے مفاد کی خاطر بخوشی اپنی قربانی دے سکتی ہے۔ اس کے دل میں غلط کاری کے علاوہ کسی شے کا خوف باقی نہیں رہتا۔ وہ موت اور وقت کی سرحدوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے حیاتِ ابدی سے بے پایاں توانائی حاصل کر لیتی ہے۔

اقتباسات از پیش لفظ
"بدھ دھرم کے ڈھائی ہزار سال"

مہاتما بُدھ کا پیغام

تقدس مآب کشک بکولا ہٹیلا مرلاخ

آقا بُدھ نے جنم جنم میں اپنے ذہن کا تزکیہ کر کے بے شمار کارِ ہائے حسنہ انجام دئے۔ انھوں نے ایک بودھی ستو کے آدرش پر عمل کرتے ہوئے عالم ذی روح کی خدمت کے لئے بار بار پیکرِ انسانی اور دوسرے کمتر پیکروں میں جنم لیا۔ آخری بار ایک ساکیہ شہزادے کے طور پر انھوں نے اپنی مملکت کی شان و شوکت اور سامانِ تعیش کو ٹھکرا کر ایک بھکشو بننا پسند کیا۔ چناں چہ اس طرح ادراک خودی کے اعلیٰ ترین منازل طے کرتے ہوئے وہ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے بُدھ یا تجلّی مآب ہو گئے۔

یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ آقا بُدھ کی ڈھائی ہزارویں یادگار کے موقع پر سارے ہند میں بدھ مذہب کا زبردست احیا شروع ہو رہا ہے جس کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ اس مبارک موقع کے جشن میں تقریباً سبھی فرقوں کے لوگ بڑی گرم جوشی سے شریک ہو رہے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اور ضروری یہ ہے کہ ہم آقا بُدھ کی تعلیمات کا مطالعہ کریں، اُن پر غور کریں اور اُن پر عمل کریں۔ یہ تعلیمات تری پٹک کے مقدس اوراق میں درج ہیں جنھیں آقا بُدھ کے تین عالم شاگردوں کشیپ، آنند اور اُپالی نے بڑی کاوش سے جمع کیا تھا اور جو تبت اور کئی دوسرے ملکوں میں اب تک محفوظ ہیں۔

اوّل ہمارے لئے سیل یعنی اخلاقِ حمیدہ کے دس اصولوں کا پابند رہنا ضروری ہے۔ یعنی قتل، زنا، استحصال، جھوٹ، چغلی، فضول گوئی، سخت کلامی، لالچ، تنفر اور غلط نظریوں سے سختی سے پرہیز لازمی ہے۔ دوئم ہمیں کرم یعنی علت و معلول کا قانون سمجھنا ہے اور اسی کی روشنی میں اپنے طور طریقوں کو درست کرنا ہے — سوئم یہ کہ ہمارے لئے تینوں رتن یعنی بدھ، دھرم اور سنگھ کی اعلیٰ خصوصیات کی آگاہی اور ان سے اپنی عقیدت کو پختہ کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی ذات میں محبت اور ترحم کا جذبہ پیدا کریں اور بودھی ستو کے آدرش کی پیروی کریں۔ چناں چہ اگر ہم مادی اشیاء کو زیادہ اہمیت نہ دیں گے اور بُدھ کی تعلیمات پر عمل کرتے رہیں گے تو اپنی موجودہ زندگی میں خورسند ہوں گے اور وقت آنے پر بُدھ کی طرح نجات اور تجلّی حاصل کر سکیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی قوموں میں پائیدار امن و اخوت پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ بُدھ کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ اس کے لئے سالک کو کسی مرشد کی ضرورت پڑتی ہے جو تری پٹک کا بخوبی ماہر ہو۔ سالک کو چاہیئے کہ وہ تری پٹک پر مختلف ہندوستانی اور تبتی کتابوں اور تفسیروں کا مطالعہ کرے۔ بُدھ کی تعلیمات کے مسلسل مطالعے اور ان پر مستقل عمل کرنے سے ہم رفتہ رفتہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ آخری نجات کی منزل تک پہنچ جائیں۔

(پروفیسر) محمد مجیب

کامل انسان

گوتم بدھ کا ذکر کہاں سے اور کس عنوان سے شروع کیا جائے، اُن کی پیدائش سے، اُن کے نروان حاصل کرنے سے، ہندوستان میں مذہب اور تہذیب کی ابتدا سے، یا دین کی اس تعلیم سے جو گوتم بدھ جیسی شخصیتوں کو انسانیت کے وجود کا سبب اور مقصد مانتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کہیں سے بھی شروع کریں، اصل بات بیان نہ کی جاسکے گی کہ بدھ ہونے، نروان حاصل کرنے کا مطلب کیا ہے۔ راجہ پسیندی کے سوال پر کہ گوتم بدھ نے جیتے جی نروان کیسے حاصل کیا بھکشنی کھیما نے جواب دیا تھا:

"کامل انسان (یعنی گوتم بدھ) کے وجود کا حساب مادی دنیا کے اعداد میں نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ اس سے بالاتر ہے۔ . . . . . . اس کی گہرائی ایسی گہرائی ہوتی ہے جسے ناپا نہیں جا سکتا، جس کی تہ تک ہم نہیں پہنچ سکتے جیسے کہ مہا ساگر کی۔ یہ کہنے سے بات صحیح صحیح بیان نہیں ہوتی کہ کامل انسان موت کی حد کے اِس طرف (یعنی زندہ) ہوتا ہے، یا یہ کہنے سے کہ وہ موت کی حد کے اُس طرف نہیں ہوتا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ وہ موت کی حد کے اِس طرف ہے نہ اُس طرف۔"

کامل انسان اور اس کے مقام کی یہ تعریف ایسی ہے جو عقل اور تصور کو عاجز کر دیتی ہے، لیکن آدمی کا تخیل شکست تسلیم کرنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ بدھ متی سنگھ کے اس عقیدے کے ساتھ ساتھ کہ گوتم بدھ نے ان مسائل کے بارے میں کوئی تعلیم نہیں دی ہے کہ انسان کا کوئی جداگانہ مستقل وجود ہے یا نہیں ہے، اور کامل انسان مادی موت کے بعد زندہ رہتا ہے یا نہیں رہتا، خود گوتم بدھ کی زندگی کے حالات اور واقعات اس طرح بیان کیے جانے لگے کہ گویا وہ مادی صورپر وجود کی تمام پابندیوں اور مجبوریوں سے بری تھے۔ ممکن اور ناممکن کا فرق مٹا دیا جائے تو اس سے اُلجھن ہوتی ہے، لیکن گوتم بدھ کے حالات پڑھتے وقت ہمیں احساس ہو کہ ایک اعلیٰ حقیقت کو ناحق افسانہ بنا دیا گیا ہے تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ حقیقت کو صحیح صحیح بیان کرنا بہرحال امکان سے باہر تھا۔ قرآن میں جگہ جگہ رسول اللہ کو خدا کا بندہ اور پیغمبر کہا گیا ہے، اور رسول اللہ برابر اصرار کے ساتھ فرماتے رہتے کہ وہ معمولی انسان ہیں، مگر ہم اُن تمام روایتوں کو نہ مانیں جو پیغمبر کے معمولی انسان ہونے میں شبہ پیدا کرتی ہیں تو پھر نبوت کی اصل شان چھپ جاتی ہے۔ گوتم بدھ معمولی انسان بھی تھے، لیکن ان کی تاریخی اور دینی حیثیت بیان ہی نہیں ہو سکتی اگر ہم انھیں صرف ایک معمولی انسان سمجھ کر بات شروع کریں۔

اسی مسئلے پر دوسرے طریقے سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ بدھ متی کتابوں میں گوتم بدھ کی تعلیم کا اثر دکھانے کے لئے ایک مقرر طریقہ، ایک فارمولا ہے جو بار بار ملتا ہے۔ گوتم بدھ سے جس کو عقیدت ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے "جیسے کسی نے ایک چیز کو جو گری پڑی تھی اُٹھا کر سیدھا رکھ دیا، یا جو چھپی تھی اسے نظروں کے سامنے کر دیا، یا ایک بھولے بھٹکے کو صحیح رستہ بتا دیا، اندھیرے میں روشنی لے آیا تاکہ آنکھوں والے ہر چیز کی شکل کو دیکھ سکیں۔" انسان کو اس طرح سے بیدار اور فطرت اور حقیقت سے آگاہ کرنا دراصل اسے اپنی توفیق کا احساس دلانا ہے۔ توفیق کسی میں کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ، ہر انسان اپنی توفیق کے مطابق "کامل" بھی ہو سکتا ہے۔ گوتم بدھ خود کامل تھے، ان کے پیرووں میں سے کئی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی کامل ہو گئے۔ ان کو اور ان کے پیرووں کو برابر کا مرتبہ دینا صحیح نہ ہوگا، لیکن ان میں سے کسی کی بزرگی کا اندازہ الفاظ یا "مادی دنیا کے اعداد" ہی کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت نگاری حقیقت کو بیان نہیں کر سکتی۔ صرف اسے محدود اور مختصر کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ مثالوں سے کام لیتے ہیں اور مثالوں کے ذریعے حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والوں

میں توفیق کی کمی ہو تو مثالیں ذہن اور دل میں روشنی پیدا کرنے کی بجائے عقل کو حیران کرنے والی داستانیں بن جاتی ہیں۔

گوتم بدھ کی زندگی کے ابتدائی دور کا جو نقشہ بدھ مت روایات میں ملتا ہے وہ ایک مثال ہے۔ انسان کی طبیعت زندگی میں استقلال چاہتی ہے، لیکن اس میں انقلاب پسندی کا میلان بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے خاندان، سماج اور سماجی قانون سب کو استقلال پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ کسی نظام کو قائم رکھنا خود ایک مقصد بن جائے تو حق تلفی، بے انصافی، تشدد اور ظلم کرنا بھی لازمی سا ہو جاتا ہے، اور یہ ایک محرک ہوتا ہے ان لوگوں کے لئے جنھیں بہتر زندگی کی آرزو ہوتی ہے۔ آپ کو تاریخ اور مختلف راہبوں کی روایات میں ایسی مثالیں ملیں گی کہ ایک حادثے یا صدمے نے آدمی کی زندگی کا نقشہ بدل دیا، اور پھر اس نے اپنی توفیق کے مطابق اپنی اور اپنی دنیا کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ گویا وہ ہیں جو خارجی اثرات کے جھٹکا نہ سہ سکے، اور ان کا مرتبہ اُن لوگوں سے بہت بلند مانا جاتا ہے جن کی نیند میں خارجی اثرات سے کچھ خلل تو پڑ سکتا ہے مگر وہ اچاٹ نہیں ہوتی۔ گوتم بدھ کا ضمیر خارجی اثرات سے بے نیاز نہ تھا۔ انھوں نے وہی سب دیکھا جو ہم سب دیکھتے ہیں بڑھاپا، بیماری، موت، اور ان کی توفیق نے اسے گوارا نہ کیا کہ وہ چین سے زندگی گزاریں اور دُکھ کے مسئلے کا حل نہ نکالیں۔

ان کا زمانہ روحانی بے چینی کا زمانہ تھا اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر بن باس اختیار کریں۔ ان میں بعض مخلص ہوتے تھے اور سچے دل سے حق کی تلاش میں نکلتے تھے۔ لیکن حق کی تلاش میں بھی آدمی تھوڑی دور جا کر رُک سکتا ہے، بہک سکتا ہے، گمراہ ہو سکتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں ایسے سادھو اور سنیاسی تھے جو بہت ریاضتیں کرتے تھے، بہت کم کھاتے تھے اور وہ بھی لمبے وقفوں کے بعد، منہ، ہاتھ اور بدن کو صاف نہیں رکھتے تھے، کیلوں اور کانٹوں کے آسنوں پر بیٹھے رہتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھیں زندگی کا منشد طہارت معلوم ہوتا تھا اور وہ ہر وقت اشنان کرتے رہتے تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے اور انھیں کی طرح کھانا کھاتے اور پانی پیتے تھے۔ جبھی اور سمجھدار سب ایک طرح کا ذہنی سکون چاہتے تھے، اور اس وجہ سے فلسفیانہ بحثوں اور مناظروں کا بڑا چرچا تھا۔ گوتم بدھ کی توفیق نے انھیں فضول کوششوں اور تجربوں سے بچایا، مگر انھوں نے کبھی معقول بات کو سننے، کسی معقول مسلک کو آزمانے سے انکار نہیں کیا۔ روایت یہ ہے کہ انھوں نے ایسے عالموں کی پیروی کی جنھوں نے وحدت الوجود کے مسلک کو اختیار کیا تھا، مگر اس سے انھیں تسلی نہیں ہوئی، اس لئے کہ اس میں عمل کی کوئی تعلیم نہیں تھی، اور اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا جو اخلاقی اعتبار سے مفید ہو۔ عمل کا موقع تپسیا میں زیادہ نظر آیا۔ گوتم بدھ نے بڑی سخت ریاضتیں کیں، لیکن اس سے بھی مقصد حاصل نہ ہوا۔ ان دونوں مسلکوں پر چلنے کی کوشش کا اثر یہ تھا کہ ان کا ذہن اور ان کی طبیعت اس حقیقت کی حامل بننے کے لئے تیار ہو گئی جس کی انھیں جستجو تھی۔ حقیقت کا ان پر الہام ہوا۔ یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ الہام کیسے ہوتا ہے۔ بعض بدھ مت روایات ہیں جن میں معرفت کے اس لمحے کو خیر و شر کے مقابلے کی ایک رزمیہ داستان بنایا گیا ہے اور اس میں گوتم بدھ کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک مثال ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جسے بیان کرنا انسان کے امکان میں نہیں۔

اس علم نے جو اس وقت گوتم بدھ کو حاصل ہوا، انھیں کامل انسان بنا دیا۔ اس اصطلاح کا مطلب بدھ مت فلسفیوں نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسلامی تصوف میں بھی "انسانِ کامل" فلسفۂ مذہب کا ایک نظریہ ہے، ایک تصور جس میں الوہیت اور انسانیت کی آمیزش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کی ذات کی بدولت اس طرح کی آمیزش نہ ہو تو الوہیت اور انسانیت دونوں ظہور کے محتاج رہ جاتے ہیں۔ لیکن کامل انسان کو اس شخص کی نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جو صرف دیدار کا طلب گار ہو اور یہ مانتا ہو کہ آنکھ کی بینائی اور ذہن کی رسائی کا مدار دل کی بیداری پر ہے۔ ایسا شخص گوتم بدھ میں علم، حسن اور ان اخلاقی صفات کو تلاش کرے گا جنھوں نے ان کو کامل خیر کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اسے یہ مغالطہ نہیں ہوگا کہ اسے ایک دو مرتبہ دیکھنے سے سب کچھ نظر آ جائے گا۔ وہ یہ سمجھے گا کہ اس کی بینائی گوتم بدھ کے حسن سے فروغ پائے گی، اس کا علم ان کے طریقے پر چلنے سے ترقی کرتا رہے گا اور اس کے دل پر کیفیتیں گزریں گی جنھیں اس کی زبان بیان نہ کر سکے گی، مگر جو اس کی شخصیت کی تکمیل کرتی رہیں گی۔

ایک مرتبہ گوتم بدھ نے ایک درخت کی چند پتیاں توڑیں اور اپنے چیلوں سے پوچھا کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں زیادہ پتیاں ہیں یا اس جنگل میں جو تمھارے سامنے ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ جنگل میں پتیاں زیادہ ہیں۔ گوتم بدھ نے کہا کہ میرے ہاتھ میں جو پتیاں ہیں وہ میرے علم کا وہ حصہ ہیں جو میں نے تم تک پہنچایا ہے، اور جنگل کی پتیاں میرے علم کا وہ حصہ ہیں جو میں نے تم کو

نہیں بتایا ہے اس لئے کہ اس سے تمھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ گوتم بدھ کے
بیشتر پیروؤں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ہوگی کہ علم کو پوشیدہ رکھنے میں بڑی
مصلحت ہوسکتی ہے۔ بظاہر یہ بیجا معلوم ہوتا ہے کہ علم اور عمل میں تناسب اور
ہم آہنگی علم کو محدود کرکے قائم رکھی جائے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انسان
کی شخصیت صحیح معنی کے ذہنی [illegible] شخصیت کی نشوونما
نہ ہو، خالص ذہنی جدوجہد ایک بڑی رکاوٹ ہوسکتی ہے۔ اگر صحیح معنی میں [illegible]
شخصیت کی نشوونما ہوتی رہے تو انسان علم کی پیاس بجھانے کے لئے [illegible]
نہیں پھرتا، خود علم کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ گوتم بدھ کو یقین تھا کہ ان کے زمانے
میں مذہبی عقائد و فکر و نظریات کا ایک جنگل بن گیا ہے جس میں سب بھٹکتے پھرتے
ہیں۔ ایسے شخص کے لئے جو کامل علم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو کسی سوال کے جواب میں
[illegible] یہ کہنا کہ اس بارے میں میں نے کوئی تعلیم نہیں دی ہے ایک
عجیب سی بات ہے۔ مگر گوتم بدھ نے یہی کیا۔ دنیا فانی ہے یا غیر فانی، محدود
ہے یا غیر محدود، روح اور جسم ایک وجود ہیں یا الگ الگ، جو شخص معرفت حاصل
کرلیتا ہے، وہ موت کے بعد زندہ رہتا ہے یا نہیں رہتا، یہ سب سوال گوتم بدھ
سے کئے گئے اور ہر دفعہ انھوں نے جواب دیا کہ "یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں
میں نے کوئی [illegible] نہیں دی ہے۔" وہ دنیا اور دینی فکر [illegible]
[illegible] کی چھان بین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ "بھکشوؤ! جیسے سمندر کے [illegible]
پانی کا ایک مزہ ہے یعنی نمک کا مزہ، ویسے ہی ہماری اس تعلیم اور اس تنظیم میں
صرف ایک ہی مزہ ملتا ہے، اور وہ ہے نجات کا مزہ۔" جو شخص علم اور عمل کے
تناسب کو اور اس نکتے کو [illegible] وہ گوتم بدھ کی عظمت کا
[illegible] زبانی اعتراف کرسکتا ہے، جو لازمی طور پر دیکھے گا کہ یہ علم معرفت [illegible]

تناسب صرف علم اور عمل کے درمیان نہیں بلکہ عمل اور [illegible] کے درمیان
بھی ہونا چاہئے۔ گوتم بدھ نے عمل میں بیچ کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی اور
خود بھی اسی طریقے پر چلے

"بھکشوؤ! انتہا پسندی کی دو شکلیں ہیں، جن سے اس شخص کو بچنا چاہئے
جس نے کہ نجات کی خاطر دنیا کو ترک دیا ہے ..... (ایک تو) ایسی زندگی
جس کا مقصد عیش پرستی ہو، جس میں عیش پرستی اور ہوس رانی کے سوا کچھ نہ ہو،
یہ ذلیل کرتی ہے، شہوت میں ڈوبی ہوئی ہو اور کمینی ہوتی ہے، اس سے
کچھ حاصل نہیں ہوتا (دوسرے) ایسی زندگی جس کا مقصد نفس کو ایذا پہنچانا
ہو۔ یہ تکلیف دہ کمینی اور لاحاصل ہوتی ہے۔"

"تتھاگت نے ان دونوں شکلوں سے بچنے کی وجہ سے تتھاگت (یعنی
خود گوتم بدھ) نے اس بیچ کے راستے کا علم حاصل کیا جو بصیرت کی طرف لے جاتی
کی طرف لے جاتا ہے، جس سے سکون پیدا ہوتا ہے، آگہی، معرفت اور نروان
حاصل ہوتا ہے۔"

بیچ کے راستے پر چلنے کے مسلک کی بہت ہی دل آویز وہ نصیحت ہے جو گوتم بدھ
نے اپنے ایک چیلے سون کو کی تھی۔ سون ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان تھا، اور
[illegible] بننے کے بعد وہ اپنے نفس پر اس طرح قابو نہ پا سکا جیسے کہ وہ چاہتا تھا
ایک مرتبہ پریشانی میں وہ سوچنے لگا [illegible] گوتم بدھ کو
اس کی [illegible] تو انھوں نے سون سے سوال کرکے سمجھایا کہ جیسے تاروں سے
ٹھیک [illegible] اسی وقت نکلتے ہیں جب وہ نہ زیادہ ڈھیلے ہوں نہ زیادہ کسے، ایسے
ہی انسان کی طبیعت اپنے جوہر اسی وقت دکھاتی ہے جب اس پر نہ جبر کیا جائے
نہ اسے ڈھیل دیا جائے۔ [illegible] استقلال کے ساتھ جد و جہد
[illegible] پیدا کرو اور کوشش کرکے اپنی ذہنی قوتوں میں ہمواری قائم کرو۔"

اگر انسان کی فطرت میں [illegible] ہے تو [illegible] یہ سمجھنا ہے کہ اس کے
[illegible] کے عمل اور اس کے مقاصد میں ایک خاص تناسب ہو۔ یہ تناسب کسی
منطقی اصول، کسی نظریے کو جانچنے اور مستند کرنے سے نہیں پیدا کیا جاسکتا، اس
کا [illegible] شخصی ہے جس کا [illegible] نہیں۔ مذہب اور ہر تہذیب میں ملتا ہے،
[illegible] "کسی چیز کی فطرت ہم اسی کی
اس شکل کو کہتے ہیں جب وہ تکمیل پا چکی ہو۔" ارسطو کا یہ مقولہ صرف یونانیوں
کا ایک نظریہ [illegible] بلکہ یہ ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی
ترجمانی کرنے کی کوشش ہر تہذیب نے کی ہے۔ فطرت کو اس معنی میں بدھ
مذہب اور اسلام نے ایک معیار مانا ہے، اور اسی وجہ سے ان میں "کامل"
اور "انسان" کے تصور [illegible] تصورات کے مل کر
ایک ہو جانے کو [illegible] سب سے بلند مقام سمجھا گیا ہے۔

[illegible] کی کوشش کرتے تو ان سے بہت
سی مخالفت [illegible] کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جہاں یہ مخالفت مشخص ہوں بات سمجھنے
میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی دشمنوں سے، غصہ اور [illegible]
سے انتقامی [illegible] یا سیاسی نظام سے لڑے تو یہ دکھایا جاسکتا

ہے کہ اس نے انسانیت کی اصلاح اور تکمیل کے لئے جد و جہد کی اور اس طرح اچھے اور اعلیٰ اوصاف بھی پیدا کئے۔ لیکن اس میں اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم جد و جہد کے لئے کسی مخالف کا ہونا لازمی سمجھیں، ہماری نظر مقابلے کی کیفیتوں پر رہے اور ہم اس مغالطے میں پڑ جائیں کہ انسان کی تکمیل خارجی اثرات کا رد عمل ہے۔ گوتم بدھ کے خلاف اُن کا چیلا اور رشتہ دار دیودت سازشیں کرتا رہا، شیطان نے اُنھیں ورغلانے کی کوششیں کیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا محرک ان کا اپنا ارادہ تھا، اور ان کے مخالف وہ رجحانات تھے جو انسان کو مادی زندگی کی پابندیوں، اس کی ناپائیداری اس کے "دکھ" کو تسلیم اور برداشت کرنے پر آمادہ رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے گوتم بدھ کی تعلیم میں صرف ایک پہلو ہے اور وہ اثباتی ہے، اور تردید اور نفی کی شکل یہ ہے کہ ان میلانات کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کی ترقی اور تکمیل کو روکتے ہیں۔ گوتم بدھ کی شخصیت اپنے حسن سے ممتاز ہے، وہ ایسا چراغ نہیں ہے جس کی روشنی گرد و پیش کی تاریکی کی دست نگر ہو۔ گوتم بدھ کے مباحثوں میں بھی ایسا ہی حسن ہے۔ انھوں نے ذات پات کی تقسیم کو مٹانے کی کوشش نہیں کی، مگر اسے تسلیم بھی نہیں کیا اور اس کی تعلیم دیتے رہے کہ شرافت کا معیار خاندان نہیں بلکہ عمل اور اخلاق ہیں۔ ہم کو شاید زیادہ تسلی ہوتی اگر انھوں نے ذات پات کے بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی ہوتی، لیکن ان کی نظر میں "دکھ" کا جو تصور تھا اسے دیکھتے ہوئے ان بندھنوں کی اتنی اہمیت نہیں تھی کہ انھیں توڑنا ایک الگ مقصد بنایا جائے۔ ایک مرتبہ وہ ویسالی گئے اور وہاں کی بہت مشہور طوائف امبا پالی نے ان کی اور ان کے چیلوں کی دعوت کی۔ انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد ویسالی کے شرفاء کی ایک جماعت اُن کے پاس آئی اور اپنے یہاں ان کی دعوت کی۔ انھوں نے کہا کہ میں امبا پالی کی دعوت قبول کر چکا ہوں، اب میں اس کے یہاں جانے سے انکار نہیں کر سکتا۔ آخری کھانا جو انھوں نے کھایا چنڈا لوہار کے یہاں تھا۔ یہاں سور کی طرح کی کوئی چیز تھی جو سڑ گئی تھی۔ اسے چکھتے ہی انھوں نے میزبان سے کہا کہ اس چیز کو صرف میں کھاؤں گا اور جو کچھ بچے اسے دفن کر دینا۔ اس طرح انھوں نے میزبان کا دل نہ دکھانے بغیر اپنے چیلوں کو بچا لیا۔ اس چیز کے کھانے سے انھیں پیچش ہو گئی اور جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی حالت خراب ہے اور وہ جانبر نہ ہو سکیں گے تو انھوں نے اپنے خاص شاگرد آنند کو بلایا اور کہا کہ دیکھو، چنڈا سے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ میری موت کا سبب وہ کھانا تھا جو میں نے اس کے یہاں کھایا اور اس سے چنڈا کو ندامت اور تکلیف ہو سکتی ہے۔ تو تم اس سے اور سب سے کہنا کہ میں نے اپنے کانوں سے بدھ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ سب سے متبرک وہ کھانا ہے جسے کھا کر بدھ دنیا سے رخصت ہوا اور بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کے یہاں یہ کھانا کھلایا جائے۔

گوتم بدھ نے اپنا معمول بیان کرتے وقت ایک مرتبہ کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے الگ جا کر بیٹھ جایا کرتا ہوں اور محبت کے اس جذبے کو جو میرے اندر ہے ساری دنیا میں پھیلاتا ہوں۔ ان کی یہ محبت خالص خیر خواہی تھی جسے کسی طرح مشتعل نہیں کیا جا سکتا، سوا اس کے کہ ہم کہیں کہ وہ ساری مخلوق میں خود شناسی اور خفیت شناسی کی تڑپ پیدا کرنا اور اس طرح اسے کمال اور نجات کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ عقیدت مندوں نے ان کی پرستش اختیار کی اور انھیں بلند ترین مقام دے کر انھیں اپنے آپ سے دُور کر دیا۔ ہمارے زمانے میں عقیدت مندوں نے ان کی تعلیمات کا مطالعہ خود اپنی اُلجھنوں کو سلجھانے کے لئے کیا ہے، اور انھیں ایک عظیم الشان رہبر یا نیستی کے فلسفے کا مجسمہ فرض کر لیا ہے۔ در اصل کامل انسان کے دیدار کی کوئی تاب نہیں لا سکتا۔ ہم صرف ان چیزوں کو پہچان لیتے ہیں جن پر ہماری بھٹکی ہوئی نظریں پڑتی ہیں۔

بچّوں کا عجائب گھر

حکومت ہندوستان ایک لاکھ میں سات لاکھ روپے کے خرچ سے بچوں کے لئے ایک شاندار عجائب گھر بنا رہی ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہوگا (۱) گڑیوں کا شعبہ (۲) بچوں کی تیار کردہ تصویروں، کھلونوں اور کاریگری کے نمونوں کا شعبہ (۳) تاریخ فطرت سے متعلق شعبہ

تجویز ہے کہ اس عجائب گھر کے لئے دنیا بھر کے مختلف ملکوں کے بچوں کے بنائے ہوئے کھلونے، تصویریں اور گڑیاں وغیرہ حاصل کی جائیں۔

اُمید ہے کہ عجائب گھر دوسرے پنج سالہ پلان کے دوران میں مکمل ہو جائے گا۔ سال رواں کے بجٹ میں اس کی عمارت کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم مہیا کی گئی ہے۔

رادھا کمد مکرجی

بدھ مذہب میں تعلیم اور خانقاہی تربیت

ہر مذہبی نظام اپنے لئے ایک خاص طریقۂ تعلیم کی تشکیل کرتا ہے اور اس کے ذریعے وہ اپنے پیروؤں کی تربیت کرتا ہے۔ مذہبی نظام کی مقبولیت اور ترقی کا انحصار انھیں پیروؤں پر ہوتا ہے۔ انھیں نے مذہب کی معنویت، صداقت، نقطۂ نظر، تصورِ حیات اور دستور کی زندہ مثال اور جیتا جاگتا نمونہ ہونا چاہیئے۔ کچھ حد تک یہ بات صحیح ہے کہ بودھ فلسفہ ویدانت کے فلسفے سے پیدا ہوا ہے اور اس کا نظام تعلیم بھی برہم چریہ کے اصولوں اور دستوروں پر قائم برہمنی نظام سے متاثر ہوا ہے۔ برہمنی نظام میں برہم چریہ کی تعلیم استاد کے گھر ہی میں دی جاتی تھی۔ طلباء کی حیثیت استاد کے "انتے واسیوں" یعنی خاندان کے رکن کی ہوتی تھی۔ اس طرح استاد کا گھر گویا ایک کرنی اسکول تھا۔ بودھ نظام میں اس کی جگہ "وہار" نے لی۔ وہاروں کے اجتماعی نظام اور بہتر تعلیم میں طلبا کے لئے اجتماعی زندگی گذارنے کے زیادہ مواقع تھے۔ بودھ نظام کا مقصد تھا کہ "وہار" میں زیادہ منظم تعلیم و تربیت کی مدد سے پیروؤں یا فقیروں کا ایک ایسا حلقہ بنا لیا جائے جو تمام برائیوں سے پاک، اور ہر لحاظ سے مثالی ہو۔

نظامِ تعلیم

بودھ نظام تعلیم میں تعلیم کا دائرہ انھیں لوگوں تک محدود ہے جو ترکِ دنیا کر چکے ہوں اور اپنشد کے نظریے کے مطابق فقیری کی زندگی اپنا چکے ہوں۔ اپنشد میں کہا گیا ہے

> "جو لوگ ذہین اور عقلمند ہیں انھیں اولاد کی آرزو نہیں ہوتی۔ جن کا گھر "آتما" ہے، ان کے لئے اولاد کی کیا اہمیت ہے؟ وہ بچوں کی آرزو ترک کر دیتے ہیں، دولت کے لئے جد و جہد کرنے اور دنیاوی بہبود کے لئے تگ و دو کرنے سے باز آجاتے ہیں اور فقیری زندگی اپنا لیتے ہیں۔"

لیکن عام طور پر برہمنی نظام میں ترکِ دنیا کی چار منزلوں میں سے زندگی کی صرف دو آخری منزلوں یعنی پوری براجک آشرم اور سنیاس کا ہی تصور ملتا ہے۔ بودھ مذہب کی تعلیم یا اس میں شریک ہونے کی پہلی منزل کو "پبجّا" کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "آگے جانا" یا اپنی پہلی حالت سے نکل جانا۔ اس طرح یہ ذات کے لوگوں کے لئے اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ جب اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر بے گھر ہو جاتے ہیں تو ان کے پرانے نام اور حسب و نسب کا وجود اسی طرح نہیں رہتا جس طرح ندیاں سمندر میں اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔ برہمنی نظام میں بھی شاگرد اپنے والدین کے گھر کو چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن تعلیم کے لئے وہ جب استاد کے گھر میں جا کر رہ جاتا ہے تو یہ اس کا نیا گھر بن جاتا ہے۔ تب اس کو "برہم چاری" کا لقب ملتا ہے۔ بودھ نظام میں یہ لقب "سرمنیر" کا ہے۔ فقیری کی پہلی منزل "پبجّا" کے بعد دوسری منزل "اپ سمپدا" کی ہوتی ہے جس کے بعد فقیری کا پورا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ "اپ سمپدا" کی تکمیل کے لئے صرف ایک استاد کی تصدیق کافی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس مقصد کے لئے جمہوری طریقے پر ساری جماعت یا سنگھ کی مجلس ضروری سمجھی جاتی تھی۔ فقیری کا درجہ پانے کے بعد بھی شاگرد دو استادوں کی نگرانی میں رہتا تھا۔ یہ استاد اچاریہ اور اپادھیائے کہلاتے تھے۔ اول الذکر استاد مذہبی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا اور مؤخر الذکر کی حیثیت ایک نگراں کی ہوتی تھی۔ اول الذکر کے اس رشتے کی مدت چھ سال اور آخر الذکر کی دس سال ہوتی تھی۔

خانقاہی زندگی

خانقاہوں کی زندگی اصولوں کی پابند ہوا کرتی تھی۔ ان اصولوں کا اطلاق

خدا [illegible] سنگی کی [illegible] ہوتا تھا۔ غذائی قسم دو حصوں میں کی گئی تھی۔ (۱) سخت جیسے [illegible] گوشت [illegible] اور (۲) نرم جیسے آٹے کے چاول اور ترکاری۔ [illegible] چند چیزوں کے استعمال [illegible] کی بھی اجازت تھی، گھی [illegible] شہد [illegible] دودھ اور دہی [illegible] جیسے [illegible] اور خاص [illegible] پھلوں کا رس اور [illegible] کی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ([illegible] ۳۵ [illegible]) [illegible] چیزوں کا [illegible] ممنوع تھا [illegible] کے بعد بھی وہ شکر کے ساتھ [illegible] تیل، چاول اور [illegible] تھے۔ [illegible] گاؤں کے پاس ایک [illegible] اس کے علاوہ [illegible] دونوں طرح کی [illegible] چیزیں [illegible]"

([illegible])

بھکشوؤں کا لباس تین حصوں میں [illegible] تھے۔ تینوں حصے 'انتر واسک'، 'اتر سنگ' اور 'سنگھاٹی' کہلاتے تھے۔ 'انتر واسک' کمر کے گرد اندر پہننے کا کپڑا تھا اسے کسی کپڑے کے [illegible] سے یا ایک پٹکے سے جسے 'کایہ بندھن' کہتے تھے، باندھ لیا جاتا تھا۔ 'اتر سنگ' ڈھیلا جامہ تھا جو کہ گلے سے [illegible] پیروں کے [illegible] اس کا ایک سرا داہنی جانب سے ہوتا ہوا بائیں کندھے پر [illegible] جاتا تھا اور پیٹھ پر چھوڑ دیا جاتا تھا" (چلا وگ [illegible]) 'سنگھاٹی' کو کمر [illegible] لپیٹ کر پہنا جاتا تھا [illegible] ایک پٹکے سے باندھا جاتا تھا۔

لباس کے سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ 'ونے' میں کپڑے تیار کرنے کے تمام [illegible] اور وہ تمام چیزیں جو رنگ چڑھانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں موجود تھیں۔ بھکشوؤں [illegible] اپنا لیا [illegible] تیار کریں گے [illegible] کی مدد سے [illegible] ہمیشہ اچھی حالت میں رکھیں گے [illegible] ۷-۱۱ یہ بھی کہا گیا ہے کہ [illegible] بھکشو کسی دستکاری کا کام نہیں کریں گے وہ کسی بھی [illegible] میں منتخب ہو سکتے تھے۔

بودھ درسگاہیں

بدھ اور [illegible] سنگھ [illegible] جو [illegible] قائم کئے گئے تھے، وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] کا ذکر بھی ملتا ہے [illegible]

بودھ [illegible] میں طلبہ کو [illegible] کے مطابق مندرجہ ذیل چار [illegible] میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] پر مشتمل مرتبہ کی [illegible]۔

درس و تدریس کی زبان کے تعلق بدھ نے حکم دیا [illegible]! [illegible] تعلیم دی جاتی تھی [illegible] ہر ایک [illegible] اپنی زبان میں [illegible]"

اسی طرح [illegible] کو عوام کے لئے بہت مشکل سمجھا گیا اور [illegible] تعلیم [illegible] بولیوں کی وساطت سے دی جاتی تھی۔

(چلا وگ [illegible])

[illegible] جو چیزیں پڑھائی جاتی تھیں وہ عام طور پر تحریر میں نہیں آتی تھیں [illegible] دستاویزات میں قلمبند کی جاتی تھیں [illegible]

بدھ بنیادی طور پر جمہوریت پسند تھے۔ انھوں نے سنگھ کی تعمیر ایک جمہوری ادارہ کی حیثیت [illegible] تعلیمی اور مذہبی مسائل پر فیصلے کرنے کے لئے سنگھ کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں کی کارروائیوں کے قانونی [illegible] کے لئے کچھ [illegible] ہوتے تھے جلسے کے لئے کورم کا پورا ہونا ضروری تھا [illegible] اکثر سنگھ (واگ کام سم) کوئی قانون پاس کرتا تو اسے باطل (واگا سم) قرار دے دیا جاتا تھا۔ کورم کے سلسلے میں دیکھ بھال کی ذمہ داری ایک افسر پر ہوتی تھی جس کو "گن پورک" کہتے

تھے - اس کی حیثیت وہی تھی جو موجودہ قانون ساز انجمنوں میں "وہپ" کی ہوتی ہے۔ سنگھ کا ایک صدر ہوتا تھا جسے "ونیئے دھر" یعنی "ضابطے کا محافظ" کہتے تھے۔ ایک افسر اراکین کے لئے نشستوں کا انتظام کیا کرتا تھا اس کو "آسن پرگیہ پاک" کہتے تھے۔ سنگھ کے سامنے جو موضوع ہوتا اُسے تقریر کی صورت میں نہیں بلکہ تحریک کی باضابطہ نوٹس (گیپتی) کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا (تھانیم)۔ یہ نوٹس تین بار پڑھا جاتا تھا (انوسوانہ)۔ اس کے بعد ایک قانون کی حیثیت سے منظور کر لیا جاتا تھا۔ اسے "کی اپتی چتر تھ کرم" کہتے تھے۔ سنگھ جو تجویز منظور کرتا تھا اُسے "سنگھ کرم" یعنی سنگھ کا قانون کہتے تھے۔ قانون کی عبارت یا اُسے عمل میں لانے کو "کرم وچ" کہا جاتا تھا۔ مباحثے کے بھی اصول تھے۔ مباحثے کا نتیجہ سخت اختلاف (بھنڈن) یا جھگڑا (کلہہ) یا اختلاف رائے (ویواد) ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی مباحثے کے دوران میں بے معنی (انگیہ) تقریریں بھی ہو سکتی تھیں۔ پہلے اختلافات کو اتفاق رائے کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جب ایسا کرنا مشکل ہوتا تو سنگھ مختلف گروہوں کے رہنماؤں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دیتا تھا۔ نزاعی معاملات اس کمیٹی کو سپرد کر دئے جاتے تھے۔ کمیٹی ان معاملات پر غور و فکر اور سکون کے ساتھ بحث کرنے کے لئے کسی تنہائی کی جگہ میں اپنا جلسہ منعقد کرتی تھی۔ کمیٹی اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ کرتی تو سنگھ کے فیصلہ کی طرح اُسے پورے سنگھ کو قبول کرنا پڑتا تھا۔ کمیٹی کے اراکین کی حیثیت ثالثوں کی ہوتی تھی جنہیں سنگھ کی جانب سے نزاعی معاملات (اوبباہیکا)

طے کرنے کا کام سونپا جاتا تھا (سمت)۔ کمیٹی "اُدوا ہیکا سبھا" کہلاتی تھی۔ اس کے معنی ہیں - ایسی کمیٹی جو اپنے اراکین کو کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور کر سکے۔ آٹھ اراکین پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک صدر تھا اور دوسرا مشیر۔ مؤخر الذکر اول الذکر کے سامنے مختلف نزاعی معاملات کو سلسلہ وار رکھتا ہے اور سیلیپ کے ذریعے دوسرے اراکین کو ہر معاملے پر کئے گئے فیصلے کی اطلاع دیتا ہے۔ (اودنی پیتم سلاکم مجھی ہی)

لیکن جب کمیٹی کسی متفقہ فیصلے پر پہونچنے میں ناکام رہتی اور سمجھوتے کے تمام طریقے اور ذرائع بے سود ثابت ہوتے تو معاملہ پورے سنگھ کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا تھا۔ تب سنگھ اکثریت کی رائے سے (دیپے بہو یا سیکینہ) فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طریق کار کو "یدبھویا سکاکیا" (اکثریت کی رائے پر عمل کرنا) کہتے تھے۔

ووٹ کو "چھند" کہتے تھے جس کے معنی آزادی کے ہیں۔ ووٹ آزادی کے ساتھ اور خفیہ (سلاکا) کی شکل میں دئے جاتے تھے۔ مختلف نظریوں کی نمائندگی کرنے کے خیال سے یہ ٹکٹ مختلف رنگوں کے ہوتے تھے اور لکڑی سے بنائے جاتے تھے ہر ممبر کو آزادی تھی کہ وہ اپنے نظریے کے مطابق ایک خاص رنگ کا ٹکٹ منتخب کرے۔ اسے کسی اور کو نہیں دکھلانے کی تاکید کر دی جاتی تھی۔ جو افسر ووٹ لینے کا ذمہ دار ہوتا تھا اُسے "سلاکا گاہاپک" کہتے تھے (چلیدوگ XV ۱۴، ۱۶؛ مہاوگ II ۲۳، ۹۶؛ x ۱، ۴، ۵، ۱۰)۔ اس کا فرض تھا کہ ووٹ دینے والوں کے لئے مکمل آزادی بہم پہونچائے اور رائے دہندگی میں پوری غیر جانب داری سے کام لے۔

اعداد و شمار کی زبانی

۱- دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لئے ۸۹ کروڑ روپیے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی تعلیم پر زور دیا جائے گا۔

۲- بھارت میں کچے لوہے کی پیداوار جولائی ۱۹۵۶ء میں بڑھ کر ۳۲۵۳۰۰ ٹن ہو گئی۔ جبکہ یہی پیداوار جون ۱۹۵۶ء میں ۲۹۱۱۵۰ ٹن تھی۔

۳- ۵۶-۱۹۵۵ء میں بھارت نے ۱۲ کروڑ ۹۷ لاکھ روپے کی مالیت کا ۳۰۸۶۲ ٹن کاجو دوسرے ملکوں کو بھیجا ہے۔

۴- ۵۶-۱۹۵۵ء میں چائے کی کھپت ۱۰ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ تھی۔ اس کے مقابلے میں ۵۵-۱۹۵۴ء میں چائے کی کھپت ۸ کروڑ ۳۰ لاکھ پونڈ تھی۔

۵- بھارت کا تمباکو ۴۳ ملکوں کو بھیجا جاتا ہے اس سے بھارت کو قریباً ۱۲ کروڑ روپے سالانہ کا غیر ملکی سکہ تبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

تنویر احمد علوی

گوتم بُدھ

ترا شباب نہ بہلا حسین نغموں سے
کہ دل میں دی تھی جگہ تو نے درد آہوں کو
بھلا وہ کھائے گا کیونکر فریبِ نقش و رنگ
جو سن چکا ہو غمِ زیست کی کراہوں کو

دکھوں کے بوجھ سے ہے آدمی کی پشت دوتا
جنونِ جوشِ جوانی ہے رنجِ پیری ہے
یہ تیلیاں ہیں قفس کی کہ تارہائے نفس
یہ زندگی ہے کہ افسانۂ اسیری ہے

یہ موجِ آب یہ سبزہ یہ کنجِ گل یہ بساط
یہ سازِ نغمہ کہ فردوسِ گوش کہئے جسے
یہ چاندنی یہ حسیں بادباں یہ رنگ محل
یہ رقصِ رہزنِ تمکین و ہوش کہئے جسے

ہیں بے شمار اگر فاقہ کش تو چند نفوس
دبے ہوئے ہیں یہاں سیم و زر کے ڈھیروں میں
ادھر چراغ پہ کچھ رہبروں کا قبضہ ہے
بھٹک رہے ہیں ادھر قافلے اندھیروں میں

اسی کے سائے میں صدہا وہ غم کدے بھی ہیں
جہاں یہ رقص یہ نغمہ یہ انبساط نہیں
وہ نامراد بھی بستے ہیں جن کی قسمت میں
یہ جامِ عیش یہ موجِ مئے نشاط نہیں

بڑھا تو چشمۂ حیواں کی ظلمتوں کی طرف
کہ زندگی کے لئے آبِ زندگی لائے
سحر کو ڈھونڈنے نکلا سیاہ راتوں میں
کہ گمرہوں میں ہدایت کی روشنی لائے

یہ موت و زیست یہ آواگون یہ گردشِ وقت
جو چاہو تم تو یہ زنجیر ٹوٹ سکتی ہے
ہے ترکِ دنیا میں مکتی کا مارگ پوشیدہ
حیات مرگِ مسلسل سے چھوٹ سکتی ہے

وہ فلسفہ جو ضمیروں کو مضمحل کر دے
وہ فلسفہ نہیں فکر و نظر کا دھوکا ہے
تم اُس خدا کو زمان و مکاں میں مت ڈھونڈو
جو خود تمھارے ہی من مندروں میں بیٹھا ہے

غرورِ دولت و ثروت کو توڑنے کے لئے
خدائے دولت و ثروت فقیر بن کے رہے
ذلیل و خوار ہیں جو اُن کی لاج رکھنے کو
عزیزِ چشمِ جہاں بھی حقیر بن کے رہے

گرا کے تو نے روایات کے گھروندوں کو
نژاد و نسل کے دامِ کہن کو توڑ دیا
ہر ایک کے لئے کھولیں نجات کی راہیں
طلسمِ ذات و بُت و برہمن کو توڑ دیا

فنا ہوئی ترے پیغامِ انقلاب کی روح
وہ زندگی کے حقائق بنے ہیں افسانے
بدل کے وقت نے پھر کچھ حسیں بتوں میں تجھے
سجائے وہی وہم و گماں کے بُت خانے

بشارت فاطمہ

بُدھ مت

"غالباً آپ اس پرانے قصے سے واقف ہوں گے جس میں چند اندھوں سے پوچھا گیا تھا کہ ہاتھی کس چیز کے مشابہ ہوتا ہے؟ ایک اندھے نے اس کے کان چھو کر کہا "پنکھے کی طرح" دوسرے نے اس کے پاؤں پکڑے اور کہا "کھمبے کی طرح" اس حکایت کا اطلاق ان مغربی افراد پر بخوبی ہو سکتا ہے جنھوں نے بدھ مت پر قلم اٹھایا ہے۔" (آرتھر ویلے)[1]

مگر بدھ مت کے سمجھنے میں غلط فہمی کی یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے ہمیں ان دشواریوں سے واقف ہونا چاہیئے جو بدھ مت کو سمجھنے میں درپیش آتی ہیں۔ یہ دشواریاں کچھ تو زمانی ہیں اور کچھ مکانی، ساتھ ہی ساتھ خود بدھ مت کا مزاج بھی عہد جدید کے طالب علم کے لئے بہت پیچیدہ ہے۔ بدھ لٹریچر کا بیشتر حصہ ان تحریروں کا ہے جو تاریخی حیثیت سے پیش آتی ہیں۔

سب سے پہلی دشواری یہ ہے کہ بدھ لٹریچر کی تاریخ تصنیف اور یا اس کے مصنفین کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ خود گوتم بدھ کی وفات کی تاریخوں میں بڑا اختلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی وفات کی تاریخ عام طور پر (۴۸۳ ق-م) تسلیم کی جاتی ہے مگر خود بدھ روایات کے مطابق ان کی تاریخ وفات (۲۸۵ یا ۶۶۲ یا ۵۴۴ یا ۳۵۱ یا کبھی ۲۵۲ ق-م) بتلائی جاتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ افسوس ناک خود بدھ لٹریچر کی توقیت Chronology کی عدم موجودگی ہے۔ لانگ لوا اور سینو باس Longlois and Seignobos نے ایک جگہ بالکل ٹھیک بات لکھی ہے کہ ایسے مخطوطات جن کے مصنف، تاریخ اور مقام متعین نہ کئے جا سکتے ہوں وہ مورخ کے کسی کام کے نہیں۔[2]

بدھ علماء چونکہ نام و نمود سے بچتے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تصانیف پر اپنا نام نہیں لکھا۔ بعض اوقات یوں ہوا کہ کئی لوگوں کی مشترک تصنیف کسی ایک کے نام سے شہرت پا گئی۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے تصنیفوں کی اس گنجلک گتھی کو سلجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

تاہم اندازاً ان تصنیفات کی توقیت کی جا سکتی ہے۔ ابتدائی عہد سے بدھ لٹریچر حسب ذیل شعبوں میں منقسم ہے:

۱۔ دھرم: اس میں بدھ مت کے بنیادی اصول درج ہیں
۲۔ ونیہ: اس میں جوگیانہ تنظیم کی تفصیلات درج ہیں۔
۳۔ سوتر یا ابھیدھرم: اس میں وہ باتیں درج ہیں جو خود مہاتما بدھ نے کہی تھیں۔ ان کے مرتب کرنے والوں کے نام عام طور پر معلوم نہیں ہیں

[1] A Text Book of Historical Methods by Conglois

[2] Prof. Arthur Waley

۴ - شاستر - یہ بدھ علماء کی تصنیفات ہیں جو عام طور پر ان کے نام سے مشہور ہیں -

ان کے علاوہ ستا نی پاتا سب سے قدیم کتاب سمجھی جاتی ہے - مہا وستو اور للت وستار وغیرہ بھی قابل ذکر کتابیں ہیں -

ابتدائی عہد میں بدھ ادب کا ذخیرہ بہت کافی تھا - ہم تک بہت ہی تھوڑا پہنچا ہے - نیز بدھ مت کی ابتدائی روایات مذہبی اصولوں کو حفظ کرنے کی تھیں - یہی وجہ ہے کہ ابتدائی چار سو سال تک تقریباً سارا کام سینہ بہ سینہ زبانی چلتا رہا - رفتہ رفتہ اس کو قلمبند کرنے کا رجحان پیدا ہوا

بدھ مذہب چونکہ دنیا بھر کے مختلف حصوں میں پھیلا اس لئے اس پر اہم جغرافیائی اثرات بھی پڑے - چین، جاپان، ہندوستان، برما، جاوا، سماٹرا، لنکا، ایشیا اور یورپ جہاں جہاں یہ پھیلا اس کے اصلی رنگ پر وہاں کے جغرافی کے گہرے اثرات پڑے - اس طرح ہمیں بدھ مت کی کئی شکلیں نظر آتی ہیں - یہ تفصیلات اس وقت ہمارے موضوع سے دور ہیں - یہاں بدھ مت کے صرف دو ہی پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے - ایک تو اس کا تاریخی اور تدریجی ارتقاء اور دوسرے بنیادی اور مشترک تصورات - مشترک تصورات کے ضمن میں ہم اہم بدھ مکاتب خیال کا بھی ذکر کریں گے -

بدھ مت کو سمجھنے میں تیسری اہم دشواری اس کا طرز استدلال ہے - اوّل تو یہ کہ مہاتما بدھ کے زمانے سے آج تک کے طرز استدلال میں بڑی تبدیلیاں اور بڑا فرق ہو گیا ہے - دوسرے یہ کہ بدھ علماء نے خود کبھی منطق کو ملحوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی - ہمیں افلاطون اور ارسطو کی تصنیفات میں منطقی اصولوں کی جو پابندی نظر آتی ہے وہ بدھ ادب میں نظر نہیں آتی - بدھ مت کے اصولوں میں کوئی پہلو ایسا نہیں جسے فلسفے کی زبان میں بیان کیا جا سکے - ڈاکٹر کونزے نے اس کی بڑی اچھی مثال دی ہے کہ

> "شاید یہ مماثلت صورت حال کو واضح کر دے کہ چینی زبان، چینی سمجھتے ہیں مگر اس کی کوئی گرامر نہیں ہے اور چینی زبان بغیر گرامر کے پڑھائی جاتی ہے - بعض مغربی ماہرین لسانیات نے لاطینی اصولوں پر اس کی قواعد مرتب کرنا چاہی تھی وہ خیال سود مند ثابت نہ ہو سکی - یہی حالت فلسفے کے اصطلاحوں کی بدھ مت کے ساتھ ہے "[1]

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بدھ مت میں کوئی معقولیت یا فلسفہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی معقولیت اور طرز استدلال مخصوص وجوہ کی بنا پر اس کے اپنے طرز کے ہیں - سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بدھ اصول بحیثیت عمل ہیں - بدھ مت مذہبی فلسفے کی طرح مظاہر Phenomenon کے "کیوں؟ اور کیسے؟" میں نہیں جاتا - بدھ مت میں فکار کی اہمیت کا بیشتر حصہ تو طریقے Process کی حیثیت سے ہے نہ کہ نتیجہ Product کی حیثیت سے ہے - وہاں فکر کی عملی افادیت کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے - بے سود فکر سے کچھ حاصل نہیں - فکر کی اس دنیا میں "انسان کی حیثیت مریض کی ہے بدھ مت کے اصول دوا ہیں اور مہاتما بدھ کی حیثیت ڈاکٹر کی ہے "

بدھ نظریے کے مطابق کوئی بھی نظریہ مطلق Absolute نہیں ہو سکتا - ایک ہی خیال کی دو متضاد سرحدیں برحق ہو سکتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ بدھ منطق میں ایک ہی وقت میں دو متضاد باتیں سچ ہو سکتی ہیں - بدھ عقیدے کے مطابق منطق کا مقصد اس لئے ختم کی نفی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ روحانی آزادی ـــــ اور اس آزادی کے لئے وسیع سے وسیع تر فضا حاصل کی جائے - بدھ مت کے اس غیر منطقی مزاج میں جو ربط ہے اسے جدلیاتی Dialectic کہا جا سکتا ہے - اس کی مثالیں بیشتر ہیں - مگر یہاں ان کی گنجائش نہیں ہے - آگے "عقل"، "مراقبہ" اور "ریاضت" کے ضمن میں یہ بات خود واضح ہو جائے گی

نیز یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ بدھ فلسفے کو منطق سے اتنا ربط نہیں ہے جتنا نفسیات سے ہے - یہ زیادہ اس کے شدید عملی ہونے کی وجہ سے ہے اس کے فلسفے کا بیشتر حصہ مابعد الطبیعی نہیں ہے

مہاتما بدھ کی شخصیت

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ بدھ مت میں مہاتما بدھ کی شخصیت کے تین مظہر سمجھے جاتے ہیں - پہلا انسانی مظہر "گوتم بدھ" جو غالباً ۵۶۰ اور ۴۸۰ ق م کے درمیان کا ہے - مگر بدھ مت کے پیرو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ گوتم بدھ اس دنیا میں صرف ایک بار نہیں آئے - وہ مختلف روپ میں کئی بار

[1] Buddhism - its Essence and Development by Dr. Edward Conze

آ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے پاس بدھ کے انسانی مظہر کی کوئی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے بلکہ ان کے اس وجود کی اہمیت ہے جو ایک ماورائی مظہر ہے۔

ان کا دوسرا مظہر روحانی ہے۔ بدھ مت کے پیرو اس روپ کو تتھاگت کے نام سے منسوب کرتے ہیں یا ان کا "دھرم شریر" کہتے ہیں۔ لفظ "تتھاگت" کے معنی ٹھیک طور پر آج تک نہ معلوم کئے جا سکے۔ اس کی مختلف توجیہات ہیں۔ ایک معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ "وہ جو اس طرح آیا اور چلا گیا۔" اس سے گوتم بدھ کی بار بار آمد کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرا مظہر ان کا انبساطی جسم Enjoyment body ہے۔ یعنی جس انسانی جسم میں وہ اس دنیا میں آئے تھے محض نمائشی اور ظاہری تھا۔ ان کا اصلی روپ اس جسم کے پردے میں پنہاں تھا جس کو صرف ایمان اور وفا کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس جسم سے گوتم بدھ کی شخصیت ظاہر ہوتی تھی۔ اس جسم میں بتیس اہم اور اسی ذیلی نشانیاں تھیں۔ یہ نشانیاں ان کے فوق البشر Superman ہونے پر دلالت کرتی تھیں۔ ان کا یہ جسم ۱۸ فٹ لمبا تھا چنانچہ ان کے بعض مجسمے اسی قامت کے ہیں۔ ان کے اس جسم سے روشنی نکلا کرتی تھی اور اس کی کرنیں اطراف کو منور رکھتی تھیں۔ یہ روشنی دن رات رہتی اور ان کے گرد ایسا نور رہتا کہ گویا ہزار سورج چمک رہے ہوں یا ہیروں کا ایک پہاڑ جگمگا رہا ہو چنانچہ ان کے اکثر مجسموں میں چہرے کے گرد نور کا ہالا بنایا گیا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں اس کو عیسائیوں نے اپنایا اور مسیح و مریم کی تصویروں میں چہرے کے گرد ہالا بنایا۔

کیا بدھ مت کوئی مذہب ہے؟

یہ بڑا دلچسپ سوال ہے۔ اس میں بڑے اختلافات بھی ہیں۔ چونکہ بدھ مت میں کسی "خدا" کا وجود نہیں ہے اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ مذہب نہیں ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مذہب کے لئے "خدا" کا تصور ضروری نہیں ہے، بغیر خدا کے تصور کے بھی مذہب کا وجود ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بدھ مت اس کی مثال ہے۔

مگر بدھ مت نے خدا کے وجود سے کہیں انکار بھی نہیں کیا ہے۔ بدھ مذہب کا مقصد آفرینش کے اول و آخر کی توجیہہ پیش کرنا نہیں تھا۔ بلکہ انسانی زندگی کو آلام سے نجات دلانا تھا۔ اس لئے وہ ان مسائل میں گیا ہی نہیں جو اس کی عملی دنیا سے متعلق نہیں تھے۔ بدھ مت نے ایسے خالق کائنات کا تصور کم از کم ابتداء میں نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے یا کسی کے بھی "انا" کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بدھ مت کے پیرو تھی خودی کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات بدھ کا مرتبہ "برہما" سے بھی بڑھا لے جاتے ہیں۔ کیونکہ برہما میں تکبر تھا اور بدھ اس سے پاک تھا۔ کیوں کہ برہما کا کہنا ہے کہ:

"میں برہما ہوں، میں عظیم برہما ہوں، میں دیوتاؤں کا راجہ ہوں۔ مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ میں نے دنیا کو پیدا کیا ہے میں دنیا کا مقتدر اعلیٰ ہوں۔ میں تخلیق کر سکتا ہوں، تغیر پیدا کر سکتا ہوں، اور جنم دے سکتا ہوں۔ میں ہر چیز کا باپ ہوں۔"

بدھ صاحب اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تتھاگت اس قسم کی بچگانہ خود فہمی سے بلند تھا۔ خدا کا یہ لامحدود تصور بدھ مت کا اپنا ہے۔

بات دور نکلی جا رہی ہے۔ ہاں تو لامذہبیت اگر ایسے خدا کے وجود سے انکار کا نام ہے جو "خالقِ کائنات" ہو تو بدھ مت یقیناً مذہب نہیں ہے۔ ایک لامذہب فلسفہ ہے۔

بدھ مذہب کا منتہا "نروان" ہے جو ایک مستقل، مستحکم، لافانی، ناقابلِ انتقال، فرماں اور نا آفریدہ کیفیت ہے جو ایک قوت ہے، ایک مسرت ہے، ایک توانائی ہے۔ یہ ایک پناہ گاہ یا آسرا ہے جو اصلی حقیقت بلکہ ارفع حقیقت ہے اور یہی "علائی" ہے۔ مگر دوسرے مذاہب کی جنت کی طرح "نروان" کسی دوسری دنیا میں نہیں ہے۔ بلکہ ہم اسے اسی دنیا میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح بدھ فلسفے میں شدید "ارضیت" پائی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ بدھ مت میں ایک محبت کرنے والے خدا کا تصور بھی ملتا ہے۔ بدھ مت کے پیرو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مذہب انھیں آفات اور بیماریوں سے محفوظ رکھے گا۔ اس میں ان کی اولاد اور خود ان کی بھلائی ہے۔ خود کو مٹانے کی خواہش اور اس مذہبی عقیدے میں جو تضاد ہے وہ بدھ فلسفے پر نظر رکھنے والوں کے لئے انوکھا نہیں ہے۔

بدھ مت کے پیروؤں نے غیر شعوری طور پر برہمنوں سے تین دیوتاؤں کو تسلیم کر لیا پھر رفتہ رفتہ انھوں نے جیتا جاگتا بدھ کو آدی بدھ کی حیثیت دے دی جو "قادرِ مطلق" اور "دانائے کل" ہے جس نے اپنے دھیان گیان

۱؎ دیکھئے متھرا کا بدھ مجسمہ سرورق

سے کائنات کو پیدا کیا۔

یہ باتیں بدھ مت کے مذہب ہونے یا نہ ہونے پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

چار مقدس اصول

مہاتما بدھ نے تجلی کے فوراً بعد بنارس میں یہ چار اصول پیش کئے تھے۔ یہ اصول بدھ مت کے ہر مکتبِ خیال میں یکساں طور پر مانے جاتے ہیں۔ ان چاروں اصولوں پر دھیان گیان کرنا ہی بودھ زندگی کا مرکزی عمل ہے۔ یہ اصول زندگی کی نہایت حقیقت کے ضامن ہیں:۔

(۱) جب کوئی چیز مسرت انگیز ہوتی ہے تو یقیناً اس میں دوسروں کی تکلیف کا کوئی پہلو ہوگا۔

(۲) جب کوئی چیز مسرت انگیز ہوتی ہے تو انسان اس سے مربوط ہو جاتا ہے اور اس کے کھو جانے کے خیال سے غیر مطمئن رہتا ہے۔[2]

۳۔ جب کوئی چیز مسرت انگیز ہوتی ہے تو ہمیں اپنے دوسرے متعلقات کے ساتھ مربوط کر دیتی ہے جن سے آزار کا اندیشہ ہے، جو ناگزیر ہیں۔

(۴) مسرت جو کسی بھی ایسی چیز سے حاصل کی جائے جو اسکندھ[3] میں شامل ہو۔ ایسی مسرت ہماری قلبی پیاس کو بجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔

ان اصولوں پر عمل کرکے انسان لافانی ہو سکتا ہے اور "نروان" کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ ان مشترک عقاید کے بعد بدھ مت کے اہم مکاتبِ فکر کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان مکاتب کے جائزے سے بدھ مت کی صحیح شکل و صورت سامنے آئے گی۔

بدھ مت کے اہم مکاتبِ فکر یہ ہیں:۔

۱۔ جوگیانہ بدھ مت ۲۔ مقبولِ عام بدھ مت

۳۔ قدیم مکتبِ عقل ۴۔ جدید مکتبِ عقل

۵۔ تنتر ۶۔ یورپی بدھ مذہب

جوگیانہ بدھ مت

خود کو مٹانا اور اسکندھ کے پھندے سے بچنا بدھ مت کا بنیادی اصول ہے، اس کے لئے مکمل طور پر تارک الدنیا ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ بات ہر ایک کے لئے قابلِ عمل نہیں ہے چنانچہ بدھ مت نے کسی جگہ بھی ہر ایک کو بدھ مت تسلیم کر سکنے کے قابل نہیں سمجھا ہے چنانچہ بدھ مت کے پیروؤں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک تو وہ جو کماتے کھاتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں اور اپنا گھر آباد کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو ان سارے علائق سے گریز کرکے جوگیانہ زندگی اختیار کرتے ہیں۔ آخر الذکر طبقہ ہمیشہ زیادہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ کیوں کہ جوگیانہ زندگی ہی ایک ایسا ماحول پیدا کر سکتی ہے جو روحانی ارتقاء کی ارفع ترین منازل تک پہنچنے میں سازگار ہو۔ یہ تارک الدنیا اور تنہا زندگی گزارنے والا جوگی طبقہ "سنگھ" کہلاتا ہے۔ دنیا بھر کی بدھ آبادی کے تناسب سے سنگھ ایک بدھ اقلیت ہے۔ ان کی تعداد بتدریج گھٹتی جا رہی ہے۔

سنگھ بدھ پیروؤں کا عمدہ اور منتخب طبقہ ہے۔ یہی لوگ اصل معنی میں بدھ مت کے پیرو ہیں۔ گھریلو زندگی ارفع ترین روحانی مقامات کے حصول کے لئے ناسازگار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو مہایان نے اتنی رعایت کر دی کہ عام آدمی بھی نروان تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ جوگیانہ تنظیم کی تفصیلات ہمیں ونیہ پٹک میں ملتی ہیں۔ اس طبقے کی بنیادی خصوصیات افلاس، تجرد اور کسی کو گزند نہ پہنچانا ہیں۔

افلاس

جوگی کی کوئی بھی شخصی جائداد نہیں ہونی چاہیئے۔ اسے صرف ایک جبہ، ایک کشکول، ایک سوئی، ایک پھولوں کا ہار اور ایک استرا رکھنے کی اجازت ہے۔ ہر پندرہ روز بعد جوگی کو اپنا سر منڈوانا چاہیئے وہ ایک چھننا Filter بھی رکھ سکتا ہے تاکہ پینے کے پانی سے ننھے ننھے کیڑوں کو الگ کر سکے۔ اس کے کپڑے چیتھڑوں سے تیار ہوں اور سب کے لباس گیروے رنگ میں رنگے ہوں۔ عام طور پر معتقدین جوگی کو لباس فراہم کرتے ہیں۔ نظری طور پر اس کی بھی ممانعت ہے کہ کوئی گھر یا جھونپڑا بنایا جائے۔ جوگی کی زندگی بے گھری ہونی چاہیئے۔

---

[1] قطبِ پہلوی زندہ باز رسیب
انتظارِ روزی دارد نہ بیب (مولانا روم)

[3] فنی طور پر اسکندھ پانچ اجزاء سے مرکب ہے وہ یہ ہیں ۱۔ جسم ۲۔ احساسات ۳۔ ادراک ۴۔ جذبات اور جذباتی ہیجان ۵۔ اعمال یا مقصد

لنگوں بدھ اقتدارِ اعلیٰ کی علامت ہے۔ جوگیوں کو اپنا گزارہ بھیک پر کرنا چاہیئے۔ بدھ مت کے پیرووں کے نزدیک بھیک "خوری" کو مٹانے کی بہترین صورت ہے۔ گوشت کھانا ان کے لیے جائز نہیں ہے مگر جب وہ کسی گاؤں میں جائیں اور انھیں بھیک میں گوشت ملے تو اسے بھی قبول کر لینا چاہیئے اور اسے کھانے کی اجازت ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تک تاکید ہے کہ اگر ان کے لنگوں میں کسی جذامی کا چھلا گر جائے تو اسے بھی قبول کر لیں۔

بھیک مانگنے کا طریقہ آج کل چین، کوریا اور نام سے بالکل اٹھ گیا ہے۔ ہندوستان میں اس کی مثالیں اب بھی ملتی ہیں۔ جوگیوں کو بھیک اور نذر دینا عوام کارِ خیر سمجھتے ہیں۔

تجرّد

جوگیوں کو مجرد (برہم چاری) رہنا ضروری ہے۔ کیوں کہ جنسی مباشرت، جذبات اور خواہشات کو ابھارتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ جوگی، عورتوں کو ایک خاص نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ مہاتما بدھ اور اُن کے خاص چیلے آنند کے مابین ذیل کے مکالمے سے بدھ پیرووں کا عورتوں کے ساتھ رویہ Attitude معلوم ہو سکتا ہے:۔

آنند۔ "ہم عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟"

مہاتما۔ "انھیں نہ دیکھو!"

آنند "اگر ہمیں انھیں دیکھنا پڑے؟"

مہاتما۔ "ان سے مت بولو!"

آنند۔ "اگر ہمیں ان سے بولنا پڑے؟"

مہاتما۔ "اپنے خیالات کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھو۔"

جوگیوں کے لیے یہ بھی تاکید تھی کہ جب وہ بھیک مانگنے کے لیے کسی دروازے پر جائیں اور اگر کوئی عورت آئے تو انھیں اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔ جنسی محبت روحانی ارتقاء کے لیے مہلک ہے۔ مگر بعد میں یہ قیود کم ہو گئے کاوساکی لکھتے ہیں:۔

"ریاضتوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم بالکل ہی تارک الدنیا ہو جائیں تاکہ ہم ایک معیاری بدھ پیرو بن سکیں۔ ہمارے بیشترا شوتن نشتران نے شادی کی تھی اور ایسی ہی زندگی گزارتے تھے جیسی کہ دنیا گزارتی ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے خاندان ماحول اور قوم کے مروّجہ قوانین کے مطابق زندگی گزاریں۔ اور اپنے کسی بھی عمل سے خود کو دوسروں سے ممیز نہ کریں۔"

کسی کو آزار نہ پہنچانا

کسی کو آزار پہنچانا بدھ مت کے چار بنیادی "مقدس اصولوں" کے خلاف ہے۔ بدھ مت کے پیرو کو ہر قسم کا آزار برداشت کرنا چاہیئے اور ہر ایک کا جواب خندہ پیشانی اور شکر گزاری سے دینا چاہیئے۔

اس اصول کی اہمیت پورن اور مہاتما بدھ کے اس مکالمے سے ظاہر ہو سکتی ہے:۔

بدھ۔ "سرونا پارنت کے لوگ ظالم، جفا جو اور سفاک ہیں۔ وہ دوسروں کو تنگ کرنے، گالیاں دیتے اور ستاتے ہیں۔ اگر وہ تمہیں شرارت سے تنگ کریں، گالیاں دیں اور ستائیں اور درشت اور سخت الفاظ استعمال کریں تو تم خیال کروگے؟"

پورن:۔ "ایسی صورت میں میں یہ خیال کروں گا کہ سرونا پارنت کے لوگ حقیقتاً اچھے اور شریف ہیں کیوں کہ مجھے وہ اپنے ہاتھوں یا پتھروں سے نہیں مارتے۔"

بدھ۔ "لیکن اگر وہ تمھیں ہاتھوں یا پتھروں سے ماریں! تب تم کیا خیال کروگے؟"

پورن "ایسی صورت میں میں یہ خیال کروں گا کہ سرونا پارنت کے لوگ حقیقتاً اچھے اور شریف ہیں کیوں کہ وہ مجھے لاٹھی یا ہتھیار سے نہیں مارتے!"

بدھ۔ "لیکن پورن! اگر وہ تمھیں لاٹھی یا ہتھیار سے ماریں؛ تب تم کیا خیال کروگے؟"

پورن۔ "ایسی صورت میں میں یہی خیال کروں گا کہ وہ لوگ اچھے اور شریف ہیں! کیوں کہ وہ مجھ سے میری زندگی نہیں چھینتے۔"

بدھ۔ "پورن! اگر وہ تمھیں مار ڈالیں تب تم کیا خیال کروگے؟"

پورن۔ "ایسی صورت میں بھی میں یہی خیال کروں گا کہ وہ لوگ اچھے اور شریف ہیں۔ کیوں کہ مجھے وہ جسم کے اس گندے جھگڑے سے بہ سہولت نجات دلاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے جوگی بھی موجود ہیں جو اپنے جسم پر شرمندہ ہیں، اس کی وجہ سے پریشان اور بیزار ہیں؛ وہ ہتھیاروں سے خود کو قتل کر ڈالتے ہیں، وہ زہر کھا لیتے ہیں، خود کو پھانسی پر لٹکا لیتے ہیں۔"

بُدھ ہو۔ "مجھیں پوری تشریح" اور "تحمل" حاصل ہے۔ تم سے زیادہ پارمت سے ولیس
میں جا کر رہ اور مجھ سکتے ہو۔ جاؤ اور انھیں محدود کرو، آزاد کیجیے۔
... [illegible] آزاد ہو۔"

"متبرک عام بدھ"

اگرچہ بنیادی طور پر بدھ مت بڑی حد تک ترکِ دنیا کو اپنی کرتا ہے تاہم اس میں عام طرزِ زندگی کا بھی کچھ نہ کچھ مقام ہے۔ خود جوگی اور رہبانی زندگی بسر نہیں کر سکتے مگر یوں زندگی بسر کرنے والوں کے محتاج ہوتے ہیں اور بدھ اور جوگی عوام کی فلاح اور خوش حالی کے ضامن اور ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔

جیسے جیسے بدھ تصورات میں ارتقا ہوتا گیا اسے علمی حیثیت بھی ملنے لگی [illegible] سماج [illegible] کو بھی اس پر کافی ترجیح [illegible] اس سے بدھ مت میں [illegible] پیدا ہو گئی اور [illegible] جوگیوں، دھرم [illegible] کہ اس کے [illegible] گھریلو زندگی گزارنے والے بھی اپنانے لگے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ لوگ بھی نروان تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ [illegible] طرزِ زندگی [illegible] حاصل رہی۔ بدھ مت کی یہ صورت حال [illegible] مکتب کے زیرِ اثر رونما ہوئی۔ اس طرزِ فکر کے لوگ بھی مہایانی کہلائے [illegible] لنکا، برما، تبت، چین، جاپان اور ساترا میں پہنچے۔

بدھ مت کی مقبولیت کے اسباب خود بدھ کی شخصیت [illegible] اور [illegible] فکر ہیں۔ شاہی سرپرستی میں اشوکِ اعظم (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق م) کا نام سرِ فہرست ہے۔ اشوک نے سب سے پہلے بدھ مت کو ایک عالمی مذہب کی اہمیت دی اور اسے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلایا۔ اشوک نے اپنے عہد کے یونانی بادشاہ، سیریا کے انٹیاکس دوم، فلاڈلفس اور مقدونیہ کے اینٹی گونس گوناٹاس کے پاس اپنے پیام بر بھیجے نیز ہندوستان کے اطراف کشمیر، لنکا، اور گندھارا تک بدھ مت کو پہنچایا۔ اشوک کے بعد بدھ مت کو کنشک (۷۸ تا ۱۰۳ء) کی سرپرستی حاصل رہی جس نے شمالی ہندوستان پر حکمرانی کی۔ پھر ہرش وردھن (۶۰۶ تا ۶۴۷ء) اور پالا خاندان (۷۵۰-۱۱۵۰ء) نے اس کی سرپرستی کی۔

ہندوستان کے باہر بہت سے [illegible] بدھ مت قبول کر لیا۔ منگول خان اور جاپانی شوتوکو طیشی [illegible] قابلِ ذکر ہیں۔ منگو خان کئی مذاہب کی صداقت پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک سارے مذاہب ایک ہی ہاتھ کی انگلیاں" تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں تاجروں کے ذریعے سے بھی بدھ مت نے کافی فروغ پایا۔ کیوں کہ اس زمانے میں بیرونی تجارت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد بدھ مت کی پیرو تھی۔ وہ جہاں جہاں جاتے اپنا پیغام پہنچاتے تھے۔

بدھ مت کی مقبولیت میں معجزوں اور شعبدوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ بہت ہی سلجھے ہوئے دماغ کے اور تعلیم یافتہ بدھ پیرو بھی معجزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مادیت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ روحانیت کے تجربے گھٹتے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس مسئلے کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس وقت تک بدھ فلسفے کا عملیات سے ربط ہے۔

عام زندگی گزارنے والے بدھ پیرو کسی نہ کسی دیوتا کی پوجا کرتے ہیں تاکہ روحانی یا قدرت کی کوئی مدد [illegible] ہو۔ بعض لوگ خود بدھ کی مورت کی پوجا کرتے ہیں۔ بدھ علماء ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ بدھ کی مورت کی پوجا اتنی اہم نہیں ہے جتنی اہمیت ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ہے۔ ان عوام کے عقائد اور فرائض "سہ جواہر" کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ایک عام بدھ پیرو بدھ کی تعلیمات کا استقبال "سہ جواہر" سے کرتا ہے۔ یہ "سہ جواہر" حسبِ ذیل ہیں:-

"۱۔ میں بدھ کے پاس پناہ کے لئے جاتا ہوں۔
۲۔ میں دھرم کے پاس پناہ کے لئے جاتا ہوں۔
۳۔ میں سنگھ کے پاس پناہ کے لئے جاتا ہوں۔"

یہ تین فقرے تین دفعہ دہرائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ اہم احکامات ہیں:-

"۱۔ کسی کی جان لینے سے پرہیز کرنا
۲۔ اس چیز کو لینے سے پرہیز کرنا جو دی نہ گئی ہو
۳۔ جذباتی مسرت کی غلطیوں سے پرہیز کرنا
۴۔ جھوٹ بولنے سے پرہیز کرنا۔
۵۔ نشے سے پرہیز کرنا کیونکہ یہ دماغ کو ماند کر دیتا ہے۔"

یہ وہ چند اہم اصول ہیں جن کی بنا پر بدھ مت مقبولِ عام ہوا۔ ان اصولوں کی تشریح و تفسیر نہایت اہم اور تفصیل طلب ہے، افسوس ہے کہ اس مقالے کی اسکیم میں اس کی جگہ نہیں ہے۔

تقریباً [illegible] ۴۸۰ ق م میں جب بدھ کے [illegible] میں بدھ مت

کو بڑا دھکا پہونچا۔ اس وقت تک کی بدھ تعلیمات قلمبند نہیں کی گئی تھیں۔ یہ تعلیمات سینہ بہ سینہ چلتی رہیں۔ اس سلسلہ میں ساری پتر کا نام لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ سب سے پہلے اُنھوں نے بدھ تعلیمات کو اکٹھا کرنے کی فکر کی اور قریباً بیس نسلوں تک انھیں کے فراہم کئے ہوئے سرمائے سے کام چلتا رہا۔

ساری پتر:۔ مگدھ کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے اپنی شکّی Sceptic طبیعت کی وجہ سے مختلف مذاہب اختیار کئے۔ مگر جب اُنھوں نے بدھ مت اختیار کیا تو وہ ہی ہفتے کے اندر ابدی حقائق کی اُن پر تجلّی ہوگئی۔ اُنھوں نے نوجوان جوگیوں کی تعلیم و تربیت کا کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ اور سرداستو ادین انھیں بدھ مت کا دوسرا بانی ٹھہراتے ہیں۔ ڈاکٹر کونزے لکھتے ہیں:۔ "ٹھیک جس طرح بدھ دھرم کے بادشاہ ہیں، ساری پتر اس کے سپہ سالار ہیں"[1]

قدیم مکتبِ عقل کا سارا نظام انھیں کے ہاتھوں منضبط ہوا۔

قدیم مکتبِ عقل جو کہ صرف مکتبِ عقل کے نام سے بھی موسوم ہے۔ پانچ اہم عناصر کا حامل تھا وہ یہ ہیں:۔ (۱) ایمان (۲) توانائی (۳) بیدارمغزی (۴) مرکزیت (۵) عقل

ان سب میں عقل کا ارتقاء آخری راہِ نجات ہے۔ یہاں 'عقل' کا لفظ مخصوص معنوں میں برتا گیا ہے۔ آگے اس کی تشریح کی جائے گی۔ ساری پتر کے مکتب کو قدیم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد (۱۰۰ ق م) میں ایک نیا مکتبِ عقل بھی پیدا ہوا۔ قدیم مکتبِ عقل کا مطالعہ ہم ذیل میں "مردِ کامل" "وجد" اور "عقل" کے عنوانات کے تحت کریں گے۔

مردِ کامل:۔ قدیم مکتبِ عقل کی روح کو سمجھنے کا بہترین طریقہ اس بات کا مطالعہ ہے کہ وہ کس قسم کے افراد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس میں سب سے مکمل اور معیاری Ideal فرد کون اور کیسا ہوگا؟

اس مکتب کا مردِ کامل "ارہت" کہلاتا تھا۔ لفظ 'ارہت' دو الفاظ آدی (دشمن) اور ہن (مارنا) سے مرکب ہے۔ اس کا مطلب "دشمن کش" ہوا۔ مگر یہ دشمن کون ہے؟ یہ وہی جذبات، خواہشات اور خودی ہیں۔ ابتدائی زمانے میں سارے بدھ جوگی "ارہت" کہلاتے تھے۔ خود مہاتما بدھ کو بھی "ارہت" کہا گیا ہے۔ بدھ آرٹ میں ہمیں ارہتوں کی بے شمار تصویریں ملتی ہیں۔ ارہت ظاہری طور پر سر منڈواتے تھے۔ وہ جذبات، احساسات، خواہشات، وجود، جہالت اور غلط نقطہ ہائے نظر سے بالکل پاک ہوتے تھے۔ ان کا اندرون آزاد اور غیر محدود ہوتا تھا۔ انھیں خود پر پورا قابو ہوتا تھا۔ وہ غضب کے ریاضت کرنے والے ہوتے تھے آدا دانا ساتاکانے 'ارہت' کی اچھی تصویر کھینچی ہے۔

> " وہ خود پر زور لگاتا ہے۔ جدوجہد اور کوشش کرتا ہے۔ تب اس پر موت و حیات کا دائرہ اپنے پانچوں اسکندھ کے ساتھ منکشف ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے سارے علائق سے انکار کر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ علائق اپنے ساتھ دوسرے علائق کا جھگڑا پیدا کر دیتے ہیں اور آخرکار ان کا انجام مرجھا جانا اور مر جانا ہے، بدل جانا اور مٹ جانا ہے۔ چناں چہ وہ ان ساری گندگیوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور "ارہت" بن جاتا ہے۔
>
> جب کوئی شخص "ارہت" بن جاتا ہے تو وہ اس دُنیا سے اپنا تعلق بالکل ہی ختم کر لیتا ہے۔ سونا اور مٹی کا ڈھیلا اس کیلئے ایک سے ہوتے ہیں۔ اس کے دماغ کے لئے آسمان اور ہتھیلی برابر ہیں۔ وہ خطروں میں بھی اسی طرح پُرسکون اور مطمئن رہتا ہے جس طرح صندل کا درخت" جب کہ اس پہ کُلہاڑی چل رہی ہو"

"ارہت" قابلِ احترام ہوتا ہے۔ وشنو، اندر، کرشن اور دوسرے دیوتا اس کی عزت کرتے ہیں۔ مگر مہاتما بدھ کے سوا آج تک کوئی شخص بھی کامل ارہت نہیں بن سکا۔ ارہت کے مقام تک پہونچنے کے لئے مختلف روحانی مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں بدھ گھوش کی وی سدّھی مگ نہایت اہم کتاب ہے جس میں ارہتوں کی تربیت کی تفصیلات ہیں۔

وجد:۔ بدھ طریقوں کا ایک دوسرا شعبہ بھی ہے۔ جو سمادھی کہلاتا ہے۔ اس میں فکر و توجہ کے حلقہ کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ فکر اتنی منقح ہو جاتی ہے جیسے شمع کی لَو" ایسی 'لَو' جو ہوا کے جھونکوں میں بھی سکون کی حالت میں رہتی ہو۔ یہی وجد یا سمادھی

---

[1] Buddhism : Its Essence and Development by Dr. Edward Conze

ہے۔ اس مقام پر ذہنِ انسانی ہر اس چیز سے کنارہ کش ہو جاتا ہے جو خلل پیدا کر سکے۔ اس سلسلے میں شدید ریاضتیں کرنا ہوتی ہیں۔ رواج کے مطابق حسب ذیل تین اہم ریاضتیں ہیں۔

(۱) دھیان (۲) اپرادان (۳) سدّھی

ان ریاضتوں کی اور بہت سی ذیلی شاخیں ہیں۔ ان ریاضتوں سے گزر کر انسان "روحانی لطافت" "لطافتِ طبع" بے لوث محبت، یگانگی، سلجھی ہوئی مطمئن فکر، فکری صحت مندی، اور "ہمواریٔ طبع" حاصل کرتا ہے۔ اس کا دماغ ایک غیر محدود خلا کا حامل ہوتا ہے۔ اس خلا کے لئے شون یتہ کا لفظ برتا جاتا ہے۔ شون یتہ ایک عظیم خلا Great Emptiness کا نام ہے
اس سے شخصیت کی لطافت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ آدمی پانی پر چل سکتا ہے دیوار میں سے گزر سکتا ہے اور ہوا میں چل سکتا ہے۔ "یہ عظیم خلا" ہی وہ فضا ہے جس میں عقل "پرجنَ" ہو سکتی ہے۔

عقل۔ اس کے لئے سنسکرت لفظ "پرجنَ" برتا جاتا ہے۔ پر جن کے معنی ٹھیک وہی نہیں ہیں جو ہم عقل کے لیتے ہیں۔ بدھ لٹریچر کے مطابق "پرجنَ" "دھرم" پر اصولی اور تدریجی مراقبہ کا نام ہے۔ اسی مراقبہ سے متوازن عقل حاصل ہوتی ہے۔ آروبندو لکھتے ہیں[1]:۔

"ایک پُرسکون دماغ میں یہ پرجنَ ایک عقلی مادہ ہے۔ جو بالکل پُرسکون ہے۔ اس قدر پُرسکون کہ کوئی چیز اس میں خلل انداز نہیں ہو سکتی اگر خیال یا عمل داخل ہوتا ہے تو وہ دماغ ہی کی پیداوار نہیں ہوتا۔ بلکہ باہر سے آتا ہے اور دماغ کی فضا سے اس طرح گزر جاتا ہے جیسے "بغیر ہوا کے آسمان" میں سے پرندے اڑ کے نکل جاتے ہیں۔ خیال اس طرح گزر جاتا ہے کہ کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ وہ (دماغ پر) اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ اگر ہزاروں تصوّرات یا پُرہنگامہ واقعات بھی اس فضا سے گزر جائیں تب بھی یہ پُرسکون خاموشی بالکل اسی طرح باقی رہتی ہے جیسے کہ دماغ کے تانے بانے کبھی نہ منتشر ہونے والی کسی شئے سے بنائے گئے ہوں۔ وہ دماغ جس نے سکون کی یہ منزل حاصل کر لی ہو قوت اور شدت کے ساتھ عمل کر سکتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کا بنیادی سکون برقرار ہی رہیگا۔"

اس طرح کی فکر میں مشاہدہ، فکر اور مطالعۂ قدرت کو "[illegible]" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان چیزوں کو جب ہم اپنی "انا" سے مربوط کرتے ہیں تو ہمارے خیالات شخصی ہو جاتے ہیں۔ یہ اشیاء ہمارا جزو بن جاتی ہیں۔ ان سے ہماری دلچسپیاں وابستہ ہو تی جاتی ہیں اور بالآخر ان پر غور کر کے ہم دُکھ اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ "پرجنَ" قطعاً غیر شخصی Impersonal عمل ہے ایسی فکر کا حامل سکونِ طبع کی یقیناً ضامن ہوگی۔

بدھ پیروؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر پانچ سو سال بعد بدھ اصولوں میں تبدیلیاں ہوں گی۔ یہ مدت متنازع فیہ ہے بعضوں کے نزدیک اس سے کم و بیش بھی ہے۔ ان تبدیلیوں کا سبب مہاتما بدھ کی بار بار آمد کا عقیدہ ہے۔ وہ خارجی اور ظاہری اسباب جنھوں نے آج تک بدھ عقائد اور اصولوں کو متاثر کیا ہے جغرافیائی، لسانی، تہذیبی، فکری اور تاریخی ہیں۔ ان عناصر کی زو میں بدھ مذہب کے رنگ و روپ نے ایک ہزار سال میں کافی تبدیلی اختیار کر لی۔ اسی فکری انقلاب کے نتیجہ میں نیا مکتبِ فکر پیدا ہوا۔

جدید مکتبِ عقل:۔ بدھ مت میں کئی مکاتبِ فکر رہے اور مٹ گئے ہم نے صرف اہم مکاتبِ فکر کا انتخاب کیا ہے۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اشوک اعظم کے عہد سے اس مکتب کی ابتدا ہوئی۔

مہادیو کے پانچ نکات اس مکتب کے آغاز میں اہمیت کے حامل ہیں انھوں نے اپنے پانچ نکات میں خود ارہتوں پر تنقید کی ہے۔ قدیم مکتبِ عقل کے پیرو ہینیان اور جدید مکتب کے پیرو مہایان کتب کو اپنا مدارِ عمل بناتے ہیں۔ اگرچہ دونوں میں بہت اختلافات ہیں مگر آٹھویں صدی عیسوی میں آئی تسانگ یوں لکھتا ہے:۔

"ہینیان اور مہایان کے پیرو دونوں اسی ایک ونیہ پر عمل کرتے ہیں۔ ان پانچ اسکندھ پر یقین رکھتے ہیں اور ان چاروں "مقدس اصولوں" کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ جو بودھی ستو کی پوجا کرتے ہیں اور مہایان پڑھتے ہیں وہ مہایانی کہلاتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ "ہینیانی" کہلاتے ہیں۔"

جدید مکتبِ عقل کو سمجھنے کے لئے ہم وہی طریقہ اختیار کریں گے جو قدیم مکتبِ عقل کے لئے اختیار کیا تھا یعنی کہ یہ مکتب کس قسم کے افراد پیدا کرنا چاہتا ہے؟ اس مکتب کا معیاری فرد بودھی ستو کہلاتا ہے۔ اس کے لغوی معنی قریب قریب "روشن ضمیر" کے ہوتے ہیں۔ مجازاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ "وہ جو

---

[1] Basis of Yoga by Aurobindo Ghosh

جو آتما بدھ بننے جا رہا ہو " ابھیدھرم نے بودھی ستو کی ذہنیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

" مگر کیوں ؟ جب بودھی ستو تجلی اعلیٰ کے حاصل کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں تو وہ اس میں اتنا وقت کیوں لگاتے ہیں !!؟

" اس لئے کہ ۔ تجلی اعلیٰ کا حصول بہت مشکل ہے ۔ کیونکہ تین " ناپیدا کنار کلپ " سے گزرنے کے لئے وسیع علم، نیکی اور بے شمار اعمال خیر کی ضرورت ہوتی ہے

" ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ بودھی ستو اس تجلی کا جویا ہوتا ہے جس کا حصول اس قدر دشوار ہے ۔ اب اگر یہی تجلی اس کی نجات کا آخری ذریعہ ہوتی تو ایک بات تھی ۔ مگر واقعہ ایسا نہیں ہے ۔ تب وہ اس قدر بے پناہ مشقت کیوں اٹھاتے ہیں !؟

" اس لئے کہ ۔ وہ دوسروں کی بھلائی چاہتے ہیں ۔ کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو آلام کے اس عظیم طوفان سے باہر گھسیٹ نکالیں

" ۔۔ مگر انھیں یہ کرنے سے کیا شخصی فائدہ حاصل ہوتا ہے !؟

دوسروں کا نفع ۔۔ ان کا اپنا نفع ہے ۔ کیوں وہ یہی چاہتے ہیں !

" ۔۔ مگر اس پر یقین کون کر سکتا ہے ؟

" یہ سچ ہے کہ وہ لوگ جو رحم و ہمدردی سے محروم ہیں ۔ جو صرف اپنا ہی بھلا سوچ سکتے ہیں وہ بودھی ستو کے ایثار و قربانی پر بمشکل یقین کر سکتے ہیں ۔ مگر کیا ہم یہ نہیں دیکھتے کہ کتنے ہی لوگ ۔ جو جذبۂ رحم سے محروم ہیں ۔ دوسروں کی مصیبتوں میں اپنی مسرت حاصل کرتے ہیں ؟ حالاں کہ اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا ۔ اسی طرح یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بودھی ستو جو جذبۂ رحم سے معمور ہوتے ہیں دوسروں کا بھلا کرنے میں مسرت حاصل کرتے ہیں حالانکہ اس سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا !"

ہم ذیل میں پرجن پارمتیا سے دو اقتباس نقل کرتے ہیں ۔ اس سے نئے مکتب کا اجتماعی شعور اور اس کی انسانی قدر اور عظمت کی کافی وضاحت ہوتی ہے ۔

" وہ لوگ جو جوگیانہ جکڑ اور تنگ رجحانات سے نسبت رکھتے ہیں ۔ اپنی تربیت کیسے کرتے ہیں ؟ وہ سمجھتے ہیں ۔ ہم اپنے تنہا خود کو سدھار لیں گے ۔ اپنے تنہا خود کو سکون پہنچا لیں گے ، اپنے تنہا خود کو نروان تک پہونچا لیں گے ۔ تب وہ ریاضتیں کرتے ہیں ۔ جو ان کی تربیت کے لئے عمدہ بنیادیں فراہم کرتی ہیں اس طرح وہ خود کو سکون پہونچا لیتے ہیں اور نروان سے قریب تر کر لیتے ہیں ۔

" یقیناً بودھی ستو اپنی تربیت اس طرح نہیں کرتا ۔ وہ ریاضتیں کرتا ہے تاکہ عمدہ بنیادیں حاصل ہو جائیں تاکہ " میں خود کو نروان میں پہونچا سکوں ۔ اور پھر ساری دنیا کی مدد کرنے کے لئے میں ساری خلقت کو نروان میں پہنچاؤں لاتعداد افراد کی میں نروان کی سمت قیادت کروں گا ۔"

اس پرجن پارمتیا میں پھر ایک جگہ یوں ذکر ہے ۔

" وہ کچھ کرنے والے (یعنی جو کچھ مشکل ہے) بودھی ستو ہیں ۔ وہ عظیم افراد جو تجلی اعلیٰ کی جستجو میں نکل پڑے ہیں ۔ وہ صرف خود اپنی ذات کے لئے نروان نہیں چاہتے ۔ برخلاف اس کے انھوں نے شدید دکھی انسانی دنیا کا جائزہ لیا ہے ۔ اور پھر تجلی اعلیٰ کی تسخیر کے آرزومند ہیں ۔ وہ موت و حیات کے معاملات میں ڈگمگاتے نہیں ۔ وہ ساری دنیا کی فلاح اور بہبود کے لئے نکل پڑے ہیں جو نتیجہ ہے ان کی دنیا سے ہمدردی کا ۔ انھوں نے تہیہ کر لیا ہے ہم دنیا کے لئے ایک سائبان بن جائیں گے ۔ ایک پناہ گاہ بن جائیں گے ۔ دنیا کے لئے جائے سکون ، آخری مقام راحت ایک نور ہدایت ایک سچے قائد اور ایک راہ نجات بن جائیں گے "

مکتی یا نجات جدید مذہب میں تین انکاروں " سے حاصل ہوتی ہے :-

۱ ۔ بے حصولی (خود کو مارنا) Self Extinction

۲ ۔ بے بیانی (سوال بستہ) Non Assertion

۱ے اس اقتباس کی شکل مکالمہ بلکہ زیادہ تر Soliloquy کی سی ہے ۔

۳۔ بے اعتمادی (سوائے عقل کے کسی پر اعتماد نہ کرنا) Non Relying
ایک چوتھا عنصر اثباتی ہے یعنی :۔
۴۔ علمِ کُل (یہ آخری درجہ ہے جس کے نتیجے میں نروان حاصل کیا جا سکتا ہے)

Omniscience

تنتر۔ یہ بدھ مت میں بہت بعد کا اضافہ ہے۔ اسے جادوئی بدھ مت Magical Buddhism بھی کہا جاتا ہے۔ اس مکتب میں کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ مگر ان کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے کچھ کتابوں کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر زیادہ سود مند نہیں ہے۔ اس مکتب نے مذہب اور افسوں گری میں ایک امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ اس میں بھی دو طبقے ہیں (۱) دکشن کارن (۲) وام کارن

اس مکتب نے بدھ مت میں جذبات پرستی، بدکرداری اور جادو پرستی کے دروازے کھول دیئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مکتب کے بچے کھچے اثرات ابھی تک کسی نہ کسی حد تک بدھ مت اور ہندو مت کے بعض طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی اس کا تذکرہ تضیع اوقات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ طبقہ ہوس کوشی اور نفس پرستی کو نروان تک پہونچنے کا ذریعہ سمجھتا رہا ہے۔

بدھ مت ہندوستان سے باہر:۔ بدھ مت نے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس کے باہر بھی فروغ حاصل کیا۔ ہندوستان سے باہر چین، تبت جاوا، سماترا اور بہت سارے علاقوں میں بدھ مت پھیلا۔ بیرونِ ہند بدھ مت کے تین اہم اسکول بن گئے۔

(۱) زین Zen
(۲) امدمت Amidism
(۳) ریِن ین ماپا Ruyin-Ma-Pa

یورپ اور بدھ مت۔ یورپ نے سترھویں اور اٹھارویں صدی ہی سے ہندوستانی اور چینی بدھ مت کی چھان بین شروع کر دی تھی مگر یورپ کو سب سے پہلے بدھ مت سے آشنا کرانے والا ایک جرمن فلسفی شوپن ہار Arthur Schopenhauer تھا۔ جس نے ایک بدھ کتاب کے فارسی ترجمہ کے لاطینی ترجمے کا مطالعہ کیا تھا مگر ۱۸۱۹ء میں شوپنہار نے ایک منضبط فلسفہ[1] پیش کیا۔ اس کے فلسفہ نے براعظم یورپ پر ایک نمایاں اثر چھوڑا۔ رچرڈ ویگنر R. Wagner بدھ تعلیم سے بے حد متاثر تھا۔ البرٹ شوئٹزر Albert Schweitzer نے تو وہ زندگی ہی اختیار کر لی جس کی شوپن ہار نے سفارش کی تھی

مغربی تجارتی کمپنیوں نے جب سے مشرق میں قدم جمانے شروع کئے اور یورپی امپیریلزم کا فروغ شروع ہوا اسی زمانے سے مغربی فلسفہ پر مشرقی فلسفہ کی پرچھائیاں پڑنے لگیں مطالعہ علوم مشرق Orientalism نے فروغ پایا۔

بدھ مت روس میں بھی پہنچا۔ وہاں اس پر کافی کام بھی ہوا۔ مگر بدھ مت کا روحانی نظام وہاں کے مادہ پرستوں کے جدلیاتی مزاج سے لگا نہ کھا سکا۔

۱۸۷۵ء میں مادام بلاوٹسکی اور کرنل دا لکاٹ نے ایک مذہبی ادارہ Theosophical Society قائم کیا۔ اس میں ایشیائی بدھ مت پر کافی کام ہوا۔ سب سے زیادہ نمایاں کام A. P. Sinnett کا ہے۔ انھوں نے ایک نہایت جامع کتاب Esoteric Buddhism۔ اڈون آرنلڈ Edwin Arnold کی نظم The Light of Asia نے کتنے ہی دلوں میں بدھ مت کی محبت پیدا کر دی۔

بیسویں صدی میں بدھ مت پر یورپ اور خصوصاً انگلستان میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے۔ اس وقت بھی وہاں Christmas Humphreys کی نگرانی میں "بدھ سوسائٹی" اپنا کام کر رہی ہے

یورپ میں جن لوگوں نے بدھ مت قبول کیا ان کو وہاں کا ماحول سازگار نہ رہا۔ کیونکہ وہاں جوگیانہ زندگی گزار سکنے کے مواقع بہت کم ہیں یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جو لوگ بدھ مت قبول کر لیتے ہیں وہ ہندوستان، لنکا یا برما چلے آتے ہیں۔

---

[1] The Philosophy of the Negation of the Will toLive

ضروری نوٹ۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے اگر واپسی کے لئے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ مضمون کے ساتھ ہوگا۔

قمر مرادآبادی

مہاتما بدھ

امن کے اوتار اے صدق و صفا کے دیوتا
اے محبت کے خدا مہر و وفا کے دیوتا

زندگی کے رخ سے تو نے اس طرح اٹھا نقاب
ماند ہو کر رہ گئے یہ آفتاب و ماہتاب

تیری نظریں بندشِ شام و سحر سے دور تھیں
تیری راہیں گردشِ شمس و قمر سے دور تھیں

تیرے سر میں تھا مئے "الفقر فخری" کا خمار
تیرے دل پر ہو چکا تھا رازِ وحدت آشکار

زندگی کی تلخیوں کو تو نے شیریں کر لیا
ساغرِ ہستی شرابِ آگہی سے بھر لیا

چل دیا دنیائے رنگ و بو کو ٹھکراتا ہوا
اختیار و جبر کی گتھی کو سلجھاتا ہوا

زندگی تجھ کو پیامِ ناز دیتی رہ گئی
بادشاہی دور سے آواز دیتی رہ گئی

محترز فکرِ جہاں بندی سے تھا تیرا خیال
تیری دنیا میں نہ ماضی تھا نہ مستقبل نہ حال

خدمتِ مخلوق تھا تیرا شعارِ زندگی
خارزاروں کو عطا کر دی بہارِ زندگی

چشمِ باطل کو حقیقت آشنا تو نے کیا
سچ تو یہ ہے رہبری کا حق ادا تو نے کیا

تھی گراں تجھ پہ یہ راجہ اور پرجا کی تمیز
تیری نظروں میں تھا ہر چھوٹا بڑا یکساں عزیز

حسنِ گل بھایا نہ شورِ نالۂ بلبل تجھے
پھر بستانا یاد بھی آیا کبھی نہ بل تجھے

بحر و بر کی نعمتوں سے ایک غم تو نے لیا
راحتیں دنیا کو بخشیں اور الم تو نے لیا

تیری ہستی پر ابھی تک اک جہاں کو ناز ہے
موت پر تیری حیاتِ جاوداں کو ناز ہے

زندگی و موت میں اک ربط پیدا کر دیا
خار و گل میں تو نے نظم و ضبط پیدا کر دیا

تو نے انسانوں کو جود و رحم کی ترغیب دی
زندگانی کے فسانے کو نئی ترتیب دی

مبارزالدین رفعت

اجنتا کا پیغام

گرمی کی رُت تھی کڑی دھوپ میں جلتی جھلستی سڑکوں پر سے گزر کر جب میں آصفیہ لائبریری کی خوب صورت اور شاندار عمارت کے اندر پہنچا تو اس کی ٹھنڈک، اس کی چھایا اور اس کی بھیدوں بھری خاموشی میں مجھے بے اختیار اجنتا کے غار یاد آگئے۔ ان کی یاد نے من میں کچھ ایسی چٹکی لی کہ جس کام کے لئے لائبریری آیا تھا وہ بھول گیا اور ڈاکٹر غلام یزدانی کی لکھی ہوئی کتاب "اجنتا کی تصویریں" منگائی۔ اور سینکڑوں میلوں کی دوری ہوتے ہوئے بھی اجنتا کی جنتِ ارضی کی سیر سے آنکھیں ٹھنڈی کرنے لگا۔ آپ جانتے ہیں ڈاکٹر یزدانی پرانے آثار اور خاص کر اجنتا کی تاریخ کے مانے ہوئے جان کار ہیں۔ ان کے دل موہ لینے والے بیان اور کتاب کی سندر تصویروں نے کچھ ایسا سماں باندھا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ اور پریوں کی اس دنیا میں ایسا ڈوبا کہ تن من کا بھی ہوش نہ رہا۔ میرا یہی حال تھا کہ اتنے میں ایک طرف سے بڑی نرم، بڑی نازک اور بہت ہی میٹھی آواز آئی، جیسے کوئی کچھ پوچھ رہا ہو۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن تمام لوگ چپ چاپ اپنی کتابیں پڑھنے میں لگے ہوئے تھے۔ خیال ہوا کہ یہ میرا اپنا ہی واہمہ تھا— پھر میں اسی سندرتا اور شانتی کی دنیا میں کھو گیا۔ پھر وہی آواز آئی۔ اب تو میری حیرانی بڑھی۔ یہ کسی انسان کی آواز نہ تھی، کسی نرناری کی بولی نہ تھی۔ یہ تو کچھ ایسی آواز تھی جو نہ اس سے پہلے کبھی سنی نہ اس کے بعد کبھی میرے سننے میں آئی۔ یہ لائبریری کی آواز تھی جو اجنتا کے غاروں سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ میری دلچسپی اور بڑھی۔ من کے کان لگائے تو آصفیہ لائبریری کو یہ کہتے سنا:

"اے اجنتا کے غارو! اے سندرتا اور شانتی کے گہوارو! تمھارے پاس پڑوس کے من موہ لینے والے مناظر کا کیا کہنا۔ جس کسی نے بھی تمھارے بنانے کے لئے یہ جگہ چنی ہے آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ہری بھری پہاڑیاں جنگل پھولوں سے لدے ہوئے پیڑ، سریلے راگ گاتے ندی نالے، سر ٹپک ٹپک کر گنگنانے والے آبشار، تمھارے چاروں طرف برستی ہوئی سندرتا اور شانتی! ان سب کے بیچوں بیچ تم تمھاری دل میں کھب جانے والی بناوٹ اور تمھارے اندر من میں بس جانے والی سندر سندر تصویریں، یہ سب کچھ ہے مگر تم سنسان ہو، ویران ہو، اداس ہو۔ کبھی کبھار غیر ممالک سے آنے والے سیلانی کچھ دیر کے لئے تمھارے درشنوں سے اپنا من بہلاتے ہیں اور پھر ٹھنڈی آہیں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ایشور جانے تمھارے کیا بھید ہیں اگر تم اسے برا بول نہ مانو تو اپنی بات کہوں۔ میرے یہاں بھی روز سینکڑوں آدمی آتے اور جاتے ہیں۔ یہ کچھ میری باہر کی سندرتا ہی دیکھنے نہیں آتے، میرے من کے اندر جو بھید ہیں، انھیں ٹٹولنے آتے ہیں۔ اور میرے ایک دو بھید نہیں ہزاروں عالموں اور جان کاروں نے اپنے جیون بتا بتا کر جو کچھ لکھا ہے ان سب کو میں اپنی گود میں سمیٹے بیٹھی ہوں۔ جو دنیا اور علم کی پیاس لے کر میرے پاس آتے ہیں ان کے لئے میں اپنی چھاتی کھول دیتی ہوں۔ میری بات کا برا نہ ماننا اور اپنا من میلا نہ کرنا مگر اتنا بتانا کہ کیا تمھاری سندرتا بس باہر ہی کی ہے یا تمھارے اندر بھی کچھ ہے اور اندر کی سب سے بڑی سندرتا تو یہی ہے نا کہ ہمارا جیون منش کے کام آئے اور بھولے بھٹکوں کو ہم سیدھا راستہ دکھائیں۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اجنتا کے غاروں کی آواز آئی، کچھ گونجتی، گنگناتی سریلی اور کچھ اداس سی۔ سینکڑوں میل دور سے آتی ہوئی آواز، کبھی مدھم کبھی اونچی۔ یہ اجنتا کی آواز تھی آواز آ رہی تھی۔

"بہن، ہم بھی دھرم کی نشانی ہیں۔ اسی کو سدا یہی پرچار رہا کہ

بڑی سے بڑی مصیبت اٹھاؤ لیکن ناامید نہ ہو، بڑے سے بڑا دکھ سہو لیکن اُف نہ کرو، کڑے سے کڑا بول سنو لیکن من میلا نہ کرو۔ تمہاری بات کا برا ماننا کیسا، اور پھر تمہاری بات بھی تو ایسی کیا بری تھی۔ اس لئے ہمیں تو تمہاری باتوں سے خوشی ہوئی۔ ہمیں دیکھنے کے لئے نہ جانے کہاں کہاں سے کتنے ہی لوگ آتے رہتے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کے من میں ایسی کرید ہم نے دیکھی جیسی یہ تمہارے من میں پیدا ہوئی ہے۔ ہمیں تو اسی کا دکھ ستاتا رہتا ہے کہ کم ہی لوگ ہمارے اندر کا بھید جاننا چاہتے ہیں۔ ہمارے باہر کی صورت جتنی سندر بنا لیتی ہو، بس ایک جھلک ہے ہمارے اس سندیسے کی جو ہم اپنے اندر منش کے لئے رکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم یہاں آنے والے بھانت بھانت کے سیلانیوں کو ہمارے اس اندر کے سندیسے سے اپنی آنکھیں بند کئے، بس ہماری کاریگری، ہماری بناوٹ یا ہماری تصویروں پر سر دھنتے دیکھتے ہیں تو ہمارے من ڈوبنے لگتے ہیں۔ اس وقت ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا ہونا نہ ہونا ایک ہو، اور ہمارے بنانے کے لئے جتنی محنت ہوئی وہ سب بیکار گئی۔

آج تم نے اتنے پیارے ڈھنگ سے ہمارے من کی بات پوچھی کہ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ اپنا من کھول کر تمہارے آگے رکھ دیں۔ تم تو جانتی ہو کہ آج سے لگ بھگ پچیس سو برس پہلے بھارت کی دھرتی پر ایک سورج اترا تھا۔ بھگوان گوتم بدھ کی باتوں نے لوگوں کا من ایسا موہ لیا کہ بس اُتر دکھن، پورب پچھم چاروں طرف ان کی بتائی ہوئی باتیں پھیل گئیں۔ بھگوان گوتم کے مکتی پا جانے کے لگ بھگ تین سو برس بعد ان کے نام کی مالا جپنے والے کچھ بھکشو یہاں آئے جہاں آج ہم کھڑے ہیں۔ یہ جگہ ان گیان دھیان کے متوالوں کو ایسی پسند آئی کہ بس یہیں انہوں نے اپنا ڈیرا ڈالا اور پھر کوئی آٹھ سو برس تک ایک کے بعد ایک وہار اور استوپ پہاڑی کے اندر کاٹ کر بنائے گئے۔ بس ایک ہی لگن کا دیا ان کے من میں اجیالا کئے رہتا تھا اور یہ لگن تھی بھگوان گوتم کے اپدیش کو امر بنانے کی، ان کے جیون بھر کے کام کو ہر کسی تک پہنچانے کی۔

اور اسی لگن کے ساتھ چپ چاپ آٹھ سو برس تک کام ہوتا رہا۔ بھگوان گوتم کے نام پر اپنا سب کچھ تج دینے والے اس طرح کام کرتے اور گیان دھیان میں اپنا من لگائے گزرتے چلے گئے۔ ہماری گنتی بڑھتی ہی گئی۔ ہمارے اندر بھگوان گوتم کی ایک سے ایک بڑھیا مورتی ترشتی رہی۔ ہماری دیواروں پر ایک سے بڑھ کر ایک تصویر اترتی رہی۔ نروان کے اپدیش دئے جاتے رہے اور گیان دھیان ہوتا رہا، پرارتھنائیں ہوتی رہیں اور دھرتی کے ہر کونے سے لوگ بھگوان گوتم کے اس اپدیش کو سننے اور اس کو اپنے من میں بٹھانے کے لئے یہاں آتے رہے۔ لیکن تم جانو زمانہ سدا ایک سا کہاں رہتا ہے۔ اچھے سے اچھے قانون اور اچھے سے اچھے اصول کو بھی الٹ پلٹ اور ادل بدل کے پھیر میں آنا ہی پڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ بدھ دھرم کا نام لینے والے بھارت سے مٹ گئے اور جب اس دیش کے باسیوں کے من سے اس دھرم کی بتائی ہوئی باتیں بھی مٹ گئیں تو پھر ہم بھی دھیرے دھیرے لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس طرح کوئی ہزار برس بیت گئے اور پچھلے سو ڈیڑھ سو برس کی بات ہے کہ ہم کو پھر ڈھونڈ نکالا گیا۔ ہم کہیں پورے، کہیں آدھے اور کہیں پوری مٹی سے اٹے پڑے تھے۔ یہ مٹی ہٹائی گئی اور ہمیں صاف ستھرا کیا گیا۔ ہماری تصویروں کو ٹھیک ٹھاک کیا گیا۔ تب سے ہمارا دوسرا جنم شروع ہوا ہے اور اب تو دھرتی پر شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں ہمارا نام جانا پہچانا نہ جاتا ہوگا۔ لیکن کہاں ہمارا وہ پچھلا جنم اور کہاں ہمارا یہ نیا جنم! پچھلے جنم میں ہم سچ مچ زندہ تھے۔ نیا جنم پچھلے جنم کی ایک چھایا کے سوا اور کچھ نہیں۔

تم پوچھتی ہو ہم منش کے کیا کام آتے تھے، تو لو وہ بھی سن لو۔ ہمارا کام بھی لگ بھگ وہی تھا جو آج تم کر رہی ہو یعنی منش کو گیانی دھیانی بنانے کا کام۔ کڑی بات کہنا ہمارے دھرم میں مہا پاپ ہے لیکن یہ بات بھی تو سچی ہے نا کہ علم کا بس ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے من کی پاکیزگی۔ اس سے من کی پاکیزگی کا کام ہو تو اس سے بڑھ کر اور کوئی یار اور کوئی ساتھی نہیں، لیکن تن کے لئے علم سے کام لو تو اس سے بڑھ کر ڈسنے والا اور کوئی ناگ نہیں۔ تمہارے پاس کتابیں تو بہت ہیں مگر ان میں سے بہت سی کتابوں میں علم کو تن کے کام میں لانے کے ڈھنگ سکھائے گئے ہیں۔ ہمارے بھگوان نے اور پھر ان کے بعد ہمارے گروؤں اور ہمارے گیانیوں نے تو علم کو بدن کے کام میں لانے کی جڑ ہی کاٹ دی تھی۔ ہماری چار دیواریوں کے اندر جو اپدیش ہوتے تھے ان میں بدن کے لئے علم سے کام لینے کا کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ ہر طالب پر یہ بات کھول دی جاتی تھی کہ جتنا مایا کے جنجال میں پھنسوگے، جتنا اس فانی دنیا کی چیزوں کی ہوس میں ڈوبوگے اتنی ہی من کی شانتی اجڑتی جائے گی۔ بس اسی پر دھیان لگا کر اس دکھ بھرے جیون سے منش کیسے چھٹکارا پائے، اس کا جیون کیسے سکھ سے سکھی بنے اور اسے کیسے مکتی اور نروان حاصل ہو۔

ہمارے پاس بھی پستکیں ہوتی تھیں لیکن یہ پستکیں تمہارے چھاپے کی کتابوں جیسی نہ تھیں اور اچھا بھی تھا کہ اس سے چھاپے کی ان گنت کتابیں نہ تھیں۔ اب تو چھاپے کی وجہ سے لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہیں۔ تب لکھنے والے کم تھے اور پڑھنے والے زیادہ۔ اب تو جس کسی کے پاس قلم اور سیاہی ہوتی ہے وہ لکھتا ہے۔ اکثر بے سوچے سمجھے لکھتے ہیں اور چھاپ بھی دیتے ہیں۔ اس زمانے میں چاہے قلم ہو بھی تو ہر ایک نہ لکھتا تھا۔ وہی لکھتا تھا جسے اس کا حق حاصل تھا، جس نے برسوں اس موضوع پر سوچ بچار کیا تھا۔ ہماری پستکیں کاغذ پر نہیں لکھی جاتی تھیں۔ تاڑ کے پتوں پر لوہے کی کیل سے لکھی جاتی تھیں اور انھیں ذرا سی آگ دکھائی جاتی تھی۔ پھر ان کو نتھی کرکے پستک بنالی جاتی تھی۔ لیکن ہماری ودیا کے پیاسے ان پستکوں پر ہی بھروسہ کئے بیٹھے نہ رہتے تھے۔ سارا علم اور ساری ودیا تو بس گرو کی زبان ہی سے ملتی تھی اور ودیا کے پیاسے بدھی میں بٹھا کر اسے اپنے من میں رچا بسا لیتے تھے اور یہ علم اور یہ ودیا ان کا حصہ بن کر رہ جاتی تھی۔ آج کی طرح نہیں کہ کتاب پڑھی اور اسے بند کیا تو سارا پڑھا لکھا بھولی بسری کہانی ہوئی اور پھر سے اس کی طرف لپکنے کی لاچاری رہی۔

ہمارے بنانے والوں اور ہمارا بس ایک ہی بھید اور ایک ہی [illegible] منش جاتی کے نام یہ سندیس کچھ ہمارا اپنا نہیں بھگوان بدھ کا سندیس ہے۔ یہ سندیس ہے منش جیون کے دکھوں کو کم سے کم کرنے اور اس کے سکھ کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کا۔ منش جیون کے سکھوں کا سکھ من کی شانتی ہے اور من کی شانتی بے غرض خدمت اور اپنی دھن میں تن من دھن سے لگے رہنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ گیان دھیان بھی رہے تو یہ شانتی پکی اور اصلی ہو جاتی ہے اور نروان کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ اسی سندیس اور اسی اپدیش کو اپنے سامنے رکھ کر ہمارے بنانے والوں نے ان تھک محنت سے کام کیا، ان کے ہاتھ کام میں جٹے رہے اور ان کا من من موہن کے دھیان میں گم رہا۔ اسی سے ان کا کام امر بنا اور آج بھی پوتر ہردوں میں ایک تڑپ پیدا کرنے کی شکتی اس میں باقی چلی آتی ہے۔ یہی ہماری سب سے بڑی شکتی ہے۔ ہمارے اندر کی سب سے بڑی سندرتا اور ہمارے باہر کی سب سے بڑی خوبصورتی!

جاوید

گوتم بُدھ کا تصوّرِ غم

آغازِ کائنات سے اس سائنٹفک دور تک غمِ حیات انسان کے لئے سب سے ہمہ گیر اور آفاقی مرحلہ رہا ہے۔ اسی پس منظر میں مسرت کا وہ تصور اُبھرتا ہے جو زندگی اور کائنات کی تمام تر جدوجہد کا پہلا قدم اور آخری منزل ہے۔ غمِ حیات کے دو پہلو ہیں اوّل منفی دوم اثباتی۔ اس میں تخریب مضمر ہے مگر اس تخریب سے تعمیر کے پہلو بھی نکلتے ہیں۔ اس نے انسان کی بے پناہ قوتوں کو مضمحل کیا ہے اور انھیں نئی زندگی بھی دی ہے۔ یہ اہرمن بھی ہے اور یزداں بھی۔ غم سے مسرت تک پہنچنے کے لئے ذہنِ انسان مفکر، فلسفی اور پیمبر کے رُوپ میں مختلف راہوں سے گزرا ہے اور ہر دَور کا فکری شعور اس منزل تک پہنچنے کی ایک نمایاں کوشش ہے۔ یہ کوشش زندگی کے مسائل اور اُلجھنوں کو حل کرنے اور ایک بہتر نظامِ حیات کی تخلیق میں صرف ہوتی رہی جو افراد کو عارضی یا دائمی حیثیت سے غم سے نجات دے سکے۔ غم اور مسرت کے تصوّراتی اور نظریاتی اختلاف سے قطعِ نظر یہ کوشش سماجی رو اور سماجی تغیّر کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر اور تغیّر پذیر ہوتی رہی ہے۔ چناں چہ ذہنِ انسانی کا ارتقا غم کے مرحلوں کو عبور کرنے اور مسرت کی منزلوں کو پالنے کا ایک طویل پیچ پیچ سفر ہے۔

اس طویل سفر کی ایک بہت ہی اہم منزل گوتم بدھ کا وہ درسِ آسمانی ہے جو حیات و کائنات کے مجموعی غم و اذیت کا علاج ہے۔ چناں چہ بدھ مذہب انسانی درد و غم کا انتہائی پُر خلوص مطالعہ ہے اور انتہائی پُر خلوص حل بھی۔

گوتم بدھ نے غمِ حیات کو اس طرح مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے:۔

"وجود اذیت ہے، زوال پذیری اذیت ہے، غم اذیت ہے، نالہ و بُکا اذیت ہے، درد اذیت ہے، صدمہ اذیت ہے، مایوسی اذیت ہے، ناکامیِ تمنّا اذیت ہے۔" ان کے نزدیک زندگی کرب و اذیت کی ایک مسلسل چیخ اور ایک مستقل گہری خراش ہے۔ اس راہِ ہفت خواں کا سفر ہر فرد کے لئے لازمی اور یقینی ہے مگر اس سے نجات پانے کا راستہ بھی اختیاری اور یقینی ہے۔ زندگی کے انتہائی حزن و قنوطی سے انھوں نے اُمید اور رجائیت کے چراغ روشن کئے ہیں۔

گوتم بدھ نے غمِ حیات کا مطالعہ افراد سے کیا ہے۔ دیوتاؤں کی ایسا سے محل کے اطلس و کمخواب کے حجابات سے گزر کر سدھارتھ کی نگاہوں نے ایک کہن سال ضعیف، ایک بیمار، ایک مردہ شخص اور ایک درویش کو دیکھا۔ یہ مناظر انسانی درد و غم کے مختلف رُخ اور مختلف مَدور کا مرقع تھے۔ گوتم بدھ نے افراد کی بے پناہ قوتوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے مگر ان بے پناہ قوتوں کو جسمانی امراض، پیرانہ سالی اور موت کے مہیب پنجوں میں خائف اور مجبور دیکھا ہے۔ یہ وہ ازلی و ابدی بلائیں ہیں جو ہر فرد کے لئے لازمی اور یقینی ہیں۔ چناں چہ انھوں نے فرد کے غم و اذیت سے کائنات کے تمام تر غم و اذیت کا ادراک کیا ہے۔ یہ وہ ادراک ہے جو گوتم بدھ کے ذہن میں محل کی الف لیلائی فضاؤں سے حیات کے گرم ریگ زاروں تک ایک مسلسل خلش اور ایک مہیب رات کی طرح چھایا رہا۔

گوتم بدھ نے حیات کے وہ مسائل نہیں لئے جو کسی دَور کے سماجی نظام کے تخریبی عناصر سے ترکیب پاتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے وہ مسائل لئے ہیں جو جسمِ انسانی سے وابستہ ہیں۔ حیات فنا پذیر ہے، عناصرِ ترکیبی زوال پذیر ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جنھیں ہمیشگی حاصل ہے۔ کسی خاص جگہ یا ماحول کی پیداوار نہیں ہیں یہ ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ چناں چہ گوتم بدھ کا پیام نہ کسی خاص دور کا پابند ہے نہ کسی خاص جگہ کا ماتحت۔ یہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ یہ پیام

کسی مخصوص سماج کا براہ راست مخصوص نظام نہیں، اگرچہ اس کا پُرخلوص عمل ایک نئے سماج کا پیش خیمہ ہے۔ یہ کائنات کے اجتماعی غم و الم کا یقینی درماں ہے۔

گوتم بدھ کے نزدیک زندگی اذیت کا سلسلہ ہے۔ یہ اذیت انسان کے احساسات، خیالات اور افعال کا نتیجہ ہے۔ بدھ کی اصطلاح میں یہ اس کے کرموںٌ کا پھل ہے۔ زندگی بذاتِ خود لعنت نہیں بلکہ اسی وجہ سے لعنت ہے کہ آدمی اسے اسفل ترین شکل میں پیش کرتا ہے۔ نروان کے حصول کے بعد ہی نجات مل سکتی ہے۔

لاعلمی تمام بُرائیوں کی جڑ ہے۔ یہ حقیقت میں اپنے نفس، اپنی خودی کے اصلی خدوخال کے نہ پہچانے کا نتیجہ ہے۔ نفس جسم اور روح سے مرکب ہے۔ اسے جسم کے پانچ عناصر اور ذہن کی مختلف حالتوں سے بھی مرکب کیا جا سکتا ہے۔ خودی ایک حال میں نہیں رہتی۔ نروان کی منزل تک یہ مستقل طور سے تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے۔ نروان خودی کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد اذیت کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور انسان بار بار جنم لینے سے نجات پا جاتا ہے۔

اس کے برعکس خودی کے غلط تصور اور نظریے سے وابستگی زندگی کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کا پیش خیمہ ہے۔ زندگی کی تمام لعنتیں اسی غلط تصور سے پیدا ہوتی ہیں۔ نفس کے غلط ادراک، تمنا اور زندہ رہنے کے شدید جذبے سے براہ راست احساسات، خیالات اور اعمال میں بُرائیاں سرایت کر جاتی ہیں۔ بُرائیوں کے صحیح اسباب کے علم سے ان کا حل بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

گوتم بدھ نے ان تمام بُرائیوں سے بچنے کے لئے آٹھ اصول پیش کئے ہیں جو ایک تو انسان کو غلط راہ سے بچاتے ہیں اور دوسرے نروان کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ اصول نفس یا خودی کے اصلی خدوخال کو سنوارتے اور نکھارتے ہیں اور انسان کو زندگی اور کائنات کی مادی آلائشوں سے بچاتے ہیں۔ ان آٹھ اصولوں کے اپنانے سے وہ بُرائیاں جو آدمی کی سرشت میں داخل ہو جاتی ہیں، زائل ہونے لگتی ہیں اور وہ اچھائیاں رونما ہونے لگتی ہیں جو نفس کا تزکیہ کرتی ہیں یہاں تک کہ ایک منزل پر پہونچ کر وہ روح کے پورے جلال و جمال کا ادراک کرتا ہے۔ چنانچہ گوتم بدھ اپنے ضمیر اور روح کی روشنی میں زندگی کے کرب و اذیت کا حل اس صورت میں پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ راست فہمی:۔ حقائق کی ماہیت اور ان کا صحیح ادراک لازمی ہے۔ فانی اور غیر فانی قدروں کا امتیاز، تشکیک اور غلط نظریات سے احتراز ضروری ہے۔ منطق اور فلسفے کی پُرپیچ راہوں سے گریز اور حقیقتوں کو پانے کی پُرخلوص کوشش اوّل و آخر مقصد ہیں۔ حیات کے سفر کی یہ پہلی منزل ہے۔

۲۔ راست ارادہ۔ منزل عرفان کی کمل آگہی کے لئے وہ قوتِ ارادی ہے جس کا حصول اور تصرف حقائق کے صحیح ادراک کے ضبط و نظم کے سہارے لازمی ہے۔ یہ دوسری منزل ہے۔

۳۔ راست گفتار۔ خودی کے ضبط و نظم کے لئے یہ پہلا قدم ہے۔ ایسے ہی الفاظ بولنا روا ہیں جو پاکیزہ، پُرخلوص اور مقدس جذبوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ الفاظ جن کے پردے میں نفرت، کینہ اور فساد ہے، ان سے احتراز لازمی ہے، یہ تیسری منزل ہے۔

راست گفتار اور راست کردار کے مدارج بہت ہی سخت ہیں۔ لیکن ان مدارج کے طے کرنے کے بعد آدمی ان بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سے منزل آخر تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے اور نفس پر کامل اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ راست کردار:۔ وہ عمل مراد ہیں جو مقدس اور برگزیدہ ہیں۔ ایسے عمل بذاتِ خود اپنا حاصل ہیں۔ اس لئے سود و زیاں کا تصور، حاصل و لاحاصل کا خیال غلط ہے۔ وہ عمل جو ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ممنوع ہیں۔ حسن عمل کے لئے محبت اور خلوص کا اصول بنیادی ہے۔ یہ اصول اچھے اور بُرے عمل کے درمیان حدیں قائم کرتا ہے۔

۵۔ راست زندگی۔ حلال روزی کمانے کا وہ طریقہ جو دیانت داری، صداقت اور خلوص پر مبنی ہے۔ بددیانتی اور گمراہی کی پُرخطر راہوں اور مرحلوں سے گریز ضروری ہے۔ یہ پانچویں منزل ہے۔

۶۔ راست جد و جہد۔ اپنے برگزیدہ مقصد اور منزل کو پانے کے لئے انسان تمام خلوص، محبت اور سرگرمی سے جسمانی اور روحانی قوتوں کا اپنے عمل میں تصرف کرتا ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد وہ سوتے جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے، غرض کہ ہر حالت میں اصولِ فطرت سے ہم آہنگ رہتا ہے۔ یہ چھٹی منزل ہے۔

۷۔ راست تفکر۔ ذہن کی اس حالت کا نام ہے جو بصیرت رکھتی ہے۔ خودی کے غلط اور گمراہ کن تصورات، فریب اور تمنا کے تباہ کن اثرات سے ہٹ کر آدمی حقائق کا صحیح ادراک کرتا ہے۔ وہ حقائق سے اس طرح ہمکلام ہوتا ہے جس طرح اپنے دوستوں سے۔ یہی نہیں کہ وہ حقیقت آشنا ہے بلکہ وہ خود ایک روشن حقیقت ہے۔ یہ ساتویں منزل ہے۔

۸- راستہ ہشیاری ذہن کی پُرسکون حالت کا نام ہے۔ کرب و غم، اشکوہ و ہراس ختم ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی فریب ہے نہ اندیشہ۔ بے بنیاد عقاید، خام توقعات اور اندیشہ ہائے دور و دراز کا گزر نہیں۔ یہ آٹھویں منزل ہے۔

گوتم بدھ نے ان آٹھ اصولوں کی اہمیت اور افادیت ایک مختصر پیرایہ میں پیش کی

" وجود اذیت کی وجہ ہے کیوں کہ زندگی، پیدائش سے موت تک، تمام عمر کے مراحل سے گزرتی ہوئی اذیتوں کا ایک مستقل سلسلہ ہے، یہ پہلی حقیقت ہے۔ وجود کی وجہ زندگی کی ہوس ہے جو حیات کے غرور، آنکھوں کی حرص اور گذشت و بود کی ہوس کا نتیجہ ہے اور حیات و موت کی نہ ختم ہونے والی گردش میں سلسلہ بہ سلسلہ منتقل ہوتی رہتی ہے، یہ دوسری حقیقت ہے۔ وجود کی وجہ کا خاتمہ جینے کی ہوس کو ختم کرنے سے ہو سکتا ہے۔ جینے کی ہوس نفس کشی سے ختم کی جا سکتی ہے، یہ تیسری حقیقت ہے اور چوتھی حقیقت آٹھ اصولوں کا مقدس راستہ ہے جو منزلِ عرفان تک رہبری کرتا ہے۔ چنانچہ اے درویشو! کرب و اذیت کی حقیقت نے ان تصوّرات کا مجھ پر انکشاف کیا اور فیصلے اور آگہی کے دروازے کھول دئے۔ نجات کا راستہ نہ قربانی سے مل سکتا ہے نہ اذیت پسندی سے اور نہ عبادت سے، بلکہ صرف آدمی کی خودی کی رہنمائی سے، جو اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ جب تک میں اس راز سے آشنا نہ ہوا، مجھے عرفان کی روشنی نہ ملی۔ لیکن مجھے اب وہ روشنی مل گئی ہے اور میری نجات یقینی ہے۔ اب میں زندگی اور موت کی گردش میں گرفتار نہ ہو سکوں گا۔ موت کا مجھ پر اب کوئی زور نہیں رہا۔"

زندگی کی اذیت، موت و حیات کے مسلسل چکر میں پڑنے اور ان سے نجات پانے کے امکانات کی کچھ وضاحت گوتم بدھ کے " کرم کے تصوّر " سے ملتی ہے۔

کرم کا تصوّر harma زندگی کی قوت اور تحریک عمل کا تصرّف ہے جو انسان کے خیال و عمل میں نفرت، کینہ، محبت و خلوص میں ظاہر ہوتا ہے۔ خیال و عمل فرد کی شخصیت کے اجزاء مرکب ہیں جو اپنے مزاج اور ماہیت کے اعتبار سے تخریبی یا تعمیری عناصر کی تخلیق کرتے ہیں اور آخر میں شخصیت کی آزادی و غیر آزادی، آفاقی و غیر آفاقی قدروں کا تعین کرتے ہیں۔ انسان کا کردار، جسم ماحول سب ماضی کے خیال و عمل کے باہمی عمل اور ردِّ عمل سے ترکیب پاتے ہیں۔

" ہمارا سارا وجود ہمارے خیال کا نتیجہ ہے۔ اس کی بنیاد ہمارے خیالات میں ہے۔ یہ ہمارے خیالات سے مرکب ہے۔ اگر ایک شخص پاکیزہ خیالات کے ساتھ بولتا ہے اور کام کرتا ہے، تو مسرت ایک ایسے سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے جو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔"

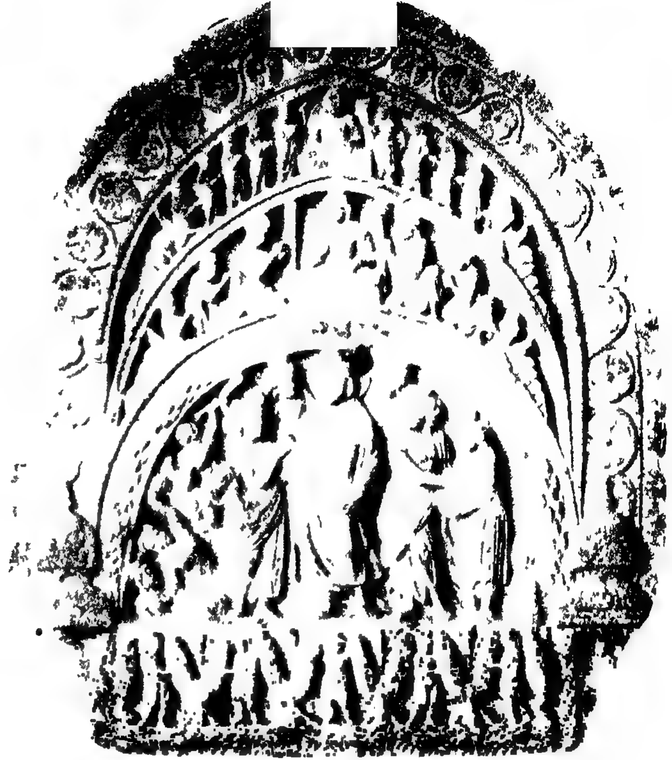
" آدمی خود برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ آدمی خود اذیت اٹھاتا ہے۔ آدمی خود برائی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ آدمی خود اپنے کو پاکیزہ بنا سکتا ہے۔ پاکیزگی اور آلودگی کا تعلق آدمی کے نفس سے ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کو پاکیزہ نہیں بنا سکتا۔"

چنانچہ آدمی کے خیال و عمل اس کی آنے والی زندگی، اس زندگی کی سطح اور مزاج کے امکانات کو ترتیب دیتے ہیں۔ اچھائی یا برائی، تعمیر و تخریب کی قوتوں کا زندگی میں تصرّف کر کے وہ خود سود و زیاں اور بلندی و پستی کی بنیادیں تعمیر کرتا ہے۔ کرم کا اصول سزائیں عاید نہیں کرتا۔ یہ فردِ جرم کی مانند نہیں۔ یہ اصول زندگی کے مختلف رُخ، مختلف پہلوؤں کے امکانات میں توازن قائم کرتا ہے۔ یہی اصول موت و حیات کے آنے والے چکّر کی خبر کرتا ہے اور نروان کی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ نروان کی منزل کی ہمارے سامنے واضح تصویر نہیں۔ کیونکہ روح کی پرواز کی یہ وہ بلندی ہے جو ذہن و خرد کی ادراک سے باہر ہے۔

گوتم بدھ کا پیام غم حیات کا ادراک ہے۔ اس کے اسباب کے علم کی بصیرت ہے۔ اور اس سے نجات پانے کا یقینی راستہ ہے۔ انھوں نے غم حیات کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ لیکن اسے حکم الٰہی یا تقدیر کا تابع نہیں بنایا۔ انھوں نے زندگی کے کرب و اذیت سے نجات پانے کے جو اساسی مدارج متعین کئے ہیں، وہ قابل فہم ہیں اور قابل قبول۔ ان کے اصول، تصوّرات اور نظریات واضح اور سادہ ہیں۔ انھوں نے ماورائی اور مابعد الطبیعاتی مسائل سے ذہنوں میں غبار اٹھنے نہیں دیا۔ ان کے مقدس اصولوں پر زندگی گزارنے کا صلہ جنت نہیں بلکہ وہ ابدی سکون و سرخوشی ہے جو ذہنِ آدم کی فکری پرواز کی منزل آخر ہے۔ اس کے برعکس زندگی گزارنے کی سزا جہنم نہیں بلکہ ابدی سرخوشی کی محرومی ہے اور زندگی کے کرب و اذیت کا مستقل احساس۔ گوتم بدھ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں سال پہلے غم حیات کا بصیرت اور خلوص سے ادراک کیا اور اس کا حل پیش کیا

آج کل کا اگست ۱۹۵۷ء کا شمارہ جنگ آزادی نمبر سے متعلق ہوگا۔ مفصل اعلان کا انتظار کیجئے ——— (ادارہ)

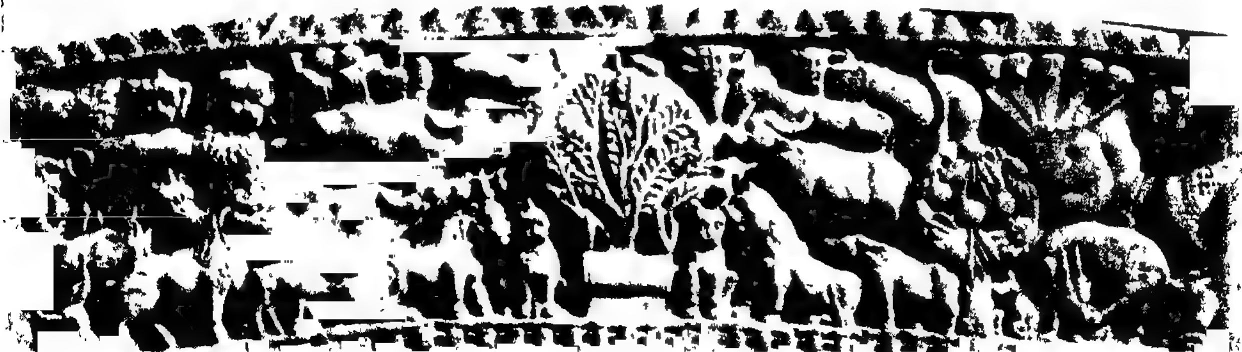




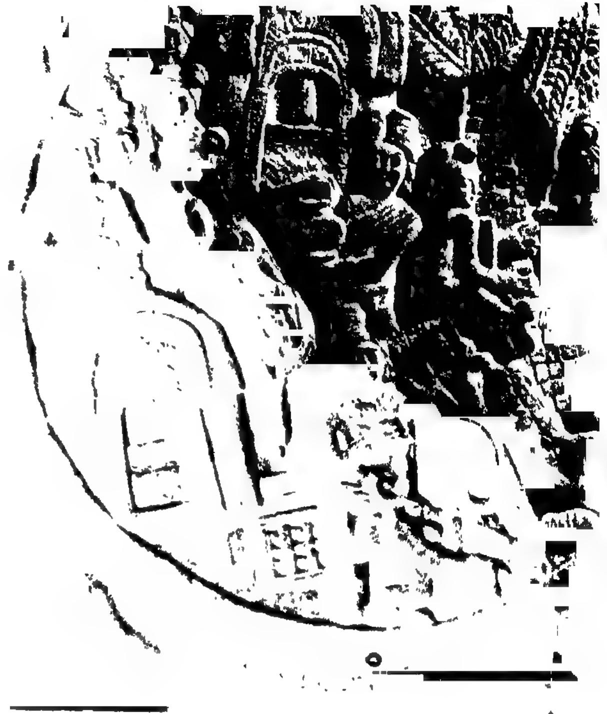
(اوپر) ناگا راجہ اپا لال کی اطاعت (گندھارا اسکول)

(بائیں) بدھ کا مجسمہ - متھرا

(نیچے) ساکیہ منی (علامت درخت) کی خدمت میں وحشی جانور سانچی کا دروازہ









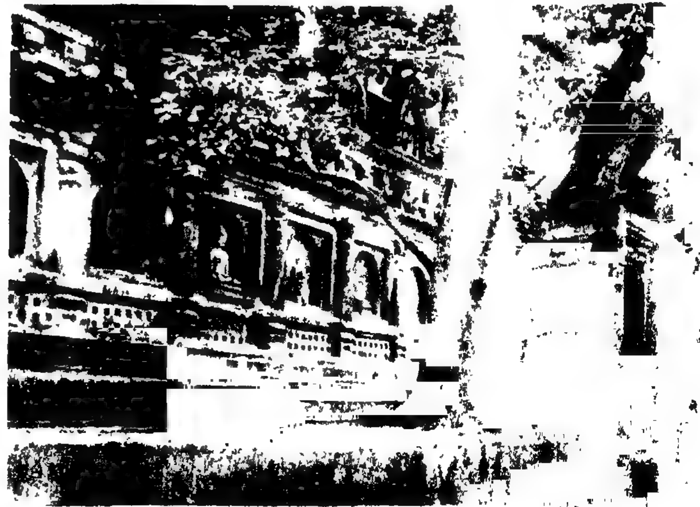
(اوپر) بدھ کا مجسمہ (گردن سے اوپر) - گندھار

(اوپر دائیں) دیوتاؤں کي نذر - بھرہت

(دائیں) مقام عرفاں کا جلوہ (مقدس بودھي پیڑ) - سانچی



بدھ بشکل امر جیوتی



منزل عرفاں

مقدس بودھی پیڑ - گیا



دھمیک اسٹوپا
سارناتھ





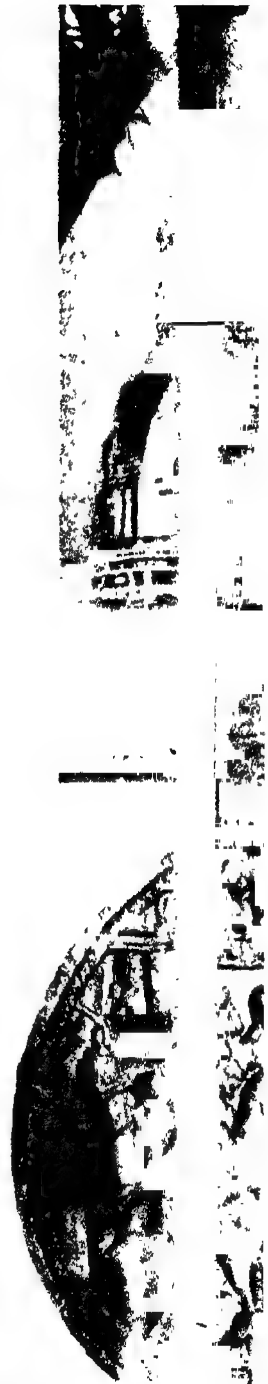
مہاتما بدھ کا ایک معجزہ۔

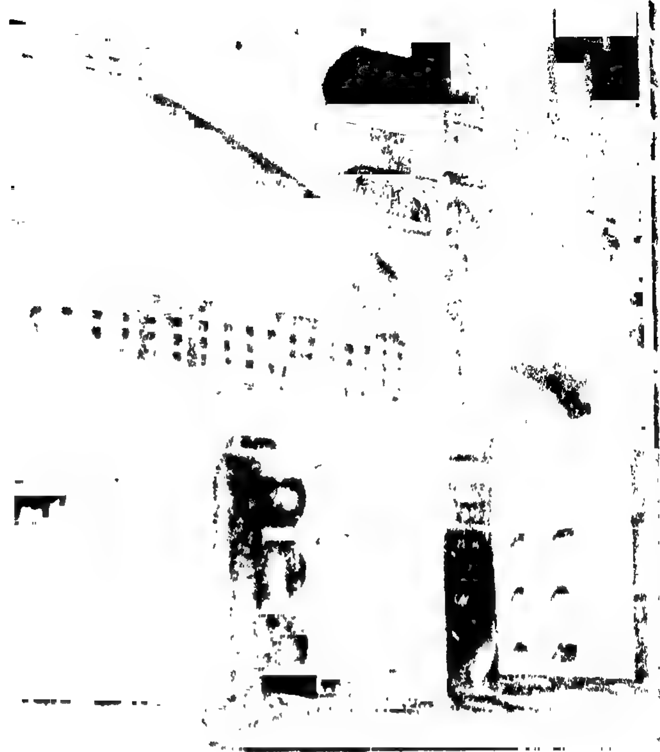
بودھ گیا





اشوڪ جي لٺ - سارناٿ - (اوپري حصو)





سانچی کا استوپ

ایک دروازہ اور استوپ کا کچھ حصہ

نالندہ یونیورسٹی







ہیو ان چو انگ
چینی سیاح تلاش حق میں



اوپر بائیں - اجنتا - دروازہ غار
نمبر ۱۹

منقش چھت - اجنتا



راشٹرپتی
محکمہ نشر و اطلاعات کی کتاب
"بدھ دھرم کے ڈھائی ہزار سال"
قبول کر رہے ہیں

وزیر اعظم مہابودھی سوسائٹی
کو بودھ راہبوں کی استوپیاں
پیش کر رہے ہیں

میکش اکبرآبادی

بُدھ مت کا سلوک

سلوک سے وہ جسمانی اور ذہنی اعمال مراد ہیں جن کی ورزش سے کسی اصلی روحانی منزل تک پہونچا جا سکتا ہے۔ عام طور سے صوفی اپنے ان باطنی اعمال کو سلوک کہتے ہیں۔ اصل چیز وہ منزل ہے جو انتہائی نصب العین کے طور پر متعین کی جاتی ہے۔ راستے کو سمجھنے سے پہلے منزل کا سمجھنا اور منزل کے متعین کرنے میں جو نظریات کارفرما ہیں اُن کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے اجمالاً پہلے ان نظریات کا ذکر ضروری ہے جو بدھ مت کی اصل ہیں۔

بدھ مت میں سب سے اہم اور سب کی اصل زندگی سے بیزاری اور اس کا ترک ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت بدھ کی فکر کی ابتدا زندگی سے بیزاری سے ہوئی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے ایک ہی روز میں تین ایسے منظر دیکھے کہ ان کا دل زندگی سے بیزار ہو گیا۔ ایک بڈھا جس کی کمر جھک گئی تھی اور اس سے چلا نہیں جا رہا تھا، ایک طاعون کا خطرناک مریض، اور ایک مردہ جس کی شکل بدل گئی تھی۔ گوتم نے سوچا یہ بڑھاپا دنیا میں کیوں آیا؟ بیماری کیوں آئی؟ اور موت کیوں آئی؟

گوتم کو یقین ہو گیا کہ دنیا ایک عظیم دار المحن ہے لیکن اس مصیبت کی اصل اور سبب کیا ہے اور اس کا تدارک کیا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے انھوں نے قدیم مذہب کا پورا سلوک طے کیا شدید ترین ریاضتیں کیں لیکن چھ سال کی مسلسل ریاضت کے بعد انھیں ناامیدی ہوئی اور انھوں نے خود اپنی فکر سے منطق اور نور اعلیٰ حاصل کر لیا۔ اس مخصوص فکر اور اس کی ترتیب کا خلاصہ یہ ہے:۔

انحطاط اور موت کا سبب پیدائش (جنم) ہے۔ جنم اپنے سے پہلے جنم اور سابقہ وجود (بھاو) پر منحصر ہے۔ بھاو اپادان سے پیدا ہوتا ہے (اپادان محبوب اشیا اور مرغوب چیزوں کے استقلال کی خواہش کو کہتے ہیں) اپادان خواہش سے پیدا ہوتا ہے جو ناخوشگوار احساس اور احساس کے لئے حسی اتصال ضروری ہے۔ کیونکہ اگر حسی اتصال نہ ہو تو احساس نہیں ہو سکتا۔ چھ حسی اتصال اور چھ ان کے موضوعِ عمل یا محل ہیں اور ان کا انحصار جسم اور نفس (نام روپ) پر ہے۔ نام روپ شعور پر منحصر ہے۔ شعور کا انحصار ارادۂ فعل (سنسکار) پر ہوتا ہے۔ ارادۂ فعل کی اصل جہالت ہے اس لئے اگر جہالت کو روک دیا جائے تو اس کے نتیجے میں یہ تمام دکھ بھی ختم ہو جائے گا۔ اسے بارہ کڑیاں یا مستی "پکر نیتے" کہتے ہیں۔

مصیبت ان اعمال سے پیدا ہوتی ہے جن میں نفس اپنے کو الجھا ہوا پاتا ہے جب جہالت فنا ہو جاتی ہے تو جہالت کے اعمال اور محسوسات بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ ان محسوسات یعنی جس کو ہم خارجی عالم کہتے ہیں اسی کے ساتھ خود وہ نفس بھی فنا ہو جاتا ہے جو اس سے تعلق رکھتا ہے۔

جہالت کیا ہے

علم کی طرح جہالت بھی اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی محض علم کے تقابل سے از روئے قیاس ہم جہالت کو بیان کر سکتے ہیں۔ جہالت کے لمس سے یہ تمام وجود ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن وہ جہالت کیا ہے جس کے مٹ جانے سے الم دور ہو جاتا ہے اور نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ بدھ مت اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ وہ جہالت ہے کسی مستقل وجود کا اقرار، روح کا اعتقاد، ہستی کا اقرار اور اس قسم کے تمام اقرار۔ اس لئے ان سب کا انکار اور ترک جہالت کا ترک ہے۔

بدھ مت کی رو سے یہ سوال کرنا کہ کائنات ازلی ہے یا نہیں، جسم اور روح ایک ہیں یا علیحدہ علیحدہ، "نِروان" ایجابی حالت ہے یا سلبی محض، کفر سمجھا گیا ہے۔ روح کے ماننے والوں، خدا کے ماننے والوں، ویدوں کے معتقدین اور ان کو جو مظاہر یا عالم کو معلول مان کر اس کے لئے کسی علت کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں دہریہ الہ

لیے دین کہا گیا ہے۔

حقیقت اعلیٰ

بدھ محققین کے نزدیک دنیا اور جو کچھ ہے سب مایا اور دھوکا ہے جسے ہم کچھ ہونا یا عالم سمجھتے ہیں۔ وہ متغیر ہونے والے مظاہر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ذات یا جوہر کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نہ کوئی حقیقتِ اعلیٰ نہ کوئی مستقل شعور ہے سب کچھ خلا ہی خلا ہے اور دھوکا ہی دھوکا۔

جس طرح یونانی اور اسلامی فلسفیوں نے عالم کے تغیر پر غور کیا ہے اور اسے عالم کے حادث ہونے کی علامت قرار دیا ہے اسی طرح بدھ محققین نے بھی عالم کے تغیر پر غور کی ہے اور اس تغیر کو عالم کے مایا اور فریب ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ وہ اس نقطۂ نظر پہ زور دیتے ہیں کہ جو کچھ ہمیں ایک وقت معلوم اور محسوس ہوتا ہے وہ دوسرے وقت فنا اور معدوم ہو جاتا ہے لہٰذا سب کچھ عارضی ہے۔ استقلال کا تصور ہمارے خود اپنے وجود کے تصورِ استقلال سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک فریب ہے خود ہمارا شعورِ ذات کسی خاص شے کے جذبات و تصورات کی پیداوار ہے نہ علت نہ معلول نہ نفس ہے نہ روح۔

عناصر اور ان کی نمائش یا ظہورِ خلافِ حقیقت اور ایک جادوگر کے شعبدے کی طرح ہیں جو نہیں ہیں مگر نظر آتے ہیں یہاں تک کہ خود بدھ اور اُن کی تعلیم بھی ایک خواب ایک خیال اور ایک سراب ہے۔ جب ذات کے ادراک کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو وہ ذات کا ادراک نہیں ہوتا بلکہ صرف ذہنی تجربات اور اعراض کا ادراک ہوتا ہے

بدھ مت کے اس نظریے کو ہم عدمیت سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کے جراثیم بدھ مت کے علاوہ بھی ہندو فلسفے میں ملتے ہیں جیسا کہ یاجنا ولک کے سوال پر کہ برہما کیا ہے، جواب دیا ہے کہ آتما خاموشی ہے اور اس کے بتانے کے لئے راستہ یہ ہے "نیتی نیتی" (وہ یہ نہیں ہے وہ یہ نہیں ہے)

وجود

بدھ کے متقدمین کا خیال ہے کہ جو شے ہمارے اندر اثر پیدا کرتی ہے وہ موجود ہے اور جو اثر نہیں کرتی وہ معدوم ہے اس طرح گویا اثر کی پیدائش ہی ان کے نزدیک وجود کی تعریف ہے۔ اثر کی ہر وحدت یا اکائی دوسری وحدت سے جُدا ہے اس لئے اثر مختلف وحدتوں کا ایک تسلسل ہے اور تمام اشیاء عارضی ہیں۔

چوں کہ بدھ کے نزدیک جوہر[2] موجود نہیں ہے اور تمام نمائش و ظہور صرف اعراض کا ہے اس لئے کبھی تو انھوں نے وجود کی تعریف ایک ایسی استعداد سے کی ہے جس سے ہم مشاہدات کے ذریعے سے واقف ہوتے ہیں اور جس کا ثبوت شکلوں اور صورتوں سے ہوتا ہے اور کبھی کہا ہے کہ وجود کسی شے کی تخلیق یا ظہور کی قابلیت ہے، اسی طرح شے کی تعریف یہ ہے کہ وہ مستقل خصوصیات کا اتصال یا اجتماع ہے اور جب نئی خصوصیات ان خصوصیات میں مجتمع ہو جاتی ہیں تو ایک جدید شے کا ظہور ہوتا ہے۔ عرض یا صفت کو یہ لوگ جوہر سے علٰحدہ فرض کرتے ہیں اور جوہر کو محض دھوکا مانتے ہیں۔ ہر شے کے متعلق بدھ فلسفہ پہلے اقرار کرتا ہے پھر انکار، اور پھر اقرار نہ انکار۔ مثلاً اگر سوال کیا جائے کہ موت کے بعد بھی بدھ قائم رہے گا یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ بدھ موت کے بعد قائم ہے اور بدھ موت کے بعد قائم نہیں ہے اور بدھ موت کے بعد نہ موجود ہے نہ معدوم۔

اپنشد اور اس کے اثر سے اس متغیر عالم میں اس عالم سے ماورا ایک غیر متغیر ذات تسلیم کی جاتی ہے جو اس عالم کی علت ہے لیکن بدھ مت مستقل وجود یا ذات یا علت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی ایسی ذات کو جو متغیر تجربات سے وابستہ ہے مستقل ذات نہیں کہہ سکتا۔ عالم بدلنے والے مظاہر کے سوا کچھ نہیں لہٰذا سب کچھ معدوم ہے اور اس لئے الم اور دکھ ہے۔ ویدانت اور بدھ مت میں یہ اہم اور بنیادی فرق ہے۔

بدھ مذہب کے چار اصول

وہ حالت جو بدھ کے درجے کو پہونچاتی ہے۔ رہبانیت کی حالت ہے ان چار حقیقتوں کی تعلیم عام لوگوں کو نہیں دی جاتی بلکہ صرف راہبوں کو دی جاتی ہے کیوں کہ ان اصول اور حقائق کو سمجھنے کے لئے بہت سے مدارج کو طے کرنا ضروری ہے

---

[2] جوہر سے مراد ہے مستقل بالذات یا وہ شے جو اپنے پائے جانے میں کسی دوسری شے کی محتاج نہ ہو۔ عرض اسے کہتے ہیں جو اپنے پائے جانے میں دوسرے کا محتاج ہو۔

[1] بدھ سے مراد یہاں مہاتما بدھ کی مخصوص شخصیت نہیں ہے بلکہ وہ ایک انتہائی درجہ ہے جس کو گوتم بدھ نے حاصل کیا تھا اور اسی راستے پر چل کر دوسرے بھی حاصل کر سکتے ہیں اور بدھ ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر لی بان کہتے ہیں کہ ایک فرقے کا اعتقاد یہ ہے کہ ساکیامنی (گوتم بدھ) کے بعد ایک اور بدھ آئے گا جو نئی روشنی اور نئی قوت لائے گا اور نجات کا اس سے بھی زیادہ آسان راستہ بتائے گا۔ ڈاکٹر لی بان کی تحقیق کی رُو سے بدھ کے معنی وجودِ کامل کے ہیں جو خدا سے بھی بڑا درجہ ہے۔ اس سے مراد وہ وجودِ کامل ہے جو عالم کی ابتدا اور انتہا ہے۔ اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی فنائے مطلق ہے۔

للت وستر[1] میں لکھا ہے :-

" اے راہبو یہ ہیں وہ چار محترم حقائق - اوّل دنیاوی مصیبت دوسرے دنیاوی مصیبت کی جڑ - تیسرے دنیاوی مصیبت کا معدوم ہو جانا - چوتھے دنیاوی مصیبت کو معدوم کرنے کا طریقہ -

" دنیاوی مصیبت کیا چیز ہے ؟ اصل میں پیدائش دُنیاوی مصیبت ہے ! بڑھاپا ، بیماری ، موت ، ان سے جُدا رہنا جن سے ہم محبت کرتے ہیں اور ان سے ملنا جن سے ہم نفرت کرتے ہیں اس کا نام دنیاوی مصیبت ہے - انسان کسی چیز کی خواہش کرتا ہے اور کوشش کے ساتھ بھی اسے نہیں پاتا - یہ دنیاوی مصیبت ہے ، غرض وہ چیزیں جو حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتی ہیں دنیاوی مصیبت ہیں

" دنیاوی مصیبت کی جڑ کیا ہے ؟ یہ وہ خواہش ہے جو ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہے وہ خواہش جو حظِ نفسانی کی شدّت سے پیدا ہوتی ہے جو اس سے اور اُس سے لذّت حاصل کرتی ہے یہی جڑ ہے دنیاوی مصیبت کی ، دنیاوی مصیبت کو معدوم کرنا کیا ہے ؟ شہواتِ نفسانی کو ٹھنڈا کرنا اور اس خواہش کو معدوم کرنا جو ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہے اور حظِ نفسانی کی شدّت سے پیدا ہوتی ہے اور اس چیز سے لذّت حاصل کرتی ہے اور پھر پیدا ہوتی ہے اور بجھتی ہے - یہ ہے دنیاوی مصیبت کا معدوم کرنا -

" اور وہ طریقہ کون سا ہے جس سے دنیاوی مصیبت معدوم ہو جاتی ہے ؟ یہ وہ محترم طریقہ ہے جس کے آٹھ حصے ہیں یعنی کامل عقیدے کر مراقبۂ کامل تک ، یہ ہے حقیقت اس طریقے کی جس سے دنیاوی مصیبت معدوم ہو جاتی ہے - اے راہبو یہی ہیں چار محترم حقائق -"

(للت وستر باب ۲۶)

اگرچہ رہبانیت اور ترک ہندو فلسفے میں ایک عام اور مشترک تعلیم ہے لیکن بدھ کا فلسفہ الم سے بچنے کی کوشش اور الم کے اسباب کی دریافت سے ہی پیدا ہُوا ہے اور اس کی تحقیق میں تینوں زندگیوں میں سوائے الم کے ظہورات کے اور کچھ نہیں ہے - اس لئے زندگی اور زندگی کے تمام لوازم قابلِ ترک سمجھے جاتے ہیں - ان کا سلوک اور مراقبے سب کی روح زندگی سے بے زاری اور ترک ہے - اس موقع پر " ناگارجن " کی " سہرلیکھ " کے چند فقروں کی نقل بے محل نہ ہوگی جنھیں پروفیسر گپتا نے " وترل " کے ترجمے کے حوالے سے نقل کیا ہے -

" تُو جو دُنیا سے آگاہ ہے تو اٹھ دُنیاوی احوال سے بے نیاز ہو جا ، مثلاً نفع ، نقصان ، مسرت ، الم ، عزت ، ذلت ، تعریف مذمت ، اس لئے کہ یہ تیرے خیالات کی چیزیں نہیں ہیں -"

" چار دھیان کرنے سے تُم برہمن کی قسمت کا پھل پاؤگے بشرطیکہ خواہش ، فکر ، خوشی ، مُسرّت والم کو ترک کر دو "

" مذہبی رسمیں ، باطل آرا اور شکوک ان سے تعلق رکھنا گویا تین بیڑیاں ہیں "

" اگر تمھارے کپڑوں یا سر کو آگ لگ جائے تو اُسے بجھاتے وقت بھی خواہش کی فنا کی کوشش کرو - اس سے بڑھ کر کوئی اہم ضرورت نہیں ہے کہ خواہش کو فنا کیا جائے "

اس تمہید اور اقتباسات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ بدھ مت کا مقصد اور آخری منزل یہ ہے کہ زندگی کے دُکھوں سے نجات حاصل کی جائے جو فنائے محض ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ اور طریقہ کیا ہے ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیں - اس طریقے کا نام ہی سلوک ہے -

بُدھی سلوک

بدھی سلوک میں یہ تین چیزیں بہت اہم ہیں -

سِل -

سمادھی -

پرجنا -

سِل سے مراد ہے ضبطِ نفس یعنی انسان صحیح راہ پہ چلے اور غلط راستے سے باز رہے - سل ارادے کی صحت ، ذہنی احوال کی مطابقت ، ضبطِ خیال اور جسم زبان اور عمل و کردار سے کسی کو نقصان نہ پہنچانے پر مشتمل ہے - سل کی اچھی طرح مشق

[1] ڈاکٹر لی یان کے بیان کے مطابق بدھ ازم پر سب سے قدیم کتاب " للت وستر " ہے جو نیپال میں غالباً پہلی صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی -

اور انجام دہی سے ولایت کی دو منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں منزلوں کے نام ہیں سوتا پتی بھاؤ اور سکدا گامی بھاؤ یعنی وہ منزل جس میں انسان سیدھے بھاؤ میں ڈالا جاتا ہے اور وہ منزل جس میں صرف ایک پیدائش اور جبلی پڑتی ہے پہلی سے حواس کی موقوفی شروع ہو جاتی ہے اور خارجی محرکات کے اثر کو روکنے اور اُن سے پریشان نہ ہونے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی مشق سمادھی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

سمادھی سب سے بلند مقام اور اعلیٰ جد وجہد کا نام ہے اس کا ترجمہ ارتکاز کیا جا سکتا ہے یعنی تمام حواس اور ذہنی احوال و افعال فکر و توجہ کو ایک نقطہ پر جمع کر لینا جسے صوفیوں کی اصطلاح میں جمعیت خیال یا استغراق کہتے ہیں اس مقام پر ذہنی نمو موقوف ہو جاتا ہے۔

پنیہ سے مراد وہ فراست ہے جس سے الم، الم کا سبب، الم کی فنا اور الم کی فنا کے اسباب کا صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے

نجات اور اس کے لئے مراقبے (دھیان)

۱۔ ابتدائی تدبیر یہ ہے کہ پہلے ذہن کو اس طرح تربیت دینا اور یہ خیال کرنا چاہیئے کہ کھانے پینے کی خواہشات مکروہ ہیں۔ ان تکلیفوں کا خیال کرنا چاہیئے جو کھانے پینے کی تلاش میں اٹھانی پڑتی ہیں غذا کے آخری مکروہ تغیر پر غور کرنا اور نفرت پیدا کرنا چاہیئے۔

اس طریقے سے ان چیزوں سے تعلق خاطر ختم ہو جائے گا ایک مجبوری کی برائی سمجھ کر انسان یہ کام کرے گا اور منتظر رہے گا کہ کب اس سے چھٹکارا پاؤں۔

۲۔ یہ تصور کریں کہ ہمارے جسم کے تمام اعضا جو خاک، آگ، پانی اور ہوا سے مرکب ہیں ایک کاٹے کی نعش کی مانند ہیں جو قصائی کی دوکان پر ہو۔ اسے مراقبۂ جسم کہتے ہیں۔

۳۔ بدھ اور اُن کے مخصوص راہب شاگردوں کی عظمت اور نیکیوں پر، بدھ دیوتاؤں[1] اور ان کے قانون کی عظمت، اس کے اچھے اثرات پر، موت

[1] بدھ دیوتاؤں سے غالباً وہ برہمنی دیوتا مراد ہیں جو آخر میں برہمنی اثر سے بدھ مذہب میں شامل ہو گئے تھے ورنہ بدھ مذہب میں کوئی خاص دیوتا نہ تھے۔ ان دیوتاؤں کو بدھ مذہب نے قائم رکھا شروع میں ان کو بدھ سے نیچا درجہ دیا گیا مگر رفتہ رفتہ وہ دیوتا اپنی قدیم عظمت واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو انھیں برہمنی مذہب میں حاصل تھی اور بدھ کی مورت بھی ایک دیوتا کی حیثیت سے ان کی پرستش میں شامل ہو گئی

کی نوعیت اور تمام مظاہر عالم کے آخری اختتام اور اُس کی نوعیت پر غور کرنا۔

یہ ابتدائی مراقبے "اپچار سمادھی" کہلاتے ہیں۔ ان سے ترقی کرنے کے بعد مؤثر مراقبے شروع ہوتے ہیں جو سمادھی تک پہونچاتے ہیں۔ اس منزل پر تزکیۂ نفس اور جمعیت خیال کی کوشش جاری رہتی ہے اور اس طرح "نیان" (آخری منزل) تک پہونچنا ممکن ہو جاتا ہے۔

اس درمیانی منزل کے ابتدائی حصے میں رشی مرگھٹ جاتا ہے اور مردوں کے جسم کے خوفناک تغیرات کو دیکھتا ہے وہ ان مناظر کی کراہت، ناپاکی اور خوفناک تغیر پر نفرت کے ساتھ غور کرتا ہے پھر اسی خیال کے زیر اثر زندہ اجسام کو دیکھتا ہے کہ یہ بھی دراصل مردہ لاشوں ہی کی طرح ہیں اور اتنے ہی نفرت و حقارت کے قابل ہیں۔ اس کو اجسام کی ناپاکی کے ادراک کا مجاہدہ کہتے ہیں۔ اس مجاہدے سے جسم نفس سے علیحدہ ہو جاتا ہے

دھیان جمانے میں ان طریقوں سے امداد لی جاتی ہے کہ رشی ایک پرسکون جگہ پر بیٹھتا ہے اور اپنے سانس کے آنے (پرانا پاس[1]) اور جانے (اپانا پاس) پر دھیان لگاتا ہے اس طرح بےشعوری اور غفلت سے سانس لینے کے بجائے وہ یہ آگاہی حاصل کرتا ہے کہ وہ جلد سانس لے رہا ہے یا آہستہ اور اس طرح وہ سانسوں کو شمار سے متعین کرتا ہے تاکہ ذہن متعین ہو سکے

اس کے بعد برہم دھاما ہے جو چار مراقبوں پر مشتمل ہے

۱۔ عالمگیر دوستی (۲) عام رحم (۳) سب کی مسرت میں اپنی مسرت (۴) دوست یا دشمن کسی کو کسی پر ترجیح نہ دینا اور اُن سے بے پروائی۔ اس طرح یہ قوت بہم پہونچائی جاتی ہے کہ رشی اپنی سلامتی اور دوسروں کی سلامتی میں فرق محسوس نہ کرے اسے سب کی مصیبت دور کرنے اور موت سے بچانے کی ایسی ہی کوشش کرنی چاہیئے جیسی کہ اپنے واسطے۔

غصّے سے سل فنا ہو جاتی ہے۔ رنج، ناخوشی وغیرہ تمام عوارض (دکھ) عارضی ہیں اور کھنڈوں (اعراض) کا وجود ہی نہیں ہے پس ضرر کس سے پہونچے گا اس طرح دوستی عام تک رسائی ہو جاتی ہے

رشی کو چاہیئے کہ مٹی کے ایک بھورے گولے پر کبھی آنکھ کھول کر توجہ دے اور کبھی آنکھ بند کر کے اس کا تصور جمائے۔ جب تصور جمنے لگے تو مٹی کے گولے

[1] ایرانی صوفیہ کا "پاس انفاس" غالباً اسی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

کو علیحدہ کردے اور محض تصور کی مدد سے اس کی شبیہ کو خیال میں قائم کرے اس طرح بتدریج مراقبۂ مدلل (وتک) سے وچار تک دسترس ہو جاتی ہے اور ایک حد تک نفس میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے سکھ کا حصول آسان ہو جاتا ہے اور خواہشات کی رغبت، نفرت، سستی، غرور، اضطراب اور شک دفع ہو جاتے ہیں۔

اس حالت کے قائم ہو جانے کے بعد رشی کو احساس ہوتا ہے کہ یہ حالت بھی ناقص ہے اس لئے وہ دوسرے مراقبے (دوتی یم جھانم) میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں پہلے مراقبے کا "وتک" اور "وچار" نہیں کیونکہ اس میں ایک طرح کی حرکت موجود رہتی ہے لیکن یہاں نفس پُر سکون حالت میں منتقل ہو جاتا ہے اور حرکت فنا ہو جاتی ہے

اس سے آگے کی منزل میں رشی کو اس لطف اندوزی سے بھی قطع نظر کرنا پڑتا ہے جو اس پرسکون حالت سے حاصل ہوتی ہے یہاں وہ اشیاء کو دیکھتا ہے لیکن ان سے متاثر نہیں ہوتا پھر بھی آرام اور سکھ اور اس سے لطف اندوزی اس منزل میں باقی رہتی ہے اس لئے اگر ضروری احتیاط اور نگہداشت نہ کی جائے تو رجعت واقع ہو سکتی ہے یعنی اس مقام سے تنزل واقع ہو سکتا ہے۔

چوتھی اور آخری منزل میں دکھ سکھ سب فنا ہو جاتے ہیں دوستی اور دشمنی کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں اور رشی اعلیٰ اور مطلق بے نیازی کی حالت حاصل کر لیتا ہے چت ختم ہو جاتی ہے اور فنائے کامل حاصل ہو جاتی ہے۔ اعراض پیدا ہونے موقوف ہو جاتے ہیں اور دوبارہ جنم کی تکلیف اٹھانی نہیں پڑتی اور اس طرح سارے دکھ مطلق موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس حالت کو نِربان کہتے ہیں۔

نِربان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ خالص فنا، ناقابلِ تصور اور غیر متغیر حالت ہے اس آخری حالت کو "تتھتا" بھی کہا گیا ہے جس میں رشی کا نفس فنا ہوتا ہے اسی طرح سے نروان کی بھی تعریف کی گئی ہے اور میں ان کا باہمی فرق سمجھنے سے معذور ہوں۔ غالباً یہ مختلف فرقوں کے مختلف اصطلاحی الفاظ ہیں جن میں سب سے معروف نروان کا لفظ ہے۔

نروان اور نجات (موکش)

جب کرم اور خواہشات فنا ہو جاتی ہیں اور فہم و ادراک کرنے والا نفس عمل سے رک جاتا ہے باطل اور مجازی مخلوقات پیدا ہونا موقوف ہو جاتی ہے تو اس حالت کو نروان کہتے ہیں۔ نروان عمل کی آخری فنائیت ہے اس حالت کو موت نہیں کہہ سکتے کیونکہ موت کے بعد تناسخ ہے اور نروان کے بعد تناسخ نہیں ہے۔ اسے فنا بھی نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ مرکب اشیا فنا ہوتی ہیں اور یہ مرکب نہیں ہے

غرض یہ کہ نروان نجات کی اعلیٰ ترین صورت ہے کیونکہ دوسرے ہندو نظامات فکر کی طرح بدھ مت میں بھی اصلی نجات زندگی کے مسلسل چکر، دوبارہ پیدائش اور زندگی کے دکھوں سے نجات حاصل کرنا ہے بعض کے نزدیک نروان کا درجہ نجات کے بھی بعد حاصل ہوتا ہے اور اس سے بھی اعلیٰ ہے

اشوک کے بعد بڑے بڑے بودھ تاجدار

ملندر یا ملند۔ تقریباً ایک سو سال قبل مسیح اس صاحبِ علم و فہم بادشاہ کا زمانہ ہے۔ اس نے مشہور بودھ سادھو ناگ سین سے اپنے شکوک رفع کئے۔ اظہارِ تشکر کے طور پر ایک بودھ عبادت خانہ ملندر وہار کے نام سے تعمیر کیا اور ناگ سین کے حوالے کیا۔

کنشک۔ [illegible] سے [illegible] تک اس نے حکومت کی۔ مہایان مدرسۂ فکر کی ترقی اس زمانے میں ہوئی۔ اس نے کشمیر میں ایک بہت بڑی بودھ مجلس منعقد کی۔ پارسو کے کہنے پر یہ مجلس بلائی گئی۔ وسومتر اس کا صدر تھا اور اسوگھوس اس کا نائب صدر تھا۔ اس مجلس میں بودھ مت کے قوانین اور ان پر تبصرے قلم بند اور مرتب کئے گئے۔ یوان چانگ نے لکھا ہے کہ اس مجلس نے اپدیش شاستر، ونے وبھاشا شاستر، آدی دھرم وبھاشا شاستر کے ایک لاکھ اشلوک تصنیف کئے۔ کلہن نے بھی راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ کنشک نے بہت سی عبادت گاہیں اور وہار تعمیر کئے البیرونی نے کنشک کے پشاور میں تعمیر کردہ کنشک مہا وہار کا ذکر کیا ہے۔

ہرش وردھن (ساتویں صدی عیسوی) یہ بہت بڑا فاتح ہوا ہے چھتیس سال تک یہ جنگ و جدل میں مصروف رہا۔ سنسکرت کا مشہور شاعر بانا اسی کے عہد میں ہوا ہے۔ سنسکرت کے تین ڈرامے ناگ نند، رتناولی اور پریہ درشک خود ہرش سے منسوب ہیں۔ یہ بڑا ہر دلعزیز بادشاہ تھا۔ اس نے بدھ عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ شو مندر بھی تعمیر کئے۔ یہاں تک کہ بعض مؤرخوں نے اسے شو کا ہی پجاری گردانا ہے لیکن زیادہ تر شہادت ایسی ملتی ہے کہ ہرش بودھ مذہب کا پیرو تھا۔

شاہین غازی پوری

خوابِ صنم

رات تاریک تھی رات ویران تھی
زندگی دم بخود اور پریشان تھی
خاک و خوں میں تھا لتھڑا ہوا آدمی
روحِ انسانیت کی پشیمان تھی
ہو رہا تھا ہر اک سمت محشر بپا
آفتِ دو جہاں اور اک جان تھی

خاورِ علم و عرفاں دمکتا نہ تھا
کوئی ذرہ زمیں پر چمکتا نہ تھا
دور نظروں سے آوارہ تھی چاندنی
اک چکورا بھی امبر کو تکتا نہ تھا
غم سے خوں ہو گیا تھا کلی کا جگر
عندلیبِ گلستاں چہکتا نہ تھا
مے گسارانِ مے خانہ بے حال تھے
دورِ مے بند تھا خم چھلکتا نہ تھا

سخت مجروح تھے لالہ و یاسمن
خون میں تر بتر تھی نگارِ صبا
زلزلہ خیز تھیں موت کی چشمکیں
تھے نگوں سار کاخِ سرافراختہ

آتش انگیز تھا لالہ زارِ ارم
شعلۂ گل بھڑک اٹھتا تھا دمبدم
شہرِ کنعان میں کوئی یوسف نہ تھا
تھیں زلیخائیں بے گانۂ کیف و کم
کوئی شے ہی نہ تھی آذری نام کی
رازِ پنہاں ابھی تک تھا خوابِ صنم

اور ایسے میں اک بندۂ حق پسند
راہِ پُر پیچ و خم دار کا رہنما
دشتِ اوہام میں ایک شمعِ یقیں
تند طوفان میں ایک جلتا دیا
گل کدہ کے لئے اوس کی جل ترنگ
مضطرب غنچہ و گل کو بادِ صبا
پستیوں کو بلندی پہ لاتا ہوا
بھولے بھٹکوں کو رستہ دکھاتا ہوا

شعلہ زاروں کو گلشن بناتا ہوا
آدمیت کے پرچم کو لے کر اُٹھا
اس کے ہونٹوں پہ معصوم مسکان تھی
اس کی آنکھوں میں شبنم کی گمبھیرتا
امن اور آشتی کی تمنا لیے
وہ پیامِ محبت سناتا رہا
"آگ سے آگ نہ بجھا بجھتی نہیں
تُند شعلوں پہ پانی کا چھڑکاؤ دو
ہو نہیں سکتی نفرت سے نفرت فنا
نفرتوں کو محبت بھرا گھاؤ دو"

اور پھر ہر کلی مسکرانے لگی
چار سو زندگی گیت گانے لگی
سوئے منزل نیا قافلہ چل پڑا
آرزوئے طلب رنگ لانے لگی
چھٹ گئی رات کی بے کراں تیرگی
مہرِ تاباں کی طلعت جھلکانے لگی
زندگی جاگ اٹھی اور اجل سو گئی
جشنِ نو روزِ گیتی منانے لگی
"آگ سے آگ نہ بجھا بجھتی نہیں
تُند شعلوں پہ پانی کا چھڑکاؤ دو
ہو نہیں سکتی نفرت سے نفرت فنا
نفرتوں کو محبت بھرا گھاؤ دو"

بودھ تیرتھ استھان

۱۔ لُمبنی بن موجودہ نام اُتنِ دِئی۔ تحصیل بھگوان پور نیپال میں واقع ہے۔
یہ گوتم بدھ کی جائے پیدائش ہے۔
۲۔ بودھ گیا شہر گیا (بہار) سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں پر بدھ کو
عرفان حاصل ہُوا۔
۳۔ سارناتھ۔ بنارس سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ہرنوں کا باغ تھا
جس میں بدھ نے اپنا پہلا وعظ کیا اور دھرم چکر پرورتن کی
تعلیم دی۔
۴۔ کُسی نگر۔ موجودہ نام کسیہ ضلع گورکھ پور۔ اُتر پردیش۔ یہاں پر سال کے
درختوں کے جھنڈ میں بدھ کا مہا پری نروان (نجاتِ آخر) ہُوا
۵۔ سراوستی۔ موجودہ نام سہیتھ مہیتھ، اتر پردیش میں گونڈہ اور بہرائچ
کی سرحد پر۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ نے یہاں کئی معجزات دکھائے۔
۶۔ سنکسیہ۔ موجودہ نام سنکیسہ یا سنیہ بسنت پور ضلع ایٹہ اتر پردیش
کہا جاتا ہے یہاں پر بدھ نے معراج حاصل کیا یعنی سورگ میں
جا کر اپنی والدہ کو اپنی دھرم کی تعلیم کی اور ایک آسمانی سیڑھی کے
ذریعے زمین پر واپس آگئے۔
۷۔ راج گریہہ۔ موجودہ نام راج گیر ضلع پٹنہ، بہار۔ یہاں پر بدھ کے
رشتے کے بھائی دیودت نے بار بار ان کی جان لینے کی کوشش کی،
اژدہا بار بار بچ گئے۔
۸۔ ویشالی موجودہ نام راجہ بسال کا گڑھ۔ ضلع مظفر نگر، بہار۔ یہاں
پر بندروں نے بدھ کو شہد نذر کی تھی۔

رتن پنڈوروی

بُدھ اور اُس کا مت

زندگی

آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے کا ہندوستان بہ لحاظ تہذیب و تمدن ان عروج اندفاع پر فائز ہو تو ہو لیکن بہ لحاظ مذہب و ملت اغلاط کے بحرِ ذخار میں غوطہ نشین تھا۔ برہمن مذہب کے متاجر سمجھے جاتے تھے۔ اور وہ بھی ایسے کہ جارپایہ پر دو کتابے چند " مسوی دُملی زندگی مفقود تھی۔ تز دید دیا۔ ریاضت اور نمود و نمائش عرفان میں داخل تھے۔ محیر العقول حکایات و فوق الفطرت شعبدات کے علاوہ انانیت و تمکنت مذہب کے مدار الہام سمجھے۔ خود نما رہنماؤں کی علمی و عملی کائنات چند روایات بے درایت کے سوا کچھ نہ تھی۔ مذہبی متاجروں کی لاف زنی ایک تار عنکبوت تھی جس میں خلقِ خدا مگس سادہ کا کی طرح اسیرِ بلا ہو کر ختم ہو جاتی تھی۔ بے زبان جان داروں کی خاموش فریاد نہوں سے اُٹھنے والے دھوئیں کے ساتھ عرشِ عظیم پر پہنچتی اور پیپے کسی دادرس کی جویا رہتی تھی۔ الغرض انسانیت لرزہ براندام اور روحانیت بدنام تھی۔ چناں چہ منشی امیر احمد علوی نے اپنی کتاب " سوانح عمری گوتم بدھ " میں ولادتِ بُدھ کے وقت دنیا کی مذہبی تاریکی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

" مغربی سرحد پر کیانیوں کا اخترِ اقبال ترقی پر ہے۔ پنجاب کو مملکت فارس کا ایک صوبہ بننے کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ بابل میں بختِ نصر کا جاہ و جلال نقطۂ نصف النہار پر ہے۔ یروشلم تباہ ہو چکا اور شوکتِ جمانی کے وارث اپنی مٹی ہوئی عظمت پر آنسو بہا رہے ہیں۔ فراعنہ جو کسی وقت خدائی کے دعوی دار تھے فاتحِ بیت المقدس کی شوکت سے لرزہ براندام ہیں۔ رومۃ الکبریٰ کا عالمِ طفلی ابھی شباب تک نہیں پہنچا۔ وہ دن دور ہے کہ یونان کے دانش مندوں کو غلام بنائے اور دجلہ و فرات پر درفشِ کاویانی سے مقابل ہو۔ یونان علم و فضل میں گوئے سبقت لے گیا لیکن وہ منزلِ کمال ابھی بہت آگے ہے اگر اس کا ایک شہزادہ سلطنتِ ایران کو تباہ کرے اور شہنشاہِ عالم کی خطرناک ہوس کا شکار ہو۔ شریعتِ زرتشت فارس کی قومی مذہب ہے۔ آگ صرف قبلہ نہیں بلکہ معبود ہو رہی ہے۔ ستارہ پرستی بابل اور اس کے مقبوضات میں رائج ہے۔ آفتاب مظہرِ قدرت نہیں بلکہ قادرِ مطلق ہے۔ روما اور یونان کا مذہب عجائب پرستی عظمت، شجاعت اور سنگین مورتوں کے سامنے سر جھکانا ہے بنی اسرائیل کا مقدس شہر ویران و سنسان ہے اور ملکِ شام میں توحید کا چراغ جلانے والے ایک جابر حاکم کی قید میں گرفتار ہیں۔"

مصنفِ موصوف نے دنیا کی حالت کے علاوہ ہندوستان کی حالت بھی اسی طرح لکھی ہے اور مجملاً یہ لکھا ہے کہ برہمنوں کا زور تھا قربانیاں ہوا کرتی تھیں۔ شودر اور اچھوت ذاتوں کے لئے علم کے دروازے بند تھے۔ راجہ عیاش تھے۔

اس استبداد، انانیت، خوں ریزی، عیاشی اور مذہبی تاریکی سے متاثر ہو کر نیپال کی ترائی اور لُمبنی کے جنگل میں رحم و انصاف کا ایک دیوتا پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر آیا۔ کسی نے اُسے گوتم کے نام سے پکارا۔ کوئی بدھ (عارف باللہ) کہنے لگا۔ کہیں ساکیہ مُنی کے لقب سے ملقب ہو کر شہرت پائی۔ لیکن خوش نصیب والد راجہ شدھودھن اور بامراد والدہ مایا دیوی نے

سدھارتھ نام رکھا اور وہ ہستی بے عدیل اپنے آپ کو تتھاگت کہنے لگی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے اس مذہبی گورکھ دھندے کا جائزہ لیا اور اپنے ماحول میں ہر طرف فسق و فجور، جور و استبداد اور افراط و تفریط کی آگ شعلہ زن پائی۔ اس نے محسوس کیا کہ دنیا ایک نہایت تنگ و تاریک راستے پر چل رہی ہے۔ مطلب پرست رہنما محض اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے مذہب کا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں۔ اس بے دینی کے عالم میں وہ کسی ایسے صراطِ مستقیم کا جویا رہنے لگا جس پر چل کر انسان حقیقی معنوں میں علائقِ انسانیت سے متحد ہو سکے اور اسے سکونِ ابدی حاصل ہو۔ پائندگی، واسی دیکھ کر والدین نے اسے سیم و زر کی زنجیروں میں جکڑا۔ دولت و ثروت کے سبز باغ دکھائے۔ یشودھرا ایسی خوبصورت بیوی اس کے پاؤں میں پہنائی اور راہل ایسے ہونہار فرزند نے ہتھکڑی کا اور اضافہ کر دیا۔ لیکن یہ قیود و بند اس طائرِ آزاد کو پابندِ قفس نہ رکھ سکے۔ اس کی متجسس نگاہیں ایک ضعیف العمر ناتواں، ایک بیمار خستہ جان اور ایک مردہ قالب پر پڑیں نیز ایک تارک الدنیا پر پڑیں۔ سانحاتِ ثلاثہ جس قدر اس کی دل برداشتگی کا موجب تھے اسی قدر مؤخر الذکر منظر تسکینِ قلب کا مظہر تھا۔ دنیا کی نمود بے بود سے متنفر ہو کر اس نے ترکِ عظیم کا عزمِ صمیم باندھا اور انتیس سال کی بھرپور جوانی کو لیتا ہوا محلاتِ شاہی و ٹھاٹ قیصری کو ٹھکراتا ہوا محض مسرتِ ابدی کی تلاش میں گھر سے چل کھڑا ہوا۔ پانچ زاہدوں کے ہمراہ نورِ باطن سے منور ہونے کے لئے پورے چھ سال ریاضتِ شاقہ میں مستغرق رہا۔ لیکن اس نفس کشی کا نتیجہ محض جسمانی نقاہت و ناتوانی تک ہی محدود رہا، نہ کہ خیرِ اعلیٰ و علمِ بالا کا حصول۔ بالآخر اس نے نفس کشی کی مشقت چھوڑ کر بدھ گیا میں ایک پیپل کے سائے میں باقاعدہ مراقبہ شروع کیا اور ٹھان لی کہ جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں گا نہ اٹھوں گا۔ اسی اثنا میں انواع و اقسام کے وسوسے اس کے دل میں آنے لگے اور کئی روحانی رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ چنانچہ ایک رات خواب کی صورت میں شیطان نے دنیا جہان کی دولت کی پیشکش کی لیکن جب اس کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی تو اس پر باد و باراں، سنگ و خشت اور خوفناک آتشیں ہتھیاروں سے حملہ کیا لیکن یہ اپنی ضد کا پورا بات کا دھنی وہیں گم سم بنا بیٹھا رہا۔ شیطان معہ اپنے لشکرِ جرار کے اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ آخر ۴۹ دن کے مسلسل مراقبے کے بعد عرفان و حقیقت کے رموز اس پر عیاں ہو گئے۔ اب وہ صداقتِ حقیقی کو پا کر سدھارتھ سے بدھ (عارف باللہ) بن گیا۔ یہ کشف بیساکھ کی پورن ماشی کے دن ہوا تھا۔ اسی بنا پر سب پورن ماشیوں کو عام طور پر اور بیساکھ کی پورن ماشی کو خاص طور پر بودھی ملکوں میں تیوہار کے طور پر منایا جاتا ہے۔

روشن ضمیر بدھ ایک عالم کو تجلیاتِ حقیقت سے بہرہ ور کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا اور یہ صلائے عام ("حیاتِ ابدی کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا ہے۔ جو گوشِ ہوش رکھتا ہے آئے اور سنے") دیتا ہوا بنارس پہنچا۔ وہاں اسے پرانے پانچوں ساتھی رشی پتانا (پالی) یا رشی پتانا (سنسکرت) کے مرگ دیا (باغ آہو) میں ملے۔ وہ گوتم بدھ کی باتوں پر ایمان لے آئے اور مرید ہو گئے۔ اسی مقام پر مریدوں کی تعداد ساٹھ تک پہنچ گئی۔ بہ نظرِ سہولت اس نے ایک فرقہ برادری کی بنیاد ڈالی جسے سنگھ کے نام سے موسوم کیا۔ اپنے مریدوں کو اقصائے عالم میں اپنے مت کی اشاعت کے لئے روانہ کیا اور کہا

"او بھکشوؤ! جاؤ تم اور کام کرو بہتوں کے فائدے کے لئے بہتوں کی بہبود کے لئے بہ نظرِ ترحم دیوتاؤں اور انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے۔

"او بھکشوؤ! شاندار دھرم کی تشہیر کرو، متبرک، کامل اور پاک زندگی کی تلقین کرو۔"

خود بھی جگہ جگہ گھوم کر تبلیغ کرنے لگا۔ اس نے اپنی تقریروں میں ہندوستان کی کتبِ مقدسہ کی زبان (سنسکرت) استعمال نہیں کی۔ بلکہ وہ مگدھ دیس کی بولی یعنی پالی میں بولتا تھا جس میں بدھ ازم کے سب سے قدیم نوشتے تحریر ہوئے تھے۔ یہ بولی سنسکرت سے [illegible] تھی۔ یہ اس کا عقیدہ تھا کہ "ہر شخص اپنی زبان میں ہی [illegible] سیکھ سکتا ہے۔" انہی امور پر نظر کر کے بدھ ازم کو پہلا تبلیغی مذہب کہا گیا ہے۔

دمِ واپسیں تک کامل پینتالیس سال بدھ نے اپدیش دیا۔ اپنے طریقت کے قواعد کے مطابق وہ قبل از دوپہر ایک مرتبہ کھانا کھاتا تھا جو اور لوگوں کے گھروں سے بھیک مانگ کر لاتا تھا۔ بدھ نے راجاؤں، رشیوں، برہمنوں، سوداگروں، مزدوروں، الغرض ہر جماعت کے مردوں اور عورتوں کو اپنا پیرو بنایا۔

اس کی تقریر سامعین کی استعداد کے مطابق عام فہم ہوتی تھی۔ مناسب مقام پر تمثیلات و استعارات کا استعمال بھی انتہائی احتیاط کے ساتھ کرتا تھا۔ آخر اسی سال کی عمر میں اس کے ایک پیرو چندا نامی لوہار نے اسے کھانے کے ہمراہ کھمبیں کھلائیں جن میں اتفاق سے ایک کھمب زہریلی تھی جس کے کھانے سے بدھ بیمار

پڑ گیا اور یہی عارضہ ۴۸۳ ق-م میں ان کی رحلت کا موجب ہوا۔ اس پر بھی مرنے سے پہلے اپنے میزبان کی دل جوئی کے خیال سے بدھ نے کہا کہ اس کا کوئی قصور نہیں بلکہ یہ اس کی نیکی ہے اس نے مجھے آخری کھانا کھلایا ہے۔

مرتے وقت گوتم بدھ نے اپنے حاضر شاگردوں کے سامنے اپنے مت کے اہم اصول بیان کئے۔ شاگردوں نے عرض کی کہ آپ کے بعد سنگھ کا خلیفہ یا امام کون ہوگا۔ فرمایا کہ "طریقیت کے قواعد اور مت کی تعلیم ان کے ہادی ہوں گے"۔ ایک عزیز ترین شاگرد آنند نے عرض کی کہ آپ کے مرنے کے بعد کس طرح آپ کا احترام کریں۔ تو آپ نے کہا کہ:۔

"مجھے کسی احترام کی حاجت نہیں۔ میرے جو شاگرد ہمیشہ میرے مت کے مطابق رہیں گے اور حصولِ کمال کے لئے سعیٔ بلیغ سے کام لیں گے وہ میری بہترین عزت کریں گے۔"

مرتے وقت ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "سب مرکب چیزیں چند روزہ ہیں اپنی نجات کے لئے متواتر کام کئے جاؤ۔"

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بودھوں کے خیال کے مطابق نجات کے معنی ہوسوں اور بندھنوں سے آزاد ہونا ہے نہ کہ بقول برہمنوں کے آتما کا برہم کے ساتھ وصال یا بقول مسیح مذہب کے آسمان میں حیاتِ جاوید۔

جو شاگرد اُن سے دور رہتے تھے اُن کی تسکینِ خاطر کے لئے مہاتما بدھ کہا کرتے تھے کہ:۔

"جو میرے مت کے مطابق رہتا ہے وہ میرے قریب ہے۔"

تعلیم

بدھ کی وفات کے تھوڑی ہی مدت بعد ۴۸۳ ق۔م میں ایک شاگردِ رشید کشیپ نے راج گرہ میں بھکشوؤں کی ایک مجلس منعقد کی تاکہ کتب مقدسہ مرتب و مدون ہو سکیں۔ چنانچہ آنند نے جو بدھ کا چچیرا بھائی اور پیارا شاگرد تھا کچھ سوتر جو اُسے از بر تھے سنائے۔ اپالی حجام نے (جو قواعدِ ملت سے بخوبی آگاہ و ماہر تھا) ونیہ سنایا ابھی دھم اس مجلس میں نہیں سنایا گیا کیوں کہ اس میں معقولات کے رسالے تھے اس کے بعد بھی کئی مجلسیں منعقد ہوئیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

دوسری مجلس۔ ۳۸۳ قبل مسیح میں وشالی ضلع مظفر پور صوبہ بہار میں ہوئی۔ اس میں کالا شوک مہاراج کی مدد سے تری پٹک مرتب کی گئی۔ اس میں سات سو بھکشو اکٹھے ہوئے۔

تیسری مجلس۔ ۲۴۰ قبل مسیح میں ایک ہزار بھکشوؤں نے مہاراجہ اشوک کی مدد سے اشوکارام (بہار) میں پٹنہ کے قریب منعقد کی اس میں تینوں شاستر مرتب ہوئے اور لنکا وغیرہ نو ملکوں میں بھکشوؤں کو بھیج کر دھرم کی اشاعت کی گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۲۱۳ ق-م میں مہاراجہ اشوک کے بیٹے مہامہندر نے ۴ لاکھ بھکشوؤں کو اکٹھا کیا اور لنکا کے راجہ "وشٹ گرامنی" کی مدد سے تری پٹک کو تال پتروں پر لکھوا دیا۔

چوتھی مجلس۔ مہاراجہ کنشک کے عہد میں اشو گھوش کی زیرِ صدارت انعقاد میں آئی۔ اس میں تری پٹک از سرِ نو مرتب ہوئی۔ اصل میں اس مجلس میں اتری بدھ مت (مہایان) فرقے کی بنیاد پڑی۔ بدھ کا اصلی دھرم یعنی جنوبی ہند کا فرقہ (ہین یان) ہے

(بدھا دَم مصنفہ پروفیسر رہئس ڈیوڈس اور لیکچر پروفیسر بیری مطبوعہ پریس)

گوتم بدھ نے سب سے پہلی تقریر پانچ زاہدوں کو خطاب کر کے کی تھی۔ اس کا نام تھا "دھما چکا پرتا ناستوا" ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں۔ "مت کے پہیے کو حرکت دینا" اور اصطلاحی معنی ہیں۔ "راست بازی کے بادشاہ کی بنیادی تقریر"۔ فی الحقیقت یہی تقریر بدھ مت کی بنیاد ہے۔ اس میں چار حقائقِ گرامی کا بیان ہے جن کا ذکر بدھ مت کی کتب میں اس طرح آتا ہے۔

"میں نے یوں سنا ہے کہ ایک مرتبہ بنارس میں بمقام مرگ رمنا موسوم رشی پتانا مہاتما بدھ قیام فرما تھے وہاں انھوں نے پانچوں زاہدوں کو اس طرح خطاب کیا۔

"راست کاری کے خواست گار کو دو باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ایک بات لذات و خواہشاتِ نفسانی کا پورا کرنا ہے۔ جو ذلیل، رذیل اور ہیچ ہے دوسری بات بے حد نفس کشی اور خود فقیری ہے جو معزت رساں اور بے سود ہے۔"

مسلکِ درمیانہ جو تتھاگت نے معلوم کیا ہے ان دونوں غلط رستوں سے بچتا ہے۔ جو آنکھیں کھول دیتا ہے، بصیرت بخشتا ہے، خرد مندی، عقلمندی، بیداری کی راہ بتاتا ہے۔ یہ مسلکِ گرامی یا راہِ مستقیم حسبِ ذیل فضائلِ ہشت گانہ پر مبنی ہے۔

۱۔ رائے صحیح، ۲۔ تمنا صحیح، ۳۔ کلام صحیح، ۴۔ اعمال صحیح، ۵۔ معاش صحیح

۶۔ سعی صحیح ، ۷۔ فکر صحیح ، ۸۔ توجہ صحیح۔

ان فضائل ہشت گانہ کے بعد دُکھ کی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے۔ پیدائش دُکھ ہے ، عارضہ دُکھ ہے ، موت دُکھ ہے ، غم دُکھ ہے ، آہ و زاری دُکھ ہے ، ناگوار کے ساتھ ملاپ دُکھ ہے ، پیاری چیزوں سے لگاؤ دُکھ ہے ، ناکام خواہش دُکھ ہے۔ دکھ کے اسباب کی حقیقت گرامی یوں بیان کی گئی ہے۔

"یہ جاذبِ تشنگی ہے یعنی زیست کی ہوس اور اس سے لطف اٹھانے کی خواہش جس سے پُنر جنم ہوتا ہے۔ تا کہ کسی نہ کسی طرح خواہشات نفسانی پوری ہوں ہوائے نفسانی کے بھڑکنے کی ہوس۔ ہوس زیست ، خواہ زندگی حال یا زندگی آئندہ میں ہو یا آرزوئے فنا یہ سب دُکھ کے پیدا کرنے والے ہیں۔

دُکھ کو زائل کرنے کا واحد طریقہ ہے ہوس کو قطعی نیست و نابود کرنا۔ اس پر فتح پانا اور اس کا فنا کرنا۔

مندرجہ بالا حقائق و اصول کی سادگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کر یہ چھوٹے چھوٹے اصول اتنے بڑے مذہب اور فلسفے کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن بہ نظرِ غائر ان کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر اصول اپنے اندر نجات و تسکینِ حقیقی کا ایک غیر محدود جہان چھپائے بیٹھا ہے۔

مہاتما بدھ نے سائینٹفک طریق پر شخصیت کا پانچ حصوں میں تجزیہ کیا ہے۔ جسم ، احساس ، تفہیم ، تحتِ شعور اور شعور۔ اس کے بعد کتب مقدسہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ منفرد اور مجموعی حالت میں یہ حالتیں عارضی ہیں اور ایسی عارضی حالتوں کی ہوس کا نام شخصیت ہے جو جلد یا دیر سے دکھ پیدا کرتی ہیں۔

بدھ کے مقالات میں دوازدہی اصول کا ذکر آیا ہے جس میں علت و معلول کا باہمی تعلق مفصل اور باقاعدہ طریق سے دکھایا گیا ہے۔ اس کو "تیکا سام پادہ" کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہے "انحصاری ابتدا" اس کی تفصیل اس طرح ہے

۱۔ جہل کے انحصار سے ترکیب پیدا ہوتی ہے جسے سنسکار بولتے ہیں۔
۲۔ تراکیب کے انحصار سے شعور ظہور میں آتا ہے۔
۳۔ شعور کے انحصار سے روح اور قالب میں تعلق پیدا ہوتا ہے۔
۴۔ ارتباطِ روح و قالب کے انحصار سے شش شکلی عالمِ حواس جسے اندریاں کہتے ہیں پیدا ہوتا ہے۔
۵۔ شش شکلی عالمِ حواس کے انحصار سے چیزوں کے ساتھ حس پیدا ہوتی ہے۔
۶۔ حس کے انحصار سے احساس پیدا ہوتا ہے
۷۔ احساس کے انحصار سے ہوش پیدا ہوتا ہے۔
۸۔ ہوش کے انحصار سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے
۹۔ لگاؤ کے انحصار سے ساخت پیدا ہوتی ہے۔
۱۰۔ ساخت کے انحصار سے جنم ہوتا ہے
۱۱۔ جنم کے انحصار سے بڑھاپا ، موت ، غم ، درد ، اندوہ ، یاس پیدا ہوتی ہے
۱۲۔ اس طرح دُکھ کا سارا تودا بن جاتا ہے

اگر جہل کو کلیتہً دفع کر دیا جائے تو دکھ خود بخود معدوم ہو جاتا ہے مہاتما بدھ نے ایک جگہ خود فرمایا ہے کہ :۔

"جس طرح سمندر کا پانی ہمیشہ نمکین ہوتا ہے اُسی طرح میرے مت میں بھی ایک ہی ذائقہ ہے یعنی نجات کا ذائقہ۔ بس میں ایک ہی بات سکھاتا ہوں دُکھ اور اس سے رہائی۔"

بدھ ازم کے بنیادی اصولوں سے حسب ذیل تین چیزیں خاص علاقہ رکھتی ہیں ان کو پالی زبان میں تیل کھانا (تین خصوصیتیں) کہتے ہیں۔

۱۔ سب چیزیں عارضی ہیں جس کو پالی میں انیکا کہتے ہیں
۲۔ سب چیزیں غم ناک ہیں جسے دُکھ کہتے ہیں
۳۔ سب چیزیں بلا شخصیت کے ہیں جسے اناتا کہتے ہیں

بدھ روح غیر فانی سے منکر ہے۔ لیکن وہ نفس کے مدارج مثلاً جذبات ، ولولے ، خیالات ، ارادے وغیرہ سے منکر نہیں۔ وہ ایسی روح کا بھی قائل نہیں جو غیر مادی حالت میں نفس کے مدارج مذکورہ کے پس پردہ محرک ہو یا وہ جسمانی موت کے بعد کسی جگہ پرواز کرے یا وہ جنت یا دوزخ میں تا ابد رہے۔ مہاتما بدھ کا ارشاد ہے کہ زیست کا موجب محض مادی ہی نہیں بلکہ اور بھی ہے یعنی "ہوس" اور یہی چیز دُکھ کی بانی ہے۔ اگر ہشت گانہ مسلکِ گرامی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے تو یہ ہوس دوسرے جنموں کے سبب سے رفتہ رفتہ رفع ہو جاتی ہے پھر دوسرا جنم نہیں ہوتا اور وہ حالت حاصل ہو جاتی ہے جو بدھ مت کی منزلِ مراد ہے یعنی "نروان" جسے پالی زبان میں نبھان کہتے ہیں۔

جو لوگ نبھان (نروان) کا مطلب فنا ہونا سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ نبھان کا لغوی ترجمہ ہے نکل جانا۔ جیسے تیل ختم ہونے پر چراغ کا بجھ جانا۔ سوال ہے کیا بجھ گیا ؟ جواب ہوگا "خودی کی تین آگیں" یعنی حرص ، نفرت اور دھوکا

بدھ کی تعلیم کے مطابق یہ کیفیت دورانِ حیات میں بھی حاصل ہو سکتی ہے چناں چہ بمقام بدھ گیا بودھی درخت کے نیچے ایک رات بدھ کو خود نروان حاصل ہوا جس کے بعد ۴۵ سال وہ زندہ رہا۔ پالی زبان میں اس شخص کی موت کو جسے پہلے ہی جیتے جی نروان حاصل ہو چکا ہو، پری نروان کہتے ہیں۔

برہمنی دھرم میں نروان کے معنی آتما کا پرماتما کے ساتھ وصال ہوتا ہے، جو بعد مرگ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بدھ مت میں نروان ایک کیفیت ہے جس میں پرماآنند اور پوری مخلصی ملتی ہے۔ چناں چہ نروان پا کر خود بدھ نے اپنی نسبت کہا ہے:-

"دنیا کے خورسندوں میں ایک میں ہوں"

جن کو نروان حاصل ہو جاتا ہے وہ آرہا (ارہت) کہلاتے ہیں جس کے معنی سنت کے ہیں چوں کہ نروان کے حصول سے سب کرموں میں خودی کی بُو تک نہیں رہتی اور خواہش ختم ہو جاتی ہے اس لئے دوسرا جنم نہیں ہوتا۔

بعض مورخ بدھ مت پر چند اعتراضات کرتے ہیں۔

سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ چوں کہ ویدوں کے الہامی ہونے کو بدھ نے تسلیم نہیں کیا اس لئے وہ ہندو نہ رہا بلکہ اس نے ہندو دھرم کو سخت صدمہ پہنچایا۔

پروفیسر ڈیوڈس اس بارے میں یہ رائے رکھتا ہے۔

"کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ بدھ ہندوازم کا دشمن تھا صحیح نہیں ہے۔ گوتم ہندو پیدا ہوا۔ ہندوؤں کی مانند اس نے پرورش پائی اور ہندوؤں کی طرح مرا۔ اس کا بیشتر فلسفہ ایسا نہیں ہے جو ہندوؤں کے کسی نہ کسی طریقِ فلسفہ میں نہ پایا جائے۔ اور جو اخلاق اس نے سکھایا وہ بھی قدیم و جدید کتب اخلاق مصنفہ ہنود میں پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بدھ ازم ہندو دھرم کا دشمن بلکہ اس کا بچہ تھا۔ برہمنوں ہی سے بدھ نے تعلیم پائی تھی اور وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہی مذہبِ قدیم کی سب سے صحیح تعبیر کرنے والا ہے اور حق تو یہ ہے کہ وہ سب ہندوؤں سے اعظم، زیرک اور بالاتر تھا۔"

مسٹر آرتھر للی کی بھی یہی رائے ہے۔ ایڈون آرنلڈ جس نے 'لائٹ آف ایشیا' لکھی، اس کے دیباچے میں اور اپنی دوسری کتاب "انڈیا ری وزٹڈ" میں لکھتا ہے۔

"جہاں جہاں ایک مرتبہ بدھ مت کا قدم پہنچا ہے۔ اس کے اثرات مٹ نہیں سکتے۔ گویا وہ لوہے کے ساتھ پارس کا کام کرتا ہے۔"

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "بدھ مت میں یاس و ناامیدی برستی ہے۔" اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں نہ امید ہے نہ یاس۔ بلکہ یہ مت دونوں چیزوں سے کنارہ کش ہے۔ اور سکھاتا ہے کہ بیچ دونوں انتوں کے درمیان ہے۔ اس درمیانی راستے پر پہنچنے کے لئے سکونِ طبع کو بڑھانا چاہیئے۔

تیسرا اعتراض بدھ مت پر یہ ہے کہ یہ ہمت کو مفلوج کر دیتا ہے۔ لوگوں کو کاہل بنا دیتا ہے۔ گویا کسی کو کچھ کام نہیں کرنا اور محض سوچ میں پڑے رہنا ہے۔

قطعِ نظر اس کے کہ گہرا دھیان کٹھن ہوتا ہے۔ بدھ مت ثابت قدمی اور سرگرمی پر بار بار زور دیتا ہے جس کا ذکر اس مت کی کتب مقدسہ میں یوں آیا ہے:-

"لہو و لعب، کاہلی، بے اعتدالی، بے چینی سے بڑھ کر کون سی چیزیں برائی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہمت سے بڑھ کر کون سی شے ہے جو اتنی آسانی سے برائی کو روکتی اور نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔"

"سو برس کاہلی اور سستی میں جینے سے ایک دن سرگرمی سے کام کرنا اچھا ہے۔"

اس طرح کے ہمت افزا اور حوصلہ پرور اقوال بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بدھ مت کاہلی سکھاتا ہے۔

چوتھا اعتراض۔ "ایک اور عیب بدھ مت پر یہ ہے کہ یہ انانیت بڑھاتا ہے۔"

بفرضِ محال اگر انانیت مان بھی لی جائے تو ان لوگوں کی انانیت سے کم درجے کی ہے جو یقین کرتے ہیں کہ اُن کی روح کو نیک کاموں سے ثواب ابدی ملے گا۔ بودھی لوگ یقین کرتے ہیں کہ نیکی کا ان کو شخصی صلہ نہیں ملتا بلکہ وہ نیک کاموں سے دوسرے جنم کی بہتری کے لئے تیاری کرتے ہیں جو ظہور میں آئے گا۔ حتیٰ کہ دوسرا جنم بھی محدود وقت کے لئے ہے۔

پانچواں اعتراض ۔ "بدھ مت پر ایک طعن یہ ہے کہ وہ فرقۂ اناث سے خصومت رکھتا تھا، کیونکہ بدھ نے عورتوں کو سنگھ میں شامل کرنے میں تامل ظاہر کیا تھا۔ جب اپنی سوتیلی ماں پجاپتی اور اپنے خاص شاگرد آنند کی منت سماجت سے اس نے اجازت دے دی تو اُن کے لئے قواعد بھی سخت بنائے۔"

جب ہم ہندوستان کے اُس زمانے کی حالت پر غور کریں تو بدھ کا تامل سمجھ میں آسکتا ہے۔ بدھ کی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات ظہور میں آئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کی کتنی قدر و منزلت کرتا تھا۔ اس نے خود بہت عورتوں کے نام لئے ہیں جن کو وہ اپنے جلیل اور عالم شاگردوں میں گنتا تھا۔

تبلیغ

بدھ میں صدق دل عمیق تھا اور اُس کی محبتِ انسانی وسیع اور غیر محدود تھی۔ خواہ کتنا ہی اختلاف کسی کو بدھ کے فلسفے سے ہو اُس کی راست بازی، صاف گوئی اور دلیری کی ساری دنیا قائل ہے۔ اس کے زمانے میں مذہبی اور فلسفی آراء کی اشاعت کے لئے کمال درجے کی رواداری اور آشتی ظہور پذیر تھی۔ اس وقت تک بدھ ازم نے یہی وطیرہ قائم رکھا ہے۔ ۲۵۰۰ سال کے عرصے میں ایک متنفس پر بھی تبدیلیٔ مذہب کا جبر نہیں ہوا اور نہ مت کے پھیلانے میں ایک قطرہ خون کا بہا ہے۔ اس پر بھی بدھ مذہب تبلیغی مذہب ہے۔ وسطی ایشیا اور مشرقی ایشیا میں جلد ہی پھیل گیا۔ مغل اور تاتار جیسی وحشی قوموں کی عادات بھی اس نے بدل دیں۔ مہاراجہ اشوک ہی کے زمانے سے یہ حکومت کا مذہب ہو گیا۔ موریا راجاؤں نے اسے ایک عالمی مذہب کا درجہ دیا اور یہ ہندوستان کی حدود کو پھاند کر تبت، لنکا، ترکستان، چین، بلوچستان، فلسطین، کوریا، جاپان، برما، سیام، کمبوڈیا، جاوا، سماترا، جزیرہ نما ملایا، افغانستان میں پھیلنے کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل گیا۔ چنانچہ ذیل کے تاریخی شواہد اس صداقت کا بیّن ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر بسیلو کی کتاب "اقوام افغانستان" صفحہ ۷۵ اور ۷۶ پر مرقوم ہے کہ افغانستان میں جلال آباد کی وادی کا سابقہ نام "نوی گرہ" یا "نو وہارا" تھا لیکن نو مندر یہاں تھے۔ پانچویں صدی میں بدھ مت کا متبرک اور پُررونق مقام تھا۔ اب بھی یہاں بودھی عمارتوں کے کھنڈرات موجود ہیں۔

بلوچستان ۔ ڈاکٹر بسیلو کی کتاب مذکور کے صفحہ ۲۲ پر بلوچستان میں بدھ مذہب کا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ پرانا قندھار کلتا شہر کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر مذکور کو یہاں سے سیاہ و سبز پتھر کا ایک کاسہ ملا جو کسی اسلامی درگاہ میں پڑا تھا۔ سیتھین قوم کے حملے کے وقت جب بودھی لوگوں نے یہاں سے نقل مکان کیا وہ اس کاسہ کو چھوڑ گئے ہوں گے۔

ایران ۔ چینی سیاح ہیوانگ چوانگ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ ایران میں اس وقت پارسی مندروں کے علاوہ تین بودھی درگاہیں جن میں کئی سو فقرا بستے ہیں موجود ہیں۔ یہاں ہینیان فرقہ کے بودھوں کی تعلیم ہوتی ہے۔

فلسطین ۔ اشوک کے بھیجے ہوئے مشنری حضرت عیسیٰ سے دو صدی پہلے یہاں اخلاق کا پرچار مشرقی صوبوں میں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے عیسوی مذہب کئی امور میں بودھی تعلیم سے مشابہت رکھتا ہے۔

(انگریزی انڈین ایپاسٹر صفحہ ۱۴ اتپرد تیبر مہانی)

مصر ۔ مصر میں تارکوں اور زاہدوں کے فرقے بودھی اثر سے پیدا ہوئے۔ جو اشوک کے مبلغوں کے ذریعے سے وہاں پہنچا تھا اور جس کے مقابلے کا کوئی فرقہ اُن دنوں یورپ میں نہ تھا۔

(مذاہب مصر از ڈاکٹر پیٹری)

چین ۔ مسٹر بیکین کی کتاب "تاریخ بدھ ازم" کے صفحہ ۷۷ پر مذکور ہے کہ شہنشاہ منگٹی نے ۶۱ء میں خواب میں ایک سنہری مورت محل میں داخل ہوتے دیکھی۔ اس کے جوتشیوں نے کہا کہ یہ شکل ساکیہ منی کی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ شہنشاہ نے سفارت بھیج کر ہندوستان سے بودھی مت کے فقرا بلوائے اور چین میں انھوں نے پرچار کیا۔ اپنے ہمراہ دو مورتیاں اور کتابیں لائے تھے ان کا ترجمہ چینی زبان میں کیا گیا۔ اس شہنشاہ کے بعد کسی بادشاہوں نے تائید کی مخالفت کی لیکن آخر چین میں بدھ دھرم استقامت پکڑ گیا۔

کوریا۔ شہاب الدین چوہدری نے رسالہ "قانونی انڈین گیسوز"
جلد ۱۴ کے صفحہ ۳۹۹ پر لکھا ہے کہ چین سے ۳۷۲ء میں کوریا میں بدھ مت پہنچا۔ مقام حیرت ہے کہ بعض چینی بدھ۔ تاؤ اور کنفیوشس تینوں مذہبوں کو ایک ہی وقت مانتے ہیں اور ان میں کوئی امر ایک دوسرے سے تناقض نہیں دیکھتے۔

جاپان۔ ۲۰۰ء میں کوریا کو امپرس ریجنٹ جنگو کوگو نے فتح کیا۔ فاتحین بدھ دھرم کے اثرات پڑنے لگے۔ کوریا سے ۵۵۲ء میں بہت سے بودھی سادھو جاپان آگئے۔ شنٹو مذہب جاپان کا قدیم مذہب تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو بدھ دھرم نے بھی پاؤں جما لئے۔ اس وقت تعلیم یافتہ جاپانی بدھ مت کے پیرو ہیں۔ شاہی مذہب شنٹو ہے۔

برما۔ روایت ہے کہ گھوس نامی بدھ سادھو پانچویں صدی میں بدھ دھرم اس ملک میں لے گیا۔ یہ مگدھ کا باشندہ تھا اور بدھ لٹریچر کا بڑا عالم تھا۔ مسٹر ہیمی اس روایت کو معتبر نہیں سمجھتے بقول اُن کے کوئی اور سادھو برما گیا تھا۔

سیلون۔ اشوک کے شہزادہ مہندرا اور اس کی شہزادی سنگھ متری نے اس جزیرہ میں بدھ مت پھیلایا۔ الغرض کسی نہ کسی سادھو یا بھکشو کے ذریعہ سیام۔ کمبودیا۔ نیپال۔ بھوٹان سکم کشمیر میں بدھ مت پھیلا۔ حتیٰ کہ روس۔ والگا اور ڈان کی کلمک قوم بدھ کی پیرو ہوگئی۔ پانچ یونانی بادشاہ جن کے ملکوں میں مہاراجہ اشوک نے مبلغ روانہ کئے تھے حسب ذیل تھے۔

۱۔ سیریا کا بادشاہ اینٹی یاکس ۲۔ بطلیموس مصر کا۔
۳۔ میسڈن کا اینٹی گونس ۴۔ سائرینی کا میگس
۵۔ ایپی راس کا سکندر

مارکوپولو لکھتا ہے کہ کشمیر سے کئی بودھی مشنری ایشیا کے مختلف ممالک میں پرچار کے لئے گئے تھے (میڈیول ریسرچ جلد اول صفحہ ۱۰)

بابو نیپندر ناتھ بوس نے ایک مختصر کتاب بموسوم "انڈین ٹیچرز آف بدھسٹ یونیورسٹیز" لکھا ہے۔ اس کتاب میں چار کشمیری بودھ مشنریوں کا حال درج ہے۔ جن کے نام ہیں:۔ رتنا وجرا۔ سورج گپت۔ ساکیا سری بدرا۔ پدما سمبھو۔ علاوہ ازیں کتاب میں لکھا ہے۔ "وہ زمانہ ذہن میں لایئے جب سڑکیں نہیں تھیں جغرافیہ معلوم نہ تھا۔ سواریاں تو سوائے یابو کے اور کیا ہوں گی۔ کہیں کہیں بیلیاں میسر ہوتی ہوں گی۔ اس زمانہ میں کشمیری برہمن مگدھ کی یونیورسٹیوں سے تعلیم پاکر واپس وطن کو جاتے اور وہاں سے پھر تبت جاتے۔ وہاں سنسکرت سکھاتے۔ تبتی زبان سیکھتے اور ترجمے کرتے۔ معبد گاہیں قائم کرتے دھرم کا پرچار کرتے۔ شاہی درباروں میں دخل پاتے اور ہندوستان سے باہر وحشی ملکوں میں دھرم کی خوش خبری دیتے تھے۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بودھوں کے عروج کے زمانہ میں ہندوستان میں وکرم شیلا۔ نالندا۔ جگ ڈالا اور اودنتاپوری یونیورسٹیاں بنگال اور مگدھ میں ہوا کرتی تھیں یہاں تبت کے لوگ تعلیم پانے کو آتے تھے اور یہاں کے ہندی پنڈت تبت جایا کرتے تھے۔

پروفیسر فرائر کی تحقیق ہے کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کنندہ نہ تھا۔ یہ براعظم اُس سے بہت پہلے دریافت ہو چکا تھا چنانچہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں ذیل کے واقعات بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کئی شہروں کے نام بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً گوٹ مالا جو دراصل گوتم مالا ہے۔ میکروپیری یعنی ساکیا پورہ۔

۲۔ کھنڈرات سے معبد گاہوں اور مندروں کے آثار کثرت سے برآمد ہوئے ہیں۔ بدھ کی بے شمار مورتیاں نکلی ہیں۔ ان میں سے بعض عجائب گھروں میں رکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک مورتی گنیش کی ہے اور ایک مورتی پر نام سکو دی کھدا ہوا ہے جو دراصل ساکیا منی تھا۔

۳۔ قدیم باشندگان کی نسلیں جو اس وقت تک موجود ہیں اپنے پروہتوں کو لاما کہتی ہیں۔

۴۔ اب تک روایت چلی آتی ہے کہ ایک سنت لمبا جامہ پہنے ہوئے ایک ہزار سال ہوئے یہاں آیا تھا وہ ایک اعلیٰ دھرم کا پرچار کرتا تھا اس کے بعد ایک اور سنت بھی اسی وضع کا آیا تھا۔

۵۔ چینی مورخ "ماتالنگ" نے شرح و بسط سے لکھا ہے کہ امریکہ میں بدھ مت کولمبس سے کئی صدیوں پہلے رائج تھا۔ بقول اُس کے کابل سے کوئی بدھ سیاح امریکہ آیا تھا۔ ایک تحریر بھی دریافت ہوئی ہے۔ جو چین کے شاہی خاندان میں نہایت احتیاط سے رکھی ہوئی ہے۔ یعنی کابل کا ایک بودھی گورنر شہنشاہ چین کو لکھتا ہے کہ ایک وسیع ملک دریافت ہوا ہے۔

جہاں خود گورنر گیا اور بدھ ازم کی بنیاد ڈال آیا ہے۔ جس تو دریافت شدہ ملا... کا ذکر اس خط میں درج ہے وہ عین مطابق میکسیکو کے ہوتا ہے یہ خط پانچویں صدی ق م کا لکھا ہوا ہے۔

۶۔ چینی زبان میں امریکہ کا نام فوسنگ ہے۔ کابل کو چینی زبان میں کا فنگ بولتے ہیں۔ ایک بودھی شخص جو کابل کا باشندہ تھا اور جس کا نام ہوئی سین تھا ۴۹۹ قبل مسیح میں چین کے رستہ سے امریکہ پہونچا۔ یہ بودھی سیاح فوسنگ سے واپس آتا ہوا شہنشاہ چین سے ملا اور بہت سے تحائف نذر کئے۔ اس واقعہ کا ذکر بھی شاہی خاندان کے دفتر میں نہایت احتیاط سے رکھا ہوا ہے اور اس وقت تک موجود ہے۔ (مہا بودھی جرنل ۱۹۱۶ء۔ اخبار ملاپ ۲۰ جون ۱۹۲۳ء ، مسٹر ایس و تنا یہ رسالہ ینگ ایسٹ میں لکھتے ہیں (ماڈرن ریویو اپریل ۱۹۲۶ء صفحہ ۴۶۸):-

پیلنکیو میں پتھر کی مورتی ملی۔ دو شیر آگے ہیں پیچھے کے آسن پر بدھ آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اس کے مشابہ مجسمے ہندوستان۔ چین اور جاپان میں بھی ملے ہیں۔ پتھر کی ایک ، فیل ، اور ہاتھی کا پورا سر کندہ ملا ہے۔

کاپنچی میں ایک بڑی مورتی ملی ہے۔ ایک بھکشو اپنے مخصوص لباس میں بیٹھا ہے۔

آزٹک میں ایک مورتی ہاتھی کی شکل کی ملی ہے جو گنیش سے مشابہ ہے

اکسمول اور پیلنکیو وغیرہ مقامات میں دیواروں کے طاقوں میں ہندوستان چین اور جاپان کے بدھ کی مورتیوں کی نقلیں ملی ہیں۔

پیرس کے "انتھرو پولیجیکل سوسائٹی" کے عجائب خانہ میں میکسیکو سے لا کر ایک مورتی رکھی ہوئی ہے جس میں بدھ کو آلتی پالتی کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے دونوں طرف حروف کندہ ہیں۔ اکسمول کی دیواروں پر علم ہیئت کے نقشے اور رموز بنے ہیں جن میں ایک اژدہا بھی دکھایا گیا ہے جو چینی خیال کے مطابق سورج کو نگل جاتا ہے جس کے سبب سے گرہن لگتا ہے۔

مثلاً ان پیلنکیو سے بے شمار مندر اور محل نکلے ہیں جو ایشیا کے مندروں کی عین نقل ہیں خصوصاً جو ہندو شمالی چین منگولیا اور جاوا میں پائے گئے ہیں ان کی اہرامی بنیادیں اور طرز عمارت بودھی طرز ساخت کی شاہد ہے۔

پیلنکیو کے ایک ستون پر کراس کندہ ہے جو بدھ کی علامت ہے۔ میکسیکو کے بعض حصوں میں آرائش و عمارات کی طرز بجنسہ وہی ہے۔ جو ہندوستان اور چین کی کئی عمارتوں میں موجود ہے۔

یہ انکشافات کولمبس کی دریافت سے صدیوں پہلے امریکہ میں بودھوں کا ہونا ثابت کرتے ہیں۔

ہندو سوپر یشن ان آینشنٹ امریکہ مطبوعہ ۱۸۸۹ء "میں لکھا ہے:" زمانہ قدیم میں آریہ لوگ امریکہ میں جاتے تھے جن کے مذہبی نشانات ، مذہب و عمارت و رنگ وغیرہ کے امریکہ میں موجود ہیں۔ آریہ لوگ آریہ ورت سے بحری جہاز براہ جاوا و بالی میکسیکو۔ پیرو۔ وسط امریکہ اور جزیرہ نما یوکاٹن کے ملحقہ علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ آج مغربی محققین بڑے فخر سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ امریکہ کو سب سے پہلے کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ سخت حیرت ہے کہ اگر کولمبس امریکہ کا دریافت کنندہ تھا تو قدیم ہندو تہذیب کے یہ آثار جو پائے گئے ہوئے ہیں یہاں کیوں کر پہنچے۔

امریکہ کے بعد یورپ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ممالک میں بدھ مت کے پیرو پائے جاتے ہیں۔ مثلاً نام ملکا ہونا۔ پڑا۔ تم انوسار سو جیدا قوم کے جرمن تھے جنہوں نے بھکشو بن کر یہ نام اختیار کر لئے۔

"نتا نور" قوم کا ڈچ اور نا آمکا کا شاگرد تھا

"انندماتریا" قوم کا انگریز تھا۔ اس نے انگلستان میں ۱۹۰۸ء میں بودھی سوسائٹی قائم کی اس سوسائٹی نے ۱۹۰۸ء میں ایک سالہ "بدھسٹ ریویو" جاری کیا۔

• "سلکارا" قوم کا اسکاچ تھا۔

پروفیسر سلوان لیوی فرانسیسی تھا۔

• "ڈاکٹر پال دہلکے" جرمن تھا۔

دورہ حاضرہ میں جبکہ کشیدگی زوروں پر ہے۔ ہر زبردست زیردست کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں ہے۔ سائنس کی ارتقائی منازل میں پہنچ کر بعض حریص دنیا کی اقوام محض اپنی ایجادات و اختراعات کے جارحانہ استعمال سے دنیا کو تہ و بالا کر دینے پر تلی بیٹھی ہیں۔ بدھ اور صرف بدھ ہی کا پیغام آشتی اہل دنیا کو اخوت و یگانگی کے سحر کارانہ اقدام سے راہ حیات دکھا سکتا ہے اور موجودہ بہیمیت کو انسانیت و نجابت سے تبدیل کر کے ذہنیت میں ایک ارفع مقام کی خلش بھر سکتا ہے۔ مبارک ہیں بہی خواہان وطن جنہوں نے بدھ مت کی اہمیت کو محسوس کر کے بدھ کا پیغام ہر گوش ہوش تک پہنچانے کی مساعی جمیلہ و سعی جزیلہ کا عہد باندھا ہے۔

پی۔ این۔ کے۔ بامزئی

گاندھارا فن کا ارتقاء

ڈاکٹر بی۔ این۔ پوری نے لکھا ہے۔ "ہم دیکھ چکے ہیں کہ بودھ مذہب کی ترویج کے پہلے دور میں شمالی مغربی علاقوں، خاص طور پر گاندھارا اور کشمیر نے بہت نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ اس لئے یہ بالکل فطری ہے کہ ان دونوں علاقوں کے مبلغین وسط ایشیا اور چین میں اپنے ساتھ ہند یونانی فن کے نمونے بھی لے گئے ہوں گے جو ان کے پاکیزہ جذبات کے اظہار کا واحد ذریعہ تھا۔"

اگرچہ کشمیر براہ راست ہند یونانی سلطنت کے زیر اثر نہیں رہا تھا لیکن یونانی فن کے اثرات اس پر نمایاں تھے۔ بہت زمانے سے اس حسین وادی کے لوگ باکمال دستکاری کی حیثیت سے ساری دنیا میں مشہور رہے ہیں۔ ایک ایسے ملک کی حیثیت سے جن کی صناعانہ صلاحیت پہاڑوں جیسی فطری مناظر کی گہری چھاپ ہے جن کی گود میں وہ سانس لیتے ہیں۔ ان کے ملکی تصوف — کشمیری شیو فلسفہ — نے بھی فن کو اس کی بلند ترین منزل پر پہنچا دیا ہے۔ جیسا کہ ابھی نوتن نے کہا ہے "کسی فن کی تخلیق میں ذات کی آمیزش الوہیت شناسی کی قریب ترین منزل ہے۔"

فن معماری میں باکمال ہونے کی بنا پر کشمیری غیر ملکی لوگوں میں [illegible] یا معمار کے نام سے مشہور رہے ہیں۔ یونانیوں کی طرح انہوں نے فطرت کے مظاہر کو [illegible] بت میں مجسم کیا ہے اور انہیں وہی زندگی اور شوخی عطا کی ہے جو انہوں نے اپنے [illegible] وادی میں دیکھی اور محسوس کی تھی۔ ابتدائی دور کے ان فن کاروں کے مذہبی جوش کا اظہار مندروں اور بتوں کی تعمیر کی صورت میں ہوا۔

قوت کائنات جو شبد، شاکتی وحدت وجود کا مظہر ہے [illegible] پرجا شیو کے نام سے کی جاتی تھی۔ کشمیر کے فن کار بت تراش کو اس سے فیضان ملتا تھا۔ شیو جابر اور جیرو بھی تھے، شفیق بھی تھے اور سب سے زیادہ [illegible] دستکاروں کے [illegible] تھے۔ ماہروں کی کنیا پاروتی سے مل گئے۔ [illegible] کہتے ہیں۔

اس میں بہت ہی گہری اشاریت ہے۔ ہمیں اس کے فلسفیانہ مفہوم کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے تاکہ ہم کہیں اس کی غلط تعبیر نہ کر بیٹھیں کیونکہ ہم یہاں پاروتی کے دیوتا کو تخلیقی قوت سے ہم آہنگ پاتے ہیں [illegible] فطرت کے حسن کو تخلیقی قوت کے سرچشمے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔"

کشمیری فن بت تراشی کا یہ انوکھا اور ترقی یافتہ پہلو وسط ایشیا، تبت اور چین میں پہنچا جہاں بودھ مذہب کے زیر اثر "اولوکیت ایشور" ادھی بدھ اور بے شمار دھیانی بدھ تخریبی اور تخلیقی — دونوں ہی قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وسط ایشیا کے دور دراز کے گوشوں سے لے کر جاپان اور تبت تک میں کشمیری فن کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

چین بودھ یونانی فن سے بہت گہرے طور پر متاثر ہوا ہے — یہ فن وہاں کشمیری اور ہندوستانی مبلغین کے ساتھ ساتھ گیا تھا۔ اب یہ بات پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ اس مدرسۂ فن کی بنیاد گاندھارا میں رکھی گئی۔ گاندھارا فن کی ترقی میں کشمیری فن کاروں کا جو حصہ رہا ہے اسے اس موضوع کے ماہرین ابھی نظر عام پر نہیں لائے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ کشمیر کے آثار قدیمہ کے متعلق معلومات کی ابھی بہت کم یابی ہے، لیکن ابھی حال میں ہرون میں سرخی مائل بادامی رنگ کی مٹی کے بنے ہوئے جو کھپرے اور ٹائیل اور مشکر میں مورتیوں کے جو ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہ خلا بڑی حد تک پر ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں کشمیر اور گاندھارا کے درمیان جو گہرے سیاسی اور تہذیبی تعلقات رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مشہور قدیم یونانی بدھ

فن کی روایت کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے کا فخر بڑی حد تک کشمیر فنکاروں کو ہی حاصل رہا ہوگا۔ اس لئے اس اہم پہلو پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

جب اشوک کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو اس کا اثر ہندوستان کے شمال مغربی صوبے پر بھی پڑا۔ مرکزی قوت چونکہ بہت گھٹ چکی تھی، اس لئے شمال کی جانب سے پنجاب پر پھر حملے ہونے لگے۔ اس بار حملہ آور تہذیبی حیثیت سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ یونانی باختر میں ایک آزاد ریاست قائم کر چکے تھے۔ ہندوستانی سرحد کو عبور کر کے انھوں نے گاندھار کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ باختر کے یہ یونانی ہندوستانی سانچے میں ڈھلتے گئے۔ تبدیلی کا یہ عمل آخرکار ایک ایسے نقطے پر پہونچ گیا کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے یونانی ہندو سماج کا ایک حصہ بن گئے۔ دو قوموں کی اس آمیزش سے ہندوستانی تہذیب اور یونانی تہذیب کا غیر معمولی امتزاج عمل میں آیا جس نے گاندھار کے مشہور مدرسۂ فن کو جنم دیا

جب کدفیس دوئم نے آخری یونانی بادشاہ ہرمیئس کو شکست دے دی تو گاندھار بھی خانہ بدوش کشنوں کے حلقۂ اقتدار میں آگیا۔ کشنوں نے آہستہ آہستہ یونان، پارتھیا اور شک کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو ختم کر دیا اور کنشک کے زیر اقتدار ایک بہت وسیع سلطنت قائم کر لی کنشک کے زیر اثر کشمیر نے جو سیاسی اور تہذیبی کارنامے انجام دیئے، اُن پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ گاندھار کا فن جس پر یونانی اثرات غالب تھے، کشنوں کو بہت پسند آیا۔ کنشک کی سرپرستی میں نہ صرف اس کی بہت ترقی ہوئی بلکہ وہ ہندوستان اور وسط ایشیا میں دُور دُور تک پھیل گیا۔

اس علاقے میں یونانیوں کے پہونچنے سے بہت پہلے ہی گاندھار اور کشمیر میں گہرے سیاسی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ کلہن کی لافانی تخلیق "راج ترنگنی" کا پہلا منظر گاندھار ہی ہے۔ آگے چل کر گاندھار اور وہاں کے برہمنوں کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ کشمیر کی فوج کے لئے گاندھار کے نوجوان سورماؤں کی بہت مانگ تھی۔

"کشمیر میں ابھی حال تک شمال مغربی ہندوستان کے ہند یونانی، پارتھیائی اور ساہی بادشاہوں کے سکّے جتنی کثرت سے ملتے تھے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ دو صدی قبل عیسیٰ مسیح اور پہلی صدی عیسوی میں پشاور اور کابل کی ریاستوں اور کشمیر کے درمیان سیاسی تعلقات نہیں تو گہرے تجارتی تعلقات ضرور تھے۔"

(آر۔ سی۔ کاک، قدیم عمارتیں)

کہا جاتا ہے کہ کشمیر اور گاندھار میں سب سے پہلے بودھ مذہب کی تبلیغ کرنے کا سہرا مبلغ اعظم مدھیانتک کے سر ہے جسے اشوک کے مذہبی مشیر موگلی پُت تیسا نے بھیجا تھا۔ قدیم دستاویزوں میں کشمیر کی سلطنت گاندھار ہی کا ایک حصہ نظر آتی ہے۔ بودھ مذہب کی کتاب میں جہاں سولہ مہاجن پدوں کی فہرست دی گئی ہے وہاں کشمیر گاندھار کو ایک ہی جن پد مانا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک سے پہلے یہ دونوں دیش مل کر ایک سیاسی وحدت کی تکمیل کرتے تھے۔ اشوک کے عہد حکومت میں کشمیر اور گاندھار ایک دوسرے کے اور بھی قریب آ گئے۔ اشوک کی وسیع سلطنت کے خاتمہ کے بعد بھی ان دونوں کے تعلقات قائم رہے۔ گاندھار باری باری سے کشمیر اور پنجاب کا حلقہ بگوش بنتا رہا۔ ممدھی مت آریہ راجہ کے کنارہ کش ہو جانے کے بعد کشمیر کے امراء نے گاندھار سے میگھاواہن کو لا کر کشمیر کا راجہ بنایا۔ اشوک کے بعد بھی کشمیر اور گاندھار ایک ہی سیاسی وحدت کی تکمیل کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یونانی دستاویزوں سے ملتا ہے جن میں کسپ پیرو (کشپ پور، کشمیر) کو گاندھار کا ایک شہر کہا گیا ہے

"ملیندپنہا" میں جس کی تخلیق سن عیسوی کی ابتدا میں ہوئی تھی دونوں ملکوں کو کشمیر۔گندھار کہا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں بودھ مذہب کی کتابوں کے چینی مترجموں نے سنسکرت لفظ "کشمیر" کے لئے چینی لفظ "کپین" کا استعمال کیا ہے۔ "کپین" میں کشمیر کے علاوہ گاندھار اور کپیش گر شامل ہیں مہاومسہ کے ابتدائی بابوں میں سے کسی ایک باب میں دونوں ملکوں کو کشمیر۔گاندھار کہا گیا ہے۔ لیکن ایک دوسرے باب میں جس کا تعلق بہت بعد کے زمانے کے کسی واقعہ سے ہے فقیروں کا ذکر کرتے ہوئے اُنھیں کشمیر کا باشندہ بتایا گیا ہے اس میں بھی کوئی شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلہن نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر کشمیری راجاؤں کے حملوں کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح ہیں۔ یوان چوانگ کے تحریروں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب ٹکسیلا پہونچا تھا تو یہ ملک کشمیر کے ماتحت تھا۔ راج ترنگنی کے مطالعہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وادیٔ کابل کے ساہی

حکمرانوں سے جن کا پایۂ تخت اُدھنڈپور (موجودہ اوہند) تھا، کشمیری راجاؤں کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ وادیٔ کابل کے جو کشن حکمران بعد میں ہوئے۔ اُن کے بہت سے شاہزادوں کو لِلتادتیہ نے اپنے یہاں پناہ دی اور انھیں اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا۔ کشمیر کی بعد کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری راجاؤں نے گاندھارا کے شاہی حکمرانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے بھی قائم کئے۔ اننت دیو (۱۰۲۸ - ۱۰۶۳ء) کے عہد میں ہمیں اُن کے خاندان میں ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں جو ساہی پُتر یا راج پُتر کے نام سے پکارے جاتے تھے اور جو کشمیر کے دربار میں اعلیٰ ترین عہدوں اور ممتاز ترین حیثیتوں کے مالک تھے۔ گاندھارا میں اس سلسلۂ نسب کا آخری خود مختار حکمران تری لوچن پال تھا۔ اسے کشمیر کے راجہ سنگرام راج کی مدد کے باوجود محمود غزنوی کے ہاتھوں بُری طرح شکست کھانی پڑی۔ اُس نے زندگی کا باقی حصّہ کشمیر میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے گزارا۔ چودھویں صدی عیسوی میں سکندر نے کشمیر گاندھارا کو فتح کیا اور اُدھنڈپور کی شاہزادی سے شادی کی۔ مشہور بادشاہ زین العابدین جو کشمیر کا اکبر تھا، اسی شاہزادی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ کشمیر اور گاندھارا کے درمیان اتنے گہرے سیاسی اور تہذیبی تعلقات کے ہوتے ہوئے اس بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ گاندھارا کے مدرسۂ فن نے کشمیری فنکاروں کی چابک دستی کی مدد لئے بغیر ہی ترقّی کی منزلیں طے کی ہوں گی۔ ہزاروں سال سے کشمیری صنّاع اپنے فنکار ہاتھوں سے تیار کی ہوئی خوشنما چیزوں کے لئے مشہور رہے ہیں اور آج بھی سارے ایشیا اور یورپ میں اُن کی شہرت اُسی طرح قائم ہے جہاں یہ بات سچ ہے کہ کشمیر کے قدیم مندروں کے کھنڈروں میں یونانی اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، وہاں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ گاندھارا کا فن کشمیری فنِ مجسّمہ تراشی اور فنِ معماری سے ضرور متاثر ہوا ہوگا

گاندھارا اور کشمیر کی عمارتوں کی تعمیر میں جو مسالے استعمال کئے گئے ہیں۔ اُن کے ناگزیر فرق کو چھوڑ کر دونوں ملکوں کی عمارتیں بالکل ایک سی ہیں۔ کشمیر کی بودھ عمارتوں کا نقشہ اور شاید اٹھان بھی قریب قریب وہی ہے جو اس زمانے کے گاندھارا کی بودھ عمارتوں کا ہے۔

یونانی۔ بودھ فن کی ترقّی میں سب سے زیادہ حصّہ بودھ مذہب مہایان شاخ نے لیا۔ چین کے لوگوں نے اس فن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بے شمار بودھ دیوتا اور دیویوں ۔ اولوکت ایشور، تارا، منجسری کوان یِن، ترے وغیرہ ـــ میں کشمیر اور گاندھارا کے فنکاروں کو فنی تخلیقات کے ایک وسیع میدان مل گیا اور انھوں نے نہ صرف وسط ایشیا اور چین بلکہ جاپان تک کے فنونِ سنگ تراشی پر اپنے گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے۔

آئندہ شمارے کی ایک جھلک

مندرجہ ذیل کرم فرماؤں کے مضامین شائع ہونے کی توقع ہے

خواجہ غلام السیدین	اقبال کے پیغام کی عالمگیری
مولانا نیاز فتح پوری	داستانِ جرم و تعزیر
راجندر سنگھ بیدی	سوانحی اور تاریخی فلمیں
علی سردار جعفری	وجد کی شاعری
اوپندر ناتھ اشک (افسانہ)	نیا ہدایت کار
کوثر چاندپوری (افسانہ)	دودھ کے جھاگ

اس کے علاوہ مقتدر شعراء کی نظمیں اور غزلیں (ادارہ)

مبشر الحق بحری آبادی

مکالماتِ گوتم بدھ

حسبِ ذیل مکالمہ Dialogue of Buddha حصہ دوم کے ایک حصّے کا ترجمہ ہے جسے پالی زبان سے انگریزی میں T. W. Rhys Davids نے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب مہاراجہ سیام کی سرپرستی میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس ترجمے میں حاشیے پر جو نمبر پڑے ہوئے ہیں وہ اصل پالی کتاب کے ہیں۔ (مترجم)

(۲۵-۲۷) پوتھ پد۔ "اچھا حضور، یہ بتائیے کہ کیا عالم ابدی ہے؟ کیا صرف یہی صداقت ہے اور دوسرے خیالات حماقت پر مبنی ہیں؟"

گوتم بدھ "پوتھ پد، یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر میں نے اظہارِ خیال نہیں کیا ہے۔"

تب پوتھ پد نے حسبِ ذیل مزید سوالات کئے۔

"۲۔ کیا دُنیا ابدی نہیں ہے؟

۳۔ کیا دنیا محدود ہے؟

۴۔ کیا دنیا غیر محدود ہے؟

۵۔ کیا روح جسم کی مانند ہے؟

۶۔ کیا روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں ہیں؟

۷۔ کیا جو شخص سچائی کو پالیتا ہے وہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہوتا ہے؟

۸۔ کیا وہ مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوتا؟

۹۔ کیا وہ مرنے کے بعد زندہ بھی ہوتا ہے اور زندہ نہیں بھی ہوتا ہے۔

۱۰۔ کیا وہ مرنے کے بعد نہ تو زندہ ہوتا ہے اور نہ زندہ نہیں ہوتا ہے؟

گوتم بدھ "اے پوتھ پد، یہ ایسے معاملات ہیں جن پر میں نے کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے۔"

۲۸ پوتھ پد "لیکن عالی مقام نے اس پر اظہارِ خیال کیوں نہیں کیا ہے؟"

گوتم بدھ۔ "یہ بے فائدہ سوال ہے اس کا دھرم سے کوئی تعلق نہیں ہے اس سے نہ تو بنیادی خوش اطواری پیدا ہوتی ہے اور نہ آزادیٔ رائے، نہ خواہشاتِ نفسانی سے چھٹکارا ہوتا ہے اور نہ تزکیہ نفس۔ نہ اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے نہ علم حقیقی، نہ مراطِ مستقیم کے بلند مراتب کی کیفیتِ باطنہ کا پتہ چلتا ہے اور نہ نروان حاصل ہوتا ہے۔"

[۱۸۹] ۲۹۔ پوتھ پد۔ "پھر عالی مقام کے کیا خیالات ہیں؟"

گوتم بدھ "پوتھ پد، میں نے دُکھ کی تشریح کردی ہے۔ میں نے دُکھ اور سکھ دونوں کے بارے میں بتادیا ہے اور یہ بھی سمجھادیا ہے کہ کوئی شخص دکھوں سے کس طرح چھٹکارا پا سکتا ہے۔"

۳۰۔ پوتھ پد۔ "مگر عالی مقام نے اس قسم کی بات کیوں بتائی ہے؟"

گوتم بدھ۔ "اس وجہ سے پوتھ پد، کہ ایسا سوال مفید ہوتا ہے۔ اس کا تعلق دھرم سے ہوتا ہے، اس سے خوش اطواری اور آزادیٔ رائے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے خواہشِ نفسانی سے چھٹکارا اور تزکیہ نفس

ہوتا ہے۔ اس سے اطمینان اور علم حقیقی حاصل ہوتا ہے۔ اس سے صراطِ مستقیم کے بلند مراتب کی کیفیت، باطنہ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور نروان حاصل ہوتا ہے۔"

پوتھ پد:- "ٹھیک ہے اے عالی مقام، درست ہے اے خوش و خرم، اب عالی مقام جو مناسب سمجھیں وہ کریں"

(تب عالی مقام اپنی جگہ سے اُٹھے اور وہاں سے چلے گئے)

۳۱ اور عالی مقام جوں ہی وہاں سے گیا بھکشو پوتھ پد پر ہر طرف سے دوسرے بھکشوؤں نے اپنے سوالات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ کہنے لگے "یہ پوتھ پد تو سامان گوتم کے ہر ہر لفظ کی تائید کرنے لگتا ہے۔ "ٹھیک ہے عالی مقام، درست ہے خوش و خرم" اور ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ سامان گوتم نے کوئی ایسا نظریہ بھی پیش کیا ہے جو ان پیدا شدہ دس مسائل سے متعلق ہو"

اور وہ سب لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔

۱۹۰۔ لیکن جب انھوں نے اس طرح کی باتیں کہیں تو بھکشو پوتھ پد نے انہیں جواب دیا۔ "میں یہ نہیں دیکھتا ہوں کہ اس نے ان مسائل کے بارے میں کوئی نظریہ پیش کیا ہے یا نہیں، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ گوتم نے اشیا کی فطرت کے مطابق ایک ایسا مناسب اور ٹھیک طریقہ تجویز کیا ہے جس کی بنیاد کامل دھرم پر ہے۔ پھر میں کس طرح سے اس کی تائید سے انکار کر سکتا ہوں۔" بھکشو نے مکرر کہا کہ "گوتم نے اس نظریے کو کتنی اچھی طرح پیش کیا ہے۔"

۳۲۔ پھر دو تین دنوں بعد مہاوت کا بیٹا کتّا اور بھکشو پوتھ پد، عالی مقام کی قیام گاہ پر آئے۔ وہاں پہنچ کر مہاوت کا بیٹا کتّا عالی مقام کے سامنے جھکا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور بھکشو پوتھ پد، عالی مقام سے پُر وقار، بے تکلفی اور دوستانہ طریقے سے سلام و کلام کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے عالی مقام کو بتایا کہ کس طرح دوسرے بھکشوؤں نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی تھی اور اس نے ان کو کیا جواب دیا تھا۔ تب عالی مقام بولا۔

۳۳ (۱۹۱) گوتم:- "پوتھ پد، وہ تمام بھکشو اندھے ہیں، انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ان میں صرف تمھیں ایک ایسے ہو جس کے آنکھیں ہیں۔ اے پوتھ پد، کچھ باتوں کو تو میں واضح کر دیتا ہوں اور کچھ کو غیر واضح چھوڑ دیتا ہوں۔ تمھارے کئے ہوئے دسوں سوالات کے جوابات میں نے غیر واضح چھوڑ دئے اور اس کا سبب بھی وہی ہے جو میں تمھیں بتا چکا ہوں۔ بنیادی بات تو وہ چار صداقتیں ہیں جن کی میں تشریح کر چکا ہوں۔"

۳۴ (۱۹۲) "اے پوتھ پد، کچھ برہمن اور سامان ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ روح کو مرنے کے بعد ہی مکمل خوشی اور صحت حاصل ہوتی ہے۔ میں ان لوگوں کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ کیا ان کے خیالات ایسے ہی ہیں تو انھوں نے تسلیم کیا کہ ان کے خیالات یہی ہیں اور میں نے ان سے پوچھا کہ کیا دنیا، یعنی دنیا کے باشندے، مکمل خوش ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں"

"تب میں نے ان سے پوچھا، علاوہ ازیں کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود آپ نے ایک پوری رات یا ایک دن، یا آدھی رات یا آدھا دن مکمل خوشی کی حالت میں گذارا ہے۔ اس کا بھی انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں"

"تب میں نے اُن سے کہا کہ "کیا آپ کوئی ایسی ترکیب یا کوئی ایسا طریقہ جانتے ہیں جس کے ذریعے آپ ایسی حالت پیدا کر سکیں جو مکمل خوشی کی ہو" اس پر بھی اُن کا جواب نفی میں تھا۔

"اور تب میں نے اُن سے کہا "اچھا تو کیا آپ لوگوں نے کبھی ان دیوتاؤں کی آواز سنی ہے جو پُرمسرت دُنیا میں یہ کہتے ہوئے دوبارہ پیدا ہوئے تھے کہ "نیک بزرگ آدمیو اور مکمل خوشی کی دنیا میں دوبارہ جنم کے لئے کوشش کرو" تب بھی ان کا جواب 'نہیں' تھا۔"

"پوتھ پد اب اس سے تم کیا سمجھتے ہو، کیا ان سامانوں اور برہمنوں کی بات سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ بے بنیاد خیالات رکھتے ہیں۔"

(۱۹۳، ۳۵) ان کی مثال تو اس آدمی کی طرح ہے جو یہ کہے کہ "میں روئے زمین کی خوبصورت ترین عورت کی بے حد تمنا رکھتا ہوں اور اس سے بے پایاں محبت کرتا ہوں۔" اور جب لوگ اس سے یہ پوچھیں کہ "اچھا دوست، یہ تو بتاؤ کہ وہ خوبصورت ترین عورت جس کی تمھیں تمنا ہے اور جس سے تم محبت کرتے ہو وہ کون ہے؟ کیا وہ کسی معزز گھرانے کی عورت ہے؟ کوئی براہمن ہے؟ کسی تاجر خاندان سے تعلق رکھتی ہے یا کوئی اچھوت ہے؟" "تو وہ اس سوال کے جواب میں کہہ دے کہ "میں تو کچھ نہیں جانتا۔"

"اور تب اس سے پھر پوچھا جائے کہ "اچھا دوست، روئے زمین کی وہ خوبصورت عورت جس کی تمھیں تمنا ہے اور جس سے تم محبت کرتے ہو، کیا تم اس کا نام جانتے ہو؟ اسے پہچانتے ہو؟ اس کے خاندان کے بارے میں تمھیں کوئی علم ہے؟ اس کے قد و قامت کے متعلق کوئی بات معلوم ہے؟ اس کا رنگ کالا ہے کہ گورا یا سانولا ہے۔ وہ کس گاؤں یا قصبے کی رہنے والی ہے یا شہر کی ہے۔" تو وہ ان سوالوں کے جواب میں کہہ دے کہ "مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

"لوگ اس سے پھر کہیں کہ "اچھا دوست، جس کو تم جانتے نہیں ہو، جسے تم نے دیکھا نہیں ہے کیا اس کی تمھیں تمنا ہے اور تم اس سے محبت کرتے ہو۔" تو وہ کہہ دے کہ "ہاں"۔

"تو ایسے شخص کے بارے میں پوٹھ پد تمھارا کیا خیال ہے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ شخص بے عقلی کی باتیں کرتا ہے۔"

(۱۹۴، ۳۶-۳۷) "پوٹھ پد، یہی حالت ان سامانوں اور برہمنوں کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد روح کی تکمیل ہوتی ہے اور اسے مکمل خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک دوراہے پر کھڑا ہو کر ایک بلند مکان پر چڑھنے کے لئے زینہ بنائے اور لوگ اس سے کہیں کہ "دوست جس محل میں داخل ہونے کے لئے تم زینہ بنا رہے ہو کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ مشرق میں ہے یا مغرب میں، شمال میں ہے یا جنوب میں۔ وہ بلند ہے یا پست یا متوسط ہے۔" تو وہ اس کے جواب میں کہے کہ "مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

"تب لوگ اس سے یہ کہیں کہ اچھا دوست تم ایک ایسے محل میں داخل ہونے کے لئے زینہ بنا رہے ہو جس کو نہ تم جانتے ہو اور نہ ہی تم نے دیکھا ہے تو وہ اس کے جواب میں کہہ دے کہ "ہاں"۔

"اب بتاؤ پوٹھ پد، کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ بے عقلی کی باتیں کرتا ہے۔"

پوٹھ پد: "یہ حقیقت ہے حضور، کہ اس قسم کی باتوں سے اس آدمی کی کوتاہ فہمی ظاہر ہوتی ہے۔"

۳۹۔ گوتم: "تو بس اے پوٹھ پد، یہی حال ہے ان برہمنوں اور سامانوں کا، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح کو موت کے بعد مکمل خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں اس وقت کی موجودہ دنیا کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کبھی ایک دن یا آدھے دن پوری طرح خوش و خرم رہے ہوں۔ اور وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس نتیجے پر ایمان لانے کا ان کے پاس کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے۔"

"پھر تم اس کے بارے میں کیا سوچتے ہو پوٹھ پد، کیا ایسی حالت میں ان لوگوں کی باتوں سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ سب بے عقلی کی باتیں کرتے ہیں۔"

پوٹھ پد: "یہی بات تو ہے حضور، کہ ان کی باتیں بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں۔"

۴۰۔ گوتم: "پوٹھ پد، شخصیت کے حسب ذیل تین روپ دنیا میں عام طور سے تسلیم شدہ ہیں:۔

مادی، غیر مادی اور غیر صوری

مادی شے کی تو شکل ہوتی ہے اور وہ چار عناصر سے مل کر بنتی ہیں اور غذا سے ان کی پرورش ہوتی ہے۔ غیر مادی کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ وہ دماغ میں ہوتی ہیں اور ان کے چھوٹے بڑے تمام اجزاء مکمل ہوتے ہیں۔ تیسری غیر صوری صرف خیال کی پیداوار ہوتی ہے۔"

۴۰-۴۴۔ "پوتھ پد، اب میں تمہیں ایک ایسی نصیحت کرتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو بری عادتوں سے بچ جاؤ گے۔ اس سے مانی بہ اصلاح عادات واطوار بڑھ جائیں گے، اور گیان کی کاملیت اور اس کا جاہ وجلال بدیرہ دیکھا اور محسوس کیا جا سکے گا۔"

(۱۹۶) "اسے پوتھ پد، یہ یوں ہو سکتا ہے کہ تم سوچو کہ بری عادتوں کو دور کرنا چاہیئے اور مائل بہ اصلاح عادات واطوار کو بڑھانا چاہیئے اور گیان کی کاملیت اور اس کے جاہ وجلال کو دیکھنا اور محسوس کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی کوئی ہمیشہ رنجیدہ رہتا ہو تو اسے پوتھ پد یہ صحیح فیصلہ نہیں ہے۔ کیونکہ جب یہ شرائط مکمل ہوں گی تب خوشی حاصل ہوگی، سکھ ہوگا، امن ہوگا، مکمل اعتماد اور خود اختیاری ہوگی اور انسان آرام وسکون کے ساتھ رہے گا۔"

(۱۹۷) ۴۳-۵۰۔ "اور باہر والے، اے پوتھ پد، ہم سے اس طرح پوچھ سکتے ہیں کہ "کیوں حضور، مادی (یا ذہنی یا غیر مادی) شخصیت کی وہ کون سی کیفیت ہے جس کو دور کرنے کے لئے آپ ہمیں وہ نصیحتیں کرتے ہیں جن کے ذریعے ایک شخص ان بری عادتوں سے نجات پا جائے گا جن کے خصائل اس نے خود اپنے میں پیدا کئے ہیں اور ان نصیحتوں سے ان کیفیات کا اضافہ ہوگا جن کا میلان طہارت کی طرف ہوگا حتیٰ کہ وہ خود گیان کی نشو ونما اور اس کی کاملیت کو دیکھے اور محسوس کرے۔"

"ایسے شخص کو مجھے یہ جواب دینا ہے کہ کیوں نہیں، وہ شخصیت جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو وہی تو میرا مقصود ہے۔"

۱۹۸ ۔ "اب تم اس سے کیا سمجھے جو مطلب تم نے پیدا کیا اس بات سے اس کی کچھ بنیاد نہیں رہتی"

پوتھ پد۔ "سچ ہے سرکار، ایسا ہی ہے۔"

۴۶ ۔ گوتم ۔ "پوتھ پد، ایسا ہی ہے جیسے ایک آدمی ایک محل کے اوپری حصے میں جانے کے لئے اسی محل کے نیچے حصے میں ایک زینہ بنائے اور لوگ اس سے کہیں "اچھا پیارے دوست، جس محل میں داخل ہونے کے لئے تم زینہ بنا رہے ہو کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ مشرق میں ہے یا مغرب میں یا شمال میں ہے یا جنوب میں، اونچا ہے یا نیچا یا متوسط ہے؟"

"اور جب اس سے ایسا پوچھا جائے تو وہ کہے۔ "واہ، وہ مکان تو یہ سامنے موجود ہے، میں تو اسی کی جڑ میں اس پر چڑھنے کے لئے زینہ بنا رہا ہوں۔"

"اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے پوتھ پد، کیا اس بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اچھی بنیاد پر ہے۔"

پوتھ پد۔ "یہی بات تو یہ ہے حضور کہ اس سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

(۱۹۹) ۴۸ گوتم بدھ۔ "تو اسے پوتھ پد، مجھ سے جب اس قسم کے سوالات کئے جاتے ہیں تو میں ان کا اسی طرح جواب دیتا ہوں۔"

یوآن چانگ

یہ چینی سیاح ہرش کے زمانے میں آیا تھا۔ وہ ہندوستان میں ۶۳۰ء سے ۶۴۳ء تک رہا۔ ہرش سے اس کی ملاقات کجنگل نزد راج محل کے مقام پر اس وقت ہوئی جب وہ اڑیسہ کو فتح کر کے آ رہا تھا۔ وہ اسے قنوج لے گیا جہاں معزز مہمان کے اعزاز میں ایک بڑی مجلس منعقد کی گئی۔ اس مجلس میں ہرش کے باج گزار راجے اور چار ہزار عالم سادھو شامل ہوئے۔ ان میں سے ایک ہزار سادھو نالندہ یونیورسٹی سے آئے تھے۔ یوآن چانگ کو میر مباحثت مقرر کیا گیا تھا۔ اکیس دن تک مذہبی مباحثے جاری رہے۔ اس کے بعد ہرش اپنے مہمان کو پریاگ لے گیا۔ یہاں ہرش نے جو کچھ اس کے پاس تھا دان کر دیا۔ یوآن چانگ کے توسل سے ہندوستان اور چین کے درمیان رابطہ دوستی اور سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔

بال مکند مشر

بدھ اور عورت

عورت دنیا کی عجیب ترین تخلیق ہے۔ مختلف فلسفیوں نے اسے الگ الگ شکلوں میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ اسی طرح مختلف مذہب بھی اس کے لئے الگ الگ جگہ رکھتے ہیں۔ کچھ اسے چھوٹا اور حقیر بتاتے ہیں تو کچھ اسے اونچا اور عظیم۔ ہندو مذہب میں بھی ایک طرف عورت کو جو مرتبہ بخشا گیا ہے اسے تمام امور کے لئے ضروری اور عظیم بتایا گیا ہے۔ تو دوسری طرف اسے روحانی ریاضت کی راہ میں ایک دیوار بتایا ہے، زہر سے تشبیہہ دی ہے، اسے تاریکی اور فریب کے ناموں سے منسوب کیا ہے۔ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کا معاملہ سماجی مفکرین کے سامنے ہمیشہ سے ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ ان میں برابری، برتری یا کمتری نے مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ اسی معاملے نے کبھی کبھی انسان کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اور ایک کو جابر اور دوسرے کو مظلوم بنا دیا اور کبھی کبھی ان دونوں میں وہ ہم آہنگی پیدا کی کہ ترقی کی اونچی اونچی منزلیں طے ہو گئیں۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھرپور ہے جن میں عورتیں بہادری، عقلمندی، فنون لطیفہ اور ایسی چیزوں میں مردوں سے سبقت لے گئیں۔ روحانی سادھنا میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ عورتیں کچھ عظیم شخصیتوں کے سہارے اس قدر آگے بڑھیں کہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے لافانی کر گئیں اور ان کی زندگیاں آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بن گئیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی سنتوں اور رشیوں نے کہا ہے:۔

"عورت ایک غیر معمولی اور بے مثال کشش ہے، اس سے بچو یہ تمہیں منزل مقصود تک پہنچنے نہیں دے گی یہ تمہاری راہ میں چٹان بن کر حائل ہو جائے گی۔"

حالانکہ شاید وہ بھی جانتے تھے کہ عورت سے بچنا آسان نہیں کیوں کہ اس دنیا میں ہمیں لانے والی "ماں" بھی تو آخر کار ایک عورت ہی تو ہے۔

بہت ممکن ہے کہ عورت کی جو یہ دو تصویریں ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں اس کے یہی دو پہلو ہوں جو الگ الگ حالات اور زمانوں میں ابھرتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عورت صرف ان لوگوں کے لئے خطرہ ہو، زہر ہو، تاریکی ہو جو راہ روحانی میں نو وارد ہوں جن میں ٹھوس پن ابھی کچھ نہ ہو اور جو ظاہری حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر گمراہ ہو جائیں اور اس کے برعکس قلبی زور سے معمور شخصیتوں کے سامنے اس کا ظاہری جادو نہ چل پاتا ہو اور اس کی تابانی سے یہ ظاہری اور سطحی تاریکی بھاگ جاتی ہو۔

مہاتما گوتم بدھ کی زندگی میں بھی ایسے بہت مواقع آئے جبکہ حسن و جمال نے ان پر ڈورے ڈالنے چاہے۔ یہ اوقات ان کے امتحان کے تھے لیکن وہ ان سب پر پورے اترے۔ امرپالی اور سوجاتا اور نامعلوم کتنی اور خوبصورت عورتوں کے قصے ان کی ذات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بہت ہی حسین تھی۔ قدرت کی تمام نعمتیں انہیں حاصل تھیں اور انسانی تہذیب و تمدن کے تمام فنون کی بھی وہ ماہر تھیں، اور پھر انہوں نے اپنا سب کچھ بدھ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن بدھ راہ راست سے ڈگمگائے نہیں بلکہ انہوں نے ان کو بھی اپنے نور کے ایسے پارے بخشے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان کی گرویدہ ہو گئیں اور مکمل روحانی زندگی بسر کرنے لگیں۔

گوتم بدھ نے کہیں بھی صاف صاف طور پر عورت کے متعلق کچھ نہیں کہا مگر ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے مطابق ان کے تاثرات سے جگہ جگہ عورتوں کے متعلق ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

بدھ کی زندگی کے حالات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک اصلی گیان کے لئے قدرت کی طرف سے مخصوص تھے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ وہ [illegible]

سے واقف ہوں اور دوسرے لوگوں کو اس سے فیضیاب کریں۔ پیدائش کے آٹھویں دن ان کی والدہ مایا دیوی کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پرورش شاہی طریقے پر ہوئی اور دنیا کی ہر عیش و عشرت انھیں بہم پہنچائی گئی تاکہ انھیں دوسری چیزوں سے اُنس نہ ہو۔ وہ ان سے دل بہلا لیتے، دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ ان کے والد نے انھیں ترکِ دنیا سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنے کے لئے یشودھرا نامی خوبصورت لڑکی کماری گوپا سے ان کی شادی کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ بیوی کا ان پر خوب اثر رہے گا اور انھیں دنیاداری میں پھنسائے رکھے گی۔ شادی کے بعد ان کے یہاں بیٹا پیدا ہونے سے کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس کا نام راہول رکھا گیا۔ یہ راجہ کو یقین ہو گیا کہ سدھارتھ دنیاوی زنجیروں میں جکڑے گئے ہیں مگر سدھارتھ کے سامنے جو مقصد تھا اس کے سامنے یہ چیزیں ان کو روک نہ سکیں یہ ان کی بات نہ تھی۔ ایک رات وہ اپنی پیاری بیوی اور بچے کو سوتا چھوڑ کر محل سے چپکے سے نکل گئے اور اس سب مایا اور تاریکی کے خلاف نورِ حق کے حصول میں لگ گئے۔

انھوں نے تپ کیا اور وہ روشنی حاصل کی جس کی انھیں تلاش تھی۔ اس روشنی کی شعاعیں دور دور تک پھیلنے لگیں اور عوام اس سے فیض پانے لگے۔ اس نئی روشنی کے پھیلاؤ کو ترتیب دینے اور اسے منظم کرنے کے لئے انھوں نے ایک سنگھ (انجمن) کی بنیاد ڈالی تاکہ اس میں بھکشو داخل ہو سکیں اور ان اصولوں پر چل کر عوام کے سامنے ایک نمونہ بن سکیں اور ان کے خیالات کو دور دور پھیلا سکیں۔ اس سنگھ کے دروازے پر کسی قسم کی بندش نہ تھی لیکن اس میں عورتوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ گوتم بدھ سمجھتے تھے کہ عورتیں کمزور ہیں اور دنیاوی معاملات سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتیں، ان کا داخلہ ان کے خیالات کی اشاعت میں نہ صرف حائل ہوگا بلکہ اسے ختم ہی کر دے گا۔

اس کے برعکس مہاتما بدھ کے پیارے شاگرد آنند اس خیال کے تھے کہ عورتوں کو بھی سنگھ میں شامل ہونے کی اجازت ہونی چاہئے۔ وہ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ چل سکتی ہیں اور سماجی قدروں کے انقلاب کی ہر جدوجہد میں شامل ہو کر اسے کامیاب کر سکتی ہیں۔ آنند نے بہت کوشش کی اور بدھ سے التجا کی کہ وہ عورتوں کو بھی سنگھ میں شامل ہونے کی اجازت دے دیں۔ بھگوان بدھ نے ان کی بات مان لی اور اجازت دے دی لیکن کہا۔

"آنند! اگر عورتوں کو سنگھ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی ہوتی تو بدھ دھرم بہت دیر تک قائم رہتا۔ ہزار سال سے بھی زیادہ لیکن اب چونکہ عورتوں کو سنگھ میں آنے کی اجازت دے دی گئی ہے اب یہ دھرم پانچ سو سال ہی قائم رہ سکے گا۔"

گو مہاتما بدھ کا دور عورتوں کی اچھی حیثیت کوئی پوشیدہ نہ ہوئی۔ مہاگوتمی نے جو بدھ مت کی صف اول کی رکن تھیں اپنے کام سے اسے بدل دیا اور بدھ سنگھ کو بہت بڑی ترقی دی۔

گوتمی بھگوان بدھ کی خالہ تھیں اور انھوں نے ہی بدھ کو پالا تھا۔ جب بھگوان بدھ کپل وستو کے لوگوں کو نجات دلانے آئے تو گوتمی ان کی آمد کی خبر سن کر بہت خوش ہوئیں لیکن جب انھیں فقیرانہ لباس میں دیکھا تو بہت دکھی ہوئیں۔ اس کے باوجود انھوں نے استقلال سے کام لیا۔ جب بھگوان بدھ برسات کے موسم میں ویشالی میں ٹھہرے تو گوتمی نے اپنے بال کٹوا دئے، جسم کو ایک معمولی کپڑے سے ڈھکا اور ساکیہ ذات کی عورتوں کے ساتھ ساتھ بھکشو بن گئیں۔ گوتمی نے بھکشونی سنگھ (عورتوں کی انجمن) قائم کیا جو تقریباً ایک ہزار سال چلا اور بدھ مت کے نظریے کے مطابق بھکشونی سنگھ کا اختتام سولہویں صدی کی چوتھی صدی میں ہوا۔

سنگھ میں بہت دل چسپی کے ساتھ عورتیں شامل ہوئیں، بھکشونی بنیں، انھوں نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا کے گوشے گوشے تک بھگوان بدھ کے پیغام کو اچھی طرح سے پہنچایا۔ اس طرح عورتوں نے سنگھ میں ممبریت کی اجازت کے لئے اپنے آپ کو قطعاً اہل ثابت کر دیا اور بدھ کے پیغام کو دائمی بنانے کی پوری کوششیں کیں۔

بدھ کے زمانے میں پردے کا رواج نہ تھا لیکن انھوں نے ایک بار عورتوں کے بارے میں تنبیہ کی کہ عورتیں اپنی زندگی کو سادہ اور پاک بنائیں۔ بھگوان بدھ نے اپنی زندگی کے آخری سال اپنا آخری کھانا ایک باعزت طوائف اور پاک خیال امرپالی کے یہاں کھایا۔

ایک بار آنند سے بات کرتے ہوئے انھوں نے آنند کے سوالات کے اس طرح جواب دئے۔ ان جوابات سے عورتوں کے متعلق ان کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

"بھگوان! ہم عورتوں کی طرف کس قسم کا رُخ اختیار کریں۔"

"آنند! تم اُن کی طرف دیکھو ہی نہیں۔"

"لیکن اگر وہ ہماری طرف دیکھیں تو ہم کیا کریں؟"

"تو تم چپ رہو۔"

"اور اگر وہ ہم سے بولیں تو ہم کیا کریں؟"

"تو تم ہوشیار رہو۔"

ایک اور واقعہ جس سے عورتوں کے متعلق اُن کی رائے پر روشنی پڑتی ہے اناتھ پنڈیک نام کے ایک سیٹھ کے ساتھ گزرا۔ ان کے لڑکے کی بیوی بہت ہی مغرور تھی اور اپنی خوبصورتی کے غرور میں اپنی ساس، سسر اور کسی دوسرے رشتہ دار کا کوئی ادب یا پاس نہیں رکھتی تھی۔ سیٹھ نے اپنی اس پریشانی کا ذکر بھگوان بدھ سے کیا۔ بھگوان بدھ ایک دن اس کے یہاں کھانا کھانے گئے اور موقع پاکر نہایت حلیمی سے اس کی بہو سے بولے:-

"بیٹی تم جانتی ہو اس دنیا میں سات قسم کی بیویاں ہوتی ہیں۔"

بہو نے پوچھا:- "مہاراج کون کون سی؟"

بدھ بولے۔ "پہلی قسم کی بیویاں 'گھاتک' کہلاتی ہیں۔ اُن کا برتاؤ ٹھیک قاتل کا سا ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں روز نئے آشنا کی تلاش کرتی ہیں اور اپنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کرتی ہیں۔"

"دوسرے قسم کی عورتیں چور ہوتی ہیں وہ اپنے مزے اور اپنی ضروریات کو ہی سب سے برتر سمجھتی ہیں اور انھیں برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں ایسی عورتیں خود غرض ہوتی ہیں اور اپنی تمام کاروائیوں کا مرکز وہ خود ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے خاوند سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور انھیں اپنے سکھ اور چین ہی سے غرض رہتی ہے۔"

"تیسری قسم کی بیوی کا اپنے شوہر کے ساتھ آقا کا سا برتاؤ ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو نوکر سمجھتی ہے۔"

"چوتھی قسم کی عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ ماں کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی تمام ضرورتوں کو سمجھتی اور پورا کرتی ہیں۔"

"پانچویں قسم کی عورتیں اپنے شوہر سے بہن کا سا برتاؤ کرتی ہیں اس سے پاک اور سچی محبت رکھتی ہیں اور شرم اور پریم کا مجسمہ ہوتی ہیں۔"

"چھٹی قسم کی بیویاں اپنے خاوند کو دوست سمجھتی ہیں اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کی عزت کرتی ہیں اور اس کے دکھ درد میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔"

"ساتویں قسم کی عورتیں اپنے آپ کو خاوند کا غلام سمجھتی ہیں اور اس کی ہر خدمت بجا لاتی ہیں وہ اپنا سب کچھ اپنے شوہر پر قربان کر دیتی ہیں اور اس کی سیوا اپنا دھرم سمجھتی ہیں"

بھگوان بدھ نے یہ سب بتانے کے بعد پوچھا۔ "بتاؤ بہو تم کیسی بیوی بننا چاہتی ہو؟"

مغرور حسینہ بھگوان کے چمکتے نور کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ ان کے اُپدیش کے سامنے اس کا غرور پانی پانی ہو گیا اور اس نے ان کے پاؤں پر اپنا سر جھکا دیا۔

بھگوان بدھ نے کہا۔ "من صاف رکھو ڈرو مت۔"

اُس مجسمۂ حسن نے کہا۔ "بھگوان آج تک میں اندھیرے میں تھی اب آپ نے مجھے راستہ دکھا دیا ہے مجھے ساتویں قسم کی بیوی بننا پسند ہے میں وہی بنوں گی اور گھر والوں کی خدمت ہی میں نروان (نجات) پاؤں گی۔"

بھگوان بدھ نے اُسے اشیرواد دیا اور چلے گئے۔ اس واقعہ سے گوتم بدھ کے نفسیاتی مطالعے اور معاملات سلجھانے کے انوکھے ڈھنگ کا پتہ چلتا ہے ⁂

ریئر ایڈمیرل رام داس کٹاری

ریئر ایڈمیرل رام داس کٹاری نے ۲۔ اکتوبر کو فلوٹیلا کے پہلے ہندوستانی فلیگ آفیسر کا چارج لے لیا موصوف کو اس امتیاز کا فخر حاصل ہے کہ وہ تعلیمی زندگی میں ہمیشہ اوّل رہے اور اپنے پیشے کے مشاغل میں بھی اول ہی رہے ہیں۔ آپ کے چند امتیازات حسب ذیل ہیں:- وہ ایڈمیرل بننے والے پہلے ہندوستانی ہیں۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے جولائی۔ اگست ۱۹۵۲ء میں بحریہ کے کمانڈر انچیف کی قائم مقامی کی تھی۔

عابد سہیل

گوتم بُدھ کا فلسفۂ اخلاقیات

ہندوستان کی زندگی، ثقافت اور علم و ادب کی طرح فلسفہ سے بھی یورپ نے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے۔ ہندوستان کے فلسفہ کی قدر و قیمت متعین کرنے میں یورپ کے مفکروں نے ہمیشہ جانبداری سے کام لیا ہے۔ پروفیسر فرینک تھلی تاریخ فلسفہ میں رقمطراز ہیں۔

"تاریخ فلسفہ میں تمام ممالک کے فلسفہ کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ لیکن تمام ممالک کے لوگوں نے باقاعدہ مدارسِ فکر کو جنم نہیں دیا اور چند ہی ممالک ایسے ہیں جن کے فلسفہ کی باقاعدہ تاریخ ملتی ہے۔ چینیوں، ہندوؤں اور عراقیوں کی پروازِ فکر چند توہماتی کہانیوں اور چند اخلاقیاتی ضوابط تک محدود ہے اس کے علاوہ انھوں نے کوئی باقاعدہ نظامِ فکر نہیں پیش کیا۔"

یہ الزام کس قدر غلط اور جہالت پر مبنی ہے اس کا اندازہ صرف ہندوستان کے فلسفہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہندوستان نے فلسفہ کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جن کو کوئی بھی فلسفے کا طالبعلم نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں بدھ ازم اور جین ازم ایسے مبسوط نظامِ فلسفہ اس وقت بھی موجود تھے جب یورپ میں فلسفہ نے آنکھ کھولی تھی۔ اُپنشدوں کی تاریخِ تحریر کے بارے میں اختلاف ضرور ہے لیکن خود یورپ کے علما نے ان کو چار ہزار سال قدیم تک بتایا ہے اس سلسلے میں جیکوبی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی مدارسِ فلسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ناستک اور آستک۔ آستک اسکول وہ کہلاتے ہیں جو اپنے فلسفہ کا جواز اُپنشدوں پر رکھتے ہیں ان میں سانکھ، یوگ، نیائے اور ویدانت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ناستک اسکول وہ ہیں جو اپنے فلسفے کی بنیاد اُپنشدوں پر نہیں رکھتے ہیں ویسے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ناستک اسکول اُپنشدوں کے اثرات سے بالکل آزاد رہے ہیں لیکن پھر بھی ان میں اُپنشدوں کے اثرات مقابلتاً کم ملتے ہیں۔ ان میں جین اور بدھ واد خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان کے فلسفے کا تعلق یہاں کی زندگی سے نہایت گہرا رہا ہے۔ یورپ کے برخلاف ہندوستان میں مختلف مدارسِ فکر کی ترویج و ترقی متوازی طور پر اور ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ ایک ہی وقت میں نیائے، بدھ واد اور دوسرے مدارس نے فروغ پایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں فلسفہ چند اصولوں، باریک بینیوں اور ذاتیات پر منحصر نہیں تھا بلکہ راست باز اور پاک زندگی اور سچائی کے حصول کا دوسرا نام تھا۔ یہاں کے فلاسفہ کے قول و فعل میں فرق نہیں پایا جاتا۔ گوتم بدھ نے جو پیغام دیا خود بھی اس پر عمل کیا۔ اس طرح یہاں کے فلسفہ اور زندگی میں ایک گہرا اور اٹوٹ تعلق ملتا ہے۔

آج سے دو ہزار سال قبل پانچ سو ترسٹھ ۵۶۳ء قبل مسیح میں کپل وستو کے قریب لمبنی نامی مقام پر گوتم بدھ کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت اس کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔ اس کی پیدائش کے سات ہی روز بعد ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اُسے سوتیلی ماں نے پالا پوسا۔ اس کی پیدائش کے وقت ہی نجومیوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ یہ بچہ بڑا ہو کر دُنیا کے عیش و آرام کو تج کر فقیرانہ زندگی گذارے گا۔

اسی خیال کے تحت اس کی شادی کم سنی ہی میں یشودھرا نامی ایک لڑکی سے کر دی گئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام راہل رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اس کو لڑکے کی پیدائش کی خبر ملی وہ غور و فکر کی دنیا میں مستغرق تھا۔ یہ خبر سن کر اُس نے کہا "یہ ایک اور بندھن

ہے جیسے توڑتا ہے" چنانچہ اس نے محل کی آرام دہ زندگی کو چھوڑ کر راہب بن جانے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں سچائی کی جستجو کرنے والوں کا یہ دستور تھا کہ وہ عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر راہبانہ زندگی گذارتے اور اپنے جسم کو طرح طرح کی اذیت اور ایذا پہونچاتے۔ فلسفہ سے مایوسی کے بعد بدھ نے اب یہ راستہ اختیار کیا۔ اس وقت اس کے ساتھ پانچ شاگرد تھے۔ گوتم نے اپنے ان شاگردوں کے ساتھ اذیت کوشی شروع کردی اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ ضرور سچائی کے حصول میں کامیاب ہوگا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور اپنے جسم کو طرح طرح کی تکالیف دیں۔ وہ روز بروز کمزور ہوتا گیا اور ایک رات، تو مہاتما بدھ کی حالت نہایت خراب ہوگئی۔ اس حالت میں بھی اگر سچائی اور حقیقت خود کو اس پر منکشف کر دیتی تو شاید وہ اذیت کوشی جاری رکھتا لیکن روح کا سکون میسّر آنا تو دُور کی بات وہ تو اس سے لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتا جا رہا تھا۔ عیش و آرام، دولت و حشمت کی بے مائگی سے وہ پہلے ہی بدظن ہو چکا تھا علم و دانش نے اس سلسلہ میں اس کی ذرا بھی رہنمائی نہ کی اور اذیت کوشی نے روح کے سکون اور سچائی کو اس سے اور بھی دُور کر دیا۔

حقیقت کا وہ متلاشی بھلا راستے کی ان دقتوں سے مایوس ہونے والا کب تھا۔ اس نے تو سچائی کو جاننے کا پکّا ارادہ کر لیا تھا اور اس کے لئے اس نے ایک نیا طریقہ آزمایا۔ مشرق کی جانب منہ کر کے وہ ایک برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اُس نے اعلان کر دیا "میں اس درخت کے نیچے سے اس وقت تک، نہ ہلوں گا جب تک کہ مجھے حقیقت اور سچائی کا علم نہیں ہو جائے گا" اور جوئندہ یابندہ کی مصداق حقیقت نے خود کو اس پر منکشف کر ہی دیا۔ ایک ایسے وقت جب کہ ذہن کسی مسئلہ کے حل میں بُری طرح محو ہوتا ہے۔ حقیقت دھیرے دھیرے خود کو منکشف کرتی ہے اور ذہن ان کامیابیوں سے بے خبر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ پھر یکلخت ایک ہی لمحہ میں مجاز کے تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں اور حقیقت سچائی اور اصلیت سامنے کھڑی ہوئی مسکراتی ہیں۔ ایسے ہی محویت کے ایک عالم میں سچائی، حقیقت، اور روشنی نے خود کو اس کے سامنے عریاں کر دیا۔ اس انکشاف حقیقت کی وجہ سے اس درخت کا نام بودھی ترا The Tree of Intelligence پڑا۔ اس کی اس کامیابی کے بعد ہی اس کے شاگردوں کا حلقہ بڑھتا گیا۔ اس کے وہ شاگرد جنھوں نے اس کی ترک اذیت کوشی پر ساتھ چھوڑ دیا تھا پھر اس سے آملے۔ گوتم بدھ کا پیغام سارے ہندستان میں اس کونے سے اُس کونے تک پھیل گیا۔ اس کے تجربات نے اسے چار ایسے اصول فراہم کئے جن پر اس کے فلسفہ اخلاق کی بنیاد پڑی۔ یہ چار اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) زندگی میں دُکھ اور مصائب ہیں (۲) لاعلمی ان مصائب کی بنیاد ہے (۳) ان مصائب اور دُکھوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے (۴) سچے علم اور حقیقت کے حصول سے ان سے نجات ممکن ہے۔

دُکھ اور مصائب سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اسباب ہیں اور جن چیزوں کے سبب اور وجوہ موجود ہیں۔ ان وجوہ کو ختم کرنے سے وہ چیزیں بھی ختم ہو سکتی ہیں۔ پہلا اصول یہ کہتا ہے کہ یہ ساری زندگی، اور اس سے ہمارا لگاؤ مصائب کے علاوہ اور کچھ نہیں بیماری، بڑھاپا اور حد یہ ہے کہ پیدائش تک دُکھ ہی کے مظہر ہیں۔ اس دُنیا میں رہ کر خواہشات سے نجات حاصل کئے بغیر مسرت اور حقیقت کی جستجو لایعنی ہے۔ لیکن اس کے باوجود گوتم بدھ پر یاسیت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا اس لئے کہ اس نے اس سے نجات کا بھی طریقہ بتایا ہے

دوسرے اصول کے مطابق ان مصائب اور دُکھوں کی وجہ لاعلمی اور جہالت ہے۔ حقیقت سے لاعلمی ہی ان مصائب کو دعوت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہماری آرزوئیں اور خواہشات ختم ہو جائیں تو پھر ہم کو نہ کسی چیز کی تمنّا ہو گی اور نہ اس کے عدم حصول کا غم

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتا (میرؔ)

ہمارے مقصود کا وجود غیر مستقل، وقتی اور لمحاتی ہے اور اس کی یہ غیر مستقل کیفیت ہی ان مصائب اور ناکامیوں کا سبب ہے۔ اس لمحاتی کیفیت اور اصولِ وجود منحصر Principle of Dependent Origination کا تعلق نہایت گہرا اور قریبی ہے۔ گوتم بدھ کے خیال میں بڑھاپے اور موت کا انحصار پیدائش پر، پیدائش کا انحصار

گذشتہ زندگی پر، گذشتہ زندگی کا انحصار تعلق یا لگاؤ پر، اور تعلق یا لگاؤ کا انحصار مس حس پر اور مس حس کا تعلق دماغ اور جسم پر، دماغ اور جسم کا انحصار شعور پر، شعور کا انحصار رجحان پر اور رجحان کا انحصار جہالت اور لاعلمی پر ہے۔ اگر اس لاعلمی کو روکا جا سکے یا اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے تو رجحان اور اگر رجحان زیر نگیں ہو جائے تو جسم اور دماغ پر قابو پایا جا سکتا ہے اور اس طرح بڑھاپے موت، دنیا کے تمام مصائب، موت و زیست کے مستقل چکر سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے تیسرے اصول کے مطابق ان مصائب سے نجات ممکن ہے اور چوتھا اصول یہ بتاتا ہے کہ ان سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے اور وہ طریقہ علم اور بصیرت میں مضمر ہے۔ مہاتما بدھ کے فلسفۂ اخلاقیات کو سمجھنے کے لئے ان دونوں اصولوں کی مکمل توضیح ضروری ہے ہندوستان کے تمام فلاسفہ نے ایک مستقل، ہمیشہ قائم رہنے والی اور دائمی 'ذات' میں یا 'ایغو' Ego کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کیا ہے۔ برخلاف اس کے گوتم بدھ کے فلسفہ نے اس 'ذات' کے وجود کی صاف اور بدیہی الفاظ میں تردید کی ہے۔ دراصل ایک مستقل ذات کا تصور ہی ہماری خواہشات کو جنم دیتا ہے۔ اگر 'ذات مستقل' Self کا کوئی وجود ہی نہیں تو پھر 'میں' 'تو' کا جھگڑا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ چارواک کے علاوہ ہندوستان کے تمام فلاسفر نے کرم کے اصول کو بلا کسی حیل و حجت کے تسلیم کر لیا ہے۔ کرم کے اصول کے مطابق انسان کے افعال اس کی موجودہ اور آنے والی زندگی کی تشکیل اور تعین کرتے ہیں۔ گوتم بدھ نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیلات دوسرے فلاسفر سے قدرے مختلف اور انوکھی ہیں۔ دوسرے مذاہب فکر کے مطابق ہمارے تمام افعال زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھے قضایا کا اثر اچھا اور بُرے قضایا کا اثر بُرا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے گوتم بدھ نے قضایا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ عفیف اور غیر عفیف۔ عفیف افعال وہ ہیں جو انسان کی زندگی پر ذرا بھی اثر نہیں ڈالتے۔ زندگی کی تشکیل اور تعین میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا اور یہ افعال سچائی کے ان چار اصول پر مبنی ہوتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ غیر عفیف افعال وہ ہوتے ہیں جو زندگی کی تشکیل اور تعین کرتے ہیں۔ عفیف اور غیر عفیف کا یہ فرق نہایت باریک ہے اور بدھ کے فلسفۂ اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ غیر عفیف افعال یقینی طور پر بُرے ہی نہیں ہوتے۔ یہ افعال اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ غیر عفیف افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غیر عفیف افعال نیک اور غیر عفیف افعال بد۔ غیر عفیف افعال نیک وہ ہیں جو ہم جذبات یا خواہشات کے زیر اثر، یا ان کے غلام ہو کر نہیں کرتے ان افعال سے موت اور زندگی کے چکر (بھاؤ چکر) سے نجات حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے برخلاف اس کے غیر عفیف افعال بد وہ ہوتے ہیں جو ہم اپنے جذبات اور خواہشات سے مغلوب ہو کر انجام دیتے ہیں۔ یہ افعال اس زندگی سے ہمارا جذباتی لگاؤ زیادہ گہرا اور دیرپا کر دیتے ہیں۔ یہ افعال نروان کے حصول کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔

گوتم بدھ نے موت اور زندگی کے چکر اور خواہشات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ راست انتظامی Right Discipline انہماک Concentration اور دانائی Wisdom بتایا ہے۔ راست انتظامی کو سنسکرت میں سیلا کہتے ہیں۔ سیلا پر عمل کرنے سے ہماری تمام خواہشات رجحانات اور لگاؤ کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ سیلا ایک ابتدائی اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہماک یا سمادھی میں انسان تمام دل پسند اور دل پذیر چیزوں کی طرف سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ خورد و نوش کی اشیا کی طرف اس کی کوئی خاص دلچسپی باقی نہیں رہتی اپنی خواہشات کو وہ دوسروں کی خواہشات کے برابر ہی نہیں سمجھتا بلکہ ان کو دوسروں کی خواہشات پر قربان بھی کر دیتا ہے۔ دوسروں کے بُرے افعال بھی اُسے بدظن نہیں کرتے اور وہ سچائی کے ان چاروں اصولوں کے تحت زندگی گذارتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ افعال جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کسی قسم کے اثرات نہیں چھوڑتے لیکن موت اور زندگی کا چکر اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ قدیم غیر عفیف افعال کے نتائج پورے نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد ہی نروان حاصل ہو جاتا ہے۔

ڈھائی ہزار سال قبل گوتم بدھ نے انسانیت کو جو پیغام دیا تھا آج بھی اس پر عمل کر کے ہم اس دنیا کو جنت نظیر بنا سکتے ہیں۔ اپنی خوشی کو دوسرے کی خوشیوں پہ قربان کر دینا اور خود غرضی سے اجتناب ایسی صالح اقدار ہیں جن پر بڑی حد تک ہمارے سماجی روابط کا دار و مدار ہے۔ ہندوستان نے ہمیشہ امن، آشتی اور بے غرض خدمت کا پیغام دیا ہے۔ گوتم بدھ کا پیغام ہندوستان کے اس عام رجحان کی نمائندہ مثال ہے۔

موسیقی نمبر کے باب میں

ڈاکٹر سید محمود وزیر امورِ خارجہ حکومت ہند

آپ نے موسیقی پر اس قدر پُر از معلومات اور دیدہ زیب نمبر نکالا ہے کہ آپ کی کاوش و تفتیش اور حسنِ ترتیب کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

میری دانست میں اتنا مکمل اور اتنا خوبصورت موسیقی نمبر اُردو ادب میں اب تک شائع نہیں ہوا تھا جس میں معاصرت کے بڑے بڑے ماہرینِ موسیقی اور سازنوازوں کے مضامین تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

راگ اور راگنیوں کے تصویری خاکے عام پڑھنے والوں کے لئے دلچسپ اور معلومات کا ماخذ ہوں گے۔

میری طرف سے اتنے اچھے خاص نمبر کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔

نواب سید رضا علی خاں بہادر نواب آف رام پور

"آج کل" کا موسیقی نمبر موصول ہوا۔ اس کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت اچھا نمبر نکالا ہے۔ بلاشبہ یہ موسیقی کے شیدائیوں میں مقبول ہوگا۔ میں شکرگزار ہوں کہ اس نمبر میں آپ نے میرا مضمون بھی شائع کیا۔

مولانا نیاز فتح پوری

آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوقِ انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے یہ خصوصی نمبر نکال کر موسیقی کے متعلق اتنی مفید معلومات فراہم کر دی ہیں کہ آج ان کی بنیاد پر اچھا خاصا تحقیقی کام بھی کیا جا سکتا ہے۔

آل احمد سرور جنرل سیکرٹری انجمن ترقی اُردو ہند

"آج کل" کا موسیقی نمبر ایک کارنامہ ہے۔ اُردو ادب میں فنِ موسیقی کے متعلق عام فہم انداز میں ایسے اچھے مضامین اور ممتاز موسیقاران کے متعلق ایسی معلومات مشکل سے کہیں اور یکجا ہوئی ہوں گی۔ خسرو کے متعلق مضامین بھی بہت اچھے ہیں۔ اس معیاری اور جامع نمبر پر آپ تمام اردو داں طبقے کے شکریے کے مستحق ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر اور بھی مسرت ہے کہ "آج کل" آپ کی ادارت میں اور بھی دلکش ہوتا جاتا ہے۔

شوکت تھانوی

"آج کل" کا موسیقی نمبر ایک رسالے کا خاص نمبر نہیں بلکہ ایک فن پر ایک مستقل سرمایہ ہے۔ اس دور میں جب کہ علوم و فنون پر مستند کتابیں مفقود ہیں، آپ نے آج کل کے اس نمبر کو ہر کتب خانے کے لئے ایک نادر نسخہ دے دیا ہے۔

ممتاز حسین

مجھے یاد نہیں کہ اُردو کے کسی ادبی رسالے نے اب تک کوئی موسیقی نمبر بھی نکالا ہے۔ اس کی اوّلیت کا سہرا بھی آپ کے رسالے کے سر جاتا ہے۔

انڈین پی ای این (انگریزی)

رسالہ "آج کل" دلی نے اب کے سال اپنا سالنامہ یعنی اگست ۱۹۵۶ء کا شمارہ بطور موسیقی نمبر پیش کیا ہے جو ایک نہایت ہی کامیاب اور کارآمد

کوشش ہے۔ اس نمبر میں ہندوستانی موسیقی کے مختلف گھرانوں اور مایہ ناز موسیقاروں کے بارے میں مستند مضامین شامل ہیں۔ بیشتر مضامین خود ماہرین موسیقی کے ہیں اور اس لئے علمیت اور بصیرت کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں۔ علاوہ ازیں موسیقی کے متعلق قدیم مصوری کے تین نمونے اور موجودہ مشہور فن کاروں میں سے تقریباً سبھی کی تصویریں بھی اس شمارے کی دید زیبی کو دوبالا کرتی ہیں۔ غرض کہ ۷۰ صفحوں میں فن موسیقی سے متعلق اتنا مواد مہیا کر دیا گیا ہے جو عوام و خواص دونوں ہی کے ذوق کی تسکین کے لئے کافی ہے۔

تمکین کاظمی

موسیقی نمبر دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ واللہ گمان تک نہ تھا کہ ایسا نفیس، ایسا عظیم الشان، اتنا ٹھوس اور اس قدر دلچسپ موسیقی نمبر مرتب ہو سکتا ہے۔ آپ نے کمال ہی کر دیا۔ اس مبارک نمبر کی جس قدر داد دوں کم ہے۔ اُردو میں اتنا مواد آج تک مرتب نہیں ہوا تھا۔

جوہر قریشی چیف ایڈیٹر ندیا بھوپال

میں موسیقی کے علم اس کے نشیب و فراز اور اس کی تاریخ سے قطعی نابلد تھا لیکن آپ کے موسیقی نمبر کے مطالعہ کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ موسیقی کے بارے میں اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ضرور جاننے لگا ہوں۔ اس سے زیادہ کامیابی آپ کی کاوشوں کی اور بھی کیا سکتی ہے۔

روزنامہ 'طلاپ' حیدرآباد دکن

'آج کل' سرکاری پرچہ ہے مگر شروع سے ہی اس کے عام پرچے دوسرے عام پرچوں سے اور اس کے خاص نمبر دوسرے پرچوں کے خاص نمبروں سے بہتر پائے گئے ہیں۔ اس کی ادارت قابل ہاتھوں میں رہی ہے۔ ادبی بحث مباحثے عام معلوماتی، تاریخی، جغرافیائی اور سائنسی مضامین نہایت اعلیٰ پایہ کے ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ 'آج کل' اپنے رنگ کا ایک خاص پرچہ ہے جو ادب و علم اور شعر و شاعری کی خدمت کے ساتھ ساتھ ملک اور قوم کی بھی خدمت کرتا ہے۔ اس کے بہت سے خاص نمبر ہماری نظروں سے گزرے ہیں مگر اس وقت جو نمبر زیر تبصرہ ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے مدیر نے اس وشوار اور اہم میدان میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کی۔ موسیقی ایک ایسا فن ہے جسے سمجھنے اور اس پر تبصرہ کرنے کے لئے ماہر فن ہونا لازمی ہے۔ عام قسم کے گیت گا لینا، آواز کے زیر و بم سے عام آدمیوں سے خراج تحسین حاصل کر لینا اور بات ہے مگر موسیقی کی گہرائیوں میں اُتر کر اس پر ہر لحاظ سے قابل تعریف نمبر مرتب کرنا اور بات ہے۔ قابل مدیران 'آج کل' کو مضامین کی فراہمی اور مواد کے ڈھونڈنے میں جو دقت پیش آئی ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ممکن ہے فلک موسیقی پر پرواز کرنے والے اس نمبر کو ہر لحاظ سے مکمل اور جامع نہ پائیں مگر توزن قائم ہے اور ایک عام آدمی بھی اس کے مطالعہ سے نہ صرف فن موسیقی کی تاریخ سے کما حقہ واقفیت حاصل کر سکتا ہے بلکہ فن موسیقی سے بھی کافی سوجھ بوجھ پیدا کر کے فن کاروں میں نو نہیں فن داں تو میں ضرور قدم رکھ سکتا ہے۔

سیاست حیدرآباد دکن

گورنمنٹ آف انڈیا کے پبلی کیشنز ڈویژن کی جانب سے شائع ہونے والے رسالہ 'آج کل' نے اپنا خصوصی موسیقی نمبر نکالا ہے جو محض ایک رسالے کا خصوصی نمبر نہیں بلکہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ موسیقی نمبر بلا شبہ اردو ادب میں موسیقی سے متعلق ادب کی کمی کو بڑی حد تک دور کرے گا۔ اس شمارے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں موسیقی پر پہلی مرتبہ ایک معیاری چیز شائع ہوئی ہے۔

لکھنے والوں میں یہاں ہندوستان کے مشہور اور ممتاز موسیقار ہیں وہیں اردو کے ادیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ نواب صاحب رام پور ہز ہائی نس سید محمد رضا علی خاں نے بھی ایک مضمون لکھا ہے۔

ایڈیٹر آج کل نے توزن قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر مضامین معلومات آفریں ہیں: 'فن موسیقی اور اس کے کچھ بڑے فن کار' 'مجھے اب تک یاد ہے' 'تان سین' 'فن موسیقی کے عظیم استاد جنہیں میں نے سنا' اور ایسے ہی دیگر مضامین ان لوگوں کے لئے جو فن سے ناواقف ہیں دلچسپی کا موجب ہیں۔

مدیران آج کل قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے موسیقی پر ایک معیاری خاص نمبر نکالا ہے۔



KEEPING BALANCE DURING PREGNANCY

سنکارا

تمام خاندان کیلئے ایک ٹانک

قیمت بڑی بوتل ۷ روپے۔ ادھا ۳ روپے ۱۲ ر

● حاملہ کو یہ نہ بھولنا چاہیے۔ کہ اُسے دو زندگیوں کی پرورش کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی خوراک غذائیت سے پُر ہونی چاہیے۔

آجکل ناکافی غذائیت کی خرابی عام ہے سنکارا اس خرابی کو دُور کرتا ہے اور دورانِ حمل میں خوراک کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ جسم کو توانا اور صحت مند رکھتا ہے۔

"سنکارا" ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

● ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔

Hamdard
DAWAKHANA TRUST DELHI

کام کرنے کی قوّت



قوت کا مطلب کام کرنے کی طاقت ہے ہندوستان کو اپنے دوسرے پانچسالہ پلان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ طاقت کی ضرورت پڑے گی. ہندوستان کے کارخانے و صنعتیں چلانے کیلئے کوئلہ، بجلی اور تیل سے حاصل شدہ طاقت ہندوستان کی جملہ طاقتوں کے لحاظ سے نسبتاً نہایت کم ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہ طاقت ہندوستان کی زندگی کے دینی طریقوں اور مُلک کے دُور دراز دیہاتوں کی زندگی پر اپنا اثر ڈال رہی ہے۔

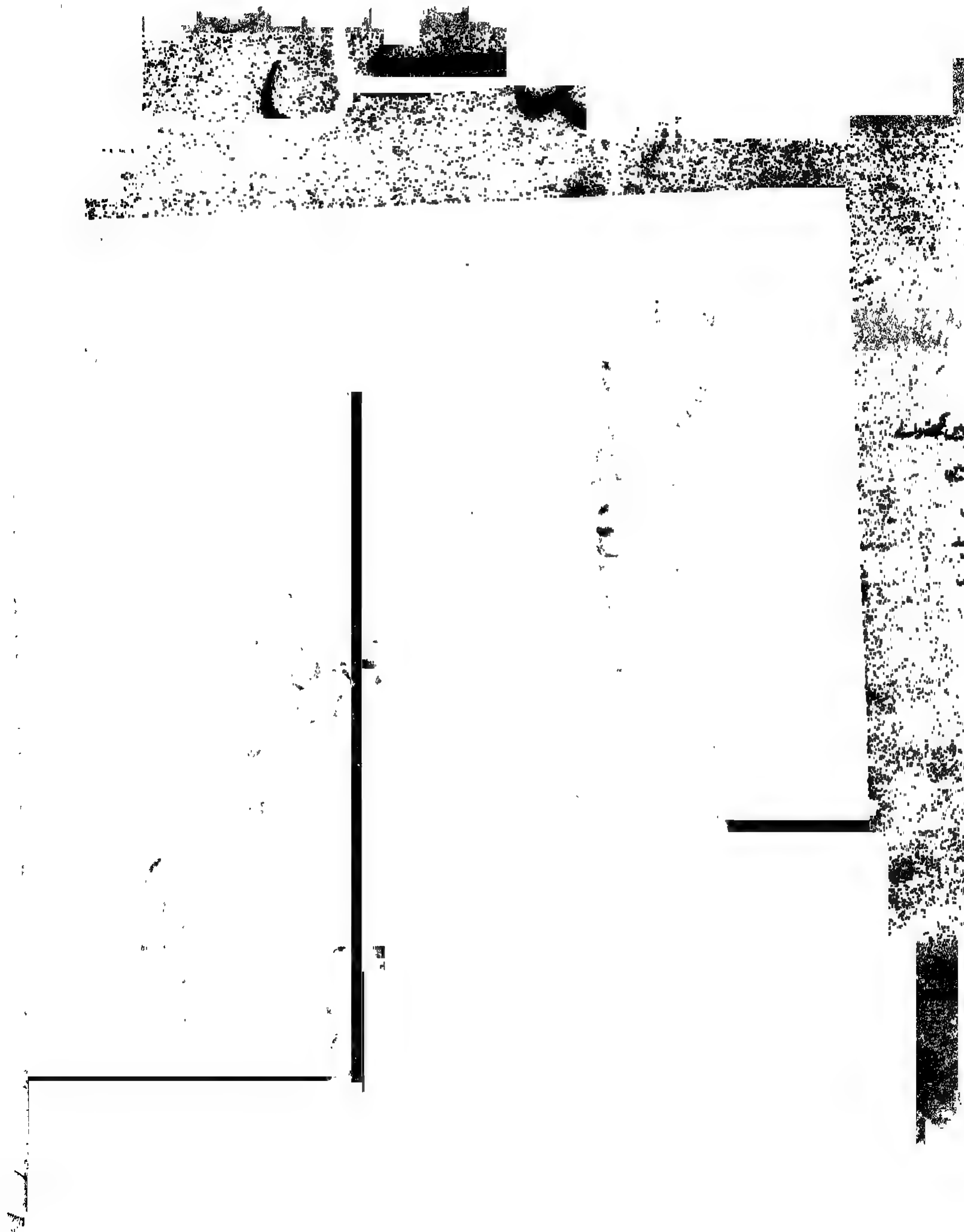
یہ کارخانے و صنعتیں چلانے والی طاقت کی امداد میں تیل کا حصہ ۱۹۴۸ء کی بہ نسبت ... فیصدی زیادہ ہوگیا ہے. تیل حسبِ ضرورت کام آنے والا طاقت کا ایک ذریعہ ہے. دراصل تیل طاقت کی ایک مجتمع ٹھوس شکل ہے جو آسانی سے ہر جگہ منتقل ہوسکتی ہے. تیل سے پیدا ہونیوالی ان طاقتوں کو ملک کے ہر حصے میں باقاعدگی کے ساتھ سستے داموں کافی مقدار میں پہنچانے کے لئے تقسیم کرنے والے عملہ کو قائم کرنا اور اس کو وسیع کرنا ہمارا کام ہے۔

ہر مشین... ہندوستان کی زندگی کا ایک حصہ ہے





Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.



اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں:۔ چھ روپے
پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ ہندوستان میں:۔ آٹھ آنے
پاکستان میں:۔ آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی

ترتیب

سرورق:۔ کورگ کا ایک منظر — عمل۔ جے بھٹا چاریجی

جلد ۱۵ — نمبر ۶

جنوری سنہ ۱۹۵۷ء

مُلاحظات

مصر اور ہنگری کی سرزمین پر بدیشی فوجوں کے تاخت و تاراج کی کہانیاں ابھی ختم تو نہیں ہوئیں لیکن یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ برطانوی اور فرانسیسی فوجیں مصر کی سرزمین کو چھوڑ کر زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ع چہ لاکارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اقوامِ متحدہ کے دستوں نے جن میں ہندوستان کے فوجی دستے بھی شامل ہیں مصر میں برطانوی اور فرانسیسی فوجوں سے چارج لینے میں قابلِ تعریف خدمات ادا کی ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ مصری فوج کے دستے ناچتے گاتے پورٹ سعید میں داخل ہو کر بین الاقوامی فوج سے انتظام سنبھال رہے ہیں۔ مختلف ممالک سے صدر ناصر کو تہنیتی پیغام آ رہے ہیں۔ بھارت اور چین نے اس معاملے میں مصر کی جو خدمت کی ہے مصری اخبارات نے اس کی تعریف کی ہے۔ پنڈت نہرو کو انھوں نے بالخصوص خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

افسوس کہ ہنگری کا معاملہ ابھی تک خاطر خواہ طریق سے نہیں سلجھا لیکن امید کی جا سکتی ہے کہ دیگر پُرپیچ مسائل کی طرح یہ بھی سُلجھ جائے گا۔

پنڈت نہرو اور پریزیڈنٹ آئزن ہاور کے درمیان تبادلۂ خیال نے ہندوستان اور امریکہ میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دُور کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملاقات سے امنِ عالم کو زیادہ سے زیادہ استقامت حاصل ہونے کے امکانات ہیں۔

اِدھر جب کہ دنیا کی بڑی طاقتیں جدال و قتال کی تیاریوں میں مصروف تھیں ہند نہ صرف سیاسی میدان میں امن کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا بلکہ اس میں انسانی علم و تہذیب کے سب سے بڑے ادارے یونیسکو کا اجلاس بھی ہو رہا تھا۔ نومبر میں سرزمینِ ہند پر پہلی بار یونائٹڈ نیشنز کے تعلیمی، سائنسی اور کلچرل ادارے کا اجلاس منعقد ہوا۔ ہند کے وزیرِ تعلیم اور ملک کے پرانے مایۂ ناز رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کو اتفاقِ رائے سے دو برس کے لئے یونیسکو کا صدر چنا گیا۔ ہمارے نامور ماہرِ تعلیم اور عالم ڈاکٹر ذاکر حسین یونیسکو کے انتظامی بورڈ کے رکن منتخب ہوئے۔ ہند کی پیشوائی میں ایشیائی افریقی اور جنوبی امریکی ملکوں کی یہ تجویز بھی منظور ہو گئی کہ یونیسکو کے بجٹ میں دس لاکھ ڈالر کا اضافہ کیا جائے اگرچہ دنیا کے تین سب سے بڑے ملک امریکہ، روس اور برطانیہ اس تجویز کے موافق نہیں تھے۔ اجلاس کے دوران میں کئی ملکوں کے نمائندوں نے کہا کہ یونیسکو انسانیت کا جیتا جاگتا ضمیر ہے لہٰذا اسے جارحانہ کارروائیوں کے خلاف آواز اٹھانی چاہیئے۔ لیکن اکثریت نے فیصلہ کیا کہ یونیسکو کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیئے۔

اس تاریخی اجلاس سے قبل ہی دلّی میں موسمِ سرما کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی جس میں علمی و فنی سرگرمیاں پیش پیش تھیں۔ وزارتِ تعلیم نے یونیورسٹیوں کے سالانہ میلے کا انتظام کیا جس کے دوران میں ہند کی ساری یونیورسٹیوں کے طلبا و طالبات جمع ہوئے۔ اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ ہند کے مختلف حصوں کے طلبا ایک دوسرے کے خیالات، احساسات، علم و فن، کلچر اور روایات سے بخوبی واقف ہوں۔ کچھ اپنی کہیں کچھ دوسروں کی سنیں اور قوم کے سامنے اپنے جوہر اور کمال دکھا سکیں۔ اس سلسلے میں محکمۂ نشر و اطلاعات نے اوّل کم سن اور ہونہار بچوں کا مقابلہ اور بعد میں ریڈیو سنگیت سمیلن منعقد کیا۔ وزارتِ تعلیم نے بھی نمایندوں کی دل بستگی کے لئے دیگر باتوں کے علاوہ مختلف علمی و فنی نمائشوں کا انتظام کیا جن میں ساہتیہ اکاڈمی کی کتابوں کی نمائش، حکومتِ ہند کی بدھ کلا کی نمائش اور 'بھارت درشن' PAGEANT OF INDIA اور امریکی دفترِ اطلاعات کی 'خاندانِ آدم' FAMILY OF MAN نامی نمائش خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کاٹھمنڈو کی عالمی بدھ کونسل کے بعد دلّی میں بھی "بدھ دھرم کا صحیح اثر" کے موضوع پر ایک مباحثہ منعقد ہوا جس میں شریک ہونے کے لئے اقوام سے بدھ عالموں کے علاوہ تبّت سے دلائی لاما اور پنچن لاما اور سکّم سے مہم بھی تشریف لائے۔

اِدھر کشمیر کی آئین ساز اسمبلی نے کشمیر کے آئین کی ہر دفعہ پر غور کر کے اسے منظور کر دیا اور صدرِ ریاست نے بھی اس پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی۔ ہندوستان کا الحاق اب ہر لحاظ سے مکمل اور مستحکم ہے۔ لارڈ ایٹلی سابق پرائم منسٹر برطانیہ حال ہی میں ہندوستان کی سیاحت سے واپس گئے ہیں، ایک بیان میں فرمایا ہندوستان کے ساتھ الحاق کے باب میں قطعی فیصلہ کر چکا ہے۔ انھوں نے کہا کشمیر نے تعلیمی، مجلسی اور سیاسی ہر اعتبار سے ترقی کی ہے۔ معمولی گاؤں سے حکومت کے ایوانِ اعلیٰ تک جمہوری نظام قائم ہے۔ توسیع و ترقی کے پراجیکٹ شروع ہو رہے ہیں جن سے ریاست کی زرعی اور معاشی ترقی کی رفتار اور تیز ہو جائے گی۔

ڈاکٹر سید عابد حسین

وحدت میں یہ دُوئی کیوں — ؟

مندرجہ ذیل مضمون ایک باب ہے OUTLINE OF THE CULTURAL HISTORY OF INDIA کا، جسے حیدر آباد کے مؤقر علمی ادارے INSTITUTE OF INDO-MIDDLE-EAST CULTURAL STUDIES نے ہندوستان بھر کے منتخب فضلاء کے تعاون سے مرتب کیا ہے اور عن قریب شائع کرنے والا ہے۔ ہم اسے ادارے کی اجازت سے اور اس کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

دو تہذیبی جماعتوں کے ایک دوسرے سے سابقہ پڑنے اور ایک دوسرے پر اثر ڈالنے کی شہادت یوں تو سبھی تہذیبی مظاہر میں ملتی ہے لیکن غالباً سب سے زیادہ وثوق کے ساتھ اس کی گواہی ان دونوں کی زبانیں دیتی ہیں۔ جتنا زیادہ گہرا اثر دو جماعتوں کی زبانوں کا ایک دوسرے پر نظر آئے اتنا ہی قریبی تہذیبی تعلق ان دونوں جماعتوں میں فرض کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ اگر دو زبانوں کے میل سے ایک تیسری زبان بن گئی تو ہم بے تامل اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ کھچڑی زبان ایک مخلوط تہذیب کی آواز ہے۔

مسلمانوں کے ہندوستان سے سابقے کا پہلا دَور ساتویں صدی عیسوی کے آخر سے شروع ہُوا جب کہ عرب تاجر جنوبی ہند کے جزیرہ نما میں مشرقی اور مغربی ساحل پر آباد ہونے لگے۔ آٹھویں صدی کے شروع میں مسلمان عربوں نے سندھ اور ملتان پر حملہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کی اور اُن کا اثر گجرات اور کاٹھیاواڑ تک پھیل گیا۔ اس سابقے کی نشانی علاوہ اور چیزوں کے جنوبی اور مغربی ہند کے ساحلی علاقے کی زبانوں میں بہت سے عربی الفاظ کی موجودگی ہے جو بظاہر فارسی کے ذریعے شمالی ہند سے ہوتے ہوئے نہیں آئے ہیں بلکہ براہِ راست "عربی" سے لئے گئے ہیں۔ اگر اس زمانے (یعنی آٹھویں صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی تک) کے سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ، اور جنوبی ہند میں آباد ہونے والے عربوں کی تحریریں ملیں تو شاید تصویر کا دوسرا رُخ بھی نظر آئے کہ اُن کی عربی میں مقامی زبانوں کے الفاظ داخل ہو گئے تھے۔

مگر اس سابقے کا جو مسلمانوں کو ہندوستان سے پڑا، دوسرا دَور جو گیارھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ یہ دَور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے لئے پہلے دَور سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ اس دوسرے دَور میں پنجاب سے لے کر بنگال کی سرحد تک اور ہمالیہ سے لے کر وسط ہند اور دکن کی سطح مرتفع تک ایک بڑے وسیع علاقے میں نو وارد ترک اور ایرانی مسلمانوں کے تہذیبی تعلّقات پُرانے باشندوں کے ساتھ رفتہ رفتہ گہرے ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ دو تہذیبوں کے ملنے سے ایک تیسری تہذیب وجود میں آگئی۔ اس تہذیب کا عکس سب سے زیادہ اور سب سے صاف ہندی اردو، ہندوستانی زبان میں نظر آتا ہے۔ اس لئے اس زبان کی نشو و نما کی کہانی تہذیبی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے نہایت دل چسپ ہوگی۔ ہم یہ کہانی نہایت اختصار سے چند صفحوں میں لکھنے کی کوشش کریں گے۔

گنگا اور جمنا کے بیچ کا خطہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ جو مدھیہ دیش کہلاتا ہے شمالی ہند کا دل ہے۔ ہرش وردھن سے لے کر آخری راجپوت راجہ جے چند کی وفات تک چند سو سال کے عرصے میں مختلف حکمران خاندان قنوج کی راجدھانی سے اس علاقے پر بلکہ اکثر اوقات کل شمالی ہند پر حکومت کرتے رہے اور یہاں کی زبان مختلف مقامی بولیوں کے پہلو بہ پہلو شمالی ہند کی مشترک زبان رہی۔ یہ زبان جو پہلی، دوسری اور تیسری پراکرت کے واسطے سے نکلی تھی، "شورسینی اپ بھرنش" کہلاتی تھی اور گجرات و مغربی پنجاب سے لے کر

انتشار کا نتیجہ تھی ایک نئی تہذیبی صورت حال کو پیدا کر دیا تھا یعنی اس مغربی تہذیب سے جو انگریزوں کے ساتھ آئی تھی شمالی ہند کی مشترک "ہندوستانی تہذیب" کو جو مغلوں کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی، بڑا خطرہ تھا اور اس خطرے کو ہندو مسلمان سب بہت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

"انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر دونوں کو خطرہ پیدا ہُوا کہ کہیں سبھی ہندوستانیوں کی رُوحیں غلامی کی زنجیر میں نہ جکڑ جائیں اس بحران کی حالت میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہُوا کہ اپنی اخلاقی مزاحمت کی قوّتوں کو مضبوط کرنے کے لئے ان کو اپنے تہذیبی اور مذہبی احساس کے سرچشموں کی طرف لوٹنا اور ان سے فیضان اور تقویت حاصل کرنا چاہیئے۔ اس مقصد میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی لیکن ماضی بعید کی طرف دیکھنے کا ایک ناگوار نتیجہ ہُوا اور وہ یہ کہ ماضی قریب اور اس کی سب سے زیادہ اہم پیداوار مشترک تہذیب کی اہمیت ان کی نظروں میں کم ہوتی گئی یہاں تک کہ ایک چھوٹی سی جماعت کو چھوڑ کر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اس تہذیب کو جو کئی صدیوں کی کوشش کے بعد اسلامی اور ہندو عناصر کی ترکیب سے بنی تھی رد کر دیا اور یہ اندیشہ پیدا ہُوا کہ وہ اپنے عناصر میں تحلیل ہو کر رہ جائے گی۔"[1]

جو تہذیبی تفریق ہندو مسلمانوں میں اس طرح پیدا ہوئی تھی اس کا اثر سب سے زیادہ زبان کے معاملے میں ظاہر ہُوا۔ بول چال کی زبان تو آسانی سے نہیں بدلا کرتی، لیکن ادبی زبان میں دوئی کے رجحانات نظر آنے لگے۔ بہت سے ہندو فارسی رسم خط چھوڑ کر ناگری رسم خط میں لکھنے لگے اور کھڑی بولی یا ہندوستانی سے فارسی عربی لفظوں کو نکال کر سنسکرت الفاظ استعمال کرنے لگے اور اس طرح انھوں نے ادبی ہندی یا اعلیٰ ہندی کی بنیاد ڈالی۔ باقی ہندو اور کل مسلمان بدستور فارسی رسم خط میں لکھتے رہے۔ ان کی تحریروں میں عربی فارسی الفاظ کا تناسب بڑھنے لگا، ان کے ہاتھوں کھڑی بولی ہندوستانی پیرا اردوئے معلیٰ کی شکل اختیار کرنے لگی۔ اس طرح لسانیات کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مظہر کی نمود ہوئی کہ جو چیز عام لسانی قوانین کی رُو سے ایک ہی زبان تھی وہ صرف رسم خط اور اونچے الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے عملی مقاصد کے لئے دو زبانوں اُردو اور ہندی میں تقسیم ہو گئی۔

اب ہم چند لفظوں میں اس کا ایک خاکہ کھینچتے ہیں کہ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اردو اور ہندی کے اندر ادب کی نشو ونما کس طرح ہوئی اور ان دونوں نے ہندوستان کے علمی و ادبی خزانے کو کیا دیا۔

انیسویں صدی کے شروع تک اردو شاعری جس نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو موضوع بیان، طرز ادا، تشبیہات و استعارات اور عروض غرض ہر پہلو سے فارسی کے سانچے میں ڈھال لیا تھا بعض چیزوں کے لحاظ سے بہت کچھ ترقی کر چکی تھی۔ شاعرانہ اظہار کے آلے کی حیثیت سے اس نے ایک حد تک پختگی حاصل کر لی تھی۔ اس کے اندر تصوّف یعنی مذہبی عاشقانہ شاعری اور تغزّل یعنی غنائی عاشقانہ شاعری کا بیش بہا ذخیرہ موجود تھا جو ولی، میر، سودا، درد، حسن، انشا، مصحفی جیسے استادانِ فن کے کلام پر مشتمل تھا۔ مگر چوں کہ اردو شاعری کی نشو ونما مخاطب پذیر شاہی درباروں کے سائے میں ہوئی تھی اس لئے اس کے اندر بعض خامیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ قصیدے نے جو بادشاہوں اور امیروں کی بے خلوص تعریف کا ذریعہ تھا ایک مستقل صنفِ شاعری کی حیثیت حاصل کر لی تھی، ہجو طنز کے بجائے پست مذاق کی گالی گلوج بن گئی تھی۔ منظر نگاری، دیہاتی رومانی زندگی کی عکاسی، قصصی شاعری، عوامی گیت اردو میں نہ ہونے کے برابر تھے۔

انیسویں صدی کے بڑے حصّے میں اُردو شاعری مجموعی طور پر اسی ڈھرے پر چلتی رہی جو اس نے اٹھارھویں صدی میں اختیار کر لیا تھا۔ البتہ اتنا فرق تھا کہ تغزّل کا مذاق بڑھ گیا اور تصوّف کا مقابلتاً کم ہو گیا۔ مگر تغزل و تصوّف کے محدود میدان میں بھی بڑے بڑے اُستادوں مثلاً ناسخ، آتش، غالب، مومن، ذوق نے انسانی فطرت کے نازک جذبات کی مصوّری کا حق ادا کر دیا اور دستور و روایات کے تنگ دائرے کے اندر صناعانہ احساس و اظہار میں اپنا اپنا انفرادی رنگ پیدا کر لیا۔ ان کی بدولت اردو شاعری کے لب و لہجے میں زیادہ سنجیدگی، وقار اور فکر میں زیادہ باریکی اور گہرائی آ گئی۔ اس کے علاوہ اس دور میں موضوع شاعری کی تنگی میں کچھ وسعت پیدا ہوئی اور اس نے نئے میدان گھیر لئے۔ انیس و دبیر جیسے باکمال فن کاروں نے مرثیے کو جو رزمیہ اور ماتمی شاعری کا ایک مخصوص مرکّب تھا، فروغ دیا اور نظیر اکبرآبادی نے ہندوستانی عوام کے راحت و الم، ان کے ارمانوں اور حوصلوں کے گیت گا کر اور اُن کے کاموں اور مشغلوں تفریحوں اور تیوہاروں کے

---

[1] قومی تہذیب کا مسئلہ از ڈاکٹر عابد حسین

مناظر دکھا کر شاعری کو اجتماعی زندگی کا آئینہ بنا دیا اور اس طرح وہ نئی شاعری کے نقیب بن گئے۔

انیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیوں سے لے کر آج تک ایک طرف داغ، امیر، صفی، ثاقب، حسرت، فانی، جگر نے پرانی اردو شاعری کی خصوصیات، عاشقانہ احساس کی گہرائی اور اظہار کی شدت کو باقی رکھا۔ دوسری طرف حالی، آزاد، چکبست نے نئی شاعری کا پرچم لہرایا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ طرزِ ادا میں زیادہ سادگی، بے تکلفی اور اصلیت، اور موضوعِ بیان میں وسعت پیدا ہوئی یعنی شاعری صرف انفرادی جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ فطرت کی عکاسی، زندگی کی ترجمانی، قومی اور وطنی جذبات کی علم برداری بھی کرنے لگی۔ نئی شاعری نے ملک کو ایک طنز و ظرافت کا بادشاہ اکبر، ایک فلسفی شاعر اقبال، اور ایک باغی شاعر جوش دیا۔

پچھلی تین دہائیوں سے نئی شاعری نے ترقی پسند یعنی انقلابی اشتراکی شاعری کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے سب سے ممتاز نمایندے ہندوستان میں علی سردار جعفری اور پاکستان میں فیض ہیں۔

اردو نثر کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک وہ صرف تھوڑی سی مذہبی کتابوں اور چند قصے کہانیوں تک محدود تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں خاصے بڑے پیمانے پر آسان اردو (ہندوستانی) میں پرانے طرز کے افسانے، تاریخ، سوانح عمری وغیرہ کی کتابیں لکھوائی گئیں اور سنسکرت اور فارسی کی مستند کتابوں کے ترجمے کرائے گئے۔ اسی زمانے میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے کلام مجید کے ترجمے اردو میں کئے اور اس کے تھوڑے دن بعد سید احمد بریلوی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی نے اردو نثر کو اپنی زبردست مذہبی و سیاسی تحریک کا ذریعہ بنا دیا۔ عیسائی مبلغوں نے بھی اردو میں بائبل کے ترجمے اور تبلیغی رسائل شائع کرنے شروع کئے۔ دلی کالج میں جو جدید علوم کی تعلیم کے لئے دہلی میں قائم ہوا تھا مختلف مضامین کے نصاب کی کتابیں اردو میں لکھوائی گئیں۔

آسانی اور سلیس اردو نثر کا یہ سلسلہ (ایک درمیانی دور کے سوا جس میں رجب علی بیگ سرور اور لکھنؤ کے دوسرے مصنفوں نے اردو نثر کو آخری عہد کی اغلاق پذیر فارسی نثر کے نمونے پر مقفّیٰ مسجّع اور رنگین بنانے کی کوشش کی) برابر جاری رہا۔ غالب کے خطوط اور سرسید کی تحریریں اس سلسلے کی اہم کڑیاں

ہیں۔ سرسید اور اُن کے ساتھیوں حالی، شبلی، نذیر احمد اور ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد نے اردو کو علمی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسے جدید ادبی تنقید، روشن خیال مذہبی لٹریچر، تاریخ اور سیرت نگاری سے مالامال کر دیا۔ آگے چل کر سرسید کے کام کو انجمن ترقی اردو نے مولوی عبدالحق کی رہنمائی میں جاری رکھا اور ایک محدود پیمانے پر وہ آج تک جاری ہے۔

عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار نے اردو میں جدید طرز کی ناول نگاری کی بنا ڈالی۔ جس پر پریم چند، مرزا محمد ہادی رسوا اور مرزا محمد سعید نے ایک عالی شان دار عمارت کھڑی کر دی۔ مختصر افسانہ نویسی نے بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور پریم چند سے لے کر علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر تک متعدد اچھے لکھنے والے پیدا کئے۔ ڈرامے نے اردو میں مقابلتاً کم رواج پایا۔ یوں تو مقدار کے لحاظ سے ناٹکوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے مگر ان میں سے بہت کم ادبی یا فنی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ پرانے طرز میں کامیاب ڈرامے لکھنے میں تھیٹر کی کمپنیوں کے بعض ڈرامہ نگار خصوصاً آغا حشر نے کامیابی حاصل کی اور نئے طرز کے ڈرامے کا اچھا نمونہ امتیاز علی تاج نے پیش کیا۔

طنز نگاری اور مزاح نگاری کا سلسلہ سجاد حسین اور اودھ پنچ کے دوسرے مضمون نگاروں نے شروع کیا جس کی آخری کڑی رشید احمد صدیقی ہیں۔ ادبی تنقید نگاری میں شبلی اور حالی کے بعد مولوی عبدالحق اور مرزا جعفر علی خاں اثر نے خاصا اونچا معیار قائم رکھا جسے آج آل احمد سرور اور احتشام حسین سنبھالے ہوئے ہیں۔

اردو نثر کے خزانے میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کے ترجمے سے معقول اضافہ ہوا ہے۔ سید علی بلگرامی سے لے کر مولوی عنایت اللہ اور ڈاکٹر عابد حسین تک بہت سے مترجموں نے اردو کے دامن کو مغربی ادب و علوم و فنون کی کتابوں اور عزیز مرزا نے سنسکرت ادب کے ترجموں سے بھر دیا۔

تقسیمِ ہند کے بعد متعدد وجوہ کی بنا پر جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں اردو نثر پر ایک جمود کا دور گزر رہا ہے۔ تنقیدی ادب کی پیداوار تو جاری ہے لیکن تخلیقی ادب کے سوتے خشک نظر آتے ہیں۔ یقین ہے کہ اس جمود کی عارضی وجوہ کے دور ہو جانے کے بعد یہ چشمے پہلے سے زیادہ تند و تیز ہو کے

اُبھرنے لگیں گے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس مشترک مخلوط زبان نے جو شمالی ہند میں صدیوں سے نشو و نما پا رہی تھی دو الگ الگ اسلوب اور الگ رسم خط اختیار کئے اور گویا دو ذیلی زبانوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کا نام اونچی ہندی، ادبی ہندی قرار پایا اور آگے چل کر ہندی رہ گیا اور دوسری کا "اردو"۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اردو ادب کا ارتقاء دکھانے کے بعد ہم چند لفظوں میں یہ بتائیں گے کہ اس عرصے میں ہندی ادب کی نشو و نما کا کیا حال رہا۔

جدید ہندی شاعری کا آغاز دراصل انیسویں صدی کی تیسری چوتھائی سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اب ہندی نثر کی طرح اس نے بھی اپنا ذریعۂ اظہار کھڑی بولی کو بنایا۔ لیکن چوں کہ خالص کھڑی بولی میں شاعری کا قدیم ورثہ محض برائے نام تھا اس لئے اس نے شمالی ہند کی چار اور بولیوں ڈنگل (قدیم راجستھانی)، پنگل (برج بھاشا) اودھی اور میتھلی کے سات سو برس کے خزانے کو اپنا لیا جس میں چند اور دوسرے شاعروں کی رجزیہ اور رزمیہ نظمیں، ہندی اسلامی تصوف کے علم برداروں جائسی وغیرہ کی تراوشِ فکر، رام بھگتی اور کرشن بھگتی کے علم برداروں نام دیو، نانک، کبیر، ودیا پتی، نندداس، میرا بائی، رس کھان کے محبت و عقیدت کے نغمے، تلسی داس اور سورداس کے زندۂ جاوید کارنامے، رحیم، کیشو، بہاری، بھوشن، دیو، رتنا کر کا مرصع کلام شامل ہے۔ ان خالص ہندی زبانوں کی بحریں ان کے الفاظ اور ترکیبیں، تشبیہات، استعارات اختیار کرنے کی وجہ سے ہندی شاعری اردو شاعری سے جس نے سب کچھ فارسی سے لیا تھا اس سے بھی زیادہ دور ہو گئی جتنی ہندی نثر اردو نثر سے تھی۔

ہندی شاعری کے جدید دور کا آغاز بھارتیندو ہریش چندر سے ہوتا ہے، جنھوں نے بھگتی کے موضوع کو عاشقانہ سطح سے اُبھار کر روحانی عاشقانہ سطح پر پہنچایا۔ ہندوؤں کو اُن کی پستی پر غیرت دلائی اور ترقی پر اُبھارا اور ان رجحانات کو رواج دینے کے لئے ایک تحریک اُٹھائی اور ایک حلقے کی بنیاد ڈالی جس میں بہت سے شاعر شامل تھے۔

بھارتیندو ہریش چندر اور اُن کے ساتھی برج بھاشا میں شعر کہتے تھے شری دھر پاٹھک جدید دور کے پہلے ہندی شاعر تھے جنھوں نے کھڑی بولی کو اختیار کیا اور اردو طرز میں قطعے اشعار کہے۔ مگر ایودھیا سنگھ اپادھیائے نے کھڑی بولی ہندی شاعری کا ذریعہ سنسکرت بلکہ ورس کو بنایا اور سنسکرت کے لفظوں اور ترکیبوں کی بھرمار کر دی۔ کلاسیکل طرز کے سب سے بڑے شاعر میتھلی شرن گپت ہیں۔ لیکن ان کے ہاں نئے جاگتے ہوئے ہندوستان کی رومانی روح کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ رومانی شاعری کے بانی جے شنکر پرشاد ہیں اور ان کے بعد ہندی شاعری نے عام طور پر رومانیت کی لے اختیار کی جس میں سبھدرا کماری چوہان کے ہاں وطن پرستی کا، سمترا نندن پنت کے ہاں حسنِ فطرت اور حسنِ انسانی سے خالص جمالیاتی لطف اندوزی کا، مہادیوی ورما کے ہاں باطنی وجد کا، بچن کے یہاں مایوسی اور تقدیر پرستی کا، بھگوتی چرن ورما کے ہاں تلخ سماجی اور معاشی حقیقتوں پر غم و غصے کا اور دنکر کے ہاں ان تلخ حقیقتوں کے باوجود اُمید اور عقیدے کا سُر غالب ہے۔ اُردو شاعری کے برعکس ہندی شاعری میں ترقی پسندی اشتراکی انقلابی شاعری نے زیادہ فروغ نہیں پایا اور کوئی قابلِ لحاظ شاعر پیدا نہیں کئے۔

نثر کا حقیقی طلوع ہندی میں بھی اردو کی طرح فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے سلسلے میں انیسویں صدی کے آغاز میں ہوا اس حلقے کے لکھنے والوں کی زبان بول چال کی ہندوستانی یعنی "آسان اردو" سے بہت قریب ہے۔ ان کے بعد عیسائی مبلغوں نے سیرامپور کے پریس سے اور ان کی تعلیمی سوسائٹیوں نے مرزا پور، آگرہ وغیرہ سے ہندی میں بائبل اور بائبل کے ترجمے اور دوسری مذہبی کتابیں اور مختلف علوم و فنون کی درسی کتابیں شائع کیں۔ راجا شیو پرشاد نے بھی درسی کتابیں لکھ کر اور "بنارس اخبار" جاری کر کے ہندی نثر کی بڑی خدمت کی۔ لیکن ان کے یہاں بھی ہندی زبان ایسی ہے کہ اس میں اُسے ہندوستانی شکل سے امتیاز ہو سکتا ہے۔ مگر اسی زمانے میں ہندی میں سنسکرت کی بھرمار کرنے کا رجحان بھی شروع ہو گیا جس کا نمونہ تارا چند مترا کا اخبار "سدھا کر" تھا۔

مستند ادبی کتابوں کی ابتدا بھی ہندی میں بھارتیندو ہریش چندر سے ہوئی۔ جو ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ بڑے پایے کے نثر نگار تھے انھوں نے بہت سی تاریخ کی کتابیں، سوانح عمریاں اور ڈرامے لکھے۔ کئی میگزین جاری کئے اور ایک بڑا ادبی حلقہ بنا کر ہندی زبان کی ترقی میں اتنی مدد دی جس کی قدر و قیمت اندازے سے بڑھ کر ہے۔ زبان کے بارے میں مجموعی طور پر انھوں نے سنسکرت آمیز ہندی اور فارسی اردو کے بیچ میں ایک معتدل رنگ اختیار کیا۔

پہلا ناول ہندی میں شیو پرشاد کا "راجا بھوج کا سپنا" سمجھا۔ مگر اردو کی طرح یہاں بھی ناول اپنی پیدائش کے ساتھ بیسویں صدی میں

میں نمودار ہوا اور اسی مصنف یعنی پریم چند کے قلم سے جس نے اردو ناول کو نشو و نما دے کر بلند سطح پر پہنچایا تھا۔ پریم چند، جے شنکر پرشاد اور کوشک نے ناول کو سماجی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ لیکن اِلا چند جوشی، جینندر کمار اور بھگوتی چرن ورما نے سماجی بغاوت اور انقلاب کا علم بلند کیا۔ تاریخی ناول کے اچھے نمونے راہل سنکرتیاین اور ہزاری پرشاد دویدی نے پیش کئے۔ ترقی پسند ناول نگاری میں یشپال کا نام قابلِ ذکر ہے۔

مختصر افسانہ ہندی میں خوب پھلا پھولا اور مقبول ہوا۔ پہلے مصنف جنہوں نے ناول اور ڈرامے کے ساتھ مختصر افسانے کو بھی مستقل صنفِ ادب کی حیثیت سے اختیار کیا جے شنکر پرشاد تھے۔ مگر اردو کی طرح ہندی میں بھی سب سے ممتاز افسانہ نگار پریم چند مانے گئے۔ ان کے بعد سے آج تک ہندی میں بے شمار افسانے لکھے گئے جو زندگی سے بھرپور ہیں اور ہندوستانی سیرت کے ہر گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہندی کے ممتاز مجلّے سرستی اور "مایا" میں بہت سے کہنہ مشق اور بعض نئے ہونہار لکھنے والوں کے اچھے افسانے نکلتے رہتے ہیں جن کے ناموں کو گنوانے کی یہاں گنجائش نہیں اور ان میں سے چند کا انتخاب مشکل ہے۔

ادبی تنقید کا سلسلہ یوں تو گریرسن سے شروع ہو چکا تھا لیکن وہ انگریزی میں لکھتا تھا۔ ہندی میں تنقید نگاری اور عام ادبی مضمون نگاری میں پہلی قابلِ لحاظ شخصیت مہاویر پرشاد کی ہے۔ ان کے اور ان کے سے بہت سے دوسرے افراد کے علاوہ ایک ادبی سوسائٹی نے ہندی میں تنقیدِ ادب، تاریخِ ادب اور لغت نویسی پر ٹھوس کام کیا۔ یہ کاشی ناگری پرچارنی سبھا تھی جسے شیام سندر داس نے سیاسی محاذ پر ہندی کے لئے جنگ کرنے اور ادبی میدان میں ہندی ادب کی پائدار عمارت تعمیر کرنے کے لئے قائم کیا اور رام چندر شکلا، رام کمار ورما، ہزاری پرشاد دویدی اور ان کے ساتھیوں نے پروان چڑھایا۔ اس سبھا نے ہندی کو علمی اور ادبی زبان بنانے میں جو خدمت انجام دی وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔

ڈرامے کے لئے ہندی کی آب و ہوا اردو کی فضا سے کہیں زیادہ سازگار ثابت ہوئی اس لئے کہ یہاں اس کے محرک صرف خارجی مغربی اثرات نہیں تھے بلکہ اس کی پشت پر سنسکرت ڈرامے کی شاندار روایات تھیں۔ دو ایک متفرق ناٹکوں کو چھوڑ کر ہندی میں ڈرامے کی بنا بھی اور اصنافِ سخن کی طرح بھارتیندو ہریش چندر کے ہاتھوں پڑی جنہوں نے جدید مغربی ڈرامے اور قدیم سنسکرت ڈرامے کے مزاج اور تکنیک کو ملانے کی کوشش کی۔ ان کے بعد جے شنکر پرشاد اور ایک ایکٹ کے چھوٹے ڈرامے لکھنے والوں میں بھوتیشور پرشاد، گنیش پرشاد دویدی، رام کمار ورما زیادہ مشہور ہوئے جو زیادہ تر تاریخی ناٹک اور مسائلِ حیات سے متعلق ناٹک لکھتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں آزاد ہندوستان کے آئین میں ہندی کے وفاقِ ہند کی سرکاری زبان قرار پانے کے بعد سے اس کا مستقبل نہایت شاندار ہو گیا ہے۔ وفاقی حکومت اور کئی ریاستی حکومتوں کی کوششیں اور وسائل اسے علمی اور ادبی حیثیت سے ترقی دینے میں صرف ہو رہے ہیں۔ یہ کوششیں اب تک بغیر کسی منصوبے اور نظام اور بغیر باہمی ربط و تعاون کے ہو رہی تھیں لیکن اب یہ امید ہے کہ "سرکاری زبان کمیشن" کی سفارشوں پر عمل ہونے کے بعد ایک متحد، منظم، مربوط کوشش ہندی کی ترقی کے لئے شروع ہوگی، تاکہ اسے بہت سی علاقائی قومی زبانوں کے درمیان ملک کی مشترک قومی زبان کی حیثیت حاصل ہو جائے اور وہ ہندوستان کی تہذیبی وحدت کی بنیاد کا کام دے۔

آپ نے ایک زبان کی کہانی سنی جسے مستقل تاریخی و جغرافی قوتوں نے ہندوستان کے بہت بڑے حصّے کی مشترک بول چال کی زبان بنا دیا لیکن عارضی سیاسی اور تہذیبی تحریکوں نے دو ادبی زبانوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک یعنی ہندی کو قومی آئین کی رُو سے کل ہند سرکاری زبان کا منصب دیا گیا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہندوستانی کے خزانے کو اور دوسری زبانوں کے ان عناصر کو جو اس میں کھپ سکیں اپنا لے۔

پچھلے صفحات کے مطالعے سے آپ کو خود بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس زبردست ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہندی میں ابھی بہت کچھ توسیع و ترقی کی ضرورت ہے۔ اس توسیع کا پہلا قدرتی قدم یہ ہے کہ وہ اُردو کو جو دراصل اس کی ہم زاد ہے پھر سے اپنے اندر جذب کر کے ایک مکمل وجود بن جائے۔ ذرا تصور کیجئے کہ ہندی، ویدک سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش کا ورثہ لئے ہوئے، اور اُردو کھڑی بولی کی جیتی جاگتی بیٹی گھریلو محاوروں کے خزانے اور فارسی کی ساری روایات سے مالا مال، مل کر ایک زبان بن جائیں اور دوسری ہندوستانی زبانوں اور بھارت کی عزیز مہمان انگریزی زبان سے دل کھول کر لفظوں اور ترکیبوں کو اپنائیں تو کیسی دولت مند اور تومند زبان

وقت اب وہ ہے کہ سو تیرگیاں منڈلائیں — وقت اب وہ ہے کہ تاروں کے دیئے بجھ جائیں
وقت اب وہ ہے کہ گمراہیاں ٹھوکر کھائیں — تشنگیٔ ذوق کی کیا تکتی ہے دائیں بائیں

اب بجز رنگ پرستی کوئی امکاں نہ رہا
چشمۂ نور بہ پیرِ شجرستاں نہ رہا

ہم پہ اک سایۂ دامانِ پدر تھے وحشت — جس پہ آنچ آئے کوئی سینہ سپر تھے وحشت
خستگی کو جو بلائے وہ شجر تھے وحشت — بسکہ اک نخلِ سرِ راہگذر تھے وحشت

جس میں راحت تجھے اے بے وطنی ملتی تھی
ہر مسافر کو جہاں چھاؤں گھنی ملتی تھی

آج ڈھونڈے سرِ تسلیم کا یہ خم کس کو — ہوگا بیچارگیٔ عزم ترا غم کس کو
سونپے گا اپنے جگر دیدۂ پُرنم کس کو — زخم دکھلائے گا اپنا "غمِ مرہم" کس کو

دوستی وقت پہ کھینچے گی گریباں کس کا
دھجیاں دے گا گل و خار کو داماں کس کا

اب بجز اشک کے کیا دیں گی حیا کی آنکھیں — اپنا سرمایہ لٹائیں گی وفا کی آنکھیں
ڈبڈبائی ہیں کئی دن سے فضا کی آنکھیں — لختِ دل رُوئیں گی ساون میں گھٹا کی آنکھیں[1]

شامِ کلکتہ بہ آوازِ حزیں لوٹے گی
تھی جو وحشت کے قدم سے وہ زمیں لوٹے گی

---

[1] وفاتِ حسرت آیات شبِ برات میں ہوئی تھی۔ خبر آئی تو کلکتے میں موسلا دھار بارش تھی۔

"آج کل" کا اگست ۱۹۵۷ء کا شمارہ

جنگِ آزادی نمبر

ہوگا

تفصیلی اعلان کا انتظار فرمائیے (ادارہ)

نوح ناروی

غزل

اسرارِ غمِ عشق کو دل کھول رہا ہے — معلوم یہ ہوتا ہے کہ تو بول رہا ہے

گذرا نہ مہِ صوم ابھی اے مرے ساقی — میخانے کے دروازے کو تو کھول رہا ہے

پہلے نہ کیا وزن مرے عشق و وفا کا — اب حُسن کے کانٹے میں کوئی تول رہا ہے

جو مجھ کو پلایا دمِ گلگشت کسی نے — وہ جام مئے سُرخ کا انمول رہا ہے

سُوجھی یہ عجب بات کہ آواز بدل کر — محفل میں نئے طور سے وہ بول رہا ہے

بازارِ محبت میں مرے دل کو وہ جانچیں — بے میل رہا ہے نہ یہ بے مول رہا ہے

بے وجہ سرِ بزم نہیں اس کے اشارے — وہ اپنی نگاہوں میں مجھے تول رہا ہے

جینے میں تو مجھ پر نہ گرائے گئے آنسو — موتی سرِ مدفن کوئی اب رول رہا ہے

ممکن نہیں دن عمر کے اک شکل سے گذریں — کیا جانے بڑا بول وہ کیوں بول رہا ہے

اے مرغِ گرفتار رہائی نہیں ممکن — پرواز کو تو کس لئے پر تول رہا ہے

کیوں نوح کے اشعار پسند آئیں نہ ہم کو
نالے میں وہ دِلّی کی زباں بول رہا ہے

شیخ تصدق حسین

واجد علی شاہ کا سفرِ کلکتہ

۱۸۵۶ء کا زمانہ ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہیں۔ اُن کی "آگے بڑھو"[1] یعنی ملک گیری کی پالیسی پورے شباب پر ہے۔ دیسی ریاستیں دھڑا دھڑ مقبوضاتِ کمپنی میں شامل کی جا رہی ہیں۔ آج ستارا کو کسی حیلے سے ہتھیا لیا کل جھانسی کو کسی بہانے سے ہڑپ کر لیا۔ کبھی تنجور پر ہاتھ صاف کیا کبھی ناگ پور پر قبضہ جمایا کبھی برہما کو ہضم کر لیا۔ آخر میں ملکِ اودھ بھی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ سلیمن صاحب رزیڈنٹ اودھ کا دورہ کر کے رعایا کی مفروضہ شکستہ حالی اور ملک کی بدنظمی کی رپورٹ پیش کر کے ضبطیٔ سلطنت کے لئے پیشتر ہی سے زمین ہموار کر چکے تھے۔ آخرکار ۱۲۔ فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزی فوج دھینگا دھینگی سے اودھ پر بھی اپنا تسلط جمانے کان پور سے آ پہونچی۔ موقع کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس جابرانہ اور ظالمانہ فعل کے جواب میں شمشیرِ آبدار میان سے نکل کر اپنے جوہر دکھاتی اور انگریزوں کو منہ توڑ جواب دہانِ توپ سے بھی دیا جاتا۔ مگر فرمانروائے وقت واجد علی شاہ یا تو اپنی فطری امن پسندی یا کسی دوسری مصلحت سے خون کا گھونٹ پی کر خاموش بیٹھ رہے اور دل میں ٹھان لی کہ اس ظلم و ستم کی فریاد براہِ کلکتہ لندن جا کر ملکۂ انگلستان کوئین وکٹوریہ سے کروں گا اور پُرامن آئینی طریقے سے جدوجہد کر کے اپنا ملک واپس لوں گا۔

زوالِ سلطنت کے بعد بادشاہ کے حزن و ملال کی کوئی حد اور انتہا نہ تھی۔ قیصر باغ میں عین موسمِ بہار میں خزاں آ گئی تھی۔ جہاں ہر وقت خوشی کے شادیانے بجا کرتے تھے وہاں نیرنگیٔ عالم سے رنج و الم نے اپنے خیمے نصب کر دئے تھے۔ جنرل اوٹرم نے جو بوقتِ انتزاعِ سلطنت ریذیڈنٹ کے عہدے سے ترقی پا کر اودھ کے چیف کمشنر ہو گئے تھے ایک دربار منعقد کیا جس میں کل اعیانِ سلطنت اور اعلیٰ عہدے دارانِ شاہی کو طلب کر کے ضبطیٔ سلطنت کا اعلان کر دیا جس کے بعد قیصر باغ کی بجائے چیف کمشنر کی کوٹھی مرجعِ خلائق ہو گئی۔ اوٹرم صاحب نے کچھ عملہ بحال رکھا اور باقی ماندہ تخفیف میں آ گیا۔ ہزاروں انسان فکرِ معیشت میں مبتلا ہو گئے۔ دوابِ شاہی یعنی ہاتھی گھوڑے گائیں وغیرہ بشمول دیگر جانوران جن میں ایک لاکھ کئی ہزار بہترین قسم کے کبوتر بھی تھے۔ رمنہ[1] اور کوٹھی دلآرام[2] کے صحن میں کوڑیوں کے مول نیلام کر دئے گئے۔ خاص بادشاہ کی سواری کے لئے اعلیٰ قسم کے سو گھوڑے اور اکیس ہاتھی بچا لئے گئے۔ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں دواب پینتیس روپے روز کا تھا۔ واجدی عہد میں بارہ سو روپے یومیہ کا رہ گیا تھا۔ اب اور کم ہو کر صرف سو روپے یومیہ کا رہ گیا۔ خواجہ سراؤں نے انگریزوں کی ملازمت قبول نہ کی مگر اختری و نادری پلٹنوں نے منظور کر لی۔ چنانچہ وہ بدستور قائم رہیں۔

کلکتہ کو روانگی سے قبل بادشاہ نے بیگموں اور صاحباتِ محل کو کھلے الفاظ میں اجازت دے دی کہ جس کو دولت سرائے سلطانی میں قیام منظور نہ ہو، وہ

Forward Policy

---

[1] رمنہ قصرِ چھتر منزل کے سامنے دریائے گومتی کے اُس پار واقع تھا جس میں ہاتھیوں وغیرہ کی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ ندوۃ العلماء اور گورنمنٹ آرٹ اسکول کی عمارتیں رمنہ ہی کی اراضی پر تعمیر ہوئی ہیں۔

[2] کوٹھی دلآرام چھتر منزل کے مقابل جانبِ رمنہ میں واقع تھی۔ دو منزلہ عمارت تھی۔ عرصہ تخمیناً چالیس سال کا ہوا کہ منہدم کرا دی گئی۔ کبوتروں والی کوٹھی موتی محل کے پُل کی بغل میں بادشاہ باغ کی جانب اب تک قائم ہے۔

بخوشی خاطر اپنے گھر چلی جائے۔ چناں چہ بہت سی بیگمیں جو مہر و وفا سے عاری تھیں، اس آڑے وقت میں منہ موڑ گئیں۔ کچھ خدا کی بندیاں ایسی بھی تھیں جن کے پائے ثبات کو مطلق لغزش نہ ہوئی اور روزِ سیاہ میں بھی بادشاہ کا ساتھ دینا بخوشی منظور کر لیا یہ لوگ حسبِ سابق قیصر باغ میں مقیم رہیں اور بادشاہ نے حسام الدولہ[1] کو محلاتِ معلیٰ کا مہتمم مقرر کر دیا۔ علیحدگی اختیار کرنے والوں میں منجملہ دیگر محلات کے ابر محل، امراؤ محل اور سردار محل بھی تھیں جن کو بادشاہ نے طلاق دے کر بے پرواہ کر دیا۔

یہ سب باتیں بادشاہ کے نازک دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ انھوں نے بھی بے بسی اور لاچاری سے بیت الانشا کو توڑ دیا۔ فوج کو برخاست کر دیا۔ اہلِ عملہ کو موقوف کر دیا۔ محکمہ وزارت کے بخشیوں اور محرروں کو جواب دے دیا۔ رئیس بیطرف کر دئے۔ رئیس والیاں بروقت روانگی، آہ و زاری کرتیں اور سر پٹکتی تھیں اور سلطنت پر تصرف بےجا کرنے والوں کو بُرا بھلا کہتی تھیں۔ عشق منزل اور رئیس منزل دلِ شکستہ کی طرح ویران اور سنسان ہو گئیں اور کل دو ...شاہی کارخانے بھی درہم برہم ہو گئے۔

دربارِ شاہی کی بھی اب وہ اگلی سی رونق باقی رہی تھی نہ وہ چہل پہل۔ البتہ چند ہوا خواہانِ شاہ، کچھ اراکینِ سلطنت صبح و شام دربارِ شاہی میں حاضر ہوا کرتے تھے اور چند نمک خواران و جاں نثارانِ قدیم ہر وقت اعلیٰ حضرت کو گھیرے رہتے تھے اور سمجھا بجھا کر ڈھارس دے رہتے تھے۔ بقول صفیر

سب اس طرح سمجھاتے تھے شاہ کو	کہ اب کیجئے یاد اللہ کو
وہ بگڑے ہوئے بھی بناتا ہے کام	دعا کر کے ناکام پاتا ہے کام
نظر رکھئے اس کی عنایات پر	کمر بستہ رحمت سے کیجئے کمر
اُسی کی عنایات درکار ہے	عبث یاس ہے فکر بےکار ہے

آخر کار زمانے کا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر بادشاہ نے نواب منوّر الدولہ[2] احمد علی خاں سے فرمایا۔ میرا ارادہ ہے کہ لندن جا کر اس ظلم و ستم کی فریاد ملکہ وکٹوریہ سے کروں اگر دلی مراد بر آئی تو شاداں و فرحاں واپس چلا آؤں گا اور اگر خدا نخواستہ ناکامی کا چہرۂ منحوس دیکھنا پڑا تو زیارتِ عتباتِ عالیات کو چلا جاؤں گا۔ منوّر الدولہ نے

---

[1] یہ حضرت امجد علی شاہ کی بیگم نواب ملکۂ گیتی کے خویش اور نواب محسن الدولہ کے بھائی تھے۔

[2] یہ حکیم مہدی علی خاں منتظم الدولہ کے بھتیجے اور یاور علی خاں کے بیٹے تھے۔

بادشاہ کی رائے سے اتفاق کیا مگر اُن کے رخصت ہو جانے کے لیے دوسرے صاحب نے کہا۔ بحری سفر ناموافق ہوگا۔ اس پر بادشاہ نے قبلہ و کعبہ سے استخارہ کرایا جو بہتر آیا۔ چناں چہ اسی روز سامانِ سفر ٹھیک کیا گیا۔ پوشاکوں کے صندوق اور نقرئی ظروف ساتھ لے جانے کو نکلوا لئے گئے۔ باقی ماندہ سامان قیصر باغ میں چھوڑ کر حسام الدولہ کو قصرِ شاہی کا مختار اور نگراں مقرر کر دیا۔ بادشاہ نے ایک محضر پر دستخط بھی کرائے کہ ہم سے لوگ خوش ہیں یا ناخوش۔ کئی لاکھ آدمیوں نے دستخط کر دئے کہ ہم بادشاہ سے بہر طور مطمئن اور خوش ہیں۔

۱۳۔ مارچ ۵۶ء کو رجب کی پانچویں اور یوم پنج شنبہ تھا۔ جب دن گزر کر شب ہونے لگی تو بادشاہ نے جو ریذیڈنٹ کی معرفت پروانۂ راہداری کا انتظام قبل سے کر چکے تھے بگھی طلب کی جس سے محلات کے دلوں میں پنکھے لگ گئے۔ جب زنانی ڈیوڑھیوں پر سواریاں ہونے لگیں تو محلوں میں کہرام مچ گیا۔ شورِ آہ و فغاں بلند ہوا سب بیگمیں مضطرب و سراسیمہ اور بحرِ غم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تمام عزیز و اقارب، محلات اور اہلِ عملہ بادشاہ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے اور زار و قطار روتے تھے۔ اشکوں کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ اور بہ کمالِ ادب رومال سے آنسو پونچھ پونچھ ڈالتے تھے۔ اعزہ کا ہچکیاں باندھ باندھ کر رونا اور پھر اس خیال سے کہ مظلوم اور بیکس بادشاہ کے دلِ حزیں کو ٹھیس نہ لگے آنسوؤں کا پی جانا اور کلماتِ رخصت مایوسی کے پہلو لئے ہوئے ادا کرنا دل کو پاش پاش کئے دیتا تھا۔

رخصت ہوتے ہوئے بادشاہ نے تمام اعزہ اور اہلِ عملہ سے فرمایا کہ میں نے تم پر دس برس حکومت کی ہے۔ اس درمیان میں تم لوگوں کو جو کچھ تکلیف اور رنج میری ذات سے پہنچا ہو اُس کو بخوشی معاف کرنا۔ اس وقت میں معزول ہوں اور تم سے جدا ہوتا ہوں۔ خدا جانے زندگی میں پھر کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو، اس جملے پر تمام حاضرین بے اختیار ہو کر رونے لگے اور وہ مجمع مجلسِ عزا بن گیا۔ صفیر[1] نے اس موقع کی بہت دل کش تصویر کھینچی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ سرکشش دمِ گریہ نالے ہوئے	کہ لریز اشکوں سے تھالے ہوئے
دیرِ باغ تک آئے اہلِ حرم	بہاتے ہوئے چشم سے اشکِ غم

---

[1] حضرت صفیر بادشاہ کے مصاحب تھے اور ان کے ہمرکاب کلکتہ بھی گئے تھے۔

[2] اندماج شاہ

دعا شاہ کو کوئی دینے لگی　　بلائیں کوئی بڑھ کے لینے لگی
پڑھی جس نے بازو پکڑ کر دعا　　کہا اس نے سونپا بحفظِ خدا
خدا کی اماں مصطفےٰ کی اماں　　تمھیں ہر جگہ مرتضےٰ کی اماں
کہے تھی کوئی سایہ قرآن کا　　کہ اللہ حافظ رہے جان کا
غم آلودہ جاتے ہو خوش ہو کے آؤ　　ہمیں پھر عوض پٹھ کے منہ دکھاؤ
کسی نے کہا خط تو لکھنا ہمیں　　کہ دے گا کچھ آرام نامہ ہمیں
تسلی ہو جس سے یہ وہ بات ہے　　کہ نامہ بھی نصف ملاقات ہے
چلے ہو دلِ عاشقاں توڑ کر　　نہ جاؤ ہمیں نیم جاں چھوڑ کر
ادھر دیکھو آنسو بہاتے ہو کیوں　　ہمیں اور رو کر رلاتے ہو کیوں
تمھیں سے ہے نورِ مکان و چمن　　کہ ہے ہر جگہ رونقِ انجمن
ذرا شاہ ڈیوڑھی سے باہر کو جائیں　　کریں گے اکیلے مکاں سائیں سائیں
ہمیں اپنے سائے سے ہول آئیں گے　　اکیلے مکانوں میں ٹکرائیں گے
خدا کے لئے ساتھ لے لو ہمیں　　تڑپتا بلکتا نہ چھوڑو ہمیں
کہا شہ نے کس کس کو میں لے چلوں　　سفر کی درازی سے مجبور ہوں
نہ گھبراؤ میں پھر کے جلد آؤں گا　　اگر دیر ہوگی تو بلواؤں گا
غرض سب کو تسکین دیتے چلے　　چپ و راست تسلیم لیتے چلے
دلوں کو غم و رنج بے حد ہوئے　　جہاں بان محل سے برآمد ہوئے

آٹھ بجے شب کو بادشاہ محل کے باہر تشریف لائے اور ہوادار پر سوار ہو کر قیصر باغ کے پھاٹک تک آئے۔ واجد علی شاہ جیسے خوش خلق اور خوش خصال بادشاہ کا سلطنت اور حکومت سے محروم ہو کر اپنے وطنِ عزیز کو خیرباد کہنا ایک ایسا دل سوز اور جانکاہ واقعہ ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ بادشاہ لکھنؤ سے کیا گئے گویا چمن سے بہار رخصت ہوئی یا بوئے خوشِ گلِ تر و تازہ سے دور ہوئی۔

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب بادشاہ کی سواریِ بادِ بہاری[1] نکلتی تھی تو اس میں ماہی مراتب، ہاتھی گھوڑے، اونٹ، علم بردار، نیزہ بردار، برق بردار، سوار، جھنڈے باجے، نقارچی، نقیب، عصا بردار، پنجشلے اور دستیاں وغیرہ سب اعلیٰ سے اعلیٰ سامان ہوتا تھا۔ مگر جفا کار زمانے نے ایسا پلٹا کھایا اور ستم کیش فلک نے ایسا ظلم ڈھایا کہ آج جو بادشاہ کی سواری چلی تو نہ سلامی ہوئی نہ پہلا سا ساز و سامان دیکھنے میں آیا۔ نہ پیشرو سایۂ شوکت جلوس تھا نہ اگلی سی دھوم دھام اور کرّ و فر۔ ہوادار کے آگے آگے صرف چند کول بردار کول لئے جاتے تھے اور سواری بادِ بہاری کی خزاں رسیدگی کا الم ناک منظر پیش کرتی تھی۔ بادشاہ کے ہمراہ امراء اور ارکینِ سلطنت ضرور تھے مگر سب کے سب افسردہ خاطر اور پیکرِ غم بنے ہوئے ان کے علاوہ اگر ہجوم تھا تو افکار کا اور مجمع تھا تو کلفتوں اور پریشانیوں کا۔

دراصل بادشاہ کی لکھنؤ سے روانگی غافلوں اور دنیا پرستوں کے لئے درسِ عبرت تھی اور بتاتی تھی کہ دنیا کے جاہ و حشم کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کے سب کارخانے نقش بر آب اور باد در ہوا ہیں۔ شاہِ اودھ کی مثال لو اور دیکھو وہ جلیل القدر اور خودسر ہستی جو دوسروں کی حاجت روائی کرتی تھی آج انقلابِ زمانہ سے مجبور اور بے بس ہو کر خود اپنی حاجت درِ اغیار پر لئے جاتی ہے اور دوسروں کے رحم و کرم کی محتاج ہے۔

اولاً بادشاہ قیصر باغ کے شمالی پھاٹک سے سوار ہونے والے تھے۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ مشرقی پھاٹک کی طرف رعایا کا ایک مجمعِ کثیر مشتاقِ دیدار ہے تو انھوں نے رائے بدل دی اور ہجوم کے درمیان سے ہو کر گزرے۔ مجمع کیا تھا لاکھوں آدمیوں کا ایک گھنا جنگل تھا۔ اگر تھالی پھینکی جاتی تو سر ہی سر جاتی۔

بادشاہ ایک بغداد سے گاڑی (بردہم) میں سوار ہوئے۔ نواب خاص محل عالم آرا بیگم اور ولی عہد پرنس حامد علی بھی اسی گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی کے اوپر گھٹا ٹوپ پڑا تھا۔ بادشاہ کی گاڑی کے بعد والی گاڑی میں ملکۂ ملک تاج النسا نواب معشوق محل صاحبہ مع اپنے صاحبزادہ فریدوں قدر جنرل صاحب مرزا محمد بریر علی کے سوار تھیں۔ اس گاڑی کے پیچھے تین چار گاڑیاں اور تھیں جن میں دیگر محلاتِ بادشاہ یعنے جانِ جاں عاشق نما محبوبۂ خاص نواب دلدار محل صاحبہ عاشقِ سلطان نواب قیصر بیگم صاحبہ، مطلوب السلطان نواب خجستہ محل صاحبہ اور نواب جعفری بیگم صاحبہ سوار تھیں۔ ان محلات کے بعد دیگر ہمراہیوں کی سواریاں تھیں اور کچھ سوار بادشاہ کی گاڑی کے چپ و راست تھے۔ برنڈن[1] صاحب نے شاہی گاڑی کی گھوڑیوں کی راسیں سنبھالیں۔ راجہ یوسف علی خاں برنڈن صاحب کی بغل میں کوچ بکس پر بیٹھ گئے اور گاڑی جانبِ کانپور روانہ ہوئی۔

---

[1] بادشاہ کی سواری کا نام بادِ بہاری تھا۔

[1] برنڈن بادشاہ کے قدیمی نمک خوار تھے۔ بسلسلہ تجارت کانپور میں قیام تھا۔ بادشاہ نے ڈاک کا انتظام ان کے سپرد کیا تھا اور ستر ہزار روپئے بہ لئے مصارفِ ڈاک دئے تھے۔

خلقت میں اپنے محبوب بادشاہ کی ہمدردی اور محبت کے سبب سے بڑا جوش و خروش تھا۔ رعایا کے نعرے ہوا میں گونج رہے تھے۔ ہر جگہ اور ہر طرف یہی دعائیہ کلمے سنائی دیتے تھے۔ "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے"۔ "لندن سے حکم آجائے۔" "بادشاہت قائم رہے۔"

بادشاہ کی سیاسی زندگی کے متعلق مؤرخین اور محققین جو کچھ بھی رائے قائم کریں مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ نیک سرشت اور وفا کیش تھے اور ان کا دل وطن اور اہلِ وطن کی محبت سے معمور تھا۔ چناں چہ گاڑی پر سوار ہوتے وقت کمال تأسف سے یہ شعر پڑھا:

درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم [illegible] کرتے ہیں

یہ دردانگیز اور پُرتاثیر شعر سن کر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو آب دیدہ نہ ہو گیا ہو اور جس کے دل پر غم و اندوہ کی گھنگھور گھٹائیں نہ چھا گئی ہوں۔ جب شاہی سواری اس بے سروسامانی سے سڑکوں پر گذری تو راہگیروں کے کلیجے بھی غم سے شق ہو گئے اور ہر دو کا نداروں تک کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

شہر کے ہندو بھی دردِ دولت سے دریائے گنگا تک سواری کے ساتھ پیدل گئے اور سلطنت کو تباہ و برباد کرنے والوں کو سخت سست کہہ رہے تھے۔

سواری صبح کو نماز کے وقت کان پور پہنچی۔ مسافروں کی کثرت سے کانپور کا کرایہ بارہ روپے سے لے کر ساٹھ روپے تک ہو گیا تھا۔ سوائے معدودے چند کے سب ارکینِ سلطنت اور اعیانِ دولت کانپور روانہ ہو گئے۔ بادشاہ کے برادرانِ مختلف البطن یعنی شہزادہ مرزا سطوت (از بطن نواب ملکہ گیتی صاحبہ) اور شہزادہ سلیمان قدر (از بطن نواب ملکہ عہد صاحبہ) اور بعض دیگر اقربا و شاہی بھی کانپور روانہ ہو گئے۔ بوقتِ روانگی نواب منور الدولہ نے عرض کیا ایسے موقع پر غلام کو اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے۔ چناں چہ وہ بھی بحیثیت مدار المہام کانپور گئے اور وزیر اعلیٰ نواب علی نقی خاں لکھنؤ میں رہے۔

کانپور پہنچ کر بادشاہ نے برنڈن صاحب کی کوٹھی میں قیام کیا۔ گویا ناچیز چیونٹی کو حضرت سلیمان کی مہمانی کا شرف حاصل ہوا۔ کوٹھی میں وسعت کم تھی اس لیے تاج گھر اور گرد و پیش کی کوٹھیاں بھی خالی کرالی تھیں۔ تاج گھر میں بیگمیں فروکش ہوئیں۔ بادشاہ کے قیام والی کوٹھی کے احاطے میں خیمے بھی استادہ کیے گئے۔ اعلیٰحضرت کو بوجہ تنگیٔ مکان بہت اذیت ہوئی۔ گو برنڈن صاحب اپنے امکان بھر بادشاہ کا دل بہلاتے رہے اور نفیس نفیس تحائف پیش کیا کرتے۔

کلکتہ پہنچ کر بادشاہ نے اپنی ایک بیگم مقیم لکھنؤ کو حالاتِ سفر تحریر کیے۔ اس میں قیامِ کانپور کے متعلق لکھتے ہیں:-

لکھنؤ سے چلے جو ہم اے جاں — کانپور میں ملا غضب کا مکاں
وہ برنڈن کا ایک بنگلہ تھا — اپنی ٹوپی سے بھی تھا تنگ ہوا
رات دن سب کے دل میں خطرۂ جاں — پاؤں پھیلے تو پھر عدم کو رواں

لکھنؤ کے لوگ کثرت سے کانپور پہنچ گئے تھے۔ کوٹھی کے باہر ایک بازار سا لگ گیا تھا۔ بھنگیڑوں کے پالں تک پہونچ گئے تھے۔ شہر لکھنؤ کے مشہور نان پز میاں محمّد[1] بھی اپنی دوکان لے کر کانپور پہنچ گئے تھے۔ نواب منور الدولہ نے بختِ طعامِ خاصہ انھیں کے سپرد کر دی۔

بادشاہ نے حسام الدولہ کو لکھا کہ خزانہ جلد روانہ کرو۔ حکنامہ موصول ہوتے ہی حسام الدولہ نے فوراً خزانہ روانہ کر دیا جس میں اسبابِ پُرتکلف اور گراں بہا جواہرات کے بہت سے صندوقچے تھے۔ خزانہ پہنچنے پر بادشاہ نے کوچ کا حکم دے دیا۔

کانپور سے یکم شعبان کو الہ آباد روانہ ہوئے۔ سو بیگمیں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔ اول منزل بمقامِ فتح پور ہوئی۔ ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ گرمی قیامت خیز تھی اس لئے دن بھر قیام کر کے شام کو پھر روانہ ہوئے۔ صبح کو الہ آباد میں قیام ہوا۔ برنڈن صاحب کی معرفت ایک عیسائی کا مکان موسومہ "پنج گھر" کرایے پر لیا مگر کرایہ طے نہیں کیا۔ مکان بہت تکلیف دہ تھا۔ آفتاب الدولہ مرزا محمد رضا علی جو بادشاہ کے ہمرکاب تھے مکان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حال کچھ اس کی خرابی کا بھی کرتا ہوں بیاں — جھونپڑا یا بیوں کے اور چھت کے ٹپکنے کے نشاں
ڈھیرِ خاشاک کے تھے چاروں طرف جالے تھے — ہر چھنتی تھی وہ ٹوٹے ہوئے پرنالے تھے

بحالتِ قیامِ الہ آباد مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والیٔ بنارس نے نواب منور الدولہ کو لکھا کہ شاہِ ذی جاہ کی مہمانی سے مجھ ناچیز کو مشرف فرمائیے۔ عرضی علیحدہ سے ارسالِ خدمت ہے۔ بادشاہ نے خوشنودی ظاہر فرمایا خیر وہیں قیام ہوگا۔

---

[1] میاں محمّد کی دوکان ماکولات کی فرنگی محل کے باہر والی مسجد کے نیچے تھی۔ شب کو دوکان بڑھاتے وقت جو کچھ سامان فروخت ہونے سے بچ جاتا تھا وہ سب کا سب طلبا اور حاجت مندوں کو تقسیم کر دیتے تھے۔

آٹھویں روز بادشاہ الٰہ آباد سے روانہ ہوئے۔ پانسو روپے بابت کرایہ مکان مالک مکان کو دئے جاتے تھے۔ مگر اس نے نالش کرکے ایک ہزار وصول کئے اور گاڑی روکنے کو سڑک پر رسی بھی باندھ دی تھی۔ اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے قلق لکھتے ہیں :-

فیصلہ اس سے کرایہ جو نہیں پایا تھا — وقتِ رخصت وہ شقی فیل تڑا لایا تھا
روکنے راہ سواری کی وہ خود آیا تھا — اور اُس شہر کے حاکم کو بھی بلوایا تھا
کیا کہوں میں دمِ رخصت کہ وہ کیسا بپھرا — کہتے تھے دیکھنے والے کہ بنڈ بلا پھرا

الٰہ آباد سے دس کوس کے فاصلے پر دریا پڑتا ہے۔ جیسے ہی اس کے پار ہوئے گاڑی کے پہیئے ریتی میں پھنس گئے۔ جب سبھوں نے زور لگایا تب گاڑی چلی۔ بادشاہ نے خود بھی گاڑی سے اُتر کر بنفسِ نفیس سہارا لگایا۔ شب میں متعدد بار یہ زحمت اُٹھانی پڑی اور ساری رات بہت تکلیف سے گذری۔ کلکتہ پہنچ کر بادشاہ نے ملکہ بیگم تن مقیم لکھنؤ کو حالاتِ سفر تحریر کئے۔ اس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں :-

چرخ گاڑی کا پھنس گیا گِل میں — ساتھ دھچکا پہنچ گیا دل میں
جعفری بیگم اس میں تھیں ہمراہ — دل یہ بولا ہوئے یہیں پہ تباہ
آخرش ہم اُتر پڑے سے نیچے — پہیے گاڑی کے ہاتھ سے کھینچے
آہ کرکے ہوئے پھر اُس پہ سوار — ضعف دل میں ہوا اٹھا جو غبار

صبح کو گوپی گنج پہنچے۔ دن بھر ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ موسمی تپش اور بنگلے کی تکلیف کا ذکر کرتے ہوئے قلق لکھتے ہیں :

بے مزا ایسی طبیعت کہ نصیبِ دشمن — اور وہ موسمِ گرما و غمِ ہجرِ وطن
جیٹھ بیساکھ کی وہ دھوپ کہ گھرا گگن — سلطنت جانے کا دھیان آٹھ پہر نشترِ تن
ڈاک بنگلے وہ تنور ایسی حرارت جن میں — سو کھے جھونکے صفتِ شرارِ جن میں

گوپی گنج سے روانہ ہو کر صبح کو بنارس میں داخل ہوئے۔ معتبر حضرات راوی ہیں کہ مہاراجہ بنارس شہر کے ناکے تک خود استقبال کو گئے تھے اور سڑکوں پر کیوڑہ گلاب کا چھڑکاؤ بہت فراخدلی سے کرایا تھا۔ خود بہت سادی پوشاک پہنے بادشاہ کی گاڑی کے ساتھ ساتھ پیادہ پا چل رہے تھے۔ ہر چند کہا گیا کہ گاڑی پر سوار ہو لیں مگر خلافِ ادب سمجھ کر منظور نہ کیا۔ جب بہت اصرار کیا گیا تو بادشاہ کی گاڑی سے دو تین گاڑیاں چھوڑ کر ایک گاڑی کی پچھلی نشستگاہ پر جس میں بیگمات سوار تھیں بیٹھ گئے۔ اہلِ بنارس زیارت کے بہت مشتاق تھے مگر بادشاہ وہاں بھی بند گاڑی میں سوار تھے۔ بقولِ صغیر :

ہزاروں تھے مشتاقِ دیدارِ شاہ — تمنا میں آتے تھے شام و پگاہ
مگر بادشہ کو یہ منظور تھا — کہ بعدِ حصولِ دُدیہ مُدعا
اسی راستہ سے اگر آئیں گے — تو جاہ و حشم سب کو دکھلائیں گے

بادشاہ مہاراجہ بنارس کے مہمان ہو کر انھیں کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ مہاراجہ نے بادشاہ نے قیام و طعام و خسخانہ وغیرہ کا نہایت معقول انتظام کیا تھا اور گوہر بے بہا نذر میں گذارے۔ پانسو روپے برائے تصدق حاضر کئے اور سات توڑے ضیافت کے لئے بھی پیش کش کئے۔ جب مہاراجہ کو باریابی ہوئی تو بہ نظرِ الطافِ خسروانہ نشست کی اجازت دی اور فرمایا ہم تم کو خلعت اور ہاتھی پالکی عطا کرتے لیکن آج ہماری وہ حشمت اور ثروت باقی نہیں ہے اس لئے مجبور ہیں اور خلعت وغیرہ کی قیمت کے موافق زرِ نقد ادا کرنے کا حکم فرمایا اُسی کے ساتھ پیشکش کی واپسی کا بھی حکم دیا اور فرمایا تمھاری پیشکش میں نے قبول کی مگر دل میں آزردہ نہ ہونا۔ میری امانت رکھ لو جب خدا میرے دن پھیرے گا تو لے لوں گا۔ مہاراجہ نے عرض کیا اُسی روز جہاں پناہ سے خلعت بھی لوں گا اور اُس کے علاوہ جس چیز کی حسرت میرے دل میں ہوگی اس کے لئے بھی عرض کروں گا اور بہت کچھ اظہارِ ہمدردی کیا جس کا ذکر کرتے ہوئے قلق لکھتے ہیں :

آرزو تھی کہ مرے گھر میرا آقا آئے — تا نمک خوار بھی ہم چشموں میں عزت پائے
یا فلک دفعتاً اس قہر کی آفت ڈھائے — کہ وہ آئے بھی تو تشریف یہاں یوں لائے
ہائے کیا روؤں میں اس پھوٹی ہوئی قسمت کو — دیکھوں آوارہ وطن اپنے ولی نعمت کو
دل میں کہتا تھا نہ راز اپنا میں کرتا تھا فاش — کہ مری بخت نے کی مجھ سے مبادا پرخاش
یا کسی اور سبب سے ہوئی تنگیٔ معاش — تو نہیں فضلِ خدا سے مجھے کچھ فکر و تلاش

میری سرکار سلامت رہے پروا کیا ہے
لاکھ دو لاکھ سے جا بیٹھوں تو گھر میرا ہے

اس سال مہاراجہ نے بادشاہ کی غمگساری اور ہمدردی میں کوئی تہوار بھی نہ منایا جس کے بارے میں قلق کہتے ہیں :

واہ رے پاس جو کہتا تھا کوئی اس کا یار — نہ کیا اب کے برس آپ نے کوئی تہوار
تو وہ کہتا تھا کہ ہوں عیش میں ہم تو سرشار — اور اس طرح سے لٹ جائے ہماری سرکار

شاد کیا خاک ہوں کس سے کہیں کس غم میں ہیں
اپنی سرکار کے مٹ جانے کے ماتم میں ہیں

اس سفر میں بادشاہ نے مہاراجہ بنارس کی ذات سے گھر کا ایسا آرام پایا اور مہاراجہ کے خاطر مدارات سے بہت مسرور ہوئے۔ چناں چہ اپنی ایک نظم مقیمِ کلکتہ کو انھوں نے مہاراجہ بنارس کی تعریف میں لکھا تھا:

ایک راجہ ملا وہاں وہ نیک — لاکھ راجاؤں میں تھا راجہ ایک
پانسو روپے برائے نثار — پھر دعوت بھی بھیجے سات ہزار
مٹیاں حسن کی نصب ہر جا تھیں — چشم گرما کی وہ تماشا تھیں
ایسی خاطر ہماری کی اُس نے — آتے ہی ہم کو نذر دی اُس نے
کشتیاں پیش کش جواہر خوب — سب قرینے سے اور با اسلوب
خوب کوٹھی سبھی سجائی درست — چاق ہو ہو گئے وہاں سب سست
پندرہ روز ہم رہے اُس جا — ایک میلہ تھا ایک تماشا تھا

پندرہ روز گزر کر جب سولھواں دن آیا تو بادشاہ ایک دخانی جہاز "جنرل میکلوڈ" نامی میں سوار ہو کر تری کی راہ سے مع چند محلات و ندیمانِ خاص سوئے کلکتہ روانہ ہوئے۔ دیگر ہمراہیاں و محلاتِ سمتِ خشکی کی راہ سے روانہ ہوئے۔ ریل اس وقت تک جاری نہ ہوئی تھی مگر پانی بہت متلاطم تھا۔ بادشاہ کا جہاز ڈگمگانے لگا۔ خوف و ہراس سے ہو خشک ہوا جاتا تھا۔ مزید براں بادشاہ کو دورانِ سر ہونے لگا۔ کوئی غذا ہضم نہ ہوتی تھی۔ زندگی وبال ہو گئی تھی۔ ان تکالیف و مصائب کا نقشہ خود بادشاہ نے اس طرح کھینچا ہے:

رہے انیس دن جہاز پہ ہم — کیا کہیں غم سے کیا ہوا عالم
تارِ مسطر سی ہو گئی تھیں رگیں — پاؤں ٹکن نہ تھا زمیں پہ کہیں
ہوا دورانِ سر مجھے اتنا — چرخ پھرتا ہے رات دن جتنا

بارے ساتویں رمضان مطابق ساتویں اپریل ۱۸۵۶ء کو خدا خدا کر کے جہاز کلکتہ پہنچا تو جان میں جان آئی۔ کلکتہ پہنچ کر بادشاہ نے ایک کوٹھی ملکیتی راجہ بردوان واقع موچی کھولا پانسو روپے ماہوار کرایہ پر لے کر اسی میں قیام کیا۔ ادھر بادشاہ کی والدہ محترمہ نواب ملکۂ کشور صاحبہ اور بھائی سکندر حشمت مرزا جواد علی عرف جرنیل صاحب براہِ خشکی بنارس سے آگئے اور ملک کی واپسی کی تدبیریں شروع ہوئیں۔ بادشاہ نے لندن تشریف لے جانے کا عزم ظاہر کیا اس پر ندیموں نے عرض کیا کہ اب بحری سفر درپیش ہے۔ اتنے ہی سفر میں تکان سے یہ حالت ہو گئی۔ اگر اب اور سمندر کا سفر کیجے گا تو حالت زیادہ ابتر ہو جائے گی۔ غرض کہ بادشاہ کلکتے میں رہ گئے اور بتاریخ ۱۸ جون ۱۸۵۶ء اپنی والدہ بھائی اور ولی عہد پرنس حامد علی کو مع خدم حشم لندن روانہ کیا کہ استردادِ سلطنت کی کوشش کریں۔

بانہال سرنگ میں اضافہ

نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء کو بانہال سرنگ کے پہلے درے کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ یہ سرنگ ریاست جموں و کشمیر کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ "اس ڈیڑھ میل لمبی نئی سرنگ کی وجہ سے کشمیر اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے درمیان تمام موسموں میں آمد و رفت ہو سکے گی۔ چناں چہ اب ریاست کی ترقی کے لئے سال کے ہر حصے میں ضروری سامان بھیجا جا سکے گا اور کشمیر کے کھیتوں اور کارخانوں کی پیداوار برابر دوسری منڈیوں تک پہنچائی جا سکے گی۔ اس طرح کشمیریوں کے لئے روزگار کے نئے ذرائع مہیا ہو جائیں گے اور ان کا معیارِ زندگی بلند ہو جائے گا۔

"سرنگ کی کھدائی اپریل ۱۹۵۵ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس سے متعلق تحقیق کا کام اور اس کا عمومی ڈیزائن تین سال سے بھی کم مدت میں تیار کر لیا گیا تھا۔ دنیا میں اتنی بڑی کسی بھی سڑک کی سرنگ سے متعلق ڈیزائن اور تحقیق کے کام میں آٹھ دس سال سے کم مدت نہیں لگتی ہے اور تعمیر کے آغاز سے دو سال سے بھی کم مدت میں سرنگ کی ایک ٹیوب گاڑی کو آمد و رفت کے لئے کھول دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال دنیا میں ایسی نوعیت کے سرنگ کے پروجیکٹ کی نہیں ملتی — "سرنگ ۱۰ میل کی چڑھائی پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ سڑک میں دو گھنٹے کی کمی ہو جاتی ہے۔ سرنگ میں ہوا کی آمد و رفت کا انتظام برقرار رکھنے کے لئے ہوائی آلات لگا دیئے گئے ہیں۔ جب ۱۹۵۹ء میں یہ سرنگ مکمل ہو جائے گی تو یہ عجیب و غریب چیز ہو گی۔

بلونت سنگھ

ایڈیٹر لوگ

پہلے میرا خیال تھا کہ ایک 'ہدایت نامہ ایڈیٹران' لکھا جائے۔ آخر جب 'ہدایت نامہ خاوند'، 'ہدایت نامہ بیوی'، 'ہدایت نامہ والدین' وغیرہ لکھے جا چکے ہوں تو 'ہدایت نامہ ایڈیٹران' لکھنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟ لیکن پھر کچھ یوں محسوس ہوا کہ بات ذرا سخن گسترانہ سی ہو جائے گی خود بھی ایڈیٹر رہ چکا ہوں، ایڈیٹروں سے واسطہ بھی زندگی بھر پڑنا ہے اس لئے ایسی شوخ ادائی سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہے چناں چہ مندرجہ بالا نہایت معتدل، مسکین اور غریب نواز عنوان قائم کر دیا۔ اب اس مضمون کو ہدایت کے خیال سے نہیں لکھا جا رہا بلکہ مقصود امرِ واقعہ کا اظہار کرنا ہے

دیکھنے میں آیا ہے کہ ایڈیٹر لوگ لیکھکوں کے خطوط کے حوالے دے کر اکثر چہلیں اور کلیلیں کیا کرتے ہیں۔ بے شک لیکھکوں کے نام صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں پھر بھی بے چارے لیکھک دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان بے مہار اونٹوں (ایڈیٹروں) کی ناک میں نکیل ڈالنے کی کسی کو جراُت نہیں ہوتی۔

اس قسم کی دُم بازی FLIRTATION کرنے والوں میں بڑے بڑے سنجیدہ صورت اور فرشتہ طینت بزرگ بھی شامل ہیں۔ مثلاً ہمارے ایک مولانا صاحب تھے نہایت معقول، سنجیدہ اور انسان دوست۔ تقسیمِ ہند سے پہلے بیڈن روڈ پہ آپ کا دفتر تھا۔ میرا فلیٹ بھی اسی سڑک پر تھا۔ اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مولانا بھی مندرجہ بالا قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے اور بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں زبانی بھی ادیبوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک ادیب کے بارے میں مجھے بتایا کرتے تھے کہ جب وہ صاحب نئی کہانی لکھ چکتے ہیں تو آ کر مسودہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں: "لیجئے مولانا! اب کے میں نے کمال کر دیا ہے۔"

اس وقت ان کی بُرس نما مونچھوں تلے دم بدم پھیلتی ہوئی مسکراہٹ سے شوخی بلکہ شرارت ٹپکتی تھی۔ یہ اشارہ ایک دو دھاری تلوار کا کام کرتا تھا۔ یعنی اپنی تحریر کو خود ہی کمال کا درجہ دینا اور پھر کمال کو کمال کہنا۔

یہ سب درست لیکن پھر بھی میری ہمدردی تو ادیب کے ساتھ ہی رہے گی کم از کم اس وقت تک جب تک میں بھی کسی سرکاری رسالے کا ایڈیٹر نہیں بن جاتا۔

ہر بشر خاص و عام دآم نہیں ـــ یہ ہدایت اس لئے کہ وہ صاحب کو جو ابھی زندہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، وہ مرے نہیں) کو معلوم ہونا چاہیئے کہ لفظ ایڈیٹر میں اس کا آخری حصہ یعنی 'ٹر' بہت اہم ہے۔ یوں تو ایڈیٹر میں بہت سے اوصاف ہونے لازمی ہیں جو کبھی ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔ لیکن ہر ایڈیٹر میں 'ٹر' ضرور ہوتی ہے ـــ یہ انکشاف طبع زاد نہیں ہے۔ جو بزرگ اس کے موجد تھے یا ہیں ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔ بہر کیف میں نے انھیں کی خوشہ چینی کی ہے۔ چاہیں تو اسے سرقہ یا چوری بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ـــ سینہ زوری نہیں۔

جیسا کہ ہم رسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ رسی جل گئی پر بل نہیں گیا۔ اسی طرح ایڈیٹر کی 'ٹر' گل جائے سڑ جائے لیکن۔ جاتی نہیں۔ گزرنے کو تو ہر کیفیت اُس 'ٹر' پر گزر سکتی ہے لیکن یہ پھر بھی قائم رہتی ہے۔ مر مر کے زندہ ہو جاتی ہے۔

محفوظ ترین 'ٹر' ایک سرکاری رسالے کے ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ مثلاً سرکاری ایڈیٹر مضمون کے لئے پرانے لیکھک سے یوں تقاضا کرے گا:

" برادرِ مکرم

تسلیم۔ اب تو افسانہ ملے دیر ہو گئی ذرا جلد التفات فرمائیں

مخلص

.... "

بڑے سائز کے کاغذ پر یہ چند الفاظ ..... یہ دو فقرے، باقی سارا کاغذ خالی۔ خالی نہیں۔ اس میں ایڈیٹر کی 'ٹر' ہے۔ لیکن اس 'ٹر' کی بلائیں لے لینے کو جی چاہتا ہے کیوں کہ ان کے وہاں سے لیکھک کو معقول (یا نامعقول

بہرحال) معاوضہ ملتا ہے۔ سرکاری ایڈیٹر اگرچہ مندرجہ بالا قسم کا گرگ باراں دیدہ ذ بھی ہو تو بھی اس کی شخصی خاص حد سے تجاوز نہیں کرنے پاتی۔ مثلاً ایک دو صاحب لکھتے ہیں :

مکرمی تسلیم۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ خط کے ہمراہ ..... کا ایک شمارہ ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے کہ رسالہ آپ کو پسند آئے گا۔ ادارہ ...... آپ کا ممنون ہوگا اگر آپ پہلی فرصت میں ہمارے لئے اپنی کوئی غیر مطبوعہ کہانی بھیجنے کی تکلیف گوارا کریں۔

براہِ کرم خط کی رسید سے مطلع فرمائیں

زیادہ آداب

نیاز مند

....

آپ کو مندرجہ بالا خطوط بالکل معقول نظر آئیں گے۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ لیکن غیر سرکاری ایڈیٹروں کی APPROACH ذرا مختلف ہوتی ہے۔

یہ ایڈیٹر ڈاکوؤں اور پولیس کی مدد لینے کے سوا باقی سب ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ علم و ادب کا واسطہ دیں گے، تحریک کو بڑھانے اور گرم تر کرنے کے لئے ابھاریں گے، پبلک کے کرتے ہوئے اخلاق کو بلند کرنے کی تلقین کریں گے۔ ادیب کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے۔ دیگر ادیبوں سے سفارشی خطوط لکھوا کر بھجوائیں گے، دھمکیاں دیں گے، صرف آپ کی خاطر سارا پرچہ سال دو سال تک رد کے رہیں گے، شاعری کریں گے، دُور ہی دُور سے مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں گے، چھوٹی بڑی بے تکلفیاں کریں گے — غرض کہاں تک گنوایا جائے ....

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ وہ یہ کہ سرکاری ایڈیٹر کو محض ایڈٹ کرنا پڑتا ہے یعنی جو ایڈیٹر کا کام ہے وہی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کے ایڈیٹروں کو ایڈیٹنگ کم کرنی پڑتی ہے باقی کام بہت زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ پہلی قسم کے ایڈیٹروں کی تعداد بہت کم ہے جیسے آٹے میں نمک بلکہ انھیں ایڈیٹر کہنا ہی بے کار ہے۔ اصل ایڈیٹر تو دوسری قسم کے ہوتے ہیں۔ انھیں وہ وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن سے خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ کاغذ، کتابت، بلاک، چھپائی، بیسیوں جھنجھٹ اور — گویا ایک انار کو سو بیماریاں لگی ہوتی ہیں — بے چارے دن رات بڑی بڑی ٹیڑھی کھیریں پکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی لئے میری ہمدردی ہمیشہ دوسری قسم کے ایڈیٹروں پر سایہ فگن رہتی ہے، بالخصوص ایسے ایڈیٹروں سے جو رسالے کے اخراجات کے سلسلے میں کاغذ، کتابت، بلاک، چھپائی، سلائی، سیاہی، نب، قلم — غرض ہر الّم غلّم چیز کا بجٹ بناتے ہیں لیکن لکھک کے لئے معاوضے کی بات صاف بھول جاتے ہیں۔ مجھے ان کی اس بھول پر بہت پیار آتا ہے۔ کیوں کہ میں ان کی مجبوریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن جب وہ میری مجبوریوں کا خیال نہ کرتے ہوئے میرے پیار اور ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور مفت مضمون طلب کرتے ہیں تو مجھے ان کی اس طوطا چشمی پر بڑا دُکھ ہوتا ہے۔

ان گشتی مراسلوں کو پڑھ کر میں خوش ہوتا ہوں جن میں چند پرستارانِ ادب و فدایانِ فنونِ لطیفہ و شریفہ ہمالہ ایسی عظیم اور بھاری ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اقدارِ نو کو جنم دینے، ابھارنے نیز نوجوانانِ وطن کی رگِ حمیت اور جذبۂ حریت کو ابھارنے کے لئے ادب کے اکھاڑے میں آ تنے آتے ہیں اور آپ کو آفتابِ ادب سمجھ کر آپ سے از راہِ مولا ایک عدد تازہ بتازہ طبع زاد مضمون کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اصحاب سے ذرا سی بے فکری رہتی ہے خواہ وہ قریب کے کسی قصبے کے رہنے والے بھی ہوں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ڈیڑھ روپیہ خرچ کر کے بہ نفسِ نفیس آ دبوچیں گے۔ ان مالی مجبوریوں کا نہایت خوش گوار نتیجہ نکلتا ہے۔ پرستارانِ ادب محلے کے بھاڑی کی دکان کے ہیرے پھیرے میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور آفتابِ ادب اپنی ڈھیلی چارپائی پر پڑے پڑے غروب ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا قسم کے ایڈیٹران کی خوش نوائیوں کا جوابی بول تو بس ایک حد ہے۔ لیکن جو ایڈیٹر لطیف حملے کرتے ہیں وہ ذرا مشکلات بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ بھی ادیب ہوتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ ادھر بھی ان کے قدردان ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

" بھائی بلونت سنگھ

یہ میں جانتا ہوں کہ آپ کسی کو خط نہیں لکھتے۔ لیکن اپنی فطرت کا کیا کروں۔ مجھے یہ ضد ہے کہ میں آپ سے کوئی نہ کوئی کہانی لے کر رہوں۔ ہو سکتا ہے جیت آپ کی ہو مگر مجھے اتنا اطمینان تو رہے گا کہ سدا آگے 'دلِ ناتواں' والا مصرع ہے)

'گمراہ' کے افسانہ نمبر کے لئے کوئی کہانی دیجئے۔ پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں۔ آ،

"آپ میرے دوست ہیں۔ میرے دل میں ان کے لئے پیار ہی پیار بھرا ہے۔ لیکن کلجگ میں دل کو کون دیکھتا ہے۔ تاہم صبر کرتا ہوں کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں اور میں اپنی عادت سے مجبور۔

ایک اور صاحب کا بیان سنیئے:

"بھائی جان! اتنا ظلم تو نہ کیجئے گا۔ پرچہ رُکا پڑا ہے اور جب تک آپ کا افسانہ نہیں ملے گا پرچہ پریس کو نہیں جائے گا۔" لیکن سوال یہ ہے کہ اگر چلا بھی جائے تو کیا پریس چھپائی وصول نہیں کرے گا — "منیجر آپ کا پرچہ ہے" بہت خوب! آنے دیجئے منیجر کو، میں اسے سر ماتھے پر جگہ دوں گا۔ اتنی سی بات ہے تو میں اسے سینے سے لگائے لگائے پھروں گا — آخر میں خفا ہو کر لکھتے ہیں:

"برادرم تسلیم

اتنی بھی بے نیازی کس کام کی کہ ہمیں مجبوراً یہ لکھنا پڑے:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی"

اب وہ دیدہ و دانستہ غلط کو صحیح و جہ سمجھ رہے ہیں۔ صاحب! بے نیاز ہوتے تو نیاز میں مضامین بانٹا کرتے۔

ایک اور دوست جو خود بھی لکھتے ہیں بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں ایڈیٹر بھی ہیں اور ایڈیٹروں والی متعدد قدیم یعنی مزمن بیماریوں کے مریض بھی۔ لکھتے ہیں:

"..... خدا کے لئے دوسرے شمارے کے لئے جلد از جلد اپنی کوئی چیز بھیجو ورنہ میں مر جاؤں گا اور میرے کفن دفن کا انتظام تمہارے ذمہ ہوگا۔ (بھائی میں آج کل آدم خور ہو رہا ہوں۔ مرتا کیا نہ کرتا) — اگر تم کہانی نہیں بھیجو گے یعنی جب تک نہیں بھیجو گے اس وقت تک دوسرا شمارہ شائع نہیں ہوگا۔" (اگر یہ خوش خبری صحیح ثابت ہو تو ایک رات بھوکا رہ کر بھی پانچ پیسے کے بتاشے ہنومان جی یعنی بجرنگ بلی کے مندر میں چڑھاؤں گا) "یہ میرے مرنے مارنے پر اُتر آنے کا ثبوت ہے —" (ہم تو پہلے ہی قبر کے اندر سے بول رہے ہیں۔ آپ ہی تکلف میں پڑے ہیں)

ایک اور صاحب کا طریقِ کار یہ ہے کہ خط پر خط داغتے جاتے ہیں۔ میری نہیں سنتے۔ میں ان کے خطوط بڑے پیار سے فائل میں رکھتا ہوں۔ اُن کے انداز سے معصومیت ٹپکتی ہے۔ یوں بھی ایک خط میں دو تین الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتے اس لئے وقت ضائع نہیں ہوتا۔ ایک خط حاضر ہے:

"پیارے!

کہانی لاؤ

تمہارا..."

بمبئی سے ہندی کے ایک سمپادک (ایڈیٹر) صاحب نے بڑے لوچ دار لفظوں میں چٹھی لکھ کر مجھے آگاہ کیا کہ وہ ہندی کا ایک رسالہ نکالنے والے ہیں اس کے لئے میری کہانی کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے انہیں بور کرنے کی بجائے صرف یہ لکھا کہ وہ کہانی کا معاوضہ بتا دیں۔ منظور ہوا تو کہانی بصیغہ وی پی ارسال کر دی جائے گی — اس پر آپ نے ہڑبڑا کر واپسی ڈاک سے جواب بھیجا اور مندرجہ ذیل نکات میرے ذہن نشین کر دیئے: (۱) رسالہ چھ ماہ یا ایک سال بعد نکلے گا (۲) مضمون ٹائپ کیا ہوا ہونا چاہیئے (۳) ہر مضمون کی نقل اپنے پاس رکھ لیں (۴) مضمون کی واپسی کے لئے ٹکٹ روانہ کریں (۵) کسی مضمون کا اوّل تو معاوضہ نہیں دیا جا سکتا (۶) اگر دیا گیا تو مضمون جانچ کر (۷) بھگوان کے لئے وی پی کسی صورت میں بھی روانہ نہ کریں۔

ظاہر ہے کہ سمپادک صاحب سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کے رسالے میں لکھنا لیکھک کے لئے سات کھٹائیوں والے چورن یا منجن کا کام دے گا۔ لیکن یہ بات لکھ کر میں نے ان کے کومل ہردے کو کشٹ دینا اُچت نہیں سمجھا اس لئے جواب دیا:

"پوجیہ سمپادک جی!

آپ نے جو نیم (اصول) بنائے ہیں وہ واقعی بڑے سُندر ہیں آپ کا رسالہ بھی نیا ہی ہوگا — اگر نکلا تو — اس لئے اس سے تو میں آپ کی سیوا میں شبھ کامنائیں ہی پیش کر سکتا ہوں۔

آپ ہی کا

......."

لوگ کہتے ہیں دل آنے کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ میں کہتا ہوں مضمون ہتھیانے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ ایک ایڈیٹر صاحب کے تیور ملاحظہ ہوں — "..... کے دوسرے شمارے کے لئے کس طرح تم سے کہانی کے لئے کہوں، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ واہگورو جی کو تم مانتے نہیں ہوگے ورنہ انھیں کی قسم دیتا۔ بیوی بچوں کی قسم دینا اور کھانا کوردوقی ہوگی ..... اس صورت میں تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کس طرح

دام کیا جا سکتا ہے ؟"

میلوڈرامٹک اپروچ MELODRAMATIC APPROACH کے نمونے ملاحظہ ہوں — " پیارے بھائی میں ضدی ہرگز نہیں ہوں لیکن اس چیز کا ہمہ وقت افسوس رہتا ہے کہ

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

دوسرا نمونہ :

" گرامی نامہ ملا۔ آنکھوں سے لگایا، بار بار پڑھا، خدا کا شکر ادا کیا . . . . "

ایک ایڈیٹر صاحب کی ڈانٹ ملاحظہ ہو :

" پیارے بلونت !

آخر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ خود ہی خط لکھ کر مطلع کیا کہ افسانہ دو چار روز تک مل جائے گا — اور کئی ہفتے گزر گئے۔ تار بھیجا۔ جواب ندارد"

ایک اور ایڈیٹر صاحب کا پھڑ پھڑاپن ملاحظہ ہو :

" جس طرح بھی ہو جلدی سے کچھ کیجئے۔ اب اتنے انتظار کے بعد کچھ تو ملنا چاہیئے۔ اور میرے لئے اس سے بڑا کوئی انعام نہیں کہ آپ کا افسانہ افسانہ نمبر میں شامل ہو . . . . "

غرض جتنے ایڈیٹر اُتنی ہی باتیں !

نہ جانے کیسے ایک بار ایک غیر ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب نے ایک کہانی معبیوء وی، پی منگالی۔ پسند نہیں آئی۔ لکھا مجھے ہو بہو آپ کی فلاں کہانی کی سی کہانی درکار ہے" تامل کیا، سوچا کہ ایسی کہانی سوجھے تو لکھ کر بھیج دوں۔ اسی اثنا میں ان کا ایک اور خط آیا — " پیسے رکھ لئے کہانی بھی نہیں بھیجی — اچھا خدا آپ کا بھلا کرے۔" میں نے جیسا کہ شریف آدمیوں کا قاعدہ ہے حسب توفیق شرمندگی کا احساس کیا، لیکن ان کی قلندرانہ شان بے نیازی سے دل پر وجد طاری ہو گیا۔ چناں چہ شدومد سے طے کیا کہ ان کی من پسند کہانی ضرور بھیجیں گے۔ لیکن چوتھے ہی روز ان کا ایک اور خط آیا جس میں وہ قریب قریب کراہ اُٹھے تھے : " . . . . . تو سچ مچ ہمارے روپے ہضم کر جاؤ گے، اور ڈکار بھی نہیں لو گے ؟ "

میں ڈکار تو کیا لیتا۔ بھیگی بلی بن کر روپے واپس کر دیئے۔

ممکن ہے کہ ایک آدھ ایڈیٹر ایسے بھی نکل آئیں جو اعتراض کریں کہ صاحب آپ کے پاس تو سال سال بھر تک پیسے پڑے رہتے ہیں۔ آپ کہانی نہیں بھیجتے۔ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اعتراض سولھوں آنے ٹھیک ہے۔ قائل کرنے والی دلیل سے میں فوراً قائل ہو جاتا ہوں . . . . . لیکن اب میرا المیہ TRAGEDY ملاحظہ فرمائیں۔ جو ایڈیٹر پیشگی روپے بھیج دیتے ہیں میں اُن کی شرافت کا اس حد تک قائل ہو جاتا ہوں کہ تہیہ کر لیتا ہوں کہ انھیں شاہکار افسانہ بھیجوں گا۔ پھر جو افسانہ لکھتا ہوں وہ شاہکار دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے انھیں ارسال نہیں کر پاتا — یہاں تک کہ اُن کی بھیجی ہوئی رقم کی پائی پائی خرچ ہو جاتی ہے — اُن کی عنایت کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ اور وہ پھر بھی تقاضے جاری رکھتے ہیں تو دل کو کھلنے لگتا ہے . . . . رفتہ رفتہ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے بیگار لینا چاہتے ہیں۔ بالآخر انھیں کچھ بھیجنا بالکل مفت کے بار برجھ ہونے لگتا ہے۔

ایڈیٹروں کے حلیے، عادات وخصائل و دیگر اوصاف اگرچہ مزیدار ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ مشتے از خروارے بمصداق ایک اچھے خاصے ایڈیٹر صاحب کی حرکت ملاحظہ ہو۔

پچھلے سال لاہور (پاکستان) کے ایک مشہور ادبی رسالے کے مشہور الہ آباد تشریف لائے۔ غریب خانے پر قیام کیا، طعام کیا ہر معقول و نامعقول کا — دبی دبی مسکراہٹیں، جھکی جھکی نظریں۔ بڑے اہتمام سے رخصت ہوئے۔ بخیر و خوبی لاہور پہنچ گئے تو بقول منٹو (مرحوم، مغفور بھی) وہاں سے ایک چھٹی لکھی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے

" بلونت جی !

بخیر و عافیت لاہور پہنچ گیا ہوں۔ ممکن ہے اس اطلاع سے آپ کو خوشی ہوئی ہو۔ "

جیسے میں بارگاہ الٰہی سے دن رات خیر میں اُن کے اللہ کو پیارے ہو جانے کی دعائیں مانگتا رہا ہوں . . .

کرتار سنگھ دگّل

جب عورت ہارتی ہے

رکمنی گھلتی جا رہی تھی۔ رکمنی کے بال گرتے گرتے کہیں چپہ چپہ کہیں بالشت بالشت رہ گئے تھے۔ اور رکمنی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُن کا وہ کیا کرے۔ پھر رکمنی کے بال سفید ہونے شروع ہو گئے۔ کن پٹیوں پر مانگ کے دائیں، مانگ کے بائیں۔ تالو پر۔ چوٹی کو اپنے ہاتھ میں لیتی اور رکمنی کی پلکیں بھیگ جاتیں۔ کبھی گرم گرم آنسو اُن میں سے ٹپکنے لگتے۔ کبھی وہ ایک لمبا سانس لے کر ٹھنڈی یخ ہو جاتی۔ رکمنی کا گورا رنگ پیلا ہوتا گیا۔ پیلا ہوتا گیا۔ پیاز کے چھلکے کی طرح پیلا ہو گیا۔ رکمنی کا چوڑا ماتھا جو اس کے باپ کے خاندان سے اُسے وراثت میں ملا تھا۔ جھرّیوں سے اس طرح بھر گیا جیسے پہاڑی علاقے کی کسی کھیتی میں ٹیڑھا میڑھا ہل پھرا ہو۔ رکمنی کی سیاہ کالی آنکھیں جیسے سیپ ں میں سے کوئی موتی نکال لے۔ خالی خالی، ویراں ویراں، روکھی روکھی صرف دیکھ رہی ہوتیں، انھیں پہچان بالکل نہ ہوتی۔ اس کو ہو کیا گیا ہے۔ جو کوئی بھی رکمنی کو دیکھتا اُس کے منہ سے خود بخود یہ نکل جاتا۔

رکمنی کی بھرے بھرے، گول گول گورے گالوں کا گوشت لٹکتا گیا۔ لٹکتا گیا اور پھر اُس کی ہڈیاں نکل آئیں۔ رکمنی کے ہونٹوں کی پہلے لالی گئی۔ پھر رونق ختم ہو گئی۔ اور پھر وہ سوکھنے لگے۔ ان پر پیپڑی جمنے لگی۔ رکمنی سونے کے لئے جاتی۔ ان پر پیپڑی جمی ہوئی ہوتی۔ رکمنی سو کر جاگتی ان پر پیپڑی جمی ہوئی ہوتی۔ تھوڑی کے نیچے رکمنی کا گوشت ہڈیوں کو چھوڑ کر لٹکنے لگ گیا۔ بجھے ہوئے کوئلوں جیسا رکمنی کا گوشت۔ جیسے کوئی چمگادڑ کسی شہتیر کے ساتھ چمٹی۔ اب گری کہ تب گری ٹوٹ ہی ہو۔ رکمنی سے ہنسا جیسے اب جاتا ہی نہ تھا۔ جب وہ مسکراتی۔ آگے پیچھے زہر گھل جاتا۔ رکمنی کا اُونچا لمبا قد اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس کا کیا کرے۔ جھک جھک کر اس کی پیٹھ جیسے کُبڑی ہو گئی۔ لوگ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے۔ بار بار ایک دوسرے سے پوچھتے: "رکمنی کو کیا ہو گیا ہے۔"

رکمنی رنگ برنگ کے جوڑے چھوڑ کر اب سیدھی سادی دھوتی میں لپٹی ہوتی۔ گھر میں کھڑاویں۔ باہر چپّل۔ جہاں جاتی پیدل۔ ایک پرانا سا چھاتا گرمیوں میں اُسے دُھوپ سے بچاتا۔ جھڑیوں میں بارش سے اُس کو اوٹ دیتا۔ رکمنی کی نوکرانی کی خواہش ہی رہتی کہ کبھی وہ مہندی گھولنے کے لئے کہے۔ کبھی مالش کے لئے یاد کرائے۔ کبھی کجلا اس گھر میں پیسا جائے۔ کبھی اس کے بالوں کو وہ تیل لگائے انھیں سنوار دے۔ اب تو رکمنی نوکرانی سے ہمیشہ اپنا جسم دبواتی رہتی۔ ہاتھ دبوا دبوا کر تھکتی۔ پیر دبوانے شروع کر دیتی۔ پیر دبوائے تھکتی تو کندھے دبوانے شروع کر دیتی۔ رکمنی کے نوکر حیران ہوتے۔ رکمنی کی نوکرانی سوچتی: "آخر اس کو کیا ہو گیا ہے"

رکمنی کو ایک گھن جیسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا اور لوگ سوچ سوچ کے حیران ہوتے۔ وہ رکمنی کون سی تھی جو نمودری کی سب سے حسین لڑکی چنی گئی تھی۔ وہ رکمنی کون سی تھی جس کی طرح سارے کے سارے شہر میں کوئی ناچتا نہیں تھا۔ ہوٹل میں، کلب میں جہاں کہیں بھی ناچتی اپنے ساتھی کو اڑا کر لے جاتی لوگ حیران ہوتے۔ وہ رکمنی کون سی تھی جس کے گز گز لمبے بال سنبھالے نہیں سنبھلتے تھے۔ جس کی آنکھوں کا جادو جیسے مست کر دیتا تھا اُن کو جو اُس کی طرف ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔ وہ رکمنی کون سی تھی جو جہاں سے گزر جاتی خوشبوئیں بکھر جاتیں۔ جہاں بیٹھ جاتی لوگ اُس کی کہانیاں کرتے رہتے۔ ہر کھیل میں نمبر، ہر کام میں آگے ہر بات میں اوپر۔ وہ رکمنی کون سی تھی اور یہ رکمنی کون سی ہے۔ جیسے کسی شیش محل کا کوئی کھنڈر ہو۔ ہر کوئی رکمنی کو دیکھ کر دل ہی دل میں قیاس آرائیاں کرتا تھا۔

"نظر لگ گئی ہے بے چاری کو۔"

کوئی: "کوئی بیماری ہو گئی ہے اسے چاہئے اپنا علاج کروا لے۔ میاں ڈاکٹر

محمد بشیر الحق دسنوی

حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط

بنام

حکیم محمد شمس الحسن سہسوانی مرحوم

حکیم محمد شمس الحسن سہسوانی مرحوم خلف جناب حکیم محمد ضیاء الحسن مغفور میب سبترگیا ۹۔ شعبان [illegible]ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ والد کی حیات ہی میں ابتدائی درسی کتابیں نہرگیا کے علما سے پڑھیں۔ ان کی وفات کے بعد دہلی جاکر عالی جناب شفاء الملک ہم رضی الدین احمد خاں سے علمِ طب کی تکمیل کی۔ بائیس برس کی عمر میں اپنے والد کے قدیم مطب کو ازسرِ نو قائم کیا۔ مطب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔ ملک کے اکثر معزز حضرات کے خطوط مرحوم کے نام آتے تھے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے بعض خطوط درج ذیل ہیں:

(۱)

الہ آباد ۲۶ ستمبر ۱۹۱۹ء

مکرمِ من

اخبارات میں میری علالت کا ذکر چھپا۔ میں خوش تھا کہ قیدِ ہستیٔ دنیا سے نجات پاؤں۔ اب کرنا ہی کیا ہے اور میرے لئے رکھا ہی کیا ہے۔ ناگوار انقلابوں کا سامنا ہے۔ بہرحال زندہ ہوں

کمزور ہے میری صحت بھی کمزوری بیماری بھی
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

اکبر حسین

(۲)

الہ آباد یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء

مکرمی زاد لطفہٗ

اللہ کا کرم ہے کہ اس نے آپ کے دل میں مجھے جگہ دی ہے۔ جوارش کو کھانے کے کتنی دیر بعد استعمال کروں۔ دونوں وقت یا صرف شب کو۔ خدا کرے آپ سے ملنے کا پھر کوئی موقع ملے۔

اکبر حسین

---

(۳)

الہ آباد ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء

مکرمی سلمہ اللہ تعالےٰ

جوارش کو استعمال کیا اس کا اثر دیکھا نافع ہے۔ آپ سے ملنا ہوا تو باتیں ہوں گی۔ آپ کو تو میں یارانِ طریقت میں سمجھتا ہوں۔ دل ملے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے دعائے خیر کرتا رہے۔ دنیا خواب ہے اور لہو لعب۔ فقط

اکبر حسین

ڈاکٹر ست پرکاش سریواستو

جے پور کے عجائب گھر کا نادر ایرانی غالیچہ

جے پور کا عجائب گھر ہندوستانی اور ایرانی غالیچوں کے ذخیرے کے لئے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کے غالیچوں کو دیکھنے کے لئے دنیا کے تمام ملکوں سے ماہرینِ عجائب گھر تشریف لایا کرتے ہیں۔ آج سے قریب آٹھ سال پیشتر غالیچوں والے کمرے میں سب کو جانے کی اجازت نہیں تھی اور خاص لوگ ہی جا سکتے تھے۔ مگر اب ہر خاص و عام کو اس کمرے میں جانے اور غالیچوں کو دیکھنے کی اجازت ہے۔

یوں تو مہاراجہ جے پور کے پُرانے محلات میں بھی کافی تعداد میں غالیچے محفوظ ہیں مگر انھیں ہر شخص دیکھ نہیں سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ماہرینِ فنونِ لطیفہ اُن کی خوبیوں سے واقف نہیں ہیں۔

آیئے آپ کو ہم جے پور کے عجائب گھر کے غالیچوں والے بڑے کمرے میں لے چلیں اور دیوار میں تخت پر بچھے ہوئے بڑے ایرانی غالیچے کی خوبیاں بتلائیں۔ یہ غالیچہ بہت بڑا ہے اس لئے اس کا نصف سے کچھ ہی زیادہ حصّہ کھلا ہے۔ باقی حصّہ لپٹا ہُوا ہے۔ مہینے دو مہینے کے بعد لپٹا ہوا اور کھلا حصّہ باری باری ایک دوسرے کی جگہ لیتا ہے۔

یہ ایرانی غالیچہ ۲۸ فٹ ۴ انچ لمبا اور ۱۲ فٹ ۴ انچ چوڑا ہے۔ اس میں ایک مربع انچ میں ۲۵۶ گانٹھیں ہیں۔

بُنائی کے خیال سے اس میں سوت کی چار چار ڈوریاں بٹ کر لگائی گئی ہیں۔ اون کی ڈوری دُہری بٹ کر لگائی گئی ہے۔ یہ ڈوری کہیں پیلی، کہیں لال اور کہیں نیلی ہے۔

غالیچہ کالی زمین پر بُنا گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف حاشیہ ہے۔ یہ نیلے رنگ کا ہے مگر تنگ ہے۔ یہ حاشیہ پھولوں کا ہے۔ حاشیے پر جو ٹیڑھی بیل ہے اس میں گلاب کی طرح کے پھول ہیں۔ ان پھولوں کے ساتھ کھجور کی طرح کے پنکھے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ پانچ کلیوں والے شگوفے ہیں۔

اس غالیچے میں طرح طرح کے رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان رنگوں میں ہلکا سبز، گہرا سبز، ہلکا لال، گہرا لال، ہلکا پیلا، گہرا پیلا، نارنجی، گہرا نیلا، آسمانی، خاکی، ہلکا اور گہرا گلابی، ہلکا اور گہرا بھورا رنگ خاص طور سے استعمال ہُوا ہے۔

اس غالیچے میں جو نالی کا پانی دکھلایا گیا ہے اس کے لئے ہلکا بالائی رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے راستے کی زمین کا رنگ لال رکھا ہے۔ لال رنگ ہی غالیچے کا سب سے خوش نما رنگ ہے۔ اس لال رنگ زمین پر جو بیل بوٹے ہیں وہ طرح طرح کے رنگوں میں بنائے گئے ہیں۔ ان کے دائرے میں طرح طرح کے رنگوں میں باغوں کے کئی چوکور ٹکڑے ہیں۔ یہ چار باغ ہیں اور ہر ایک میں پانچ پلاٹ ہیں۔ ان پلاٹوں میں الگ الگ رنگ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چار چار باغوں کے پلاٹوں کا منظر اوپر اور نیچے دونوں طرف یکساں دیتا ہے۔ ان میں جو رنگ استعمال کئے گئے ہیں وہ سب ان پانچ پلاٹوں مجموعے سے مختلف ہیں۔ چار پلاٹوں کے رنگوں میں گلابی، گہرا نیلا اور پیلا بھی شامل ہے۔ باقی جگہ جو رنگ استعمال کئے گئے ہیں اُن کے بارے میں پہلے کیا جا چکا ہے۔

غالیچے کے باغات میں جو درخت دکھلائے گئے ہیں اُن میں زیادہ تر درخت ہیں۔ ان میں انار، کھجور، سیب، انجیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہر ایک میں تین خاص درخت رکھے گئے ہیں۔ بہت کم پلاٹ ایسے ہیں جہاں ایک ہی درخت ہے۔ کچھ میں سایہ دار درخت اور کچھ میں پھل دار درخت ہیں۔

درختوں کے علاوہ چند پرندے بھی دکھلائے گئے ہیں۔ پرندوں میں طوطا، سارس وغیرہ شامل ہیں۔ جانوروں میں گینڈے، لومڑی، بارہ سنگھا، چیتا، چینی سانپ نمایاں ہیں۔ مچھلیاں، مرغابیاں اور پانی کے سانپ وغیرہ بھی بنائے گئے ہیں۔

جانوروں اور درختوں پر بہ نظرِ غور دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس غالیچہ میں موسمِ بہار کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا احساس اُن درختوں کے دیکھنے سے ہوتا ہے جو پھلوں سے لدے ہوئے ہیں اور جن پر خوبصورت پرندے چہچہا رہے ہیں۔

اب آیئے اس غالیچہ کی اور خوبیوں پر نظر ڈالیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالیچہ میں جس بڑے باغ کا منظر پیش کیا گیا ہے وہ اُس زمانے کا کوئی خاص باغ ہوگا۔ اس غالیچہ میں ایسے باغ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ جس کے ہر سمت نہریں اور نالیاں جاری ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالیچہ شاہ عباس کے زمانے کے اصفہان شہر کی نقل پیش کرتا ہے۔ شاہ عباس نے ایک بہت بڑی نہر زندہ رود دریا سے نکلوائی تھی اور اس کو کئی چھوٹی نہروں میں تقسیم کرایا تھا۔ جس کے ذریعے بہت سے چھوٹے اور بڑے باغات کی آب پاشی کا انتظام کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دریا، نہروں اور باغات کا ایک نقشہ اس غالیچہ میں پیش کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ زندہ رود اصفہان کے مغرب سے ۹۰ میل کے فاصلے پر زندہ کوہ سے نکلتی ہے۔

شاہ عباس کے دو بڑے محل 'چہل ستون' اور 'ہشت بہشت' کہلاتے ہیں۔ ان دونوں محلوں کے چاروں طرف بڑے بڑے باغ ہیں۔ ان کے چاروں طرف ۔۔ بنے ہیں۔ اور درختوں کو سینچنے کے لئے نہریں بنی ہیں۔ ان نہروں کی زمین پختہ ہے اور ان میں مستقل فوارے بنے ہوئے ہیں۔

بڑے بڑے درختوں کو پھولوں اور پھلوں سے لادنے میں کاریگر نے کوئی بھول نہیں کی ہے۔ ساتھ ہی اُس نے ان سب کو خوش نما اور شوخ رنگوں میں پیش کرنے میں بھی غلطی نہیں کی ہے۔ البتہ کاریگر نے کہیں کہیں بہت آزادی سے کام لیا ہے اور اصلیت سے آگے بڑھ گیا ہے۔ کاریگر نے جو آبی جانور پیش کئے ہیں وہ بڑے خونخوار دکھاتے ہیں۔ پرندے ایسی حالت میں دکھلائے گئے ہیں کہ اصلیت کو بھی مات کرتے ہیں۔

کاریگر نے پورا غالیچہ ۲۸ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ درمیان میں ایک تالاب ہے اور اس تالاب کے چاروں طرف ۱۲ باغوں کے چار الگ الگ حصّے رکھے گئے ہیں۔ ایک حصّے میں اس طرح سے ۱۲ باغات ہیں۔ باقی حصّوں میں ایک ہی طرح کے ۱۲ باغات کے مناظر دکھلائے گئے ہیں۔ مگر ان سب میں ایک دفعہ جو رنگ استعمال کیا گیا ہے اُن کو دوبارہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ غالیچے کے چار خاص حصّے کئے گئے ہیں ان میں سے ۹ میں چھوٹے چھوٹے باغ دکھلائے گئے ہیں۔ باقی ۴ میں اصل زمین کے تقسیم شدہ حصّے ہیں۔ بڑے باغ کو اور اس کے ساتھ کے دوسرے چھوٹے چھوٹے باغوں کو پانی بڑے درمیانی تالاب سے ملتا ہے۔ مگر یہ پانی بیچ کی ایک نہر سے ہو کر آتا ہے۔ بیچ کے بڑے تالاب کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں۔ بیچ کے تالاب کے چاروں طرف کئی چھوٹی چھوٹی نہریں ہیں جن سے ہو کر پانی باغات میں جاتا ہے۔ نہروں کا پانی بادامی رنگ کا ہے اور پانی کی لہروں کو ہلکے نیلے رنگ میں دکھلایا گیا ہے۔ مچھلیوں اور مرغابیوں کو بھی پانی میں تیرتے ہوئے بڑی خوبی سے دکھلایا گیا ہے۔

باغ کے بیچوں بیچ جہاں سے پانی نہروں اور تالابوں سے ہو کر باغات کی طرف جاتا ہے ایک بہت بڑا تالاب ہے جس میں ایک بہت بڑا چبوترا ہے۔ اس چبوترے کے اوپر ایک ہلکے نیلے رنگ کا گنبد ہے۔ اس گنبد کے اندر کا حصّہ بہت سجا ہوا ہے۔ اس میں ایک شاہی تخت ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ فارس اس تخت پر بیٹھ کر باغ اور تالاب کا منظر دیکھتے ہوں گے۔ چبوترہ پکّی اینٹوں کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس کی دیواریں بھی پختہ اینٹوں کی ہی ہیں۔ اس عمارت کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ پانی کے اوپر سے کوئی راستہ اس عمارت میں نہیں آتا ہے۔ عمارت کے آس پاس کے حصّے میں آبی جانور بے شمار تعداد میں ہیں ان جانوروں میں چینی جانور بھی ہیں۔ کچھ جانور پانی میں بڑے لطف اٹھا رہے ہیں اور کچھ ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہیں۔ دیگر حصّوں میں بھی آبی جانور ہیں۔ باغوں میں درختوں کی شاخوں پر جو چڑیاں بیٹھی ہیں وہ سب بڑی خوشنما ہیں۔

غالیچے کے کام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ۳۰۰ برس سے زیادہ پرانا ہے۔ اس پر لکھا ہوا لیبل بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تین سو برس پہلے خریدا گیا تھا۔ اس غالیچہ پر ایک جگہ لیبل پر یہ تحریر ہے۔ منشی رام جی۔ ایک چار باغ کی کاریگری کا بیر ملکی غالیچہ۔ بیچ میں ایک بڑا تالاب جس میں حاشیے پر جانور چاروں طرف مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ اور جس میں باغ کا خطّہ پانچ رنگ کا ہے اور جس کی کناری ریشمی ہے اور جس کی لمبائی ۱۲ ۳/۴ اور چوڑائی ۵ ۱/۲ ہے اور جو ایک حصّے میں ہے۔ داخلے کی تاریخ صفر ۱۲۔ ۱۰۴۲ھ جو عیسوی سن کے مطابق ۲۹۔ اگست ۱۶۳۲ء ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ غالیچہ مہاراجہ مان سنگھ کابل سے لائے تھے۔

یہ غالیچہ آمیر کے محلات میں ۱۹۳۷ء تک پڑا رہا اور ۱۹۳۷ء میں جناب امرناتھ اٹل کے زمانے میں جبکہ وہ وزیر مال جے پور تھے، جے پور لایا گیا۔ اس طرح تقریباً ۲۰ سال سے یہ غالیچہ جے پور کے عجائب گھر کی زینت ہے اور خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

یومِ جمہوریت

"پچھلے سال جنوری میں جشنِ جمہوریت کے سلسلے میں ایک مشاعرہ دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ ذیل کی دونوں نظمیں اسی مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں۔ (ادارہ)

آلِ احمد سرورؔ

زندگی میں ایک دن ایسا بھی آتا ہے سرورؔ
ایک لمحے میں سمٹ آتے ہیں کتنے ماہ و سال
ہر نفس میں جلوہ گر ہوتا ہے باصد آب و تاب
کتنے قرنوں کا تجمّل، کتنی صدیوں کا جلال
جگمگا اُٹھتی ہے اک سوزِ یقیں کی شمع سے
وقت کے ہاتھوں کی دُھندلائی ہوئی بزمِ خیال
صبحِ نو کی اک کرن سے خود بخود ہوتی ہے محو
شب کی تاریکی نے بخشی تھی جو کچھ گردِ ملال
روح کی گہرائیوں میں کیا ہی کِھلتے ہیں چمن
اللہ اللہ ہند کی صبحِ بہاراں کا جمال

یہ مقدّس دن، یہ صدیوں کی تمنّاؤں کا عطر
کتنے خوابوں کا دیا، کتنی امیدوں کی کرن
اس کی زینت، اس کی زیبائش بڑھانے کے لئے
حل ہوا کتنے شہیدانِ وطن کا بانکپن
کتنے قید و بند نے روکا تھا اس کا راستہ
راہ میں تھے اس کی حائل کس قدر دار و رسن
کتنی ٹیسوں میں نویدِ جانفزا تھی اس کی یاد
کتنے زخموں کا تھی مرہم اس کی اک پیہم لگن

یہ مبارک دن منانے کے لئے درکار ہے
اک ادائے سرفروشی، اک نوائے سینہ تاب
عشق اپنے جلوۂ صد رنگ کی ہر آن سے
حاملِ قوسِ قزح مثلِ شعاعِ آفتاب

فکر میں کوہِ ہمالہ کی بلندی کا جلال

شوق میں گنگ و جمن کا سا مسلسل اضطراب

روحِ گوتم کی طہارت ذہنِ اکبر کا شکوہ

قلبِ گاندھی کی حرارت، فکرِ نہرو کا شباب

ہر نفس میں تازہ کاری، ہر قدم پر طرحِ نو

کہنہ و فرسودہ ہر شے کو پیامِ انقلاب

ہند کی تقدیر کیا ہے ایک شعلہ ایک شوق

آج ہر سینے میں ہو روشن شرارِ آرزو

لاکھ فطرت مہرباں ہو سعیٔ پیہم کے بغیر

کیا جگائے دشتِ ویراں کو بہارِ رنگ و بُو

شیشہ سازی ہے فقط خارا تراشی کا کمال

غازۂ تہذیب ہے سعیٔ فسردہ ژاں کا لہو

کاش ہم پر فاش ہو جائے یہ رمزِ کائنات

روحِ ماضی کے امیں سے عصرِ نو کی آبرو

ایک منزل پہ ٹھہر جاتا ہے مستی کا زوال

زندگانی خوب سے ہے خوب تر کی جستجو

دل ہے یہ تجدیدِ پیمانِ محبت کے لئے

دعوتِ تازہ ہے ہر چشمِ بصیرت کے لئے

محمود دہلوی مرحوم

چمن میں بلبلیں ہر سمت چہچہاتی ہیں — فضائیں نغمۂ دلکش ہمیں سناتی ہیں
ہوائیں آج ترانے خوشی کے گاتی ہیں — کھلے ہیں پھول بھی کلیاں بھی مسکراتی ہیں

بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

نشاط و عیش کا آئینہ دار آ ہی گیا — وہ زندگی کے چمن پر نکھار آ ہی گیا
وہ جس کے آنے کا تھا انتظار آ ہی گیا — وہ جھوم جھوم کے ابرِ بہار آ ہی گیا

بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

جو غم کے ساتھ تھی مہمان وہ برات گئی — جو دن کو رات بناتی رہی وہ رات گئی
ہجومِ یاس گیا تلخیٔ حیات گئی — جھکے نہ غیر کے آگے نہ اپنی بات گئی

بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

چمک رہے ہیں ستارے چراغ جل تو گئے — اندھیری رات کے سائے تمام ڈھل تو گئے
کھلے ہیں پھول فضاؤں کے رُخ بدل تو گئے — کھٹک رہے تھے جو کانٹے وہ سب نکل تو گئے

بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

اُٹھاؤ سازِ طرب زندگی کی بات کرو — غموں کو دل سے بھلاؤ خوشی کی بات کرو
اندھیرا جا چکا اب روشنی کی بات کرو — چمن میں پھول کھلاؤ کلی کی بات کرو

بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

بنا ہے زینتِ دستور جشنِ آزادی — ہے چشمِ شوق کو منظور جشنِ آزادی
ہُما ہوں دیکھ کے مسرور جشنِ آزادی — نظر نواز ہے محمود جشنِ آزادی

بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

مہدی عباس حسینی

گھاٹا

میرا من دلّی کے موسم سے اوب چکا تھا۔ جب دیکھو پانی، جہاں دیکھو پانی، لکڑی گیلی، کوئلہ گیلا، سبزی بھاجی کے دام چڑھ گئے، دودھ میں پانی بڑھ گیا، اور تو اور بازار سے دودھ اور ترکاری دونوں غائب ہو گئیں۔ نوکر منڈی جانے کے لئے چھتری مانگنے لگا۔ گاڑی الگ اسٹارٹ ہونے میں نخرے کرنے لگی۔

اچھی طرح یاد تھا کہ کل ہی دو گیلن پٹرول ڈلوایا تھا لیکن ڈرائیور تیل کے پیسے مانگ رہا تھا اور سوئی سے صاف لگتا تھا کہ ٹنکی خالی ہو چکی ہے۔ میں نے بہیتری بار سوچا ہے یہ ڈرائیور لوگ تیل اور میل کی سوئی میں ضرور گڑبڑ کر دیتے ہیں۔

"لیکن ک۔ک۔کل ہی تو۔" میں نے کچھ ہکلاتے ہوئے کہا۔ گھبراہٹ، غصے یا جھنجھلاہٹ میں بڑے بڑے لوگ ہکلانے لگتے ہیں۔ پر جب میں ہکلا کر بات کرتا ہوں تو لوگ مجھ کو عجیب طریقے سے دیکھتے ہیں۔

"بی بی جی کل میڈیم سیر کو گئیں اور تین پارٹی بارہ کیے۔" ڈرائیور نے جیسے کسی ناسمجھ بچے کو بڑے صبر کے ساتھ سمجھایا۔

"اچھا اچھا" میں نے دس کا نوٹ دیتے ہوئے کہا "ایک گیلن پٹرول اور ملٹی گریڈ موبل آئل ڈلوا دینا۔"

ایسا نہیں کہ میں کوئی دس روپے روز کا پٹرول پھونک نہیں سکتا۔ پتا جی اچھی آڑھت چھوڑ کر سورگباش ہوئے تھے اور ادھر میں نے کمیشن ایجنٹی کا کام بھی بڑھا لیا تھا۔ پھر بھی آدمی اپنے سارے خرچے کا اندازہ لگاتا ہے اور اس سے زیادہ خرچ ہونے پر جھنجھلاہٹ ضرور ہوتی ہے۔ دوسرے تاؤ تو اس پر آتا ہے کہ یہ لوگ مجھے کچھ سیدھا آدمی سمجھتے ہیں۔ بے وقوف تو نہیں بنا سکتے۔ مجھے کوئی کیا کھا کر دھوکا دے گا۔ لیکن سارے نوکر جب بھی کوئی بڑی بات ہو، بس بی بی جی سے پوچھتے ہیں۔ میں تو صرف چیک کاٹنے کی مشین ہوں۔

یہ دوسری بات ہے کہ جہاں تک موہنی کا معاملہ ہے میں اُسے سچ مچ بے وقوفوں کی طرح چاہتا ہوں۔ مجھے اب تک بڑا اچنبھا ہے کہ اس نے ہزاروں آدمیوں کو چھوڑ کر مجھ سے کیسے شادی کر لی۔ میں بدصورت تو نہیں لیکن کچھ ایسا خوبصورت بھی نہیں۔ چھوٹا موٹا، گول مٹول، بال کم، دانت بڑے جو ہنسنے میں بہت آگے نکل آتے ہیں۔ موہنی کہتی ہے، میں بھلا آدمی ہوں۔ اُسے میری بھلائی اور سیدھا پن پسند آ گیا۔

میں کتنا خوش تھا کہ جب میں موہنی سے شادی کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو کمتا انگلینڈ میں تھا۔ کمتا میرا بہت پیارا دوست ہے۔ بچپن کا ساتھی سکول کالج اور یونیورسٹی میں ہم جماعت۔ لیکن میں پڑھنے لکھنے میں بس واجبی تھا اور وہ بہت تیز۔ پھر اس لمبے، دُبلے، چتپلے لڑکے کی صورت میں نہ معلوم کیا بات تھی کہ لڑکیاں تو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ شاید اس لئے بھی کیونکہ وہ اُن سب کی طرف سے بالکل بے پروا تھا۔ رسالے پڑھتا، فلم دیکھتا، کرکٹ کھیلتا تقریریں کرتا، یار دوستوں سے ہمیشہ ہنسی خوشی کی باتیں کرتا۔ میری زندگی میں جو کچھ نہیں تھا اس کے پاس بیٹھ کر پورا ہو جاتا۔

کمتا میں غریبی کے سوا اور کوئی عیب نہ تھا۔ میں نے خود پتا جی سے کہہ کر اپنی فرم میں نوکر کرا دیا تھا اور وہ فرم ہی کے روپیہ سے انگلینڈ گیا تھا۔ دراصل جانا تو مجھ کو تھا لیکن پتا جی کے سورگباش ہو جانے سے سارا کام مجھی کو سنبھالنا پڑا۔ کمتا نے ہر جگہ بڑا نام پیدا کیا۔ اسے لوگوں کو دوست بنانے کا گر آتا ہے۔

موہنی نہ معلوم کیوں اُس سے بہت چڑھتی ہے۔ کہتی ہے یہ اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں دونوں شاید ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔

موہنی ایک تو خوش مند، پھر کتنے کام، کتنی باتیں بڑے اچھے ڈھنگ سے کر لیتی ہے دوسرے میں بھی برابر کا گُن پایا جائے، عورت سے شاید یہ نہیں برداشت ہو سکتا۔ میں کہتا ۔ "موہنی، کمتا واقعی ہیرا ہے۔" وہ کہتی ۔ "ہیرے اور کوئلے میں کیا فرق۔ بس ایک میں چمک بھڑک زیادہ ہوتی ہے۔" میں کہتا : "کمتا کو کھانے پر بُلائیں؟" وہ کہتی ۔ "ماتحتوں کو سر چڑھانا اچھا نہیں۔" اِدھر کمتا بھی بڑے ادب تمیز سے بات کرتا ہے۔ آج تک کبھی اس نے موہنی کو نام لے کر نہیں پکارا۔ البتہ کبھی کبھی بڑے بے ڈھب فقرے کستا ہے : "مسز مہرا کے کان کا بُندا قطب مینار کی یاد دلاتا ہے۔" "کل شام مسز مہرا ہری ساری اور لال لپ اسٹک میں طوطے کی طرح حسین لگ رہی تھیں" اور جب موہنی نے گھور کر دیکھا تو بولا : "گھبرائیے نہیں مسز مہرا، جیوتشی نے کہا ہے کہ میں جلد ہی مرنے والا ہوں۔ پھر یہ ٹیں ٹیں بھی بند ہو جائے گی۔" پھر اک دم سے بولا "آپ کے کوئی چھوٹی بہن تو نہیں مسز مہرا ؟"

"نہیں"۔ موہنی دب سٹ میں کہہ گئی

"تب تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں کنوارا ہی مروں گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ آج موت کی کیا رٹ لگا رکھی ہے ۔"

کہنے لگا : "بدہضمی میں موت بہت یاد آتی ہے۔ پیٹ نہ ہو تو جیون میں رہ کیا گیا۔ جبھی تو میں عورت کے بغیر رہ سکتا ہوں لیکن چورن ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر جیب سے پڑیا نکالی۔ معلوم نہیں کاہے کی۔ جلیا کبیس کا۔

موہنی کچھ ٹرک کر بولی : "آپ مجھے مسز مہرا کیوں کہتے ہیں ؟"

بن کر کہنے لگا : "کیا آپ مسز مہرا نہیں ! اچھا تو آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو مسز گورو کہا کروں۔" اس پر مجھے ہنسی آ گئی ۔ میں اپنا بڑا سا منھ پھاڑ کر ہنس رہا تھا۔ میرے سارے جسم میں ہنسی کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے زلزلے آ رہے تھے۔ موہنی کا چہرہ مارے غصّے کے سُرخ ہو گیا۔ وہ چپکے سے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

"آپ کو اُسے نکالنا ہوگا۔ میں اُس سے نفرت کرتی ہوں، ایڈیٹ، بدتمیز۔"

"دیکھو بزنس میں ذاتی پسند ناپسند سے کام نہیں چلتا۔ کمتا بڑا قیمتی آدمی ہے ہماری ساری کیشن ایجنسی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔" "تو تم کیا بالکل نکمے ہو ؟"

موہنی نے چوٹ کی۔ "تو تم کیا چاہتی ہو کہ وہ بالکل بھوکوں مر جائے"۔ میں نے جواب دیا۔ اس پر موہنی چُپ ہو گئی ۔ پھر اک دم ہنس کر کہنے لگی۔ "اچھا جانے دو گورو سیٹھ، جب تمھیں گورو بھائی بُرا نہیں معلوم ہوتا تو کچھ کیا۔"

سچ پوچھئے تو یہ "گورو بھائی" مجھے بھی کانی کھلتا ہے۔ اچھا خاصا نام ہے سیٹھ گوردھن داس مہرا۔ مگر اس پاجی نے جو بچپن سے گورو بھائی کہنا شروع کیا تو آج تک یہی کہے جاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ سب کے سامنے نہیں کہتا، دفتر میں ہمیشہ سیٹھ جی یا بھائی جی کہتا ہے۔

موسم خراب ہو گیا تھا۔ کمتا دو ہفتے تک کوٹھی پر نہ آیا۔ اس کے نہ آنے سے کچھ چہل پہل نہیں رہی۔ آخر موہنی خود بولی۔ "گورو سیٹھ آپ کے دوست جیتے ہیں یا چل بسے"۔ میں نے کہا۔ "مرا تو نہیں لیکن مرنے لگا ہے"۔ "کیا مطلب؟" وہ تیکھے ہو کر بولی۔ مجھے ذرا شرارت سوجھی۔ "ارے تم اس کا بیاہ ویاہ تو کراتی نہیں، وہ آفس کی ایک لڑکی سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔"

"میں تو اُسے ہمیشہ ذلیل سمجھتی تھی۔" موہنی دانت پیس کر بولی۔

مزے کی بات تو یہ تھی کہ کمتا بے چارے کو مرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ وہ فرم کے کام میں بے حد مشغول تھا۔ برسات کی وجہ سے بنگال، بہار، اتر پردیش سارے صوبوں میں ہمارا کاروبار گڑبڑ ہو گیا تھا۔ پھر کمتا کو سماج سیوا وغیرہ کا بھی شوق تھا نا۔

ایک روز ڈرائیور نے کہا : "حضور جنتا جی میں باڑھ آ گئی ہے۔ اپنا گاؤں نیچی زمین پر ہے۔ چھٹی ملے تو بیوی بچّوں کو لے آؤں۔" دیکھا دیکھی دفتر کی گاڑی کے ڈرائیور نے بھی چھٹی مانگ لی۔ اب کار موہنی چلائے یا کمتا میں اس جھنجھٹ سے دور رہتا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ صلح ہو گئی یعنی پھر اک جھونک جاری ہو گئی۔ دونوں ملتے، باتیں کرتے، ایک دوسرے کو چیزیں اُٹھا کر دیتے۔ پر کمتا میرا کتنا ادب کرتا۔ کبھی موہنی کے برابر نہ بیٹھتا۔ پٹرول کا بل دس روپے روز سے بھی زیادہ ہو گیا۔ کمتا کار لے کر نہ معلوم کہاں کہاں اٹا پھرتا۔ ایک روز گاڑی لے کر اتنی دیر میں پہنچا کہ میں ایک پرانے گاہک سے ملنے نہ جا سکا۔

"معلوم ہوتا ہے میں اپنی گاڑی کے لئے بھی تمھارا محتاج ہوں۔" میں نے بڑے تاؤ سے کہا۔

اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ شیو بڑھا، آنکھیں لال، سوٹ میلا اور شکن پڑا۔ بال روکھے اور اُلجھے۔ تھکے ہوئے روکھے لہجے میں بولا۔

"سیٹھ جی آپ کی گاڑی آپ کو مبارک ۔ اپنی دوسری چیزیں بھی ذرا سنبھال کر رکھئے ۔" اور پلٹ کر ایک تانگے پہ چلا گیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آخر کیا" موہنی نے پوچھا

"یہی کہ کل دو گیلن پٹرول ڈلوایا تھا۔ سوئی سے معلوم ہوتا ہے گاڑی نشو ہیں چلی۔"

"کھنّا نے اور پٹرول ڈلوا لیا ہوگا۔"

"اپنے پیسے سے ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تعجب کی کیا بات ہے" موہنی بولی۔ "اپنے کام کے لئے گاڑی لے جاتا ہے تو اپنے پیسے کیوں نہ خرچے۔"

"مگر یہ راتوں میں کہاں جاتا ہے"۔ میں نے تھک کر پوچھا۔ "ایک سوسیل"

"جہنم میں۔ اپنے یار دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے میں" وہ تیز ہو کر بولی

اُس دن کھنا دفتر نہیں آیا۔

دوسرے دن بھی کھنّا دفتر نہیں آیا۔ مکان پہ آدمی دوڑائے۔ دکانوں پر، کلب میں، سینما تھیٹر ہر جگہ تلاش کی۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ مجھ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ کہیں خفا ہو کر ادھر اُدھر تو نہیں چلا گیا۔ موہنی میری پریشانی سے پریشان تھی۔ انھیں باتوں کی وجہ سے موہنی پر جان دیتا تھا۔ کتنا بڑا دل ہے اس کا۔ کھنا کو بار بار جلی کٹی سناتی۔ لیکن گھڑی گھڑی پہ اس کی خبر بھی پوچھتی جاتی۔

شام کو جیا تک دھندلکا چھا گیا۔ اس پر دھواں دھار بارش سے ادھ بھی ناک میں دم تھا۔ رات کو آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ "سیوا سماج کے دفتر سے بول رہا ہوں۔ کھنا جی ایک کشتی لے کر باڑھ میں گھرے ہوئے گاؤں سے لوگوں کو نکالنے گئے تھے۔ کشتی اُلٹ گئی۔۔۔" "م موہنی !" میں نے چلّا کر کہا "کہ کھنا ڈوب گیا !" موہنی نے میری طرف عجب بے بسی سے دیکھا اور بے سدا گر گری۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن فون ہاتھ میں لگا گسٹ آیا۔ کوئی چیخ رہا تھا: "کھنا جی ڈوبے نہیں کھنا جی زندہ ہیں۔" "م موہنی۔" میں ٹیلیفون پھینکتے ہوئے چیخا: "کھنا زندہ ہے وہ ڈوبا نہیں۔" لیکن موہنی سامنے بے ہوش پڑی تھی۔ یکایک بجلی چمکی اور جیسے میری آنکھیں کھل گئیں۔ نہیں نہیں میرا دل چیخا۔ "موہنی اس سے نفرت کرتی ہے! وہ تو اس سے نفرت کرتی ہے" لیکن جب میں موہنی کو اُٹھانے کے لئے آہستہ آہستہ ایک بوڑھے کی طرح جھکا تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بہت بدصورت، بہت موٹا اور بہت بے وقوف ہوں۔

فضا ابن فیضی

غزل

ساقیا! جامِ بادہ عنبی — بڑھ چلا ہے خمارِ تشنہ لبی

میکدہ اور شکر خشک لبی — دیکھ! حسنِ مذاقِ بے طلبی

دھندلی دھندلی ابھی ہے صبحِ حیات — اور اٹھا پردہ ہائے تیرہ شبی

کیوں یہ اپنی عروجِ ہمہ دانی — آدمی ہے شہیدِ بوالعجبی

کبھی ڈھل جا غزل کے سانچے میں — اے نشاطِ فغانِ نیم شبی

کیسے کہہ دوں کہ تیرے جلووں سے — سیکھ لی ہے نظر نے بے ادبی

ہر نفس ہے جنوں کا حلقۂ موج — دور ہے ساحلِ سکوں طلبی

رنج کیا انتظارِ ساغر کا — کم نہیں ہے سرورِ بے طلبی

خالقِ کل! تری دہائی ہے — زندگی ہے حریمِ بولہبی

جبر کہیئے کہ اختیار فضا

ہر سبب ہے دلیلِ بے سببی

وارث کرمانی

دیوانِ حافظ پر ایک نظر

حافظ شیرازی کو ہمیں بھولے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ابھی پچاس سال پہلے تک اُن کا دیوان ہر اُردو داں کے گھر کی زینت رہتا تھا۔ لوگ اُنھیں لسان الغیب کہہ کر پکارتے تھے۔ اُن کے دیوان سے فال نکالی جاتی تھی اور اُن کے رنگ میں شعر کہنا شاعری میں پایۂ اعتبار تک پہنچنے کے برابر تھا۔ غرض کہ ہماری تہذیب کے چپے چپے پر اُن کی عظمت کے نقوش ثبت تھے۔ دیوانِ حافظ ہماری تہذیب کا ایک وسیع اور دلکشا مرقع ہے جس سے اردو ادب کی سب سے مہذب اور شائستہ صنفِ سخن غزل نے طاقت اور توانائی حاصل کی ہے۔ دہلی سے سمرقند اور سمرقند سے بغداد تک پیدا ہونے والے کسی بھی سخن ور نے غالباً ہماری شاعری کی تحلیل و تشکیل پر حافظ سے زیادہ ہمہ گیر اثر نہیں ڈالا۔

دیوانِ حافظ کا تاریخی پس منظر بیت پُر آشوب اور خلفشار سے بریز نظر آتا ہے۔ تاتاریوں کی یورشوں نے خطا و ختن، کشمیر و کاشغر، خراسان و خوارزم غرض کہ سارا وسطِ ایشیا تہ و بالا کر ڈالا تھا۔ دُنیا نے کشت و خون اور بربریت کا وہ عالم دیکھا تھا کہ روم و فرنگ تک لرزہ بر اندام ہو رہے تھے۔ حافظ کے دَور کی ذہنی اور ادبی فضا کو اس عالم گیر تاریخی طوفان سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ جیسا کہ ہماملکی و سیاسی انقلابات تیزی سے رونما ہوئے اُسی تیزی سے ادبی و معاشی قدریں بدل گئیں۔ نویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک فارسی ادب کا ایک خاص آہنگ رہا ہے۔ جو اس کے بعد بہت تیزی سے بدل جاتا ہے چناں چہ دولتِ سامانیہ سے لے کر غزنویوں کے وقت تک ادب میں ہمیں ایک زمزمے کی سی اُمنگ اور حوصلہ ملتا ہے۔ تاریخیں نظم و نثر دونوں میں لکھی گئیں۔ اگر پچھلے بادشاہوں کی عظمت کو بلعمی و دقیقی و فردوسی نے بے نقاب کیا تو معاصر حکمرانوں کی تعریف میں انوری و خاقانی نے قصائد لکھے۔ اس ادبی دور کو ایک طرف غزنویوں کے جاہ و جلال اور سامانیوں کی ادب نوازی پر اعتماد تھا تو دوسری طرف اُسے اپنے ماضی کی عظمت پر بھی بڑا ناز تھا۔ باوجودیکہ اسلام کا پرچم ہر کاخ و کو میں لہرا رہا تھا۔ لیکن فریدوں و بہمن کی دنیا دلی اور رستم اور اسفندیار کی شجاعت کے ترانے گائے جا رہے تھے۔ منگول حملہ آوروں نے یکایک یہ فضا درہم برہم کر دی۔ مقامی فرماں رواؤں کی ساکھ ٹوٹ گئی اور ماضی کا فخر اور حال کی اُمنگیں خاک میں مل گئیں۔ ادب بجائے جوش و خروش دکھانے کے پناہ ڈھونڈھنے لگا۔ تسلی اور سکون کا متلاشی ہوا اور مذہب و فلسفہ و اخلاق کے دامن میں پناہ لی۔ رزمیہ مثنویوں اور مدحیہ قصائد کی جگہ مراقبہ و تصوف نے لے لی۔ دُنیا کی بے ثباتی، انسانی مجبوری اور تقدیریہ کی سفاکی خیالات کا مرکز بن گئیں۔ بعض اہلِ قلم حالات کے آگے سپر انداختہ ہو گئے۔ مثلاً عراقی، بعض نے اُن کا فلسفیانہ حل تلاش کرنے کی کوشش کی اور ہمت افزائی جاری رکھی مثلاً مولانا روم لیکن سوچنے کا انداز سب کا بدل گیا۔ حافظ کی رندی و سرمستی اس دَور کی افسردگی کا ردِ عمل ہے۔

حافظ کا سب سے بڑا کارنامہ غزل ہے اس صنف میں اُن کے معلم سعدی شیرازی، سلمان ساوجی اور خواجو کرمانی تھے۔ ان لوگوں کے رنگ میں شعر کہنا حافظ نے شروع کیا اور اکثر اُن کے مضامین آزادی سے اپنے شعروں میں نظم کئے۔ رندمشربی میں وہ خیام کے پیرو ہیں۔ متذکرہ بالا شعرا کے یہاں سے جو کچھ حافظ نے لیا اُس کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے کسی خاص شاعر کے رنگ کو بہت زیادہ آگے نہیں بڑھایا۔ بلکہ اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اُن شعرا کے یہاں حافظ سے اچھے شعر ملتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری اردو شاعری کی تحلیل و تشکیل میں حافظ سے زیادہ کسی اور شاعر کا حصہ نہیں۔ خود حافظ کے بعد اور اردو شاعری کے آغاز سے پہلے فارسی غزل کا زریں عہد ہندوستان میں نظر آتا ہے۔ اس عہد نے

اردو غزل کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے۔ ہمارے بیشتر شعرا عرفی، نظیری، کلیم اور بیدل سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس دور کے شاعروں نے فارسی غزل کو اپنے منتہائے عروج پر پہنچا دیا تھا۔ نظیری وغیرہ کی غزلوں میں شاعرانہ زور وزیبائش، آرائش، زبان کی لطافت اور تخیل کی وہ حیرت انگیز جادوگری ملتی ہے جو نقد ونظر کو مسحور کر دے لیکن حقیقت میں یہ شعرا حافظ کی بنائی ہوئی عمارت میں نقش ونگار بناتے رہے۔ اینٹ اور چونا حافظ کا تھا۔ رنگ وروغن ان لوگوں نے استعمال کیا۔ حافظ کی حیثیت ایک مرکز کی ہے جہاں سعدی وخیام کے تخیلی سلسلے ملتے ہیں اور جہاں سے فغانی، عرفی نظیری، صائب، کلیم اور بیدل کے تخیل کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ سعدی کو حافظ کا پیش رو ہونے کی وجہ سے بجا طور پر حافظ پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن سعدی نے غزل کا صرف سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ حافظ نے اُس بنیاد پر ایک پرشکوہ اور فیض رسانی محل تعمیر کر دیا۔ جس کی زیب وزینت میں آنے والے شعرا مزید اضافہ کرتے رہے۔ لیکن متاخرین کی تراش وخراش اُن کی نو بہ نو اختراعات دیوانِ حافظ کی تاثیر اور توانائی کو کبھی نہ پہنچ سکیں۔

دیوانِ حافظ کی مختلف شعری خصوصیات سے جو ایک خاص فضا قائم ہوتی ہے وہی حافظ کا طرۂ امتیاز ہے، وہی حافظ کی اسپرٹ ہے۔ دیوانِ حافظ کا تجزیہ کرنے سے یا اُس کو مختلف موضوعات میں تقسیم کرنے سے ناقد شاعر کی صحیح عظمت تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ عظمت شعروں سے دل ودماغ میں اتر آتی ہے۔ وہ عظمت خاموش احساس میں مضمر ہے اور اُس عظمت کا ادراک شاعر کے ساتھ ساتھ بڑے صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے ہم پرواز ہونے میں حاصل ہو سکتا ہے۔ دیوانِ حافظ کو مجموعی طور پر دیکھ سکنے کے بعد حافظ کی وہ اسپرٹ نظر آنے لگتی ہے۔ جس نے نہ صرف اُن کے کلام کو جاں بخشی اور زندگی سے معمور کر دیا۔ بلکہ وہ اسپرٹ صدہا سال تک چھائی رہی مختلف تہذیبوں اور مختلف رسم ورواج سے ٹکرا کر اُن کے اثرات قبول کرتی رہی اور اُن پر اپنا اثر ڈالتی رہی، عرفی اور نظیری کی غزلوں میں ہمیں دیوانِ حافظ کی روح ملتی ہے۔ جس نے مغل آرٹ اور کلچر کے زیرِ اثر آ کر غزلوں میں نئے نئے رنگ اختیار کئے پھر بھی اگر کوئی پوچھے کہ وہ اسپرٹ کیا ہے تو جواب میں عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسپرٹ حافظ کی فطرت پرستی، عافیت سوزی اور بے پناہ رجائیت پر مشتمل نظر آتی ہے جس نے اُن کی غزل کو ایسی سکت اور ارتقائی طاقت عطا کی جو فارسی کے متاخرین شاعروں سے لے کر اردو شاعری تک اپنے پر پھیلائے نظر آتی ہے۔ اس جگہ براؤن کی HISTORY OF PERSIAN LITERATURE کا ایک حوالہ دینا ضروری ہے۔ جس سے حافظ کی عظمت پر کافی روشنی پڑتی ہے

MISS GERTRUDE L. BILL دیوانِ حافظ کی کچھ غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ جس کو انھوں نے ۱۸۹۷ء میں POEMS FROM THE DIWAN OF HAFIZ کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے دیباچے میں مس موصوف نے حافظ پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عین اُس وقت جب کہ تیمور کی قتل وغارت گری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور جب کہ سارا وسطِ ایشیا نت نئے انقلابات سے زیر وزبر ہو رہا تھا۔ خود ایران میں شاہ ابو اسحاق، شاہ محمد مظفر، شاہ شجاع کرمانی اور شاہ منصور یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور سر بایہ خوں ریزیاں ہوئیں۔ لیکن حافظ کی بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ اُن کے کلام سے ان واقعات کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ البتہ ہر بادشاہ کی تعریف کسی نہ کسی غزل میں بہت واجبی سے ملتی ہے۔

مس گرٹروڈ کی یہ ژرف نگاہی قابلِ مبارک باد ہے کہ انھوں نے مشرق و مغرب میں سب سے پہلے حافظ کو وہ خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن وہ حافظ کو دانتے پر ترجیح دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ حافظ کو اُن کی بے تعلقی DETACHMENT پر معاف کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے ہمیں بہت وسیع عرصۂ خیال عطا کیا جو عالم گیر ہے۔ لہٰذا اُس میں مقامی اور ہنگامی نقوش واضح نہیں مل سکتے۔ برخلاف اس کے دانتے اپنے وقت کے فلسفے اور ہنگامی قدروں سے دبا ہوا ہے۔ جو اُس کے لئے خواہ کتنی ہی حقائق سے لبریز کیوں نہ ہوں ہمارے لئے محض خوبصورت یا خوفناک تصورات بن کر رہ گئی ہیں۔ حالاں کہ مس گرٹروڈ کسی حد تک حافظ کی بے تعلقی کو سمجھنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ خود اُن کے بیان سے ظاہر ہے۔ پھر بھی اُن کے ساتھ اتنا عرض کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ اگر کوئی فن کار اپنے گرد وپیش کے تاریخی واقعات کو اپنے فن میں ایک نامہ نگار کی طرح بیان نہ کرے تو اسے بے تعلق نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا معافی کا کوئی سوال نہیں اور نہ یہ تاویل کرنا چاہیے کہ وہ فن کار اپنے وقت کے مادی حالات سے متاثر نہیں فرق صرف یہ ہے کہ اور یہ فرق ایک بڑے فن کار میں اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، کہ وہ اُن مادی حالات اور تاریخی واقعات کو سپاٹ طور پر بیان کرنے کی بجائے اُن کے تاثرات کو قبول کرتا ہے۔ جو کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی وقت اُس کی تخیلی سطح پر اُونچے مقام سے ظاہر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاسر کو لیجئے جو حافظ ہی کی طرح دُنیا کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے اور تقریباً اُن کے

ہم عصر بھی تھا۔ اُس کے وقت میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے۔ بطانیہ میں طاعون آیا۔ جس نے لاکھوں انسانوں کو ڈس لیا۔ کسانوں کی انتہائی خوفناک بغاوت ہوئی۔ ایڈورڈ سوم کی فتوحات نے فرانس کو روند ڈالا۔ چاسر نے ان سب باتوں کو دیکھا ہوگا وہ اپنے وقت کا بڑا معروف آدمی تھا۔ اُس نے سیاسی سرگرمیوں میں بڑی شدت سے حصّہ بھی لیا لیکن پھر بھی اُس کے کلام سے ان سب باتوں کا پتہ نہیں چلتا۔ تاثرات صرف ایسے پائے جاتے ہیں جن میں چودھویں صدی کے انگلستان کی فضا ملتی ہے۔ لامحالہ ایک طالب علم کی توجہ اس حقیقت کی طرف مائل ہوتی ہے کہ جو ادیب یا فن کار جتنا بڑا ہوتا ہے وہ اُسی قدر مقامی اور ہنگامی قدروں سے آزاد ہوتا ہے۔ یہ قانون چاسر، حافظ، تُلسی داس اور غالب سب کے فن میں یکساں کارفرما نظر آتا ہے۔

میں حافظ کے کلام کے اجتماعی اثر کی بات کر رہا تھا۔ جو فارسی شاعری سے اردو شاعری تک نظر آتا ہے اس کے علاوہ حافظ کے اور کارنامے بھی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ اُنھوں نے غزل کا رنگ و آہنگ قائم کیا اُسکے زبان و بیان کا خاکہ تیار کیا اور اُس کی تہذیب کی حدیں مقرر کیں۔ آدابِ عاشقی اور لوازماتِ محبوبیت کو قائم کرنے میں اُنھوں نے اپنے عہد کے کلچر کی ترجمانی بھی کی اور اس کو اپنے ذہنی معیار کی بلندی تک لاکر اُس کو مستقبل کی شاعری کے لئے دستور العمل کا درجہ دیا۔ آج جب کہ دیوانِ حافظ کو وجود میں آئے تقریباً ساڑھے پانچ سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں وہی دستور العمل کارفرما ہے

دیوانِ حافظ میں عشق کا ایک بہت وسیع پرخلوص اور جاندار تصوّر ملتا ہے عشق کا ردِّ عمل اُن کے یہاں مریضانہ رنج و غم کی لذّت اندوزی نہیں بلکہ اُس نے اُن کے مزاج میں دخل پاکر اُن کی شخصیت کو جھڑکا دیا اور اُن کے کردار کو مضطرب کر دیا وہ باغ و بہار کے شیدائی کوہ و صحرا کے سیاح اور سبزہ و گل کے رازدار بن گئے عشق نے اُنھیں مضمحل کم اور مشتعل زیادہ کیا۔

صبا بہ لُطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ ما را

عشق کا جذبہ اُن کے یہاں جمود نہیں حرکت رکھتا ہے، کمزوری نہیں طاقت کا کام دیتا ہے۔ اس لئے اُن کے شعروں میں ایک صالح پیغام ایک شفا بخش کیفیت ملتی ہے۔

شفا ز گفتۂ شکر فشانِ حافظ جو
کہ حاجتت بہ علاجِ گلاب و قند مباد

جدید نفسیاتی تحقیق اس شعر کی صداقت کی تائید کرتی ہے جس کے مطابق زیادہ تر بیماریاں جسم سے نہیں دماغ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کو خیالات کی کمزوری اکثر پیدا کرتی ہے اور بیشتر مدد دیتی ہے۔ ایسی صورت میں جسمانی پرداخت کی بجائے دماغ کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اس حقیقت سے واقف ہو جانے کے بعد حافظ کے مندرجہ شعر کی صداقت کا احساس ہو سکتا ہے۔ حافظ کے دیوان میں کثرت سے ایسے شعر ملیں گے۔ جن میں اُنھوں نے بیماریوں پر کاری ضرب لگائی ہے جسمانی کمزوریوں پر صحت مند خیالات کے قابو پانے کا اُنھیں علم تھا وہ بیماریوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیوں کہ اُن کے نزدیک یہ فطرت کے اصولوں کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھی۔ اس کا اظہار کہیں رمزاً کیا ہے اور کہیں صاف صاف کہا ہے

منت بنازِ طبیباں نشیانہ مند مباد   وجودِ نازکت آزردۂ گزند مباد
سلامتِ ہمہ آفاق در سلامت تست   بہیچ عارضہ شخصِ تو دردمند مباد
شفا ز گفتۂ شکر فشانِ حافظ جو   —

ترتیبِ قند و گلاب نہ علاج دل ماست   بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

آخر عمر میں جب اُنھیں بڑھاپے نے گھیر لیا۔ اُن کی زندہ دلی اور "خوش دلی" اُسی صورت سے قائم رہی وہ اپنے خیالات سے تازگی اور توانائی حاصل کرتے رہے

دوش بیتِ فراق و غم دل پیر شدم   ساغرے ز کفِ تازہ جوانے بمن آر
گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر   تا سحر گہ ز کنارِ تو جواں برخیزم

حافظ کا کلام ایک طاقت ور رجائیت کے مفرّح احساس سے بھرا ہوا ہے۔ دیوانِ حافظ کی یہ ایک بہت اہم خصوصیت ہے بیشتر غزلوں سے ہمیں سعادت کی نیک فالیں نکلتی ہیں اور ہر جگہ رنجِ فراق اور اندوہِ ہجراں شکست کھاتے نظر آتے ہیں دیوانِ حافظ کی فال میں شہرت اور صدیوں سے لوگوں کی عقیدت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ خوشدلی اور خوش مزاجی اُن کے کلام کا خاص جوہر ہے اسے آج کل کے معیار کے مطابق حقائق سے گریز یا فراریت پسند محمول کرنا چاہئے یہ وصف دراصل بہت بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے اس حقیقت کی طرف بڑے مزے سے اشارہ کیا ہے۔

بیشوۂ رندانِ بے پروا خرام از ما مپرس   ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

حافظ کا آسان زیستن، ہر شخص کے بس کی بات نہیں اُن کے خیالات کی چاندنی میں اُن کے احساس کی نزہت شامل ہے اُن کے لب و لہجہ میں نسیم صبحگاہی کی خنکی ہے۔ فارسی کے تمام شعرا میں قنوطیت کا دشمن حافظ سے بڑا کوئی نہیں۔ انسانیت کی آخری فتح پر اُن کو یقینِ کامل تھا۔ زندگی اور شادمانی کو وہ ایک

دوسرے سے الگ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ خوشی اور مسرت کے نقیب اور بہار کے پیغامبر تھے۔

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جوان خواہد شد

حافظ کی فطرت پرستی اُن کے تخیل اور احساس کی مشترکہ ورزش کے بعد پیدا ہوئی جس کی طرف اُن کا یہ شعر اشارہ کرتا ہے۔

شرحِ مجموعۂ گل مرغِ سحر داند و بس
کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

اُنھوں نے عام شعرا کی طرح فطرت کی عکاسی زیادہ نہیں کی وہ کوئی بھی صاحبِ بیان کر سکتا تھا۔ اُنھوں نے فطرت کے پیغام کو گوشِ ہوش سے سُنا۔ اُس کے لمس کو محسوس کیا، پہاڑوں، دریاؤں اور سبزہ زاروں کی عبارت کو لفظ بلفظ پڑھا اور اس کی ترجمانی کی۔ ورڈز ورتھ اور اُس کی رومانی تحریک میں فطرت اور انسان کے مابین جو رابطہ ملتا ہے وہ حافظ کے یہاں اُن سے چار سو برس پہلے موجود تھا۔ فطرت کا زندہ اور متحرک تصوّر اُن کے کلام میں بہت نمایاں ہے۔ ورڈز ورتھ سے بہت پہلے وہ فطرت کی سچائی پر ایمان لا چکے تھے۔ ورڈز ورتھ نے اس کو اپنی مختلف نظموں میں الگ الگ بیان کر دیا ہے۔ حافظ کے یہاں یہ چیز ایک اجتماعی اثر کی صورت میں ہے۔

صبح است و ژالہ میچکد از ابرِ بہمنی ... برگِ صبوح سازد و بدہ جامِ یکمنی
بلبل بشاخِ سرو بہ گلبانگِ پہلوی ... می خواند دوش درسِ مقاماتِ معنوی
اے صبا نکہتے از خاکِ رہِ یار بیار ... ببر اندوہِ دل و مژدۂ دلدار بیار
تا معطر کنم از لطفِ نسیمِ تو مشام ... شمۂ از نفحاتِ نفسِ یار بیار
بنفشہ طرّۂ مفتولِ خود گرہ می زد ... صبا حکایتِ زلفِ تو در میان انداخت
اے صبا گر بجوانانِ چمن باز رسی ... خدمتِ ما برساں سرو و گل و ریحاں را

بادِ صبا، بادِ شمال یا نسیمِ صبح کو اُن کے یہاں بطور قاصد سمجھنا ایک فاحش جاہلانہ غلطی ہوگی اُنھوں نے ان SYMBOLS کو روایتی طور پر نہیں استعمال کیا ہے بلکہ فطرت کے یہ عناصر اپنی ذات میں جذب کر کے اُن کی تازگی کو شعروں میں منتقل کر لیا ہے اور اُن میں اپنی روح اور نظر اس طرح سمو دی ہے کہ پڑھنے والا وہی کیفیت خود پر طاری کر سکے۔

ہر صبح و شام قافلۂ از دعائے خیر ... در صحبتِ شمال و صبا می فرستمت

حافظ کی قلندرانہ آزادگی بھی ان کی اسپرٹ کا ایک جزوِ اعظم ہے وہ بے پروا خرام اور آسان آدمی تھے۔ وہ عمر بھر شراب و کباب کے دلدادہ اور راگ رنگ کے شیدائی رہے۔ وہ زندگی کو بیل گاڑی کھینچنا نہیں سمجھتے تھے اور نہ انھیں اس کے ذریعہ تسخیرِ کائنات کا دعویٰ تھا۔ وہ تو اسی بہارِ چند روزہ سے زیادہ سے زیادہ خوشی اور مسرّت حاصل کر لینے کے قائل تھے۔

شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں ... خلافِ مذہبِ آناں جمالِ اینان بیں

شرابِ لعل و جائے امن و یارِ مہرباں ساقی
دلا کے بہ شود کارے اگر اکنوں نخواہد شد۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ محنت سے پہلو تہی کرنے کی تعلیم دیتے ہوں۔

دوامِ عیش و تنعّم نہ شیوۂ عشق است ... اگر معاشرِ مائی بنوش نیشِ غمے

وہ اپنی زندگی کو خواہ مخواہ سخت بنانے پر تیار نہ تھے اور نہ وہ سرد کیے ہوئے سخت گیر تھے۔ اُن کی انسانی ہمدردی کا کوئی اور چھور نہ تھا۔ اُن کی شخصیت میں خلوص، رنگینی، محبّت اور ظرافت کے گہرے رنگ ملتے ہیں۔ وہ زمانہ سازی کے خلاف تھے اور ریا و فریب سے کسی قیمت پر بھی مصالحت پر تیار نہ تھے۔ اس جذبے کے تحت واعظ اور زاہد پر انھوں نے مسلسل حملے کیے ہیں اور اس طبقے کی گندم نما جَو فروشی ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ایک بڑے شاعر کی خصوصیت ہوتی ہے اُن کے دل میں مُلّاؤں کے خلاف بھی کوئی تلخی نہ تھی۔ اس سلسلے میں اُن کے شعروں میں ایک لطیف ظریفانہ طنز ملتا ہے جس کو سُن کر واعظانِ کرام بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

من حالِ دلِ زاہد با خلق نخواہم گفت ... کیں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ
ترسم کہ صرفہ نبرد روزِ باز خواست ... نانِ حلالِ شیخ ز آبِ حرامِ ما

حافظ کی فطرت جیسا کہ خود اُن کے شعروں سے مترشح ہے بہت معصوم، رنگین، اور محبت آگیں تھی۔ اُن کے جذبات اور رجحانات روزِ روشن کی طرح آشکار ہیں۔ جس کے لئے داخلی اور خارجی شہادتیں دونوں مہیا ہیں۔ حافظ کے عہد میں مصلحت اور ادب ساتھ ساتھ نہیں چلتے تھے۔ فن کاری اور ریاکاری میں ازلی بیر تھا۔ حافظ کے یہاں ہمارے دور کی ذہنی کشمکش اور تہذیبی پیچ و خم نہ ملیں گے۔ انھوں نے کنارِ آب رکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ کے گیت گائے لیکن سچے دل سے، انھیں اپنے وطن کی خاک سے بھی محبت تھی۔ شیراز کی تعریف میں جو غزل انھوں نے کہی ہے اس کے ایک ایک شعر سے حبِ وطن کی شراب ٹپک رہی ہے۔

خوشا شیراز و وضع بے مثالش　　　خداوندا نگہدار از زوالش

حافظ کے اشعار کی اس آسودہ و نرم سیر فضا کے باوجود کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کا دائرۂ شعور اس فضا سے زیادہ اور اس سے ماسوا بھی تھا۔ وہ زندگی کے قاہرانہ اور دلبرانہ دونوں پہلوؤں سے واقف تھے۔ عشق و مزدوری عشرت گہِ خسرو' پر ہمارا پیشوائے عالی مقام معترض ہے لیکن حافظ مزدوری عشرت گہِ خسرو کے پردے میں جنون و جہاد کو پہچاننے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں　　　شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

نسب و نجابت کے معاملے میں عرفی سے غالب تک ہمارے متعدد سخن ور اپنی کلاہ کج کرتے رہے لیکن حافظ کو انسان کے جوہرِ ذاتی پر اعتقاد تھا۔

تاجِ شاہی طلبی گوہرِ ذاتی بنما　　　ورخود از گوہرِ جمشید و فریدوں باشی

حافظ کا تصورِ زندگی محنت' امن اور خوشی کے تین الفاظ سے بنتا ہے۔ ایسی محنت جو رقابت اور مقابلوں سے محفوظ ہو۔ ایسا امن جو خارجی حالات اور داخلی کیفیات دونوں میں کارفرما ہو اور ایسی خوشی جس میں وقتی قہقہوں کے بجائے پُرسکون انبساط کا ٹھہراؤ ہو۔

آسایشِ دوگیتی تفسیرِ ایں دو حرفست　　　با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

آج ساری دنیا کی قومیں حافظ کے اس شعر کی پالیسی پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ ہر ملک سے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ آج نطشے اور رُوسو جیسے حکیموں کا بلند بانگ فلسفہ زہر بن کر رہ گیا ہے لیکن آج بھی حافظ غیر فانی امن اور یہی آسایش کا ضامن ہے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　　بے زر و گنج بصد حشمتِ قاروں باشی

حافظ کے اشعار اپنے اندر ایک ذرّیں مستقبل ایک حسین سوشلسٹ سماج کی تصویر لئے ہوئے ہیں جہاں افراط زر، جنگ بازی اور تجارت جیسی منحوس وبائیں نہیں پائی جاتیں۔ اب دنیا ہزاروں سال کی مسافت طے کر چکی ہے۔ اسلحہ سازی کا جنون، وزنی مشینوں کی گہما گہمی' سمندروں اور ہواؤں کی مسلسل بھاگ دوڑ سے انسان تھک چکا ہے۔ اُسے شرابِ لعل وجائے امن و یارِ مہرباں' کی تلاش ہے نیویارک اور لندن کے بسنے والے آتش و فولاد کے کارخانوں سے اُکتا کر تبت کی معصوم خانقاہوں اور گنگا کی پُرسکون وادیوں کی طرف متجسس نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم آج دنیا میں سلامتی و ترقیِ حیات کی ضمانت چاہتے ہیں ہمارا مطالبہ ہے کہ معاش و روزگار کی آسانیاں عام ہوں اور تعمیر و تعمیر کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ ہماری خواہش ہے کہ دن کی مشقت رات کے آرام و انبساط میں خلل انداز نہ ہو۔ دیوانِ حافظ میں ایسی ہی زندگی کا انعکاس ہے بلکہ وہ اس زندگی کا ذہنی اور روحانی پہلو ہے۔

ارشد کاکوی

غزل

یوں تو ہونے کو کیا نہیں ہوتا
صبحِ شامِ الم نہیں ہوتی

اُس ادائے کرم کا کیا کہنا
جس میں شانِ کرم نہیں ہوتی

شمعِ اُمید بجھ گئی لیکن
روشنی ہے کہ کم نہیں ہوتی

دل کشی کوچۂ تمنّا کی
بڑھتی جاتی ہے کم نہیں ہوتی

بس انھیں کی ہے زندگی جن کو
فکرِ دیر و حرم نہیں ہوتی

دم نہ گھٹ جائے آپ کا ارشد
آپ کی آنکھ نم نہیں ہوتی

نوری

قصیدۂ آزادی

بادشاہت کا مٹ گیا اب نام
نُوحَش اللہ جدوجہدِ عوام

ہیں کہاں آج مصر کے فرعون ؟
خود کو کہتے تھے جو خدائے عوام

ہیں کہاں آج روم کے قیصر ؟
ماورائے بشر تھا جن کا مقام

ہیں کہاں آج طغرل و سنجر ؟
زیبِ تاریخ ہے اب ان کا نام

ہیں کہاں آج چین کے خاقان ؟
ہیں کہاں آج وہ مغولِ عظام ؟

ہیں کہاں ہند کے مہاراجہ ؟
جن کے دربار کا تھا شہرہ عام

کس کے لب پر ہے تخت کی سوگند
"مابدولت" ہے کس کا تکیہ کلام ؟

مرحبا! آج مٹ گیا وہ دَور
حبّذا! آگیا ہے دَورِ عوام

آج ہوتے اگر زمانے میں
اِیرج و تور و خسرو و بہرام

تاج پوشی جو اِن کی کی جاتی
سر پہ رکھتے وہ اپنے کفشِ عوام

آج باقی نہیں زمانے میں
جو سمجھتے تھے ہم کو کالانعام

بادشاہی فرانس کی توبہ
ایک لعنت تھی جو برائے عوام

والٹیر کا اور روسو کا
محو تاریخ سے نہ ہوگا نام

انقلابِ عظیم لانے میں
سب سے ہے پیش پیش ان کا نام

رُوس کی وہ شہنشہی جس میں
ایک آقا تھا اور لاکھ غلام

آدمیت جہاں سسکتی تھی
آدمیت کا تھا جہاں نہ مقام

فخرِ انساں، وہ لینِنِ اعظم
کس قدر ہے بلند اس کا مقام!

زار کا دَور ہوگیا آزار
آج آزاد روس کے ہیں عوام

ذکر ترکی کا اب میں کرتا ہوں
جس کا معلوم سب کو ہے انجام

کیا ہوئی وہ خلافتِ ترکی
سازشوں کے سبب جو تھی بدنام

تھے خلیفہ کے بے شمار حرم
اور ساکت تھا مذہبِ اسلام

آگیا اب زباں پہ اک مطلع
مدح کا کس کی آگیا ہے مقام

مطلع

کب اتاترک سے یہ ہوتا کام ؟
ساتھ اس کے اگر نہ ہوتے عوام

توسنِ طبع دیس کی جانب
چاہتا ہے کہ اب ہو محوِ خرام

ہند میں وہ فرنگیوں کا راج
نام جس کا ہے دورِ نافرجام

فوج کے بل پہ حکمرانی تھی
نوکِ سنگیں سے ملتے تھے احکام

قیدخانوں کی وہ فضا جس سے
چین رخصت ہُوا اور خواب حرام

عام تھی یہ سزائے حق طلبی
لوٹ، غارت گری و قتلِ عام

تفرقہ سازی ان کی تھی ایسی
ہوگیا جس سے دیس یہ بدنام

پھوٹ کی اس قدر بڑھی چاہت   نہ رہی وہ دلوں میں اُلفت عام

ہے سیہ برطانیہ پہ اِک مطلع   چاہتا ہوں کہ اب کروں ارقام

مطلع

ان کے سوتھے اگر رفاہی کام   لُوٹنے کے تھے بے شمار اقسام

واسطے ان کے شیرِ مادر تھا   ہند کا جس قدر تھا مالِ خام

یوں نہیں رخصت نہیں ہوئے انگریز   یوں نہیں آیا نہیں یہ دورِ عوام

عازمِ راہِ حُریت ہوں میں   پی کے چلتا ہوں اک غزل کا جام

غزل

فصلِ گل کا پھر آگیا ہنگام   پھر چلے ساغرِ مئے گلفام

آپ کے حسن کا قصور نہیں   میرے دل نے مجھے کیا بدنام

پھر کسی کی ستا رہی ہے یاد   آگیا پھر کسی کا لب پر نام

قُرب پر اپنے ناز ہو مجھ کو   دُور ہی سے اگر وہ لیں سلام

اُف زباں سے کبھی نہیں کہتے   جانتے ہیں جو عاشقی کا مقام

ہو مرے واسطے وہ آبِ بقا   وہ اگر زہر کا بھی دیں جام

درد دل میں اگر نہیں نوری

کس لئے ہوگئی ہے نیند حرام؟

اس بہشتِ برینِ بھارت کا   ہُوا برطانیہ میں جب اِدغام

دشمنوں کے بنے وہ آلۂ کار   ملک میں تھے جو مثلِ رستم و سام

دیکھ کر دیس کا یہ حالِ زبوں   نکلی پونا سے "کیسری" صمصام

کیا کیا ہے تلک نے کیا کہیئے   تھا مہاراشٹر کا جو ضرغام

آگ اس نے لگائی کچھ ایسی   پھیل کر جو رہی وطن میں تمام

مالٹا کے اسیرِ شیخ الہند   لیں فرشتے ادب سے جن کا نام

قوم میں پھونکی رُوحِ آگاہی   تا نہ کھائے فریبِ دانۂ و دام

ہوئے اس وقت وہ اسیرِ فرنگ   جسم پر جب تھا جامۂ احرام

گو کھلے وہ مجسّمِ ایثار   نور افشاں تھا جس کا اک اک کام

ہند کا وہ مہاتما جس کا   تا قیامت رہے گا روشن نام

کارواں کا وہ قافلہ سالار   ساتھ تھے جس کے بے شمار عوام

نقشِ پا جس کا خضرِ آزادی   آستاں جس کا قبلہ گاہِ انام

راز ہائے سیاستِ افرنگ   آج اس کے سبب ہیں طشت از بام

وہ گدا باج لے جو شاہوں سے   وہ گدا سلطنت جو دے انعام

وار جس کا نہ جاتا تھا خالی   جس کی ستیاگرہ تھی رشکِ حسام

اس نے بدلی سرشتِ محکومی   اس نے کاٹا فرنگیوں کا دام

قابلِ فخر تھے رفیق اس کے   ذکر کرتا ہوں اُن کا نام بہ نام

وہ محمدؐ علی وہ جوہرِ قوم   مثلِ ضیغم تھا جس کا اک اک گام

وہ خلافت کا کارواں سالار   جس سے ڈرتا تھا چرخِ نیلی فام

وہ مسیحائے قوم اجمل خاں   واقفِ نسخۂ حیاتِ دوام

لیا باپو نے ساتھ ان کو بھی
تا غلامی کا دور ہو سرسام

گوہرِ بحرِ ہند، موتی لال
بخت و اقبال و جاہ جس کے غلام

اس غلامی کو توڑنے کے لئے
کر دیا ترک اس نے ہر آرام

داس کی وہ معاملہ فہمی
اور سوراج پارٹی کا قیام

نامِ مختار احمد انصاری
ہے نگینِ دلِ خواص و عوام

لاجپت رائے اور مالویہ
بھول سکتے نہیں ہم ان کا نام

ذکر سوبھاش کا بھی لازم ہے
مل گئی ہے جسے حیاتِ دوام

وہ خلوص و وفا کا اک پیکر
شاعری میں ہے جس کا حسرتؔ نام

جیل میں جس نے پیسی تھی چکی
جیل میں جس نے دی تھی دادِ کلام

نابلد وہ زمانہ سازی سے
اور تغزل میں اپنے فن کا امام

قدر آصف علی کی وہ سمجھے
ہو سلیماں سے کم نہ جس کا مقام

بلبلِ ہند وہ مسز نائیڈو
دیس کی بیٹیوں کا جس سے نام

ذکر جس کا ہے اب بھی جاں افزا
روح پرور ہے جس کا اب بھی کلام

نامِ قدوائی جاوداں بادا
ہے محلِ پرستش اس کی قبر مدام

کرکے اس نے دکھایا دنیا کو
جو کسی سے نہ ہو سکا تھا کام

ملک کو جس نے زندگی بخشی
محمد کے دیوتا کو کر کے رام

نامکمل ہے ہند کی تاریخ
آئے سردار کا نہ جب تک نام

عزم نے اس کے کر دیا آساں
راہ میں آگیا جو سخت مقام

ہند کا تھا وہ کام بھی انساں
جس نے بدلا ریاستوں کا نظام

سبھی حضرت حسین احمدؔ سے
پھوٹ کا فتنہ ہو گیا ناکام

فخرِ بھارت وہ ڈاکٹر پرشاد
ہند کی جن کے ہاتھ میں ہے زمام

خاص ہے ان کی گو نگاہِ کرم
سب پہ یکساں ہے ان کا فیضِ عام

شیرِ حق وہ ابوالکلام آزاد
رہ نوردانِ حریت کا امام

وہ ضیا پاش الہلال اُن کا
نور جس کا تھا رشکِ ماہِ تمام

اِس سے پیدا ہو روشنی دل میں
اور اُس کا ہے سطح ہی پہ مقام

بھول سکتی نہیں وطن کی زمیں
کرپلانی نے جو کیا ہے کام

وہ بلند بلیغ ڈاکٹر محمود
وہ خجستہ گہر خجستہ مقام

سرفروشی میں ان کی شک کس کو
جاں فشانی میں ان کی کس کو کلام

راجہ جی کا بھی ذکر لازم ہے
تذکرہ ورنہ یہ رہے گا خام

آج مدراس میں برائے دوا
ملے ممکن نہیں مئے گلفام

جیل خانے میں جس کی عمر کٹی
مدح کرتا ہوں اس کی اب ارقام

حریت کا ہوا ہے مہر طلوع
جگمگا اٹھے جس سے منظر و بام

نورِ چشم و چراغِ موتی لال
دست و بازو و قلب و جانِ عوام

پیکرِ حریت جواہر لال
مظہرِ قوتِ خواص و عوام

امنِ عالم کی ہے بنا اس پر
اس سے قائم اخوتِ اقوام

یہ اسی کی نگاہ کا ہے اثر
تیغ ہے اور خواب گاہِ نیام

سربلندی ہماری اس سے ہے | ہے جہاں میں ہمارا اس سے نام
بہ لحاظِ طوالتِ مضموں | کرسکا میں نہ سب کا حال ارقام
بے غرض ان کا جذبۂ ایثار | بے نمود و نمایش ان کے کام
لیلیٰ ہند کے تھے یہ مجنوں | دیس کے تھے یہ عاشقانِ کرام
قیس و فرہاد سے بھی بالاتر | راہِ عشقِ وطن میں ان کا مقام
سخت مشکل تھی راہِ آزادی | ہوئی کوشش سے ان کی سرانجام
سعی کا ان کی یہ ہے ماحاصل | اب فرنگی کے ہم نہیں ہیں غلام
سعیِ مشکور ان کی کب ہوتی | ساتھ دیتے اگر نہ ان کا عوام
یہ خوشی ہے کہ انقلاب آیا | یہ خوشی ہے کہ یہ ہے دورِ عوام
آدمی اب نہیں ہے خانہ نہاد | آدمی اب نہیں کسی کا غلام
کیا کیا ہم نے بعدِ آزادی | قابلِ غور ہے یہ استفہام
شمعِ دستور کو کیا روشن | ہاتھ میں لیتے ہی وطن کی زمام
ہوگیا جب وطن کا بٹوارہ | اک قیامت سے کم نہ تھا ہنگام
آگئے بے حساب شرنارتھی | جن کا دنیا میں تھا کہیں نہ مقام
ان کو ہم نے لگایا سینے سے | اور پہنچایا ہر طرح آرام
پنج سالہ بنا کے منصوبہ | ملک کو ہم نے بخشا استحکام
زندگی کا قیام ہے جب تک | ہے ضروری بہت لباس و طعام
کرکے پورا یہ ہم نے منصوبہ | بختِ ناساز کو کیا ہے رام

ٹھیک ہے اب غذائی صورتِ حال | ہر طرف ہیں بھرے ہوئے گودام
ہوگیا حل لباس کا بھی سوال | ہوگیا پارچے کا اب آرام
لیکن اب بھی بہت مسائل ہیں | ٹھیک اب بھی نہیں ہے حالِ عوام
عام ہیں ملک میں ابھی امراض | کہیں سرطان ہے کہیں ہے جذام
اب بھی کم ہیں یہاں شفاخانے | ہے یہ دیہات میں شکایت عام
ہے مکانات کی ابھی قلت | ہے سڑک اب بھی آدمی کا مقام
اب بھی ہیں ذات پات کے جھگڑے | اب بھی بدلا نہیں سماجی نظام
اب بھی دولت کی ہے غلط تقسیم | آدمی کے ہیں بے شمار اقسام
فرقہ وارانہ ذہنیت کی شراب | ساغرِ قومیت میں اب بھی عام
عورتیں علم سے ہیں بے بہرہ | جنس سے کم ہے ان کا اب بھی مقام
اب بھی نہروں کی ہے کمی بے حد | اب بھی بجلی نہیں وطن میں عام
اب بھی سیلاب پہ نہیں قابو | اب بھی دریاؤں کو نہیں ہے لگام
ندیوں پر نہیں ہیں اب بھی پُل | بند بارش میں اب بھی راہِ عام
ہیں ضرورت سے اب بھی کم ریلیں | اب بھی دیہات کی ہیں سڑکیں خام
کس قدر ہم کو کام کرنا ہے | ہے قسم لیں ذرا اگر آرام
لے جو آرام وہ نہیں ہندی | یہ ہمارا ہوا ہے تکیہ کلام
رہنمائی میں ہم جواہر کی | دیس کے دور کردیں سب آلام
ملک میں روزگار سب کو ملے | زندگانی ہو سب کی با آرام

اظہر علی فاروقی

دوہے
(عوامی مرثیے)

اس سے انکار کی اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ لوک کہانیوں، لوک ناچوں اور لوک کہاوتوں کی طرح لوک گیت بھی سماجی زندگی کے آئینہ دار ہیں اور خصوصیت سے عوامی زندگی اور جذبات کے ترجمان، عوامی ادب کسی قوم کا ایک ایسا سرمایہ ہوتا ہے۔ جسے وہ ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہتی ہے۔ لوک گیت عوامی جذبات کے کیف و نشاط اور اندوہ و الام کی ایک دائمی کیفیت پیش کرنے کے ذمہ دار رہے ہیں۔ لوک گیت عوام کے سینوں میں محفوظ رہے۔ البتہ ادھر کچھ عرصے سے تعلیم یافتہ طبقہ انھیں منظر عام پر لانے کے لئے کوشاں ہے۔ مگر ہم جن لوک گیتوں، بلکہ عوامی مرثیوں کا ذکر کر رہے ہیں وہ آج بھی عوام کے سینوں میں ہی مدفون ہیں اور ان کی طرف کسی نے اعتنا نہ کی۔ حالانکہ دوہے یعنی عوامی مرثیے بھی عوامی مجلسی زندگی کو روشنی میں لانے کے بہت کچھ ذمہ دار ہیں۔ یوں تو لوک گیتوں کے تہذیبی ورثے میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں پھر بھی ان لوک گیتوں میں خدائی رات، رتجگا، بسم اللہ، ختنہ، جنیو، بھونری اور پھیروں کے گیت الگ الگ راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر دوہے عوامی مرثیے ہونے کے باوجود ایسا نہیں ہونے دیتے۔ آج بھی دیہات ایسی نظریں پیش کر سکتے ہیں کہ اگر ہولی، دیوالی میں ہندو اور مسلمان، برابر کے شریک ہیں تو تعزیوں اور محرم کو بھی دونوں اپنا سمجھتے ہیں۔ تعزیوں کی قطاروں میں اگر مسلمان مرثیہ خوان مرثیہ پڑھ کر ارباب جلوس پر رقت طاری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو عقیدت مند بھگتن اور تھیلن کی زبان سے یہ بول سنائی دیں گے۔

چھینکے حسن میاں گھوڑوا پلاندن چھینکے جبش سوار
(کسا)

لوک گیتوں کی اس صنف پر مذہبی عقیدت مندی اور عظمت کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہے کہ ان کے لئے "گانے" کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ "دوہے رونا" مستعمل ہے دوہے کب اور کس طرح وجود میں آئے۔ انھیں پہلے پہل کس نے کہا اور آج انھیں کون کہہ رہا ہے۔ ان سب کا تعیّن تو ناممکن سا ہے۔ لیکن چند دیہاتوں کا چکّر لگانے کے بعد ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے۔ کہ چند دوہوں کی زبان عوامی ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم اردو سے بہت ملتی جلتی ہے اس وقت ہمیں پورا دوہا تو یاد نہیں رہا۔ صرف ایک کڑی یاد ہے۔ جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

عورتاں ٹھاڑیاں لٹ چھتراتیاں کریں بیان
دس مون نہار نہار ماریاں کلا کا میاں

(عورتیں بال بکھیرے کھڑی تھیں۔ اور بین کر رہی تھیں۔ دشمن دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے) اردو میں مرثیہ نگاری دکن سے شروع ہوئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوہوں کا جنم بھی اس کے ساتھ ساتھ، بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ اس سے بہت پہلے ہو چکا ہوگا۔ اور کیا تعجب ہے کہ ردیف، قافیے اور دوسرے لوازمات شعری سے آزاد، عقیدت مند عوام کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے۔ یہ بول ہندوستان میں تعزیہ داری کے رواج کے ساتھ ساتھ وجود میں آگئے ہوں اور اس طرح اردو مرثیے سے ان کی عمر بہت زیادہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ مرثیے اردو شاعری کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ دوہوں کی لفظی تنگ بندی اُن کے سامنے کوئی وقعت نہ پا سکے۔ اس لئے کہ مرثیوں اور دوہوں میں نہ تو کوئی لفظی مناسبت ہے اور نہ معنوی مگر یہ بات ضرور ہے کہ اگر مرثیے احساسات اور جذبات کی ایسی تصویریں ہیں جن پر شعریت کا رنگ و روغن چڑھا ہے تو دوہے احساسات اور جذبات کے ایسے مرقعے ہیں جنھیں سیدھے سادے انسانوں کی عقیدت مندی اور خلوص نے بنایا ہے۔ مرثیے اپنے عناصر اور لوازمات کی پابندیوں میں جکڑے ہیں اور "دوہے" ان سب سے آزاد۔ دوہوں میں نہ کوئی ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ تسلسل، مرثیہ بیک وقت سراپا، واقعات، ذوالفقار ذوالجناح روایات وغیرہ سب کا ترجمان ہوتا ہے۔ مگر "دوہا" ایک وقت میں ایک ہی چیز پر روشنی

ملتا ہے۔ مرثیے طویل ہیں اور یہ نہایت مختصر۔ اگر مرثیوں کا کنایہ صرف ایک شخصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے تو دہوں کے کنائے میں متعدد شخصیتیں مقصود ہوتی ہیں۔ دہوں میں "میڈ" حضرت امام حسینؑ بھی ہیں۔ اور حضرت علی اکبرؑ بھی، حضرت عباسؑ بھی، اور علی اصغرؑ بھی، "بی بی" حضرت فاطمہؑ بھی حضرت سکینہؑ بھی، حضرت صغریٰؑ اور کبریٰؑ بھی حضرت زینبؑ بھی اور حضرت کلثومؑ بھی۔ "لال" ہر بچہ ہے۔ خواہ حضرت علی اصغرؑ ہوں یا حضرت فاطمہؑ کی زبانی حضرت امام حسینؑ اور حسنؑ، البتہ تلوار اور "دُلدُل" (ذوالجناح) کا ذکر الگ الگ بغیر کنائے کیا جاتا ہے۔ ایک بات اور ہے کہ حضرت امام حسینؑ کی جگہ حضرت امام حسنؑ کا نام لیا جاتا ہے۔

واقعات اور روایات کے سلسلے میں دہوں میں عوامی جذبات کی تصویریں اس طرح ملیں گی۔ حضرت صغریٰؑ بیمار تھیں اور حضرت امام حسینؑ انہیں اپنے ساتھ لے جانے سے معذور تھے۔ پھر بھی وہ بڑی آزردہ خاطر تھیں۔ میر انیس نے اس واقعے کو بڑے شدومد کے ساتھ نظم کیا ہے۔ مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔ اور اسی کے مقابلے میں دہوں کا نمونہ۔

پاس آن کے اکبر نے یہ کی پیار سے تقریر　　　کیوں مجھ سے خفا ہو گئیں صغریٰ مری تقصیر
چلانے لگی چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر　　　محبوب برادر ترے قربان ہو ہمشیر
جلد آن کے بہنا کی خبر لیجیو بھائی　　　لے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

بھیّا نے پوچھن کو نے کھتا پرے رُوٹھی بہنیا　　　اللہ روٹھی بہنیا
(پوچھا) (کس) (خفا)
مونڈھا سے لگ کے مارن ڈُڈکا ریا　　　اللہ سے ڈُڈکا ریا
(شانہ)　　　(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں)
جو لیس چلتا بہن ہو دیو جاتی وادی دے　　　اللہ وادی دے
(ہو جاتی)
پرتا نہ چھوڑتیوں آ برپا سادی دے　　　اللہ وادی دے
(بھائی کو ساری عمر نہ چھوڑتی)
اب گئے بیرن کب سے آ یئہ
(کب آؤ گے)
راہن پہ انکھیاں بچھوتی رہے بہنیا دے　　　اللہ وادی دے
راہ　　　(بچھاتی رہوں گی)
چھٹی پٹھے وہوں مور سے بہتی کا سہ کو ہوت دکھیدا　　　اللہ وادی دے

سانے بھیتر لوٹ آ بھوں نہ ہو بہن بے کراری دے　　　اللہ بے کراری دے
(سال کے اندر)

اب آپ غور فرمایئے کہ مرثیہ نگار نے بہن سے جو استدعا کرائی ہے۔ اس میں شفقت کے ساتھ ساتھ طنز زیادہ ہے مگر "دہاگو" نے بہن کے جذبات کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ "اگر بس چلتا تو ساری عمر بھائی کا ساتھ نہ چھوڑتی۔ تمھارے انتظار میں میری آنکھیں راہ پر بچھی رہیں گی۔ . . "

اسی جذبے کا ایک دوسرا خاکہ ملاحظہ فرمایئے۔

اُڑ جا رے کاگا　　　پہنچا دے بہن کا سندیسا
مور سے ویرنا لینے کو آئے　　　اللہ لینے کو آئے ویرنا
اُڑ جا رے کاگا　　　پہنچا دے دھی یا کا سندیسا
(بیٹی)
مور سے بابل لینے کو آئے　　　اللہ لینے کو آئے بابلا
اُڑ جا رے کاگا　　　پہنچا دے نا سندیسا
میں کلپ کلپ مر جاؤں　　　اللہ کلپ کلپ مر جاؤں
مور سے ویرنا لینے کو آئے　　　اللہ لینے کو آئے

عام لوک گیتوں کی طرح "دہاگو" بھی قدرت اور نیچر کا پرستار نظر آتا ہے اگرچہ ہمیں ابھی تک صرف دو ایسے دہے ملے ہیں۔ جن میں کوّے اور طوطے کے ذریعہ پیغام بھیجا گیا ہے۔

اس سلسلے میں آپ کو نہ تو کوئی ترتیب ملے گی اور نہ تسلسل مگر یہ واقعات جذبات سے لبریز ملیں گے۔ مدینے سے حضرت امام حسینؑ کی روانگی، مصائب سفر، حضرت صغریٰ کی فرقت میں بے چینی، حضرت عباسؑ کا مشک بھر کر لانا، حضرت قاسم کی شادی، "دُلدُل" (ذوالجناح) کا باتیں کرنا۔ عونؑ اور محمدؑ کی شجاعت اور ہمت وغیرہ کے بیانات وہاں ملیں گے۔ اگرچہ یہ سمجھنا اور اس کا تعین کرنا کہ واقعہ کیا ہے۔ ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس بیان میں کہ "میڈ" مشک بھرنے نکلے، میڈ حضرت عباسؑ ہیں۔ میڈ کے سامنے ہاتھ جوڑے "لال" آئے ہیں میڈ امام حسینؑ اور لال حضرت عونؑ و محمدؑ ہیں۔ "ظالم کے گال پر لال" نے تھپڑ رسید کر دیا میں ظالم یزید ہے اور "لال" حضرت زین العابدینؑ ہو سکتے ہیں۔ ان بیانات میں "دہاگو" اپنی فضا اور اپنا ماحول تو پیدا ہی کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے عقائد اور ذہنیت بھی سمو دیتا ہے۔ حضرت قاسمؑ کی شادی کا واقعہ صحیح ہو یا غلط وہ اس کی تیاری اس طرح کرتا ہے۔ کہ "میڈ"

گھوڑے پر چڑھ کر بزاز کی دکان پر پہنچے۔ بزاز کی لڑکی نے جھانک کر دیکھ لیا اور اپنے باپ کو بتایا کہ امام آئے ہیں۔ اسی طرح دولہا کار درزی کی دکان پر پہنچتا ہے اور وہاں سے وہ جامہ، پٹکا، مکنا (مقنع) پاجامہ، کرتا سلواتے ہیں۔ سکلاتی (بانات) جوتا مالی سے ہار اور سہرا، منہارن سے سہاگ کی چوڑیاں، عطار سے عطر اور تیل، پنساری کی دکان سے ناریل، چھوہارے لیتے ہیں۔ اور اس طرح شادی ہو جاتی ہے۔ اس دوہے میں ٹیپ کی کڑی سے دولہا، رثائیت پیدا کرتا ہے جو بار بار آتا رہتا ہے

دن بیچ چلے تر دریا رے

حضرت قاسمؑ دولہا بنے کھڑے ہیں اور انھیں میدانِ جنگ میں جانا ہے

"بی بی کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ وہ چُنری کے گھونگھٹ سے بڑوں کی آنکھ بچا کر اپنے شوہر کو دیکھ رہی ہیں۔ اپنے ہاتھ سے ڈھال لگائی، تلوار باندھی، کٹار باندھتے وقت وہ زار و قطار رونے لگیں۔ شاید یقین ہو گیا ہو کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

یہ سب حادثات کیوں پیش آئے، دولہا نے اپنے عقیدے کے مطابق پہلے ہی بتا دیا کہ "سید" نے جب گھوڑا تیار کیا اور جب سوار ہوئے تو کسی نے چھینک دیا تھا۔ توہمات کی پرچھائیاں تو بنگلا کے 'مقتل حسین' میں بھی ملتی ہیں جو ادبی مرثیے ہیں جنگ کے نقشے ملاحظہ ہوں۔

"چھن چھن تلوار چل رہی ہے۔ 'سید' (حضرت عباسؑ) کی تلوار ناگن بن کر راہ روکنے والوں کو ڈس رہی ہے۔ ہائے رے اللہ غضب ہو گیا۔ بازو کٹ کر گر پڑا اور وہ مشک پیٹھ پر لادے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔۔۔۔"

"تلوار چل رہی ہے۔ چھری اور کٹاری بھی، لاٹھی اور بلّم بھی، گولوں کے دھماکوں سے زمین ہل رہی ہے۔ اور بندوق کی آواز سے کان پھٹے جاتے ہیں 'سید' (حضرت امام حسینؑ) کی کراہ سے آسمان رو رہا ہے۔"

دوسرے منظر میں دولہا بنانے والا اپنے ماحول سے کس درجہ متاثر نظر آتا ہے اُسے اس سے مطلب نہیں کہ اُس وقت کیا ہوا تھا، بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ ایسے موقعوں پر یہ ہو سکتا ہے۔

گھوڑے کی تصویر عوامی مرثیے اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"دُلدُل کی ننگی پیٹھ دیکھ کر اماں (حضرت فاطمہؑ) تڑپ گئیں اور دروازے پر آ کر اس سے پوچھا۔ ہمارا لال (حضرت امام حسینؑ) کہاں ہے؟ دُلدُل ہنہنایا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔۔۔"

"کربلا سے ایک لشکری مدینے لوٹا اور اماں (حضرت فاطمہؑ) اس سے اپنے لال کا حال پوچھنے لگیں۔ لشکری جواب دیتا ہے۔ تلوار چلی، گولی چلی، اور تیروں کی بوچھار سے بادل چھا گئے، خون کی ندیاں بہ گئیں۔ 'سید' کے گورے گورے بدن سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ میں اپنے امام پر مورچھل جھل رہا تھا۔ کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ دُلدُل وہیں تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے۔۔۔"

یہ ہے ایک نہایت سرسری خاکہ، اُن عوامی مرثیوں کا جو عوام کے دلوں کی گہرائیوں سے عشرہ محرم کے دوران میں اُن کی زبانوں پر آ جاتے ہیں۔ مرثیہ خوان شاید مرثیہ خوانی کے دوران میں پانی پی لیتا ہو اور ختم ہونے پر داد کا طالب ہو، دوسروں کو رُلانے کی کوشش میں ممکن ہے وہ خود رونا بھول جائے مگر یہ رونے والے نہ تو بیچ میں پانی پیتے ہیں اور نہ دوسروں کو رُلانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ خود سُنتے ہیں اور خود روتے ہیں اور یہ میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ان عوامی مرثیوں کی تخلیق اور بقا میں مردوں سے زیادہ عورتوں کا حصہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مردوں کا وجود اگر صفر نہیں تو اعشاریہ ایک فی صدی سے زیادہ بھی نہیں۔ یہ ایک بیش بہا سرمایہ ہے جو نائنوں، گدینوں، فقیرنیوں، دھوبنوں، کہارنوں، ملاحنوں وغیرہ کے سینوں میں محفوظ ہے اور جسے منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

ضروری نوٹ

غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ واپسی کے لئے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ مضمون کے ساتھ ہوگا۔

آج کل کے بدھ نمبر میں محترمہ بشارت فاطمہ کے مضمون میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ناظرین اُن کی تصحیح فرمالیں۔

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۱۶	فٹ نوٹ		CONGLOIS	LONGUOIS
۱۸	۳	۱۱	لامحدود	محدود
۲۵	۲	۱۴		سطر کے آخر میں 'لکھی' بڑھا لیجئے

کیلاش ماہر

فیروز آباد میں شیشہ گری کی صنعت

شیشہ گری کی ابتدائی تاریخ

شیشہ گری کی ابتدائی تاریخ زمین کے وجود میں آنے کے افسانوں سے وابستہ کی جاتی ہے۔ تاہم وثوق کے ساتھ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ شیشہ سازی کا دور تاریخی اعتبار سے کب شروع ہوا۔ "کانچ" کا ذکر قدیم سنسکرت کتابوں میں ملتا ہے۔ "یجروید" میں بھی کانچ کا تذکرہ مستورات کے زیورات کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ اس حوالے کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیشہ سازی کی ابتدا ہندوستان میں ۸۰۰ قبل مسیح سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ کچھ مورخین کی رائے ہے کہ شیشہ سازی کی پیدائش پہلے میسوپوٹامیا میں ہوئی اور اس ایجاد سے مصریوں نے افادہ کیا۔ مصر کے رہنے والے ۱۴۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ شیشہ سازی کرتے تھے۔ اس دور میں شیشے کی اشیاء کا شمار ذاتی سجاوٹ کے سامان میں ہوتا تھا۔ ان چیزوں کی قیمت بندوقوں اور دیگر سامان جنگ سے بھی کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ قدیم رومی تمدن کے ساتھ ساتھ شیشہ گری کی صنعت کو یورپ میں بہت فروغ ملا۔ "وینس کے گرجا گھروں میں جو شیشے کا سامان ملا ہے وہ بستی میں کیڑا ضلع کے کپڈونج کے بنے ہوئے شیشے کے سامان سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔" تاریخی حوالوں کا ذکر زیادہ نہ کرتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند سطور ہندوستان میں شیشہ گری کے ابتدائی دور پر بھی لکھ دیئے جائیں۔ مغلیہ دور حکومت میں شیشے کا استعمال زیادہ تر رؤسا اور تعلقہ داروں میں ہوتا تھا۔ اس دور میں رنگین شیشے کی اشیاء اور کانچ کی چوڑیاں بازار میں زیادہ فروخت ہوتی تھیں۔ ۱۸۷۰ء سے لے کر ۱۹۱۵ء تک شیشہ سازی کی صنعت کو ہندوستان میں قائم کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں لیکن قابل اطمینان کامیابی نہ ہو سکی۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں باہری سامان کی آمد بند ہو جانے سے شیشے کے بہت سے نئے کارخانے ہندوستان میں قائم کئے گئے۔ لڑائی کے بعد جاپان کی شیشے کی سستی اور خوبصورت اشیاء ہندوستان کے بازاروں میں بہت مقبول ہوئیں جس سے اس دور میں قومی صنعت کو کوئی قابل ذکر ترقی نہ مل سکی۔ لیکن دوسری جنگ کے دوران میں شیشے گری کی صنعت کو ہندوستان میں ابھرنے کا زریں موقع ملا۔ اس دور میں شیشے کا کافی سامان ہندوستان میں بننے لگا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد چوڑیوں کی درآمد مکمل طور سے بند ہو جانے کے باوجود ہندوستان میں شیشے کے سامان کی پیداوار بازار کی مانگ کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت کم ہے۔ اس لئے آج بھی بھاری مقدار میں شیشے کا سامان بیرونی ممالک سے منگایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔

ہندوستان میں شیشہ اور شیشے کے سامان کی درآمد

سال	قیمت روپوں میں
۱۹۵۳ء - ۵۴	۱۳۶ لاکھ
۱۹۵۴ء - ۵۵	۱۳۹ لاکھ
۱۹۵۵ء - ۵۶	۱۶۴ لاکھ

ہندوستان میں شیشہ گری

ہندوستان میں تقریباً ۲۰۰ شیشہ سازی کے کارخانے ہیں جن میں تقریباً اسی ہزار (۸۰۰۰۰) مزدور کام کرتے ہیں۔ ان کارخانوں میں زیادہ تر کانچ کی چوڑیاں، بوتلیں، چھوٹی موٹی سائنس اور ڈاکٹری میں کام آنے والا سامان۔ گلاس کی چادریں۔ گھریلو استعمال کی چیزیں وغیرہ وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔ تمام ہندوستان کا جائزہ نہ لیتے ہوئے ہم یہاں صرف فیروز آباد میں شیشہ گری کی صنعت اور اس کے مسائل کا ہی تجزیہ کریں گے۔ فیروز آباد (ضلع آگرہ) کو شیشہ گری کے لحاظ سے ہندوستان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاریخی اعتبار سے شیشہ گری کی ابتدا فیروز آباد میں کس دور میں ہوئی اس کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ یہاں شیشہ گری کی صنعت کا آغاز گھریلو پیمانے

پیدا ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں فیروز آباد میں شیشہ گری کی صنعت کی باقاعدہ تنظیم نہیں ہوئی تھی۔ جو کچھ بھی پیداوار ہوتی تھی وہ چھوٹی چھوٹی بھٹیوں تک محدود تھی یہ بھٹیاں شیشہ گروں کے مکانوں سے وابستہ تھیں۔ جن میں نہ تو مزدوروں اور دیگر کام کرنے والوں کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ صحیح طریقے سے صنعت کی تنظیم ہو سکتی ہے ۱۹۰۸ء میں جرمن ماہر کی امداد سے فیروز آباد میں ایک شیشے کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ رفتہ رفتہ کانچ کی چوڑیوں کے کئی کارخانے یہاں قائم ہو گئے۔ فیروز آباد کے مزدوروں نے جنھیں عام زبان میں "شیشہ گر" کہا جاتا ہے۔ شیشہ سازی کی صنعت کو ترقی دینے میں کافی امداد دی اور اپنے چھوٹے چھوٹے ذاتی کارخانے جگہ جگہ قائم کر لئے۔

فیروز آباد میں صنعت کا آغاز

پہلی جنگِ عظیم کے بعد فیروز آباد میں جاپانی ماہروں کی مدد سے پُرانی بھٹیوں کی جگہ نئی سائنٹیفک بھٹیاں بنائی گئیں جس سے اچھی قسم کی چوڑیاں بنانے میں بہت آسانی ہو گئی اور چوڑیاں بیلن کی امداد سے بنی شروع ہو گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان کے بازاروں میں جاپان کی ریشمی چوڑیاں بھاری مقدار میں آگئیں جو فیروز آبادی چوڑیوں سے زیادہ خوبصورت تھیں اور اُن کی قیمت بھی مقابلتاً کم تھی۔ بازار کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے فیروز آباد کے شیشہ گروں نے بھی ریشمی چوڑیاں بنانا شروع کر دیا اسی دور میں شیشے کے اور بہت سے معاون کارخانے قائم ہو گئے۔ اس طرح چوڑی کی صنعت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں فیروز آباد کے شیشہ گروں اور دیگر کارخانے داروں نے حکومت ہند سے تحفظ کی اپیل کی۔ مگر چند وجوہ کی بنا پر یہ اپیل مسترد کر دی گئی۔ مگر دوسری جنگ نے فطری طور پر فیروز آباد میں شیشہ گری کی صنعت کو ترقی کا زرّیں موقع دیا۔ لیکن جنگ کے اختتام پر ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم نے اس صنعت کو کافی نقصان پہنچایا۔ تقسیم سے بازار کا بڑا حصہ جہاں چوڑیوں کی کافی کھپت ہوتی تھی۔ ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ اس کے علاوہ شیشہ گروں کی کافی تعداد پاکستان چلی گئی۔ لیکن ان سب اثرات کے باوجود فیروز آباد کی صنعت اسی طرح اپنا وقار بنائے ہوئے آہستہ آہستہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

صنعت کی تنظیم

فیروز آباد میں صنعت کی موجودہ تنظیم کو مدِّنظر رکھتے ہوئے۔ تمام کارخانوں کو ہم تین حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ اول وہ کارخانے ہیں۔ جہاں شیشے کو پگھلا کر تار بنائے جاتے ہیں۔ دوئم وہ کارخانے ہیں جہاں شیشے کے کھینچے ہوئے لمبے تاروں کو بیلن کی مدد سے گول چوڑیوں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ سوئم وہ چھوٹے چھوٹے کارخانے ہیں جو اپنے گھروں میں گول شیشے کے تاروں کو جوڑ کر چوڑیاں بناتے ہیں۔ ان کے علاوہ چوڑیوں پر سنہری پالش چڑھایا جاتا ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ فیروز آباد میں تقریباً بارہ سو ۱۲۰۰ چھوٹے بڑے کارخانے ہیں۔ شیشہ گری کی صنعت نے فیروز آباد میں تیس ہزار انسانوں کو روزگار دیا ہے۔ مختلف قسم کے کارخانوں کی تعداد کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
۱۔ شیشے کو پگھلانے اور تار کھینچنے والے	۸۰	۱۰۰۰
۲۔ بیلن سے کام کرنے والے	۹۰	۶۰۰۰
۳۔ چوڑیوں کو جوڑنے، سجانے اور پالش چڑھانے والے	۱۰۰۰	۲۳۰۰۰
کل تعداد	۱۱۷۰	۳۰۰۰۰

مندرجہ بالا اندازے سے یہ ظاہر ہے کہ اس صنعت میں تقریباً تیس ہزار اور اس سے بھی زیادہ انسان مختلف شعبوں سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کارخانوں میں تقریباً چار کروڑ روپے کی چوڑیاں اور کانچ کا دیگر سامان بنایا جاتا ہے جو ہندوستان کے کونے کونے میں فروخت ہوتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں ہندوستانی عوام رہتے ہیں۔ چوڑیوں کی کھپت ہوتی ہے۔

چوڑیاں ہندوستانی خواتین کے لئے سنگار کے علاوہ سہاگ کی نشانی سمجھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے ہر کونے میں چوڑیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ فیروز آباد میں مختلف قسم کے کانچ کے کڑے۔ ریشمی، موٹی اور ڈوری دار چوڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ مگر پچھلے پانچ سال میں بنی ہوئی چوڑیوں کی کل مقدار بڑھنے کے بجائے کچھ گھٹ رہی ہے۔ جس کی خاص وجہ "بازار میں مانگ کی کمی" ہے کانچ کی چوڑیوں کی مانگ گھٹنے کے بہت سے اسباب ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس دور میں خواتین میں زیورات کے علاوہ چوڑیاں پہننے کا رواج برابر کم ہوتا جا رہا ہے۔ سادگی پسندی کی بنا پر سجاوٹ کی کم سے کم چیزوں کا استعمال ہونے لگا ہے۔ علاوہ اس کے پلاسٹک کی چوڑیوں نے بھی مانگ کا بہت کچھ حصہ اپنا لیا ہے۔ جس کے سبب سے بازار میں کانچ کی چوڑیوں کی فروخت کم ہو رہی ہے۔ کانچ کی چوڑیوں کی مانگ گھٹنے سے فیروز آباد کے صنعتی حلقوں میں بے روزگاری کا خوف بڑھتا جاتا ہے۔ اگر صنعت کے مسائل کا جلد ہی کوئی حل تلاش نہ کیا گیا تو ہزاروں مزدور جن کا ذریعہ معاش شیشہ گری کی صنعت پر منحصر ہے بے روزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔

فیروز آباد کے مسائل

فیروز آباد میں شیشہ گری کی صنعت کے مسائل کا صحیح تجزیہ کرنے اور اُن کا حل سوچنے کے لئے صنعت کی تنظیم کو بھی مدِّنظر رکھنا ہوگا۔ تمام مسائل کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے وہ مسائل ہیں جن کا براہِ راست تعلق مالیات سے ہے۔ صنعت کا ڈھانچہ اس طرح ہے جس میں ایسے کارخانوں کی تعداد بہت ہے جو اپنا کام گھریلو پیمانے پر کرتے ہیں۔ جن کی کل لاگت پچاس روپے سے دو سو روپے تک ہے روپے پیسے کی کمی سے چھوٹے چھوٹے گھریلو کارخانے جو کانچ کے لمبے تاروں کو جوڑ کر چوڑیاں بناتے ہیں یا سنہری پالش کرتے ہیں اپنے مال کو بڑے بیوپاریوں کو سستے داموں فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے ان کارخانہ داروں کو کچا مال ادھار خریدنا پڑتا ہے اور بازار کے نرخ سے زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔ چوڑیوں اور کانچ کے دیگر سامان میں کام آنے والے کچے مال میں کوئلہ، سوڈا ایش اور دیگر دوائیاں بہت اہم ہیں۔ بازار کی تنظیم کے علاوہ کچے مال کی خریداری کے لئے بھی روپے کی ضرورت ہے۔ جس کو مہیّا کرنے کے لئے چھوٹے کارخانوں کو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ کچے مال کے سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ کوئلے کا ہے کوئلے کی کھپت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے فیروز آباد میں مقررہ کوٹے کی مقدار بہت کم ہے جس سے اکثر کارخانہ داروں کو کبھی کبھی مقررہ نرخوں سے زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اندازہ کیا ہے کہ فیروز آباد میں کم سے کم ایک سو بیس (۱۲۰) ویگن کوئلے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے "سنہری پالش" کے لئے "لیکوئڈ گولڈ" جو بیرونی ممالک سے منگایا جاتا ہے۔ کارخانے داروں کو کافی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اب ہندوستان میں سنہری پالش بنانے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ عنقریب ہی ہندوستان میں سنہری پالش کی کمی دور ہو جائے گی۔

فیروز آباد میں زیادہ تر کارخانے شہری حلقوں میں آباد ہیں اور بیشتر مزدور چھوٹے چھوٹے گندے چھپّروں میں کام کرتے ہیں۔ جگہ کی قلّت سے اس صنعت کی صحیح تنظیم نہیں ہو سکتی۔ شیشہ گری کی صنعت کے لئے ضروری ہے کہ شہر سے کچھ دور صنعتی کالونی بسائی جائے۔ جہاں چھوٹے بڑے کارخانوں کو رعایتی قیمت پر یا کرائے پر ایسے مکان دیئے جائیں جن میں شہری فیکٹریاں منتقل کی جا سکیں۔ جگہ کی قلّت کے علاوہ بازار کی باقاعدہ تنظیم بھی صنعت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ چوڑیوں کی مانگ کو برقرار رکھنے کے لئے اور بازار کو وسیع کرنے کے لئے صنعت کی از سرِ نو تنظیم کی ضرورت ہے۔ باہمی امداد کے ذریعے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ بازار کی ترقی کے لئے جو باہمی امدادی سوسائٹیاں بنائی جائیں۔ وہ جگہ جگہ چوڑیوں کی پبلسٹی کے فرائض بھی انجام دیں اور کارخانہ داروں کو نئے نئے فیشن اور ڈیزائن سے بھی آگاہ کرتی رہیں اور اگر ضرورت پڑے تو بیرونی ممالک میں اخباروں اور رسائل کے ذریعہ تشہیر کی جائے۔

مختصر الفاظ میں فیروز آباد کی شیشہ گری کی صنعت کا مستقبل باہمی امداد کے اصولوں سے وابستہ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سرکاری امداد اور باہمی تعاون سے ایک ایسی کوآپریٹو سوسائٹی کی تشکیل کی جائے جس میں تمام کارخانوں کے مالک اور مزدوروں کے نمائندے شامل ہوں۔ اس سوسائٹی کے صحیح انتظام اور صلاح دینے کے لئے کسی سرکاری افسر کا تقرر کیا جائے۔ علاوہ اس کے صنعتی علاقے کی تعمیر کچے مال کی خریداری اور بازار کی ترقی کے لئے چھوٹی چھوٹی ماتحت سوسائٹیاں بنا دی جائیں جو جنرل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام رہیں۔

آج کل فروری ۱۹۵۷ء نمبر

آئندہ شمارے میں حسب ذیل اہلِ قلم کے
نگارشات شائع ہونے کی توقع ہے

غلام رسول مہر	دل شاہجہان پوری
عرشی رام پوری	ناطق گلاوٹھوی
مالک رام	علی سردار جعفری

بچوں کا آج کل

'بچوں کا آج کل' بند کر دیا گیا ہے لیکن 'آج کل' کے صفحات میں کمی نہیں ہوگی۔ یعنی ہر شمارہ حسب سابق ۶۰ صفحوں پر مشتمل ہوگا۔ مضمون نگار حضرات اور شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ بچوں کے لئے مضامین، کہانیاں اور نظمیں وغیرہ ارسال نہ فرمائیں۔

اسرار احمد آزاد

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی صدارت

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جمہوریت کے مغربی نظریات پر مبنی، دُنیا کی سب سے بڑی وفاقی جمہوری ریاست ہے۔ براعظم امریکہ کی دریافت کے بعد اگرچہ وہاں یورپ کی متعدد قوموں کے نوآباد کار آباد ہو گئے تھے اور اُنھوں نے نئی دُنیا کی وسعتوں میں متعدد ریاستیں قائم کر لی تھیں لیکن شمالی امریکہ کی بیشتر ریاستیں برطانوی نوآبادیات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ نوآبادیاتی نظام جن نقصان رساں خصوصیات کا حامل ہے۔ امریکہ کی برطانوی نوآبادیات کے باشندے بھی ان کے اثرات اور نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ مگر چوں کہ ان نوآبادیات کے باشندے بھی اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے جو انھیں نوآبادیاتی نظام کا محکوم بنائے ہوئے تھی۔ اس لئے وہ اس نفرت انگیز اور نقصان رساں صورتِ حالات کو زیادہ مدت تک برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ جولائی ۱۷۷۶ء کو اُنھوں نے برطانیہ سے علیحدگی اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور پانچ سال تک برطانیہ کے مقابلے میں آزادی کی لڑائی لڑتے رہے اور کامیاب ہونے کے بعد انھیں آزادی حاصل ہوئی تو وہ ایسی تیرہ ریاستوں میں منقسم تھے جو اگرچہ ایک وفاق کے ساتھ وابستہ تھیں لیکن انھیں داخلی طور پر وفاقی حکومت سے کہیں زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ مگر جنگ نے انھیں کمزور بنا دیا تھا۔ کسی ریاست میں جداگانہ طور پر اپنے دفاع کی قوت باقی نہیں رہی تھی اور کوئی ریاست بھی ذاتی طور پر کوئی اہم تعمیری قدم نہیں اُٹھا سکتی۔

ان حالات میں انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اپنے تمام تر وسائل کو مشترک اور متحد کرنے کی نیت سے ۱۷۸۷ء میں فیڈرل کنونشن منعقد کر کے ایک مضبوط متحدہ حکومت کے قیام کا فیصلہ کیا اور آج کی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اسی فیصلے کی بنیاد پر قائم ہے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دستور کی ترتیب میں تیرہ ریاستوں نے حصہ لیا تھا۔ ۹ ریاستوں نے فوراً اس کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ دو ریاستوں نے ایک ماہ کے بعد جون ۱۷۸۸ء میں اس کی توثیق کی تھی اور باقی ماندہ دو ریاستیں ۱۷۹۰ء میں اس کے ساتھ وابستہ ہوئی تھیں۔ لیکن آئین کا نفاذ ۴ مارچ ۱۷۸۹ء کو عمل میں آگیا تھا۔ اور اس کے نفاذ کے پہلے قدم کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پہلے صدر اور نائب صدر فروری ۱۷۸۹ء کے پہلے چہارشنبہ کو منتخب کر لئے گئے تھے۔ اس وقت سے دسمبر ۱۹۵۶ء تک وہاں ۳۴ صدر برسرِ اقتدار رہ چکے ہیں اور اب مسٹر آئزن ہاور اس ریاست کے ۳۵ویں صدر منتخب ہوئے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کا انتخاب چار سال کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور چوں کہ اس مدت میں اسے وسیع ترین اختیارات حاصل رہتے ہیں۔ اس لئے یہ انتخاب قومی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ بین اقوامی زاویۂ نظر سے بھی بے حد اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس کے نتیجے کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے باشندوں کی داخلی اور بین اقوامی حکمتِ عملی کا آئینہ دار تصوّر کیا جاتا ہے۔ لیکن سیاسی اہمیت کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدارتی انتخاب بعض حیثیتوں سے بجائے خود ایک دلچسپ سیاسی واقعہ بھی ہے۔

سیاسی پارٹیوں کی قوت آزمائی۔

دنیا کے دوسرے جمہوری دساتیر کی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین میں بھی منصبِ صدارت کے لئے بطور اُمیدوار کھڑے ہونے والے حضرات میں بعض خصوصیات کی موجودگی کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور ان خصوصیات یا شرائط کے مطابق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہر وہ باشندہ جو چودہ سال سے اس ملک کا شہری ہو اور عمر میں ۳۵ سال سے کم نہ ہو اس منصب کے لئے اُمیدوار ہو سکتا ہے لیکن

وہاں رواجی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ منصبِ صدارت کے لئے اُمیدواروں کو وہاں کی دو سیاسی پارٹیاں — ری پبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹیز — نامزد کرتی ہیں۔ اور اگرچہ اس انتخاب میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہر ووٹر (رائے دہندہ) حصّہ لیتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ انتخاب انھیں دونوں پارٹیوں کی قوت آزمائی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

ڈیموکریٹک پارٹی [illegible] میں قائم کی گئی تھی۔ لیکن ۱۷۹۲ء میں اس کا نام تبدیل کرکے 'ری پبلکن پارٹی' رکھ دیا گیا تھا۔ اس وقت یہ پارٹی مرکزی حکومت کے اختیارات کو محدود کرنے، تجارت کی آزادی اور سیاسیات میں عوام کے اثر و رسوخ کو ترقی دینے کی حامی تھی۔ ۱۸۲۴ء کے بعد اس پارٹی میں اختلاف اور انتشار رونما ہوا۔ پارٹی کا ایک گروہ غلامی کو باقی رکھنے اور تجارتی محاصل کو کم کر دینے کا حامی تھا اور دوسرا گروہ غلامی کے خاتمے اور محاصل کو بڑھانے کا داعی لیکن چوں کہ ان دونوں نظریات کے حاملین کے مابین کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ اس لئے موخرالذکر گروہ نے [illegible] میں 'نیشنل ری پبلکن پارٹی' کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کر لی اور [illegible] میں اس کا نام صرف ری پبلکن پارٹی رہ گیا۔ اور [illegible] میں قائم شدہ جماعت دوبارہ خود کو ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے موسوم کرنے لگی۔

سطورِ بالا کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ابتدا میں امریکہ کی ان دونوں پارٹیوں میں اگر نظریہ اور مسلک کا کوئی فرق تھا تو وہ صرف اس قدر ہی تھا کہ ڈیموکریٹک پارٹی غلامی کی رسم کو باقی رکھنا اور محاصل میں کمی کرنا چاہتی تھی اور ری پبلکن پارٹی اس نظریہ کی مخالف تھی۔ لیکن ان کا یہ اختلاف رسمی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے مابین فرق اور امتیاز کے نمایاں اسباب متعین نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے باوجود ان پارٹیوں کے مابین اختلافات رہتے ہیں اور ان میں سے بیشتر اختلافات وقتی مسائل اور نظم و نسق سے متعلق ہوتے ہیں اور انتخابی مہم کے دوران میں یہ اختلافات زیادہ نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً [illegible] کے انتخابات میں یہ سوال بھی موضوع رائے دہندگی بنا رہا ہے۔ کہ ایٹمی دور میں ہونے والے تجربات کو فوراً بند کر دینا چاہئے یا نہیں۔

انتخابی مہم کے مرحلے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدارتی انتخاب کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس منصب کا انفرادی طور پر کبھی کوئی شخص اُمیدوار نہیں ہوا۔ بلکہ [illegible] تک دونوں پارٹیوں کے رہنما کانگریس کے اراکین سے مشورہ کے بعد صدارت اور نائب صدارت کے لئے اُمیدواروں کو نامزد کر دیا کرتے تھے۔ لیکن [illegible] سے دونوں پارٹیاں براہِ راست ان مناصب کے لئے اپنے اُمیدوار نامزد کرنے لگی ہیں۔

انتخابی مہم کا آغاز بھی صدارتی انتخاب کے سال کے آغاز ہی سے ہو جاتا ہے ابتدا میں اس منصب کے حصول کے خواہش مند حضرات، انتخاب میں حصّہ لینے کے لئے اپنی رضامندی کا اعلان کرتے ہیں اور اس کے بعد الکٹرل کالجوں کے انتخابات اور پارٹی کنونشنوں کے انعقاد کی کارروائیاں شروع ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رائے دہندہ شہری اگرچہ براہِ راست صدر کا انتخاب نہیں کر سکتے لیکن انتخاب انھیں کی رائے پر منحصر ہوتا ہے۔ اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ امریکی جمہوریت کے قیام کے بعد جب صدر کے انتخاب کا مرحلہ سامنے آیا تو اس کے ساتھ ہی رائے دہندگان کی تعلیم اور جمہوری شعور کی کمی کا مسئلہ بھی پیشِ نظر تھا اور چوں کہ امریکی جمہوریت کے آباد اپنی قسمت کو مذکورہ بالا قسم کے رائے دہندگان کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھے اس لئے انھوں نے صدر اور نائب صدر کے انتخاب کو الکٹرل کالجوں کے توسط کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔ یہ طریقۂ کار اس وقت تک جاری ہے اور رائے دہندگان صدر کا نہیں بلکہ صدر کو منتخب کرنے والوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انتخابی سرگرمیاں کم و بیش ایک سال تک جاری رہتی ہیں۔ اس مدت میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شامل ۴۸ ریاستیں کانگریس (امریکی پارلیمنٹ) کے ایوانِ نمائندگان یعنی ایوانِ زیریں کے تمام اراکین، سینیٹ یعنی ایوانِ بالا کے ایک تہائی اراکین کو منتخب کرنے کے علاوہ ملک کے نائب صدر کا انتخاب بھی کرتی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صدارتی انتخابات کی مہم کا آغاز، انتخابی سال کے شروع میں اُس وقت ہوتا ہے جب دونوں پارٹیوں کے متعدد اراکین منصبِ صدارت کے لئے اپنی نامزدگی پر رضامندی کا اظہار کرتے ہیں اس کے بعد ایک جانب تو دونوں پارٹیوں کی جانب سے 'کنونشن' منعقد کرنے کی تیاریاں کی جانے لگتی ہیں اور دوسری طرف الکٹرل کالجوں کے انتخابات شروع ہو جاتے ہیں۔

پارٹی کنونشن

امریکہ میں منصبِ صدارت کے اُمیدواروں کی نامزدگی کے لئے دونوں پارٹیوں کے 'نیشنل کنونشن' منعقد کئے جاتے ہیں۔ ان ملک کے آئین سے [illegible]

کوئی تعلق نہیں لیکن چونکہ ۱۸۳۱ء سے اس وقت تک ہر چوتھے سال یہ کنونشن منعقد ہوتے چلے آرہے ہیں اس لئے انھیں امریکہ میں ایک اہم قومی ضرورت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے کنونشن کی کارروائی کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے ہر پارٹی اپنی "کنونشن کمیٹی" قائم کرتی ہے اور یہ کمیٹی ہر ریاست کے دو دو نمائندوں (ایک مرد اور ایک خاتون) پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور یہی کمیٹی تمام نمائندوں کے حق نمائندگی کی توثیق بھی کرتی ہے۔ اس کے بعد ہر ریاست کے انتخابی حلقوں سے ہر پارٹی کے اراکین کی تعداد کے مطابق کنونشن کے لئے نمائندوں کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ لیکن بعض ریاستوں میں یہ انتخاب پارٹی کے اراکین کی عام آراء سے کیا جاتا ہے اور بعض ریاستوں میں پارٹی رہنماؤں کے کنونشن انھیں منتخب کر لیتے ہیں اور ہر ریاست کے نمائندوں کو "کنونشن" میں صدارت کے لئے اپنے اُمیدواروں کے نام پیش کرنے اور دوسرے کسی اُمیدوار کی نامزدگی پر اتفاق رائے کر لینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد صدارتی انتخاب کی تاریخ سے چھ ماہ قبل دونوں پارٹیوں کے "کنونشن" منعقد ہوتے ہیں۔ اسی دوران دونوں پارٹیاں اپنے اپنے انتخابی منشور مرتب کرتی ہیں اور ہر پارٹی کے کنونشن میں سب سے پہلے اسی منشور کو جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں "پارٹی پلیٹ فارم" کے نام سے موسوم ہے منظور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اُمیدواروں کے نام پیش ہوتے ہیں اور اُن کی تائید کی جاتی ہے اور اس کارروائی کے بعد اُمیدواروں کے انتخاب کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ نمائندوں کو تمام اُمیدواروں میں سے کسی ایک اُمیدوار کو رائے دینے کا حق حاصل ہوتا ہے اور جس اُمیدوار کو کنونشن کی اکثریت کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کی نامزدگی عمل میں آتی ہے اس طرح اگر پہلی مرتبہ کسی اُمیدوار کو بھی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہوتی تو دوبارہ رائیں لی جاتی ہیں اور جن اُمیدواروں کو کم رائیں ملتی ہیں وہ اُمیدواروں کی صف سے نکلتے چلے جاتے ہیں۔

منصبِ صدارت کے اُمیدوار کی نامزدگی کے بعد پارٹی کے ممتاز ترین رہنما، صدارت کے اُمیدوار کے مشورے سے نائب صدر کے منصب کے لئے کسی شخص کا انتخاب کرتے ہیں اور کنونشن عموماً اس انتخاب کی تائید اور توثیق کر دیتا ہے اور کنونشن کی جانب سے اُمیدوارِ صدارت کی نامزدگی کے اعلان کے بعد انتخاب کی عوامی مہم کا آغاز ہوتا ہے۔

الکٹرل کالج

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کروڑوں رائے دہندگان صدر کے انتخاب کے لئے جن نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں ان کی تعداد صرف ۵۳۱ ہوتی ہے اور جو اُمیدوار ۲۶۶ آرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر منتخب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر متعدد اُمیدواروں میں سے کسی اُمیدوار کو بھی کم از کم ۲۶۶ رائیں حاصل نہیں ہوتیں تو یہ معاملہ ایوانِ نمائندگان کے روبرو پیش ہوتا ہے اور وہاں اس مسئلے پر ہر ریاست صرف ایک ہی رائے دینے کی مجاز ہوتی ہے اور یہ ایوان منصبِ صدارت کے تمام اُمیدواروں سے انھیں اُمیدواروں کو مقابلے کا اہل قرار دے کر جنھیں "الکٹرل کالج" کی علی الترتیب سب سے زیادہ رائیں حاصل ہوتی ہوں کسی ایک کو صدر منتخب کر لیتا ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۴۸ ریاستوں پر مشتمل ہے اور جس ریاست کو ایوانِ نمائندگان اور ایوانِ بالا کے لئے مشترکہ طور پر جتنے نمائندے منتخب کرنے کا حق حاصل ہے وہ "الکٹرل کالج" کے لئے بھی اسی قدر نمائندے منتخب کرتی ہے۔ امریکہ میں ریاست جارجیا کے علاوہ جہاں رائے دہندہ کے لئے صرف اٹھارہ سالہ ہونا کافی ہے۔ ۲۱ سال یا اس سے زیادہ عمر کے ہر ایسے شہری کو جو کسی جرم میں سزا یاب نہ ہوا ہو، لکھنا پڑھنا جانتا ہو اس کا نام فہرستِ رائے دہندگان میں درج ہو اور جن ریاستوں میں "پول ٹیکس" نافذ ہے وہاں اس نے یہ ٹیکس ادا کر دیا ہو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ پھر جو امریکی "یومِ انتخاب" پر اپنے رائے دہندگی کے حلقوں میں موجود نہیں رہ سکتے اُن کی رائے حاصل کرنے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے اور اس طرح امریکی رائے دہندگان کی اکثریت صدر کے انتخاب میں حصہ لیتی ہے۔

الکٹرل کالج کے انتخاب کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اگرچہ ہر ریاست میں اس کے اراکین کا انتخاب پارٹیوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ لیکن جس ریاست میں جس پارٹی کے کامیاب اُمیدواروں کو اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ اس ریاست میں دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے بھی صدر کے انتخاب کے وقت اپنی ریاست کی اکثریت کے ساتھ رائے دیتے ہیں اور الکٹرل کالج کے انتخاب کے نتائج ہی سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ آئندہ چار سال میں ریاستہائے متحدہ

امریکہ کے منصبِ صدارت پر کس پارٹی کا نامزد کیا ہوا اُمیدوار فائز رہے گا۔

الکٹرل کالج کا انتخاب نومبر کے پہلے ہفتے میں ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دسمبر کے دوسرے چہارشنبہ کے بعد آنے والے دوشنبہ کو ہر ریاست کے الکٹرل کالج کے اراکین اپنی ریاست کے دارالحکومت میں جمع ہو کر صدر کا انتخاب کرتے ہیں اور بیلٹ پیپرز کو سربمہر کر کے واشنگٹن بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں کم و بیش ایک ماہ کے بعد کانگریس کے دونوں ایوانات کے اراکین کے سامنے رائیں کھول کر شمار کی جاتی ہیں اور کامیاب اُمیدوار کے نام کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور وہ ۲۰ جنوری کو باقاعدہ طور پر اس منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۰۸ء سے دونوں پارٹیوں کے وہ نمائندے جو الکٹرل کالج کے رکن ہوتے تھے اپنی پارٹی کے کسی اُمیدوار کو رائے دے سکتے تھے۔ لیکن ۱۸۰۸ء میں دونوں پارٹیوں نے یہ اصول اختیار کر لیا تھا۔ کہ ان کے رہنما جس شخص کو منصبِ صدارت کے لئے اُمیدوار نامزد کریں گے پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے الکٹرل کالج کے تمام اراکین اسی کو رائے دیں گے۔ اس وقت سے اب تک ایک یا دو مستثنیات کے علاوہ اسی اُصول پر عمل کیا جاتا ہے۔

مصارف اور عطیات

ریاست ہائے متّحدہ امریکہ کے صدر کا انتخاب قومی اور بین اقوامی نقطۂ نظر سے جس درجہ اہم ہے انتخابی مہم کے مصارف بھی اسی قدر زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ ہر اُمیدوار کی مؤید پارٹی قانونی طور پر ایک تقویمی سال میں ۳۰ لاکھ ڈالر جمع اور خرچ کر سکتی ہے

تیس لاکھ ڈالر کی یہ گراں قدر رقم پارٹی کے حامیوں کے عطیات سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن قانوناً کوئی شخص ۵ ہزار ڈالر سے زیادہ عطیہ نہیں دے سکتا تھا۔ پھر بنکوں، کارپوریشنوں اور مزدور سبھاؤں کو بھی سیاسی جماعتوں کے لئے عطیات دینے کی ممانعت ہے۔ لیکن ان اداروں کے ملازمین اور عہدیدار ذاتی حیثیت میں یہ عطیات ضرور دے سکتے ہیں۔

اہم ترین کام

صدارتی انتخاب کے سلسلے میں سب سے اہم کام رائے دہندگان کو ہم نوا بنانا ہوتا ہے۔ چناں چہ دونوں پارٹیاں اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ ان کا 'الیکشن پلیٹ فارم' اقتصادی، مذہبی اور جغرافیائی گروہوں کو زیادہ سے زیادہ متوجہ اور متاثر کر سکے۔

پھر رائے دہندگان کو اس پلیٹ فارم سے واقف اور روشناس کرانے کا کام صرف اُمیدواروں، پیشہ ور مدبرین اور عوام کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے کے فن کے ماہرین تک محدود نہیں رہتا بلکہ دونوں پارٹیوں کے ہمدرد اپنی اپنی پارٹی کے اُمیدوار کو کامیاب بنانے کی جد و جہد کرنے کو اپنا قومی فریضہ تصور کرتے ہیں۔ خواتین اپنے ہمسایوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرتی ہیں بڑے شہروں اور قصبوں میں جلسے منعقد کئے جاتے ہیں۔ سیاسی دعوتیں دی جاتی ہیں رائے دہندگان کو اطمینان کے ساتھ غور و فکر کا موقع دینے کے لئے انتخاب سے متعلق زیادہ سے زیادہ لٹریچر شائع کیا جاتا ہے اور ریڈیو نیز ٹیلی ویژن کے ذریعے سے عوام کو انتخابی مسائل اور انتخابی مہم کی رفتار سے برابر باخبر رکھا جاتا ہے

ریاست ہائے متّحدہ امریکہ کے صدارتی انتخاب کی مہم کی ایک ندرت "اسٹاپ وہسل کمپین" بھی ہے۔ اور اس مہم کا مطلب یہ ہے کہ منصبِ صدارت کے اُمیدوار ٹرین کے ذریعے سے علیحدہ علیحدہ ملک کے زیادہ سے زیادہ رقبے کا سفر کر کے ٹرین ہی میں سے زیادہ سے زیادہ رائے دہندگان کے روبرو تقریر کرتے ہیں اور اگرچہ حالیہ صدارتی انتخاب کے زمانے میں ریاست ہائے متّحدہ امریکہ کے چار کروڑ گھرانوں میں ٹیلی ویژن سٹ موجود تھے اور اُن کی بدولت کم و بیش نصف رائے دہندگان اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہوئے انتخابی مہم کے تمام مناظر کو دیکھ سکتے تھے۔ اس کے باوجود "اسٹاپ وہسل کمپین" پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور اس میں کوئی ترمیم یا تخفیف نہیں کی گئی۔

ذمہ داریاں

ریاست ہائے متّحدہ امریکہ کے صدر کی ذمہ داریاں بے حد وسیع اور گوناگوں واقع ہوتی ہیں۔ اور ان کی وسعت اور ہمہ گیری کے پیشِ نظر اُن سے عہدہ برا ہونے کے وسائل کو بھی وسیع اور ہمہ گیر بنایا گیا ہے۔ چناں چہ صدر کا ذاتی عملہ جس میں اقتصادیات، مالیات، عسکریات، قومی اور بین اقوامی معاملات و مسائل، میزانیہ، مراسلت اور پروپیگنڈا کے ماہرین شامل ہوتے ہیں۔ کم و بیش ۔وصد افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور صدر کے ذاتی دفاتر میں ایک ہزار افراد کام کرتے ہیں

کابینہ صدر کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ لیکن اراکینِ کابینہ کے علاوہ صدر وقتاً فوقتاً مختلف محکموں کے اعلیٰ افسروں، ہر دو ایوانات کے اراکین اور دونوں پارٹیوں کے رہنماؤں سے بھی مشورے کرتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ قومی اور بین اقوامی معاملات اور مسائل سے باخبر رہتے ہیں۔ اور ان کے ذاتی

عملے میں شامل ماہرین تمام مسائل کو ان کے روبرو اتنے اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ انھیں کسی مسئلے کو سمجھنے میں کوئی دقت اور دشواری پیش نہیں آتی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کو ان کی گوناگوں ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے میں امداد دینے کے لئے کانگریس نے ۱۹۴۷ء میں "نیشنل سکیورٹی کونسل" کے نام سے ایک اور مجلس بھی قائم کی تھی۔ یہ مجلس صدر، نائب صدر، ناظم امور خارجہ، ناظمِ دفاع اور مختلف محکموں کے ممتاز ترین حکام پر مشتمل ہے اور اس کے ذریعے سے صدر کو اپنی داخلی، غیر ملکی اور عسکری حکمتِ عملی میں، اشتراک عمل قائم رکھنے میں قابلِ قدر امداد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ نائب صدر، ایوان نمائندگان کا اسپیکر اور ایوانِ بالا کے وہ پارٹی لیڈر بھی جن کی پارٹی کے ساتھ صدر کا تعلق ہوتا ہے اُن کی امداد کرتے ہیں۔

حقوق و اختیارات

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کی وسیع ذمہ داریوں کی نسبت سے ان کے اختیارات بھی بے حد وسیع ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس عہد کا کوئی دستوری بادشاہ بھی ان سے زیادہ اختیارات کا حامل نہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صدر کی تنخواہ دو لاکھ چالیس ہزار ڈالر ہے۔ وہ مسودہ قانون کو مسترد کئے بغیر اس پر اپنے دستخط ثبت نہ کرکے اسے قانون بننے سے روک سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس زمانے میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہو رہا ہو تو گیارہ دن بعد یہ مسودہ قانون خود بخود قانون بن جاتا ہے۔ البتہ دس روز سے پہلے کانگریس کا اجلاس ختم ہو جانے کی صورت میں یہ مسودہ قانون مسترد سمجھا جاتا ہے۔ صدر اپنے حق استرداد (ویٹو) سے کام لے کر قانون کے مسودوں اور کانگریس کی دوسری تجاویز کو نامنظور کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں انھیں اس نامنظوری کی وجوہ کے ساتھ ایسے مسودات یا تجاویز کو اس ایوان میں واپس بھیجنا پڑتا ہے۔ جس نے اسے منظور کیا ہو اور اگر دونوں ایوانات جُداگانہ طور پر ان مسودوں یا تجاویز کو ایک تہائی اکثریت سے دوبارہ منظور نہیں کر سکتے تو انھیں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

صدر ہی امریکہ کی بری، بحری اور فضائی افواج کے سپہ سالارِ اعظم بھی ہوتے ہیں انھیں ایوانِ بالا کے اراکین کی دو تہائی اکثریت کی رضامندی سے معاہدات طے کرنے کا حق بھی حاصل ہے اور وہ ایوان کی منظوری کے بغیر، سفیروں، وزیروں، عدالت عالیہ کے ججوں اور دوسرے اعلیٰ عہدے داروں کا تقرر بھی کر سکتے ہیں۔

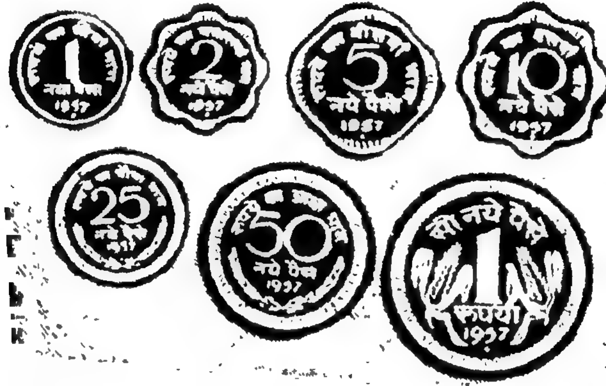
کانگریس کے دونوں ایوانات کے اجلاس صدر ہی کی دعوت پر منعقد کئے جاتے ہیں اور التوا کے وقت کے تعین پر اختلاف رائے پیدا ہو جانے کی صورت میں وہی اس وقت کا تعین بھی کرتے ہیں۔ انھیں تمام قوانین کے نفاذ اور نفاذ کے طریقۂ کار سے متعلق ضوابط بنانے کا اختیار بھی حاصل ہے اور وہ ریاست کے خلاف جرائم کا ارتکاب کرنے والے مجرمین کے علاوہ تمام مجرمین کی سزاؤں میں تخفیف یا اُن کی تنسیخ بھی کر سکتے ہیں۔

بھارت میں دھان کا زیرِ کاشت رقبہ

بھارت میں دھان کی فصل کا زیرِ کاشت رقبہ دنیا بھر میں دھان کے زیرِ کاشت رقبے کا قریباً ایک تہائی ہے۔ بھارت میں چاول کی پیداوار دنیا بھر میں اس فصل کی کل پیداوار کا چوتھا حصہ ہے۔ بھارت میں فی ایکڑ اوسط پیداوار ۱۲۲۰ کلوگرام ہے جب کہ دنیا کا یہ اوسط ۱۶۵۰ کلوگرام ہے۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ چاول پیدا کرنے والا ملک چین ہے۔ اس سے دوسرے درجے کا دیش بھارت ہے۔ ۱۹۵۴-۵۵ء میں بھارت نے دو کروڑ چالیس لاکھ میٹرک ٹن صاف شدہ چاول پیدا کیا۔ اسی برس کے دوران میں پاکستان نے اسی لاکھ میٹرک ٹن، تھائی لینڈ نے ۶۳ لاکھ میٹرک ٹن اور برما نے ۳۸ لاکھ میٹرک ٹن چاول پیدا کیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں دنیا بھر میں چاول کی جتنی تجارت ہوئی تھی، اندازہ ہے کہ اس کا آٹھواں حصہ بھارت نے برآمد کیا تھا۔

آپ کے نئے سکّے



یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے

خرید و فروخت کے لئے دونوں ہی سکّے یعنی نئے اور پرانے ٹھیک ہوں گے۔ کوئی شخص ان میں سے کسی بھی سکے میں ادائگی لینے سے انکار نہیں کر سکتا۔

آپ کو سکّوں کے تبادلے کے نقشہ میں دیئے گئے متبادل سکّوں سے زیادہ کی نہ تو مانگ کرنی چاہئے اور نہ ہی زیادہ ادائگی کرنی چاہئے۔

آپ موجودہ سکّوں یا نئے سکّوں یا دونوں سکّوں کو ملا کر جو سکّے بھی آپ کے پاس ہوں ان میں ادائگی کر سکتے ہیں۔

- سکّوں کے تبادلے کے نقشہ کو رقم کی ٹھیک ادائگی کے وقت ہی استعمال میں لائیے۔
- ٹھیک ٹھیک گنتی کے مقاصد کے لئے ۱۰۰ نئے پیسوں کو ایک روپیہ یا ۱۶ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے برابر ہی حساب لگائیں۔
- حساب کی سہولت کے لئے اکائیوں کو پورا کرنے کی کاروائی جیسا کہ اس نقشہ میں کی گئی ہے ٹھیک اسی وقت ہی عمل میں آئیگی جبکہ آپ کو رقم کی ادائگی کرنا ہی مقصود ہو۔ جبکہ نصف نیا پیسہ اور اس سے کم کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور اس سے زیادہ کو پورا نیا پیسہ شمار کر لیا جائے گا۔

آسانی سے یاد رکھنے کے قابل

۱	روپیہ	...	...	۱۰۰ نئے پیسے
۸	آنے	...	...	۵۰ نئے پیسے
۴	آنے	...	...	۲۵ نئے پیسے
۳	آنے	...	...	۱۹ نئے پیسے
۲	آنے	...	...	۱۲ نئے پیسے
۱	آنہ	...	...	۶ نئے پیسے
½	آنہ	...	...	۳ نئے پیسے



سکوں کے تبادلہ کا نقشہ

(ایک مرتبہ کی ادائگی کے لئے برابر کے سکے)

آنے	پائیاں	نئے پیسے	آنے	پائیاں	نئے پیسے	آنے	پائیاں	نئے پیسے	آنے	پائیاں	نئے پیسے
۰	۳	۲	۴	۳	۲۷	۸	۳	۵۲	۱۲	۳	۷۷
۰	۶	۳	۴	۶	۲۸	۸	۶	۵۳	۱۲	۶	۷۸
۰	۹	۵	۴	۹	۳۰	۸	۹	۵۵	۱۲	۹	۸۰
۱	۰	۶	۵	۰	۳۱	۹	۰	۵۶	۱۳	۰	۸۱
۱	۳	۸	۵	۳	۳۳	۹	۳	۵۸	۱۳	۳	۸۳
۱	۶	۹	۵	۶	۳۴	۹	۶	۵۹	۱۳	۶	۸۴
۱	۹	۱۱	۵	۹	۳۶	۹	۹	۶۱	۱۳	۹	۸۶
۲	۰	۱۲	۶	۰	۳۷	۱۰	۰	۶۲	۱۴	۰	۸۷
۲	۳	۱۴	۶	۳	۳۹	۱۰	۳	۶۴	۱۴	۳	۸۹
۲	۶	۱۶	۶	۶	۴۱	۱۰	۶	۶۶	۱۴	۶	۹۱
۲	۹	۱۷	۶	۹	۴۲	۱۰	۹	۶۷	۱۴	۹	۹۲
۳	۰	۱۹	۷	۰	۴۴	۱۱	۰	۶۹	۱۵	۰	۹۴
۳	۳	۲۰	۷	۳	۴۵	۱۱	۳	۷۰	۱۵	۳	۹۵
۳	۶	۲۲	۷	۶	۴۷	۱۱	۶	۷۲	۱۵	۶	۹۷
۳	۹	۲۳	۷	۹	۴۸	۱۱	۹	۷۳	۱۵	۹	۹۸
۴	۰	۲۵	۸	۰	۵۰	۱۲	۰	۷۵	۱۶	۰	۱۰۰

اس کو سنبھال کے رکھئے۔ آپ کو اس کی ضرورت پڑیگی



ہماری نئی کتابیں

نام کتاب	قیمت	محصول
پہلا پنج سالہ پلان (جیبی ایڈیشن)	۲/-/-	-/۸/-
مستقبل کی تعمیر	-/۴/-	/۲/-
آسان پنج سالہ پلان	-/۸/-	/۲/-
سماجی بہبود	-/۴/-	-/۲/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان	-/۴/-	-/۲/-
آپ کا گاؤں اور پنج سالہ پلان	/۱/-	/۱/-
پنج سالہ پلان - سوالات و جوابات	/۴/-	-/۲/-
دیہاتی صنعتیں	-/۶/	-/۲/-

دس روپیہ یا اس سے زیادہ کے آرڈر پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔



قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے ۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں ۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں ۔"

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے ۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں "

جوش ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں ۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں ۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے ۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں ۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے ۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں ۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی ۔"

ممتاز حسین



" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے ۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے ۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو ۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اسی طرح اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اسی سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے ۔"

اشفاق حسین

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے ۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذب نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے ۔"

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے ۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے ۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے ۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں ۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے ۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی	قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division and printed by the Production Officer
United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi
No D—509

نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بغالب مدظلہ



نام و نشانم مپرس ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پہلا پنج سالہ پلان (حستا ایڈیشن)	۲/-/-	-/۸/-
مستقبل کی تعمیر	-/۴/-	/۲/-
آسان پنج سالہ پلان	-/۸/-	/۲/-
سماجی بہبود	-/۶/-	-/۲/
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان	/۴/-	-/۲/-
آپ کا گاؤں اور پنج سالہ پلان	/۱/-	/۱/-
پنج سالہ پلان - سوالات و جوابات	/۴/-	-/۲/-
دیہاتی صنعتیں	-/۶/-	-/۲/-

دس روپیہ یا اس سے زیادہ کے آرڈر پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔



قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے



اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

مجلسِ ادارت

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، حکومتِ ہند

ترتیب

سرورق:- غالب کی ایک قلمی تصویر جو ۱۸۶۸ء میں جبکہ غالب بقید حیات تھے اُن کی کلیاتِ نثر میں شائع ہوئی

جلد ۱۵ — نمبر ۷

فروری ۱۹۵۷ء

[illegible]

ملاحظات

غمِ جاناں

ہم ہر سال فروری کے 'آج کل' میں 'اس شعلۂ عشق' کی یادگار میں کچھ مضامین شائع کرتے ہیں جو ۱۵- فروری ۱۸۶۹ء کو خاکِ دہلی میں پنہاں ہو گیا۔ حافظ و خسرو کی طرح غالب بھی ایک نابغہ تھا جس کے کلام کو علم و آگہی اور جذبہ و سرمستی کا دو آتشہ کہا جا سکتا ہے۔ اُس نے جس صنفِ ادب کو ہاتھ لگایا اُسے سونا کر کے دکھا دیا۔ چاہے وہ نثر کی سادگی ہو یا نظم کی نغمگی و پرکاری، جذبات کی بے خودی ہو یا علم و ذہانت کی ہشیاری، غالب نے ہر پیرایے میں ایک بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے دل میں گداز اور گہرائی ہے تو طبیعت میں آزادہ روی و خودداری، اس کے ذہن میں وہ جودت اور کلام میں وہ جولانی پائی جاتی ہے جسے انگریزی میں WIT (طباعی) کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ غالب پرستوں کے امام، عبدالرحمن بجنوری کی طرح ہم غالب سے غلو کی حد تک عقیدت رکھیں اور اس کے نقائص یا خامیوں کے ذکر کو گناہ سمجھیں۔ تنقید نہ تقریظ ہے نہ تنقیص۔ چنانچہ یاس یگانہ کی طرح غالب کی خوبیوں سے مایوس ہو کر غالب شکنی پر کمر باندھنا بھی فضول و لاطائل ہے۔ غالب کے نغمے کو یاس کی ترشی نہیں اتار سکتی۔ مانا کہ غالب کے اردو کلام میں نہ صرف فارسی شعراء کے زمزموں کی جھنکار سنائی دیتی ہے بلکہ اس نے اُن کی معانی آفرینی کے نور سے بھی اپنے خیال و معانی کے آئینہ خانے کو منور کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ غالب نے بیدل کی دقّت پسندی کا بھی لوہا مانا ہے اور اس نے دلِ پرخوں کی اک گلابی سے سرمست رہنے والے میر کی میری بھی تسلیم کی ہے۔ پھر بھی غالب کا اپنا بادۂ سرجوش اتنا تند و تیز تھا کہ شرابِ کہن کے دو چار چھینٹوں سے اس کے کیف و سرور میں اضافہ تو ہو سکتا تھا لیکن اس کی ماہیت پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد کے آبگینے اس کی صہبا کی تاب لانے سے قاصر تھے اور اس کی گرمی سے پگھلے جاتے تھے۔ اگر غالب اپنی زندگی میں کماحقہ مقبول و معروف نہ ہو سکا تو حیرت کا مقام نہیں۔ بڑے لوگ ہمیشہ مستقبل کے نقیب و ترجمان ہوتے ہیں۔ نوائے سروش کو سننے اور سمجھنے کے لئے ذہنِ انسانی کو کمال و معراج کی منزل تک پہنچنا ہی پڑتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اب جا کر اردو زبان میں وہ وسعت و گیرائی آ گئی ہے کہ ہم غالب کے کلام کے رس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں، اس نے دامِ ہر موج میں ڈوب کر جو گہر ہائے حیات نکالے ہیں ان کی آب و تاب کو پرکھ سکتے ہیں۔ غالباً اسی کے پیشِ نظر غالب نے کہا تھا ؎

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

اس شمارے کے مضامین غالب کے فن سے زیادہ اس کے پسِ منظر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ادارۂ 'آج کل' غلام رسول مہر، امتیاز علی عرشی، مالک رام، مرتضیٰ ملگرامی اور عطا کاکوی جیسے غالب دانوں کا ممنون ہے کہ ان صاحبانِ علم نے غالبیات کے بارے میں اپنی تازہ ترین تحقیقات 'آج کل' کو عطا کیں۔

غمِ دوراں

نیا سال نئے طور اور نئے انداز سے آیا ہے۔ امریکہ میں صدر آئزنہاور کا نیا دَور دسمبر ۱۹۵۶ء میں شروع ہو چکا تھا۔ ۹- جنوری کو برطانیہ کے وزیرِ اعظم سر انتھنی ایڈن مستعفی ہو گئے اور مسٹر میک میلن ان کے جانشین ہوئے۔ یہ سب تو ہوا لیکن بڑی طاقتوں کے اندازِ فکر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صدر آئزنہاور نے ۵- جنوری ۱۹۵۷ء کو امریکی کانگریس کے نام ایک پیغام میں درخواست کی ہے کہ صدر کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ اگر کوئی ایسا ملک جس پر بین الاقوامی کمیونزم کا کنٹرول ہے، مغربی ایشیا کے کسی ملک پر حملہ کرے اور وہ مظلوم ملک امریکہ سے امداد کی درخواست کرے تو صدرِ امریکہ کو مغربی ایشیا میں امریکی فوجیں اتارنے کا اختیار ہو۔ اس مقصد کے پیشِ نظر صدر آئزنہاور مغربی ایشیا کے ملکوں کی فوجی اور اقتصادی امداد کرنا چاہتے ہیں۔ شری جواہر لال نہرو نے بھی ناگپور کے کانگریس اجلاس میں آئزنہاور پلان پر رائے زنی کی ہے۔ شری نہرو نے کہا کہ مغربی ایشیا میں اس وقت کوئی بڑی طاقت نہیں لیکن اس خلا کو وہیں کے ملک پُر کر سکتے ہیں نہ کہ باہر کی طاقتیں۔ اگر کسی باہری طاقت نے اس علاقے پر اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کی تو دوسری طاقت بھی اس کے مقابلے پر آ جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر وہی اعصابی جنگ اور گروہ بندی کی دوڑ شروع ہو جائے گی۔ شری نہرو نے کہا کہ دنیا کا کوئی بھی مسئلہ طاقت کے بل پر حل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ جنگی معاہدے اور ضابطے بالکل بے سود ہیں۔

آج کل دہلی

غلام رسول مہر

احوالِ غالب کی گم شدہ کڑیاں

خاندان دہلی سے آگرہ کیوں کر پہنچا

میرزا غالب کے احوال و سوانح اور شعر و ادب پر اتنی کتابیں ترتیب پا چکی ہیں کہ اگر انھیں یکجا رکھا جائے تو ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے۔ شعرا کو تو چھوڑ دیجئے، اس سرزمین کے شاید ہی کسی ممتاز و مشہور فرد کو تحریر و نگارش اور تحقیق و کاوش میں اعتنا و توجہ کا وہ مقام حاصل ہوا ہو جو میرزا غالب کے حصے میں آیا۔ شاید اقبال اس باب میں میرزا سے ہمسری کا دم بھر سکتا ہے۔ تاہم میرزا کی زندگی کے بعض گوشے ایسے بھی ہیں جو اب تک پوری طرح روشنی میں نہیں آ سکے ان میں سے ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ میرزا کا خاندان دہلی سے آگرہ کیوں کر پہنچا۔

مسئلے کی حیثیت

نظر بہ ظاہر یہ مسئلہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا اور شاعر کی زندگی کے بیشتر سوانح حقیقتاً اہم نہیں ہوتے۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ میرزا کے جدِ امجد، والدِ ماجد اور عم محترم طالع آزما سپاہی تھے۔ جب وہ سمرقند سے لاہور ہوتے ہوئے دہلی پہنچ گئے تو وہاں سے آگرہ چلے جانا ہرگز مشکل نہ تھا۔ لیکن اگر ہم دوسرے گوشوں میں چھان بین اور کرید کو ایک اہم علمی کام سمجھتے ہیں تو اس معاملے پر کیوں غور و فکر نہ کریں، جس کے صحیح حل پر ایک سے زیادہ پیچیدگیوں کا سلجھاؤ موقوف ہے؟ ممکن ہے اس طرح میرزا کے سوانح کی بعض اور کڑیوں کا سراغ مل جائے، جو ہماری معلومات میں خاصے قابلِ قدر اضافے کا باعث بن جائے۔

دادا کی ملازمت

معلوم ہے کہ شاہ عالم ثانی کی سرکار میں میرزا کے دادا کی ملازمت کا وسیلہ ذوالفقار الدولہ نجف خاں تھا۔ خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں لکھا ہے:

"ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں شاہِ عالم کے دربار میں دخلِ کلّی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے میرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوا دیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کرا دیا۔"

میرزا کے دادا قوقان بیگ خاں کے متعلق تمام سوانح نگاروں کا بیان یہی ہے بلکہ یہ تصریح بھی موجود ہے کہ میرزا قوقان بیگ خاں پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے تھے۔

نقلِ مکان اور متعلقہ سوالات

اب پہلا سوال یہ ہے کہ جب وہ شاہ عالم کی سرکار میں ملازم تھے اور پہاسو کا تعلقہ ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر تھا، جو ضلع بلند شہر میں واقع ہے تو وہ دہلی سے آگرہ کیوں منتقل ہوئے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ دہلی سے آگرہ منتقل نہ ہوئے تو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ میں کیوں کی؟ میرزا کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان آگرہ کے ممتاز رؤسا میں سے تھے اور بہ ظاہر میرزا قوقان بیگ کی حیثیت زیادہ بلند نہ تھی۔ خواجہ غلام حسین خاں کیوں کر اپنی بیٹی کی شادی دہلی کے ایک غیر معروف اور اجنبی رسالدار کے بیٹے سے کر دینے پر راضی ہو سکتے تھے، جس کے ساتھ بُعدِ مکانی کے باعث تعارف کی بھی کوئی شکل نہ تھی؟ میرے محدود علم کے مطابق کسی بھی سوانح نگار نے ان امور پر توجہ نہیں کی، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ کسی کی طبیعت ان سوالات پر اٹکی ہی نہیں اور اٹکے بغیر تحقیق و کاوش کا احساس کیوں کر پیدا ہو

سکتا تھا۔

"انتخابِ یادگار" کا بیان

امیر مینائی مرحوم نے "انتخابِ یادگار" میں فرمایا ہے:

"جدِ اعلیٰ ان کے (میرزا غالب کے) ماوراء النہر سے ہندوستان
میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دارِ شاہی رہے۔
جب ریاستِ مغلیہ برہم ہوگئی، ملازم مہاراجہ جے پور ہوئے اور
بود و باش شہر آگرہ میں اختیار کی۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی وفات کے بعد نہ شاہی ملازمت باقی رہی اور نہ پہاسو کا پرگنہ قبضے میں رہ سکتا تھا۔ لہٰذا جے پور میں ملازمت کی ضرورت پیش آئی اور اس سلسلے میں دہلی کو چھوڑ کر آگرہ میں قیام اختیار کیا جو جے پور سے قریب تھا۔ گویا دہلی سے نقلِ مکان میرزا کے دادا نے کیا تھا۔

یہ بیان "انتخابِ یادگار" کے سوا کہیں نہیں ملتا۔ خود میرزا نے بھی اپنی تحریرات میں کہیں اس کی طرف اشارہ نہیں کیا حالانکہ وہ ذاتی اور خاندانی حالات کے جزئیات حسبِ ضرورت بیان کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ امیر مینائی مرحوم نے خود میرزا سے یہ واقعہ سنا ہوگا۔ اغلب اس بارے میں سوال کیا ہو تو میرزا کو تفصیل بتانے کی ضرورت پیش آئی ہو۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں

اب ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ کب ملازمتِ شاہی کے ترک کی ضرورت پیش آئی۔ ہمارے سامنے کوئی مستند بیان نہیں لیکن ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی وفات کے بعد جو حالات پیش آئے، انھیں سامنے رکھ کر زیادہ سے زیادہ قرینِ قیاس نقشہ تیار کر سکتے ہیں۔ اگر اس کی روشنی میں تحقیق کی جائے تو اغلب ہے، زیادہ مستند و موثق شہادتیں میسّر آسکیں۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں نے ۲۶۔ اپریل ۱۷۸۲ء کو وفات پائی۔ وہ سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ شجاعت و مردانگی میں فرد، نظم و نسق میں یگانہ، ہجومِ مصائب میں اولوالعزم، فتح و کامرانی میں شفیق و رحم دل، سیرت پاکیزہ، کرداراً جلا، سلطنت کی شانِ قدیم کو از سرِ نو بحال کرنے میں سرگرم۔ میرزا غالب کی شاعری کی طرح ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی ملک داری و سپہ گری بھی اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی بادشاہی کے لئے زیبا تھی۔

وارثوں میں کش مکش

اس کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ دو شخص اس کی جائداد و مناصب کے وارث سمجھے جاتے تھے: ایک اس کا بھتیجا میرزا شفیع، دوسرا افراسیاب خاں، جسے نجف خاں کی ہمشیر نے بیٹا بنا لیا تھا اور ایک روایت کے مطابق نجف خاں بھی اسی کو بیٹا سمجھتا تھا۔

میرزا شفیع کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور امیری کا ساز و سامان بھی بافراط موجود تھا۔ اگر ان دونوں میں مفاہمت ہو جاتی تو نجف خاں کے درست کردہ نظام میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی۔ لیکن نجف خاں کی ہمشیر نے اتحاد و اتفاق کی مصلحت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنے متبنّیٰ کو آگے بڑھانے پر کمر باندھ لی۔ سوئِ اتفاق سے میرزا شفیع اس وقت دہلی میں موجود نہ تھا۔ چنانچہ افراسیاب خاں کو امیرالامرائی کا منصب دلایا گیا، گویا وہی نجف خاں کا وارث قرار پایا۔

میرزا شفیع فوج لے کر دہلی پہنچا تو شاہ عالم ثانی کا بڑا بیٹا اور ولی عہد شہزادہ جواں بخت اس کا حامی بن گیا۔ بادشاہ نے افراسیاب کی جگہ میرزا شفیع کو امیرالامرائی کا منصب دے دیا۔ اس طرح کش مکش کا آغاز ہوگیا۔

شفیع اور افراسیاب کا قتل

دربار کی حالت عجیب تھی، بڑے امرا میں سے کوئی شخص کسی مہم پر دہلی سے باہر جاتا تو اس کی غیر حاضری میں نئے جوڑ توڑ شروع ہو جاتے۔ وہ ابھی کوئی کام نہ کرنے پاتا کہ اپنے بچاؤ کے لئے اسے دہلی کا رُخ کرنا پڑتا۔ ایک ایسے ہی موقع پر میرزا شفیع ستمبر ۱۷۸۳ء میں مارا گیا۔ مشہور ہے کہ اس پر گولی چلانے کا ذمہ دار یا تو محمد بیگ خاں ہمدانی تھا یا اس کا بھتیجا اسماعیل بیگ خاں۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قتل افراسیاب خاں کے ایما و اشارے سے ہوا۔ چنانچہ وہ بے خلش امیرالامرا بن گیا۔

اب افراسیاب خاں اور محمد بیگ ہمدانی میں اختلافات شروع ہوگئے۔ ہمدانی نے بطورِ خود قلعہ آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ افراسیاب خاں فوج لے کر آگرہ پہنچ گیا اور مادھوجی سندھیا والیِ گوالیار کو بھی اپنی امداد کے لئے بلا لیا۔ یہ اکتوبر ۱۷۸۴ء کا واقعہ ہے۔ ابھی ہمدانی کے خلاف کوئی کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ میرزا شفیع کا بھائی، میرزا زین العابدین ایک روز سندھیا کی لشکرگاہ سے افراسیاب کے خیمے میں پہنچا اور اسے خنجر مار کر ہلاک کر ڈالا۔ کہنے کو یہ بھائی کے خون کا انتقام تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ اس باب میں انگیخت کا ذمہ دار سندھیا تھا اور افراسیاب خاں کے قتل کے بعد خود سندھیا کے لئے دربار میں مختاری کا درجہ حاصل کرنے کا اچھا موقع پیدا ہوگیا تھا۔

سندھیا کی مختاری —— چنانچہ سندھیا آگرے کا محاصرہ چھوڑ کر دہلی پہنچا اور

اس نے شاہ عالم ثانی سے دو فرمان حاصل کئے: ایک فرمان کے مطابق پیشوا کو نائب السلطنت بنایا گیا تھا اور دوسرے فرمان کے مطابق سندھیا کو پیشوا کے نائب کی حیثیت میں فوج اور نظم و نسق کا مختار قرار دیا گیا تھا۔ پہلے فرمان کی غرض محض یہ تھی کہ سندھیا کے خلاف دوسرے مرہٹہ سرداروں یا خود پیشوا کے لئے اعتراض کی گنجائش نہ رہے حقیقتاً اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

افراسیاب خاں کے اہل و عیال علی گڑھ کے قلعے میں رہتے تھے اور نجف خاں کے عہد کی ساری دولت بھی اسی قلعے میں محفوظ تھی۔ سندھیا نے مختاری کا درجہ حاصل کرتے ہی علی گڑھ پر بھی قبضہ کر لیا اور تمام مال و اسباب بھی لے لیا

سندھیا کی اصلاحات

اب سندھیا کو ضرورت پیش آئی کہ فوج نئے اصول پر مرتب کرے اور پرانا جاگیرداری نظام توڑ دے۔ اس طرح ان تمام امیروں اور رسالداروں کی جاگیریں یکے بعد دیگرے واپس ہونے لگیں جنھیں فوجی خدمات کے صلے میں یہ دی گئی تھیں۔ یہ لوگ مسلمان اور زیادہ تر مغل تھے۔ ممکن ہے سندھیا کے پیش نظر یہ مصلحت بھی ہو کہ جب تک ان فوجیوں کو بے دست و پا نہ کیا جائے گا یا ان کے جیش توڑے نہ جائیں گے یہ مختاری کا سلسلہ بے خلش جاری نہ رہ سکے گا۔ یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ ممکن ہے بعض رسالدار کسی موقع پر افراسیاب خاں کی اولاد میں سے کسی کے طرفدار بن جائیں یا کسی اور امیر و رئیس کے زیر علم جمع ہو جائیں اور اس طرح سندھیا کی مختاری پر ضرب لگے۔ اس انتظام نے ہندو مسلم کا سوال بھی پیدا کر دیا۔ مسلمان مغلوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سلطنت اُن کی ہے لیکن ایک مرہٹے کی مختاری نے انھیں ہر شے سے بے دخل کر دیا ہے۔ غلام قادر خاں روہیلے نے ابتدا میں جو کامیابی حاصل کی تھی، اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مسلمان امیروں اور رسالداروں کی حمایت و ہمدردی کا مدعی بن گیا تھا۔

لال سوت کی لڑائی

سندھیا کی ایک مصلحت یہ تھی کہ وہ دکن کے ساتھ ایک سلسلۂ ربط و ضبط قائم رکھتا جہاں مرہٹوں کا مرکز تھا۔ اس ضمن میں اسے راجپوتانے کے مشہور قلعے رگھوگڑھ کی تسخیر ضروری معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے محمد بیگ ہمدانی کو رگھوگڑھ روانہ بھیج دیا۔ ہمدانی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ راجپوتانے کے بڑے بڑے راجاؤں مثلاً جے پور، جودھپور، میواڑ وغیرہ نے ایکا کر کے ایک لاکھ فوج تیار کر لی اور سندھیا کے مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ سندھیا کو بھی فوج لے کر نکلنا پڑا۔ لال سوت کے مقام پر مئی ۱۷۸۷ء میں خونریز لڑائی ہوئی۔ یہ مقام جے پور سے تینتالیس میل مشرق میں واقع ہے۔ محمد بیگ ہمدانی کے بھتیجے اسماعیل بیگ نے تین سو سواروں کے ساتھ راجپوتوں پر حملہ کیا اور ان کے چھکے چھڑا دئے لیکن مرہٹوں نے اس کی اعانت نہ کی اور حملہ بے نتیجہ رہا۔ فریقین کی طرف سے گولہ باری ہوتی رہتی تھی۔ دوسرے یا تیسرے دن سخت آندھی چلی، اس میں ایک گولہ محمد بیگ ہمدانی کے لگا اور وہ ہاتھی سے نیچے گر گیا۔ افراتفری میں ہاتھی کا پاؤں محمد بیگ کی کنپٹی پر پڑا، اور وہ جاں بحق ہو گیا اسماعیل بیگ نے اسی موقع پر پکار کر کہا کہ اب چچا کی جگہ میں فوج کا سپہ سالار ہوں۔

مغلوں کی بغاوت

عین اسی حالت میں چودہ ہزار مغلوں نے سندھیا کے خیمے کو گھیر لیا اور تنخواہ کا مطالبہ پیش کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی شامل تھے، جن سے جاگیریں واپس لے لی گئی تھیں۔ ان مغلوں نے ساتھ ہی مہاراجہ جے پور کے پاس پیغام بھیج دیا کہ اگر دو لاکھ روپے فوراً ادا کر دو تو ہم سندھیا کو چھوڑ کر تمھارے ساتھ ہو جائیں گے۔ مہاراجہ جے پور نے بے تامل روپیہ دے دیا یا دینے کا وعدہ کر لیا۔ سندھیا نے یہ حالت دیکھی تو میدان چھوڑ کر گوالیار چلا گیا اور عارضی طور پر اس کی مختاری بھی ختم ہو گئی۔ یہی حالات تھے جن سے فائدہ اُٹھا کر غلام قادر خاں روہیلے اور اسماعیل بیگ ہمدانی نے دہلی پر یورش کی اور شاہ عالم ثانی کو نورِ بینائی سے محروم کیا گیا۔ یہ واقعات پیش نظر موضوع سے خارج ہیں۔

لال سوت کے میدان میں چودہ ہزار مغلوں کی بغاوت ۳۱۔ مئی یا یکم جون ۱۷۸۷ء کا واقعہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی موقع پر میرزا قوقان بیگ خاں نے جے پور کی ملازمت اختیار کی اور سکونت کے لئے دہلی کے بجائے آگرہ کو منتخب کیا۔ آگرہ ہی کے قیام میں خواجہ غلام حسین خاں سے تعارف کا موقع بہم پہنچا اور میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ کی صاحبزادی عزت النسا بیگم سے ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ۱۷۹۰ء کے بعد کا واقعہ ہے۔

اربابِ علم و نظر سے گزارش

مجھے اس اعتراف میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ یہ نقشہ قیاس پر مبنی ہے۔ تاہم ہندوستان کے اربابِ علم و نظر مزید تحقیق و کاوش کی زحمت اُٹھائیں تو کیا عجب ہے زیادہ محکم معلومات حاصل ہو جائیں۔ مثلاً آگرہ کے قدیم خاندانوں سے کچھ نہ کچھ سراغ مل جانے کا امکان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دربارِ جے پور کے پرانے کاغذات سے میرزا قوقان بیگ کی ملازمت اور اس کی نوعیت و حیثیت کے متعلق پتا چل جائے۔ اس طرح میرزا غالب کے سوانح حیات کی ایک گم شدہ کڑی ہاتھ آ جائے گی اور ہم زیادہ وثوق و اعتماد سے سوانح کے اس حصے کو مکمل کر سکیں گے۔

اسی طرح بعض دوسرے پہلوؤں کے متعلق میرے سامنے چند غور طلب امور ہیں، جنھیں بہ شرطِ حیات پیش کرتا رہوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اجمل اجملی

غالب

غالب وہ برگزیدۂ اربابِ افتخار
غالب وہ نازشِ چمنستانِ روزگار
غالب سخن شناس، سخن ور، سخن شعار
وہ جس کے ایک شعر پہ سو جنّتیں نثار
جانِ نسیمِ صبح تھا، روحِ گلاب تھا
تارے تھے ارد گرد، وہ اک ماہتاب تھا

وہ طرز، وہ خطاب، وہ اشعار، وہ سخن
سانسوں کی وہ نسیم، وہ احساس کی جا
اُف وہ نگاہِ فن سے نکلتی ہوئی کرن
اللہ رے وہ زورِ طبیعت، وہ بانکپ
خوگر ہوا جو درد سے درماں بنا دیا
جو مشکلیں پڑیں انھیں آساں بنا دیا

اشعار کی زباں میں انساں کے تجربات
جملوں کے پیچ و خم میں نہاں شورشِ حیات
لمحے میں ماہ و سال تو قطرے میں کائنات
بیگانۂ قیود تھے اس کے تخیلات
اُس آنکھ میں معلّمِ اوّل کا نور تھا
اُس کا شعور آدمِ نو کا شعور تھا

اُس طبعِ پاک باز پہ کیا کیا نہیں پڑی
کوئی خفا ہوا کبھی، روٹھا کبھی کوئی
افلاس، نارسائی و آشفتہ خاطری
یہ زندگی بھی کتنے مزے میں گزار دی
کوزہ ملے تو ساغرِ جم سے غرض نہ تھی
اس کو کسی کے جاہ و حشم سے غرض نہ تھی

ہر چند کی مشاہدۂ حق کی گفتگو
لیکن نہ چھوٹا ہاتھ سے دامانِ رنگ و بو
پائے بتاں پہ سر جھکا زاہد کے روبرو
پیشِ جنابِ شیخ ہوئی بیعتِ سبو
جامِ شراب اُچھال کے تارا بنا دیا
اُردو کو اس نے انجمن آرا بنا دیا

امتیاز علی عرشی

کچھ غالب کے متعلق

میرزا غالب اردو شاعروں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہیں کہ اُن کے متعلق ہر سال ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگلی سطروں میں اپنی تازہ دریافت پیش کرتا ہوں، تاکہ غالب دوست اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

(۱)

نواب محتشم الدولہ غوث محمد خاں بہادر شوکت جنگ والیِ جاورہ نے ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں ہندوستان کی سیر و سیاحت کی تھی۔ ان کی رودادِ سفر مذکورۂ صدر سال کے اندر ہی ریاست کے سرکاری مطبع سے مصوّر شائع ہوئی تھی۔ یہ "سیر المحتشم" نام سے موسوم ہے اور مؤرخین کے مطالعے کی حقدار ہے۔

نواب صاحب نے شعرائے دہلی میں سے میرزا غالب، امام بخش صہبائی اور ذوق کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے بارے میں اُن کا بیان حسبِ ذیل ہے[1]:

"شاہجہان آباد میں شعرا بھی بہت ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز خوش بیانی اور طرز شیریں کلامی میں ہلال و زلالی اور فیضی و عرفی ہے۔ مگر میرزا اسد اللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ کمالِ سخنوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اگر رودکی اس زمانے میں ہوتا، تو اپنے دیوان کو رودِ اشکِ ندامت میں دھوتا۔ اگر آذری اُن کے کلامِ روشن کو دیکھتا تو آتشِ غیرت سے اپنی تصنیفات کو جلا دیتا۔ حقیقت میں اُن کا ہر مصرع، مصرعِ ہلالِ آسمان سے بلند تر ہے، اور ہر بیت، بیتِ ابروئے خوباں سے خوب تر۔ معنیِ دقیق گویا تنگیِ دہانِ غنچہ دہناں، اور مضمونِ باریک گویا میانِ نازک بتاں۔ خیالاتِ میرزا جلال اُن کے دامِ زلفِ خیال بندی میں سراپا اسیر، اور معانیِ بلند پروازِ بیدل اُن کی نظمِ مسلسل میں پابہ زنجیر۔ نثرِ گہر بارِ نصیرائے ہمدانی اُن کی عبارتِ پُر بشارت کے آگے معترفِ بیہمدانی۔ چار عنصرِ میرزا بیدل اُن کے فقراتِ موزوں کے روبرو نامعتدل۔ انشائے وحید و ابوالفضل اُن کے رقعاتِ بے بدل کے مقابل میں ذلیل و مبتذل۔ یہ شعر انھیں کے ہیں۔ نظم

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

"کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق؟" ہے مکرر لبِ ساقی سے[1] صلا میرے بعد

ایضاً

"[2]دل جگر تشنۂ فریاد آیا پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ولہ

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں

ولہ

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

ولہ

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

(۱) دیوان میں "سے" کی جگہ "میں" ہے۔ عرشی

(۲) دیوان میں یہ مطلع کا دوسرا مصرع ہے۔ عرشی

(۱) سیر المحتشم: ۲۲۳ - ۲۲۶

ولہ

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں — کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ گھر میں آئے ہمارے[1] خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس انتخاب میں غالب کا تقابل فارسی کے استادوں سے کیا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خود نواب صاحب کی نظر میں، یا جن اصحاب نے انھیں معلومات بہم پہنچائی تھیں اُن کی نظر میں، غالب اُردو کے نہیں فارسی کے مستند ادیبوں اور شاعروں کے ہم پلہ تھے۔

(۲)

رضا لائبریری میں "نگارستانِ سخن" نام کا ایک مجموعۂ اشعار محفوظ ہے جس کا بڑا حصّہ امو جان دہلوی کے مطبعِ احمدی میں چھپا ہے۔ اس کتاب کا ہر صفحہ ۱۶ کالموں کا ہے، جس میں بالترتیب ذوق، غالب اور مومن کی غزلیں درج کی گئی ہیں۔

صفحہ ۱۶۱ تک یہی ترتیب نظر آتی ہے، صرف ایک جگہ غلطی سے ترتیب بدل گئی ہے یعنی صفحہ ۸۷ پر مومن کی جگہ غالب کی غزل اور صفحہ ۸۸ پر غالب کے کالم سے مومن کی غزل لکھ دی گئی ہے۔

صفحہ ۱۶۲ پر ذوق کا کلام ختم کر کے ظفر شاہ کے سہرے کا عنوان تحریر کیا گیا ہے۔ اسی صفحے کے دوسرے کالم میں غالب کا قطعہ:

نصرۃ الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے — تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

ختم کر کے ذوق کے سہرے کا عنوان درج کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۶۳ پر ظفر، ذوق اور غالب کے سہرے پہلو بہ پہلو مندرج ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ کے وسط میں سہرے ختم ہو کر حسبِ ذیل خاتمہ شروع ہوتا ہے:

"الحمدللہ والمنۃ کہ ایں تماشا بہ زمان انتخاب دیوان ہر سہ شعرای جادو بیان شیوا زبان عرصۂ سخندانی، شہریارانِ شہرستانِ نکتہ دانی، کہ گوی سبقت از قدماء و متاخرین ربودہ، وعلمِ استادی در میدان فصاحت و بلاغت افراشتہ اند۔

اولاً کلامِ معجز نظامِ سلطان و عرش، خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق استادِ حضورِ والا، ثانیاً طوطیِ شکرستانِ معانی، چراغ افروزِ شبستانِ زبان دانی، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خان غالب نظام جنگ بہادر،

ثالثاً افلاطونِ دوران سحبانِ زمان، حکیم محمد مومن خاں متخلص بہ مومن، در ایں چند اوراق حسبِ فرمائش لالہ بیج ناراین صاحب سوداگرِ کتب، در مطبعِ احمدی واقع شاہدرہ دہلی بہ حسنِ اہتمام میرزا امو جان حلیۂ انطباع پوشید۔ بتاریخ بست ہفتم صفر ۱۲۷۹ھ ہجری تمام شد۔"

صفحہ ۱۶۵ سے مومن، غالب اور ظہیر کے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ مومن کے قصیدے صفحہ ۱۷۴ پر ختم ہوتے ہیں، اور اسی صفحے سے ان کا مخمس حافظ شیرازی کی غزل پر

آن کہ از سنبلِ او غالیہ تابی دارد — باز با دلشدگان ناز و عتابی دارد

درج کیا گیا ہے، جو صفحہ ۱۷۶ پر تمام ہوتا ہے۔

غالب کے قصیدے صفحہ ۱۷۵ پر ختم ہوتے ہیں، اور فوراً بعد اُن کا قطعہ

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو — رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

شروع ہو کر صفحہ ۱۷۶ پر ختم ہو جاتا ہے۔

ظہیر کا قصیدہ صفحہ ۱۷۳ پر ختم ہوتا ہے، صفحہ ۱۷۴ تا صفحہ ۱۷۶ پر اُن کی یہ غزل مندرج ہے

علائق سے وارستہ انساں نہیں — گلوگیر کس کا گریباں نہیں

نیز اسی صفحہ ۱۷۶ پر "نگارستانِ سخن" کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

پہلے ظہیر کے متعلق یہ کہتا چلوں کہ اُن کے قصیدے کا عنوان ہے:

"قصیدۂ فقیر سراپا تقصیر ظہیر الدین مؤلف تذکرہ ہذا، کمترین از تلمیذانِ شیخ محمد ابراہیم ذوق، در مدحِ حضور لامع النور بہادر شاہ بادشاہ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر کسی تذکرے کے مؤلف ہیں، اور اُس تذکرے میں انھوں نے یہ قصیدہ درج کیا ہے اور وہاں سے "نگارستانِ سخن" میں نقل کر لیا گیا ہے۔ مگر میری دانست میں یہاں "تذکرہ" بجائے "مجموعہ" لکھا گیا ہے، اور ظہیر اسی "نگارستانِ سخن" کے مؤلف و مرتب ہیں، واللہ اعلم

نیز ظہیر کا یہ قصیدہ جس کا مطلع ہے:

کہاں تلک ہوں رقم جو ر چرخِ ناہنجار — کہ ایک خلق ہے ہاتھوں سے اس کے سینہ فگار

---

[1] دیوان میں ہے "وہ آئے گھر میں ہمارے" عرشی

۱۸ شعروں پر مشتمل ہے، اور ان کے دیوانِ مطبوعہ میں موجود نہیں ہے۔

اسی طرح اُن کی مذکورہ بالا غزل ۲۴ شعروں کی ہے۔ دیوان میں ظہیر نے صرف ۱۴ شعر انتخاب کر کے لکھے ہیں۔ ان چودہ شعروں میں سے کئی کے اندر لفظی ترمیمیں بھی کی ہیں۔ جو شعر ترک کر دئے ہیں وہ یہ ہیں:-

فلک سوزِ گرِ آہ و سوزاں نہیں — تو کیا نالہ بھی آتش افشاں نہیں
محبت کی تھی ساری پردہ دری — ہوا چاک یوسف کا داماں نہیں
مجھے مسندِ جم ہے، فرشِ حصیر — تمنائے تختِ سلیماں نہیں
ثباتِ گلستاں پہ ہنستا ہے یہ — لبِ غنچہ بے وجہ خنداں نہیں
جو رونا ہے تجھ کو تو تھم تھم کے رو — یہ گریہ ہے اے چشم، طوفاں نہیں
مری شوریدگی ہے اور داغِ دل — بلا سے نہ ہو گر نمکداں نہیں

ق

جہاں میں بس اب جی کے کیا کیجیے — کوئی جی بہلنے کا ساماں نہیں
وہ اگلی سی وحشت وہ جوشِ جنوں — وہ سر اور وہ سنگِ طفلاں نہیں
وہ رمز و کنایہ، وہ شعر و سخن — وہ ہم بزمیِ بزمِ یاراں نہیں

کہاں ہم ظہیر اور فکرِ غزل — جز ایمائے داغِ سخنداں نہیں

جیسا کہ ابھی صفحہ ۱۶۴ کے خاتمے میں گزر چکا ہے، مرتبِ نگارستان نے ذوق، غالب اور مومن کے کلام کا انتخاب چھاپا ہے۔ مگر غالب کا دیوان خود ہی منتخب اور مختصر تھا، اس لئے اس کا بہت بڑا حصّہ اس مجموعے میں سما گیا ہے، اتنا بڑا کہ ہم اسے مطبعِ احمدی کا دوسرا ایڈیشن کہہ سکتے ہیں۔

غالب کا متروکہ کلام حسبِ ذیل ہے:

(الف) قصائد میں سے دو قدیم قصیدے:

(۱) ساز یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار

(۲) دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

(ب) مثنوی در صفتِ انبہ

(ج) قطعات میں سے حسبِ ذیل ۱۳ قطعے:

۱۔ گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری

۲۔ کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں

۳۔ ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی

۴۔ نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے

۵۔ منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی

۶۔ اے شاہِ جہانگیرِ جہاں بخشِ جہاں دار

۷۔ افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو

۸۔ اے شہنشاہِ آسماں اورنگ

۹۔ سیہ گلیم ہوں، لازم ہے میرا نام نہ لے

۱۰۔ سہل تھا مسہل، و لے یہ سخت مشکل آپڑی

۱۱۔ خجستہ انجمنِ طوی میرزا جعفر

۱۲۔ ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی

۱۳۔ گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں

(د) رباعیاں کل متروک ہیں

(ہ) غزلیات میں سے متروکہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ سرمۂ مفت نظر ہوں الخ — ۲ شعر
۲۔ غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — ۵ شعر
۳۔ جور سے باز آئے پہ باز آئیں کیا — ۷ شعر
۴۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — ۲ شعر
۵۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — ۷ شعر
۶۔ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — ۱ شعر
۷۔ جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام — ۱ شعر
۸۔ نشّہ و رنگ سے ہے واشُدِ گل — ۱ شعر
۹۔ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب — ۱ شعر
۱۰۔ ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ — ۱ شعر

اس طرح غزلوں کے ۳۵ شعر چھوڑ دئے گئے ہیں۔

جہاں تک اس نسخے کی صحت کا تعلق ہے، یہ احمدی کے مطبوعہ نسخے سے بدتر ہے، اتنا بدتر کہ اگر غالب کے علم میں آجاتا تو اپنا سر پیٹ لیتا۔ چونکہ غالب نے کہیں اس ایڈیشن کا ذکر نہیں کیا ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ دہلی میں امو جان کے اہتمام سے اُن کا کلام شائع ہو، اور وہ باخبر نہ ہوں۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اُن کا اس ایڈیشن کا کہیں ذکر نہ کرنا اس کی انتہائی ناپسندیدگی کی بنا پر ہو،

دیوانِ غالب، احمدی ایڈیشن اور نگارستانِ سخن کا مطبع ہی نہیں، کاتب بھی ایک ہے۔ نیز اس میں، چند کو مستثنیٰ کر کے، باقی وہ سب غلطیاں بھی موجود ہیں، جو احمدی ایڈیشن کے غلط نامہ میں مذکور تھیں اور اسی لئے انھیں بآسانی دُور کیا جا سکتا تھا، نیز اس میں سیکڑوں اور کتابت کی غلطیاں بھی کی گئی ہیں۔ ذیل میں صرف اُن کا ذکر کیا جاتا ہے، جو قابلِ افسوس ہیں۔

(الف) اس نسخے میں حسبِ ذیل مصرعے چھوڑ دئے گئے ہیں:

۱۔ ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا

۲۔ تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

۳۔ مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

۴۔ راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بُلائے کیوں

(ب) حسبِ ذیل مصرعوں میں کاتب نے شاید بزعمِ خود اصلاحیں کی ہیں۔ چونکہ احمدی اور نظامی دونوں میں یہ الفاظ نہیں، اس لئے جو ان میں سے غلط نہیں ہیں، وہ بھی غالب کے لفظ نہیں مانے جا سکتے، اور اس لئے مرتبِ دیوانِ غالب کے لئے روا نہیں کہ اُنھیں "نسخہ" قرار دے کر اپنے یہاں نوٹ کرے۔

۱۔ پھر غضب کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہُوا

دیوان میں "غلط" ہے، "غضب" کاتب کی اصلاح ہے۔

۲۔ کام کا ہے مرے وہ دُکھ کہ کسی کو نہ ملا

دیوان میں ہے "کام کا میرے ہے جو دکھ"

۳۔ ہر بنِ مو سے دمِ فکر نہ ٹپکے خوناب

دیوان میں "دمِ ذکر" ہے۔

۴۔ ہم نے یہ مانا رہے دِلّی میں پر کھاویں گے کیا

دیوان میں ہے "ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے۔"

۵۔ برشکالِ دیدۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیئے۔

دیوان میں "گریۂ عاشق" ہے

۶۔ گھِستے گھِستے مٹ جاتا، تم نے کیوں اُٹھا ڈالا

دیوان میں ہے "آپ نے عبث بدلا۔"

۷۔ واں وہ ذوقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

دیوان میں "فرقِ ناز" ہے۔

۸۔ دل میں اب ذوقِ وصالِ یار تک باقی نہیں

دیوان میں ہے "دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں"

۹۔ ذکر میرا بہ بدی بھی انھیں منظور نہیں

دیوان میں "اُسے" ہے

۱۰۔ نہیں کہ روزِ قیامت کا اعتقاد نہیں

دیوان میں "روز" کی جگہ "مجھ کو" ہے

۱۱۔ کوئی کہے کہ شبِ غم میں کیا بُرائی ہے

دیوان میں "شبِ مہ" ہے

۱۲۔ سوائے عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

دیوان میں "علاوہ عید کے" ہے

۱۳۔ جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

دیوان میں ہے "تیری زلفیں جس کے بازو پر"

۱۴۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

دیوان میں ہے "مجھ پہ پڑیں اتنی"

۱۵۔ وفاداری بشرطِ استواری عینِ ایماں ہے

دیوان میں "اصلِ ایماں" ہے

۱۶۔ غالب نوائے خامہ صریرِ سروش ہے

دیوان میں ہے "صریرِ خامہ نوائے سروش"۔

۱۷۔ عمر بھر کا تو نے پیوندِ وفا باندھا، تو کیا

دیوان میں "پیمانِ وفا" ہے۔

۱۸۔ کیا وہ بھی بیگنہ کُش و ناحق شناس ہے

دیوان میں "حق ناشناس" ہے

۱۹۔ اُبھرا ہُوا نقاب میں اُن کی ہے ایک تار

دیوان میں ہے۔ "نقاب میں ہے اُن کی"

۲۰۔ بھاگے تھے ہم بہت سے، اسی کی ہے یہ سزا

دیوان میں ہے: "بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ۔"

اغلاطِ طبع کے تحت یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ صفحہ ۴۹ پر یہ مطلع لکھا ہے:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے ‏ ‏ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اور بقیہ اشعار ۹۶ صفحے پر لکھے ہیں۔ اسی طرح دستور کے خلاف صفحہ ۱۰۶

میں پہلے کالم میں غالب کی غزل درج کردی ہے

(۳)

شاہ باقر علی باقر گیاوی بہار کے بہت مشہور صوفی تھے۔ اُن کا دیوانِ فارسی سیّد عطا حسین صاحب ایم اے (ملازم حیدرآباد) نے ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۸ء) میں حیدرآباد سے شائع کیا تھا۔ اس کے دیباچے (صفحہ ۵۰) میں سیّد صاحب لکھتے ہیں کہ "ایک بار حضرتؒ غالب کا فارسی دیوان دیکھ رہے تھے، اُن کی نظر سے یہ رُباعی گزری:

شرطست کہ بہرِ ضبطِ آدابِ رسوم — خیزد بعد از نبی، امام معصوم
ز اجماع چہ گوئی؟ بہ علی باز گرائے — مہ جای نشینی مہر باشد از نجوم

اس کو پڑھ کر دہ بہت آزردہ ہوئے، اور مکدر بیٹھے ہوئے تھے کہ اتفاقاً میں سامنے آگیا۔ مجھے بُلایا اور بِٹھا کر دیوان میرے جانب بڑھایا اور فرمایا:
"دیکھو تو غالب نے یہ کیا لکھ دیا۔ کیا یہ صریح تبرّا نہیں ہے؟"
حضرتِ غالب کی شاگردی پر انھیں ہمیشہ فخر رہا، اور ان کی مدحت اور اُن کے ساتھ اظہارِ عقیدت میں بیسیوں شعر اُن کے دیوان میں نظر آئیں گے۔ تاہم اُن سے ضبط نہ ہو سکا، اور اُسی وقت اس رباعی کے جواب میں ایک قطعہ لکھا جو اس دیوان میں شریک ہے۔"

دیوان کے صفحہ ۲۹۰ پر یہ قطعہ اس تمہید کے ساتھ درج ہے:

ایں قطعہ بجوابِ رباعی حضرتِ غالب کہ شعرِ ثانیش این است نوشتہ شد:

ز اجماع چہ گوی بہ علی باز گرائے — مہ جای نشینی مہر باشد از نجوم

دریں شعر اظہارِ تشیّع خود نمودہ اند انکارِ اجماع نمودہ، حالانکہ اجماع از اصولِ دین است۔

اصحاب نجوم اند، نہ ہرگز ہر کس — اطلاقِ مہ آمد بہ حدیثِ نبوی
مہ نیز بود بغیر از جملہ نجوم — این امر بدیہی است بدانند صبی
ز اجماع چو منکر تو شدی ای نادان — حاصل چہ ز گردیدن تنہا بعلی

(۴)

قاطع برہان کے جواب میں مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری نے مؤیدِ برہان لکھی، تو جواب در ردِّ جواب کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ امیر مینائی مرحوم نے غالب کی حمایت میں ایک مضمون لکھ کر چھپوایا، تو اس کے جواب میں میرزا فاضل شمس شاگردِ قاضی محمد صادق خاں اختر نے اودھ اخبار شمارہ ۲۶، مورخہ ۲۵ ماہ جون ۱۸۶۷ء میں اس کی تردید کی۔ اس تردید میں آغا نے غالب کے چند اُردو شعروں پر اعتراض بھی کئے تھے، باقر نے فارسی نثر میں ان کا رد کیا، اور خود قتیل پر اعتراض جڑے۔ آغا کا ایک اعتراض یہ تھا کہ غالب نے اپنے مصرع

نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

میں اعلانِ نون کیا ہے، جو درست نہیں۔ اس کا جواب باقر نے یہ دیا (دیوان صفحہ ۲۲۰) کہ اصل میں مصرع یوں تھا۔

نافِ زمیں ہے یہ نہ کہ نافِ غزال ہے

مطبوعہ نسخے کے کاتب نے لفظ "یہ" کو جو لفظ "نہ" کی تجنیس ہے، مکرر جان کر حذف کر دیا، اور مصرع دیوان میں غلط چھپ گیا، ورنہ یہ غلطی تو مبتدی بھی نہیں کر سکتے"، چہ جائیکہ رئیس المنتہیین۔
لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں "زمین" با علانِ نون ہی ہے، اس لئے باقر کا یہ جواب کسی طرح درست نہیں۔ اگر یہ غلطی ہے تو ان کے اُستاد رئیس المنتہیین سے یقیناً سرزد ہوئی ہے۔

(۵)

باقر نے غالب کے ایک اُردو شعر کا مطلب بھی بیان کیا ہے۔ میں اسے سیّد عطا حسین صاحب کے دیباچے (صفحہ ۱۱) سے خود انھیں کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔

"مولوی سیّد اقبال علی بحر مرحوم کے چھوٹے بھائی سیّد خورشید علی مرحوم ایک روز پٹنہ میں حضرت باقر سے ملنے آئے۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا کہ غالب کے اردو دیوان میں بعض شعر ایسے ہیں جو مہمل اور بے معنی ہیں اور جنھیں انھوں نے غالباً مدہوشی کی حالت میں کہہ دیا ہوگا۔ فرمایا۔ ایسا کوئی شعر پڑھئے۔ انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

سُن کر پہلے تو اس شعر کی دیر تک تعریف کرتے رہے، اس کے بعد اس کا مطلب ایسے لطیف اور دلکش طریقے پر بیان فرمایا کہ جتنے وہاں بیٹھے تھے نہایت محظوظ ہوئے، مجھے ان کے الفاظ

بجنسہٖ یاد نہیں رہے لیکن جو کچھ اُنھوں نے بیان کیا اس کو میں اپنے الفاظ میں ادا کرتا ہوں فرمایا:-

اسی مضمون کا فارسی کا ایک شعر ایک استاد کا ہے۔ غالب کے شعر سے اس کا مضمون زیادہ صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے بعد غالب کے شعر کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

مرا جدائی او سوخت، وقتِ شبنم خوش
کہ در مشاہدۂ آفتاب می سوزد

شاعروں کے تخیل میں شبنم آفتاب پر عاشق ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے، اس کی تمازت سے شبنم خشک ہو جاتی ہے، گویا جل جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی جل گئے اور شبنم بھی جلی لیکن جلنے اور جلنے میں فرق دیکھئے کہ ہم تو معشوق کی جدائی اور فراق کی آگ میں جل گئے اور خوشا وقت شبنم کا کہ وہ اپنے معشوق کے عین مشاہدے میں اس کی تجلیات کی گرمی سے جلتی ہے۔ اسی قسم کے مضمون کو حضرتِ غالب نے اپنے شعر میں نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ کسی چیز پر چاروں جانب سے جب نہایت سخت دباؤ پڑتا ہے، تو وہ چیز کھِل جاتی ہے۔ حنا بھی پس کر خون کی طرح سُرخ رنگت پیدا کرتی ہے اور گوری رنگت کا آدمی جب شراب پی کر بدمست ہو جاتا ہے، تو اس کا چہرہ بھی خون کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ آئینہ ہاتھ میں لے کر دیکھے تو اس کے چہرے کی سُرخ رنگت سے عکس پذیر ہو کر گویا وہ بھی حنائے سائیدہ کی طرح خون جیسا سُرخ ہو جاتا ہے۔ حضرتِ غالب فرماتے ہیں کہ معشوق کے فراق میں اُس کے دیدار کی حسرتوں کی پورش اور کشمکش سے عاشق کا دل کھِل کر خون ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں آئینہ کی خوش نصیبی دیکھئے کہ پسی ہوئی حنا کی طرح خون جیسا ہُوا تو وہ بھی، لیکن اس کی یہ حالت معشوقِ بدمست کے ہاتھ میں جا کر اس کے عینِ دیدار میں اس کے رخسار کے عکس سے نصیب ہوئی۔ عاشق کے دل کی یہ حالت فراق کی بدولت ہوئی اور آئینہ کی عینِ وصال اور مشاہدۂ رخسارِ یار کی بدولت۔

شتاں بینہما۔"

باقر کا یہ مطلب تمام شارحین سے الگ ہے۔

(۶)

کوئی بزرگ سید زمان علی شاہ دفعدار تھے انھوں نے بوئی خلد نام کی ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کی تھی جو مختلف شعرا کے چیدہ منقبتی کلام پر مشتمل ہے اور مطبع یوسفی دہلی میں سنہ ۱۳۲۰ھ میں چھپی تھی۔

اس کتاب کے آخر میں (ص ۵۶) انھوں نے بعنوان لطیفۂ غالب۔ لکھا ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب (غالب) دہلوی اپنے معمولی شغل میں تھے۔ ناگاہ ایک شخص نے دستک دی، معلوم ہُوا کہ میر حامد ہیں۔ اندر آنے کی اجازت ہوئی۔ بعد مزاج پرسی حالِ تشریف آوری دریافت فرمایا۔ میر صاحب نے عرض کی کہ عرصے سے ایک مصرع کے واسطے متفکر اور متحیر ہوں۔ ہرچند مغز مارتا ہوں لیکن مصرعۂ ثانی موزوں نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب نے کمال مہربانی سے مصرع پوچھا۔ میر صاحب نے یہ مصرع کہا اسپ وزن و شمشیرِ وفادار کہ دید؟

مصرع سنتے ہی مرزا صاحب جوش میں آ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بآوازِ بلند بڑے جذبے اور شوق سے یہ فرماتے تھے:- "واللہ علی دید علی دید علی دید" اور بار بار بتکرار خوش ہو کر اُچھلتے تھے اور فرماتے تھے:

اسپ وزن و شمشیرِ وفادار کہ دید؟ واللہ، علی دید، علی دید، علی دید

میر حامد صاحب اس خداداد لیاقت پر اور حاضر جوابی پر غش غش کر گئے اور خوش و خرم اپنے دولت سرا کو واپس ہوئے۔"

(۷)

غالب نے مطبع نولکشور میں اپنا کلیاتِ فارسی طبع کرانا چاہا تو نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر سے اُن کا نسخہ طلب کیا تھا۔ انھوں نے کچھ تساہل کیا تو غالب نے لکھا کہ

"جنابِ قبلہ و کعبہ آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہ ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلدیں بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دل خوش ہو، تمہاری تعریف کا قصیدہ اہلِ علم دیکھیں، تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے، اتنے فوائد کیا تھوڑے

ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرضِ راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بسبیلِ ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخرالدین خان مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے۔ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے۔ تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں۔ اگر دیں تو میرے کس کام کا۔ پہلے تو ناتمام پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں سے اوروں کے نام کر دئے گئے ہیں اور اس میں اُسی ممدوحِ سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط، ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں، ہاں احتمالِ نقصان وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم اُس صورت میں میں تلافی کا کفیل جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ ..... بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طلب اُس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔ رحم کرم کا طالب غالب"۔

(اُردوئے معلّیٰ: ۲۴۴ مطبع اکمل الاخبار، دہلی ۱۸۹۱ء)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے کچھ قصیدے دوسرے ممدوحوں کے نام بھی کر دئے تھے۔ ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور دام اقبالہم نے ابھی حال میں اپنا ذخیرۂ کتب رضا لائبریری کو عطا فرمایا ہے۔ اس میں غالب کے کلیات فارسی کا ایک مخطوطہ بھی ہے۔ یہ غالب کے پسندیدہ کاتب نواب فخرالدین خاں کے قلم کا نوشتہ ہے۔ سرورق پر نواب علائی کی ۱۸۷۵ء کی تحریر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کے پاس اسی سنہ میں پہنچا۔ اس مخطوطے میں بہت سا کلام حاشیوں پر درج ہے، جس کا کچھ حصہ کلیاتِ فارسی میں اور باقی 'سبدِ چین' میں شائع ہو چکا ہے۔

سبدِ چین (صہ ۳۷، دہلی ۱۹۳۸ء) میں پانچواں قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے

بزمِ نواب جم حشم مکوڈ   بوستانیست پر ز نعمت و ناز

یہ قطعہ مخطوطۂ رامپور کے ورق ۱-الف پر بھی مندرج ہے۔ مگر اس میں مصرعِ اوّل یوں ہے:

چارلس تر دلن کہ بہ ہنگش

اور خط کشیدہ الفاظ خود غالب نے اپنے قلم سے ایک چپی پر لکھے ہیں۔ اس سے غالب کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے جو ابھی نواب ضیاءالدین خان بہادر کے نام خط میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

اس مخطوطے کے ورق ۱۲ کے حاشیے پر غالب کا یہ قطعہ خود اُس کے اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

با خرد گفتم، ار تو فرمائی   شویم از دل خیالِ بادۂ ناب
گفت صد آفریں، و لے نتواں   شستن ایں خیال جز بشراب

یہ قطعہ سبدِ چین میں چھپ گیا ہے۔

اس مخطوطے میں قطعات وغیرہ سے پہلے نثری عبارتیں بھی ہیں۔ ان میں سے بعض نظموں کے مطالب پر اچھی روشنی ڈالتی ہیں اور اسی لئے یہاں نقل کی جاتی ہیں:

(۱) غالب کا ایک طویل قطعہ ہے:

ایا بکوشش و بخشش رئیسِ ملت و ملک   ایا بدانش و بینش مدارِ دولت و دیں

کلیات میں یہ بے عنوان درج ہے اور اس لئے اس کے مخاطب کا تعین دشوار نظر آتا ہے۔ مخطوطۂ رامپور میں اس کا عنوان ہے:

"در مدح امین الدولہ امداد حسین خان بہادر وزیرِ شاہِ اودھ"۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ غالب کے مخاطب نواب امین الدولہ لکھنوی تھے۔

۲۔ غالب کا ایک قطعۂ تاریخ اس عنوان سے شروع ہوتا ہے "تاریخِ تعمیرِ مسجد و امام باڑہ"

صحنِ امام باڑہ و مسجد بر آں کہ دید   در کربلا زیارتِ بیت الحرام کرد (۴ شعر)

مخطوطے میں اس کا عنوان ہے: "تاریخِ اساس پذیرفتنِ مسجد بمقبرۂ قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم۔"

۳۔ اس قطعہ کے متصل ہی دوسرا قطعہ ہے جس کا عنوان ہے: "تاریخِ تعمیرِ امام باڑہ سراج الدین علی خان۔"

چوں شد بصحنِ مدفنِ خانِ بزرگوار   طرحِ امام باڑۂ عالی سپہر سا (۵ شعر)

مخطوطے میں اس قطعہ کا عنوان یہ ہے:

"جنبشِ قلم بنگارشِ تاریخِ تعمیرِ امام باڑہ کہ در کلکتہ محلہ ٹالی بر مزارِ اقضی القضاۃ قاضی سراج الدین علی خان مرحوم واقع است۔"

ان دونوں تحریروں سے بڑے کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

حبیب احمد صدیقی

غزل

جب کوئی فتنۂ ایّام نہیں ہوتا ہے
زندگی کا بڑی مشکل سے یقیں ہوتا ہے

عشوہ و ناز و ادا کا بھی فسوں ہے تو حسیں
خود فریبی کا فسوں سب سے حسیں ہوتا ہے

لکھے جاتے ہیں جو نظروں سے نہاں کچھ جلوے
منتخب اُن کے لئے قلبِ حزیں ہوتا ہے

مرنے کے بعد بھی مرنے پہ نہ راضی ہونا
یہی احساس تو سرمایۂ دیں ہوتا ہے

ہے رگِ جاں میں کہ دل میں یہ کہاں ہوش ہمیں
اتنا معلوم ہے اک درد کہیں ہوتا ہے

ہم سے اور ناصیہ سائی کی توقع زاہد
جذبۂ دل کہیں پابندِ جبیں ہوتا ہے

ہائے بیدادِ محبّت کہ بہ ایں بربادی
ہم کو احساسِ زیاں بھی تو نہیں ہوتا ہے

ایک شک وہ ہے کہ ہے مانعِ اقرارِ یقیں
ایک شک اور ہے جو حُسنِ یقیں ہوتا ہے

برقِ بیتاب کسے کہتے ہیں اُس سے پُوچھو
جس کے معمورۂ دل میں وہ مکیں ہوتا ہے

وہ کرم ہو کہ ستم ایک تعلّق ہے ضرور
کوئی تو رازِ محبّت کا امیں ہوتا ہے

فتنہ ہوتا ہے جو منسوب فلک سے، دراصل
تربیت یافتۂ اہلِ زمیں ہوتا ہے

مالک رام

غالب کا ایک شعر

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت، مرے بیاں کے لئے

ادھر جب سے ہمارے بعض شاعروں اور نقادوں نے غزل کے خلاف جہاد شروع کیا ہے، یہ شعر عام طور پر اس بات کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے، کہ اور تو اور غالب بھی غزل کی محدود صلاحیتوں کے شاکی تھے اور چاہتے تھے کہ کاش کہ، انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ امکانات کی کوئی صنفِ شعر مل سکتی۔ اور ان معترضوں کے خیال میں یہ نظم ہی ہو سکتی ہے۔

یہ استدلال غلط ہے۔ نہ غالب کا یہاں یہ مطلب ہے اور نہ وہ غزل ہی کے خلاف تھے۔

سب سے پہلے ہمیں اس شعر کا شانِ نزول دیکھنا چاہیئے۔

یہ شعر متداول دیوان کی آخری غزل میں ہے، جس کا مطلع ہے ؎

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

مولانا حالی فرماتے ہیں:

"اسی غزل کے اخیر میں چند شعر نوابِ فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں، جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد بلایا تھا، مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا۔"

(یادگارِ غالب ص ۱۴۹)

اس جگہ یہ بیت الغزل بہت مشہور ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اس کے بعد ذیل بحث شعر ہے اور آخر میں نواب تجمل حسین خاں والی فرخ آباد کی مدح میں یہ قطعہ ہے:-

دیا ہے خلق کو بھی، تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں، اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں، جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اور مقطع ہے ؎

ادائے خاص سے، غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میرزا در اصل غزل لکھنے بیٹھے تھے۔ ان کا ارادہ کوئی قصیدہ لکھنے کا نہیں تھا۔ لیکن بقول حالی، فرخ آباد کی دعوت بھی موصول ہو چکی تھی۔ گویا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ فرخ آباد جا نہیں سکتے۔ قصیدہ کے لئے طبیعت حاضر نہیں لیکن فتوح کا جو خفیف سا امکان پیدا ہو گیا ہے، اس سے کیوں نہ فایدہ اُٹھایا جائے اور یہ موقع کیوں ہاتھ سے گنوایا جائے! اس لئے انھوں نے سوچا کہ لاؤ، لگے ہاتھوں ان سے بھی نپٹ لو۔ لیکن اب یہ مشکل پیش آئی، کہ غزل میں مدح کی گنجائش کہاں۔ بے شک لوگ قصیدے میں غزل لکھتے آئے تھے مگر غزل میں

(بھوپال) کی سوانح عمری چار جلدوں میں آثرِ صدیقی کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں (جلد دوم، ص ۷۰-۷۹) انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی سفرِ حج کے دوران میں نواب تجمل حسین خاں سے ملاقات کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے:

"(مدینہ میں) ایک روز راستہ میں نواب تجمل حسین مرحوم رئیس فرخ آباد سے ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب ممدوح ایک نہایت عالی مرتبہ رئیس تھے۔ والا جاہ نے ان کی دولت و ثروت و عروج و اقبال کا زمانہ فرخ آباد میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کے در دولت پر ارباب حاجت کا ہجوم رہا کرتا تھا اور ان کے آستانۂ اقبال پر ہاتھی جھوما کرتے تھے۔ انھیں کی شان میں نواب اسداللہ خاں غالب مرحوم نے یہ اشعار لکھے تھے:

دیا ہے خلق کو بھی، تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں، جس کے آستاں کے لئے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

نواب صاحب باوجود امیرِ کبیر اور صاحبِ جاہ و حشم ہونے کے فضائلِ اخلاقِ اسلامی اور اوصافِ غیرت و حمیتِ دینی کے ایک جوہرِ فرد تھے۔ زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء میں جب انھوں نے ہر طرف نصاریٰ کا تسلط اور استیلائے اسلام کی بربادی کا عبرت انگیز ہنگامہ دیکھا اور ایک پاک باز موحد خدا پرست کے لئے فتنہ ہائے روزگار سے کہیں ہندوستان میں امن نہ پایا اور حکامِ وقت کے تیور بدلے ہوئے پائے، تو انھوں نے ہندوستان کو خیرباد کہہ کر خانۂ خدا کے زیرِ سایہ پناہ لی۔ الخ"

نواب والا جاہ صدیق حسن خان نے یہ حج ۱۸۶۹ء میں کیا تھا۔ نواب تجمل حسین خاں کا انتقال اس سے بہت پہلے ۱۸۴۶ء میں ہو چکا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مدینہ میں دونوں کی ملاقات کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ مآثرِ صدیقی کے مؤلف کے تتبع میں یہی غلطی "تراجم علمائے اہلِ حدیث" کے مؤلف مولوی ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی کو بھی ہوئی ہے اور انھوں نے بھی نواب صدیق حسن خاں کے ترجمے میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

دراصل نواب تجمل حسین خاں نہیں بلکہ ان کے جانشین نواب تفضل حسین خان حجاز چلے گئے تھے۔ ان کے والد نواب خادم حسین خاں شوکت جنگ کے بھائی اور والدہ سلطان عالیہ بیگم تھیں۔ یہ ۲۶۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء (۵۔ ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ) کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی مشہور تحریک انھیں کے زمانے میں ہوئی اور جب ہنگامہ فرو ہوا تو انگریزوں نے ان پر بھی بغاوت کے الزام میں مقدمہ قائم کیا تھا۔ جب عدالت نے انھیں پھانسی کی سزا دی تو انھوں نے کہا، کہ میں نے جب جنوری ۱۸۵۹ء میں اپنے آپ کو میجر بارو (BARROW) کے حوالے کیا ہے تو اس وعدے پر، کہ اگر میں نے ذاتی طور پر کسی انگریز یا یورپی کے قتل میں حصہ نہیں لیا، تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب یہ پھانسی کی سزا کیسی؟ بہت رد و کد کے بعد یہ عذر تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن گورنر جنرل نے حکم دیا، کہ بہرحال انھیں انگریزی علاقے سے فوراً نکال دیا جائے۔ انھوں نے جزیرۃ العرب جانے کو ترجیح دی۔ چناں چہ انھیں جہاز میں سوار کر کے عدن لے گئے اور وہاں خشکی پر اتار دیا۔ یہ وہاں سے سرحد پار کر کے حجاز چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام وہیں بسر کئے۔ ممکن ہے نواب والا جاہ کی ملاقات ان سے وہاں ہوئی ہو۔

غالب نے بھی اپنے ایک خط میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

"مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً، کہ جہاز سے اتر کر سرزمینِ عرب میں چھوڑ دیا۔ اہا، اہا۔"

(اردوئے معلیٰ ص ۲۴۳؛ خطوطِ غالب (۱)، ص ۳۴۴)

یہاں "جزیرہ" سے مراد انڈمان ہے۔ "جزیرہ نشینوں" سے مراد مولوی فضلِ حق خیرآبادی اور ان کے رفیق ہیں، جنھیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لینے کی پاداش میں کالا پانی کی سزا ملی تھی۔ اور رئیسِ فرخ آباد سے نواب تفضل حسین خاں مراد ہیں۔

ان کا ۱۸۸۳ء میں حجاز ہی میں انتقال ہوا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

۱۸۸۳ء کے دو خط متعلق بہ غالب

جناب محمد اسمٰعیل صاحب بہر آروی "فسانۂ غمناک" میں رقمطراز ہیں :

"میر سید خورشید علی بلگرامی خورشید مورثِ اعلیٰ جناب صفیر بلگرامی حنفی المذہب تھے - بعد اون کے سید انتظار علی بلگرامی و سید محمد عسکری بلگرامی و سید بہادر علی بلگرامی و سید بندہ علی بلگرامی پسرانِ میر سید خورشید علی بلگرامی نے مذہبِ اہلِ تشیع اختیار کیا اور باب الام اون کے حضرت مولوی سید صاحب عالم بلگرامی صاحب ولد حضرت سید شاہ مخدوم عالم بلگرامی خلفِ جناب سید شاہ مقبول عالم بلگرامی ولد جناب سید شاہ نجات اللہ پسرِ دوم جناب حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب بلگرامی ثم مارہرہ الملقب بہ صاحب البرکات سجادہ نشینِ سجادۂ مارہرہ غفرانہم -

حضرت صفیر بلگرامی منجانب الاب و الام حسینی الحسنی نسلاً و واسطی اصلاً بلگرامی وطناً، قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد مسکن تھے - آپ کی ولادت بتاریخ ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۴۹ھ اپنے ننہال میں بمقام مارہرہ ضلع ایٹہ باعتبار کلکٹری و ضلع میں پورہ باعتبار عدالت محلہ بستی درگاہ حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب الملقب بہ صاحب البرکات قدس سرہ، سرکار خورد میں خدمت میلاد پہنچا - اور نام تاریخی آپ کا "شمس الضحیٰ" رکھا گیا - پانچ برس کی عمر میں [مگر بقول جناب سید محمد حسن امیر صاحب چار برس کی عمر میں ۱۲۴۹ھ] بمعیت بزرگان اپنے، قصبہ مارہرہ سے بلگرام کی سیر کرتے ہوئے واردِ مقامِ آرہ ہوئے اور تحصیلِ علوم میں کوشش شروع کی - تیرہ برس تک سوائے تحصیلِ علوم کے کسی طرف متوجہ نہ ہوئے - بعد تحصیلِ علومِ ضروری پھر آمد و رفت بلگرام، لکھنؤ، مارہرہ، دہلی، فرخ آباد، دکان پور وغیرہ وغیرہ کی متواتر و متوالی رہی - اور ۱۸۹۰ء تک اسی روش سے سیرِ دیار و امصار محض بہ نظرِ تفریحِ طبع کرتے رہے -"

(فسانۂ غمناک - غیر مطبوعہ)

سید فرزند احمد نام، صفیر تخلص تھا - مرزا غالب اور مرزا دبیر کے شاگرد تھے - ابتدائی تعلیم عربی و فارسی آرہ و مارہرہ میں حاصل کی، ادبی ذوق غیر شعوری طور پر خاندان سے ورثے میں پایا تھا - مگر ابتداء سے شعر و سخن کا ذوق نہ تھا - چودھویں برس یعنی ۱۲۶۳ھ میں بغیر کسی کی تحریک کے طبیعت میں موزونی پیدا ہوئی اور دو غزلیں اپنی زمین میں نظم کیں -

صفیر بلگرامی نے پے در پے سات تخلص تبدیل کیے - آثم - اثیم، صبا، نالاں، احقر اور صفیر - قطب سب سے اول، صفیر آخر میں رکھا جو زندگی کے آخر لمحات تک ہم نوائی کرتا رہا - گمان ہے قطب اپنے نانا صاحب کے ماحول سے جو صوفی اور بڑے پایہ کے ولی و بزرگ تھے، متاثر ہو کر رکھا ہو۔

صفیر بلگرامی کی ولادت "شمس الضحیٰ" ۱۲۴۹ھ اور وفات "شہر رمضان المبارک" ۱۳۰۷ھ کے تاریخی ناموں میں مضمر ہے - آپ کی تالیف مطبوعہ[1] اور غیر مطبوعہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں -

آج کی صحبت میں دو غیر مطبوعہ خط ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے فارسی کلام اور اردو کلام کے متعلق اہلِ فن اس دور میں کیا نظریہ رکھتے تھے بلکہ آزاد کے پیش کردہ واقعات کو جن نگاہوں نے تعصب کی عینکوں سے دیکھا ہے اور غلط استدلال سے آزاد پر حرف گیری کی ہے وہ ان خطوط کی روشنی میں آزاد کو حق بجانب سمجھنے پر مجبور ہو سکتے ہیں -

---

۱- راقم نے جناب صفیر بلگرامی کی جملہ تصنیفات کی ایک مکمل فہرست فروری ۱۹۵۶ء کے آج کل میں "عکسی زیارت" کے عنوان سے شائع کر دی ہے -

خط سید بندہ رضا بلگرامی آرزو - محلہ ملکنتہ بلگرام

جناب صفیر تسلیم [مزاج شریف - بندگی حضرت بندگی - آپ کی دعائے اس جملہ مہلہ کو یوں معنی پہناتا ہوں کہ آپ تو اس عریضہ اور اس تسلیم کا اور مزاج شریف کا جواب دیں گے نہیں، لہذا بمصداق

از من بمن سلام و ہم از من بمن پیام
رنجِ دلی صیاد پیام و سلام را

خود ہی سلام کہا اور خود ہی جواب بھی دے لیا - خود ہی مزاج پوچھا، خود ہی دعا کہہ لی - آج دوپہر کا وقت، دھوپ کی شدت، گرمی کا تراقہ، لون کا زور شور] بیٹھے بیٹھے جی جو گھبرایا، 'رشحاتِ صفیر' دیکھنے لگا - اس کتاب کا کیا کہنا - اگرچہ کلیتاً تانیث تذکیر کے قواعد کا انضباط بہت دشوار ہے - تاہم آپ نے خوب ہی قواعد منضبط فرمائے - مگر ساتھ ہی اس کے ایک بہت رستیز یہ کر دیا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے۔

اور اسی طرح یہ کر طپش میر علی کو بھی مستند ٹھہرایا ہے - حالانکہ خود آپ اختلاف دہلی اور لکھنؤ کے قایل ہوئے ہیں - [دیکھئے صفحہ ۴ 'رشحاتِ صفیر'] ورحالیکہ اختلاف مابین دہلی و لکھنؤ مسلم ٹھہرا تو مقلدینِ لکھنؤ کو مجرد دلی والوں کی تانیث و تذکیر پر مجروسا کرنا کب روا ٹھہرا - مگر کیا کیجئے - حب الشئی ..... آپ کو اور جناب قدر کو مرزا غالب صاحب کی محبت نے ایسا مجبور کر رکھا ہے جیسا قومِ نصیری کو حبِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے - حالانکہ میرا بھی اعتقاد ہے کہ مرزا غالب صاحب فارسی میں اکثر اہلِ ہند سے بہتر ہیں مگر اردو میں تو ایک مبتدی لکھنوی کے مقابل نہیں سے

کارِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

ملاحظہ و انصاف طلب ہے - اگر نقص اس کتاب میں ہے تو یہی ہے -

مجکو یہ بھی آپ کے اور جناب قدر کی طرف سے احتمال ہے عجب نہیں کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخِ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرایہ سے داخل کر دئے جائیں - میری اس رائے ناقص سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں مرزا غالب صاحب کا غیر معتقد ہوں - مگر بمقابلہ لکھنؤ دلی والوں کو میں ضرور ناقص سمجھتا ہوں - اس میں کوئی ہوں دوسرے یہ کہ اسیر کی نسبت جو آپ نے اپنا اعتقاد بہت کچھ ظاہر کیا ہے، کیسے میاں بحر صاحب سے کچھ اچھے تھے ؟ ایسٹی میں نہیں رہتے تھے ؟ بڑے غضب کی بات ہے کہ ناسخ طبقہ سوم میں معلمِ ثالث کہلائیں - اور آتش جو طرز عاشقانہ میں فرد تھے صرف ناسخ کے شریکِ مشاعرہ لکھے جائیں اور اس پر آپ اعتقاد لائیں -

آرزو عفی عنہ

۱۸ - مئی ۱۸۸۳ء

اس خط کے چند جملے غور طلب ہیں -

۱ - مرزا غالب صاحب فارسی میں اکثر اہلِ ہند سے بہتر ہیں مگر اردو میں ایک مبتدی لکھنوی کے مقابل نہیں

۲ - عجب نہیں کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخِ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرایے سے داخل کر دئے جائیں -

۳ - بمقابلہ لکھنؤ دلی والوں کو ضرور ناقص سمجھتا ہوں - اس میں کوئی ہوں -

۴ - ناسخ طبقہ سوم میں معلمِ ثالث کہلائیں اور آتش ..... صرف ناسخ کے شریکِ مشاعرہ لکھے جائیں -

آزاد نے آبِ حیات میں اُس دور کے عوام و خواص کی رائے کو غالب کے سلسلے میں پیش کیا تو تمام محققین نے آزاد کو مطعون قرار دے دیا کہ اپنے اُستاد ذوق کی مدح کے سبب غالب کی تنقیص کی گئی - لیکن غالب کی موت کے بعد ۱۸۸۳ء کا یہ خط شاہد ہے کہ غالب کی فارسی دانی کے سبب ان کے اردو کلام کو ناپسند قرار دیا جاتا تھا، مگر غالب کے مداحین اُس وقت کیا تصورات رکھتے تھے، اس خط کے جواب میں ملاحظہ فرمایئے

خط سید فرزند احمد بلگرامی صفیر ~~~ پھاٹک میر صاحب - آرہ

محترم - تسلیم

میری تحریر جو اساتذہ کے باب میں ہے ' یا ایسی ایسی باتوں میں جو میری رائے ہے نہ ابھی آپ نے دیکھی نہ سنی - میں اپنے ہوش کے وقت سے کبھی ایسے کا شاگرد نہیں ہوا - جس کو سمجھ نہ لیا ہو - محبت اور چیز ہے اور سمجھ اور چیز ہے سنئے - میں نے جو غالب کو سمجھا ہے حقاً اور ایماناً بیان کرتا ہوں - علمِ عربی میں تو اُن کو محض ناآشنا جانتا ہوں - مگر نثر و نظمِ فارسی اور میں ضرورتی[2] واقفیت کا

[1] جناب سید فرزند احمد صفیر بلگرامی اور جناب غلام حسین قدر بلگرامی دونوں مرزا غالب کے شاگرد تھے -

[2] ضروری میری دانست میں لازمی کے معنی میں استعمال کیا ہے

قائل ہوں ۔ فارسی میں اُن سے بڑھ کر کسی شاعرِ ہند کو فارسی گو نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ کیا ہے ۔ سُنئے ۔ہندوستان میں یہی نامی شاعر ہوئے ہیں۔

۱۔خسرو، ۲۔بیدل ، ۳۔ آرزو، ۴۔قتیل، ۵۔مظہر جانجاناں ۔۶۔فقیر، ۷۔حسن، ۸۔غالب ۔

ان کے سوا فنی کشمیری تھے۔ واقف لاہوری تھے ۔ علی سرہندی تھے اور فیضی .... شاعر خاص ہندوستانی تھے ان میں سے خسرو، فقیر، حسن ایک پایہ کے اور آرزو، قتیل ایک سرمایہ کے، اور بیدل، مظہر، غالب ایک پایہ کے ہیں، مگر خسرو اور حسن دہلوی اس وضع کے شاعر تھے جو وضع سعدی کے پہلے تھی۔ جس کو ابوالفضل نے متروک اور ناپسند لکھا ہے۔ وہ لوگ عرفان آب تھے، شاعر نہ تھے۔ بلند نام اور عالی مقام تھے، شاعر نہ تھے[۱]۔

آرزو، قتیل.... نہ اِلّا الذی نہ آلا الذی... مگر ان کی معلومات کا قائل ہوں، نہ ان کے مذاقِ شاعری کا۔ بیدل، مظہر، غالب یہ تینوں بہادرانِ میدانِ سخن تھے ۔بیدل اور مظہر نے مضامینِ عارفانہ کو مذاقِ شاعرانہ سے ملا کر جیسا کہا ہے دل لوٹا جاتا ہے اللہ درمن قائل ؎

چو سرِ شک بے سروپائم قدمے نزدِ بہوائی تو
کہ ہزار آبلہ در عرق بگداختم زحیائی تو

نہ بدل زعجز رسا رسم، نہ بر موآئینہ وا رسم
یک جا رسم کہ بجا رسم من بیدل از ہمہ جائی تو

نفس آشفتہ می دارد چوگل جمعیت دل[۲] را
پریشاں می نویسد کلک موج احوال دریا را
اے زشوخی ہائے حسنت موج پیچ و تاب ہا
حیرت اندر آئینہ چوں موج در گرداب ہا

نظم تو نظم۔ نثر بھی ایسی کہ دل پذیر بلکہ دل گیر۔ بیان کی وسعت، ظہوری کی قدرت یاد دلاتی ہے۔ بھلا ظہوری نے تو نو رنگوں کو مدِ نظر رکھا تھا اور نو رس کو بیان کیا تھا جس میں ہزار بار رنگ مل سکتے ہیں۔ بیدل تو نیرنگی کے بیان میں اور یک رنگی کے میدان میں چلا جاتا ہے۔ جس کا حد نہ کنار، نہ آغاز نہ انجام، واہ واہ سبحان اللہ، وسعتِ بیاں ہو تو ایسی ہو۔ مجھے فیضی فیاضی اور بیدل اس بات میں ایک ہی جوڑ کے معلوم ہوتے ہیں۔

مظہر جانجاناں کا دیوان اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ مگر اُن کی بھی شستگی اور رفتگی اور سلیقہ اور شاعری کچھ کم نہیں۔ چند شعر مثنوی کے یاد ہیں ؎

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست — محمد چشم بر راہِ ثنا نیست
خدا مدحت طرازِ مصطفیٰ بس — محمد حامدِ حمدِ خدا بس
محمد از تو می خواہم خدا را — خدایا از تو حبِّ مصطفیٰ را

غالب جنّت آرام گاہ کہ خاتم الشعرائی فرس ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ اُن کی درخشانی طبع نے آخر زمانہ میں ہندوستان کا نام روشن کر دیا۔ کلامِ فارسی اُن کا مشہور اور زبانوں پر مذکور ہے۔ چند شعر مثالاً لکھے جاتے ہیں۔

اے زساز زنجیرم در جنوں نوا گر کن — بند گر بدین ذوق ست پارہ گراں تر کن
جنوں مستم بفصلِ نو بہارم می تواں کشتن — صراحی در کف و گل در کنارم می تواں کشتن
بجرم ایں کہ در دستی بپایاں بردہ ام عمرے — بکوئی میفروشاں در خمارم می تواں کشتن
بہ ہجراں زیستن کفر است، خونم را دین بتو — چراغ صبح گاہم آشکارم می تواں کشتن
حسرت، دخدا داور، دہ نگام بپایاں — اے شکوۂ بے مہری احباب کجائی
خوں را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم — تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

یہ حقیقت شعرائے فارسی گو ہندوستان کی تھی۔ اب ان لوگوں میں سے سب نے اردو شعر کہے ہیں۔ مگر وہ ابتدا تھی تعریجاً اور تفنناً کہنے کا اتفاق ہوا۔ اور غالب کہ آخر میں ہوئے اُنھوں نے زمرۂ شعرائے اردو میں گنجائش کی اور اردو شاعری بطرز خاص کی۔ اور طرزِ خاص کی وجہ وہی ہوئی جو ناسخ کا کلام دیکھ کر اہلِ دہلی کے لئے واقع ہوئی۔ مگر سب میں غالب نے جو طرزِ بیاں ایجاد کی بہ نسبت اوروں کے سہل اور صاف ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فارسی ترکیب کے شعر کہے اور اس میں فعل و حرفِ اِشارہ فقط ہندی رکھے۔ جیسے کاوکاوِ سخت جانی ..... نہ پوچھ کی جگہ مپرس ہوتا تو فارسی کا مصرع صاف تھا۔ بخلاف مومن خاں کے کہ اُن کے مصرع ایسے پیچیدہ الفاظ، تغضیب و تعقید سے مملو ہوتے ہیں کہ جس سے مضمون میں پیچیدگی آجاتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ نہیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ کہ آخر عمر میں غالب نے محاورات اور سلاست کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی فارسی کا مذاق چھپا چھپا ایسا رکھا ہے کہ دل کو لبھا لیتا ہے مثلاً چند شعر دونوں طرز کے لکھتا ہوں۔

طرزِ اول: ۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

[۱] ۔ خط کے حاشیہ پر شاید مولانا روم تحریر ہے۔
[۲] اصل خط میں ’’ا‘‘ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اس لئے قوسین میں لکھا گیا۔

طرزِ دوم :- ملتی ہے خوئی یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

طرزِ دوم :- ملتی ہے خوئی یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
ہے[1] تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تو ہم لوگ غالب کو اچھا اس سبب سے سمجھتے ہیں کہ طرزِ بندش اور صفائی بیان میں سب شعرائے دلی سے، علم اور زبانِ فارسی میں یکتا تھے، اب میں مثالاً ذوق، مومن، غالب کا کلام لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ غالب میں صفائی کیسی ہے اور ان دونوں میں کلک کیا ہے؟

مقابلہ ذوق و غالب :

ذوق :- مزے یہ دل کے لئے تھے، نہ تھے زباں کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

غالب :- زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

یا محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

باقی رہی زبان دانی۔ ان کے سوائے چند محاورات خاص دہلی کے جس کے خود مرزا غالب قایل ہوئے ہیں۔ چہ غالب، چہ مومن، چہ نصیر وغیرہ سب دہلوی اور سب لکھنوی کہیں کے رہنے والے ہوں۔ بشرطیکہ انھوں نے لکھنؤ یا دہلی میں نشو و نما پائی ہو اور اساتذہ کے خاندان سے منسوب ہوں اول درجہ کے ہیں اور دوسرا محاورات میں درجہ عوام و خواص کا ہے، اور تیسرا درجہ بازاریوں کا ہے۔

اور شہروں کے اعلیٰ ترین خواص ...... اور بازاریوں کے قابل نہیں .... اور یہی رائے انشاء اللہ خاں کی بھی ہے۔ مگر یہ بات فقط دہلی و لکھنؤ کے واسطے ہے۔ بسبب اجتماعِ سلطنت و اہلِ علم و فن کے۔ ایسی حالت میں قصباتی یا دوسرے شہر کے رہنے والوں کو تمام اہلِ دہلی و لکھنؤ کی تقلید جائز ہے۔ مگر کسی بات میں محاورے اور تذکیر و تانیث میں جب تک اختلاف اُن میں نہ ہو، اور جس محاورے و تانیث و تذکیر میں اختلاف ہو اُس میں سے اُسی محاورے کو ماننا چاہیئے جس مقام کی تقلید اُسے پسند ہو۔ یعنی لکھنؤ کی یا دہلی کی مگر حالی نے کیا خوب کہا ہے :

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں ——— !
قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط، منھ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

باقی بحث تو زباندانیٔ دہلی و لکھنؤ میں آ ہی جاتی ہے۔ ناسخ کی سالمیت سے انکار اور غیر سے بد اعتقادی کا شکوہ بھی بے جا ہے۔ ہاں آتش کے طرزِ عاشقانہ کے موجد ہونے میں کلام کیا ہے : سنئے، گو کہ وہ خوشہ چینِ تھے پھر بھی ان کی زبان میں پورب پچھم کا فرق بہت ہے۔ نہ دلی نہ لکھنؤ، اپنی الگ ایجاد ہے !

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی عفی عنہ
بتاریخ ۷۔ جون ۱۸۸۳ء
۳۰۔ رجب ۱۳۰۰ھ

[1] مطبوعہ نسخے میں "تیوری چڑھی ہوئی" درج ہے، اگر یہاں مصرع میں ذرا سی تبدیلی ہے۔

[2] صفیر بلگرامی مرثیہ میں مرزا دبیر لکھنوی سے اور غزل میں جناب غالب دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن دلی کی زباندانی کے قایل تھے۔

علی سردار جعفری

قصیدہ

ایشیا جلوۂ خورشیدِ درخشاں کا وطن — ایشیا حسنِ گل و لالۂ و نسریں کا چمن

چین و ایران کے باغوں سے گلستاں بردوش — جلوۂ وادیٔ کشمیر سے گل پیراہن

ایشیا حافظ و خیّام کی مے سے سرشار — ایشیا سعدی و تلسی کے ترانوں میں مگن

ایشیا اپنی شجاعت میں ہے ارجن کا شباب — ایشیا رستم و سہراب کے دل کی دھڑکن

اس کے سینے میں ہیں دولت کے خزانے پنہاں — ایشیا مشکِ ختن، دُرِّ عدن، لعلِ یمن

یہی آغوش ہے گہوارۂ تہذیبِ جہاں — اسی گہوارے میں پروان چڑھے شعر و سخن

انھیں ہاتھوں سے بہی حسنِ عمل کی گنگا — اسی پیشانی سے پھوٹی ہے تمدن کی کرن

مُنہ میں رکھی ہوئی انجیل و اوستا کی زباں — لبِ اعجاز میں قرآں کا اندازِ سخن

ہم نے کس طرح سحر کی ہے شبِ تارِ حیات — وید کی سحر بیانی سے ہُوا ہے روشن

ہم نے صدیوں کبھی جنگل میں منایا منگل — شہر کے شہر بسائے ہیں کبھی کاٹ کے بن

جب پہاڑوں کو بھی دعوائے خداوندی تھا — اپنے قبضے میں ہیں اس وقت سے سنگ و آہن

دستِ اعجاز سے دھرتی کا مقدّر بدلا — تیشے پتھر سے تو مٹی سے بنائے برتن

کوہساروں میں کبھی ہم نے تراشے ہیں مکاں — کبھی دریاؤں کے پہلو میں بسایا مسکن

یاد ہے اپنی غلامی کا زمانہ اب تک — مائلِ جور تھے یورپ کے پُرانے ساون

چیت پھاگن کی ہواؤں سے بھرتے تھے پسینے
بھیگی بھیگی ہوئی آنکھوں میں بسا تھا ساون

پھولی رہتی تھی سُرخ زرد پہ غم کی سرسوں
دلِ مجروح میں مہکے ہوئے زخموں کے چمن

نہ تو بلبل کے ترانے تھے نہ کوئل کی صدا
باغ ویران تھا، آباد تھے زاغ اور زغن

ایک اک موڑ پہ تھا مجسِ زنداں کا عروج
ایک اک گام پہ آگے آتے تھے سُود اور رسن

لوٹ لیتے تھے حفاظت کا بہانہ کر کے
دوست کے روپ میں پھرتے تھے ہمارے دشمن

کھیتیاں لرزہ براندام تھیں سہمے ہوئے گاؤں
ظلم ہر شہر میں ہر ایک نگر میں تھا دُمن

موت کے مُنہ میں چلے جاتے تھے مادکی سپوت
ایشیا جنگ کی بھٹی کے لئے تھا ایندھن

قصرِ خسرو پہ ہُوا تیشۂ فرہاد بلند
ہو گیا بند جو سر پھوڑ کے مرنے کا چلن

عشق کیوں دشت و بیاباں میں پھرے آوارہ
دوشِ مجنوں پہ ہے اب گیسوئے لیلیٰ کی شکن

ہجر نے وصل کے ساماں کئے ہیں پیدا
لبِ وامق سے مہک اُٹھا ہے عذرا کا دہن

حسنِ یوسف سے ہے پھر ارضِ زلیخا پہ شباب
آج پھوٹی ہے ابوالہول کے ماتھے سے کرن

مصر کی خاک سے موسیٰ کی بغاوت اُٹھی
نیل کی موج ہے فرعون کے لشکر کا کفن

دستِ راون سے ملی دامنِ سیتا کو نجات
پھر سے آباد ہُوا رام کے گھر کا آنگن

خون آنکھوں ہی سے ٹپکے گا نہ دل سے آنسو
بن کے اس عہد میں ہیر آئے گی رانجھا کی دلہن

آج مٹ جائے گی عمرِ رواں کی خاطر
ہاتھ جوڑے ہوئے حاضر ہیں روایاتِ کہن

کل تو شاہی کے تصور کو عطا کی تھی حیات
آج شاہی کے تصور کو پنہایا ہے کفن

ہاں یہی خاک ہے چنگیز و ہلاکو کا مزار
جنگ بازوں کے عزائم کا پُرانا مدفن

نغمۂ وحدتِ اقوام کی ہر سمت ہے دھوم
ہند اور چین سے تا وادئ تاتار و ختن

امن کے پھول ہیں آزادی کی دیوی کا سہاگ
عکسِ محبوب سے روشن ہیں دلوں کے درپن

(ناتمام)

عطا کاکوی

غالب کے اُردو دیوان کی اشاعتیں

(خود غالب کی زندگی میں)

پُرانے شعرا میں غالب ہی ایک ایسا خوش نصیب اردو شاعر ہے جس کا دیوان کئی بار خود اس کی زندگی میں طبع ہوا۔ ذوق تو یہ حسرت دل میں لیتے گئے۔ البتہ مومن کا دیوان کریم الدین نے ان کی زندگی ہی میں شائع کیا۔ مگر یہ دیوان بہت ناقص چھپا اور اس کا چھپنا نہ چھپنا برابر تھا۔ اس مضمون کے ذریعے ناظرین کو غالب کے مطبوعہ دیوان کی ایک ایسی اشاعت سے روشناس کرانا ہے جو غالباً اب تک "غالبیات" کے ماہرین سے پوشیدہ ہے۔ مالک رام، مہر اور نور نے غالب کے دیوان کی اشاعت صرف چار بتائی ہے۔ اس نادانی پر شوکت سبزواری نے ایک حد تک ان کو ملامت کی ہے اور اپنے ایک مضمون (ماہِ نو فروری ۵۴ء) میں شانِ تبختر کے ساتھ ایک مزید اشاعت کی اطلاع دی ہے اور قطعیت کے ساتھ یہ حکم لگایا ہے کہ غالب کی زندگی میں ان کے اردو دیوان کی پانچ اور صرف پانچ اشاعتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ غالب پر ریسرچ کا کام ابھی ہو ہی رہا ہے اور حقیقت یہ کہ ابھی شروع ہوا ہے، اس لئے قطعیت کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں حکم لگانا بڑی جسارت ہے۔ اس نئی دریافت کا سہرا بھی شوکت سبزواری کے سر نہیں رہتا جب کہ اُن کے مضمون کی اشاعت سے بہت پہلے دسمبر ۵۲ء کے آج کل میں خواجہ احمد فاروقی ان پانچوں اشاعتوں پر سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ شوکت صاحب کو اس کی اطلاع نہ ہونی حیرت انگیز ہے مگر میری حیرت میں خفیف کمی اس لئے ہو جاتی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ شوکت صاحب نے یہ مضمون قبل ہی لکھا ہو اور ماہِ نو کے دفتر میں اشاعت کا منتظر رہا ہو اور اسی وقفے میں خواجہ صاحب نے ان کا طرۂ امتیاز چھین لیا ہو۔ ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہیں کہ مضمون نگار اپنے ہر مضمون کے بعد تاریخ کتابت بھی دے دیا کریں۔ اس کی اشاعت جب بھی ہو اس سے بحث نہیں۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جا سکتی ہیں۔ بہر کیف اب ان پانچوں اشاعتوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ایک نئی اشاعت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

(۱) غالب کے دیوان کا پہلا ایڈیشن سید محمد خاں بہادر کے پریس میں شہر شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء چھپا۔

(۲) اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء مطبع دار السلام حوض قاضی دہلی سے شائع ہوا۔

(۳) تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی شاہدرہ سے ۲۰۔ محرم ۱۲۷۸ھ م جولائی ۱۸۶۱ء میں چھپا۔ یہ اشاعت بہت غلط تھی اس لئے غالب نے اس کی تصحیح کی اور مطبع کے مہتمم محمد حسین خاں کو واپس بھیجی تاکہ اس کو دوبارہ کسی دوسرے مطبع میں شائع کرائیں اور یہ نسخہ انھوں نے مطبع نظامی کانپور کو بھیج دیا۔

(۴) یہ چوتھی اشاعت مطبع نظامی کانپور سے ہوئی اس کی طباعت ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ م جون ۱۸۶۲ء ہے (شوکت صاحب مئی بتاتے ہیں صحیح جون ہے) مہتمم مطبع محمد عبدالرحمٰن نے خاتمہ یہ لکھا:

"محمد حسین خان نے ...... درستی کمال سے چھاپا۔"

ان دونوں اشاعتوں کے متعلق چند باتیں وضاحت طلب ہیں:

۱۔ غدر سے کچھ پہلے غالب نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب رام پور کو بھیجا۔ جب غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو اس نسخے کی ایک نقل

سے کر ضیاء الدین احمد خاں کے پاس دہلی بھیجی۔ اس سے ثابت ہوا کہ غالب کے پاس کوئی اور نسخہ نہ تھا۔

۴۔ یہ رام پور ہی میں تھے کہ میرٹھ کے ایک کتب فروش نے ان کا دیوان چھاپنا چاہا۔ شیفتہ نے سفارش کی اور تصحیح کا ذمہ لیا تو غالب راضی ہوئے۔ دہلی آ کر ضیاء الدین احمد خاں والا نسخہ لے کر انھوں نے میرٹھ روانہ کر دیا۔ ابھی چھپنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ منشی شیو نرائن بیچ میں ٹپک پڑے اور غالب سے بہ اصرار وہ نسخہ میرٹھ سے طلب کروایا۔ ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو یہ نسخہ آگرہ روانہ ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ تیسری اور چوتھی اشاعت کس نسخے کی بنا پر ہوئی۔

(۵) غالب نے جو ضیاء الدین والا نسخہ آگرے بھیجا تھا اس کی اشاعت تین سال کے بعد ۱۲۸۰ھ م ۱۸۶۳ء میں ہوئی گرچہ اس کی کتابت ۱۸۶۱ء ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ اسی عرصے میں اشاعتِ سوم اور چہارم کی نوبت آئی۔

(۶) میرے ذاتی کتب خانے میں ایک کتاب "نگارستانِ سخن" ہے۔ اس کے اوراق میں تین تین کالم ہیں۔ ہر کالم میں تین ہم عصر شعرائے اُردو، ذوق، مومن اور غالب کے اُردو کلام کا انتخاب ہے۔ یہ کتاب ۱۷۶ صفحات کو محیط ہے اور مطبع احمدی واقع شاہدرہ باہتمام محمد جان (کہیں امو جان بھی ہے) طبع ہوئی ہے۔ اس کی تاریخ طباعت صفحہ ۱۷۶ پر اس طرح مندرج ہے:

"حسب فرمائش لالہ جی نرائن صاحب تاجر کتب در مطبع احمدی
واقع شاہدرہ ملحقہ (دہلی ؟) بحسن اہتمام میرزا امو جان
حلیۂ انطباع پوشیدہ بتاریخ بست ہفتم صفر ۱۲۷۹ھ تمام شدہ"

صفحہ ۱۶۵ سے ۱۷۲ تک مومن، غالب اور ظہیر کے قصیدوں کا انتخاب ہے۔ ظہیر کی ایک غزل بھی ہے جہاں تک ذوق اور مومن کے کلام کا تعلق ہے یہ

ظاہر ہے کہ نگارستانِ سخن میں ان کا انتخاب ہے مگر غالب کا کلام متداول نسخوں کی طرح از ابتدائے "نقش فریادی" تا انتہائے "یارانِ نکتہ داں کے لئے" مکمل ہے اس لئے بہ اطمینانِ تمام یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی زندگی میں ان کا ایک اور دیوان ۲۷ صفر ۱۲۷۹ھ مطابق اگست ۱۸۶۲ء اسی مطبع سے شائع ہوا جہاں سے ان کے دیوان کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس لئے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اب یہ نسخہ پانچویں اشاعت کا دعویدار ہے اور آگرے سے جو دیوان شائع ہوا اس کا نمبر اب بجائے پانچویں کے چھٹا ہو گیا۔ نگارستانِ سخن سے ذوق کے کلام کے باب میں بھی بہت ہی حیرت کُن باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جس کو میں کسی دوسرے موقع کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ یہاں ایک اور ضروری بات کی طرف اشارہ ناگزیر ہے۔

خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مضمون (آج کل دسمبر ۵۲ء) میں بتایا ہے کہ دیوانِ غالب کے تیسرے ایڈیشن میں ان کا وہ قطعہ بھی ہے جس کی ابتدا ہے۔ "ہے چار شنبہ آخر ماہِ صفر چلو" اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس قطعہ کا چوتھا شعر "سونے رُمپے کے چھلے" والا اس نسخہ میں ہے مگر ان کو یہ یاد نہیں کہ اور نسخوں میں بھی ہے یا نہیں اور اطلاع دی ہے کہ جوش طسیانی والے نسخے میں یہ شعر نہیں۔ نگارستانِ سخن میں بھی یہ شعر موجود ہے اور نہیں کیسے ہوتا اس لئے کہ پانچویں شعر "یوں سمجھئے" کا تعلق چوتھے شعر سے ہے۔ تعجب ہے کہ جوش طسیانی والے نسخے میں یہ شعر کیوں نہیں؟ میں نے یہ نسخہ نہیں دیکھا۔ فاروقی صاحب نے چوتھے شعر کی ابتدا یوں لکھی ہے۔ "بنتے ہیں ..... الخ" حالانکہ صحیح ہے "بٹتے ہیں۔"

---

[1] "نگارستانِ سخن" اپنی اہمیت کی بنا پر حالیہ کتابی نمائش دہلی میں پیش ہوئی۔

مالابار کے آب پاشی کے پراجیکٹ

ہندوستان کے جنوب میں مغربی گھاٹ کی ڈھلانوں پر مالابار کی زمین مناظر سے پُر ہے۔ ضلع مالابار میں بارش کی سالانہ اوسط تقریباً ۹۰ اِنچ ہے۔ جو اگر بارشیں اچھی ہوں تو کھیتی باڑی کے لئے کافی ہے۔ قدیم زمانے سے ہی مالابار میں فصلوں کی پیداوار کا انحصار بارش پر چلا آ رہا تھا۔ لیکن تھوڑا عرصہ ہوا پانی محفوظ کرنے کی اسکیمیں بروئے کار آئی ہیں جن کی غرض و غایت یہ ہے کہ کسان کو بارش کی ضرورت کے وقت آسمان کو نہ تکنا پڑے۔ ان اسکیموں کا طریقہ کار یہ ہے کہ پانی مصنوعی جھیلوں میں جمع کر لیا جاتا ہے اور حسبِ ضرورت نہروں میں چھوڑ دیا جاتا ہے

کشمیر میں نئے آئین کا نفاذ

وزیر اعظم سید میر قاسم نے ریڈیو کشمیر سے ایک نشری تقریر میں ریاست کے نئے آئین کی خاص خاص باتوں پر روشنی ڈالی، آپ نے کہا کہ یہ آئین ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو پوری طرح سے لاگو ہو گا۔ اس آئین میں ریاست کے ہر ایک باشندے کو اقتصادی، سماجی، سیاسی اور مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ آئین کے تحت حکومت سے ہدایت کی گئی ہے کہ وہ نیا کشمیر کے پروگرام کے مطابق عوام کے لئے ایک ایسا سماج بنائے۔ جس میں کسی قسم کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

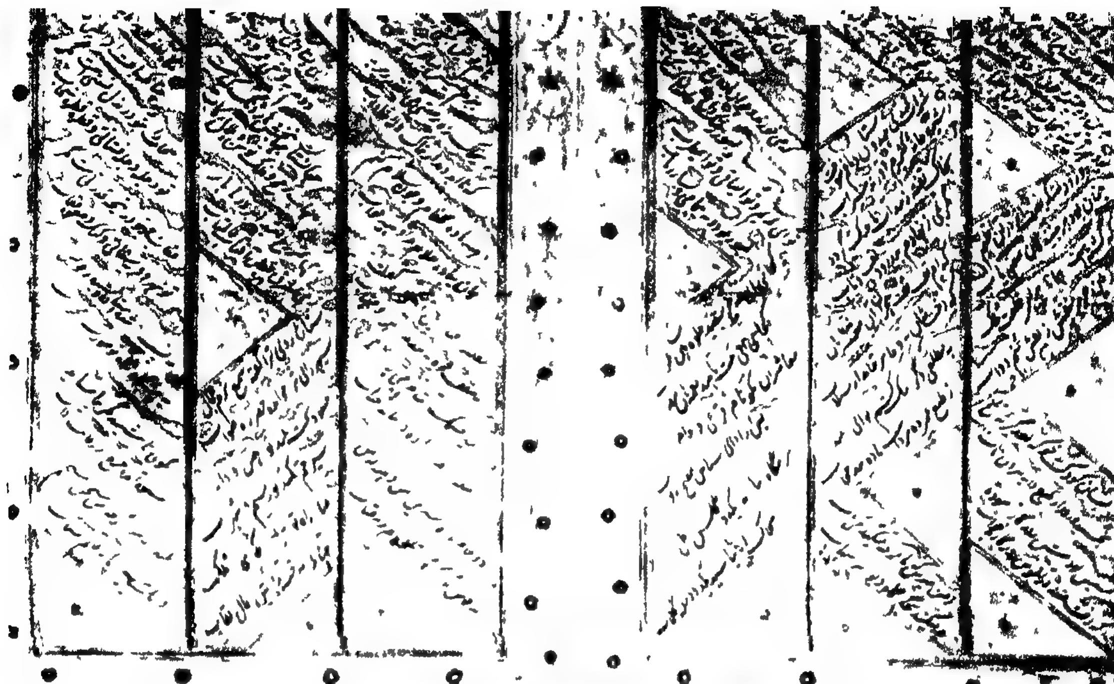
وچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

دائیں - دیوان غالب - ۱۸۵۷ء ایڈیشن

بیچے دائیں - دیوان غالب -
۱۸۴۷ء ایڈیشن

دیوان غالب پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء

دیوان اردو تصنیف
مشتری اوج حق پژوہی وخدادانی
رصد بند فلک البروج معارف سبحانی
افصح فصحای دوران شاہنشہ شعرای ممالک
ایران و ہندوستان دقاق غوامض و رموز
سخن سنجی و نکتہ دانی خلاق مضامین و معانی
سرآمد ارباب فضل و کمال مہر سپہر بسالت
واجلال جناب مستطاب منیع الالقاب میرزا اسد اللہ خان
بہادر ادام اللہ برکاتہم وحشمتہم المتخلص بغالب واسد
بتصحیح و مقابلہ جناب مصدر المدح در مطبع دار السلام
دہلی واقع محلہ حوض قاضی بسعی اقل العباد عنایت حسین
در ماہ مئی سنہ ۱۸۴۱ع باہتمام نور الدین احمد لکھنوی



غالب نے
کا لکھا
فارسی قد



دیوان غالب
۱۸۴۱ ایڈیشن
آخری صفحہ
مع غلط نامہ

اوپر :- پیش لفظ دیوان غالب ۱۸۵۷ ایڈیشن

اوپر بائیں :- غالب کا خط نواب یوسف علی خاں والی رامپور کے نام

نیچے بائیں :- دیوان غالب ۱۸۴۱ ایڈیشن - پہلا صفحہ

تصاویر دیوان غالب بہ شکریہ رضا لائبریری رام پور وصولت پبلک لائبریری (رامپور)

بشٹ کے فن پارے



گم کھال (گڑھوال) کا ایک م

ع - وہ اک جگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

پہاڑی لڑکا



نجم الحسن

رنبیر سنگھ بشٹ

(اتر پردیش کے مصور)

نوجوان مصوروں کی پود میں رنبیر سنگھ بشٹ شاید سب سے زیادہ ذہین اور قابلِ وقعت مصور ہے۔ بشٹ ایک نوجوان، جواں ہمت اور جواں بخت مصور ہے جس کو زندگی کے ہر نکھرتے اور اُبھرتے پہلو سے والہانہ محبت ہے اور اسی محبت نے بشٹ کے فن کو عوام کی زندگی سے وابستہ کر دیا ہے۔ بشٹ کی فنی تخلیقات خیالی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ تخیل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تخلیقات میں خواہ وہ انسانی چہرے کے خطوط ہوں یا مناظرِ فطرت، زندگی جھلکتی ہے اور وہ اپنے دیکھنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہیں۔ یہ تخلیقات پُرخلوص جذبات، ذہنی مواد، گہرے مطالعے اور ہنرمندی کے حسین امتزاج کا قابلِ قدر نتیجہ ہیں۔

ہمارے ملک کی ثقافت، روایات اور فلسفہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر بشٹ نے اپنے فنی نظریے کی تعمیر کی ہے۔ بشٹ کی پیدائش تقریباً ۳۰ برس قبل گڑھوال کے رومان پرور علاقے میں ہوئی۔ وہیں بشٹ کے جذبات اور تخیل نے پر پرواز پائے اور جمالیاتی شعور کی نشوونما ہوئی۔ وطن کے پُرکیف مناظر اور رومانی فضا نے بشٹ کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔ یہ اثر اتنا گہرا ہے کہ اس کا اثر غیر شعوری طور سے نہ صرف روایتی موضوع کی تصاویر میں ہوتا ہے بلکہ تجرباتی تصاویر بھی اس اثر سے محفوظ نہیں۔ اس اثر کو خاص طور سے بشٹ کے حالیہ تجربہ "تخلیقِ عالم" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تصویر میں آدم کے چہرے کے خطوط خود فن کار کے قومی کردار کے مظہر ہیں۔ خطوط کی یہ یکسانیت قطعاً غیر شعوری ہے۔

بشٹ کے لئے فنِ مصوری کوئی تفریحی فن نہیں بلکہ عوامی زندگی کو بہتر بنانے کا ایک با اثر ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بشٹ کا فن عوام سے نہ صرف قربت رکھتا ہے بلکہ عوامی زندگی کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے اور عوامی زندگی کے تمام ہی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک کامیاب فن کار کی طرح بشٹ روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور لمحات کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر جانی پہچانی شکل اور شے ایک نیا انداز، نیا پہلو اور نئے معنی لے کر ہمارے سامنے یوں آتی ہے گویا کہ ہم اس کے قبل اس سے واقف ہی نہ تھے۔ معمولی سے معمولی شخصیت اور چھوٹی سے چھوٹی شے بھی بشٹ کے لئے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ بشٹ کی تخلیقات میں بچوں، بوڑھوں اور جوانوں سب کا برابر کا حصہ ہے۔ عوام سے رشتہ رکھنے والی ہر شے اور عوامی زندگی کا ہر لمحہ بشٹ کی تصاویر میں نظر آ سکتا ہے۔ بشٹ محنت اور مشقت کے بلند اور باعزت مقام سے ناآشنا نہیں وہ اُبھرتی دنیا کا فن کار ہے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں "اپسرا" کی صورتیں نہیں بلکہ ہماری ہی دنیا میں رہنے والوں کی شکلیں ہیں جن کے چہروں پر محنت کا غرور اور استقلال اور ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں کی پُرسکون معصومیت جھلکتی ہے۔ استحصال اور بربادی کی طاقتوں اور ترقی پسند قوتوں کی آپسی جد و جہد میں کوئی بھی سچا فن کار تماشائی نہیں رہ سکتا۔ بشٹ کو اس حقیقت کا بھی احساس ہے۔ یہی احساس بشٹ کی تصویروں میں قنوطیت نہیں آنے دیتا بلکہ اس کی تصویریں ہمارے درخشندہ مستقبل کی نشان دہی کرتی ہیں۔

بشٹ نے اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے سب ہی طرح کے موضوع اور تمام ہی میڈیم چنے ہیں۔ اس نے گڑھوال کی پہاڑیوں کے ان گنت مناظر بنائے ہیں۔ یہ مناظر اس پہاڑی علاقے کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کوہستانی مناظر کی بہترین مثال "روشنی کی وادی" ہے۔ ایک پُرکیف وادی کے رومان کو فن کار نے بہت ہی چابک دستی سے نکھرے اور شاداب رنگوں میں نہایت حقیقت پسندی سے تخلیق کیا ہے۔ ان مناظر میں ایک اور تصویر "پرارتھنا" بھی بہت دل کش اور دل چسپ ہے۔ کوہستان کی سحر آگیں سحر میں تین بودھ بھکشو صبح کی پرارتھنا میں منہمک ہیں اور پس منظر میں ایک قلی بوجھ لادے چڑھائی پر چڑھ رہا ہے۔ رنگوں کا بتدریج امتزاج ہلکے کُہر کی غمازی کر رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک اشاری تصویر ہے اور بہت کامیاب بھی، فن کار نے اس میں اپنی قوم کی موجودہ حالت کو ان جان طور سے

اشاریت میں پیش کیا ہے۔ بھکشوؤں کے چہرے کی معصومیت اور خلوص پہاڑی علاقے کے عوام کی پُر سکون اور پُر امن طبیعت کی مظہر ہے اور پہاڑ کی سخت چڑھائی ان مسائل اور مشکلات کی نمائندہ ہے جو عوام کی راہ میں حائل ہیں۔ تلی کی عملی جد و جہد اور بھکشوؤں کی پارسائی اُن دو راستوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جو مشکلات کو حل کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں یعنی دوا اور دُعا۔ تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ تصویر مکمل ہے۔

بشٹ کی تمام تخلیقات میں "پرارتھنا" ایک بلند درجہ رکھتی ہے۔ اس نوجوان فنکار کے بنائے ہوئے میدانی علاقے کے مناظر کوہستانی مناظر سے کم دلکش نہیں ہوتے۔ روغنی رنگوں یا ٹمپرا میں بنائے مناظر میں جہاں کہیں دھوپ نظر آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید آفتاب سے ایک لمعۂ نور چھین کر تصویر میں ایک نگینہ کی طرح جڑ دیا گیا ہے۔ روغنی تصاویر میں "غربت اور خیرات" ایک مجمع کی کامیاب اسٹڈی ہے۔ اس وسیع کینوس کے کمپوزیشن کو فن کار نے نہایت چابک دستی اور پختگی سے نبھایا ہے اور مجمع کے ہر ہر چہرے کے انفرادی جذبات کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ہر چہرہ خود اپنی جگہ پر ایک مکمل اور منفرد تصویر معلوم ہوتا ہے۔ بشٹ نے ایک اور اچھے موضوع کو روغنی رنگوں میں پیش کیا ہے جس میں بچوں کی صحت اور تفریح کے اہم سوال کو اُبھارا گیا ہے۔ یہ تصویر ۱۲ فٹ لمبی اور ۴ فٹ چوڑی ہے اور میڈیکل کالج کے بچوں کے اسپتال کی زینت ہے۔ یہ تصویر بھی اپنے توازن اور پرکاری کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ آبی رنگوں میں "میلہ" عوامی زندگی کے ایک اور اہم پہلو کو بہت دلکش انداز میں پیش کرتی ہے۔ اپنی مفلسی اور پریشانیوں کے باوجود کس طرح عوام اپنے آپ کو قنوطیت سے دور اور الگ رکھتے ہیں اور تہواروں کے موقع پر رنگ برنگ کے لباس کو زیب تن کرکے نہ صرف اپنے آپ بلکہ ہر راہرو تک کی طبیعت میں شگفتگی پیدا کرتے رہتے ہیں۔

بشٹ کے بنائے ہوئے انسانی چہروں کی حقیقت پسند عکاسی میں بھی پختگی آچلی ہے۔ ان چہروں میں امریکن طالب علموں کے چہرے بھی ہیں اور اندھے فقیروں کے بھی۔ یہ چہرے مختلف میڈیم میں ہیں۔ پیسٹل میں بنائے ہوئے چہروں میں اندھے فقیر کا چہرہ بہت موثر ہے۔ بشٹ نے اسی میڈیم میں ایک پہاڑی گھسیارن کا بھی بہت پُر اثر چہرہ بنایا ہے۔ ایک پہاڑی عورت اپنے سر پر گھاس کا ایک بوجھ لادے آرہی ہے۔ اور گھنے درختوں کے درمیان گذرنے سے اس کے چہرے پر روشنی بہت کم کم اور چھن چھن کر پڑ رہی ہے۔ اس کی ہلکی روشنی کی مدد سے اس کے خد و خال اور جذبات کو بہت با اثر طریقے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ سیاہ پس منظر پہ سبز و سرخ رنگوں کے ٹکراؤ نے اس تصویر میں ایک عجیب پُر کیف ماحول پیدا کر دیا ہے۔ ٹمپرا میں بنائی ہوئی زینہ کی تصویر بہت کامیاب اور تابناک ہے۔ کانٹی کے خطوط میں "جیوتی" اور "بابولال" کے چہرے بھی اچھی "مکھ آکرتیاں" ہیں جن میں بنیادی فکروں سے دور، شوخی اور دُنیا کے نشیب و فراز کی پیدا کی ہوئی پختگی اور سنجیدگی دونوں ہی اپنی اپنی جگہ نظر آجاتی ہیں۔

روائتی موضوع کی تصویریں بھی بشٹ نے تخلیق کی ہیں۔ شاعرانہ تخیل اور نزاکت ان روائتی تخلیقات کا طرۂ امتیاز ہیں۔ "خانہ بدوش ماں" "رفیقِ تنہائی" اور "حکایتِ نَے" اول درجے کی روائتی تخلیقات ہیں۔ اوّل الذکر تصویر میں ہلکے سنہرے، گلابی، ارغوانی اور نیلے رنگوں کی حسین آمیزش نے ایک والہانہ ماحول پیدا کر دیا ہے۔ ہلکے دھلے رنگوں کے امتزاج اور نازک خطوط کی روانی کے سبب یہ تصویر اوّل درجے کی روائتی تخلیق ہو گئی ہے۔ "حکایتِ نَے" رادھا کرشن کے روائتی موضوع کا عکس ہے۔ کرشن کی سریلی بانسری کی مسحور کُن آواز رادھا کے تخیل کو اس طرح جگاتی ہے کہ تخیل کے پردہ پر من موہن کرشن کا چہرہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اُبھر آتا ہے۔ اگر رومانی جذبات اور شاعرانہ نزاکت کو رنگوں میں ظاہر کیا جاسکتا ہے تو یہ تصویر اس اظہار کا بہترین اور کامیاب ترین نمونہ ہے۔ "رفیقِ تنہائی" ایک بہت سن رسیدہ اور غریب عورت کا PORTRAIT بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس چہرے کے خطوط جن جذبات کو ظاہر کرتے ہیں ان میں نہ صرف غُربت کا احساس پایا جاتا ہے بلکہ دنیا و مافیہا کی طرف ایک ایسے رجحان کا اظہار ہوتا ہے۔ جس میں بیک وقت بیگانگی اور حقارت دونوں جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ تینوں ہی تصویریں چابک دستی، نزاکت اور تکنیک، ہر لحاظ سے بہت کامیاب تصویریں ہیں۔

یوں تو بشٹ لکھنؤ اسکول کے زیرِ اثر ہے۔ مگر دانستہ طور سے وہ کسی بھی اسکول کی فنی زنجیروں میں جکڑنا پسند نہیں کرتا۔ بشٹ کا کہنا ہے: "فن کار کسی بھی اسکول کا پابند نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اسکول خود فن کار ہی سے جنم لیتے ہیں۔" نظریۂ فن پر بھی بشٹ کی اپنی رائے نہایت غیر مبہم ہے۔ "نظریاتی اعتبار سے میں تو اُس کا قائل ہوں کہ فن عوامی زندگی سے جتنا نزدیک ہوگا اتنا ہی ترقی کرے گا۔"

عوام سے اس قدر محبت کرنے والا یہ نو عمر فن کار ایک دن یقیناً عوام کا محبوب فن کار ہوگا۔

عرش ملسیانی

غزل

حاصل جو طرب کا ہے وہ غم ہم نے بنایا
اس دوزخِ دنیا کو اِرم ہم نے بنایا

ہر شخص کو بخشی طربِ شوق کی توفیق
ہر شخص کو بیگانۂ غم ہم نے بنایا

اللہ کو پابندِ در و بام بنا کر
اک سلسلۂ دیر و حرم ہم نے بنایا

ہر جام کو دی دولتِ کونین نمائی
ہر جام کو غیرت دہِ جم ہم نے بنایا

جب دیکھا خوشی ہو گئی اندازے سے باہر
اس کے لئے پیمانۂ غم ہم نے بنایا

ہوتی ہے جہاں پرورشِ علم و معانی
وہ مدرسۂ لوح و قلم ہم نے بنایا

آگاہ کیا حُسن کو آئینِ ستم سے
خود عشق کو محرومِ کرم ہم نے بنایا

دُنیا کو دیا جامِ مئے عیش و مسرّت
اپنے لئے پیمانۂ غم ہم نے بنایا

پیمانِ محبّت کو بہ ایمائے ارادت
بیگانۂ ہر قول و قسم ہم نے بنایا

ہمّت یہ ہماری ہے کہ ہر سست قدم کو
منجملۂ اربابِ ہمَم ہم نے بنایا

وابستہ ہُوا ہم سے ہر اک کام جہاں کا
ہر نقشۂ تقدیرِ اُمَم ہم نے بنایا

اللہ کی تخلیق میں اپنا بھی ہے حصّہ
بیش اس نے بنایا ہے تو کم ہم نے بنایا

اے عرش پئے لشکرِ افکار و معانی
آزادیٔ فطرت کو علَم ہم نے بنایا

مسیح الحسن رضوی

ایک شب کا مُسافر

پچھم کے اونچے پیڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ افق پر آگ سی لگی ہوئی تھی۔ زمین سے آسمان تک ایک سیاہ غبار پھیلا ہوا تھا۔ یہ اُس مٹی کے ذرّات تھے جو سونا اُگلتی تھی۔ اس کی لاری ہچکولے کھاتی ہوئی اب خام سڑک سے مڑ کر اس پگڈنڈی پر جا رہی تھی جو پنجتن پاک کی درگاہ پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ یہ لاری ہمیشہ سے اسی جگہ پر آ کر رُکتی تھی۔ اب سے پندرہ برس پہلے جب وہ پہلی بار اس دُور افتادہ قصبے میں اپنی نئی نویلی دُلھن کو لے کر آیا تھا تب بھی لاری یہیں آ کر رُکی تھی۔ رمضانی نانا لاری کے مسافروں کو لالٹین دکھاتے تھے اور ان کا سامان احتیاط سے اتروا تے تھے۔ آج بھی رمضانی نانا شاید اپنی اندھی لالٹین لئے کھڑے ہوں گے۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہیں گے — "ارے دولھا میاں تم — اچھے تو رہے؟" اس کے ذہن میں ماضی کی یادیں جگمگا اُٹھیں۔ اس کا وہ پہلی بار قصبے میں آنا، اس کی بیوی کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر لوگوں کا بھڑکنا، پھر گھر گھر دعوت صوبے دار بھولے خاں کے یہاں کا مجرا، خوفناک بیڑوں میں تیندوے کا شکار، بیتوا ندی میں صبح و شام نہانا، جہاں سارے قصبے کی لڑکیاں، مغل گھاٹ سے ذرا ہٹ کر دریا کے اندر بنی ہوئی پتھر کی مسجد میں جمع ہو کر چھاجھم دریا میں کود پڑتیں اور شرط باندھ کر دریا کو پار کرتیں۔ وہ دوسرے کنارے پر کھڑا حیرت سے یہ سب دیکھا کرتا۔ یہ لڑکیاں ہیں یا جل پری؟ دیکھنے میں نوجوان ہرنی کی طرح سُبک، لیکن جو اپنے سروں پر چار چار گھڑے پانی رکھ کر اونچی پہاڑیوں کی پگڈنڈی پر ہرنی کی طرح کلیلیں کرتی ہوئی چڑھ جاتی ہیں اور اس کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہیں — "بھائی جی تم کیا جانو دیہاتی زندگی کے مزے۔"

جب وہ پہلی بار فیلٹ لگائے اور گلے میں کیمرہ ڈالے قصبے میں آیا تھا تو بیتوا ندی میں اُٹھنے والی لہریں سارے قصبے میں دوڑ گئی تھیں۔ وہ جدھر نکل جاتا سیدانی بی کے داماد کے بارے میں کانا پھوسی ہونے لگتی۔ "سیدانی بی کا داماد ولایت تک پڑھا ہوا ہے۔ کوئی افسر دپی کھٹے ہے۔ بیوی تو بائیسکوپ کی بائی جی ہے۔" صبح شام قصبے کے لوگ اس سے باتیں کرنے اور دنیا کا حال چال معلوم کرنے کے لئے جمع ہوتے۔ "پاکستان بنے گا بھائی جی؟" "یہ مسٹر جناح بمبئی میں کس جگہ رہتے ہیں؟" "کیا گاندھی جی بڑے لاٹ سے ملنے شملے جا رہے ہیں؟" وہ ان سب سوالوں کا جواب بڑی بلندی سے دیتا، ٹھیر ٹھیر کر، آہستہ آہستہ، اور سب اونچی آوازوں میں سوال کرتے رہتے اور ان کے قہقہے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے ٹکرا کر بیتوا ندی تک پھیل جاتے۔

اس کی بیوی نے میکے آتے ہوئے اپنے قصبے کے بارے میں بڑی ہولناک خبریں سنائی تھیں — "بس ایک ہمارا گھر ہے جہاں تعلیم کا چرچا ہے۔ باقی ساری بستی میں جہالت کا راج ہے۔ مرد تو مرد، عورتیں تک جب ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو بڑی خوفناک گالیاں بکتی ہیں۔ بڑی گراری اور مردانہ قسم کی گالیاں۔" لیکن جب وہ قصبے میں پہونچا تو اسے دوسرا ہی نقشہ نظر آیا، مخلص مرد اور مخلص تر عورتیں، جن کی لڑکیاں آزادی سے بستی میں گھومتی ہیں۔ منوں گیہوں پھٹک کر کٹھیوں میں بھر دیتی ہیں چپیت کاٹنے کے لئے راتوں کو بھی کھیتوں میں رہتی ہیں جن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگلوں میں خوفناک درندے رہتے ہیں لیکن یہی لڑکیاں اگر انھیں گھور کر دیکھو تو چھوئی موئی کی طرح سُکڑ جاتی ہیں اور ان کی آنکھوں میں غصّے اور شرم سے آنسو آ جاتے ہیں۔ تصویر کے اس رُخ کو دیکھ کر اسے بڑا ہی سرور حاصل ہوا۔ اس نے قصبے میں رہنے کا صرف ایک ہفتے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں کے ساتھ

ایک مہینہ رہا۔ وہ ان کے ساتھ کھیتوں میں جاتا۔ اونچے اونچے پیڑوں میں ان کے ساتھ میلوں چلا جاتا۔ ان پیڑوں میں، جن میں خوبصورت رَل رَل کرتے جھرنے بہتے ہیں جو دیکھنے میں شہر کی نالیوں کی طرح گندے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ان کے قریب جاؤ تو آئینے کی طرح صاف شفاف پانی اتنا شیریں کہ شہر کے کوکو کولا کو شرمائے۔ اسے اپنی بیوی کی رائے پر بڑا رحم آیا۔ یہ فرشتہ صفت لوگ جو ایک پیالہ دودھ کے لئے اپنے گھروں سے ایک سیر دودھ بھجوا دیتے ہیں، جاہل تو ہرگز نہیں تھے۔ علم کی روشنی اگر اُن کے قصبے تک نہیں پہونچی تھی تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر وہ ٹونے ٹوٹکوں اور جھاڑ پھونک سے اپنے مریضوں کا علاج کرواتے تھے تو اس کے لئے وہ ہرگز ذمے دار نہیں تھے۔ اگر برسات میں ان کا چھوٹا سا قصبہ ساری دنیا سے کٹ جاتا تھا تو اس میں بھی اُن کی کوئی خطا نہیں تھی۔ ضلع سے اُن کے قصبے تک پختہ سڑک ہی نہیں تھی۔

سورج اونیچے اُتر گیا تھا۔ اب بیتوا ندی کا پانی بھی سُرخی مائل ہو گیا تھا۔ لاری ہچکولے کھاتی پنجتن پاک کی درگاہ کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ سیّد ولی کے مزار کا اونچا مینار صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب پچھلی بار وہ قصبے سے رخصت ہُوا تھا تو ساری بستی اُسے سیّد ولی کے مزار تک پہونچانے کے لئے آئی تھی بلکہ صوبے دار بھولے خاں تو اُسے ستھر تک پہونچانے کے لئے کہتے تھے لیکن اس نے ہاتھ پیر جوڑ کر ان کو اس ارادے سے باز رکھا تھا۔ لاری پندرہ منٹ میں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے والی تھی۔ رمضانی نانا کیسے ہو گئے ہوں گے؟ وہ اسے پہچان لیں گے یا نہیں؟ اس نے سوچا۔ پھر ایک طرف سے شور کی آواز آئی۔ اس نے لاری کی کھڑکی سے سر نکال کر گرد آلود فضا میں جھانکا — ایک سفید عمارت کے سامنے چند لڑکے والی بال کھیل رہے تھے۔ اس نے لاری کے اندر سر کو واپس کرتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا یہ کون سی عمارت ہے؟ ہائی اسکول آف او! اس نے سوچا قصبے میں ہائی اسکول کھل گیا— والی بال کا رواج ہو گیا۔ خوب— اگر قصبے تک پختہ سڑک آ جائے تو پھر یہ قصبہ اور یہاں کے لوگ زندگی کی بھاگ دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں گے۔ پرمورنی کی طرح سیک لڑکیوں کا کیا ہوگا کیا وہ بیتوا ندی پر اسی شان سے پانی بھرنے جاتی ہوں گی؟ کیا وہ آنکھوں میں موٹا موٹا، پھیلا پھیلا کاجل لگائے، نیم کے درختوں میں جھولے ڈال کر بس طرح سے پردیس سے آنے والے پیا کے انتظار کے گیت گاتی رہیں گی؟

ایک جھٹکے سے لاری رُک گئی۔ پنجتن پاک کی درگاہ آ گئی تھی۔ اس نے سر نکال کر جھانکا۔ پندرہ برس پہلے والے رمضانی نانا اسی طرح اندھی لالٹین لئے کھڑے تھے۔ لیکن وقت نے انھیں پہلے سے زیادہ بوڑھا کر دیا تھا۔ ان کی کمر جھک گئی تھی۔ آنکھوں پر آتشیں شیشوں والی عینک تھی۔ وہ لاری سے نیچے اُترا۔ "ارے دولھا میاں تم آ گئے! اچھے تو رہے؟" رمضانی نانا نے اسی گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے بڑے خلوص اور محبّت سے رمضانی نانا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اچھے تو ہو رمضانی نانا؟" "ہاؤ"۔ پھر رمضانی نانا نے رات کے سنّاٹے میں آواز دی۔ "اے مٹھو! سیدانی بی کا داماد آیا ہے، سامان گھر پہونچا دے۔"

اسے گھر پہونچنے کی ایسی عجلت نہیں تھی۔ وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پنجتن پاک کی درگاہ کو دیکھا۔ شب کے سرمئی اندھیرے میں اسے یہ دیکھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا دایاں مینار جو اب سے پندرہ برس پہلے شکستہ ہو گیا تھا اب ٹوٹ کر گر گیا ہے اور اس کا ملبہ صحن میں ڈھیر ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر سیّد ولی کے مزار کی حالت ضرور سُدھر گئی ہے۔ شاید کسی عقیدت مند نے عمارت پر سفیدی پھروا دی ہے۔ اور اس سے بھی ذرا ہٹ کر دکن جانب جامع مسجد کے مینار اسی شانِ استغنا سے آسمان کی طرف سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ قصبے والوں کو اپنی اس جامع مسجد پر بڑا ناز تھا ان کا کہنا تھا کہ اس جامع مسجد کو اورنگ زیب نے اس وقت بنوایا تھا جب وہ دکن کی مہم پر جا رہا تھا اور اس نے ان کے قصبے میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہ مغل گھاٹ اور بیتوا ندی میں پتھر کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی مسجدیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

اتنے میں مٹھو آ گیا۔ "کہاں ہے سامان بھائی جی؟" رمضانی نانا نے اُسے موٹی سی گالی دی۔ "ابے بیٹھ، سامان اُتارتا ہوں۔" رمضانی نانا اپنی لالٹین زمین پر رکھ کر لاری کی چھت پر چڑھ گئے۔ "لے بے مٹھو! یہ رہی پیٹی اور یہ بستر سنبھال لے۔"

وہ مٹھو کے ہمراہ گھر کی طرف چل پڑا۔ کھپریل پوش باہری کمرے میں صادق ممّا بیٹھے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے سنا تھا کہ صادق ممّا اب کھیتی باڑی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مقامی مڈل اسکول میں مدرسی بھی کرتے ہیں۔ اس کے قدموں کی آواز اور اس سے زیادہ مٹھو کی گرج دار آواز سے وہ چونک پڑے "ارے تم آ گئے؟ آؤ! آؤ!!"

پندرہ برس پہلے کی یادیں اُس کے دماغ میں پھر جگمگا اٹھیں۔ یہی کمرہ تو تھا جس میں وہ پہلی بار آکر ٹھہرا تھا تو قصبہ بھر کے چھوٹے بڑے جمع ہو گئے تھے۔ آج اس کمرے میں صادق تما اور اُن کے دو تین نوجوان ساتھی بیٹھے تھے۔ یہ ساتھی صوبیدار بھولے خاں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں ایک نوجوان کے ہاتھ میں ایک دن پہلے کا نیشنل ہرالڈ تھا۔ وہ سب تیزی سے کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر وہ سب خاموش ہو گئے۔

"سلام علیکم بھائی جی مجھے پہچانا؟" جو نوجوان ہاتھ میں نیشنل ہرالڈ لئے تھا اُس نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے پوچھا۔ اس نے پہچاننے کی کوشش کی لیکن اُسے ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ صادق تما ہنسے "ارے یہ صوبیدار بھولے خان کا نواسا ہے، نور خان، لکھنؤ میں پڑھتا اور نوکری تلاش کرتا ہے۔ جو بے چارے کو نہیں ملتی۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ "اچھا نور خان، اتنا سا تھا" اس نے ہاتھ سے بتلاتے ہوئے کہا "جب میں پہلی بار آیا تھا۔" نور خان بڑے پُرخلوص انداز میں مسکرایا۔ لیمپ کی تیز روشنی میں اس کے خوبصورت ہموار دانت چمک گئے۔ "اور یہ اسے پہچانا؟" نور خان نے اپنے ایک دوسرے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ مٹھو کا بھتیجا طوطا خان ہے...." اور وہ ہنسا۔ "طوطا خان نے حبیب بیگ مغلوں کے گھرانے والا یہ انٹر کر کے اب یہاں کھیتی کرتا ہے۔ تیتروں کا شکار کھیلتا ہے، گھڑیال مار کے اس کی کھالیں کا پیہ اور کلکتہ میں بیچتا ہے۔" "حبیب بھائی جی کو کل شکار کھلانے چلیں گے اور یہاں کیا رکھا ہے، نہ سینما، نہ ہوٹل اور نہ...." نور خان پھر ہنسا۔

اسے ڈر لگنے لگا کہ کہیں یہ تعارف کا سلسلہ لامتناہی نہ ہو جائے۔ کمرے میں اور لوگ بھی جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یہ سوچ کر اُس نے صادق تما کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ چلو گھر میں آپا بی سے مل آئیں۔ آپا بی اُس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ڈیوڑھی پر آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے داماد کو پچھلے تین برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے کام دھندوں میں اُن کا نکلنا نہیں ہوتا تھا اور اُسے توفیق نہیں تھی کہ وہ خود جاکر آپا بی سے مل آئے۔ حالاں کہ اُس کی بیوی سال میں کم از کم ایک بار ضرور قصبے آتی تھی اور اُسے طرح طرح کی خبریں سناتی تھی۔ جن پر وہ یقین نہیں کرتا تھا۔ لیکن صادق تما کے کمرے میں ذرا ہی دیر ٹھہرنے کے بعد اُسے اپنی بیوی کی بعض باتوں کا یقین آنا شروع ہو گیا تھا۔

جب وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو آپا بی نے اسے وفورِ جذبات سے گلے لگا لیا۔ محلے کی دوسری عورتوں بھی وہاں جمع تھیں۔ سب نے اسے دُعائیں دیں "شہری بڑے بے مروت ہوتے ہیں۔ کب آیا تھا یہ؟"

ایک ادھیڑ عمر عورت نے کہا "پندرہ سولہ برس تو ضرور ہوئے ہوں گے میری عائشہ کے دانت نکل رہے تھے کیوں سیدانی خالہ؟" سیدانی بی نے محبت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں اور کیا، اس سے کم کیا ہوئے ہوں گے" وہ خیالات سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پندرہ برس واقعی بہت ہوتے ہیں۔ ایسے پُرخلوص لوگوں سے وہ پندرہ برس کیسے جُدا رہا؟ دروازے پر کسی نے آواز دی۔ سیدانی بی نے کہا۔ "بھولے بھائی ہیں، بے چارے اتنی رات گئے تم سے ملنے آئے ہیں۔"

وہ باہر نکلا۔ ڈیوڑھی پر صوبیدار بھولے خان کھڑے ہوئے تھے۔ ا[illegible] کی کمر جھک گئی تھی۔ رائفل سے بے خطا نشانہ لگانے والے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُنھیں دیکھ کر اسے ہالی وڈ کا فلم جولیس سیزر یاد آگیا۔ وہی قد و قامت جبڑوں کے نیچے وہی لٹکا ہوا گوشت، وہی چھ فٹ کا قد جو سینہ کے پاس سے ہلکا سا خم ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر صوبیدار بھولے خاں نے اپنی گڑگڑی زمین پر رکھ دی اور بے تحاشا اُسے گلے لگا لیا "بہت بدل گئے ہو یار، زمانہ ہی بدل گیا ہے، اپنا قصبہ ہی بدل گیا" اُنھوں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ اُنھیں لئے ہوئے کمرے میں آگیا۔ آج اس سے کسی نے اخباروں کی خبر کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا۔ جناح اور گاندھی کا ذکر نہیں آیا۔ بے رحم زمانے نے سب کے سامنے نئے مسائل کھڑے کر دیئے تھے۔ صوبیدار بھولے خاں کو سب سے بڑی تکلیف اس بات نے پہنچائی تھی کہ شہر سے قصبے تک پختہ سڑک آرہی ہے، تھانہ آرہا ہے اور اس کے ساتھ پولیس کا ڈنڈا اور رشوت آرہی ہے۔ ان کے قصبے والوں کا ایک گروہ ان کے ساتھ تھا۔ دوسرا گروہ نوجوانوں کا تھا۔ جو اُن کی مخالفت کر رہا تھا۔ سڑک آرہی ہے تو اس کے ساتھ سڑک کی برکتیں آرہی ہیں۔ قصبہ پورے ملک سے جڑ جائے گا۔ تجارتی لین دین اور علم و تہذیب کے پھیلنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن یہ گروہ اقلیت میں تھا۔ اکثریت صوبیدار بھولے خان کے ساتھ تھی۔

واقعات سے واقعات پیدا ہوتے رہے۔ کسی کا لڑکا میٹرک کر کے کھیتی باڑی کرنے سے منکر تھا اور شہر کی ملازمت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ خو[illegible]

صوبیدار بھولے خان کا سب سے چھوٹا لڑکا پڑھ لکھ کر پاکستان بھاگ گیا تھا۔ انھوں نے اس بھگوڑے لڑکے کو بے حد موٹی گالی دی اور اسے بتلایا کہ میں اس کی بیوی کو بہت جلد اس کے میکے پہنچا دوں گا۔ میں نے کسی کے کھلانے پلانے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ پھر اُنھوں نے اپنے نواسے کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھتے ہو اسے یہ نور خان۔۔۔۔ یہ شہر سے شادی کر کے لایا ہے۔ شہروں میں اپنی بیوی کو بازار ہاٹ گھماتا ہے اور یہاں آکر پردہ کراتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہاں تو جب تک عورت بیتوا میں نہیں نہاتی ہے اس وقت تک ناپاک رہتی ہے۔ منگل گھاٹ پر ڈبکی لگائے بغیر عورت سلکّھ شُلّے کی بن ہی نہیں سکتی، پر ان باتوں کو یہ۔۔۔۔ کیا جان سکتا ہے۔"

اس نے صوبیدار بھولے خاں کی باتوں میں شکست کا اعتراف محسوس کیا گویا وہ باآوازِ بلند اپنے زمانے کے ختم ہو جانے کا اعلان کر رہے تھے۔ ان کی گڑگڑی کی چلم جل چکی تھی۔ ایک زوردار کش لگانے کے بعد انھوں نے منھ بنایا۔

"جل گیا۔۔۔" اس نے صوبیدار بھولے خان کی خدمت میں سگریٹ پیش کرنا چاہی لیکن اُنھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ "میں نے یہ سب شغل فوج سے پنشن پانے کے بعد ختم کر دیئے۔"

ایک ایک کر کے سب لوگ اُٹھنے شروع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ تنہا کمرے میں رہ گیا۔ صادق تما منھ پر لحاف ڈالے خر خر کر رہے تھے۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا۔ "ارے صادق تما سو گئے کیا؟"

صادق تما نے کروٹ بدلی۔ "کیوں کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟" اُنھوں نے منھ سے لحاف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یار یہ صوبیدار بھولے خاں بہت بدل گئے ہیں۔ عمر کے ساتھ اتنے چڑچڑے ہو گئے ہیں۔" صادق تما لحاف کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر اٹھ بیٹھے۔ "بے چارے بھولے خان، انھیں زمانے نے بہت شکستیں دی ہیں۔ تمھارے سامنے تو کچھ نہیں بولے۔ پنجتن پاک کی درگاہ پر لاری کے اڈے کے پاس بیٹھے وہ دن رات زمانے کو کوسا کرتے ہیں۔ پچھلے پانچ برس سے شہر تک نہیں گئے ہیں۔" پھر صادق تما نے رازدارانہ لہجے میں کہا "ان سے اپنے گھر کی تباہی نہیں دیکھی جاتی۔" "تباہی؟" اس نے حیرت سے پوچھا "ہاں وہ اسے تباہی ہی سمجھتے ہیں۔ نور خان کے کرتوت وہ تم سے بیان ہی کر گئے ہیں کل اپنی نواسی کے کرتوت بیان کریں گے تو تم کانوں میں انگلیاں دے لو گے۔"

"یعنی کیا مطلب۔؟"

صادق تما نے اپنے پیر پلنگ سے لٹکا دیئے اور جوتے تلاش کرنے لگے پھر وہ اس کے پلنگ پر آکر بیٹھ گئے۔ "بھولے خان نے اپنی جوان بیوہ اور اُس کے بچوں کی پرورش کی خاطر جو کچھ کیا ہے اس سے ساری بستی واقف ہے۔ نور خان لکھنؤ میں پڑھ رہا ہے۔ اس کی بہن عائشہ نے بی۔ اے کر لیا ہے اور اب پوری میم بن گئی ہے بستی میں اس کا دل نہیں لگتا۔ جانتے ہو اس کے کرتوت؟"

صادق تما نے سنسنی پیدا کر کے تھوڑی دیر اس کا لُطف لیا۔ وہ بھی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ بیوی نے ذکر ہی نہیں کیا۔" اس کے بعد بھی صادق تما تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر بولے کہ "بھولے خاں نے سید ولی کے مزار پر منت مانی ہے کہ عائشہ مر جائے"

"عائشہ مر جائے، آخر کیوں؟"

"کل صوبیدار تمھیں خود ہی بتلائیں گے۔" اس کے جذبۂ حیرت سے صادق تما نے لُطف لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن آخر تم ہی کیوں نہ بتلا دو۔"

"عائشہ نے لکھنؤ میں ایک لڑکا پسند کر لیا ہے۔ اب خود ہی اس سے شادی کر رہی ہے۔"

عائشہ۔ اس نے سوچا اس ادھیڑ عمر عورت کی لڑکی جس نے کہا تھا کہ جب وہ پہلی بار آیا تھا تو عائشہ کے دانت نکل رہے تھے۔ اب شاید عائشہ کے دانت نکل آئے تھے۔ جب ہی تو وہ لکھنؤ میں اپنی مرضی سے شادی کر رہی تھی۔ اسے عائشہ اور اس کے ہونے والے شوہر دونوں پر رشک آیا۔

صادق تما نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "صوبیدار کو عائشہ سے نہیں نور خان سے شکایت ہے جو اس معاملے میں اپنی بہن کی طرفداری کر رہا ہے بھولے خاں نے تمام کوششوں کے کر ڈالنے کے بعد تھک ہار کر سیّد ولی کے مزار پر عائشہ کے مر جانے کے لئے چِلّہ باندھا ہے۔ کل وہ خود ہی تمھیں سب قصّہ بتلائیں گے۔"

وہ صبح ہی صبح اُٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف کے جنگلوں میں مور چنگھاڑ رہے تھے کمرے کے سامنے سے جو پگڈنڈی بیتوا کی طرف اُترتی تھی اس پر قصبے کی بہت سی عائشائیں سروں پر گھڑے رکھے پانی بھرنے جا رہی تھیں جن کے بارے میں صادق تما نے اسے بتلایا کہ اب یہ لڑکیاں کھیتی باڑی کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی اسکول میں تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں۔ اس نے نوجوان مورنی کی طرح سبک ان سب لڑکیوں کو دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں صوبیدار بھولے خاں کی دیو ہیکل شخصیت گھوم گئی۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ آج شام کو واپس لوٹنے سے قبل وہ سیّد ولی کے مزار پر جا کر منت مانے گا۔ کہ آگے چل کر یہ سب لڑکیاں اپنی پسند کے بر منتخب کریں۔

[illegible] جب ساز پہ لہرا سا بجاتا ہے ستار

سرشار فضاؤں کی رگیں ٹوٹتی ہیں   چھلکاتا ہے انگیا جوانی کا خمار

اتنے برجستہ بڑے مصرعے، اتنی عجیب و غریب تشبیہیں اور تعبیریں فراق ہی میں ہیں اس درجہ ڈوبی ہوئی آواز اردو شاعری میں اور کہیں نہیں ملتی

یہ روپ کے گرد سات رنگوں کی پھوار   جیسے مدھم سُروں میں خود گاتے ملہار
پڑتا ہے فضا میں عکس ہم رنگیں   یا قوسِ قزح کے جھلملاتے ہیں شرار

ملہار کے راگ کا تعلق گھنگھور گھٹاؤں اور برسات سے ہے۔ اور سات رنگوں کی پھوار قوسِ قزح کی جھلملاتی ہوئی سیال چنگاریوں کی وجہ سے ہو رہی ہے۔

اب ایک اور مصرع ملاحظہ فرمائیے جو اپنے رنگ کا انوکھا ہے اور خود دادِ سخن دے رہا ہے۔

ع "وہ رس آواز میں کہ امرت لٹ جائے"

نغمے کی الاپ ہے کہ قامت کا تناؤ   کہتا ہے ہر عضو پہ لپک شعلوں کی چڑھاؤ
آ آ کے راگنی کھڑی ہوتی ہے   دیکھے کوئی رسیلے بدن کا یہ رچاؤ

پوری رباعی کا کیا کہنا۔ تیسرا مصرعہ خاص طور سے قابلِ توجہ ہے معشوق کا قد رہ رہ کے ایک قیمتی عمل کی یاد دلاتا ہے یعنی بار بار راگنی آ آ کے کھڑی ہوتی ہے۔

ہونٹوں پہ گنگناتی نئے ہے کہ سکوت   جاگ اٹھنے کا سازوں کے سمے ہے کہ سکوت
لرزش ہے فضاؤں میں کہ بجتے ہیں کان   سنگیت کی کوئی نرم لے ہے کہ سکوت

رباعی کو پڑھ کر ایسا جان پڑتا ہے گویا سکوتِ نازنیں سنگیت کروٹیں لے رہا ہے۔

کومل، پد، گامنی کی آہٹ تو سنو   گاتے قدموں کی گنگناہٹ تو سنو
ساون لہرا ہے مد میں ڈوبا ہوا روپ   رس کی بوندوں کی جھنجھناہٹ تو سنو

پوری رباعی میں رس کی بوندوں اور ساون لہرا کی جھنجھناہٹ اس انداز میں سنائی دے رہی ہے کہ کان ترنم سے تر آلود ہوئے جاتے ہیں۔

تخیل کی بلندی اور صوتی اثرات کا حسین اجتماع مندرجہ ذیل رباعی میں نظر آتا ہے۔

پائل کی صدا ہے یا چھلکتے ہیں ایاغ   ملتا ہی نہیں ہے آج دھرتی کا دماغ
پگ، دھونی نرم دیتی ہے امبر سے پرے   جل اٹھتے ہیں لالہ زارِ جنت کے چراغ

رادھا کی نگاہ کا چھلاوا ہے کوئی   یا کرشن کی بانسری کا لہرا ہے بدن

"کھل بھی میں ستار بجتا ہے کہ زلف"

شاید ہمارے قدیم ادب میں بھی اتنی لطیف تعبیر نظر نہ آئے جو ادیب کے ہوئے مصرع میں ہے۔

مدھم لے میں چھڑا ہے سازِ ہستی   جیون سنگیت گنگناتی ہوئی زلف

ہلتی ہوئی زلفوں سے وہ موجیں اٹھ رہی ہیں جو نغمۂ حیات کے تال سم کی یاد دلاتی ہیں۔

زلفیں سارنگیوں کے بجتے ہوئے تار   یہ ہیں بے صدا کے ساون کی پھوار

بے صدا کے برسے یا نغمۂ بے آواز اتنا لطیف تخیل ہے کہ اسے ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں۔ لکھ نہیں سکتے۔

گنگا میں چوڑیوں کے بجنے کا یہ رنگ   یہ راگ، یہ جلترنگ، یہ روپ، یہ امنگ
بھیگی ہوئی ساڑھیوں سے کوندے لپکے   ہر پیکرِ نازنیں کھنکتی ہوئی چنگ

فراق کی یہ رباعی بجا طور پر سارے ہندوستان میں ہر کس و ناکس کی زبان پر رواں ہے اور ہر علاقے میں مشہور ہے۔ دوسرے مصرع میں آواز کے تموج کو کس بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

سنگیت کی پنکھڑی کو شبنم دھو جائے   جیسے شعلوں کی جگمگاہٹ کھو جائے
پچھلے کو خمارِ جسم رنگیں۔ جیسے!   کلیوں کے لبوں پہ مسکراہٹ سو جائے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس رباعی کی تعریف کس طرح کی جائے۔ یہاں پر آکر نقاد کا قلم کانپ جاتا ہے۔ اتنی حسین، دلکش اور نادر رباعی اردو کے منظوم ادب میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ پچھلے پہر معشوق کا ہر عضوِ بدن شبنم سے دھلی ہوئی سنگیت کی پنکھڑی بن جاتا ہے۔ یہ بات اپنے طرز کی واحد ہے۔

یہ رات فلک پہ تھرتھراتا سا غبار   شیشے پہ نرم نرم پڑتی ہے پھوار
یا بیٹھ کے ماہِ نو میں دیوی کوئی   چھیڑے ہوئے راگنی بجاتی ہے ستار

ع "عارض میں غنا کا نرم شعلہ دیکھے"

مندرجہ بالا تشبیہ سے ادبیات عالیہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ع "گفتار میں تو راگنی تھام لے دل"

یہ کتنا مترنم تصور ہے۔ شاعر کی قدرتِ بیان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

"جب سازِ سکوت رات ہو ایسے میں   گاتے قدموں کی گنگناہٹ آئے"

سکوتِ شب کا ساز اور مترنم آہستہ خرامی شاعر کی اعلیٰ فنکاری کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

جب زہرہ لئے ہوئے ہو ہاتھوں میں ستار   جب چرخ پہ اڑ رہے ہوں نغموں کے شرار
جھپکاتے ہوں آنکھ جب ستاروں کے چراغ   ایسے میں ہو کاش مجھ کو تیرا دیدار

جب زہرہ ہاتھ میں ستار لے گی تو نغموں کے شرار زمین پر نہیں، آسمان پر اڑیں گے۔

شاعر کے تصوّر کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

کیا تجھ کو محبت کے وہ ایّام ہیں یاد   جب پردۂ شب بجتے تھے دن گاتے تھے

پردہ ہائے شب کا بجنا اور دن کی روشنی کا گاگانا، جن ایّامِ محبت کی یاد دلاتے ہیں اُن کے تصوّر سے ہی وجد آفریں فضا طاری ہو جاتی ہے۔

۴   "جس طرح اساوری کے دل کی دھڑکن"

اس رُباعی میں راگنیوں کے دل کی دھڑکن سے معشوق کے اٹھتے ہوئے شباب کو تشبیہ دی ہے۔

کرونا رس کی سُریلی کویتا ہے بدن   اُٹھتے ہوئے درد کا ترانا ہے بدن
رادھا کے آنسوؤں کے ہلتے ہوئے تار   کُل گوپیوں کے برہ کی پڑا ہے بدن

اس رُباعی میں معشوق کے بدن کو ایک ایسی سُریلی نظم سے تشبیہ دی گئی ہے جو سوز و گداز سے معمور ہے۔

"گاتے ہوئے لمحوں کا وہ رنگیں احساس"

اس مصرع میں پیا ملن کی جیتی بولتی ہوئی مصوّری کی گئی ہے اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

اب ایک ایسی رُباعی ملاحظہ فرمایئے جس میں موسیقی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

انگ انگ میں لے بجتے ہوئے ساندوں کی   سر تا بہ قدم کہکشاں گاتی ہوئی
یہ رات گئے روپ کے سنگیت کا لوچ   آواز میں جیسے لگ گئی ہو چوٹی
یہ سناٹا، سماں کی یہ بلوا نجیں   تاروں کا یہ ترنم زیر لبی
ایک نغمۂ ساز ہے نگاہوں کا سکوت   یہ ادھ کھلی آنکھ جادوئے نیم شبی

مندرجہ بالا رُباعی میں جادوئے نیم شبی کا سکوت نما ہلکا ہلکا ترنم ایک عجیب کیفیت طاری کر رہا ہے اسی اُس کے اثر سے دل و دماغ دونوں فرحت پا رہے ہیں۔

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے   دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ، یہ لوچ، یہ ترنم، یہ نکھار   بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

فراق کی مندرجہ بالا رُباعی ہر قسم کی تعریف سے مستغنی ہے۔

لہرائے سروں سے سر کے سر کے آنچل   منڈلائے گیسوؤں کے کالے بادل
یہ کس نے پریم کے ترانے چھیڑے   روشن ہوتے چلے ہیں گالوں کے کنول

پریم کے ترانوں کے حسین عورتوں پر جو اثرات ہوتے ہیں اُن کی مصوّری کس چابک دستی سے کی ہے۔

آنکھیں ہوں تو دیکھ لو ان ترانوں کا جمال   الفاظ کے زیر و بم سے اٹھ رہا ہے جو
اوروں کے یہاں کہاں یہ تیور یہ رچاؤ   کیا سے کیا کر دیا ہے اُردو کا جمال

شنگرف اور گلال کے اڑنے سے پوری رُباعی کی فضا رنگا رنگ ہو گئی ہے۔

اب آپ کی خدمت میں بغیر کسی تبصرے کے ایک رُباعی پیش کی جاتی ہے۔

کیا تیرے خیال نے بھی چھیڑا ہے ستار   سینے میں اٹھ رہے ہیں نغموں کے شرار
دھیان آتے ہی صاف بجنے لگتے ہیں کان   ہے یاد ہیں تیری وہ کھنک وہ جھنکار

فراق کے ادبی کارنامے یکجا دستیاب نہیں ہوتے اُن کی اپنی زندگی ایک طویل انتشار کا شکار رہی ہے۔ پھر انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے منصبی فرائض ڈانواں ڈول صحت، وسیع علمی دلچسپیاں اور غمِ دوراں کے ساتھ غمِ جاناں کی کشاکش مناسب مستعد ناشران کتب کی کمیابی۔ ان تمام وجوہ سے ابھی اُن کی تصنیفات کا بیشتر منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اُن کے کلام کے تمام شائقین ابھی اُن کی اکثر چیزیں نہیں پڑھ سکے ہیں۔ اُن کی ایک نظم ہے "ہنڈولا" جو دو برس پہلے رسالہ "سیارہ" کراچی میں شائع ہوئی تھی ویوں شروع ہوتی ہے۔

دیارِ ہند تھا گہوارہ —— یاد ہے ہمدم   بہت زمانہ ہوا کس کے کس کے بچپن کا

اس نظم میں ایک مقام پر ہندوستانی سنگیت کی تخلیق کا بیان ملتا ہے۔ ہندوستان کی سنگیت کلا یا فنِ موسیقی کا کرشمہ یہاں کی دیومالا، روحانیت اور فلسفہ میں ملتا ہے۔ سام وید کو عام طور سے علمِ موسیقی کا مخزن مانا جاتا ہے۔ اب ہندوستانی موسیقی کے وجود میں آنے کا ماجرا فراق کی زبان سے سُنئے۔

اس ارضِ پاک سے اٹھیں بہت سی تہذیبیں
یہیں طلوع ہوئیں اور یہیں غروب ہوئیں
اسی زمین سے اُبھرے کئی علوم و فنون
فرازِ کوہِ ہمالہ یہ رودِ گنگ و جمن
اور اُن کی گود میں پروردہ کاروانوں نے
یہیں رموزِ خرامِ سکوں نما سیکھے،
نسیمِ صبحِ تمدن نے بھیرویں چھیڑی
یہیں وطن کے ترانوں کی وہ پویں پھوٹیں
وہ بے قرار و سکوں زا ترنمِ سحری
وہ کپکپاتے ہوئے سوز و ساز کے شعلے
انھیں فضاؤں میں انگڑائیاں ہو کے اٹھے

جنھوں نے ہند کی تہذیب کو زمانہ ہوا
بہت سے زاویوں سے آئینہ دکھایا تھا

(ہمنڈولا)

یعنی ہندوستان کا سنگیت محض سطحی تفریح یا کان کی گدگدی کے لئے نہیں تھا یہاں کا فنِ موسیقی، یہاں کے راگ اور راگنیاں محض آواز کی سرگم نہیں تھیں بلکہ وہ پوری تہذیب کی ترجمان تھیں۔ ایک شعورِ کائنات کی آئینہ بندی اور آئینہ داری اس کے ذریعہ کی گئی تھی۔ اور اسی قومی شعور سے ہندوستانی سنگیت کے سرچشمے پھوٹے تھے۔ اسی سنگیت میں جس پختگی اور شعورِ جس توازن، حیات کے جس گہرے احساس، مصوّری دہمہ دانی، کائنات سے جس پرستارانہ ہم آہنگی اور جس سوز و ساز کی طرف فراق نے خلّاقانہ اشارے کئے ہیں وہ اردو ادب میں ایک بے بہا اضافہ ہے۔ ہندوستانی سنگیت میں یہاں کی روحانی تاریخ وسوانح عمری ہے۔

فراق کی ایک اور نظم ہے " رقصِ شب تاب " جو کئی برس ہوئے رسالہ آج کل ہی میں شائع ہوئی تھی اور جسے فراق نے پہلے پہل جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی کے موقعہ پر ریڈیو سے نشر کیا تھا۔ صرف ایک اس نظم میں رقص و سرود کا جتنا رنگین بیان ہے اور مصوّری کے ساتھ ساتھ جس تخیّلِ عالیہ کا ثبوت دیا گیا ہے اُس کی مثال ہمیں اردو ادب میں نہیں ملتی۔ فنِ شاعری، فنِ موسیقی اور فنِ رقص کو آغوش میں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اب نظم دیکھئے۔

رات ہنس ہنس دیتی ہے بادیۂ پُرنم ساقی بتیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
لَو پہ لَو دیتی ہے تاریکیٔ عالم ساقی جب پیالوں میں چراغوں کی لویں ڈھلتی ہیں
تھاپ پر تھاپ پڑی سازِ طرب پہ ساقی تا بہ نہ گنبدِ افلاک گمک جاتی ہے
چنگ سے اُٹھتی ہے جھنکار برابر ساقی تیرگی رات کی رہ رہ کے کھنک جاتی ہے
آتی ہیں مدھ بھرے سنگیت کی لپٹیں ساقی آگ آکاش کے سینے میں وہ دہکاتی ہوئی
انگلیاں ساز کے پردوں پہ رواں ہیں ساقی اس جہاں رات کے دل کی کسک کساتی ہوئی
پھول گرتے ہیں سرِ فرش برابر ساقی ساز کی آنچ پہ رقصندہ شراروں کا گماں
گرمیٔ رقص سے دمکے ہوئے پیکر ساقی وہ پسینے کی جھلک دیتی ہوئی کاہکشاں
رقصِ شب تاب سے ہر عضو درخشاں ساقی برق سیّال لپکتی ہوئی شریانوں میں
جیسے یکبارگی ہو جائے چراغاں ساقی جسمِ رنگیں کے لپکتے شگفتانوں میں
رقص میں پیکرِ رنگیں کا لپکنا ساقی انگ کے بیچ میں کل راگنیاں جھومتی ہیں
یہ مدھر بول یہ کوندوں کا لپکنا ساقی لالہ گوں ہونٹوں کو نغموں کی لویں چومتی ہیں
رس میں ڈوبی ہوئی آواز کی سرگم ساقی سات رنگوں کی بجلی قوس پہ باہنوں کی دھنک
یہ کھنکتی ہوئی پائل کی چھما چھم ساقی نرغۂ گل رنگ پہ سنگیت کی یہ نرم دمک
تھم جب رات کے سنگیت کے لوٹتے ہیں جگمگا اُٹھتی ہے پیشانیٔ دوراں ساقی
نغمے جب زیرِ فلک کانپ کے دم لیتے ہیں جھلملا اُٹھتا ہے تاروں کا چراغاں ساقی
موہنی روپ کے سنگیت کا جادو ساقی آئینہ زیر و بمِ نغمہ کا ہر عضوِ بدن
دل بے تاب بدلتے ہوئے پہلو ساقی دیکھیں اب پڑتی ہے کس پہ نگہ معتقدن
گت میں اندازِ جہانِ گزراں ہے ساقی تہ کے پردوں سے کوئی دردِ نہاں اُٹھتا ہے
بزم میں عود کی موجوں کا سماں ہے ساقی صاف ہروں سے شفق رنگ دھواں اُٹھتا ہے
رین سنگیت کے اب جیگ چلے ہیں شعلے سرنگوں سا لگے نور کے خم ہیں ساقی
تیرگی اُنگلیاں چٹخاتی ہے گیسو کھولے برق آواز کی پلکیں بھی تو نم ہیں ساقی
رات لیتی ہے جمائی پہ جمائی ساقی ہر نظر جاگے ہوئے تاروں کی اُسانی ہوئی
پور کتنی ہے تری نیم نگاہی ساقی رس میں ڈوبے ہوئے سنگیت کو نیند آئی ہوئی

اس حقیقت سے کسی بھی سمجھ دار آدمی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نظم میں جو استعارات، تشبیہات اور تعبیرات موجود ہیں وہ قدرِ اوّل کی چیزیں ہیں۔

موسیقی اور اس کے لوازمات کا ذکر یا اُن کی طرف اشارے فراق کی غزلوں میں بھی سینکڑوں مقامات پر مل جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اُنھوں نے سب سے پہلا شعر غالباً اپنے زمانۂ طالب علمی میں کہا تھا جو یوں ہے۔

زندگی اپنی ہے اک نغمۂ فراق یاد کا پردہ ہائے سازِ ہستی میں کوئی روپوش ہے

کچھ اور اشعار سنئے۔

جو بکھی چھاؤں میں نغموں کی پنکھڑی سے بنے وہی سُنا ہے ترے حسن کا نشیمن ہے
فضا میں جیسے لپک جائیں سُرخ شعلۂ نے نگاہِ شوخ یہ رنگیں نوائیاں تیری
لبِ نگار ہیں یا شعلۂ نوائے بہار سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطلبِ رنگیں
سکوت کو بھی تو کانوں میں گونجتا پایا جدا یک کردے سُنا اَن سُنا وہ راگ ہے تو
نگاہ و گوش کی پُرکیف تشنگی کو نہ پوچھ اِک ادھ کھلی سی کلی ادھ سُنا سا راگ ہے تو
نرم دوشیزہ ادائیں ہیں ۔ کہ جنت کی ہوائیں تاروں کے گیت کی نے مست چلن کیا کہنا
تیری آواز سویرا تری باتیں تڑکا آنکھیں کھل جاتی ہیں اعجازِ سخن کیا کہنا

اگرچہ اس شعر میں موسیقی کا ذکر نہیں ہے لیکن آواز کے جادو کا ذکر ہے۔ ہر آواز میں ایک نے مضمر ہوتی ہے۔ موسیقی کا پرستار درحقیقت آواز کا پرستار ہوتا ہے۔

لہ اصل لفظ سارنگی ہے۔ عوام کی زبان پر سُرنگی ہے۔ سودا اس نے بھی سُرنگی لکھا ہے۔

مشہور انگریزی شاعر کیٹس کا قول ہے۔

LOOK UPON BEAUTIFUL WORDS AS A LOVER

" میں خوبصورت الفاظ کو عاشق کی نگاہ سے دیکھتا ہوں "

" فراق کے کلام میں جو موسیقیت اور غنائیت ہے وہ اُن کی تہہ دار آوازسے ہی پیدا ہوتی ہے۔

" جُلاتی " کے عنوان سے فراق کی ایک نظم کے کچھ اشعار سُنئے۔

وہ دیپ ، وہ موہنی ، وہ کام روپ آنکھوں کا
رسیلی اداؤں میں وہ راگنی رچائی ہوئی

وہ خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں وہ صبح
وہ سیر دیں تری بیداریوں کی گاتی ہوئی

فراق بزمِ فضا میں ہے وہ مری آواز
جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی

فراق کے کچھ اور اشعار سُنئے۔

آگئی بادِ بہاری کی لچک رفتار میں
موجِ دریا کا ترنم بس گیا رُخسار میں

شام کے سائے گھلے ہوں جس طرح آواز میں
ٹھنڈکیں جیسے کھنکتی ہوں گلے کے ساز میں

چھاگلیں بجتی ہیں یوں لیتا ہے لہریں انگ انگ
مست لے میں چھیڑ دے جس طرح کوئی جل ترنگ

جیسے شمشیریں کھنچیں جُنبش بھووں کا وہ تناؤ
راگنی جیسے کھڑی ہو جسم کا ایسا رچاؤ

چند اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

زبانِ حال سے پانچوں حواس بول اُٹھے
کئی ثبوت تری خوبی بدن کے ملے

ہر شے کے سکوتِ سرمدی میں
سُنتا ہوں میں اپنی گنگناہٹ

مفکرین نے کہا ہے کہ بڑے ادیب جس صوتی کائنات کی تخلیق کرتے ہیں اُس میں اتھاہ خاموشیاں بھی سموئی رہتی ہیں۔ جہاں فراق مناظر سے آوازیں آتی ہوئی سُنتے ہیں وہاں آفاق کے لامحدود سکوت کا بھی مستقل احساس انہیں رہتا ہے۔ اُن کی نظم "آدھی رات" میں احساسِ سکوت کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پہ
سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں
چھلک رہی ہے خمِ غیب سے شرابِ وجود
فضائے دہر ہے اِک نرگسِ خمار آلود
گلوں نے چادرِ شبنم میں منہ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی

سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں

فراق کی ایک نظم "جگنو" کے عنوان سے اب سے تین سال پہلے شائع ہو چکی ہے۔ بچہ ماں کی یاد کر رہا ہے۔ صرف دو شعر سُنئے۔

سکوتِ رات کا جس وقت چھیڑتا ہے ستار
کبھی کبھی تری پائل کی آتی ہے جھنکار

تو میری آنکھ سے موتی برسنے لگتے ہیں
اندھیری رات کے پرچھائیں ڈسنے لگتے ہیں

فراق کی یہ رُباعی بھی ملاحظہ ہو۔ جس کے متعلق جوش ملیح آبادی نے کہا تھا "یہ رُباعی پورے دیوان پر بھاری ہے"۔

ہیں ایک بیوگنی برہ سے بیکل
ہریالی پہ چل رہی ہو انکھیاں چھلکیں

یہ تاروں بھری رات کھنک جاتی ہے
شبنم پاؤں کی بن گئی ہے چھاگل

فراق کی ایک اور نظم "حدیثِ حُسن" کے نام سے ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے

یہ انگ انگ جوانی چمن چمن پیکر
یہ غنچہ غنچہ تبسم قدم قدم گفتار

اب اس نظم کے کچھ اور اشعار سُنا کر مضمون ختم کرتا ہوں۔

جو سُن سکے کوئی ہر عضو بات کرتا ہے
نظر نظر ہے تکلم ادا ادا گفتار

جمال ہے کہ مجسم کھنچی ہوئی اِک الاپ
نشانِ نغمہ ہے ایک ایک خطِ جسمِ نگار

صدائے ناز ہیں جیسے دمک ستاروں کی
وہ بارشِ کرنیں ہیں آواز کا چڑھاؤ اُتار

رگوں میں گونج رہے ہیں ترانۂ جمال
سماعتوں کی قسم جسم ہے کہ زمزمہ زار

جمال زیر و بم سازِ نغمۂ فردوس
شبابِ زہرہ کا امواجِ مرتعش سے اُبھار

کنواریاں کوئی جس طرح مل کے بانگ گائیں
سدا سہاگ ادا ہائے حُسن پُر اسرار

فضائیں وجد میں آتی ہیں وقتِ فکرِ سخن
نوائے رازِ شعورِ جمال کی جھنکار

یہ یادِ یار کی کیفیتیں ، یہ ہجر کی رات
سکوتِ نیم شبی نے اُٹھا لیا ہے ستار

اردو کے کسی اور شاعر کا اگر پورا کلام ہم چھان سکیں تو آواز کی رمزیت اس کے اثرات کی تہیں ، موسیقی یا سنگیت کلا کے اتنے حوالے اور موسیقی سے متعلق اتنی تشبیہیں ، تعبیریں اور اتنے استعارے ہمیں نہیں ملیں گے۔ فراق کے کلام کے اس حصہ کے مطالعہ سے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ٹھوس اور جامد کائنات دنیا کا ہر نظارہ گویا سانس لے رہا ہے اور نغموں میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ سکوت اور آواز ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور یہ ازل سے ابد تک آپس میں آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہیں۔ فراق کے فلسفۂ شاعری کا ایک اہم پہلو آواز [illegible] کی گہری معنویت کی طرف اشارہ کرتا ہے

دل شاہجہاں پوری

بادۂ کہن

بدلنی تھی ہمیں رفتارِ ہستی کی بدل آئے
نکالا راستہ وحشت خرامی کا نکل آئے

صدائے نغمۂ شورِ میکدہ زاہد کی ہُو حق سے
مرے ذوقِ سکونِ زندگی میں یوں خلل آئے

شبِ غم بختِ خوابیدہ یہ ہے کچھ وہمِ بیداری
ابھی تک تو سمجھتا ہوں کہ شاید دن نکل آئے

رُکے بیٹھے ہوئے ہیں منتظر ہیں اُن کی آمد کے
اجل آئی تھی اُس سے کہہ دیا ہم نے کہ کل آئے

فضائے زندگی میں کربِ درماں کے سوا کیا تھا
گئے تھے ہم بھی جا کر پاؤں پٹکے ہاتھ مل آئے

بُتوں کو آدمی کی جُون میں آنا نہیں آیا
نہیں معلوم ظالم کون سے سانچے میں ڈھل آئے

جو تو چاہے تو رکھ دے توڑ کر کُفرِ اہلِ ایماں کا
ترے ایما سے کافر کے بھی ایماں میں خلل آئے

ابھی کچھ اضطرابی کروٹیں لینی ہیں دنیا کو
سکون آئے تو لیکن دیکھ کر موقع محل آئے

برائے بیت لکھ لانا غزل آسان ہے ناطق
یہ مشکل ہے کہ جو شعر آئے وہ بیت الغزل آئے

سربسجدہ سوئے بزمِ ناز جانا ہی پڑا
حُسن کی تسخیر پہ ایمان لانا ہی پڑا

کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخیٔ موجِ نسیم
بے تکلف ہر گل کو مُسکرانا ہی پڑا

حُسن محوِ نازِ تمکیں فطرتِ دل بندگی
جو کرشمہ ہم نے دیکھا سر جھکانا ہی پڑا

کیا کہیں کس مصلحت سے امتحانِ عشق میں
زندگی اک داغ تھی جس کو مٹانا ہی پڑا

شدتِ غم میں جب آہیں بے اثر ثابت ہوئیں
چشمِ تر کو خون کا دریا بہانا ہی پڑا

کیا کہا؟ یہ خود سمجھتی تھی نگاہِ منفعل
آج حالِ سوزِ دل اُن کو سنانا ہی پڑا

بارگاہِ حُسن میں نخوت تھی گو ہمت شکن
دل ہوا مجبور اس حد تک کہ جانا ہی پڑا

سنگِ در گو التجائے عشق سے تھا بے نیاز
حضرتِ دل کو مقدر آزمانا ہی پڑا

اطہر حسین جعفری

تین خطوں کے مُوجد — محمدؔ مقلہ

علی ابنِ مقلہؔ بیضاوی شیراز کے رہنے والے اور ایران کے بلند پایہ دانشمند اور خطِ کوفی کے خوش نویسوں میں سے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ محمدؔ اور عبداللہ وہ ان دونوں کی تعلیم و تربیت میں بڑے کوشاں رہتے تھے۔ بڑے بیٹے محمدؔ کو نہ صرف علم و ہنر حاصل کرنے کا بلکہ اس بات کا بھی شوق تھا کہ جس طرح بھی ہو اپنے مخصوص ہنر (خوش نویسی) میں درجۂ کمال حاصل کیا جائے۔ چناں چہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتے کہ کسی طرح اپنے عصر کے خوش نویسوں سے گوئے سبقت لے جائیں۔ ساتھ ہی اس کے دل میں یہ جذبہ بھی تھا کہ اس فن میں جدّت پیدا کی جائے۔

ہنر کوئی بھی ہو اُسے درجۂ کمال پر پہونچانے کے لئے زحمت و کوشش اور ہوش و آمادگی لازمی ہوتی ہے۔ چناں چہ محمدؔ نے انھیں ذرایع سے کام لے کر خود کو خوش نویسی کے درجۂ کمال پر پہونچایا۔

اس زمانے میں خطِ کوفی کا لکھنا بہت مشکل تھا۔ مقلہؔ کو یہ فکر ہوئی کہ ایسا خط ایجاد کیا جائے جسے ہر شخص حاصل کر کے بآسانی لکھ سکے۔

پہلے انھوں نے ایک خط بنایا جس کا نام "محقق" رکھا۔ اس کے لئے نئے قاعدے اور نئے اسلوب بنائے چوں کہ کوفی خط میں ۵ ½ دانگ کی سطح اور نصف دانگ کا دور تھا اس لئے انھوں نے اپنے ایجاد کردہ خط میں ایک دور کا اضافہ کیا۔ اسے بہتوں کو سکھایا اور اسی خط میں متعدد دینی کتابیں اور قرآن لکھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انھیں یہ بھی پسند نہ آیا اور یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس سے آسان تر خط پیدا کیا جائے۔ اس لئے ایک دوسرا خط ایجاد کیا جس کے بیشتر حروف پہلے خط کے حرفوں کی طرح اور دور و سطح میں بھی انھیں کے مثل تھے۔ اس کا نام انھوں نے "خطِ ریحان" رکھا۔ یہ خط کوفی خط سے آسان تر اور زیبا تر تھا چنانچہ اسے بھی انھوں نے دوسرے خوش نویسوں اور خود اپنے شاگردوں کو سکھا دیا۔ تھوڑے زمانے میں یہ خط بخوبی رواج پا گیا۔

ابنِ مقلہؔ نے خط میں سادگی پیدا کر کے خطوں اور کتابوں کا لکھنا آسان کر دیا۔ چناں چہ اُن کا یہ خط عالم گیر ہو گیا اور اتنا مشہور ہوا کہ اس زمانے کے اکثر بزرگوں کو اس کے حاصل کرنے کی آرزو ہونے لگی۔

ابنِ مقلہؔ ایسا شخص دراصل ایک مقامِ ارجمند کا سزاوار تھا چنانچہ خلیفہ المعتضد باللہ نے ان کو فارس سے بغداد طلب کیا اور جب خلیفہ کو علم ہوا کہ وہ دراصل بڑے ہی قابل ہیں تو انھیں کئی جگہوں کی فرمان داری عطا کی۔

ابنِ مقلہؔ بغداد میں تازہ وارد ہوئے تو اُن سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ یہاں تک کہ اُن کو پتہ نہ تھا کہ انھیں کون سا کام انجام دینا ہوگا۔ ان کے دل میں بڑی آرزوئیں تھیں۔ چاہتے تھے کہ ایسے بلند مرتبے پر فائز ہوں جہاں پر اس عہد میں کسی کی بھی رسائی نہ ہو۔

فارس سے اس نیت سے طلب کرلئے گئے تھے کہ دیوان میں انھیں کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کر دی جائے گی تاکہ وہ اس ذریعے سے زندگی بسر کرنے کا سروسامان مہیا کر سکیں۔

اتفاق سے ایک دن خلوت کے کوچہ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ پایۂ تختِ خلیفہ میں اُن کو وہ زیبائی نظر نہ آئی جو خود اُن کے شہر میں تھی، لیکن پھر بھی اس کا لپسند کرنا ناگزیر تھا۔ لیکن اُس دن بغداد کی قدر اُن کی نگاہ میں بڑھ گئی جس دن ایک حسینہ سے اُن کی ملاقات ہو گئی۔

ایک حسین لڑکی ایک باغ سے نکل کر پریشان حال اور برہنہ پا ایک پرندے کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ پرندہ جو تھکا ماندہ دیوار سے ٹکرا گیا اور آڑھا ترچھا اڑنے لگا۔ اِدھر سے اُدھر یا تو ایک دو گز کی بلندی پہ دیوار سے ٹکرا جاتا تھا یا چھپنے

کی غرض سے کسی گوشے میں دبک جاتا تھا۔

لڑکی بڑی حسین تھی۔ لمبا چوڑا پیراہن زیب بدن تھا۔ گُندھی ہوئی چوٹی کمر تک لٹک رہی تھی۔ بائیں طرف بالوں میں سفید رنگ کا ایک پھول لگا ہوا تھا۔ اس کے نازک بدن کی سادگی اور زیبائی دیکھ کر مقلہ کے جوان قلب میں ایک گُدگُدی سی پیدا ہوئی۔ آگے بڑھے اور اپنا رومال اس پرندے پر ڈال کر اُسے پکڑ لیا اور آہستگی سے رومال کے اندر سے نکال کر اُس لڑکی کے ہاتھوں میں دے دیا اور کہنے لگے۔ "اے پیاری لڑکی۔ ذرا دیکھ تو اس پرندے کا دل کیسا تڑپ رہا ہے۔ اسے میری خاطر سے آزاد کر دے۔ میں اس کے عوض میں تجھے ایک دوسرا پرندہ دوں گا جو تجھے بہت دوست رکھے گا۔"

اس لڑکی نے یہ سنتے ہی اس پرندے کو پیار کر کے ہوا میں چھوڑ دیا۔ پرندہ تو خوشحال ہو کر اڑ گیا اور لڑکی نے شرم آلود مگر متجسس نگاہ سے ابنِ مقلہ کی جانب دیکھا۔ گویا وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ پرندہ جس کے دینے کا وعدہ کیا گیا ہے کہاں ہے؟

ابنِ مقلہ نے کہا "اے دخترِ زیبا ذرا اپنا نام تو بتا۔"

اس نوجوان لڑکی نے اپنے لب ہائے زیبا سے شیریں لہجے میں کہا "مجھے وسیمہ کہتے ہیں۔"

ابنِ مقلہ نے وسیمہ کا ہاتھ پکڑ کر کانپتی ہوئی اور نیم ناامید اور مہر و درد سے بھری آواز میں کہا۔

"وسیمہ، میں اپنے دل کے پرندے کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ ساری عمر تجھے دوست رکھوں گا۔ اگر تو نے دلداری کی تو میں اسی بغداد میں تیرے لئے ایک بے نظیر باغ لگا دوں گا جس میں جملہ اقسام کے پرندے مہیا ہوں گے۔"

وسیمہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور چلتی ہوئی۔ باغ کے پھاٹک پر پہونچ کر ذرا ٹھہری اور ابنِ مقلہ کی طرف دیکھا۔

نوجوان مقلہ اس شخص کی طرح جسے ٹھیک پتہ نہ ہو کہ امیدوار رہنا چاہیئے یا ناامید ہو جانا چاہیئے اپنی جگہ پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور آتش باز نگاہوں سے وسیمہ کے قدِ زیبا کو تکتے رہے۔ وسیمہ نے اپنے بالوں سے پھول نکال کر محمد مقلہ کی طرف اُچھال دیا اور جب دیکھا کہ مقلہ کے ہاتھوں میں آ گیا تو ہنس کر بولی۔ "اگر لینا ہے تو مجھے میرے والد سے مانگو۔"

اپنے کارہائے متعلقہ میں پورے طور پر مشغول ہونے سے پہلے ہی مقلہ نے وسیمہ کی خواستگاری کی۔ وسیمہ کے مقلہ کے گھر آتے ہی ان کے کاموں میں ترقی ہونے لگی۔ دُور دُور سے لوگ خط سیکھنے کی غرض سے بغداد آنا شروع ہوئے اور ان کی بزرگی کی شہرت اطراف و جوانب میں پہنچنے لگی۔ ان کا مکان ہنرمند اور ہنردوست لوگوں سے بھرا رہنے لگا۔ دانش مند لوگ اُن کے معتقد ہو گئے۔ ان کو مقلہ کے چہرے پر درخشانی کے آثار نظر آنے لگے۔ خط نگار اور خوش نویس لوگ اُن کے گھر پر آ کر ہنر سیکھتے۔

باوجود اس مشغولیت کے جو مقلہ کو اُن اداروں کے کاموں میں رہتی جو اُن کی سپردگی میں تھے اور اُن مراجعات کے جو مختلف طبقے کے لوگوں کے اُن کی جانب رہتے تھے مقلہ نہ صرف زیادہ سے زیادہ کام اور کوشش کرتے بلکہ انتہائی شائستگی اور مہربانی و کشادہ دلی کے ساتھ لوگوں کے مرافعات انجام دیتے تھے۔ لوگوں کو اس درجہ راضی و خوش رکھتے تھے کہ وہ ہر مقام پر اُن کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اور ان کی طرح خلیفہ بھی مقلہ کے کاموں سے بہت خوش تھا اور روز بروز اُن کا جاہ اور مرتبہ بڑھاتا جاتا تھا۔ کبھی ان کے لئے خلعت بھیجتا تھا کبھی ان کے حوزۂ حکمرانی میں دوسری جگہوں کا اضافہ کرتا تھا۔

باوجود ان باتوں کے مقلہ کو اطمینان حاصل نہ تھا۔ برابر اسی دُھن میں لگے رہتے تھے کہ خط نویسی میں کوئی نہ کوئی جدت پیدا کریں۔ ان کو اپنے ہنر پر اعتماد تھا اور چاہتے تھے کہ اپنے فن میں شائستگی اور زیبائی پیدا کر دیں۔ ہمیشہ یہی فکر دامن گیر رہتی۔ انھیں ہنر اور مرتبے کی افزائی کا بڑا ارمان تھا۔

کئی سال کی زحمت اور مطالعے کے بعد ایک نیا خط اختراع کیا اور اس کا نام "نسخ" رکھا۔ یہ خط اگلے خطوں سے آسان تر اور زیبا تر تھا۔

خطِ نسخ کے لئے چار دانگ دَور اور دو دانگ سطح قرار دی۔ اس کام اور اس کے سیکھنے کی بنیاد نقطوں پر رکھی۔ اسی طرح بارہ قاعدے معین کئے تاکہ اس فن کا سیکھنا اور حاصل کرنا زیادہ آسان اور زیادہ عملی ہو جائے۔ یہ ساری زحمت اس لئے برداشت کی کہ شاگرد اس خط کے سکھانے والے ان کے بعد حرفوں کو اور ایک دوسرے کے ساتھ اس کے اندازے کو گھٹا بڑھا نہ سکیں۔

ابنِ مقلہ بڑے ذی ہوش تھے۔ جو لوگ ان کے ارد گرد رہتے تھے ان کو وہ خوب پہچانتے تھے اور ان کے کریم اخلاق اور عادات معلوم کرنے کی کوشش کرتے

تھے تاکہ خلوص کے ساتھ اُن سے میل ملاپ رکھا جا سکے۔ اسی صفت کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں ان کے دوستوں کی تعداد بڑھ گئی۔ نہ صرف ان کے احباب اُن سے محبت کرتے تھے بلکہ ابو عبداللہ اسمعیل زنجی، منشی مخصوص ابن فرات ایسے لوگ بھی اُن سے بڑی دلبستگی رکھتے تھے اور اُن کی ترقی و پیش رفت میں کسی قسم کی ہمدردی سے دریغ نہ رکھتے تھے۔

مقلہ ہر شخص کو دوست رکھتے تھے اور اگر کسی سے دل میں ناخوش بھی ہوتے تو بھی اس کو دوست بنائے رہتے۔ ان کی یہی کوشش رہتی کہ ہر شخص کو فائدہ پہونچایا جائے اور اس کی حاجت براری کی جائے۔

اس خاص صفت نے اُن کو اپنے زمانے میں سیاست میں بے نظیر بنا دیا تھا۔ اکثر حاجت مند اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کی کارداتی و کارگزاری نیکوکاری کا عام شہرہ تھا۔

ابوالحسن علی بن فرات کو جو اُس زمانے میں خلیفہ کا وزیر تھا، ابن مقلہ ایسے شائستہ اور کاردان شخص کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اُن کو طلب کر لیا۔ اس کے بعد جو کام وزیر کے سپرد ہوتے وہ ان کے حوالے کر دیتا۔ حکم دے دیا کہ لوگ اپنی اپنی حاجتیں ان کے پاس لے جایا کریں۔

اس زمانے سے مقلہ کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی لیکن وہ اتنے ہی سے راضی نہ تھے۔ اُن کی آرزو تھی کہ وہ بھی ہو یا اس سے پہلے خلیفہ کے بعد اسلام کی بزرگ شہنشاہیت میں اگر کسی کا درجہ اول ہو تو انھیں کا ہو۔

وزیر ابن فرات ان دشمنوں کی کوشش سے جو عرصۂ دراز سے پوشیدہ طور پر اس کی بد طرفی کے درپے تھے معزول کر دیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی زمانے کے بعد پھر وزیر ہو گیا۔ اُن لوگوں کو جنھوں نے اس کے خلاف اقدام کیا تھا گرفتار کر کے قید کر دیا انھیں میں سے ایک ابن مقلہ بھی تھے۔

یہ بڑی کاری ضرب تھی جو مقلہ کو پہونچی لیکن وہ آہنی ارادے کے شخص تھے اور ہر سختی کو حقیر سمجھتے تھے۔ جس کی فکر بلند اور ارمان بزرگ ہوتے ہیں وہ ہر دشواری و سختی کو آسان سمجھتا ہے۔ مقلہ گوشۂ زنداں میں بھی بیکار نہیں رہے بلکہ قرآن لکھا کئے۔ اسی نہج سے چند رسالے بھی لکھے غرض کہ اپنا وقت عزیز خط کی تکمیل میں گزارتے تھے۔ ان کو اپنی بے گناہی کا یقین تھا۔ اس لئے مطمئن تھے کہ جلد قید سے رہائی ہو گی۔

اُن کی بیوی وسیمہ بھی بیکار نہیں بیٹھی رہی ہمیشہ اپنے شوہر کی رہائی کی کوشش بھی ان کی رہائی کے اقدامات کرتا رہا۔ ابن فرات ہمیشہ تاک میں رہتا اور خود کو وسیمہ اور زنجی کے اقدامات سے بچاتا رہتا تھا۔ آخر کار ابن فرات کے دشمن مقلہ کے دوست ابن فرات کی معزولی میں کامیاب ہو گئے۔ خلیفہ نے ابن فرات کو مقید کر کے اپنے خادم خاص مونس کی نگرانی میں دے دیا۔ مونس کو وزیر سے عداوت تھی اس نے ابن فرات کو قتل کرا دیا۔

اس کے بعد علی ابن عیسیٰ وزیر ہوا۔ لیکن وہ عرصہ تک اس عہدے پر قائم نہ رہ سکا۔ خلیفہ نے اسے معزول کر کے ۳۱۶ھ میں وزارت ابن مقلہ کے حوالے کی۔

پھر کیا تھا۔ وزارت ملتے ہی ابن مقلہ اقتدار کی چوٹی پر پہونچ گئے اور دراصل خلیفہ کے بعد اسلامی ممالک میں سب سے اول ہو گئے۔ ثروت و اقبال، اقتدار و اختیار نے اُن کے قدم چومے۔ اب اس حالت میں انھیں اُس بڑی آرزو کی انجام دہی کا خیال ہوا جو انھوں نے ایک زمانے میں وسیمہ کے متعلق سوچ رکھی تھی۔ چنانچہ ایک بڑا اور وسیع باغ نصب کرایا جس میں ہر قسم کے بے شمار درخت اور طرح طرح کے پھولوں کے پودے لگائے گئے۔ بڑے بڑے پنجروں میں رنگ برنگ کے پرندے پالے گئے۔ دنیا بھر کے صحرائی و دریائی جانور فراہم کئے گئے۔ جو مہمان یا بڑے بڑے لوگ اس "فردوس" نام باغ کو دیکھنے آتے تھے اس کے نظارے سے سیر نہ ہوتے تھے۔ سب سے بڑی موفقیت جو اس زمانے میں کسی کو نصیب ہو سکتی تھی وہ مقلہ کو حاصل تھی۔ یہ باغ جو مقلہ نے لگایا تھا سب سے پہلا اسلامی باغِ وحش (ZOO یا زندہ عجائب خانہ) تھا۔ ہر مقام پر اس باغ کا چرچا رہا کرتا تھا ہر شخص کو مقلہ کے باغِ فردوس کے دیکھنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ یہاں تک کہ دور دراز مقامات سے لوگ اس بہشت نما باغ کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ اقبال مند ایرانی جب اپنی عزیزہ وسیمہ کو خوش نما پرندوں کے جھرمٹ میں دیکھتا تھا تو خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا۔ وسیمہ روزانہ اپنے بیٹے ابوالحسن کو ساتھ لئے باغ میں ٹہلا کرتی تھی یا اُن خواتین سے ملاقات کرتی تھی جو وہاں سیر کے لئے آتی تھیں۔ وسیمہ کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ اس کے شریکِ حیات نے اس کے لئے ایک ایسا بے مثل باغ نصب کرایا جس کا چرچا ہر اسلامی ملک میں ہوا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ بغداد کی سب سے زیادہ سرفراز خاتون تھی۔

افسوس کہ تھوڑے ہی زمانے کے بعد مقلہ کو اس سارے جاہ و جلال سے

اُن سے عداوت تھی۔ لیکن چوں کہ ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ تنگ چشم لوگ دوسروں کی خوبیوں کو جلد فراموش کر دیتے ہیں اسی بنا پر اطراف کے لوگ ان کی ترقی و افتخارات سے بہ تنگ آ گئے تھے۔ چوں کہ ان کو ہنر و کمال میں یگانہ، مرتبہ میں اوّل اور ذوق و سلیقہ میں بے نظیر دیکھتے تھے ان کے ہوش و استغنا پر حسد کرنے لگے اور خلیفہ کی بارگاہ میں ان کے خلاف سخن چینی شروع کر دی۔ نتیجے کے طور پر خلیفہ نے ان کو معزول کر کے بغداد سے نکال دیا۔ مقلہ اپنی بیوی و ہمشیرہ اور اپنے بیٹے ابوالحسن کو لے کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔

اس کے بعد مقلہ کئی سال تک فارس میں رہے اور اپنی ہمشیرہ اور اپنے بیٹے کے علاوہ اپنے فنِ خوش نویسی میں دل چسپی لیتے رہے۔ وہ بے کار نہیں بیٹھے شیراز میں بہت سے شاگرد تیار کرتے رہے۔

ایک روز بغداد سے ایک خط آیا جس میں انھیں پھر کارِ وزارت سنبھالنے کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں بغداد میں ایک ہنگامہ برپا ہو رہا تھا۔ لوگوں نے (خلیفہ کے خلاف) شورش برپا کر کے المقتدر کو قتل کر دیا تھا۔ اس کی جگہ پر القاہر باللہ خلیفہ ہوا۔ اسی نے مقلہ کو اپنی وزارت کے لئے طلب کیا تھا۔

مقلہ بغداد آئے اور پھر وزیر ہو گئے جس سے اُن کی حالت پھر سنبھل گئی۔ لیکن تھوڑے ہی زمانے کے بعد دشمنوں نے اُن کی بدگوئی شروع کر کے معزول کرا دیا۔ مقلہ بغداد میں روپوش ہو گئے اور مدت تک اسی حالت میں گذر کی۔ لیکن پھر بھی بے کار نہیں بیٹھے رہے۔ لوگ القاہر باللہ اور اس کے دربار سے ناراض تھے۔ چنانچہ پوشیدہ طور پر اس کے خلاف شورش برپا ہوئی۔ مقلہ اس کی آگ کو اپنے دامن سے ہوا دیتے رہے۔

مقلہ کے علاوہ ابنِ رائق بھی خلیفہ کے سخت مخالفین میں سے تھا۔ وہ بھی مقلہ کی طرح لوگوں کو انقلاب کے لئے آمادہ کر رہا تھا۔ اس کے دوستوں اور طرفداروں نے سازش کر کے خلیفہ کو نہ صرف گرفتار کر لیا بلکہ اندھا بھی کر دیا۔

اس کے بعد جو خلیفہ ہوا وہ محمد پسرِ المقتدر تھا جو ابنِ رائق کی تقویت سے منتخب ہو کر الراضی باللہ کے نام سے موسوم ہوا۔ الراضی مقلہ کی قابلیت سے بخوبی واقف تھا۔ اسی وجہ سے وزارت کے لئے ان سے بہتر کسی کو نہ پایا لہٰذا اس نے بھی مقلہ ہی کو وزیر بنایا۔ چناں چہ یہ فرزندِ بزرگِ شیراز تیسری بار پھر وزیر ہوا۔

پھر کیا تھا مقلہ کے دشمنوں کو حسد دامن گیر ہوا۔ ان کی معزولی میں رقیبوں میں سے ایک ابنِ رائق تھا جو خود وزارت کا متمنی تھا اور دوسرا؟ کا سوار امیر مظفر یاقوت جو مقلہ سے دلی رنج رکھتا تھا۔ چناں چہ مقلہ سے کو ناراض کر کے ایک روز جب وہ (مقلہ) دربار کو جا رہے تھے اُن کو گرفتار قید کر دیا گیا۔ عبدالرحمان عیسیٰ جو مقلہ کی جگہ پر وزیر ہوا ان کو بڑی بے رحمی تکلیف پہونچانے لگا۔ آخرکار دس لاکھ دینار کے علاوہ اور بہت سا مال لے کر مقلہ کو رہا کر دیا۔

مقلہ اپنے گھر واپس آئے اور دوست و بیگانہ سے قطع تعلق کر کے تنہا کی زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر ایک قرآن لکھنا شروع کیا لیکن ابنِ رائق نے اُ چین سے بیٹھنے نہ دیا۔

ابنِ رائق پھر وزیر ہوا۔ مقلہ سے کینہ رکھنے کے علاوہ اُسے ہمیشہ کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا تھا۔ سمجھے ہوئے تھا کہ مقلہ تنہا اُسے برطرف کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اپنے قوی دشمن اور رقیب کو شکست دینے کی غرض سے پہلے اُن کی املاک کی ویرانی کا حکم دیا۔ اس کے بعد اُن کی مزروعی جائداد بھی ضبط کرا مقلہ نے خلیفہ کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجی جس میں ابنِ رائق کی شکایت کے علاوہ خلیفہ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ ابنِ رائق نے اس خیال سے کہ ایسا نہ مقلہ خلیفہ سے ملتے ہی اُسے اپنے نفوذ سے رام کر لے اور اُسے ابنِ رائق سے ناراض کرا دے، پیش دستی کر کے زرِ کثیر خلیفہ کی خدمت میں نذر کیا۔

الراضی کی نظر جو اس سامنے زر و جواہر پر پڑی تو مارے خوشامد کے مقلہ کا خط ابنِ رائق کو دکھا دیا۔ اس میں مقلہ نے لکھا تھا کہ اگر خلیفہ مجھے وزارت دے کرے اور ابنِ رائق کے جان و مال پر اختیار دے دے تو میں خلیفہ کو تین کروڑ دینار اس سے وصول کرا دوں گا۔ ابنِ رائق نے جو خط پڑھا تو اسے مقلہ سے انتقام کی فکر دامن گیر ہوئی۔ خلیفہ سے مقلہ کا ہاتھ قلم کرا دینے کی اجازت چاہی، لیکن خلیفہ نے اسے پسند نہ کیا حتیٰ کہ اور لوگوں نے بھی جو اس وقت بھی خلیفہ کی خدمت میں حاضر تھے اس خواہش سے رنجیدہ ہو کر کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہوگی اگر ایسے نابغہ اور ہنرمند کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔"

باوجود اس کے ابنِ رائق نے خلیفہ کو اس بات پر آمادہ کر ہی لیا۔ اور مقلہ کا ہاتھ کٹوا کر ان کو قید کرا دیا۔

دو روز کے بعد خلیفہ کو اپنے فعل پر شرمندگی دامن گیر ہوئی۔ بغداد کے مشہور

بیب ابوالحسن ثابت کو مقلہ کے علاج کے لئے بھیجا۔ افسوس کہ دیر ہو گئی تھی۔ جب بیب اس پیش آمد پر اظہار افسوس کر رہا تھا مقلہ نے بچشمِ پُرنم اپنا کٹا ہوا ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اسی ہاتھ سے میں نے تین خلفاء کی خدمت انجام دی۔ دو دفعہ میں دو بار قرآن لکھا اور بڑی زحمت و کوشش کے بعد میں نے ایک ایسا خط ایجاد کیا جس سے ساری دنیا کو لکھنے کی دشواریوں سے چھٹکارا مل گیا۔ لیکن افسوس کہ میرا ہاتھ چور کے ہاتھ کی طرح کاٹا گیا۔

ابوالحسن نے تشفی دلا کر کہا۔ "افسردہ خاطر نہ ہوں۔ یہ آخری تکلیف ہے جو آپ کو پہونچی ہے۔"

مقلہ نے کہا۔ "ابھی مجھے زندگی سے سیری نہیں ہوئی ہے۔ میں وہ آدمی نہیں ہوں کہ زمانہ مجھے پستی و بلندی اور موافقت و عدم موافقت کا مزہ چکھائے میں اپنے حاسد کے حق میں آگ ہوں۔ اگر وہ دم مارے اور اپنے دوستوں اور قرابت داروں کے حق میں پانی ہوں۔"

پھر ذرا دیر کے بعد ایک آہِ سرد بھری اور کہا۔ "آہ، اے زندگی، جب میرا ہاتھ کٹ گیا تو تُو بھی مجھ سے جُدا ہو جا، اس لئے کہ اس کے بعد مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے خاص اور محبوب ہُنر سے دل چسپی رکھ کر دُنیا کے جھگڑوں سے نجات حاصل کروں۔ بغیر ہُنر کے زندگی کس درجہ تلخ و دشوار ہوتی ہے۔"

ابوالحسن نے تشفی دلا کر کہا۔ "امیدوار ہوں کہ قسمت پھر آپ کی رہبری کرے اور جلد یہ ذلت مبتدل بہ عزت ہو جائے۔"

یقیناً ہُنرمند کے لئے زندگی بغیر ہُنر کے تلخ و دشوار ہوتی ہے۔ چونکہ مقلہ بغیر ہُنر کے زندہ نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا ہاتھ کا زخم پورے طور پر مندمل نہ ہو پایا تھا کہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ وہ ہاتھ کٹ جانے کے بعد بھی آسودہ نہ بیٹھ سکے۔ قلم بازو سے باندھ کر پھر پہلے کی طرح لکھنا شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُن کے خط نے پھر وہی سابقہ زیبائی حاصل کر لی اور پھر وہی گزشتہ کمال و شکوہ اُن کے خط میں نظر آنے لگا۔ دنیاوی رنج کو بھلا کر پھر تیسری بار قرآن لکھنا شروع کیا۔ اسی طرح بائیں ہاتھ سے ایسے خطوط اور رسالے لکھے کہ لوگ ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ پھر مقلہ کے خط کا شہرہ چاروں طرف پھیل گیا۔ ہر انجمن میں مقلہ اور اُن کی ہُنرمندی کا تذکرہ ہونے لگا۔ کسی شاعر نے کہا تھا۔ "اُن کا ہاتھ کاٹا گیا تو قلم کے ڈر سے نہ کہ شمشیر کے خوف سے۔ لیکن اُن کی رائے اور ہوش کو نہ کاٹ سکے۔ ان کے دشمنوں کو رات کی نیند حرام ہو گئی تھی اور حاسدوں کے دن کا چین۔ اُن کے ضمیر کی آنکھ کور ہو گئی تھی۔"

ابنِ رائق سب سے زیادہ اُن سے ناراض اور پُر وحشت رہتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ اس کا بڑا اور زبردست رقیب مقلہ کہیں پھر عہدۂ وزارت پر پہونچ نہ جائے اور غالب آ کر اس کو دبا لے۔ اس لئے حیلے تراشے، نہ صرف اُس نے بلکہ مقلہ کے تمام بدخواہوں نے۔ رات دن خلیفہ کے کانوں تک یہ خبر پہونچاتے رہے کہ مقلہ کے سر میں پھر سرداری کا سودا سمایا ہے اور اگر اس مرتبہ پھر وزیر ہو گیا تو پھر اس کی چالوں سے بچنا دشوار ہو جائے گا۔

راضی باللہ نے اپنا ایک نمایندہ مقلہ کے پاس بھیجا تاکہ اظہارِ دلجوئی کے بعد یہ پیغام پہونچائے کہ جو تکلیف تمھیں پہونچی میں اس سے راضی نہ تھا اور اب پشیمان ہوں۔ اگر کہو تو میں تلافیٔ مافات کرا دوں۔ اور اگر معلوم ہو جائے کہ تمھیں پھر وزارت کی خواہش ہے تو میں وہ بھی تم کو دے دوں گا۔ لیکن چوں کہ داہنا ہاتھ کٹا ہوا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ تم کام سے عہدہ برآ نہ ہو سکوگے۔

خلیفہ نے یہ پیغام ابنِ رائق اور مقلہ کے دشمنوں کے ایما سے بھیجا تھا۔ گو مقلہ کو اشتباہ لاحق ہوا لیکن یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے خلیفہ نے سچ کہا ہو جواب میں کہا۔ "اگر ہاتھ کٹ گیا ہے تو کیا پروا۔ میرے دل و ہوش و عقل کو تو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اس کے علاوہ میں بائیں ہاتھ سے بھی ویسا ہی لکھ سکتا ہوں جیسا کبھی داہنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ اب اپنی کہنی کی مدد سے لکھنے پر بخوبی قادر ہوں۔ مزید براں میں نے بہت سے کاتب اور منشی تیار کر لئے ہیں جو کام کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔"

جب یہ جواب خلیفہ کو پہونچا تو حاضرین نے موقع غنیمت سمجھ کر پھر مقلہ کی بدگوئی شروع کی اور خلیفہ کو ان کی طرف سے بدگمان اور غضبناک کر دیا۔ چناں چہ اُسی دن خلیفہ الرّاضی نے ممدوح مقلہ کے قتل کا حکم صادر کیا۔ اُن کی لاش اسی زندان میں دفن کر دی گئی۔

کچھ دنوں کے بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ ان کی لاش قید خانے کی قبر سے نکال کر گورستان میں دفن کی جائے۔ مقلہ کی بیوی دسیمہ نے جو اپنے شوہر سے عرصۂ دراز سے جُدا رہ چکی تھی خلیفہ سے درخواست کی کہ اُسے اجازت دی جائے کہ اس کے شوہر کی لاش گورستان سے نکال کر خود اُسی کی خاص عمارت میں دفن

کی جائے۔ خلیفہ نے درخواست منظور کرلی اور تیسری مرتبہ اس بزرگ ہنر مند کی لاش اسی کے باغِ خانگی میں سپردِ خاک کی گئی۔

محمد مقلہ ۳۲۸ھ میں ۵۶ سال کی عمر میں زنداں میں قتل کئے گئے۔ تین مرتبہ وزیر ہوئے۔ تین مرتبہ مکمل قرآن لکھا۔ تین خلیفہ کے وزیر رہے اور تین ہی مرتبہ ان کی لاش سپردِ خاک ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ محمد مقلہ ایک بزرگ ہنر مند تھا جس کے مرہونِ احسان وکرم نہ تنہا کشورِ ایران بلکہ عالمِ اسلام اور تمام وہ لوگ ہیں جو آج کل خطِ نسخ لکھتے ہیں اس لئے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنی کوشش اور جدّت سے خط کو اُن بے شمار مشکلوں سے نجات دلادی جو لکھنے پڑھنے میں پیش آتی تھیں۔ خط میں نہ صرف آسانی بلکہ زیبائی بھی پیدا کردی۔ (ماخوذ از ہفت چہرہ سش پرتو)

اعشاری نظام کیا ہے ؟

۱۔ یہ دس کی اکائی پر مبنی ہے۔ اعداد کو دس میں لکھنے کا طریقہ بھارت ہی کی ایجاد ہے۔

۲۔ اعشاری نظام میں وزن (ٹھوس) وزن (رقیق) اور ناپ کے لئے کلوگرام، لیٹر اور میٹر کو بنیادی اکائی مانا گیا ہے۔ ان کے نیچے کی اکائیاں حسبِ ذیل۔

ناپ۔ ا میٹر = دس ڈیسی میٹر، ا ڈیسی میٹر = دس سینٹی میٹر،
ا سینٹی میٹر = دس ملی میٹر۔

وزن۔ (ٹھوس) اکلوگرام = دس ہیکٹوگرام، ایک ہیکٹوگرام = دس ڈیکاگرام
ایک ڈیکاگرام = دس گرام

وزن (رقیق) ایک لیٹر = دس ڈیسی لیٹر، ایک ڈیسی لیٹر = دس سینٹی لیٹر۔
ایک سینٹی لیٹر = دس ملی میٹر۔

۳۔ موٹے حساب سے ایک میٹر ایک گز کے لگ بھگ، ایک کلوگرام ایک سیر کے قریب اور ایک لیٹر (رقیق چیزوں کا) کوئی سیر بھر ہوتا ہے۔

۴۔ ناپ اور تول کا اعشاری نظام قائم کرنے سے پہلے ملک میں اعشاری سکے بھی ڈھلے جا رہے ہیں۔ جس کے حساب سے ایک روپیہ ایک سو نئے پیسوں کے برابر ہوگا۔ ہم سات روپے اور پینتیس پیسوں کو اس طرح لکھ سکیں گے۔ ۳۵، ۷ پیسے یا ۷.۳۵ روپے موجودہ طریقے سے اسی رقم کو اس طرح لکھا جائے گا۔ ۷ روپے ۸ آنے ۹ پائی۔

جوگندر پال

یہ ڈرامہ وُہ ڈرامہ

"پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" ہکسلے کے ناول کی طرف اس نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، جی میں آیا کہ سب کچھ چھوڑ کر اسے پڑھنا شروع کر دے مگر کل ریڈیو اسٹیشن کو ڈرامے کا مسودہ ارسال کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں سے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آخر کیا لکھے۔

"رومی کے ڈرامے شاید اچھے ہی ہوں دایا بھائی، مگر انھیں سُن کر میرے پلّے تو کچھ بھی نہیں پڑتا" رام سنگھ نے پرسوں اُس کی موجودگی میں دایا بھائی کو کہا تھا۔ "کہو، رومی، تم خود تو اپنے ڈراموں کو بخوبی سمجھ لیتے ہوگے۔" سب خالی خالی قہقہے لگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

رومی خود کو کوسنے لگا کہ میں کیوں دو گھنٹوں سے بیٹھا ان لوگوں کے لئے مغز ماری کر رہا ہوں جن کی ناقدرشناسی کے مدِّ نظر کسی فن کار کے لئے خونِ جگر سے اپنے آرٹ کی پرورش کرنے کی بجائے یہی مناسب ہے کہ وہ وسکی ملی کافی کے کڑوے گھونٹ پیتا ہوا انھیں فحش لطیفے سنا کر خوب ہنسائے اور ان کے ذہن کے موٹاپے پر خود بھی ہنستا چلا جائے۔

"تم خود دراصل بے وقوف ہو رومی" راندر نے اُسے ایک دن کہا تھا۔ "یہاں آرٹ وارٹ کو پوچھتا ہی کون ہے۔ کامیاب دوکانداروں کی طرح بازار میں جس چیز کی طلب ہو وہی چیز اپنے گاہکوں کو پیش کرو۔ شے کی اصل قیمت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ درحقیقت سوال لوگوں کی پسند کا ہے۔ اگر وہ بے وقوف ہیں تو انھیں اور بے وقوف بناؤ، وہ بھی خوش، تمھارے دام بھی دگنے، باقی رہ گئے آرٹ اور ضمیر، ان دو کو بڑے اطمینان سے پڑیا میں باندھ کر جلتے ہوئے چولہے میں پھینک دو کہ انھیں کبھی کوئی دیکھ بھی نہ پائے۔"

برابر کے کمرے سے اپنے بچّے کے بے اختیار رونے کی آواز سُن کر رومی چونک اُٹھا۔

"ارے بھئی کیا ہوا ہے؟" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اونچی آواز میں پوچھا۔

"یہ پپو تو میری جان لے کر چھوڑے گا۔" اس کی بیوی نے چلّاتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت تنگ کرتا رہتا ہے۔"

رومی اپنے چیختے ہوئے بچّے اور بوکھلائی ہوئی بیوی کا تصوّر باندھے ایک پھیکی سی ہنسی ہنس کر پھر اپنے ڈرامے کی طرف متوجہ ہو گیا، سامنے رکھے ہوئے خالی اوراق پر اُس نے ابھی تک ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ ڈرامے لکھنا اب میرے بس کا روگ نہیں رہا، یہ بھی کیا ہُوا کہ کوئی گھنٹوں بیٹھا رہے اور اُسے لکھنے کی کوئی بات نہ سوجھے، کہانیاں اور ڈرامے لکھنا تو ایک خدا داد عطیّہ ہے، یہ کوئی پوریاں بیلنا نہیں کہ جتنی دیر بیٹھو اتنی ہی زیادہ پوریاں بیل لو۔ اگر میں حقیقی فن کار ہوں تو مجھے اپنے فن کے اظہار میں اتنی دقّت کیوں پیش آتی ہے؟ دنیا میں ہزاروں اچھوتے موضوعات موجود ہیں، آرٹسٹ کی خاطر تو فرشتے خود کہیں سے بنی بنائی چیزیں لئے آن موجود ہوتے ہیں۔"

رومی کو اپنے اسلوبِ فکر پہ خود ہی ہنسی آگئی۔ "فرشتے بنی بنائی چیز لئے فن کار کے سامنے آن موجود ہوتے ہیں۔" اُس نے طنزاً دہرایا۔ "ہو نہ ہو کئی نقّادوں کو بھکنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے؟ اپنی کھوکھلی اور بے بنیاد باتیں یہ لوگ تنقید کے اعلیٰ رموز میں شمار کرتے ہیں۔ اگر میرا بس چلے تو ادب میں ایسی سطحی تنقید کی تمام کتابیں یکسر جلا دوں، میدانِ ادب میں تمام نااہل لوگ نام نہاد نقّاد بن جاتے ہیں اور برسات کے کئی معمولی نالوں کی طرح چاروں طرف شور مچاتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی تیسرے درجے کے فن کار کو واہمی باتیں بنا بنا کر آسمان پہ

جا ٹھلتے ہیں اور حقیقی فن کار کو اپنے دقیانوسی معیار سے مختلف پا کر اُس کی تضحیک پر اُتر آتے ہیں۔"

"کیٹس" رومی سوچنے لگا " وہ نوجوان، خوبصورت جوانمرگ شاعر، یہی لوگ تو شاعری کے اُس عظیم الشان دیوتا کے قائل تھے "ہر خوبصورت شے جاودانی مسرّت کی حامل ہے"" رومی حسن کے خالق کیٹس کی نگاہ سے جہان کی تمام حسین چیزوں کی قربت محسوس کرنے لگا، یہ خوبصورت آہو چشم عورت اپنی ڈگمگاتی ہوئی مست آنکھوں میں بے تحاشہ تمناؤں کا جال بچھائے ہوئے ہے، اس کے گھور سیاہ لانبے لانبے ریشمیں گیسو رومی کے مُنہ کو چھو رہے ہیں، اس کی مخملیں باہیں رُومی کی گردن پہ لے شعلہ سی لٹکی پڑی ہیں۔ آبشاروں سے اُٹھتی ہوئی گیلی، تازہ اور حیات بخش موسیقی سننے کے لئے سارا عالم اپنے کام روک کے ہمہ تن گوش بنا کھڑا ہو گیا ہے جیسے کوئی غسل کر کے گنگناتی ہوئی سامنے سے آتی کسی شگفتہ نوجوان حسینہ کو دیکھ کر دم بخود کھڑا رہ جاتا ہے اور اس کے بدن کی سندرتا سے پھوٹتی ہوئی خاموش راگنیوں کو کبھی اپنے کانوں سے سنتا ہے اور کبھی آنکھوں سے۔

زندگی حسن ہے، حسن، عورت، اور عورت، عورت! یکایک آبشاروں کی گیلی موسیقی کی آواز دُور چلی گئی، رومی سوچنے لگا " اور عورت، چار بچّوں کی ماں" رومی کی اپنی بیوی اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی، رومی کی بیوی، چار چلاتے ہوئے بچّوں کی ماں، رومی کی بیوی ایک بچّے کو دھمکا رہی ہے "خبردار، جو اب بھاگ کر ادھر سے گزرا، کم بخت نے میرے کندھے چھیل دئے ہیں" رومی کی بیوی دوسرے بچّے کو پچکار رہی ہے "پی لو بیٹا، پی لو، ٹھنڈا ہو جائے گا دودھ پھر" رومی کی بیوی اپنے کسی بیمار بچّے کے سرہانے منہ لٹکائے غمگین سی بیٹھی ہوئی ہے، اُسے خود کئی روگ لگے ہوئے ہیں لیکن رومی کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ اُس کی بیماریوں کا باقاعدہ علاج کروا کر کیٹس کی شہزادیوں کے دکتے ہوئے رخساروں کی طرح اس کے چہرے پر بھی دو سُرخ سُرخ سیب لا رکھے۔

"اور عورت، عورت" رومی کا تخیل گویا جھٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ "عورت میری بیوی ہے، میری سوکھی ہوئی بیمار بیوی، جو بتیس سال کی عمر میں پچاس سالہ بوڑھی سی نظر آنے لگے گی۔ اس کے بال سفید ہو جائیں گے اور طبیعت چڑچڑی"۔ رومی نے دیکھا کہ جگمگاتی ہوئی شاہراہوں سے پرے اس کی زندگی ایک تاریک اسٹر اور لمبی پگڈنڈی کی طرح پھیلی ہوئی ہے جو موت کے نکتے کی طرف ہوتے ہوتے رینگتی چلی جاتی ہے۔

وہ اپنے ڈرامے کو قطعاً بھول کر سوچ رہا تھا کہ زندگی کی تلخ اصلیت کو شاعر نے اس قدر دل کش رنگوں میں کیوں چھپا رکھا ہے! کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انسان بچّوں کی طرح ہمیشہ ان خوش نما رنگوں کے سراب میں کھوئے رہیں۔ افلاطون نے ٹھیک ہی کیا تھا کہ شاعروں کو اپنے جمہوریہ میں کوئی جگہ نہ دی، اس کے نزدیک شاعری اصلیت کی نقل ثانی کے مترادف ہے، لہٰذا حقیقت سے دو بار علیحدہ ہو کر اس کا مسخ ہو جانا لازمی ہے۔ شاعری یا کسی بھی اور فنِ لطیف کی بنیاد جھوٹ پر ہے جس عمارت کی بنیاد ہی کھوکھلی ہو اس کی طرزِ تعمیر لاکھ دل کش ہو مگر وہ پائدار نہیں ہو سکتی۔

"یہ ڈرامے لکھنا بھی ایک جنجال ہی تو ہے" رومی کو یاد آیا کہ اس نے ابھی تک اپنا ڈرامہ لکھنا شروع بھی نہیں کیا۔ اُسے خیال آیا کہ اگر میں مصنّف بننے کی بجائے کسی عام کام کاج میں اس قدر دلچسپی لیتا تو کتنا کامیاب انسان ہوتا۔

"رومی، ڈرامہ نویس!"

"ہا ہا۔ ہہ ہا" باہر ساری دنیا قہقہوں سے گونج رہی تھی اور وہ اندر بیٹھا ایک سستا سا سگریٹ لبوں میں دبائے اپنے ڈرامے کے لئے کوئی موضوع ڈھونڈنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔

رومی کی پُرانی خواہشات گویا اس کے اندر گرم پانی میں اُبلنے لگیں، یہ خواہشات ننھے منے بخارات بن بن کر اُس کے ذہن کی طرف اُمڈنے لگیں۔

اُس کی خواہش تھی کہ امیروں کی طرح اُس کا اپنا خوش نما مکان ہو، نوکر ہوں موٹر ہو اس کی بیوی کا چہرہ ہمیشہ اُداسیوں سے اجنبی اور مسکراتا ہوا نظر آئے، اس کے بچّے نہایت مسرور اور متمدّن ہوں اور وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے جس میں دن بھر میں زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کام کرنا پڑے، باقی وقت وہ فارغ سا بیٹھا جو چاہے کرے اور اگر چاہے تو کچھ بھی نہ کرے —— کچھ بھی نہ کرے، کچھ بھی نہ کرتے ہوئے بھی زندگی کے تمام سرو سامان مہیا ہونے کا خیال کتنا نشہ آور ہے۔

وہ کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی یونیورسٹی میں لیکچرار ہو گیا مگر جب تھوڑے عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں سرو سامان کی بہتات تو ایک طرف، ضروریات کا نبھانا ہی دشوار ہے اور کہ خود مرنے کے لئے پڑھنا دوسروں کو سکھانے کے لئے پڑھانے سے بہت مختلف ہے تو رومی وہاں سے نکل کر بزنس کی سوچنے لگا، کتابوں کا دھندا ٹھیک رہے گا بس پھر جناب نے جھٹ سے ایک بک شاپ

کھول لی۔ مگر میاں بھی وہی مصیبت پیش آئی، دکان کھول کر بڑے مزے سے آرام کرسی میں بیٹھے بیٹھے کتابیں پڑھتے۔ رہنا بہت بھلا لگنے کے باوجود ایک اور بات ہے اور کاونٹر پہ میٹھی میٹھی باتیں کرکے کتابیں بیچ سکنا ایک اور بات،

بُک شاپ بند کر دینے کے بعد رومی نے کئی ٹھوکریں کھائیں، آخر بیٹھ رہ مصنّف بن کر بیٹھ رہا۔ پیسہ کم ہوتا گیا، تقاضے بڑھتے گئے۔ بیوی کی صحت گرتی گئی، بچّوں کی تعداد زیادہ ہوتی گئی۔ اب رومی کو اچھوتے پلاٹ نہ سوجھتے، پھر بھی وہ اپنا قلم چلانے کے لئے بیٹھ جاتا۔ اس کی بیوی اپنے دائمی مرض کی وجہ سے سوکھ گئی مگر وہ اُسے یقین دلاتا رہتا کہ اس کی صحت لوٹ آئے گی۔ اس کے بچے گھر میں چیختے چلّاتے تو وہ پیدری شفقت کا سہارا لے کر اُن کی چیخوں کو زندگی کی موجودگی کی دلیل سمجھنے کی بے سود کوشش کرتا۔

"میری زندگی کی کہانی کسی بہکتے ہوئے شرابی کے الفاظ کی طرح اکھڑی اکھڑی ہے" رومی کے سامنے میز پر رکھے ہوئے خالی اوراق اس کا منہ چڑانے لگے "ڈرامہ کل ریڈیو اسٹیشن کو ڈرامے کا مسودہ بھیجنے کی آخری تاریخ ہے، ڈرامہ، تین پاؤنڈ، چلو، بچّوں کے جوتے ہی آجائیں گے" رومی اب ارادہ کرکے ڈٹ کر ڈرامہ لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ "مگر۔ مگر لکھوں کیا؟"

"پوائنٹ کاونٹر پوائنٹ" ہکسلے کے ناول کی کاپی پھر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر اُسے دعوت دینے لگی۔

"کالرج جب لکھنے بیٹھتا تھا" ہیزلٹ کے الفاظ اس کے دماغ میں اُبھر آئے "تو دنیا بھر کے غیر فانی لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے مقابلے میں اُسے اپنی نظم لکھنے کا خیال بہت ادنےٰ معلوم ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت کم لکھا مگر عالم بھر کے لٹریچر کو اپنی ہی تخلیق سمجھتے ہوئے بہت زیادہ پڑھا۔"

"تین پاؤنڈ، بچّوں کے جوتے، ڈرامہ، مگر کیا لکھوں؟ مجھے آج کچھ سوجھ ہی نہیں رہا۔"

رومی نے جھنجھلا کر خالی اوراق کو پرے جھٹک دیا اور سگریٹ سُلگا کر بڑے اطمینان سے 'پوائنٹ کاونٹر پوائنٹ' کو پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

ضروری نوٹ

غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ واپسی کے لئے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ مضمون کے ساتھ ہوگا۔

سیّدہ فرحت

خواب حقیقت بن سکتے ہیں؟

خواب حقیقت بن سکتے ہیں ساتھی تیرا قول بجا ہے
خواب ہیں اپنا عکسِ تخیّل حسنِ تخیّل رُوح فزا ہے

ساتھی! لیکن خواب کی اکثر اُلٹی ہوتی ہیں تعبیریں
قیدی خواب رہائی دیکھے دُہری ہوتی ہیں زنجیریں

خواب کی وادی بھول بھلیّاں اس میں اکثر کھو جاتے ہیں
فکر کا حاصل خواب اگر ہوں، ذہن ہمارے سو جاتے ہیں

خواب میں چھلکیں لاکھوں ساغر تشنہ لبی کو کم نہ کریں گے
خواب کے یہ خوشرنگ مناظر ہلکا اپنا غم نہ کریں گے

جیون کی اس کڑواہٹ کو کم نہ کریں گے میٹھے سپنے
خواب میں موتی کون پرُوئے، بکھر رہے ہیں جیون اپنے

خواب کی باتیں کون سُنے گا جاگ رہا ہے اب تو انساں
راہِ حقیقت اس پہ کھلی ہے، ذوقِ سفر ہے دل میں فراواں

جاگ رہا ہے انساں لیکن، عام نہیں بیداری پھر بھی
خواب کا افسوں تھوڑا تھوڑا ذہنوں پہ ہے طاری پھر بھی

فن کاروں کا فرض ہے ساتھی سوئے ہوئے ذہنوں کو جگانا
راہِ عمل کو واضح کرنا، فکر و نظر کے روگ مٹانا

محمد رضا خاں

صنعتِ زرّیں

اس مضمون کے لکھنے والے محمد رضا خاں صاحب صنعتِ زردوزی کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ اسی صنعت کے موضوع پر آپ نے ایک مفصّل اور منقّش کتاب بھی لکھی ہے جو ابھی طباعت کی منتظر ہے۔ (ادارہ)

اللہ تعالیٰ نے جب دُنیا کو انسانوں سے آباد کیا تو اُن کی ضروریات کے پُورا کرنے کا علم بھی اُن کو بتدریج عطا فرمایا۔ اور وہ رفتہ رفتہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے قابل ہوتے گئے۔ رہنے کے لئے مکانات بنائے گئے۔ پیٹ بھرنے کو غلہ پیدا کیا گیا اور زراعت کی گئی۔ کام کرنے کے لئے اوزار بنائے گئے اور لڑنے کے لئے ہتھیار۔ معدنیات کی دریافت ہوئی۔ دولت و ثروت نے اپنا مقام پیدا کیا۔ طاقت اور دولت نے مل کر حکومت حاصل کی اور آرائش و زیبائش کی ضرورتیں پیدا ہونے لگیں تو انسان ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور استعداد کے مطابق اُن ضرورتوں کو پورا کرنے لگے۔ اس طرح جن لوگوں نے جو کام اختیار کیا وہ اُس میں مہارت حاصل کرتے گئے اور اُن کا ایک گروہ الگ قائم ہوتا گیا۔ اور اسی وجہ سے دُنیا میں ہر قسم کا کام کرنے والے اپنے اپنے کام اور پیشے کے لحاظ سے الگ الگ موسوم ہوتے گئے۔ اور اہلِ ہنر اور پیشہ وروں کے بے شمار گروہ قائم ہو گئے جو الگ الگ ناموں سے مشہور ہوئے۔

اِنھیں گروہوں میں سے ایک گروہ زردوزوں کا ہے جو آرائش و زیبائش کے کاموں کے لئے معرضِ وجود میں آیا۔ اگرچہ ابتدا میں یہ گروہ بہت قلیل تعداد میں تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس گروہ کی تعداد بڑھتی گئی۔ اب سے آٹھ دس سال قبل اندازہ تھا کہ ہندوستان میں تقریباً ایک لاکھ زردوز ہوں گے۔ لیکن آج ان کی تعداد کا اندازہ ہندوستان میں دو لاکھ سے کم نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس تعداد میں اچھے ہنرمند نصف کے قریب ہوں گے۔ باقی تعداد برائے بیت کے مصداق سمجھنا چاہیئے۔

اس صنعت یعنی فنِ زردوزی پر تاریخی طور پر کچھ لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ اس فن کو دنیا میں جاری ہوئے ہزاروں برس گزر گئے اور ہر زمانے میں اس کام کے کرنے والوں میں یقیناً ترقی ہوتی رہی۔ اور جیسے جیسے تمدن میں ترقی ہوتی گئی اس فن کی مقبولیت بھی زیادہ ہوتی گئی۔ شواہد یہ بتاتے ہیں کہ انسانی تقاریب و شادی کا کوئی موقع ایسا نہ رہا جس میں اس فنِ لطیف نے حصہ نہ لیا ہو۔ آرائش و ملبوسات کا کوئی حصّہ ایسا نہیں جو اس سے بچا ہو۔ دوپٹے ساڑیاں۔ دستار۔ ٹوپیاں۔ کلاہ۔ جمپر۔ قمیض۔ صدری۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ انگرکھا بلوز۔ کُرتے۔ شلوار۔ پائجامے۔ غرارے۔ اوڑھنی۔ سلیپر۔ سینڈل۔ ٹیبل کلاتھ۔ کُشن۔ گدیں۔ پالکی کے پردے۔ ہاتھی کی جھولیں۔ فرش۔ مسند۔ تکیے۔ شامیانے مورتیاں۔ مکٹ۔ شاہی تاج۔ فوجی وردیاں۔ بریجز۔ فوجی نشان۔ پرس۔ بلٹ۔ پلنگ کی چادریں۔ شال۔ دوشالے۔ رومال۔ پردے۔ طغرے۔ تصویریں مونوگرام وغیرہ بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو زردوزی کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہیں۔

ان تمام چیزوں کو دیکھ کر یا اُن کا حال معلوم کر کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ آیا یہ تمام کام ابتدا سے اب تک اسی طرح بنتے چلے آئے ہیں۔ یا ان کی نوعیت پہلے کچھ اور تھی؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ تمام چیزیں پہلے سے ایسی ہی بنتی چلی آ رہی ہیں۔ تو یہ بھی لازم آئے گا کہ ان چیزوں میں جو اجزا استعمال ہوتے ہیں وہ بھی پہلے موجود ہوں گے۔ اور اس بات کا یقین کے درجہ پر پہنچنا ذرا مشکل ہے۔ کیوں کہ اہلِ فن کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ اس کام میں استعمال ہونے والی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا زمانۂ سلف میں ہونا ناممکن ہے۔ مثلاً فرانس اور یورپ کے بنے ہوئے پلاسٹک کے پھول پتے اور ٹیکی۔ سکوئنس۔ پلاسٹک کا بنا ہوا بادلہ جس کو دفیہ کہتے ہیں۔ نیٹ سے کاٹے ہوئے پھول پتے۔ یورپ کے بنے ہوئے کپڑے کے نیچرل طرز کے پھول پتے، چیکوسلواکیہ کے موتی، جرمنی کی بنی ہوئی تانبے کی رنگین ڈاک۔ ہندوستان کا بنا ہوا سلمہ اور نیم زری وغیرہ کتنی ایسی چیزیں ہیں جن کا گزشتہ زمانے میں ہونے کا قیاس کرنا بھی عقل سے کوسوں دور ہے۔

ہزاروں برس کا زمانہ تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کو اگر سو برس پہلے

کی بنی ہوئی چیزوں کے کچھ نمونے کسی ریاست یا کسی میوزیم میں دیکھنے کو مل جائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ موجودہ اور سابقہ کاموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا کچھ مشکل نہیں کہ اس زمانے سے بھی پہلے جو کام بنتے ہوں گے وہ اس سے بہت مختلف ہوں گے۔ اسی طرح ہزاروں برس میں اس کی بناوٹ میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں، اس کو ماننا پڑے گا۔

باوجود اس یقین کے کہ زمانۂ سابقہ میں اس صنعتِ زریں کے اچھے اچھے ماہرین ہوئے جنھوں نے اس گلستانِ زردوزی کی آبیاری کر کے ہمارے لئے گلہائے رنگارنگ پیدا کئے اور اس کو ایسا سدا بہار بنا دیا جس سے قیامت تک لوگ فیض پاتے رہیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہئیں کہ اس فن کو ترقی دینے والے کون کون بزرگ تھے؟ انھوں نے کس کس زمانے میں کیا کیا کام بنائے؟ کس کس مال سے بنائے؟ کس کے لئے بنائے؟ تو اس کا ہمیں کوئی پتہ نہیں معلوم ہو سکتا۔ کیوں کہ اُن بزرگوں نے جنھوں نے اس صنعت کو ترقی دے کر ہم تک پہنچایا اس فن کی واقفیت اور گذشتہ ادوار کی صنعت اور بناوٹ کو جاننے کے لئے کوئی تحریری مواد نہیں چھوڑا۔

فنونِ لطیفہ میں سے اس سب سے زیادہ نازک و خوشنما صنعتِ زردوزی کے تحریری حالات اہلِ فن کی طرف سے نہ ہونے کے دو ہی سبب ہمارے ذہن میں آسکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ زمانہ سلف سے لے کر بیس پچیس سال پہلے تک اچھے اچھے فن کاروں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنا فن یا ہنر آسانی سے دوسروں کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔ بہت جانچ پڑتال کے بعد اپنا جوہرِ فن اپنے شاگرد کو بتلاتے تھے (ایسے لوگ اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں) تو ایسی حالت میں بھلا وہ کوئی کتاب لکھ کر یا صنعتی نکات و حالات کیسے شائع کر سکتے تھے۔

دوسرے یہ کہ اس فن کے جاننے والوں کے لئے تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یعنی اس کام کے کرنے والوں کے لئے کبھی یہ شرط نہیں رکھی گئی کہ اس قدر تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ کام کر سکتا ہے۔ اس لئے بے پڑھے لکھے لوگ ہی اس کام کے کرنے والے زیادہ ہوئے پھر ایسے لوگوں سے یہ اُمید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ کچھ لکھ کر ہم تک پہنچا سکتے۔ رہا اُس وقت کے غیر زردوزوں کا اس فن پر کچھ لکھنا وہ تقریباً ایسا ہی حال ہوتا جیسا اب بھی ہمیں تحریری طور پر کچھ ملتا ہے۔ کیوں کہ کسی فن پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے اُس فن کا جاننا بھی لازمی ہے۔ ورنہ ضرور اس میں خامیاں رہیں گی۔

عہدِ مغلیہ کی لکھی ہوئی اکثر تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ لیکن وہ زردوزی کا سرسری ذکر سمجھا جا سکتا ہے۔ جس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے، کہ فلاں وقت میں زردوزی ہوئی۔ اس سے زیادہ کچھ حالات معلوم نہیں ہوتے۔

اس بات کا تو ہمیں اعتراف ہے۔ کہ یورپین حضرات نے بہت کچھ لکھا ہے اور اُس سے ہم نے استفادہ بھی کیا ہے۔ یورپین حضرات کو جو نمونہ کہیں سے دست یاب ہوا اُس کی خوب تحقیق کی اور اس کا حال تصریح سے لکھا کہ یہ فلاں وقت میں بنایا گیا اور اس چیز سے بنایا گیا نیز اُس کا فوٹو بھی شائع کیا اور اس کے متعلق یہ تذکرہ بھی کیا کہ اُس وقت جب یہ نمونہ بنایا گیا۔ اس صنعت میں ایسی ایسی صورتیں رائج تھیں یا ہوئیں۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ بھی تو فن سے غیر متعلق حضرات کا بیرونی بیان ہے کسی اہلِ فن کا بیان نہیں۔ ہمیں جو شکایت ہے وہ اپنی جگہ بحالہ قائم ہے۔ کہ اہلِ فن حضرات نے اپنی حالت فنِ زردوزی کے متعلق تحریری طور پر ہم تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی جس کا ہمیں افسوس ہے۔

ہم حتی الامکان پوری تحقیق اور کاوش کے بعد فنِ زردوزی کے متعلق جو حالات معلوم کر سکے ہیں۔ اُن کو اس مضمون میں بہت اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔ چوں کہ ہمیں بحیثیت ایک زردوز ہونے کے اپنی کمزوریوں اور کمی واقفیت کا اعتراف ہے اس بنا پر اگر کوئی صاحبِ بصیرت بنظرِ اصلاح ہماری استعانت فرمائیں گے تو بصد شکریہ ہم قبول کرنے کو تیار ہیں۔

زردوزی کا کام دُنیا میں سب سے پہلے سرزمینِ مصر میں حضرت موسےٰ (علیہ السلام) کے زمانے میں بنایا گیا۔ جن کو تقریباً چار ہزار برس کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس سے قبل دُنیا میں اس کام کا وجود نہ تھا۔ اس صنعت کے ذریعے سب سے پہلے جو کام بنائے گئے اُن میں دینی اعتقادات کو زیادہ دخل تھا۔ صرف دنیوی آرائش و زینت مقصود نہ تھی۔ اس کے بعد کے زمانوں میں بھی عرصہ دراز تک دینی و مذہبی اعتقاد کا جذبہ ہی اس صنعت پذیری میں کار فرما رہا۔ اگرچہ کام کی شکل اور نوعیت بدلتی گئی شروع میں یہ کام سونے کے تاروں سے کپڑے پر بنایا گیا اور سرزمینِ مصر میں یہ کام ترقی کرتا رہا اور ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پہلے جو کام سونے کے تاروں سے بنایا گیا بعد کے زمانے میں اس میں چاندی اور دوسری چیزیں بھی شامل ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ سُوت سے بھی بہت سے کام بننے لگے۔ جن میں بعض جانوروں کی تصویریں بھی

شامل ہو گئیں۔ چونکہ اُس زمانے میں تحریر کا رواج نہ تھا اور اس قسم کی تصویروں کے ذریعے اپنے مفہوم کو ادا کرنے کا طریقہ تھا۔ اس لئے اس صنعت میں تصویروں کا جاری ہو جانا بعید از قیاس نہیں، اگرچہ حالات و ضروریات کے ماتحت بہت زیادہ کام اُس وقت میں سُوت سے بننے لگا تھا۔ لیکن سونے چاندی وغیرہ سے بھی کام بنایا جاتا رہا۔ اور صرف مصر میں ہی نہیں بلکہ جن جن ملکوں میں بھی اس صنعت کی ترقی ہوئی وہاں مال سے زردوزی ضرور ہوتی رہی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری اختراعات کے ذریعے اس صنعت میں ترقی ہوتی رہی۔

مصر میں کافی ترقی و ترویج کے بعد یہ صنعت عرب میں بھی پھیلتی گئی اور عربستان کے لوگوں نے اس میں کافی حصّہ لیا اور انہیں لوگوں کے ذریعے یہ صنعت یورپ میں پھیلی۔ یورپ میں جب یہ صنعت آئی تو اس صنعت کی عمر دوسرے ہزار میں پہنچ گئی تھی۔ کیوں کہ یورپین حضرات نے بہت محنت اور عرق ریزی سے جو نمونے پرانے زمانے کے پیش کئے ہیں وہ ڈیڑھ ہزار برس سے لے کر ساڑھے تین ہزار برس قبل تک کے ہیں یورپ کے پُرانے دستیاب شدہ نمونے دو ڈھائی ہزار برس قبل تک کے ملتے ہیں۔ جن میں روس اور ایران کے اکثر نمونے بھی شامل ہیں۔

ان یورپی اور ایرانی نمونوں میں سُوت کے علاوہ اُون سے بھی کام لیا گیا ہے اور ان نمونوں میں سے بعض نمونوں میں سنہری کلابتوں بھی استعمال ہوا ہے۔ نیز ان کاموں میں رنگوں کا استعمال بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت میں بہت سی نئی چیزیں شامل ہوتی گئیں۔ حتےٰ کہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے نمونوں میں جو چین یا اُس کے قریب کے علاقوں میں بنائے گئے ریشم کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ریشم کی دریافت ہو چکی تھی اور اس کو بھی اس صنعت میں شامل کر لیا گیا تھا۔

ابتدا میں جو زردوزی کام سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا۔ جس کو ہم "قدیمی زردوزی" کہہ سکتے ہیں وہ بھی اپنی خاص روش کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔ اور دو ڈھائی ہزار برس کی عمر ہونے تک اُس میں کلابتون اور کٹوری چاندی کی شامل ہو گئیں اور یہ کام اپنے ہمعصر دوسرے کاموں کے مقابلے میں سینے میں آسان رہا اور قیمت میں مال کی وجہ سے زیادہ۔ اور دوسرے طریقوں میں اُون اور سُوت کی قیمت تو زیادہ نہ ہوتی تھی لیکن محنت زیادہ۔ یہ زردوزی جو مال وغیرہ سے بنائی جاتی تھی۔ مصر کے بعد عرب اور یورپ سے گذر کر ایرانیوں میں رائج ہوئی اور اُنھوں نے اس صنعت میں خالص کلابتوں کے ایک کام کا اضافہ کیا۔ جو "دوخت" کا کام کہلاتا ہے اور وہاں سے یہ کام کشمیر و پنجاب ہوتا ہوا ہندوستان میں آیا۔

جس وقت عرب سے چل کر یہ صنعت یورپ میں داخل ہوئی اُس کے بعد یہ روس اور چین تک پہنچ گئی۔ روس میں تو اس کام میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوئی البتہ چینیوں نے ریشم کے کام میں بہت ترقی کی اور ریشم کے کام کو انتہائی عروج تک پہنچایا۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ دُنیا کے کسی دوسرے خطّے کے لوگ اس کام میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر مال وغیرہ کے دوسرے کاموں سے وہ عاری ہیں۔ روس کی زردوزی بھی ہمارے خیال سے بہت ادنیٰ درجے کی ہے۔

صنعتی ایجادات کے سلسلے میں کشمیری اور پنجابی بھی ایرانیوں سے پیچھے نہ رہے اور اُنھوں نے بھی خالص کلابتوں سے اس صنعت میں "مروڑی" کے کام کا اضافہ کیا جو پہلے "ہاتھ زری" کہلایا پھر "مروڑی" جب یہ کام ہندوستان میں آیا تو یہاں اس میں اس قدر ترقیاں ہوئیں جن کو احاطۂ تحریر میں لانا بھی مشکل ہے۔ ہندوستان نے ایران کے ایجاد کردہ "دوخت" کے کام کو بھی اس قدر ترقی دی کہ انتہا کو پہنچا دیا اور دہلی، بمبئی، آگرہ، لکھنؤ، بنارس اور بریلی وغیرہ شہر اس کام کے مرکز بن گئے۔ اور ہندوستان کی اکثر ریاستوں میں "دوخت" کا کام بے انتہا بنایا گیا۔ ہندوستان کے خاص خاص مقامات میں سے دوخت سے ملتے جلتے کتنے ہی نئے شعبے ایجاد ہو گئے جیسے "موٹے دوزی" لیس، ورق لیٹہ کا کام، بلوری کام، سوت کسب اور رنگین سوت کسب وغیرہ۔ اس میں سے "موٹے دوزی" تو پنجاب سے مخصوص رہی باقی شعبوں میں بمبئی اور بریلی نے زیادہ حصّہ لیا۔

اسی طرح مروڑی کے کام نے پنجاب سے نکل کر دہلی، بریلی اور امروہے میں بہت کچھ ترقی کی۔ اور ان تینوں مقامات نے اپنے اپنے طرز کی "مروڑی" کے کام میں الگ الگ جدّت دکھائی۔ امروہہ میں مروڑی نے جو خاص طرز اختیار کیا اُس میں ٹوپیوں کا کام بنایا گیا۔ دہلی اور اُس کے ہمراہ میرٹھ نے ٹوپیوں کے علاوہ دوسرے لباس میں بھی اپنی جالی دار مروڑی کو پیش کیا۔ بریلی نے پنجابی مروڑی کو ترقی دی اور اُس میں وصلی کے کام کو شامل کر کے ایک طرزِ خاص ایجاد کیا جو بہت مقبول ہوا ہندوستان کے شہروں میں سے مدراس نے بھی زردوزی میں نمایاں حصّہ لیا۔ یعنی آری کے ذریعے کلابتوں کے کام میں بیش بہا اضافہ کیا اور ایک شعبہ "سوئی کسب" کے کام کا فنِ زردوزی میں بڑھا دیا۔

ہندوستان کے متعلق اوپر ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے اُس سے مراد یہ ہے کہ ہندوستان نے اُن کاموں کو جن کو ایران اور کشمیر و پنجاب نے ایجاد کیا تھا۔ ترقی دے کر اُس میں بہت

کچھ اضافہ کیا۔ لیکن ہندوستان کی اصل ایجاد جو اس فنِ زردوزی میں کی گئی سلمے کے کام کی ہے۔ جس نے فنِ زردوزی کو چمکا دیا اور دیکھنے والوں کی نظریں خیرہ ہونے لگیں۔ آپ پُرانے نمونوں پر جہاں سے بھی ملیں نظر ڈال جائیے۔ لیکن سلمے کا کام سوائے ہندوستانی نمونوں کے کہیں نظر نہ آئے گا۔ اس سلمے کے کام میں کلابتوں اور ٹیکی کو چھوڑ کر (جن کو ہم قدیمی ایجاد سمجھتے ہیں) روپہلی و سنہری ملا کر سترہ اٹھارہ طرح کا سلمہ بنایا جاتا ہے۔

صنعتِ زردوزی کا ابتدائی کام یعنی "قدیم زردوزی" جس کا ذکر ہم نے کیا ہے اور کاموں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی آیا اور یہاں بنتا رہا اور اُس میں بھی ترقی ہوئی۔ یو۔پی کے علاقے میں وہ "بُنت" کے نام سے بنتا رہا۔ اودھ میں "گوٹوں" کے نام سے بنا۔ دہلی اور آگرہ میں "شال دوزی" کہلایا۔ ان دونوں جگہ جو لوگ اس کام کو کرتے تھے وہ شال دوز کہلاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ دہلی کے زردوزوں نے اس کو ترقی دے کر اس میں ریشم کا اضافہ کیا۔ اور اس طریق پر بہت کام بنایا گیا۔ راجپوتانہ (جے پور وغیرہ) میں یہ کام "فرخ شاہی" کے نام سے بنا۔ اور اس میں ایک جانور کے رنگین پر شامل کئے گئے جس کا نام وہاں بھیم ہے اور جو خاندیس میں ہوتا ہے۔ مدراس میں بھی یہ کام بنتا رہا اور اس میں جانور کے پر بھی استعمال ہوتے رہے۔ مدراس میں اس جانور کا نام "زیرہ گلی" ہے اور خاندیس ہی سے آتا تھا۔ اب یہ قدیمی زردوزی کا کام تقریباً سب جگہ ترک ہو چکا ہے۔ البتہ ریاستِ حیدرآباد دکن میں ابھی تک تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بنتا ہے یعنی پروں کی بجائے اس میں ریشم یا رنگین ڈاک استعمال ہوتی ہے اور "تاش کناری" کا کام کہلاتا ہے۔

ہندوستان میں سلمے کے کام کی ایجاد تو اس فنِ زردوزی کے ابتدائی دور کی ہے جس کو تقریباً چار سو برس کا زمانہ ہو گیا۔ لیکن اس بیسویں صدی عیسوی میں تو اس صنعت میں اتنی ترقیاں ہوئیں جس سے عوام تو در کنار شاید آج کل کے بہت سے زردوز بھی ناواقف ہوں گے۔ مثلاً تیلون کا کام، کسب ٹیکی، کٹاؤ کا کام، آری کا کام، پینٹ کا کام، بیڈنگ کا کام، شیڈنگ کا کام، پائپنگ کا کام، جدید مرو ڈی، سکونس کا کام، سوتی کسب، پلاسٹک کا کام۔ اس کے علاوہ فنِ زردوزی کے اور بہت سے ایسے طرز ہیں جو آری، اسپیشل کسب نیموری، بجریٹکی اور موتیوں کی مدد سے بنائے گئے۔ جن کی تفصیل پیش کرنے کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ ہم نے زردوزی کے ان تمام شعبوں اور اس کی نوعیتوں کا ذکر ایک کتاب میں کیا ہے۔ جس میں ہر ایک شعبے کے ڈیزائن لکھ کر اُس کی تشریح کی ہے اور اُس کے سینے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام ہندوستان کے مشہور اہلِ فن کے حالاتِ زردوزی معہ اُن کے لکھے ہوئے ڈیزائنوں کے پیش کرکے اُن کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ہندوستان کے فنِ زردوزی پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ زردوزی کا فن حاصل کرنے والوں کے لئے ابتدا میں ایک "نصابِ زردوزی" بھی پیش کیا ہے۔ یہ کتاب عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک امر اور گزارش کر دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ صنعتِ زردوزی کے لئے انگلش میں لفظ ایمبرائڈری استعمال ہوا ہے جو ہمارے خیال میں زردوزی اور کشیدہ کاری دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اس کی اصلاح لفظ "گولڈ" سے کی گئی ہے اور زردوزی کے لئے گولڈ ایمبرائڈری استعمال ہونے لگا ہے۔ اس لئے پُرانے حوالوں میں جو زیادہ تر یورپین حضرات کی تحریروں سے ماخوذ ہیں اس بات کا امتیاز کرنا کہ کون سا کام کشیدہ کاری کا ہے اور کون سا کام کارچوب پر بنایا گیا مشکل ہے۔

اسی طرح لفظ زردوزی کے لغوی معنے "چاندی سونا سینے" کے ہیں۔ حالانکہ آج کل زردوزی میں بہت سے ایسے کام بنائے جاتے ہیں جو اس معنے میں صحیح نہیں اُترتے یعنی بہت سے کام ریشم، سکونس، پلاسٹک، پوتھ، پینٹ یا ریشمی کپڑے سے بنائے جاتے تھے اور ان میں سے بعض کاموں میں مال بالکل نہیں لگتا۔ مگر وہ زردوزی کام کہلاتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ایسے کام جو واقعی زردوزی کہلانے کے مستحق ہیں۔ زردوزی کام نہیں سمجھے جاتے۔ جیسے ہاتھ زری اور کامدانی کے کام۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل زردوزی کا کام اصطلاحی طور پر اُس کام کو سمجھا جاتا ہے جو کارچوب (اسٹینڈ) پر بنایا جائے۔ خواہ وہ کسی چیز سے بنایا جائے۔ یہی اصول ہم نے اپنی کتاب "تاریخِ زردوزی" میں اختیار کیا ہے۔

"آج کل" کا اگست ۱۹۵۷ء کا شمارہ

جنگِ آزادی نمبر

ہوگا ـــــ تفصیلی اعلان کا انتظار فرمائیے۔ (ادارہ)

"بچوں کا آج کل" بند کر دیا گیا ہے لیکن "آج کل" کے صفحات میں کمی نہیں ہوگی۔ یعنی ہر شمارہ حسبِ سابق ۶۰ صفحوں پر مشتمل ہوگا۔ مضمون نگار حضرات اور شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ بچوں کے لئے مضامین، کہانیاں اور نظمیں وغیرہ ارسال نہ فرمائیں۔ (ادارہ)

ترقی کے لیے یوجنا

یہ تاریخی ترقی

دوسرے پلان میں زور فوری صنعتی ترقی پر ہے اور ساتھ ہی ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کی توسیع پر تاکہ ضروری خدمات اور مطلوبہ اشیا عوام کو آسانی سے مل سکیں۔ پلان کے دو بڑے نشانے پیداوار اور اس کی تقسیم ہیں۔ اور پلان کی کل رقم کا تقریباً آدھا حصہ ان پر خرچ ہوگا۔

ہر طرف اضافہ

پیداوار میں اضافہ کرنے کیلئے بھاری اور مشینیں تیار کرنے کی صنعتوں کو ترقی دی جائیگی اور ملک کے معدنی ذرائع کا زیادہ اور بہتر استعمال کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے پلان میں ۹۰۰ کروڑ روپے (کل خرچ کا ۱۹ فی صدی) مخصوص کئے گئے ہیں۔ اسمیں گھریلو اور چھوٹی چھوٹی صنعتیں بھی شامل ہیں۔ دوسرے پلان میں مزید روزگار بہم پہنچانے کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس مد میں زراعتی پیشہ کے علاوہ تقریباً ۸۰ لاکھ لوگوں کو روزگار ملنے کی اُمید ہے۔

بہتات کی راہ پر

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اشیاء کی تقسیم اور خدمات کا معیار بھی بلند ہوگا۔ چنانچہ ۱۳۸۵ کروڑ روپے یعنی دوسرے پلان کے اخراجات کا ۲۹ فی صدی حصہ ریلوے، نئی سڑکوں، مزید بس سروس، سیر و سیاحت کی سہولتوں، جہاز سازی، ہوائی آمد و رفت، براڈکاسٹنگ اور ڈاک و تار وغیرہ مدوں پر خرچ ہوگا۔

دوسرا پانچسالہ پلان

قومی خوشحالی کے لئے



(ماڈل پریس پرائیویٹ لمیٹڈ نیا بازار دہلی)

آجکل

اردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو کی علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے ۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں ۔ رسالے کی حیثیت محض ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُرازمعلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگان علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں ۔"

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسن ظاہر اور حسن باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینت اشاعت ہوتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے ۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔"

جوش ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں ۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں ۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے ۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں ۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے ۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں ۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی ۔"

ممتاز حسین



" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے ۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے ۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار لوگوں کو ۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اسی طرح اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اسی سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے ۔"

اشفاق حسین

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے ۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذب نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے ۔"

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی معیاری رسالہ ہے ۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے ۔ "آج کل" میں یہ گُن پایا جاتا ہے ۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں ۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے ۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No D—309


اس شمارے میں لکھنے والے
ارچ ۱۹۵۶ء

آج کل

دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب	جامعہ ملیہ - دہلی
محی الدین قادری زور	حیدرآباد
گوپی ناتھ امن	دہلی
خواجہ احمد فاروقی	دہلی
رحمان راہی	سری نگر

یو۔ ایس۔ موہن راؤ۔ ڈائرکٹر۔ پبلیکیشنز ڈویژن

بال مکند عرش۔ ایڈیٹر شعبۂ اردو و سیکریٹری

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں:۔ چھ روپے / پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:۔ ہندوستان میں:۔ آٹھ آنے / پاکستان میں:۔ آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ترتیب

سرورق:۔ رقصِ بہار

جلد ۱۵ - نمبر ۸

مارچ ۱۹۵۷ء

مُلاحظات

اب کے سال ۲۶ ۔ جنوری کا مبارک دن دوہری خوشیوں کے ساتھ آیا ۔ ہند میں جشنِ جمہوریت کی عید تھی تو کشمیر میں نئے آئین کے نفاذ کی شادمانی ۔ جس کی رُو سے اب کشمیر ہر لحاظ سے ہند کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے ۔ دلّی میں راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرساد نے ایک عظیم الشان پریڈ میں سلامی لی ۔ بعض بدیسی طالب علموں نے جو اپنے ممالک سے خاص طور پر ہند کے جشنِ جمہوریت میں شریک ہونے آئے تھے کہا کہ انھیں جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ مغربی ممالک میں یا تو فوجی پریڈیں ہوتی ہیں یا کلچرل جلوس نکالے جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں یومِ جمہوریت کی تقریبات میں شاندار فوجی پریڈوں پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ عوام کی پُرامن و پُرمسرت زندگی ، اُن کی تہذیب و تمدّن ، علوم و فنون اور سعی و عمل کے مناظر بھی پیش کئے جاتے ہیں ۔ پریڈ کے موقع پر روس کے وزیرِ دفاع مارشل زوخاف بھی تشریف رکھتے تھے اور انھوں نے اس کی تنظیم و انتظام کو بہت سراہا ۔

مارشل زوخاف سے پہلے صدرِ شام ، جناب شکری القواتلی ہند تشریف لائے تھے اور انھوں نے شری نہرو کے ساتھ جو مشترکہ اعلان جاری کیا اس میں انھیں اصولوں کا اعادہ تھا جن پر ہند کاربند ہے ۔ ادھر یونائیٹڈ نیشنز میں سعودی عرب کے شاہ سعود نے جو تقریر کی ہے اس سے بھی پنچ شیل کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک اور ہند کے درمیان کس درجہ ہم آہنگی و ارتباط ہے ۔

جشنِ جمہوریت کے مسعود و مبارک موقع پر راشٹرپتی قومی اعزازات بھی عطا فرماتے ہیں ۔ چنانچہ اب کے سال شری گووند بلبھ پنت کو " بھارت رتن " کا اعزاز ملا ۔ ملک کے مشہور عالم اور اردو کے مایۂ ناز ادیب ڈاکٹر عابد حسین کو جن کی تقریباً ساری عمر علم و ادب ، فکر و فلسفہ اور جامعہ ملیہ کی خاموش خدمت میں گذری ہے " پدم بھوشن " کا اعزاز عطا کیا گیا ہے ۔ اسی طرح ہندی کے نامور عالم ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں انھیں بھی اس اعزاز سے نوازا گیا ہے ۔ فنونِ لطیفہ کے لئے اعزاز پانے والوں میں ہندوستانی گائکی کے ماہر اُستاد مشتاق حسین خاں اور پنڈت رتن جنکر کو بھی یہ اعزاز بخشا گیا ہے ۔

بین الاقوامی سیاست کی بساط پر عجیب عجیب چالیں چلی جا رہی ہیں ۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ پیش ہُوا تو پاکستان کے وزیرِ خارجہ مسٹر فیروز خاں نون نے وہی پُرانا راگ چھیڑا ۔ اُن کی تقریر میں کوئی نئی بات نہیں تھی ۔ کشمیر میں استصوابِ رائے کا مطالبہ تو انھوں نے حسبِ سابق کیا لیکن اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا کہ کشمیر میں یو ، این ، او کمیشن کے فیصلے کا پاکستان نے احترام کیوں نہیں کیا ۔ اس کمیشن نے پاکستان کو حملہ آور قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ پاکستان اپنے مقبوضہ علاقے سے اپنی افواج کو ہٹا لے ۔ اب نو سال کی طویل مدت کے بعد جب کہ دنیا بھر کے حالات نئے نئے فوجی معاہدات کی وجہ سے تبدیل ہو چکے ہیں وہی پرانا راگ چھیڑنا اور استصوابِ رائے کا مطالبہ کرنا ایک غیر منصفانہ بات نہیں تو اور کیا ہے ۔

پاکستان کے مقبوضہ علاقۂ کشمیر میں آج تک انتخابات نہیں ہوئے ۔ ادھر بھارت کی ریاستِ کشمیر میں عام انتخابات بھی ہوئے ، دستور بھی بنا ، اُس کا نفاذ بھی ہُوا اور کشمیری عوام نے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے باب میں مُہر بھی ثبت کر دی ۔ خود پاکستان میں نئے دستور کے مطابق عام انتخابات نہیں ہوئے ۔ ایسے حالات میں محض بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر ان کے اشارے پر ناچنا ، اُن سے فوجی امداد لے کر ہمسایہ ملکوں کو ڈرانا ، اور ان تمام شرائط و قوانین سے رُوگردانی کرنا جن کے تحت خود پاکستان کا وجود ہُوا ایک قسم کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے ۔ کشمیر قانونی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے ہندوستان کا حصّہ ہے اب تو ہندوستان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ پوری ریاستِ کشمیر اس کے حلقۂ اختیار میں ہو اور جس حصّے پر پاکستان نے جارحانہ قبضہ کیا ہے وہ اسے واپس ملے ۔ سلامتی کونسل کے اراکین جو فوجی معاہدوں کے پابند ہیں معاملہ فہمی کا ثبوت دینے سے قاصر رہیں تو یہ ایک قدرتی بات ہے ۔ غیر جانبدار رہنے والوں کے لئے یہ باتیں نئی نہیں ۔ غیر جانبداری کا راستہ نہایت پُرخطر اور صبر آزما ہُوا کرتا ہے ۔ امنِ عالم کی خاطر یہ صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں تو حوصلہ مندی سے برداشت کرنا چاہئیں ۔ بالآخر راستی کو فتح ہوتی ہے اور دنیا کا ہر سلامتی پسند انسان یہ جانتا ہے کہ ہندوستان راستی پر ہے ۔

جوشؔ ملسیانی

غزل

اس کے ہر رنگ سے کیوں شعلہ زنی ہوتی ہے
اُن کی تصویر تو کاغذ کی بنی ہوتی ہے

عقل و مذہب کی جب آپس میں ٹھنی ہوتی ہے
پھر تو ہر راہ بری راہ زنی ہوتی ہے

یاد آتی ہے جب اُن کی نگہِ ناز مجھے
ایک برچھی مرے سینے پہ تنی ہوتی ہے

گوہرِ اشک سے پُر رہتا ہو دامن جس کا
وہ محبت بھی تو قسمت کی دھنی ہوتی ہے

کس طرح دُور ہوں آلامِ غریب الوطنی
زندگی خود بھی غریب الوطنی ہوتی ہے

پھل اُسے آئے نہ آئے یہ مقدّر کی ہے بات
چھاؤں تو نخلِ تمنّا کی گھنی ہوتی ہے

شکوے تو قیرِ محبت بھی ہوا کرتے ہیں
مگر اُس وقت جب آپس میں بنی ہوتی ہے

میں بھی پیتا ہوں مجھے اس سے کچھ انکار نہیں
وہ مگر دامنِ تقوےٰ میں چھنی ہوتی ہے

اک تمھاری ہی نزاکت ہے جو ہے تم پہ گراں
ورنہ ہر پھول میں نازک بدنی ہوتی ہے

ضبطِ گریہ سے کہیں چاک نہ ہو جائے جگر
بوند آنسو کی بھی ہیرے کی کنی ہوتی ہے

اس قدر غیر ہے کیوں حال تمھارا اے جوشؔ
کبھی دل پہ تو کبھی دم پہ بنی ہوتی ہے

راز یزدانی

داغ رام پور میں

داغ رام پور میں کیوں آئے ۔ اس کو واضح طور پر بیان کرنے کے لئے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے قیامِ دہلی کے اسباب اور دہلی میں داغ کی خالہ عمدہ خانم کا ناظم کے حضور میں آنے جانے کا تذکرہ ضروری ہے ۔ دہلی میں نواب یوسف علی خاں بہادر کا قیام کیوں تھا ۔ اس کو جاننے کے لئے رام پور کی تاریخ کے اس حصّے کو مختصر طور پر سمجھ لینا چاہیئے ۔

۷ اکتوبر ۱۷۷۴ء کو نواب فیض اللہ خاں بہادر رحمۃ اللہ اور وہ نواب شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان صلح ہو کر رام پور کی ریاست قائم ہوئی ۔ ۱۶ جولائی ۱۷۹۴ء کو نواب فیض اللہ خاں بہادر کا انتقال ہوا ۔ نواب فیض اللہ خان بہادر نے گیارہ بیٹے اور سات بیٹیاں چھوڑیں ۔ لیکن صرف دو بیٹوں کا رام پور کی سیاسی تاریخ سے تعلق ہے ۔ یعنی اُن کے سب سے بڑے بیٹے اور جانشین نواب محمد علی خاں اور اُن کے چھوٹے بھائی نواب غلام محمد خاں ۔

نواب محمد علی خاں بہادر ۱۶ جولائی ۱۷۹۴ء کو تخت نشین ہوئے اور کل ۲۵ دن کی مختصر سی حکومت کے بعد ۹ اگست ۱۷۹۴ء کو اپنے چھوٹے بھائی نواب غلام محمد خاں بہادر کے ہاتھ سے زخمی ہو کر تخت سے الگ ہو گئے ۔

نواب محمد علی خاں بہادر کے زخمی ہونے اور بعد کو مارے جانے کے متعلق مختلف قصّے کہے جاتے ہیں ۔ مثلاً امیر مینائی نے "انتخاب یادگار" میں رام پور کی جو مختصر تاریخ لکھی ہے ۔ اس میں نواب محمد علی خاں بہادر کو مغرور، تشیعی اور کم ہمت کا پتلا بتایا ہے ۔ معظم نے "جنگ نامہ" دو جوڑا میں نظم کیا ہے ۔ کہ نواب فیض اللہ خاں بہادر نے اپنی زندگی میں انھیں تمام اختیارات دے دیئے تھے ۔ اور انھوں نے نواب فیض اللہ خاں بہادر کی زندگی میں انھیں معزول کر کے خود ریاست پر قبضہ کرنا چاہا تھا ۔ قرابادین "نافع الامراض" کے مصنّف نے لکھا ہے ۔ کہ نواب محمد علی خاں بہادر کو بچپن سے مراق کا عارضہ تھا ۔ اخبار الصنادید[1] کے مطالعہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنے زمانۂ ولی عہدی میں نواب فیض اللہ خاں بہادر کی بجائے آصف الدولہ کے متبنیٰ نواب وزیر خاں کی شادی کے موقع پر وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے لکھنؤ گئے تھے اور وہاں آصف الدولہ کی ترغیب پر شیعہ ہو گئے تھے ۔ نیز انھیں لکھنؤ کے درباری آداب اتنے پسند آئے تھے کہ اپنے درباریوں پر ان کے بجا لانے کے لئے شدّت کیا کرتے تھے ۔

نواب محمد علی خاں کا شیعہ ہو جانا تو ابھی تک ثبوت کا محتاج ہے ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ سے واپس آ کر انھوں نے اپنے حاضر باشوں سے لکھنؤ کے درباری آداب کی توقع ضرور کی اور رام پور کے عام پٹھانوں کی ناگواری کے باوجود اپنی بات پر اڑے رہے ۔ نواب فیض اللہ خاں بہادر سے بھی وہ اسی وجہ سے ناراض رہتے تھے ۔ کہ نواب صاحب لکھنوی آدابِ دربار کو رام پور کے لئے نامناسب سمجھتے تھے ۔ اور روہیلہ سرداروں سے برابر کے بے تکلفانہ تعلقات رکھتے تھے ۔ روہیلہ سردار نواب فیض اللہ خاں بہادر کی زندگی میں ہی ولی عہدِ ریاست سے بدظن ہو گئے تھے اور ان کے یہاں کی حاضر باشی سے نہ صرف کتراتے تھے بلکہ نفرت کرتے تھے ۔

دربارِ تاجپوشی میں اور اس کے بعد نواب محمد علی خاں بہادر نے ان غلامانہ آداب کو لازمی قرار دے کر روہیلہ سرداروں کا رہا سہا اعتماد کھو دیا اور سرداروں نے نواب غلام محمد خاں بہادر کے سامنے یہ تجویز رکھ دی کہ وہ

---

[1] "اخبار الصنادید" کٹھیر میں روہیلوں کے عروج و زوال اور ریاستِ رام پور کے قیام کے وقت سے عہدِ نواب حامد علی خاں بہادر تک کی مستند تاریخ از مولوی نجم الغنی خاں۔

ناپسند تھی وہ راتوں رات شہر چھوڑ کر اپنی جاگیر کی طرف چل دیئے۔ مگر سرداروں نے خبر پاکر انھیں راستے میں جالیا اور کہا کہ آپ نے ہماری تجویز پر عمل نہیں کیا تو ہم آپ کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چناں چہ ۹ اگست ۱۷۹۴ء کو نواب غلام محمد خاں بہادر نے اپنے بڑے بھائی کو زخمی کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ معزول محمد علی خان نظر بندی کی حالت میں مار ڈالے گئے۔ لیکن نواب غلام محمد خاں کے تخت نشین ہو جانے کی خبر لکھنؤ پہنچ چکی تھی۔ آصف الدولہ نے اُن کی تخت نشینی قبول نہیں کی اور چڑھائی کر دی۔ کمپنی کی امدادی فوج کی تدبیروں سے دوجوڑا کے میدان میں پٹھانوں کی جیتی ہوئی بازی کا رنگ بدل گیا۔ اور نواب غلام محمد خان بہادر شکست کھا کے لال ڈانگ کے پہاڑی مقام پر چلے گئے جہاں جنرل آبر کرمبی انگریزی فوج کے افسر نے بیچ میں پڑ کر حفاظت جان و مال کے وعدے پر ان کو اپنی پناہ میں لے لیا اور بالآخر ان کو بنارس بھیج دیا گیا۔

۲۹ نومبر ۱۷۹۴ء کو نواب محمد علی خان بہادر کے بیٹے نواب احمد علی خاں بہادر کو حکمران بنا دیا گیا جو ۱۷ جولائی ۱۸۴۰ء کو مر گئے۔ نواب احمد علی خان بہادر کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس وقت تک نواب غلام محمد خان بہادر بھی مر چکے تھے۔ البتہ اُن کے بڑے بیٹے محمد سعید خان جو ۱۹ مئی ۱۷۸۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ کمپنی کی ملازمت میں تھے۔ ان ہی کو رام پور کا نواب تسلیم کر لیا گیا۔ اور ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو وہ تخت نشین ہوئے۔

نواب محمد سعید خان بہادر کے بیٹے نواب یوسف علی خاں بہادر تھے۔ یہ ۵ مارچ ۱۸۱۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ گویا اپنے باپ کی تخت نشینی کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ نواب محمد سعید خاں بہادر کے ایک بھائی جو آخر میں میرٹھ کے صدر الصدور بھی ہو گئے تھے، دہلی میں رہتے تھے اور دہلی میں ان کا مملوکہ مکان تھا۔ اسی مکان میں نواب یوسف علی خان بہادر ۱۸۴۰ء تک دہلی رہے اور اسی سال نواب محمد سعید خاں بہادر کے ساتھ رام پور آ گئے۔ یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو نواب محمد سعید خاں بہادر کا انتقال ہوا اور ان کے بعد ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء تک نواب یوسف علی خان بہادر نے حکومت کی۔ یہ وہی نواب یوسف علی خاں بہادر تھے جو ناظم تخلص کرتے تھے۔ اور غالب کے مشہور شاگرد تھے۔ ان ہی کے بڑے بیٹے نواب کلب علی خاں بہادر ان کے بعد ۱۸۶۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ نواب کلب علی خان بہادر کا انتقال ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو ہوا۔ اور ۲۵ مارچ

دائمی علالت کی وجہ سے ۱۸ اپریل ۱۸۸۹ء کو ایک کونسل آف انتظامیہ مقرر کر دی۔

بس یہی داغ کی زندگی کا وہ دور ہے جو رام پور میں گزرا لیکن داغ کب رام پور آئے یہ سوال بھی ایک تاریخی تشریح چاہتا ہے دہلی میں ایک کشمیری سادہ کار تھے جن کا نام محمد یوسف تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ محمد یوسف کے کے اولادیں ہوئیں۔ نہ یہ کوئی بحث طلب بات ہے۔ لیکن اس کی دو بیٹیاں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں ایک چھوٹی بیگم دوسری عمدہ خانم یہی چھوٹی بیگم داغ کی والدہ تھیں۔ اور یہی عمدہ خانم یعنی داغ کی خالہ نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے قیام دہلی کے زمانے میں ان کی حاضر باش تھیں

نواب احمد بخش خان فیروز پور جھرکہ کے مشہور رئیس تھے۔ جو مرزا غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خان معروف کے بڑے بھائی تھے۔ نواب احمد بخش خان کے تین بیٹوں کا پتہ چلتا ہے۔ نواب شمس الدین خان، نواب امین الدین خان اور نواب ضیاء الدین خان، نیر درخشاں، جو غالب کے مشہور شاگرد اور ان کی بیوی کے برادر عمزاد تھے۔ یہی نواب شمس الدین خان داغ کے والد تھے۔

'غالب نامہ' میں مولانا غلام رسول مہر نے یہ لکھا ہے کہ شمس الدین خان کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا کو غالباً یہ مغالطہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے اور جاگیر کی ضبطی کے بعد ان کی بیاہتا بیوی اور لڑکیوں کی طرف سے ریاست کی واگزاری کے لئے چارہ جوئی ہوئی مگر داغ کی والدہ اور داغ کی طرف سے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی لیکن واقعہ یہ تھا کہ داغ نواب شمس الدین خان کے غیر قانونی اولاد تھے۔ اس لئے جاگیر کی واگزاری کی درخواست نہ داغ کی طرف سے دی جا سکتی تھی نہ ان کی والدہ چھوٹی بیگم کی طرف سے۔

بہرحال داغ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو بدھ کے دن دو بجے کے وقت چاندنی چوک دہلی میں نواب شمس الدین خاں کی حویلی میں پیدا ہوئے مگر — ولیم فریزر ایک انگریز تھا جو غالباً دربار دہلی میں ریذیڈنٹ تھا یا ریذیڈنسی میں کسی بڑے عہدے پر مامور تھا۔ اس نے کہیں نہ کہیں نواب شمس الدین خاں کی کسی بہن جہانگیرا بیگم کو دیکھ پایا اور اس قدر از خود رفتہ ہوا کہ جہانگیرا بیگم سے عقد کرنے کی خواہش کا اظہار نواب شمس الدین خاں کے سامنے بڑے بیباکانہ اور بے تابانہ لہجہ میں کر دیا۔

نواب شمس الدین نے اسے مروا دیا۔ اس زمانے میں ہندوستانیوں کی عزت کا بھاؤ اور ان کے خون کا نرخ سستا ہو چکا تھا۔ ادھر انگریز تو بڑی بات ہے۔ انگریز کے سائیس کا خون بھی روزانہ مہنگا ہوتا جاتا تھا۔ چناں چہ قاتل پر مقدمہ چلا۔ سازش کے قتل نواب شمس الدین احمد خان گرفتار ہوئے۔ فریزر کی عبارت کو جلا دیا گیا اور نواب شمس الدین احمد خاں کو ۱۸۳۵ء میں نہ صرف پھانسی دے دی گئی بلکہ جاگیر بھی ضبط کر لی گئی۔ نواب شمس الدین احمد خاں کو جس دن پھانسی ہوئی ہے داغ کی عمر اُس دن چار سال چار مہینے اور نو دن کی تھی یعنی دوسرے دن داغ کی بسم اللہ (رسم تسمیہ خوانی) ہونے والی تھی۔

اس کے بعد داغ کی والدہ نے آغا تراب علی سے عقد کر لیا اور انھیں اپنی بہن عمدہ خانم کی حفاظت میں دے دیا۔ جس کے ساتھ داغ ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ پہلی بار رام پور آئے۔ داغ رام پور آئے اور فارسی کی تحصیل میں ملا غیاث الدین قبرت (صاحب غیاث اللغات) کے شاگرد ہو گئے۔

ادھر آغا تراب علی کے صلب سے داغ کے دوسرے بھائی آغا مرزا شاغل پیدا ہوئے۔ انتخاب یادگار میں امیر مینائی نے آغا مرزا شاغل کی عمر ۳۳ سال بتائی ہے (صفحہ ۱۷۷) اور انتخاب یادگار ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں لکھی گئی ہے۔ اس حساب سے آغا مرزا شاغل کی پیدائش ۱۸۴۰ء کی ٹھہرتی ہے اور اُن کے پیدا ہونے کی یہی تاریخ "جلوۂ داغ" میں بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی بیگم کا نکاح آغا تراب علی سے ۱۸۳۹ء میں ہی ہوا ہوگا اور آغا تراب علی نے داغ کو اپنے ساتھ رکھنا منظور نہیں کیا ہوگا۔ اس لئے چھوٹی بیگم نے انھیں اپنی بہن کے سپرد کر دیا اور وہ رام پور آئیں تو داغ کو اپنے ساتھ لیتی آئیں اور غالباً ان کا ارادہ رام پور میں زیادہ دنوں ٹھہرنے کا تھا۔ اسی لئے انھوں نے داغ کی تعلیم کا انتظام کیا اور یہ انتظام داغ کی فارسی تعلیم کا تھا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ داغ جو اس وقت نو برس کے تھے اپنی مادری زبان یعنی اردو پڑھ چکے تھے۔

۱۸۴۴ء میں ولی عہد دہلی مرزا فخرو نے چھوٹی بیگم سے نکاح کر لیا اور داغ مستقل طور پر قلعہ دہلی میں رہنے لگے۔ "جلوۂ داغ" کے بیان کے مطابق اُس وقت داغ کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ لال قلعہ میں داغ کو شمشیر زنی شہسواری اور دیگر فنون کے ساتھ فارسی کی تکمیل کرائی گئی اور لال قلعہ میں ہی مرزا فخرو نے انھیں اُستاد ذوق کا شاگرد کرا دیا۔ داغ کے تیسرے بھائی مرزا خورشید عالم مرزا فخرو کے صلب سے ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ داغ کے ایک بھائی اور بہن کا پتہ اور بھی چلتا ہے۔

اس بھائی کا نام امیر مرزا اور بہن کا نام بادشاہ بیگم عرف سی یا یچا جا بتایا جاتا ہے۔ مرزا فخرو کا ۱۸۵۶ء میں ہیضے سے انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد چھوٹی بیگم کسی انگریز کپتان بلاک نامی سے متعلق ہو گئیں۔ مسیح جان اسی انگریز کے نطفے سے تھی۔ یہ شاعرہ بھی تھی اور مخفی تخلص بھی کرتی تھی۔ امیر مرزا کے متعلق صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اس کی ایک عرضی نواب کلب علی خان بہادر کے نام ۱۸۶۶ء کی لکھی ہوئی رضا لائبریری میں موجود ہے۔ جس میں اُس نے بے نظیر کے میلے میں شرکت کا عذر کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے۔

" ایک مہینہ گزرتا ہے جو بھائی صاحب یعنی نواب مرزا خان داغ نے خط نہیں لکھا کمال تشویش ہے واللہ اعلم کیا بات ہے " یہ عرضی جے پور سے لکھی گئی ہے۔ خود داغ نے حیدرآباد سے بیخود دہلوی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ "بھائی امیر مرزا جے پور واپس گئے" یہ خط "انشائے داغ" (داغ کے خطوں کا مجموعہ) میں شائع ہو چکا ہے۔ "جلوۂ داغ" میں بھی امیر مرزا کا تشریحی ذکر نہیں ہے۔ لیکن نواب مرزا، آغا مرزا اور امیر مرزا یہ نام ایک ہی تخیل کے پیچھے بیٹے معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ امیر مرزا مسیح جان کا سگا بھائی ہو اور آغا مرزا شاغل کی طرح داغ کا ماں جایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ماں جایا بھی نہ ہو اور کسی رشتے کا ہو۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کی موت کے بعد داغ لال قلعہ سے نکل آئے اس وقت اُن کی عمر ۲۴ برس کی تھی۔ استاد ذوق کا انتقال بھی ۱۸۵۴ء میں ہوا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ داغ نے یہ گیارہ برس مستقل طور پر قلعہ دہلی میں گزارے اور دس سال برابر استاد ذوق سے مستفید ہوتے رہے۔ بلکہ داغ اس مدت میں اپنی خالہ عمدہ خانم کے ساتھ کئی بار رام پور آئے اور چھ چھ مہینے رہے۔ اس آمد و رفت کی جو تفصیل مل سکی ہے درج ذیل ہے۔

۱۔ چھوٹی بیگم نے ۱۵ اگست ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ کو نواب یوسف علی خان بہادر کے نام ایک عرضی لکھی ہے جس میں تحریر ہے:-

" از تحریر دمۂ حدیقہ تمنا برخوردار نواب مرزا خان کلبا نگ نوید صحت وری مزاج عالی دریافتہ ..." اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۸۵۵ء سے پہلے داغ رام پور آئے ہوئے تھے۔ حالاں کہ مرزا فخرو کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا ہے۔

۲۔ عمدہ خانم ۳۰ محرم ۱۲۷۲ھ کو (۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ سے پہلے کی آئی ہوئی) رام پور سے دہلی واپس پہنچیں اور اُسی دن اس نے نواب یوسف علی خان بہادر

تو ایک عرضی ... داغ ... معلوم ہے ...

رام پور آ گئے اور اسی کے ساتھ دہلی واپس ہو گئے ۔

۳۔ دسمبر ۱۸۵۵ء سے اگست ۱۸۵۶ء تک داغ دہلی رہے ۔ کیوں کہ اس مدت میں عمدہ خانم نے نواب یوسف علی خاں بہادر کو جو عرضیاں لکھیں وہ داغ کے قلم کی ہیں اور نواب صاحب کو داغ نے ان میں اپنا سلام لکھا ہے (انشائے داغ)

۴۔ ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء کو غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل داغ رام پور آ کر دہلی واپس ہو چکے تھے ۔ (حکایاتِ غالب)

۵۔ مارچ ۱۸۶۰ء سے نومبر ۱۸۶۰ء تک داغ نے دہلی سے نواب یوسف علی خاں بہادر کو منجانب عمدہ خانم عرضیاں لکھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں داغ دہلی میں تھے (انشائے داغ)

۶۔ ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء کو غالب کی عرضی بنام نواب کلب علی خاں بہادر سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ اس وقت رام پور تھے ۔

۷۔ ۱۸ فروری ۱۸۶۶ء کو خود داغ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نواب کلب علی خاں بہادر کے جشنِ تاج پوشی میں شرکت کی اور اس تاریخ سے قبل دہلی واپس ہو گئے ۔ (انشائے داغ)

۸۔ ۲۹ مارچ ۱۸۶۶ء کو غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ رام پور آ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں (مکاتیبِ غالب) کیوں کہ اوائل مارچ ۱۸۶۶ء میں داغ کی متعدد عرضیوں کے جواب میں نواب کلب علی خاں بہادر کی طرف سے جواب لکھا جا چکا تھا کہ

"چوں حاضر شدنِ آں عوالی مرتبت درحضور مناسب متصور لہذا قلمی می رود کہ حاضرِ حضور شوند۔" "قلمی می رود" کے پُر لطف جملے سے قطعِ نظر بالآخر ۲۴ اپریل ۱۸۶۶ء کو داغ مستقل طور پر رام پور آ گئے ۔

میں ان تمام حوالوں کے لئے محترمی عرشی صاحب ۔ ناظم رضا لائبریری کا شکر گزار ہوں ۔

مولانا تمکین کاظمی کا مقدمہ 'فریادِ داغ' دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مرزا فخرو کے انتقال کے بعد داغ کے آٹھ سال اس طرح گزرے کہ رام پور سے مواجب ملتا تھا مگر کوئی خدمت متعلق نہیں تھی ۔ گویا داغ غدر کے بعد یا اس سے کچھ قبل رام پور کے وظیفہ خوار ہو چکے تھے ۔ لیکن جب تک چاہیں دہلی اور

عمدہ خانم رام پور رہتی داغ اس کے ساتھ رام پور رہتے اور جب وہ دہلی جاتی داغ اس کے ساتھ چلے جاتے ۔ قیاس ہے کہ داغ کو آٹھ سال تک جو وظیفہ بلا خدمت ملتا رہا وہ اس قدر نہ ہوگا کہ اس میں پورے طور پر گزر بسر ہو سکتی اس لئے داغ رام پور میں مستقل حاضری اور خدمت تفویض کئے جانے کی درخواستیں کرتے رہے جو ۱۸۶۶ء میں منظور ہوئیں ۔

رام پور میں داغ کی پہلی آمد ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۱ء کے بعد کی ہے ۔ اس زمانے میں داغ نو دس برس کے ایک طالب علم کی حیثیت رکھتے تھے ۔ اگر داغ کے سوانح نگاروں کا یہ کہنا صحیح ہے کہ داغ نے دس گیارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا تھا تو قیاس ہے کہ داغ کو شعر گوئی کا چسکا نواب یوسف علی خاں بہادر کے دربار میں شعراء کی قدر و منزلت دیکھ کر لگا ۔ نیز داغ کے استاد ملا غیاث الدین خود شاعر تھے اور عبرت تخلص کرتے تھے ۔ عبرت فارسی کے شاعر تھے ۔ مگر ان کے پاس اردو کہنے والوں کی آمد و رفت ضرور ہوگی ۔ یوں نواب یوسف علی خاں بہادر کے دربار میں اس عہد کے رام پور کے سب سے بڑے شاعر نظام کو شاگردانہ رسوخ حاصل تھا ۔ اس حادثے کی تفصیل یہ ہے ۔ کہ نظام نے فنِ شعر تو علی بخش بیمار اور اپنے پیر میاں احمد علی احمد سے حاصل کیا تھا ۔ مگر معاشی بے ہنگامیوں نے انھیں نواب یوسف علی خاں بہادر کا شاگرد بنا ڈالا کیونکہ نواب صاحب کے شاگردوں کو وظیفہ بھی ملتا تھا ۔ چناں چہ انتخابِ یادگار کے صفحہ ۲۸۱ پر نظام کے تذکرے میں لکھا ہے :-

جنابِ مستطاب نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے شاگردِ رشید ہیں شیخ علی بخش بیمار اور اپنے پیر و مرشد ۔ میاں احمد علی مرحوم سے بھی مستفید ہیں سرکار میں نوکر تھے ۔ قدردانی سرکار سے موقر تھے ۔ پچاس برس کی عمر ہوئی ۲۵ شعبان ۱۲۸۹ھ (یعنی تقریباً ۱۸۷۲ء) کو قضا کی بندگانِ حضور (مراد نواب کلب علی خان بہادر) دام اقبالہم وملکہم نے سب مسودات جمع فرما کے دیوان ترتیب فرمایا اور اس دیوان کا انتخاب ضبطِ تحریر میں آیا ۔

نواب یوسف علی خان بہادر کا انتقال ۱۸۶۵ء میں ہوا ہے گویا نظام نواب صاحب کے بعد ۷ سال زندہ رہے اور انھوں نے پچاس برس کی عمر پائی اس حساب سے وہ نواب یوسف علی خان بہادر کی موت کے وقت ۴۴ سال کے تھے داغ نے گیارہ سال کی عمر میں یعنی تقریباً ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں شعر کہنا

…اس وقت ان کی عمر بیس سال سے زیادہ ہی ہونا چاہیے۔

اسی طرح سید احمد علی رسا رام پوری (علی بخش بیمار کے ایک دوسرے شاگرد) کی عمر ۱۳۰۹ھ میں ۶۵ سال کی تھی ۱۲۹۰ھ مطابق ہے ۱۸۷۳ء کے اس حساب سے رسا کی پیدائش تقریباً ۱۸۱۶ء کی ٹھہرتی ہے۔ گویا داغ پہلی بار رام پور آئے تو رسا ۲۸ برس کے تھے اور داغ نے شاعری شروع کی ہے تو رسا ۲۰ برس کے تھے۔ رسا وارستہ طبیعت آدمی تھے مگر نواب یوسف علی خاں بہادر اور ملا غیاث الدین دونوں کے حاضر باش تھے اس لئے ممکن ہے کہ داغ کو شعر کہنے کا شوق نواب یوسف علی خاں کے دربار میں شعراء کا انداز دیکھ کر اور ملا غیاث کی صحبت میں شعراء کی دیکھا دیکھی ہوا ہو اس لئے داغ کے متعلق یہ لکھنا کہ لال قلعہ میں شعر گوئی کے عام چرچے سے متاثر ہو کر انھوں نے شعر کہنا شروع کیا صحیح نہیں ہے کیونکہ داغ لال قلعہ میں ۱۸۴۴ء میں گئے ہیں (مرزا فخرو سے چھوٹی بیگم کے نکاح کے بعد) اس وقت داغ کی عمر ۱۳ سال کی تھی اگر یہ صحیح ہے کہ داغ نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کئے تھے تو یہ واقعہ ۱۸۴۲ء کا ہے اور داغ ۱۸۴۴ء کے بعد لال قلعہ میں گئے۔ اس لئے اغلب یہ ہے کہ داغ کو شعر کہنے کا شوق رام پور کی شاعرانہ صحبتیں دیکھ کر ہوا۔ غرض تیرہ برس کی عمر یعنی ۱۸۴۴ء میں داغ کو قلعہ کے اندر ذوق کا شاگرد کرا دیا گیا۔

داغ سے پہلے اور داغ کے آنے کے بعد رام پور کا شاعرانہ ماحول کیا تھا یہ مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتا ہے۔

نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے عہد میں یعنی ۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۵ء تک

	نام	تاریخ آمد
(۱)	منشی مظفر علی اسیر	اپریل ۱۸۵۹ء
(۲)	منشی امیر احمد امیر مینائی	”
(۳)	میر ضامن علی جلال	۱۸۵۶ء
(۴)	مرزا رحیم الدین حیا	۱۸۵۵ء
(۵)	نواب مرزا خاں داغ	آخر ۱۸۵۷ء سے وظیفہ یاب اور ۱۸۶۶ء سے باقاعدہ ملازم
(۶)	آغا مرزا شاغل	آخر ۱۸۵۷ء
(۷)	سید ظہیر الدین دہلوی شاگرد ذوق	۲۷-اپریل ۱۸۵۸ء
(۸)	امداد مرزا انور شاگرد داغ	”

نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد یعنی ۱۸۶۵ء سے ۱۸۸۷ء تک جو شاعر رام پور آئے ان کی فہرست درج ذیل ہے

	نام	تاریخ آمد
(ا)	میر محمد زکی بلگرامی شاگرد دبیر	۱۸۶۵ء
(ب)	مرزا مجو ہندی شاگرد مصحفی	۱۸۶۵ء
(ج)	میر یار علی جان صاحب	۱۸۶۹ء
(د)	منیر شکوہ آبادی	نومبر ۱۸۷۰ء
(ہ)	منشی احمد حسن خاں عروج	۱۸۷۲ء
(و)	شیخ امداد علی بحر	۱۸۷۲ء
(ز)	منشی امیر اللہ تسلیم	۱۸۷۳ء
(ح)	خواجہ ارشد علی خاں قلق عرف خواجہ اسد	اگست ۱۸۷۵ء
(ط)	گوبند لال حیا	۱۸۷۵ء
(ی)	حسین علی خاں شاداں	۷ ستمبر ۱۸۸۰ء

۱۔ اخبار الصنادید جلد دوئم اور رپورٹ انتظامیہ ریاست رام پور حصہ اول

۲۔ سوانح عمری امیر از ممتاز علی آہ

۳۔ تذکرہ کاملان رام پور، صفحہ ۱۷۷ ۔ خم خانۂ جاوید، جلد دوئم صفحہ ۱۱

(۶) داستان غدر از ظہیر دہلوی و اخبار الصنادید جلد دوئم

(۷) داستان غدر ظہیر دہلوی

(۸) داستان غدر

(د) کلیات منیر

(ہ) تذکرہ کاملان رام پور صفحہ ۱۱

(ز) نظم دل افروز (دیوان تسلیم) صفحہ ۳۵۷

(ح) ہفتہ وار تاج الاخبار رام پور ۱۳۔ اگست ۱۸۷۵ء صفحہ ۱۵ (اسیر رخصت پر گئے اور قلق کو [illegible])

نواب یو [illegible]

عہد میں رام پور کے مقامی شعراء کی فہرست حسبِ ذیل ہے :-

۱۔ حافظ الٰہ داد طالب متوفی یکم جون ۱۸۵۹ء

۲۔ حکیم احمد خاں فاخر متوفی ۱۸۷۳ء بعمر نوے سال

۳۔ میر شرف الدین شستہ متوفی اگست ۱۸۵۸ء

۴۔ صاحبزادہ فصیح اللہ خاں مفتون متوفی ۱۸۶۶ء

۵۔ صاحبزادہ امداد علی خاں امداد متوفی ۱۸۶۵ء

۶۔ سید نظام شاہ نظام متوفی ۱۸۶۷ء

۷۔ سید احمد علی رسا متوفی اگست ۱۸۹۱ء

۸۔ صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب متوفی ۶۔ جون ۱۸۸۳ء

۹۔ حشمت علی خاں موحد شاگردِ مومن ۱۹۰۰ء تک زندہ تھے۔

۱۰۔ نتیاب خاں اختر شاگردِ غالب

۱۱۔ حکیم مظہر احسن خاں احسن شاگردِ غالب متوفی ۱۰۔ مارچ ۱۸۹۱ء

۱۲۔ صاحبزادہ امیر اللہ خاں امیر متوفی اپریل ۱۸۷۳ء

۱۳۔ محمد مظفر خاں گرم شاگردِ ذوق متوفی ستمبر ۱۸۶۸ء

۱۴۔ مولوی محمد حیات خاں حیات شاگردِ ذوق متوفی دسمبر ۱۸۰۷ء

۱۵۔ صاحبزادہ کرامت علی خاں کرامت متوفی نومبر ۱۸۶۲ء

باقاعدہ ملازمت یعنی ۱۸۶۵ء سے پہلے داغ رام پور کے شعراء سے متعارف تھے یا نہیں اس کا ثبوت ایک اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ۱۸۵۸ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے داماد صاحبزادہ محمد رضا خاں کے مکان پر ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں داغ نے غزل پڑھی "گھر میں چلے آتے ہیں" "برابر میں چلے آتے ہیں" اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داغ رام پور کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

داغ کے کلام کے متعلق یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ زمانۂ قیامِ دہلی کا کون سا کلام ہے اور زمانۂ قیامِ رام پور کا کون سا کلام ہے کیوں کہ آج کے شاعروں کی طرح اس زمانے میں نظم یا غزل پر تاریخِ تصنیف لکھنے کا رواج نہیں تھا۔

داغ کے حسبِ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں :-

۱۔ 'یادگارِ داغ' ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔

۳۔ 'مہتابِ داغ' ۱۳۱۰ھ میں مطبوعہ حیدرآباد سے

۴۔ 'یادگارِ داغ' ۱۳۲۳ھ میں اسٹیم پریس لاہور سے

ظاہر ہے کہ 'گلزارِ داغ' میں ہی داغ کے زمانۂ قیامِ دہلی کا کلام مل سکتا ہے لیکن 'گلزارِ داغ' کے متعلق احسن مارہروی مؤلفِ 'جلوۂ داغ' کی رائے ہے کہ :-

"ابتدائی کلام جو ساٹھ جزو میں تھا۔ غدر میں ضائع ہو گیا۔ ایک ایک دو دو شعر جو یاد رہ گئے تھے پھر ان میں چند شعر بڑھا کر پرانی غزلیں پوری کر لی گئیں (صفحہ ۱۱۱)

گویا پرانی غزلوں میں بھی نئے رنگ کی آمیزش ہے لیکن نئے اور پرانے رنگ سے جو کچھ میرا مطلب ہے وہ سن لیجئے۔

نہ صرف میں نے بلکہ داغ کے اس نئے اور پرانے رنگ کو ہندوستان کے تمام تذکرہ نویسوں اور اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے تسلیم کیا ہے۔ چناں چہ رام بابو سکسینہ کی مشہور 'ہسٹری آف اردو لٹریچر' میں بھی یہ حقیقت تسلیم کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا ہے۔ میں اس ترجمے سے چند اقتباس پیش کرتا ہوں۔ صفحہ ۲۱۴ پر نواب یوسف علی خاں بہادر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے :-

"نواب موصوف نے شعرائے دہلی اور لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے عہد میں بڑی ترقی کی۔"

اور نواب کلب علی خاں بہادر کی ادب نوازی کا ذکر کرتے ہوئے اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۴ پر لکھا گیا ہے :-

"یہ اردو شاعری کا ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس کی طرف کافی توجہ ابھی مبذول نہیں ہوئی ہے۔ ناسخ کا طرز (ان کے شاگردوں کے زمانے میں جو کہ اپنے استاد کی استادانہ روش کو قائم نہ رکھ سکے بد سے بدتر ہو گیا تھا۔ ان کے (ناسخ کے شاگردوں سے مراد ہے) کلام میں اس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے لیکن خوبیاں مفقود تھیں۔ اس طرز کے برتنے والے

رام پور میں جب امیرؔ، ظلقؔ اور اسیرؔ تھے، برخلاف اس کے دلّی کے پیرو داغؔ اور تسلیمؔ تھے۔"

داغؔ گو کہ ذوقؔ کے شاگرد تھے مگر انھوں نے ایک ایسا دل کش طرز اختیار کیا جس میں جرأتؔ کا کچھ رنگ ملتا جلتا تھا۔"

اس موقع پر اُردو ادب کے ایک دوسرے مستند تذکرے 'شعر الہند' سے بھی ایک اقتباس پیش کرنا ضروری نظر آتا ہے:۔ صفحہ ۲۸۹۔ تیسرا باب "متاخرین کا پہلا دور" "ریاست رام پور" ان عنوانات کے ماتحت کہا گیا ہے:۔

"غدر کے زمانے تک یہ دونوں اسکول (دہلی اور لکھنؤ) الگ الگ قائم رہے۔ لیکن غدر کے بعد جب نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کی قدردانیوں نے رام پور کو اساتذۂ لکھنؤ اور اساتذۂ دہلی دونوں کی شاعری کا مرکز بنا دیا تو دلّی اور لکھنؤ کے یہ دونوں اسکول ایک دوسرے سے قریب ہو گئے اور ایک پر دوسرے کا اثر پڑنے لگا۔"

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ رام پور میں جمع ہوئے تو ایک تیسرے رنگ کی بنیاد پڑی۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر بابو رام سکسینہ نے اسے ان الفاظ میں کیوں کہا ہے کہ:۔

"یہ اردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس کی طرف کافی توجہ ابھی منعطف نہیں ہوئی ہے۔"

رام پور میں دلّی اور لکھنؤ کی شاعری کا امتزاج کوئی ایسا غور طلب مسئلہ نہیں ہے اور اس مسئلے پر کافی توجہ بھی منعطف ہو چکی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس امتزاج کو ماننا ہی ایسی غلطی ہے جس نے خوش فہمی کی اتنی مضبوط اور اونچی دیواریں کھڑی کر دی ہیں جن کا ڈھانا بڑی ہمّت کا کام ہے۔

قاعدہ ہے کہ دو متضاد نظریوں کے ماننے والے، اگر وہ اپنے نظریات کو سچّے دل سے مانتے ہوں اپنی اپنی جگہ اٹل، ایک دوسرے کے معاملے میں تشدّد اور تعصّب برتنے والے ہوتے ہیں۔ علی المخصوص ان نظریات کے ماننے والوں میں سے ہم عصر اساتذہ امیرؔ اور داغؔ اور جلالؔ۔ اگر ان لوگوں کے متعلق یہ طے کر لیا جائے کہ یہ ایک دوسرے سے آسانی کے ساتھ کچھ سیکھنے پر آمادہ ہو سکتے تھے تو یہ ہماری خوش فہمی ہوگی۔ میرؔ کی تمام عمر لکھنؤ میں کٹی۔ اب لائیے اس عہد میں اہل لکھنؤ میں سے کوئی میرؔ کا مشہور مقلد۔ انشاؔ ایسے لکھنؤ گئے کہ وہیں مر کے رہے۔ لائیے لکھنؤ میں انشاؔ کا کوئی مقلد۔ مصحفیؔ نے لکھنؤ میں بیٹھ کر گرم، منتظر اور آتشؔ جیسے اُستاد پیدا کیے مگر آتشؔ اور مصحفیؔ میں ہی فرق باقی رہا۔ امیرؔ اور مصحفیؔ میں فرق باقی رہا۔ وہ ایک رنگِ طبیعت جو مقامی اور مخصوص مقامی تھا ہر جگہ موجود ہے۔ درحقیقت مقامی اثرات سے بچنا آج تک انسان کے معمولاتِ امکانی میں نہیں آیا ہے۔ دور کیوں جائیے۔ دیکھیے۔ ملکوں کے جغرافی اثرات نے نسلِ انسانی کو کتنے ٹکڑوں میں تقسیم کر ڈالا ہے اور سب اپنے اخلاق و عادات میں ایک دوسرے سے ممیز ہیں حالانکہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح لکھنؤ اور دہلی کے ادبی رجحانات کے اختلاف کا جھگڑا اتنا معمولی جھگڑا نہیں تھا جو کسی طاقت کے بغیر آسانی سے طے ہو جاتا۔

سوچیے آخر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جس طرح جلالؔ اور امیرؔ داغؔ کی طرف جھکے داغؔ بھی کچھ نہ کچھ لکھنوی رنگ کی طرف جھکتے۔ دو چیزوں کے امتزاج کا نتیجہ تو یہی ہوتا ہے کہ اس سے جو تیسری چیز پیدا ہو اُس میں کچھ کچھ خصوصیات ایک دوسرے کی ضرور ہوں۔ لیکن یہاں صاف نظر آتا ہے کہ امیرؔ و جلالؔ نے دہلوی رنگ اختیار کیا اور اس کوشش میں دونوں ناکام ہوئے مگر جلالؔ کم اور امیرؔ زیادہ۔ یہ تذکرہ نویسوں اور اردو ادب کے مؤرخوں کا فیصلہ ہے:۔

۱۔ امیرؔ سے زیادہ حکیم ضامن علی صاحب جلالؔ دہلی کے رنگ سے متاثر ہوئے۔

۲۔ منشی امیر احمد صاحب مرحوم نے اپنی قدیم روش کو چھوڑ کر اصلاحیہ داغؔ کا رنگ اختیار کرنا چاہا۔

یہ لکھنؤ کی صریح شکست ہے۔ تلاش کرنا چاہیے کہ اس صاف شکست کو جلالؔ اور امیرؔ نے آسانی کے ساتھ کیوں کر قبول کر لیا۔ کیا اسے دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ کی شکست بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اسے داغؔ کے رنگ میں ڈھونڈنا چاہیے۔ کیوں کہ یہی مانا جاتا ہے کہ امیرؔ اور جلالؔ نے داغؔ کا تتبع کیا۔

---

[۱] امیرؔ کے متعلق یہ کہنا کہ انھوں نے ناسخؔ کی پیروی کی صحیح نہیں ہے۔ امیرؔ مصحفیؔ کے شاگرد تھے اور اُن کے کلام میں یہی رنگ غالب ہے۔ تاؔز

[۱] 'شعر الہند' صفحہ ۲۸۹

[۲] 'شعر الہند' صفحہ ۲۸۰

"تذکرۂ شعراالہند" میں اس سے اختلاف کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو شعرالہند حصہ اول ۳۱۰)

"داغ کا کلام بظاہر دہلی کے رنگ سے بالکل الگ نظر آتا ہے اس لئے بعض لوگ ان کی شاعری کا سلسلہ جرأت سے ملاتے ہیں اور اُن کی شاعری کی تاریخ جرأت سے شروع کرتے ہیں لیکن اُن کے نزدیک بھی باوجود اس اشتراک کے داغ اور جرأت کے رنگ میں نمایاں فرق و امتیاز موجود ہے۔ چناں چہ مدراس یونیورسٹی کے امتحان کے پرچے میں اُردو لٹریچر کی تاریخ کے متعلق جو سوالات کئے گئے تھے ان میں ایک سوال تھا:-

داغ اور جرأت کے طرز کلام کا مقابلہ کرو دونوں ایک ہی رنگ میں کہتے ہیں مگر پھر بھی فرق پایا جاتا ہے مگر وہ فرق کیا ہے۔"

اس کے بعد "شعرالہند" کے فاضل مصنفوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ داغ کا رنگ خالص دہلوی ہے۔ اس سلسلے میں جو دلائل وہ لائے ہیں اور جو گفتگو اس سلسلے میں کی گئی ہے وہ سب تحصیل حاصل ہے کیوں کہ جرأت بھی دہلی اسکول کے شاعر تھے کسی کے رنگ کو اُن کا کہنا بھی دہلی کا رنگ کہنا ہے۔ صاحب "شعرالہند" نے جرأت اور داغ کے رنگ میں فرق تو تسلیم کیا ہے مگر اسے بھی وہ دہلوی بتاتے ہیں اور یہی لغزش اُن سے ہوئی ہے اور یہ لغزش موجودہ حالات میں ایک حد تک قدرتی ہے جو ہونا چاہیئے تھی اور ہوئی۔

لغزش در حقیقت یہاں نہیں وہاں ہوئی ہے جہاں رام پور میں دہلی اور لکھنؤ کے "اذکار" کے ملاپ یا ٹکراؤ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس وقت کے رام پور کے شاعرانہ ماحول کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ پس اس عہد کے رام پور کے شاعرانہ ماحول کو نظرانداز کر دینا اتنی بڑی اور مہلک غلطی تھی جس نے تاریخ ادب اردو میں

[illegible]

بری الذمہ ہی ملنے جا سکتے ہیں۔ صرف رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب میں (جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے) اتنا تسلیم کیا ہے کہ یہ "اردو شاعری کا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس کی طرف کافی توجہ ابھی منعطف نہیں ہوئی ہے"، مگر انھوں نے بھی "کافی توجہ" اس طرف منعطف کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور ان ہی نتائج کو جنھیں انھوں نے سرسری (بغیر کافی توجہ منعطف کئے ہوئے) مانا ہے خود بھی قائم کرتے چلے گئے ہیں جس سے مسئلہ اپنی حقیقت سے اور دور ہوتا چلا گیا ہے اگر مسٹر سکسینہ کے نزدیک اس وقت تک کے معتقدات بغیر کافی توجہ منعطف کئے ہوئے قائم کئے گئے تھے تو ان کا فرض تھا کہ وہ کافی توجہ منعطف کرتے تاکہ حقیقت سامنے آجاتی۔ بات بالکل معمولی تھی۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کے امتزاج تک اپنی کتاب لکھ چکنے کے بعد وہ ذرا رام پور تشریف لانے کی زحمت گوارا کرتے اس دربار کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے۔ جس میں تیسرا اور نیا رنگ پیدا ہوا تھا۔ رضا لائبریری کے دروازے سب تحقیق کرنے والوں پر کھلے ہوئے ہیں اور ان پر بھی کھل جاتے اور لائبریری میں نہ صرف نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم اور نواب کلب علی خاں بہادر نواب کے عہد کے رام پور کے شاعرانہ ماحول کی تاریخ اور تصویریں (دیوان) موجود تھیں بلکہ قائم چاند پوری کے زمانے سے (جب رام پور بسا اور یہاں پر میں شاعری آئی) آخری فرماں روا نواب رضا علی خاں بہادر کے عہد تک اور دورِ جدید اور دورِ رواں تک کی پوری تفصیل موجود تھی۔ وہ تفصیل جو تمام تذکرہ نویسوں اور تاریخ لکھنے والوں کو صحیح طور پر سمجھا دیتی کہ داغ اور جرأت کے رنگ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ فرق اور جس رنگ کو ہم داغ کا رنگ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔

(باقی)

زراعتی مقاصد کے لئے ایٹمک قوت کا استعمال

ہندوستان میں ایٹمک قوت سے فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کام ابھی معمولی پیمانے پر شروع کیا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے ایٹمک قوت کے پُرامن مقاصد کے لئے استعمال کے سلسلے میں دیگر شعبوں کے علاوہ زراعت کے شعبے میں بھی اس سے فائدہ اٹھانے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ نئی دہلی میں ہنگری زرعی تحقیقی انسٹی ٹیوٹ میں ریڈیو ٹریسر لیبارٹری قائم کی گئی ہے جس میں ایک سال سے زیادہ عرصے سے کھاد کے استعمال سے متعلق تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں۔

شمیم کرہانی

راہ گزر

یہ بھی اک راہگزر ہے اے دوست

ٹوٹے پھوٹے در و دیوار، شکستہ محراب
یہ خرابہ ہے کہ بگڑی ہوئی تقدیر کوئی
خاک آلودہ سے آثار، فسردہ سے نقوش
جیسے ارمانوں کی مٹتی ہوئی تصویر کوئی

نہ چراغوں کے تبسم نہ تبسم کے چراغ
طاق پر شمع کے ٹپکے ہوئے اشکوں کی لکیر
صحن اور صحن کی ٹھہری ہوئی خاموش فضا
سہما سہما ہُوا جیسے کسی مُجرم کا ضمیر

چھت کا یہ زخم اور اس زخم پہ ہنستی ہوئی دھوپ
جیسے ناموس کے دل میں کسی تہمت کی خراش
یہ حوادث کی ہوائیں یہ خرابہ میرا
جیسے طوفان کی موجوں پہ کسی ناؤ کی لاش

پاؤں گرداب کی جانب ہیں نگہ ساحل کی طرف
کوئی بتلائے تو جانیں کہ کہاں ہیں ہم لوگ
دل میں جینے کی تمنّا ہے نہ مرنے کی تڑپ
ایک ٹھہری ہوئی منزل ہے جہاں ہیں ہم لوگ

چاند تاروں سے فضاؤں کی ملاقات نہیں
اس اندھیرے میں بھی رہ لیتے ہیں رہنے والے
نہ ٹھہرنے کا ٹھکانہ، نہ سنورنے کی جگہ
زندگی اس کو بھی کہہ لیتے ہیں کہنے والے

یہ بھی اک زیست کا اندازِ سفر ہے اے دوست
یہ بھی اِک راہگزر ہے اے دوست

ٹوٹ جاتا ہے شبستاں کی تمنّا کا طلسم
حُسن اُجڑے ہُوئے آغوش میں کھو جاتا ہے
کہکشاں آنکھ سے بہہ جاتی ہے آنسو بن کر
چاند گھبرا کے سرِ خاک ہی سو جاتا ہے

ملگجا سا کہیں آنچل کہیں دھندلی سی نگاہ
کہیں ماتھے سے ٹپکتا ہوا محنت کا عرق
حسن اور گردِ غمِ زیست میں غلطاں شب و روز
جیسے مٹی میں ملائے کوئی سونے کا ورق

تھرتھراتا ہوا احساس کے غم خانے میں
نرگسی آنکھوں کا معصوم سا شکوہ دن رات
زیست کے ساتھ رہا کرتا ہے سائے کی طرح
چند اترے ہوئے چہروں کا تقاضا دن رات

شام ہوتی ہے تو روتی ہیں زنداسی آنکھیں
لوریاں روٹھ گئیں، پیار بھری بات گئی
صبح آتی ہے تو تکتی ہیں نگاہیں اٹھ کر
کس لئے دن کا اجالا ہوا، کیوں رات گئی

روشنی لائے جو کوئی تو کہاں سے لائے
شامِ غم بھول گئی صبحِ خوشی کا رستہ
کھوئی کھوئی سی نگاہوں میں چمک ہے پھر بھی
اب بھی تکتا ہے کوئی جیسے کسی کا رستہ
پاؤں کانٹوں میں ہیں تاروں پہ نظر ہے اے دوست
یہ بھی اک رہگزر ہے اے دوست

ایسی مسموم ہواؤں میں یہ شیریں نغمے
زہر سے بادۂ جاں بخش بنا لایا ہوں
ایسی تاریک فضاؤں میں تبسم کی جھلک
دودھ کی نہر پہاڑوں سے بہا لایا ہوں

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ملا کر آنکھیں
دیکھ لیتا ہوں کہ رات آئی ہے تارے لے کر
وقت کی وادئ گریاں سے گزر جاتا ہوں
صبحِ فردا کے تبسم کا سہارا لے کر

میری قسمت پہ مری زیست کی تاریکی پر
تارے آکاش سے کرتے ہیں اشارہ ہنس کر
غمِ دوراں مرے ماتھے کو جھکا دیتا ہے
اور میں سر کو اٹھاتا ہوں دوبارہ ہنس کر

سامنے کشمکشِ زیست کا میدان ہے گرم
اب تو جانوں پہ بن آئی ہے، لڑے جانا ہے
سوچنا کیا کہ مجھے فتح ملے گی کہ شکست
زندگی ایک لڑائی ہے، لڑے جانا ہے

سر ہوں اب ناوکِ آلام کہ ہو بارشِ سنگ
دل و جاں لے کے بڑھا ہوں تو پلٹنا کیسا
آندھیاں آگ کی آئیں کہ ہوکے طوفاں
کارواں لے کے بڑھا ہوں تو پلٹنا کیسا

ہر شبِ تار کی دنیا میں سحر ہے اے دوست
یہ بھی اک راہگزر ہے اے دوست

مارچ ۱۹۵۷ء

دیوانِ جہاں

دیوانِ جہاں' اُردو شاعروں کا تذکرہ ہے لیکن اصل میں اس کو بیاض کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کے مؤلف بینی نرائن جہاں لاہور کے رہنے والے تھے۔ لیکن گردشِ روزگار سے مجبور ہوکر کلکتہ آئے جہاں بارہ برس انھوں نے سخت تکلیف میں گزارے[1] آخر میں حیدر بخش حیدری کے توسط سے ان کا تعارف کیپٹن ٹامس روبک سے ہوا جو اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے سیکرٹری تھے۔ یہ تذکرہ 'جہاں نے انھیں کی فرمائش پر لکھا ہے۔

'دیوانِ جہاں' میں ۱۲۵ اُردو شاعروں کا ذکر ہے لیکن ان کے سوانحی حالات نہایت مختصر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلوم ہارٹ کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ ۱۸۱۲ء میں مرتب ہوا ہوگا[2] لیکن اشپرنگر نے اس کی تاریخ ۱۸۱۳ء دی ہے[3] جو ممکن ہے آغازِ تصنیف کا سال ہو

گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ بینی نرائن جہاں مولانا سید احمد بریلوی کے معتقد تھے اور بعد میں مسلمان ہو گئے تھے[4]

دیوانِ جہاں' میں کئی بیتیں "جنابِ فیض مآب، دست گیرِ بے کساں دعامی و رماندگاں مسٹر ٹامس روبک" کی تعریف میں ہیں۔ اس کے بعد تذکرے کی ترتیب بلحاظِ حروفِ تہجی شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے شاہ عالم آفتاب کا ذکر ہے۔ بعد ازاں نواب آصف الدولہ آصف کا، جن کی مشہور غزل

"الم دیکھتے ہیں، ستم دیکھتے ہیں" نقل کی ہے۔ غزل کے اختتام پر نواب بیگم کی ایک غزل اسی زمین میں دی ہے اور لکھا ہے کہ یہ غزل نواب بیگم کی نواب موصوف کی غزل کے جواب میں ہے۔ اس کا مطلع ہے :

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں — اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں

آخری اشعار ہیں :

کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں — تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ — نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

انشا کے حال میں لکھا ہے :

"انشا تخلص، نام میر انشاء اللہ، میر ماشاء اللہ کے بیٹے کہ فنِ حکمت میں بوعلی سینا اور لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں۔"

افسوس کے ترجمے میں لکھا ہے :

"نام میر شیر علی، میر علی مظفر خاں کے بیٹے، پہلے تھوڑے دنوں میر سوز سے اصلاح لی، بعد اس کے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیران کے، نارنول کے رہنے والے، کلکتہ میں اُن کے رحلت کی"

محمد ظہیر الدین مرزا علی بخت عرف مرزا اظلاں گورگانی اظفری کے متعلق لکھا ہے

"کلکتے میں تشریف لاکر شاہ جہاں آباد کو معاودت (کذا) فرمائی۔ یہ ارشاد اُن کا ہے ؎

شکر ہم عشق کے کوچے سے سبکسار چلے
نقدِ دل ایک جو رکھتے تھے، سو یہاں ہار چلے"

رند کے بیان میں لکھا ہے :

"نام رائے کیم نارائن، مہاراجہ لچھمی نارائن کے پوتے، ہمیشہ

---

[1] 'دیوانِ جہاں' : مخطوطہ برٹش میوزیم ص ۲
[2] فہرستِ کتب خانۂ برٹش میوزیم (ہندستانی وغیرہ) ص ۸
[3] اشپرنگر : فہرستِ کتب خانۂ شاہانِ اودھ
[4] ایضاً ص ۱۸۸ و نیز تاریخِ ادبیاتِ ہندستانی جلد اول ص ۳۱۹

عمدہ رو ز گار رہے ۔ دلی کے رہنے والے اور اب ... ہیں ... اور یہ خاکسار ، جہاں ، بھی چھوٹا بھائی انھیں کا ہے ۔ یہ کلام انہی کا ہے ۔ قطعہ :

کل کہا میں نے میرے گھر چلئے ... اس میں کچھ کم نہ ہوگی محبوبی
سن کے تیور بدل لگا کہنے ... راہ و رسم ادب تو سیکھ لی
مجھ سے کہتا ہے میرے گھر چلئے ... دیکھیو اختلاط کی خوبی "

میر کے ترجمے میں لکھا ہے :

" میر تخلص ، نام محمد تقی ، لکھنؤ میں وزیر الممالک آصف الدولہ کے پاس نوکر تھے ، قریب اسی برس ہو کے وفات پائی ۔"

مصحفی کے حال میں بس یہ جملہ ہے : " نام غلام ہمدانی ، امروہے کے رہنے والے ۔"

' دیوانِ جہاں ' اغلاط سے خالی نہیں ہے ۔ میر کی عمر اسّی برس لکھی ہے حالاں کہ انھوں نے نوّے برس کی عمر میں وفات پائی ۔ محمد امان کا تخلص نیاز لکھا ہے حالاں کہ نثار ہونا چاہیئے ۔ قائم کے متعلق لکھتے ہیں : " محمد قائم ، دکن کے رہنے والے تھے ۔" قائم کا وطن چاند پور ضلع بجنور تھا ۔ ولی کے بارے میں لکھا ہے : " نام میرزا محمد ولی ، معروف آگاہ شاہ اسرار اللہ کے بھتیجے ، دکن کے رہنے والے "۔ یہ بیان صریحاً غلط ہے ۔ جہاں نے ولی دکنی اور ولی دہلوی میں فرق نہیں کیا ۔ برٹش میوزیم میں ' گلزارِ ابراہیم ' کا مستند قلمی نسخہ موجود ہے اُس میں لکھا ہے ۔

" ولی تخلص ، دکنی ، اسمش شاہ ولی اللہ ، اصلش گجرات ، وہ از شعرائے دکن مشہور و ممتاز[2]

صاحبِ گلزارِ ابراہیم ، نے ولی دہلوی کا بھی ذکر کیا ہے :

" ولی تخلص ، دہلوی ، نامش مرزا محمد ولی برادر زادۂ معارف آگاہ اسرار اللہ از دوستانِ این خاکسار است ، الحال کہ سن یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری باشد در بلدۂ مرشد آباد اقامت دارد "[3]

' دیوانِ جہاں ' میں یقین کے بارے میں لکھا ہے :

" نام انعام اللہ خاں ، اظہر علی خاں کے بیٹے ، مرزا جانِ جاناں کے

---

[2] ' گلزارِ ابراہیم ' مخطوطہ برٹش میوزیم

[3] ایضاً

جہاں کی رائے کے ساتھ مصحفی اور صاحب گلزار نے جو کچھ یقین کے بارے میں لکھا ہے ، اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔

تذکرۂ ہندی مصحفی : " میاں انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خان نواسہ حمید الدین خاں ، مرزا مزاج و شیریں زبان ، از حسن و وجاہت بہرہ وافی داشت ۔ گویند مرزا جانِ جاناں او را بسیار دوست داشتے ۔ اکثر و در خانہ اش شب را روز و روز را شب کردے ۔ دیوانش از نظر مرزا بخوبی گزشتہ بلکہ بقولے ہمہ کلامش گفتۂ مرزا است ، شاید کہ چنیں باشد خالی از نفاست نیست ۔ در دولۂ ایہام اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود ، بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ ۔ چنانچہ خود می گوید ؎

حق کو یقین کے یار و برباد مت دو آخر
طرز یں سخن کی اس کی تم نے اٹھائیاں[1]

مجھے یاد پڑتا ہے کہ مصحفی کی اس عبارت کو (در دولۂ ایہام اول کسے الخ) بعض لوگوں نے یقین کے بجائے مرزا مظہر کے متعلق سمجھا ہے جو درست نہیں ۔ برٹش میوزیم کے مخطوطے مذکور پر سلیمان جاہ ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مہریں ہیں اور پوری عبارت کو ایک ساتھ پڑھنے کے بعد شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی ۔ جہاں نے یقین کے والد کا نام صحیح نہیں لکھا لیکن ان کی شاعری کے متعلق تقریباً وہی رائے ظاہر کی ہے جو مصحفی کی ہے ۔ ' گلزارِ ابراہیم ' میں لکھا ہے :

" یقین خلفِ اظہر الدین ..... منظورِ نظر و شاگرد مرزا مظہر بود ۔ جمعے را گمان است کہ یقین استعدادے نداشت ، مرزا مظہر اشعار خود را بنام او کردہ ۔"

بینی نرائن جہاں نے شعرائے فورٹ ولیم کالج کا کلام قدرے تفصیل سے دیا ہے اور آخر میں ایک خاص مشاعرے کی چند ہم طرح غزلیں لکھی ہیں جو بمقام ہاسٹل ۲۰ ۔ جولائی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں منعقد ہوا تھا ۔ قبل اس کے کہ غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار لکھے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند جملے اس قدیم ادبی محفل کے متعلق عرض کر دئے جائیں ۔

---

[1] تذکرۂ ہندی مصحفی مخطوطہ برٹش میوزیم لندن

۲۵ جولائی ۱۸۰۲ء کو دن کے دس بجے شروع ہوا اور جس میں چیف جج ، انگریز حکام اور شرفاے شہر سب ہی جمع تھے ۔ اس کی صدارت گورنر جنرل کی غیر موجودگی میں کالج کے ACTING VISITOR این بی اڈمنسٹن N. B. EDMONSTONE نے کی ۔ اس موقع پر اردو کا سالانہ مباحثہ بھی ہوا جس کا عنوان تھا :

" قدیم و جدید کسی زبان کے جاننے کے لئے ایک سے زیادہ زبانوں کا جاننا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا ہندوستانی کی اچھی لیاقت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے "

اس سلسلے میں اڈمنسٹن صاحب نے اپنے خطبے میں جو اظہار راے کیا اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) ہندی اور اردو میں (صاحبِ صدر کے نزدیک) وہ تعلق ہے جو گیارہویں اور بارھویں صدی کی سیکسن SAXON اور موجودہ انگریزی میں ہے

(۲) اگر ہمیں ہندوستان کے تمام طبقوں سے وسیع اور شخصی تعلق پیدا کرنا ہے تو ہندی کا جاننا بھی لازمی ہے[3]

(۳) ڈاکٹر گل کرائسٹ GILCHRIST کا ہمیں ممنون ہونا چاہیئے کہ ان کی حوصلہ مند مساعی اور بلند پایہ تحقیقات کی بدولت ہم ہندستانی زبان کی وسعتوں اور باریکیوں سے آشنا ہو سکے[4]

اسی روز مشاعرہ بھی ہوا جس میں جوان، حیدری، رواں، شہرت، حیاں، قاسم، ممتاز اور ولا نے شرکت کی ۔ کلکتہ کے اس قدیم اردو مشاعرے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں[5]

مم کی جہاں :

ایک دم میں گو ہوا اور رات کو ہو جائیں ٹھوں
پان کھایا چاہیئے اسی لگایا چاہیئے
قافیہ پیمائی ہے ہر چند لیکن اے جواں
ہنچ بیتی اک غزل اور اب سنایا چاہیئے

—

یہ دلِ پُر سنسنش مشتاق ہے دیدار کا
لن ترانی کیجے پر جلوا دکھایا چاہیئے
گر مآلِ کار پر تجھکو نظر ہے اے جواں
سب سے بگڑا چاہیئے اُن سے بنایا چاہیئے

حیدری :

دُھن بندھی ہے اب یہی اُس پاس جایا چاہیئے
شرحِ درد و غم کسی ڈھب سے سنایا چاہیئے
یہ ہواے باغِ ہستی آج کچھ ہے کل ہے کچھ
دل کو اس سیرِ دو روزہ سے اُٹھایا چاہیئے
اس نصیحت سے تو بہتر ہے یہی اے ناصحو
کرکے کچھ تقریر یہاں تک اس کو لایا چاہیئے
شیخ پھر کعبے کو جاوے تو کروں اس کو سلام
ایک بار اس بُت کے کوچے کو دکھایا چاہیئے
منعِ الفت گر مجھے کرتے ہو ہمدم دوستو
تو تو قسمت کے لکھے کو بھی مٹایا چاہیئے

حیاں (جواں کے بیٹے) :

لیجئے پہاں ہر دم یار کے کوچے کی راہ
جو کوئی پوچھے اسے پتا بتایا چاہیئے
استفادے کے لئے اب اس غزل کو اے حیاں
شاعروں کی بزم میں سب کو سنایا چاہیئے

قاسم ، ابوالقاسم خاں دہلوی :

جی اُسی کے دھیان میں اپنا لگایا چاہیئے
دل سے اسبابِ تعلق سب اُٹھایا چاہیئے

---

[1] THE ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM, COMPILED FROM OFFICIAL RECORDS BY THOMAS ROEBUCK, PRINTED AT CALCUTTA IN 1819 صفحہ ۳۰۳

تحریک کے محرک LT. W. BLACKER اور ثانی MR. W. H MACNAGHTEN

[2] ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM ص ۲۹۳

[3] ایضاً ص ۲۹۴

[4] ایضاً صفحہ ۲۹۵

[5] " دیوانِ جہاں " : مخطوطہ برٹش میوزیم

خاک تھوڑی مرقدِ مجنوں سے لایا چاہیئے

ہوکے پامالِ خرامِ ناز جوں نقشِ قدم

آپ کو کوچے میں اس کے بس مٹایا چاہیئے

تاک کے سایے میں جاکر خوشۂ انگور کو

آبلے دل کے دکھا غیرت دلایا چاہیئے

اب اذیت دہ ہے پورب کی ہوائے مختلف

یہاں سے اسبابِ سکونت کو اٹھایا چاہیئے

لگ رہی ہے تو یہی قاسم کئی دن سے ہمیں

حضرتِ دہلی کو کلکتے سے جایا چاہیئے

ولاؔ، مظہر علی خاں ولاؔ دہلوی:

انس و جاں مشتاق ہیں مکھڑا دکھایا چاہیئے

اے پری رو چہرے سے برقع اٹھایا چاہیئے

اب تو اک پردہ نشیں پر آگیا ہے دل مرا

رازِ پر افشا نہ ہو اس کو چھپایا چاہیئے

قصۂ فرہاد و مجنوں کو کہوں میں کب تلک

اس میں شامل کرکے حالِ دل سنایا چاہیئے

بزم میں شب دیکھ مجکو غیر سے کہنے لگا

بیٹھے اس ڈھب سے جو اس کو اٹھایا چاہیئے

فورٹ ولیم کالج نے نثر میں سادگی شروع کی۔ ہرچند کہ یہ رجحان سرسید کے زمانے تک ایک ہمہ گیر اور وسیع تحریک میں تبدیل نہ ہو سکا۔ لیکن اس طرح ایک اچھے کام کی ابتدا تو ہوئی۔ شاعری میں (خارجی شاعرے کی دقتوں کے باوصف) وہ تقلیدی بندشوں میں گھرا رہا اور اس کی بڑی وجہ یہ کہ کالج کے توآموز صاحبوں اور انگریز طالب علموں کے لئے اردو نظم کی نہیں، نثر کی ضرورت تھی۔

ریویو کے لئے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

غزل

بہت عجیب ہے ہم اہلِ عشق کا دستور

کہ ضبطِ غم بھی ہے لازم تو چشمِ نم بھی ضرور

ہے غم کمالِ خوشی انتہائے عیش و سرور

جو غم نہیں تو مجھے زندگی نہیں منظور

ترا جمال مری جستجو کا حسنِ شعور

ترا خیال مری آرزو کا نکہت و نور

کبھی کبھی تو ضروری ہے ڈھہ جانا بھی

فقط وفا ہی نہیں اہلِ عشق کا دستور

ملال کیوں ہو جو ملتی نہیں مجھے منزل

یہ کم نہیں ہے کہ حاصل ہے جستجو کا شعور

مدارِ تیری طلب تیری جستجو پہ ہے

کہ راہِ عشق میں منزل نہ ہے قریب نہ دور

جہاں میں دعوئ اعلانِ حق ہے عام مگر

کہاں ہر ایک کو ملتا ہے رتبۂ منصور

عجیب چیز ہے نازشِ غمِ محبت بھی

تمام درد و اذیت، تمام لطف و سرور

غزل

ژوندۂ جوان تا ابد پرون شو رسمِ بُت گری
ژوند چہ زندگی سیٹماہ میرلن یہ شوقِ دلبری

باو تہ محبتُک سیراہ ، تراو سُو نخوتِ کتما
لو چہ پیتھ قلندری پہ شینہ کا ثبہ سکندری

وقتِ سحر قریب دوُت ، تازہ ہوا ڈلن ہیوتن
ساقیہ! زچہ پیتن بجر دُنتہ چہ جام گینہ ژہری

سادہ مُرادِ عشق آو وعـــدہ ہیتنِ کمن کمن
عقلِ بچارہ مُشکلن آیہ مہ سیتِ برابری

یُعتنہ بہ زاہنہ کُنن گرژ عیم قافلہ دوُت منزلـــس
دوُپ بہ تُوے مُتبس دِلـــس شو تہ ژہ کرِژہ رہبری

حُسنیہ بارگاہ بہ منز وُچہ بہ دِلکۂ عجیب رنگ
گوس دِلسں تۂ گوو رہبت اگوسنہ ورا د سرسری

شاردَ تِن چہ دِل پیتن تا وِہ تلن تۂ بأ گرُ ن
کیا د بہ وُنے وَنِ تکاں چھمنہ بہ کینہہ تگ •

(ترجمہ)

بُت گری کی وہ قدیم رسم آج ہی نہیں ابد تک زندہ وجواں رہے گی۔ (اس لئے کہ) تو نے
زندگی کو میرے شوقِ دلبری سے پیار ہو گیا ہے۔

دستِ آ اورمحبت کے کسی راز سے پردہ اُٹھا، جھوڑیں سے وہ پُرانی غرور ونخوت کی باتیں
عشق کی اس قلندری کے آگے طاقت کی کسی بھی سکندری کے قدم نہیں ٹھہر سکتے۔

سحر کا وقت قریب آپہنچا اور تازہ ہوا چلنے لگی۔
ساقی! آج اپنی عظمت کو سنبھال، بزم میں ابھی تک کچھ جام خالی پڑے ہیں۔

عشق سادہ مُراد ہے آیا اور آتے ہی بڑے بڑے وعدے حاصل کر گیا۔ رہی عقل سو بیچاری
تو میرے ساتھ بھی مشکل ہی سے نبھا سکی۔

اس اندیشے سے کہ کہیں کسی وقت میرے کانوں میں یہ بھنک نہ پڑے کہ قافلہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا،
میں نے پہلے ہی اپنے دلِ دیوانہ سے کہہ رکھا ہے کہ تم پورے ذوق وشوق سے رہبری کے فرائض انجام دینا

حُسن کی بارگاہ میں، میں نے دل کے عجیب رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں کبھی جو جی میں آیا تو
مبہوت ہو کے رہ گیا اور کبھی گماں گزرا تو محض ایک سرسری نظر ڈال کے چل دیا۔

شعر کہنا تو اپنا دل فکر کی کڑاہی میں تل کر اہلِ بزم میں بانٹنے کے مترادف ہے۔
ہائے میں یہ بات کیسے سمجھا سکوں! مجھے تو باتیں بنانا آتا ہی نہیں۔

دیوندر ستیارتھی

ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں

اِندرا کا ہاتھی تھا اَیراوت۔ اُس کا رنگ روپ کیسا تھا، سبھاؤ کیسا تھا، یہ مت پوچھئے۔ ایراوت کی تصویر پیش کر سکنا میرے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو ایک انسان کا قصہ ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔

نام ہے سُدامَا۔ زبان بڑی پیاری ہے۔ اُن کی عمر کا پُل بہت مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ اس کے نیچے سے پچاس سال اُس پار چلے گئے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں۔ جگہ جگہ کی کہانیاں سناتے تھکتے نہیں۔ لیکن اب تو راجدھانی سے ایسے چپک گئے ہیں، جیسے اُن کا آن جل اب ہمیشہ کے لئے اسی شہر کے ساتھ بندھ گیا ہو۔ بات بات میں یہی رٹ لگاتے ہیں کہ آن جل پہ مہر لگی رہتی ہے اور اُسے چھوڑ کر جانا کسی طور ممکن نہیں۔ میں سوچنے لگتا ہوں، یہ شخص ایک طرف اتنا وسیع تجربہ رکھتا ہے کہ اس کے پیچھے زیادہ نہیں تو تیس سال کی لمبی جاترائیں نظر آتی ہیں جیسے یہ پہاڑیوں کا لمبا چوڑا سلسلہ ہو اور دُور تک چلا گیا ہو، اور دوسری طرف یہ شخص آن جل کا فلسفہ لے بیٹھتا ہے۔ جس کے مطابق اب اُسے راجدھانی میں ہی رہنا چاہیئے۔ کبھی کارلائل کے حوالے سے کہتے ہیں "محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے"۔ کبھی کنفیوشس کے سنہری قول کا ذکر خیر کرتے ہیں۔ "صداقت انسان کو عظیم نہیں بناتی، انسان صداقت کو عظیم بناتا ہے۔" کبھی اُپنشد کے مطالعے سے نکال کر لے آتے ہیں ایک انمول موتی۔ "آنند سے ہی سارے سنسار میں جیون کا جنم ہوا ہے!" "دراصل میں تان اسی بات پر توڑتے ہیں۔" "سب آن جل کی بات ہے۔ اب میں جاترا پر نہیں نکل سکتا مگر بیٹھے بیٹھے کلپنا کے ہاتھی پر چڑھ کر دُور دُور نکل جاتا ہوں۔"

سچ پوچھو تو سدا ماجی کا یہی ہاتھی میرے من کو بھا گیا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات اتنی دلچسپ رہی تھی، اس کی میں نے کلپنا ہی نہ کی تھی۔ گلی سے بچوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی:

ہاتھی گھوڑا پالکی، جے کنھیا لال کی!

سُنتے ہی سداماجی بولے۔ "بچپن میں ہم نے بھی گایا تھا یہ گیت۔"

میں نے کہا۔ "اب تو ہاتھی گھوڑا پالکی کا زمانہ نہیں رہا۔"

سداماجی اُٹھ کر بک شیلف سے ایک کتاب نکال لائے۔ میں نے غور سے دیکھا یہ 'آبِ حیات' کی ایک پُرانی جلد تھی۔ وہ ورق گردانی کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ "کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"تھوڑا صبر کیجئے۔" وہ بولے۔ "ابھی دکھاتا ہوں، مل جائے ہی۔ پھر دیکھئے مزا! نہ آئے تو کہیئے۔ کیا کہا آپ نے؟ — اب تو ہاتھی گھوڑا پالکی کا زمانہ نہیں رہا! — کم بخت ملتا کیوں نہیں۔ لال پنسل سے نشان لگا رکھا ہے۔ ملے گا ضرور۔ ملنا ہی چاہیئے۔ جی ہاں۔ ضرور ملنا چاہیئے۔" وہ دیر تک ڈھونڈتے رہے۔ اور پھر خوشی سے اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ "مل گئی وہ چیز جو میں دکھانا چاہتا تھا۔"

"ارشاد۔" میں مسکرایا۔

وہ پڑھتے چلے گئے: "ایک تو وہ اودھ کا زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کی ناک کے بال تھے۔ اپنے کمالِ لیاقت اور شگفتہ مزاجی کے سبب سے مرجعِ خلائق تھے۔ دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی، نالکی کے ہجوم سے رستہ نہ ملتا تھا۔"

"پالکی تو ہوئی" میں نے ٹوکا "یہ نالکی کیا ہوئی، سداماجی؟"

"نالکی نہیں سمجھتے؟" سداماجی کو جیسے میرے سوال سے صدمہ ہوا۔ "نالکی یعنی کھلی پالکی۔ اس کو تام جھام بھی کہتے تھے۔" اور پھر انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "تو کیا اب یہ الفاظ محض لغات میں ہی سسکتے رہیں گے؟ خیر چھوڑیئے۔" اور وہ پھر پڑھنے لگے: "دوسری وہ حالت کہ پھر جو لکھنؤ گیا تو دیکھا کہ ظاہر درست تھا مگر درختِ اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی۔" اور پھر جیسے کسی بے لطفی کا

[illegible] تصویر پیش کی ہے ۔"

میں نے بڑے ادب سے کہا ۔" انشا بھی کیا خوب انسان تھے سداماجی! آنا نے وہ منظر بھی تو پیش کیا ہے کہ کس طرح انشا ایک مشاعرے میں پہنچے جس میں ابھی دو تین سو آدمی ہی آئے تھے ۔ مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا ۔ ایک شخص روئی دار مرزئی پہنے آیا اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا ۔ کسی نے اس سے مزاج پرسی بھی کی ۔ اس نے اپنی چلم میں تمباکو بھرا اور تھوڑا سلگا جایا اور کہا کہ صبیح ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا ۔"

سداماجی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور کتاب کا اگلا ورق پلٹ کر پڑھنے لگے :

" اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گڑگڑاتی نشک پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے ۔ وہ بے دماغ ہو کر بولا کہ صاحب نہیں ہمارے حال پر رہنے دو ، نہیں تو ہم جاتے ہیں ۔ سب نے اس کی بات کہنے تسلیم اور تعمیل کی ۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کہ کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا ۔ لوگوں نے کہا کہ جناب ، لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں ۔ سب صاحب آ جائیں تو شروع ہو ۔ وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے دیتے ہیں ۔ یہ کہہ کر تو بڑے میں سے ایک غذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی ۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

میں نے کہا ۔" کتنی بڑی حقیقت ہے ، کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں ! "

سداماجی جیسے کسی کلپنا میں کھو گئے اور پھر سنبھل کر کتاب کو پرے رکھتے ہوئے بولے " اتنی جلدی تو ابھی رخصت ہونے کا ہمارا ارادہ نہیں ہے ۔ ہاں تو بات چلی تھی ہاتھی گھوڑا پالکی کی ۔ آپ نے کہا ، ان کا زمانہ نہیں رہا ، یہ تو ٹھیک ہی کہا آپ نے لیکن اس کا بھی کیا اُپائے کیا جائے کہ ادب میں ادیبوں نے اس زمانے کی تصویر پیش کر رکھی ہے اور یہ تصویر منہ سے بولتی ہے ۔"

اس کے بعد چائے کا دور چلا ۔ تپائی پر ایک ہاتھ دانی پڑی تھی جس پر ملتی نقاشی کا خوبصورت نمونہ پیش کیا گیا تھا ۔ دیوار پر ایک طرف موہنجوداڑو کی زندگی کی تصویر لگی تھی تو دیوار دیگر پر جدید ترین ڈیزائن کا ٹائم پیس پڑا تھا ۔

[illegible] سداما نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا ۔" اب میں تو یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ پانچ ہزار برس پرانی اس تہذیبی کی طرف دیکھوں یا جدید ترین ٹائم پیس کی داد دوں ۔"

میں نے ہنس کر کہا ۔" سداماجی ! دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ نمائندہ ہیں "

سداماجی جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے ۔ پھر سنبھل کر بولے ۔" وہ ایک کہانی ہے نا ۔ سوتیلی ماں نے اپنی سوت کے لڑکے لڑکی کو گھر سے نکال کر ایک جنگل میں بھیج دیا تھا ۔ جانتے ہو لڑکے لڑکی نے جانے انجانے عقل سے کون سا کام کر ڈالا تھا ۔ جنگل میں تو چلے گئے دونوں بہن بھائی لیکن جاتے جاتے راستے بھر ایک ایک کنکر گرا کر اپنے راستے پر نشان لگاتے گئے ۔ سچ پوچھو تو پرانے وقتوں کی یہ چیزیں بھی اس زمانے کی نشانیاں ہیں جن کی مدد سے وہ زمانہ چاہے تو لوک کتھا کے بھائی بہن کی طرح جنگل سے گھر لوٹ سکتا ہے ، چاہے وہ موہنجوداڑو کی زندگی ہو چاہے غلیہ دور کی رنگ داری ۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا بیتا ہوا سمے واپس لوٹ سکتا ہے اور میں نے دیکھا کہ سداماجی پھر کسی سوچ میں ڈوب گئے ۔ اب جو اپنی کلپنا کی لہروں سے باہر نکلے تو اپنے ساتھ شاعر کی زبان پا کر آئے اور بڑے انداز سے گنگنانے لگے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

میں نے کہا ۔" وہ کہانی تو آپ نے ضرور سنی ہوگی ۔ ایک سنگیت کار کی کہانی گورو اور شِشیہ دونوں ساتھ ساتھ ایک ریاست میں پہنچے ۔ راجہ صاحب نے گورو جی کے سنگیت پر خوش ہو کر ہیرے لٹا دیں ۔ ایک دن جب راجہ صاحب نے سنا کہ گورو جی مندر میں بیمار پڑے ہیں تو وہ خود چل کر ان کا سماچار پوچھنے کے لئے آئے ۔ شِشیہ اداس بیٹھا تھا ۔ بہت سے بھگت لوگ موجود تھے ۔ بڑی مشکل سے گورو جی کو ہوش میں لایا گیا ۔ وہ بولے ۔" مجھے تو کوئی کشٹ نہیں " ۔ اشارے سے انھوں نے شِشیہ کو وچتر وینا بجانے کی آگیا دی ۔ شِشیہ وچتر وینا پر گورو جی کا دل پسند راگ بجانے لگا ۔ اسے سنتے سنتے گورو جی نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر پتہ چلا کہ گورو جی سنگیت کے پتھ پر چلتے چلتے اب اتنی دور نکل گئے کہ واپس آنا ناممکن ہے ۔"

" ٹھیک فرما رہے ہیں آپ " سداما نے چائے کا تیسرا کپ تیار کرتے ہوئے کہا ۔" کاش کسی کی موت اتنی ہی خوبصورت ہو سکتی ۔ موت کے بارے میں کسی کا یہ قول مجھے بے حد پسند ہے ۔ جیسے ماں بچے کو ایک طرف کا دودھ پلا کر یہ سوچتی ہے کہ شاید ادھر اتنا دودھ نہیں رہا ۔ وہ دوسری طرف کا دودھ پلانا چاہتی

رونا بند کر دیتا ہے جب دیکھتا ہے کہ ماں نے دوسری طرف کا دودھ اس کے مُنہ میں تھما دیا۔

" واہ سدا ماجی! موت کے بعد جھٹ زندگی شروع ہونے کی اس سے بڑھیا دلیل نہیں ہو سکتی۔" یہ کہتے ہوئے میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گھر لوٹتے ہوئے میرے دل و دماغ سے بار بار یہ آواز آتی رہی کہ سُداماجی بہت سُلجھے ہوئے مذاق کے انسان ہیں۔

بعد کی ملاقاتوں سے مجھے یہ پتہ چلتے دیر نہ لگی کہ سداماجی کی زندگی میں وہ دن تو ہرگز نہیں آ سکتے جب انھیں روٹیوں کے لالے پڑ جائیں۔ لیکن تازہ کمائی کی کمی کے مارے وہ پریشان ضرور رہتے ہیں۔ ڈرائینگ روم کی آرائش اور سجاوٹ پُرانی پڑتی جا رہی تھی۔ صوفے کا کپڑا، جو بہت پہلے ہی بدل دیا جانا چاہیئے تھا، اب تک سداماجی کے ذوق کا منہ چڑا رہا تھا۔ فرش پر جو ایرانی قالین بچھا رہا تھا، اس میں جگہ جگہ مرمت کی ضرورت تھی۔ کئی بار وہ اسے یہاں سے اُٹھا دینے کا فیصلہ کرتے کرتے رُک جاتے، جیسے وہ اس پُرانی یادگار کے غلام ہو کر رہ گئے ہوں۔

اُن کے بچّوں کی ماں انھیں چھوڑ گئی تھی۔ اس کے پیچھے کیا کہانی تھی، یہ مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ بچّے اپنے قدموں پر کھڑے ہو چکے تھے اور اُن سے الگ رہتے تھے۔ اپنے نوکر سے بھی سداماجی بہت خوش تو نہ تھے لیکن اب اس عمر میں نئی بیوی لانے کا بھی تو کوئی سوال نہ تھا۔

اپنے بچّوں کے بارے میں وہ کئی بار کہہ چکے تھے۔ " اُن سے میں یہی کہتا ہوں۔ مجھ پر اب تمھاری کوئی ذمہ داری نہیں۔ تم میری خدمت کرو، میں یہ بھی نہیں کہتا۔ بس اتنا ضرور کہتا ہوں، مجھ پر رحم کرو۔ مجھ سے کچھ مانگو مت۔"

ویسے وہ جانتے تھے کہ قانون کے مطابق اُن کا گھر اُن کے بچّوں کے حصّے میں آ کر رہے گا، بس اُن کے آنکھیں بند کرنے بھر کی دیر ہے۔ یہ خیال کیوں اُن کے لیے ایک چُبھن بن کر رہ گیا، یہ سمجھنا میرے لیے آسان نہیں۔

وہ کسی سے کم ہی ملتے جلتے تھے۔ لکھتے بھی بہت کم تھے۔ حالانکہ میں جب بھی اُن سے ملا، ایک نیا خیال لے کر لوٹا۔ اُن کی باتیں سنتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ راجدھانی کی ایک بے لاگ شخصیت یوں ہی برباد ہوتی جا رہی ہے۔ یہ شخص، جو اتنا گھوما پھرا ہے، جو کئی میگزینوں کا مدیر رہ چکا ہے، جو بہت سی کتابوں کا مصنّف ہے اور جو چائے کے پیالے میں طوفان اُٹھا سکتا ہے،

لگتا۔ سداماجی کے ڈرائنگ روم کے پُرانے صوفے پر بیٹھ کر پُرانے ایرانی قالین کی حالتِ زار پر ترس کھاتے ہوئے میں کئی بار سوچتا کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ ہمارے سداماجی کسی محفل میں ایک اچھی خاصی تقریر کریں اور سننے والے انھیں گھیر کر کھڑے ہو جائیں اور اس بات کا اقرار کریں کہ اب آئندہ وہ اپنے اس محبوب مصنّف کو چھپ کر گھر میں ہی بیٹھنے نہیں دیں گے۔

کئی بار باتوں باتوں میں سُداماجی نے صاف لفظوں میں کہا۔ " مجھے سونا نہیں چاہیئے۔ اپنے رام کی اب گہنے پہننے کی عمر نہیں رہی!" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ لیکن مجھے یہ جانتے دیر نہ لگی کہ سُداماجی یہ ضرور چاہتے ہیں کہ کسی طرح اپنے ڈرائینگ روم کو نئے ڈھنگ سے سجانے میں کامیاب ہو جائیں۔

یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ سداماجی نے لکھنے سے کیوں منہ موڑ لیا۔ حالانکہ وہ مانتے تھے کہ چالیس برس کی عمر پار کر جانے پر ہی انسان کوئی کام کی بات لکھ سکتا ہے۔ اب تو اُن کی عمر پچاس سے اُوپر تھی اور یہ بھی حقیقت تھی کہ پچھلے تین برس سے اُنھوں نے ڈٹ کر لکھنا تو دُور رہا، مہینے میں دو ایک کہانیوں اور چار پانچ مضامین کی اوسط نبھانے کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ خودداری کا یہ جنون کتنا خطرناک تھا، اور ہمیشہ یہ سوچتے رہنا کہ کوئی پبلشر رائلٹی کی پیشگی رقم دے کر یا کوئی ایڈیٹر ایک کہانی یا مضمون کے لئے سات سات چٹھیاں لکھ کر اُن کی کلپنا کو گُدگُدائے، کتنا غلط تھا۔ اس طرف اُن کی توجہ جاتی ہی نہ تھی۔ کارلائل کا یہ خیال کہ محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے، اُن کے ہاتھ سے کیوں نکل گیا۔ یہ بات میرے لئے کچھ کم تشویش ناک نہ تھی۔ کئی بار میں اُن سے کہتا۔ " دیکھئے سداماجی، کنفیوشس کے اس خیال میں تو آپ کا دشواش برابر بنا ہوا ہے نا کہ صداقت انسان کو عظیم نہیں بناتی، انسان صداقت کو عظیم بناتا ہے۔" وہ سامنے سے ہمیشہ ہاں میں سر ہلاتے۔ لیکن میرا اشارہ سمجھ کر بھی وہ میری بات کو اَن سُنی کر جاتے اور قلم اُٹھا کر پھر سے ادب کے میدان میں کُود پڑنے کا عہد کرنے کے راستے میں نہ جانے کیا رکاوٹ آ جاتی۔

سداماجی کے ہاں جاؤں اور اُن کی زبان سے پھول نہ جھڑیں، یہ تو ناممکن ہے۔ قلم سے چاہے ہی کام نہ لیں، زندگی کو وہ بہت بڑا میدان مانتے ہیں۔ اُن کا ادبی سرمایہ اُنھیں بقائے دوام بخشنے کے لئے کافی ہے۔ یہ تو وہ خود بھی نہیں مانتے۔ پھر میں یہ سوچ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ سداماجی قلم اُٹھا کر لکھنے

...میں نہیں بیچ پاتے۔ ان کی جیسی انہی باتوں میں ان کا سا عقیدہ ہے تو کیا تحریر میں وہ پیچھے رہ سکتی ہے؟ زبان پر انھیں پورا عبور حاصل ہے۔ زبان کو نیا رنگ روپ دینے کی شکتی بھی اُن میں نظر آتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے نہیں لکھنا چاہتے تو بول کر ہی لکھوانا شروع کر دیں۔ یہ خدمت میں سرانجام دے سکتا ہوں۔ لیکن اس کے جواب میں وہ ہمیشہ "واہ رے میں" یہ کہہ کر ہنس چھوڑتے ہیں۔ یا تو سداماجی کی دقعت ہی نہ ہوتی اس حد تک میری کلپنا میں، یا پھر وہ نئے ادب کے سہارے نئے کا ہتیہ کر لیتے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ یہ سوچ کر میری آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔

ابھی اگلے ہی روز سداماجی اپنی ایک سمندر یاترا کا ایک قصہ لے بیٹھے اور پھر چھوٹتے ہی بولے۔ "ساگر منتھن کی کہانی بھی کتنی دلچسپ ہے۔ ساگر سے چودہ رتن نکلے تھے اُن میں ایک لکشمی بھی تھی جسے وشنو بھگوان نے اپنا لیا۔ ساگر سے امرت بھی نکلا اور بس بھی۔ امرت کے لئے جھگڑا شروع ہو گیا۔ بس پینے کو کوئی تیار نہ ہوا۔ سارے کا سارا بس شِو نے اپنے منہ میں انڈیل لیا۔ لیکن اُسے کنٹھ سے نیچے نہ جانے دیا۔ اسی سے وہ نیل کنٹھ بن گئے۔ میں نے بھی زندگی کا بس پیا ہے۔ میں بھی نیل کنٹھ ہوں۔"

میں نے کہا۔ "سداماجی! یہی عنوان رکھئے۔ میں بھی نیل کنٹھ ہوں۔ ضرور لکھ ڈالئے۔"

"واہ رے میں!" سداماجی نے زور کا قہقہہ لگایا۔

پھر وہ دیر تک اس بات پر ویاکھیان دیتے رہے کہ دھرتی کا بھی تو ساگر سے جنم ہوا۔ وہ اس منظر کی دیر تک تعریف کرتے رہے جب سمندر کا پانی تو سیاہی مائل نیلا معلوم ہوتا ہے اور کئی کئی گز اونچی اٹھتی لہریں ساحل کی ریت کو گویا چاندی کے جھومر پہنا دیتی ہیں۔ اور پھر وہ اپنی بک شیلف سے ایک کتاب نکال لائے اور بولے "یہ ربندر ٹیگور کے خطوط کا ایک مجموعہ۔ اس کا پہلا خط مجھے بے حد پسند ہے۔"

"اسے پڑھئے۔" میں نے بڑے ادب سے کہا

"آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ میرا یہ کتابوں کا کیڑا بنے رہنے کا خبط کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔" وہ کہتے چلے گئے۔ "کبھی کبھی تو میرا دماغ کہتا ہے کہ آج کل لکھنے والوں کی تعداد اتنی بڑھتی جا رہی ہے کہ یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں وہ پڑھنے والوں کی تعداد سے بڑھ نہ جائے۔" یہ کہتے کہتے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور پھر ذرا سنبھل کر بولے۔ "خیر چھوڑیئے۔"

"آپ یہ خط پڑھ کر سنانے والے تھے۔"

"ضرور سنیں گے؟" وہ مسکرائے۔ "اچھا تو لیجئے۔ یہ ادبی خطوط کا مجموعہ مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کتاب کا نام ہے چھِنّ پتر یعنی ٹوٹے ہوئے پتے۔ یہ خط جس سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے، ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو لکھا گیا تھا۔ تب گورودیو کی عمر بہت زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں۔ "ساگر کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی نامعلوم شکتی بندھن میں پڑ کر چھل کو دبا رہی ہے اور ہم لوگ کسی چنتا کے بنا کنارے پر کھڑے ہیں۔ ساگر کے کھلے ہوئے منہ میں ہم لوگ گھر بار بنا کر بیٹھے ہیں۔ ہم لوگ گویا شیر کی یال پکڑ کر کھینچ رہے ہیں، تو بھی یہ بے سہارا شیر کچھ بھی نہیں بول پاتا۔ ایک بار اگر یہ ساگر چھٹکارا پا جاتا تو ہم لوگوں کا پھر کوئی نشان بھی نہ رہتا۔ پنجرے میں باگھ اپنی دُم اِدھر اُدھر پٹک رہا ہے ہم لوگ دو ہاتھ دور رہ کر کھڑے کھڑے ہنس رہے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہی لکھا ہے گورودیو نے۔"

"پھر آگے جا کر گورودیو لکھتے ہیں۔ "زمین اور ساگر میں لڑائی چل رہی ہے۔ زمین دھیرے دھیرے، چپ چاپ ایک ایک قدم اُٹھا کر اپنی سنتان کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتی جا رہی ہے اور ہارا ہوا ساگر پیچھے ہٹتا ہوا صرف پچھتاتا ہوا چھاتی پر ہاتھ مار کر بے حال ہو رہا ہے۔ یاد رکھئے کسی زمانے میں ساگر کا راج تھا۔ اُس سمے وہ پوری طرح سوتنتر تھا۔ اس کے گربھ سے جنم لے کر دھرتی نے اس کا سنگھاسن چھین لیا ہے۔ پاگل بوڑھا ساگر اپنے جھاگ کو لئے ہوئے کنگ لیئر کی طرح آندھی پانی میں، کھلے آکاش کے نیچے ولاپ کر رہا ہے۔"

"یہ تو بہت پتے کی باتیں ہیں سداماجی۔ آپ نے بھی تو کسی ساگر یاترا کو لے کر ایسا کوئی انوبھو دیا ہوتا۔"

"میری کلپنا کا ہاتھی بھی پھرتا رہتا ہے منزل بہ منزل!" سداماجی گمبھیر ہو گئے۔ "اسے روکنے والا تو آج تک پیدا نہیں ہوا۔ میرے پیچھے ہیں میری یاترائیں اُنھیں کون چھین لے گا۔"

"لیکن اس ہاتھی کو پیچھے جانے کی بجائے آگے جانا چاہیئے۔"

اس کا انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔

نوکر چائے لایا۔ انھوں نے چائے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اُن کا اشارہ پا کر اس روز میں نے دونوں پیالیوں میں چائے انڈیلی۔ اُن سے پوچھ کر اُن کی حسبِ منشا اُن کے پیالے میں آدھا چمچہ چینی ڈالی۔ لیکن وہ کچھ اتنے اداس

ٹال دی۔ "آج میں چائے نہ پیوں تو اچھا ہوگا۔ اندر سے طبیعت ٹھیک نہ ہو تو چائے اُلٹا نقصان کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "گورو دیو نے ساگر کے سمندر میں اتنے سندر و چار دئے تو کیا آپ کچھ بھی نہیں لکھ سکتے تھے؟"

"واہ رے میں!" کہتے ہوئے انھوں نے قہقہہ لگایا اور پھر سنبھل کر بولے "جب ہم کسی مندر کی یاترا پر جاتے ہیں تو پہلے بڑے پوجا بھاو سے مندر کے چاروں طرف گھوم کر پرکرما کرتے ہیں اور پھر مورتی کے درشن کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں لیکھک کی آتما سرسوتی کی مورتی کے گرد کئی کئی جنم پرکرما کرتے گزار دیتی ہے، تب کہیں کوئی لیکھک ٹیگور بن پاتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے شرما جی! میں بھی مانتا ہوں کہ گورو دیو ٹیگور ہمارے دیش کے ادب میں سورج بن کر چمکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم دئے بن کر چمکنے کو ذرا بھی اہمیت نہ دیں۔"

"واہ رے میں!" شرما جی ہنس پڑے۔ اور پھر ذرا سنبھل کر یہ شعر گنگنانے لگے — 'ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا!'

میں نے کہا۔ "اگر محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے، اگر صداقت انسان کو عظیم نہیں بناتی، انسان صداقت کو عظیم بناتا ہے، اگر یہ سچ ہے کہ آپ کے پیچھے تیس سال کی لمبی جاترائیں ہیں، اگر —"

"سب اُن مِل کی بات ہے۔" انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھئے۔ اپنشد کی وہ بات بھی مت بھول جائیے — آنند سے ہی سارے سنسار میں جیو ماتر کا جنم ہوا ہے۔"

"تو آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟ آنند کے لئے ہی سہی، لکھئے تو۔"

"واہ رے میں!" وہ پھر ہنس پڑے اور پھر ذرا سنبھل کر بولے۔ "میں نے اُس دن کیا کہا تھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ اس دیس میں لکھنے والوں کی تعداد پڑھنے والوں کے مقابلے میں بہت بڑھنے لگی ہے۔"

اس پر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ "سو تو ٹھیک ہے۔" اور پھر میں نے گمبھیر ہو کر کہا۔ "آپ یہاں اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ اتنی تنہائی بھی اچھی نہیں۔ یا پھر اس تنہائی سے لابھ اُٹھائیے۔ میرا مطلب ہے آپ کی تنہائی سے ہمیں لاابھ

"واہ رے میں!" وہ زور سے ہنس پڑے
معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا کسی نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں۔ میں اجازت لے کر چلا آیا۔

آخر میں نے ایک دن اپنا فرض پہچانا۔ میں نے ایک پبلشر کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ شرما جی کو ایک خط لکھے اور چھوٹتے ہی یہ وعدہ کر دے کہ اگر وہ اپنی جاتراؤں کی کہانی کو سموتے ہوئے ایک ضخیم آپ بیتی لکھ دیں تو انھیں اس کے لئے پندرہ فیصدی رائیلٹی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

شرما جی کو یہ پتہ نہ چلنے دیا گیا کہ اس خط کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔
اگلے ہی دن میں اُن سے ملنے گیا تو انھوں نے مجھے وہ خط دکھایا۔ میں نے صلاح دی کہ وہ فوراً اُس پبلشر کو رضا مندی کا خط لکھ دیں۔ وہ ہنس کر بولے

"واہ رے میں!" اور پھر سنبھل کر بولے۔ "کتاب کا نام کیا ہونا چاہئے؟"

"نام تو آپ ہی رکھیں گے۔"

"اب اس وقت تو کوئی نام سوجھ ہی نہیں رہا۔"

"یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ آپ خط کا جواب تو لکھ دیجئے۔"

اُس دن میرے بار بار زور دینے پر بھی انھوں نے جواب نہ لکھا۔
میں نے کہا۔ "تو اگر کسی روز پوچھتے پوچھتے وہ پبلشر یہاں آ نکلا تو اس پر آپ کا کیا رعب پڑے گا؟"

"آپ کا مطلب ہے ڈرائنگ روم سجانا چاہئے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ۔"

اگلے روز میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ صوفے کے لئے نیا کپڑا آ گیا ہے اور پرانا ایرانی قالین بھی اُٹھا دیا گیا۔ اُس کی جگہ وہ کمرے کے سائز کا نیا کارپٹ خرید لائے تھے۔ پہلے ہی یہ جوٹ کی رسیوں سے تیار کیا گیا تھا۔

بولے۔ "اب میں تیار ہوں، پہلے ہی وہ پبلشر کل آ جائے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا ہو کہ کتاب کا پہلا باب بھی آپ آج رات لکھ ڈالیں۔"

"واہ رے میں!" وہ ہنس پڑے۔ اور پھر سنبھل کر بولے۔ "میں جتن کروں گا۔"

اگلے دن میں شام کے وقت ٹیکسی لے کر اُن کے ہاں پہنچا۔ میں نے کہا "دیکھئے آج 'وانگا' میں ایک دعوت ہے جس میں فرانس کے ایک ادیب

" سوالات کیا جا رہا ہے۔ اپ ہی پچھیے۔ آپ کا فراس سے اس ادیب سے تعارف کرایا جائے گا۔ کیونکہ جیسے آپ نے یہاں ہمارے دیس میں تیس برس کی جاترا کی۔ پچھلے پندرہ برس سے وہ ادیب بھی سارے یورپ اور ایشیا کا چکّر لگا رہا ہے۔"

وہ تیار ہو گئے۔ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اُنھوں نے مجھے بتایا کہ " آپ بیتی کا پہلا باب میں نے لکھ ڈالا۔"

" یہ تو بہت اچھا ہوا۔ وہاں وہ پبلشر بھی تو ہو گا۔"

" میٹنگ کے بعد سے ہمارے ہاں پینے آئیں گے۔" وہ ہنس پڑے۔

" واہ رے میں!"

ہال میں پہنچنے پر میں سب سے پہلے انھیں کھینچ کر اُس صوفے پر لے گیا جہاں وہ پبلشر بیٹھا تھا۔

اُنھوں نے اپنی آپ بیتی کا پہلا باب جیب سے نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ " آج ہی میں آپ کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دوں گا۔"

پبلشر کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ بولا۔ " کتاب کا نام بہت اچھا سا ہونا چاہیے۔ کتاب یا تو نام اچھا ہونے پر بکتی ہے یا ٹائٹل کی تصویر خوبصورت ہونے پر۔ ٹائٹل کا انتظام میں نے کر لیا ہے۔"

" کتاب کا نام کیا رکھا جائے؟" شرما جی نے گمبھیر ہو کر کہا۔

لیکن اگلے ہی لمحے ہاتھ سے کاجو کی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

" واہ رے میں! لیجیے۔ یہ نام اچھا رہے گا اور کتاب خوب بکے گی۔ بس یہی نام رکھیے — ہاتھی ہیرے گاؤں گاؤں!"

ضروری نوٹ

غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ واپسی کے لئے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ مضمون کے ساتھ ہو گا۔

گوپال مِتل

غزل

فقط اک شغلِ بیکاری ہے اب بادہ کشی اپنی
وہ محفل اُٹھ گئی قائم تھی جس سے سرخوشی اپنی

خدایا نا خدا اب جس کو چاہو بخش دو عزّت
حقیقت میں تو کشتی اتفاقاً بچ گئی اپنی

بس اب گذریں گے راہِ زندگی سے بے نیازانہ
اگر تیرے کرم پر منحصر ہے زندگی اپنی

بڑا جی چاہتا ہے یہ فقط نقشِ بصارت ہو
بڑی سرعت سے دنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

خموشی پر بھی ہے ان کو گماں عرضِ تمنا کا
زبانِ حال سے کچھ کہہ گئی وارفتگی اپنی

اگر تم ہنس دئے احوالِ دل پر کیا تعجب ہے
کہ میں خود بھی بمشکل ضبط کرتا ہوں ہنسی اپنی

ہوئی ہیں بارشیں سنگِ ملامت کی بہت لیکن
نہ بدلی وضعِ جنوں قائم ہے شوریدہ سری اپنی

آسکر وائلڈ کا اِک شہ پارہ

آسکر وائلڈ عہدِ وکٹوریہ کا مشہور ادیب تھا جس نے اپنے خاص طرزِ تحریر سے اس عہد کے ادب میں انقلابِ عظیم پیدا کیا۔ اس کے ادب کی وہ خصوصیت جسے POETRY IN PROSE یا "شعرِ منثور" کہتے ہیں بہت زیادہ مقبول ہوئی کیونکہ اس سے قبل اس تحریر کے نمونے صرف فرانسیسی ادب میں ملتے تھے اور انگریزی ادب اس سے ناآشنا تھا۔

اپنی اس مخصوص طرزِ انشا میں اس نے یونانی صنمیات کی ایک روایت کو پیش کیا ہے جس میں اس کا فطری طنز بھی کافی نمایاں ہے۔ اس کا عنوان بھی اس نے POETRY IN PROSE یعنی شعرِ منثور رکھا ہے۔ اس کا لب ولہجہ اس مضمون میں وہی ہے جو عہدِ عتیق کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ ادبِ لطیف میں یقیناً ایک نیا اضافہ ہے۔

ایک شام اس کے جی میں آئی کہ آؤ ایک مجسمہ بنائیں "مسرت" کا، خواہ وہ ایک لمحے ہی کی مسرت کیوں نہ ہو۔ اور وہ کانسے کی تلاش میں چل پڑا۔ کیونکہ وہ اس بت کے مجسمے کا تصور صرف کانسے ہی میں کر سکتا تھا۔ لیکن دنیا کا تمام کانسہ ختم ہو چکا تھا۔ اسے کہیں بھی کانسہ نہ ملا، سوا اُس "مجسمۂ غم" کے، جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا اور اس کی قبر پر نصب کر دیا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے یہ مجسمہ اس لئے نصب کیا تھا کہ انسان کی دائمی محبت اور اس محبت سے کبھی نہ مٹنے والے غم کی یادگار قائم رہے۔ اور اب ساری دنیا میں سوا اس مجسمے کے کانسے کے کوئی اور کانسہ موجود نہ تھا۔ اس نے مجسمۂ غم کو قبر سے اُٹھا لیا اور ایک بڑی بھٹی میں رکھ کر آگ دے دی۔ مجسمۂ غم سے اس نے ایک دوسرا مجسمہ "مسرت" کا تیار کیا۔ لیکن "مسرت گریز پا" کا۔!

رات تھی اور وہ تنہا۔ اس کو دور شہر کی فصیل نظر آئی۔ وہ اس کی جانب چل پڑا۔ جب قریب پہنچا تو اس نے شہر کے اندر مسرت کے قدموں کی آہٹ، خوشی کے قہقہے اور بربطوں کی بلند آوازیں سنیں۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دربان نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے دیکھا سنگِ مرمر کا ایک مکان جس کے ستون بھی سنگِ مرمر ہی کے تھے اور ان پر پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر اور باہر دیودار کی مشعلیں روشن تھیں۔ وہ اندر داخل ہوا۔ جب مرمر اور یشب کے کمروں سے گذر کر ضیافت کے بڑے کمرے میں پہنچا تو ارغوانی رنگ کی کوچ پر ایک ہستی کو لیٹے دیکھا جس کے بالوں میں سُرخ گلاب کے پھول گندھے ہوئے تھے اور لب شراب سے سُرخ تھے۔ وہ پشت کی طرف بڑھا اس کے شانے کو چھوا اور کہا۔ "تم اس طرح کیوں رہتے ہو؟" نوجوان نے گردن موڑی، پہچانا اور جواب دیا۔ "میں کسی وقت کوڑھی تھا، تم نے مجھے اچھا کیا، تو پھر کس طرح رہوں؟"

وہ گھر سے باہر نکلا اور گلیوں میں پھرا، تھوڑی دیر بعد ایک عورت کو دیکھا جس کا چہرہ اور لباس رنگین تھا اور پاؤں میں موتیوں کے سلیپر۔ اس کے پیچھے آہستہ آہستہ ایک شکاری آ رہا تھا، جو کئی رنگ کا لبادہ پہنے تھا۔ عورت کا خوبصورت چہرہ ایک تراشے ہوئے مجسمے کا سا چہرہ تھا، اور اس نوجوان کی آنکھیں ایک خاص جذبے سے روشن۔ اس نے تیزی سے دونوں کا پیچھا کیا اور نوجوان کا ہاتھ چھو کر کہا۔ "تو عورت کو کیوں اس طرح دیکھتا ہے۔" نوجوان نے پہچانتے

تولیو نہ دیکھوں؟"

وہ آگے بڑھا عورت کے رنگین لباس کو چھوا اور بولا - "کیا اس دنیا میں کوئی اور راستہ نہیں جو گناہ کی راہ سے ہٹ کر گزرتا ہو؟" عورت نے پلٹ کر دیکھا، پہچانا ہنسی اور بولی: "تم نے میرے گناہ بخش دئے تھے، اب میرے لئے زندگی کا یہ راستہ بڑا مسرت بخش راستہ ہے۔"

وہ شہر سے باہر نکل گیا۔ کچھ دور چل کر دیکھا سڑک کے کنارے ایک نوجوان بیٹھا رو رہا ہے۔ یہ آگے بڑھا اس کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں چھوئیں اور پوچھا۔ "تم کیوں رو رہے ہو؟" نوجوان نے سر اونچا کیا اور پہچان کر بولا - "میں مر گیا تھا تم نے مجھے دوبارہ زندہ کیا۔ اب میں رونے کے سوا کیا کروں؟"

جب نرگس مری تو اس کی مسرتوں کا چشمہ شیریں پانی کے جام کی جگہ آنسوؤں کے جام میں تبدیل ہو گیا، اور پہاڑی پریاں جنگل کی طرف سے روتی ہوئی آئیں۔ تاکہ وہ "چشمۂ غم" کے پاس کچھ گائیں اور اس میں سکون پیدا کریں۔ جب انھوں نے شیریں جامِ مسرت کو آنسوؤں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا تو اپنے بالوں کی سنہری لٹیں کھول ڈالیں اور بولیں: "نرگس ایسی ہی حسین تھی اور تمھیں اس کے لئے اتنا ہی غم کرنا چاہیئے۔" چشمے سے آواز پیدا ہوئی "کیا واقعی نرگس اتنی ہی حسین تھی؟" پریوں نے جواب دیا - "تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ ہمارے پاس سے تو وہ بے خبر گذر جاتی تھی، اس کو ہمیشہ تمھاری تلاش رہی، وہ تمھارے ہی ساحلوں پر لیٹی رہتی، تم کو دیکھتی رہتی، تمھاری ہی لہروں کے آئینے میں وہ اپنے آپ کو تکا کرتی۔" چشمے نے جواب دیا۔ "میں بھی نرگس سے محبت کرتا تھا کیوں کہ جب وہ میرے کنارے آتی، مجھے دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں مجھے خود اپنے عشق کی جھلک نظر آتی۔"

جب تاریکی پھیلی، یوسف نے ایک مشعل صنوبر کی روشن کی اور پہاڑی سے اُتر کر وادی میں چلا گیا، اسے اپنے گھر میں کام تھا۔ "وادیٔ حسرت" کے پتھروں پر اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان بیٹھا رو رہا ہے۔ اس کے بالوں کا رنگ شہد کا سا تھا اور جسم سفید پھول کی مانند لیکن کانٹوں سے زخمی اور خاک آلود۔
اس نے اس برہنہ روتے ہوئے نوجوان سے کہا: "میں جانتا ہوں تمھارا

اپنے لئے روتا ہوں۔ میں نے بھی پانی کو شراب بنا دیا ہے، میں نے بھی کوڑھیوں کو اچھا کیا ہے، میں نے بھی اندھوں کو بینائی عطا کی ہے، موجوں کی سطح پر میں چلا ہوں اور میں نے بھی قبرستانوں سے شیطانوں کو بھگایا ہے۔ میں نے صحرا میں بھوکوں کو کھانا کھلایا ہے اور مردوں کو اُن کی تنگ قبروں سے اُٹھا کر زندہ کیا ہے اور ایک بڑے مجمع کے سامنے ایک خشک انجیر کا درخت اُٹھا کر اس پھل لے آیا۔ تمام وہ باتیں جو اُس نے کی ہیں میں نے بھی کیں۔ مگر لوگوں نے اب تک سولی پر نہیں چڑھایا۔"

فیصلہ گاہ میں خاموشی تھی۔ جب وہ آیا تو خدا نے اس کی زندگی کی کتاب کھولی اور کہا - "تیری زندگی بڑی گندی ہے۔ تو نے ان لوگوں پر ظلم کیا جو مدد کے محتاج تھے اور ان کے ساتھ سخت دلی سے پیش آیا جن کا کوئی ہمدرد نہ تھا، جو کچھ طلب تیرے پاس آئے تو نے اُن کی ایک بھی نہ سنی، تیرے کان میرے ستم رسیدہ بندوں کی آواز کے لئے بند رہے، یتیموں کا مال تو نے لے لیا، پڑوسیوں کے تاکستان میں تو نے لومڑیاں بھیجیں، بچوں کے ہاتھ سے روٹی چھینی اور کتوں کو دے دی، کوڑھیوں جو دور دلدلوں میں رہتے تھے دھتکارا اور میری زمین پر جس سے میں نے تجھے پیدا کیا تھا تو نے معصوموں کا خون بہایا۔" اس نے جواب دیا۔ "بے شک سب کچھ میں نے کیا۔" خدا نے پھر اس کی زندگی کی کتاب کھولی اور کہا "تیری زندگی بہت خراب گندی۔ تو حسن اور نیکی سے بالکل بے خبر رہا، تیرے مکان کی دیواریں بتوں کی تصویروں سے رنگین رہتی تھیں اور تو اپنے بستر سے عود اور بربط کے نغمے سنا کرتا تھا۔ تو نے گناہوں کی سات قربان گاہیں تعمیر کیں، تو نے وہ چیزیں کھائیں جو نہ کھانی چاہیئے تھیں اور تو نے وہ لباس پہنے جو گناہ کے نشان سے آلودہ تھے، تیرے بت سونے چاندی کے نہ تھے جو پائیدار ہوتے، بلکہ گوشت کے تھے جو فنا ہونے والے تھے، تو نے اُن کے بالوں میں خوشبو لگائی۔ ان کے ہاتھوں میں انار رکھے، پاؤں میں زعفران ملی، ان کے سامنے قالین بچھائے۔ سُرمے سے تو نے ان کی آنکھوں کو آراستہ کیا اور اُن کے جسم کو مہندی سے رنگین بنایا۔ اور تو نے اپنے آپ کو اُن کے سامنے جھکایا۔" آدمی نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔"
خدا نے پھر تیسری بار اُس کی زندگی کی کتاب کھولی اور کہا۔ "تیری

زندگی بہت خراب گذری ہے۔ تیرے ہاتھوں سے انھیں کوڑی کیا جنھوں نے تجھے غذا دی اور ان مینوں کو مجروح کیا جن سے تو نے دودھ پیا۔ وہ جس نے تجھے پانی دیا تیرے پاس سے پیاسا اُٹھا اور وہ لوگ جنھوں نے تجھے رات کو اپنے خیموں میں پناہ دی تو نے انھیں کا راز فاش کیا۔ جس نے تجھے کبھی نہ ستایا اسی پر تو نے اپنی کمین گاہ سے حملہ کیا اور اپنے جال میں پھنسایا۔ تیرے وہ دوست جو تیرے ساتھ رہتے ان کو تو نے دھوکا دیا اور جن کو تجھ سے محبت تھی تو نے اُن سے نفرت کی۔" آدمی نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے یہ بھی کیا۔"

خدا نے اس کا صحیفۂ حیات بند کیا اور کہا۔ "میں ضرور تجھے جہنم میں بھیجوں گا۔" آدمی چیخ اٹھا۔ "نہیں تو ایسا نہیں کر سکتا ہے۔" خدا نے پوچھا۔ "میں کیوں نہیں ایسا کر سکتا؟" آدمی نے جواب دیا۔ "کیوں کہ میں ہمیشہ دوزخ ہی میں رہا ہوں۔"

فیصلہ گاہ میں خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد خدا بولا۔ "چوں کہ میں تجھے جہنم میں نہیں بھیج سکتا اس لیے اب میں تجھے جنّت میں بھیجوں گا۔ اب تجھے جنّت میں جانا پڑے گا۔"

آدمی نے کہا۔ "نہیں تو یہ بھی نہیں کر سکتا۔"

خدا نے پوچھا۔ "میں کیوں نہیں ایسا کر سکتا؟"

آدمی بولا۔ "کیوں کہ میں کبھی جنّت کا صحیح تصوّر نہیں کر سکا۔"

وہ لڑکپن ہی سے خدا کے علم سے بھرپور تھا۔ جب چھوٹا تھا تب سے ہی مقدّس راہب اور بہت سی مقدّس عورتیں جو اس کے شہر میں رہتی تھیں اس کے سنجیدہ اور عاقلانہ جوابوں سے حیران رہ جاتی تھیں۔ جب اس کے ماں باپ نے اسے جوانی کی عبا اور انگوٹھی دی تو اس نے انھیں بوسہ دیا اور اپنے والدین کو چھوڑ کر دُنیا میں خدا کی باتیں کرنے نکل گیا۔ اس وقت بہت سے لوگ ایسے تھے جو خدا کو بالکل نہیں جانتے تھے یا اس کا بہت تھوڑا علم رکھتے تھے یا ان دیوتاؤں کو پُوجتے جو غاروں میں رہتے۔ اس نے اپنا چہرہ آفتاب کی طرف کیا اور برہنہ پا چل پڑا جیسا کہ اس نے مقدّس راہبوں کو کرتے دیکھا تھا۔ چمڑے کا ایک تھیلا کمر میں اور ایک چھوٹی مٹی کی بوتل پہلو میں لے کر وہ شاہراہوں سے گذر رہا تھا اور بہت خوش تھا۔ وہ برابر خدا کی تعریف کے گیت گاتا جاتا تھا۔ کچھ زمانے بعد وہ ایک ایسی سرزمین پہ پہونچا جہاں بہت سے شہر آباد تھے۔ وہ گیارہ شہروں سے گذرا جن میں سے بعض وادیوں میں تھے، بعض بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے اور کچھ پہاڑیوں پر۔ ہر شہر میں اُس نے اپنا ایک مُرید پیدا کیا جو اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس طرح بہت سے لوگ ہر شہر سے اس کے پیرو ہو گئے اور خدا کا علم اس سرزمین میں پھیل گیا۔ بہت سے حکمران اور بجاریوں نے اس کا مذہب قبول کر لیا۔ جب وہ دوپہر کو اپنے ڈھول بجاتے تو لوگ طاؤس اور بہت سے جانور نذرانے کے طور پیش کرتے۔ اس کے مُریدوں کی تعداد بڑھتی گئی لیکن اس کے ساتھ اس کا غم بھی بڑھتا گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں اس قدر غمگین ہے حالانکہ وہ ہمیشہ خدا ہی کی باتیں لوگوں سے کیا کرتا۔ ایک شام وہ گیارھویں شہر کے اندر سے گذرا جو آرمینیا کا شہر تھا۔ یہاں بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہو لیے۔ پہاڑ پر جا کر وہ ایک چٹان پر بیٹھا اس حال میں کہ اس کے سارے مُرید چاروں طرف کھڑے ہوئے تھے اور دوسرے لوگ وادی میں اس کے سامنے دوزانو نظر آتے تھے۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اپنی رُوح سے خطاب کیا۔ "ایسا کیوں ہے کہ میں غم اور خوف سے بھرا ہوا ہوں اور میرا ہر مُرید دشمن کی طرح پیچھا کرتا نظر آتا ہے۔" روح نے کہا۔ "خدا نے تجھ کو اپنے علم سے بھر دیا تھا لیکن تو نے یہ علم دوسروں کو دے دیا۔ اس قیمتی موتی کو تو نے چُور چُور کر دیا اور اپنی مقدّس عبا کو جس میں کوئی جوڑ نہ تھا پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ جو اپنی عقل دوسروں کو دے دیتا ہے اپنے آپ کو تباہ کر دیتا ہے۔ جیسے کوئی اپنا خزانہ قزاق کو دے دے۔ کیا خدا تجھ سے زیادہ عقل مند نہیں؟ تب پھر تو کون ہوتا ہے جو خدا کے راز دوسروں پر ظاہر کرے۔ میں کسی وقت امیر تھا تو نے مجھے غریب کر دیا۔ میں کسی وقت خدا کو دیکھتا تھا اب تو نے اسے میری نظروں سے چھپا لیا۔" وہ روتا رہا کیوں کہ اس نے جان لیا کہ اس کی رُوح سچ کہتی ہے۔ اس نے واقعی خدا کا علم دوسروں کو دے دیا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اب میں خدا کی باتیں کسی سے نہ کروں گا۔ اس کے مُرید پاس آئے اس کے سامنے سرنگوں ہوئے اور بولے "اے آقا کچھ خدا کی بات کر۔" اس نے جواب دیا۔ "میں آسمان و زمین میں جو کچھ ہے ان سب کی باتیں کر سکتا ہوں لیکن خدا کی نہیں، اب نہ کبھی۔" یہ سُن کر وہ بہت برہم ہوئے اور بولے۔ "ہم تیرے ساتھ اس صحرا میں اس لیے آئے تھے کہ تو ہم سے خدا کی باتیں کرے گا اور اب تو ہمیں تشنہ اور ناکام واپس لوٹا رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "نہیں اب میں تم سے خدا کی بات نہ کروں گا۔" یہ سُن کر وہ لوگ بڑبڑانے لگے۔ "تو ہمیں صحرا میں لایا، ہم نے

بھوک پیاس گوارا کی اور اب ہم تجھ سے خدا ہی کی باتیں سُنیں گے۔" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے مرید رنجیدہ اور ملول اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ جن میں سے اکثر راہ ہی میں فنا ہو گئے۔ اب وہ تنہا تھا۔ اُٹھا، اپنا چہرہ چاند کی طرف کیا اور سات مہینوں تک چلتا رہا۔ نہ کسی سے بات کی نہ کسی کا جواب دیا۔ جب ساتویں مہینے کا چاند گھٹنے لگا تو وہ ایک صحرا میں پہنچا — دریائے نیل کا صحرا — یہاں وہ ایک غار میں جاکر ٹھہر گیا۔ اس نے نرکلوں کی ایک چٹائی بیٹھنے کے لئے بنائی اور خدا کی توصیف میں مشغول ہو گیا۔ ایک شام وہ غار کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نوجوان کو دیکھا، بہت خوبصورت نوجوان — لیکن بوسیدہ لباس میں۔ یہ نوجوان روز شام کو اُس کے پاس سے خالی ہاتھ گذرتا۔ جب صبح کو لوٹتا تو اس کے ہاتھ موتیوں اور عقیق سے بھرے ہوتے۔ کیوں کہ وہ قزاق تھا اور سوداگروں کے قافلے لوٹتا تھا۔ یہ اس کو دیکھتا اس کے حال پر افسوس کرتا مگر کہتا کچھ نہیں۔ ایک صبح جب وہ نوجوان اپنے ہاتھوں میں جواہرات لئے ہوئے لوٹا تو اس کے پاس ٹھہر گیا اور غصّہ کی آواز سے بولا۔ "تم کیوں مجھے روز اس طرح دیکھتے ہو، جب میں اس طرف سے گذرتا ہوں، آج تک کسی آدمی نے مجھے ان نگاہوں سے نہیں دیکھا — ایسی نگاہیں جو کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔" راہب نے جواب دیا۔ "جو چیز تم میری آنکھوں میں دیکھتے ہو وہ کانٹا نہیں رحم ہے۔" نوجوان یہ سن کر حقارت سے ہنسا اور بولا "میرے ہاتھوں میں موتی ہی موتی ہیں اور تمھارے پاس بیٹھنے کے لئے ایک اچھی چٹائی بھی نہیں، تم کو مجھ پر کیوں رحم آتا ہے؟ مجھے تم پر رحم آنا چاہیئے۔" راہب بولا۔ "مجھے رحم اس لئے آتا ہے کہ تم خدا کے علم سے ناواقف ہو۔" نوجوان اور زیادہ قریب آگیا اور غار کے دہانے کے پاس جاکر بولا۔ "کیا خدا کا علم بہت قیمتی چیز ہے؟" راہب بولا "ہاں، وہ دنیا کے تمام موتیوں سے زیادہ قیمتی ہے۔" نوجوان قزاق بولا۔ "کیا وہ تمھارے پاس ہے؟" راہب نے کہا ہاں کسی وقت تھا لیکن اپنی حماقت سے دوسروں کو بانٹ دیا۔ پھر بھی جو کچھ رہ گیا ہے وہ تمھارے تمام موتیوں سے زیادہ قیمتی ہے۔" یہ سُن کر نوجوان نے موتی پھینک دئے اور اپنی تیز تلوار کھینچ کر بولا۔ "خدا کا علم مجھے دے، ابھی دے۔ ورنہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ میں کیوں نہ اُسے ہلاک کر دوں جو میرے موتیوں سے بھی بیش بہا دولت اپنے پاس چھپائے ہوئے ہے۔" راہب نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور بولا۔ "کیا یہ میرے لئے بہتر نہ ہوگا کہ میں خدا کے سب سے بلند دربار میں پہونچ کر اس کی حمد بجالاؤں، تم اگر چاہتے ہو تو مجھے مار ڈالو لیکن میں خدا کا علم تجھ پر نہ ظاہر کروں گا۔" قزاق دو زانو ہو کر اس سے التجا کرنے لگا لیکن راہب نے خدا کی بات اس سے نہ کی۔ قزاق اُٹھا۔ راہب سے بولا "خیر جانے دو، تمھاری مرضی اب میں سات گناہوں کے شہر کو جاتا ہوں جو یہاں سے تین دن کے فاصلے پر ہے۔ جہاں میں ان موتیوں کے بدلے مسرّت و شادمانی خرید سکوں گا۔" وہ اپنے موتی اور عقیق لے کر چلا گیا۔ راہب بھی اُٹھا اور اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ تین دن تک وہ قزاق کے پیچھے چلتا رہا اور کہتا رہا۔ "لوٹ آؤ سات گناہوں کے شہر میں نہ جاؤ۔" راہب کی ہر آواز کے اوپر قزاق پلٹ کر دیکھتا اور پوچھتا "کیا تم مجھے خدا کا علم بتاؤگے جو میرے موتیوں سے زیادہ قیمتی ہے اگر مجھے وہ دو تو میں بے شک سات گناہوں کے شہر میں داخل نہ ہوں گا۔" راہب کہتا۔ "نہیں میں سب چیزیں تم کو دے سکتا ہوں مگر خدا کا علم نہیں۔"

تیسرے دن شفق کی روشنی میں وہ شہر معصیت کے ارغوانی پھاٹک کے دروازے پر پہونچے۔ شہر کی طرف سے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ نوجوان قزاق بھی ان کے جواب میں ہنسنے اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ راہب یہ دیکھ کر دوڑ پڑا اور دامن پکڑ کر بولا۔

"اپنے ہاتھ پھیلا، اپنے بازو میری گردن میں ڈال، اپنا کان میرے ہونٹوں کے پاس لا، خدا کا جو کچھ علم میرے پاس باقی ہے تجھے دوں گا۔"

قزاق رُک گیا، جب راہب خدا کا علم اُسے دے چکا تو زمین پر گر گیا، رونے لگا اور ایک تاریکی چھا گئی۔ جس میں وہ قزاق کو نہ دیکھ سکا جب وہ بیٹھا ہوا رو رہا تھا تو اُسے صرف ایک ہستی کا ہوش تھا، جو اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے پاؤں پیتل کے تھے اور بال باریک اون کے سے۔ اس نے راہب کو اُٹھایا اور بولا: اس سے پہلے تجھے صرف خدا کا علم حاصل تھا لیکن اب تجھے اس کی محبت بھی حاصل ہوگئی۔ تو کیوں روتا ہے۔ جا! ....

راہب نے بوسہ دیا اور چلا گیا۔



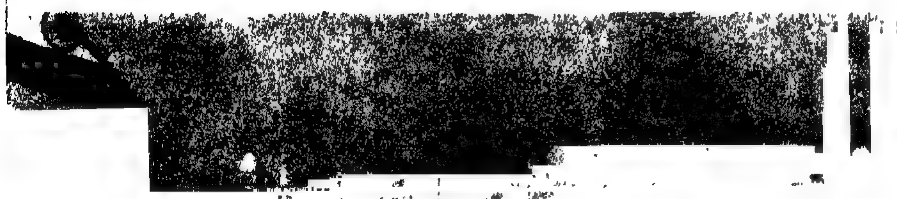
راشٹرپتی کا سلامی کی جگہ پر ورود



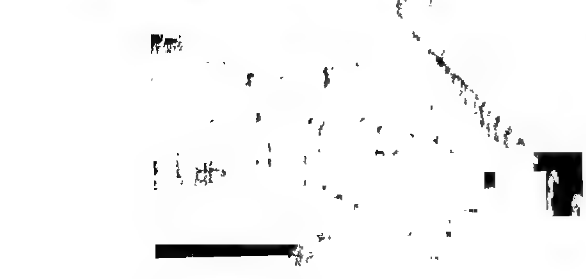
دہلی میں جشن جمہوریت

ایک بچی شری نہرو کو پھول پیش کر رہی ہے

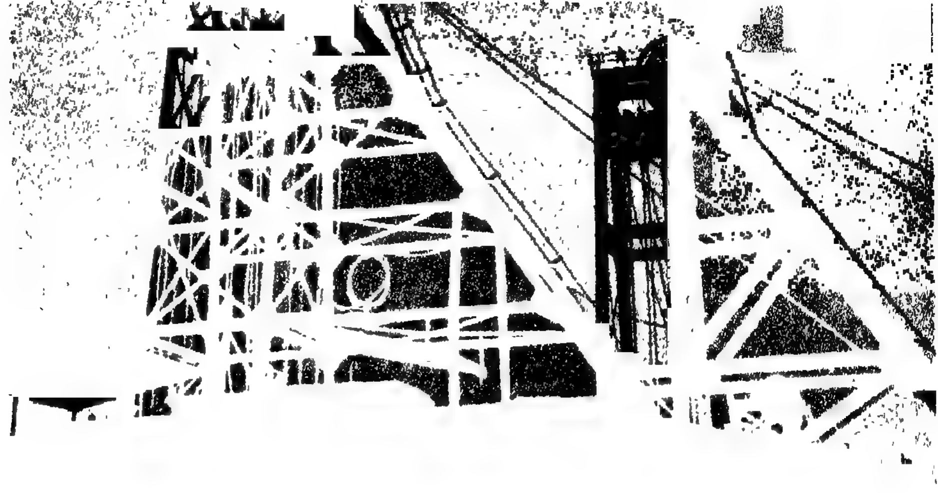
پنجاب ریجیمنٹ کے جوان سلامی دے رہے ہیں











سیاہ ہیرے کی کہانی (صفحہ ۳۴)

اوپر - سیاہ ہیرے کو سطح زمین پر لانے والی مشینری

بائیں - کوئلے کے کھیت (Quarry mining)

نیچے - کان کن زیر زمین کان میں اتر رہے ہیں (Pit-mining)





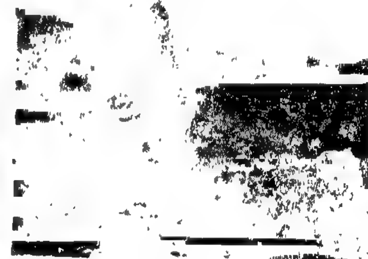


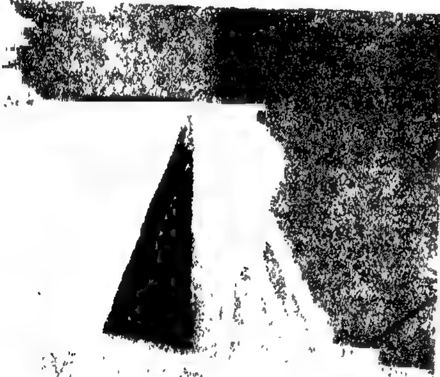


اوپر - کوئلہ بھرا ٹب پٹی پر انڈیلا جا رہا ہے

نیچے دائیں - بجلی کے ذریعے کان کنی

نیچے - کان سے گرم گندی ہوا کو نکال کر اس میں صاف ٹھنڈی ہوا پھونکنے کی مشین







سیاہ ہیرے کی کہ

اوپر - پٹی کوئلہ کو ویگن میں
ڈال رہی ہے

اوپر دائیں - پٹی کے ذریعے کوئلہ

دائیں - کام سے واپسی

نیچے دائیں - کوئلے کے ڈپو کا م

نیچے - تارکول بنانے کا کارخانہ





سیاہ ہیرے کی کہانی

کہتے ہیں جب زمین آفتاب سے جُدا ہوئی تھی تو وہ اُس وقت جلتی ہوئی آگ تھی۔ لیکن بارش اور ہوا کی وجہ سے وہ زمین آہستہ آہستہ سرد ہوتی گئی۔ ایک زمانے کے بعد جب زمین کے اوپر کا حصّہ ٹھنڈا ہو گیا (اور آگ کچھ نیچے چلی گئی) تو سطحِ زمین پر درخت اُگ آئے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں، جہاں اب کوئلہ پایا جاتا ہے، وہاں بہت ہی گھنا جنگل تھا۔ ابتدائے آفرینش میں زمین پر بہت بڑے بڑے تغیرات ہوتے رہے۔ جس آہستگی سے زمین کے نیچے کی آگ ٹھنڈی ہوتی گئی اُسی طرح زمین دھنستی اور چھٹتی رہی۔ بڑے بڑے تباہ کُن زلزلے آتے رہے اور پورے کا پورا جنگل نیچے دبتا چلا گیا۔ اُن درختوں پر مٹی کی تہہ جمتی گئی۔ اُس کے بعد اُوپر کے دباؤ اور زمین کی گرمی سے جنگل کے درخت سیاہ پتھر کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

پہلے تو لوگ محض اسے افسانہ سمجھتے رہے۔ لیکن جب کوئلہ نکالا جانے لگا تو اس بات کا ٹھوس ثبوت بھی مل گیا۔ کوئلے کے ایسے ٹکڑے ملے جن میں درخت کی پتیوں اور شاخوں کے واضح نشانات تھے۔ ایسے ٹکڑے فیول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جیل گوڑہ میں محفوظ ہیں۔ پھر کان میں کوئلہ کئی تہوں میں پایا جاتا ہے ابتدائے آفرینش میں جتنی بار زمین نیچے دھنسی اُتنی ہی بار جنگل کا کچھ نہ کچھ حصّہ نیچے دبتا چلا گیا۔ اکثر کوئلے کی کانوں میں تین تین طبقے ہیں۔ یعنی قدیم زمانے میں وہاں کی زمین تین بار دھنسی تھی۔

کوئلہ عموماً ہندوستان میں تین طریقوں سے نکالا جاتا ہے

INCLINE, QUARRY اور ... کے ذریعے (ہندوستان میں سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے رانی گنج فیلڈ میں کوئلے کی کان کھودی تھی۔

۱- QUARRY کواری کو کولیری کی اصطلاح میں "پکھوڑا" کہتے ہیں۔ جہاں کوئلے کی تہہ، سطحِ زمین سے کم گہرائی پر ہوتی ہے۔ وہاں تالاب کی مانند مٹی اور پتھر گینتی، کدال اور بلاسٹنگ کے ذریعے صاف کر کے کوئلہ نکال لیا جاتا ہے۔ اس میں تہہ خانے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اُوپر ہی سے کوئلے کی موٹی تہہ کاٹ لی جاتی ہے۔ پھر کوئلے کی تہہ جہاں تک پھیلی ہوتی ہے۔ وہاں تک تہہ خانے کے ذریعے کوئلے نکال لئے جاتے ہیں۔ جھریا علاقے میں کوئلہ سطحِ زمین سے بہت ہی کم گہرائی پر موجود ہے۔ اس لئے یہاں کواری کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ اس کے علاوہ کواری دوسری صورت میں بھی کی جاتی ہے۔ جب کان [illegible] سے تہہ خانے کے ذریعے میلوں دُور تک کوئلہ نکال لیا جاتا ہے۔ تو اُوپر کا کوئلہ (جو پیچھے کان کی چھت ہوتا ہے) کواری کر کے نکال لیا جاتا ہے۔ لیکن کواری کوئی سائنسی طریقہ نہیں ہے۔ اس سے بہت سی زمین خراب ہو جاتی ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اس میں مشینری کی ضرورت برائے نام پڑتی ہے۔ نیچے آہنی پٹڑی پر بیٹھی ہوئی ٹالی [illegible] کو کان کُن ٹوکریوں سے بھر دیتے ہیں اور [illegible] SURFACE HAULAGE اُسے اوپر کھینچ لیتی ہے۔ آج سے پچیس تیس سال پہلے بیلوں [illegible] اور گھوڑوں کے ذریعے کوئلے سے بھری ٹالی کھنچوائی جاتی تھی۔

۲- INCLINE ان کلائن جسے کولیری و [illegible] کہتے ہیں۔ دراصل یہ سُرنگ (تہہ خانہ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ایک نہر [illegible] ڈھلوان کی صورت میں زمین سے دُور تک نیچے چلا جاتا ہے۔ پھر وہیں [illegible] MAIN DEEP سے الگ ہو کر تہہ خانے، مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی جانب چلے جاتے ہیں۔ پھر ان تہہ خانوں میں سے اور کئی تہہ خانے درخت کی

MAIN DEEP وہ تہہ خانہ ہے جو سب سے پہلے کھودا جاتا ہے۔ اُس کے دہانے کے عین سامنے سطحِ زمین پر ایک انجن SURFACE HAULAGE ہوتا ہے۔ جو اندر سے کوئلے سے بھری ہوئی ٹالی کو کھینچ کر ڈپو تک پہنچا دیتا ہے۔ ان کانوں میں بھی دہیں کی جاتی ہے جہاں کوئلے کا خزانہ سطحِ زمین سے نزدیک ہوتا ہے۔ یہ بھی کوئلہ نکالنے کا اچھا طریقہ نہیں ہے۔ ان کانوں کی کثیر تعداد بکارو، گریڈیہہ اور ہزاری باغ فیلڈ میں ہے۔

۳۔ PIT پٹ۔ جسے کولیری والے چانک کہتے ہیں یہی سب سے اچھا اور سائنسی طریقہ ہے۔ سب سے پہلے (جہاں کوئلہ نکالنا مقصود ہوتا ہے) ماہرارضیات تحقیق کرتے ہیں کہ کوئلہ ہے یا نہیں اور ہے تو کتنی گہرائی میں؟ تحقیق و تفتیش کے بعد کان کی کھدائی شروع کی جاتی ہے۔ کان ٹھیک کنوئیں کی مانند اندر جاتی ہے مٹی کی تہہ تو آسانی سے کاٹ لی جاتی ہے۔ لیکن سخت پتھر کی تہہ ملنے کے بعد ڈائنامیٹ سے بلاسٹنگ کی جاتی ہے۔ یہ کوئلہ کان کے لئے ایک سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ کاٹی ہوئی مٹی اور بلاسٹنگ کے پتھر نیچے ٹوکریوں میں بھر دیئے جاتے ہیں اور اوپر مرد اور عورتیں ٹوکری میں لگے لمبے رسّے کو کھینچتے ہیں اور دیہاتی گانے الاپتے ہیں۔ اُس وقت بہت ہی خوش گوار اور بہت ہی پُرکیف ماحول ہو جاتا ہے۔ ساری فضا رس بھرے گیت گنگنانے لگتی ہے اور اس طرح جب پتھر کی تہہ ختم ہو جاتی ہے (کم سے کم صفر فٹ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰۰ فٹ) تو پھر کوئلے کی تہہ ملتی ہے۔ اس کے بعد وہاں سے پھر تہہ خانے نکالے جاتے ہیں۔

کان کے دہانے کو اینٹ سے پختہ بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس پر لمبے لمبے آہنی گارڈر نصب کر دیئے جاتے ہیں۔ جسے HEAD GEAR کہتے ہیں۔ اور بہت سی مشینریز کے ساتھ WINDING HAULAGE اور ڈولی CAGE کے ذریعہ کوئلے کے نکالنے کا کام شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی RAISING ہونے لگتی ہے۔

ڈسپیچ DESPATCH کرنے کے طریقے۔

اندر کان سے نکالا ہوا کوئلہ ایک جگہ اسٹاک کر دیا جاتا ہے جسے کول ڈپو کہتے ہیں۔ ڈپو کے درمیان ریلوے لائن ہوتی ہے۔ محکمہ ریل کولیری میں ویگن کو سپلائی کر دیتا ہے۔ اور ویگن کے لوڈ ہو جانے پر ملک کے دُور دراز صوبوں

[illegible]

ڈسپیچ کے وقت کوئلے کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اُسی مناسبت سے اُس کی قیمت ہوتی ہے۔

(الف) کوئلے کی بڑی چٹان کو STEAM COAL کہتے ہیں۔

(ب) ۱½ سے ۳ کے ٹکڑے کو RUBBLE COAL کہتے ہیں۔

(ج) ایک انچ اور کوئلے کی گرد کو SLACK کہتے ہیں۔

کوئلے سے بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ ان میں سوفٹ کوک ہارڈ کوک، فنایل کی گولیاں، فنایل، کولتار، سکرین اور کئی کیمیکل اشیاء خاص ہیں۔

کوئلے کے متعلق حکومتِ ہند کی تحقیقی سرگرمیاں۔

بجلی کی طرح کوئلہ بھی ایک نہایت ہی کارآمد چیز ہے۔ آج کے زمانے کو کوئلے کا زمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ گھریلو ضروریات کے علاوہ صنعتی کاموں میں بھی اس کا استعمال ناگزیر ہے۔ کوئلے کی مختلف قسمیں اور درجے ہیں۔ اور حرارتی صلاحیت کے مطابق انھیں مختلف صنعتوں کے کام میں لایا جاتا ہے کوئلے کے تجزیئے کے لئے حکومتِ ہند کی طرف سے ایک مرکزی ادارہ جھریا کے نزدیک جیل گوڑہ میں فیول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ جس کے ماتحت رانی گنج، رانچی، جودہاٹ (آسام) اور بلاس پور میں چار سرٹیے اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ جو کوئلے کی مختلف اقسام کی خصوصیات دریافت کرنے میں مصروف ہیں۔ تاکہ کوئلے کی مختلف اقسام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکے۔

کوئلے کی عام قسمیں دو ہیں۔ ایک تو ٹھوس شکل میں ملتا ہے۔ جو بھاپ تیار کرنے اور گیس سازی کے کام میں آتا ہے۔ دوسری قسم کا کوئلہ ڈھیلوں کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ جسے کوک پتھر کے کوئلے کہتے ہیں۔ یہ دھاتوں کی تیاری اور صفائی میں کام آتا ہے۔ ہندوستان میں کوک پتھر کا کوئلہ زیادہ نہیں ملتا اس لئے ٹھوس ہی کوئلے سے دونوں کام لئے جاتے ہیں۔

کوئلے کو استعمال کرنے سے پہلے اُن کی خصوصیات دریافت کرنے کے مقصد سے کوئلہ کانوں سے نکالے ہوئے کوئلے کے ۳×۳ نمونے اکٹھے کر کے جیل گوڑہ کی لیبارٹری میں لائے جاتے ہیں یہاں انھیں پیس کر سفوف بنا لیا جاتا ہے۔ پھر مختلف مراحل سے گزار کر ترازو سے اُن کا مخصوص وزن دریافت کیا جاتا ہے کوئلے میں نباتاتی اور معدنی اجزاء دونوں پائے جاتے ہیں نباتاتی مادّے کے جلنے سے تو حرارت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن معدنی

گریڈیہہ کی کان صرف سات مربع میل کے اندر ہے۔ اس کا کوئلہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ ان کانوں کے علاوہ بوکارو، کرن پورا، مان بھوم، سی پی اور سنتھال پرگنہ میں بھی کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ ٹالشن گنج، اور نگ آباد سمبل پور، جینتی، پنجاب، متوسط ہند، آسام اور حیدرآباد میں بھی چھوٹی چھوٹی کانیں ہیں۔ بنگال کے علاقے میں کوئلے کی جو کانیں ہیں وہ بنگال کے سرحد کو پار کر کے مان بھوم اور سنتھال پرگنہ میں چلی آئی ہیں۔ بہار کی کانوں میں اتنا کوئلہ جمع ہے کہ سینکڑوں برسوں تک یہ نکلتا رہے گا۔ بنگال اور چھوٹا ناگ پور کی تقریباً کل خاص کوئلے کی کانیں دامودر ندی کے طاس میں ہیں۔

آج کی دنیا میں کوئلے کی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں کوئلہ نکلتا ہے۔ وہاں ریلیں اور کارخانے وغیرہ آسانی سے جاری ہو سکتے ہیں۔ مختلف جگہوں کے کوئلے کے نرخ میں کافی فرق ہوتا ہے۔ ہندوستان میں دوسرے ملکوں کے نسبت کوئلہ سطح کے قریب ملتا ہے۔ لیکن جس طریقے سے یہاں کوئلہ کانوں سے نکالا جاتا ہے وہ نہایت ہی خطرناک ہے۔ اُس سے کوئلے کا ذخیرہ جلد ختم ہونے کا احتمال ہے اس لئے کوئلہ نکالنے کے طریقے میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

ہمارے غلامی کے عہد میں ہندوستان کے کوئلے کو ہمارے یہاں کے باشندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اُس وقت کوئلے کی کانوں کے مالک غیر ممالک کے سرمایہ دار تھے۔ اُن کے کھدائی کے طریقے ایسے تھے جو سائنسی طریقوں سے مختلف تھے۔ اور جس کی وجہ سے کوئلے کی بہت سی مقدار برباد ہو گئی۔ اُن کا خیال نفع کمانے کی طرف رہا اسی لئے انھوں نے کوئلہ خوب برآمد کیا۔ ہماری کانیں خالی ہونے لگیں۔ اب ملک کو آزاد ہوئے ۹ سال ہو گئے۔ اُمید ہے کہ کانوں کی حفاظت کا خاص خیال۔ کیا جائے گا۔ کوئلہ نکالنے میں سائنسی طریقوں سے کام لیا جائے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کوئلہ کا زیادہ استعمال ملک کے لئے ہوگا۔

جھریا اور رانی گنج کا کوئلہ ہندوستان کی دوسری جگہوں کے کوئلے سے بہتر مانا جاتا ہے اور بیشتر ڈھلے بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ دن بدن اچھے کوئلے کا ذخیرہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور اب زیادہ راکھ دینے والے کوئلے بھی بڑے پیمانے پر نکالے جاتے ہیں۔ کئی کولیری میں ان کوئلوں کو صاف کر کے بہتر بنانے کے لئے بڑے بڑے کل لگائے گئے ہیں۔ جہاں انھیں دھو کر فضول راکھ کو نکال دیا جاتا ہے۔

کوئلے کی خراب حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اچھے کوئلے کو حاصل کرنے

آمیزش معلوم کی جاتی ہے۔ تاکہ اُسے صاف کر کے منافع بخش طریقے سے استعمال کیا جائے جس کوئلے میں زیادہ سے زیادہ نمی پائی جاتی ہے۔ وہ بھاپ تیار کرنے کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ اُس کے خود بخود جل پڑنے کا احتمال ہوتا ہے۔ اس لئے اُسے احتیاط اور حفاظت سے رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن کم نمی والا کوئلہ باہر دھوپ میں پڑا رہے تو نمی زائل ہو جاتی ہے اور راکھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

لیبارٹریوں میں تجزیئے کے بعد معلوم ہوا ہے۔ کہ کوئلے میں کاربن ہائیڈروجن، گندھک اور فاسفورس کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ جو کوئلہ دھات صاف کرنے کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اُس میں گندھک اور فاسفورس کے اجزاء کم ہوتے ہیں۔ اور بھاپ STEAM کے لئے بائیلر BOILER میں استعمال کرنے والے کوئلے میں کاربن اور ہائیڈروجن کے اجزاء متقابلتاً زیادہ ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں تقریباً ۹۱۰ کوئلہ کی کانیں ہیں۔ جن میں ہر سال دو کروڑ ستر لاکھ ٹن (۲۷۰۰۰۰۰۰) کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ لیکن کوئلہ کانوں کی تحقیقاتی کمیٹی نے اندازہ لگایا ہے کہ ۱۹۶۵ء سے کوئلے کی ضرورت اتنی بڑھ جائے گی کہ ہندوستان کو اپنی صنعتوں اور دوسری ضروریات کے لئے ہر سال تین کروڑ نوے لاکھ ٹن سے زائد (۳۹۰۰۰۰۰۰) کوئلے کی ضرورت پڑے گی۔

فروری ۱۹۵۶ء میں کوئلہ کے کانوں کی تعداد ۸۴۳ تھی۔ ان میں ۳۵۰۰۰۹ مزدور کام کرتے تھے۔

کوئلے کو QUALITY کے اعتبار سے کئی گریڈوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سب سے اچھا کوئلہ SELECTED گریڈ زیادہ سے زیادہ ۱۵ یا ۱۳ فی صد راکھ اور کم سے کم ۷۰۰۰ کیلوری گرمی پیدا کر سکتا ہے۔

TRIBUNAL AWARD کے مطابق مزدوروں کی مزدوری بڑھا دی گئی ہے۔ مزدوری بڑھ جانے کی وجہ سے کوئلے کی قیمتوں میں بھی ۲ روپے فی ٹن کا اضافہ ہو گیا ہے

معدنی اشیا پیدا کرنے میں بہار سب سے بڑھ گیا ہے کوئلہ پیدا کرنے والے صوبوں میں ہندوستان کا مقام چھٹا ہے اور سارے ہندوستان کا تقریباً ۰ فیصدی کوئلہ بہار کی کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ بہار کے صرف ایک جھریا کی کانوں سے ۱۹۵۳ء میں ایک لاکھ پچاس ہزار ٹن کوئلہ نکالا گیا تھا اور اوسطاً ۸ روپے فی ٹن کے حساب سے بائیس لاکھ پچاس ہزار روپے کا کوئلہ جھریا کی

فیصلہ کیا ہے کہ سب METALLURGICAL COAL کو دھودیا جائے۔ صاف کئے ہوئے کوئلے کو BHILAI اور ROURKELA اسٹیل پلانٹ کو سپلائی کرنے کے لئے حکومت کی MINISTRY OF PRODUCTION بہت جلد بکارو میں پہلا اسٹیٹ واشنگ پلانٹ بنا رہی ہے۔ جو بکارو اور کارگلی اسٹیٹ کولیریز کے کوئلے کو صاف کرے گا۔ یہ واشنگ پلانٹ ۰۰ ۵ ٹن کوئلہ ایک گھنٹے میں صاف کرے گا۔ اس طرح تقریباً ہر سال سو لاکھ ٹن کوئلہ صاف ہو جائے گا۔ جس میں ہر سال ایک کروڑ دس لاکھ ٹن۔ ماؤنڈ کیلا اور پانچ لاکھ ٹن بھلائی اسٹیل پلانٹ کو سپلائی کیا جائے گا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ کوئلہ صاف کرنے کا کام ۱۹۵۶ء کے آخر میں شروع ہو جائے گا۔

ہندوستان میں پہلا واشنگ پلانٹ ویسٹ بکارو میں اپریل ۱۹۵۱ء میں شروع کیا گیا اور دوسرا جاماڈوبا میں ADOBA ستمبر ۱۹۵۲ء میں لگایا گیا اور ۱۹۵۵ء کے شروع میں تیسرا واشنگ پلانٹ رونا میں لگا۔ یہ چاروں واشنگ پلانٹ صوبہ بہار کے اندر ہی ہیں۔

دُنیا کے ملکوں میں کوئلے کی پیداوار ۱۹۵۴ء میں حسب ذیل تھی۔

دس لاکھ میٹرک ٹنوں میں

امریکہ	۳۸۰
روس	۳۰۰
برطانیہ	۲۲۸
پولینڈ	۹۱
ہندوستان	۳۷
جنوبی افریقہ	۲۹
آسٹریلیا	۲۸
کینیڈا	۱۵
نیوزی لینڈ	۲ء۵
جنوبی رھوڈیشیا	۰۰۳

جھریا کے کوئلے سے جو دیگر اشیاء برآمد کی جا سکتی ہیں۔ حسب ذیل ہیں۔

اصلی کاربن	۶۰ فی صدی
اشیاء کشید	۲۶ فی صد

کثیف بنزول	۲ء۵ گیلن فی ٹن
گیس	۱۰۰۰۰ مکعب فٹ
امونیم سلفیٹ	۲۵۰۰ پونڈ
کوک	۱۵ ہنڈرڈ ویٹ تقریباً ۲۱ء

۱۹۵۴ء میں ہندوستان کے کوئلہ کانوں کی پیداوار حسب ذیل تھی

بہار	۱۹۰۷۶۱۰۴ ٹن
مغربی بنگال	۱۰۵۹۳۳۳۲ ٹن
مدھیہ پردیش	۳۶۱۴۰۹۴ ٹن
حیدرآباد	۱۵۰۲۳۹۶ ٹن
وندھیہ پردیش	۹۴۹۳۱۷ ٹن
اڑیسہ	۵۱۹۸۵۸ ٹن
آسام	۴۸۸۸۸۹ ٹن
راجستھان	۲۶۶۱۵ ٹن
میزان	۳۶۷۷۳۶۰۵ ٹن

۱۹۵۰ء GEOLOGICAL SURVEY کی رپورٹ مطابق ہندوستان کے کوئلہ کے میدانوں میں کوئلے کی مقدار مندرجہ

علاقہ	دس لاکھ ٹنوں میں
بنگال و بہار	۲۱۷۴۳
وسطی ہند	۵۹۲۹
چندا ویلی	۵۳۵۷
گوداوری ویلی (حیدرآباد)	۴۰۴۲
آسام	۲۰۰۰
اڑیسہ	۲۴۰
میزان	۳۹۰۱۱

۱۹۵۰ء میں کوئلے کی کھپت کچھ اس طرح تھی۔ آج کل اس میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔

ریلوے	۱۰٫۵
مل وغیرہ	۳٫۰
بجلی	۲٫۵
سیمنٹ	۰٫۵
لوہا اور فولاد	۴٫۰
اینٹوں کے بھٹے	۱٫۰
گھریلو استعمال	۲٫۵
برآمد وغیرہ	۳٫۰
دیگر صنعتیں	۱٫۵
کوئلے کی کانیں	۲٫۰
میزان	۳۰٫۵

یوم جمہوریہ پر اشوک چکر کے اعزازات

یوم جمہوریہ کے موقع پر گزٹ آف انڈیا کے ایک اعلانیہ میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی فوجوں کے ۴ افراد کو اشوک چکر کے اعزازات عطا کئے گئے ہیں۔

مرحوم سپاہی بابو لال کو اتر پوربی سرحدی ایجنسی کے علاقے میں سول حکام کی مدد کرتے ہوئے بہادری دکھلانے کے صلے میں اشوک چکر درجہ دوم کا اعزاز عطا کیا گیا ہے۔ نائک گیان سنگھ اور سپاہی جنگ سنگھ کو مارچ ۱۹۵۶ء میں ہند اور پاکستان کی سرحد پر حسینی والا ہیڈورکس کے نزدیک قیادت کی نمایاں خوبیوں کا ثبوت دینے کے صلے میں علی الترتیب اشوک چکر درجہ دوم اور درجہ سوم عطا کئے گئے ہیں۔ اشوک چکر درجہ سوم کا چوتھا ایوارڈ حوالدار مُرلی رام کو عطا کیا گیا ہے۔ حوالدار مُرلی رام نے ماہ فروری ۱۹۵۶ء میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر حسینی والا ہیڈ کے علاقے میں نمایاں بہادری کا ثبوت دیا تھا۔

اقبالی تاباں

غزل

دولتِ فکرِ رسا طبعِ رواں پائی ہے
غالب و میر کی ورثے میں زباں پائی ہے

اتنی آساں تو نہ تھی کام و دہن کی تہذیب
مدتوں تربیتِ پیرِ مغاں پائی ہے

کس کو ملتا ہے غمِ زیست سے دنیا میں فراغ
ہاں کبھی تیری جفاؤں میں اماں پائی ہے

نازپروردۂ محرومیٔ حرماں ہے یہ دل
پرورش دیکھنا ظالم نے کہاں پائی ہے

جلوۂ حسنِ فراواں پہ بجا اُن کا غرور
ہم بھی نازاں ہیں کہ چشمِ نگراں پائی ہے

ایک آشوبِ تمنا پہ نہیں کچھ موقوف
دل نے ہر رنگ میں تعلیمِ زیاں پائی ہے

کل جو تاباں کے اُنھیں شعر سنائے تو کہا
ہائے کمبخت نے کیا طرزِ بیاں پائی ہے

عبدالرشید خاں

ہم اور ہماری موسیقی

آج سے ہزاروں سال پہلے جب کہ انسان نے بولنا نہیں سیکھا تھا۔ الفاظ ادا کرنے سے معذور تھا، اُس وقت وہ اپنے خیالات و رجحانات ظاہر کرنے میں بڑی دقّت محسوس کرتا تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا۔ سمجھ سکتا تھا مگر پوری طرح اظہار نہ کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت زبان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ مجبوراً وہ اپنا مطلب حل کرنے کو اُلٹی سیدھی، ٹیڑھی بکڑی آوازیں نکال کر روزمرہ کی ضروریات پوری کرتا اور اجتماعی زندگی بسر کرتا ۔۔ وہ طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ نرم سخت، موہن اور کرخت آوازیں نکال کر چیختا چلاتا، کبھی روتا، کبھی ہنستا، کبھی اُچھلنے کودنے لگتا اور اس طرح تبادلۂ خیالات کرنا۔ صدیوں کے دوران میں اس نے اپنی فہم و فراست کے مطابق آوازوں کے نئے میل جول پیدا کئے۔ مشکل مخرج کی آواز ترک کیے۔ آسان آوازوں کو اپنایا۔ ترقّی کرتے کرتے آوازوں کے الفاظ بنے، پھر اس کا رسم الخط وجود میں آیا۔ لیکن یہ ترقّی کافی نہ تھی۔ آج بھی رسم الخط اتنے عروج پر ہونے کے باوجود، جذبات و کیفیات کی ہیئتِ اصل کو جو کہ صَوتی ہوتی ہے، حروف کی شکل نہیں دے سکتا۔ ہنسنے کا، رونے کا، سوز و گداز، درد و کرب، جوش و مسرّت کا آواز سے براہِ راست تعلق ہے۔ جن آوازوں نے صدیوں کے دوران میں حروف کی اور حروف سے الفاظ کی صورت اختیار کی وہ محض مخصوص وضع قطع کے اخراج کی توضیح کرتے ہیں از خود جذبات و کیفیات پیش نہیں کرتے ۔۔ مثلاً ایک معصوم بچہ اپنی ماں کو پکارے تو اس کے اس فعل کو ہم لکھ تو سکتے ہیں کہ۔ "بچے نے ماں کو پکارا"! لیکن وہ معصومیت اور ماں سے محبت اور لگاؤ جو اُس کی آواز سے ٹپکتا ہے۔ الفاظ کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم تمثیل، استعارہ و کنایہ سے کام لیں گے۔ مگر آواز کی اُس خصوصیت کو الفاظ کی شکل نہ دے سکیں گے۔ اسی لئے اس اولیں صَوتی ہیئت کو جو اپنے طور پر باطنی و دلی کیفیات سے وابستہ ہے اور ان کی صحیح ترجمان ہے ہم کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتے۔

پُرانے وقتوں میں انسان جنگلی خود رو پھل پھول، جڑی بوٹیاں اور شکار کے گوشت پر گزارہ کرتا تھا۔ بعد کو کاشت بھی کرنے لگا۔ آگ بھی جلانے لگا۔ پتھروں اور دھات کے اوزار استعمال کرنے لگا۔ اُس وقت کی اجتماعی زندگی میں رقص و موسیقی روزمرہ زندگی کا ایک جزوِ لاینفک تھی۔ سائنسی ترقّی نہ ہونے کے باوجود انسان قدرت اور ناگہانی حادثات پر قابو پانے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس وقت بھی موسیقی و رقص ایک سحر کارانہ عمل یا وظیفے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اشاروں سے اور خاکوں سے نقل اُتار لینا اُن کے نزدیک مظاہرِ قدرت کو مطیع کر لینے کے مترادف تھا اور وہ مطمئن ہو جاتے تھے کہ اب یہ آفتیں مہربان ہو گئیں۔ شکار کرتے وقت، کھیت میں اور زندگی کے روزمرہ کاموں میں سب مل جل کر مختلف اقسام کا شور مچاتے اور ناچتے کودتے اور یہ معمول رفتہ رفتہ (CHORUS) سموہ گیت، لوک گیت اور لوک ناچ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہر ملک کی موسیقی اسی طرح وجود میں آئی۔ ہندوستانی موسیقی نے بھی اسی طرح جنم لیا۔ ماہرین نے اسی فن کو اجتماعی زندگی کا اہم جزو سمجھ کر توجہ کی، نکھارا، اصول مرتب کئے، سُروں کے مقام متعیّن کئے اور ایک فن کی حیثیت دی۔ قدیم ہندوستانی ماہرین نے بھی جانفشانی و باریک بینی سے آوازوں کو توڑ جوڑ کر دیکھا اور پہلا مستقل سُر "شڑج" اور دوسرا "پنچم" شرتیوں اور مُرچھناؤں کا تعیّن کر کے مزید تقطیع کی اور پانچ غیر مستقل سُر جو "شدھ" کہلاتے۔ ان کی دو دو صورتیں "کومل" اور "تیور" بنیں۔ ان بارہ سُروں کے میل جول سے راگ راگنیاں بنیں۔ انھیں تال اور لَے سے سنوارا اور

پڑ، ٹھمری، دادرا، بکری اور ہوری وغیرہ۔

مذہبیات کے نزدیک زندگی کا مقتضیٰ یہی رہا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے احسانات کا شکرانہ ادا کیا جائے۔ عبادت اور بندگی اُسی وقت افضل ہے جب عقیدہ و ایمان ہو ورنہ بے سود ہے۔ ہمارے خیالات، جذبات و کیفیات ہماری آوازہی کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔ آوازوں کا امتزاج ہی اثر رکھتا ہے اور دلوں پر چھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب میں گا کر عبادت کرنا افضل طریقہ مانا گیا ہے۔ مذہب ہی کی سرپرستی میں اس فن کو فروغ ہوا۔ آج بھی مسجدوں، مندروں اور گرجا گھروں میں خوش الحانی عبادت کا ذریعہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد میں اُسے قراءت کہا جاتا ہے اور مندر میں بھجن۔ عبادت سے مراد یہی ہے کہ اپنے آپ کو عاجز و منکسر گردان کر اُس قادر المطلق کے حضور جُھک جانا، مدح سرائی کرنا۔ اور شکرانہ ادا کرنا۔ صدیوں تک گانے کا یہی مقصد رہا اور اسی مطابقت سے گایا جاتا رہا۔ مگر زمانے کے تغیر کے ساتھ یہ عاجزی، انکساری، مدح سرائی و شکرانہ خدا کے علاوہ سردارِ قبیلہ۔ حاکمِ وقت اور آقا کے سامنے بھی گا گا کر کیا جانے لگا۔ ان اجارہ داروں نے اسے اپنی دل بستگی کا سامان بنا لیا۔ رفتہ رفتہ گانا ضروریاتِ زندگی سے ذریعۂ عبادت، پھر ذریعۂ معاش اور اُس سے بھی گر کر بھیک مانگنے کا ذریعہ ہو کر رہ گیا۔ آج کی موسیقی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے جس خلا کو پُر کرنے کو اسے فروغ ہوا اور جو اصل افادی پہلو تھا وہ سرے سے مفقود ہے۔

فی زمانہ فنونِ لطیفہ دو اسکولوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک قدامت پرست اور قدیم روایات کا سختی سے حامل اور دوسرا فرسودہ روشوں سے باغی —— مؤخر الذکر کو ترقی پسند کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی دو چھوٹے گروپ ہیں۔ ایک نے سٹائل اور تکنیک بدل دی ہے اور دوسرے نے موضوع اور مواد۔ سٹائل اس طرح جیسے مصوری میں پکاسو، پال کلی اور اُن کے پیرو۔ ادب میں بودلیئر —— ہمارے ہاں جیمنی راشد اور میراجی، یا کلاسکی موسیقی کے خلاف فلمی موسیقی و رقص —— دوسرے وہ جنھوں نے موضوع بدل دیا اور گل و بلبل کے فسانوں، شہزادوں اور پریوں کی داستانوں کو چھوڑ کر زندگی کے تلخ حقائق پیش کرنے لگے ہیں۔ اُن کے نزدیک فن کو عوامی ہونا چاہیئے اور طبقاتی کش مکش میں ابھرتی پود کی فلاح و بہبودی کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ اس مقصدیت کے لئے موضوع و مواد MATTER بدلتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جس معاشی، اخلاقی و تخیلی آزادی اور معیاری زندگی کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ فنونِ لطیفہ اُس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ترقی پسندی کا مطلب یہی ہے کہ فن کار کو اس تاثر کا شعوری احساس و تجربہ ہو —— مجھے اس سے بحث نہیں کہ فنون سُرخ جھنڈے تلے ہوں یا ترنگے تلے بلکہ اس سے کہ فن کو جس قدر ہو سکے عوام سے قریب ہونا چاہیئے۔

ہماری موسیقی کا اب تک جو مقصد رہا ہے وہ ہم پر پوری طرح واضح ہے موسیقار سے اگر پوچھا جائے کہ فلاں راگ کے گانے سے کیا مقصد تھا۔ تو شاید ہی کچھ بتا سکے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے گا کہ کرشن کنھیا کی شرارتوں اور شرارتوں کا منظر پیش کر رہا ہوں۔ اگر گانے کی غرض و غایت یہی ہے اور آئندہ بھی رہی تو مجھے یقین ہے کہ وہ عوام جنھیں زندگی کے جھمیلوں سے ہی چھٹکارا نہیں اس طرف کا رُخ نہ کریں گے۔

اگر ہندوستانی موسیقی کے تمام راگوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان میں درد و کرب، ہجر و فراق، حسرت و یاس اور ظلم و تشدد کا اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یعنی ہمارے موسیقار کوئی سا راگ سنائیں اور وہ خواہ کیسی ہی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہو۔ یاسیت کا شائبہ کہیں نہ کہیں ٹپک ہی پڑے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ غلامی، محکومیت اور حسرت زدہ زندگی جو آج تک ہم پر مسلط ہے ہماری موسیقی پر بھی اثر انداز ہے —— تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ موسیقی نے جاگیرداروں اور نوابوں کے محلات میں جنم نہیں لیا بلکہ سادھو سنتوں کی کٹیاؤں میں اور نچلے طبقہ کے لوگوں میں ہی اس کی بنیادیں پڑی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور سے لے کر اب تک فن کاروں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس محکومیت و مظلومیت کے خلاف آواز بلند کی —— درباروں میں، محفلوں میں یا تنہائی میں فن کار جہاں کہیں بھی الاپا، اسی کا رونا رویا ہے اور یہ رونا ہماری پوری موسیقی پر چھایا ہوا ہے۔

ہمارے سامنے آج بھی معاشی، سماجی و قومی مسائل بکھرے پڑے ہیں۔ اعلیٰ و معیاری زندگی کے لئے جد و جہد ہو رہی ہے۔ مگر آج کا موسیقار عوام کے درد و غم میں شریک نہیں ہوتا۔ وہ جب گاتا ہے تو ہمیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماہرِ فن بجائے مضمون لکھنے کے عملی تجربے کر رہا ہے کہ یہ فلاں سُر ہے اور یہ فلاں سُر۔ یہ فلاں تان ہے اور یہ فلاں تان۔ یہ مینڈ ہے یہ گمک۔ یہ لرزہ یہ سُوت۔

[illegible]

ہے نہ اس کی موسیقی۔ وہ تو موسیقی کے دیرینہ قوانین دہرا رہا ہے۔ موضوع اور مواد کچھ بھی نہیں۔ افادیت سرے سے غائب۔ نہ ذاتی نہ اجتماعی ——— ایسی موسیقی سامعین پہ خاک اثر کرے گی؟ ——— یقیناً وہ تنزل پذیر ہے۔

عام طور پہ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فنِ موسیقی کا تعلق سماعت سے ہے اور ہر وہ آدمی جو بہرا نہیں ہے اُسے اس سے لُطف اندوز ہونا چاہئے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا اس سوال کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ قورمہ کیسے پکتا ہے۔ اور اس میں کیا کچھ مصالحے کس مقدار سے پڑتے ہیں۔ اچھے یا بُرے قورمے کی تمیز نہیں کر سکتا۔ حالاں کہ مزے کا تعلق زبان سے ہے ——— جب ہم کسی چیز کی الف بے سے بھی واقف نہیں تو کیسے جان سکتے ہیں کہ وہ اچھی ہے یا بُری۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ہم اپنی لاعلمیت کو نظرانداز کر کے بڑی فراخ دلی سے فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ کلاسکی سنگیت میں رکھا ہی کیا ہے؟ ——— ظاہر ہے کہ ہماری ایسی رائے ذہنی حماقت پہ مبنی کی جائے گی ——— فرض کیجئے۔ ہمارے سامنے ایک جاپانی شاعر اپنی معرکۃ الآرا نظم پڑھے تو ہم کیا سمجھیں گے؟ ہمارے لئے تو اُس میں کوئی مزہ، خوبی یا فن نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ مشہور جاپانی شاعر ہمارے سامنے کچھ پڑھ رہا ہے۔ اور کیا یقین ہے کہ نظم ہی پڑھ رہا ہے۔ گالیاں نہیں دے رہا ——— اور جیسی جاپان کیول جانیں!! غالب کا بہترین شعر ہمارے سامنے پڑھا جاتا ہے۔ باوجودے کہ سب الفاظ ہم سمجھ گئے اور معانی بھی جان لئے۔ پھر بھی فنِ شاعری سے واقف جو لُطف اٹھائے گا وہ ہم نہ اٹھا سکیں گے۔ اب ہم یہ کہہ دیں کہ یہ تو مہمل اور بکواس ہے تو یہ ہمارا قصور ہے۔ غلطی ہماری ہے کہ اُس فن سے ہم بالکل کورے ہیں ——— یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہمیں کہیں بھی ایسے دور کا ثبوت نہیں ملتا۔ جب ہر کس و ناکس فن کار بن گیا ہو۔ فن کاروں کی تعداد ہمیشہ محدود ہی رہی اور ان کے فن کو سمجھنے والوں کا حلقہ بھی محدود ہی رہا ——— پھر بھی ہم موجودہ دور میں سب کو فن کار نہ بنا سکیں تو کم از کم سب میں یہ صلاحیت ضرور پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ تھوڑا بہت فن کو سمجھ لیں۔

فنونِ لطیفہ میں موسیقی، رقص، مصوری و سنگ تراشی ایسے فن ہیں جن میں فن کا ہم سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان میں فن کار کی تخلیق کا ادراک قوتِ سماعت و بصارت سے ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ادب کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ اُس زبان کو نہ سمجھیں جس میں کہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن

[illegible]

اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح موسیقی اور رقص و دیگر فنون کے لئے بھی سُننا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے اصولوں سے واقفیت ضروری ہے۔ ذوقِ سلیم اور مخصوص فکر و نظر پیدا کرنا پڑتی ہے۔

عام لوگوں کا یہ کہنا صحیح ہے کہ جب موسیقی ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو سُن کر کیا کریں گے؟۔ موسیقار کہتے ہیں کہ ہمارا سنگیت اگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تو یہ اُن کی لاعلمی ہے۔ اُن کا قصور ہے ——— ہمارا یا ہمارے سنگیت کا قصور نہیں۔ فن، فن کے لئے ہے اور جہاں تک فن اس کی اجازت دے گا اور گنجائش ہے اُسی طرح پیش کیا جائے گا۔ فن کو اس سے غرض نہیں کہ وہ کس کی سمجھ میں آیا اور کس کے نہیں بلکہ اس سے غرض ہے کہ وہ روائتی حدود و بندش کا کہاں تک لحاظ رکھتا ہے ——— ایسے وقت فن کار یہ بھول جاتے ہیں کہ فن کسی انفرادی کاوش و محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ عوام کی مجموعہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عوام اُسی فن کو نہ سمجھیں جسے خود اُنھوں نے فروغ دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ سنگیت بھی فن ہے لیکن موجودہ اسلوب اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے ——— وجہ صرف یہ ہے کہ سنگیت کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ کسی کی سمجھ میں نہ آ سکے ——— سب جانتے ہیں کہ آواز میں درد ہوتا گانے والے کی آواز میں بھی درد ہے مگر عوام کے لئے نہیں۔ شوخی ہے لیکن اُن کے لئے نہیں ——— اُس کی آواز میں غصّہ و نفرت ہے مگر اُن کے دشمنوں کے لئے نہیں ——— اُس کے سنگیت میں اُن کے لئے کچھ بھی نہیں ——— پھر جس میں ان کا سُکھ دُکھ نہیں اُن کی زندگی نہیں۔ دن رات کی محنت و مشقت کا ذکر نہیں اُسے وہ کیوں سُنیں؟ جب موسیقار کی ... میں عوام کے لئے کچھ بھی نہیں تو وہ عوام سے یہ توقع کیوں کرتا ہے کہ وہ اسے غور سے سُنیں اور واہ واہ کریں۔ عوام ایسی موسیقی کو سن کر کیا کریں جو اُن کی زندگی کی حقیقتوں سے دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی۔

امکان تھا کہ قحط سالی کے وقت سورت میں ملہار گا کر قدرت سے لڑ سکتے تھے تو عوام کے دوش بدوش رہ کر اُن کے دشمنوں سے بھی لڑ سکتے تھے۔ اسی طرح فیاض خان نے بھی ——— ایک ریکارڈ میں "میاں کی توڑی" گائی ہے اور کچھ اس انداز سے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی مصیبت کا مارا اپنا دُکھڑا سنا رہا ہے۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے۔ وہ مظالم جو اُس پر ڈھائے جا رہے ہیں، سہنے کی تاب نہیں رکھتا۔ اُس کی غیرت کو ٹھیس لگی ہے۔ حُرّیت جاگ اُٹھی ہے اور جھنجھلا کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اگر فیاض خان عوام کے اسٹیج سے کسی موقعہ

ہماری موسیقی میں زندگی کو اور اُس کی مختلف کیفیات کو پیش کرنے کی بڑی عمدہ صلاحیت و گنجائش ہے۔ جن اصولوں پر ہماری کلاسکی موسیقی کی بنیادیں قائم ہیں وہ ہزاروں سالوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ انھیں مہمل و فرسودہ قرار دینا ہماری کوتاہ نظری ہوگی۔ لیکن جس طرح ہماری شاعری ایک عرصے تک گل و بلبل اور عاشق و معشوق کے گرد گھومتی رہی اُسی طرح ہماری موسیقی بھی اسی ہیر پھیر میں رہی —— خیر۔ وہ ذکرِ گل و بلبل ہی سہی مگر ذرا دیکھیے کہ ہمارے فن کاروں نے کس خوش اسلوبی سے جذبات و کیفیات کی صحیح ترجمانی کی ہے —— میں یہاں کچھ ریکارڈوں پر تبصرہ کرتا ہوں۔

• محبوبہ سے اُس کا پریتم رات کو ملنے کا وعدہ کرتا ہے۔ طرح طرح کی قسمیں کھا کر یقین دلاتا ہے۔ وہ بیچاری بھی یقین کر لیتی ہے —— انتظار کی پہاڑ سی گھڑیاں نہ معلوم کیسے کیسے گزاریں۔ رات آئی۔ انتظار شدید سے شدید تر ہو گیا۔ ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہے کہ اب آتے ہوں گے۔ (عبدالکریم خان۔ جوگیا۔ پیا سے ملنے کی آس) رات آنکھوں ہی آنکھوں میں بیت گئی اور وہ نہ آئے۔ ناامیدی کے کالے بادل اُمڈ آئے —— دل سے کبھی نہ ختم ہونے والی ایک ٹیس اٹھی۔ سازِ دل کانپ اٹھا۔ حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی ایک آواز اُبھری اور ساگ بن گئی (دیپ دیپ۔ پیا نہیں آئے۔ ہیرا بائی بڑودکر) —— دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ کہ نہ جانے کیا ہوا جو نہ آئے۔ کہیں کسی اور کے دامِ محبت میں تو گرفتار نہیں ہو گئے۔ کیا ہے، جو مجھ میں نہیں اور غیر کے پاس ہے جو وہ ریجھ گئے —— ضرور انھیں کسی نے اپنے جال میں پھانس لیا ہے ورنہ وہ ضرور آتے (فیاض خاں۔ جے جے ونتی مورے مندر اب لوں نہیں آئے) —— ناچار مغموم ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ کڑھنے لگتی ہے شکایتوں کا طوفان دل میں موجیں مارنے لگتا ہے اور وہ بے خودی میں باتیں کرنے لگتی ہے —— پریتم، تم میرے ہو، صرف میرے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم کسی اور کی آغوش گرما رہے ہو —— آؤ ساجن، آؤ —— دیر نہ کرو —— دیکھو، میں تمھارے فراق میں کیسی گھل گئی ہوں —— (اوم کارناتھ۔ نیلامبری۔ جتوا۔ بالموا) —— مگر اب تو صبح درخشاں اُس کے لئے ناامیدی کا پیغام لے کر آ گئی۔ ساری رات جاگتے بیت گئی اور پریتم نہ آئے۔ وہ پژمردہ ہو گئی۔ دل بھر آیا۔ طبیعت بوجھل ہو گئی۔ بات کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں کوئی پھانس ہے۔ کوئی چیز کھٹک رہی ہے۔ مضمحل چہرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کے فراق میں جل بھی ہے۔ اس لئے تحمل سے کام لے رہی ہے۔ دیدہ و دانستہ صبح کے سرد و آہ در لمحات میں اپنے آپ کو سمو دیا ہے۔ مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔ نمائشی مسکراہٹ و نغمہ سرائی سے بے دلی ٹپکی پڑتی ہے اور جوں جوں راز چھپانے کی کوشش کرتی ہے سسکیاں خود بخود لبوں پر تیر آتی ہیں۔ (نثار حسین خان۔ ترانہ بھیرویں) —— دل سے نکلی ہوئی آہ تو عرش کا دامن چھو آتی ہے۔ بھلا محبوب کا دل کیوں نہ پگھلتا۔ آخر محبوب کو تڑپا ہی دیا اور وہ شوقِ دید میں اپنی سجنی سے ملنے کو چل پڑا —— محبوبہ نے جونہی دھندلا سا جانا پہچانا سایہ اپنی طرف آتے دیکھا مارے خوشی کے ناچنے لگی۔ وصال کی گھڑیاں اتنے قریب دیکھ کر وہ سراپا مسرت بن گئی اور جوش و مستی، شرم و حیا و سپردگی کے نامعلوم احساس سے پاگل سی ہو گئی (روشن آرا بیگم —— کرناٹکی۔ آئے میرے گھر آج بتوا)

ہندوستانی مصوّری سے واقف حضرات کے لئے "ابھسارکا" (अभीसारिका) ایک ایسا موضوع ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہر بڑے مصوّر نے اس عنوان پر موشگافیاں کی ہیں۔ اسی موضوع کو آپ بڑے غلام علی خاں کے ریکارڈ "یہ نویلی نار —— (کیدار)" اور "منوا لاگے (دیسی)" میں سنیے یا عبدالکریم خان سے "(دمشرجنگلا)۔ رام نگریا کیسے جیؤں رے" سنیے اور ان فن کاروں کو داد دیجیے کہ "ابھسارکا" ایسے ویسے موضوع کو کسی کامیابی سے سُروں میں پیش کیا ہے —— جب ہماری موسیقی اس خوبی اور نفاست سے عشق و محبت کی داستانوں میں جذباتیت کا رنگ بھر سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہماری زندگی کے اور مسائل جو ان داستانوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں نہ پیش کر سکے۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کلاسکی موسیقی لوک گیت سے اُبھری ہے آج ان دونوں اصناف میں ایک درجۂ امتیازی قائم ہو گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے تعلق نہیں ہے —— آج کی حالت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اس قومی سرمایے کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ہمارے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ یہ موسیقی وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی اور تجدید و تغیّر کی محتاج ہے۔ لہٰذا میں اب اپنے مقصد پر آتا ہوں کہ ہمیں موسیقی کے (FORM) کو بدلنے کی ضرورت نہیں بلکہ موضوع بدلنا چاہیے اور اس کے لئے سب سے پہلا قدم اُس فاصلے کو کم کرنے کے لئے اٹھانا چاہیے۔ جو کلاسکی موسیقی اور لوک گیت میں پیدا ہو گیا ہے —— ہر علاقے میں جا کر لوک گیتوں

یہ رنگین یہ ہنگامہ اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اپنے گرد و پیش کے حالات سے نہ تو وہ متاثر ہے نہ اس کی موسیقی۔ وہ تو موسیقی کے دیرینہ قوانین دہرا رہا ہے۔ موضوع اور مواد کچھ بھی نہیں۔ افادیت سرے سے غائب۔ نہ ذاتی نہ اجتماعی ۔۔۔ ایسی موسیقی سامعین پہ خاک اثر کرے گی؟ ۔۔۔ یقیناً وہ تنزل پذیر ہے۔

عام طور پہ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فنِ موسیقی کا تعلق سماعت سے ہے اور ہر وہ آدمی جو بہرا نہیں ہے اُسے اس سے لُطف اندوز ہونا چاہیئے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا اس سوال کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ قورمہ کیسے پکتا ہے۔ اور اس میں کیا کچھ مصالحے کس مقدار سے پڑتے ہیں۔ اچھے یا بُرے قورمے کی تمیز نہیں کر سکتا۔ حالاں کہ مزے کا تعلق زبان سے ہے ۔ جب ہم کسی چیز کی الف بے سے بھی واقف نہیں تو کیسے جان سکتے ہیں کہ وہ اچھی ہے یا بُری۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ہم اپنی لاعلمیت کو نظر انداز کر کے بڑی فراخ دلی سے فتوے صادر کر دیتے ہیں کہ کلاسکی سنگیت میں رکھا ہی کیا ہے؟ ۔۔۔ ظاہر ہے کہ ہماری ایسی رائے ذہنی حماقت پر مبنی ہوں گی جائے گی ۔۔۔ فرض کیجیئے۔ ہمارے سامنے ایک جاپانی شاعر اپنی معرکۃ الآرا نظم پڑھے تو ہم کیا سمجھیں گے؟ ہمارے لئے تو اس میں کوئی مزہ، خوبی یا فن نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ مشہور جاپانی شاعر ہمارے سامنے کچھ پڑھ رہا ہے۔ اور کیا یقین ہے کہ نظم ہی پڑھ رہا ہے۔ گالیاں نہیں دے رہا ۔۔۔ اور چین جاپان کیوں جائیں!! غالب کا بہترین شعر ہمارے سامنے پڑھا جاتا ہے۔ باوجودے کہ سب الفاظ ہم سمجھ گئے اور معانی بھی جان لئے۔ پھر بھی فنِ شاعری سے واقف جو لُطف اٹھائے گا وہ ہم نہ اٹھا سکیں گے۔ اب ہم یہ کہہ دیں کہ یہ تو مہمل اور بکواس ہے تو یہ ہمارا قصور ہے۔ غلطی ہماری ہے کہ اس فن سے ہم بالکل کورے ہیں ۔۔۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہمیں کہیں بھی ایسے دور کا ثبوت نہیں ملتا۔ جب ہر کس و ناکس فن کار بن گیا ہو۔ فن کاروں کی تعداد ہمیشہ محدود ہی رہی اور ان کے فن کو سمجھنے والوں کا حلقہ بھی محدود ہی رہا ۔۔۔ پھر بھی ہم موجودہ دَور میں سب کو فن کار نہ بنا سکیں تو کم از کم سب میں یہ صلاحیت ضرور پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ تھوڑا بہت فن کو سمجھ لیں۔

فنونِ لطیفہ میں موسیقی، رقص، مصوری و سنگ تراشی ایسے فن ہیں جن میں فن کا ہم سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان میں فن کار کی تخلیق کا ادراک قوتِ سماعت و بصارت سے ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ادب کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ اس زبان کو نہ سمجھیں جس میں کہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جس طرح کسی زبان کے جان لینے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اُس زبان کے ادب کو بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح موسیقی اور رقص و دیگر فنون کے لئے بھی سُننا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے اصولوں سے واقفیت ضروری ہے۔ ذوقِ سلیم اور مخصوص فکر و نظر پیدا کرنا پڑتی ہے۔

عام لوگوں کا یہ کہنا صحیح ہے کہ جب موسیقی ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو سُن کر کیا کریں گے؟۔ موسیقار کہتے ہیں کہ ہمارا سنگیت اگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تو یہ اُن کی لاعلمی ہے۔ اُن کا قصور ہے ۔ ہمارا یا ہمارے سنگیت کا قصور نہیں۔ فن، فن کے لئے ہے اور جہاں تک فن اس کی اجازت دے گا اور گنجائش ہے اُسی طرح پیش کیا جائے گا۔ فن کو اس سے غرض نہیں کہ وہ کس کی سمجھ میں آیا اور کس کے نہیں بلکہ اس سے غرض ہے کہ وہ روائتی حدود و بندش کا کہاں تک لحاظ رکھتا ہے ۔ ایسا کہتے وقت فن کار یہ بھول جاتے ہیں کہ فن کسی انفرادی کاوش و محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ عوام کی مجموعہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عوام اُسی فن کو نہ سمجھیں جسے خود اُنھوں نے فروغ دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ سنگیت بھی فن ہے لیکن موجودہ اسلوب اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے ۔ وجہ صرف یہ ہے کہ سنگیت کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکے ۔ سب جانتے ہیں کہ آواز میں درد ہوتا ہے گانے والے کی آواز میں بھی درد ہے مگر عوام کے لئے نہیں۔ شوخی ہے لیکن اُن کے لئے نہیں۔ اُس کی آواز میں غصّہ و نفرت ہے مگر اُن کے دشمنوں کے لئے نہیں۔ اُس کے سنگیت میں اُن کے لئے کچھ بھی نہیں ۔ پھر جس میں ان کا سُکھ دُکھ نہیں اُن کی زندگی نہیں۔ دن رات کی محنت و مشقت کا ذکر نہیں اُسے وہ کیوں سُنیں؟ جب موسیقار کی موسیقی میں عوام کے لئے کچھ بھی نہیں تو وہ عوام سے یہ توقع کیوں کرتا ہے کہ وہ اسے غور سے سُنیں اور واہ واہ کریں۔ عوام ایسی موسیقی کو سن کر کیا کریں جو اُن کی زندگی کی حقیقتوں سے دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی۔

امکان تھا کہ قحط سالی کے وقت سورت میں ملہار گا کر قدرت سے لڑ سکتے تھے تو عوام کے دوش بدوش رہ کر اُن کے دشمنوں سے بھی لڑ سکتے تھے۔ اسی طرح۔ فیاض خان نے بھی ۔ ایک ریکارڈ میں "میاں کی توڑی" گائی ہے اور کچھ اس انداز سے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی مصیبت کا مارا اپنا دُکھڑا رو رہا ہے۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے۔ وہ مظالم جو اُس پر ڈھائے جا رہے ہیں۔ سہنے کی تاب نہیں رکھتا۔ اُس کی غیرت کو ٹھیس لگی ہے۔ حُرّیت جاگ اٹھی ہے اور جھنجھلا کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اگر فیاض خان عوام کے اسٹیج سے کسی موقع پر

تو نڈی "گمشتہ ہوتے تو آج دُنیا کے ہر کونے میں یہ ریکارڈ بجایا جاتا۔

ہماری موسیقی میں زندگی کو اور اُس کی مختلف کیفیات کو پیش کرنے کی بڑی عمدہ صلاحیت و گنجائش ہے۔ جن اصولوں پر ہماری کلاسکی موسیقی کی بنیادیں قایم ہیں وہ ہزار ہا سال کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ انھیں مہمل و فرسودہ قرار دینا ہماری کوتاہ نظری ہوگی۔ لیکن جس طرح ہماری شاعری ایک عرصہ تک گل و بلبل اور عاشق و معشوق کے گرد گھومتی رہی اُسی طرح ہماری موسیقی بھی اسی ہیر پھیر میں رہی — خیر۔ وہ ذکرِ گل و بلبل ہی سہی مگر ذرا دیکھئے کہ ہمارے فن کاروں نے کس خوش اسلوبی سے جذبات و کیفیات کی صحیح ترجمانی کی ہے — میں یہاں چند ریکارڈوں پر تبصرہ کرتا ہوں۔

"محبوبہ سے اُس کا پریتم رات کو ملنے کا وعدہ کرتا ہے۔ طرح طرح کی قسمیں کھا کر یقین دلاتا ہے۔ وہ بیچاری کی ماری یقین کر لیتی ہے — انتظار کی پہاڑ سی گھڑیاں نہ معلوم کیسے کیسے گزاریں۔ رات آئی۔ انتظار شدید سے شدید تر ہو گیا۔ ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہے کہ اب آتے ہوں گے۔ (عبدالکریم خاں۔ جوگیا۔ پیا سے ملنے کی آس) رات آنکھوں ہی آنکھوں میں بیت گئی اور وہ نہ آئے۔ ناامیدی کے کالے بادل اُمڈ آئے — دل سے کبھی نہ ختم ہونے والی ایک ٹیس اٹھی۔ سازِ دل کانپ اٹھا حسرت دیاس میں ڈوبی ہوئی ایک آواز اُبھری اور راگ بن گئی (پٹ دیپ۔ پیا نہیں آئے۔ ہیرا بائی بڑودکر) — دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ کہ نہ جانے کیا ہوا جو نہ آئے۔ کہیں کسی اور کے دامِ محبت میں تو گرفتار نہیں ہو گئے۔ کیا ہے، جو مجھ میں نہیں اور غیر کے پاس ہے جو وہ ریجھ گئے۔ ضرور اُنھیں کسی نے اپنے جال میں پھانس لیا ہے ورنہ وہ ضرور آتے (فیاض خاں۔ جے جے ونتی موسے مندر اب لوں نہیں آئے) — ناچار مغموم ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ کڑھنے لگتی ہے شکایتوں کا طوفان دل میں موجیں مارنے لگتا ہے اور وہ بے خودی میں باتیں کرنے لگتی ہے — "پریتم، تم میرے ہو، صرف میرے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم کسی اور کی آغوش لرہا رہے ہو — آؤ ساجن، آؤ — دیر نہ کرو — دیکھو، میں تمھارے فراق میں کیسی گھل گئی ہوں — (اومکار ناتھ۔ نیلامبری۔ بنتوا۔ بالموا) — مگر اب تو صبح درخشاں اُس کے لئے ناامیدی کا پیغام لے کر آگئی۔ ساری رات جاگتے بیت گئی اور پریتم نہ آئے۔ وہ پژمردہ ہو گئی۔ دل بھر آیا۔ طبیعت بوجھل ہو گئی۔ بات کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں کوئی چبھن ہے۔ کوئی چیز کھٹک رہی ہے۔ مضمحل چہرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کے فراق میں جل بجھی ہے۔ اس لئے تصنع سے کام لے رہی ہے کہ کوئی شُنبہ نہ کر بیٹھے۔ جان بوجھ کر اپنے آپ کو خوش و خرّم ظاہر کرتی ہے۔ دیدہ و دانستہ صبح کے سہانے لمحات میں اپنے آپ کو سمو دیا ہے۔ مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔ نمائشی مسکراہٹ، دنفریبی سے بے دلی ٹپکی پڑتی ہے اور جوں جوں راز چھپانے کی کوشش کرتی ہے سسکیاں خود بخود لبوں پر تیر آتی ہیں۔ (نثار حسین خاں۔ ترانہ بھیرویں) — دل سے نکلی ہوئی آہ تو عرش کا دامن چھو آتی ہے۔ بھلا محبوب کا دل کیوں نہ پگھلتا۔ آخر محبوب کو تڑپا ہی دیا اور وہ شوق ملاقات میں اپنی سجنی سے ملنے کو چل پڑا — محبوبہ نے جونہی دھندلا سا جانا پہچانا سایہ اپنی طرف آتے دیکھا مارے خوشی کے ناچنے لگی۔ وصال کی گھڑیاں اتنے قریب دیکھ کر وہ سراپا مسرت بن گئی اور جوش و مستی، شرم و حیا و سپردگی کے نامعلوم احساس سے پاگل سی ہو گئی (روشن آرا بیگم — کرناٹکی۔ آئے میرے گھر آج میتوا)

ہندوستانی مصوری سے واقف حضرات کے لئے "ابھسارکا" (अभी सारिका) ایک ایسا موضوع ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہر بڑے مصوّر نے اس عنوان پر موشگافیاں کی ہیں۔ اسی موضوع کو آپ بڑے غلام علی خاں کے ریکارڈ "یہ نویلی نار — (کیدار)" اور "منوا لینے (دیسی)" میں سنیئے یا عبدالکریم خاں سے "(دھشر جنگلا)۔ رام نگریا کیسے جیؤں رے" سنئے اور ان فن کاروں کو داد دیجئے کہ "ابھسارکا" ایسے وسیع موضوع کو کسی کامیابی سے سُروں میں پیش کیا ہے — جب ہماری موسیقی اس خوبی اور نفاست سے عشق و محبت کی داستانوں میں جذباتیت کا رنگ بھر سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہماری زندگی کے اور مسائل جو ان داستانوں سے کہیں زیادہ اہمیّت رکھتے ہیں نہ پیش کر سکے۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کلاسکی موسیقی لوک گیت سے اُبھری ہے آج ان دونوں اصناف میں ایک درجۂ امتیازی قایم ہو گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے تعلق نہیں ہے — آج کی حالت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اس قومی سرمایے کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ہمارے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ یہ موسیقی وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی اور تجدید و تغیّر کی محتاج ہے۔ لہٰذا میں اب اپنے مقصد پر آتا ہوں کہ ہمیں موسیقی کے (FORM) کو بدلنے کی ضرورت نہیں بلکہ موضوع بدلنا چاہئے اور اس کے لئے سب سے پہلا قدم اُس فاصلے کو کم کرنے کے لئے اٹھانا چاہئے۔ جو کلاسکی موسیقی اور لوک گیت میں پیدا ہو گیا ہے — ہر علاقے میں جا کر لوک گیتوں

کا مطالعہ کیا جائے، دُھنوں کا تجزیہ کیا جائے۔ پھر اُن میں کلاسکی موسیقی کی فنی خصوصیات بڑی آراستگی اور خوبصورتی سے سمو دی جائیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ بعض فن کاروں نے ایسا کیا ہے — اُنھوں نے لوک گیتوں کی ہلکی پھلکی زمینوں میں بھی کمالات دکھائے ہیں۔ شادی بیاہ کے ڈھولک گیت ساون کے گیت، کجری اور ہوری وغیرہ میں نت نئے تجربے کیے ہیں۔ مثلاً بسم اللہ خان، علی اکبر، روی شنکر اور ولایت خان نے ہوری، کجری اور دھنیا وغیرہ کا معیار کافی بلند کیا ہے — مشتاق حسین خان، بڑے غلام علی خان، روشن آرا اور رسولن بائی نے ٹھمریوں کو نکھارا ہے۔ اومکار ناتھ، وناٹیک راؤ پٹوردھن، رام کرشن بہرے بوا، ہیرا بائی، گنگو بائی اور کیسر بائی نے بھجن اور بھاؤ گیت کی طرزوں کو سنوارا ہے۔ اور حقیقی معنوں میں فن کی خدمت بھی یہی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے — جب عوام اپنی ہی طرزوں اور دُھنوں کو اس طرح نکھرا ہوا دیکھیں گے تو ان فنی آرائشوں کی اپنی دُھنوں میں آمیزش کر لیں گے۔ اور یوں بتدریج لوک گیت کا معیار بلند ہوگا۔ ہمارے موسیقار اپنی طرزوں کو اور اونچے مقام پر لے جائیں گے۔ عوام رفتہ رفتہ اس مقام کو بھی پالیں گے اور اس طرح لوک گیت اور کلاسکی موسیقی ایک دوسرے کے قریب تر ہو کر باہم ترقی کریں گے۔

رہا موضوع بدلنے کا سوال تو ظاہر ہے کہ اب قدیم اور روائتی پس منظر کی گنجائش نہیں — زمانے کا ساتھ دیا جائے اور اقتصادی، سیاسی و سماجی و نفسیاتی قدروں کو جگہ دی جائے — میں اگر موسیقار ہوتا تو گاتے وقت یہ نہ کہتا کہ میں خالی خولی فلاں راگ کا خیال گاؤں گا۔ بلکہ یہ کہتا کہ آج گو آ کے ستیہ گرہیوں پر گولی چلائی گئی ہے۔ میں اس تشدد کے خلاف اپنے راگ میں احتجاج بلند کروں گا یا اتر پردیش کے سیلاب زدہ لوگوں سے ہمدردی ظاہر کرنے کو یہ راگ گا رہا ہوں۔ خواجہ حسن نظامی، شانتی سروپ بھٹناگر، بے خود، منٹو اور مجاز جیسی یگانہ ہستیاں داغِ مفارقت دے گئیں اُن کی یاد میں یہ راگ سُنیئے — ہمارے سنگیت میں آج بھی راگ مالا گانے کا رواج ہے اور اس کی مدد سے میں سمجھتا ہوں ناول کے ناول پیش کیے جا سکتے ہیں، جیتے جاگتے، زندہ و جاوید — مجھے یقین ہے کہ اس طرح حقیقت نگاری کرتے وقت اگر آپ کچھ تانیں ایسی لگا جائیں گے جو عوام کی سمجھ میں نہ آئیں تو وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش نہ کریں گے بلکہ ہم نشینوں سے معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ کیوں کہ انھیں اس بات کا تو یقین ہے کہ آپ نے کچھ انھیں سے متعلق کہا ہے۔ جو وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے نہ سمجھ سکے۔ لیکن آج کل کے موسیقار اگر اسی پُرانے ڈھرّے پر چلتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ یہ فن معدوم ہو جائے گا اور شاید آئندہ نسلوں کو کتابوں سے معلوم ہوگا۔ کہ ہندوستان میں کوئی موسیقی تھی جو اب ختم ہو چکی ہے۔

آج کل کا جنگِ آزادی نمبر

مئی ۱۸۵۷ء میں ہند میں آزادی کا ایک شعلہ لپکا تھا جسے سیاستِ افرنگ نے اپنے زعم میں بجھا دیا۔ مگر یہ آگ ہمارے سینوں میں دبی رہی اور آخر ۱۹۴۷ء میں آزادی کی وہ مشعل روشن ہوئی جو آج ساری دُنیا کے امن پسندوں کے لئے شمعِ ہدایت ہے۔
آج کل اگست ۱۹۵۷ء کے خاص نمبر میں جنگِ آزادی کے شہیدوں اور اُن کی جدوجہد کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا

اس خاص نمبر میں حسبِ ذیل موضوعات پر مضامین، ڈرامے، افسانے اور نظمیں ہوں گی

۱۔ ۱۸۵۷ء اور جنگِ آزادی سے متعلق اردو ادب
۲۔ پچھلی صدی میں جذبۂ قومیت کو فروغ دینے والی سماجی، سیاسی، تاریخی، اقتصادی اور ادبی تحریکیں۔
۳۔ ہند کی علاقائی زبانوں میں آزادی کا ادب۔

یہ آزادی نمبر تقریباً ڈیڑھ سو صفحوں پر مشتمل اور نادر تصویروں سے مزیّن ہوگا۔ (ادارہ)

حامد اللہ افسرؔ

امن کا منارا

ذرّے ذرّے سے خورشید ڈھالا ہم نے دنیا کو بخشا اُجالا

ضَو فگن یوں جہاں میں ہیں ہم چاند کے گرد ہو جیسے ہالا

ہم نے پوجا ہے انسانیت کو زندگی کا بنا کر شوالا

کھل گئیں عظمتیں زندگی کی ڈھنگ ایسا اہنسا کا ڈالا

وہ نظر زندگی کو عطا کی ہوئی دنیا کی رونق دوبالا

ہم نے ڈوبے ہوؤں کو ابھارا ہم نے گرتے ہوؤں کو سنبھالا

یوں لبوں پر خوشی کھیلتی ہے جیسے کھلتا ہو صحرا میں لالا

ہے کہاں آج یہ تاب کاری
اب بھی ہے جگ کو حاجت ہماری

دَور ایسا بھی گزرا ہے ہم پر ہم تھے محبوس و مجبور و مضطر

ہم تو اُس وقت بھی پُرسکوں تھے جبر سے ظلم سے دُور رہ کر

چھوڑا دامن نہ صبر و سکوں کا صبر کے ہم نے دکھلائے جوہر

تھا اہنسا کا ادنیٰ کرشمہ بدلی تقدیر بے تیغ و خنجر

اپنی فطرت سے ہم ساز ہیں ہم اب خزاں ہے بہاروں سے بہتر

عزم کر کے یہ نکلے ہیں گھر سے خود بنائیں گے اپنا مقدّر

کوہ کے بھی اُڑا دیں گے ٹکڑے راہ میں گر وہ حائل ہوا کر

بڑھتے جاتے ہیں منزل بہ منزل خود ہی رہرو ہیں ہم خود ہی رہبر

ہے کہاں آج یہ تاب کاری
اب بھی ہے جگ کو حاجت ہماری

روحِ بھارت کے ہم ترجماں ہیں آج بھی امن کے پاسباں ہیں

ہم ہیں صدق و صفا کے پجاری مہر و الفت کی روحِ رواں ہیں

جس نے مر کر ہمیں زندگی دی ہم میں اُس نور کی جھلکیاں ہیں

شکر ہے اب ہم اپنے چمن کے خود محافظ ہیں خود باغباں ہیں

سب ہیں آزاد سب ہیں برابر ذرّے خورشید کے ہم عناں ہیں

سازگار ایسی آب و ہوا ہے خار تک باغ میں گل فشاں ہیں

جو کبھی شکستہ تھے بیکس تھے اب وہ ذرّے بھی جنسِ گراں ہیں

منزلیں ہیں ترقی کی آگے چار جانب رواں کارواں ہیں

ہے کہاں آج یہ تاب کاری
اب بھی ہے جگ کو حاجت ہماری

آج دنیا میں بھارت ہمارا عالمی امن کا ہے منارا

ہے صفا پروروں کا وہ حامی امن خواہوں کا ہے اک سہارا

مرجعِ سرفرازانِ عالم بن گیا دیش اب پھر ہمارا

تشنہ کام آتے ہیں کل جہاں سے عقل و حکمت کا بہتا ہے دھارا

خدمتیں بے غرض ہیں ہماری سارے عالم پہ ہے آشکارا

ہے ہمیشہ سے خواہش ہماری ساری قوموں کا ہو بھائی چارا

ہو محبت سے لبریز دنیا یہ جہاں ایک کنبہ ہو سارا

مہر کی جب چلیں گی ہوائیں شر کا بجھ جائے گا ہر شرارا

جگمگائے گا اک دن فضا میں امن کا عافیت کا ستارا

ہے کہاں آج یہ تاب کاری
اب بھی ہے جگ کو حاجت ہماری

کہ وہ خوشیا کی سالگرہ کی قدر کرے گا۔ اس سے قبل جب وہ دونوں یعنی
تینوں اپنے گھر سے پیچ کر لوٹ رہے تھے تو تاج محل کے نزدیک پہونچے
ہی خوشیا کے کاکا نے راموسے کہا۔

”بھیا۔ اپنے پتا سے بھی ہاتھ جوڑ کر پرنام کہنا۔ ہم بات کرنے
آویں گے۔ جلد۔“

”اچھا کاکا!“

راموکی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ تاج محل اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا
خوشیا گدھے پر چڑھی ٹک ٹک کرتی جا رہی تھی۔ اُس کی خوشیا۔ سانگ کے
راجا کی طرح گدھے پر بصد ناز و طمطراق بیٹھی ہوئی خوشیا رانی۔ تاج محل کے
مناروں کو دیکھ کر اُسے بہت پرانی بات یاد آگئی۔ وہ تاج محل کو بہت دن
سے دیکھتا آیا تھا۔ لیکن ایک دن صرف زندگی میں ایک روز اُسے خیال آیا
تھا کہ تاج محل کیوں بنا اور کیسے بنوایا گیا۔ اُسے معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی
کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیوی کی یادگار کو قائم رکھنے کی خاطر اتنا بڑا مقبرہ
بنوایا ہے۔ صرف ایک بیوی کو امر کرنے کے لئے۔۔۔۔ ایک بیوی کو امر کرنے کیلئے۔

ہوا کے جھونکوں نے راموکے دماغ کو معطر کر دیا۔ اُسے پُرانی بات یاد
ہی نہیں آئی بلکہ ستانے لگی۔ وہ خوشیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اُس کیلئے
کیا کچھ کر سکے گا۔ اگر بھاگیہ ساتھ نہ دے اور وہ اُس سے پہلے مر جائے تو وہ بھی کوئی
نہ کوئی ایسا کام کرے گا۔ جس سے خوشیا امر ہو جائے۔ اس کا مطلب یعنی دو
پکی اینٹیں تھاپ تھاپ کر بہت بڑی حویلی کھڑی کر دے گا۔ مندر بنوائے گا
پیاؤ لگوائے گا۔ جانے کیا کیا۔۔۔۔۔

تین چار مہینے کے بعد راموسے خوشیا کی شادی ہو گئی۔ راموکا تاج محل والا خیال
اب بھی قائم تھا۔ اُس خیال نے اُسے عورت کی قدر کرنا سکھا دیا تھا۔ اکثر اس کے یار دوست
شکایت کرتے کہ وہ اپنی بیوی کو رانی بنائے کیوں رکھتا ہے تو وہ تاج محل کا ذکر کر کے
بیٹھ جاتا کہ ایک بادشاہ اپنی بیوی کے لئے اتنی بڑی عمارت وہ بھی سنگِ مرمر کی بنوا سکتا
ہے تو کیا وہ اپنی بیوی کو آرام سے بیٹھ کر بھی جینے نہیں دے سکتا۔ عورت کو تو گھر میں
[illegible] کرنی چاہیئے۔ روٹی پکا دی وہ اپنے گھر والے کو کھلا دی اور دن بھر آرام ہو تاکہ
خوشیا حیران تھی کہ ماجرا کیا ہے۔ اُس نے کئی بہوؤں کو اس طرح نچنت بیٹھے
ہوئے نہیں دیکھا تھا جیسا کہ وہ بیٹھی رہتی تھی۔ وہ دونوں وقت روٹی پکا دیتی
اور دن بھر آرام کرتی۔

لیکن راموکے دماغ میں تاج محل کے ساتھ خوشیا کا خیال بھی [illegible]
رہا تھا۔ وہ بھی تو آخر ایک انسان تھا۔ بادشاہ بھی اُس جیسے ہی گوشت پوست
کے انسان ہوتے ہیں کتنی ہی باجرے اور مکا کی روٹیاں کھا کے گزاریں پھر بھی
بیوی کو کم از کم محسوس ہونا چاہیئے کہ اُس کی کتنی قدر کی جا رہی ہے۔ وہ صرف پیٹ
کے لئے نہیں بیاہی گئی ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کبھی کبھی راموچپکے چپکے
نظر بچا کر خوشیا کو دو چار پیسے کی ربڑی یا دودھ کا پیالہ لا کر دیتا۔ اُس کے لئے
نت نئی اوڑھنی لانے کی فکر میں سرگرداں رہتا۔ اور ان تمام کاموں کو سرانجام
دینے کے لئے اُسے صبح سے شام تک مٹی گوندھنی اور مٹی کے برتن تیار کرنے
پڑتے۔ لیکن وہ تھکان نہیں مانتا۔۔۔

حتیٰ کہ گرمیاں آئیں۔ خوشیا کی آنکھیں دُکھنے آئیں۔ اور تاج محل اور
بیوی کے سپنے خیال میں جاتی رہیں۔ یعنی کسی مستند حاذق نے مخلصانہ مشورہ
دیا کہ ان میں نیم کی پتیوں کو نچوڑ کر ڈالا جائے۔ اور پتیوں کے نچوڑ سے جلنے کے بعد
خوشیا کی آنکھیں ــــ نہیں صرف ایک آنکھ بینائی کھو بیٹھی۔

راموکو بہت رنج ہوا۔ اُس نے کئی بار تنہائی میں بھگوان کی قسم کھا کھا
کر خوشیا کو یقین دلایا کہ اُس نے سب کام اُس کی بھلائی کے لئے کئے تھے بہت
سچ ہے۔

لیکن خوشیا نے پہلے برتاؤ دیکھے تھے۔ لہٰذا اُس نے راموپر کوئی الزام
نہیں رکھا۔ وہ اپنی ایک آنکھ والی بیوی کا دل اب بھی رکھنا چاہتا تھا۔

اسی واسطے جب کاتک اشنان سے پہلے وہ [illegible] کر آگرہ جانے
کے لئے تیار ہوا تو اُس نے اپنی بیوی سمیت آگرہ جانے کی تیاریاں شروع
کر دی۔۔۔۔

اور جس روز اُس نے [illegible] کے اُس جگہ یعنی تاج محل کے نزدیک
پہونچتے ہی سانتا رسیک دیا تھا وہ اُس کا اپنی بیوی کے ساتھ دوسرا پھیرا تھا
وہ آگرہ سے تاج محل تک خوشیا کے بُندوں کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ دفعتاً
سے اُس کی نگاہ تاج محل کے مناروں کی طرف مڑ گئی تھی۔ کانچ کے بُندے۔۔۔
اُسے سخت رنج محسوس ہوا۔ اُس کی بیوی کے کانوں میں کانچ کے بُندے۔۔۔
تاج محل کا خیال بیوی سے منسلک ہوتا گیا۔

کانچ کے بُندے!!

اُسے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ اگر [illegible] میں خوشیا کے کانچ





کہ جیسے چھوٹے توڑنے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کرے گا - ایک ارتھی میں کسی کی لاش جمنا کنارے پھونک آئے گر جمنا کنارے جہاں تاج محل کا سایہ لہروں سے کھیلتا رہتا ہے - اور اس بادشاہ کی بیوی کی یاد تازہ سے تازہ تر ہو جاتی ہے - جس نے اپنی محبوبہ کو حیاتِ ابدی بخش دی ہے -

کانچ کے بُندے :

ماسٹر کو اپنے آپ پر بہت غصّہ آیا - کانچ کے بُندے لایا تھا! وہ چاہتا تو اپنے جسم کو بیچ ڈالتا - اپنے خیالات کو اپنے سامنے قطار میں کھڑا کر کے باری باری لاتوں کے ذریعے دھکا دے دیتا - اُسے خوشیا کے کانوں میں کانچ کے بُندے اچھے نہیں معلوم پڑتے تھے - تاج محل - سنگِ مرمر، بیوی، کانچ کے بُندے، ایک پیچیدہ سلسلہ ..... اور ماسٹر نے مڑ کر گدھے کے ایک ساٹا مارا - اور گدھا چپ چاپ فلاسفر کی طرح نگاہ نیچے کئے چلتا ہی رہا - حتّٰی کہ دو چار منٹ تک غیر ارادی طور سے خوشیا سے گفتگو کرنے کے بعد اُس نے دو فرلانگ پہ نئے ایک شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر تاج محل کی طرف دیکھتے دیکھتے خوشیا کے کانوں میں سے اُن بُندوں کو نکال کر پاؤں تلے رکھ کر چُرمُر کر دیا -

گدھا چپ چاپ فلاسفر کی مانند سر جھکائے چلا جا رہا تھا - اور ماسٹر ہزاروں بار تاج محل اور اپنی بیوی کے اُلجھتے ہوئے خیالوں میں ڈوب گیا -

---

راشٹرپتی کا حکم کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کی سفارش پر ہند کے راشٹرپتی نے ۱۴ مئی ۱۹۵۴ء کو ریاست جموں و کشمیر پر ہند کے آئین کے اطلاق کے بارے میں ایک حکم جاری کیا تھا جس کی رو سے یونین پارلیمنٹ کو ریاستِ جموں و کشمیر کی لیجسلیچر کی رضامندی کے بغیر ریاست کے رقبے میں کمی بیشی کرنے اور ریاست کا نام بدلنے کا کوئی حق نہیں رہا - ریاست کے ایسے مستقل شہری جو پاکستان چلے گئے تھے - انھیں پرمٹ کے ماتحت از سرِ نو آباد ہونے کی غرض سے واپس آنے کی صورت میں اس حکم کی رُو سے ہند کا شہری تصوّر کیا جائے گا - اس کے علاوہ مذہب، نسل، ذات، جنس اور مقامِ پیدائش کی بنا پر امتیازی سلوک ممنوع قرار دیا گیا - اور ریاستی اسمبلی کو سماجی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ طبقوں کی ترقی کے لئے خصوصی قوانین منظور کرنے کا اختیار دیا گیا - ریاستِ جموں و کشمیر کی حدود میں رہنے والے شہریوں کو تقریر کرنے، اظہارِ خیالات، ہتھیاروں کے بغیر پُرامن طریقے پر اکٹھے ہونے، ایسوسی ایشن یا یونین قائم کرنے، بھارت کے تمام حصّوں میں آزادانہ نقل و حرکت کرنے یا یونین کے کسی حصّے میں آباد ہونے، جائداد کی خرید و فروخت اور کوئی پیشہ اختیار کرنے کا حق بھی دیا گیا -

ریاست کے لوگوں کو بنیادی حقوق کے حصول و نفاذ کے لئے، سپریم کورٹ میں مناسب کارروائی کرنے کا حق دیا گیا ہے - البتہ ریاست جموں و کشمیر کے کسی بھی نافذ الوقت قانون پر یا مستقبل میں تیار کئے جانے والے ایسے قوانین پر جن میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ کون سے افراد ریاست کے باشندے ہوں گے یا جن میں اُن مستقل باشندوں کو ریاست میں روزگار دلانے اور ریاست میں غیر منقولہ جائداد حاصل کرنے، ریاست میں آباد ہونے یا وظائف حاصل کرنے کے حقوق دیئے گئے ہوں، ہند کے آئین کے کسی حصّے کا اطلاق نہیں ہوگا -

کشمیر کا نیا آئین - ریاست کی آئین ساز اسمبلی نے ۱۷ - نومبر ۱۹۵۶ء کو اتفاقِ رائے سے ریاست کے نئے آئین کی قطعی منظوری دے دی - یہ آئین ریاست کے لوگوں کی دیرینہ خواہشات کی تکمیل کرتا ہے - اس کے ذریعے جموں و کشمیر کی ریاست کو انڈین یونین کا حصّہ لاینفک قرار دیا گیا ہے - ریاست کی حدود میں وہ تمام علاقے شامل ہوں گے جن پر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ریاست کے مہاراجہ کی حکومت تھی یا جو بعد میں مہاراجہ کا اقتدار قائم تھا - بھارت کے آئین کی رو سے پارلیمنٹ کو جن امور پر ریاست کشمیر کے لئے قانون سازی کا اختیار دیا گیا ہے ان کے سوا باقی تمام امور ریاست کے مقننّہ اور انتظامیہ اختیارات کے دائرے میں آتے ہیں -

اقبال مجید

قبائلی تہذیب میں تعلیمی ادارے

اس دور میں جب کہ ارتقار کی کتنی ہی منازل طے کر کے انسان نے قمر کا دل چیر دیا ہے۔ ہر ملک میں ایسے قبیلے موجود ہیں جہاں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں پہونچی ہے۔ ان قبیلوں کی معاشرتی اور تہذیبی حالت تقریباً وہی ہے جو تاریخ نوشتہ کے قبل کے انسانوں کی ہو سکتی ہے۔ یہ قبیلے آج بھی کافی تعداد میں گروہ بنا کر کہیں پہاڑی علاقوں میں اور کہیں گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں، جہاں عام انسانوں کا گذر دشوار ہوتا ہے۔ ان قبیلوں کی طرزِ معاشرت، ان کی سماجی حالت اُن کے مذہبی عقائد، روزمرہ کی زندگی غرض کہ اُن کی پوری تہذیب ترقی یافتہ سماج سے قطعی مختلف اور جُدا ہے۔

ہندوستان میں بھی ایسے متعدد علاقے موجود ہیں۔ جہاں سیکڑوں برس سے یہ قبائلی لوگ آباد ہیں۔ چھوٹا ناگ پور کی طرف یہ قبائل کافی تعداد میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر منڈا MONDA ہو HOO اراؤنی ORAON اور کھاریا KHARIA وغیرہ۔ مدھیہ پردیش میں گونڈ GOND اور بھویا BHOIA قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح سے آسام میں یہ قبائلی لوگ مختلف پہاڑی علاقوں میں ناگا NAGA آوس AOS ممی MIMI لوہٹا LOHTA اور انگامی ANGAMI قبیلوں کے نام سے بسے ہوئے ہیں۔

یہ تمام قبیلے ہندوستان میں جہاں بھی موجود ہیں عام طور سے تہذیب یافتہ زندگی سے دور ہیں۔ اس لئے ان کی زندگی میں اونچے اونچے مکانات کی جگہ جنگلی گھاس پھوس سے بنی ہوئی پناہ گاہیں ملیں گی۔ اور اطلس و کمخواب کی پوشاک کی جگہ یہ کہیں برہنہ نظر آئیں گے یا کہیں درختوں کی چھالوں یا گھٹیا چیتھڑوں سے اپنے جسم کے مخصوص حصے چھپائے نظر آئیں گے۔ یہ ریل، ہوائی جہاز یا موٹر کی سواری نہیں کرتے۔ بلکہ ان کو آسمانی طاقت سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ طلسم جو ترقی یافتہ انسان توڑ چکا ہے اُن کے لئے اب بھی طلسم ہے۔ بجلی کی کڑک بادلوں کی گڑگڑاہٹ، آندھیاں اور سیلاب غرض کہ نیچر کی ہر تباہ کن طاقت اُن کے لئے دیوتاؤں کا جلال ہے۔ جنھیں یہ اپنی زبان میں بونگا BONGA یا ماتا کی طاقت کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ اور ایسے موقعوں پر ان طاقتوں کو خوش کرنے کے لئے مختلف قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ اُن کی معاشی زندگی قبل تاریخ کی معاشی زندگی PRIMITIVE CULTURE کی یادگار ہے۔ زراعت اور کھیتی باڑی کا فن ان کے یہاں ابھی بالکل ابتدائی دور میں ہے۔ آپ یاحتی کے بہترین نتائج سے یہ لاعلم ہیں اور نہیں جانتے کہ کھیتوں میں مشین کا دل کس طرح دھڑکتا ہے اور وسائل کیمیاوی CHEMICAL RESOURCES زراعت کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتے ہیں۔ کبھی تو یہ جنگلوں میں آگ لگا کر اس کی جُھلسی ہوئی جگہ پر فصل بوتے ہیں اور کبھی چشموں اور دریاؤں کے قریب معمولی ہل کے ذریعہ زمین کو کسی حد تک اُپجاؤ بنا کر فصل بوتے ہیں۔ زیادہ تر آسمانی بارش پر اُن کی فصل کے نیک و بد کا دارومدار رہتا ہے۔ بس کھیتی باڑی کا یہی طریقہ ان کی معاشی زندگی کا مرکز ہے۔ دوسرے پیشوں میں مچھلی اور جنگلی جانوروں کے شکار کے علاوہ جنگلی پھل جمع کرنا یا پھر مٹی کے برتن اور روزمرہ کی ضروریات کے لئے بانس وغیرہ کی ٹوکریاں بنانا بھی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ملی جُلی معاشرت ان کے مقامی حالات کے مدِ نظر کچھ مختلف ہونے کے باوجود، بنیادی طور پر تمام قبائل میں یکساں پائی جاتی ہے۔

نوٹ۔ بونگا۔ اس کے اصل معنی طاقت کے ہیں۔ یہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ اسے عام طور پر قبائلی زندگی میں اس طاقت کے بارے میں [illegible] جو دکھائی نہ دے۔ لیکن جو آگ، ہوا، پانی غرض کہ دُنیا کی ہر چیز میں موجود ہے۔

ان قبائل کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پیشتر ایک بات ضرور ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ کہ قبلِ تاریخ کی معاشرت سے گذرنے والی یہ قومیں بہ ظاہر تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں ہزاروں سال پیچھے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی معاشرت اُن کا اپنا مذہب اور اُن کی اپنی سماجی قدریں ہیں جن کو یہ پوری طرح سے برتتی ہیں اور جو انھیں اُن کے حالات کے مطابق ڈھال کر ترقی کی طرف لے جانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

لُوی LOEY کے بقول کلچر یا تہذیب نام ہے "عقائد، رواج طرزِ معاشرت، صنعت اور فنونِ لطیفہ کے اُس کُل' کا جو فرد کو سماج کی بدولت محض اسی کی کوششوں کے بجائے ماضی کا ورثہ بن کر بے قاعدہ یا باقاعدہ تعلیم کے ذریعے مل سکے"۔ انسانی سرشت نے ہمیشہ دو طرح کے اوزار بنائے ہیں۔ ایک تو وہ جن کو اُس نے مادّہ سے پیدا کیا اور دوسرے وہ جن کو اُس نے دماغ سے بنایا۔ پہلی قسم MATFRIAI ISTIC EQUIPMENT کی ہے جس میں مکان، کھیتی باڑی کے اوزار، جسم کی زیبائش کی چیزیں وغیرہ شامل ہیں، اور دوسری قسم کے اوزار جنھیں INTELLECTUAL EQUIPMENT میں شامل کیا جا سکتا ہے، انسانی ذہن کا پیدا کردہ فلسفۂ حیات ہے جس کے ذریعے انسان نے زندگی کے کارواں کو ایک مخصوص ڈگر پہ لے جانے کے لئے مثبت اور منفی قدروں کا تعیّن کیا۔ اور یہی وہ اوزار ہیں جنھیں ہم اس کی تہذیب کہتے ہیں۔

نوعِ بشر خواہ وہ سنسان جنگلوں میں بسا ہو یا جگمگاتے قمقموں کی چھاؤں میں بہرحال ان دونوں اوزاروں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اپنے ماضی کے تہذیبی ورثہ کو جو اس کے ماحول اور سماجی حالات کی پیداوار ہے اپنے وجود سے الگ نہیں کر سکتا۔ اس بات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس پچھڑی ہوئی قبائلی زندگی کی پستی کے اسباب ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم اُن کی تہذیب کی پستی پر مذمّت کرنے کے بھی اسباب فراہم کر سکتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان قبائلی گروہوں کے عقائد، اُن کے رواج، طرزِ معاشرت اُن کی صنعت اور فنونِ لطیفہ کی تعلیم انھیں کس طرح دی جاتی ہے اور ان تعلیمی مرکزوں کی نوعیت کیا ہے؟ یہاں بحث انھیں قبائل سے رکھی جائے گی جہاں یہ ادارے موجود ہیں۔ عام طور پہ یہ ادارہ تقریباً ہر قبیلہ میں موجود ہے۔ وہ قبیلے جن میں اس ادارے کی اہمیّت بہت زیادہ ہے — چھوٹا ناگپور، مدھیہ پردیش اور آسام میں پائے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند میں بسنے والے قبائل میں یہ تعلیمی ادارے نہیں پائے جاتے، لیکن، اگر وہاں کے قبائل کی زندگی کو قریب سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی تہذیب میں شدید انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ اپنے تہذیبی ورثے سے روز بروز محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے انھیں اپنے کو صحیح طور پہ ڈھالنے میں بڑی شدید دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ مگر برخلاف اس کے وہ قبائل جن کے یہاں یہ تعلیمی ادارے موجود ہیں ٹھیک طور سے کام کر رہے ہیں۔ اور ان کا ٹھیک وہی اثر ہے جو ایک تہذیب یافتہ شہر کے اسکولوں کا ہو سکتا ہے

یہ تعلیمی مرکز عام طور پہ قبیلہ کی آبادی کے بیچ میں ایسی پُرپیچ اور پوشیدہ جگہ بنائے جاتے ہیں جہاں پر کسی اجنبی کا گزر نہ ہو سکے۔ یہ ادارہ قبائلی زندگی میں کیوں ظہور میں آیا اس کے مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں کچھ سوشیالوجسٹ کا خیال ہے کہ اس ادارے کی اُن قبائل میں خاص ضرورت تھی وجہاں کے لوگوں کی زندگی کا دار و مدار زیادہ تر جنگلی جانوروں کے شکار پہ تھا اس لئے قبیلے کے چھٹے ہوئے شکاری نوجوان یہاں رات کو قیام کرتے تھے اور جنگلوں میں نکل کر شکار کھیلتے تھے۔ کچھ کا خیال یہ ہے کہ یہ اِدارہ پڑوسی قبیلوں کے حملوں سے اپنی عورتوں اور ڈھور ڈنگروں کو بچانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جہاں نوجوان راتوں کو جاگ کر قبیلے کی حفاظت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ کیوں کہ حیوانی خواہشات کی تسکین کاشتکاری کے فروغ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چند موسموں میں ممنوع تھی اس لئے یہ ادارہ اپنے یہاں پناہ دے کر ان لوگوں کو جنسی بے اعتدالی سے روکتا تھا۔

اس ادارے کے قیام کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ بعض قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ شوہر اس وقت تک گھر میں نہیں سو سکتا جب تک نوزائدہ بچہ کی نال نہ گر جائے۔ اس لئے اس دوران میں قبیلے کے لوگ راتوں کو اس جگہ آکر سو رہتے تھے۔ بہرحال کوئی وجہ بھی ہو لیکن موجودہ حالت تک پہونچتے پہونچتے اس ادارے نے قبائلی زندگی میں ایک اہم جگہ پالی ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ادارے نے قبائل کی سماجی اور تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کافی مدد دی ہے۔ ان اداروں میں قبائلی نوجوان

کو ایک خاص نوعیت کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے۔ اگرچہ تعلیم کا طریقہ ایسا نہیں جیسا کہ پڑھی لکھی دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ ان نوجوانوں کو اُن کی زندگی کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ انھیں مذہبی رسم و رواج کی ادائیگی کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ انھیں جنسی لذتوں سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے ایسے اصُولوں پر چلایا جاتا ہے جن کے ذریعے ان میں جنسی بے راہ روی نہ پیدا ہو جائے۔ انھیں تعلیم گاہوں میں اُنھیں کھیتی باڑی اور زراعت کے دوسرے فنون کے بارے میں بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ انسان کس طرح اپنی تہذیبی شان و شوکت کے ساتھ مشترکہ طور مل کر کاموں کو انجام دیتا ہے۔ یہاں یہ لوگ مختلف دوائیں بنانے، جادو ٹونے کرنے اور چٹائیاں وغیرہ بُننے کا کام بھی سیکھتے ہیں۔ ان تعلیمی اداروں کو مختلف قبائل میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چھوٹا ناگ پور کے قبائل میں مُنڈا اور ہو ان تعلیم گھروں کو گیتی اوڑا GETIORA کہہ کر پکارتے ہیں اور اوراؤن ORAON قبیلہ انھیں ڈھمکریا DHOMKORIYA کے نام سے یاد کرتا ہے اور مدھیہ پردیش میں گونڈ قبیلہ میں جہاں یہ تعلیمی ادارہ انتہائی اہم ہے اسے گوتل GOTUL کہا جاتا ہے۔

ان تعلیم گھروں کی تشکیل کا بھی یہی حال ہے۔ مختلف قبیلوں کے تعلیم گھروں کی تشکیل مختلف ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ کچھ قبائل میں ان اداروں کی بنیاد عمر یا جنس کے اعتبار سے رکھی جاتی ہے۔ کچھ قبائل میں کنوارے لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ تعلیم گھروں میں تعلیم پاتے ہیں اور اُن کے لئے الگ الگ مکان ہوتے ہیں۔ اور اُن کا مکمل انتظام الگ ہوتا ہے۔ جب کہ کچھ قبیلوں میں لڑکیاں اور لڑکے ایک ساتھ مل کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ عموماً ان تعلیم گھروں میں آنے والے ممبروں کی عمر ۵ سال سے لے کر ۳۰ سال تک ہو سکتی ہے۔ کچھ قبائل میں تعلیم گھروں میں کام کرنے والوں کو عہدے بھی دے دیئے جاتے ہیں اور تعلیم گھر کے سردار کو کچھ مخصوص اختیارات بھی دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ نوجوان جسے تعلیم گھر میں سب سے بڑا عہدہ ملتا ہے رَبیک کہلاتا ہے۔

ناگا پہاڑیوں میں آباد میں نامی قبیلہ اپنے یہاں دو طرح کے تعلیم گھر رکھتا ہے۔ یہاں لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جن میں لڑکیوں کے تعلیم گھر کو یہ اپنی زبان میں اکوچی اور لڑکوں کے تعلیم گھروں کو کچوکی KICHOKI کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مُنڈا قبائل کے گاؤں میں بھی لڑکی اور لڑکوں کے تعلیم گھر الگ ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کیلئے خاص طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انھیں گاؤں کی بیواؤں کے گھروں میں رکھا جاتا ہے۔ یا ایسی عورتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جن کے بچے نہیں ہوتے، یہ عورت اُن لڑکیوں کی پوری پوری نگرانی رکھتی ہے۔ اوراؤن قبیلوں میں بھی لڑکیاں الگ رکھی جاتی ہیں اور بوڑھی عورتیں ان کا پورا خیال رکھتی ہیں۔ اسی طرح ہو قبیلہ بھی لڑکیوں کے لئے الگ انتظام کرتا ہے۔ وہ تعلیم گھر جن میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں گونڈ کے قبیلے میں گوتل کے نام سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

ان تعلیم گھروں میں دن رات کی محنت کے بعد لڑکے اور لڑکیاں رات کو حاضری دیتے ہیں۔ کچھ قبیلوں میں تو اُن کا حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے لوہتا قبیلے کے لڑکے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مورنگ (تعلیم گھر) میں رات کے وقت حاضری دے، صرف انھیں لڑکوں کی حاضری معاف کی جاتی ہے جو کہ اپنے ضعیف یا بیمار ماں باپ کی خدمت کے لئے گھر پر رُک جاتے ہیں۔ لوہتا قبیلے کا لڑکا اگر مورنگ میں حاضری نہیں دیتا تو اس صورت میں اُسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

قبائلی تہذیب میں اس ادارے کی اہمیت گونڈ قبیلے میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ جہاں اس تعلیم گھر کا کام بڑی مستعدی اور ذمہ داری کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اس قبیلے کے گوتل گھر کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے گونڈ قبیلے کی ایک شاخ چھوٹا ناگپور میں چند شمالی علاقے میں بسی ہوئی ہے۔ یہ گیترا گونڈ GATRA GOND کہلاتے ہیں۔ ان کے یہاں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے الگ تعلیم گھروں کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں ایک تیسرا مخصوص تعلیم گھر بھی ہوتا ہے۔ جہاں شادی شدہ مرد اور عورتیں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ بستر BASTAR کے علاقے کے پہاڑی ماریا MARYA جو کہ گونڈ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی تعلیم گھر موجود ہیں۔ ایک دوسرا گونڈ قبیلہ جو کہ بستر میں کاندا گاؤں اور نرائن پور کے درمیان واقع ہے۔ مُریا گونڈ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مُریا MORYA گونڈ ایک ہی تعلیم گھر رکھتے ہیں جن میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

گونڈ قبیلے کا گوتل گھر عام طور پر بیچ گاؤں میں بنایا جاتا ہے۔ لیکن بامیاں گاؤں جہاں گونڈ قبیلے کے تقریباً سو مُریا خاندان آباد ہیں۔ وہاں گوتل گھر آبادی سے کچھ فاصلے پر بنایا گیا ہے۔ مُریا گوتل گھروں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس گوتل گھر میں ایک نوجوان سردار کی حیثیت سے منتخب

کیا جاتا ہے - جسے یہ لوگ اپنی زبان میں سلیدار یا چالان CHALAN کہتے ہیں - دن بھر کے کام کے بعد رات کو لڑکے اور لڑکیاں کھانے وغیرہ سے فراغت کر کے گوتل گھر میں جمع ہوتی ہیں اور پھر یہاں کی کارروائی شروع ہو جاتی ہے - نوجوان سردار، لڑکے اور لڑکیوں کی پوری نگرانی رکھتا ہے - انھیں رقص و موسیقی کے سلسلے میں ضروری ہدایات دیتا ہے - اور گاؤں میں اگر کسی جگہ اس کی ٹولی کو رقص کے مظاہرے کے لئے دعوت دی جاتی ہے - تو ایک کیپٹن کی حیثیت سے اُن کے انتظامات کرتا ہے - اور اگر گوتل گھر کے دو ممبران کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی یہی کرتا ہے - اس سردار کے علاوہ کچھ اور چھوٹے چھوٹے عہدے دار بھی ہوتے ہیں - مثال کے طور پر دیوان، تحصیل دار، صوبے دار، کوتوال وغیرہ - اسی طرح لڑکیوں میں، چالاتن، تحصیلدارن، اور کوتوارن کے عہدے بھی ہوتے ہیں - یہ عہدے انھیں لڑکیوں کو ملتے ہیں جو ان عہدوں پر فائز کئے گئے لڑکوں میں مقبول ہوں - ہر لڑکے کے ساتھ ایک لڑکی کو رکھا جاتا ہے جو کہ اس کی دوست ہوتی ہے لیکن یہ دوستی محض دوستی تک ہی قائم رہتی ہے اور ان دونوں کے دوستانہ تعلقات اسی وقت تک برقرار رہتے ہیں جب تک یہ دونوں گوتل گھر میں آتے رہتے ہیں - یا دو میں سے کسی ایک کی شادی ہو جائے - لڑکے اور لڑکیوں کے یہ تعلقات جنسی تعلقات میں تبدیل نہیں ہو پاتے - کیوں کہ عموماً یہ قبیلے چھوٹے چھوٹے باس CLAN میں بٹے ہوئے ہیں جو اپنے ہی باس میں شادی کرنا جائز نہیں سمجھتے - باہر کے قبیلے میں شادی LXOGAMY کرنے کے اصول کو اچھی طرح سے برتنے کے لئے انھوں نے ایک اچھا طریقہ یہ نکالا ہے کہ کچھ رسم و رواج کے مطابق یہ دوسرے گاؤں میں میلے ٹھیلوں کے موقعوں پر جاتے ہیں اور وہاں لوگوں سے خوش گوار تعلقات قائم کرتے ہیں اور شادیاں کر کے CULTURAL CONTRACT پیدا کرتے ہیں - اس طرح گوتل گھر باہری قبیلوں میں شادی کرنے کے اصول کو برتنے میں کافی مددگار ثابت ہوتا ہے لڑکے یا لڑکی کی شادی ہو جانے کے بعد گوتل گھر سے اس کی ممبرشپ ختم ہو جاتی ہے اور وہ پھر گوتل میں نہیں جا سکتا ہے - غیر ممبران مرد یا عورتیں رقص یا دوسرے تفریحی کھیل خاص اجازت کے بعد دیکھ سکتی ہیں - لیکن رات کو وہاں ٹھہر نہیں سکتی - ہاں بیوہ کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے -

لڑکی اور لڑکے کا فرض ہے کہ جب وہ گوتل گھر (تعلیم گھر) میں داخل ہو تو سب سے پہلے وہ سردار کو سلام کرے - اس کے بعد لڑکی کا کام ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کے لڑکے کے پورے بدن پر مالش کرے - اور اُن کے سروں میں تیل ڈال کر کنگھا کرے - وہ قبیلے جہاں مختلف قبیلوں کے لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم پاتے ہیں - وہاں دونوں کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ عشق و محبت اور راز و نیاز کی باتیں تخلیہ میں کریں اور اسے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں -

آسام میں کونیک KONYAK ناگا قبیلے کے لڑکے اپنی محبوباؤں کو بانس کی کنگھیاں تحفے کے طور پر پیش کرتے ہیں - بدن پر مالش کے بعد رقص شروع ہوتا ہے - یہ رقص لڑکے اور لڑکیاں سب ساتھ مل کر کرتی ہیں - ان تمام جنگلی قبیلوں میں رقص کی بہت اہمیت ہے اور زیادہ تر تعلیم یہ لوگ اسی کے ذریعے حاصل کرتے ہیں - مثال کے طور پر فصل کس طرح بوئی جاتی ہے - فصل کس طرح سب مل کر کاٹتے ہیں - شہد کس طرح جمع کیا جاتا ہے - شکار کس طرح کھیلا جاتا ہے - یہاں تک کہ مرد اور عورت کس طرح ایک دوسرے سے اختلاط اور جنسی خواہشات کی تسکین حاصل کرتے ہیں ان سب کو اشاروں کے ساتھ رقص میں ادا کیا جاتا ہے - اس کے علاوہ انھیں لوک ناچ LOEK DANCE کی بھی مشق کرائی جاتی ہے - جسے یہ سب بڑے جوش و خروش کے ساتھ ناچتے ہیں - اور اگر موسم اچھا نہیں ہوتا یا بارش کی وجہ سے باہر میدان میں رقص کی گنجائش نہیں ہوتی تو یہ دلچسپ قصّوں اور خوش گپیوں میں وقت گزارتے ہیں - اس کے بعد سونے کا وقت آتا ہے -

عام طور پر تعلیم گھر بہت ہی گھنے جنگلوں میں بنائے جاتے ہیں - تاکہ وہاں اجنبی نہ پہنچ سکیں اور ان کی اندرونی زندگی کا راز مخفی رہ سکے - قبائلی سماج کے اس طرز عمل سے بعض لوگوں کو چند غلط فہمیاں بھی ہوتی ہیں - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان تعلیم گھروں میں شرمناک حرکتیں ہوتی ہیں - اور شاید اسی لئے تعلیم گھر رکھتے ہوئے بھی متمدن قبائلی اپنے یہاں اس کے وجود کو پوشیدہ رکھتے ہیں - تاکہ دوسروں کی نگاہیں اُن کے عیبوں پر نہ پڑ سکیں - قبائلی زندگی کے اتنے اہم ادارے کے بارے میں ایسی رائے رکھنا ظاہر ہے کہ یہ اس کی بدقسمتی ہے - اگر غور سے دیکھا جائے تو انھیں تعلیم گھروں کی بدولت قبائلی انسان بہت سے عیوب سے بچا رہتا ہے - یہ ادارہ اسے سب سے پہلے خود غرضی کے جراثیم سے بچاتا ہے - اور بھائی چارے کے ساتھ مل کر چھوٹی بڑی دشواریوں کو دُور کرنے کا درس دیتا ہے - اس کے علاوہ یہ تعلیم گھر لوگوں میں جنسی انتشار اور جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لئے بہت ہی پُر اثر آلہ کار ہے - اس لئے

ان قبائل کی معاشرت اور اُن کی تہذیبی ورثہ کی حفاظت اور اسے فروغ دینے میں کوئی شک نہیں کہ ان تعلیم گھروں کو ایک مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

ہندوستان کی آزادی سے پہلے انگریزوں نے ان قبائلی علاقوں میں محض اپنی حکومت چلانے کے لئے اپنا اثر جمانا چاہا تھا اس لئے انھوں نے ان جنگلی انسانوں کی زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ لیکن آزادی کے بعد ہند کی حکومت نے ان قبائلی علاقوں کو دھیرے دھیرے ترقی کے راستے پر لے چلنے کے لئے سب سے پہلے نئے دستور میں دفعات قائم کیں۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقوں کو اور زیادہ تہذیب یافتہ زندگی سے قریب لانے کے لئے متعدد اسکیمیں بنائی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی حکومت نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ کہ ان قبائل کے مخصوص تہذیبی اداروں میں ردّ و بدل کرنے کے لئے جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔

پیچ کا مسئلہ

صنعت میں میٹری نظام کی اہمیت

گذشتہ جنگ کے دوران میں برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا کی ایک کانفرنس پیچ ساخت کرنے کا ایک یکساں نظام طے کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ چونکہ اتحادی ملکوں میں ساخت ہونے والے پیچوں کی دھاریاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں۔ اس لئے ناقص کل پُرزوں اور ساز و سامان کی مرمت یا ادل بدل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک برطانوی ساخت کی گاڑی کی امریکی ورکشاپ میں مرمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے مذکورہ کانفرنس نے یکساں قسم کی دھاریوں والے پیچ ساخت کرنے کا ایک نظام ترتیب دیا تھا۔

١٩٣٩ء میں بین الاقوامی چیمبر آف کامرس کے قریباً ایک ہزار ڈیلیگیٹوں نے بھی تجارت کے لئے اسی قسم کے ایک یکساں نظام کی قدر و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ " تمام ملکوں میں ایک جیسا نظام رائج ہونے سے بلاشبہ بہت سی پریشانیاں اور غیر ضروری حساب شماری سے نجات حاصل ہوگی۔ چونکہ دنیا کی قوموں کی بھاری اکثریت نے وزن اور ناپ کا اعشاری میٹری نظام اختیار کر رکھا ہے اس لئے یہ بات انتہائی پسندیدہ ہوگی کہ باقی ممالک بھی ان کی پیروی کریں۔"

میٹری نظام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ نظام ڈیزائن اور ساخت دونوں کے بارے میں تیز رفتاری اور درستگی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بھارت میں بھی پبلک سیکٹر کی کچھ نئی صنعتوں میں میٹری نظام کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بھارت الیکٹرونکس، ہندوستان مشین ٹول فیکٹری اور ہندوستان شپ یارڈ وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔

فٹ اور پونڈ کا ناپ تول کا نظام بیشتر ازیں اکائی سے نیچے کے ناپ تول کے لئے کسر کی بجائے اعشاریہ کا استعمال کرتا ہے۔ ٹیکنیکل اعداد و شمار بھی اعشاریہ پر مبنی ہندسوں میں دئے جاتے ہیں۔ درستگی کی اکائی ایک "تھاؤ" یعنی ایک انچ کا ٠ء٠٠١ ہے۔ ایک انچ چونکہ ٢٥ء٤ ملی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے میٹری نظام میں درستگی کا معیار قریباً پچیس گنا زیادہ ہوتا ہے۔ درستگی کے اسی معیار کا اگر ناپ تول کے فٹ اور پونڈ کے نظام سے مقابلہ کرنا ہو تو اعشاریہ کے بعد چھ ہندسے تک حساب شماری ضروری ہوگی جس سے گنتی کرنے کا کام بہت زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کسی بھی صنعتی ادارے میں صرف خاکے اور نمونے کے نقشے تیار کرنے میں ہی میٹری نظام کے ذریعے تیس فیصدی وقت کی بچت ہوگی۔

نثار احمد فاروقی

وحید الہ آبادی

مولوی وحید الدین[1] احمد خاں وحید الہ آبادی موضع کرڑا پرگنہ ملیہ ضلع الہ آباد کے ایک باوقار گھرانے میں ۱۸۲۹ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولوی امیر الدین احمد عرف مولوی امر اللہ[2] الہ آباد میں وکالت کرتے تھے اور نہایت سخی انسان تھے۔ شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ شاغل تخلص کرتے تھے اپنے کلام پر شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی سے اصلاح لیتے تھے۔[3] اُن کے دو فرزند تھے مولوی رفیع الدین لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور مولوی وحید الدین دنیائے شاعری میں وحید ہوئے۔

وحید بڑے پاک باطن، صوفی منش، نیک شمائل، متقی اور باکرامت بزرگ تھے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم خاندان اور قصبے کے بزرگوں سے حاصل کی۔ شعر کہنے کا شوق ہوا تو کرڑا کے ایک عالم اور آتش کے شاگرد شیخ بشیر علی بشیر سے مشورہ کیا، یہ شعر اُن کے اُستاد بشیر ہی کا ہے ؎

کہہ رہی ہے موت ہر دم، ہر زماں بالائے سر
غافلو آتا ہے وقتِ ناگہاں بالائے سر

بشیر سے فیض حاصل کرنے کا اعتراف وحید نے یوں کیا ہے ؎

اب تم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہو — فیضِ بشیر سے یاں کہئے تو کیا نہیں ہے

ایک اور شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے علو تخلص کے کسی شاعر سے بھی استفادہ کیا تھا ؎

اس کے سخن کا رتبہ ہے سب سے بڑھا ہوا
جس کے کلام کو ہے یہاں کچھ علو سے فیض

مولوی عبدالحیٔ مرحوم گلِ رعنا میں فرماتے ہیں:

"....... مولوی وحید الدین کہن سال اور کہنہ مشق شاعر تھے مصحفی کا زمانہ انھوں نے پایا تھا اور اُن سے مشورۂ سخن کیا تھا....." (ص ۲۸۴ حاشیہ)

بیاضِ سخن کے مرتب نے بھی ان کو سلسلۂ مصحفی میں شمار کیا ہے۔[4] اور یہ بات عام طور سے مشہور ہو گئی ہے، لیکن مصحفی کا انتقال ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں ہو چکا تھا اور وحید نے ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۲ء) میں ۶۳ سال کی عمر پا کر انتقال کیا اس طرح اُن کی پیدائش ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) قرار پاتی ہے اور مصحفی اُن کی پیدائش سے پانچ سال پہلے دنیا سے گزر چکے تھے لہٰذا یہ روایت غلط ہے۔

وحید کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں شمس العلما نواب امداد امام اثر کا بیان نقل کرنا کافی ہوگا وہ "کاشف الحقائق" (جلد دوم ص ۳۴۴) میں فرماتے ہیں:

"...... اس عاجز نے اپنے زمانے میں بھی ایک ایسے غزل گو شاعر کو دیکھا ہے کہ جن کی زیارت ثواب سے خالی نہ تھی

---

[1] "بیاضِ سخن"، مرتبہ عبدالشکور رشید ص ۵۳ میں ان کا نام غلام حسین لکھا گیا ہے جو غلط ہے

[2] بعض جگہ ان کی عرفیت "امیر اللہ" لکھی گئی ہے، قسّاخ بھی سخن شعرا میں یہی لکھتے ہیں (ص ۲۳۰) لیکن "انتخاب وحید" مرتبہ علی حسنین زیبا میں مولوی ابو نصر کے حوالے سے "امر اللہ" ہی لکھا ہے (ص ۱۴) اور یہی درست ہے۔

[3] سخن شعرا ص ۲۳۰

[4] ملاحظہ ہو ص ۵۳

یہ حضرت ہمارے مولوی وحید الہ آبادی تھے۔ شاعر کے لئے جتنی صفتیں درکار ہیں اُن کی ذاتِ بابرکات میں موجود تھیں۔ حضرت کو نہ لباس سے شوق تھا نہ کھانے سے ذوق۔ دونوں سے نہایت بے پروا اور آزاد تھے۔ جہاں نیند آئی سو رہے، جہاں جی چاہا چلے گئے۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے اس سے اُن کو کوئی بحث نہ تھی جن لوگوں سے احتراز مناسب سمجھا، بے ریائی رکھی۔ کسی کی برائی میں کبھی زبان نہ کھولی۔ اگر کسی نے بُرا کہا تو اس کا جواب نہ دیا۔ شکایت، غیبت، گلہ وغیرہ کی فرصت انھیں افکارِ شاعری سے نہ تھی۔ سالہا سال کی ملاقات میں اس عاجز نے انھیں کسی کو بد کہتے نہ سنا۔ جس کا ذکر آ گیا اُس کو اچھا ہی کہا۔ ہر طرح کے حسد سے اُن کا سینہ پاک تھا حتیٰ کہ شاعرانہ حسد بھی اُن کے دل میں نہ تھا۔ قناعت، سیر چشمی، عجز، صبر، تحمل، صدق و صفا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ قلب اس قدر سوز و گداز سے بھرا پایا تھا کہ ان کی صحبت میں طبیعت کو بے چینی پیدا ہوتی تھی۔ طلبِ جاہ سے نہایت دُور تھے۔ اُن کے دماغ میں اس خیال کا گذر ہی نہیں ہُوا تھا کہ حکام و اُمرا کے حضور میں حاضر ہو کر کسی طرح کا رسوخ پیدا کیجیے۔ وہ ایسے لوگوں کے مذاق سے خبر بھی نہیں رکھتے تھے کہ جو حکامِ وقت کے درباروں کی شرکت پر جان و مال و آبرو نثار کر دینے کو ہر وقت آمادہ رہتے ہیں اور کمال بے حیائی اور نادانی سے اس طور کی گھس بیٹھ کو سرمایۂ عزت و منزلت جانتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب مرحوم تمام ایسی صفات سے متصف تھے جو اعلیٰ درجے کے پاک سرشت، پاک طینت شاعر کے لئے درکار ہیں۔ پس لاریب انھیں صفاتِ حمیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے کلام میں سوز و گداز و خستگی کی کیفیتیں اس درجہ پائی جاتی ہیں۔ اہلِ انصاف کے نزدیک اُن کا کلام سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔ زبان کی عمدگی، سلاست اور روانی کے علاوہ اُن کے کلام کی پُر تاثیری سے سوائے حاسد کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اُن کا کلام کہے دیتا ہے کہ ہم اُس کے نتیجۂ فکر ہیں کہ جس کی خلقت میں خدا نے سادگی، راستی، سیر چشمی، علم، تحمل، صبر، رضا، سوز و گداز، درد و خستگی، آزادی، قناعت، مروت، حیا، صدق، صفا، عشق، محبت، عجز، انکسار وغیرہ وغیرہ کی صفتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ ایسے صافی طینت پاک خصلت شاعر کے ساتھ اُس ننگِ شاعری کو کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جو حکامِ وقت کے مناقب کے قصیدے بغل میں دابے درباروں اور حاکموں کے جلسوں میں پڑھتا پھرتا ہے اور شاعری سی عزیز شے کے ذریعے سے اپنے کو ذلیل و خوار بنائے رہتا ہے ع

"ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا"

وحید کے انتقال کا حادثہ بڑا المناک ہوا، ہفتہ کا دن اور رمضان کی گیارھویں تاریخ تھی۔ سالِ ہجری ۱۳۰۹ اور عیسوی ۱۸۹۲ء۔ دن کے بارہ بجے، وحید اپنے دیوان خانے میں سو رہے تھے۔ ایسی حالت میں کہ اُن کا روزہ تھا۔ ناگہاں شور و شغب ہُوا، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اُن کے مکان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر چودھری محمد تقی کے مکان میں آگ لگی تھی جو پھیلتے پھیلتے ان کے مکان تک آ گئی ہے۔ وحید کو معاً اپنی عمر بھر کی کمائی یعنی دیوان کا خیال آیا جو زنان خانے میں ایک کوٹھڑی میں رکھا ہُوا تھا۔ اور اُس زمانے میں اُس کے شائع کرنے کی تحریک بھی ہو رہی تھی۔ بھاگم بھاگ حویلی میں گئے اور سیدھے اُس کوٹھڑی میں پہنچے جہاں بیاض رکھی تھی۔ بس وہاں ان کے پہنچنے کی دیر تھی کہ کوٹھڑی بھی آگ کی زد میں آ گئی اور دھواں اتنا بھر گیا کہ راستہ نہ سوجھا۔ یہ ایک مونڈھا لے کر قبلہ رو بیٹھ گئے اور دیوان اپنی گود میں رکھ لیا۔ اُسی وقت قلم دوات لے کر دیوان کی دفتی پر ایک وصیت نامہ لکھ دیا:

"ہر کام کا بھروسا خدا کی ذات پر ہے۔ بعد السلام علیکم کے ظاہر ہو کہ اس دیوان پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی ہے اور غلطیاں کثرت سے ہیں۔ جو صاحب اس کے چھپوانے یا شہرت دینے کا قصد کریں لازم ہے کہ کسی اچھے شاعر کو دکھائیں۔ اس میں کچھ مضائقہ نہ کریں۔

متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد

آئندہ اختیار، مردہ بدستِ زندہ۔ وحید الدین محمد وحید عفی اللہ عنہ بقلمِ خود رقم نمود۔"

آگ پر قابو پانے کے بعد لوگوں نے ان کی تلاش کی تو دیکھا کہ کوٹھڑی میں اُن کا بے جان جسم مونڈھے پر بیٹھا ہے۔ دیوان گود میں دھرا ہے۔ آگ نے اُن پر مطلقاً اثر نہیں کیا، بس دُھوئیں سے گھٹ کر دم نکل گیا۔

سید شاہ محمد علیم اللہ علیمؔ الہ آبادی نے تاریخِ وفات کا قطعہ لکھا تھا

قصۂ غم ناک می گویم بشنو — تاب او از سوزِ حسرت گر بود
آں وحیدِ نکتہ سنج بے عدیل — کز غم او حالِ دل ابتر بود
ناگہاں در خانہ اش آتش گرفت — کاندر او صد شعلہ یکسا شگر بود
از پئے دیواں درو جائے چو رفت — کآورد گر مرضیِ داور بود
بود چوں فرطِ دخاں از آتشش — سوزِ او کاندر جگر نشتر بود
زود تر از اختناق دم بمُرد — رفتنی را پائے او دیگر بود
یازدہ بُد صوم از ماہِ صیام — زیں قیاسِ حالتِ مضطر بود
چوں ز فرطِ تشنگی مشتاقِ آب — صائم تشنہ دہن اکثر بود
تشنہ کامی گفت تاریخش علیمؔ — جائے پاکش بر لبِ کوثر بود

۱۳۰۹ھ

وحید کا جتنا اُردو کلام دستیاب ہُوا وہ ۹۲۸ غزلیں ہیں جن میں کم و بیش ۶۲ ۲۳ ۷ ۲ - اشعار ہیں۔ اُن کے اسی کلام کا انتخاب مرتبہ سید علی حسنین زیبا انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کی طرف سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا جس کے ساتھ ہی مرتب کا لکھا ہوا مقدمہ بھی تھا۔ اسی مقدمے سے اخذ کر کے ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں جو وحید کے بھانجے محمد ابوالفخر کے نوشتہ مضمون سے مرتبِ "انتخابِ وحید" نے درج کیا ہے:

"ایک مرتبہ آپ (وحید) کو لکھنؤ تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا۔ لکھنؤ میں ایک بیگم صاحبہ کے یہاں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ چوں کہ آپ کو واپسی کی عجلت تھی۔ اس واسطے شرکتِ مشاعرہ ناممکن تھی۔ آپ کے ایک دوست آپ کو بیگم صاحبہ کے دولت خانے پر لے گئے اور بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ یہ شاعر جو میرے ہمراہ ہیں دیہات کے رہنے والے ہیں۔ چوں کہ واپس جانے والے ہیں شرکت مشاعرے میں نہیں کر سکتے۔ ان کا کلام سُن لیا جائے بیگم صاحبہ نے فرمایا مجھکو کلام سننے کی فرصت نہیں ہے۔ ان کو مصرع طرح دیا جائے کہ ضم کریں میں ان کے کلام کا اندازہ کر لوں گی۔ مصرع طرح سنایا گیا۔ وہ یہ تھا:

دُور سے آئے ہیں مشتاقِ تماشا ہو کر

آپ نے برجستہ مصرع ضم کیا:

دُور سے آئے ہیں مشتاقِ تماشا ہو کر
ہم سے پردانہ کرو شاہدِ رعنا ہو کر

مصرع سننا تھا کہ بیگم صاحبہ نے بے محابا پردا اُلٹ دیا، اور کلام سننے کی مشتاق ہوئیں۔ کلام سُن کر بے حد مسرور ہوئیں لکھنؤ میں بھی آپ کی شہرت ہُوئی۔"

ہمارے نامور قومی شاعر اکبر الہ آبادی مرحوم وحید ہی کے شاگرد تھے۔ سید شاہ محمد سجاد ابوالعلائی داناپوری متوفی ۱۲۹۰ھ کے فرزند حضرت اکبر داناپوری اور سید عزیز الدین حیدر افسر جو اکبر الہ آبادی کے ہم سبق و ہم مشق تھے، نیز محمد شیر خاں شیر اور دیوکی نندن ہنر وغیرہ وحید کے ذی استعداد تلامذہ میں تھے جن سے سلسلہ چلا۔ ان کے سوا بھی الہ آباد، لکھنؤ، پٹنہ، عظیم آباد اور نواح میں آپ کے بہت سے شاگرد تھے۔ وحید کا قیام زیادہ تر کڑا یا الہ آباد میں رہتا تھا۔ لکھنؤ اور عظیم آباد میں بھی کچھ دنوں رہے۔ حیدر آباد دکن کا سفر بھی کیا تھا۔

وحید الہ آبادی، مولوی غلام امام شہید، منشی غلام غوث بے خبر، امیر مینائی اور نواب مرزا خاں داغ یہ سب ہم عصر اور ہم طرح شاعر تھے۔[1] وحید کا مرتبہ اپنے زمانے میں ان سبھوں سے بڑھا ہوا تھا۔

جہاں تک وحید کے کلام پر تبصرہ و تنقید کا تعلق ہے، ہمیں اُس کے غائر مطالعے کے بعد یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ وحید کا کلام آتش و مصحفی کے رنگ میں کسی طرح کم اُرز نہیں ہے، لیکن بقول محمد حسین آزاد "قبول عام اور شے ہے" اس کو کیا کیجئے کہ وحید کے کلام نے شہرت نہ پائی ورنہ وہ یقیناً اس کے مستحق تھے کہ اپنے معاصرین امیر و داغ اور شہید و بے خبر کی طرح قدر دانی و قبولیت کے ان تمغوں سے سرفراز کئے جاتے۔

وحید کی شاعری مصحفی کے رنگ میں درد و اثر سے خالی نہیں اور اُن کی اندرونی کیفیات و احساسات کا آئینہ ہے۔ مصحفی کے طرز کی یہ خصوصیت

---

[1] یادگارِ منیغم ص ۲۰۶

کہ اُس میں ایک داخلی فضا رچی ہوئی ہے اور لہجہ کی متانت کہیں بھی غیر متوازن نہیں ہوتی، وحید کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ وحید پر تصوف کا بھی غلبہ ہے وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اور صاحبِ حال بزرگ تھے۔ جیسا کہ امداد امام اثر کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری بھی سوز و گداز اور ناز و نیاز کی لذتوں سے بھرپور ہے۔ اُن کی شاعری میں جگہ جگہ حقیقت کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ زندگی اور اُس کے اندرونی مسائل پر غور و فکر بھی ہے، مشاہدۂ باطن بھی۔ کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش بھی ہے اور ماسوا کی رنگینیوں میں ڈوب جانے کی خواہش بھی۔ وحید کے ہاں بھاری بھرکم ترکیبیں اور دور از کار استعارے شاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں اور ٹھیک بھی ہے کہ دلی کیفیات کا اظہار سادگی کے سوا دوسرے سہاروں سے ہو بھی نہیں سکتا۔

وحید دہلی کی نسبت لکھنؤ سے قریب تر تھے، اُن کے زمانے میں لکھنؤ کا رنگِ شاعری چھایا ہوا تھا، وہ خود لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے اور اگر بیگم صاحبہ والا منقولہ واقعہ درست مان لیا جائے تو وہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت بھی کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن یہ متقی اسکول کا فیضان ہے کہ ان اسبابِ قرائن کے ہوتے ہوئے بھی اُن کی شاعری لکھنؤ کے روایتی تکلف اور تصنع سے بری ہے اور خارجی حسن سے زیادہ داخلی سوز و ساز کا مرقع ہے۔ اس میں تری سادگی بھی نہیں کہ "دندانِ تو جملہ در دہانند" کا اُس پر اطلاق ہو سکے اور یہ لفظی رعایتیں بھی نہیں ہیں کہ "بیریوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں"!
ذیل کا مختصر انتخاب وحید کی شاعری کے محاسن کی ایک حد تک نمایندگی کرے گا اور اُس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد دے گا۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

نہ تھے جب اس قدر بیخود تو کیا کچھ کہتے سنتے تھے
اب اشک آنکھوں میں بھر لانا نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا

کچھ کہہ کے اس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا
اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یاد آگئیں جو وحشتِ مصیبت کی منزلیں — کوسوں خیال میں دلِ شیدا نکل گیا

نظر آتا ہے ویرانہ سا اب صحنِ چمن جس جا
یہیں صحبت تھی رندوں کی یہیں تھا دور ساغر کا

مرنے پہ بھی نہیں بھولا مجھے دنیا کا خیال
کچھ اثر اب بھی ہے اے خوابِ پریشاں ترا

چراغ بھی ہوں تو وہ ہوں کہ بے فروغی سے
ہوا کے چلنے سے پہلے ہی بجھ گیا ہوں میں

اک دن اسی کے دم سے جنوں کی تھیں شورشیں
پہلو میں اب نشاں بھی دلِ زار کا نہیں

اس مےکدے میں کتنے سبو پا کے مست ہیں
کتنے فقط شراب کی بُو پا کے مست ہیں

شعرِ بالا کے ساتھ خسرو کا شعر بھی یاد کر لیجئے ؎

جان زنظارۂ خراب و تاز او ز اندازہ بیش
ما بہ بوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

جب زخم تھا تو اس سے بھی تھا روح کو سرور
اب چاکِ دل پہ اپنے رفو پا کے مست ہیں

عجیب ظرف کے وہ لوگ ہیں زمانے میں — جو حوصلے سے محبت زیادہ کرتے ہیں

رنجِ فرقت کی کون دے گا داد — اس فسانے کو آپ ہی سے کہوں

پھر کہاں ہم کہاں یہ کوچۂ یار — در و دیوار دیکھ لینے دو

اب آ نہ جامے سے باہر نہ تم نکل کے چلو
نگاہیں سب کی اسی سمت ہیں سنبھل کے چلو

کیسا محشر کہاں کی پُرسش — ساقی یہی انجمن ہمیشہ

جس کی اک اک گھڑی میں تھے سو لطفِ زندگی
اُس شب کی یہ سحر کوئی دیکھے تو کیا کہے!

نہ کھلنے پائے تا احوال رسم و راہ اُلفت کا
اُسے دیوانہ کر دیں گے جسے ہشیار دیکھیں گے

غربت کی شام دیکھ کے رونا سا آ گیا — آنکھوں کے آگے پھر گئی صبحِ وطن ابھی

عشق کا نام لیا ہے تو یہ بہتر انجام
اب تو بدنام نہ ہونے میں بھی رسوائی ہے

جنبش پہ ہر قدم کی اٹھتا تھا دل مرا
جس دم وہ آنے والے تھے آہٹ عجیب تھی

ہزار بار خزاں آئے باغ میں تو کیا — مری نظر میں ہیں کیفیتیں بہاروں کی

سرد ہے اردوئے بادِ چلے "گچھلے — شمع مہماں ہے ایک ہی شب کی
آگے کیا دور تھے کیا رند تھے کیا جلسے تھے

کیا کہیں اگلی وہ باتیں گئیں میخانے سے
دل پہ گزری ہوئی باتوں کا ہے کچھ اور اثر
اب نہ بہلے گی طبیعت کسی افسانے سے

آخر میں ایک ناگوار حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے۔ وحید کے بعض اشعار پر سرقے کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔ مثلاً حالی کا شعر ہے ؎

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

اور وحید نے کہا ہے ؎

اب مرے اشکوں سے ہے اور ہی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

خواجہ آتش کا شعر ہے ؎

فرشِ گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیرِ سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست

اور وحید نے کہا ہے ؎

کل بسترِ گل پر بھی نہ آتی تھی جنھیں نیند
وہ خاک پہ اب سوتے ہیں تحیر کی ہے یہ بات

یا ؎ کل تک جو فرشِ گل پہ بھی رکھتے نہ تھے قدم
آج اُن کی خاک تک نہیں عبرت کی بات ہے

سید انشا کا شعر ہے ؎

رکھتے ہیں کہیں پانو تو پڑتے ہیں کہیں اور
ساقی تو ذرا تھام تو لے ہاتھ ہمارا

وحید نے کہا ہے ؎

گھبرا کے چلے ہیں جو سوئے کوچۂ جاناں — رکھتے ہیں کہیں پانو تو پڑتے ہیں کہیں آج

میر کہتا ہے ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اُجاڑ کر

وحید فرماتے ہیں ؎

ویراں ہوا یہ دل تو پھر آباد ہو چکا
ایسا بنا ہو، نہ گھر اے آسماں بگاڑ

میر کہتا ہے ؎

یوں کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

وحید نے کہا ہے ؎

چاہا تھا کچھ احوال کہیں دیکھ کے اُن کو
بے خود ہوئے کچھ ایسے کہ مطلق نہ رہا ہوش

خیر اس مضمون کو تو متقدمین و متاخرین میں سے تقریباً ہر شاعر نے باندھا ہے

درد کے بھائی میر محمد اثر کا شعر ہے ؎

یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پیا اثر کی نہیں تو آس نہیں

وحید نے بھی مضمون نظم کیا ہے ؎

یوں خدا آپ کے بیمار کو اچھا کر دے — حال ہے تو مگر ہم تو یہی کہتے ہیں

میر نے کہا ہے ؎

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

وحید کہتے ہیں ؎

دیر و حرم میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کس کو ہم
جس کی طلب ہے وہ تو دلِ زار ہی میں ہے

اس مضمون کو درد نے بھی متعدد جگہ باندھا ہے

اس کے سوا بھی وحید کے کلام سے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ان باتوں سے کسی شاعر کی واقعی عظمت و رفعت متاثر نہیں ہوتی۔ ایسی لغزشیں میر و سودا، درد و مصحفی اور مومن و غالب سے بھی ہوئی ہیں۔

ان سب خامیوں اور لغزشوں کے ہوتے ہوئے بھی وحید کا کلام اپنے رنگ میں، دردو اثر میں، اور سادگی و دل نشینی میں وحید ہے اور اس کا جائزہ مستحق ہے کہ حق شناسی و قدردانی کی نظروں سے پڑھا جائے ::

ترقی کے لیے منصوبہ بندی

بہتر معیارِ زندگی

پہلے پلان کے دوران میں خوراک اور زراعتی پیداوار میں نمایاں ترقی ہوئی۔ دوسرے پلان کے عرصہ میں آبپاشی کی چھوٹی بڑی سکیموں، مصنوعی و دیسی کھاد کے زیادہ استعمال، بہتر بیج، نئے طریقوں سے زمین کی سنبھال و کاشت وغیرہ سے فی ایکڑ پیداوار اور بڑھیگی۔ جونہی دوسرے پلان کے نشانے مکمل ہونگے ہر شخص کی بنیادی ضرورتیں بہت حد تک پوری ہو سکیں گی۔

موجودہ ۱۷.۰۲ اونس کے مقابلہ میں ہر بالغ کو ۱۸.۰۳ اونس اناج ملے گا۔ اسی طرح ہر بالغ کو موجودہ ۱۰.۴ اونس کے مقابلہ میں ۱۱.۰۷ اونس کھانڈ مل سکے گی۔ اس کے علاوہ کپاس کی پیداوار میں ۲۲ لاکھ ٹن کا اور پٹ سن میں ۱۵ لاکھ گانٹھوں کا اضافہ ہوگا۔

دوسرے پلان کی کل رقم کا ۱۰.۸ فی صدی حصہ ۱۶۹ کروڑ روپے کمیونٹی پراجیکٹس اور قومی توسیعی سروس تمام دیہات میں لاگو کی جائینگی۔ اناج مچھلی کی پیداوار بڑھائی جائیگی مویشیوں و جنگلات کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جائے گی۔ اور پانی و بجلی جیسی ضروری سہولتیں مہیا کی جائینگی۔ اس طرح لوگوں کو اپنی ترقی کی کوششوں میں مدد ملے گی۔

دوسرے پلان کے عرصہ میں ۲۱۰ لاکھ ایکڑ سے زائد زمین کو آبپاش کیا جائے گا جس سے کل آبپاش رقبہ ۸۰۰ لاکھ ایکڑ ہو جائے گا۔ صنعتی اور دیہاتی مانگ کو پورا کرنے کے لئے بجلی کی پیداوار ۳۴ لاکھ کلوواٹ سے ۶۹ لاکھ کلوواٹ تک بڑھا دی جائیگی۔ دوسرے پلان پر خرچ ہونے والے ہر روپیہ میں ۳ آنہ سے زائد بجلی اور آبپاشی کے لیے مخصوص کئے گئے ہیں۔

دوسرا پانچسالہ پلان

قومی خوشحالی کے لئے





نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پہلا پنچ سالہ پلان (جنتا ایڈیشن)	۲/-/-	-/۸/-
مستقبل کی تعمیر	-/۴/-	-/۲/-
آسان پنچ سالہ پلان	-/۸/-	-/۲/-
سماجی بہبود	-/۶/-	-/۲/-
ٹرانسپورٹ اور پنچ سالہ پلان	-/۴/-	-/۲/-
آپ کا گاؤں اور پنچ سالہ پلان	-/۱/-	-/۱/-
پنچ سالہ پلان - سوالات و جوابات	-/۴/-	-/۲/-
دیہاتی صنعتیں	-/۶/-	-/۲/-

دس روپیہ یا اس سے زیادہ کے آرڈر پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔



قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

مزاحیہ شاعری مقبول عام تھی، اس کی تقلید میں ودربھ کے شعراء نے بھی سیاسی وسماجی موضوعات پر طنزیہ ومزاحیہ نظمیں لکھیں۔ ماسٹر حمزہ جذبی نظامی ناندورہ اور جلگاؤں وغیرہ میں عرصے تک قیام پذیر رہے۔ انکے شعری مجموعے "شعلہ" میں طنزیہ ومزاحیہ اشعار کے نمونے ملتے ہیں۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا نمونہ ودربھ میں علمی وادبی لحاظ سے کافی اہم ہے۔ اس زمانے میں کامٹی، ناگپور، اچلپور، اکولہ امراؤتی اور دوسرے شہروں میں تعلیمی مراکز قائم ہوئے۔ اور اخبارات ورسائل جاری ہوئے یہ دور سیاسی اعتبار سے پرآشوب دور تھا۔ جدوجہد آزادی اپنے عروج پر تھی شعراؤ ادباء اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام میں حب الوطنی اور آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس دور کے شعراء میں امراوتی کے شرف الدین شرف، آزاد، آفتاب اور لعل خاں فردوسی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، آزاد کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

مجھے جلتے توے پر بٹھا کر
تحمل آزمایا جارہا ہے

میرے دل کی وہ قیمت لگاتے ہیں
پیسہ دھیلا چھدام کیا کہنا

آفتاب کا ایک قطعہ ہے

اِسنو سے رنگ اپنا چھپانے لگے ہو تم
گویا کہ شب کو روز بنانے لگے ہو تم
داڑھی کو اب خضاب لگانے لگے ہو تم
گویا کہ دن کو رات بنانے لگے ہو تم

اسی دور میں ناگپور میں بھی کئی شعراء ظریفانہ شاعری کرتے نظر آتے ہیں، ان میں موجودہ نائب صدر جمہوریہ محمد ہدایت اللہ کے والد ماجد محمد ولایت اللہ حافظ کافی مشہور تھے۔ نمونہ کلام کے طور پر یہ قطعہ پیش خدمت ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ ہر جانب یہ ہوتی تھی پکار
بیبیاں پردہ میں ہو جائیں کہ مرد آتے ہیں یہاں
پھر یہ دیکھا لوگ کہتے تھے بآواز بلند
مرد گھر لیں اس طرف منہ آرہی ہیں بیبیاں

دیولگھاٹ کے گل شیر خاں ببر بھی اسی دور کے شاعر ہیں ان کے علاوہ یہیں کے ایک اور شاعر تبر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں شاعر مشاعروں میں ایکدوسرے پر چوٹیں کرتے رہتے تھے۔

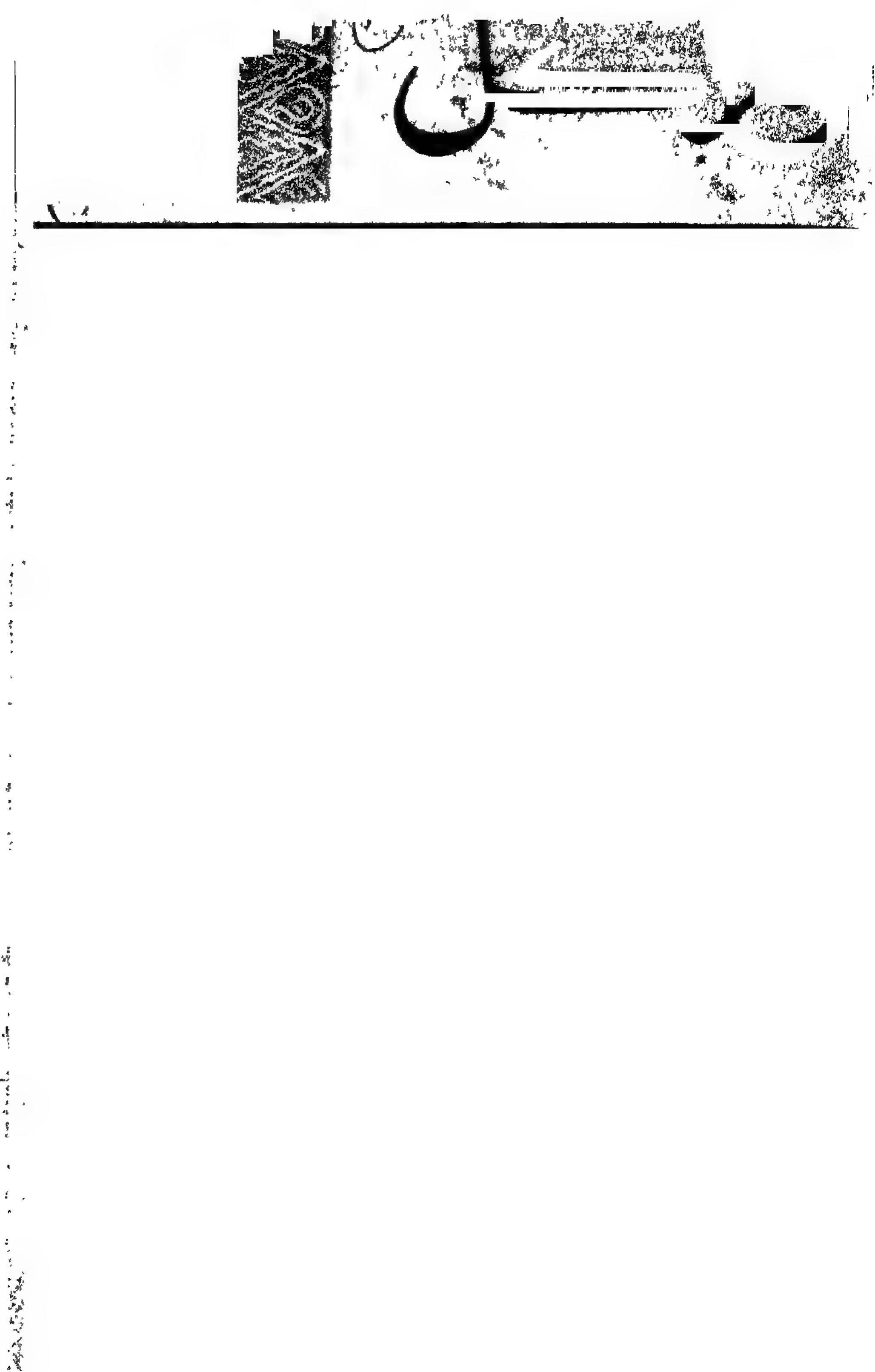
آزادی کے بعد ودربھ میں طنزیہ مزاحیہ ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا نثر میں بھی اور شاعری میں بھی۔ شعراء وادباء کی ایک نئی نسل سامنے آئی۔ ان نثر نگاروں میں شفیقہ فرحت، سید مقدر، محمد اسد اللہ، شکیل اعجاز، انصاری اصغر جمیل، رفیق شاکر، ایس ایس علی، رحمت اللہ خاں، ڈاکٹر نور السعید اختر، محمد طارق، ڈاکٹر محمد سعد اللہ، اظہر حیات، امتیاز خالق، عمر حنیف، ڈاکٹر سمیع بن سعد حیات انور، ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد، وحید اللہ اور شیخ محمد نیاز کے نام آتے ہیں۔ اسی طرح ہزل گو شعراء میں علامہ گنبد، ناظم انصاری، فیاض افسوس، سرخاب، نایاب، راہی، فنی، فوجی، بیڈھب جلوا، غنی اعجاز، نقیب، فرحاتوس، اور ضمیر الدین ساجد قابل ذکر ہیں۔

قابل وضاحت بات یہ ہے کہ محبوب راہی، غنی اعجاز، فصیح اللہ خاں نقیب، ڈاکٹر ایم۔ آئی ساجد، ضمیر الدین ساجد سید مقدر، اور رفیق شاکر کے ہاں مزاحیہ شاعری کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا اصل میدان غزل گوئی ہے۔ محمد طارق بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور ڈاکٹر نور السعید اختر اور ڈاکٹر محمد اسد اللہ کا میدان تحقیق وتنقید ہے۔

آیئے لگے ہاتھوں ودربھ کے صف اول کے فنکاروں کے فن اور شخصیت کا سرسری طور پر جائزہ لیا جائے۔ شفیقہ فرحت کا تعلق عرصے تک ناگپور سے رہا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ انہوں نے ۱۹۵۰ء کے مابین لکھنا شروع کیا انکے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ "لو آج ہم بھی" ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ انکے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے سلمیٰ صدیقی لکھتی ہیں ؎

"شفیقہ فرحت کے مزاح پہ طنز کا پیر تسمہ پا ہمیشہ سوار رہتا ہے، اور بڑے تیکھے ترچھے اور چبھتے ہوئے فقرے ان سے لکھواتا رہتا ہے۔ خواتین بھی اتنے غور وفکر سے کام لیتی ہیں۔ مردوں کے اس شبہے کی شفیقہ فرحت تردید کرتی رہتی ہیں۔"

نمونۂ تحریر کے طور پر انکے مضمون "عہد نامہ جدید"



اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق:- ع۔م ہیں گھر میں تو بیاباں میں بہار آئی ہے

جلد ۱۵ - نمبر ۹

اپریل ۱۹۵۷ء

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر 'آج کل' (اُردو) اولڈ سیکرٹریٹ - دہلی

سالانہ چندہ:- { ہندوستان میں:- چھ روپے / پاکستان میں:- چھ روپے (پاک) }

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- { ہندوستان میں:- آٹھ آنے / پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک) }

مرتّبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ سچ کا بول بالا رہتا ہے۔ ہندوستان اسی پر یقین رکھتا ہے۔ جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۲ء میں "ہند چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا تھا تو انگریزوں نے اسے بغاوت، غداری اور نہ معلوم کیا کیا کہا۔ لیکن پانچ برس کے اندر اندر انگریز کو ہند سے رخصت ہونا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب جواہرلال نہرو نے بین الاقوامی سیاست کے میدان میں اعلان کیا کہ ہند بین الاقوامی بکھیڑوں میں غیر جانبدار رہے گا۔ وہ ہر ایک کا دوست ہے اور کسی کا دشمن نہیں تو کتنوں نے جن میں اپنے اور غیر سبھی شامل تھے کہا کہ کسی نہ کسی طاقت کا حلیف ہونا ضروری ہے ورنہ وقت پڑنے پر کوئی بھی سہارا دینے والا نہ ہوگا۔ لیکن ہم نے اپنی خودی اور اپنے خدا پر بھروسہ کرکے اپنے پیروں آپ کھڑے ہونا پسند کیا اور آج یورپ ہو کہ ایشیا، افریقہ ہو یا امریکہ، ہر براعظم کے متعدد ملک ہمارے ہم خیال ہیں اور ایشیا اور افریقہ کے بیشتر قوم پرست ممالک قطعی طور پر ہمارے ساتھ ہیں۔ اسی طرح داخلی امور میں اعلان کیا گیا کہ ہند میں مذہبی امتیازات سے بالاتر ریاست قائم کی جائے گی جبکہ ہمارے ہمسایہ ملک نے اپنے کو ایک اسلامی جمہوریت بنانے کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ کیا نکلا کہ آج دُنیا کے بیشتر بڑے اسلامی ممالک ہندوستان کے ساتھ ہیں۔ صدر ناصر، صدر قوتلی، شاہِ ایران اور شاہ سعود ہند کے دَورے پر آ چکے ہیں۔ ہمارے وزیراعظم بھی مصر و شام و عرب کے دَورے پر جا چکے ہیں اور اس طرح ان اسلامی ملکوں سے ہند کا رشتۂ محبت و اخوت اُستوار ہو چکا ہے۔

وزیراعظم شری نہرو کے بعد جس ہستی نے اقوامِ عالم میں ہند کے نظریات اور مقاصد کو روشناس کرانے میں سب سے زیادہ کام کیا ہے وہ شری کرشنا مینن ہیں۔ حال میں سلامتی کونسل اور یونائیٹڈ نیشنز میں شری مینن نے جو معرکۃ الآرا تقریریں کی ہیں وہ تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔ شری مینن کی صحت انتہائی خراب تھی اور اب بھی وہ پورے طور پر تندرست نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے جی جان کی بازی لگا کر حق کو بے نقاب کرکے ہی دم لیا۔

شری کرشنا مینن کی تقریروں کا اثر اس سے صاف ظاہر ہے کہ حال ہی میں برطانیہ کے نامور لیبر لیڈر مسٹر اینورن بیوان کے اخبار 'ٹربی بیون' نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ وہ کشمیر میں رائے شماری کے خلاف ہے۔ یہ واضح رہے کہ اگر برطانیہ میں لیبر پارٹی کی اکثریت ہو جائے تو مسٹر بیوان کا وزیرِ خارجہ بننا یقینی ہے لہٰذا اس تبصرے کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

مؤقر جریدے نے لکھا ہے کہ کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہیں کہ اگر کشمیر پر پاکستان کا قبضہ ہو جاتا تو وہاں پر کوئی رائے شماری ہوتی۔ حق تو یہ ہے کہ پاکستان کے مقبوضہ کشمیر میں آج تک کوئی انتخاب نہیں ہوا بلکہ مشرقی بنگال کو چھوڑ کر خود پاکستان میں کوئی انتخاب نہیں ہوا۔ لیکن کشمیر کے عظیم تر حصے میں ایک انتخاب ہو چکا ہے اور دوسرا اگلے مہینے ہونے والا ہے اور دراصل پاکستان اسی کو روکنا چاہتا ہے۔

مؤقر جریدہ لکھتا ہے۔ اگرچہ ہند نے رائے شماری کی تجویز مان لی تھی لیکن یہ بات کوئی راز نہیں کہ ہند کے لیڈر اس تجویز کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کی طرح 'ٹربی بیون' بھی اس کو ناپسند کرتا ہے۔

کشمیر، ہند اور پاکستان میں مذہبی تعصب کے وہ آتش فشاں جذبات اب بھی موجود ہیں جو اب سے دس برس پہلے بھڑک اُٹھے تھے۔ شری نہرو اور ان کے ہم خیال لوگ نہایت جاں بازی کے ساتھ ایسے جذبات کو دبانے اور فرو کرنے میں مشغول ہیں۔

ہند میں مسلمان اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہیں مثلاً کابینہ تک میں اُدھر پاکستان میں ہندوؤں کو محض دوئم درجے کی شہریت حاصل ہے۔ وہ قانون کی رُو سے اعلیٰ ترین عہدے پانے سے محروم ہیں۔ معاشی زندگی اور تعلیم میں اُن کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔

اِدھر کشمیر تیزی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ صحت، مکانات

کی تعمیر، تعلیم اور جمہوری اصولوں کو فروغ مل رہا ہے۔

ہند، کشمیر میں بجلی کی طاقت فراہم کرنے، صنعتیں قائم کرنے اور زراعت کے بہتر طریقے رائج کرنے کے لئے بے دریغ خرچ کر رہا ہے۔

لیکن کشمیر سے افلاس و جہالت دور کرنے کے لئے کم از کم ایک نسل کی مدت درکار ہے۔

اگر ایک ہنگامی فیصلے کی بنا پر یہ کوششیں رُک گئیں تو یہ ایک المناک بات ہوگی۔ اور ہم جانتے ہیں کہ پاکستان ذہنوں کو کند کرنے والے متعصبانہ جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ لوگ گھبرا کر مذہب کے نام پر ووٹ دے بیٹھیں۔ اور اس کے بعد بھی یہ یقینی نہیں کہ پاکستان جیت ہی جائے گا۔

اور اگر وہ رائے شماری جیت گیا اور اس نے کشمیر پر اسی ناروا داری اور بدعنوانی کے ساتھ حکومت کی جیسی کہ اس اسلامی جمہوریت میں فی الحال ہو رہی ہے تو منتقمانہ کارروائیاں ہوں گی اور لوگ گھر چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوں گے اور ان پناہ گزینوں کی آمد سے ایسی تلخی پڑے گی کہ دس برس پہلے کی یاد تازہ ہو جائے گی اور ہند میں لاکھوں لاکھ مسلمانوں اور پاکستان میں ہندوؤں کی حالت مخدوش ہو جائے گی۔

آخر میں لارڈ بیولی نے لکھا ہے "سوشلسٹوں کو اس نعرے سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ عوام کو خود فیصلہ کرنے دو۔" کیونکہ یہ نعرہ وہ لوگ لگا رہے ہیں جو خود کبھی اپنے عوام کو کسی بات کا فیصلہ کرنے نہیں دیتے"

وہ راہ سجھاتے ہیں ہمیں حضرتِ ناصح
جس راہ پہ اُن کو کبھی چلتے نہیں دیکھا

غالب سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ۱۵۔ فروری کو مزارِ غالب پہ یومِ غالب منایا گیا۔ غالب پرستوں کے اس اجتماع میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، مسٹر شنکر پرشاد آئی سی ایس، پروفیسر محمد اجمل خاں اور دہلی کے اُردو دوست اصحاب شامل تھے۔ متعدد تقاریر، نظموں اور فاتحہ خوانی کے بعد مزارِ غالب پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ برج لال جگّی رعنا کی رباعیاں اور پنڈت ہری چند اختر کی غالب کے ایک شعر پر فی البدیہہ قسم کی ایک تضمین اس مجلس کا حاصل تھی۔

رعنا جگّی کی دو رباعیاں ملاحظہ فرمایئے۔

جذبات کو تخیل کی ندرت بخشی — بیمار خیالات کو صحت بخشی
اے غالبِ خستہ تری ہر بات نثار — شعلوں کو گلِ تر کی نزاکت بخشی

اسلوب کے چہرے کو نکھارا تو نے — تشبیہ کی زلفوں کو سنوارا تو نے
تخیل کی نادیدہ حسیں پریوں کو — الفاظ کے شیشوں میں اُتارا تو نے

پنڈت ہری چند اختر کی تضمین نے بہت داد پائی۔ اس کا لطف بھی اُٹھایئے۔

فضل و کمال سرنگوں خامیاں ارجمند ہیں — گم ہے صحیفۂ ادب علم کے باب بند ہیں
بے بصری و جاہلی ٹھہری عیارِ برتری — جہل پہ شور مرحبا عقل پہ زہرخند ہیں
آدمیاں جو گم شدند ملکِ خدا را خر گرفت — پختہ ہیں خامیوں میں جو اپنی ہی سربلندیوں میں
بے ہنری کی شان ہے خودنگری و خودسری — جتنی ہے بے بضاعتی اتنے ہی خود پسند ہیں
دیکھ کے یہ سہولتیں کہتا ہوں دل سے بار بار — غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
رو یئے زار زار کیا کیجیئے ہائے ہائے کیوں

ڈاکٹر محمد حسن نے اس مجلس میں غالب کے فن اور فکر پر ایک بہت اچھی اور بصیرت افروز تقریر کی۔

۲۳۔ فروری کو انجمن ترقی اُردو کے اہتمام سے یومِ غالب پھر منایا گیا۔ خواجہ غلام السیّدین صدرِ مجلس تھے۔ یہ پروگرام بڑا طویل تھا۔ اس میں متعدد تقریریں ہوئیں اور نظمیں پڑھی گئیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے ایک مزاحیہ مضمون غالب کی شاعری کے باب میں پڑھا جس میں غالب کے اشعار کو ان کی بیوی امراؤ بیگم کی تصنیف ظاہر کیا گیا تھا۔ مضمون پُر لطف تھا۔ خواجہ غلام السیدین نے غالب کی شاعری اور اس کے ادبی کمالات پر ایک تقریر فرمائی۔ اس مجلس کا انتظام انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری کی حیثیت سے حمیدہ سلطان صاحبہ نے کیا تھا۔ پنڈت سندر لال صدر انجمنِ ترقی اُردو دہلی بھی جلسے میں شریک تھے۔

۲۱ فروری ۱۹۵۷ء کو دریا گنج دہلی میں ایرانی کلچرل ہاؤس کا افتتاح ہوا۔ شری اے۔ ڈی پنڈت چیف کمشنر دہلی صدرِ جلسہ تھے۔ ہز ایکسیلینسی ڈاکٹر علی اصغر حکمت سفیرِ کبیر ایران نے مہمانوں اور صدر کا خیر مقدم کیا۔ خواجہ غلام السیدین نے آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے انگریزی میں روابطِ ہند و ایران پر ایک مؤثر تقریر فرمائی۔ تقریر کیا تھی نثری شاعری کا ایک دھارا تھا جو بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہندو ایران کے باہمی میل جول پر روشنی ڈالتے ہوئے مقررنے ادب، شاعری، آرٹ، تعمیرات، غرضکہ ہر ثقافتی نقطۂ نظر سے مثالیں پیش کیں اور شعراء اور فن کاروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

عمیق حنفی

خیال مالکوس

ہندوستانی راگوں میں مالکوس نامی مشہور راگ آج کل بہت قبولِ عام حاصل کر رہا ہے۔ یہ راگ یوں تو ہر موسم میں گایا جاتا ہے۔ لیکن موسم سرما میں آدھی رات کی پُر سکوت فضا میں اس کی دھن زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ سوز، عقیدت اور سنجیدگی کے اظہار کے لئے یہ راگ نہایت موثر آلۂ کار ثابت ہوتا ہے۔ اس راگ کا مزاج گمبھیر اور معانی نہایت شستہ اور مدھر ہوتی ہے۔ آدھی رات کی خاموش فضا اس راگ میں زبان پاتی ہے اور دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد طمانیت و سکون کے آرزو مند دل کی دھڑکنیں اس راگ کے سُروں کا روپ دھارن کرتی ہیں۔ میں نے اس راگ کی فضا کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ شاعری میں موسیقی کے فارموں سے استفادہ حاصل کرنے کا یہ اوّلین تجربہ نہ سہی مگر مجھے امید ہے کہ قارئینِ کرام میری اس کوشش کو ضرور پسند فرمائیں گے۔

(عمیق)

(استھائی)

مَ گا ما دَھ نی دھا مَ گا ماگ سا
یہ خاموشیٔ شب یہ ٹھنڈی ہوا
ٹھٹھرتی ہوئی رات کی چاندنی
تصوّر میں انگڑائیاں پیار کی
یہ تارے، یہ جگنو، یہ چمکیلے پھول
یہ اودے گگن پر سنہری سی دھول
یہ خاموش سنگیت بے لفظ گیت
یہ دھرتی سے آکاش والوں کی پریت
یہ دانتوں سے دینا ہما تال۔ پوس
یہ گمبھیر گت چھیڑتا مالکوس

(انترا)

مَ گا ما دَھ نی دھانِ سَا دھانِ سَا
یہ تنہائیٔ شب یہ دل کش فضا
یہ چادر کی شکنیں یہ پہلو میں خار
یہ دل کش مناظر بھی نظروں پہ بار
کوئی بند کردے یہ پٹ ادھ کھلے
کہ ڈسنے پہ ہیں سرد جھونکے تلے
ستاروں کی رفتار پر کب ہے دھیان
لگے ہیں کسی اور آہٹ پہ کان
یہ سچ ہے بہت خوبصورت ہے رات
بیاں میں کروں کس سے اس کے نکات
مرے ہاتھ میں ہاتھ کوئی نہیں
حسیں رات ہے ساتھ کوئی نہیں

۱۔ پوس، ہندی مہینہ، سردی کا موسم ۲-۳ مدھیہ سپتک کا آخری سا۔ راگ مالکوس میں گندھار، دھیوت اور نکھاد کومل شر لگتے ہیں اور مدھیم تیور لگتا ہے۔ اس کا اُترتا چڑھتا سرگم اس طرح ہے نی سا، گا ما، دھا نی سا، سانی، دھا، ما، گا ما گا سا۔ وادی سر مدھیم اور سموادی کھرج ہے۔ رکھب اور پنچم نہیں لگتے۔ یہ راگ بھیروی ٹھاٹ سے پیدا ہوتا ہے اور رات کے تیسرے پہر میں گایا جاتا ہے (عمیق)

راز یزدانی

داغ رام پور میں

(گذشتہ سے پیوستہ)

ان تمام معروضات قابل لکھنے والوں کی طرف سے یہ عذر کیا جا سکتا ہے کہ رام پور کا شاعرانہ ماحول ہمارے سامنے نہیں تھا اور نہ وہ ہمارے لئے داغ، امیر، جلال، اسیر، تسلیم اور بحر کی طرح سہل الحصول تھا۔ واقعی یہ رام پور کے فنکاروں کی مانی ہوئی بدقسمتی ہے۔ کہ ان کا کلام بیشتر حالات میں رضا لائبریری کی الماریوں کی زینت رہا۔ اور شائع ہو کر آسانی کے نقادوں کے اُن ہاتھوں تک نہ پہنچ سکا جو صرف سامنے کی چیزیں اپنے دامن میں سمیٹ کر صرف اپنے دامن کی سمٹی ہوئی چیزوں کو پوری دُنیا اور کُل کائنات سمجھے اور ان ہی سے نتیجہ نکال کے مطمئن ہو گئے۔ رام پور کے فن کاروں کی بدقسمتی ابتدا سے ہی ان کے ساتھ ہے مثلاً

قائم چاندپوری شعر و ادب کا وہ فن کار ہے جو رام پور کی موجودہ آبادی کے قائم ہونے سے پہلے یعنی موجودہ بستی کے بسنے سے بھی پہلے روہیلوں کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کر چکا تھا اور جب رام پور بسایا گیا ہے تو اپنے سرپرست نواب محمد یار خان (برادرِ خوردِ نواب فیض اللہ خاں بہادر) کے ساتھ رام پور آ گیا تھا اور رام پور کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ جب ٹکیت رائے کی سفارش سے چاندپور میں اس کی ذاتی جائیداد بھی بحال ہو گئی مگر وہ جائیداد کا انتظام کر کے دوبارہ یہاں آ گیا۔ اور داعیِ اجل کو لبیک کہنے کا وقت آیا تو ۱۲۰۸ھ میں اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی اور اسے اپنے سرپرست نواب محمد یار خاں کے ہم پہلو اُن ہی کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ میں نے قائم چاندپوری کو رام پور میں شعر و ادب کا پہلا فن کار کیوں کہا جب کہ اس کے نام کے ساتھ آج تک چاندپور کی نسبت باقی ہے۔ لیکن اس نسبت کی بقا کے بعد بھی میں اسے رام پور کے شعر و ادب کا پہلا فن کار کہوں گا۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی بستی نئی نئی بسائی جاتی ہے تو اُس میں دوسرے شہروں سے آ کر ہی لوگ بستے ہیں۔ پھر جو لوگ اس بستی میں رہ پڑتے ہیں اور وہیں مرکھپ جاتے ہیں۔ وہی اس بستی کے پہلے آبادکار اور اس بستی کے اولین باشندے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ اصُول صحیح ہے اور واقعی صحیح ہے تو قائم ہی شعر و ادب میں رام پور کا پہلا فنکار ہے۔

بہرحال قائم کے متعلق تمام تذکرہ نویسوں نے یہ طے کر دیا ہے کہ وہ میرؔ و میرزاؔ کا ہم پلہ تھا اور اسے یہ فخر کرنے کا حق حاصل تھا ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ۔۔۔ اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

یہی قائم دلی یا لکھنؤ میں مرتا تو آج میر و میرزا کی طرح اس کا مطبوعہ کلام بھی ہمارے سامنے موجود ہوتا یا آج اس کا قلمی دیوان لائبریریوں کی الماریوں میں موٹے موٹے قفلوں میں بند ہے اور یہ کتاب خانے ایک گوہرِ بے بہا کی طرح اسے اپنے اپنے سینوں میں چھپائے پڑے ہیں اور اس کے پانچ سو سے زیادہ شعر کلیاتِ سوداؔ میں سوداؔ کے نام سے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔[1]

---

[1] چاند ایم۔ اے۔ نے سوداؔ پر محققانہ مقالہ لکھا ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں قائم کے غیر مطبوعہ کلام اور سوداؔ کے مطبوعہ دیوان سے مقابلہ کر کے ان پانچ سو شعروں کی فہرست دی گئی ہے اور قدرت اللہ شوق کے تذکرہ تکملۃ الشعراء وغیرہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ شعر قائم کے تھے ان میں وہ مشہور مثنوی شکایت ملر

بس یہی حال رام پور کے دوسرے فن کاروں کا ہے ان کا کلام رضا لائبریری میں ہے اور اس لائبریری سے باہر وہ "محبوب از یاد رفتہ" (بھولے ہوئے محبوب) کی طرح ہیں۔ بلکہ فہرستِ محبوبیت میں اندراج نہ ہو سکنے والے محبوبوں میں سے ہیں۔ اگر ہمارے یہ فن کار چھپ کر نقادوں کے لئے سہل الحصول ہو جاتے تو۔ داغ اور جرأت کے درمیان جو فرق تسلیم کیا گیا ہے اس کی اصل حقیقت صحیح طور پر مان لی جاتی اور جس نتیجے پر میں ایک سال کی محنت اور جان کاہی کے بعد آج پہنچا ہوں وہ نتیجہ ایک مسلم حقیقت کا درجہ پا چکا ہوتا۔ لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے نقادوں اور ہمارے ادب کی تاریخ لکھنے والوں کا ایک ضروری فرض یہ بھی تھا کہ وہ داغ کے قدیم اور جدید رنگ کے فرق کو سمجھنے اور پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس ماحول کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے جو اس تبدیلی کا سبب ہوا تو انھیں محسوس ہوتا کہ داغ نے اپنے دہلوی رنگ کو چھوڑ کے جس رنگ کو اپنایا وہ ان کا طبع زاد رنگ نہیں تھا نہ جرأت کی ترقی یافتہ تقلید تھی بلکہ رام پور میں اس رنگ کی ایک چھوڑ دو دو زندہ مثالیں اُن کے سامنے موجود تھیں جن میں سے ایک یعنی نظام کا انتقال ۱۸۷۲ء میں ہوا اور دوسرے یعنی رسا نے ان کے جانے ۱۸۸۶ء سے بھی کچھ دنوں بعد یعنی ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ درحقیقت نواب کلب علی خاں بہادر کو یہ رنگ پسند تھا۔ اور سوال لکھنؤ اور دہلی کا نہیں، حکمرانِ وقت کی پسند کا تھا۔ وظیفہ لینا تھا تو اس کی پسند کے مطابق کہنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ کسی لکھنوی اُستاد کو لکھنویت کی برقراری کا خیال رہا نہ کسی دہلوی کو اپنی خصوصیات کا۔

نظام رام پوری کے متعلق تو جناب رشید رام پوری جانشین حضرت محمود رام پوری کی زبان سے یہ روایت بھی مجھ تک پہنچی ہے کہ نظام کا مجموعہ کلام ہمیشہ داغ کی پسندیدہ کتابوں میں سے رہا اور اُن کے سرہانے جو دو چار کتابیں ہمیشہ رکھی رہتی تھیں ان میں شامل تھا۔ یہ بات حضرت رشید کو اُن کے اُستاد مغفور حضرت محمود نے بتائی تھی اور ظاہر ہے کہ استاد کے متعلق شاگرد کی بات قابلِ اعتبار ہے تو داغ کے متعلق محمود کی بات بھی درخور اعتنا ہے۔ کیوں کہ محمود کو استاد داغ سے والہانہ عقیدت تھی اور وہ اپنے استاد کے رنگ کے بڑے کامیاب کہنے والوں میں سے تھے۔ اس موقع پر ان کے دو تین شعر سُن لیجئے جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا۔

دشمن اچھے ہیں جو دم دم کی خبر لیتے ہیں ۔۔۔ دوست آشنا بھی کہ حال کا پرسان نہ ہوا

تم سلامت رہو زمانے میں ۔۔۔ میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

باتوں میں گزارتے ہیں آہیں ۔۔۔ ہیں اور دلِ بے قرار میرا

تم شکل سے ہو ہماری بےزار ۔۔۔ اللہ اب ایسے ہو گئے ہم

کب آئے اجل کا کیا ٹھکانہ ۔۔۔ پھر لے والی ہزار گھر کی

گھر سے نکلے وہ مرے بعد تو بولے افسوس ۔۔۔ وہ ہی کم بخت نہیں ہے تو گلی سونی ہے

کہتے ہیں کہتے ہو کیا جی سے گذرنے کے لئے ۔۔۔ ہم سلامت ہیں تو ہیں سینکڑوں مرنے کے لئے

حضرت محمود کی گواہی سے یہ پتہ چلا کہ نظام کا دیوان داغ کے خاص مطالعے میں تھا۔ اب دیکھئے "کمالِ داغ"[1] صفحہ ۴۹ میں داغ کے زمانہ قیام دہلی کے یہ نمونے دیئے گئے ہیں۔

(الف) کبھی یہ دل تماشہ گاہ تھا عیش و مسرت کا
اب اس میں حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں

الٰہی دیدہ و دل تو نہ ٹھہرے وہ گزر ٹھہرے
کبھی حسرت گزرتی ہے کبھی ارماں گزرتے ہیں

(ب) کیا کہا۔ پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کیا ہے خمِ گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں

اک جفا تیری۔ نہیں کچھ بھی۔ مگر سب کچھ ہے
اک وفا میری کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

لامکاں میں بھی تو اک جلوہ نظر آتا ہے
بیکسی میں تو اُدھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

بھی شامل ہے جو یوں شروع ہوتی ہے۔ سردی اب کے برس ہے اتنی شدید۔ صبح نکلے ہے کانپتا خورشید۔ سودا کے دیوان میں یہ سب اشعار زیادہ بہتر صورت میں پائے جاتے ہیں اس لئے قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ قائم کے مسودات سودا کو اصلاح کے لئے بھیجے گئے جو کسی وجہ سے بعد اصلاح واپس نہ ہو سکے اور مرتب نے سودا کے دیوان میں شامل کر لئے (راز)

[1] کمالِ داغ - داغ کے کلام پر تبصرہ از حامد حسین قادری۔

میں اسی مقالے میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ داغ کے دہلی کے کلام اور رام پور
کلام کو وثوق کے ساتھ جدا جدا کر کے رکھ دینا مشکل ہے لیکن میرے سامنے
بعض شہادتیں ایسی ہیں جن پر پورے طور پر نہیں تو چند غزلوں کے متعلق یہ بات
یۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ داغ نے زمانۂ قیام دہلی میں کہی ہیں مثلاً

(۱) داغ نے پہلی غزل نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مشاعرے میں پڑھی

"سیماب نہیں" "بیتاب نہیں"

وہ مطلع جو داغ نے پڑھا یہ تھا ؎

مرد برق نہیں شعلہ سیماب نہیں ۔۔۔ کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بیتاب نہیں

(۲) زینت باڑی کے مشاعرے میں۔

"تو اپنا" "ترا نوا اپنا"

(۳) لال قلعہ کے مشاعرے میں "دم نکلے - بھرم نکلے"

(۴) نواب اصغر علی خاں نسیم کا مشاعرہ - "آسماں کے لئے جاں کیلئے"

مگر اس مشاعرہ میں داغ کو مومن اور ذوق کے درمیان جگہ ملی تھی۔
لہٰذا داغ نے قربانی کا بکرا بننے سے بچنے کے لئے یہ صورت اختیار کی کہ ان کی باری
آئی تو طرح میں نہ کہہ سکنے کا عذر کر دیا اور غیر طرح غزل پڑھی یعنی

کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

"گلزارِ داغ" میں "آسماں کے لئے اور جاں کے لئے"۔ اس طرح
میں داغ کی غزل ہی نہیں ہے اسی طرح نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مشاعرے
میں پڑھا ہوا مطلع بھی 'گلزارِ داغ' میں شائع نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف ایک
مطلع شائع ہوا ہے اور وہ مطلع یہ ہے۔

بیکسی صدمہ ہجراں کی مجھے تاب نہیں ۔۔۔ کاش دشمن ہی چلے آئیں جو احباب نہیں

مگر اس کا کیا علاج کہ 'گلزارِ داغ' کے ذریعے سے آج جو کلام ہمارے
سامنے لایا گیا ہے اس کے متعلق خود 'جلوۂ داغ' کا فیصلہ یہ ہے کہ ابتدائی
کلام جو ساٹھ جزو میں پھیلا ہوا تھا غدر میں ضائع ہو چکا ہے اور بعد کو جو
کچھ یاد آتا گیا ایک ایک دو دو شعر لکھے جاتے رہے اور ان ہی طرحوں
میں بعد کو شعر کہہ کر غزلیں مکمل کر لی گئیں گویا قدیم غزلوں میں جدید رنگ کے

نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، عہ از مقدمۂ 'فریادِ داغ' و 'جلوۂ داغ': مقدمہ
'فریادِ داغ' از مولانا تمکین کاظمی اور 'جلوۂ داغ' مصنفہ احسن مارہروی۔ عہ جلوۂ داغ صفحہ ۱۱۱

شعر ضرور رکھے گئے اور داغ کے پہلے مجموعے 'گلزارِ داغ' کا یہی عالم ہے کہ
تقریباً ہر ردیف میں دو رنگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً

رنگِ قدیم	رنگِ جدید
ابتدائے رمضاں سے ہے مۂ عید کی دھوم	تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
کسی کافر نے دکھایا نہ ہوا ابرو اپنا	تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا
قبر میں بھی نہ بجھی آتشِ غم والے نصیب	بیکسی صدمۂ ہجراں کی مجھے تاب نہیں
ہم جہاں دفن ہیں وہاں پر زمیں آب نہیں	کاش دشمن ہی چلے آئیں جو احباب نہیں
مجھے مانتے سب ایسا کہ عدو بھی سجدے کرتے	جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
در یار کعبہ بنتا جو مرا مزار ہوتا	تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا
سرِ شوریدہ کی تسکین وہیں ہوتی ہے	صبر لے زاہدِ نافہم نہ مئے خواروں کا
مجھ پہ احسان ہے اس کوچے کی دیواروں کا	بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

یہ پہچان بین تشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں۔ رنگِ قدیم دیکھئے۔

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا ۔۔۔ مگر دیکھو تو کچھ بھی آدمی سے ہو نہیں سکتا
جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا ۔۔۔ کہتا تھا آج - خاک میں کوئی ملا ہوا
ہمیشہ فیض سے دنیا دلوں سے خاکساروں کو ۔۔۔ کہ موجِ بحر تر کرتی ہے کیا کیا لب کناروں کا
مثلِ ماہی تیرتا جاتا ہوں راہِ شوق میں ۔۔۔ چشمِ گریاں کی بدولت ہے سمندر زیرِ پا

غور کیجئے داغ کی زباں سے استاد ذوق بول رہے ہیں یا نہیں۔
چشمِ گریاں کی بدولت ہے سمندر زیرِ پا - داغ اور - بہہ گیا خط لکھنے لکھتے "اشکوں میں"
آب میں" ذوق - اب ذرا داغ کا رنگِ جدید دیکھئے۔

ڈر گئے تم شکایت کرنے ہے خواہشِ مرگ ۔۔۔ منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا
مرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا ۔۔۔ وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا
عیش بھی اندوہ فضا ہو گیا ۔۔۔ ہائے طبیعت تجھے کیا ہو گیا
چپ رہیں گے حیا سے وہ کب تک ۔۔۔ غصہ الزام سے تو آئے گا
ہوئے ایک دیر و حرم کے مسافر ۔۔۔ کچھ اِس راہ چل کر کچھ اُس راہ چل کر
نہ پوچھو شبِ ہجراں کیوں کر بسر کی ۔۔۔ یہ کروٹ بدل کر وہ کروٹ بدل کر

عہ اسی مضمون کو استاد ذوق نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں کہا ہے۔
کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں ۔۔۔ جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں
سب کچھ ہو گیا اس میں - یہ کروٹ بدل کر وہ کروٹ بدل کر کی سی بات نہیں۔

انداز فکر کے اسی تبادلے پر سطحی مطالعہ سے جرأت کی تقلید کا دھوکا ہوتا ہے لیکن داغ، اور جرأت کے رنگوں کے اتحاد اور اختلاف پر "کمال داغ" میں پروفیسر حامد حسن قادری نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے "جرأت و داغ" کے عنوان سے وہ کہتے ہیں۔

۱۔ غزل میں شوخی اور بانکپن شیخ قلندر بخش جرأت کی ایجاد ہے۔ یہ رنگ ان سے پہلے نہ تھا ان کی ایجاد ہے۔

آخری دور میں یعنی متاخرین کے دور میں داغ نے اس رنگ کو چمکایا اور اس قدر شوخ کر دیا کہ اس میں بازاری شان پیدا ہو گئی۔ کمال داغ میں جرأت اور داغ کا موازنہ کر کے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ

۲۔ داغ کے ہاں عام طور پر جدتِ ادا۔ رنگینی بیان، حسنِ بندش، شوخی الفاظ جرأت سے بہت بہتر ہے۔

۳۔ داغ کے شوخ مضامین جو فحش اور ابتذال سے خالی ہیں بہت اعلیٰ ہیں۔

۴۔ جرأت کے ہاں شوخ بیانی و فحش و ہزل بہت کم ہے اور داغ کے ہاں بہت زیادہ۔

۵۔ جرأت کے ہاں میر و مصحفی کا انداز ہے جو داغ کے ہاں مطلق نہیں۔

اب ملاحظہ کیجئے اگر داغ کے کلام میں میر کا انداز مطلق نہیں ہے تو وہ "رنگینی بیان، حسن ادا، شوخی الفاظ" جو داغ کے کلام میں پائی جاتی ہے اس پر جرأت کے واسطے سے دہلی کی ملکیت کی چھاپ لگا دینا ایک اپج نہیں تو کیا ہے۔

قادری صاحب رام پور سے بہت قریب ہیں۔ یعنی فن شعر و سخن میں وہ پیارے خاں رازؔ مرحوم کے شاگرد ہیں جو امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ان میں رام پور سے ایک قسم کی عقیدت بھی پائی جاتی ہے۔ چناں چہ خود میرے متعلق انھوں نے اپنے ایک خط میں جس طرح عزت افزائی کی تھی وہ میرے خواب و خیال کی حدود سے بھی آگے ہے اور قادری صاحب کو رام پور میں داغ کے زمانے کے شاعرانہ ماحول کو تلاش کرنے میں نسبتاً آزادی اور آسانی بھی تھی۔ لیکن تمام خیالات اور قیاسات کے دریا کا بہاؤ جب ایک سمت کو ہو جائے تو حقیقت کو تلاش کرنے کا قوی ارادہ بہت کم پیدا ہوتا ہے۔

کیا یہ انتہائی رواروی نہیں ہے کہ جس شہر میں دو مختلف رنگوں کا امتزاج تسلیم کیا جائے اس کے اپنے ماحول کو نظر انداز کر کے رائے زنی کی جائے اور کیا اس سے غلطی کا زبردست امکان نہیں پیدا ہوتا۔ دیکھئے جرأت کا کلام اس وقت بھی اسی دنیا میں بالکل آج کی طرح موجود تھا جب داغ دہلی میں مشاعرے پڑھ رہے تھے اور مجروحؔ اور مالکؔ وغیرہ سے کاندھے سے کاندھا ملا کر پڑھ رہے تھے۔ بلکہ اُن کے اُستاد یعنی غالبؔ کی غزلوں پر غزلیں کہہ رہے تھے

مثلاً کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

اور نہ صرف کہہ رہے تھے بلکہ یہ غزلیں کہہ کر دہلی کے بڑے مشاعروں میں پڑھ رہے تھے مگر اس ماحول میں داغ کو جرأت کے تتبع یا جرأت سے بہتر شوخ مضامین کہنے کا کوئی خیال نہیں آیا۔ لیکن رام پور آ کر یکایک وہ اپنے اسلوب فکر کو بدل لیتے ہیں۔ کیا اس تبدیلی کے لئے کوئی زبردست محرک نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ زبردست محرک تھا اور واقعی تھا۔ یہاں تک کہ خود قادری صاحب نے اسے محسوس تو کیا لیکن رواروی میں اس کا ذکر کرتے چلے گئے۔ "کمال داغ" کے صفحہ ۵ پر جہاں وہ داغ کی اور مشکلات کا ذکر کرتے ہیں، وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔

"شعرائے رام پور سے داد لینا تھی"

بس یہ پیچ تھا جو قادری صاحب کے متجسس دماغ نے پیدا تو کیا مگر وہ اس پر زیادہ غور کئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ داغ دہلی میں جرأت کے رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تو وہ جرأت کے تتبع میں میر و مصحفی کی تقلید بھی کرتے لیکن داغ نے رام پور میں اس رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے رام پور میں اپنے طرزِ فکر کو بدلا اُن کے سامنے شعرائے رام پور بھی تھے اور امیر مینائی بھی امیر مینائی نہ صرف شاعر تھے بلکہ صاحبِ علم و فضل بھی امیر کے مقابلے میں بقول قادری صاحب کے (کمال داغ صفحہ ۵۰) داغ کے پلے میں شاعری ہی شاعری تھی اس موقع پر داغ نے سنجیدگی سے سوچا۔

اُنھوں نے دیکھا کہ رام پور کے عوام پر نظامؔ و رستا چھائے ہوئے ہیں دربار میں بھی یہی رنگ پسند کیا جاتا ہے اگر امیر سے مقامی رنگ میں ڈوب کر مقابلہ کیا گیا تو دربار سے بھی پسندیدگی کی سند ملے گی اور عوام بھی اپنا ہم رنگ سمجھ کر ہمدردی کریں گے اور امیر کا علم و فضل بھی مضامین کی شوخی کے لحاظ سے

۱۔ کمال داغ، صفحہ ۹۳

الف۔ صفحہ ۹۳، ۹۴ کمال داغ، ۲، ۳، ۴، ۵ کمال داغ، صفحہ ۹۷۔

اس میدان میں اُتر کر مقابلہ کرنے سے ان کو روکے گا۔ اس لئے انھوں نے نظام و رتسا کا آئیڈیل سامنے رکھ کر شعر کہنا شروع کر دیئے۔ نتیجہ وہی ہوا جو داغ نے سوچا تھا۔ دربار سے خوشنودی کی سند ملی۔ شعرائے رام پور کی پوری تائید حاصل ہوئی یعنی قادری صاحب کے لفظوں میں شعرائے رام پور سے داد مل گئی اور ان کے مقابل امیر مینائی نے ان کے سے شعر کہنا شروع کئے تو بہک گئے۔ امیر مینائی کے بہک جانے کو اردو ادب کے سب مورخوں نے مانا ہے مثلاً

۱۔ "امیر جو داغ کے سب سے بڑے حریف اور مقابل تھے۔ انھیں بھی رائے عامہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے ان کا دوسرا دیوان صنم خانۂ عشق 'داغ کے رنگ میں ہے۔"

یہ رائے عامہ کیا تھی رام پور کے عوام کی طرف سے مقبولیت کا عام سارٹیفکٹ، کیوں کہ مقابلہ ہی رام پور کے میدان میں ہو رہا تھا اور رام پور کے عوام پر نظام و رتسا چھائے ہوئے تھے۔ چناں چہ داغ نے وہ رنگ اختیار کیا کہ دربارِ رام پور اور شعرائے رام پور دونوں داغ کی تائید میں آ گئے اور اسی تائید کے سامنے سرِتسلیم خم کر کے امیر نے بھی وہی رنگ کہا۔ لیکن ان کا علم و فضل مانع آیا اور اس ٹکراؤ کا ردِّعمل یہ ہوا کہ:۔

۲۔ "اگرچہ وہ (امیر مینائی) داغ کے رنگ میں کامیاب نہ ہو سکے تاہم اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بہت کچھ بدل گیا۔"

یعنی امیر مینائی داغ کے رنگ کو اپنا نہ سکے اور داغ کا سوچا ہوا پیگرام چل نکلا البتہ داغ کے ابتدائی کلام کا ساٹھ جزو پر مشتمل ہونا محل نظر ہے۔ ساٹھ جزو کے معنی ہیں ۹۶۰ صفحات۔ اس زمانے میں آج کی طرح نازک اور دبلی پتلی نوٹ بکوں کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ شاعر کے پاس ضخیم ضخیم رجسٹر ہوتے تھے۔ ان رجسٹروں پر فی صفحہ پندرہ سطریں بھی مان لی جائیں تو اشعار کی کل تعداد ۱۴۴۰۰ ہوتی ہے مان لیجئے کہ داغ نے باقاعدہ طور پر ۱۸۴۴ء میں شعر کہنا شروع کئے تو ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۷ء یعنی تیرہ برس میں ۱۴۴۰۰ شعر کہے اور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک یعنی اکیس برس میں کہے ہوئے تقریباً ۵۲۰۰ — شعر گلزارِ داغ میں شائع ہوئے اور ان میں بھی اسی جلوۂ داغ کی روایت کے بموجب پُرانا

۱۔ تاریخ ادبِ اردو صفحہ ۴۱۵ - (۲) - شعر الہند صفحہ ۲۸۹ - (۳) جلوۂ داغ صفحہ ۱۱

کلام بھی شامل ہے اور اس پر طرہ یہ کہ دہلی میں داغ کو اپنی انفرادیت کے تحفظ کا زیادہ خیال نہیں تھا۔ چناں چہ کمالِ داغ' میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ:۔

۱۔ "ان کی (مراد داغ) شاعری کا اصل اور بہترین دور قیامِ رام پور کا زمانہ ہے۔ اسی لئے گلزارِ داغ' آفتابِ داغ' اور مہتابِ داغ میں فرق ہے۔"

۲۔ "گلزارِ داغ و آفتابِ داغ زمانہ قیامِ رام پور کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان دونوں دیوانوں میں اکثر وہی غزلیں ہیں جو رام پور کے مشاعروں میں کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں میں عجیب دل کشی اور سحر آفرینی ہے۔"

۳۔ "گلزارِ داغ' کے مطالعہ سے پایا جاتا ہے کہ غور و فکر سے کہتے تھے۔ شعر کی بندش اور الفاظ کے ہر پہلو پر غائر نظر ڈالتے تھے۔ مہتابِ داغ' میں اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز روانی پائی جاتی ہے۔ زبان صاف و شستہ بندش میں تصنع کو ذرا دخل نہیں بایں ہمہ مضمون میں شوخی اور تیکھاپن اس درجہ ہے کہ شعر بے مثل ہو جاتا ہے۔"

داغ کے کلام میں منفامیت

رام پور روہیلوں کی بستی ہے۔ روہیلے فطرتاً تلوار کے دھنی اور قسمت آزما قسم کے لوگ ہیں۔ جب تک روہیلے پورے کھتریعنی روہیلکھنڈ (کھڑگ تا سنگھ) میں پھیلے۔ وہ ملک کی بڑی بڑی لڑائیوں میں شریک ہوتے، ملک کی قسمت بنانے میں حصہ لیتے اور بڑی بڑی قوموں کے مقابلے میں مارتے مرتے رہے لیکن انگریزی ڈپلومیسی کے زہراب نے جب ان کی تلوار کو زنگ آلود کر دیا اور غیر ملکی سیاست کے مقابلے میں روہیلوں کی تلوار بھی بے کار ہو گئی تو اس قوم نے امن گاہ رام پور میں آ کر تلوار میان میں ڈالی اور میان کو کھونٹی پر ٹانگ دیا — جب تلوار کھونٹی کی زینت ہو گئی تو روہیلوں کی بے قرار فطرت اور طبیعت نے رزم کو ناممکن دیکھ کر بزم کی طرف اپنی توجہ موڑ لی لیکن ان کی بزم میں ایک بانکپن ایک تیکھاپن آ گیا۔ محبوب سے ردّ و بدل، لڑائی اور کھنچاؤ۔ چوں کہ ان کی بزم جو فطرت کے مطابق تھا لہٰذا عشق کی تمام نیازمندیوں کے باوجود خان صاحب' اپنی فطرت کے تتبع میں کچھ اکڑے اکڑے نظر آنے لگے اور وہ طبیعتیں جو نعرۂ جنگ اور شورِ دار و گیر میں سکون اور زندگی محسوس کرتی تھیں، جب فرضی خنجرِ ابرو اور خیالی تیرِ مژگاں کے سامنے سینہ تان تان

۱۔ جلوۂ داغ، صفحہ ۲۰۔ ۲۳۔ خم خانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۱۱۴، ۱۱۷۔

سکے آتش تو بزم کی واہ واہ اور شور تحسین میں تسکین حاصل کرنے کے ساتھ اپنے جذبۂ غیرت، عشق کی خودداری اور نیاز مندانہ آن بان کو نہیں بھول سکیں مثلاً

سب کے دل پوچھتے ہو نام مرا
اس تجاہل کو ہے سلام مرا (دشتنہ متوفی ...)

بات کرنے میں تو شرماتے ہو تم
ظلم کرنے میں نہیں آتا لحاظ (حکیم مظہر احسن احسن شاگرد غالب متوفی ۱۰ اپریل ...)

(۱) ان بے وفائیوں کا دکھاتا تجھے مزہ
ہوتا فدا بھی دل جو مرا اختیار میں (رہتاب تلمیذ مومن متوفی ... جون ...)

کرو ے شب تار میری روشن
جب جانیں تجھے کہ مہ لقا ہے (امداد شاگرد غفلت متوفی جون ...)

(۲) بزم میں اور سب سے باتیں ہیں
جیسے ہم بے بلائے بیٹھے ہیں (نظام شاگرد بیمار متوفی ...)

آج یہ کس سے ٹھن گئی کہ نظام
آستینیں چڑھائے بیٹھے ہیں " " "

اک لطف رونے کا ہے سوال و جواب میں
ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ وعدہ وفا نہ ہو " " "

داغ اس مقامیت کو لے کے ایک قدم آگے بڑھے یعنی ؎

اب کے کچھ منھ سے نکالا تو تمھیں جانو گے
داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برابر نہ کہوں

یعنی سب سہی مگر مجھے گالی کی برداشت نہیں ہے اس وقت تو خیر تم میری فطرت سے ناواقف تھے میں نے جیسے ہو سکا صبر کر لیا لیکن آئندہ ایک کہو گے تو سنو گے بھی اس کا خیال رہے ؎

مری اُن کی جو ری محفل میں ہو گی
زباں پر آئے گی جو دل میں ہو گی

داغ کا عشق دیکھا۔ برابر کی لڑائی دیکھئے اب ذرا داغ کے محبوب کو دیکھئے ؎

انکار مئے کشی نے مجھے کیا مزا دیا
سینے پہ چڑھ کے اس نے خم مئے پلا دیا

دیکھئے محبوب کا یہ پہلوان قسم کا تصور۔ دہلی اور لکھنؤ کس طرف ہے اور مٹھّے

تحرکت تم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

آیئے اب ذرا یہ بھی دیکھیں کہ داغ سے پہلے اور داغ کے زمانے میں دہلی کے شاعرانہ ماحول میں نزاکت خیال، شوخیٔ مضمون، اسلوب بیان کی خوبی اور

الفاظ کی بلندی تھی یا نہیں۔

مئے گل رنگ کی ہے جلوہ گری شیشے میں
دختر رز نہیں اُتری ہے پری شیشے میں — آلام

آشنا کو نہ اٹھا بزم سے اپنی ظالم
ایسے ملتے کے نہیں ناز اٹھانے والے — آشنا

رہ جانے کی جس دم ٹھانے لگے
یہ سنتے ہی ہم تو ٹھکانے لگے — احمد

ہوس رہ گئی یہ دل زار کی
کبھی بات اس نے نہ کی پیار کی — افزوں

تم کو محشر میں نہ ہو گے کہہ دو
ورنہ اک اور قیامت ہو گی — افگار

چلے جو اپنے سایہ سے بھی بچ کر
وہ ظالم کیا کسی کا آشنا ہو — باقر

صبح ہوتی ہے شب غم نہ قضا آتی ہے
چارہ گر کچھ تجھے مرنے کی دوا آتی ہے — حسن

عمر بھر ان کی جستجو نہ گئی
مر گئے پر یہ آرزو نہ گئی — میاں غلام حسن عشرت

ہائے نیچی وہ شرم سے آنکھیں
اور حسرت سے دیکھنا میرا — رسا

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا ڈر کریں
ہم تو بُرد ل کی جان کو پہلے ہی رو چکے — شوق

فتنۂ دہر ہو بیٹھے ہی رہو
گر اٹھو گے تو قیامت ہو گی — شہاب

عیش کیا رنج بھی نہیں رہتا
ایک عالم نہیں زمانے کا — صادق

بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن
کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں — صاحبزادہ صفدر

وہ بُت جلوہ آرا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے — صاحبزادہ صفدر

مر کے بھی ہم نے سب کو دیکھ لیا
کوئی مرتا نہیں کسی کے لئے — طالب

کیوں ترک کریں بندگی میکدہ واعظ
کیسے مٹ ہو جائیں گے بخشے سے خدا ہم — عنایت

صدقے ہوئے - فدا ہوئے - جل کر فنا ہوئے
کیا پوچھتے ہو شمع کے پروانے کیا ہوئے — نصیح

وہ جو پہلو سے اُٹھے درد کچھ ایسا اٹھا
تھام کر دل کو کئی بار میں بیٹھا اٹھا — فقیر

وہ مٹتا ہے ہزاروں کو مٹا کر
یہی پہچان ہے اس نقشِ پا کی — کاوش

نازنینوں کے ناز بھی نہ اُٹھے
ناتوانی سی ناتوانی ہے — گوہر

کہاں میں اور کہاں ترکِ محبت
نصیحت کی بھی ناصح نے تو کیا کی — موحد

پھر اس دور میں دوا کیسی
درد ملتا نہیں دوا کے لئے — مہتر

یہ سب ۱۸۴۳ء تک کے شاعروں کے شعر ہیں، ان کے ساتھ نظام کے بھی اک دو شعر ملا لیجئے ؎

مرنے کا لطف زیست سے مجھ کو سوا ہوا — گھبرا کے اس کا کہنا کہ ہے ہے یہ کیا ہوا

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا — جانے کیا بات تھی کیا بھول گیا

آپ اور آئیں اپنے وعدے پر — اور قسم بھی تو میرے سر کی قسم

انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ — دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

دنیا وہ اس کا ساغرِ مئے یا شبِ نظام — منہ پھیر کے اُدھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

یہی کہئے مری بلا آئے — وہ بھی تو میرے گھر نہیں آتی

وغیرہ وغیرہ

ایسے شاعرانہ ماحول میں داغ نے رام پور کا قیام اختیار کیا۔ دربارِ رام پور رام پور کے نکتہ رس عوام اور رام پور کے امانبد اور سہلِ ممتنع کہنے والے (نظام وغیرہ) شعراسے ربط و ضبط منظور کیا۔ ان حالات میں رام پور رہ کر بھی اگر وہ دہلی کا رنگ ہی کہتے رہتے۔ تو کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا جیسے ناصحانہ اسکول - یا "ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا" جیسے محاورہ بند مکتب کا یہ نوجوان شاعر آج تذکروں کے اندر بند پڑا ہوتا اور نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم اور نواب کلب علی خاں بہادر نواب اس کے وظائف جاری نہیں کرتے ـــــ مگر

داغ نے بڑی ہوشیاری سے کام لے کر شوخ مضامین کو اپنایا۔ نظام کو سامنے رکھ کر ادابندی اختیار کی۔ اپنی شاعری میں داخلیت اور مقامیت پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رام پور کے عوام ان کے ہمدرد اور شائق ہو گئے۔ رام پور کے شعرا ان کو پسند کرنے لگے۔ دربار میں ان کا وقار بڑھا اور جہاں جہاں ان کا کلام پہنچا اس کی شہرت آگے آگے پہنچی۔ لوگوں نے اسے محض ان کا کارنامہ سمجھ کر سینوں سے لگایا کیوں کہ ان کا معنوی استاد نظام صرف رام پور کے اندر گمنام کر رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ آخر میں ان کے سب سے بڑے حریف امیر مینائی ان کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے مگر یہ رنگ یا داغ جیسے بے پروا کے بس کا تھا یا نظام جیسے آزاد کے قبضے کا۔ اس لئے امیر نے اس کی طرف بڑھ کے ٹھوکریں کھائیں۔ اب بتایئے -

کیا یہ کہنا غلط ہے کہ داغ رام پور نہ آتے تو وہ داغ نہ ہوتے جو آج ہیں۔ نہ تو وہ فصیح الملک ہوتے نہ جہاں استاد۔ اور اس کے لئے داغ رام پور کے شاعرانہ ماحول۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار اور نظام کی آئیڈیل شاعری کے خوشہ چین نہ تسلیم کئے جائیں (وہ بھی محض بربنائے پاسِ جہاں اُستادی) تو بھی وہ رام پور کے شکر گزار ضرور مانے جائیں گے۔ جن کے واسطے سے رام پور نے ادبِ اردو کو ایک نیا رنگ دیا۔

جاتے تھے مُنہ چھپائے ہوئے میکدے کو ہم
آتے ہوئے اُدھر سے کوئی پارسا ملا

لہو کی بوند مژگاں سے جھڑی ہے
یہی گلزارِ دل کی پنکھڑی ہے

ملے مجھ سے تو فرمایا تمہیں کو داغ کہتے ہیں؟
تمہیں ہو ماہِ کامل میں تمہیں رہتے ہو لٹے میں — داغ

علی عباس حسینی

اپریل فول

پورے کالج میں ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی - اس ادارے کی تاریخ میں بالکل نئی بات ہوئی تھی - آج نوٹس گھومی تھی کہ تیسرے ہی گھنٹے کے بعد سارے لڑکے ہال میں جمع ہو جائیں - یہ بات "گرو جی" کے اصول کے بالکل خلاف تھی - ہال میں لڑکے کالج شروع ہونے سے پہلے دس بجے جمع کئے جاتے یا پھر کالج کے بعد چار بجے - ہفتے کے پانچ دنوں میں کبھی کوئی جلسہ تعلیمی گھنٹوں کے بیچ میں نہیں ہوتا تھا - سنیچر کے دن البتہ انٹرول کے بعد مباحثے ہوتے تھے یا کھیل - مگر آج پیر کے دن "گرو جی" کا حکم نامہ نکل گیا کہ تعلیمیں رد کو اور ہال میں جمع ہو - کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور تھی ، ورنہ آندھی آئے کہ آگ لگے ، برف باری ہو کہ سنگساری گرو جی اپنی جگہ سے ہٹنے والے آدمی نہ تھے - کوئی مرے یا جیئے وہ اپنے اصول نہیں توڑ سکتے تھے - یہ گرو جی کوئی چھوٹے سے مدرسہ یا کسی مکتب کے معلم نہ تھے - یہ تھے مسٹر مکندی لال ایم اے ڈی ، لٹ - کالج کے بانی اور اس کے پرنسپل - بڑے نیک ، بڑے سیدھے مگر اصول کے معاملے میں ہمالیہ پہاڑ - اس لئے سب کو تیسرے گھنٹے کے بعد ہال میں حاضری کے حکم پر تعجب تھا - استادوں کو بھی ، لڑکوں کو بھی - مگر بعض پرانے ٹیچر تو اس [illegible] کرتے تھے کہ [illegible] کیسے آئے - آج تو پہلی اپریل ہے - سب جانتے ہیں کہ پہلی کو گرو جی مون برت رکھتے ہیں - چوبیس گھنٹے نہ بولتے ہیں نہ کسی سے ملتے ہیں - بس اپنے کمرے میں بند رہتے ہیں - نوکروں کو [illegible] ہیں - ہاں چوکیدار البتہ صبح سے شام تک پھاٹک پر بیٹھا رہتا ہے - اسے حکم ہوتا ہے ، جو بھی آئے پلٹا دو - ۲ - اپریل سے پہلے کسی سے نہ ملیں گے - مگر آج وہ کالج بھی آئے اور انہوں نے اس طرح کا خلافِ معمول حکم بھی نکالا - اسی لئے سب حیران تھے - مگر مدھو [illegible] سے زیادہ پریشان تھے -

وہ بار بار ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ، مگر جلد ہی گردنیں جھکا لیتے اس لئے کہ ان کی مسکراہٹ صرف ہونٹوں کی کچی تک محدود رہتی - آنکھیں نہ مسکراتیں ، ان میں تو ڈر کی ہلکی سی جھلک تھی - جیسے کسی شرارت کے کرنے میں مزا تو آیا ، مگر یہ خوف بھی ہے کہ کہیں چوری پکڑی نہ جائے اور شرارت کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے - سارا کالج جانتا تھا کہ مدھو سودن اور مشتاق میں بڑی گہری چھنتی ہے - بالکل ایک جان دو قالب والا معاملہ ہے - چولی اور دامن کا ساتھ ، پڑھائی کے درجوں میں ساتھ ، کھیل کے میدانوں میں ساتھ ، مباحثے میں ساتھ ، مطالعے میں ساتھ - ایک ساتھ اپنے اپنے گھروں سے نکلتے ، ایک ساتھ اپنے اپنے مکانوں میں پلٹتے - گھر بھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے - بس گلی بیچ میں تھی - وہ بھی اتنی ہی چوڑی کہ ایک چھلانگ میں پار کر لی جائے -

مگر یہ سارا ساتھ ، ساری یکرنگی مدھو اور مشتاق کی ذات ہی تک تھی - ورنہ مدھو کے پتا جی بڑے بڑے بد وانوں کے گرو تھے - شاستروں کا جاننے والا اُن سے بڑا کوئی برہمن نہ تھا - اپنے ہی شہر میں نہیں بلکہ دُور دُور کے شہروں میں بھی ہون کرانے وہی بلائے جاتے - مت اور دھرم کی باتوں میں اُن کا فیصلہ آخری ہوتا تھا - آج سے نہیں بلکہ سات پیڑھیوں سے اُن کا خاندان آس پاس کے رجواڑوں کا گرو تھا - ادھر مشتاق کے والد جامع مسجد کے پیش نماز تھے اور عربی جامعہ کے مدرسِ اعلیٰ - ہر وقت یا تو کلامِ مجید کی تلاوت کرتے یا دینیات کا درس دیتے - اس لئے ہمسایہ ہونے پر بھی دونوں گھروں میں کوئی ربط نہ تھا ، کوئی نقطہ مشترک نہ تھا جہاں دونوں ملتے - یہ دو خاندان کیا تھے

دو چٹانیں تھیں جن کے درمیان سلے رنگی اور غیر ہمنوائیگی کی ایک گہری ندی بہ رہی تھی۔ لیکن مدھو اور مشتاق نے پہلے تو اس درمیانی خلیج کو پھاند پھاند کر دوستی کی، پھر دونوں کے اخلاص نے اس خلا پر ایک پُل سا بنا دیا۔ اور اس کے دونوں سروں پر اخوّت کے دو چراغ جلا دئے جنھیں نہ جھکڑ بجھا سکے اور نہ آندھیاں گُل کر سکیں۔ اور پھر تو دونوں گھر ایسے ملے ایسے ملے جیسے وید و قرآن۔ ظاہر میں تو سنسکرت اور عربی کی لفظوں کا فرق مگر باطن میں وہی اللہ اور برہما کی وحدانیت!

ہاں، تو مدھو سودن اور مشتاق احمد مسکراتے تو ضرور تھے مگر کچھ ڈرے سہمے ہوئے۔ اور آج خلافِ معمول آپس میں باتوں کا وہ سلسلہ بھی نہیں جاری تھا جو درجے میں ہو یا درجے کے باہر دونوں میں برابر ٹیچروں کی ڈانٹ اور ساتھیوں کی شکایت کا موجب بنتا تھا۔ مگر آج صرف آنکھیں کچھ پیغام دیتیں، ہونٹوں پر مسکراہٹیں آتیں اور گردنیں جھک جاتیں۔ جب سے گُرو جی کا حکم گُما یا گیا تھا یہ کیفیت اور بڑھ گئی تھی۔

بالآخر تیسرا گھنٹا ختم ہوا۔ ہال میں ایک کے بعد ایک ہر درجے کے طلبا اور ٹیچر آنے لگے۔ مدھو اور مشتاق بھی اپنے درجے کے لڑکوں کے ساتھ اگلی بنچوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ دونوں انٹرمیجیٹ میں تھے، یعنی کالج کے پہلے سال میں، انھیں تو آگے بیٹھنا ہی تھا۔ ان کے چہرے غمّاضی کرتے تھے کہ یہ ٹیچروں لیکچراروں اور پروفیسروں کے پلیٹ فارم سے کچھ دور ہی بیٹھنا چاہتے تھے۔ مگر کیا کرتے کہیں اور بیٹھ کر خود نمائی بھی تو مناسب نہ تھی۔

لڑکوں کے اکٹھا ہو جانے کے بعد اب گُرو جی کا انتظار ہونے لگا۔ دیر ہوئی تو آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لڑکوں سے زیادہ خود ٹیچر آپس کی گفتگو سے ہال کے شور کو بڑھانے لگے۔ ٹھنگے، سوکھے ناگر جی، وائس پرنسپل برابر پہلو بدلتے رہے۔ انھوں نے ہمیشہ سے بے چین طبیعت پائی تھی، ان سے نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ بالآخر گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "میں دیکھتا ہوں کہ پرنسپل صاحب کیوں نہیں آئے۔" اور وہ اپنی ٹائی ٹھیک کرتے نکل گئے۔

گُرو جی اپنے کمرے میں بیٹھے ضروری کاغذات پر دستخط کر رہے تھے۔ ان کے سامنے رجسٹروں اور فائلوں کا ایک ڈھیر تھا، ورمشی جی کاغذات ایک کے بعد ایک پیش کرتے جاتے تھے۔ ناگر جی داخل ہوئے تو انھوں نے ان کے سلام کا جواب گردن سے دیا اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ ناگر جی بیٹھے تو مگر کچھ بے چینی سے بیٹھے۔ گُرو جی نے ان کی بے چینی محسوس کر لی۔ انھوں نے کاغذ سے نظر ہٹا کر انھیں دیکھا اور پوچھا "کیا ہے ناگر جی؟"

ناگر جی نے کہا "جی، سارے درجے ہال میں جمع ہیں، آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

گُرو جی نے چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا۔ "ہال میں؟ چوتھے گھنٹے میں؟ یہ کیوں؟"

ناگر جی نے یاد دلانے والے لہجے میں کہا "جی آپ ہی تو حکم گُمایا گیا تھا کہ تیسرے گھنٹے کے بعد سب ہال میں جمع ہوں۔"

گُرو جی کے چہرے پر غصّے کا ہلکا رنگ آ گیا۔ وہ بولے "میرا حکم کیسا؟ میں نے تو کوئی حکم نہیں دیا۔"

ناگر جی سٹ پٹا گئے۔ منشی جی نے ناک پر آگے بڑھی ہوئی عینک کو پیچھے کھسکا کر کہا "جی، ہاں، جی، جب میں دفتر میں آیا تو میری میز پر آرڈر بک کھلی رکھی تھی اور اس پر آپ کا حکم لکھا تھا۔ میں نے گُمانے کو دے دیا۔"

وہ لپک کر آرڈر بک لے آئے۔ حکم صاف صاف لکھا تھا۔ اور گُرو جی سے ملتا جلتا دستخط بھی تھا۔ مگر نیچے پہلی اپریل تاریخ پڑی تھی اور اس کے آگے بریکٹ میں اس طرح مہین مہین "فول" لکھا تھا کہ جب تک اس کی خاص تلاش نہ ہو اس لفظ پر سرسری نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ مگر گُرو جی نے پہلی ہی نظر میں اسے دیکھ لیا۔ انھوں نے اس لفظ پر اُنگلی رکھ کر ناگر جی کی طرف دیکھا اور "فول" عجیب طرح زبان سے کہا۔ ناگر جی کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ دانت پیس کر بولے۔ "جس لڑکے نے یہ حرکت کی ہے اسے کالج سے فوراً نکال دینا چاہیئے!"

گُرو جی کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ منشی جی سے بولے "کاغذات لے جائیے، پھر دیکھوں گا!"

وہ جلدی سے کاغذات سمیٹ کر کمرے سے نکل گئے۔ گُرو جی اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ناگر جی کرسی پر سہمے بیٹھے رہے۔ وہ گُرو جی کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔ گُرو جی خاصے لمبے تڑنگے گورے چٹے آدمی تھے۔ بڑی سی لمبی داڑھی اور بڑی بڑی کاکلیں رکھتے تھے۔ ان کا لباس ہمیشہ لمبا

کیرا کرتا اور ہمدرد ہوتا تھا۔ سب اسی لئے انھیں پرنسپل صاحب کی جگہ گرو جی کہتے تھے۔ وہ برہمچاری تھے اور انھوں نے اپنا سب کچھ، تن من دھن اسی کالج میں لگا دیا تھا۔ سب اُن سے محبت کرتے تھے، سب اُن سے ڈرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اپنے طلبا اور مدرسوں کے معاملے میں ہمہ تن اخلاص تھے، اور اخلاص کے غصّے کی آنچ جلتے ہوئے جنگل کی آنچ سے بھی تیز ہوتی ہے۔

اس وقت گرو جی کی بڑی بڑی آنکھیں کبھی غصّے سے خون کبوتر ہو جاتی تھیں کبھی درد سے بجھے ہوئے کنٹلے کی طرح گرد آلود کالی۔ کبھی چہرہ مانجھے ہوئے پیتل کے رنگ کا ہو جاتا، کبھی پگھلتے تانبے کے رنگ کا۔ انھوں نے دونوں ہاتھ پشت پر رکھے ہوئے تھے۔ مگر انگلیاں بند ہو کر کبھی فولادی گھونسا بن جاتی تھیں، کبھی ڈھیلی پڑ کر سوسن کی پتیاں۔ وہ لمبے لمبے قدم رکھ کر کمرے میں ٹہل رہے تھے کہ دفعتہً ہال کا شور اُن کے کمرے میں بھی سنائی دینے لگا۔ وہ چونک کر ناگر جی کی طرف اس انداز سے مڑے اور ناگر جی کرسی سے یوں گھبرا کر کھڑے ہوئے کہ کرسی اُلٹ کر گر گئی۔ وہ اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو گرو جی بولے:

" رہنے دیجئے اسے۔ آپ ہال میں جا کر لڑکوں سے کہئے شور نہ مچائیں، میں آتا ہوں "

ناگر جی "بہت اچھا" کہتے ہوئے جلدی سے باہر چلے گئے۔ گرو جی نے گری ہوئی کرسی خود اٹھا کر ٹھیک جگہ پر رکھی، پھر اس سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے اور لمبی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھا کرنے لگے۔ دفعتہً انگلیاں ٹھوڑی کے قریب گال پر ایک جگہ ٹھہریں۔ وہ اس مقام پر کلے کی انگلی اس طرح پھیرنے لگے جیسے ماں گود میں سوتے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس کے سر کے نشیب و فراز ٹٹولنے لگتی ہے۔ ان کی نظر اُدھر مڑی جہاں اوٹ کے پیچھے منہ دھونے کا طشت اور صراحی اور گلاس رکھے تھے۔ انھوں نے گلاس میں پانی انڈیلا، چلو میں پانی لے کر منہ پر ڈالا، کھونٹی پر لٹکے ہوئے تولئے سے منہ ہاتھ پونچھا، دو گھونٹ پانی پیا اور ہال کی طرف روانہ ہوگئے۔

گرو جی کے داخل ہوتے ہی ہال میں سنّاٹا سا چھا گیا۔ سارے لڑکوں اور ٹیچروں نے کھڑے ہو کر تعظیم دی۔ ان کا معمول تھا وہ ہال میں داخل ہوتے تو مختلف لڑکوں سے خیر سلّا پوچھتے ہوئے اپنی میٹھی مسکراہٹیں بانٹتے اپنی کرسی تک جاتے تھے، مگر آج خلافِ معمول وہ گردن جھکائے سیدھے اس پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے جہاں صدر میں اُن کی جگہ تھی اور اردگرد دوسرے اُستادوں کی کرسیاں۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے سب کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود میز کے آگے آ کر سامنے کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے نظریں جھکائے جھکائے تقریر کرنا شروع کی:-

" انگریزوں سے جہاں ہم نے کچھ اچھی باتیں سیکھی ہیں، وہاں کچھ بُری باتیں بھی۔ انھیں میں سے ایک یہ "اپریل فول" والی بدعت بھی ہے، یعنی اس تاریخ کو اپنے کسی ساتھی یا دوست کو بے وقوف بنانا۔ یوں تو کسی کو بے وقوف بنانا ہی کوئی اچھی بات نہیں، اس لئے کہ اس کی تہہ میں بڑی خود بینی ہے یعنی ہم خود بڑے عقل مند ہیں۔ اور یہ خود بینی ہم سے ہماری سب سے بڑی ترقی کی آخری منزل کو چھین لیتی ہے، یعنی انسان بننا۔ اس لئے کہ انسانیت کی بنا انکسار پر ہے، ایثار پر ہے، قربانی پر ہے، نفس کشی پر ہے، نہ کہ خود بینی، خود سری اور خود سرائی پر! "

گرو جی رُک گئے۔ انھوں نے پہلی بار اپنے شاگردوں اور ماتحتوں پر بھرپور نظر ڈالی۔ سب کے چہروں پر حیرانی بھی تھی، سراسیمگی بھی۔ وہ آہستہ آہستہ بولے:-

" لیکن میں اس وقت کوئی لیکچر دینے نہیں آیا ہوں۔ میں تو تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم میں سے کس نے مجھے، اپنے باپ کو، بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے لڑکوں میں سے کوئی بھی اپنے کو اپنے استادوں اور مجھ سے زیادہ عقلمند نہیں سمجھتا، یہ صرف انگریزوں کی ریس میں مذاق کیا گیا ہے۔ گویہ مذاق " از ریش با باہم بازی " کے مترادف ہے۔ (اور گرو جی اپنی لمبی داڑھی میں انگلیاں پھنسا کر مسکرائے۔ سارے چہروں پر مسرّت کی ایک لہر دوڑ گئی) مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس گستاخی کی کوئی سزا نہیں دینا چاہتا۔ میں تو اپنے اس بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اب تک اپنے اور بدیشی طور طریقے کے فرق کو نہیں سمجھا ہے (وہ تھوڑی دیر پھر رُک گئے) ہاں، تو جس نے اکیلے یا جن لوگوں نے مل کر یہ مذاق کیا ہے انھیں سب کے سامنے آ کر کھڑا ہو جانا چاہیے۔ میں کچھ نہ کہوں گا، صرف اُن کے ساتھ مل کر ہنس لوں گا! بتایئے وہ کون صاحب ہیں؟ "

سب خاموش رہے، گرو جی کی آنکھوں میں مدھم سی چمک پیدا ہوئی وہ بولے:-

" مجھے دُکھ ہوا اس لئے کہ اب یہ مذاق جُرم کی حدوں میں آیا چاہتا ہے

تم کہو گے مذاق جرم کیسے بن سکتا ہے۔ تو میں اپنے تجربے کا ایک اور اپریل فول کا قصہ سناتا ہوں۔ دیکھو ہنسی مذاق کی بات کیسے دُکھ کی کہانی اور جرم کا مقدمہ بن گئی ۔۔۔ آج سے کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ ایک ہی درجے میں دو نوجوان پڑھتے تھے۔ کہانی سچی ہے اس لئے میں نام نہ بتاؤں گا۔ تم مان لو کہ ایک کا نام تھا مہیش، دوسرے کا سدھیشور۔ مہیش کروڑپتی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، خوبصورت بھی تھا، ذہین بھی، چال چلن کا بھی اچھا تھا، سیدھا اور نیک بھی۔ سدھیشور غریب زیادہ تھا۔ صورت و شکل میں آدمی کا بچہ تھا، ٹیوشن کر کے تعلیم کا خرچ چلاتا تھا اور ہر بات میں پیش پیش رہنے کا بڑا خواہش مند تھا۔ وہ ان لڑکوں میں تھا جو محض اپنی محنت اور اپنی کوشش سے دُنیا میں اپنے لئے جگہ بنا لیتے ہیں۔ بس اس میں ایک کمزوری تھی۔ وہ بہت زیادہ خود اعتمادی کا شکار تھا۔ مہیش جہاں مباحثوں میں، کالج کے الیکشنوں میں خاموش بیٹھا مسکرایا کرتا، سدھیشور وہاں ہر بحث میں حصہ لیتا، ہر چناؤ میں کھڑا ہوتا اور اکثر میں لڑ بھڑ کر کامیاب بھی ہو جاتا۔ دونوں میں نہ دوستی تھی نہ دشمنی، نہ چشمک، نہ رقابت نہ محبت نہ عداوت، بس کالج کا ساتھ تھا، جیسا کہ تم میں سے اکثر میں ہوگا۔"

گرو جی پھر رُک گئے۔ انھوں نے لمبی داڑھی میں پھر اُنگلیوں سے کنگھی کی۔

"یہی حالت تھی کہ دفعتاً کالج میں ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس کا نام رتنا مان لو۔ یہ لڑکی شہر کے ایک بہت ہی متموّل اور معزّز خاندان کی فرد تھی۔ اس نے انگریزی اسکولوں میں تعلیم پائی تھی اور سینیئر کیمبرج میں اوّل آئی تھی۔ صورت شکل گویا بھگوان نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی۔ انگریزوں کی پڑھائی ہوئی، متموّل، حسین، ذہین رتنا تھوڑی سی گھمنڈی بھی تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی بھگوان نے اسے سب کچھ دے دیا تھا۔ وہ تو آکسفورڈ، کیمبرج میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن ماں باپ آنکھوں کے تارے کو نظر سے دُور رکھنا نہ چاہتے تھے اس لئے مجبوراً ہندوستانی یونیورسٹی میں اسے پڑھنا پڑا۔ وہ بھلا کالج کے لڑکوں کو کیا خاطر میں لاتی۔ مگر ہر لڑکا اسی کا خواہش مند کہ ہمارا رتنا سے ضرور تعارف ہو جائے۔ ہم اس سے قریب سے جا کر دُو بدُو دو باتیں کر لیں۔ اور وہ تھی کہ سوائے دو ایک منتخب سہیلیوں کے کسی سے باتیں تک نہ کرتی۔ لڑکوں میں سے دے کے بس ایک مہیش تھا کہ سلام پیام ہو جاتا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ دونوں گھرانوں میں بڑا تا میل تھا اور شاید والدین کے دلوں میں یہ خواہش بھی تھی کہ دونوں پڑھ لکھ لیں، اور ایک دوسرے کو پسند بھی کریں تو ان کا رشتہ بھی کر دیا جائے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مہیش کے دل میں اس رشتے کی کوئی خواہش نہ تھی، مگر یہ ضرور تھا کہ فطرتاً اُس کے احساس میں شدّت نہ تھی، اس لئے رتنا سے شادی و یگانگی میں بھی کوئی تیزی اور گرمی نہ تھی۔ اس ایک طرح کی سرد مہری کا باعث رتنا کا گھمنڈ بھی تھا۔ اس کے ہاں وہ احساسِ برتری تھا کہ کوئی نظروں میں سماتا ہی نہ تھا۔ ادھر مہیش کو یہ فکر کہ اس طرح کی لڑکی کو پتنی بنانا کہیں زندگی کے سکون میں تلاطم کا باعث تو نہ بن جائے گا۔ اور تلاطم سے وہ ہمیشہ ڈرتا اور گھبراتا تھا۔ اس لئے حُسن و دولت جہاں اسے رتنا کی طرف کھینچ کر قریب لاتے، غرور و تیز زبانی اسے ٹھوکر مار کر پیچھے ہٹا دیتے۔ مگر وہ ان باتوں پر غور کرنا بھی ناپسند کرتا تھا، اس طرح کی فکریں زندگی کو پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔ اور وہ پیچیدگیوں سے دُور ہی رہنا چاہتا تھا اس لئے وہ خاموشی سے رتنا کے خواہش مندوں کے ہجوم کو دیکھنے لگا۔ اور اس ہجوم میں سدھیشور اپنی فطرت کے مطابق پیش پیش تھا۔ اس نے رتنا کو ہمیشہ دُور ہی سے دیکھا تھا۔ وہ موٹر سنبھالتی کالج میں آتی، کلاسوں میں جاتی خالی گھنٹوں میں سہیلیوں کے جھرمٹ میں رہتی اور کالج ختم ہوتے ہی موٹر اڑاتی گھر چلی جاتی۔

مگر دل دینے والوں کو تو کوئی روک نہیں سکتا۔ سدھیشور نے رتنا کو دل دیا اور بہت زور شور سے دل دیا۔ اور اس کی یہ پریم کہانی سارے کالج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لڑکوں نے اس سے فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔ کوئی کہتا رتنا کی فلاں سہیلی سے مجھ سے تعارف ہے، مجھے مٹھائی کھلاؤ تو میں تم کو اس سے اپنی دوست کے ذریعہ ملا دوں۔ کوئی کہتا رتنا کو تقریر کرنے کا بڑا شوق ہے تم میری دعوت کرو تو اب کے مباحثے میں اسے شریک کرا دوں۔ اور سدھیشور جھٹ ایسوں کی خاطر مدارات شروع کر دیتا۔ یہی نہیں بلکہ یاروں نے رتنا کا واسطہ دے کر اس سے رومال، موزے، سوئیٹر تک لینا شروع کر دئے۔ ہوشیار سدھیشور اب اس پریم کی خاطر ہر طرح بے وقوف بنایا جا سکتا تھا۔ مہیش نے بھی ان بے وقوفیوں سے لطف لینا شروع کیا۔ امتحان سر پر تھا۔ مارچ کا آخری ہفتہ تھا، مطالعے کی تھکن دماغ سے دُور کرنے کے لئے یہ اچھی خاصی تفریح ہاتھ آئی تھی۔ اس نے سوچا لاؤ ذرا میں بھی سدھیشور کو بے وقوف بناؤں۔ ایک خط ٹائپ کرا کے سدھیشور کے پاس بھجوا دیا۔ یہ ایک دعوت نامہ تھا رتنا کی طرف سے۔ مضمون یہ تھا کہ میں نے چند سہیلیوں

کو ہمیشہ ہاں چار بجے پہلی اپریل کو چاء پر بلایا ہے۔ آپ بھی، گر تشریف لائیں تو زہے قسمت!

یہ خط کیا ملا، سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ سدھیشور سمجھے نہ سمایا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے پارٹی میں شرکت کے لئے اپنی بساط سے زیادہ تیاری شروع کر دی۔ آخری ٹرم کی اب تک فیس نہ دی تھی اس کے لئے کچھ روپیوں کا بندوبست کیا تھا۔ وہ سب اسی کی نذر ہو گئی۔ نیا سوٹ بنوا ڈالا، نئی قمیص، نئے جوتے موزے، ٹائی خرید لی۔ یار دوستوں کو ایک آدھ دعوتیں بھی کھلا دیں، سنیما بھی دکھا دیا۔ ایک نے دبی زبان کہا بھی کہ "یار کہیں اپریل سے تمہیں اپریل فول نہ بنایا ہو!" مگر وہ سودائی ہنس کر بولا۔ "تو بہ قسمت اگر رتنا اپریل فول بنائے!"

اُدھر لڑکی کو کوئی خبر نہیں کہ کیا گل کھلنے والا ہے۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس کے ہاں پہلی کو چار بجے سے بیڈمنٹن کھیلنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ تین بجے ہی کالج سے چلی گئی۔ گھر پہنچی تو ماں نے اصرار کر کے اون خریدنے بازار بھیج دیا۔ وہ اسی کے لئے نیا سوئٹر بُن رہی تھیں۔ اندازہ سے زیادہ ایک لچھی کی اور ضرورت پڑ گئی۔ رتنا ہی یہ اون لائی تھی۔ اب بقیہ اون بھی وہی لا سکتی تھی اس لئے رتنا کو جانا ہی پڑا۔

سُدھیشور دو ہی بجے سے گھر جا چکا تھا۔ گھر کیا تھا، کرائے کا ایک کمرہ تھا۔ ماں باپ سورگ باش ہو چکے تھے دوسرے اعزا دیہات میں رہتے تھے۔ وہ خود یہاں اکیلا رہتا، ٹیوشن کرتا اور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کر نیا سوٹ پہنا، چھوٹی سی میز پر آئینے کو کتابوں کے سہارے لگا کر ٹائی باندھی، خیال ہوا صبح کے شیو سے چہرے میں وہ چمک نہیں پیدا ہوئی جو ایسے موقع کے لئے ضروری ہے، اس لئے پھر سے شیو کیا۔ کریم لگائی ہلکا سا پاوڈر لگا کر چہرے کے رنگ کو کسی قدر صاف بنانے کی کوشش کی اور سینٹ لگے ہوئے رومال کو تین تہہ موڑ کر سینے پر جیب میں رکھا۔ آئینے میں پھر بیسیوں دفعہ اپنے کو دیکھ کر کچھ مطمئن ہوا اور سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے نکلا، جست لگا کر اپنی سائیکل پر بیٹھا اور مسکراتا ہوا کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔

رتنا کی کوٹھی بڑی شاندار تھی۔ آہنی پھاٹک سے آگے روشیں، دونوں طرف پھولوں کی جھاڑیاں، بیچ میں سبزے سے لہکتا لان۔ پورٹیکو میں ایک بڑی سی موٹر کھڑی ہوئی۔ عمارت سہ منزلہ، بلند کرسی۔ ہر طرح شاندار۔ آتے جاتے جو نوکر، خانساماں دکھائی دئے وہ سب زرق برق وردیوں میں بِلّے لگائے۔ سدھیشور کے جی میں ڈر سمایا۔ یہ میں اپنی پُرانی چُوں چُوں کرتی سائیکل لئے کہاں چلا جا رہا ہوں۔ اس نے سائیکل پھاٹک کے قریب پھولدار ٹٹی سے لگا کر کھڑی کر دی اور پیدل ہی آگے بڑھا۔ برآمدے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ایک بل ڈاگ نما ڈبل کتا بھونکتا ہوا جھپٹا۔ قریب تھا کہ سدھیشور کے منھ سے ہیرج نکل جائے کہ ایک نوکر نے برآمدے ہی سے ڈانٹا۔ "کیا کرتا ہے ٹامی"۔ کتا تو رُک کر وہیں بیٹھ گیا۔ ملازم نے سدھیشور پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ "کس کو مانگتے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

سدھیشور نے زبان خشک لبوں پر پھیر کر پوچھا "مس صاحبہ ہیں؟"

اس نے کہا "نہیں" اور اس طرح دوسری جانب قدم بڑھائے جیسے وہ سدھیشور سے مزید گفتگو کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔

سدھیشور نے قدرے گڑگڑا کر کہا۔ "بھائی انھوں نے مجھے چاء پر بُلایا تھا۔"

ملازم مُسکرایا۔ اس نے نام پوچھا اور سُدھیشور کا نام سنتے ہی اُس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔ اس نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

"جی مس صاحبہ تو نہیں ہیں۔ لیکن ایک صاحب اور آئے تھے وہ آپ کے نام یہ چٹھی دے گئے ہیں۔"

سدھیشور نے جلدی سے خط چاک کر کے دیکھا۔ لکھا تھا۔ "میاں سدھیشور یہ مُنہ اور گل گلے! یہ اپریل فول ہے!"

سدھیشور کا ہاتھ اس طرح کانپا کہ خط زمین پر گر پڑا۔ کُتا پھر بھونک کر آگے بڑھا۔ نوکر نے جلدی سے گردن کے پٹے میں انگلیاں ڈال کر اُسے روکا۔ سدھیشور جلدی سے بھاگا۔ نوکر کی ہنسی اور کتے کی بھونکنے کی آواز پر "اپریل فول! اپریل فول!" کی آواز غالب تھی۔ اسے محسوس ہوتا وہ روش پر نہیں چل رہا ہے انگاروں پر چل رہا ہے۔ پھولوں کی ٹہنیوں میں پھول کی جگہ کانٹے ہی کانٹے نظر آتے تھے۔ سائیکل تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ اس نے ٹرم کی فیس نہ دی۔ اس نے سوٹ بنوا ڈالا۔ اس نے ایک پیالی چائے کی امید میں کتنی دعوتیں کھلائیں، کتنے پیسے اُٹھائے۔ پھر کالج بھر اب اس پر ہنسے گا۔ "یہ مُنہ اور گل گلے!" واقعی سچ ہے، اتنی بڑی کوٹھی میں رہنے والی رتنا

اور وہ جس کے پاس اپنا کوئی گھر بھی نہیں! اسے بھاگ نکلو یہاں سے رتنا نہ کہیں آ جائے۔ وہ کچھ سمجھ سکتا تھا اپنی سائیکل پر بیٹھا اور جلدی جلدی پاؤں مار کر تیزی سے بنگلے سے نکلا۔ آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسوؤں نے راستے پر ایک پردہ سا چھوڑ رکھا تھا۔ کانوں میں "اپریل فول! اپریل فول!" کی آواز نے بہرا سا بنا دیا تھا۔

رتنا نے اولی کی بھی خریدتے خریدتے گھڑی جو دیکھی تو چار بجنے میں دس منٹ۔ اور ٹھیک چار بجے بیڈمنٹن کھیلنے کا وعدہ۔ نہ ابھی غسل کیا، نہ لباس بدلا۔ ماتا جی بھی بعض دفعہ ایسے ناوقت کام دے دیتی ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔ بس ان کا کام ہونا چاہیئے۔ اس میں چاہے کوئی جھوٹا بنے یا وعدہ خلاف۔ وہ جھنجھلاتی ہوئی موٹر پر بیٹھی اور اسے تیز کر کے بھاگی۔ چوراہے کے پولس والے نے ہاتھ دکھا کر اسے روکنا چاہا۔ مگر رتنا ایسے وقت بھلا کسے کیا دھیان میں لاتی۔ اس نے "ہش" کیا اور ایکسی لیریٹر کو پاؤں سے اور دبا دیا۔ راستے میں تانگوں، موٹروں، بسوں، رکشاؤں اور آدمیوں سے ٹکرانے سے بچنے میں اپنی مہارت دکھاتی ہوئی وہ اسی طرح موٹر تیز چلاتی رہی۔ گھر کے قریب پہنچ کر سڑک صاف ملی۔ اب تو رفتار کی سوئی اسی اور نوے میل فی گھنٹہ کا پتہ دینے لگی۔ چھوٹی موٹر اب سڑک پر چل نہیں رہی تھی اُڑ رہی تھی۔ اپنے پھاٹک سے قریب کوئی دو سو گز پر سائیکل دکھائی دی۔ رتنا نے زور سے ہارن بجایا۔ مگر سائیکل والا اندھا بھی تھا بہرا بھی۔ نہ وہ ہارن سنتا تھا اور نہ اسے موٹر ہی دکھائی دیتی تھی۔ صاف اپنے داہنے سے چلا آ رہا تھا۔ موٹر جب سر پر پہنچ گئی تو جیسے ہوش میں آیا۔ اس نے جلدی سے سائیکل داہنی جانب سے بائیں جانب موڑ دی۔ مگر موٹر پہلے ہی اس سے بچنے کے لئے اپنی داہنی جانب مڑی جا چکی تھی۔ بس ایک چیخ سنائی دی اور موٹر سائیکل اور سدھیشور کو چور کرتی گزر گئی۔ جب رتنا نے اپنے پھاٹک سے ٹکرا کر موٹر روکی تو وہ خود تو سدھیشور کی طرف دوڑی اور نوکر "کیا ہوا بی بی" کہتے اس کی طرف لپکے۔ سدھیشور خاک و خون میں لت پت بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے سدھیشور کو نوکروں کی مدد سے موٹر پر لادا اور راستے سے کر اسپتال بھاگی۔ وہاں ڈاکٹروں نے پہلے پولیس کو اطلاع کی جب وہ پہنچ کر بیان لے چکے تب انھوں نے سدھیشور کو ہاتھ لگایا۔ اتنے میں حلقے کے پولیس انسپکٹر بھی آ گئے۔ ان کو چوراہے کے سپاہی کی رپٹ مل چکی تھی۔ انھوں نے کہا۔ "مس صاحبہ آپ مجرم ہیں، تھانے چلیے۔" اور وہاں سے جا کر اسے "لاک اپ" میں بند کر دیا۔ بوڑھے باپ نے مجسٹریٹ کے ہاں جا کر دس ہزار کی ضمانت کی تو رتنا وہاں سے چھوٹی۔ باپ کہتے تھے اب سیدھے گھر چلو، مگر وہ چل گئی کہ اسپتال پہلے جاؤں گی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کئی اپریشن کئے گئے، سیکڑوں جگہ سیا ٹانکا گیا مگر دماغ کی چوٹ کا کوئی علاج نہیں۔ اکسرے کل سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ مریض کو دوائیں دی جا رہی ہیں، خون بھی پہنچایا گیا ہے، انجکشن بھی دئے گئے ہیں، مگر بالکل مُردہ سا بے جان پڑا ہے۔ مہیش بھی آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا، منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، آنکھوں میں شرم و ندامت کا درد تھا۔ اس نے رتنا کی حالت دیکھ کر اس کے پتا جی سے کہا۔ "انھیں یہاں سے لے جائیے۔ میں نے کلکتہ اور بمبئی کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو تار دے دیا ہے وہ ہوائی جہاز سے آ رہے ہیں۔ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کچھ سدھیشور کو بچانے کے لئے کیا جائے گا!" اور رتنا نے عمر میں پہلی اور آخری بار مہیش کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور باپ کے ساتھ سر نہوڑائے چلی گئی۔

دوسرے دن باہر کے ڈاکٹر بھی آئے۔ اکسرے بھی ہوا مگر کسی کا کوئی بس نہ چلا۔ سر کی ہڈی کاٹی جاتی تو شاید کوئی مداوا ہو سکتا، اس کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ سدھیشور برابر بے ہوش پڑا رہا۔ بس کبھی کبھی کراہ کے ساتھ رتنا کا نام لیتا، کبھی کبھی "اپریل فول! اپریل فول" کہہ کر زیادہ بلند آواز سے چیخ اٹھتا۔ یہی حالت برابر تین دن رہی۔ چوتھے دن ذرا سی دیر کے لئے ہوش میں آیا۔ مہیش کو پٹی سے لگا بیٹھا دیکھا۔ اٹک اٹک کر پوچھا۔ "موٹر کون... چلا رہا تھا؟"

مہیش نے کہا "رتنا"۔

سدھیشور کے چہرے پر خون جھلک آیا۔ وہ بولا "جیل سوامت بھائی" اور پولیس کو یہ بیان دے کر کہ قصور میرا تھا، موٹر ڈرائیور کا نہ تھا، مسکراتا ہوا مر گیا —— مگر وہ جی کی آواز بھرا گئی۔ وہ کانپنے لگے۔ انھوں نے دونوں ہاتھ میز پر سہارے کے لئے ٹیکے۔ پھر ایک ہاتھ سے جیب سے رومال نکال کر انھوں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ پھولتی ہوئی سانس کو قابو میں کیا۔ اور آہستہ آہستہ بولے:

"رتنا تین راتوں سے سوئی نہ تھی۔ بس گھڑی گھڑی کی خبر منگاتی رہتی تھی۔ اس نے سہیلیوں کی زبانی سدھیشور کے پریم کی کہانی بھی سُنی

لائق اور طلائم ہے اس "اپریل فول" کا قصہ بھی جو مہیش کی کارستانی تھی۔ جب اس نے سدھیشو کی موت کی سناؤنی سنی تو ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ اور جب ہوش میں آئی تو پاگلوں کی سی باتیں کرنے لگی۔ چھ مہینے رانچی کے اسپتال میں رکھی گئی۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے علاج کیا جب جا کر ٹھیک ہوئی۔ اُن سب کا کہنا تھا کہ اس کا جلد سے جلد بیاہ کر دینا چاہیئے۔ مگر اب تو شہر بھر میں مشہور تھا کہ اس نے ایک لڑکے کا خون کیا پھر پاگل بھی ہے۔ کون اس سے شادی کرتا۔ مہیش کے ماں باپ تک نے اس سے بُلا کر کہا۔ "مہیش جی اس لڑکی کا خیال دل سے نکال ڈالو، ہم ایسی لڑکی لا کر اپنے خاندان کا خون خراب نہ کریں گے!" مگر مہیش تو سب کچھ جانتا تھا۔ وہ اب تنہا تابلے پرعا مرغاں مرغ مہیش رہ گیا تھا۔ وہ خود اپنے کو خونی سمجھتا تھا اور ترنا کے پاگل پن کا ذمہ دار۔ اسی نے تو اپریل فول منا کر یہ سب آگ لگائی تھی۔ اس لئے وہ ماتا پتا کے حکم کے خلاف سیدھا ترنا کے ہاں پہنچا۔ اور اس کے ماں باپ سے مل کر شادی کا پیغام دے دیا۔ وہ دونوں اسی حیص بیص میں تھے کہ ہامی بھر لیں یا انکار کر دیں کہ ترنا آ گئی۔ لٹ چھٹکائے، داغدار ساڑھی پہنے، دیدے نکالے، گھورتی ہوئی آئی اور اس کی نظر مہیش پر پڑ گئی۔ بس جیسے سر پر بھوت سوار ہو گیا۔ وہ دانت پیستی مہیش پر جھپٹی۔ "کیوں آیا تو رے خونی! کیوں آیا!" اور اس نے مہیش کے منہ پر تھوک دیا۔ "دُور ہو یہاں سے دُور ہو!"۔ اور جب اس کے ماتا پتا کے اشارے پر مہیش جلدی سے اپنی موٹر میں بیٹھ کر اس بنگلے سے نکلا تو وہ چیخ رہی تھی "ماتا جی! ماتا جی! میرے ہاتھ دھلواؤ ماتا جی! میرے ہاتھ دھلواؤ ماتا جی! میرے ہاتھ! دیکھتی نہیں ہو! اس میں خون بھرا ہے!....."

اور اس کی چیخ بند ہو کر اس کے گلے سے ایک ایسی آواز نکلی جسے سسکی بھی کہہ سکتے ہیں اور ہنسی بھی جسے سن کر مہیش کا جی چاہنے لگا کہ وہ اپنا گریبان پھاڑ ڈالے، وہ اپنا سر پھوڑ لے! اس نے بنگلے سے موٹر تیز نکالی۔ پھر اسے آہستہ آہستہ کر لیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ تھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے گال پر تھوک! اپریل فول کا تھوک!"

گرو جی رُک گئے۔ کچھ بچے رو رہے تھے، کچھ لڑکے آنکھیں پونچھ رہے تھے اور مدھو اور مشتاق ایک دوسرے کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور گرو جی کا ہاتھ پھر داڑھی میں چھپے ہوئے گال کو سہلا رہا تھا۔ ناگر جی نے زور سے رومال میں ناک صاف کی۔ گرو جی چونکے۔ انھوں نے ایک لمبی، سینے میں کھٹکتی سانس لے کر کہا۔

"تو بیٹا دیکھا تم نے مذاق کیونکر ایک المیہ بن گیا اور ایک جسم! اس لئے آج کے مذاق کو جرم نہ بننے دو! مذاق کرنے والے کو ہمت سے کام لینا چاہیئے اور سب کے سامنے اقرار کر لینا چاہیئے۔ بزدل نہیں ہنس سکتا۔ صرف دلیر ہی کو ہنسنے کا حق ہے!"

مشتاق اور مدھو ایک ساتھ آ گئے اور گرو جی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"گرو جی! یہ ہم دونوں کی کارستانی ہے!"

قبل اس کے کہ گرو جی کچھ کہیں ناگر جی بول اُٹھے۔ "نہایت نالائق ہیں یہ دونوں! ان کو کالج سے یقیناً نکال دینا چاہیئے!"

گرو جی نے اُن کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور دونوں لڑکوں کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جاؤ، میں نے معاف کیا۔ پھر بے سوچے سمجھے کسی سے عملی مذاق نہ کرنا!"

دونوں نے جھک کر گرو جی کے پاؤں چھوئے۔ گرو جی نے اُن کی پیٹھ تھپ تھپا کر دوسرے لڑکوں سے کہا۔

"اچھا اب تم لوگ بھی درجوں کی جگہ کھیل کے میدانوں میں جاؤ۔ آج دن کی چھٹی تو تمھیں پڑھنے سے ان بے وقوفوں نے دلا ہی دی۔ جاؤ اسے کرکٹ، والی بال، فٹ بال وغیرہ کی نذر کرو!"

لڑکوں نے تالیاں پیٹیں۔ مدھو سودن نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "گرو جی کی جے!" لڑکوں نے ہنس کر ایک ساتھ دہرایا۔ "گرو جی کی جے!"

ایک لڑکے نے سب کے پیچھے چھپ کر آواز لگائی "اپریل فول کی جے!" لڑکوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے مڑ کر اودھر دیکھا مگر وہ چھپ گیا۔

گرو جی نے مسکرا کر کہا "مسخرے!" اور انھوں نے ناگر جی کے نتھنے پھولتے ہوئے دیکھ کر اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "جانے بھی دیجئے ناگر جی، یہ تو دن ہی ان بے وقوفوں کا ہے!"

محمد علی خاں آتش

غزل

الفت میں احتیاط بھی اب چارہ گر کہاں — پہنچی دلوں کی بات نظر در نظر کہاں

وہ دل کہاں، خیال کہاں، وہ نظر کہاں — دیکھا انھیں تو پھر رہی اپنی خبر کہاں

کنجِ قفس میں ذکرِ نشیمن نہ چھیڑیے — یوں تو ہیں بال و پر بھی مگر بال و پر کہاں

نظریں اٹھیں نہ تھیں کہ گریں دل پہ بجلیاں — لایا ہے کھینچ کر مجھے ذوقِ نظر کہاں

دل کیا کہ کائنات دھواں دھار ہو گئی — تو ہی بتا گری تری برقِ نظر کہاں

اللہ رے کرشمۂ حسنِ نظارہ سوز — جلوے تو عام ہیں مگر اذنِ نظر کہاں

جب دور سے چلا تو اٹھا ہر طرف سے شور — ساقی ادھر کہاں، مرے ساقی ادھر کہاں

بیٹھے بٹھائے دل میں آتش کے لگا کے آگ
دامن بچا کے جاتا ہے او فتنہ گر کہاں

وجاہت افروز

شاعری

گہر ہوں کے لب کا ذکرِ معرفت — بُت شکن ذہنوں کا ذوقِ بُت گری

محفلِ قرطاس کا نازک چراغ — گرمیٔ جذبات کی صورت گری

لفظ و معنی کا سمندِ برق پا — فکر و احساسات کی جادوگری

ہمتِ نازک کا عزمِ بے پناہ — ذرۂ مجمل کا گمانِ داوری

ابتدائے نورِ تخیلِ بشر — انتہائے عرشِ چرخِ چنبری

گاہ درسِ مکتبِ عجز و نیاز — گاہ تعلیمِ غرور و خود سری

گاہ اعجازِ نگاہِ پُر سکوں — گاہ طوفانِ ادائے دلبری

گاہ تشبیہِ غبارِ کارواں — گاہ تمثیلِ طریقِ رہبری

گاہ تقدیسِ حجابِ لامکاں — گاہ تخریبِ نقوشِ آذری

ماورائے فاعلاتن فاعلن
شاعری جزویست از پیغمبری

خورشید احمد جامی

صبحِ نو

ہمارے عزم سے پیدا نیا ہندوستاں ہوگا — مقدر وقت کے آغوش میں پل کر جواں ہوگا

رُخِ تہذیب کا غازہ، شفق کی سرخیاں ہوں گی — تمدن کے حسیں عارض پہ نورِ کہکشاں ہوگا

زمیں کھیتوں کی صورت میں خزانوں کو اگائے گی — حقائق پر سنہرے مست خوابوں کا گماں ہوگا

دلِ فولاد پگھلے گا، مشینیں گنگنائیں گی — حیات و ارتقا کا نقش نقشِ جاوداں ہوگا

ٹٹولا جائے گا ذروں کا دل، کہسار کا سینہ — شعورِ زندگانی بجلیوں پر حکمراں ہوگا

ملے آرا، خم بہ خم جیسے کسی محبوب کے گیسو — نشاط انگیز رومانی کارخانوں کا دھواں ہوگا

بدل جائیں گے دریاؤں کے رُخ موسم کے افسانے — غرورِ وقت پر چھایا ہوا عزمِ جواں ہوگا

وطن کی سرزمیں پر صنعتوں کا بانکپن ہوگا — نگاہِ شوق کے آگے بہاروں کا سماں ہوگا

نظر افروز صحراؤں میں تالابوں کے ہونٹوں پہ — سرود و کیف کا، نغموں کا سیلابِ رواں ہوگا

چمن شاداب ہوگا، صبحِ عشرت گنگنائے گی — نہ غم کی بجلیاں ہوں گی نہ فاقوں کا نشاں ہوگا

مقدر وقت کے آغوش میں پل کر جواں ہوگا
ہمارے عزم سے پیدا نیا ہندوستاں ہوگا

شفا گوالیاری

غزل

حجابِ سادہ اُن کی بے حجابی ہم نے دیکھی ہے — شبِ آخر گلوں کی نیم خوابی ہم نے دیکھی ہے

سوالِ دید پر کیا حشر اٹھا ہم بتائیں گے — نگاہِ نازنیں کی حاضر جوابی ہم نے دیکھی ہے

مآلِ سوزِ الفت پر نہ کیونکر اشک بھر آئیں — سحر کو شمع کی حسرت مآبی ہم نے دیکھی ہے

اک ایسا دور بھی گزرا تری چشمِ عنایت سے — کہ تا حدِ نظر ہر شے گلابی ہم نے دیکھی ہے

نہ جانے کیا معمہ ہے کہ میدانِ محبت میں — ہمیشہ حسن ہی کی کامیابی ہم نے دیکھی ہے

جہاں سے چاند سورج کو بھی رنگِ نور ملتا ہے — محبت کی وہاں تک باریابی ہم نے دیکھی ہے

اٹھی غنچوں کے لب سے تو گلوں کے قلب جاگ اٹھے
شفا اُن کی پراگندہ نقابی ہم نے دیکھی ہے

انوار احمد سوپاپوری

تحریکِ بھودان

" زمین خدا کی ہے اور انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ اس پر اپنا قبضہ جمائے رہے ہاں وہ صرف خدا کے نائب یا غلام کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ لیکن وہ اس مذکور حقیقت کو فراموش کر بیٹھا ہے اور خود کو زمین کا مالک تصور کرتا ہے، حالانکہ اس کا یہ قبضہ عارضی طور پر ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں کا بھی حق تسلیم کرے جن کے پاس زمین نہیں ہے۔ اور انھیں اپنی زمین میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دے دے" (ونوبا بھاوے)

آزادی کے دور میں حریتِ اظہارِ رائے بڑی اہمیت اور افادیت کی حامل ہوتی ہے۔ بلکہ یہی چیز دراصل آزادی کی بنیاد اور اساس ہے۔ جہاں کہیں خونی انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ وہاں اسی قسم کے "مخالف انقلاب" کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ اور اس طرح انقلاب تو رونما ہوتا ہے مگر اس کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کسی سماج میں بنیادی اور ضروری تغیّرات ہی اس سماجی عمارت کی شکل سرے سے بدل دیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک نیا سماج، ایک نیا معاشرہ جنم لیتا ہے یا بالفاظِ دیگر سماج میں اخلاقی اور ذہنی انقلاب ایک مستحکم اور پائدار صورت پیدا کر دیتا ہے اور اسی انقلاب کو ونوبا جادوئے انقلاب کی اصل روح قرار دیتے ہیں، اور اسے دھرم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد ملک میں جس نوعیت کا نظام قائم کرنا مقصود تھا اس کے حصول کی کامیابی میں "تحریکِ بھودان" ایک افادی پہلو رکھتی ہے حکومت کو اس نظام کے تخلیق کے لئے کئی سال بیت جائیں گے۔ مگر بھودان اس تقاضے کو جس سرعت سے پورا کر رہا ہے وہ نہایت ہی حوصلہ افزا اور اُمید افزا ہے۔ یہ ایک دلیر انسان کا جہاد ہے، اپنے ملک قوم کی خاطر اچاریہ ونوبا بھاوے نے اس انقلابی تحریک کا نام "بھودان یوجنا" رکھا ہے۔ یہ لوگوں سے ایک اپیل ہے اور اس جذبۂ "تحریص" کو نیست و نابود کرنے کی کوشش ہے جو قدرتی طور پر انسانی قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح گویا انسان کے اندرونی جوہر ابھر کے کار آتے ہیں۔ اور اس دولت سے جس پر چند انسانوں کا قبضہ ہوتا ہے سب انسان یکساں مستفیض و فیض یاب ہوتے ہیں۔ اور اس عمل کو دان یا مسلوی حق کے نام سے نوازا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس تحریک پر بڑا شور و غل مچایا اور اسے بھیک یا بھکشا کہنے لگے۔ لیکن ونوبا جی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ بھکشا نہیں ہے بلکہ دکشا" Deeksha ہے۔ یعنی نئی زندگی کی خوش خبری یا حیاتِ نو کی پکار ہے۔ دان Dan کے لغوی معنی دولت کا سب انسانوں پر برابر تقسیم ہونے کے ہیں۔ پھر اسے بھیک سے تعبیر کرنا سراسر غلطی ہے۔

ہندوستان اپنی عظمتِ رفتہ کی طرف بڑی سرعت سے بڑھ رہا ہے۔ اور اب "تحریکِ بھودان" ہندوستان کی طرف سے دنیا کو جو ایک نازک ترین دور سے گزر رہی ہے ایک نایاب تحفہ ہے۔ الغرض ہندوستانی بلکہ بیرونی ممالک کے عوام بھی اس اقتصادی تحریک کو بڑی اُمید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس دور کی سب سے عظیم تحریک یا مسلک (کمیونزم) کے علمبردار انگشت بدندال ہیں کہ اس مادّی دور میں "روحانیت" Spiritualism معاشی ضروریات کو کیوں کر پورا کر سکتی ہے۔ لیکن "تحریکِ بھودان" کو کسی ایک ہی پہلو سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ بلکہ اس تحریک کی اصل تعلیم یہ ہے کہ اگر جنگ سے گریز کرنا مقصود ہے۔ سماجی قباحات سے بچنا ہے تو لازمی ہے کہ انسان اپنی ہر مرضی کے پورے ہونے کے جذبہ کو بالکل ختم کر دے۔ کوئی شے حاصل کرنے کی خواہش ہر انسان کو ہوتی ہے، لیکن اپنے پاس سے کسی چیز کو صرف کرنے

ہیں اسے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ کیوں؟

مہاتما گاندھی ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء نظربندی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ اسی دور میں انھیں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ آزاد ہندوستان میں "زمین" کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا۔ کیوں کہ جاگیردارانہ نظام نے زمین کے صحیح مصرف کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اکثر و بیشتر زمین ناکارہ اور بلا کاشت کے پڑی رہتی تھی۔ حالاں کہ یہی زمین اگر حاجت مندوں میں تقسیم کردی جائے تو وہ خود محنت اور مشقت کریں گے اور ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ اس سلسلے میں مہاتما گاندھی نے کئی بار ذکر بھی کیا۔ مگر فلک کج رفتار نے اُن کو ہم سے چھین لیا۔ لیکن ان خیالات کو ونوبا بھاوے نے عملی صورت دے دی اور وہ خود گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔

اگر پنڈت نہرو نے قیام و استحکامِ امنِ عالم کے لئے "پانچ اصول" دُنیا کے مدبرین کے سامنے پیش کئے تو ونوبا بھاوے نے تحریکِ بھودان پیش کرتے ہوئے دُنیا کو بتلادیا کہ "اقتصادی انقلاب" لانے کے لئے انسان کے دماغ میں تبدیلی ضروری ہے۔ اور اس کے سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے ڈھنگ کو ایک نرالا انداز دیا چاہئے۔

ونوبا جی نے گاندھی جی کے خیالات کو نالگونڈا ضلع کے ایک گاؤں پوچامپلی (تلنگانہ) میں عملی صورت دی اور اس کے محرک وہ چالیس اچھوت تھے جو غربت کے شکار، مفلس و نادار تھے۔ اُنھوں نے اپنی تمام مشکلات اور ضروریات کا مفصل ذکر ونوبا جی سے کردیا اور آچاریہ جی نے اسی دن شام کو جب کہ گاؤں کے تمام زمیندار عبادت گاہ میں جمع ہوئے تھے اعلان کردیا کہ

"اگر تمھارے پانچ بچے ہیں اور ایک اور بچہ جنم لیتا ہے تو تم اپنی ساری ملکیت میں اس کا اتنا ہی حق سمجھتے ہو جتنا پہلے پانچ بچوں کا ہوتا ہے تو تم مجھے اپنا چھٹا بچہ سمجھو اور مجھے اپنی جائداد میں سے $\frac{1}{6}$ حصّہ دے دو۔"

یہ فقرے کچھ ایسے موثر انداز میں ان کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ مجمع میں سے ایک بڑا زمیندار اُٹھ کھڑا ہوا اور کہہ اٹھا۔۔۔

"ہاں تو میرا بیٹا ہے اور میں نے تجھے سو ایکڑ زمین دے دی۔"

ونوبا جی نے اسّی ایکڑ زمین ان چالیس اچھوتوں پر برابر برابر تقسیم کردی اور بقیہ بیس ایکڑ زمین اس زمیندار کو لوٹا دی۔

اپنی زمین کا $\frac{1}{6}$ حصّہ بھودان میں دینا اس انقلابی تحریک کی ابتدا ہے۔ اور اس کے بعد اصل مقصد تو سارے گاؤں کی زمین کو اس گاؤں کے تمام رہنے والوں پر ان کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرنا ہے جسے "گرامی دان" کہتے ہیں۔ اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے میں کسی فرد یا کسی زمیندار پر جبر یا زبردستی نہیں کی جائے گی اور یہی بات اس تحریک کے پھلنے پھولنے کی ضامن ہے۔ منگروٹھ (اُتر پردیش) سب سے پہلا گاؤں ہے جو "گرامی کرن" کے تحت وہاں کے باشندوں پر ان کی حاجت اور ضروریات کے مطابق تقسیم ہوا۔ وہاں کے جملہ زمینداروں نے متفق الرائے ہوکر اپنی زمین بخوشی ونوباجی کو بخش دی اور اب وہاں پندرہ اشخاص پر مشتمل ایک "سرووسیوا منڈل" قائم ہے۔ یہ ممبران سب اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور ساری زمین کا انتظام منڈل کرتا ہے۔ اس میں زمین کی تقسیم خاندانوں پر ہوتی ہے اور دو تین خاندان مل کر مشترکہ طور پر اپنی زمین لگا سکتے ہیں۔ اس خاموش انقلاب کی تحریک کے تین سب سے اہم ستون ہیں اور اس کا اصل منشا ہی یہ ہے کہ سماج میں تین طرح کا انقلاب آئے تو مقصد پورا ہو۔ ستون یہ ہیں۔

۱۔ وچار پریورتن (فکری تغیر یا انقلاب)

۲۔ ہردے پریورتن (قلبی انقلاب)

۳۔ پرستھتی پریورتن (لوگوں کے رہن سہن میں تبدیلی)

شری بھاوے کا یہ عقیدہ ہے کہ زمین، ہوا اور پانی کی طرح خدا کی ملکیت ہے اور یہ خیال کرنا زبردست حماقت ہے کہ زمین انسانوں کے کسی ایک مخصوص طبقہ کی ہمیشہ ملکیت بن کر رہے گی، اس لئے زمین مفت دینا انسان کی اعلیٰ خصلت کی نشانی ہے۔

آچاریہ ونوبا بھاوے ۱۱ ستمبر ۱۸۹۵ء میں ایک پکے برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ نہایت ہی مذہبی واقع ہوئی تھیں۔ وہ اکثر دان کرتی رہتیں اور اپنے بچے کو بھی اس کی تلقین کیا کرتیں۔

ونوبا جی نے بڑودہ کے ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا اور بعد میں انٹر پاس کیا۔ اس زمانے میں وہ شاعری سے بھی شوق فرماتے تھے۔ آپ کو دُنیا کے تمام مذاہب اور دوسری زبانوں سے خاص لگاؤ ہے۔ آپ نے اسلام اور عیسائیت کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور آپ انگریزی، عربی، سنسکرت

فرانسیسی اور فارسی کے علاوہ ہندوستان کی اور آٹھ زبانیں جانتے ہیں۔ آپ کا اندازِ گفتگو کچھ اس قسم کا ہے کہ جاہل بھی بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ ۱۹۲۶ء سے وہ گاندھی جی کے ساتھ رہنے لگے اور گاندھی جی کی ہدایات پر ہی اُنھوں نے "سیوگرام" میں ایک آشرم کھولا۔ جو بعد میں مہاتما گاندھی کا مسکن بن گیا۔

ونوبا جی کی شخصیت کچھ ایسی ہے کہ کوئی ملنے جلنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی شہرت دیکتامی در اصل ان کی عابدانہ پاکیزہ اور سادہ زندگی کی وجہ سے ہے۔ وہ دس ہی سال کے تھے کہ اپنی ماں کی بتلائی ہوئی راہ پر چل پڑے تھے۔ ہلکے پھلکے بدن والا جسم جس کا وزن مشکل سے نوّے پونڈ ہوگا ہر روز تقریباً ۱۵ میل کا پیدل سفر کرتا ہے۔ بارش ہو یا آندھی، گرمی ہو یا سردی یہ اپنے "مشن" کو کامیاب بنانے کے لئے گاؤں گاؤں پھرتا ہے۔ اور ہر جگہ ایک ہی نعرہ بلند ہوتا ہے۔

میں نے تم سے زمین مانگی ——— تو زمین دیجئے اور زمین لیجئے

تحریک بھودان کو عملی صورت ونوبا جی نے ۱۹۵۱ء میں دی اور آج تک یعنی پانچ سال میں اُنھوں نے تیرہ ہزار میل سے بھی زیادہ سفر کیا اور آج تک تقریباً ۴۵ لاکھ ایکڑ زمین ان لوگوں کو بخش دی جن کے پاس زمین نہیں تھی۔ زمین دینے والوں کی تعداد تین لاکھ بتلائی جاتی ہے

ونوبا جی کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کے انقلاب کی ضرورت ہے اور وہ لوگوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان کا ساتھ دیں۔ دُنیا میں انقلاب رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسی ہستی ملک کے اس نازک ترین دور میں ضرور جنم لیتی ہے جو ملک میں یا تو تلوار کی دھار سے یا اپنی دماغی طاقت و ذہانت سے یا اپنے نوکِ قلم سے انقلاب پیدا کرتی ہے جو اس معاشرے کی مانگ ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشی نظام ہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کی عمارت استادہ ہوتی ہے اور اسی لئے ملک کی نامور ہستیاں ملک میں معاشی نظام کے استحکام پر زور دے رہی ہیں اور اس سلسلے میں بھودان تحریک ملک میں ایک اقتصادی انقلاب پیدا کر رہی ہے۔

پنڈت نہرو نے جو پچھلے دنوں کہا تھا کہ "ہم ملک میں سوشلسٹ قسم کا نظام لانا چاہتے ہیں۔ جو ایک مخصوص مارکہ کا ہوگا" تو سمجھنا چاہئے کہ یہ تحریک (بھودان) اسی نظام کی بنیاد کی تخلیق کر رہی ہے۔

مُسلمانانِ ہند کا مقام

"........ میں سمجھتا ہوں کہ مُسلمانانِ ہند کا مقام ہندی قوم میں آج ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، مسلمان آبادیاں دُنیا میں بہت ہیں، کہیں خدا کے فضل سے وہ اپنی زندگی کی تشکیل میں خود مختار ہیں، کہیں دوسروں کے زیرِ اقتدار آزادی سے محروم، مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیرِ اقتدار نہیں لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے۔ وہ ایک آزاد جمہوریہ میں آزاد شہری کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کی آبادی مختلف مذاہب و مسالک مختلف السنہ اور مختلف تاریخی و تمدنی عناصر پر مشتمل ہے۔ اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیئے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور اپنی مثال، اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اسی طرح مسلمانانِ ہند پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیاتِ طیبۂ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے اُن کے ہم وطنوں کے دل میں اُن کے دین کے لئے جگہ پیدا ہو......"

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

ہمایوں مرزا

پان کی تاریخی سماجی اور ادبی مقبولیت

پان کے مختلف نام

برگ تنبول یا پان نیز اس کے مختلف تلفظ تنبول تانبول اور تامول ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ تنبول کو مغلیہ سلاطین پان کہا کرتے تھے مسٹر رسل R. V. Russel نے اپنی تالیف "اقوام صوبہ متوسط" میں پان کا مادہ "پارنا" Parna ایک سنسکرت لفظ بتلایا ہے۔ جس کے معنی پتّے کے آتے ہیں مگر ایڈورڈ بالفور Edward Balfour مولف ان سائیکلوپیڈیا ہند Encyclopaedia of India نے لکھا ہے۔ کہ "تنبولا" سنسکرت لفظ ہے لاطینی زبان میں اس کو "پاپئر" Piper یعنی کالی مرچ کے کہتے ہیں اور یہ پاپئریشیس Piperacious یعنی از قسم کالی مرچ ہے جس کی پچاس قسمیں ہیں جو جزائر زیر باد East Indies جاوا سماترا کی پیداوار ہے۔ جس میں سے ایک پان بھی ہے۔ اور یہ قرین عقل بھی ہے، کیوں کہ پان مزہ میں کالی مرچ سے ملتا جلتا ہے۔ بلاکمین Blockman لکھتا ہے کہ یہ ایک سبز پتہ ہے، مگر اس کو منفعت مزاج نقاد نفیس میوہ کہتے ہیں۔ چناں چہ ہمارے ہندوستان کے نہایت مشہور شاعر اور صوفی حضرت امیر خسروؒ دہلوی نے ایک نظم پان پر کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

نادرہ برگے چو گل در بوستان

خوبتریں نعمت ہندوستان

(قرآن السعدین قلمی)

طب کی مشہور کتابوں "مخزن المفردات" اور "گنج باد آورد" میں تنبول فارسی لفظ بیان کیا گیا ہے۔ مگر اردو زبان کی لغت "جامع اللغات" میں درج ہے۔ کہ یہ لفظ ہندی ہے عرب لوگ اس کو "فان" "بیزبان" کہا کرتے ہیں۔ ایک قدیم لغت فارسی میں اس کا تلفظ تامول ہے۔ چناں چہ لکھا ہے "تامول" برگ کہ برابر سپاری خورند در ہندی "تنبول گویند" (ملاحظہ ہو طب حقائق الاشیاء) چینی زبان میں اس کو کوسیانگ Tku-Tsing اور توبی پوہ Tu-Pih-Poh اور تامل میں ویتولے Vettilei تلگو میں تملا پاکو Tamala Paku (بالفور) مگر علاقہ تلنگانہ میں تلنگی بیوپاری والی بیوپاری اس کو "آکلو" Aklu پکارتی پھرتی ہے۔ غرض مشرق بعید سے لے کر مشرق وسطیٰ تک ہمارا پان مشہور ہے۔

تاریخی پس منظر

ڈاکٹر پی۔ وی لنگن Dr. P. V. Lingan مرتب دھرم شاستر نے لکھا ہے کہ پان کا رواج ہندوستان میں غالباً ابتدائی سنہ عیسوی سے یا تقریباً دو ہزار سال سے ہے۔ اس کی ابتداء پہلے جنوبی ہند میں ہوئی۔ بعد میں رفتہ رفتہ شمالی ہند میں رائج ہوا۔ گرہیا سوتر Grhya Sutras یعنی گھر گرہستی کے باب مندرجہ وشنو پران اور بعض دوسری کتابوں مثلاً لاگھوہرت Laghuharita اور لاگھو وسوالین Laghvasvalayana میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ مگر یہ تو یقین ہے کہ اس کا استعمال راجہ بکرما جیت والی اجین کے زمانے یعنی چھٹی صدی عیسوی میں تھا۔ چناں چہ بکرما جیت کے نورتن علماء میں ورامیہ Varaha-Mihira نے نیز کالی داس کی راگھو دمش Raghuvamsa اور کام شاستر میں پان کا ذکر آیا ہے۔

ہماری تحقیق میں بھی قدیم ویدک طب کی ایک کتاب اشٹنگ ہردے A litangharoe مصنفہ مشہور وید "واگ بھٹ" میں برگ تنبول کے خواص بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ تصنیف بقول بعض کچھ زمانہ ماقبل حضرت مسیحؑ یا

پہلی صدی عیسوی اور بقول بعض چھٹی عیسوی ہے (تاریخ الاطباء غلام جیلانی دہلوی مطبوعہ) (طب محمودی قلمی آصفیہ)

عرب سیاح اور مؤرخین

بزرگ بن شہریار (تیسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی) نے اپنی تصنیف عجائب الہند میں مورخ مسعودی $\frac{330}{943}$ھ نے اپنی تاریخ میں ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند اور کتاب الصیدلہ (صنعت دواسازی) ابن بطوطہ نے برگ تنبول کا ذکر کیا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ بزمانۂ قیام دہلی والدۂ سلطان محمد تغلق نے ابن بطوطہ کی ضیافت کی تو پان کا تحفہ بھی تھا۔ محمد تغلق نے امیر غیاث الدین عباسی کو اپنے ہاتھ سے پان عطا کیا۔ جو ایک خاص اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ایک امیر سیف الدین کی شادی سلطان کی ہمشیرہ سے ہوئی تو دولہن نے دولہا کو پان کھلایا۔ ابن بطوطہ کی لڑکی کا انتقال ہوا تو سیوم کی فاتحہ یعنی پھولوں میں پان کے بیڑے بھی تھے۔ شہر حیدرآباد میں بھی بعض جگہ یہ طریقہ رائج ہے ابن بطوطہ جب سماترا اور جاوہ گیا تو سلطان ملک ظاہر ابوبکر نے اس کو پان اور چھالیہ کا تحفہ دیا، جزائر مالدیپ کے سلطان نے پان اور گلاب ہدیۃً عطا کئے بطوطہ نے سلیمان وزیر کی لڑکی سے عقد کیا تو پان اور صندل کی لکڑی تحفتہً دی گئی (عجائب الاسفار۔ ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ از محمد حسین لاہوری) دوسرے سیاح ملک التجار عبدالرزاق سمرقندی کو دکن کے راجہ دیجانگر نے پان اور کافور ہدیتہً دیئے۔ مدراس (دکن) کے ایک مشہور بزرگ مخدوم عبدالحق بیجاپوری سادی عرف دستگیر صاحب گیان بھنڈاری (وفات ۱۱۶۵ھ) بارھویں صدی ہجری کے بڑے سیاح تھے۔ سماترا و جاوہ کے سفر میں دیکھا کہ لوگ پان کثرت سے بکری کی طرح کھاتے ہیں۔ تو تہدید کی کہ اعتدال اچھی چیز ہے (ملفوظات قلمی)

چین کے سیاح

چینی سیاح آئیزنگ I-Tsing نے اپنے سفرنامہ الموسوم بہ "تاکاکوسو" Taka-Kusu میں بدھمت کے رواج کے ضمن میں لکھا ہے۔ کہ میں نے جزائر زیرباد کے دس جزیروں میں کاچا سے لے کر انسولائی نیوڈورم Insolae Nudorum تک پان اور چھالیہ کے درخت کثرت سے دیکھے یہاں "اپاوستھ" Upavasattha کی رسم میں پجاریوں کو شربت پلاتے ہیں اور سپاری کی ڈلیاں تحفتہً دیتے ہیں۔

یورپین سیاح۔ (۱) سیاحت ایپولیٹو ڈیسی ڈیری Ippolito Desideri of Tistoia تالیف ۱۷۱۲ء میں بیان کیا گیا ہے کہ پان کا رواج نیپال میں تھا۔ (۲) بقول سفرنامہ ٹیورنیر Teverneur (اطالوی سیاح) مترجمہ وی۔بال V. Ball ۱۸۸۹ء مطبوعہ لندن جزائر زیرباد East Indies کے ایک راجہ کو طلائی پان کوٹنی میں پان کوٹ کر کھلایا جاتا تھا۔ جس کو وہ بڑے مزے سے بیان کرتا ہے کہ راجہ کے منہ میں دانت تھے اور نہ پیٹ میں آنت اسٹوریہ ڈی منغل Storiadomogole by Mancci (سفرنامہ منوچی معاصر عالمگیر ترجمہ ولیم اروِن مطبوعہ ۱۹۰۸ء لندن) نے بیان کیا ہے کہ اورنگ زیب کا ایک سفیر ایران میں مامور ہوا تو اس سفیر کو پان ہندوستان سے بھیجے جاتے تھے اور اس کا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ پان تازہ بہ تازہ ملیں اور یہ پان نہایت عمدہ اور خوشبودار ہوتے تھے۔

تاریخ سماترا مولفہ ولیم مارسڈن William Marsden مطبوعہ لندن ۱۸۰۴ء میں لکھا ہے کہ سماترا Sumatra میں پان اور چھالیہ کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں اور یہ اشیاء اچھی Achin پایۂ تخت سے علاقہ تلنگانہ جنوب مشرقی ہندوستان میں برآمد کی جاتی ہیں۔ یونیورسل بیالوجی کل ڈکشنری مولفہ تھامس گرین مطبوعہ $\frac{1823}{1923}$ لندن میں لکھا ہے کہ ہند چینی میں اس کی کاشت اور تجارت خوب ہوتی ہے کیپٹن ایڈورڈ مور Captain Edward Muir (۱۷۹۴ء) نے اپنی تالیف میں ہندوستانی سروتہ کا ذکر کیا ہے۔

ہابسن جابسن Hobson Jobson مطبوعہ ۱۹۰۳ء میں اسد بیگ قزوینی (۱۶۰۴ء) سفیر اکبر اعظم برائے بیجاپور کے حال میں پان کے ایک لوازم تمباکو کے بیجاپور میں استعمال کا ذکر ہے۔ جو شمالی ہند میں رائج نہیں تھا۔ اسی نے وہاں رائج کیا۔ اہل ہند کے قدیم کتابوں میں بھی برگ تنبول اور پان کا ذکر ہے۔ مثلاً نندی پران Nandi Puran نروایا سندھو Nirvaya Sindhu مطبوعہ بنارس ۱۸۹۷ء کام شاستر Kama-Sutra مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۰ء سمرتیا سار مولفہ سری دھر Smrtyarthasara of Sridhar $\frac{1150}{1200}$ مرتبہ انندرام شرما مطبوعہ پونا ۱۹۱۲ء میں لکھا ہے کہ شادی کی قرارداد پان دینے کی رسم سے پکی ہو جاتی ہے۔ پدمیسری Padmasri تالیف ۱۰۰۰ء میں پان کی پانچ قسمیں اور اس کو عشق و محبت کا تحفہ بیان کیا گیا ہے نیز مرجاکتک

Mrichakatika مولفہ ایچ ایم شاستری H. M. Saastari مطبوعہ بمبئی ۱۹۱۰ء میں بھی اس کا ذکر ہے (جرنل آف ہسٹری ٹراونکور مدراس ۱۹۵۰ء)

بیان کیا جاتا ہے کہ جب سلطان محمود غزنوی نے نویں دفعہ ۱۰۱۰ء میں قنوج پر حملہ کیا ہے تو بقول بعض مورخین وہاں میں ہزار تنبولیوں کی دوکانیں تھیں۔
(رسالہ زمانہ ماہ اپریل و مئی ۱۹۱۶ء)

مسلمان سلاطین اور اولیا اللہ بھی اس کے عادی رہے ہیں اور خاطر تواضع میں آٹھویں صدی سے عطر اور پان استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ بحوالہ ابن بطوطہ ہم سلطان محمد تغلق کی ضیافتوں اور تقاریب کا ذکر کر چکے ہیں۔ مشہور شاعر امیر خسرو نے پان کی بے حد تعریف کی ہے۔ خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز بھی پان کھایا کرتے تھے۔ اپنی واردات قلبی کے ضمن میں ایک پنواڑن کا ذکر اپنی تصنیف اسماء الاسرار میں کیا ہے۔ حضرت ممدوح سلطان محمد فیروز شاہ بہمنی (وفات ۸۲۵ھ) کے معاصر تھے۔ سلاطین مالوہ و گجرات اور قطب شاہیہ بھی پان کے دلدادہ تھے چنانچہ مالوہ کے سلطان محمود خلجی نے سلطان مظفر حلیم گجراتی کی ضیافت کی تو جشن موسیقی میں طلائی کشتیوں میں تنبول داران شاہی نے پان تقسیم کئے (تاریخ مظفر شاہی گجرات قلمی) سلطان ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷/۹۸۸ھ) نے اپنے برہمن وزیر راسے راؤ کو روزانہ پوجا پاٹ کے لئے پاؤ سیر مشک و عنبر، عود و عطر اور پان اور دو من صندل مقرر کیا تھا (تاریخ قادر خاں بیدری قطب شاہی قلمی) مغلیہ سلاطین بھی پان کھاتے تھے۔ بلہری کے پان کی ابوالفضل نے بڑی تعریف کی ہے۔ پان کے اقسام اور اعداد و شمار دیئے ہیں اور شہنشاہ اکبر کے وزیر راجہ بیربر کا مقولہ ہے کہ "پتوں میں پان کا پتہ اچھا ہوتا ہے۔ اس کی خاطر دشمن بھی دوست بن جاتا ہے" (آئین اکبری)

شاہ اودھ نواب سعادت علی خاں اپنے درباریوں کی عطر و پان سے تواضع کرتے تھے (اسناد دفتر ملکی حیدرآباد مطبوعہ) سلاطین آصفجاہی کے کارخانہ جات شاہی میں خاص طور پر ایک "تنبول خانہ" بھی تھا اور ان کی نگرانی "ناظم علم دولت" کرتا تھا۔ (بستان آصفیہ مانک راؤ مطبوعہ)

راجپوت سردار جب کسی سخت مہم کو قبول کرتا تو بیڑا اٹھایا کرتا تھا۔ جو اردو زبان کا خاص اور نفیس محاورہ ہے۔ جے پور کے راجہ جے سنگھ کے زمانے میں شادی میں "باہی" (Bahi) کی رسم یعنی منگنی پان کی گلوری سے شروع ہوتی تھی جو رضامندی اور تعلق تصفیہ کی علامت تھی۔ (انڈین ہسٹری جرنل کلکتہ اپریل ۱۹۵۷ء)

غرض یہ سبز پتہ صدیوں سے نہایت مقبول ہے اور ہندوستانی معاشرت کا جزو ہو گیا ہے۔ ہندو مسلمان سب ہی اس کے دلدادہ ہیں، جہیز میں پان دان اگالدان ضرور دیتے ہیں۔ دلھن کے لئے "پان دان کا خرچ" فال نیک اور اس کا حق سمجھا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عالمگیر جیسے محتاط بادشاہ نے اپنی لڑکی زیب النساء بیگم کے پان کھانے کے اخراجات کے لئے سورت کا علاقہ دیا تھا۔ پان میں چونے کے استعمال کو ملکہ نورجہاں یا زیب النساء کی اختراع کہا جاتا ہے مگر اس کا رواج قدیم ہے۔ پان نہ صرف مشرق بعید بلکہ مشرق قریب یعنی عدن، حجاز، مکلا، شحر، سواحل افریقہ، خلیج فارس میں بھی استعمال ہوتا ہے جو بمبئی سے برآمد ہوتا ہے اور وہاں فی گلوری ۸ر سے فروخت ہوتا ہے۔
(العرب بمبئی ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ) ——— عربستان یعنی عدن اور یمن میں پانوں کو شہد میں رکھ کر سڑنے گلنے سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

پان کے اقسام

پان کی بیسوں اقسام ہیں۔ پدم سری Padmasri (۶۰۰ء) نے پان کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔ مگدھی، بنگلہ پان، مہوبا (وسط ہند) گینگری، بلہری، کانپوری، سانچی، مدراسی، بنارسی، جبیرا وغیرہ بہت مشہور ہیں، مگر حیدرآباد میں بورم پہاڑ (علاقہ کھم) کا پان مشہور ہے جو نرم اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ مگر شمالی ہند کی طرح یہاں کے پان تیز اور خوشبودار نہیں ہوتے، البتہ بھونگیر ضلع نلگونڈہ کے پان سیاہی مائل اور تیز ہوتے ہیں جس کو حیدرآبادی لونگ کا پان کہتے ہیں۔ غالباً اس کی کوئی بیل شمالی ہند کے علاقہ آسام سے لاکر لگائی گئی ہو۔ جس کی وہاں کاشت ہوتی ہے۔ اس کی کچھ پیداوار کٹڑپہ (مدراس) میں بھی ہوتی ہے۔

(لوازمے) چھالیہ کے اقسام

گڑھے کی چھالیہ (گوا) کی لمبی چھالیہ، سنگاپوری (جہازی، بندری) سری یعنی گول چپٹی (منگلوری) کلکتہ کی سیوردانی (بمبئی) چکنی (سرسی سے بنتی ہیں) ثابت کنی، بکل (راجپوتانہ)

کتھا

گلابی یا دیسی (بمبئی۔ گجرات) محلاتی (امراء و شاہی محلات حیدرآباد) پاپڑیا کتھا (بھی قسموں میں) کانپوری، بریلوی، بلگانوی، کالا کتھا، نظام آبادی کتھا (ریاست حیدرآباد) گجراتی ہندو سولکھی کا کارخانہ، نرمل، خانہ پور (ضلع عادل آباد)

سکے جنگلوں کی پیداوار سے بنتا تھا۔ آسام کے کاریگر ملازم تھے۔ کارخانہ دور کے علاقوں کی مسابقت (تمباکو) نیز جنگلات کی سختیوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ دکنی لوگ زیادہ تر سوکھا کتھا کھاتے ہیں۔ چونا سنگِ مرمر کا بہترین ہوتا ہے۔

خواص

ان سیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں اس کے اجزائے کیمیاوی کی تفصیل درج ہے اس میں چونا، کیلشیم، فاسفورس، لوہا، وٹامن اے۔سی (Vitamin A-C) پروٹین (نشاستہ، کاربوہائیڈریٹ، شکر وغیرہ بھی ہے۔ اسی طرح اس کے ڈالنے چھالیہ میں بھی ([illegible] گورنمنٹ ہند مقالہ ڈاکٹر [illegible])

پان میں ایک قسم کا تریاقی مادہ Antiseptic ہوتا ہے جو کاربولک ایسڈ سے پانچ گنا قوی ہوتا ہے۔ پان پرانے زخموں پر باندھنا اور اس سے سینکنا مفید ہے (ڈاکٹر گیبن) نیز مرضِ فیل پا، متھندی اور ڈپتھیریا میں اس کی بھاپ لینا اور سینکنا مفید ہے، عرقِ پان دردِ گردہ کے لئے مجرب ہے پان کھانا مضر نہیں، بقول ایک حاذق حکیم کے کسی قدیم طبیب نے اس کو بجائے دوا کے غذا بنا دیا ہے۔ پان کی کثرت اور پھر اس کے ساتھ تمباکو کا استعمال سخت مضر ہے، عجیب عادت ہو جاتی ہے کہ چین نہیں آتا۔ جنوبی ہند کے لوگ عادی ہیں۔ پان کے ساتھ چونا اور تمباکو بہت کھاتے ہیں اور سپاری میٹھی خوشبودار استعمال کرتے ہیں۔ مگر اس سے پان بے تکلف ہو جاتا ہے۔ ایک دوست نے کہا کہ مدراس کے شہروں میں کوئی بجلی کا کھمبا ایسا نہیں جس پر پیک کے تھوکے کا نشان نہ ہو۔ سڑکیں تو گلنار رہتی ہیں۔ اعتدال کے ساتھ دانتوں اور منہ کی صفائی کے لئے پان اور نیم کی مسواک ہندوستان کی خاص چیز ہے۔

ہندوستان میں تنبولیوں کی ایک قوم ہے جو برائی کہلاتی ہے۔ ان میں دو طبقے ہیں۔ ایک پنساری یعنی پان بیچنے والے دوسرا طبقہ بارانی یعنی "لفظ ترا باری" روایت یہ ہے ان کے آبا و اجداد برہمن تھے۔ کسی گناہ کے پاداش میں دیوتاؤں نے زنار چھین کر دفن کر دیا تو پان کی بیل نمودار ہوئی دوسرا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہستناپور فتح ہوا تو ایک رشی باسوکی نے اپنی انگلی کے پور کا ٹکڑا قاصد کو دے دیا جو بوئی گئی تو ناگر بیل پیدا ہوئی۔ مگر تعین یہ ہے کہ یہ غیر آریائی فرقے ہیں۔ ان میں نو طبقے بہت مشہور ہیں۔

تنبولیوں کے طبقے

چوراسیا (مرزا پوری) پنگادے (ناگر بیل پور کے) مہوبیا (مہوبہ کے) جائسوال (جائس کے رائے بریلوی) گنگا پاری (گنگا پار کے) پروشی یعنی (دوشاوری۔ فیروز کی) قنوجیا (قنوج کے) برہان پوری (برہان پور کے)

ان کے رواجی نام

مثلاً۔ جھنڈاری، پتھارا، بنکا بھورا (برتن توڑ) وغیرہ۔

ٹوٹمی نام۔

کتامار (کتا مارنے والے) رچھارے (ریچھ) بندریلے (بندر)

پوجا پاٹ

ان کی خاص دیوی ناگ پنچمی ہے۔ جس میں باسوکی یعنی سانپوں کی رانی کی پوجا کرتے ہیں۔ پھول، ناریل چڑھاتے ہیں اور بکرے بھینٹ دیتے ہیں۔

اعتقاد

ایک پیالے میں دودھ بھر کر پان کے باغ میں رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ ناگ سانپ آکر پیئے۔ اس طرح وہ سانپ کے کاٹنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

پان کی کاشت کا زمانہ

فروری میں قلم لگائے جاتے ہیں۔ پانچ ماہ میں پیداوار حاصل ہو جاتی ہے
بعض ضرب الامثال کہتے ہیں کہ نوکری بغیر مربی کے، نوجوان بغیر سپر کے اور پان بغیر تمباکو کے بے مزہ ہوتا ہے۔ کبھی حیدرآباد دکن میں سفارشوں کا بڑا زور تھا۔ اور لوگ کہا کرتے تھے "مربی پیادہ ہے مجبور" قوام عنبری وغیرہ کے کثرت استعمال نے دانتوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بلکہ فقط باز تو پان میں کوکین استعمال کرتے ہیں جو تباہ کن ہے۔

ادبی حیثیت

پان ہمارے اردو ادب کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ متقدمین و متاخرین شعراء اردو نے اس کو سینکڑوں طرح باندھا ہے۔ نیز بعض ہندی شعراء نے بھی۔ بلکہ اس میں پہیلیاں بھی کہی ہیں اور محاورہ بھی ہیں۔ ایک خاص کتاب "بوجھ پہیلی" عرف کاغذی پنچ تالیف ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء مطبوعہ میں بعض اچھی پہیلیاں یہ ہیں۔

۱۔ سات کبوتر ساتوں رنگ   محل میں جاویں ایک ہی سنگ (پان)

۲۔ ہر ارنگ ہے بیچ وہ بات   گھر میں دھرے دکھائے جلت (〃)

تین ستو سی اور کھ پیارا   جانت ہیں سب ہی نر نار

ہر ایک سبھا کا درکھے مان   چترائی کی یہ پہچان

بھائی کہیں اور وا کو کھائیں   اتنے پہ پھر منہ دکھلائیں (پان)

۳۔ ایک گنی نے یہ گن گنیا — ہر یل مار پنجرے میں دنیا
۴۔ دیکھو جادوگر کا کمال — ڈالے سبز نکالے لال (پان)
۵۔ گلا کٹے پر چوں نہ کرے منہ سے رکت بہائے
پیاری سے باتیں کرتا بیڑا دھک سوہائے

پان کے محاورے

پان پتہ یعنی لوازم خانہ داری، بیوی کا جیب خرچ، پان دان کا خرچ (دکھن) پان پھیرنا یعنی (وقت کاٹنا) رخصت کا پان۔ پان کا کھرٹا، پان کھلائی (منگنی) پان سا پتلا چاند سا چکلا (نازک خوبصورت) بیڑا اٹھانا (کسی مشکل کام کا عہد کرنا اور انجام دینا) تنبول بانٹنا یا دینا (اہل ہند میں بھانجے بھانجی کے شادی کی وداع کے وقت بہن کی رشتہ دار عورتوں کو نقدی دینا) "سات پان کا بیڑا" ہندو دلھن کا باپ دولھا کو یہ بیڑا ہدیتہً بھیجتا ہے مطلب یہ کہ رسم شادی پکی ہو گئی۔ پان اور ایمان پھیرنے ہی سے اچھا رہتا ہے یعنی پان الٹ پلٹ کرنے سے اور ایمان توبہ سے۔

ایک اور ضرب المثل سُنئے

پان پُرانا، گھرت نیا اور کلونتی نار — یہ تینوں تب پایئے جب پرسن ہوں مرار
یعنی پُرانا پان، نیا گھی اور پاک دامن عورت تب ملتی ہے جب خدا خوش ہو۔
(جامع اللغات مطبوعہ لاہور)

غرض پان ہندوستان کی نعمت ہے اور مسلمانوں کو بھی اسی وقت سے پیارا ہے، جب کہ ان کے قدم ہندوستان میں جمے۔ ایک قدیم دکھنی شاعر کہتا ہے۔

ہندو مسلمان سب ایسے مل جل رہیں — جیسے سپاری، چونا کتھا اور پان
دوست دشمن سوں مل کے رہو قسمی — پان سوں جیوں سپاری، چونا، کات

فارسی ادب بھی اس سے خالی نہیں۔ امیر خسروؔ فرماتے ہیں۔

او پان تجلق می سپرد و ہمہ خلق — در پیش دکانش جان سپاری میکرد

خان آرزوؔ کا بھی شعر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا مگر پان کا اگال کھا لیتا ہے۔

کس نہ خورد خوردۂ دندان کس — انچہ تواں خورد ہمیں است و بس

ماہ لقا بائی چندا حیدرآبادی کہتی ہے

گواہی میکند بار تبسم لعل جاناں را — کہ آں لب زتیز اکت برنتابد سُرخی پاں را

یوں تو عربی اور فارسی طب کی مشہور کتابیں ابن بیطار، اختیارات بدیعی گنج بادآورد وغیرہ اس سے بھری پڑی ہیں۔ حال ہی میں زبانِ فارسی کے ایک شاعر اور فاضل طبیب حکیم باقر حسین خاں مائق المعروف بہ فند محمد خراسانی معاصر نواب اعظم جاہ آرکاٹ نے برگِ تنبول کے اقسام اور تمباکو پر ایک کتاب "جامع الاشیاء" تالیف کی تھی جو مدراس کی اورینٹیل سوسائٹی سے حال ہی میں طبع اور شائع ہوئی ہے۔

ہندی ادب۔ بہاری لال شاہ جہانی ہندی شاعر کہتا ہے۔

کری بیت گوری گرے جنت پان کی پیک — منو گلوبند لال کی لال لال دست لیک

یعنی ماہرو کے گورے گلے میں اترتی ہوئی پان کی پیک کی سرخی باہر سے ایسی جھلکتی ہے گویا گلوبند کی لالی کا عکس اس کی سرخ لکیر ہے (دامنگر جولائی ۱۹۵۵ء)

قدیم اردو ادب میں ملک الشعراء غواصی نے اپنے دیوان میں ایک جگہ تنبول دان (پان دان) کا لفظ لکھا ہے۔ (دیوان غواصی قلمی)

دوسرا ملک الشعراء وجہی گولکنڈوی اپنی مشہور نثر "سب رس" میں کہتا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ نے قصۂ حسن و دل یعنی سب رس لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ مثلاً "وجہی نادر من کوں دریا دل گوہر سخن کوں حضور بلائے پان دیئے مان دیئے"۔ گجرات کے حضرت خوب محمد چشتی "خوب ترنگ" میں فرماتے ہیں ؎

چکنیں چھالیں تیل لگائیں — پان سی کرکسوٹ آئیں (خوب ترنگ قلمی)

اور شمالی ہند کے رجب علی بیگ سرورؔ لکھنوی "فسانۂ عجائب" میں کس مزے سے فرماتے ہیں۔ "عبیر ہے نہ گلال ہے کتھے چونے سے ادھی ہیں کھڑا لال ہے تنبولی سرخروی سے یہ رمز و کنایہ کرتے بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتے ہیں۔ "تمھیں کا منہ کالا ہو یا گرد کر ڈالا" (فسانۂ عجائب مطبوعہ)

ولی بابائے ریختہ کہتا ہے ؎

کرتا ہوں جان سپاری کتنی ہوں آت جسکے — کر نیکوں دل کا چونا آتا ہے پان کھا کر

شاہ سراج اورنگ آبادی کی شوخی ملاحظہ ہو ؎

جب سے دیکھی ہے خط سبز میں تیرے لب سُرخ — تب سیں سبزے میں چھپی پان کی لالی ہے سُرخ

عطا بریلوی کہتا ہے ؎

دل تو سو جا گہ سے ٹکڑے ہو گیا غنچہ کی طرح — آگ لگ جائے تمھارے پان کھانے کے تئیں

مرزا داؤد اورنگ آبادی ؎

لعل [illegible] لالی — لعلِ لب [illegible] پان کھاتے ہیں

مرزا مظہر ؎ کسی کے خون کا پیاسا کسی کے جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے صنم نے بیڑہ پان کو

شاہ نصیر ؎ کیا یہ ترے لب پہ تماشا ہے سُرخی پان و رنگِ مسی
لالہ نافرمان ہے گویا سُرخی پان و رنگِ مسی !!

شفق و صبح بہم دست و گریباں ہیں مجھ
پان کھانے سے ترا ہے یہ جمالِ گردن

مصحفی ؎ پان کھانے کی ادا ہے یہ تو اک عالم کو
خون رُلا دے گا مری جاں دہنِ سُرخ ترا

حنا لکھنوی ؎ ملاتے ہی آنکھ خوں کیا دل دکھا کے ہونٹوں پہ رنگ پان کا
قسم ہے جوبن غضب ہے چتون یہ کون چلمن اُٹھا کے جھانکا

امانت لکھنوی لاکھا ترا یاقوت ہے یا لعلِ بدخشاں
نیلم ہے کہ سوسن ہے کہ مسی کی دھڑی ہے

ظہیر دہلوی ؎ پان لگ لگ کے میری جان کہاں جاتے ہیں
یہ میرے قتل کے سامان کہاں جاتے ہیں

فیض حیدرآبادی ؎ کرتے ہو کیا خون پھر کسی کا لاکھا لب پہ جمائے ہو
محسن قتا لکھنوی پسرِ میر ہو جمالی مسی گھٹا کہیئے سُرخ لاکھے کو خون بہا کہیئے
بات میں لال ہوتا کہیئے ناز کی اور لبوں کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

مومن خاں مومن دہلوی مسی آلودہ لب پہ رنگِ پان ہے
تماشہ ہے نہ آتش دھواں ہے !

ضمیر گیاوی کا بیان ہے کہ مومن نے خواصِ پان پر ایک رسالہ بہ عبارت رنگین لکھا تھا۔ طنزاً لکھتے ہیں: "جو مومن کے کسی عزیز کے قبضہ میں تھا اور بمنزلہ تبرکات اس کو پان دان میں بند رکھتے ہیں۔ اگر مانگو تو منہ لال کر دیں۔"

(حیاتِ مومن مولفہ ضمیر گیاوی مطبوعہ)

حاتم علی بیگ تہرا اکبرآبادی ؎ لکھوٹا پان کا دیکھے جو واعظ اُن کے ہونٹوں پہ
لہو ڈالے، لہو روئے، لہو اگلے، لہو تھوکے

عصر تلمیذ فیض آؤ اک بات سُنو مجلسِ حیراں نہ بنو
کس پہ شب خون گرا چاہتے ہو بولو تو
مسی مل مل کے ہو کیوں پان چباتے جاتے

کیفی حیدرآبادی تلمیذ میکش دوام کثرت سے پان کھاتے تھے۔ ہمیشہ پان کی ایک تھیلی (دکنی، دکھنی) ساتھ رہتی۔ کوئی عطاء کی پوپلی بڑھیا مل جاتی تو فرماتے کہ آج کل وہی۔

"اماں پان نہیں کھاتے؟" کیفی نذر کرتے اور بڑھیا سے پان بنوا کر کھاتے کبھی وجہ سے پان کھانا ترک کر دیا تو ترکِ پان خوری کا تاریخی قطعہ بھی کہا تھا جو اس وقت دستیاب نہ ہو سکا۔

حیدرآبادی شعراء میں پنڈت سورج بھان میکش (سجاد علی شاہ) تھانہ جھونی ثم حیدرآبادی کی دو تین غزلیں پان پر بڑے مزے کی ہیں۔ بخوف طوالت چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

پہلے پان کا ضلع سُن لیجئے ؎
پان کھا کر لبوں کو لال کیا ہم نے سمجھا ہمیں حلال کیا

پان کے بیڑے ۔ میکش ؎
تیرے ہاتھوں کی گلوری تو کبھی چھپتی نہیں لاکھ میں ہم لیتے ہیں پہچان بیڑے پان کے
طشتری میں اس طرح رکھے ہیں جو ابھرے ہوئے کیا اُٹھائیں گے کوئی طوفان بیڑے پان کے
کیوں نہ ہیں دل کی گلوری کو کروں اُن پہ نثار آئے ہیں گھر میں میرے مہمان بیڑے پان کے
لب کی سُرخی سے ہوا دونا حبیب کا لٹے یار جانے اب کیا رنگ لائے گا یہ لاکھا پان کا
دیکھتے ہی اُس کو پہلو سے اکھڑ جائینگے دل اپنی وہ ٹِکی جمائے گا یہ لاکھا پان کا

پان کے ساتھ مسی قدیم لوگوں کا لوازمہ تھا۔ میکش نے کہا ہے ؎
لب پہ ہے ترے طرحدار دھڑی مسّی کی بن گئی کالی گھٹا یار دھڑی مسّی کی

(دیوانِ میکش مطبوعہ)

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) مرحوم کی بھی ایک نظم پان پر چھپی تھی۔ مگر وہ ایسی دل کش نہیں۔ دو ایک شعر یہ ہیں۔

اہلِ یورپ کا سگار و چائے پر ہے جان ہے ایشیا کے ملک میں غایتِ تواضع پان ہے
پان کھا کر مسکرانے سے یہ ہوتا ہے گماں برقِ تاباں ہے شفق میں کیا غلط کی شان ہے

البتہ ان کا یہ مصرعہ ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے: "اس کی ہر بازار میں چلتی ہوئی دوکان ہے۔" (رسالہ ذخیرہ ۱۹۱۴ء) پان چائے کی طرح عام ہے لاکھوں کی تجارت ہوتی ہے۔ اور حیدرآباد کے پنواڑی بڑے جدت پسند ہو گئے ہیں۔ یوں تو اُن کی دوکانوں کے نام "ثریا پان" "غالب پان" "پان محل" تھے مگر ایک عنوان تھا "دوڑتے خون کی ایک لہر"۔ حیدرآباد میں شمالی ہند کے پان بھی ملتے ہیں۔ مگر ان کا استعمال بہت کم ہے۔ دیسی پان میں لونگ، الائچی کا زیادہ استعمال ہے۔ ربع صدی پہلے دکنی لونگ جاوتری وغیرہ ڈال لیتے تھے مگر اب اس کا رواج کم ہے۔ غرض ہند کا یہ عجیب تحفہ ہے۔

"برگِ سبز است تحفۂ درویش" مشہور مقولہ ہے۔

ع حضور کو نهن گٹودی تو آبرو هو جائے



ع هے جو حضرت کے کف دست پہ یہ چکلی ڈلی



بھارت کلا بھون بنارس

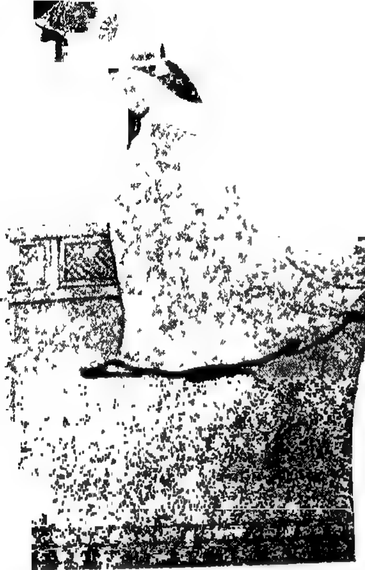
کے

نوادر

دیکھئے صفحہ - ۳۴



رادھا کرشن
کانگڑا اسکول - اٹھارویں صدی



أسد طوفان
کانگڑا اسکول - اواخر اٹھارویں صدی







[illegible]
کانگڑا اسکول - اوائل انیسویں صدی



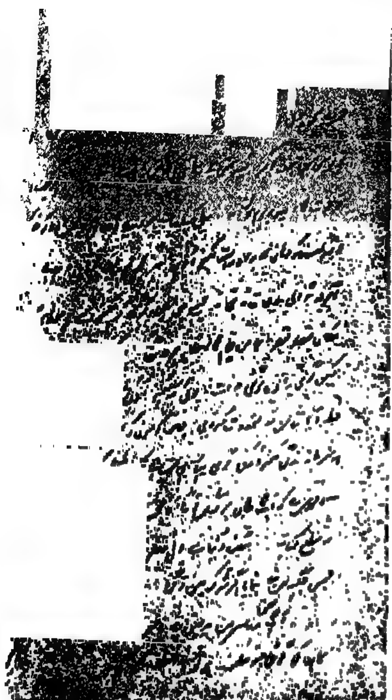
موسی اور لشکر فرعون
مغل اسکول - اوایل سترھویں صدی

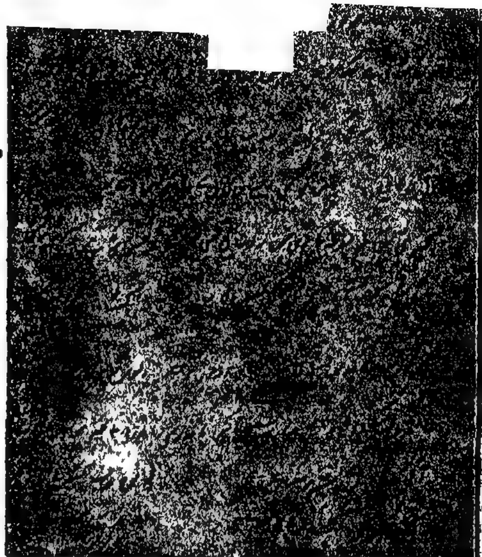


دل بے تاب بہلتا نہیں بہلاے سے
کلو اسکول - اٹھارویں صدی



پیا ملن کو جائے باوری
راجستھانی اسکول (؟)



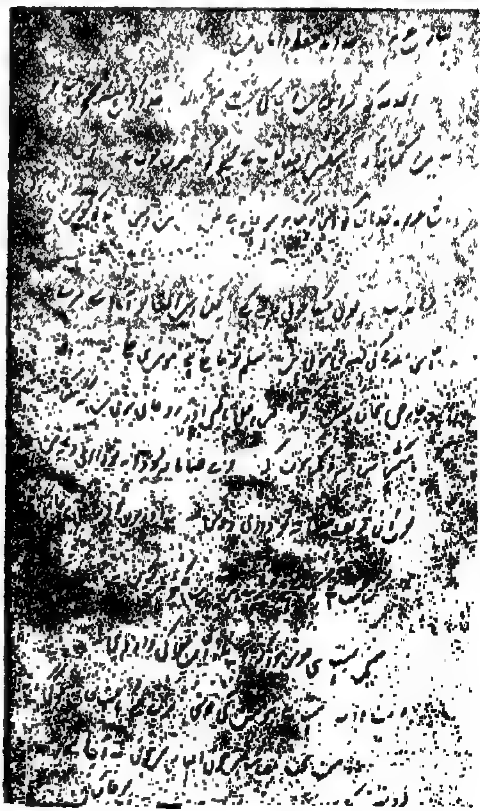


اکبر الہ آبادی

بنام

عزیز لکھنوی





ڈاکٹر اعجاز حسین

اکبر الہ آبادی

"...... اکبر کے دور میں مغرب و مشرق کا امتزاج یا تصادم اپنے شباب پر تھا مغرب کا تمدنی سیلاب مشرق کی بنیادی خوبیوں کو بھی بہائے لئے جاتا تھا۔ ہندوستان کورانہ تقلید میں مبتلا ہو چکا تھا۔ عام طور سے لوگ بغیرتہ تک پہونچے ہوئے تحریکات سے مغلوب ہو رہے تھے، بغیر روح کے جسم متحرک ہو گئے تھے۔ انگریزوں کی روح اور اُن کی ترقی کے اسباب پر نظر نہ تھی۔ لباس و معاشرت کی نقالی سے انگریز بننے کی ایک عام خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اکبر دوراہے پر کھڑے تھے ان کی نظروں میں مشرقی تمدن و تخیل کا پورا نقشہ تھا، ان کی رگوں میں ہندوستان کا خون تھا وہ ماضی و حال کی نبض پر اُنگلیاں رکھ کر اپنے دور کی تبدیلی کا اندازہ کر رہے تھے اور جو محسوسات پیدا ہو رہے تھے ان کو شعر بنا کر پیش کر رہے تھے، جو بڑا مشکل کام تھا۔ آج ان کی یہ پیش کش ممکن ہے آسان نظر آئے لیکن اُس عالم اور اُس وقت کو سوچئے کہ جب اُن کے سامنے اس احساس کو رو بہ کار لانے کے لئے کوئی نمونہ ادب میں نہ تھا۔

وہ حالی کا اصلاحی طریق کار دیکھ رہے تھے ان کی شاعری اور سنجیدگی کا اثر محسوس کر رہے تھے۔ بہت کم لوگ ان کو وعظ و نصیحت سے متاثر ہو رہے تھے۔ اکبر ان کی تحریک کے حامی بھی نہ تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی نیا راستہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کا اختیار کریں۔ دوسرے فلسفیانہ انداز میں اور لوگ بھی تلقین کر رہے تھے یا کر چکے تھے۔ یہ طریقہ کوئی نیا عنوان نہ ہوتا اکبر نے ہنسا ہنسا کر رُلانے کا ذہن میں نقشہ مرتب کیا مگر اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے کوئی مثال نہ تھی۔ ان کے سامنے جو راستہ آیا اس پر کسی شاعر کا نقشِ قدم دکھائی نہ دیا۔ انھوں نے بڑی طباعی اور جدت پسندی سے مروجہ ہیئت میں رنگ آمیزی شروع کی۔ شاعری کا ڈھانچہ وہی رکھا یعنی غزل، قطعہ، رباعی، مخمس وغیرہ جیسے تھے ویسے ہی برقرار رکھا۔ ان کی شکل میں کوئی تبدیلی نہ کی اس لئے کہ یہ شکلیں صدیوں سے سوسائٹی کی نظروں میں کھپ گئی تھیں ان کو بدلنے میں نراجی کیفیت ہوتی۔ اکبر کو اس میں ادبی محسوسات کے مجروح ہونے کا ڈر تھا۔ ان کا مطلب ادب سے بغاوت نہ تھی۔ ان کو ثواب سے مطلب تھا۔ وہ سماج کی اصلاح مواد و اندازِ بیاں سے کرنا چاہتے تھے لہذا بڑی دُور اندیشی سے ٹیکنیک وغیرہ کے جھگڑوں سے الگ ہو کر اپنے خیالات و محسوسات کو ایسے انداز سے پیش کیا کہ ہر شخص نے اثر لیا کسی نے یہ نہ محسوس کیا کہ کوئی شخص ہم سے الگ ہو کر کچھ کہہ رہا ہے بلکہ سبھوں نے سمجھا کہ ہم ہی میں سے کوئی کچھ ایسی باتیں کر رہا ہے جو سننے کے قابل ہیں۔ اس معرکے میں اکبر کا ایک خاص کارنامہ یہ تھا کہ ان سے پہلے ظریفانہ شاعری میں ایک شخص کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا تھا۔ اجتماعی شعور کا فقدان تھا۔ اکبر نے اپنی بلندیٔ تخیل سے فرد کو طبقہ یا جماعت بنا دیا۔ ان کے جمن، کلو، بدھو مردِ واحد نہیں بلکہ بذاتِ خود ایک انجمن ہیں۔ ان کے کردار میں پوری جماعت کا عکس ہے۔ اب سے پہلے کی ظریفانہ شاعری میں شدتِ اثر پیدا کرنے کے لئے شعراء فریقِ مخالف کی بدترین خصلت، پست ترین اخلاق کو اُبھار کر پیش کرنے کی کوشش کرتے اور کبھی کبھی رکیک و مبتذل الفاظ سے بھی کلام کو دل پذیر بناتے۔ اس طرح اپنی ذاتی مخاصمت اور کینہ پروری کا ثبوت دیتے، لیکن اکبر مذہبی و قومی شعور اور اصلاحی اخلاق کی ٹھوس بنیادوں پر کھڑے تھے۔ کیا مجال کہ ان کے پائے متانت کو بداخلاقی یا بد مذاقی جنبش دے سکتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کو ایسی بھی کوئی بات نہ ملے گی جس میں ذاتی بغض و عناد کی جھلک نظر آئے۔ انھوں نے اس معرکہ میں بڑی بلندی و بہادری سے مخالفین پر حملہ کیا ہے۔ کسی کے حسب نسب یا صورت و سیرت کی کمزوریوں سے فائدہ نہیں اُٹھایا البتہ اس کی اس تحریک یا رویے کا مذاق اڑایا ہے جس سے قوم یا ملک پر شہ پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا مگر کبھی رکیک یا مبتذل الفاظ سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ ان کے اس احساس کو عظمتِ فن سے تعبیر کیجئے یا اپنے مقصد کا احترام سمجھئے، بہرحال اس ادراک کی اہمیت کو اُردو ادب نظرانداز نہیں کرسکتا ......"

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

بھارت کلا بھون۔ بنارس

بھارت کلا بھون ۱۹۲۰ء میں بنارس میں قائم کیا گیا تھا۔ شری رابندر ناتھ ٹیگور اس کے تاحیات صدر مقرر ہوئے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ اور آثارِ قدیمہ کے تمام ممکن مراحل کے مطالعے اور تحقیق کا انتظام ایک ہی جگہ پر کر دیا جائے۔ یہ کلا بھون خوش اسلوبی سے ترقی کرتا گیا اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۰ء تک یہ ایک خود مختار جماعت "کاشی ناگری پرچارنی سبھا بنارس" کے زیرِ انتظام رہا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کا انتظام بنارس ہندو یونیورسٹی نے سنبھال لیا۔

یہ عجائب گھر بھارت کے بہترین عجائب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بہت سے سیکشنوں میں بے شمار لاثانی اشیاء کے مجموعے موجود ہیں۔

اس کا سب سے نفیس سیکشن غالباً مصوری کا سیکشن ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے ہر ایک دور کی نمائندگی کرنے والے عمدہ ترین نمونے چن چن کر یہاں جمع کئے گئے ہیں۔ اس سیکشن کی تکمیل کے دوران میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ کسی دور کے معمولی نمونے جمع کرنے کی بجائے اس دور کو بالکل ہی چھوڑ دینا بہتر ہے۔ کلا بھون آج ترقی کی ایسی منزل پر پہنچ چکا ہے کہ یہ بھارت کی ایسی حقیقی قومی گیلری بن جائے گا جہاں ہندوستان کی مصوری کے فن کے تمام ادوار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

مجسمہ سازی کی گیلری میں بھی اسی طرح کے خاص چنے ہوئے نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ اس جگہ ہندوستان کے پلاسٹک آرٹ کے اعلیٰ ترین نمونے موجود ہیں۔ پرساد ھیکا کارتکی اور نٹ راج (پندرھویں صدی کا کانسی کا مجسمہ جو ترچناپلی سے ملا ہے) چند ایک نمایاں نادرات ہیں۔ پختہ مٹی کی مورتیوں کے سیکشن میں راج گھاٹ (بنارس) اور کوشمبی (الٰہ آباد) سے حاصل کی گئی خاص اشیاء رکھی گئی ہیں۔ کشن اور گپتا عہد کے سونے کے سکوں کے علاوہ مغل عہد کے تانبے اور چاندی کے سکوں اور دہلی کے سلطانوں کے سکوں کے کئی ایک عمدہ نمونے بھی یہاں جمع کئے گئے ہیں۔

کلا بھون کا ایک اہم حصہ گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں کے نمونوں کے لئے مخصوص ہے۔ جس میں زیورات، قیمتی جواہرات اور میناکاری کے بے شمار نمونے جمع ہیں۔ ہندوستان کی پارچہ بافی کی صنعت کے عمدہ نمونوں میں شالیں، کشیدہ کاری، زرنگاری، چھینٹ اور زربفت کے پارچات سارے ہندوستان کے مختلف حصوں سے جمع کئے گئے ہیں۔

تانبے پر کندہ کاری والی تھالیاں، پتھروں پر کھودی گئی تحریریں، مٹی کی مہریں، قدیم سندیں اور مغل شہنشاہوں کی کئی یادگاروں کے علاوہ موہنجوداڑو سے برآمد کی گئی عمدہ اشیاء، تانبے کے چند اوزار اور برتن بھی یہاں موجود ہیں۔

کلا بھون کے انوکھے ادبی شعبے میں ہندی اور اردو کے مشہور اہلِ قلم کے قلمی نسخے، ہندی کتابوں کے پہلے ایڈیشن اور ہندی اخباروں اور رسالوں کے پہلے پرچے بھی جمع کئے گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی کچھ قلمی تحریریں اور دستاویز بھی اس سیکشن کی قیمتی اشیاء میں شامل ہیں۔

عجائب گھر کی لائبریری میں بھارتی فنونِ لطیفہ اور ان سے متعلق مضامین پر بہت سی اچھی کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔ کلا بھون خود بھی ایک با تصویر آرٹ رسالہ ہندی میں "کلا ندھی" کے نام سے شائع کرتا ہے۔

اختر علی تلہری

خودستائی کی ورزش

خاص طرح کے پڑھے لکھے انسانوں کا وہ محترم گروہ جس کی رُوح پر فتوح پہ خشکی کی کئی کئی تہیں چڑھ چکی ہیں ہمیشہ موقع بے موقع اخلاقیات کا درس دیتا نظر آتا ہے اور اس مقدس اُن کی روکھی پھیکی ہدایتوں سے وہ ایک لمحے کے لئے بھی نگاہ ہٹا لینا گناہِ عظیم سمجھتا ہے۔ کسی نے اِدھر اُس کے سامنے "ثنائے خود بخود کردن" کا خودوارانہ عمل شروع کیا اور اُدھر اُس کی پیشانی کی اچھی خاصی صورت بگڑ گئی۔ کسی نے اس طرف "انانیت" کے بجائے بھرکم سجیلے جذبے سے ذرا اکڑ کر "تعلی" کی بساط بچھائی اور اُس طرف اُس کی بھویں بلاوجہ تننے لگیں۔

دنیا کی اس "اخلاق زدہ" مخلوق کا عقیدہ ہے کہ آدم و حوا کی تمام اولاد کو خواہ اُن کا رشتہ جوانی سے ہو یا بڑھاپے سے اپنے فکر و خیال و گفتگو کی کمر ہمیشہ خمیدہ رکھنا چاہیئے۔ اُن کے کسی انداز سے، کسی طریقے سے یہ نہ معلوم ہو کہ نفس کی بلندی اور مزاج کی تمکنت کی سرفرازیوں سے انھیں کوئی دُور کا بھی علاقہ ہے۔ حضرت عزرائیل (یعنی ملک الموت) کے ملایانہ چہرے کی زیارت سے پہلے مر رہنا جیسے "روحانی زیرکی" ہے اُسی طرح بوڑھا ہونے سے پہلے بوڑھا بن جانا "اخلاقی ہوش مندی" ہے۔ ان کی نگاہ میں انسانیت کا جوہر صرف یہی ہے کہ دیو جانس کلبی در افلاطون وغیرہ کے اخلاقی اصول عمل کی مٹھی میں ہر وقت دبے رہیں۔ اب خواہ اُس طرح خاکسار بنتے بنتے "نابکار" اور "ناہنجار" ہی کیوں نہ بن جانا پڑے۔ موقع و محل کا لحاظ کئے بغیر اس مرحوم جماعت کی سنہری اور روپہلی نصیحت یہی ہوگی کہ "جھوٹ نہ بولو، باتیں نہ بناؤ، شیخی نہ بگھارو"۔ بہت اچھا، بہت خوب۔ یہ پیرانہ فیلسوفائی سر آنکھوں پر۔ لیکن پوچھنے کی بات یہ ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی جھوٹ ایسا ہو، کوئی شیخی ایسی ہو جس سے ہماری قوتِ تخیلہ کی بلند پروازی کا سکّہ بلا کچے دنوں پر بیٹھ جائے یا بغیر کسی محنت و مشقت کے ہم عجائب و غرائب کی جیتی جاگتی انسائیکلوپیڈیا سمجھ لئے جائیں تو یہ جھوٹ، یہ تعلی، یہ شیخی زیادہ صحیح لفظوں میں یہ زندگی سے بھرپور مکمل شعر کیونکر کسی واعظانہ زجر و توبیخ کا مستحق ہو سکتا ہے؟ ذرا غور فرمائیے! جہاں سخن شناس اور نکتہ سنج احباب باصفا کا مجمع ہے اور اُن کا ہر بُنِ مو زبانِ حال سے کہہ رہا ہے "کان ہیں مشتاق کچھ ارشاد ہو" تو ایسے میں ہمارا کیا فرض ہے؟ کیا مقتضائے حال کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ ہماری گفتگو کا سینہ ہر گوشے سے قانون ساز جماعتوں کی ممبری کے اُمیدواروں کی تقریروں کی طرح تن جائے اور ہم بلا تکلف اپنی معلوماتی وجاہت اور ہمہ جہتی فضل و دانش کی وسعت کا رُعب جمانے کی تمام شریفانہ صورتیں اختیار کریں۔

ایسے مناسب و سازگار موقع پر اگر ہم نہایت متانت کے ساتھ یہ کہہ ڈالیں کہ اب سے دس برس اُدھر ایک کشمیر نظیر خطے کے ایک اخلاص کیش عقیدت مند پیر نے ہماری خدمت میں نیاز مندانہ خلوص کے ساتھ ایک ایسا عجیب و غریب خوش رنگ و خوش ذائقہ سیب پیش کیا تھا جس کی ایک قاش کھا لینے کے بعد سال بھر ہمیں کسی غذا کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی اور اس دوران میں جس وقت ہم نے جس غذا کا تصور کیا اُس کا مزہ سچ مچ حاصل ہو گیا اور بلا مبالغہ اس مدت میں ہمیں کبھی اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ مرغ مسلّم، بریانی، شاہی ٹکڑوں وغیرہ وغیرہ کی لذّت حاصل کرنے کے لئے اپنے حلقہ بگوش مریدوں سے دعوتیں وصول کرنے کی سعی کریں۔ آج بھی اُس فردوسی سیب کی قوت ہماری رگوں میں اس طرح اُچکتی پھاندتی نظر آتی ہے کہ ہم ایک جست میں ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ سکتے ہیں۔ یا پھر سامعینِ کرام کے شوقِ سماعت کی تشنگی محسوس کرتے ہوئے ہم یہ فرما ڈالیں کہ فلاں بر اعظم کے فلاں بے آب و گیاہ دشت کی سیاحی میں ہماری نگاہ سے ایک ایسا شخص گذرا ہے جو اپنی اُنگلیوں سے بادلوں کا رُخ حسبِ منشا

مشرق سے مغرب کی طرف اور مغرب سے مشرق کی طرف موڑ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہمارا بندۂ بے دام ہوگیا اور اپنے چوڑے چکلے کاندھوں پر بٹھا کر ہمیں نہ صرف چاند کی سیر کرائی بلکہ مریخ وغیرہ کے چپے چپے میں گھما ڈالا اور وہاں کے اس سائنسی عظیم الشان کارخانے کی بھی زیارت کرادی جہاں فضائے عالم میں پرواز کرنے والے طشتری نما جہاز تیار کئے جاتے ہیں تو اب آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ ہمارے ان بیانات پر کسی باحواس انسان کو "خواہ" اس کا کیا حق ہے کہ وہ ہمیں کھا جانے والی تیز و تند نظروں سے دیکھے اور "لاحول ولا قوۃ"، توبہ، استغفر اللہ العیاذ باللہ کے سے وحشت انگیز نعروں سے ہماری تواضع کرے

اور گو اور یہ اخلاقی سرچڑھے عالی خیال، عرش پرواز شاعروں کی رندانہ محفلوں میں بھی کبھی کبھی چور دروازوں سے گھس آتے ہیں۔

صاف بات تو یہ ہے کہ انسانی خودداری کے مطالبوں کی تسلی کا سامان صرف اسی بلند نفس جماعت کے پر تفاخر رجزیہ قسم کے دعووں سے فراہم ہوتا رہا ہے۔ اسی عالی ظرف گروہ کی انجمنِ شرف ہی سے تو یہ ہمت افزا خوش آیند صدائیں اکثر و بیشتر شان کے ساتھ بلند ہو کر "سامعہ" کی ضیافت کرتی رہتی ہیں۔

بانگِ قلم درین شبِ تار | بس منی خفتہ کرد بیدار
امروز نہ شاعرم حکیم | دانندۂ حادث و قدیم

اسی قسم کے نعروں سے تو ہمیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ انسان کی خودداری کہیں سے خطرے میں نہیں ہے۔ ہمیشہ اس کا بول بالا رہے گا۔

ایسی صورت میں اسے ڈھیلے ڈھالے معاشرے کی ستم ظریفی ہی سمجھئے کہ یہ اخلاق گزیدہ مخلوق۔ یبوستِ ذوق کے یہ خطرناک مجسمے، پند و موعظت کا لبے معنی دفتر بغل میں چھپائے بھیس بدلے خانقاہوں سے ان محترم خراباتوں میں بھی اخلاقی تبلیغ کا مزعومہ فریضہ ادا کرنے وارد ہو جاتے ہیں۔

کوئی پوچھے آخر آپ کو دنیا کی ان دل چسپ رنگینیوں سے اتنی دشمنی کیوں ہے آپ کے دل و دماغ پر اگر خشکی نے بدنصیبی سے قبضہ کر لیا ہے اور آپ مذاق کی لطافتوں اور نفاستوں کا احساس نہیں فرما سکتے تو اس کے درپے کیوں ہیں کہ ہماری یہ خوب صورت حسین دنیا کسی "بد سیاہ چہرہ زنِ صد سالہ" کے جھریاں پڑے ہوئے بدنما چہرے کی طرح پیچ پیچ بن جائے۔

جناب صائب صاحب تبریزی ایران کے بڑے نامی گرامی تمثیل باز شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو شعراء کے بکھانے ہوئے صاحب جبہ و عمامہ شیخ بننے کا مبارک مرض اکثر لاحق ہو جاتا ہے۔ آپ اچھی اچھی باتیں کرتے کرتے دفعۃً "خودستائی" سی قابلِ ستائش چیز پر بگڑ بیٹھے ہیں اور واعظانہ درشت لہجے میں بڑے ہی عجب و پندار کے ساتھ دل سوختہ کے رنگ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ثنائے خود بخود کردن نہ زیبد مردِ عاقل را"

اس یبوست مزاج دعوے کو مبرہن اور مستحکم بنانے کے لئے آپ دوسرے مصرعہ میں ایک خاص الخاص ادق نفسیاتی مسئلہ بیچ میں گھسیٹ لائے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"چو زن ..... خود مالد حظوظِ نفس کے یابد"

اس قسم کی "بلا اعانتِ غیرے مالش" اور عدمِ احساسِ لذت کا تعلق تو خیر ہیولاک ایلس، ڈاکٹر میری اسٹوپس، فرائڈ اور ینگ وغیرہ کے سمجھنے کی بات ہے۔ ان کوک شاستری مسئلوں سے ہمیں کوئی بحث نہیں لیکن واعظانِ سرکہ جبیں کی ملامتوں سے ڈرے بغیر ہم یہ ڈنکے کی چوٹ کہیں گے کہ صائب صاحب کا یہ پُرتحکم فرمان کہ خودستائی مردِ عاقل کے لئے زیبا نہیں ہے۔ اخلاقی نصیحت گری کی نہایت ہی غیر دل چسپ تری کھری واعظانہ نمائش ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ منطقی چیر پھاڑ کے چھوٹے بڑے اوزار لے کر اس موعظے پر جراحی عمل کر دیا جاتا لیکن ایک بدیہی بات کے واضح کرنے کے لئے اس سر مغزن کی حاجت بھی کیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ خودستائی میں لطف نہیں آتا جناب صائب کی غیر صائب قیاس مع الفارق نوعیت کی تمثیل کا فتوے کچھ ہو لیکن حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ اس سے زیادہ نفس کے کام و دہان اور کسی چیز سے لذت یاب نہیں ہوتے۔ اس کی چاٹ اگر ایک مرتبہ لگ جائے تو پھر دیکھیں کہ اس کے مزے سے کون اخلاق مآب صاحب کنارہ کش ہونا پسند فرماتے ہیں۔ خودستائی کا مزہ وہ کیا جانیں جن سے بلا تکلف یہ کہا جاسکتا ہے ع ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔

میں تو کہوں گا خودستا انسان دنیا کا بہترین انسان ہے۔ اس کا دماغ برابر عرشِ اعلیٰ پر کرسی نشین رہتا ہے۔ اس کا قلب علامہ اقبال کی محدود خودی کا فلسفیانہ احساس رکھتا ہے۔ اس میں عالم الملکوت کو شرما دینے والی بے نظیر جرأت ہوتی ہے۔ اسے دوسروں کو بے وقوف سمجھ لینے کا فن آتا ہے۔ وہ اپنے کو کسی خاکسارانہ دلیل کی بنا پر گرانا نہیں چاہتا۔ وہ

اپنی ذات میں پوشیدہ عظمتوں اور رفعتوں کو پورے زورِ بیان سے اُچھالتا ہے۔ اُسے اپنی اہمیت کا اعتراف کرانے کے لئے کسی "اپرے غیرے نتھو خیرے" کے آستانے پر سرِ نیاز جھکانے کی حاجت نہیں ہوتی۔

آخر خودستائی بُری چیز کیوں ہو۔ اگر ہم اپنی تعریف خود کرتے ہیں اپنے اوصاف خود گناتے ہیں۔ اپنے فضائل کی تشہیر کے لئے طلاقتِ لسانی سے کام لیتے ہیں اور اس طرح عوامی محاورے میں "اپنے منہ میاں مٹھو" بن لیتے ہیں تو خدا را بتائیے اخلاق کی بارگاہ میں ہم سے کون سی گستاخی ہو جاتی ہے۔ اخلاقی شریعت کے نقطۂ نظر سے ہم کس گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

فرض کیجئے ہم سیاسی سُوجھ بوجھ میں دنیا کے بڑے بڑے سیاست دانوں سے فرسنگوں آگے ہیں اور اس فنِ شریف میں ہماری معلومات کچھ اس ڈھب کی واقع ہوئی ہیں کہ آج کے تمام اعاظمِ رجالِ سیاست کو ہمارے سامنے زانوئے تلمذ بغیر کسی پس و پیش کے تہ کر لینا چاہیئے۔ لیکن ناشناس دُنیا اس اہم واقعے کا علم نہیں رکھتی تو پھر ہمارا اس حقیقت کے اظہار کے لئے مختلف گوشے پیدا کرنا اور سامعین کے کانوں کو اپنی غیر معمولی سیاست دانی کے افسانوں اور قصّوں سے بھرتے رہنا کون سی غلط بات ہے۔ ان افسانوں اور قصّوں میں مبالغے سے مستعار لیا ہوا کچھ داستانی رنگ سہی لیکن ان سے ایک حقیقت تو اُجاگر ہوتی ہے۔ ایک مُحقق امر کے چہرے سے پردہ تو ہٹتا ہے، یا پھر حُسنِ اتفاق سے ہم ایک ایسے شاعر ہو پڑے ہیں جس کے مقابلے میں کالی داس، شکیپیر، فردوسی اور انیس و غالب کے زمزمے زاغ و زغن کی آواز سے زیادہ غیر شاعرانہ معلوم ہونا چاہیئے۔ لیکن بد مذاق اور بے شعور دنیا اسے نہیں سمجھ رہی ہے اور روایتی اعتقاد کے چکّر میں مبتلا ہو کر اس سچائی کے احساس سے محروم بھی رہنا چاہتی ہے تو پھر ہم اگر اُٹھتے بیٹھتے اپنے کلام فصاحت التیام و بلاغت نظام کی سحر کاری و اعجاز نمائی کا ذکر کر کے دنیا کی بد مذاقی کو خوش مذاقی سے بدلنے کی مسلسل جدوجہد کریں اور یہ کہتے رہیں کہ اس عصر کے تمام شعرائے کرام خواہ وہ اقبال و جوش وغیرہ کی قسم کے دیوزاد ہی کیوں نہ ہوں ہمارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان سب نے ہمارے ہی "رشحاتِ فکر" سے اپنی شاعری کی کھیتیاں سرسبز کی ہیں۔ ہمارے ہی سرمایۂ شعر کے سرقے پر اُن کی شاعری کی زندگی کا دارو مدار ہے تو ہم پر کبھی سے کسی اعتراض کا کوئی پہلو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں بہرحال اپنی اعلےٰ شاعری کا لوہا منوانے کا فطری حق حاصل ہے وہ دوسروں پہ سرقے کا الزام لگا کر

ہی سہی تو پھر ہم کیوں اپنے اس پیدائشی حق سے خواہ مخواہ کے احمقانہ اخلاقی "تکلّفات" کی بنا پر دست کش ہوں۔ اسی طرح فرض کیجئے ہم دنیا کے بڑے ہی چوٹی کے انشا پرداز ہیں۔ تصنیف و تالیف کی جملہ اعلےٰ صلاحیتیں ہماری فطرت کی جھولی میں قدرت کے ہاتھوں نے بڑی فیاضی سے ڈال دی ہیں اور اب عالم یہ ہے کہ ہمیں ذرا سی بات مل جائے تو ہم اسے اتنا لے اڑیں کہ وہ آسمان تک پہنچ جائے۔ جس فن کی زمین میں قدم رکھیں اُس میں لطیف نکتوں اور باریکیوں کے اتنے پھول کھلا دیں کہ گوشہ گوشہ "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" ہی نظر پڑے۔ لیکن بدنصیبی سے موجودہ کم نظر کاروباری دنیا کو اس کا موقع نہیں ملا کہ وہ ہماری تصنیفی صلاحیتوں کا قرار واقعی احساس کر سکے یا ہماری لاثانی انشا پردازی کے خوش آب جواہر پہ تعریف و ستائش کے موتی نچھاور کر سکے تو پھر یہ کون سی عقلمندی کی بات ہوگی کہ ہم خود اپنے کمالات کا اپنے اوصاف کا زور و شور سے ڈھنڈورا نہ پیٹیں۔

کسی زمانے میں مشک ضرور ایسی خوش بو دیتا ہوگا جس سے ہر سو نکھنے والا یہ سمجھ جائے کہ یہ مشک ہے مشک۔ لیکن اب تو صورت حال بالکل ہی بدل چکی ہے۔ مشک کو مشک ثابت کرنے کے لئے اچھے خاصے دلائل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج قانون بنانے والی سبھاؤں میں پہنچنے کے لئے ہمارے بڑے نیتاؤں کو اخباروں کے کالموں میں اور پبلک پلیٹ فارموں پر اپنی خودستائی کے قصیدے ارشاد نہ فرمانا پڑتے۔ ہمیں اگر کسی جگہ کے حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں اپنی قابلیت کے نمایاں کرنے کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلنا پڑتے۔ سوچیے، غور کیجئے کیا یہ باتیں خودستائی کو عیب قرار دینے کے بجائے اُسے ایک ترقی پسند انسان کے لئے لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی نہیں بنا دیتیں۔ اصل کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے "میں" عربوں کے "انا" اور یونانیوں کے "ایگو" کے جوہر اصلیت میں تو خودستائی ہی کی بدولت کھلتے ہیں۔ اُس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اب سے کچھ پہلے ہم بھی خودستائی کے متعلق اس اخلاق گزیدہ برگزیدہ مخلوق کے اسی زہریلے پراپگنڈے کے مارے ہوئے تھے۔ خودستائی کے شرف کے مالک معدودے چند افراد کی خود نمایانہ ستائیشیں ہمیں بد اخلاقی یا پھر معصومانہ ابلہیت کی بدنما تصویریں معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب ہمارے ان فرسودہ خیالات پر اُن اخلاق نما مغالطوں کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اب ہم برابر

اپنی ان احمقانہ زباں درازیوں سے تو یہ کہتے رہتے ہیں جن کا ارتکاب ہم سے دورِ جہالت میں خودستائی کے خلاف ہو چکا ہے۔ ہم اپنے ان دوستوں اور بزرگوں کے ممنون ہیں جنھوں نے خودستائی کو عملاً برت برت کر ہمیں اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کرنے کی ہمت بندھائی۔

جب ہمارے واجب الاحترام دوست اور بزرگ ہر موقع پر مختلف حکمت و رنگ کی گفتگوؤں کو اپنی تعریفوں کے مرکز کی طرف موڑ دینے پر آمادہ نظر آئے تو ہم سمجھے کہ اگر خودستائی فی الحقیقت بُری چیز ہوتی تو سقراط و بقراط کے پر کان کاٹنے والے عثمان وار سطو کی متاعِ ہوش و فرہنگ کو یہ لوٹ لینے والے اس شغلے میں رات دن اتنے کیوں منہمک رہتے۔ تھوڑے دنوں کے غور و فکر ہی نے ہمیں سمجھا دیا کہ ہماری پہلی روش محض ناتجربہ کاری اور عقل و فہم کی نارسیدگی کا نتیجہ تھی فللہ الحمد

اب تو بفضلہ ہم اس کے کہنے کے لئے مستعد اور آمادہ ہیں کہ خودستائی نہ صرف شاعرانہ لطافتوں کا گنجینہ اور روحانی علاوتوں کا خزینہ ہے بلکہ اُس میں افلاطون کی مثالیت، مِل کی افادیت اور مارکس کی اشتراکیت بھی پائی جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اب ہم نظری حیثیت سے خودستائی کی لطیف ورزش کو منجملۂ فضائلِ انسانی قرار دیتے ہیں اور اس کے کلّی حامی ہیں۔ اس فضیلت کا جس محترم ہستی میں بھی ہمیں معمولی سا نشان بھی نظر آ جاتا ہے۔ ہم اس کے صرف مداح ہی نہیں بلکہ اس کے کمترین مرید بن جاتے ہیں۔ لیکن ابھی ہم میں ایک بڑی کمی ہے۔ ہم گفتار کے غازی تو بن گئے ہیں مگر کردار کے غازی نہیں بن سکے ہیں۔ اپنے عمل کی اس تہی دامنی پر ہمیں افسوس ہی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اس کوتاہی پر ہم جھنجلا بھی اُٹھتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب ہمارا کوئی بے تکلف دوست خودستایانہ لہجہ میں اپنے "ہر فن مولے" ہونے کے مختلف واقعے مزے لے لے کر بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ تو ہم اُس کی اس قابلیت کو کتنے رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس وقت ہمیں اپنی فطرت کی پستی کا بے حد تلخ احساس ہوتا ہے اور ہم بُری طرح سوچنے لگتے ہیں کہ یا اللہ وہ دن کب آئے گا جب ہم بھی اسی طرح سینہ تان کر گردن کی رگیں پھلا کر تفاخر کناں لہجہ میں اپنے اوصاف کے، اپنے فضائل کے لذت بخش ستائشی قصیدے پڑھتے نظر آئیں گے۔ طبع کے چھوٹے پن سے ابھی تو اپنا یہ حال ہے کہ جب ہم اس قسم کی کوشش کی خفیف سی ہمت بھی کرتے ہیں تو دل کی حرکت خاصی تیز ہو جاتی ہے۔ زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ چہرے کے رنگ میں تغیر پیدا ہونے لگتا ہے۔ یقین فرمایئے کہ اگر اُس وقت کوئی مشاہدہ بازِ نفسیات کا عالم موجود ہو تو وہ فوراً اس کا احساس کر لے گا کہ ما بدولت ندامت و خجالت کی قدِ آدم تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ خدا اعصاب کی اس کمزوری اور کہتری کے اس خطرناک احساس سے دشمن تک کو بچائے۔

کل ہی کا ذکر ہے۔ ایک جگہ خاص الخاص بزرگوں اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ایک گوشے میں ہم بھی سکڑے سکڑائے بیٹھے تھے۔ موجودہ سیاسیات کا تذکرہ چھڑ گیا۔ ایک سال خوردہ محترم بزرگ نے جو اب عملی سیاست سے بعض مخصوص مصالح کی بنا پر الگ ہو چکے ہیں۔ بلا توطیۂ و تمہید اپنے سیاسی کمالات کا یوں قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ "آج کل کے سیاسی چودھری میرے سامنے طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیاسیات کے جن رموز و نکات تک میری نظر پہنچتی ہے۔ اُن کی ہوا بھی بڑے سے بڑے سیاسی بوجھ بجھکڑ کو نہیں لگ سکتی۔ آج قومی اور بین الاقوامی مسائل میں جو گتھیاں پڑی ہوئی ہیں، انھیں میں باتوں باتوں میں سلجھا سکتا ہوں۔ بینن، لائڈ جارج، پریسیڈنٹ ولسن، مصطفےٰ کمال برابر خفیہ طور سے مجھ سے اہم ملکی مسائل میں مشورے حاصل کرتے رہتے تھے۔ استعماری نظام کی بنیادیں کمزور کر دینے میں میرا بڑا ہاتھ ہے۔ بہت سے غلام ملکوں کو آزادی میری ہی سیاسی تدبیروں نے دلوائی ہے۔ یو۔ این۔ او کی داغ بیل ڈالنے میں میری ان تھک کوششوں کا بیشتر حصّہ ہے۔ مختصر لفظوں میں تمام سیاسی رہنما مجھے سیاست و تدبّر کا دیوتا مانتے ہیں۔"

دوسرے حاضر دماغ رفیق نے یہیں سے ایک گوشہ پیدا کر کے اپنے ادارتی و صحافتی بین الاقوامی امتیاز پر فاضلانہ تقریر شروع فرما دی کہ میں نے انگریزی، اُردو وغیرہ وغیرہ کے فلاں فلاں نامی گرامی اخبارات اور جرائد میں مسائلِ حاضرہ کے بارے میں ایسے ایسے مقالے لکھے ہیں جن کی شہرت آج بھی سیاسی دُنیا میں ہے۔ لندن ٹائمز، مانچسٹر گارجین پارود وغیرہ کے محترم اڈیٹروں نے بڑے ہی ستائشی الفاظ میں اُن کا نوٹس لیا ہے۔ اور اب بھی اُن کی مجھ سے یہ خواہش ہے کہ بین الاقوامی مسائل کے متعلق کبھی کبھی چند سطریں لکھ دیا کروں۔ ایک تیسرے عیاری مجرکم صاحب نے بات سے بات نکال کر یوں گویائی کے جوہر دکھانا شروع کئے۔ "آپ حضرات نے میری

فلاں تنقیدی تصنیف دیکھی ہے۔ اس کا تو ہر طرف چرچا ہو رہا ہے۔ مارکس کا جدلیاتی فلسفہ ملحوظ رکھتے ہوئے مصنف نے تمام دنیا کے ادب کا مادی تحلیل و تجزیہ کر ڈالا ہے اور اس طرح رجعت پسندی کے تابوت میں آخری کیل جڑ دی ہے۔ تمام بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی رائے ہے کہ اس مرتبہ نوبل پرائز کا قرعہ اسی کتاب کے نام پر نکلے گا۔ ایک صاحب جو ابھی تک مخصوص خاموشی کے ساتھ اپنے بکھرے ہوئے لمبے لمبے بالوں سے کھیلنے میں معروف تھے یک دفعہ جیسے کسی خواب سے چونکتے ہوئے بول پڑے کہ آپ سب حضرات کے کارنامے قابلِ صد احترام ہیں لیکن یہ سب "خشکیات" کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ انھیں عام حلقوں میں قبولیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ البتہ آپ کے اس خادم نے علم و ادب کی جو خدمتیں اپنی لطیف و لذیذ، شیریں و ملیح شاعری کے ذریعے سے کی ہیں اُن کا تذکرہ ہر خاص و عام کے لب پر ہے۔ صنفِ کرخت کا تو ذکر ہی کیا صنفِ نازک بھی پس پردہ میرے لطیف اشعار گنگنا گنگنا کر گونا گوں لذتیں حاصل کرتی رہتی ہے۔ مجھے معاشرے کا ہر طبقہ اپنا مخصوص شاعر سمجھتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ میری آسمان پیما تخیل کے سامنے ملٹن، عرفی اور غالب کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ چھوڑیئے۔ ان سب سوکھی پھیکی باتوں کو اور سنیئے میری تازہ بتازہ نو بہ نو نشاط بخش سرور انگیز غزل نما نظم۔" ان مزیدار ارشادات کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے حاضرینِ بزم میں سے ایک ایک کو نام بنام مخاطب کر کے اپنی بانکی چھبیلی نظم خود ستایانہ الفاظ کے شان دار مرعوب کن تشریحی ضمیموں کے ساتھ چھیڑ دی۔ اس دل چسپ محفل کا یہ شگفتہ رنگ دیکھ کر ہمارا بھی جی چاہا کہ ہم بھی اس لطیف گفتگو میں حصہ لے کر اپنے حظِ نفس کا سامان فراہم کریں۔ فلہٰذا ہم نے بڑے ہی انہماک کے ساتھ یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہم کس چیز میں بالفعل خود ستا بنیں۔ ہم نے اپنی تمام ظاہری و باطنی خصوصیتوں کا جائزہ لے ڈالا مگر قسمت کی بد توفیقی سے ہم کوئی چیز بھی اپنے اندر اس خود دارانہ مشق کے لئے منتخب نہ کر سکے اور ہمیں مجبوراً اُن محترم اور معزز افراد کی باتوں کے سننے اور اُن کی صورتوں کے دیکھنے پر اکتفا کرنا پڑی۔ ہمیں اپنی بے چارگی کا اس سے زیادہ اور کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اب ہم نے نہایت سنجیدگی سے اس کا عزم بالجزم کر لیا ہے کہ آئندہ سے ہم اپنی خلوتِ خاص میں خود ستائی کی ڈنڈیں اور بیٹھکیں لگانا شروع کر دیں گے اور اس وظیفے کا ورد کریں گے کہ ہم دنیا کے سب سے اچھے شاعر ہیں۔ سب سے اچھے انشا پرداز ہیں سب سے اچھے افسانہ نگار ہیں سب سے اچھے تیر بہدف قسم کے سیاسی مدبر ہیں۔ مختصر جامع و مانع لفظوں میں آٹھوں گانٹھ کمیت (اسے علامہ کا ترقی پسند مقام سمجھئے) ہیں۔ کوئی ابھی سُنے نہیں۔ ہم نے آج ہی صبح سویرے نمازِ فجر کے بعد خودی کے اس اُبھارنے والے وظیفے کی کئی تسبیحیں پڑھ ڈالی ہیں۔ اگر ہمارا یہ ارادہ کسی ثقیل قسم کے اخلاقی ملا کے شکنجے میں نہ پھنس گیا تو انشاء اللہ العزیز انکسار و فروتنی کے پست جذبے کی پیدا کی ہوئی یہ جھینپ جلد مٹ جائے گی اور ہم بھی ہر محفل میں ہر مجمع میں اپنے موجودہ و متوقع اوصاف و محاسن کو دھڑلے سے اپنی بقلم خود زبان معجز بیان سے تڑاق پڑاق ادا کرتے نظر آئیں گے۔ فقط

شمبھوناتھ شیش   ترجمہ از ہندی منوّر لکھنوی

وقتِ حسیں

(ہندی زبان کے مشہور نوجوان شاعر شری شمبھوناتھ شیش کی نظم سویلا کا منظوم عکس)

دُور چشمِ ظاہری سے لاکھ ہوں انوارِ حسن
رہ نہیں سکتے مگر دم بھر بھی چشمِ دل سے دُور
وقتِ شب رہتا نہیں جیسے ستاروں کا جمال
آسمانِ نیلگوں کی نازنیں محفل سے دُور

آدمی کے دل کا آئینہ دکھاتا ہے ہمیں
حُسن کی دنیائے گوناگوں کے آثارِ جمیل
اپنے مرکز پر بھی رہ کر وہ بعید از شکل و نام
کچھ نہیں ہے جلوہ گاہِ کیف کے حاصل سے دُور

محوِ خمیازہ ہیں کس کی مدھ بھری رعنائیاں
نغمہ سنجی طائرِ دل کی ہے کوئل کی طرح
پھر بھی سازِ دل کا اک پردہ نہیں اے جانِ حُسن
نغمگی کی مرتفع سے مرتفع منزل سے دُور

ہوشیار اے عقل و دانش ہوشیار اے آگہی
انقلابِ نو کا دریا کتنا طوفاں خیز ہے
کارنامہ زندگی کا ایک بھی ایسا نہیں
جو نہیں پامالیِ دنیائے آب و گِل سے دُور

جادۂ ہستی میں اے محوِ تلاشِ گنجِ عیش
دل کا آئینہ مکدّر کیوں ہے گردِ یاس سے
میں نے یہ مانا کہ ہے دشوار تیرا راستہ
تو نہیں ہے جلوہ گاہِ عشرتِ کامل سے دُور

جادوانیّت کے جھولے میں جھلاتی ہے کبھی
سازِ دنیا پر کبھی رکھتی ہے مضرابِ طرب
اس طلسمی کارخانے میں نہیں کوئی عمل
اُس سراپائے نیازِ سوز و سازِ دل سے دُور

اکرام جاوید

ریڈیائی تمثیل

سویرا دور نہیں

کردار

اختر شرفو سجاد اختر کی ماں رمیش رضیہ

(ہلکی ہلکی اضطراب انگیز موسیقی کے درمیان دھیمی سی دستک۔ قدموں کی چاپ اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز)

اختر۔ (رازدارانہ لہجے میں) کون؟ شرفو۔ تیار ہو گیا سامان؟

شرفو۔ (دھیمی آواز میں) جی ہاں اختر میاں۔ سب تیار ہے۔ اور ہاں آپ کے دوست رفیق بابو نے کہا ہے کہ وہ ہوٹل ہی پر آپ کی راہ دیکھیں گے۔

اختر۔ اچھا تو شرفو تم جلدی سے پورا سامان موٹر میں رکھ دو۔ سمجھ گئے نا؟

شرفو۔ سمجھ گیا میاں۔ سمجھ گیا (قدموں کی چاپ)

اختر۔ (جلدی سے مخاطب کرتے ہوئے) اوہ سجاد بھائی آپ؟

سجاد۔ (قریب پہنچ کر) یہ سب کیا ہو رہا ہے اختر؟

اختر۔ (پُرسکون لہجے میں) میں گاؤں جا رہا ہوں۔

سجاد ....اختر

اختر۔ (تڑپ کر) سجاد بھائی

سجاد۔ (اداس آواز میں) پانچ سال تک نگر نگر کی خاک چھان کر اب گھر لوٹے ہو اور آج دوسرے ہی دن پھر گاؤں جانا چاہتے ہو۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے اختر؟

اختر۔ (غم سے) یہ مت پوچھئے سجاد بھائی۔ بس مجھے جانے دیجئے۔

سجاد۔ کیوں نہ پوچھوں؟ تم میرے صرف چچا زاد بھائی ہی نہیں بلکہ ایک عزیز دوست بھی ہو۔ کیا مجھے اتنا حق حاصل نہیں؟ آخر تم چاہتے کیا ہو اختر؟

اختر۔ (کھوئے ہوئے انداز میں) میں یہ نہیں بتلا سکوں گا سجاد بھائی (رک کر) اب میں یہاں رہوں بھی تو کس کے لئے رہوں۔ کیوں کر رہوں؟

سجاد۔ تو تمہیں اب تک نجمہ کا غم ہے؟ (ساز کی جھنکار)

اختر۔ (کراہ کر) میں بھول جانا چاہتا ہوں۔ سجاد بھائی میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔

سجاد۔ مجھے بھی اس کا بڑا غم ہے اختر۔ کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تم نجمہ کو اس قدر چاہتے ہو۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا۔

اختر۔ (ڈوبتی ہوئی آواز میں) شاید آپ کچھ نہیں کر سکتے تھے سجاد بھائی۔ شاید نجمہ میری زندگی میں آئی ہی اس لئے تھی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے۔ شاید شمع جلتی ہی اس لئے ہے کہ ایک بار جلے اور پھر بجھ جائے ہمیشہ کے لئے۔

سجاد۔ اختر! زندگی سے اس قدر مایوسی! تعجب ہے۔

اختر۔ مگر میں زندہ ہی کب ہوں سجاد بھائی۔ ایک متحرک سانس کو آپ زندگی کا نام دے دیں تو پھر زندگی کا مفہوم ہی بدل جائے گا۔ میں کہاں اور زندگی کہاں؟

سجاد۔ کس قدر جذباتی ہو اختر۔ یہ بھول رہے ہو کہ تم ایک ادیب ہو، فن کار ہو، اور ایک فن کار کا فن خود اس کی زندگی ہے۔

اختر۔ (غم سے) میرا فن ہی میری زندگی تھا۔ مگر اب تو میرے فن کی جوانی، میری کہانیوں کا شباب سب کچھ لٹ گیا سجاد بھائی۔

سجاد۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے اختر۔ تمہاری یہ حالت ہو جائے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا.... (خاموشی) (پکارتے ہوئے) اختر۔۔۔!

اختر۔ ہاں سجاد بھائی اب مجھے جانے دیجئے۔ میں گاؤں جا رہا ہوں۔ شاید وہیں میرا سکون، میرا قرار اور میری تسکین میرا انتظار کر رہے ہوں۔

سجاد۔ نہیں اختر۔ تم گاؤں نہیں جاؤ گے (دھیرے سے) سوچو تو تمہاری صحت کس قدر گر گئی ہے۔ اس وقت تمہیں آرام کی ضرورت ہے مت جاؤ اختر۔

اختر۔ (تیز آواز میں) مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میں اس ماحول سے فرار چاہتا ہوں۔ میں جاؤں گا۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

(جاتا ہے)

ماں۔ (آتے ہوئے) کیا میں بھی نہیں میرے لال (پکارتے ہوئے) اختر۔ اختر۔ (گھٹی گھٹی آواز میں چیخ کر) سجاد اسے روکو — روکو سجاد! نجمہ کے غم نے اسے پاگل بنا دیا ہے۔ وہ یہ بھول رہا ہے کہ اس کی نجمہ اب کسی اور کی ہو چکی ہے — اسے مت جانے دو سجاد بیٹا۔

(باہر موٹر کے جانے کی آواز)

سجاد۔ (پُر سکون لہجے میں) اب اسے کوئی نہیں روک سکتا ہے چچی جان!

(ماں کی سسکیاں — غم انگیز ساز)

منظر بدلتا ہے

[موٹر کے ہارن اور ہلکی ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے درمیان رمیش اور اختر کے قہقہے بلند ہوتے ہیں]

رمیش۔ تم سے ملے ہوئے کتنا زمانہ ہوا اختر۔ آج جب اچانک تمہارا پیغام ملا کیسے بتاؤں کتنی خوشی اور کتنی حیرت ہوئی تھی مجھے اُس وقت۔ خیر یہ تو کہو اتنے دن رہے کہاں اور یہ کیا حالت ہو گئی ہے تمہاری!

اختر۔ اپنا کیا ہے رمیش۔ بس جی رہا ہوں۔ یہی بہت کافی ہے (بات بدلتے ہوئے) خیر میری چھوڑو کچھ اپنی سناؤ۔ کالج چھوڑنے کے بعد کچھ عجیب عجیب سی خبریں سُنی تھیں، تمہارے بارے میں۔ کبھی معلوم ہوا کہ ایم اے کر رہے ہو اور کبھی معلوم ہوا کہ تعلیم ختم کر دی اور گاؤں چلے گئے ہو اور سجاد بھائی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خدانخواستہ تم پنڈت بن گئے ہو۔

رمیش۔ شکر ہے تمہیں اتنا تو پتہ تھا میرے بارے میں۔ ورنہ اس زمانے میں کون کس کو یاد رکھتا ہے۔

اختر۔ (غم سے) کیسی باتیں کرتے ہو رمیش۔ میں اور تمہیں بھول جاؤں۔

رمیش۔ (ہنس کر) ارے تم خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے اختر۔ پیارے وہ تو ایک مذاق تھا۔

(موٹر کی گڑگڑاہٹ اُبھرتی ہے)

اختر۔ خیر۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ تو بتاؤ۔ آج تم گاؤں سے شہر کیسے آ گئے؟

رمیش۔ بھئی بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں نے گرام کمیٹی کا سیکریٹری بنا دیا ہے۔ اب تم ہی اندازہ کر لو کہ مجھے یہاں کس کام کے لئے آنا پڑا ہوگا۔

اختر۔ (دھیرے سے) اوہ ٹھیک ہے......

(خاموشی)

رمیش۔ کیا سوچنے لگے..... (پکارتے ہوئے) اختر۔ ارے بھئی اختر آخر تم ہو کہاں؟ دیکھو تو اب ہم گاؤں کی حدوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ دیکھو شیام گھاٹ کی پہاڑیاں..... وہ سرمئی غبار میں ڈوبا ہوا مہادیو جی کا مندر.....

(موٹر کی گڑگڑاہٹ)

اختر۔ (اپنے آپ سے) گاؤں وہی ہے (رمیش سے) تم نہیں جانتے رمیش مجھے پھر سے اپنے گاؤں میں لوٹ آنے سے کتنی خوشی اور کتنی مسرت ہو رہی ہے۔ نظارے وہی ہیں، ہوائیں وہی ہیں۔ تالاب کا پانی اب بھی چمک رہا ہے۔ سب کچھ وہی ہے مگر ہم وہ نہیں رہے۔

رمیش۔ (جلدی سے) گاڑی روک لو اختر۔ ہمیں یہیں اُترنا ہے۔

اختر۔ (سُنی ان سنی کرتے ہوئے) ابھی تک امرائیوں پر ویسی ہی بہار ہے۔ ابھی تک ہوائیں اُسی طرح گنگناتی ہیں۔

رمیش۔ (زور سے) دیکھو تو ہم آگے نکل آئے ہیں۔ تمہاری کوٹھی پیچھے رہ گئی ہے۔

اختر۔ (چونک کر) اوہ۔ ہاں بھئی۔ معاف کرنا رمیش۔ کبھی کبھی مجھ پر ایسے دورے پڑ جاتے ہیں (تھوڑا سا وقفہ۔ بریک لگنے کی آواز) دیکھو شرفو گاڑی سے سامان اُتار لو.....

(ہلکی سی موسیقی۔ قدموں کی چاپ)

رمیش۔ کیا سوچ رہے تھے اختر؟

اختر۔ (بات بدلتے ہوئے) اوہ رمیش۔ یہ ہمارا اپنا گاؤں ہے نا۔ یہ کتنا بدل گیا ہے یہ۔ پوسٹ آفس کے سامنے والا یہ کھلا چٹیل کھیل کا میدان یہ گیروی رنگ کی پختہ سڑک اور اس کے کنارے پر لگے یہ شکیر کے درخت یہ سب کچھ کتنا بھلا لگ رہا ہے رمیش

رمیش۔ (سنجیدگی سے) ہاں اختر۔ پرانا گاؤں اب ایک نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ دیکھو سامنے دواخانہ ہے۔ اور اس سے ذرا ہٹ کر اسکول ہے اور وہ پیپل کے پیڑ کی اور جو سفید براق سی عمارت نظر آ رہی ہے نا۔ بس اُسی میں یوتھ کلب بھی ہے اور گرام کمیٹی کا دفتر بھی۔ اور......

اختر۔ اور تمہارا سر۔ بالکل افسر رمیش بیورو بن گئے ہو۔ بھلا تمہاری ان خشک تفصیلات سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ پہلے پیٹ سیوا کی بات کرو۔ پھر اپنی سیوا کی کتھا سنانا۔

رمیش۔ معلوم ہوتا ہے پورے تین دن سے فاقہ کر رہے ہو۔ خیر چلو میں تمہاری کوٹھی تک تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ بھئی ذرا جلدی۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے

اختر۔ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنا تم ایسے لیڈروں ہی سے کوئی سیکھے۔ آخر ایسی کون سی مہم سر کرنی ہے تمہیں؟

رمیش۔ مہم؟ ہاں میرے بھائی رضیہ کو رپورٹ دینا ایک مہم سر کرنا ہی تو ہے

اختر۔ (چھیڑتے ہوئے) اچھا۔ یہ بات ہے۔ بے چارے کو رپورٹ دینی پڑتی ہے اور وہ بھی محترمہ رضیہ کو۔

رمیش۔ (سنجیدہ ہو کر) اختر غلط نہ سمجھو۔ میں اس کی بڑی عزت کرتا ہوں میں اُسے جتنا مان دیتا ہوں شاید اپنی سگی بہن کو بھی نہیں دے سکتا تھا۔

اختر۔ ارے تو چھوکریوں کی طرح منہ کیوں پھلا بیٹھے؟ سیدھے منہ کیوں نہیں کہہ دیتے۔ آخر یہ رضیہ وضیہ ہے کون بلا؟

رمیش۔ (طنزیہ) بلا—؟ شہر کے ایک بڑے گھرانے کی بیٹی ہے جس نے اپنے سکھ، چین اور آرام کو گاؤں کے غریب، جاہل، اجڈ گنواروں کے لئے تیاگ دیا ہے۔ آج چار سال ہوئے اسے یہاں آئے۔ بڑی حسین بڑی خوب صورت لڑکی ہے (جلدی سے) اوہ بڑی دیر ہو گئی مجھے۔ میں چلتا ہوں اختر (جاتا ہے)

اختر۔ (دھیرے سے) بڑی حسین، بڑی خوبصورت، بڑی نیک (مایوسی سے) مگر وہ نجمہ تو نہیں ہو سکتی۔ (ساز)

منظر بدلتا ہے

رمیش۔ (مخاطب کرتے ہوئے) رضیہ دیدی!

رضیہ۔ (مسرت سے) اوہ رمیش بھیا۔ آ گئے تم کام تو پورا ہو گیا نا؟

رمیش۔ ہاں دیدی۔ ہم کو مزید چار واٹر پمپ اور دو ٹریکٹر مل رہے ہیں۔

رضیہ۔ بہت خوب۔ مگر بہت دیر کر دی تم نے بھیا۔ تم تو جلد لوٹنے والے تھے

رمیش۔ بات یہ ہوئی کہ شہر میں میرا دوست اختر مل گیا۔ اس کی وجہ سے ٹھہرنا پڑا۔ وہ آج ہی میرے ساتھ یہاں آیا ہے۔ شہروں کی زندگی سے اُکتا کر، گاؤں کی زندگی کو ایک بار پھر اپنانے کے لئے (ٹھنڈی سانس بھر کر) بڑا زندہ دل جوان تھا بے چارہ۔

رضیہ۔ (جلدی سے) تھا— کیوں اب نہیں رہا کیا؟

رمیش۔ بڑا دکھی ہے بے چارہ۔ کالج کے زمانے میں ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔ وہ حسین تھی اس کے ہاتھ نہ آ سکی۔ اور یہ پاگل آوارہ پھر رہا ہے ہمیشہ سوچتا رہتا ہے، لکھتا رہتا ہے اور پھرتا رہتا ہے اور آج کئی سال کے بعد یہاں آیا ہے، بے چارہ اختر۔

رضیہ۔ (بات بدلتے ہوئے) پہلے مجھے سامان کی فہرست اور رسیدیں تو دکھاؤ پھر باتیں ہوں گی۔

رمیش۔ (چونک کر) اوہ، رسیدیں وہ تو میں آفس ہی میں بھول آیا۔ وہیں چل کر رسیدیں بھی دیکھ لیجئے اور فہرست بھی۔

رضیہ۔ (ہنستے ہوئے) بڑے کھوئے ہوئے تھے۔ دوست کے غم میں برابر کے شریک معلوم ہوتے ہو۔

رمیش۔ کیا بتاؤں دیدی۔ وہ ہے ہی اتنا پیارا۔ کوئی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ بھی۔

رضیہ۔ رمیش بھیا آپ تو (اچانک حیرت سے) ارے یہ کون؟

(ساز)

رمیش۔ اوہ اختر (پکارتے ہوئے) اے اختر۔ بھئی میں یہاں ہوں ادھر آؤ (قدموں کی چاپ) آؤ آؤ ان سے ملو۔ یہی رضیہ دیدی ہیں ہماری گرام کمیٹی کی جوائنٹ سیکریٹری۔ میں نے کہا تھا نا تم سے۔ اور دیدی یہ اختر ہے میرا بڑا پیارا دوست

رضیہ۔ (آہستہ سے) آپ سے مل کر خوشی ہوئی اختر صاحب

اختر۔ (ڈوبی ہوئی آواز میں) اور مجھے بھی (اپنے آپ سے) بالکل وہی سے وہی بال، وہی ہونٹ، وہی انداز، وہی رنگ روپ اور وہی آواز۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ نجمہ یہاں کیسے آگئی (بے خودی سے) لیکن تم یہاں کیسے آگئیں؟

رمیش۔ (جلدی سے) اختر!

اختر۔ (ہکلا کر) معاف کیجئے۔ میری طبیعت خراب سی ہے۔ میں پھر ملوں گا

(جاتا ہے)

رضیہ۔ (حیرت سے) عجیب آدمی ہے۔

(ساز کی لہریں تیزی سے ابھرتی ہیں)

منظر بدلتا ہے

[مدھیا تیز دبکی ملی جلی آوازوں کا دھیما دھیما سا شور۔ کدالوں اور پھاوڑوں کی آوازیں اور پس منظر میں گنگناہٹ اور پُرجوش تانیں]

رمیش۔ (پکار کر) اے رامو بھیا۔ رکو نہیں۔ ابھی کام بہت باقی ہے۔

ایک آواز۔ آج دن ڈھلے تک یہ کام پورا ہو جانا چاہیئے

دوسری آواز۔ شام تک یہ سڑک بن جائے گی۔

تیسری آواز۔ ہم اپنا کام خود کریں گے

چوتھی آواز۔ کام ہمارا جیون ہے۔

پانچویں آواز۔ کام ہمارا ساتھی ہے

اختر۔ واقعی تم لوگ بہت بڑا کام کر رہے ہو رمیش!

رمیش۔ کام اور محنت ہی تو در اصل زندگی ہے پیارے۔ اب یہی دیکھ لو۔ اس سڑک کا پہلے کیا حال تھا۔ برسات میں تو کسی طرح بھی اس پر سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ اب یہ پوری دو میل لمبی پختہ سڑک تیار ہو رہی ہے۔ کون خیال کر سکتا تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا۔

اختر۔ ٹھیک کہتے ہو تم۔ یہ کام کا زمانہ ہے۔

رمیش۔ (پُر اعتماد لہجہ میں) لیکن کیا تم نہیں کر سکتے کوئی کام؟ اب بھی وقت نہیں گیا ہے بہت سارے کام کرنے ہیں۔

اختر۔ ہوں۔ (خاموشی)

رمیش۔ اوہ۔ پھر لگے سوچنے۔ اچھا چلو تمہیں اپنے آفس لے چلتا ہوں۔ وہاں رضیہ دیدی بھی ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی

اختر۔ (چونک کر) اوہ۔ رضیہ۔ ہاں ہاں چلو

(ساز۔ قدموں کی چاپ)

رمیش۔ دیدی۔

رضیہ۔ (چونک کر) میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی رمیش بھیا ــ اوہ اختر صاحب۔ آپ اور گاؤں کے اس معمولی سے آفس میں۔

اختر۔ مجھے شرمندہ کیجئے مس رضیہ۔۔ (خاموشی)

رمیش۔ یوں حیران حیران سے کیا دیکھ رہے ہو اختر؟

اختر۔ (جلدی سے) اوہ۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہ ہال کتنا خوبصورت بن گیا ہے۔

رمیش۔ (ہنستے ہوئے) یہ سب قومی توسیعی اسکیم کے تحت بنائے گئے ہیں۔

رضیہ۔ (دھیرے سے) یہ ہے ہماری ترقیاتی کاموں کی پوری رپورٹ۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اب تک یہاں کس طرح کا کام ہوا ہے

اختر۔ شکریہ (کاغذ کی سرسراہٹ) مئی ۱۹۵۲ء میں من فرٹلائزر اور طواں کھاد کسانوں میں تقسیم کی گئی۔ پینتالیس من اعلیٰ قسم کے ذرعی بیج فراہم کئے گئے۔ گرام کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ نائٹ اسکول اور لائبریری قائم کی گئی۔۔۔۔۔۔ اگست ۱۹۵۲ء کو اپریٹو سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ملٹی پرپز اسکیم کے تحت ڈیری فارم کی تشکیل عمل میں آئی۔ آب پاشی کی باولیوں کی تعمیر کے لئے رقم دی گئی۔ تقاوی پر واٹر پمپ اور ٹریکٹر دیئے گئے۔۔۔ اپریل ۱۹۵۳ء یوتھ کلب کی عمارت تیار ہو گئی۔ دو سو گز نالیاں تعمیر ہوئیں۔ سڑک کو پختہ اور کشادہ بنایا گیا۔۔۔ گاؤں کے اسکول کی نئی عمارت تیار ہو گئی۔ جولائی ۱۹۵۳ء

رمیش۔ (جلدی سے) ارے بھئی یہ پوری تفصیلات حکومتی امداد وغیرہ کی

ہیں۔ یہ سب گورنمنٹ کا کیا ہوا کام ہے۔ اسے پھر کبھی پڑھ لینا۔ اب ہم کو اپنی مدد خود آپ کرنی ہے۔ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ اس مقصد کے تحت یہاں مقامی ترقیاتی کاموں کی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ بہت سے کام ہونے ہیں۔ (لہجہ بدل کر) اور بجلی کی اسکیم تو بالکل نئی اور نہایت اہم اسکیم ہے۔

رضیہ۔ واقعی یہاں بجلی آ جائے تو بہت سے کام آسانی سے انجام پا سکیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ روزگار میں اضافے اور معیار زندگی میں بہتری کی اس سے کوئی صورت نکل آئے۔

رمیش۔ یہ سب ٹھیک ہے دیدی۔ مگر بڑا سوال سرمایے کا ہے۔ عوام اپنا حصہ محنت کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ حکومت کی دی ہوئی امداد دوسرے ضروری کاموں پر ختم ہو چکی ہے۔ اس کے لئے ہم کو کم از کم چھ ہزار کا خرچ برداشت کرنا ہوگا۔

اختر۔ دھنوانوں سے اُن کا حصہ کیوں طلب نہیں کرتے آپ لوگ؟

رضیہ دھنوان۔۔! بیچارے دھنوانوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے اختر صاحب انھیں تو ہر وقت اپنے ذاتی مفاد اور شخصی نفع کا خیال رہتا ہے۔ ایسے ان لوگوں کی وجہ سے ہمیں ابتدا میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔

رمیش۔ (ہنستے ہوئے) بھئی تم دھنوانوں سے زیادتی کر رہی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں اختر بُرا نہ مان جائیں۔

رضیہ۔ (شوخی سے) زندگی کا مسافر منزل تک پہنچتے پہنچتے کئی راہیں بدلتا ہے راستے کے غلط انتخاب پر اگر اسے ترک کر دیا جائے تو اس میں اس کے بُرا ماننے کا کیا سوال؟

اختر۔ (اپنے آپ سے) زندگی کا مسافر راہیں بدلتا ہے ... بالکل وہی انداز وہی آواز۔ نجمہ۔ نجمہ (سنبھلتے ہوئے) اوہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ دھنوانوں کو قومی ترقی کے کاموں میں حصہ لینا چاہیئے۔ ضرور لینا چاہیئے۔ اچھا تو رمیش میں چلتا ہوں۔ ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ (جاتے ہوئے) دیکھو یہاں سے واپسی میں مجھ سے ضرور ملنا۔

(قدموں کی چاپ خاموشی میں ڈوب جاتی ہے)

رضیہ۔ رمیش بھیا ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟

رمیش۔ پوچھئے

رضیہ۔ یہ ان کی نجمہ کون تھی آخر؟

رمیش۔ (تاسف سے) ایک بہت خوبصورت لڑکی۔ بہت حسین۔ بالکل آپ جیسی

رضیہ۔ (بُرا مان کر) رمیش بھیا۔! (سازی گریز)

رمیش۔ (خلوص سے) یقین مانو دیدی وہ بالکل آپ جیسی تھی۔ عجیب اتفاق ہے واقعی۔ میں بھی کبھی کبھی سوچ میں پڑ جایا کرتا تھا۔۔ بے چارہ

اختر (لہجہ بدل کر) اچھا تو اب میں چلتا ہوں دیدی (جاتا ہے)

رضیہ۔ (اپنے آپ سے) نجمہ مجھ جیسی تھی۔ کیا وہ واقعی مجھ جیسی تھی؟ اوہ میرے خدا ... نہ جانے کیا ہونے والا ہے (ساز)

(کچھ دیر خاموشی پھر دھیرے دھیرے موسیقی کی لہریں اُبھرتی ہیں)

رمیش۔ (آتے ہوئے) دیدی دیدی ایک خوش خبری سنوگی؟

رضیہ۔ (حیرت سے) خوشخبری؟ (سوچ کر) کیا ہے رمیش بھیا۔ بتاؤ تو؟

رمیش۔ (مسرت سے) دیدی اب ہمارے گاؤں میں بجلی کی روشنی جلد ہی آ جائے گی۔ ہمارے ترقی کے پروگرام پورے ہو سکیں گے سرمائے نے محنت کو گلے لگا لیا ہے۔

رضیہ۔ یہ معاشیات کی پہیلیاں مجھ سے نہ بوجھی جائیں گی صاف صاف کہو کہ آخر بات کیا ہے؟

رمیش۔ اختر بھی ہمارے ساتھ ہے دیدی۔ اُس نے گاؤں کو بجلی کی روشنی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب ہمارا گاؤں جگمگا اُٹھے گا۔

رضیہ۔ اوہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے (اپنے آپ سے) میں نے اُن کی آنکھوں میں انسانی ہمدردی کے سوتے اُبلتے دیکھے تھے۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا (رُک کر) بے چارہ دُکھی افسانہ نگار۔ میں اُس سے ملوں گی۔ میں اس کا شکریہ ادا کروں گی۔

(ساز)

منظر بدلتا ہے

اختر۔ (اپنے آپ سے) وہ نجمہ نہیں ہو سکتی .... مگر وہ نجمہ سے اتنی ملتی جلتی کیوں ہے .... کس قدر مشابہہ (قدموں کی چاپ)

رضیہ۔ (آتے ہوئے) اختر صاحب۔! (سازی جھنکار)

اختر۔ اوہ۔ آپ مس رضیہ۔ آئیے آئیے تشریف رکھیئے۔

رضیہ۔ (آہستہ سے) شکریہ (بیٹھتے ہوئے) میں دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ قومی ترقی کے کاموں میں آپ کا تعاون بڑا ہی قیمتی ہے اختر صاحب

اختر۔ (غم سے) قومی ترقی کے کام کا رسمی شکریہ! کیا یہ میرا اپنا فرض نہیں؟ مس رضیہ آپ نے مجھے سمجھنے میں جلدی کی ہے

رضیہ۔ (گھبرا کر) مجھے افسوس ہے اختر صاحب۔ میں نے آپ کو خواہ مخواہ رنجیدہ کر دیا۔

اختر۔ نہیں نہیں مس رضیہ یہ بات نہیں ہے۔ میں بھلا کیوں رنجیدہ ہونے لگا۔ یہ تو میری اپنی قسمت ہے (لہجہ بدل کر) بات دراصل یہ ہے مس رضیہ میرا بچپن اسی گاؤں میں بیتا ہے۔ مجھے یہاں کے ذرّے ذرّے سے پیار ہے

رضیہ۔ کتنے اچھے جذبات ہیں آپ کے۔!

اختر۔ جی ہاں صرف جذبات۔ کاش میں حقیقی معنوں میں کچھ کر سکتا۔ کاش میرا وجود بھی کسی کام کا ہوتا (غمگین موسیقی)

رضیہ۔ (ہمدردی سے) آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں اختر صاحب میرے خیال میں صرف ایک با مقصد زندگی ہی آپ کے اس ذہنی اُلجھاؤ کا واحد علاج ہے۔ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ اب میرا کوئی نہیں رہا۔ مگر اس کے باوجود میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ ایک عظیم مقصد سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے میں نے کتنا سکون، کتنی راحت اور کس قدر آرام پایا ہے۔ کاش میں بیان کر سکتی۔

اختر۔ کاش مجھے بھی ایسا ہی سکون، ایسا ہی آرام اور ایسی ہی تسکین ملتی (غم سے) سچ کہتا ہوں مس رضیہ میں خوشی اور اطمینان کے ایک ایک لمحے کے لئے ترس گیا ہوں۔

رضیہ۔ وہ سب کچھ آپ سے بہت قریب ہے اختر صاحب۔ وہ سب کچھ یہاں اس گاؤں میں موجود ہے۔

اختر۔ اس گاؤں میں ہے وہ سکون۔ کاش میں یقین کر سکتا۔

رضیہ۔ یقین کیجئے اختر صاحب۔ زندگی کا دامن اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ گاؤں ہے۔ یہاں حسن اور خوبصورتی بھی ہے اور گندگی اور غلاظت بھی۔ سکھ چین بھی ہے اور غربت و افلاس بھی۔ اندھیرے بھی ہیں اور اُجالے بھی۔ اور ہم سب یہاں اندھیروں سے جنگ کر رہے ہیں۔ روشنی کے لئے، زندگی کے لئے۔ ہمارے دوش بدوش چل کر آپ بھی اس زندگی کو پا سکتے ہیں (لہجہ بدل کر) ہم نے غربت و افلاس کے مورچے میں رخنے ڈال دئے ہیں۔ اب قدامت پرستی کی دیواریں گر رہی ہیں۔ جہالت کے قلعے مسمار ہو رہے ہیں۔ توہمات کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں۔ ہمارے ساتھ بڑھئے ہم نئے بھارت کے دل کی دھڑکن ہیں

اختر۔ (بے چین ہو جاتا ہے) واقعی آپ نے مجھے ایک نیا پیغام دیا ہے۔ ایک نئی روشنی ایک نئی زندگی۔ میں اس زندگی سے ضرور ہاتھ ملاؤں گا۔

رضیہ۔ (مسرت سے) مجھے یقین تھا۔ میں اس نئی زندگی میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔۔۔۔ (ساز)

منظر بدلتا ہے

[بانسری کی ہلکی ہلکی سی موسیقی۔ دیہاتیوں کی دور سے اُبھرتی ہوئی تانیں]

اختر۔ (مسرت سے) اوہ رضیہ۔ کتنی ضدی ہو تم۔ خیر چلو یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ سنتے ہیں بزرگوں کا قول ہے کہ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

(دونوں کی ہنسی)

رضیہ۔ اختر دیکھو۔ آج گاؤں والے کتنے خوش ہیں۔ آج گاؤں میں بجلی آگئی ہے۔ آج کی رات اپنے ساتھ اندھیرے نہ لا سکے گی۔ تم نے گاؤں کو روشنی دی ہے اُجالا دیا ہے۔

اختر۔ (جذباتی آواز میں) تم نے بھی تو دیپ جلائے ہیں رضیہ۔ میرے اندھیرے من میں اُجالا پھیلا دیا ہے تم نے۔ اگر تم نے مجھے روشنی نہ دی ہوتی تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ نہ جانے میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوتا۔

رضیہ۔ بس۔ بہت ہو چکی شاعری۔ اس وقت طبیعت بہت تھک گئی ہے چلو ذرا گھوم آئیں۔

اختر۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔

رضیہ تو پھر چلو۔ (ساز۔ تھوڑا سا وقفہ)

اختر (رومان پرور لہجے میں) آج ہم کتنی دُور نکل آئے ہیں۔ اُف۔ یہ

کھلے کھلے میدان، یہ لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت۔ اور چاروں طرف چھایا ہوا یہ سرمئی غبار۔ کتنے پیارے، کتنے حسین نظارے ہیں یہ رضیہ۔

رضیہ۔ (دھیرے سے) مگر زندگی ان رنگین نظاروں سے بھی پیاری ہے۔

اختر۔ (جذباتی لہجے میں) واقعی زندگی بھی بڑی حسین ہے۔ مجھے اس کے حُسن کا اب اندازہ ہُوا ہے۔ یقین مانو رضیہ۔ تم جیسے انسانوں کو دیکھ کر دل میں زندہ رہنے کی خواہش اُبھرتی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر ایک کسان بن جاؤں۔ ٹریکٹر چلاؤں اور کہانیاں لکھوں (لہجہ بدل کر) اس نئی زندگی کی کہانیاں لکھوں (اداسی سے) مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بہت مجبور ہوں۔ بہت ہی مجبور

رضیہ۔ (جلدی سے) کیا کہہ رہے ہو اختر؟ مجبور ہی؟ (خاموشی)... (پریشانی سے) آخر تم سوچ کیا رہے ہو؟

اختر۔ (اُداسی سے) سوچ رہا ہوں کہ محرومی اور تشنگی کا یہ کربناک احساس میرا ساتھ کیوں نہیں چھوڑتا۔ کیوں زندگی میں ایک گہری خلا کی موجودگی کا احساس اس شدّت سے اُبھرتا ہے؟ ایک نامعلوم سا غم۔ ایک بے نام سی خلش۔ جانے اس کا کیا انجام ہوگا۔

رضیہ۔ آخر تمہیں یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے اختر؟ کیسی عجیب باتیں کرنے لگے ہو تم۔

اختر۔ (درد بھری آواز میں) آج تشنگی اور محرومی کا احساس پھر اُبھر آیا ہے رضیہ۔ نہ جانے کیوں یادوں کے کنول یوں اچانک کِھل اُٹھتے ہیں۔

رضیہ۔ کوئی وجہ تو ہوگی؟

اختر۔ وجہ؟ ہاں بظاہر ایک وجہ تو ہے رضیہ۔ آج میری ماں کا خط آیا ہے۔

رضیہ۔ تو اس سے کیا ہُوا؟

اختر۔ میری ماں ایک مدّت سے سپنے دیکھتی آئی ہے۔ ایسے سپنے جن کی تعبیر آج تک کوئی نہ دے سکا۔ خود میں بھی نہیں۔

رضیہ۔ (ہمدردی سے) آخر کیسے سپنے دیکھتی ہیں تمھاری ماں؟

اختر۔ (یاد کرتے ہوئے) سپنے۔ خواب۔ کچھ اس طرح کے جیسے گھر سجا ہُوا ہے۔ شہنائیاں بج رہی ہیں اور ایک چاند سی بہو اُن کے گھر میں آئی ہے۔ گھر میں اُجالا پھیل گیا ہے (لہجہ بدل کر) رضیہ۔ کیا میری ماں کے سپنے پورے ہو سکتے ہیں؟

(سازی گرج)

رضیہ۔ (خاموشی) (ساز اضطرابی کیفیت ظاہر کرتے ہیں)

اختر۔ رضیہ۔

رضیہ۔ (دھیرے سے) ماں کے سپنے رائگاں نہیں جاتے

اختر۔ (خوشی سے چیخ کر) رضیہ (سازی جھنکار)

رضیہ۔ (شوخی سے) جب میں اتنے پاس ہوں تو چیخ کیوں رہے ہو۔

(ساز)

منظر بدلتا ہے

[شہنائیوں کی آوازیں دھیرے دھیرے اُبھر کر جدید قسم کے باجوں کی آوازوں میں گھل مل جاتی ہیں۔ ہنسی اور پُرمسرّت قہقہوں کا دھیما سا شور]

رمیش۔ (مسرّت سے) اختر آج میں تمھیں اور رضیہ دیدی کو اپنی اور گاؤں والوں کی طرف سے پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آج واقعی مجھے دِلی مسرّت ہو رہی ہے۔

اختر۔ (جذباتی آواز میں) تمھارے اور گاؤں والوں کے اس بے لوث پیار اور محبت کا شکریہ ادا کرنا خود اس پیار اور محبّت کی توہین ہوگی تم لوگوں نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ محنت اور مقصد کا فلسفہ سکھایا ہے۔ سکون اور آسودگی عطا کی ہے اور آج اپنی شادی کے موقع پر تمھاری ہی دی ہوئی اس زندگی کو، تمھاری ہی عطا کی ہوئی ان خوشیوں اور مسرّتوں کو میں تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ آج سے میرا سب کچھ اس عظیم مقصد کے حوالے ہے۔ میں اس دھرتی کی گود سے اُبھرتے ہوئے امر جیون کو سلام کرتا ہوں۔

رضیہ۔ (دھیرے سے) اب سویرا دُور نہیں ہے۔

سب۔ (ایک ساتھ) اب سویرا دُور نہیں۔ سویرا دُور نہیں۔

(آوازیں دھیرے دھیرے موسیقی کی تیز لہروں میں بدل جاتی ہیں)

(فیڈ آوٹ)

شری پاد جوشی

اک بنگلہ بنے نیارا

"اُف اب تو حد ہو گئی! اگر اسی طرح آپ فضول خرچ کرتے رہیں گے تو بنگلے کی بات درکنار، ایک معمولی جھونپڑا بھی تیار نہیں ہو سکے گا۔ مگر جناب کو بنگلے کی یا کوٹھی کی ضرورت ہے کہاں؟ میں ہی بے شرم ہوں جو ہر وقت چلاتی رہتی ہوں اور اپنی طرف سے خرچ کو کم کئے جاتی ہوں۔ گویا میں اکیلی ہی اُس بنگلے میں رہوں گی اور آپ اور آپ کے بال بچے زندگی بھر کرائے کے مکان میں ہی رہیں گے۔ ایک ایک پائی بچانے کے لئے میں خون پانی ایک کر دیتی ہوں اور آپ ہیں کہ نواب زادہ کی طرح پیسہ اڑاتے جاتے ہیں!" ہماری بیوی صاحبہ نے اپنی زبان کی توپ ہم پر داغتے ہوئے کہا۔

مگر میں بالکل ٹس سے مس نہ ہوا۔ چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ کیوں کہ میرے لئے اُس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اپنی گھر والی کے طعنے سُننا میرا ہمیشہ کا کام ہو گیا تھا۔ بڑے شوق سے میں نے کماؤ یعنی پیسے کمانے والی لڑکی سے شادی کی تھی اور اُسی کے پھل میں بھگت رہا تھا۔ اس کے بارے میں میں نے کبھی کسی کے سامنے شکایت بھی نہیں کی۔ کیوں کہ غلطی آخر میری ہی تھی۔ اس کے برعکس میں یہ بہانا بناتا تھا کہ ہماری گھریلو زندگی بڑی خوشی سے جبری ہوئی ہے۔ اور کماؤ عورت کی وجہ سے میں بہت شادماں رہتا تھا۔ اسی لئے اُن کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دے کر میں چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

مگر انھوں نے اپنی قینچی کو بند نہیں کیا۔ وہ کہتی گئیں: "میں آپ سے پوچھتی ہوں۔ پھر آنے کے صابن سے جو کام ہو سکتا ہے اُس کے لئے وہ آپ سوا روپے کا پیسٹ کیوں لائے؟ گھر میں پُرانی پیالی موجود ہے۔ پھر بھی آپ ڈاڑھی بنانے کے لئے یہ نیا پیالہ کیوں خرید لائے؟ اور اگر سستے ریزر بلیڈوں سے ہمیشہ کام چل سکتا ہے تو پھر آپ نے یہ مہنگے بلیڈ کیوں خرید ے؟ کیوں جی زبان کیوں بند ہو گئی؟ کیا پیسہ آپ کی جیب میں رہنے کو تیار نہیں تھا؟"

اب آپ ہی بتائیے کہ ان دیوی جی کو میں کیا جواب دوں؟ ڈاڑھی کے سُکھ دُکھ کو بھلا وہ کیا جانیں؟ آخر جُوتے کی چبھن وہی جانے گا جو اُسے پہنتا ہو! ویسے میں بہت کفایت شعار ہوں بلکہ اپنے یار دوستوں میں تو کنجوس کے طور پر بدنام ہوں!

اور اس میں اُن لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس بدنامی کی ذمہ داری ہم پر ہی ہے۔ دیکھئے نہ! میں خود اتنا پیسہ کماتا ہوں اور ہماری بیوی صاحبہ بھی اچھی خاصی تنخواہ والی نوکری کرتی ہیں۔ پھر بھی میں نے کبھی ریشمی یا اُونی سُوٹ نہیں پہنا اور نہ وضع دار یعنی فیشن ایبل کپڑے سلائے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ میں اپنی شریمتی جی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ آپ پوچھیں گے آخر وہ کون مرد ہے جو اپنی بی بی کو ناراض دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ کا پوچھنا بالکل صحیح ہے۔ مگر دوسرے مرد جب دیکھتے ہیں کہ اُن کی جورو اُن کے عیش میں خلل ڈالنے پر آمادہ ہو گئی ہے تو وہ اُس کی ناراضی کی پروا کئے بغیر اپنی خواہش کو پورا کر ڈالتے ہیں۔ مگر میں اپنی تکلیف کا خیال کئے بغیر اُن کی بات مان لیتا ہوں۔ لیکن سستے صابن اور ردّی بلیڈوں کی وجہ سے ڈاڑھی بناتے وقت جو ناقابلِ برداشت تکلیف مجھے ہر روز اٹھانی پڑتی ہے اُس سے نجات پانے کے لئے میں آج بازار سے قیمتی بلیڈ اور بڑھیا شیونگ کریم خرید لایا۔ اس میں آپ ہی بتائیے کہ میں نے کون سا بڑا گناہ کیا؟ میری ڈاڑھی ذرا 'ولیسی' ہے! تھوڑی بھی بڑھ جائے تو سُور کے بالوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کوئی سمجھدار عورت ہوتی تو وہ خود ہی بازار سے میرے واسطے قیمتی کریم اور تیز بلیڈ خرید لاتی! خیر!

ہماری شریمتی جی پر رات دن ایک ہی جنون سوار رہتا ہے - وہ یہ کہ اپنا ایک بنگلا ہو! جی ہاں، کرائے کا نہیں، خود اپنی ملکیت کا، اور اسی لئے وہ آٹھوں پہر دوڑ دھوپ کرتی رہتی ہیں! ایک ایک پائی بچانے کے لئے اپنے (اور دوسروں کے بھی) جسم و دل کو چاہے جتنی تکلیف اٹھانی پڑے تو بھی انھیں اُس کی پروا نہیں ہوتی۔ گھر میں کام کاج کے لئے اُنھوں نے کبھی نوکرانی نہیں رکھی اور نہ ہی کسی رشتے دار کے لڑکے لڑکی کو پڑھائی کے لئے گھر پر رہنے دیا۔ دس روپے سے زیادہ قیمت کی ساڑھی اُنھوں نے کبھی نہیں پہنی اور نہ مجھے ایک روپے گز سے زیادہ قیمتی کپڑا خریدنے دیا ہمارے بچوں کے جسم پر تو بازار کا سب سے ارزاں کپڑا رہتا ہے اور اس کے لئے وہ سارا بازار پیدل چھان مارتی ہیں!

آپ جو بھی کہیں شہر کے اُن متوسط طبقہ کے لوگوں کے دل و دماغ پر اپنا نجی مکان بنانے کا شوق اس قدر کیوں حاوی رہتا ہے۔ اس کا کارن ابھی تک میرے دھیان میں نہیں آیا ہے۔

ہم تو ٹھہرے دیہاتی یا گنوار لوگ! بڑے بڑے مکانوں میں ہم نے اپنا بچپن گزارا ہے اس لئے ریل کے ڈبوں جیسے چھوٹے کمروں میں یا کبوتر کے دڑبوں جیسے مکانوں میں رہنے کو ہمارا بالکل جی نہیں چاہتا۔ مگر بھولے سے بھی ہمارا دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ اپنا کوئی نجی بنگلہ ہو۔ کیوں کہ آج کل مالک مکان بننا گویا جان کا وبال مول لینا ہے۔ مگر ان شہر والوں کی بات اس سے بالکل اُلٹی ہوتی ہے۔ ساری زندگی بھوکوں مریں گے۔ ردّی کپڑے پہنیں گے اور ہمیشہ روپیہ ہی کی فکر میں مرتے رہیں گے۔ کسی مہمان کو دیکھ کر اُن کو ایسا لگے گا کہ یہ آفت کہاں سے آئی اور کوئی رشتے دار آجائے تو اسی سوچ میں گھل گھل کر سوکھ جائیں گے کہ یہ بلا کب ٹلے گی، دوسروں کو، پاس پڑوس والوں کو اُن سے ذرا بھی مدد نہیں ملتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُلٹے تکلیف ہوتی ہے - اور یہ سب کس لئے؟ صرف اسی لئے کہ بڑھاپے میں اپنے نجی بنگلے میں رہنے کو مل سکے۔ مرنے کے بعد جنت پانے کی خواہش سے زندگی بھر مرتے رہتے والے اناڑی مذہب پرستوں اور ان شہر والوں میں بالکل فرق نہیں ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ "اتنا اگر آپ جانتے تھے تو پھر آپ نے شہر کی لڑکی سے شادی کی ہی کیوں؟" اس پر میں اتنا ہی کہوں گا کہ یہ غلطی مجھے شادی کے بعد ہی حاصل ہوئی ہے - اور دوسری بات یہ کہ میری یہ شادی بھی بہت کچھ میری مرضی کے خلاف میری بیوی نے مجھ پر لاد دی ہے!

کیوں؟ آپ کو یقین نہیں آتا؟ جی ہاں، میں سمجھ گیا، ہزاروں برسوں سے آپ یہی مانتے آئے ہیں کہ شادیاں تو عورتوں کی مرضی کے خلاف ہی ہوا کرتی ہیں۔ مردوں پر اُن کی مرضی کے خلاف کبھی کوئی عورت زبردستی شادی نہیں لاد سکتی۔ مگر میرے بارے میں آپ کا یہ اندازہ بالکل غلط ہے۔ میری بیوی کو ایک ایسے شوہر کی ضرورت تھی جو کافی پیسہ کماتا ہو اور "میمنا" یا بندھالہ کی طرح بے زبان ہو۔ جیسے کوئی شکاری شکار پکڑتا ہے ویسے اُنھوں نے مجھے پکڑ لیا ہے اور تقریباً زبردستی ہی مجھ سے شادی کر لی۔ تقریباً کہنے کا کارن یہ ہے کہ چند لمحات کے لئے اُنھوں نے مجھ پر ایسا جادو ڈالا جیسا کہ اکثر لڑکیاں ڈالا کرتی ہیں کہ میں اُن کے ساتھ بیاہ کرنے کو تیار ہو گیا مگر جب سے ہمارا بیاہ ہوا ہے تب سے اُنھوں نے مجھے اتنا پریشان کر دیا ہے کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے اس گرہستی یا خانہ داری سے جان چھڑا کر دور کہیں بھاگ جائیں۔

مگر ہاں! اس کے معنی یہ نہیں کہ اپنا نجی بنگلہ ہو جائے تو اُس سے مجھے خوشی نہیں ہو گی۔ جی نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ میرے بھی دل کے کسی گوشہ میں وہ جذبہ ضرور چھپا ہوا ہے۔ لیکن اُس کے لئے ابھی سے جان کو جنجال میں ڈال دینا مجھ کو بالکل منظور نہیں ہے۔ اصل میں جتنا پیسہ میں کماتا ہوں اُتنے میں ہماری گرہستی مزے سے چل سکتی ہے (اور آج بھی میری کمائی سے ہی گھر چل رہا ہے!) اور میں چاہتا ہوں کہ زندگی کے چار دن آرام سے گزر جائیں۔ اچھی اچھی چیزیں کھائی جائیں، بڑھیا کپڑے پہنے جائیں، اپنی عورت کو لے کر گھومنے یا فلم دیکھنے جایا جائے اور اس طرح زندگی سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ پھر لوگ ہمیں امیر یا مالک مکان نہ کہیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ مگر ہماری دیوی جی نے اپنے کو گرہستی کی گاڑی میں اس طرح جُتوا لیا ہے کہ میری تمناؤں اور خواہشوں کے بارے میں سوچنے کی انھیں فرصت ہی نہیں ملتی۔ وہ خود تو غلام بن ہی گئی ہیں۔ مجھے بھی اُنھوں نے اپنے ساتھ غلامی کی زنجیر میں گرفتار کر لیا ہے۔ اپنے ہی بنائے ہوئے قید خانے میں ہم قیدیوں کی طرح سڑ رہے ہیں۔

انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے کہ بے وقوف لوگ گھر بناتے

ہیں اور عقل مند لوگ ان میں رہتے ہیں! اسی وزن پر ہماری مراٹھی زبان میں ایک ضرب المثل رائج ہے۔ کہ "آدمی مکان بناتے ہیں اور چوہے چھچھوندر ان میں رہتے ہیں!" میں بھی اسی طرز پر ایک کہاوت بنانا چاہتا ہوں، کہ "بے وقوف ماں باپ گھر بناتے ہیں اور نادان لڑکے ان میں رہتے ہیں!" مگر یہ لڑکے خود ان مکانوں میں رہیں تو بھی میں کہوں گا کہ غنیمت ہے کیوں کہ اکثر دیکھا یہ جاتا ہے کہ والدین پانی کی طرح پسینہ بہا کر تمام زندگی میں مکان بنا لیتے ہیں۔ مگر ان مکانوں میں رہنا بہت کم لوگوں کی قسمت میں بدا ہوتا ہے گھر بنانے والے مشکل سے دو چار برس اُس میں رہنے پاتے ہیں کہ خدا کے گھر سے انھیں بلاوا آتا ہے اور جو کوں رہ کر بنایا ہوا گھر چھوڑ کر انھیں چل دینا پڑتا ہے۔ اس طرح بنے بنائے مکان جن لڑکوں کو ملتے ہیں وہ اکثر نالائق نکلتے ہیں اور باپ دادا کی جائداد کو بہت جلد اُڑا دیتے ہیں۔ اسی لئے میری یہ پکی مانتے ہو گئی ہے کہ کم از کم بچوں کی بھلائی کے لئے تو ہمیں پیسہ یا جائداد بنا کر نہیں رکھنی چاہئے۔ مگر میری بات سمجھنے کو ہماری شریمتی جی تیار ہوں تب نا!

اس معاملے میں بمبئی کے لوگ بڑے عقل مند ہوتے ہیں۔ دن رات تکلیف اٹھا کر پیسہ کمانے اور مرتے وقت اپنی (یا مہاجن کی) ملکیت کا گھر بنانے کی نادانی وہ کبھی نہیں کرتے۔ وہ اس طرح رہتے ہیں گویا "آج کا دن اپنا ہے، کل کی فکر کل کریں گے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا!" پشت در پشت وہ ایک ہی چال یعنی بڑی عمارت میں ایک ہی کمرے میں رہتے آئے ہیں۔ اس لئے وہ کمرہ انھیں اپنے نجی مکان جیسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جتنا پیسہ ملے اُس سے زندگی کے لطف کو پوری طرح لوٹنا ہی اُن کا اصول ہوتا ہے اس طرح وہ کبھی مایوس نہیں رہتے۔ مستقبل کی فکر نہ ہونے سے جب جتنا پیسہ ملے اُتنے میں سارے شوق کیسے پورے کرنے چاہئیں۔ اس کی جانکاری اُن کو اپنے باپ دادا سے ہی ملتی ہے۔

ہماری مراٹھی زبان میں مکان کے متعلق ایک اور ضرب المثل مشہور ہے۔ وہ یہ کہ: "گھر پاہاوے باندھون آنی لگن پاہاوے کرون" یعنی مکان بنا کر دیکھو اور شادی کر کے دیکھو! دونوں چیزیں بڑی مشکل ہیں۔ دونوں باتیں پہلے تو بڑی دل چسپ معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بعد میں دونوں کے متعلق آدمی کو پچھتانا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے دماغ سے یہ کہاوتیں نکلی ہوں گی وہ سچ سچ غیب دان ہوں گے۔ ان پیشین گوئی کرنے والے صاحبوں کو صدہا سال پیشتر شاید یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ بیسویں صدی میں مہا بھارت سے بھی زیادہ خطرناک دو جنگیں ہونے والی ہیں اور اس وقت آدمی کو رہنے کے لئے جگہ ملنا اتنا ہی مشکل ہو گا۔ جتنا کہ ساری عمر پاپ یا گناہ کرنے والے کو موت کے بعد جنت میں جگہ پانا مشکل ہو گا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں اپنا نجی گھر بنانا اتنا مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے کہ کوئی بھی شخص جس کا دماغ ٹھکانے ہو اپنا گھر بنانے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑے گا۔ جس کو زندگی بھر کی فکر اور پریشانی مول لینی ہو وہی اپنا گھر بنائے۔

میرے ایک دوست مالک مکان ہیں۔ اچھے ادیب ہیں۔ بھلے آدمی ہیں۔ زبان پر کافی عبور رکھتے ہیں اور جب کبھی فرصت ملتی ہے تو بڑے دل کش مضمون بھی لکھتے ہیں، مگر عدالتوں کے چکر میں وہ اتنی بری طرح پھنس گئے ہیں کہ اپنا مکان بیچ کر کرائے کے مکان میں رہنے کی بات وہ فی الحال سوچ رہے ہیں۔ اُن کے کرایہ دار طرح طرح کی ترکیبیں نکال کر ان کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ مُنہ مانگا کرایہ قبول کر کے جگہ حاصل کرنا اور پھر کرایہ ہی نہ دینا۔ واجب کرایہ کے لئے عدالت میں عرضی پیش کرنا یا مالک کو ہی کرایہ وصول کرنے کے لئے عدالت جانے پر مجبور کرنا، اور پھر عدالت سے قسط بندی حاصل کر کے قسطیں ادا نہ کرنا۔ یہی وہ ترکیبیں ہیں۔ آج کل کے قانون مالک مکان کے بجائے کرایہ دار کی ہی مدد کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے دوست کا سارا وقت عدالتوں اور وکیلوں کے گھروں میں ہی چلا جاتا ہے۔

اُن کی یہ مثال آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے مالک مکان بننے کے خیال سے ہی میری تدرح لرز اٹھتی ہے۔ خدا نخواستہ آئندہ کبھی ہماری شریمتی جی کا بنگلا بن گیا۔ ہو جائے گا تو اتنی رقم کا سود نکل آئے گا یا میونسپل ٹیکس MUNICIPAL TAX کا پیسہ اپنی جیب سے دینا پڑے گا۔ منہ مانگا کرایہ دینے والے (یعنی دینے کا وعدہ کرنے والے) لوگوں کو ہماری بیوی صاحبہ کرایہ پر جگہ تو دے دیں گی۔ لیکن جب وہ کرایہ دینا بند کر دیں گے تو عدالت کے چکر مجھے ہی کاٹنے پڑیں گے۔ تب شریمتی جی گھر سے باہر نہیں نکلیں گی۔ بلکہ گھر میں بیٹھے بیٹھے ہمیں حکم فرماتی رہیں گی کہ فلاں وکیل سے ملو، فلاں مجسٹریٹ یا حاکم کی خوشامد کرو۔ یا فلاں افسر کے پاؤں پکڑو وغیرہ وغیرہ!

مکان کے اخراجات کا اندازہ شروع میں صحیح طور پر نہ ہونے سے

کبھی کبھی بڑی بُری حالت ہوتی ہے۔ میرے ایک متوسط طبقہ کے دوست ہیں۔ اُنھوں نے پائی پائی جمع کر کے مکان بنوانا شروع کر دیا۔ مگر گھر آدھا بھی نہیں بن پایا تھا کہ اُن کی ساری پُونجی ختم ہو گئی۔ اب وہ بیچارے کیا کریں؟ مکان ویسا ہی ادھورا چھوڑ دیں تو خرچ کیا ہوا پیسہ فضول جاتا ہے اور اُسے مکمل کرنے کے لئے تو پیسہ نہیں تھا۔ آخر اُنھوں نے قرضہ لے کر کسی طرح گھر مکمل کر دیا۔ مگر اُس قرضے کے سُود اور سرکاری ٹیکسوں کے بوجھ کے نیچے وہ اتنی بُری طرح دب گئے کہ ان کی جان عذاب میں پڑ گئی۔ اور جلد ہی اُنھوں نے وہ مکان بیچ ڈالا۔ اب وہ کرایے کے مکان میں بے فکر ہو کر آرام سے رہتے ہیں۔

چند بمبئی والے کہیں گے کہ آدمی کو کئی دفعہ لاچار ہو کر مالک مکان بننا پڑتا ہے۔ اور اُن کے اس قول کو مجھے قبول کرنا ہی ہوگا۔ بمبئی میں رہنے والا ہمارا ایک دوست ہے۔ اُسے جب رہنے کو جگہ نہ ملی تو مجبوراً ایک بڑے مکان میں تین کمرے یعنی بلاک اونرشپ Block-Ownership کے اصول پر دو کمروں کا مالک بننا پڑا ہے۔ اس سے بھی وہ بہت تنگ آ گیا ہے۔ مکان کی قسط اور کرایہ چکانے کے لئے اس کی بیوی اور بھائیوں کو ہی نہیں بلکہ اس کے بوڑھے باپ کو بھی ضعیفی میں نوکری کرنی پڑتی ہے اس سے اُن کی شادی کی خوشی بھی کافور ہو گئی ہے۔ اس کی بیوی اور والد گویا اُس روز کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ کب مکان کی رقم پوری ہو اور نوکری کی قید سے نجات ملے۔

یہ ساری باتیں بہت بڑھا چڑھا کر میں اپنی گھر والی کو سُناتا تھا اور اُنھیں یہ بھی اچھی طرح سمجھاتا تھا کہ ہمارے دیش میں جلد ہی سماج وادی Socialistic سرکار آنے والی ہے، اُس وقت سب خانہ بدوشوں کو سرکار کی طرف سے آرام دہ مکان ملنے والے ہیں۔ شاید اس سے پیشتر ہی 'جوتنے والے کی زمین' کی طرز پر 'رہنے والے کا مکان' کا قانون پاس ہونے والا ہے۔ اُس قانون کے تحت ابھی ہم جس مکان میں رہتے ہیں وہ ہمارا ہو جائے گا اور آئندہ ہمارے بنگلے میں رہنے والا کرایہ دار اُس بنگلے کا مالک بن جائے گا۔ مگر ہماری شریمتی جی پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ اُن کو ان کے عزم سے ہٹانے کے واسطے میں جھوٹی باتیں کہتا ہوں اور تب وہ پہلے سے بھی زیادہ ناراض ہو جاتی تھیں

چناں چہ آج کل میں اس بات کو ٹالنے لگا ہوں۔ مگر مالک مکان کی تکلیفوں سے آگاہ ہونے کی وجہ سے میں خدا پر پورا بھروسہ نہ ہونے کے باوجود خدا سے التجا کرتا رہتا ہوں۔

"اے خُدا! تم مجھے اس جھنجھٹ میں مت پھنسانا!"

بچپن میں مجھے مرحوم سہگل (یا کسی اور) کا "ایک بنگلا بنے نیارا" گیت بہت پسند آتا تھا۔ مگر آج کل اُس کا سُننا بھی مجھے گوارا نہیں ہے۔ کبھی کبھی میں بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ "اے ایشور! ہماری شریمتی جی کو عقل دینا، اگر یہ تمھارے اختیار کی بات نہ ہو تو کم از کم مجھ پر رحم کر کے تم میری بیوی کی نوکری تو چھڑوا دو اور کسی غرض مند کو دلوا دو، کیوں کہ جب تک وہ نوکری کرتی رہیں گی تب تک اُن کے دماغ میں عقل کی روشنی نہیں پہنچے گی۔ چنانچہ بڑی مہربانی ہوگی، اگر ہماری بیوی صاحب کی نوکری چلی جائے!"

کیوں صاحب؟ آپ ہنس رہے ہیں؟ جناب آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کی ہنسی کا طنز میرے دھیان میں نہیں آیا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ایسا شوہر اب تک نہ کہیں دیکھا ہے نہ سُنا جو بھگوان سے یہ منت مانگے کہ اُس کی جورو کی نوکری چلی جائے۔ مگر سنت میرا بائی نے کہا ہے ناکہ

"گھائل کی گت گھائل جانے"

چوں کہ آپ کی بیویاں نوکری نہیں کرتیں، اور اگر کرتی بھی ہیں تو اُن پر بنگلا بنانے کا خبط یا بُھوت سوار نہیں ہوا ہے اِسی لئے آپ ہنس رہے ہیں، مگر یاد رکھئے کہ جب چکّی میں پسنے والے روتے ہیں، تب باہر والے ہنستے ہیں، لیکن اُن کی بھی وہی حالت ہونے والی ہوتی ہے، چناں چہ ذرا سنبھل کر ہی ہنسئے!

آیندہ شمارے کے متوقع مضامین

ایس، پی چیٹرجی

بھارت کا قومی اٹیلس

بھارت کے ایک قومی اٹیلس کی ضرورت آزادی کے فوراً بعد ہی محسوس کی گئی تھی۔ سورگ باشی سردار پٹیل نے ۱۹۴۹ء میں مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ملک کا ایک قومی اٹیلس تیار کیا جائے۔ ہمارے پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کو بھی اس کام سے دلچسپی ہے حکومت ہند کی وزارت قدرتی ذرائع و سائنسی تحقیق نے انھیں کی ہدایت پر بھارت کا ایک قومی اٹیلس تیار کرنے کا کام شروع کیا اور یہ اسکیم دوسرے پنج سالہ منصوبے میں بھی شامل کر لی گئی ہے اس پر تقریباً ایک کروڑ روپے کے خرچ کی منظوری دی گئی ہے۔

قومی اٹیلس کی ترتیب و تالیف کا خاص مقصد ایسے نقشے تیار اور جمع کرنا ہے جو ملک کی ایک مکمل سماجی اور اقتصادی تصویر پیش کرتے ہوں۔ اس کا ایک اور مقصد ملک کے متعلق بھارت کے شہریوں کی معلومات میں اضافہ کرنا اور مادرِ وطن سے ان کی محبت کے واسطے ایک مستحکم بنیاد تیار کرنا ہے۔

ایک ایسا اٹیلس مرتب کرنے کا کام درحقیقت بہت بڑا کام ہے، چونکہ اس میں جغرافیائی نقشوں کے علاوہ ایسے نقشے بھی شامل کئے گئے ہیں جن سے ملک کے سماجی و اقتصادی حالات کا علم ہو سکے، اس لئے ریاستی حکومتوں کو اس اٹیلس کی تیاری میں ایک اہم پارٹ ادا کرنا ہوگا۔ ملک کے مختلف حصّوں کی زرعی، صنعتی و مواصلاتی ترقی اور سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں کے بارے میں ایسی معلومات جسے نقشوں میں دکھایا جا سکے، فراہم کرنا انھیں کا کام ہے۔

بھارت کا قومی اٹیلس ایسے خصوصی اور تفصیلی نقشہ جات پر مشتمل ہوگا۔ جن کے ذریعے سے ملک کے جغرافیائی حالات کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوگا بھارت کے چھ لاکھ دیہات میں سے تقریب قریب ہر ایک گاؤں کے بارے میں سماجی اور اقتصادی معلومات حاصل ہو سکے گی۔ یہ نقشے اس طرح تیار کئے جائیں گے کہ ساری تفصیل آسانی سے سمجھ میں آ سکے۔ قومی تعمیر و منصوبہ بندی کے لئے اس اٹیلس کی اہمیت بہت زیادہ ہوگی اور یہ دوسرے پنج سالہ منصوبے اور حکومتِ ہند کے آئندہ منصوبوں کے واسطے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔

ہم نے کئی موجودہ قومی اٹیلسوں اور خاص کر روسی اٹیلس اور فرانسیسی اٹیلس کا مطالعہ کیا ہے۔ روس نے یہ اٹیلس تیار کرنے کی اسکیم لینن کے مشورے پر منظور کی تھی۔ روسی حکومت کی مرکزی ایگزیکیوٹو کمیٹی نے ۱۷ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ایک حکم کے ذریعے سوویٹ اٹیلس تیار کرنے کی اجازت دی اور ڈاکٹر اے ای موٹیلوف کی صدارت میں ایک ایڈیٹوریل بورڈ مقرر کیا۔ ان کے ماتحت ۱۷۵ نقشہ نگاروں نے پانچ برس تک کام کیا۔ حکومت کے حکم کے مطابق روس کے تمام سائنسی اداروں کے لئے نقشے کی تیاری میں مدد دینا ضروری تھا۔ یہ اٹیلس دو جلدوں پر چھاپا گیا۔ پہلی جلد ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی اور دوسری ۱۹۳۹ء میں، حال ہی میں روس نے دنیا کے اٹیلس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک اور شاندار اٹیلس جس کا نام "بحری اٹیلس" ہے پچھلے سال شائع کیا گیا ہے۔

روس کے بعد جغرافیائی نقشوں کی ترتیب و اشاعت میں فرانس سب سے آگے ہے۔ نقشہ کشی کے میدان میں فرانسیسی اٹیلس کو سب سے نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن لڑائی سے پہلے چھاپا گیا تھا

اور اب دوسرے ایڈیشن کے واسطے نقشے تیار کئے جا رہے ہیں۔

ٹیکنیکل نوعیت کی منصوبہ بندی میں جغرافیائی نقشوں کی اہمیت برطانیہ میں بھی تسلیم کی گئی ہے اور وہاں یہ کام ایک نئے محکمے کے سپرد کیا گیا ہے۔ یہ محکمہ مکانات اور لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزارت کے تحت کام کرتا ہے۔

بھارت کی نیشنل اٹلس آرگنائزیشن کی بنیاد ۱۹۵۶ء میں مزید مستحکم کی گئی پلاننگ کمیشن کی اٹلس کی اصل اسکیم پر نظر ثانی کرنے کی تجویز منظور کر لی گئی اس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ اہم نقشے دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں شائع کئے جائیں اور باقی ماندہ تیسرے منصوبے کے دوران میں چنانچہ نظر ثانی کے بعد ایک نئی اسکیم تیار کی گئی ہے نیشنل اٹلس آرگنائزیشن ایک مشاورتی بورڈ اور ایک ایگزیکیوٹو کمیٹی کے زیر ہدایات کام کر رہی ہے بورڈ کے صدر مرکزی وزیر قدرتی ذرائع شری کے۔ ڈی مالویہ ہیں۔

قومی اٹلس میں جو نقشے شامل کئے جانے ہیں ان کی ایک ترمیم شدہ فہرست پلاننگ کمیشن اور غیر ملکی ماہرین کی تجویزوں کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی اس فہرست میں مزید تبدیلی کرنا پڑے۔ اس امر کی سفارش کی گئی ہے کہ اٹلس کی جلد اس طرح باندھنی چاہئے کہ اس میں سے نقشے نکالے جا سکیں یا مزید نقشے اس میں شامل کئے جا سکیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو نقشے تیار ہوں گے وہ فوراً چھاپے جا سکیں گے اور ساری اٹلس کے مکمل ہونے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ فرانس کے قومی اٹلس کی جلد بندی اسی نمونے پر ہوتی ہے۔ قومی اٹلس کے ہندی ایڈیشن کا سائز لمبائی میں ۱۸ انچ اور چوڑائی میں ۲۰ انچ ہوگا۔ توقع ہے کہ بڑے اٹلس کا سائز بھی یہی ہوگا۔

اٹلس کے لئے نقشہ جات جن عنوانات کے تحت تیار کئے جا رہے ہیں ان میں سے خاص خاص عنوان یہ ہیں۔

(۱) عام نقشے (۲) تاریخی جغرافیہ اور آثار قدیمہ (۳) جغرافیائی خصوصیات (۴) ارضیات (۵) آب و ہوا (۶) سمندر اور دریا اور پانی (۷) پیڑ پودے اور جنگلی جانور (۸) اقتصادی نقشہ جات (۹) سماجی نقشے (۱۰) سیاسی نقشے۔

اٹلس کا ابتدائی ہندی ایڈیشن تیار کرنے کے لئے ۱۵ جون ۱۹۵۶ء کی اور سروے آف انڈیا کے ذریعے اس کی طباعت کے واسطے ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی تاریخیں مقرر کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ اٹلس کا بڑا ایڈیشن دوسرے پنج سالہ منصوبے کے اختتام تک مکمل ہو جائے گا۔

نئے سکے یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے رائج ہوں گے

سکّوں کو بدلنے کا ضابطہ

یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے اعشاری نظام کے سکّے رائج ہو جائیں گے۔ اگرچہ روپے کی قیمت یہی رہے گی۔ البتہ اس کی تقسیم موجودہ ۶۴ پیسوں کی بجائے "۱۰۰ نئے پیسے" ہو جائے گی۔

موجودہ اٹھنّی اور چوّنی کی قیمت برقرار رہے گی اور وہ نصف روپیہ اور ایک چوتھائی روپے کے طور پر علی الترتیب ۵۰ نئے پیسے اور ۲۵ نئے پیسے کے بالکل مساوی قیمت پر چلتی رہیں گی۔ لیکن دوّنی اور اس سے نیچے کے سکّوں کے بالکل مساوی کوئی بھی نئے پیسے نہیں ہیں۔

موجودہ سکّوں سے اعشاری نظام کے سکّوں کے تبادلے سے متعلق دو گوشوارے حکومت کی طرف سے تقسیم کئے جا رہے ہیں، یہ گوشوارے اخباروں اور رسالوں میں بھی چھپ چکے ہیں

ہندوستانی سکّوں کے ترمیم شدہ قانون میں تبادلے کی شرح کے مطابق موجودہ ایک پیسہ ۱ ۹/۱۶ نیا پیسہ کے بالکل برابر ہے لیکن حقیقی لین دین میں ½ نیا پیسہ اور اس سے کم کی کسر کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور ½ نیا پیسہ سے زیادہ کی کسر کو ایک نیا پیسہ تصور کیا جائے گا۔ لہٰذا کسی بھی لین دین میں جس میں صرف ایک ہی پیسے کی رقم ہو اُسے دو نئے پیسے کے مساوی قرار دیا جائے گا۔

بعض لوگ موجودہ دوّنی اور اس سے نیچے کے سکّوں کے تبادلے کی بابت پریشان ہیں۔ لیکن ان سکّوں کے عملی لین دین میں خسارے کی اوسط قدر سے قلیل رہے گی۔ اگر اور لین دین کی مجموعی حالت پر غور کیا جائے تو نفع یا نقصان نہ ہونے کے برابر رہے گا۔

نئی کتابیں اور رسالے

نقدِ غالب

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۷۵ صفحات ۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ کتاب مجلد اور جلد پوش کی حامل ہے ۔ قیمت دس روپے ناشر انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ، مرتب ڈاکٹر مختار الدین احمدؔ

علی گڑھ میگزین کا 'غالب نمبر' جسے مختار الدین احمدؔ آرزو نے مرتب کیا تھا ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا ۔ حالات و شخصیت سے متعلق جو مضامین اس میں شامل تھے وہ 'احوالِ غالب' کے نام سے چھپ چکے ہیں ۔ تحقیق و تنقید سے متعلق جو مضامین اس میں شامل تھے ترمیم و اضافہ کے بعد وہ 'نقدِ غالب' کے نام سے شائع ہوئے ہیں ۔ لکھنے والوں میں اُردو ادب کے نمائندہ ادیب شامل ہیں ۔ غالب پر اس زمانے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ چنانچہ انھیں باتوں کا کسی حد تک اعادہ اس کتاب کے مضامین میں بھی ہے لیکن 'غالب کا تفکر' میں سید احتشام حسین نے غالب کے کلام پر ایک نئی حیثیت سے دعوتِ نظر دی ہے ۔ آپ نے غالب کے تفکر کا پس منظر پیش کر کے اس زمانے کے سماجی اور معاشی حالات کے پیشِ نظر کلامِ غالب کا جائزہ لیا ہے ۔

نوجوان تنقید نگار ممتاز حسین کا مضمون 'نظریۂ شعر' اور خلیل الرحمن اعظمی کا مضمون 'غالب اور عصرِ جدید' ایسے مضامین ہیں کہ نئی نسل کو ان کی روشنی میں غالب کو سمجھنے میں ایک خاص مدد ملے گی ۔ اعظمی کے مضمون کا آخری حصہ خاص طور پر توجہ طلب ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"غالب کے کلام کا اگر ہم غور سے مطالعہ کریں اور اس کے دائروں تک ہماری نگاہ جا سکے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ماضی کے افکار و خیالات کے علاوہ غالب کے ذہن پر خود اپنے ذاتی مسائل کا بھی اثر پڑا تھا ۔ زمانے کے مروجہ نظامِ معاشرت میں زندگی گزارنے کے لئے اور سماج میں اپنے آپ کو پیش کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے غالب کو جو جو کچھ کے بیلنے پڑے اُن کی تفصیل بڑی لمبی ہے ۔ لیکن اس کے نتائج کو آپ دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے ان کے یہاں تلخی، شکست خوردگی، طنز، تشکیک، تنہائی کا احساس، انانیت اور مردم بیزاری پیدا ہو گئی تھی ۔"

چنانچہ غالب کا ایک شعر غالب کے اس ذہنی پس منظر کو پیش کرنے میں کامیاب ہے ۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اعظمی نے بہت سے اور اشعار اپنے بیان کی وضاحت میں پیش کئے ہیں ۔ آخر میں اعظمی نے فیض، ن ۔ م راشد، مجاز، میراجی، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، جذبی، یوسف ظفر، اختر الایمان، منیب الرحمٰن کے کلام سے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جس سے آج کے نوجوان ادیب کی محرومی اور مایوسی سامنے آ جاتی ہے اور آخر میں اعظمی نے عصرِ جدید کے شعراء اور غالب میں ایک خاص فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"نئی شاعری کا یہ انسان پیچیدہ و مبہم اور اپنے زمانے کی لائی ہوئی مصیبتوں کا شکار ہے ۔ اس کی بنیاد کمزور ہے اور نئے زمانے نے اسے سوائے احساسِ شکست کے کچھ نہیں دیا ہے اس لئے نیا شاعر اپنے اندر وہ سکت نہیں پاتا کہ

فضا میں دُور تک پرواز کر سکے ۔ غالب کی شخصیت اپنی بنیاد
کے اعتبار سے مضبوط تھی اس لئے وہ سارے آلام سہہ گئی ۔"

کتاب کے آخر میں قاضی عبدالودود صاحب کا تحقیقی مقالہ " غالب بہ حیثیت محقق "
دو سو سے زیادہ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ قاضی صاحب کا تبحرِ علمی، مطالعہ اور پایۂ تحقیق
بہت بلند ہے ۔ موصوف نے اپنی ساری عمر ایسی ادبی کاوشوں میں بسر کی ہے جن کا
نام سننے سے آج کی نسل لرز اٹھتی ہے ۔ غالب پرستی کے اس دَور میں قاضی صاحب
نے غالب کی لغزشوں، ادبی فراموش کاریوں اور غلط تحقیق کو بڑی جسارت سے پیش
کیا ہے اور حق یہ ہے کہ ~ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

غالب ایک عام انسان کی حیثیت رکھتے تھے ۔ ان کے یہاں بھی لغزشیں
ہیں، خامیاں ہیں ۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ ایک رند مشرب شاعر
تھا، بذلہ سنج ادیب تھا ۔ محقق کا دعویٰ اُسے نہیں دینا چاہیئے ۔ غالباً یہی مقصد
قاضی صاحب کے گراں قدر مقالے کا ہے ۔

یہ کتاب ادبِ اردو میں ایک متوازن اضافہ ہے ۔ غالبیات سے دلچسپی
رکھنے والوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ اور ادب کے طالب علموں کے لئے ایک
رہنما ۔ ملنے کا پتہ ۔ انجمن ترقیٔ اردو ہند علی گڑھ

ذکرِ حافظ

مرتب سجاد ظہیر ۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۔ قیمت ۲ روپے
۴ آنے ۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوش عمدہ ۔ صفحات ۱۵۲ ۔ تقطیع
۲۲×۱۸/۸ ۔

پہلے ۷۰ صفحوں میں مرتب نے کلامِ حافظ کا جائزہ لیا ہے ۔ ظ انصاری نے
اپنے ایک مضمون میں جس کا مقصد غزل کو صنفِ مردود قرار دینا تھا، سعدی
اور حافظ کی غزل گوئی پر توجہ خاص کی تھی ۔ سعدی کے باب میں انھوں نے کہا
سعدی نے غزل اور غزل گوئی کو موضوع کے اعتبار سے بہت زیادہ وسعت دی ۔
لیکن ان کے زمانے میں جو ایران کی ملکی حکومت کا زوال ہوا اور ہلاکو خاں کے حملے
سے جو تباہی واقع ہوئی اس نے سعدی کی طبیعت میں طنز بھر دیا ۔ حافظ کے متعلق
انھوں نے چند نظریے قائم کئے ۔

" حافظ نے فرار میں نجات چاہی اور اپنے گرد انھوں نے عیش کوشی اور
سکون پسندی کا حصار کھینچ لیا ۔
حافظ کی غزلوں میں وہ لذت پر مبنی، بے ثباتیٔ عالم، داخلیت گزا
اور زندگی کی تاریکیوں کو جامِ عیش میں ڈبو دینے کا جذبہ رچا
ہوا ہے جو خود حافظ کی زندگی میں رَس بس گیا تھا ۔ "

اس کتاب کی طویل تمہید غالباً انھیں نظریات یا مفروضات کو جھٹلاتی ہے ۔
سجاد ظہیر نے بڑی انصاف پسندی سے حافظ کے کلام کی حقیقتیں اُجاگر کی ہیں وہ
لکھتے ہیں :-

" محبت کے زمزمہ سنج حافظ کی نظر محدود نہیں ہے ۔ اگر اس
میں نشاطِ حیات کا جوش ہے اور وہ انسانوں کو زندگی کے ایک
ایک لمحے اور فطرت کے ہر ایک رنگین مظاہرے سے اپنے جسم
اور روح کو شادماں اور پُر نور کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو دوسری
طرف اس کی حقیقت بیں نظر اپنے معاشرے کی ان خرابیوں پر
بھی پڑتی ہے جو بیشتر اچھے اور ایماندار انسانوں کی زندگیوں کو
مایوسیوں سے بھر دیتی ہے ۔"

جہاں حافظ کے یہاں شدید قسم کی تقدیر پرستی پائی جاتی ہے وہاں جہدِ حیات
کا پیغام بھی اس کے وہاں ملتا ہے ۔ اس کتاب کی تمہید جدید تنقید کا ایک بہت
اچھا شہ پارہ ہے ۔ آخر میں حافظ کے کلام کا ایک بصیرت افروز انتخاب ہے ۔ انتخاب
بھی غلام محمد قزوینی اور ڈاکٹر قاسم غنی کے مرتب کردہ نسخے سے کیا گیا ہے جو اس
وقت تک دیوانِ حافظ کا سب سے مستند نسخہ ہے ۔

سرِ رشتۂ ہستی

شاد عظیم آبادی کے قطعات کا مجموعہ ۔ مرتب حمید عظیم آبادی ۔
ناشر کتاب منزل ۔ سبزی باغ پٹنہ ۔ ۴ قیمت ۱؎ ضخامت ۱۰۸ صفحات
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت عمدہ ۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پوش
کی حامل ۔

شاد عظیم آبادی کی منفرد غزل گوئی کا ایک زمانہ معترف ہے ۔ اُن کے
اشعار زبان زدِ عوام ہیں

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی
خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئے گا

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

تسلیوں میں اُلجھایا گیا ہوں ۔۔۔ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ان کے قطعات کی وہی شانِ سخن ہے ۔ چند عنوانات یہ ہیں ۔ اسرارِ وجود، تغیراتِ عالم، خدا اور انسان، آشوبِ زمانہ، لوازم شاعری، گوتم بدھ، نیا اور پرانا وطن، میں کون ہوں ۔ کوئی اڑتالیس قطعات شاملِ کتاب ہیں ۔
"میں کون ہوں" کے آخر میں فرماتے ہیں :-

مجھ سے ہزار خاک کے پردے میں جا چھپے   ان کا بلوکل ہیں فقط آئینہ دار ہوں
بیکس مسافرت ہیں ہوتے وہ ذی کمال   میں ہوں وطن میں اس پہ غریب الدیار ہوں

حالِ زمانہ کے عنوان سے ایک قطعے کے آخر میں فرماتے ہیں :

یا للعجب ہمارے زمانے کے قدرداں   شاعر سے چاہتے ہیں امامت نماز کی

محرابِ غزل

مصنف روشؔ صدیقی ۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر دہلی ۔ قیمت تین روپے ۔ کتاب ۸/۲۲×۱۸ کے ۱۶۰ صفحوں پر مشتمل ہے ۔

روشؔ اردو کے خوش گو شعراء میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ۔ یوں تو نظم اور غزل دونوں میدانوں میں آپ نے شہ سواری کے جوہر دکھائے ہیں لیکن غزل سے آپ کو مناسبتِ خاص ہے ۔ اس مجموعے میں غزلیں ردیف وار (حروفِ تہجی کے اعتبار سے) شائع ہوئی ہیں ۔ یہ طریقہ بہت پُرانا ہے اس سے شاعر کے ذہنی ارتقاء کا کم پتہ چلتا ہے مگر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہر غزل کا سنِ تصنیف درج کر دیا گیا ہے ۔ روشؔ کے یہاں غزل کا وہ سوقیانہ پن نام کو نہیں جو اردو کے بیشتر شعراء کے ہاں پایا جاتا ہے ۔ مضامین کی پاکیزگی، عزتِ نفس، بلند کرداری، خلوصِ قلب کے حامل مضامین نے آپ کی غزل کو پاکیزگی، عزت، بلندی اور خلوص بخشا ہے ۔ انتخابِ کلام کی ضرورت نہیں کیونکہ سارا کلام ہموار اور ایک سطح کا ہے ۔ ان کا کلام پڑھ کر خود انھیں کے قول کے مطابق کہنا پڑے گا

میخانے میں ہم نے تو روشؔ آج یہ دیکھا
باقی ابھی کچھ لوگ ہیں اربابِ صفا میں

ہمیں امید ہے کہ اردو غزل کا یہ شائستہ مجموعہ قبولِ عام کی سند پائے گا

دونیم

ڈاکٹر مسعود حسین کی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ ۔ ناشر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۔ قیمت دو روپے ضخامت ۱۰۸ صفحات ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
ڈاکٹر مسعود حسین صاحب اردو کے نہایت قابل قدر ادیبوں میں ہیں ۔ شاعری کی دنیا میں بھی آپ اپنے ہمہ جہت ذوقِ ادب کا ثبوت دیتے رہتے ہیں ۔ "دونیم" میں آپ نے نئے نئے تجربے کئے ہیں اور خود اپنے قول کے مطابق بہت سی فنی قیود کو توڑا ہے ۔ ہمیں آپ کے اس قول سے تو اتفاق ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں ہمیں عربی اور فارسی کے تتبع میں اپنے دیسی الفاظ سے کنارہ کشی نہیں کرنا چاہئے ۔ لیکن پرواہ کو نگاہ اور تھاہ کا ہم قافیہ قرار دینا تو محض غلطی ہے (صفحہ ۱۲۵)

گیتوں میں بڑا تنوع اور سادگی ہے ۔ ہندی الفاظ و قوافی کے صوتی حسن سے آپ نے بہت فائدہ اٹھایا ہے مسعود حسین صاحب کی نظموں اور غزلوں میں ایک نئی زندگی کی جھلک ہے ۔ طرزِ اظہار، اسلوبِ بیان اور ہیئت میں آپ کے تجربے نئے لکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں ۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے ۔

گلوں کے گھاؤ بھی شبنم سے دھل سکے ہیں کبھی
کہ اشک نے مرے زخموں کو اور مہکایا

وہ معتبر تو نہیں ہے پر اس کو کیا کیجے
کہ اس کے وعدوں پہ پھر آج اعتبار سا ہے

آج بھی انکار
لیکن کچھ تو بول
ان ہونٹوں کو کھول
جو کرتے ہیں پیار
آج بھی انکار

"بانسوں کے جنگل میں" اور "آموں کے کنج میں" بہت پیاری نظمیں ہیں ۔ ڈھیں، فعلن کے وزن پر آیا ہے یہ درست نہیں ۔ یہاں، وہاں، جہاں وغیرہ کے بعد پتہ یا پہ کا استعمال فصیح نہیں ۔ ایک دو جگہ یہ بھی موجود ہے ۔

سرودِ نو

مجموعۂ کلام پروفیسر اختر قادری صدر شعبۂ اردو و فارسی ال ۔ اس کالج مظفر پور بہار ۔ قیمت ۔ ناشر کاشانۂ ادب ہتیر یا سرائے دربھنگہ مرتب حمید قادری ذوق ۔

تعارف عطا کاکوی، مقدمہ اثر لکھنوی

۱۳ نظمیں، ۲۳ غزلیں اور متعدد رباعیات و قطعات اس مجموعے میں شامل ہیں ۔ اختر قادری اچھے نظم نگار ہیں ۔ فنی روایات کے پابند

لیکن روایت پسندی کے ہلکے اثرات ان کے کلام میں کہیں نہیں ملتے۔ ذرا دو تین شعر ملاحظہ فرمائیے

عجیب دن تھے وہ دن زندگی کے اے اختر — مگر غزاں میں غلط ہیں بہار کی باتیں

اختر ہزار بات کی اک بات ہے یہی — یعنی دماغ کا نہیں اب دل کا وقت ہے

ہزار پیچ لگائیں خرد کے دیوانے — جنونِ عشق کی اک جست اور قصہ پاک

ہمارا اسکول کے شعراء میں جہاں راسخ و شاد کا نام آتا ہے وہاں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کے بعد اختر قادری بھی وہاں کے مقبول، معروف اور لائق احترام شاعروں میں سے ایک ہیں۔

اختر شیرانی، فیض، مجاز، عرش، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی — ان شعراء کا انتخاب علیحدہ علیحدہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ ہر انتخاب کی قیمت بارہ آنے ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔

حسرت کی شاعری

ڈاکٹر یوسف حسین۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔ قیمت ۱۲ ۶۴ صفحوں پر مشتمل یہ مختصر رسالہ حسرت کا ایک بہت اچھا تعارف ہے۔

سیاسی معلومات

جلد دوم (حصہ اول) مصنف اسرار احمد آزاد۔ ناشر مکتبہ برہان دہلی قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔ صفحات ۴۰۸ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت و طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ

اس کتاب کی پہلی جلد مقبول ہو چکی ہے۔ مصنف بڑے کہنہ مشق صحافی اور ادیب ہیں۔ اردو میں یہ کتاب اپنی نوعیت کا واحد انسائیکلو پیڈیا ہے اور ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ انگریزی اصطلاحات کو انگریزی حروف میں لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کو ہر لائبریری کی زینت بننا چاہیئے۔

نکہت و نور

سلام سندیلوی کے کلام کا مجموعہ ۱۱۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت عہ شائع کردہ ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ۔ پروفیسر آل احمد سرور نے تعارف لکھا ہے۔ سلام نغز گو شاعر ہیں۔ نظم اور غزل دونوں پر قدرت ہے جذبات کا خلوص اور احساس کی صداقت ان کے یہاں عام ملتی ہے۔ بعض اشعار تو واقعی نشتر ہیں۔

کٹے گی کیسے گل نو کی زندگی یا رب — کہ اس غریب کا کانٹوں میں گھر ابھی سے ہے

بجلی گرے گی صحنِ چمن میں کہاں کہاں — کس شاخِ گلستاں پہ مرا آشیاں نہیں

اس مجموعے میں بہت سی اچھی تاریخی اور رومانی نظمیں شامل ہیں۔

دوسری شام

مصنف پروفیسر محمد مجیب۔ ڈراما۔ ضخامت ۴۴ صفحے۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔ کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۱۲ دو ایکٹ کا یہ دلچسپ ڈراما آرٹسٹ یا فن کار کی بے نیاز زندگی کے سلسلے میں ایک بھرپور طنز ہے۔ زبان آسان ہے اور مکالموں میں تصنع نام کو نہیں۔

سمندر کے کنارے

از سلطانہ آصف فیضی۔ قیمت عہ ضخامت ۲۷ صفحے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ بچوں کے لئے معلوماتی کتاب ہے۔ سمندر سے جو بچے دور رہتے ہیں اُن کے لئے بالخصوص مفید ہے۔ عنوانات ہیں، سمندر کا کنارا، کیکڑے، لائٹ ہاؤس، پکنک، مچھلیاں، جوار بھاٹا، ناریل کا درخت اور ریانا۔ کتاب مصور ہے اور مسلسل مکالمے کا انداز اختیار کر کے نہایت دلچسپ پیرایے میں لکھی گئی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل

از سیف بدرالدین طیب جی۔ قیمت ۵ ملنے کا پتہ ڈائمنڈس امپوریم لمیٹڈ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی علہ ضخامت ۵۶ صفحات

صہبائے ناب

از تقدیس ناب نرمل کلام کا مجموعہ۔ پبلیشر مشری کمار نانڈ گرو۔ مالک ماڈل ووولن اینڈ سلک ملز ویرکہ (امرتسر)

ہندو مسلمان یکساں

کلام فاضل نمبر ۲ از فاضل کشمیری۔ کشمیری نظم مع ترجمہ اردو۔ ملنے کا پتہ محمد احسن مالک کتاب گھر اننت ناگ کشمیر۔ ضخامت ۱۶ صفحات۔

گاندھی جی

تصنیف۔ از خورشید احمد جامی۔ ان بالغوں کے لئے جنھوں نے ابھی پڑھنا سیکھا ہے۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیاتِ اُردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

شرحِ شکوہ و جوابِ شکوہ

کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴۔ قیمت ۵ار۔ مقدمہ پروفیسر سید نواب کریم صدر شعبۂ اردو بہار نیشنل کالج پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔

ارمغانِ امجد

مرتبہ خواجہ حمیدالدین شاہد۔ جناب امجد حیدرآبادی کے جشنِ الماسی منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۹۵۵ء کے مقالات نظمیں، مشاہیر کے پیامات، سپاسنامہ اور جوابِ سپاسنامہ اور تقریبات کی مکمل روداد قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ مہتمم ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن۔

یادگارِ صفی

حضرت صفی اورنگ آبادی کے حالات اور خصوصیاتِ کلام سے متعلق مضامینِ نثر و نظم کا مجموعہ۔ مرتب خواجہ حمیدالدین شاہد۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اُردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

ادارہ ادبیاتِ اُردو ۱۹۵۶ء میں۔

مرتبہ۔ محمد جمال الدین (مہتمم ادارہ) قیمت آٹھ آنے۔ ضخامت ۴۶ صفحے ملنے کا پتہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

وادئ کشمیر

کشمیر کا قومی ترانہ از کوثر قریشی مرحوم۔ یہ نظم آج کل کے کشمیر نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ ضخامت ۳۲ صفحات

امرت سروور

مصنف بھاگ مل سینی۔ ضخامت ۶۸۰ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت، طباعت اوسط۔ کتاب مجلّد ہے۔ قیمت ۶ روپے دس آنے۔ ملنے کا پتہ جیون سدھار پبلیکیشنز بڑھاپورہ ضلع بجنور یو، پی۔

یہ کتاب اخلاقیات محنت سے مرتب ہوئی ہے۔ صوفی شعراء کے اقوال کتبِ مقدسہ کے اقتباسات سبق آموز کہانیاں، الغرض ایک خزانہ ہے جس سے دل و دماغ کو سکون ملتا ہے زبان ملی جلی۔ ہندی، اُردو، فارسی۔ کتاب دلچسپ ہے اور اس زمانے میں اتنی ضخیم کتاب کا شائع کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

بیکراں

جگن ناتھ آزاد کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت ۴ روپے ۸۔ کتاب مجلّد ہے اور خوبصورت چھپی ہے۔ آزاد کا کلام محتاجِ تعارف نہیں۔ آزاد نے نہایت کم عمری میں بصیرت کی وہ منزلیں طے کی ہیں جو کہن سالوں کا مقدر ہوا کرتی ہیں۔ یہ مقبول مجموعہ تیسری بار چھپا ہے۔ ملنے کا پتہ دہلی کتاب گھر نیا محلہ پُل بنگش دہلی

آنند کی شاہی سڑک

مصنف بھاگ مل سینی۔ ۴۶ صفحوں کا یہ مختصر رسالہ صرف چھ آنے کے ٹکٹ بھیج کر جیون سدھار پبلیکیشنز بڑھاپورہ ضلع بجنور سے منگوایا جا سکتا ہے۔ امرت سرووَر کی طرح یہ کتاب بھی اخلاقیات و روحانیت کا مرقع ہے۔

نہ بیداغ دل

مکتبۂ شعور کراچی کی پہلی پیش کش۔ ٹائپ کی طباعت کا ایک اعلیٰ نمونہ۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸۔ جلد اور جلد پوش اعلیٰ

عبدالعزیز خالد کی تمثیلی نظموں کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک حسین و جمیل اضافہ ہے، ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے۔ مصنف کی نظموں کے ماخذ مشہور انگریزی نظمیں ہیں۔ آخر میں 'عرضِ تمنا' کے عنوان سے مصنف نے نہایت بلیغ اور شعری نثر میں اپنی تخلیقات کی توضیح و توجیہ پیش کی ہے نئے مصنف کی انانیت کے برعکس خالد میں انکسار کی شان ہے۔

"مصنف اپنے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں خیال آفاقی و اثیری ہے، زبان اسیرِ رسوم و قیود، بیان پابندِ زمان و مکان، فطرت کے کرشمے بوقلموں ہیں جذبات کے جلوے گوناگوں اور قلم و قرطاس معدود و محدود!"

قیمت دس روپے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ شعور ماتڈی والا بین۔ بریڈی سٹریٹ کراچی۔

موصولات

تاریخ بالکنڈہ۔ مؤلف منشی محمد فیض الدین صدیقی۔ ناشر ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد (دکن) قیمت کتاب پر درج نہیں۔

پن چکی ۔ حضرت بابا شاہ محمد سعید پلنگ پوش نقش بندی اور حضرت محمد عاشور بابا شاہ مسافر کے تفصیلی حالات، نہر پن چکی اور پن چکی کی عمارتوں کی تاریخ۔ مرتب سیّد مبارز الدین رفعت ۔ ناشر ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد (دکن) قیمت ایک روپیہ ۔

رسالے

شور ۔ پہلا شمارہ ۔ قیمت ڈھائی روپے ۔ ٹائپ میں چھپا ہے ۔ طباعت کا دیدہ زیب نمونہ ۔ مضامین کے اعتبار سے معیاری ۔ ملنے کا پتہ ۔ مانٹھوی والا لین ۔ پریڈی سٹریٹ صدر ۔ کراچی

سینک سماچار ۔ دی پبلک ڈے نمبر ۱۹۵۷ ۔ ترتیب اور مضامین کے لحاظ سے یہ شمارہ بہت دلچسپ اور معیاری ہے ۔ فوجیوں کے لئے اچھے اچھے مضامین اس میں جمع کئے گئے ہیں ۔ عام دلچسپی کا سامان بھی بہت ہے ۔ ادارہ ایسے معیاری شمارے کی اشاعت کے لئے مبارک باد کا مستحق ہے ۔ نظمیں بھی دلآویز ہیں اور تصویریں بھی فردوسِ نظر ۔ قیمت ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ ۔ نیو سینک سماچار نئی دہلی ۔

بہارستان ۔ محکمۂ تعلیم مدھیہ پردیش کا تعلیمی رسالہ ۔ بالاپور ضلع اکولہ ۔ مدھیہ پردیش ۔ ناظم مدیر محمد حفظ الکبیر قریشی ۔

علی گڑھ میگزین ۔ شمارہ اوّل ۱۹۵۷ء اڈیٹر قمر رئیس ۔ نگران پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔ منیجر سیّد ظہیر الدین علوی ۔ قیمت درج نہیں ۔ ضخامت ۲۷۷ صفحے تقطیع ۱۸×۲۲

صالح ادب کا یہ شائستہ مجموعہ حسین و جمیل سرورق کا حامل ہے ۔ کتابت و طباعت بھی اچھی ہے ۔ علی گڑھ میگزین جو اب تک سال بھر میں ایک بار شائع ہوتا رہا ہے اُمید ہے اب سال میں متعدد بار ضیا باری کرے گا ۔ اس شمارے میں اُردو کے بہت سے نمائندہ اور مشہور شعراء و ادبا جمع ہیں ۔ علی گڑھ نے اُردو ادب و شعر کی پرورش میں بڑا کام کیا ہے ۔ یہاں سے ترقی پسند اور صالح ادب کے معمار بڑی تعداد میں اُٹھے ہیں ۔ یہ شمارہ ان میں سے بہتوں کی تخلیقات کا حامل ہے ۔

نیا راہی کراچی ۔ مدیر مسئول ع ۔ س مسلم ملنے کا پتہ پوسٹ بکس ۹۲۹ کراچی ۔ سالانہ چندہ چھ روپے ۔

دستور ۔ جلد ۶ شمارہ ۱۰ ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبۂ دستور برانڈرتھ روڈ لاہور ۔ قیمت فی پرچہ ۸؍ ۔ مضامین اور نظمیں سب معیاری ہیں ۔

دَورِ جدید ۔ ہفتہ وار دَورِ جدید دہلی کا کشمیر نمبر ۔ مُدیر حافظ علی بہادر خاں اکتوبر ۱۹۵۶ء میں یہ خاص نمبر شائع ہوا ہے ۔ تصاویر سے مزیّن ہے ۔ انگریزی حصّہ بھی ہے ۔ کشمیر سے متعلق معلوماتی مضامین، جشنِ کشمیر کے حالات اور عام دلچسپی کا مواد اس شمارے میں ہے ۔ کشمیری عوام و خواص سب کا ذکر اس شمارے میں ہے ۔ حافظ علی بہادر خاں بہت پُرانے صحافی، ادیب اور شاعر ہیں ۔ اُن کی یہ کوشش مشکور ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے ۔

نیا دَور ۔ شائع کردہ ۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی ۵
ضخامت ۲۵۰ صفحے ۔ قیمت سالانہ پندرہ روپے ۔ فی پرچہ تین روپے ۔

یہ شمارہ تمام اصنافِ ادب پر مشتمل نگارشات کا حامل ہے ۔ لکھنے والے سب معروف ادیب اور شاعر ہیں ۔

مُسلم یونی ورسٹی گزٹ (ذاکر نمبر) مُدیر شریف الحسن بلگرامی ۔ یہ نمبر ٹائپ میں چھپا ہے ۔ طباعت نہایت اعلیٰ ۔ ذاکر صاحب کی ذاتِ گرامی سے متعلق مضامین نظم و نثر اس شمارے کی زینت ہیں ۔ لکھنے والوں میں کرنل بشیر حسن زیدی، رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور اور یونی ورسٹی کے دیگر صاحبِ ذوق افراد شامل ہیں ۔

سائنس جدید ۔ سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کا سہ ماہی رسالہ ۔
مدیر آفتاب حسن ۔ رسالہ ٹائپ میں چھپتا ہے اور موضوع کے اعتبار سے بہت اچھی کوشش ہے ۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دس روپے ۔ فی پرچہ دو روپے ۔ ملنے کا پتہ :۔ سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان شعبۂ حیوانیات، کراچی یونی ورسٹی ۔ کراچی ۔

سال نامہ روزنامہ دَورِ جدید (رنگون) رنگون سے دَورِ جدید کا سال نامہ آب و تاب سے شائع ہوا ہے ۔ بہادر شاہ ظفر سے متعلق مضامین اور تصاویر ہر اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہیں ۔ مدیر مسئول ابراہیم احمد ظاہری نے رنگون ایسی جگہ سے ایسا سال نامہ شائع کر کے بڑی ہمّت کا کام کیا ہے ۔

ریویو کے لئے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

ہندوستان کی سیر کیجئے

سیاحوں اور یاتریوں کے لئے

اسپیشل ٹرین اور گشتی سفر

"ہندوستان
کی
سیر کیجئے"

یہ نعرہ نہ صرف غیر ملکی سیاحوں کے لئے ہے بلکہ ہندوستانیوں کے لئے بھی۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو ابھی اپنے ملک سے واقفیت پیدا کرنا اور اس کے بڑے بڑے پہاڑوں، خوبصورت وادیوں، قدیم عمارتوں تاریخی مندروں اور نئی بستیوں کو دیکھنا ہے۔

مقررہ گشتی سفر

نادرن ریلوے مقررہ کرایہ کے ⅔ کے حساب سے رعائتی ٹکٹ جاری کر رہی ہے۔ بہت سے مقررہ دوروں کے لئے پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کے ٹکٹ جاری ہو رہے ہیں۔ ان دوروں کے لئے بہت سے راستے معین کر دئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیلات نادرن ریلوے کے اسٹیشن ماسٹروں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر عوام کی طرف سے اس ریلوے کے چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ (RATES) کے نام دیگر سفری راستوں کے بارے میں تجاویز بھیجی جائیں تو اُن پر غور کیا جائے گا اور رعایتی کرایے منظور کئے جائیں گے، بشرطیکہ بعض شرائط پوری ہوتی ہوں۔

اسپیشل ٹرین۔ سیاحوں اور یاتریوں کے لئے بڑی لائن پر اسپیشل ٹرین چلانے کی درخواست پر غور کیا جائے گا اور مندرجہ ذیل رعائتیں دی جائیں گی:

۱۔ باورچی خانے کا انتظام۔ ہر ایک ٹرین کے ساتھ ایک ڈبہ لگا دیا جائے گا جس کا کوئی کرایہ نہیں لیا جائے گا

۲۔ ایک کنڈکٹر اور چار باورچی یا نوکر مفت جا سکیں گے۔

۳۔ بعض شرائط کے تحت پندرہ سو (۱۵۰۰) میل سے اوپر کے سفر کے لئے مقررہ کرایہ کے ⅔ کے برابر کرایہ لیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لئے چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ (RATES) نادرن ریلوے کشمیری گیٹ کو لکھیں

پبلک ریلیشنز آفیسر نادرن ریلوے کی طرف سے شائع کیا گیا



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پہلا پنج سالہ پلان (جنتا ایڈیشن)	۲/-/-	-/۸/-
مستقبل کی تعمیر	-/۴/-	/۲/-
آسان پنج سالہ پلان	-/۸/-	-/۲/-
سماجی بہبود	-/۶/-	-/۲/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان	-/۴/-	-/۲/-
آپ کا گاؤں اور پنج سالہ پلان	/۱/-	/۱/-
پنج سالہ پلان - سوالات و جوابات	/۴/-	-/۲/-
دیہاتی صنعتیں	-/۶/-	-/۲/-

دس روپیہ یا اس سے زیادہ کے آرڈر پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔



قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجئے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، اولڈ سکریٹریٹ، دہلی

آجکل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"[illegible] اردو کی لسانی اور علمی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض [illegible] نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں جس طرح کے لکھنے والوں [illegible] سے [illegible] علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آجکل حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں [illegible] ایک [illegible] ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آرا ادبی مباحثے زیرِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملیسانی

"میں آجکل [illegible] رہا [illegible] جتنا کہ [illegible] سالوں میں ہو گیا ہوں [illegible] کی طرح ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ [illegible] کے ساتھ عام اطلاعات کی [illegible] ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت [illegible] اس کام کی [illegible] دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مضامین کا تعلق ہے آجکل کے صفحات پر ملک کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر سرکاری مہینے [illegible] اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا [illegible] کو۔ اور جب آجکل وصول ہوتا ہے [illegible] اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے [illegible] صَرف کرنے میں [illegible] ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ [illegible] خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آجکل کو بڑی پابندی سے [illegible] اور [illegible] دیانتداری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں [illegible] تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے [illegible] اسے [illegible] جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے [illegible] کی بہت افزائی بھی کی ہے۔"

[illegible] فاروقی

"آجکل [illegible] بہت [illegible] اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کمیاب ہے۔ آجکل میں یہ خوبی پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

[illegible]

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer,
United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.
[illegible] No. [illegible]

آجکل



ڈاکٹر ذاکر حسین

بنارسی داس چترویدی

فراق گورکھپوری





اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق :- مدین درشن

جلد ۱۵ - نمبر ۱

مئی ۱۹۵۷ء

ویشاکھ - جیشٹھ - سمت ۱۸۷۹

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرشؔ ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" (اُردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں :- چھ روپے؛ پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :- ہندوستان میں :- ۵۰ء۰ روپیہ یا ۵۰ نئے پیسے؛ پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مُلاحظات

اس وقت دنیا میں تعمیر و تخریب کے بے شمار عناصر کے مابین ایک شدید قوت آزمائی ہو رہی ہے۔ ایک طرف تو حرص و ہوس ہے، رشک و حسد ہے، خوف و خطر ہے، جنگ و ہلاکت ہے، تنگ نظری و عصبیت ہے، آمریت و شہنشاہیت ہے، انسان انسان کا غلام ہے، انسان انسان کا دشمن ہے۔ وہ ایٹم بم اور ہائڈروجن بم تیار کر کے نہ صرف خود اپنے گلے پر چھری پھیرنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ شاید ساری مخلوقاتِ عالم کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ مگر یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے، دوسری طرف دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان مادّی طاقت کی معراج تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے عناصرِ اربعہ کو اپنی مٹھی میں کر لیا ہے۔ وہ ہوا پر سواری کرتا ہے، وہ سمندر پر قدم رکھتا ہے، وہ دریاؤں سے کھیلتا ہے، وہ آگ سے لوہے کو فولاد اور سونے کو کندن بناتا ہے۔ وہ پہاڑوں کو پیس کر سرمہ بنا سکتا ہے، وہ ذرّوں کا سینہ چیر کر ان سے ستاروں اور سیاروں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، وہ انسان کے دل کی دھڑکن رُک کر بھی اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔ آج علم ہمیشہ سے زیادہ عام ہے۔ معیارِ زندگی ہمیشہ سے زیادہ بہتر و برتر ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کچھ بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ملکوں میں جمہوریت کا بول بالا ہے۔ اخلاقی اور انسانی اقدار کے درپے آزار بھی زبانی طور پر انھیں اقدار کا دم بھرتے ہیں۔

آج ہمیشہ سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ صالح و سود مند خیال و عمل کو فروغ دیا جائے۔ ان کی بقا و تعمیر و ترقی کے لئے جان توڑ کوشش کی جائے۔ آج مشین انسان کو روز بروز جسمانی محنت سے بے نیاز بناتی جا رہی ہے۔ اس کی فرصت کے لمحات بڑھتے جاتے ہیں۔ آج انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان لمحات کو محض ذاتی آسائشوں کے حصول و استعمال میں کھپانے کی بجائے قومی اور بین الاقوامی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرے۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لے، وہ یہ دیکھے کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو کیا حاصل ہے اور کیا حاصل کرنا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان آزاد ہے، اس کا ایک آئین ہے، اس کا نظام جمہوری ہے، اس کے شہری آزادیٔ مذہب اور ضمیر، آزادیٔ تحریر و تـ
کے مالک ہیں۔ اس کے عوام میں حقیقی مساوات ہے۔ اس کی حکومت قانـ
کی تابع ہے، اس کی عدالت عوام کے حقوق کی محافظ ہے۔ اس میں مذہبؔ
نسل و رنگ، ذات پات، مفلسی و امارت کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ ا
کی پالیسی ترغیب و تخویف سے مرعوب یا متاثر نہیں۔ وہ جس بات کو حقـ
ہے اس پر علی الاعلان عمل کرتا ہے۔ وہ اپنی منزل تک تنہا پہنچنے کا بھی
اور دم رکھتا ہے۔

حال میں ہندوستان نے ساری دُنیا کے سامنے ایک ایسی مثال پیـ
کی ہے جو صاحبانِ بصیرت کے لئے اکسیرِ چشم ہے۔ پچھلے مہینے ہند میں دُنیا
عظیم ترین جمہوری انتخاب ہُوا۔ جیسی کہ توقع تھی عوام نے ایک بار پھر کانگریس
پر اپنا اعتماد ظاہر کر کے اسے اپنی خواہشوں کے آلہ کار کے طور پر چنا۔ لیکن
انتخاب کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ کسی بھی مخالف پارٹی یا امیدوار نے یہ شکا
نہیں کی کہ رائے دہندوں کو مکمل آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کا موقع نہیں
اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کیرالا میں کمیونسٹ پارٹی کو اکثریت حا
ہو گئی۔ بہر حال اب ہمارے نئے نمائندوں کو بس یہ دیکھنا ہے کہ ملکی آزاد
برقرار رہے، دوسرے پنج سالہ پلان کو کامیابی سے مکمل کیا جائے تاکہ فلا
ریاست اور سوشلسٹ طرز کے سماج کے قیام میں آسانی ہو اور ہندوستان نے
کو امن اور بقائے باہم کا پیغام دے کر جو نیک نامی حاصل کی ہے اس میں
اضافہ ہوتا جائے۔

پچھلے دو شماروں میں "داغ رام پور میں" کے عنوان سے ایک مسلسل مضـ
راز یزدانی صاحب کا شائع ہُوا تھا۔ اس مضمون سے متعلق مخالف و موافق آرا
ملی ہیں۔ لیکن یہ سب کو تسلیم ہے کہ مضمون بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ لہجے
البتہ "رام پوری" انداز ضرور ملتا ہے۔ خود صاحبِ مضمون کو اس کا اعتراف
اس سلسلے میں ڈاکٹر رام بابو صاحب سکسینہ نے خود اُن کے متعلق جو حوالے د
ہیں ان پر اعتراض کیا ہے۔ موصوف سے طالبِ معذرت ہوتے ہوئے ہم
یہی کہیں گے ؎

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے

فراق گورکھپوری

غزل

وہ آنکھ زبان ہو گئی ہے
ہر بزم کی جان ہو گئی ہے

آنکھیں پڑتی ہیں میکدوں کی
وہ آنکھ جوان ہو گئی ہے

آئینہ دکھا دیا یہ کس نے
دنیا حیران ہو گئی ہے

چشمِ خاموش میں تھی جو بات
شاعر کی زبان ہو گئی ہے

اے شوخ تری نگاہِ کافر
ایمان کی جان ہو گئی ہے

توفیقِ نظر سے مشکلِ زیست
کتنی آسان ہو گئی ہے

تصویرِ بشر ہے نقشِ آفاق
فطرت انسان ہو گئی ہے

پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی
اب ایک جہان ہو گئی ہے

سنتے ہیں کہ اب نوائے شاعر
صحرا کی اذان ہو گئی ہے

اے موت بشر کی زندگی آج
تیرا احسان ہو گئی ہے

کچھ اب تو اماں ہو کہ دنیا
کتنی ہلکان ہو گئی ہے

یہ کس کی پڑیں غلط نگاہیں
ہستی بہتان ہو گئی ہے

انساں کو خریدتا ہے انساں
دنیا بھی دکان ہو گئی ہے

کھلتی نہیں بات زندگی کی
عاشق کی زبان ہو گئی ہے

اب رات کی رات ہجر کی رات
میری مہمان ہو گئی ہے

یہ ہجر کی رات دل کی مہمان
اب مان نہ مان ہو گئی ہے

ہر بات کو جان کے بھی اکثر
وہ آنکھ انجان ہو گئی ہے

جو شوخ نظر تھی دشمنِ جاں
وہ جان کی جان ہو گئی ہے

ہر بیت فراق اس غزل کی
ابرو کی کمان ہو گئی ہے

خانۂ فرہنگیٔ ایران

(ایرانی کلچرل ہاؤس)

دلّی میں ۲۱۔ فروری ۱۹۵۷ء کو خانۂ فرہنگیٔ ایران یعنی ایک ایرانی کلچرل مرکز کا افتتاح ہوا۔ ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر علی اصغر حکمت، سفیر کبیر ایران برائے ایران کی درخواست پر دلّی کے چیف کمشنر جناب اے ڈی پنڈت صاحب نے تقریب کی صدارت فرمائی۔ خواجہ غلام السیّدین صاحب سیکرٹری وزارتِ تعلیم ہند نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہندوایران کے تعلقات پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ ہم ذیل میں ناظرینِ آج کل کے لئے مولانا آزاد کے پیغام اور سفیر کبیر ایران اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریروں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

مولانا آزاد کا پیغام

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ حکومتِ ایران دلّی میں ایک ایرانی کلچرل مرکز قایم کر رہی ہے جس کا افتتاح ہز ایکسیلنسی سفیرِ ایران کل ۲۱ فروری کو فرمائیں گے اس مرکز کا مقصد یہ ہے کہ فارسی علم وادب میں دلچسپی رکھنے والے ہندوستانیوں کے لئے نہ صرف ایک اچھا کتب خانہ اور دارالمطالعہ بلکہ ایک ایرانی پروفیسر کی خدمات بھی مہیا کی جائیں۔ فارسی کوئی چھ صدیوں تک حکومتِ ہند کی سرکاری زبان رہی ہے اور آج بھی یہاں کے متعدد اسکولوں اور کالجوں میں فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایرانی کلچرل مرکز کے قیام سے ہمارے طالب علموں اور عالموں کو بہت فائدہ پہنچے گا اور حکومتِ ایران کا یہ اقدام ہمارے عوام میں بہت مقبول ہوگا۔ مجھے امید کلی ہے کہ اس مرکز کو اپنے مقصد یعنی ہند میں ایرانی تہذیب کی مفاہمت کے فروغ میں پوری کامیابی حاصل ہوگی۔

خطبۂ سفیرِ کبیر ایران ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر علی اصغر حکمت

حضرات!

مجھے انتہائی مسرت ہے کہ دلّی میں خانۂ فرہنگیٔ ایران کے افتتاح کی تقریب پر مجھے آپ سے چند الفاظ کہنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

ہمارے دو عظیم ملکوں کے بیش قیمت قومی ورثے کے باب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور اس بارے میں ہم کہاں دونوں ملکوں کی باہمی فیض رساں تاریخ نے عام انسانی تہذیب میں کس قدر بیش بہا اضافے کئے ہیں۔

دراصل ان دونوں ملکوں میں قدیم ترین زمانے سے سماجی اور تہذیبی رابطے قائم ہیں۔ ہندوایران کی گذشتہ تاریخ اور ان ملکوں کے ممتاز مصنفین کی ان مساعی جمیلہ کو کون نظر انداز کر سکتا ہے جن کی بدولت فارسی اور ہندوستانی زبانیں ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئی ہیں اور جن کے باعث مفاہمت باہمی کے جذبے کو تقویت ملی ہے اور تعاون باہمی کی توسیع میں مدد ملی ہے اور اس طرح دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور براہ راست طور پر تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں

خانۂ فرہنگیٔ ایران کے افتتاح کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہندی وایرانی تہذیب کی پائدار و مستحکم زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیا جائے۔

ہندوستانی زبان پر فارسی کے بنیادی اثرات اور فارسی وسنسکرت کے قریبی تعلقات کا ذکر اس مختصر وقت میں ممکن نہیں۔ درحقیقت ہندی یا ہندوستان کی قومی زبان کے مفصل مطالعے کے لئے فارسی وسنسکرت دونوں

کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جدید یورپی زبانیں سیکھنے کے لئے لاطینی و یونانی زبانوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہم ہندوستان کے اربابِ حکومت اور علی الخصوص وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے انتہائی مرہونِ منت ہیں جنھوں نے ہند و ایران کے مابین تہذیبی تعلقات کو مزید ترقی دینے میں ہمیشہ دلچسپی لی ہے اور حالیہ ثقافتی معاہدے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہمارے کام میں سہولت بہم پہنچائی ہے۔

اس خانۂ فرہنگ ایران میں ہندی طلبا کو فارسی ادب، تاریخ و جغرافیہ کے مطالعے کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ فارسی پڑھانے کے کلاس کھول دئے گئے ہیں۔ اور طالب علموں کے لئے جدید ترین ضروری سامانِ مطالعہ کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

دونوں ملکوں میں تہذیبی و ذہنی تبادلے کو فروغ دینے کے لئے ہند آریائی تہذیب پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تقریریں کرانے اور فلم دکھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور ہر اس شخص کے لئے جسے مطالعہ سے دلچسپی ہے کتابیں، رسالے، اخبارات وغیرہ مہیا کر دئے گئے ہیں۔

اب میں اپنے معزز دوست مسٹر پنڈت سے درخواست کروں گا کہ وہ اس تقریب کی صدارت فرمائیں۔

تقریر ڈاکٹر ذاکر حسین

یور ایکسیلینسی۔

میں اس اہم موقع پر اپنی موجودگی کو اپنی خوش بختی تصور کرتا ہوں اور اس کی کئی وجہیں ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ مجھے ایرانی علم و ادب یا زندگی میں کوئی استعداد حاصل ہے تاہم مجھ پر ان شعرائے ایران نے ایک عظیم احسان کیا ہے جنھوں نے اپنی بے پایاں فیاضی سے مجھ جیسے محض بہ تقاضائے شوق پڑھنے والے شخص تک کی ذہنی ساخت میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ اور یہ انھوں نے اپنی گوناگوں اعلیٰ و الہامی ترادشِ خیال کے سحر و اعجاز سے کیا ہے جو ان کے حسین و نفیس الفاظ و ترکیبات میں پایا جاتا ہے۔ واقعی ایران کی ان عظیم ہستیوں کا مجھ پر اتنا زبردست احسان ہے جسے میں کبھی اُتار نہیں سکتا۔

اس احسان میں اُن اثرات سے اور بھی بے پایاں اضافہ ہو جاتا ہے جو شعرائے ایران نے بالخصوص اور ایرانی ادب نے بالعموم صدیوں تک اس زبان پر ڈالے ہیں جو میں نے اپنی ماں سے سیکھی، جسے میں بولتا ہوں اور جس کی میں تھوڑی بہت خدمت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری مراد اردو سے ہے۔ زبان خیالات کا پاکیزہ مسکن ہوتی ہے بلکہ خیالات کو ممکن بناتی ہے اور اُن کی راہیں متعین کرتی ہے۔ چونکہ میرا آلۂ فکر اردو ہے اس لئے ایران اور ایرانی فکر و خیال کے اثرات، میرے فکر و خیال کے محرکات، ان کے رجحانات اور اُن کی ہیئت میں شامل و شریک ہیں، یا یوں کہئے کہ میری ذہنی و روحانی ہستی کے ریشے ریشے میں سمائے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ و ملکہ ایران نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اس کے کاموں میں جس خسروانہ شفقت کا اظہار کیا اور اس کی جو قدردانی فرمائی وہ بھی مجھے ہمیشہ تشکّر و امتنان کے ساتھ یاد رہے گی۔ میں اس شاہی دورے کے موقع پر یونیورسٹی سے سرکاری طور پر وابستہ تھا اور مجھے بخوبی علم ہے کہ اس عنایت نے یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے ہر فرد و بشر کی کتنی ہمّت اور حوصلہ بڑھایا۔

پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا کہ میں اُن عنایات کو ہمیشہ شکرگذاری کے ساتھ یاد نہ رکھوں جو اب سے کوئی دو برس پہلے جبکہ مجھے ایران کی حسین و جمیل اور میرے لئے جذبات سے معمور سرزمین پر جانے کا شرف حاصل ہوا، وہاں کے سیاست دانوں اور عالموں نے تہران یونیورسٹی نے اور ایرانی علم و ثقافت کے متعدد مراکز نے مجھ پر کیں اور میں اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہاں سے الفاظ لاؤں کہ اہلِ ایران نے مجھ جیسے چند روزہ مسافر کو اپنی عنایت و فیاضی سے یہ محسوس کرایا کہ گویا میں بالکل اپنے گھر میں ہوں

علاوہ ازیں میں آج یہاں اپنی موجودگی اور اس مرکز کے افتتاح کی تقریب میں شریک ہونے کو اس لئے بھی اپنی خوش بختی تصوّر کرتا ہوں کیونکہ اس مرکز کا قیام میرے عالی قدر اور عالم دوست ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر علی اصغر حکمت کی دانش و بصیرت کا مرہون ہے۔ میں اس بات کی ہمیشہ قدر کروں گا کہ موصوف مجھ پر ذاتی طور سے ہمیشہ مہربان رہے ہیں اور اس کا ثبوت نہ صرف ہند میں بلکہ ایران میں بھی ملتا رہا جبکہ میں وہاں دورے پر گیا تھا اور وہ یہیں تھے۔ یہ نہایت موزوں و مناسب ہے کہ اس مرکز کا قیام ہز ایکسیلینسی کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے تحت ہو رہا ہے کیونکہ ان کی ذاتِ والاصفات ایران میں قدیم و جدید کی بہترین خصوصیات کا مجموعہ ہے۔

ہز ایکسیلینسی نے موجودہ ایران میں علم و ادب کے احیاء میں زبردست حصہ لیا ہے۔ میں نے تہران میں علمی و ذہنی سرگرمیوں کے جو بھی جدید مراکز دیکھے اُن میں سے مشکل کوئی ایسا ہوگا جس پر ہز ایکسیلینسی کی فکر و نظر یا سعی و عمل کی مہر نہ ثبت ہو۔ وہ ایک مشہور و ممتاز عالم ہیں اور بطور سابق وزیر تعلیم انھوں نے متعدد چیزوں پر، چاہے وہ ترقی پذیر تہران یونیورسٹی ہو یا شاندار انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس یا علمی و ادبی اشاعتوں کا سیلِ فراواں، اپنی علمیت، شخصیت اور کام کرنے میں اولیت کا سکہ جما دیا ہے۔ یہ درحقیقت بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہ مرکز ایسے وقت میں قائم کیا جا رہا ہے جب کہ ہز ایکسیلینسی ہند میں اپنے عظیم ملک کے نمایندہ ہیں۔ کیونکہ بہت کم لوگ ان کے اتنا یقین و اثق رکھتے ہوں گے کہ ہند و ایران کے درمیان باہمی مفاہمت و قدردانی کو فروغ دینے والے کسی مرکز کو کوئی ایسی چیز نہیں پیدا کرنی ہے جو موجود نہیں بلکہ بیشتر انھیں عناصر کو برقرار رکھنا، فروغ دینا اور تقویت پہنچانا ہے جو ہماری تاریخ کے ہر دور میں کبھی کم کبھی زیادہ سرگرم رہے ہیں۔

دوستو!

ہند و ایرانی ثقافت کا دائرہ ہند و ایران کے سیاسی افق سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اگر ہم ہند و ایران کے باہمی روابط و تعلقات کی شروعات کا پتہ لگانا چاہیں تو ہمیں اُس دور کا جائزہ لینا پڑے گا جہاں سے تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تعلقات ہند آریائی تہذیب سے بھی قدیم تر ہیں اور بلاشبہ تاریخ کے بہت قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ آریہ اور ایرانی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں ایک ہی جگہ آباد تھے جہاں سے کوچ کرکے وہ آریانہ اور آریہ ورت پہنچے اس لئے اُن کا لسانی و مذہبی ماضی ایک ہے۔ یہ مشترک ماضی ویدوں اور اوستا سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہند و ایران کے بحری ساحل ایک ہی سمندر کے کنارے واقع ہیں لہٰذا خلیج فارس اور ہند کے مغربی ساحل کے درمیان اُس وقت سے تجارتی تعلقات قائم ہیں جبکہ سیاسی تعلقات کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تجارت اور ثقافت ایک دوسرے کی ممد و معاون ہوتی ہیں اس لئے ان تجارتی تعلقات سے ایک دوسرے کی ثقافت کو سمجھنے اور پرکھنے اور ان کے اثرات قبول کرنے کا موقع ملا۔ اس پُرامن مفاہمتِ باہمی کے فیض رساں عمل میں جنوبی ہند اور شمالی ہند دونوں ہی نے حصہ لیا۔

اس کے بعد ایران پر منگول حملہ آوروں کی تاخت سے ایران سے ہند آنے والے پناہ گزینوں کا ایک تانتا بندھ گیا جو ہند و ایران کے اسی قدیم اور معروف بحری راستے سے آئے جس سے تجارت ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سے ہماری آبادی میں ایک نہایت جاندار عنصر کا اضافہ ہوا۔ میری مراد پارسیوں سے ہے، جنھوں نے ایک آزاد اور خوش حال ہندوستان کی تعمیر کے لئے ملک میں اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور اہم حصہ لیا ہے۔

اسلام پہلے ایران پہنچا اور بعد میں جب یہ مذہب ہند میں آیا تو بہت سے ایرانی اثرات قبول کر چکا تھا۔ اگرچہ مغل نسلاً ترک تھے لیکن جب وہ ہند میں آئے تو اپنے ہمراہ ایرانی تہذیب، ثقافت اور شائستگی لائے۔ بابر فارسی میں شعر کہہ سکتا تھا اور اس نے ازبکوں کے خلاف شاہ اسمعیل سے مدد مانگی تھی۔ ہمایوں نے شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لی تھی اور ہند کے تخت پر دوبارہ قبضہ پانے کے بعد بھی دربارِ صفوی سے سفارتی تعلقات قائم رکھے تھے۔ ہند و ایران کے باہمی سفارتی تعلقات کو اکبرِ اعظم کے عہد میں سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اکبر کو روحانیات سے جو سچا شغف تھا اور وہ اہلِ روحانی کی جس فیاضی سے سرپرستی کرتا تھا اس کی وجہ سے ایران اور وسطی ایشیا کے مایۂ ناز اہلِ کمال اس کے دربار میں کھنچ آئے تھے۔ اس عہد میں ان ممالک سے باقاعدہ سفارتی تعلقات قائم ہو گئے اور سفیروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ پھر یہ بات شمالی ہند کے مغل دربار ہی تک محدود نہ تھی۔ شاہانِ گولکنڈہ اور احمد نگر نے بھی شاہ طہماسپ کے دربار میں اپنے سفراء بھیجے سلطنت بیجاپور کا ایک سفیر دربارِ صفوی میں گیا۔ یہ محض سفارتی تعلقات نہ تھے۔ ان کی وجہ سے ملک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً انتظامِ سلطنت، تجارت اور فنونِ لطیفہ پر زبردست اثرات پڑے۔ اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ اکبرِ اعظم اور عباسی سلاطین کے انتظامِ سلطنت میں ایک قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ ہند میں دفتری حکومت کا رواج اور منصب داری کا نظام غالباً ایران سے درآمد کیا گیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان مادی اجناس کا مبادلہ سرگرمی سے جاری تھا۔ خلیج فارس کی بندرگاہ ہرمز اور مغربی ہند کی بندرگاہ بھڑوچ، گوا، کوچین اور کالی کٹ میں ہند ایرانی تجارت کا بازار گرم تھا اور ایران کے ریشمی کپڑے، موتی اور غالیچے اور ہند کے سوتی کپڑے، نیل اور مصالحے کی لین دین ہوتی تھی۔ یہ تجارت اور آمد و رفت اتنی باقاعدہ تھی کہ آگرہ کی ہنڈی اصفہان میں اور اصفہان کی ہنڈی آگرہ میں بھنائی جاتی تھی۔

جہاں تک فن و ادب کا تعلق ہے سارے مغل دور میں دونوں ملکوں کے

درمیان شاعروں، عالموں اور فن کاروں کا مسلسل مبادلہ ہوتا رہا اور ایک مدّت کے سودمند میل جول سے ادب، مصوّری اور تعمیرات میں ہند آریائی طرزوں نے جنم پایا۔ ایرانی و ہندی نژاد شعراء کے ایک ممتاز گروہ نے ایک مدّت میں شاعری کو وہ نفیس سرمایہ عطا کیا ہے جو آج 'سبک ہندی' کہلاتا ہے۔ اس زمرے میں ایسے نامور اور اعلیٰ مرتبہ شعراء شامل ہیں جو کسی بھی زبان کے لئے باعثِ افتخار ہو سکتے تھے، مثلاً خسرو، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی، کلیم، غنی کاشمیری، علی حزیں، مرزا بیدل، مرزا غالب اور صائب تبریزی۔

مصوّری میں عظیم الشان مغل اسکول نے ایرانی مصوّری سے الہام کی حد تک اثر قبول کیا ہے اور اس کی تکنیک کی خوشہ چینی کی ہے۔ یہ طرز و تکنیک ہند میں ہمایوں نے تقریباً براہِ راست روشناس کرائی یعنی اس نے اُستاد بہزاد کے ایک شاگرد میر سیّد علی اور عبدالصمد شیرازی کو ملازم رکھا جو جہانگیری میں فتح پور سیکری میں شاہی مصوّروں کا سرغنہ تھا۔ جہاں اس نے اور اس کے دوسرے ایرانی ساتھیوں نے ہندی مصوّری کو ایرانی مصوّری کے تصوّرات اور تکنیک سے روشناس کرایا۔ ہندی مصوّروں نے جلد ہی ایرانی مصوّری کی رنگارنگی، رنگوں کی شوخی اور حسنِ آرائش ترکیب کو اپنا کر انھیں اجنتا کی حقیقت نگاری اور راجپوت لوک کلا کے پس منظر کی روایات میں ضم کر دیا۔ جو اگرچہ استدادِ زمانہ سے مدھم پڑتی جا رہی تھیں لیکن پھر بھی بالکل مٹی نہیں تھیں۔

ہندوستان کی یادگار تعمیرات میں بھی ایرانی اثرات نمایاں ہیں۔ ایسی تعمیرات ہمیشہ عوام کے ذوق کی تربیت کا زبردست آلہ ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے دور میں جبکہ تربیتِ ذوق کے لئے کتابی علم مہیّا نہیں تھا ان کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔

ہند کی بے شمار حسین و جمیل یادگار تعمیرات جن میں دلّی کی جامع مسجد اور ہمایوں کے مقبرے اور آگرے کے تاج محل پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے، زبانِ حال سے اس کا زبردست ثبوت دیتی ہیں کہ ہند و ایران کی مشترکہ فنی مساعی کس قدر ثمرور ثابت ہوئیں۔

چاہے قالین سازی ہو کہ شیشہ گری، دھات کی چیزیں بنانے کی صنعت ہو کہ اسلحہ سازی، خوش خطی ہو کہ جلد سازی یا آرائشی گل کاری، ان سبھی پر ایرانی فنکاروں کی بے خطا چابک دستی و صناعی اور اُن کے رنگوں کی ہم آہنگی کا واضح نقش موجود ہے۔

ہماری زبانوں پر ایرانی اثرات نے ہند کو ایک نئی زبان اُردو بخشی جو اپنی

شائستگی اور نفاست، قوّتِ بیان و انجذاب اور ترقی کرنے کی صلاحیت کی بنا پر اس برِصغیر کی زبانوں کی برادری میں ایک بلند مقام و مرتبہ رکھتی ہے۔

یور ایکسیلنسی —!

ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری تعمیرات، ہماری سائنس، ہماری تاریخ، ہماری مصوّری اور ہماری دستکاری آپ کے عظیم ملک کے شہ پاروں سے ایسے رشتوں سے وابستہ ہے جو کبھی منقطع نہیں ہو سکتے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ فردوسی کا شاہنامہ، عمر خیام کی رباعیات، رومی کی مثنوی، سعدی کی گلستاں، حافظ کا دیوان، جامی کا کلام، البیرونی اور بو علی سینا کا خارجی اور سائنسی اندازِ فکر، بہزاد کا قلم، آپ کے خطِ نستعلیق کے دیدہ زیب خطوط و دوائر، آپ کے غالیچوں کی مسحور کن ڈزائنیں اور وہ حسن و دل فریبی جو آپ کے چابک دست کاریگر روزمرہ کے استعمال کی سیکڑوں چیزوں کو بخش دیتے ہیں، یہ سب نہ صرف آپ کی بلکہ ہماری بھی میراث ہے یہ گویا ہزاروں ریشمی بندھن یا سیمیں کڑیاں ہیں جو ہند و ایران کے عوام کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتی ہیں اور جن کے فیض سے وہ اپنے مشترکہ مقاصد یعنی انسانی تہذیب کی ترقی، بہتر اور اعلیٰ تر زندگی کی تعمیر اور قومی اور بین اقوامی سطح پر مل جل کر زندگی بسر کرنے کے ایسے حسین و پُرامن طریقے ایجاد کرنے کے لئے کوشاں ہیں جن میں استحصال کا نام و نشان نہ ہوگا۔ ہم آج اس وقت جس مرکز کے افتتاح میں شریک ہیں اس کے جیسے مراکز ان مقاصد کے حصول کا زبردست آلہ ہو سکتے ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ یہ مرکز انھیں مقاصد کے لئے کوشاں رہے گا۔

(ترجمہ از انگریزی)

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

غزل	سکندر علی وجد
کرن (فیچر)	ہادی القادری
اردو ادب میں ایسے	ظہیرالدین مدنی
مل جا کے کیا دیکھا	غلام احمد فرقت
ادب اور زندگی	ستیہ پرکاش سنگر
اصغر کا مطالعہ	عابد رضا بیدار

بنارسی داس چترویدی

پریم چند کے خطوط

پریم چند جی بڑے پُرخلوص آدمی تھے۔ مغرور ان کو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ انھیں اس بات کا خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہوگا کہ ان کے خطوط کبھی مضمون یا مقالے کا موضوع بن سکتے ہیں۔ دکھاوٹ کا ان میں نام و نشان نہیں تھا۔ اس لئے انھوں نے جو خط لکھے وہ بالکل فطری ہیں۔

خطوط کی خوبی بھی اسی بات میں ہے کہ ان میں کسی قسم کی بناوٹ نہ ہو۔ ایک انگریز ادیب نے لکھا تھا ـــــ بلند پایہ کے خطوط وہی کہے جا سکتے ہیں جو کبھی لکھے نہیں جانے چاہئیں تھے اور اگر لکھے بھی جاتے تو فوراً ضائع کر دئے جاتے۔

پریم چند جی کے کئی خط اس زمرے میں آ جاتے ہیں۔ ان کا ایک خط پڑھ لیجئے جو انھوں نے منشی دیانارائن جی نگم کے نام شاید ۱۹۰۵ء میں لکھا تھا۔

"بھادرم! اپنی بیتی کس سے کہوں۔ ضبط کئے کوفت ہو رہی ہے۔ جیوں جیوں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تردّدات کا تانتا بندھا۔ بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی۔ میکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ لاچار کھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی۔ وہ رو دھو کر چلی گئیں۔ میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔ آج ان کو گئے آٹھ روز ہو گئے۔ خط نہ پتر۔ میں ان سے پہلے ہی ناخوش تھا۔ اب تو صورت سے بیزار ہوں۔ غالباً اُن کی ودائی دائمی ثابت ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں بد بیوی کے رہوں گا۔ ادھر ننہال کی طرف سے اور والدہ کی طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے۔ جب کہتا ہوں مفلس ہوں تو والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضامندی دے دو۔ تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی۔ بہرحال اب کے تو لگا چھڑا ہی لوں گا آئندہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔ جیسی آپ کی صلاح ہوگی ویسا کروں گا۔ اس بارے میں ابھی پھر مشورہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔"

اس خط کی خصوصیت اس بات میں ہے کہ یہ بالکل ذاتی تھا اور اس کے شائع ہونے کا تصور بھی انھوں نے کبھی نہ کیا ہوگا۔

بڑا آدمی ہونے کی یہ سزا ہے کہ اس کی ذاتی باتوں کی جانچ پڑتال کرنے کا حق گویا سبھی کو حاصل ہو جاتا ہے اور بڑے آدمی کی بیوی ہونا تو اپنے اوپر اور بھی مصیبت لانا ہے۔ یہ سزا پورے طور پر پریم چند جی کی پہلی بیوی کو بھگتنا پڑی۔ ویسے پریم چند جی کے خط معمولی بول چال کی زبان میں لکھے گئے ہیں لیکن کبھی کبھی ان پر ادبیت کی جھلک آ جاتی ہے۔ اور خطوط نویسی میں ان کو بہت ہی بلند مقام ملے گا۔ مثال کے طور پر ان کے اس خط کو بھی پڑھ لیجئے جو انھوں نے نگم صاحب کو ہی ان کے چھوٹے بچے کی وفات پر لکھا تھا۔

"کھیل میں شریک ہو کر ہم خود ہار اور جیت کو بلاتے ہیں۔ قزاق (قضا؟) کے ہاتھوں لٹ جانا زندگی کا معمولی حادثہ نہیں ہے لیکن کھیل میں ہارنا اور جیتنا معمولی بات ہے۔ جو کھیل میں شریک ہوگا وہ بخوبی جانتا ہے کہ ہار اور جیت دونوں ہی سامنے آئیں گے اس لئے اسے ہار سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جیت میں پھولا نہیں سماتا۔ ہمارا کام تو صرف کھیلنا ہے۔ خوب دل لگا کر کھیلنا، خوب جی توڑ کر کھیلنا۔ اپنے کو ہار سے اس طرح بچانا گویا ہم کونین کی دولت کھو بیٹھیں گے لیکن ہارنے کے بعد، پٹخنی کھانے کے بعد، گرد جھاڑ کر کھڑے ہو جانا چاہئے اور پھر خم ٹھونک کر حریف سے کہنا چاہئے کہ ایک بار اور۔

کھلاڑی بن کر آپ کو واقعی اطمینان ہوگا۔ میں خود اس

میار پر پورا اُترنا ہو گیا نہیں مگر کم سے کم اب کے پیچھے کسی نقصان بیماتنا سچ نہ ہوگا جتنا آج سے چند سال قبل ہو سکتا تھا۔ میں شاید اب نہ کہوں گا کہ ہائے زندگی اکارت گئی۔ کچھ نہ کیا۔ زندگی کھیلنے کے لئے ملی تھی کھیلنے میں کوتاہی نہیں کی۔ آپ مجھ سے زیادہ کھیلے ہیں۔ ہار اور جیت دونوں دیکھی ہیں۔ آپ جیسے کھلاڑی کے لئے شکوۂ تقدیر کی ضرورت نہیں۔ کوئی گولف اور پولو کھیلتا ہے کوئی کبڈی کھیلتا ہے بات ایک ہے۔ ہار اور جیت دونوں ہی میدانوں میں ہے۔ کبڈی کھیلنے والے کو جیت کی خوشی کچھ کم نہیں ہوتی۔ اس ہار کا غم نہ کیجئے۔ آپ نے خود ہی نہ کیا ہوگا۔ آپ مجھ سے مشتاق ہیں۔ میں ۵ یا ۶ مئی تک کانپور آنے والا ہوں۔ یہاں کی کوئی چیز درکار ہو تو بے تکلف لکھئے گا۔ دیگر حالات میرے پہلے خط سے معلوم ہوئے ہوں گے۔"

پریم چند جی نے شریمتی شورانی دیوی کے نام جو خط لکھے تھے وہ پاکیزہ ازدواجی محبت کی مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ بھی کبھی چھپنے کے لئے نہ لکھے گئے تھے۔ لیکن ہم سب کو شریمتی شورانی دیوی جی کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے پریم چند جی کی زندگی کا وہ نایاب رُخ ہمیں بھی دکھا دیا۔

۴۔ جون ۱۹۳۴ء کے خط میں انھوں نے لکھا تھا :۔

" اب تمہارے پاس بیٹی اور گیان بھی پہنچ جائے گا۔ تمہارے پاس تو سبھی ہوں گے بھائی بند لڑکے، لڑکی سبھی ہیں اور مجھے تو تم لوگوں کے بنا اتنی بڑی بمبئی ہوتے ہوئے بھی سونی ہی معلوم ہوتی ہے۔ یہی بار بار اچھا (خواہش) ہوتی ہے کہ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوں۔ بار بار یہ جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہاں سے یہ بلا بھی لے لی۔ میں نے ابھی مکان نہیں لیا ہے ابھی مکان لے لوں گا تو وہ سونا گھر مجھے اور کھانے دوڑے گا۔ مکان تو اس وقت (دن) لوں گا جب تمہارا پتر آنے کے لئے آجائے گا۔ "

اس کے گیارہ دن بعد ۱۵۔ جون کو پریم چند جی نے پھر لکھا تھا :۔

" تم تو ان سبھوں کے ساتھ خوش ہو۔ ادھر میں سوچتا ہوں کہ ایک ڈیڑھ مہینہ کیسے بیتے گا اسے سمجھ ہی نہیں پاتا ہوں۔ آخر کام ہی کروں تو کتنا کروں۔ آخر بیل تو نہیں ہوں پھر آدمی کے لئے منورنجن (تفریح) بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میرا منورنجن تو سب سے ادھک (زیادہ) گھر پر بال بچوں سے ہی ہو سکتا ہے۔ میرے لئے دوسرا کوئی منورنجن ہی نہیں ہے۔ کھانا بھی کھانے بیٹھتا ہوں تب بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہاں صاحبی ٹھاٹھ باٹ ہیں اور صاحب بننے سے میری طبیعت گھبراتی ہے ...... میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ گھر بار سے الگ رہتے ہیں وہ کیسے رہتے ہیں۔ میری تو یہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ یاد کر کے نانی مرتی ہے کہ کس طرح یہ دن کٹیں گے۔ کیا کروں۔ کسی طرح سے کاٹنا ہوگا۔"

اور اس کے بعد پہلی جولائی کو پریم چند جی نے لکھا تھا :

"...... بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تمہارا اُپاسک (پرستار) ہوں تمہارے بنا مجھے اکیلے رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔"

اپنے یکم دسمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں انھوں نے مجھے لکھا تھا :

" میں اب اس بات کو سمجھنے لگا ہوں کہ شانتی گرہستی (پُر سکون خانگی زندگی) ایک بڑی بھاری نعمت ہے۔"

ان خطوط کو پڑھ لینے سے پریم چند جی کی زندگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے جب میرے بار بار بلانے پر بھی پریم چند جی کلکتہ اور شانتی نکیتن نہیں آئے تو خود مجھے یہ شک ہو گیا تھا کہ یا تو وہ کچھ پس و پیش کر رہے ہیں یا پھر بہانہ بنا رہے ہیں۔ لیکن پریم چند جی سے گھر پر ملنے کے بعد وہ شک ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا۔ دراصل وہ ایک گھریلو جیو (ہستی) تھے۔ اپنی چھوٹی گھر گرہستی میں خوش رہنے والے، تصنع اور دنیاوی شان و شوکت سے کوسوں دور رہنے والے۔

شری جینیندر کمار جی کے نام جو خطوط پریم چند جی نے لکھے تھے وہ بھی کافی اہم تھے۔ ان سے پریم چند جی کی فطرت اور خیالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جینیندر جی کی والدہ کی وفات پر لکھا گیا ان کا خط کتنا ہمدردانہ ہے،

" کل تمہارا پتر ملا۔ مجھے یہ شنکا (اندیشہ) پہلے ہی تھی۔ اس مرض میں شاید ہی کوئی بچا ہے ...... جب یہ سوچتا ہوں کہ تمہاری ماتا جی تمہارے لئے کیا تھیں اور تم ان کے کال (زمانے) میں آج بھی لڑکے سے بنے پھرتے تھے۔ تب جی چاہتا ہے کہ

تمھارے گلے مل کر رو دوں ۔ ان کا وہ سنیہہ (محبت) ۔ وہ تمھاری
جو کچھ تھیں وہ تو تھیں ہی مگر اُن کے لئے تو تم پران (جان) تھے۔
آنکھیں تھے، سب کچھ تھے ۔ بہت کم خوش نصیبوں کو ایسی
ماتائیں ملتی ہیں ۔ "

اسی خط میں آگے چل کر انھوں نے لکھا تھا :۔

" اور تو سب ٹھیک ہے ۔ چترویدی جی نے کلکتے بلایا تھا کہ ٹوگچی جاپانی کوی (شاعر) کا بھاشن سن جاؤ ۔ یہاں ٹوگچی ہندو یونیورسٹی آئے ۔ ان کا ویاکھیان (تقریر) بھی ہو گیا مگر میں نہ جا سکا ۔ عقل کی باتیں سنتے اور پڑھتے عمر بیت گئی ۔ ایشور پر وشواس (یقین) نہیں آتا ۔ کیسے شردھا ہوتی ہے ۔ تم آستکتا (خدا پرستی) کی اور جا رہے ہو ۔ جا نہیں رہے پکّے بھگت بن رہے ہو ۔ میں سندیہہ (شک) سے پکّا ناستک (دہریہ) ہوتا جا رہا ہوں ۔ "

اختر حسین رائے پوری کو ایک خط میں پریم چند جی نے لکھا تھا :۔

" اب میرا قصہ سنو ۔ میں قریب ایک ماہ سے بیمار ہوں ۔ میرے آمانشے (پیٹ) میں گیسٹرک السر کی شکایت ہے ۔ منہ سے خون جاتا ہے اس لئے کوئی کام نہیں کرتا ۔ دوا کر رہا ہوں مگر ابھی تک کوئی افاقہ نہیں ۔ اگر بچ گیا تو " بیسویں صدی " رسالہ آپ لوگوں کے خیالات کی اشاعت کے لئے ضرور نکالوں گا ۔ " ہنس " سے تو میرا تعلق ٹوٹ گیا ہے ۔ محنت کی سرمغزی کا یہ صلہ ملا کہ تم نے " ہنس " میں زیادہ روپیہ خرچ کر دیا ۔ اس کے لئے میں نے دل و جان سے کام کیا ۔ بالکل اکیلا ۔ اپنے وقت اور صحت کا کتنا خون کیا اس کا کسی نے لحاظ نہ کیا ۔ جس لٹریچر کی " ہنس " اشاعت کر رہا تھا وہ ہمارا لٹریچر نہیں ہے وہ تو وہی بھگتی والا مہاجنی لٹریچر ہے جو ہندی زبان میں کافی ہے ۔ "

یہ خط شاید ۱۹۳۶ء کا ہے ۔

پریم چند جی نے جو خط مجھے لکھے تھے آخر میں ان کا بھی کچھ ذکر کر دوں ۔ بدقسمتی سے میں انھیں اکثر انگریزی میں ہی خط بھیجتا تھا ۔ جس کی وجہ سے وہ بھی انگریزی میں ہی جواب دیتے تھے ۔ مگر ایک ہندی خط بھی ہے جو بہت اہم ہے اپنے ۴ ۔ جون ۱۹۳۰ء کے خط میں انھوں نے لکھا تھا :۔

" میری آکانکشائیں (تمنائیں) کچھ نہیں ہیں ۔ اس سمے (وقت) تو سب سے بڑی آکانکشا (تمنا) یہ ہے کہ ہم سوراجیہ سنگرام (جنگ آزادی) میں وجئی (فتحیاب) ہوں ۔ دھن یا یش (شہرت) کی لالسا (خواہش) مجھے نہیں رہی ۔ کھانے بھر کو مل ہی جاتا ہے ۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار اونچی کوٹی (بلند پایہ) کی پستکیں (کتب) لکھوں ۔ پر اُن کا اُدیشیہ (مقصد) بھی سوراجیہ وجے (آزادی حاصل کرنا) ہی ہے ۔ مجھے اپنے دونوں لڑکوں کے وشے (بارے) میں کوئی بڑی لالسا (تمنا) نہیں ہے ۔ یہی چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار سچے اور پکے ارادے کے ہوں ۔ ولاسی (عیاش) دھنی (دولت مند) خوشامدی سنتان (اولاد) سے مجھے گھرنا (نفرت) ہے ۔ میں شانتی سے بیٹھنا بھی نہیں چاہتا ۔ ساہتیہ اور سودیش کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں ۔ ہاں روٹی دال اور تولہ بھر گھی اور معمولی کپڑے میسر ہوتے رہیں ۔

جو ویکتی (آدمی) دھن سمپدا (عیش و عشرت) میں وبھور (گم) اور مگن ہو اس کے مہان پرش (عظیم انسان) ہونے کی کلپنا (تصور) بھی میں نہیں کر سکتا ۔ جیسے ہی میں کسی آدمی کو دھنی پاتا ہوں ویسے ہی مجھ پر اس کی کلا اور بدھی متا (دانائی) کی باتوں کا پربھاو (اثر) کافور ہو جاتا ہے ۔ مجھے جان پڑتا ہے کہ اس شخص نے موجودہ ساماجک ویوستھا (سماجی نظام) کو اس ساماجک ویوستھا کو جو امیروں دوارا (ذریعے) غریبوں کے دوہن (استحصال) پر اولمبت (منحصر) ہے سویکار (منظور) کر لیا ہے ۔ اس پرکار (طرح) کسی بھی بڑے آدمی کا نام جو لکشمی کا کرپا پاتر (نظرکردہ) بھی ہو مجھے آکرشت نہیں کرتا (اپنی طرف نہیں کھینچتا) بہت ممکن ہے کہ میرے من (دل) کے ان بھاووں (جذبات) کا کارن (وجہ) جیون (زندگی) میں میری نجی اسپھلتا (ذاتی ناکامیابی) ہی ہو ۔ بینک میں اپنے نام میں موٹی رقم جمع دیکھ کر شاید میں بھی ویسا ہی ہوتا جیسے دوسرے ہیں ۔ میں بھی پرلوبھن (طمع) کا سامنا نہ کر سکتا ۔ لیکن مجھے پرسنتا (خوشی) ہے کہ سوبھاو (فطرت) اور قسمت نے میری مدد کی ہے اور میرا بھاگیہ (قسمت) غریبوں کے ساتھ سمبندھ (وابستہ) ہے ۔ اس سے مجھے ادھیاتمک سانتونا (روحانی تسکین) ملتی ہے ۔ میرا بھاگیہ غریبوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے ۔ "

اس فقرے میں پریم چند کی زندگی کا نچوڑ آ جاتا ہے ۔ اپنی زندگی کی ساری فلاسفی، زندگی کا تمام نقطۂ نظر انھوں نے اپنے اس خط میں دے دیا تھا ۔

پریم چند جی کے جتنے بھی خط میرے دیکھنے میں آئے ہیں سبھی سیدھی سادی زبان میں ہیں ۔ ان میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے ۔ ان میں الفاظ کی بھرمار نہیں تکلّفی نہیں ایک قسم کا بھولا پن ہے، ایک طرح کی سادگی ہے کیونکہ اپنے خطوط میں پریم چند اپنے پورے روپ میں موجود ہیں ۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ناظر حسن

الیگزنڈر ہیڈرلی آزاد

ہندوستان میں اہلِ یورپ کی آمدورفت کا سلسلہ، جس کی تفصیلی یادداشت آج موجود ہے، سر طامس رو سے شروع ہوتا ہے جو جہانگیر کے عہد میں بحیثیت سفیر آیا اور کافی عرصہ یہاں مقیم رہا۔ اس سے پہلے بعض پرتگیز اور ولندیزی تاجر یا واعظ اس ملک کے ساحل پر قدم رکھ چکے تھے لیکن اُن کے متعلق تھوڑی سی تفصیلات کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ یہ سلسلہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ اہلِ یورپ کی آمدورفت، تجارت اور سیاسی اقتدار میں اضافہ ہوتا رہا۔ جنگِ بکسر کے بعد اُن کے قدم اچھی طرح جم گئے اور شاہ عالم ثانی نے کلائو کو بہار و بنگال کی دیوانی عطا کر کے انگریزوں کو حکومت کی باضابطہ سند دے دی۔

اہلِ یورپ ہند میں تجارتی اغراض سے آئے تھے جس میں کامیابی کیلئے پہلی شرط یہ تھی کہ یہاں کی زبان اور طور طریقے سے واقفیت پیدا کی جائے۔ انیسویں صدی میں جب انگریزوں کو عملی طور پر شمالی ہند کی حکومت مل گئی تب بھی اُن کا یہ رجحان بدستور باقی رہا کہ یہاں کی زبان اور معاشرت سیکھیں اور اس طرح اہلِ ملک سے اپنا رابطہ قائم رکھیں۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، انجمن اردو پنجاب وغیرہ سب اسی رجحان کی بدولت قائم ہوئے۔ ان اداروں کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کو ترقی دی جائے۔ اور اُسے علمی، ادبی اور فنی تصنیفوں ترجموں وغیرہ سے اتنا مالامال کر دیا جائے کہ وہ برّصغیر کی اہم ترین زبان بن کر اس کے طول و عرض میں رواج پانے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ ان میں سے اوّل الذکر ادارے کا مقصد یہ بھی تھا کہ نووارد انگریزوں کو یہاں کی زبان کے علاوہ معاشرت، رسم و رواج اور سماجی خصوصیات سے بھی آشنا کیا جائے تاکہ وہ اہلِ ہند کے حالات سے پوری واقفیت حاصل کر کے امورِ مملکت کا سرانجام اچھی طرح کر سکیں۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اہلِ یورپ[1] نے جن میں انگریزوں کے علاوہ فرانسیسی، اطالوی، پرتگیز اور ولندیزی بھی شامل ہیں، ملکی زبان سیکھنے میں کافی ریاض کر کے اپنی لسانی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اردو کی قدیم ترین لغات، قواعدِ صرف و نحو اور لسانیات انھیں لوگوں کی توجہ سے مرتّب ہوئیں۔ اس کے علاوہ پامر صاحب، صبر، شکر، فنا، خاندانِ اسکنر، خاندانِ گارڈنر (کاسگنج ضلع ایٹہ) غرض متعدد یورپین ہیں جو تجارت یا ملازمت کے سلسلے میں یہاں رہے، یہیں نشو و نما پائی، زبان سیکھی، حتّٰی کہ فنِ شعر میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ صاحبِ دیوان کہلائے، یہ لوگ زبان اور عروض و شعر میں قابلِ حیرت دستگاہ حاصل کر کے زبان دانوں اور شاعروں کی صف میں ممتاز مقام پیدا کر لیتے تھے۔

الیگزنڈر ہیڈرلی آزاد اسی سلسلے کا ایک باکمال فرد ہے جو عین عالمِ شباب میں ایک دیوان اپنی یادگار چھوڑ کر فوت ہوا۔ اُس کے مورثِ اعلیٰ سالسبری (انگلینڈ) کے تعلق دار تھے۔ آزاد کے دادا جیمز ہیڈرلی اپنے خورد سال بچے

---

[1] اگرچہ ان میں سے بیشتر افراد انیسویں صدی کے ہیں۔ لیکن عہدِ مغلیہ کے عروج میں بھی ایسے باکمال موجود تھے جو ولایت نژاد ہونے کے باوصف درباری زبان (فارسی) کے ماہر تھے۔ مرزا ذوالقرنین جس کی سخن سنجی کو جہانگیر جیسے نقاد نے سراہا ہے اور جو ایک مرکی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ فارسی میں شعر کہتا تھا چنانچہ شاہجہان کی مدح میں کئی قطعے اُس کے ہیں۔ داراشکوہ اُس کے حال پر خاص توجہ کرتا تھا۔ ۱۶۵۶ء میں بعمر ۷۴ سال فوت ہوا۔

جیمز ہیڈلی کو ساتھ لے کر تجارت کی نیت سے کلکتہ آئے اور یہاں بحری کپتان کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ بعدازاں اُن کی بیوی اور بیٹی بھی ولایت سے آگئیں کچھ عرصہ بعد وہ اپنے اہلِ عیال کو یہاں چھوڑ کر ولایت واپس گئے تاکہ اپنی جائداد کا تصفیہ کرآئیں۔ انھیں واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ بیمار پڑے اور ۱۷۹۹ء میں وہیں فوت ہو گئے۔ کمسن جیمز ہیڈلی کو اس دیارِ غربت میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دل سوز ہم وطن نے اس بچے کی دستگیری کی جس سے اُس کی تعلیم کا کچھ بندوبست ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں جب اُس کی عمر صرف ۱۴ سال تھی وہ بحیثیت کلرک فورٹ ولیم میں ملازم ہو گیا۔ اس نے صوبجات متحدہ کے اضلاع بریلی، میرٹھ، مرادآباد اور سہارن پور کی کلکٹریٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر سرکاری خدمت سے سبکدوش ہوا۔ پنشن لینے کے بعد چند ذی اثر حکام کی سفارش سے اُسے نواب فیض محمد خاں رئیسِ جھجھر کے دربار میں انگریزی مراسلات کی نوشت و خواند اور امورِ ریاست میں مشورہ دینے کا معزز عہدہ مل گیا جس پر وہ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۷ء تک فائز رہا۔ الیگزنڈر ہیڈلی آزاد اُس کا دوسرا بیٹا تھا۔ خاندان کا شجرہ[1] حسبِ ذیل ہے۔

جیمز ہیڈلی ۱۷۸۲ء-۱۸۵۹ء

۱	۲	۳	۴	۵
ٹامس ہیڈلی	الیگزنڈر ہیڈلی آزاد	جان ہیڈلی	ایمیلیا میٹلڈا فرانز (کورٹنی صاحب سے بیاہی گئی تھی۔ غدر میں ہلاک ہوئی)	چارلس ہیڈلی

۶	۷	۸	۹	۱۰
جارج ہیڈلی (غدر میں فوت ہوا)	جین ہیڈلی (جیمز اسکنر سے بیاہی گئی)	ایک اور لڑکی	ولیم (طفلی میں فوت ہوا)	ہنری ہیڈلی (اور یہی ہانڈی صاحب کے نام سے مشہور تھا)

ہنری ہیڈلی کی اولاد:

۱	۲	۳	۴	۵	۶
جیمز ہیڈلی	ونی فرڈ	ایمیلیا	ٹامس ہیڈلی	الیگزنڈر ہیڈلی	میری

آزاد ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں اتنی استعداد بہم پہنچالی کہ بے تکلف شعر کہہ لیتا تھا۔ اساتذہ کا کلام اُسے خوب یاد تھا اور فنِ شعر میں غالبؔ اور نواب زین العابدین خاں عارفؔ سے تلمذ حاصل تھا عارفؔ خود غالبؔ کے عزیز ہونے کے علاوہ اُن کے شاگرد بھی تھے۔ آزادؔ کبھی بالمواجہہ لیکن اکثر خط و کتابت کے ذریعہ عارفؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ دیوان کے دیباچے میں ٹامس ہیڈلی لکھتا ہے:۔

"اس نوجوان (آزادؔ) کو اپنے اُستاد اور اُستاد کے اُستاد (غالبؔ) کا انداز پیشِ نظر تھا۔ چناں چہ اکثر غزلیں عارفؔ غالبؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، ممنونؔ اور دیگر اساتذہ کے تتبع میں کہی ہیں جو داخلِ دیوان ہیں۔"

بعض اشعار ایسے ہیں جن میں غالبؔ سے کافی استفادہ کیا ہے۔ بلکہ غالبؔ کا خیال بعینہٖ نظم کر دیا ہے۔

بات کے بنتے ہی اُن سے قفلِ ابجد کی طرح	کھل گئی آزادؔ اپنے بخت کے تالے کی کُنج
یاد اپنا آگیا کاشانۂ ویراں ہمیں	چلتے پھرتے ہم جو جا نکلے بیاباں کو گزر
عالم کا تو کیا ذکر کہ خود ہوتی ہے نفرت	مجھ کو مرے اوقاتِ مقرر سے زیادہ

ہبو ئے بادہ لگا دے منھ سے یہ کیسی کرتا ہے چُہل ساقی
غضب ہے مجھ جیسے بادہ کش کو دیا ہے جامِ شراب آدھا

آزادؔ کا دیوان مطبعِ احمدی میں ۱۸۶۳ء میں یعنی مصنف کے مرنے سے دو سال بعد طبع ہوا۔ یہ مختصر مجموعۂ کلام جس پر ایک فارسی دیباچہ شوکت علی فتح پوری کا اور ایک دیباچہ اردو میں ٹامس ہیڈلی کا ہے۔ اندازاً تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن اس خاندان کے ایک متاخر فرد (ٹامس) نے جن سے رام بابو سکسینہ نے ملاقات کی ہے۔ اُن سے یہ بیان کیا کہ خاندانی تبرکات میں آزادؔ کا قلمی مجموعۂ کلام بھی تھا۔ جو مطبوعہ دیوان سے کہیں زیادہ ضخیم تھا۔ یہ مجموعہ دیگر کاغذوں سمیت جن میں غدر کے حالات بھی تھے جل گیا۔ گھر میں ایک مرتبہ آگ لگی تھی اُس میں یہ تمام ذخیرہ تلف ہو گیا۔ تاہم موجودہ دیوان سے بھی آزادؔ کی قادر الکلامی، مذاقِ سخن اور مزاجی خصوصیات کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ افتادِ مزاج اور خاندانی حالات پر بھی کہیں کہیں روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] میں اس شجرے اور متعلقہ حالات کے لئے رام بابو سکسینہ صاحب کی کتاب "یورپین شعرائے اردو" اور محفوظ الحق و سردار علی صاحبان کے تذکروں کا ممنون ہوں۔

اگرچہ یہ بات بجائے خود کافی حیرت انگیز ہے کہ ایک غیر ملکی شخص پرائی زبان میں عمدہ شعر کہے اور خاصا اچھا دیوان یادگار چھوڑ جائے۔ مگر اس سے زیادہ حیران کُن بات یہ ہے کہ یہ سات سمندر پار کے رہنے والے اس ملک کی زبان کے دوش بدوش یہاں کی معاشرت، رسم و رواج اور مشرقی روایات کو اس خوبی سے اپناتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوانِ آزاد میں بیشتر غزلیں ایسی ملتی ہیں جن میں ہماری معاشرت کی جزئیات اس طرح موجود ہیں کہ انھیں کسی غیر ملکی کا نتیجۂ فکر کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ ہندی روایات بالخصوص مقامی تہذیب کا عکس زندگی کے ہر شعبے میں صاف نظر آتا ہے۔ شاعری کی عام روایات و لوازم کے علاوہ متعدد باتیں ایسی ہیں جو فقط ہمارے ملک اور ہماری تہذیب سے وابستہ ہیں۔ عزتِ نفس، غیرت، پاسِ وفا، حد سے بڑھی ہوئی مروت وغیرہ وغیرہ مشرقی تہذیب کا لازمہ ہیں جن کا جلوہ دیوان کے اوراق میں جابجا ملتا ہے۔ ان سب پر طرہ یہ کہ شاعر کا اندازِ فکر خالص مشرقی ہے۔ دیوان بدستور حمدِ خدا سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعت ہے۔ کچھ قصائد مدح میں ہیں۔ ایک قصیدہ بڑے بھائی ٹامس ہیدرلی کی تعریف میں ہے۔ ایک دوسرے قصیدے میں بھتیجے کے تولد کی تہنیت ہے چند شعر اپنے دوستِ صادق لالہ منالال اور اپنے محسن احمد خاں کی تعریف میں ہیں۔ ایک قطعہ کسی کے غسلِ صحت سے متعلق ہے اور ایک مرثیہ میں اپنے اُستاد زین العابدین خاں عارف کی بے وقت موت کا ماتم کیا ہے۔ چند شعر کسی دوست کے نام آموں اور گلاہ کی رسید میں لکھے ہیں۔ تاریخیں، تہنیت، محبوب کا گلہ، روزگار کی شکایت، شیخ سے دل لگی، زاہد سے چھیڑ چھاڑ، محتسب سے آنکھ مچولی، فلکِ بے پیر کا شکوہ، محبوب کی جفائیں، اپنی ایذا طلبی، تعویذوں اور عملیات کا ذکر، غرض متعدد چیزیں ہیں جو خالص مشرقی مزاج کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اُس کی قادر الکلامی کے علاوہ مذکورہ بالا خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سب میں بے پردہ رہی پردۂ فانوس میں شمع
لگ گئی آگ ترے خانۂ ناموس میں شمع

مرغِ سلیماں یا ہو کبوتر، جن و بشر ہو کوئی ہو
نامہ مرا لے جائے، وہاں تک جس کا گذر ہو کوئی ہو

پابندِ غمِ بُتاں ہیں آزاد ۔۔۔ کیا قید سے جی چرائیں گے ہم

نوید اے دل کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اُن کا حجاب آدھا
ہزار مشکل سے یار نے اُلٹا انھوں نے رُخ سے نقاب آدھا

چلے تھے مسجد کو تم تو رستہ بتایا ہم نے ہے میکدے کا
عجب نہیں ہے کہ شیخ صاحب ملے ہمیں بھی ثواب آدھا

سبوئے بادہ لگا کے منہ سے یہ کیسی کرتا ہے چہل ساقی
غضب ہے مجھ جیسے بادہ کش کو دیا ہے جامِ شراب آدھا

چل گیا ہے کوئی شاید کہ عمل تھوڑا سا ۔۔۔ مہرباں اپنے پہ پایا انھیں کل تھوڑا سا
اے گل اندام تجھے عطر کی حاجت کیا ہے ۔۔۔ اک تکلف ہے اگر جی چاہے تو مل تھوڑا سا
چارہ گر میرے لیے تو جو بنا دے مرہم ۔۔۔ ڈال الماس بھی کچھ کر کے کھرل تھوڑا سا
یہ رہا سامنے میخانہ نہ دل چھوڑ خضر ۔۔۔ اک ذرا سا تو ہے اور بھی چل تھوڑا سا
آسماں کشتیِ طوفاں زدہ ہو جائے اگر ۔۔۔ چشمۂ دیدۂ تر جائے اُبل تھوڑا سا

سمجھیں ہم شادیِ کونین سے بہتر آزاد
غم جو ہاتھ آئے ہمیں اُس کے بدل تھوڑا سا

پوجنے کو بُت میسر ہے نہ پینے کو شراب
بخت سے آزاد مجھ پر بھی مدینہ ہو گیا

عزت سے مجھے پاس جو بٹھلاؤ تو آؤں ۔۔۔ کیوں آپ سے آؤں مجھے بلواؤ تو آؤں

اسی میں کہیں کہیں مشرقی معاشرت کے خاکے اور مقامی رنگ کا جلوہ بھی نظر آتا ہے جو ایک غیر ملکی شخص کی زبان سے عجب لطف دیتا ہے۔ مقامی رنگ پیش کرنے میں سودا، نظیر، محسن کاکوروی، انشا اور مصحفی کے نام مشہور ہیں آزاد کا انداز بھی دیکھئے۔

اٹھا ہے ابرِ سیاہ صاحب جو سُرخ جوڑا نہ ہو تو اس دم
ہمارے خونِ جگر میں رنگئے کہاں یہ رنگت شہاب میں ہے

کرے گیا چشمہ ہم چشمی ہماری چشمِ گریاں سے
مقابل اس کے کچھ نکلے تو دریائے اٹک نکلے

سمجھ کر شام کا رستہ نہ جا اُس مانگ میں اے دل
خدا جانے کہاں آخر کو جا کر یہ سڑک نکلے

نہ کرتا چھیڑنے چھونے کا قصد آزاد اُس بُت کے
خدا وہ دن نہ دکھلائے جو کچھ اس کی جھجک نکلے

شفق نہ رشک سے خوں ہوئے تو جبھی کہیو
ذرا سا اور دوپٹے کو تو شہاب تو دے

ہمارے پاس جو شب چاندنی کھیتے بلیے   لئے تجھے واسطے اک رشکِ ماہتاب کے ہول

ایک شعر میں امرد پرستی کی روایت بھی نبھاتے ہیں :-

ہند میں کم ہیں عشوہ گر طفلاں   سبھے آزاد چل کے کابل میں

مزاج کی مشرقیت نے آزاد کی شاعری پر دیگر حیثیتوں سے بھی اثر ڈالا ہے۔ کلام میں کہیں کہیں رعایتِ لفظی اور دوسری صنعتوں کے نمونے ملتے ہیں ایک قصیدہ جو راجہ شیو دھیان سنگھ رئیس الور کی مدح میں ہے۔ صنعتِ توشیح کا حامل ہے۔ بعض غزلیں سراسر شگفتہ ہیں۔ جن پر محاورہ اور لطفِ زبان ناز کرتے ہیں۔ بعض غزلیں اور قصیدے سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔ ذیل کا مختصر انتخاب ان خوبیوں کی توضیح کرتا ہے :-

ہزار بار بھی کیا ہو کے وہ خفا اُٹھے   پر اُن کی بزم سے اغیار بے حیا نہ اُٹھے
جو بیٹھنا ہے تو چپ بیٹھ ورنہ یاں سے ابھی   تجھے قسم ہے جو تو جلد ناصحا نہ اُٹھے
نہ ہو لحت اس پہ اگر متصل نمک پاشی   تو نا اک زخمِ جگر کا مجھے مزا نہ اُٹھے
رقیب پاس جو بیٹھا ہے آن کے تنہا ہوں   پھر ان کو میری طرف سے لگا بجا نہ اُٹھے
جہاں میں کون ہے وہ جس کے پاس ہم بیٹھے   اور اپنا حال سنا کر اُسے رُلا نہ اُٹھے

جو کام تھا انھیں معلوم ہے ہمیں آزاد
ہمارے پاس سے وہ کر کے شب بہانہ اُٹھے

اک نظر دیکھے جو کوئی روئے جاناں کی طرف   پھیر کر منہ پھر نہ دیکھے ماہِ تاباں کی طرف

ضعف کے ہاتھوں سے اٹھ سکتے نہیں دستِ جنوں
دیکھتا ہوں میں حسرت سے گریباں کی طرف

مشکل طرحیں۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا بعض قدیم اساتذہ کی خصوصیت تھی۔ جس کے جوہر، وہ کبھی محض تفریحِ طبع کے لئے۔ کبھی اپنی قادر الکلامی کے اظہار کی خاطر۔ اور کبھی ادبی نزاعات میں سرخرو ہونے کے واسطے دکھاتے تھے۔ شاہ نصیر اس میدان کے مرد ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ادبی ورزش ہے جس میں پہلوانانِ سخن اپنی شہزوری کے کرتب دکھاتے ہیں۔ آزاد مغربی نژاد بھی اس رجحان سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چناں چہ بعض غزلیں مشکل زمینوں میں کہی ہیں اور قدرتِ کلام کے زور سے مطالب کو نہایت سہولت سے ادا کیا ہے بعض ردیفیں شگفتہ ہیں اور ظفر کی طرح دو دو ہاتھ لمبی ہیں۔ یہاں انھیں بہ اختصار درج کیا جاتا ہے۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ آزاد کی قادر الکلامی کا اندازہ ہو سکے۔

پئے تسکینِ دل کب تک رکھوں تصویر پہلو میں   خدارا جلوہ گر ہو اے بُتِ بے پیر پہلو میں
تمھیں اس جلوہ گاہِ خاص کی ترمیم لازم ہے   شکستہ کاخِ دل کی ہو چلی تعمیر پہلو میں

اُن کی محفل میں مری توقیر آدھی رہ گئی   کیا سبب جو آہ کی تاثیر آدھی رہ گئی
ہوئے ہو سلے ہم دبائے جاتے ہیں شبِ ہجر دل   قیس کہتا ہے مری جاگیر آدھی رہ گئی
کب کبھی زنداں میں ہم دیکھو گھِس گھِس کر تمام   طوق آدھا رہ گیا زنجیر آدھی رہ گئی
خاکِ راہِ یار میں آزاد لاکھوں وصف ہیں   اس کے آگے خوبیِ اکسیر آدھی رہ گئی

دلاسے کر کہتے ہیں میرا دل بیتاب مٹھی میں   دلِ مضطر ہے یہ تیرا کہ ہے سیماب مٹھی میں
تامّل کیا ہے اے خمار ہاتھوں ہاتھ سو اُٹھے   لٹے ہوں قیمتِ رطلِ شرابِ ناب مٹھی میں
نکل کر ہاتھ سے میرے کہاں جاتے ہیں وہ اُن کو   سمجھتا ہوں بفضلِ ایزدِ وہاب مٹھی میں

نہ چھوٹ جائے کہیں ہاتھوں سے دامانِ وفا آزاد
ذرا مضبوط رکھ اے مضطر دبیتاب مٹھی میں

بصرف ہے سب دانائی ہم کو کن کی بدولت ان کی بدولت
ملتا ہے جبر چھائی ہم کو کن کی بدولت ان کی بدولت

مشکل گوئی کا یہ رجحان غزلوں کے علاوہ بعض قصیدوں میں بھی ہے۔ لیکن ہر جگہ آزاد نہایت خوبی کے ساتھ شعر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوئے ہے جیاجی راؤ سیندھیا والیِ گوالیار کی مدح میں جو قصیدہ ہے اُس کے یہ چند اشعار اس مطلب کو روشن کرتے ہیں :-

کس لئے ہے تجھ کو اے دل انتظارِ فصلِ گل   ہے مہاراجہ کی محفل میں بہارِ فصلِ گل
جلوۂ خوبانِ رنگیں پیرہن سے بزم میں   غور سے دیکھو تو ہے گویا بہارِ فصلِ گل
فرش دیکھے سبز مخمل کا جو تیری بزم میں   سبزۂ طرفِ چمن ہو ننگ و عارِ فصلِ گل
سر کو ٹکرا دے فصیلوں سے پڑی بادِ خزاں   حفظ ہو تیرا جہاں میں گر حصارِ فصلِ گل

لہ یہ وہی شیو دھیان سنگھ ہیں جن کی مدح میں غالب نے بھی ایک فارسی قصیدہ لکھا ہے۔ آزاد نے اپنے والد عبداللہ بیگ خاں کی خدمات کا حوالہ دیا ہے۔ مطلع اور چند شعر یہ ہیں:

گرد آورد بشکلِ فرس باد را بہار   تا شیو دھیان سنگھ بہادر شود سوار
باید شنید مالِ نامیانِ بارگاہ   باید شنفت قصۂ زبیرانِ آں دیار
ثانی بود مشاہدہ شاہد فزوں نیست   دعا کہ را جگر تو پدرم را بود مزار

طرحی غزلیں۔ کسی شاعر کے کمال کا صحیح اندازہ کرنے کے مختلف طریقے ہیں ایک یہ ہے کہ اُس نے دوسرے اساتذہ کی زمینوں یا ہم طرح غزلوں میں کس حد تک دادِ سخن گوئی دی ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ کس پائے کا ہے۔ آزاد نے غالب، مومن، شیفتہ، عارف، ذوق وغیرہ کی غزلوں پر متعدد غزلیں کہی ہیں جو اگرچہ ان اساتذہ کے بہ مقابلہ پست ہیں۔ مگر بجائے خود کافی بلند مقام رکھتی ہیں۔ اشعارِ ذیل اس بات کے اندازے میں کچھ مدد دیں گے۔ کہ ہم طرح غزلوں کے بعض مشکل قافیے کس سہولت سے نظم ہوئے ہیں۔ اور بحیثیت مجموعی غزل کا کیا انداز ہے۔

فتنہ[1] اُٹھے ہے کس طرح اُٹھ کے مجھے دکھا کہ یوں
حشر بپا ہو کس طرح چل کے مجھے بتا کہ یوں

نہ دے جو بوسہ گیسو نہ دے جواب تو دے — بلا سے جو مجھے دینا ہو دے شتاب تو دے
اُٹھا ہے سب مرے کھانے میں یہ تو پہلے ادل — مگر خزانۂ غم کا مجھے حساب تو دے
شراب روز تو ہم مانگتے نہیں ساقی — کوئی پیالہ دمِ ریزشِ سحاب تو دے
لیا ہے دین تو اس کے عوض میں یا وہ فروش — جو پانچ چار نہیں اک خُمِ شراب تو دے
میں نہ وحشت میں کبھی سوئے بیاباں نکلا — واں سے دل چپ مرا خانۂ ویراں نکلا

اپنے استاد زین العابدین خاں عارف کی موت پر جو مرثیہ کہا ہے اُس کی نہ صرف زمین بلکہ بہت سے مضامین بھی اُس مرثیے سے ماخوذ ہیں جو مومن نے اپنی معشوقہ "صاحبِ شیم" کے ماتم میں کہا ہے یہ موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مومن۔ خمیازۂ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج
آغوشِ رشکِ حلقۂ اہلِ عزا ہے آج

آزاد اے اہلِ دیدہ دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہے آج
میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج

مومن تشبیہِ آئینہ سے جو ہوتا تھا آب آب
مل جائے خاک میں وہ بدن واسیبتا

آزاد حیرت میں جس کو دیکھ کے رہ جائے آئینہ
آلودہ گرد میں وہ تنِ با صفا ہے آج

مومن جس نازنین صنم پہ گراں تھا حریرِ چین
اُس کا غلافِ کعبہ کفن واسیبتا

آزاد جس جسم پر کہ جامۂ گل دوز بار تھا
وہ جسم کوہِ گرد کے نیچے دبا ہے آج

عیوب۔ اس قادر الکلامی کے باوجود جس کے نمونے اوپر درج ہوئے آزاد کے کلام میں کہیں کہیں معائبِ شعری بھی نظر آتے ہیں۔ معائبِ شعر مسلّم الثبوت اساتذہ کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر آزاد کے کلام میں بھی دو چار جگہ اسقام نظر آئیں تو اس بات سے اُس کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ اُس کے دیوان میں زبان اور محاورے کی غلطیاں نہیں پائی جاتیں۔ البتہ حروف کا وزن سے ساقط ہونا، تخفیف، تشدید وغیرہ کے معاملے میں آزاد سے غلطیاں ہوئی ہیں جن کی مثالیں درج ذیل ہیں۔ حروف کا ساقط ہونا بالعموم وہاں واقع ہوا ہے جہاں کسی لفظ کا حرف اگلے لفظ کے حرفِ علت سے پہلے آیا ہے۔ ایک غیر ملکی شخص اگر ہمارے حروفِ علت کے طول کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور ایک دو جگہ یہ غلطی کر جائے تو صرفِ نظر کرنا چاہیئے:۔

حروف اور اضافت کا ساقط ہونا:۔

ع۔ ہو کے خاکِ عالم میں تیرے کشتگاں بچھڑنے لگے۔
ع ناہینا جسود ہو گئے شپّر سے زیادہ
ع اقبال مطیع ہو ترا نوکر سے زیادہ
ع ہیں مضامیں کہ لآلیِ عمّاں

غلط لفظ:۔ ع اہلِ دنیا غرضی مطلب ہیں۔

غلط ترکیب:۔ ع جوشِ زور مندی ہے عالم جوانی ہے۔

ان صفحات میں آزاد کے کلام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جس سے ہم یہ اندازہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بقول رام بابو سکسینہ یہ باکمال شاعر "اُردو کی تیسری صف میں" ایک ممتاز مقام کا مستحق ہے۔" کمالِ شاعری کے علاوہ بحیثیت انسان بھی آزاد کی ذات میں وہ جوہر نظر آتے ہیں جو انسانیت کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ وہ ریاستِ الور کی فوج میں عہدۂ کپتانی پر مامور تھا لیکن اپنے محدود ذرائع کے باوجود صد درجہ سیر چشم اور فیاض تھا۔ کبھی کبھی ایسا

---

[1] اس غزل کا وزن شاعر کے تخلص (آزاد) سے بیاکتا ہے لہٰذا آزاد نے اس میں اپنا تخلص دیگر بنظم کیا ہے جو انگریزی نذر کا مخفف ہے۔

جیمز ہیڈلی کو ساتھ لے کر تجارت کی نیّت سے کلکتہ آئے اور یہاں بحری کپتان کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ بعدازاں اُن کی بیوی اور بیٹی بھی ولایت سے آگئیں کچھ عرصہ بعد وہ اپنے اہل عیال کو یہاں چھوڑ کر ولایت واپس گئے تاکہ اپنی جائداد کا تصفیہ کرائیں۔ انھیں واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ بیمار پڑے اور ۱۷۹۹ء میں وہیں فوت ہو گئے۔ کمسن جیمز ہیڈلی کو اس دیارِ غربت میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دل سوز ہم وطن نے اس بچے کی دستگیری کی جس سے اُس کی تعلیم کا کچھ بندوبست ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں جب اُس کی عمر صرف ۱۴ سال تھی وہ بحیثیت کلرک فورٹ ولیم میں ملازم ہو گیا۔ اس نے صوبجات متحدہ کے اضلاع بریلی، میرٹھ، مرادآباد اور سہارن پور کی کلکٹریٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر سرکاری خدمت سے سبکدوش ہوا۔ پنشن لینے کے بعد چند ذی اثر حکام کی سفارش سے اُسے نواب فیض محمد خاں رئیسِ جھجھر کے دربار میں انگریزی مراسلات کی نوشت وخواند اور امورِ ریاست میں مشورہ دینے کا موزوں عہدہ مل گیا جس پر وہ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۷ء تک فائز رہا۔ الیگزنڈر ہیڈلی آزاد اُس کا دوسرا بیٹا تھا۔ خاندان کا شجرہ حسبِ ذیل ہے۔

جیمز ہیڈلی ۱۸۵۹-۱۸۸۴ء

۱	۲	۳	۴	۵
ٹامس ہیڈلی	الیگزنڈر ہیڈلی آزاد	جان ہیڈلی	ایمیلیا ہیٹلڈ ٹلافرڈ (کورٹنی صاحب سے بیاہی گئی تھی۔ غدر میں ہلاک ہوئی)	چارلس ہیڈلی

۱۰	۹	۸	۷	۶
ہنری ہیڈلی (الور میں ہانڈری صاحب کے نام سے مشہور تھا)	ولیم (طفلی میں فوت ہوا)	ایک اور لڑکی	جین ہیڈلی (جیمز اسکنر سے بیاہی گئی)	جانسن ہیڈلی (الور میں فوت ہوا)

↓

۱	۲	۳	۴	۵	۶
جیمز ہیڈلی	ونی فرڈ	ایمیلیا	ٹامس ہیڈلی	الیگزنڈر ہیڈلی	میری

آزاد ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں اتنی استعداد بہم پہنچا لی کہ بے تکلّف شعر کہہ لیتا تھا۔ اساتذہ کا کلام اُسے خوب یاد تھا اور فنِ شعر میں غالبؔ اور نواب زین العابدین خاں عارفؔ سے تلمّذ حاصل تھا۔ عارفؔ خود غالبؔ کے عزیز ہونے کے علاوہ اُن کے شاگرد بھی تھے۔ آزادؔ کبھی بالمواجہ لیکن اکثر خط وکتابت کے ذریعے عارفؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ دیوان کے دیباچے میں ٹامس ہیڈلی لکھتا ہے:۔

"اس نوجوان (آزادؔ) کو اپنے اُستاد اور استاد کے اُستاد (غالبؔ) کا انداز پیشِ نظر تھا۔ چناں چہ اکثر غزلیں عارفؔ غالبؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، ممنونؔ اور دیگر اساتذہ کے تتبّع میں کہی ہیں جو داخلِ دیوان ہیں۔"

بعض اشعار ایسے ہیں جن میں غالبؔ سے کافی استفادہ کیا ہے۔ بلکہ غالب کا خیال بعینہٖ نظم کر دیا ہے۔

بات کے بنتے ہی اُن سے قفلِ ابجد کی طرح	کھل گئی آزادؔ اپنے بخت کے تالے کی کُنج
یاد اپنا آگیا کاشانۂ ویراں ہمیں	چلتے پھرتے ہم جو جا نکلے بیاباں کی طرف
عالم کا تو کیا ذکر کہ خود ہوتی ہے نفرت	مجھ کو مرے اوقاتِ مقرّر سے زیادہ

مسبو مے بادہ لگادے منہ سے یہ کیسی کرتا ہے چُہل ساقی
غضب ہے مجھ جیسے بادہ کش کو دیا ہے جامِ شراب آدھا

آزادؔ کا دیوان مطبعِ احمدی میں ۱۸۶۳ء میں یعنی مصنّف کے مرنے سے دو سال بعد طبع ہوا۔ یہ مختصر مجموعۂ کلام جس پر ایک فارسی دیباچہ شوکت علی فتح پوری کا اور ایک دیباچہ اردو میں ٹامس ہیڈلی کا ہے۔ اندازاً تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن اس خاندان کے ایک متاخر فرد (ٹامس) نے جن سے رام بابو سکسینہ نے ملاقات کی ہے۔ اُن سے یہ بیان کیا کہ خاندانی تبرکات میں آزاد کا قلمی مجموعۂ کلام بھی تھا۔ جو مطبوعہ دیوان سے کہیں زیادہ ضخیم تھا۔ یہ مجموعہ دیگر کاغذوں سمیت جن میں غدر کے حالات بھی تھے جل گیا۔ گھر میں ایک مرتبہ آگ لگی تھی اُس میں یہ تمام ذخیرہ تلف ہو گیا۔ تاہم موجودہ دیوان سے بھی آزاد کی قادرالکلامی، مذاقِ سخن اور مزاجی خصوصیات کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اور مزاج اور خاندانی حالات پر بھی کہیں کہیں روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] میں اس تجزیے اور مختلف حالات کے لئے رام بابو سکسینہ صاحب کی کتاب "یورپین شعرائے اردو" اور محفوظ الحق و سردار علی صاحبان کے تذکروں کا ممنون ہوں۔

اگرچہ یہ بات بجائے خود کافی حیرت انگیز ہے کہ ایک غیر ملکی شخص پرائی زبان میں عمدہ شعر کہے اور خاصا اچھا دیوان یادگار چھوڑ جائے۔ مگر اس سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ یہ سات سمندر پار کے رہنے والے اس ملک کی زبان کے دوش بدوش یہاں کی معاشرت، رسم و رواج اور مشرقی روایات کو اس خوبی سے اپناتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوان آزاد میں بیشتر غزلیں ایسی ملتی ہیں جس میں ہماری معاشرت کی جزئیات اس طرح موجود ہیں کہ انھیں کسی غیر ملکی کا نتیجۂ فکر کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ ہندی روایات بالخصوص مقامی تہذیب کا عکس زندگی کے ہر شعبے میں صاف نظر آتا ہے۔ شاعری کی عام روایات و لوازم کے علاوہ متعدد باتیں ایسی ہیں جو فقط ہمارے ملک اور ہماری تہذیب سے وابستہ ہیں۔ عزتِ نفس، غیرت، پاس وفا، حد سے بڑھی ہوئی مروت وغیرہ وغیرہ مشرقی تہذیب کا لازمہ ہیں جن کا جلوہ دیوان کے اوراق میں جا بجا ملتا ہے۔ ان سب پر طرہ یہ کہ شاعر کا اندازِ فکر خالص مشرقی ہے۔ دیوان بدستور حمدِ خدا سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعت ہے۔ کچھ قصائد مدح میں ہیں۔ ایک قصیدہ بڑے بھائی ٹامس ہیدلی کی تعریف میں ہے۔ ایک دوسرے قصیدے میں بھتیجے کے تولد کی تہنیت ہے چند شعر اپنے دوست صادق لال ممتا لال اور اپنے محسن احمد خاں کی تعریف میں ہیں۔ ایک قطعہ کسی کے غسلِ صحت سے متعلق ہے اور ایک مرثیہ میں اپنے استاد زین العابدین خاں عارف کی بے وقت موت کا ماتم کیا ہے۔ چند شعر کسی دوست کے نام آموں اور گلاہ کی رسید میں لکھے ہیں۔ تاریخیں، تہنیت، محبوب کا گلہ، روزگار کی شکایت، شیخ سے دل لگی، زاہد سے چھیڑ چھاڑ، محتسب سے آنکھ مچولی، فلکِ بے پیر کا شکوہ، محبوب کی جفائیں، اپنی ایذا طلبی، تعویذوں اور عملیات کا ذکر، غرض متعدد چیزیں ہیں جو خالص مشرقی مزاج کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اس کی قادر الکلامی کے علاوہ مذکورہ بالا خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سب میں بے پردہ رہی پردۂ فانوس میں شمع
لگ گئی آگ ترے خانۂ ناموس میں شمع

مرغِ سلیماں یا ہو کبوتر، جن و بشر ہو کوئی ہو
نامہ مرا لے جائے وہاں تک جس کا گذر ہو کوئی ہو

پابندِ غمِ بتاں ہیں آزاد
کیا قید سے جی چرائیں گے ہم

نوید اے دل کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اُن کا حجاب آدھا
ہزار مشکل سے یار نے اُلٹا انھوں نے رخ سے نقاب آدھا

چلے تھے مسجد کو تم تو رستہ بتایا ہم نے ہے میکدے کا
عجب نہیں ہے کہ شیخ صاحب ملے ہمیں بھی ثواب آدھا

سبوئے بادہ لگا کے منھ سے یہ کیسی کرتا ہے چہل ساقی
غضب ہے مجھ جیسے بادہ کش کو دیا ہے جامِ شراب آدھا

چل گیا ہے کوئی شاید کہ عمل تھوڑا سا
مہرباں اپنے پہ پایا انھیں کل تھوڑا سا

اے گل اندام تجھے عطر کی حاجت کیا ہے
اک تکلف ہے اگر جی چاہے تو مل تھوڑا سا

چارہ گر میرے لئے تو جو بنا دے مرہم
ڈال الماس بھی کچھ کر کے کھرل تھوڑا سا

یہ رہا سامنے میخانہ نہ دل چھوڑ خضر
اک ذرا سا تھہ میرے اور بھی چل تھوڑا سا

آسماں کشتیِ طوفاں زدہ ہو جائے اگر
چشمۂ دیدۂ تر جائے اُبل تھوڑا سا

سمجھیں ہم شادیِ کونین سے بہتر آزاد
غم جو ہاتھ آئے ہمیں اس کے بدل تھوڑا سا

پوجنے کو بت میسر ہے نہ پینے کو شراب
بخت سے آزاد جیجھو بھی مدینہ ہو گیا

عزت سے مجھے پاس جو بٹھلاؤ تو آؤں
کیوں آپ سے آؤں مجھے بلاؤ تو آؤں

اسی میں کہیں کہیں مشرقی معاشرت کے خاکے اور مقامی رنگ کا جلوہ بھی نظر آتا ہے جو ایک غیر ملکی شخص کی زبان سے عجیب لطف دیتا ہے۔ مقامی رنگ پیش کرنے میں سودا، نظیر، محسن کاکوروی، انشا اور مصحفی کے نام مشہور ہیں آزاد کا انداز بھی دیکھئے۔

اٹھا ہے ابرِ سیاہ صاحب جو سرخ جوڑا نہ ہو تو اس دم
ہمارے خونِ جگر میں رنگئے کہاں یہ رنگت شہاب میں ہے

کرے گیا چشمہ ہم چشمی ہماری چشمِ گریاں سے
مقابل اس کے کچھ نکلے تو دریائے اٹک نکلے

سمجھ کر شام کا رستہ نہ جا اُس مانگ میں اے دل
خدا جانے کہاں آخر کو جا کر یہ سڑک نکلے

نہ کرتا چھیڑنے چھونے کا قصد آزاد اُس بت کے
خدا وہ دن پہ چھتے دے جو کچھ اُس کی جھجک نکلے

شفق نہ رشک سے خوں ہووے تو جبھی کہیو
ذرا سا اوڑھ دوپٹے کو تو شہاب تو دے

ہمارے پاس جو شب چاندنی کھیتے یا یے — لئے تھے واسطے اک رشک ماہتاب کے مول

ایک شعر میں امرد پرستی کی روایت بھی نبھاتے ہیں :۔

ہند میں کم ہیں عشوہ گر اطفال — بیٹے آزاد چل کے کابل میں

مزاج کی مشرقیت نے آزاد کی شاعری پر دیگر حیثیتوں سے بھی اثر ڈالا ہے۔ کلام میں کہیں کہیں رعایتِ لفظی اور دوسری صنعتوں کے نمونے ملتے ہیں ایک قصیدہ جو راجہ شیو دھیان سنگھ رئیس الور کی مدح میں ہے۔ صنعتِ توشیح کا حامل ہے۔ بعض غزلیں سراسر شگفتہ ہیں۔ جن پر محاورہ اور لطفِ زبان ناز کرتے ہیں۔ بعض غزلیں اور قصیدے سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔ ذیل کا مختصر انتخاب ان خوبیوں کی توضیح کرتا ہے :۔

ہزار بار بھی کیا ہو کے وہ خفا نہ اٹھے — پر اُن کی بزم سے اغیار بے حیا نہ اٹھے
جو بیٹھنا ہے تو چپ بیٹھ ورنہ یاں سے ابھی — تجھے قسم ہے جو تو عبد ناصحا نہ اٹھے
نہ ہووے اس پہ اگر متصل نمک پاشی — تو زخم جگر کا مجھے مزا نہ اٹھے
رقیب پاس جو بیٹھا ہے ان کے دُنا ہو — پھر ان کو میری طرف سے لگا بجھا نہ اٹھے
جہاں میں کون ہے وہ جس کے پاس ہم بیٹھے — الا اپنا حال سنا کر اُسے رُلا نہ اٹھے

جو کام تھا اُنھیں معلوم ہے ہمیں آزاد
ہمارے پاس سے وہ کہہ کے شب بہانہ اٹھے

اک نظر دیکھے جو کوئی روئے جاناں کی طرف — پھیر کر منہ پھر نہ دیکھے ماہِ تاباں کی طرف

ضعف کے ہاتھوں سے اٹھ سکتے نہیں دستِ جنوں
دیکھتا ہوں عین حسرت سے گریباں کی طرف

مشکل طرحیں۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا بعض قدیم اساتذہ کی خصوصیت تھی۔ جس کے جوہر وہ کبھی محض تفریحِ طبع کے لیے۔ کبھی اپنی قادرالکلامی کے اظہار کی خاطر، اور کبھی ادبی نزاعات میں سرخرو ہونے کے واسطے دکھاتے تھے۔ شاہ نصیر اس میدان کے مرد ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ادبی ورزش ہے جس میں پہلوانانِ سخن اپنی شہزوری کے کرتب دکھاتے ہیں۔ آزاد مغربی نثراد بھی اس رجحان سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چناں چہ بعض غزلیں مشکل زمینوں میں کہی ہیں اور قدرتِ کلام کے زور سے مطالب کو نہایت سہولت سے ادا کیا ہے۔ بعض ردیفیں شگفتہ ہیں اور قلعز کی طرح دو دو ہاتھ لمبی ہیں۔ یہاں انھیں بہ اختصار درج کیا جاتا ہے۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ آزاد کی قادرالکلامی کا اندازہ ہو سکے۔

پئے تسکینِ دل کب تک رکھوں تصویر پہلو میں — خدارا جلوہ گر ہو اے بُتِ بے پیر پہلو میں
تمھیں اس جلوہ گاہِ خاص کی تزئین لازم ہے — شکستہ کاخِ دل کی ہو چلی تعمیر پہلو میں

اُن کی محفل میں مری توقیر آدھی رہ گئی — کیا سبب جو آہ کی تاثیر آدھی رہ گئی
ہو رہے ہو لے ہم دبائے جاتے ہیں شبِ جنوں — قیس کہتا ہے مری جاگیر آدھی رہ گئی
کب تلک زنداں میں ہم دیکھو کھسکیں کرتے تمام — طوق آدھا رہ گیا زنجیر آدھی رہ گئی
خاکِ راہِ یار میں آزاد لا کھوں وصف ہیں — اس کے آگے خوبیِ اکسیر آدھی رہ گئی

وہ لے کر کہتے ہیں میرا دلِ بیتاب مٹھی میں — دلِ مضطر ہے یہ تیرا کہ ہے سیماب مٹھی میں
تامل کیا ہے اے خمار رہا تھوں ہاتھ سو لیے — لئے ہوں قیمتِ رطلِ شرابِ ناب مٹھی میں
نکل کر ہاتھ سے میرے کہاں جاتے ہیں وہ اُن کو — سمجھتا ہوں بفضلِ ایزدی وہاب مٹھی میں

نہ چھوٹ جائے کہیں ہاتھوں سے دامانِ وفا آزاد
ذرا مضبوط رکھ لے مضطرو بیتاب مٹھی میں

معروف ہے سب دانائی ہم کو کن کی بدولت ان کی بدولت
دل لبِ جبر چھائی ہم کو کن کی بدولت ان کی بدولت

مشکل گوئی کا یہ رجحان غزلوں کے علاوہ بعض قصیدوں میں بھی ہے۔ لیکن ہر جگہ آزاد نہایت خوبی کے ساتھ شعر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ جیاجی راؤ سیندھیا والیِ گوالیار کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس کے یہ چند اشعار اس مطلب کو روشن کرتے ہیں :۔

کس لئے ہے تجھ کو اے دل انتظارِ فصلِ گل — ہے مہاراجہ کی محفل میں بہارِ فصلِ گل
جلوۂ خوبانِ رنگیں پیرہن سے بزم میں — غور سے دیکھو تو ہے گویا بہارِ فصلِ گل
فرش دیکھے سبز مخمل کا جو تیری بزم میں — سبزۂ طرفِ چمن ہو ننگ و عارِ فصلِ گل
سر کو ٹکرائے فصیلوں سے پڑی بادِ خزاں — حفظ ہو تیرا جہاں میں گر حصارِ فصلِ گل

---

[1] یہ وہی شیو دھیان سنگھ ہیں جن کی مدح میں غالب نے بھی ایک فارسی قصیدہ لکھا ہے۔ آزاد اپنے والد عبداللہ بیگ خاں کی خدمات کا حوالہ دیا ہے۔ مطلع اور چند شعر یہ ہیں :

گر رہ آوردِ بہ شکلِ فرس بادِ بہار — تا شیو دھیان سنگھ بہادر شود سوار
باید شنید رازِ نا حیسانِ بارگاہ — باید شنفت قصۂ نیرانِ آں دیار
کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست — دمخاکِ راجگڑھ پدرم را بود مزار

طرحی غزلیں ۔ کسی شاعر کے کمال کا صحیح اندازہ کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اُس نے دوسرے اساتذہ کی زمینوں یا ہم طرح غزلوں میں کس حد تک دادِ سخن گوئی دی ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ کس پائے کا ہے۔ آزاد نے غالب، مومن، شیفتہ، عارف، ذوق وغیرہ کی غزلوں پر متعدد غزلیں کہی ہیں جو اگرچہ ان اساتذہ کے بہ مقابلہ پست ہیں۔ مگر بجائے خود کافی بلند مقام رکھتی ہیں۔ اشعارِ ذیل اس بات کے اندازے میں کچھ مدد دیں گے۔ کہ ہم طرح غزلوں کے بعض مشکل قافیے کس سہولت سے نظم ہوئے ہیں۔ اور بحیثیت مجموعی غزل کا کیا اندازہ ہے۔

فتنہ اُٹھے ہے کس طرح اُٹھ کے مجھے دکھا کہ یوں
حشر بپا ہو کس طرح چل کے مجھے بتا کہ یوں

نہ دے جو بوسہ گیسو نہ دے جواب تو دے — بلا سے جو نہ مجھے دینا ہو دے شتاب تو دے
اُٹھا ہے سب مزے کھانے میں یہ تو پہلے اول — مگر جزا ئے غم کا مجھے حساب تو دے
شراب روز تو ہم مانگتے نہیں ساقی — کوئی پیالہ دمِ ریزشِ سحاب تو دے
لیا ہے دین تو اس کے عوض میں دہ فروش — جو پانچ چار نہیں اک خُمِ شراب تو دے
میں نہ وحشت میں کبھی سوئے بیاباں نکلا — واں سے دل چپ مرا خانۂ ویراں نکلا

اپنے استاد زین العابدین خاں عارف کی موت پر جو مرثیہ کہا ہے اُس کی نہ صرف زمین بلکہ بہت سے مضامین بھی اُس مرثیے سے ماخوذ ہیں جو مومن نے اپنی معشوقہ "صورشیم" کے ماتم میں کہا ہے یہ موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مومن ۔
خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج
آغوشِ رشکِ حلقۂ اہلِ عزا ہے آج

آزاد
اے اہلِ دیدہ دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہے آج
میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج

مومن
تشبیہ آئینہ سے جو ہوتا تھا آب آب
مل جائے خاک میں وہ بدن واصیبتا

له اس غزل کا وزن شاعر کے تخلص (آزاد) سے ہم آہنگ نہ تھا لہٰذا آزاد نے اس میں اپنا تخلص ترکیبِ نظم کیا ہے جو الگ نثر کا مخفف ہے۔

آزاد
حیرت میں جس کو دیکھ کے رہ جائے آئینہ
آلودہ گرد میں وہ تنِ باصفا ہے آج

مومن
جس نازنین صنم پہ گراں تھا حریر چین
اُس کا غلافِ کعبہ کفن واصیبتا

آزاد
جس جسم پر کہ جامۂ گل روز بار تھا
وہ جسم کودہ گرد کے نیچے دبا ہے آج

عیوب ۔ اس قادر الکلامی کے باوجود جس کے نمونے اوپر درج ہوئے آزاد کے کلام میں کہیں کہیں معائبِ شعری بھی نظر آتے ہیں ۔ معائبِ شعر مسلم الثبوت اساتذہ کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر آزاد کے کلام میں بھی دو چار جگہ اسقام نظر آئیں تو اس بات سے اُس کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ اُس کے دیوان میں زبان اور محاورے کی غلطیاں نہیں پائی جاتیں۔ البتہ حروف کا وزن سے ساقط ہونا، تخفیف تشدید وغیرہ کے معاملے میں آزاد سے غلطیاں ہوئی ہیں جن کی مثالیں مندرج ذیل ہیں۔ حروف کا ساقط ہونا بالعموم وہاں واقع ہوا ہے جہاں کسی لفظ کا حرف اگلے لفظ کے حرفِ علت سے پہلے آیا ہے ۔ ایک غیر ملکی شخص اگر ہمارے حروفِ علت کے طول کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور ایک دو جگہ یہ غلطی کر جائے تو صرفِ نظر کرنا چاہئے :۔

حروف اور اضافت کا ساقط ہونا :۔

ع ۔ ہو کے خاکِ عالم میں تیرے کشتگاں بھرنے لگے۔
ع نابینا جسود ہو گئے شپرّ سے زیادہ
ع اقبال مطیع ہو ترا نوکر سے زیادہ
ع ہیں مضامیں کہ لآلیِ عماں

غلط لفظ :۔ ع اہلِ دنیا غریضِ مطلب ہیں۔
غلط ترکیب:۔ ع جوشِ زورمندی ہے عالم جوانی ہے۔

ان صفحات میں آزاد کے کلام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جس سے ہم یہ اندازہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بقول رام بابو سکسینہ یہ باکمال شاعر اردو کی تیسری صف میں "ایک ممتاز مقام کا مستحق ہے۔" کمالِ شاعری کے علاوہ بحیثیت انسان بھی آزاد کی ذات میں وہ جوہر نظر آتے ہیں جو انسانیت کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ وہ ریاستِ الور کی فوج میں عہدۂ کپتانی پر مامور تھا لیکن اپنے محدود ذرائع کے باوجود حد درجہ سیر چشم اور فیاض تھا۔ کبھی کبھی ایسا

بھی ہوا ہے کہ حاجت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اگر اُس کے پاس کچھ نہیں ہوا تو کسی سے قرض لے کر اُس کی حاجت روائی کر دی ہے۔ اُسے فنِ طب میں کافی دخل تھا لیکن اس فن کو جلبِ منفعت کے لئے نہیں بلکہ محض نفع رسانیِ خلق کے لئے اختیار کیا تھا۔ چناں چہ اکثر مریضوں کو مفت دوائیں دیتا تھا۔ یہ خوبی آزاد کے بڑے بھائی ٹامسن میں بھی تھی جو طبِ یونانی اور آیورویدک سے شغف رکھتا تھا۔

آزاد اگرچہ "غمِ روزگار" میں مبتلا رہا مگر اُس کی میر چشمی، دوست پروری اور مروّت میں کبھی فرق نہ آیا۔ وہ عین عالمِ شباب میں یعنی ۳۰ سال کی عمر میں کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر دُنیا سے اُٹھ گیا۔ لیکن اُس کا دیوان اور وہ خصائلِ عالیہ جو انسانیت کے لئے باعثِ شرف ہیں۔ اُس کی بقائے دوام کے ضامن ہیں۔

ہمارے کرم فرما (۱)

حضرت عرش! سلامت رہیں! ———— کیا کہنا؟ دل افزائی۔ قدردانی کوئی آپ سے کرنی سیکھے۔ پابندی سے آج کل آرہا ہے۔ نوازش نامہ اس حقیر کے نام اتنے آنے کہ تکئے کے دائیں بائیں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی جب اتنی کسی کی مدارات کی جائے تو کیوں نہ اُس کا دماغ پائے عرش تک پہنچ جائے۔ آج کل کا پہلا شمارہ میرے پاس آیا تھا اور پھر اُس کی آمد پلٹے کھاتی رہی۔ آپ نے جب سے نوازش فرمائی ہے، شکر ہے برابر پرچہ ملے جاتا ہے۔ میں نے اس کے سب دَور دیکھے ہیں۔ صاحب بہادر کے زمانے میں یہ حکومت کی ڈونڈی پیٹتا تھا اور ہر شخص پہلی نظر میں بھانپ لے کہ حکومت کے مصالح سب سے اوّل چیز ہیں۔ آپ نے تو اس کو خالص ادبی اور علمی بنا دیا۔ اللہ آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔

موسیقی نمبر۔ تو موسیقی پہ آپ کا احسان ہے۔ کہ وہ چیزیں ایک جگہ جمع کرا دیں کہ مستقبل میں یہ آپ کا شمارہ موسیقی پر کچھ لکھنے والے کے لئے حوالے اور سند کی چیز ہو جائے گا۔ میں انشاء اللہ آپ کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری ۱۸۵۷ء کے متعلق ایک مضمون روانہ کروں گا۔ جس کا عنوان "۵۷ کی کہانی بڑھے بڈھوں کی زبانی" ہوگا۔ یہ عنوان پچاس برس پرانا ہے، جب کہ میں نو دس برس کا فتنہ تھا۔ میں نے ان لوگوں سے جو اس جنگ کا ساکھا دیکھے ہوئے اور اس کی کھکوڑ اٹھا چکے تھے۔ ان سے سُن سُن کر انھیں کی زبان میں لکھے ہیں۔ "میرے بچپن کی دلّی" یہ طویل مضمون ہو جائے گا۔ اس کا کچھ ابتدائی حصہ ایک قسط میں جوش ۔۔۔ کے زمانے میں چھپ چکا ہے۔ یہ سلسلہ پانچ چھ قسطوں میں ختم ہوگا۔ اب آپ فرمائیں کہ آپ کو کن کن مہینوں کے پرچوں کے لئے مضمون چاہئے۔ کاہلی اتنی بڑھ گئی ہے کہ بس پڑے رہنے اور پڑھتے رہنے کے سوا ہاتھ ہلانے کو جی نہیں چاہتا یا پھر سونے کو جی چاہتا ہے۔ جو آنکھ لگ گئی تو جوانی کی نیند کا مزا آجاتا ہے۔ کہئے! حیدرآباد بھی آنے کا ارادہ ہے۔ آئیں تو میرے پاس ٹھیریں۔ آج کل موسم یہاں بڑے مزے کا ہو رہا ہے۔ آپ کے ہاں کے گلابی جاڑے ہیں۔ اور یہ یہاں کے کڑاکے کے جاڑے ہیں۔ برآمدے میں سوتا ہوں، ایک کشمیری دوشالہ اور نین سکھ کی چادر سردی بھگا دینے کو بہت ہے۔ پورا جاڑا برآمدے ہی میں گذر جاتا ہے۔ سال میں مشکل سے کوئی ڈیڑھ مہینہ باہر سویا جاتا ہے۔ آخر اپریل میں باہر نکلے اور جون کے پہلے ہفتے میں پھر برآمدہ آباد ہو گیا۔ یہاں کا بہترین موسم اگست کا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں آئیں تو جوبلی ہلز کا لطف اٹھائیں۔ گویا بیچ کے پہاڑ پہ آگئے یا کشمیر صاف لا ہو گیا اور برف کی الم حسن پر گھس گیا۔ میری چندن باڑی اور اس کی دونوں سہیلیاں چمپا اور جوہی کھلواڑیاں کر رہی ہیں کہیں مدارات نہ انڈیل دیں۔ چلتی قلم پر ٹوٹی پڑتی ہیں، یہ لکھنے نہ دیں گی۔ اللہ حافظ۔

۲۴۔ دسمبر ۵۵ء

بندۂ محبت آغا حیدر حسن مرزا

فاروق بانسپاری

طوائف کا گھر

ہمنشیں بس چل یہاں سے دل کی اب حالت ہے غیر — پڑ گئے تلووں میں چھالے ہو چکی جنت کی سیر
غور سے رنگِ سرابِ جلوۂ جانانہ دیکھ — میری آنکھیں لے کے یہ گلشن نما ویرانہ دیکھ
جوہرِ آئینہ جز حسنِ جلا کچھ بھی نہیں — یہ محل دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ بھی نہیں
ہچکیاں لیتی ہوئی محفل میں یہ طبلے کی تھاپ — جیسے رہ رہ کر لگائے قہقہہ دھرتی کا پاپ
اُف یہ سارنگی کی تانیں بزمِ محسوسات میں — چیختا ہو جیسے دوزخ پردۂ نغمات میں
گھنگھروؤں کی چھم چھما چھم رقص کی سرمستیاں — یہ فرازِ بام یہ عورت کی ذہنی پستیاں
حسن کا نیلام گھر یہ شاہراہِ عام پر — آہ یہ عصمت کے موتی کوڑیوں کے دام پر
ہوش آتا ہے مریضانِ ہوس کو دیر میں — کتنے گھر ویراں ہوئے ان بستیوں کے پھیر میں
شام کے سانچے میں صبحیں آ کے ڈھلتی ہیں یہاں — رات کی تاریکیاں سونا اگلتی ہیں یہاں
معصیت کی شاہزادی یہ کنیزِ اہرمن — جیسے پھولوں کا جہنم جیسے کانٹوں کا چمن
دشمنِ تسکینِ جاں غارت گرِ صبر و شکیب — ایک غم افزا حقیقت ایک دل خوش کن فریب
پیکرِ تحریر میں اک قصّۂ ناگفتنی — سیدھی سادی سی عبارت اور حرفوں کی بنی
اُف یہ آدم زاد بے پر کی پری، افسوں شعار — اپنے عامل کو جو خود دیتی ہے شیشے میں اُتار
یہ نظر افروز رخساروں کے بے صہبا ظروف — یہ خطِ گلزار کے پردوں میں کانٹوں کے حروف
آہ یہ شانوں پہ لہراتے ہوئے زلفوں کے ناگ — جن کے چلتے لٹ چکے ہیں کتنی بہنوں کے سہاگ
حشر زا انگڑائیاں، نیچی نظر، انفاس تیز — اُف یہ اذنِ پیش دستی اُف یہ مصنوعی گریز
دیکھ کر گاہک کی متوالی نگاہوں کا جھکاؤ — تن کا پیتل بیچتی ہے رات کو سونے کے بھاؤ
یہ جوانی کا چمن یہ حسنِ صورت کا نکھار — منحصر دو کاغذی پھولوں پہ ہے جس کی بہار
زر بکف مہماں کی جانب دل بکف بڑھتی ہے یہ — میزبانی کا لڑکپن سے سبق پڑھتی ہے یہ
خلوتِ غم کے اندھیرے میں اُجالا مل گیا — اس کی چاندی ہے جو کوئی سونے والا مل گیا
ہوش پر قبضہ جما کر زہر آگیں پیار سے — کاٹ لیتی ہے یہ جیبیں آنسوؤں کی دھار سے
آہ یہ فولاد سیرت نقرئی باہوں کا لوچ — سادہ لوحوں کو جو عیاری سے لیتا ہے دبوچ
اُف یہ بن بیاہی سہاگن، زندہ تن، مردہ ضمیر — معصیت کا جیسے رنگیں واہمہ صورت پذیر
اک نظر میں جیب کی تہہ تک پہونچ جاتی ہے یہ — مال کا اندازہ کر کے بھاؤ بتلاتی ہے یہ

گیت ساون کا نہیں ناداں یہ دیپک راگ ہے
ڈھل گیا جب آنکھ کا پانی تو عورت آگ ہے

ارشد کاکوی

شعر یا ترنّم

خدا خدا کرکے ادب میں رجعت پسندی اور ترقّی پسندی کی بےمعنی بحث و تکرار دھیمی پڑی تو "آج کل"[1] میں ایک صاحب نے دوسری پُرمعنی بحث چھیڑ دی۔ عبدالحیٔ خاں صاحب کا مقالہ یوں بھی خیال انگیز تھا۔ مُدیرِ آج کل نے مخالف و موافق خیالات کے مناظرانہ اظہار کی دعوت دے کر بادۂ خیال کو اور بھی دوآتشہ بنا دیا۔ خاں صاحب نے یہ کوئی نئی بحث یا کوئی نیا موضوع نہیں چھیڑا ہے ہاں اُن کی اس جسارت کی بابت اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھ دی۔

آج کل کے مشاعروں نے شاعری کے ساتھ ایک نئے فن کی بنیاد ڈال دی ہے اور وہ ہے مشاعرہ بازی جس کا شاعری سے تعلق بس اسی قدر ہے جس قدر سوتیلی ماں اور بیٹے کا تعلق۔ سب کچھ اور کچھ بھی نہیں۔ مشاعرہ بازی کے لئے اتنی شرط تو لازمی ہے کہ اس فن کا رسیا شاعر ہو یعنی وہ شعر کہتا ہو یا پھر یہ کہ اس کے پاس کچھ اشعار کا سرمایہ ہو۔ شاعری اور مشاعرہ بازی کا تعلق یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور ہی قسم کے "ریاض" درکار ہیں۔

غالبؔ نے ایک بار کہا تھا کہ "ورائے شاعری چیزے دگر ہست" "چیزے دگر" سے غالبؔ کا مفہوم کچھ اور ہوگا لیکن آج کل شاعری میں جو چیز "چیزے دگر" پیدا کرتی ہے وہ ترنّم ہے۔ میکشوں سے پوچھئے تو وہ اسی شراب کو دوآتشہ کہیں گے۔ جس میں ساقی کی نگاہ بھی گھلی ہوئی ہو اور مشاعرے کے سامعین اُسی کلام پر جان دیں گے۔ جس میں شاعر کے سُر تال کو بھی دخل ہو۔ بقول جوشؔ ؎

جب حاصلِ شاعری ترنّم ٹھہرے　　کیوں جا کے نہ دل پہ نیشِ کژدم ٹھہرے
اب تو ہے مشاعروں کے کھیتوں کا یہ حال　　جو "مسخرہ" "جَو" بوئے وہ گندم ٹھہرے

ترنّم سے نری قافیہ پیمائی بھی شاعری بن جاتی ہے۔ سکتہ رواں ہو جاتا ہے اور اگر ضرورت آن پڑے تو ایک ہی غزل میں رجز اور رمل دونوں کا اتحاد بھی ممکن ہے۔ ترنّم وہ کیمیا ہے جس سے ناقص شعر، مہمل شعر، غلط شعر بھی تیر و نشتر بلکہ توپ و تفنگ بن سکتا ہے۔

آج کل دل اُداس رہتا ہے
خدا جانے کس کے پاس رہتا ہے

آپ شاید مذکورہ بالا شعر کو کسی بزم میں سُناتا تو کجا دو چار لوگوں کے سامنے بھی سُنانے کی جرأت نہ کریں گے لیکن یہ شعر سینکڑوں اہلِ ذوق کی محفل میں سُنایا گیا اور بقول شخصے چھتیں پٹ گئیں۔

آج کل مشاعروں کا حال کم و بیش وہی ہے جو میوزک کانفرنسوں کا ہوتا ہے اور مشاعرے ہمارے تہذیبی ورثے کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں اور یہ صحبتیں محض آلۂ تفریح بنتی جا رہی ہیں اور "مشاعرہ پڑھنا" بذاتِ خود ایک فن بن گیا ہے۔ جو یقیناً شاعری سے کچھ کم "ریاض" نہیں چاہتا۔ اس سلسلے میں ایک مثال دیئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ فروری ۵۶ء میں ایک شہر کے اصحابِ ذوق نے ایک بزمِ مشاعرہ برپا کی۔ میں بھی گیا۔ کوئی آٹھ دس شعرا باہر سے بھی آئے تھے۔ سب کے سب تو نہیں دو چار ایسے تھے جن کا نام کسی اچھے یا بُرے رسالہ میں نہیں آیا۔ کوئی انھیں نہیں جانتا لیکن مشاعروں میں وہ

---

[1] مطبوعہ جون ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۱۵۔

بُلائے جاتے ہیں اور خاص طور پر مدعو کئے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مشاعرہ برپا کرنا بھی ایک فن ہے۔ اور پر اس فن کی کچھ "تکنیک" یہ حضرات جانتے ہیں کہ مشاعرہ کس طرح کامیاب ہوتا ہے۔ پبلک کے مذاق کی نبض یہ پہچانتے ہیں چناں چہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے شاعر لائے جاتے ہیں جن سے عوام مایوس نہ ہوں اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ میرا چندہ بے کار گیا۔ مشاعرہ جما نہیں ہاں تو مشاعرہ کے آغاز سے قبل تمام بیرونی شعرا جو سب ایک ہی ساتھ ٹھہرائے گئے تھے۔ باضابطہ مشاعرہ پڑھنے کی "ریہرسل" کرنے لگے، کون طرز ٹھیک ہے کس شعر کو پہلے اور کس شعر کو پیچھے پڑھا جائے۔ ہر شاعر وہی غزل پڑھتا جو خاص مشاعرے کے لئے تھی۔ غرض کہ کھنکھار کر۔ گلا صاف کرکے، لونگ کھاکر، پان مُنہ میں دباکر، نت نئے نسخوں کو آزماکر ایک چھا جانے والی دُھن مقرر کی گئی ــــــ ظاہر ہے کہ مشاعرہ کامیاب ہوا اور بہت کامیاب مشاعرے کے بعد دوسرے دن صبح مقامی حضرات شعرائے کرام کو دیکھنے تو نکلے، اور ان سے ملنے پہنچے۔ مجھے ایک صاحب کا ریمارک نہیں بھولتا مشاعرے کی کامیابی اور شاعروں کی تعریف میں اپنی بلند آہنگ ستائشوں کے بعد کہنے لگے کہ اب بانیانِ مشاعرہ کو چاہیئے کہ ہر سال اسی "ٹیم" کو بلایا جائے۔ یہ "ٹیم" ہر سال کی "ٹیم" سے اچھی ہے ــــــ گویا یہ شعرائے کرام فٹ بال کی ایک "ٹیم" تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مشاعروں کی اس روش سے شعر و ادب کی وقعت پبلک کی نظر میں کیا ہے۔ بانیانِ مشاعرہ پبلک کے ذوق کی اصلاح کرنے کی بجائے ان کے ذوق کی آسودگی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذاقِ عامّہ بلند ہونے کی بجائے گرتا جاتا ہے اور ہر کس و ناکس اُلٹے سیدھے مصرعے موزوں کرکے اور مناسب دُھن نکال کے شاعرِ غرّا بن جاتا ہے اور اس طرح وسیع پیمانے پر شعر و ادب کی نوحہ خوانی شروع ہو جاتی ہے۔

عبدالحئ خان صاحب سے مجھے یہ شکایت ضرور ہے کہ اُنھوں نے اپنے مختصر سے مقالہ میں کچھ ایسی باتوں کو بھی چھیڑ دیا ہے۔ جو اگر بالکل غیر ضروری نہ تھیں تو اتنا ضرور تھا کہ ان کے بغیر بھی وہ اپنے موضوع کا حق ادا کرسکتے تھے۔ شعر کا وزن، اس کا آہنگ اور شے ہے، ترنّم اور شے، پھر خان صاحب نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہر چند آزاد نظم اپنی طبعی موت مر چکی ہے، اس میں بھی ایک آہنگ، ایک موسیقی تھی ــ اس میں شک نہیں کہ آزاد نظم کے رسیا زیادہ تر بطور فیشن ایسی نظمیں لکھتے تھے جن کے دام میں عنقائے معنی کبھی نہیں پھنسا۔ آزاد نظم کے عاشقوں ہی نے اردو میں آزاد نظموں کی مٹّی پلید کی، اگر اس صنف کو سلیقہ سے اپنانے کی کوشش کی جاتی تو شاید تراشیدم، پرستیدم، شکستم کے سارے مرحلے اس قدر جلد طے نہ پا جاتے۔ بہرکیف یہاں گفتگو اس موضوع پر ہے کہ شعر برائے شعر ہو یا شعر برائے ترنم، شعر اور آزاد نظم، وزن، اور آہنگ کی باتیں یہاں غیر متعلق سی ہیں۔

اس باب میں دو رائیں کا امکان نہیں کہ آج کل وہی شاعر کامیاب ہے اور مشاعروں میں چھا سکتا ہے جو ترنّم بلکہ گلے بازی کے فن سے آشنا ہو۔ لیکن یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اس دور کا ایک بہت بڑا نظم گو شاعر جوشؔ اور ایک بہت بڑا غزل گو شاعر فراقؔ گلے باز نہیں گلے بازی اُن شعرا کے لئے تو اُن کا سہارا ہے جن کے پاس اور کچھ نہ ہو لیکن عوام کی بلا جانے کہ "اور کچھ" کیا بلا ہے؟

لیکن اس باب میں افراط و تفریط سے کام لینا نا روا ہے۔ ترنّم اور گلے بازی کے فرق کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ کچھ شاعر آپ کو ایسے ملیں گے جو صرف ترنّم ہی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اگر آپ اُن کے کلام میں خود اُن کے احساسات کا اُتار چڑھاؤ دیکھنا چاہتے ہیں تو ناممکن ہے کہ وہ بغیر ترنّم کے پڑھیں اور آپ اسے دیکھ سکیں۔ اس سلسلے میں ایک مثال ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ہے۔ جس قدر ان کے کلام میں اثر آفرینی ہے اسی قدر وہ اپنا کلام پڑھتے وقت مجسم تاثیر نظر آتے ہیں۔ ترنّم ہو یا تحت اللفظ دیکھنا یہ ہوگا کہ پڑھنے کا یہ طرز شاعر کا اپنا ہے یا کرائے کا۔ ترنّم سے پڑھنا بُرا نہیں لیکن ترنّم کو شاعری کا سہارا بنانا غلط ہے۔ کچھ دنوں کی بات ہے ایک جگہ مشاعرے کا اہتمام تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میوزک کانفرنس بھی۔ ایک ہی نشست میں۔ اس مشاعرے کی خبر سُن کر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مجھے لکھا:۔

"چاٹگام میں جو مشاعرہ ہونے والا ہے اس کی تفصیل اخبار میں دیکھی شعرا کو مبارک ہو کہ اُن کا درجہ اب گانے ناچنے والوں کے برابر قرار دیا گیا ہے اور اب تک جو کام گانے ناچنے والوں سے لیا جاتا تھا اب شعرا سے بھی لیا جانے لگا!

واضح ہو کہ یہ الفاظ اس شاعر کے ہیں جو خود ترنّم اور بے پناہ ترنّم

سے اپنا کلام پڑھتا ہے۔ اس تفصیل سے میرا مقصد یہ تھا کہ ترنم ہو یا تحت اللفظ پڑھنے والے کی آواز اور شعر کی اندرونی آواز میں ہم آہنگی ہونی چاہیئے۔ عبدالحئی خاں صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ شاعر کو کون سا لہجہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ترنم کی کس روایت کو زندہ کرنا چاہیئے گدھے کے بول سے قلمستان تک کے سلسلے میں کس سے نسبت قائم کرنا چاہیئے ——— یہ سوال ہی غلط ہے۔ یہاں "چاہیئے" کا کیا محل ہے۔ ہاں اس سوال کا جواب البتہ خاں صاحب نے مہیا دیا ہے کہ لہجہ وہ ہو جو آواز کے اعتدال پر مبنی ہو، جو فلمی گانوں کی نقالی سے مبرا ہو، یا اس میں کم و بیش وہی گنگناہٹ، وہی نغمگی اور وہی لہجہ ہو جو شعر کہتے وقت شاعر نے اختیار کیا تھا۔ ترنم کی آویزش دودھ میں شکر کی مقدار سے ہو۔

لیکن رونا اس کا ہے کہ آج کل دودھ میں شکر نہیں ڈالی جاتی بلکہ شکر میں دودھ ملایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شعر شعر کم ہوتا ہے، ترنم زیادہ۔ اب تو یہ ہے کہ "ادب کا شاعر" اور "مشاعرے کا شاعر" ——— یہ دو مختلف حیثیتیں ہیں۔ جوش و فراق کا نام عوام کو مرعوب کرتا ہے۔ وہ مشاعروں میں یک سوئی کے ساتھ جوش و فراق کو سن لیتے ہیں تو بانیانِ مشاعرہ پر احسان کرتے ہیں اور یہ سوچ کر سن لیتے ہیں کہ ضرور ان کے کلام میں عظمت ہوگی لیکن مشاعرے کی تان انھیں شعرا پر ٹوٹتی ہے اور عوام کو وہی شعر شہید کرتے ہیں جو شعر پڑھتے نہیں شعر گاتے ہیں۔

ایک روشن مثال

کوئی گیارہ برس پہلے کی بات ہے کہ ملیالم زبان کے کچھ مصنفوں نے اپنے آپ کو ناشروں کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لئے سوچ بچار کر کے ایک کوآپریٹیو سوسائٹی قائم کی۔ ۱۲ ممبروں نے دس دس روپے فی کس کے حساب سے ایک سو بیس روپے ادا شدہ سرمایہ مہیا کیا۔ آج اس سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ۲۰۰ ہے اور اس کا ادا شدہ سرمایہ ۱۲۱۱۴۵ روپے ہے۔

یہ سوسائٹی جس کا نام ساہتیہ پرورتھکا کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ اپنے ممبروں کی کتابوں کی اشاعت و فروخت کا انتظام کرتی ہے مصنفوں کو ۳۰ فی صدی رائلٹی دی جاتی ہے جب کہ عام شرح ۱۲½ فی صدی سے ۲۵ فی صدی تک ہے۔ دوسرے ناشر یہ چاہتے ہیں کہ کتاب کا کاپی رائٹ اونے پونے دام پر مل جائے۔ سوسائٹی عام طور پر کاپی رائٹ نہیں خریدتی۔ ۵۷-۱۹۵۸ء کے دوران میں سوسائٹی نے ۴۷ کتابیں شائع کیں، اور اپنے ممبروں کو ۸۸۸۴۸-۱۲ روپے رائلٹی ادا کیا۔ اس کے علاوہ ممبروں کو ہر سال ڈیویڈنڈ بھی دیا جاتا ہے اور فاضل رقم ریزرو فنڈ اور دیگر فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے۔

سوسائٹی کے بکری کے شعبے کا نام نیشنل بک اسٹال ہے۔ جس میں ممبروں کے علاوہ دوسرے مصنفوں کی تصنیفات بھی فروخت ہوتی ہیں۔ سوسائٹی کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کو بھی بطور ممبر قبول کرتی ہے۔ اور اس طرح تعلیمی ادارے اور کتب خانے سوسائٹی کے منافع میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ۵۷-۱۹۵۸ء کے دوران میں نیشنل بک اسٹال نے تین لاکھ ستر ہزار روپے کی کتابیں فروخت کیں۔

سوسائٹی ملیالم میں دیگر دیسی اور بدیسی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے بھی شائع کرتی ہے۔ ابھی تک سوسائٹی ٹالسٹائے، گورکی، ترجنیف، موپساں، دکٹر ہیوگو، پشکن، ڈیوما، چیخوف، گالزوردی، سوفوکلیس وغیرہ کے شاہکاروں کے ملیالم ترجمے شائع کر چکی ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کتابوں کے ملیالم ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ملیالم پبلک، سرت چندر چیٹرجی، پریم چند، بنکم چندر، خواجہ احمد عباس، کھانڈیکر، ملک راج آنند، ٹیگور، گاندھی اور تلک کی تحریروں سے بخوبی روشناس ہو چکی ہے۔

یہ سوسائٹی ہر سال ملیالم میں شائع ہونے والی دو بہترین کتابوں کے مصنفوں کو ڈھائی سو روپے اور سو روپے کے انعامات دیتی ہے۔ علاوہ ازیں سوسائٹی اسکول کے نادار بچوں کو مفت کتابیں تقسیم کرتی ہے۔ ایک سال سوسائٹی نے "بالا پندم" نامی کتاب کی ۳۰۰۰ کاپیاں مفت تقسیم کیں۔

کاش کہ اردو مصنفین بھی اسی قسم کی اولوالعزمی اور جذبۂ تعاون کا مظاہرہ کر سکتے۔

عبدالحیٔ خاں سیوہاروی

اِنسان یا شاعِر

انسانیت زیورِ تمدّن سے آراستہ ہوئی تو انسانوں میں نیک و بد کی تمیز بھی پیدا ہوئی۔ اخلاقی تصوّر کو فروغ ہوا تو برہنگی اور وحشت کو حیا اور شرافت کا پیراہن عطا ہوا لطیف جذبات کی قدردانی کی فضا تیار ہوئی تو انسان کے تخیل میں چاند تاروں کی جگمگاہٹ شامل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مختلف فنون کی پرورش ہوئی تو افراد بھی کئی حصّوں میں بٹ گئے شعراء حکماء اور علماء کی قطاریں بنیں، فوجوں اور سپہ سالاروں کی سج دھج ہوئی اور پھر وہ سادہ اور بے رنگ انسان، شاعر، ادیب، صوفی، شہنشاہ، وزیر، سپاہی رعایا سب کچھ بن گیا۔ یہ عظیم انسانی انقلاب چند ساعتوں کا نہیں ہزاروں صدیوں کا ہے۔ اور اس انقلاب کے جلو میں انسان کی زبردست اخلاقی اور علمی قوتیں کارفرما تھیں جنھوں نے پہاڑوں کو توڑ کر میدانوں کو سرسبزی بخشی اور کائنات کے ہر ذرّہ کی طبعی قوتوں کا انکشاف کیا۔ انسانی ترقّی کی اس ہلچل میں اگر تاریخ ماضی کے وحشیانہ افعال سے شرمسار ہوئی اور فلسفہ نے قوتِ فکر کو غاروں اور گپھاؤں سے دور بہت دور تمام کائنات میں پھیلا دیا تو ادب، شاعری، موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ نے منتشر جذبات کو یکجا کر کے فطرت اور قوانینِ فطرت کے احترام کے آداب سکھائے، اخلاقیات کا درس دیا، رزم کا ولولہ دیا، بزم کا حوصلہ پیدا کیا اور تمدّن اور معاشرت کو نکھار کر وحشت کو انسانیت عطا کی۔ اس طرح شاعر بزمِ انسانیت کا وہ چراغ بنا جس کی بڑھتی ہوئی لَو انسانی ارتقا کی مظہر بن گئی۔ شاعر نے مفکّر اور فیلسوف کا روپ دھار کر انسانی قدروں پر فکر و فلسفہ کی تجلیوں کا غلاف چڑھایا یا اولوالعزم سپاہی بن کر انسانیت کی مخالف قوتوں سے برسرِپیکار ہوا یا معلّمِ اخلاق بن کر "نیکی اور امن" کا چرچا کیا۔ زندگی کی توانا قدروں کو فروغ ہوا تو شاعر کی شاعری از خود بدل کر زندگی بن گئی۔ قدامت کو زوال ہوا تو شاعری قدامت دشمن بن گئی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ شاعری اور ادب کے خالق شاعر اور ادیب بھی انسان تھے عام انسانی ذہنوں کی طرح اُن کے ذہن پر بھی صدیوں کی تہذیبی رفتار کے نقش تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح شاعر بھی اُن تمام حیوانی افعال اور احساسات سے ہم آہنگ تھا جن کی بنا پر انسان اور درندے کی تمیز ہوئی۔ اور ٹھیک اسی طرح شاعر اُن تمام سماجی آداب، اخلاقی بندشوں اور اقتصادی و معاشیاتی اصولوں کا پابند تھا جن کی بنا پر ایک خوشحال اور توانا معاشرہ کی مثال قائم ہوتی تھی۔

شعراء کے تذکرے اور سوانح عمریاں ایسے وضعدار، سعادت مند اور انسان شعراء کا پتہ دیتے ہیں۔ جن کو نہ تو سڑکوں پر آوارگی نصیب تھی اور نہ گھر میں منتشر مزاجی جو فی زمانہ شاعر کی عظیم ہستی کا غالب جزو ہیں وہ زندگی کی تگ و دو میں اور عمل کی راہوں میں اُتنے ہی جانبازانہ اور مجاہد تھے۔ جتنا کہ اُن کی شاعری تیز تر اور ولولہ انگیز تھی اُن کے اقتصادی اور معاشی مسائل اس قدر منحوس حد تک مکروہ نہ تھے جتنے کہ آج ہیں یہاں تک کہ مہذّب یونان کے وہ بدقسمت صنّاع اپنے شاہکار کی کوئی مادّی قیمت نہ سمجھتے تھے جن کو دو وقت کی روٹی نصیب نہ تھی۔ عربوں کے یہاں مال و دولت کی تنگی تھی ہی مگر وہ بدنصیب شاعر تو اور بھی زیادہ پریشان حال تھے جو ایک وقت کے فاقہ کو عنوان بنا کر سینکڑوں اشعار پر مشتمل دردمند نظم کی تخلیق کرتے تھے۔ مگر یونان و عرب میں نہ تو کوئی شاعر ایسا ہوا کہ کسی جذبۂ خاص کی بنا پر خود فراموشی کے عالم میں سڑکوں اور بازاروں میں رسوا ہوتا پھرے اور شاید کوئی ایسا شاعر گندا ہو جو سماج کا ذلیل اور گندہ فرد تصوّر کیا گیا ہو۔

ہمارے شاعرانہ مزاج کی سب سے بڑی ذلّت اُس دن ہوئی جب حصولِ جاہ و ملکیت کی خاطر ذوقِ شاعری کو قصیدوں پر قربان کیا گیا۔ جب کہ دربار اور ایوان کی سطوتوں کے سامنے شاعری کا مینار سرنگوں ہوا اور اشرفیوں اور موتیوں کی لالچ میں "شاہ نامے" کے اشعار کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔

شاعر کی خودداری فنا ہو گئی اور قصر شاعری مسمار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ شاعر ٹکے ٹکے میں بازار بکنے لگا۔ اب نہ تو اُسے اس کا خیال رہا کہ اُس کی ٹوپی ترچھی اور مرزئی ڈھیلی ہے اور نہ یہ احساس رہا کہ اُس کے پاجامے کے دھبّوں پر انسانی وضع داری رو رہی ہے۔ وہ بے حس ہو کر سڑکوں اور بازاروں میں گھوما، اقتصادی بحران کے ہنگاموں کو اشعار میں جھگڑ کر امراء اور روساء کی مجلسوں میں پھونکتا رہا۔ شراب اور افیون کے نشوں سے غم غلط کر کے اپنے بال بچوں اور گھر کو بھی بھول گیا۔ واہ واہ کا متلاشی وظیفہ خوار، قرض خور اور کام چور بن گیا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ملوکیت اور طاغوتیت کی دو مخالف قوتوں کے درمیان ہمارا شاعر اپنا اخلاقی وزن اور تہذیبی مقام نہ تلاش کر سکا اور اپنی عمرِ عزیز کی تمام ساعتوں میں شہرت اور خیرات کی دریوزہ گری کے ڈھنگ سیکھتا رہا۔ منظّم اور باقاعدہ سماجی زندگی سے گریز کرتا رہا۔ اپنی جذباتیت اور رقّت پسندی کی بنا پر محبوب کے خال کی حیا آلود سُرخی تلاش کر کے اپنا عمامہ سُرخ کرتا رہا۔ اپنے بچوں کی تکلیف وہ زندگی کو نظرانداز کر کے اپنے دل کا درد سناتا رہا۔

ایسا کیوں ہوا؟ کیا سماجیات اور اخلاقیات کا معلّم بے راہ روی، بے اصولی اور وحشت کے مدرسہ کا متعلّم تھا؟ کیا یہ شخص "شاعر" کسی انسانوں کی دُنیا کا فرد ہے؟ ان سوالات کا جواب کافی مشکل ہے۔ ہماری تہذیبی گاڑی جن اقتصادی پٹڑیوں پر صدیوں سے لڑھکتی رہی اُن میں ناہمواری اور کجروی کی بنا پر ہر ہر قدم پہ اندیشے اور خطرے تھے۔ ان اندیشوں کا احساس ہر دور میں ہوتا رہا۔ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر دُنیا ان خطرات سے دوچار ہوتی رہی۔ رنگ و نسل اور قبیلہ اور فرقہ کے اعتبار سے جہاں سروں پر تاج پہنائے گئے اُسی کے ساتھ پس ماندہ طبقوں میں حرص و ہوس کے شعلے نمودار ہوئے۔ اجتماعی تنظیم تو تقریباً ناممکن تھی، انفرادی ارادوں نے برسرِاقتدار قوت سے زندگی کی بھیک مانگی، اخلاقی قدروں کا انحطاط ہوا اور علوم و فنون نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ شعراء شاہی تقریبوں کی زینت بن گئے۔ جنگوں کی کامیابی شاعری کی زبان میں قصیدہ بن گئی اور ملکوں اور قوموں کی شکست "مرثیہ" کا بہانہ بنی۔ شعراء خود بینی اور خودداری کی قبا سے بے نیاز ہو کر تخیّل کے فریب میں دامن تار تار کرتے رہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عام انسان اور شاعر ان کے درمیان تخیّل آفرینی اور خلوت نشینی کی فصیلیں حائل ہو گئیں۔ سماج سے بے تعلقی، شعراء کے کردار کو کھوکھلا اور اُن کے ذہن کو شرمندہ کرتی رہی۔ وہ انسانوں کی آبادی سے دور دشت و صحرا کے غاروں میں سے اُلجھے اور اُلجھتے گئے۔ حتیٰ کہ اُن کو "بیاباں" میں "گھر کی بہار" کی یاد بھی علیحدہ نہ کر سکی۔

لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب اقتصادی اور معاشی جنجال نے انسان کو پریشان حالی اور بے اطمینانی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تھا اور کسی بھی اجتماعی شعور کے فقدان نے عقل و دانش کے ہر چراغ کو انسانوں اور حاکموں سے دُور پہاڑ اور پربت کے غاروں میں چھپا رکھا تھا۔ اُس وقت تو انسان بے چارگی پر مجبور تھا اور ہر کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی فکر کی چنگاریوں سے اُس دنیا کی تمام تاریکی میں حیرت و استعجاب پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اُس وقت تو علمی تحقیقات اور دانشمندانہ موشگافی کو حسن لینا ہی عجیب بات تھی۔ چناں چہ اُس وقت اس کی قید تھی کہ اخلاق اور ادب کے معاملے میں ہر وہ شخص بڑا عالم ہے جو بڑا سماج دشمن اور شاہ دوست ہے سماج دشمنی اور شاہ دوستی کی آزمائش اُس زمانے کے دانشوروں کے لئے قدم قدم پر موجود تھی۔ کبھی اُن کے لباس کی وضع و قطع وہی ہوتی جو دربارِ شاہی کی منشاء کے مطابق ہوتی اور کبھی اُن کی طرزِ گفتگو بالکل وہی نقل ہوتی جو دوسرے درباریوں کو تربیت کے طور پر ملی تھی۔ یہاں تک کہ عالمانہ بحثوں میں وہ اندازِ گفتگو ملحوظ ہوتا جو شاہِ وقت کو مرغوب ہوتا۔ اس شاہ دوستی، سماج دشمنی، عوامی بے تعلقی اور ذہنی پراگندگی نے اُس وقت کے دانشمندوں کو یا تو دیوانِ خاص کی دیواروں سے چپکائے رکھا یا پھر وحشت و بیابان کی وسعتوں میں ملک بدر کر دیا۔ ایسے دانشمند جن میں شاعر، صوفی، ملّا، فیلسوف اور حکیم سبھی طرح کی شخصیتیں ہوتیں جب کبھی بھولے سے آبادی کی طرف لوٹتے تو اُن کے چہرے مہرے، پوشش اور گفتگو سے یا تو یہ گمان ہوتا کہ یہ شہنشاہِ وقت کے وارث ہیں کیوں کہ اُن کے خوبصورت عمامے اور خوش نما پاجامے کے رنگ و روغن اس کی چغلی کھاتے یا یہ کہ وہ اُس دور کے انتہائی مصیبت زدہ، پریشاں حال اور بدنصیب لوگ ہیں، جن کو مہینوں سے کوئی صاف کپڑا نہ ملا، کئی دنوں سے پیٹ بھر روٹی نہ ملی اور وہ اس امر سے واقف ہی نہیں کہ اسی دنیا میں حاتم نام کی کوئی سماجی اہمیت ہے۔ گویا دانشوروں کے یہی دو طبقے تھے اور اُن کے سماجی اوصاف یہی دو تھے۔ یا تاقم و کم خواب یا فقط چیتھڑے۔ مجھے یقین ہے کہ دانشمندوں اور حکیموں کے ہر دو گروہ ناگزیر تھے۔ اُس دور کے

اقتصادی اسباب و حالات کے اعتبار سے اُن کی فضیلت کا میزان انھیں اقدار سے ہونا چاہیئے جو مروّج تھے۔ سماجی اقدار کے ساتھ نیک و بد کا معیار بھی بدلتا ہے، ایسے اشعار، ادب پارے، فلسفیانہ نکتے اور علمی رموز جو آج ردّی کی ٹوکری کا سرمایہ بنتے ہیں کل تک وہی باعثِ فخر اور عین منشائے علم و فن تھے۔ کل تک ہم جسے جنسِ گراں سمجھتے تھے وہ آج جنسِ رائیگاں کی طرح بے قیمت ہے۔

لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ اجتماعی شعور میں شدّت کی زہرناکی پیدا ہو چکی ہے۔ شاہی مجالس کے آداب بدل گئے ہیں اور علم و فن کی راہیں از سرِ نو منتخب ہو رہی ہیں۔ اخلاق و شرافت کا معیار بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ آج کے دانش مند کو غاروں اور محلوں میں بیٹھنے کی بجائے سڑکوں، بازاروں اور گاؤں میں پھرنا ہے۔ طور طریق، لباس گفتگو اور برتاؤ میں ہر دانش مند فیلسوف، شاعر اور صوفی کو وہی اور بالکل وہی بننا ہے جو ایک عام انسان کا خاصہ ہے اُسے نہ تو حال و قال کی مستیوں میں پگڑی اچھالنا ہے اور نہ جذب و اثر کے کیف سے چیتھڑوں کو چپکا کر منزلِ شوق کی رہ نوردی کرنا ہے۔ کیوں کہ انسانیت ان بلاؤں سے آزاد ہو کر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس عظیم قافلہ کے چلنے والے سارے انسان ایک ہی انسانی قبیلہ کے افراد ہیں۔ پگڑی اور چیتھڑے کی تفریق مٹ چکی ہے۔

پچھلے پچیس برس سے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں نو آبادیاتی نظام آخری سسکیاں لے رہا ہے اور قومی اور بین الاقوامی خیالات کا کھُلم کھُلا پرچار ہو رہا ہے۔ لیکن اس حیرت انگیز تبدیلی میں مجھے جو چیز زیادہ دل چسپ نظر آئی ہے وہ ہمارے دانش مند طبقے کا وہ اخلاقی اور عملی سرمایہ ہے جو اگر اُن کی نجی اور انفرادی زندگی کے معیار پر تولا جائے تو صفر کے برابر ہے۔ اردو ایک کم مایہ زبان سہی مگر اس کے بولنے والے دُنیا کے ہر گوشے میں ملتے ہیں۔ اسی زبان کا ایک نمایاں طبقہ شعرائے کرام کا ہے۔ جن کی بلند پایہ نظموں اور اعلیٰ تخلیقوں نے مغربی مصنفین اور دانشوروں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے اسی زبان کے شعراء کا ذکر کر رہا ہوں۔ چوٹی کے شعراء سے لے کر تیسرے درجے کے پست گویوں کی طول طویل قطار کی علمی اور فنّی فضیلتوں کو اُن کے دیوانوں اور مجموعوں میں بند کر کے اُن کی صورت، ہیئت، وضع، قطع، پوشاک اور برتاؤ پر غور فرمائیے، بڑی آسانی سے شناخت ہوگی کہ یہ حضرت شاعر ہیں۔ لکھنؤ، دہلی، آگرہ میرٹھ، پٹنہ، فیض آباد، رام پور، حیدرآباد، بھوپال وغیرہ اپنی "شاعرانہ" خوبیوں کی بنا پر کافی مشہور ہیں۔ ممکن ہے اِن کی وہ علمی حیثیتیں ختم ہو چکی ہیں جو کسی زمانہ میں انھیں حاصل تھیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شعراء کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، اردو کی اشاعت ہو رہی ہے، اور ہر شاعر کے کلام کا "صحیفہ" بڑی خاصی تعداد میں چھپتا، بکتا ہے۔ چناں چہ شاعر کی صورت بھی بآسانی نظر آتی ہے اور اُس کی سیرت کا تماشا بھی اِنھیں شہروں میں بڑی دھوم سے ہوتا ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ابھی تک ہم اُن محترم شعراء اور ادبا کی کوئی قیمت ادا نہیں کرتے جن کے خیالات و نگارشات کی اشاعت ملک و قوم کے ذہنی رحجان کو بدلنے اور صحیح رُخ متعین کرنے کے حق میں ہماری معاونت کرتی ہے لیکن اس سے زیادہ بدنصیبی یہ ہے کہ انھیں محترم اور غیر محترم شعراء اور ادبا کی نجی اور انفرادی زندگی اس قدر تاریک ہے کہ اُن کے 'اہلِ وطن' اُن کی زندگی سے مایوس و پریشان ہو چکے ہیں۔ اُن کے گندے لباس، انتہائی داغ دار پاجامے، کیچڑ سے لت پت جوتے اور بڑھی ہوئی سیاہ اعتدالیاں حد درجہ افسوس ناک ہو چکی ہیں، زیادہ تر ایسے ہیں جن کو نہ تو محلہ سے غرض ہے اور نہ محلہ والوں سے، بہتیرے ایسے ہیں جن کا مشغلہ "پان کھانا اور گنگنانا" کے علاوہ کچھ بھی نہیں، باپ، ماں، بھائی، بہن اور بیوی، بچوں کے بھرے پُرے خاندان کا وہ معزز اور محترم فرد جسے ہم شاعر کہتے ہیں یا ادیب کہہ کر پکارتے ہیں اِن خونی رشتوں کے احساس سے خالی ہوتا ہے اور اُسے اِس سے ذرا بھی تشویش نہیں ہوتی کہ شراب، سگرٹ اور دوسرے اسبابِ زندگی جب اُس کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں تو دوسرے افرادِ خاندان دو وقت کی روٹی سے محروم کیوں ہیں؟

نظموں اور مضامین کے آئینوں میں جس شاعر یا ادیب کا حسین چہرہ نظر آتا ہے کیا وہ اس قدر بھیانک ہو سکتا ہے؟

میں یہ جملے لکھ رہا ہوں اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ واقعی وہ دن بہت ہی منحوس رہا ہوگا جس دن ہماری شاعری "مصلح" اور "واعظ دشمنی" پر کمر بستہ ہوئی۔ اور ہم نے شاعرانہ ترنگ میں یہ سمجھ لیا کہ دنیا کا ہر وہ فعل جسے دوسرے لوگ اخلاق و آداب کے عنوان سے برتتے آئے ہیں واقعی کسی مصلح یا واعظ کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ مصلح اور واعظ کے خلاف غیظ و غضب کی باتیں کرنا تحقیقی بنیادوں پر جہالت کے دَور کی یادگار ہیں جن کو اس بنا

یہ تو معاف کیا جا سکتا ہے کہ مصلح اور واعظ اب ہماری ہزاروں سال پرانی شاعری کی روایات کی روح میں داخل ہو چکے ہیں اور اُن کی "ریشِ دراز" کے سایہ کی شفقت ہماری "شعریات" کی بہجت افزائی کرتی رہے گی لیکن سماج کے ضبط و آئین اور امن و سلامتی کی بنیادوں پر ہم سے اس احساس کو چھینا جا سکتا ہے۔ کہ مصلح، واعظ یا دوسرے اخلاقی قیود ہیچ پیچ ہمارے شاعر کی شخصیت کی زد میں آ سکتے ہیں اگر اجتماعی شعور پر ایمان ہے تو اجتماعی قوانین کو نظر انداز نہ فرمایئے ورنہ وہ عظیم روحانی ذمہ داری جو آپ پر انسانی تنظیم اور معاشرہ کی جانب سے لازم ہے ادا نہ ہو سکے گی۔ سماج کا ہر فرد آپ کے آداب و اطوار کی مثال پر اُس اخلاقی اور عملی تانا شاہیت کا شکار ہو گا۔ جس کی بجلی آپ کے نشیمن پر ٹوٹ رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معاشی اور اقتصادی الجھنیں قرونِ اولیٰ میں اُتنی شدید نہیں تھیں جتنی آج کل ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلے شعراء، ادبا اور فنونِ لطیفہ کے ماہر سماج کے مروجہ صنعتی اور حرفتی علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے اور اُن کو اُن معاشی بے چینیوں کا شکوہ نہیں تھا۔ جو آج کے شاعر کے پیشِ نظر بتائی جاتی ہیں۔ لیکن اس وقت شاعر یا ادیب اس قدر بے عملی کا شکار بھی نہ تھا۔ آج تو صنعتی اداروں، کارخانوں اور دفاتر میں ایسے لوگوں کی اور زیادہ ضرورت ہے جو خلوص اور ایمان کے ساتھ اُن احساسات کی ترجمانی کر سکیں جو ہزاروں برس سے انسان کے دل میں محفوظ ہیں اور جن کے اظہار کا صحیح اور مناسب وقت آ گیا ہے۔ تاکہ انسانوں کے مختلف طبقے ایک دوسرے سے روشناس اور ہم آہنگ ہو کر اس عظیم تہذیبی منصوبے کی تشکیل کر سکیں جس کی مضبوط اور توانا بنیادوں پر کسی بلند پایہ آفاقی شاعری کا تاج محل کھڑا ہوتا ہے یا کسی غیر فانی ادب پارے کا شاہکار تربیت پاتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ شاعر اپنے مجذوبانہ لباس اور بیگانہ روی سے باز آئے اور انسان دوستی کے بلند دعووں کے ساتھ خود بھی مہذب اور شریف انسان بن کر ہماری سماجی زندگی کا ایک ذمہ دار فرد بن جائے ورنہ ممکن ہے کہ قول کو عمل کی میزان پر تولنے والے ناہنجار بنئے ہمارے شعراء کی عظیم ہستیوں کو سستے داموں بیچ بیچ کر ہماری رہی سہی علمی دولت کو پامال کر دیں اور ہم یہ بھول جائیں کہ اگلے وقتوں میں "بانکے، ٹیڑھے، ترچھے" تیکھوں کا امام کوئی وہ شخص تھا جس کی رنگین بیانی اور مضمون آفرینی کو سمندر کی لہروں، فطرت کی رنگینیوں اور کائنات کے ذروں سے خراج ملتا تھا اور جو اسی دنیا کے بسنے والوں پر عقیدت اور محبت کے راگ کا جادو جگا کر ساری دنیا کے اقلیمِ محبت کا حکمران اور بادشاہ تھا۔

آج کل دہلی

ہندوستان میں نمک کی صورت حال

۱۔ ہندوستان سینکڑوں سال میں پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں نمک کے بارے میں خود کفیل ہوا تھا۔ ۱۹۵۳ء سے ملک میں نمک درآمد کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اگرچہ اگست ۱۹۵۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تجارتی معاہدہ میں کان کا دس لاکھ من نمک درآمد کرنے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ لیکن درحقیقت پاکستان سے ہندوستان میں نمک درآمد نہیں کیا گیا۔

۲۔ اگرچہ نمک کی صنعت میں سرمایہ لگانے کے لئے تقریباً ۳٫۰۰ کروڑ روپے کی مجموعی رقم منظور کی گئی تھی۔ تاہم اس میں سے ۱٫۰۷ کروڑ روپے کی رقم پبلک سیکٹر میں اور ۲٫۲۳ کروڑ روپے کی رقم پرائیویٹ سیکٹر میں لگی ہوئی ہے

۳۔ ۱۹۵۵ء میں نمک کے کارخانوں میں محنت کشوں کی یومیہ تعداد تقریباً ۲۹۳۰۰ ہے اس میں نمک کے سرکاری کارخانوں میں محنت کشوں کی تعداد ۳۵۳۰ اور پرائیویٹ فیکٹریوں میں ۲۵۷۰۰ تھی۔ علاوہ ازیں نمک کے غیر لائسنس دار کارخانوں میں محنت کشوں کی یومیہ تعداد تقریباً دس ہزار رہی

۴۔ ۱۹۵۶ء میں ۸٫۰۶ کروڑ من نمک کی انتہائی پیداوار حاصل ہوئی جو پہلے پانچ سالہ پلان کے تحت ۸٫۳۰ کروڑ من کے متوقع نشانے سے زائد تھی۔ ۱۹۵۷ء میں اس پیداوار میں مزید ترقی ہوئی جو ۱۹۵۶ء کی پیداوار سے تقریباً دس فی صدی زائد رہی۔

۵۔ دوسرے پنج سالہ پلان میں صنعت کاری کے سریع پروگرام کی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے ۱۹۶۱ء کے لئے نمک کی پیداوار کا نشانہ دس کروڑ من مقرر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس دوران میں کیمیاوی اور متعلقہ صنعتوں میں نمک کی کھپت بہت زیادہ ہو جائے گی۔

۶۔ دوسرے پنج سالہ پلان میں نمک کے موجودہ کارخانوں میں توسیع کے لئے ۱۸۹ لاکھ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں منڈی میں نمک کی کانوں کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک کروڑ روپے خرچ ہونے کا امکان ہے کیونکہ ہندوستان میں پہاڑ کا نمک صرف اسی مقام سے نکلتا ہے۔

پربھاکر ماچوے

کتابوں کی نمائش

دہلی میں پچھلے سال نومبر میں ساہتیہ اکادمی کی طرف سے مختلف ہندوستانی زبانوں کی جو کشمیر سے لے کر کیرلا تک اور کامروپ سے لے کر کچھ تک ملک کے طول و عرض میں بولی جاتی ہیں چودہ ہزار کتابوں کی نمائش کی گئی تھی۔ نمائش میں نادر قلمی نسخوں اور کتابوں کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا جو ہندوستانی ادب کی ایک مسلسل اور مکمل تصویر پیش کرتا تھا۔

اکادمی کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ۲۰ نومبر ۱۹۵۶ء کو نمائش کا افتتاح کیا۔ یہ اکادمی ۱۹۵۴ء میں قائم کی گئی تھی۔ اکادمی کے مقاصد ہیں ادبی کاموں میں رابطہ پیدا کرنا، بلند ادبی معیار کو برقرار رکھنا اور ملک کی ثقافتی وحدت کو ترقی دینا۔ نمائش کے بارے میں جو کتابچہ شائع کیا گیا تھا، اس میں معنی خیز الفاظ میں بتایا گیا تھا۔ "ہندوستانی ادب ایک ہے اگرچہ یہ مختلف زبانوں میں لکھا جاتا ہے، یہ رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ یوں ان زبانوں کا امتیازی فرق نمایاں ہے اور اجنبی کو الجھن میں ڈال دیتا ہے، مگر دوررس نگاہوں سے ہندوستانی ادب کی بنیادی وحدت پوشیدہ نہیں۔"

بنیادی وحدت

ہندوستانی ادب کی کہانی کی ابتداء کچھ بھی ہو، خواہ اس کی ابتداء آسیائی ویدوں سے کریں یا آریاؤں سے قبل کسی قدیم عوامی ادب سے گذشتہ تین ہزار سال کے عرصے میں ہندوستانی ادب عام طور پر قدیم تصوف، وسطی دور کی گہری جذباتی رومانیت اور عہد جدید کی جدوجہد آزادی کی ہمہ گیر فضا میں پروان چڑھا۔ اس بنیادی وحدت کے اظہار کے لئے نمائش کو ان چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ رامائن، مہابھارت، کالیداس اور رابندر ناتھ ٹیگور، ان چاروں نے لسانی حدود کو پار کر کے ہندوستانی ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ رامائن سیکشن سری رام کی کانسی کی مورتی (قدیم چولا۔ دسویں صدی) کے قریب تھا۔ جس میں رامائن کے مختلف نسخے رکھے گئے تھے۔ جیسے گیارھویں صدی کی تامل "کمبا رامائنا" تیرھویں صدی کی آسامی مادھب کنڈالی رامائن" ایک نلمتہ کی مراٹھی رامائن، پندرھویں صدی کی کرتی باسا کی بنگالی رامائن، سولھویں صدی کی ہندی میں تلسی داس رامائن اور اس کی مختلف تفسیریں، اس کے علاوہ والمیکی رامائن کا اصل سنسکرت نسخہ اور کم شہرت یافتہ کشمیری، سندھی، پنجابی اور اردو تراجم بھی تھے، پرمبانم، بت تراشی پر اسٹراٹن ایم کی مستند کتاب تھی جس سے انڈونیشیا میں رام کتھا کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

اسی طرح مہابھارت سیکشن میں قدیم ترین تیلگو مہابھارت سرلا داس کی اڑیہ مہابھارت، مورو پنت کی مراٹھی مہابھارت اور دیگر نسخے رکھے گئے تھے، بھنڈارکر اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ کا مہابھارت کا مستند ایڈیشن اور جاپانی اور روسی زبانوں میں مہابھارت کے تراجم بھی شامل تھے۔ کالیداس سیکشن میں کالیداس کے چار ڈراموں اور نظموں کے چار مجموعوں کے تمام دستیاب تراجم کے علاوہ ولیم جونس کا شکنتلا کا قدیم ترین ترجمہ (۱۷۹۰ء) اور "رگھوومشا" کا لاطینی ترجمہ بھی تھا۔ "میگھ دوت" کے مختلف باتصویر نسخے، اور اس کی بنیاد پر لکھے ہوئے اردو اور مراٹھی کے اسٹیج ڈراموں کی بھی نمائش کی گئی تھی سنسکرت کی قدیم کلاسکی کتابوں کے علاوہ مختلف زبانوں کے سیکشنوں میں ان کے قدیم ادبی نسخے بھی موجود تھے، مثلاً پوتنا کی "بھگوتا" (تیلگو) باسوپران (کنڑ) سُرساگر (ہندی) راما چریتم (ملیالم) سنکھیا بھاکیا مزتا (آسامی) دنیانیشوری (مراٹھی) ترکرتال (تامل) دیوانِ غالب (اردو) وغیرہ وغیرہ۔ جین اور بدھ مت کی منتخب کتابیں بھی رکھی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ بیرونی ممالک جیسے لنکا،

انڈونیشیا، بالی، افغانستان، مشرقی ترکستان، چین، گلگت اور تبت سے حاصل کی سنسکرت کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ ہندوستانی رسوم الخط اور جنوب مشرقی ایشیا، تبت اور وسط ایشیا کی ملتی جلتی لکھاوٹوں کا باہمی تعلق اور وحدت دکھانے کے لئے مخصوص قسم کے چارٹ تیار کئے گئے تھے۔

قلمی نسخے

اس نمائش میں زیادہ تر ہندوستانی زبانوں کی مطبوعہ کتابیں رکھی گئی تھیں۔ تاکہ جدید علوم کے بالمقابل ہندوستانی ادب کی ایک تصویر پیش کی جا سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک سو قلمی نسخوں کی بھی نمائش کی گئی تھی، یہ نسخے عجیب و غریب چیزوں پر تھے، جیسے بانس کی پتی، تاڑ کا پتہ، سولا پتھ (ایک قسم کی گھاس سے تیار کردہ لکڑی) برچ کی چھال، اگورو کی چھال، کپڑا اور نیپالی کاغذ۔ یہ نسخے مختلف لکھاوٹوں میں تھے۔ سنسکرت کتابیں۔ جیسے راج ترنگنی اور گیتا، سارد رسم الخط میں، تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے مسودات دسے لنکو رسم الخط میں (جو عام طور پر پتھر پر لکھا جاتا تھا) گرنتھا، تیلگو، کوٹیلا اڑیہ مینتھی لکشارا، ملیالم، بنگالی اور آسامی لکھاوٹوں میں۔ نمائش میں داخل بعض قدیم نسخوں کی تفصیل درج ذیل ہے:-

تبتی میں مجوشری کلپ، جینیا کلا چاریہ کتھا" اور "کلپ ورتیہ" بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ سے آئے ہوئے قدیم ترین سنسکرت نسخوں (۱۳۲۰ء) کی عکسی تصویریں، مراٹھواڑہ سے دستیاب مراٹھی میں، الجبرا، اور نجوم کی قدیم کتابوں (بارھویں صدی) کی عکسی تصویر۔ ملیالم سیکشن میں تاڑ کے پتہ پر انا کتھا آسامی سیکشن میں بھگتی پردیپ، (سولھویں صدی) اڑیہ کے باتصویر قلمی نسخے خاص کر قابل ذکر ہیں۔ تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے گیت گووند، راس پنچ ادھیائے اور شاہرن اور راوبندر بھنجا کی "چتر بندھا کا دیاس" کے باتصویر نسخے۔ تیلگو رسم الخط میں گیتا کا ایک نسخہ خاص طور پر دلچسپی کا مرکز تھا۔ یہ نسخہ تاڑ کے پتوں کی مالا کی شکل میں تھا۔ اس مالا میں اٹھارہ دانے تھے جو تاڑ کے پتوں کو گول کاٹ کر خوبصورتی کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ اور ہر ایک پر خاص انداز میں گیتا کا ایک باب لکھا ہوا تھا نادر کتابوں کی عکسی تصویروں میں ایک ایک صفحہ کی تصویریں شامل تھیں۔ مثلاً شیتی کنٹھا کی مہانیایہ کا سا (سترھویں صدی) اور قدیم کشمیری رسم الخط سارد میں للا واکھیہ، مراٹھی سیکشن میں ڈاکٹر پریولکر سے مستعار داسوپنت کی پاسوڑی اور قدیم کرگنی نسخے، بنگالی سیکشن میں اپ جان کی پہلی ڈکشنری (۱۷۹۳ء) اور ہندی سیکشن میں ملک محمد جائسی کی 'پدماوت' کا قدیم نسخہ (۱۶۴۳ء)

اس کے علاوہ نامور ادیبوں کے اصل خطوط، ان کی ڈائریاں اور مسودات بھی نمائش میں رکھے گئے تھے ان کے نام ہیں:- بنگالی کے ادیب ایشور چندر ودیا ساگر، مائیکل مدھو سودن دت، بنکم چندر چیٹرجی، رابندر ناتھ ٹیگور اور شرت چندر، تامل ادیب سبرامنی بھارتی، مراٹھی ادیب ایچ این آپٹے، گجراتی کے دیوتیا اور دمرود، ہندی ادیب پریم چند، مہاویر پرساد دویدی، رام چندر شکل اور دیگر حضرات۔ غالب کے کئی خطوط اور اشعار پر ان کی اصلاحیں بھی شامل تھیں، گاندھی جی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب تھی جو بلاک میں چھپی ہوئی تھی۔ اور ہند سوراج کا اصل نسخہ محررہ ۱۹۰۹ء بھی رکھا گیا تھا۔ ٹیگور کے نام سروجنی نائیڈو کا ایک نادر خط اور ٹیگور کے نام گاندھی جی کے دو خطوں کی عکسی تصویریں نمائش میں شامل تھیں۔

پہلی مطبوعہ کتابیں

پہلی مطبوعہ کتابیں زیادہ سیرام پور مشن پریس کی تھیں، ان میں زیادہ تر گرامر، ڈکشنریاں اور انجیل کے تراجم شامل تھے۔ مختلف زبانوں میں سب سے پہلے جو کتابیں طبع ہوئیں ان کی فہرست بمعہ تاریخ طباعت درج ذیل ہے:-

آسامی:- انجیل کا ترجمہ - ۱۸۱۳ء - بنگالی:- ہال ہیڈ کی بنگالی زبان کی گرامر - ۱۷۷۸ء، گجراتی:- فرہنگ - ۱۸۰۸ء، ہندی:- فورٹ ولیم کالج کے طلبا کے لئے مضامین - ۱۸۰۳ء، کنڑا:- ڈکشنری - ۱۸۳۲ء، کشمیری:- انجیل کا ترجمہ ۱۸۲۱ء، ملیالم:- ویدارتھا سنکشیپم (مطبوعہ روم) ۱۷۷۲ء، مراٹھی:- مراٹھی زبان کے نمونے، ۱۸۰۵ء، اڑیہ:- انجیل کا ترجمہ، ۱۸۱۱ء، پنجابی:- انجیل کا ترجمہ، ۱۸۱۲ء، تامل:- عہدنامۂ قدیم کا ترجمہ - ۱۷۱۴ء، تیلگو:- اے، ڈی کیمپبل کی گرامر، ۱۸۲۰ء، اردو:- گرامر، ۱۸۰۴ء۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی مبلغوں اور دوسرے لوگوں نے کیسی محنت، صبر اور شوق کے ساتھ ہندوستان کی مختلف زبانوں، علاقائی زبانوں اور بولیوں کا مطالعہ کیا، گریرسن کی کشمیری ڈکشنری، کٹل کی کنڑ ڈکشنری اور کینڈی مولسے ورتھ کی مراٹھی ڈکشنری لسانی تحقیقات کی اچھی مثالیں ہیں نمائش میں کچھ چند زبانی کتابیں بھی رکھی گئی تھیں، جیسے گجراتی سیکشن میں "شیاجی شاسن کلپ ترو" دس زبانوں کی ڈکشنری جسے سنجیوا راؤ گیکواڑ بڑودہ نے ۱۹۳۱ء میں مرتب کیا تھا۔ اردو میں چھ زبانوں کی عجیب و غریب ڈکشنری

مرتبہ شاہ جہانی بیگم (بھوپال) ۱۸۵۱ء۔

دہ بانوں میں ہر ایک سیکشن میں ۸۰۰ سے لے کر ۱۵۰۰ کتابیں تھیں جنھیں مضمون وار ترتیب دیا گیا تھا۔ بنگالی سیکشن میں عام معلومات، فنونِ لطیفہ کی کتابیں اور ہندوستانی زبانوں کی قدیم ترین انسائیکلو پیڈیا (۱۸۴۲ء) تھیں۔ گجراتی سیکشن میں جو کتابیں رکھی تھیں اُن میں گاندھی جی کے ہند سوراج اور دیگر کتابوں کے علاوہ گجراتی زبان کے پہلے اخبار (۱۸۴۹ء) کی کاپی بھی شامل تھی۔ ہندی سیکشن میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے ۸۰ تحقیقی مقالات "ابھی نندن گرنتھ" اور اردو فارسی کے بارے میں کتابیں، کنڑ اور ملیالم سیکشن میں غیر ملکی زبانوں سے کئی اچھے تراجم، مراٹھی سیکشن میں تاریخی تحقیقات کے بارے میں اچھی کتابیں، تیلیگو میں ایک ہی شخص کی جمع کردہ لوک کہانیوں کی آٹھ سو کتابیں اور تامل سیکشن میں کرال کے سب ہی تراجم شامل تھے۔

سنسکرت سیکشن میں کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ اس میں زرتشت مذہب فلسفہ، لسانیات، فنِ خطابت پر کتابیں تھیں بلکہ باغبانی، ادویات، نجوم، گھوڑوں ہاتھیوں اور شطرنج بازی پر بھی کتابیں شامل تھیں۔ بدھ مت اور جین مت کی اہم سنسکرت کتابوں کے علاوہ بہت سی اور دلچسپ کتابیں بھی تھیں۔ مثلاً "پریجاتا منجری" یہ ایک ڈرامہ ہے۔ جو پتھر کی سل پر لکھا ہوا ہے۔ خواتین کی لکھی ہوئی سنسکرت کتابوں، ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کے سنسکرت تراجم، ناگری کے علاوہ، سارد، اڑیہ، بنگالی، تیلیگو اور دیگر رسوم الخط میں لکھی ہوئی سنسکرت کتابیں بھی نمائش کے لئے رکھی گئی تھیں، اردو سیکشن میں مختلف مذاہب کی کتابوں کے بہت سے تراجم تھے "بھگود گیتا" کے دس مستند تراجم بھی موجود تھے۔

ٹیگور اور گاندھی جی کی ایک تصویر کے نیچے ٹیگور کے اُس خط کا عکس دیا گیا تھا۔ جس میں اُنھوں نے جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے بعد سر کا خطاب واپس کرنے کا اعلان کیا تھا۔ بنگالی میں مکمل رابندر رچناولی، اور ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں اس کے مختلف تراجم بھی تھے۔ اس کے علاوہ ٹیگور سیکشن میں یہ چیزیں بھی تھیں۔ ٹیگور کی نظموں کا خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا انگریزی ترجمہ اور اصل بنگالی نظمیں، کالی داس اور آبدبندو پر ایک نظم، ٹیگور کے قلم سے "جن گن من" کا انگریزی ترجمہ، اُن کی ڈائری اور جنم پتری۔

نمائش کی بیرونی آرائش اور ترتیب کا کام فنِ تعمیرات کے ماہر شری رانا نے انجام دیا تھا۔ نمائش کے دروازے پر شری سنکھو چودھری کا بنایا ہوا ایک مجسمہ رکھا گیا تھا۔ جس میں کتاب پڑھتی ہوئی لڑکی کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ یہ مجسمہ نمائش کے مقاصد کی ترجمانی کر رہا تھا۔ دروازے پر سامنے کی طرف "ماڈل بک کیس" کی خیالی تصویر کا نمونہ دکھایا گیا تھا۔ اس کو شری رانا نے بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سری ستیہ جیت رائے کا ڈیزائن کردہ اکادمی کا نشان "ساہتیہ" بھی تھا۔ اندرونی آرائش کے لئے شری پیوزکٹ پاٹیہ نے مختلف سیکشنوں میں رنگین مٹی سے بہت سے شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں، شری جیوتی بھٹ نے دیواری تصویروں کے نمونے پیش کئے تھے۔ بچوں کے سیکشن میں 'پنچ تنتر' کی پانچ کہانیاں دیواروں پر پیش کی گئی تھیں۔ بچوں کے سیکشن میں خاص ڈھنگ سے بنایا ہوا بک کیس اور فرنیچر قابلِ ذکر ہے۔ یہ سامان شری سنکھو چودھری کے زیرِ ہدایت تیار کیا گیا تھا۔

مشہور شاعروں، ناول نگاروں، مضمون نگاروں اور عظیم مفکروں کی تصویروں کے علاوہ ایک خاص چیز یہ تھی کہ سب سیکشنوں میں خاص ڈیزائن کے کتبے لگے ہوئے تھے۔ جو جامعہ ملیہ کے ابوالکلام صاحب نے تیار کئے تھے۔

نمائش میں داخل ہوتے ہی انعام یافتہ کتابیں دکھائی دیتی تھیں۔ مختلف زبانوں کی بعض ممتاز کتابوں کو گذشتہ تین سال کی بہترین مطبوعات کی حیثیت سے پانچ پانچ ہزار روپے انعام ملا تھا۔ بیکا نیر سے آئی ہوئی بارھویں صدی کی جین سرسوتی نمائشی ہال کے وسط میں رکھی گئی تھی۔ 'قرآن شریف' اور "آدی گرنتھ" الگ الگ دو رحلوں پر رکھے ہوئے تھے۔

نمائش کے لئے مختلف قسم کی کتابیں حاصل کرنے کا کام کسی ایک شخص یا ادارہ نے نہیں کیا تھا، بہت سی علاقائی ادبی انجمنوں اُن کے کارکنوں نے یہ کام انجام دیا تھا۔ بلکہ ریاستی حکومتوں، پبلک لائبریریوں، نجی اور شخصی کتب خانوں اور ناشروں نے بھی نمائش کے لئے عاریتاً کتابیں دے کر پورا پورا تعاون کیا تھا۔ ساہتیہ اکادمی کو اس کام میں مختلف لسانی حلقوں سے بڑی امداد ملی۔ ان کے کارکنوں اور رہنماؤں نے مہینوں ان تھک کوشش کر کے عملی تعاون کا ثبوت دیا۔ اکادمی کے سیکرٹری شری کے۔ آر کرپلانی اور شریمتی کرپلانی نے ذاتی طور پر نمائش کی کامیابی کے لئے معمولی سے معمولی بات کی طرف پوری توجہ دی۔

اگر ہم "وزیٹر بک" میں درج عوام کے خیالات کو سامنے رکھ کر نمائش

کی کامیابی کا اندازہ لگائیں تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نمائش لوگوں میں کتابوں کا شوق اجاگر کرنے میں کامیاب رہی۔ صدر راجندر پرساد نے نمائش کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا "ایک بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی ذخیرہ" سنتی کمار چیٹرجی نے لکھا "یہ صرف نمائش نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ درحقیقت یہ مختلف ادوار کے ہندوستانی ادب کا اور فن کتابت کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ایسی نمائش اسی انداز میں ہمیشہ نہیں ہو سکتی۔ میری طرف سے بہت بہت شکریہ" نمائش میں کئی ممتاز غیر ملکی لوگ بھی آئے تھے۔ بوسٹن (امریکہ) کی کارولین بوآلے نے لکھا: "ایک بہت شاندار اور مفید نمائش" روس کے ای جیلو دوا نے تحریر کیا "آج ہم نے ہندوستانی کتابوں کی نمائش دیکھی اور بہت محظوظ ہوئے کیونکہ یہاں قدیم ہندوستان کے بارے میں بہت سی کتابیں تھیں"

(انگریزی سے ترجمہ)

ہمارے کرم فرما (۲)

شملہ ۲۹ دسمبر۔ اچھا تو صاحب زندہ ہیں آپ ابھی تک۔ اس سے تو زیادہ حیرت ناک معجزہ یہ ہے کہ مضامین کے گراں بار پلندوں میں ایک ننھا سا خط دو ماہ تک جیتا رہا۔ آرزو میں مرنے کی۔ اسے اس کی خوش قسمتی کہوں یا شوخی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ آپ جواب کی توقع نہیں رکھتے۔ لیکن قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم۔ پرنسپل بننے پر آپ کا پیغام ہمدردی ابھی پہنچا ہی نہیں تھا کہ عاقلانِ قضا و قدر کو کچھ اور سوجھی۔ لے ڈی ای آئی بنا کر یہاں بٹھا دیا۔

اب کیا ہے۔ کرسی ہے اور میں۔ چھ گھنٹے لگاتار چپکا رہتا ہوں۔ پیچھے انگیٹھی گرمی پہنچاتی ہے تو آگے فائلیں ٹھنڈک ——
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر والی بات ہے

ڈرتے ڈرتے کلرک فائلیں بغل میں دبائے آتے ہیں اور یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ حضرت کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے یا تیوری
نئی قسم کے اطوار سیکھ رہا ہوں اور نئی قسم کی انگریزی۔ تعلیم دینے کے لئے آیا ہوں۔ شاید ان پڑھ ہو کر نکلوں۔ اکتا جاتا ہوں تو ایک ہی علاج ہے۔ چائے۔ جتنی چائے نوشی یہاں ہو رہی ہے۔ عمر بھر نہیں ہوئی۔ یہیں سے لکھا تھا نا میں نے پچھلی بار آپ کو آموں کی بابت خط۔ کیا تعجب کہ اس بار چائے پر تبصرہ ہو جائے۔ مضمون کا خیال آتے ہی اُدھر آپ خوف زدہ ہو جاتے ہیں اِدھر میری روح کانپ جاتی ہے

دیکھی ہے برف پڑتی کبھی آپ نے۔ شوق ہو تو تشریف لائیے۔ اگلی بار تار بھیج سکتا ہوں مگر برف وقت اور لہر کی طرح کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ چار پانچ روز کا پروگرام بنائیں تو نظارہ یقینی ہے۔ شاید کوئی نظم ہی ٹپک پڑے۔ معلوم نہیں آپ کے شعراء نے برف باری (ٹھیک ہے کیا) پر طبع آزمائی کیوں نہیں کی۔ اقبال ہی اس قابل تھا لیکن بیچارہ دور سے ہی نظارہ کرتا رہا   برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت ترے سر
شاید اس لئے کہ برف گرمیٔ سخن کے لئے آگ ہے (کیا لکھ گیا ہوں) میں تو شاعر کو آتش فشاں پہاڑ سے تشبیہ دیا کرتا ہوں اور شعر کو لاوے سے۔ اور اس لئے بھی شعراء سے خوف زدہ رہتا ہوں کہ میں نے Vesuvius کا Crater دیکھا ہے۔ بیس سال ہو گئے ہیں مگر اس ہیبت ناک نظارے کی یاد ابھی تازہ ہے۔ جھانکا تو ایک ڈیڑھ گز کے فاصلے پر آگ کا ایک سمندر سا بہ رہا تھا۔ کیا یہی ہوا کرتا ہے شاعر کے دل کی آواز۔ آپ جانیں بابا ہمیں تو ان کیفیتوں کی رستخیز سے ڈر لگتا ہے۔ جسے شاعر کا دل کہتے ہیں۔

موسیقی تک تو آپ پہنچ گئے۔ کوئی نظم نمبر بھی نکالا ہے۔ کوئی کاپی موجود ہو تو بذریعہ وی پی ارسال کریں۔

نیاز کیش
الیش کمار



لا ا ابوالکلام آزاد

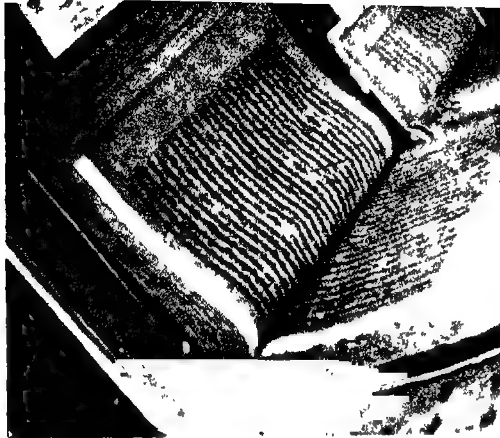
ابوں کی نمایش میں

ائیں کونے میں
امتیاز علی عرشی
خواجہ غلام السیدین
اور پربھاکر ماچوے

نیچے
پربھاکر ماچوے مولانا آزاد کو
ایک کتاب دکھا رہے ہیں



کلیات



(۱۶۹۶)

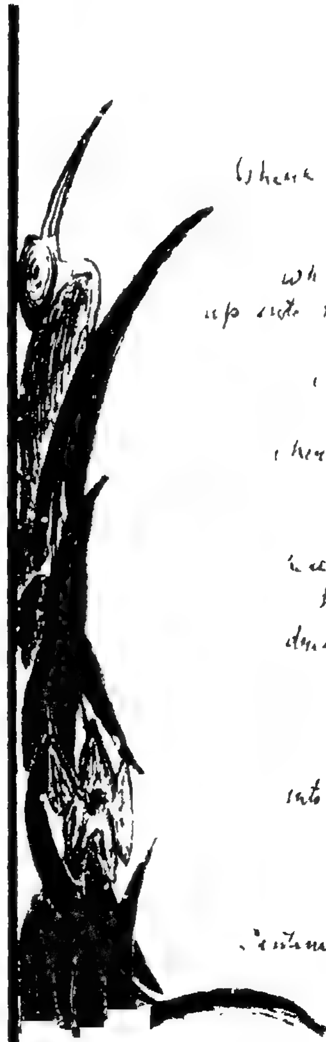
دیوان ولی
(خدا بخش [illegible])

دیــوان ولی

[illegible]

شہر [illegible]

شاعر اعظم ٹیگور کی ایک تحریر



Where the mind is without fear
and the head is held high,
Where knowledge is free
Where the world has not been broken
up into fragments by narrow domestic
walls,
Where words come out from the
depth of truth,
Where tireless striving
stretches its arms to[illegible]
perfection,
Where the clear stream of reason
has not lost its way into the
dreary desert sand of dead habit;
Where the mind is led forward
by thee into ever widening
thought and action —
into that heaven of freedom,
my Father,
let my country awake
[illegible]

Rabindranath [illegible]

لعات عراني (۱۸۸۰ء)

حرۃ الاعاب
اردو لغت جو زبانوں میں
(۱۳۰۴ء)

ایش

سروجني نائيڈو کا خط
ٹیگور کے نام

C/o Thomas Cook & Co
Ludgate Circus
London

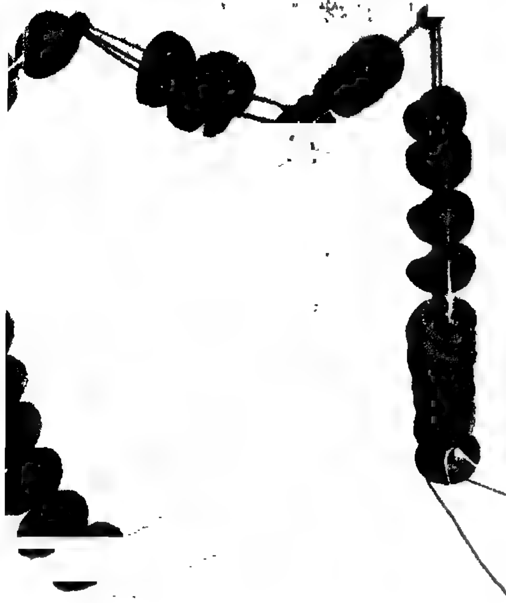
7 PARK LANE W

Dear Poet. I am writing from my sick bed on the very eve of an operation to tell you how your Gardener fills my room with the [illegible] beauty of immortal flowers, your Crescent Moon [illegible] in the tender golden ecstasy of its illumination, and [illegible] recognition of your genius [illegible] like a crown on the [illegible] of Bharat Mata India land of our hearts desire. Before I go down into the darkness for a few hours maybe or for ever [illegible] tell you how because I am a woman and a poet [illegible] see your exquisite work in your exquisite fame. Your [illegible] service to India and I offer you my three fold homage [illegible]

Your friend

Sarojini Naidu

کرما سھو رقی صدر
مدارس عا دورت واسم
کالج کلکتہ
(انجمن ترقی اردو
ہند)



بھاگوت گیتا کی مالا - تاڑ کے پتوں پر
زبان سنسکرت - رسم خط تیلیگو
(تقریباً ۸۰۰ برس قدیم)



اجنتا کی عورت
مریض غم یشودھرا



ملکہ جودھا بائی
از
غنچہ عشرت
(رضا لائبریری رامپور)



سودا اور غنچہ
نخہرۂ برٹش میوزیم

ارشد قریشی

اجنتا کی عورت

(خدوخال)

اجنتا عورت کی ایسی جلوہ گاہ ہے جہاں اس کی جسمانی رعنائیاں پاکیزہ حسن کی اوٹ میں شرماتی ہیں۔ جیسے شعلہ کو شیشے نے گھیر رکھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھنے والے کا دل ہیجان اور وجدان کے ایک ایسے لطیف سنگم پر پہنچتا ہے کہ عقیدت اور محبت کے سوا کوئی اور جذبہ اُبھرنے ہی نہیں پاتا۔ مکمل عورت، مکمل حسن اور ان دونوں کا عکس جب اجنتا کی دیواروں پر یک جا ہوا ایک تصویر بن گئی کہیں کہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تصویر مصوّر کی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ پیدا ہو گئی ہے۔

عورت کے حسن کے متعلق شاعروں نے بھی بڑی نازک خیالیاں دکھائی ہیں لیکن کوئی مصوّر اگر ان شاعروں کے محبوب کی تصویر بنانے بیٹھ جائے تو جو شکل سامنے آئے گی اس کو دیکھ کر دوسروں کا تو ذکر ہی کیا۔ خود شاعر اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجنتا کے آرٹسٹ نے اپنے خیال کو بھی مشاطگی کا موقع دیا ہے۔ لیکن اس نے جو صورت بنائی ہے وہ وہی ہے جو عورت کی حقیقی شخصیت کو ظاہر کرتی ہے وہ صورت نہیں جو ایک خاص میلان یا نظر کو پسند ہو۔ دنیا کے مختلف خطوں سے مختلف ذوق اور مختلف معیار رکھنے والے اجنتا آتے ہیں۔ لیکن اجنتا کی عورت کو دیکھنے کے بعد سب کی جستجوئیں آسودہ ہو جاتی ہیں۔ یہ فتح، یہ سحر، یہ تسخیر اجنتا کی عورت کے ذاتی حسن کے ساتھ ساتھ اس کے مصوّر کی نظر کاری حقیقت پسندی، اور کمالِ فن کی بھی مرہونِ منّت ہے۔ اس لئے مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ عورت کو اجنتا میں دیکھا اور پھر کہیں نہیں دیکھا۔ وہ عورت سے زیادہ عورت اور خوبصورت سے زیادہ خوبصورت ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اجنتا کی عورت کسی ماڈل کا عکس لگین ہے۔ یا مصوّر کا خیال بے نقاب ہو گیا ہے؟ بعض آرٹسٹوں نے "اجنتا کی تخلیق" کے عنوان سے جو تصویریں بنائی ہیں اس میں انھوں نے ماڈل دکھائے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سہولت اجنتا کے مصوّر کو حاصل نہیں تھی۔ اس نے باغ میں کالی گھٹاؤں کو سر پہ لئے کسی برق پارہ کو جھولتے دیکھا، کسی کنج میں دو محبّت منانے والوں کی جھلک دیکھی، خوش نصیبی نے اسے کسی راجکماری کی چھب دکھلا دی اور اس نے ان سارے جلوؤں کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھا۔ یہی اس کی یادداشتیں اس کے لئے ماڈل کا کام دیتی گئیں۔ اس کے علاوہ اجنتا کے مصوّر نے عورت کی خوبصورتی سے متعلق ان خصوصیات کی بھی پابندی کی ہے جن کا ذکر منو کے دھرم شاستر میں کیا گیا ہے۔ مثلاً دونوں آنکھوں کے درمیان ایک آنکھ کی لمبائی کے برابر فصل رہے۔ آنکھ کے کونے سے کنپٹی تک بھی ایک آنکھ کی لمبائی کے برابر کا فاصلہ رہے۔ اس طرح چہرے کے تین حصے ہوں۔ پیشانی سے بھوؤں تک، بھوؤں سے ہونٹوں تک اور ہونٹوں سے ٹھوڑی تک۔ اور ان تینوں حصّوں کی لمبائی برابر برابر ہو، لیکن اجنتا کے مصوّر نے اپنا سارا کمال آنکھوں اور ابروؤں کی نقاشی پر صرف کر دیا ہے۔ عام طور پر آنکھ کی پتلی سیاہ ہے اور وضع نرگسی ہے، اوپری پپوٹے کے کنارے پر ایک ہلکا سا خم پیدا کر کے ایک ایسی خوابناک اور نشیلی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے کہ بے اختیار میرؔ کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

آنکھوں کی اس نیم بازی اور مستانہ ڈھلک کے ساتھ دنبالہ کی حسن آفرینی رہی سہی کسر پوری کر دیتی ہے ہرن اپنی آنکھوں پر بڑے اتراتے پھرتے ہیں

کی جاسکے ان آنکھوں کی بات ان کو سُنا آئے۔

بعض تصویروں میں آنکھیں چینی انداز مصوری کو پیش کرتی ہیں۔ مثلاً غار نمبر (۱۷) میں بنارس کی رانی کی جو تصویر ہے اس کی آنکھیں چینی وضع کی ہیں۔ اس غار میں راجکمار اور راجکماری کو چمن کی سیر کو نکلتے ہوئے جہاں دکھایا گیا ہے اس گروپ میں بھی آنکھیں چینی وضع کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں چین سے جو بُدھ بھکشو ہندوستان آئے اُن کے ساتھ آرٹسٹ بھی تھے۔ جنھوں نے اپنی طرز نقاشی سے ہندوستانی آرٹسٹ کو متاثر کیا۔

غار نمبر (۱) میں سیدھی جانب وجرا پانی کی تصویر کے بازو میں سانولی رانی کی شہرہ آفاق تصویر ہے۔ یہ سانولی نندر کی چیزیں ساتھ لئے آتی ہے۔ اور نذر گذارنے سے پہلے اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے ٹھٹکی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت خاص ہیں۔ جوانی آنکھوں میں ڈورے ڈال چکی ہے۔ لیکن موقع کے لحاظ سے یہ آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی ہیں، یہ ادائے بندگی نظر کے لئے بھرپور پرستش کا اجازت نامہ ہے۔ چہرہ پر دیکھے جانے کا شرمگیں احساس اس قدر نمایاں ہے جیسے یہ سانولی رانی جان گئی ہے کہ سہیلیاں اسے گھورتی ہوئی گذرنے والی ہیں۔ سانولی رانی کی ناک بھی بے حد ستواں اور خوبصورت ہے اور شاید ساری تصویروں میں یہی ناک سب سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ اجنتا کے مصوروں نے آنکھوں کی نقاشی پر جو زیادہ توجہ دی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اجنتا کا مصور جذبات کا مصور بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبات کی عکاسی کے لئے وہ آنکھ ہی کو کامیاب طریقے سے استعمال کرسکتا تھا۔ غار نمبر (۱۷) کے بیرونی دروازے کی بائیں جانب راجکمار اور راجکماری کی خلوت کی تصویر ہے۔ راجکمار کے ہاتھ میں پیالہ ہے اور راجکماری کی آنکھیں کہہ رہی ہیں ہم خود نشہ ہیں۔ پوری تصویر میں مصور کی توجہ کا مرکز راجکماری ہے۔ جوانی کی اُمنگ راجکمار کی سنگت اور شراب کے کیف کے سہ آتشہ اثر کو پیش کرنے کے لئے اس نے راجکماری کی آنکھوں کو ذریعہ اظہار بنا لیا ہے۔ اس نے آنکھ کی پتلی کو اس نیم باز آنکھوں کے کونے تک اس طرح ڈھلکا دیا ہے کہ تین نشوں کی مدہوش اس پتلی کی ایک مستانہ ڈھلک میں ڈگمگاتی نظر آتی ہے۔ نشست کا انداز بھی ایسا دلربایانہ ہے کہ جی چاہے تصویر کی تصویر کھینچ لیں۔ ایک ہاتھ راجکماری کی پنڈلی پر ٹکا ہے۔ دوسرے ہاتھ کی اُنگلیاں گلے کے ہار کی لڑیوں کو اُلجھا

رہی ہیں۔ سو سو نخا کتوں کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ جیسے یہ نشست دھرتی پہ بہت بڑا احسان ہے۔

غار نمبر (۱۶) میں ایک جاں بلب راجکماری کی تصویر ہے۔ یہ تصویر ایک دردناک منظر کو پیش کرتی ہے اور کوئی آنکھ ایسی نہیں جس سے غم نہ جھانکتا ہو۔ راجکماری کا پتی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ اس کی جدائی میں بیکل رہی۔ اس کی تلاش میں لوگوں کو دوڑایا اور اس کے بارے میں کوئی سندیسہ سننے کے لئے منتظر بیٹھی تھی کہ دو آدمی اس کی خدمت میں باریابی چاہتے ہیں وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اُن کا سواگت کرتی ہے۔ لیکن کیا دیکھتی ہے کہ وہ راجکمار کا تاج اس کے پاس لے آئے ہیں۔ کیا سُنتی ہے کہ اس کے سرتاج نے اسے تج دیا ہے۔ راج پاٹ کو تیاگ دیا ہے، بھکشو بن گیا ہے۔ راجکماری کے لئے یہ صدمہ اس کی برداشت سے باہر تھا، اس کا دل ڈوبنے لگا وہ مرنے لگی۔ اس جانبازی کی تصویر دیکھئے۔ نڈھال پپوٹے، گرتی ہوئی پلکیں، ڈھلکتی پتلیاں، موت کی تصویر بن گئی ہیں۔ مصور نے ایک الوداعی نظر کو آنکھوں میں ٹمٹماتا چھوڑ دیا ہے۔ اب یہ موت کا کام ہے کہ وہ اسے بھی بجھا دے۔ لیکن اجنتا کی تصویروں کو ہاتھ لگاتے موت بھی جھجکتی ہے، کون کہتا ہے وہ پریت کی ماری دُنیا سے اٹھ گئی۔ اس کی تصویر دیکھو ایک امر زندگی اس کی، الوداعی نظر سے لپٹ کر رہ گئی ہے۔

غار نمبر (۱) کے اندرونی دالانوں میں ایک نرتکی کی تصویر ہے۔ نرتکی سولہ سنگھار کئے ناچ رہی ہے۔ بھویں کمان اور مخمور نرگسی آنکھیں ایک انداز بے نیازی کے ساتھ اس سمت دیکھ رہی ہیں جدھر کوئی دیکھنے والا نہیں۔ کمر کا لوچ اور پاؤں کا انداز، حرکت اور حسن کی ایسی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے جیسے رقص کی روح مجسم ہوگئی ہو اور دیکھنے والا گھبرا کر سوچنے لگے، ایسے میں کوئی جسم سے جو آجائے تو کیا ہو، غار نمبر (۱۷) ہی میں اندرا اور اپسراؤں کے گروپ میں جو سانولے رنگ کی اپسرا ہے اس کی آنکھیں اور ہونٹ اس برامدے کی ساری تصویروں میں سب سے زیادہ دلکش اور جاذب نظر ہیں۔ بھوئیں پیوستہ نہیں ہیں لیکن ایسی پتلی اور محرابی ہیں کہ ان میں تیر جوڑ کر چلائیں تیر نشانہ پر ہی بیٹھے۔ آنکھوں کے کناروں پر ابرو نے دنبالہ کے ساتھ جو ایک ہلکا سا موڑ لیا ہے وہ شاید اس بات کو جتانے کے لئے ہے، کہ دلربائی کے میدان میں ابرو آنکھوں کے برابر برابر چل رہے ہیں۔ ہونٹ

گلابی اور پتلے پتلے، نچلا ہونٹ قدرے موٹا اور اوپری ہونٹ پنکھڑی ہے۔ دہانہ چھوٹا ہے اور ہونٹوں کی سُرخی کی رعایت سے ہم اسے ایک فارسی شاعر کی پیروی کرتے ہوئے غنچے سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ تشبیہ مکمل نہیں ہوگی۔ کیونکہ کلی ایک بار پھول بن جائے تو دوبارہ کلی نہیں بن سکتی اور یہ دہن تو کبھی غنچہ ہے کبھی پھول۔

اجنتا کی عورت کا رنگ کہیں کرشن جی کا رنگ ہے، کہیں سانولا کہیں سیاہ شیشی، کہیں گورا، کہیں گندمی اور کہیں عنابی، غار نمبر (۱۵) میں اندر اور اپسراوں کے جس گروپ کا میں نے ذکر کیا ہے اس میں رنگ برنگ کی اپسرائیں ہیں، ایک عنابی ہے، ایک گندمی اور ایک سانولی، بعض جگہ تو یہ گمان بھی ہے کہ لباس کے اندر سے جسم کے رنگ کو جھلکا دیا گیا ہے۔

اجنتا کی عورت کا چہرہ بیضوی ہے شانے گول، کمر پتلی، ناک ستواں انگلیاں پتلی اور لمبی ہیں اور ایسے ہاتھوں کی تخلیق جن کی لاجواب نقاشی نے اجنتا کو ایک خصوصی شہرت بخش رکھی ہے۔

اجنتا کی عورت کھڑے رہنے، بیٹھنے اور دوسری حالتوں کے ایسے دلنشین انداز سے واقف ہے کہ اس کی ہر ادا ایک نگارخانہ ہے۔ غار نمبر (۲) میں اندرونی دیوار پر بُدھ کی سوتیلی ماں کی تصویر ہے اس میں کھڑے رہنے کا انداز ایسی لاابالی شان اور ایسا بانکپن لئے ہوئے ہے کہ دیکھنے والے کی تمنا ہوتی ہے۔ جب تک یہ دنیا گھومے یہ اسی طرح کھڑی رہے۔ اجنتا کے ان پہلوؤں کے ذکر سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس نگارخانہ کی ہر عورت تصویر ہے۔ اجنتا کے آرٹسٹ کی نظر با تمیز ہے اور وہ حسن کی دولت آنکھ بند کر کے نہیں لٹاتا رانیوں کے جلو میں جو داسیاں دکھائی گئی ہیں اُن کے خد و خال معمولی ہیں۔ اور کہیں کہیں تو بہت بھونڈی شکلیں بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن اجنتا کا آرٹسٹ بوڑھی عورتوں کے ساتھ خاص طور پر بہت ظالمانہ سلوک کر گیا ہے۔ جہاں جہاں اس نے بوڑھی عورتوں کو پیش کیا ہے اس قدر کریہہ اور ڈراؤنی شکلوں میں پیش کیا ہے دیکھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اس میں کچھ مرد کی ہوس کارانہ تنگ نظری کو دخل ہے کہ وہ ایک بار عورت کی موت کو تو برداشت کر لے لیکن عورت کے بڑھاپے کو کسی حال گوارا نہیں کر سکتا اور اس معاملے میں انسانی جذبۂ ہمدردی کی سفارشیں بھی بے اثر رہ جاتی ہیں۔ اجنتا کا آرٹسٹ عورت کے بڑھاپے کو اڑتے ہوئے بالوں، پھیلے ہوئے نتھنوں اور لمبے لمبے دانتوں سے نفرت انگیز بناتا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ جہاں اسے بھوتوں کی شکلیں بنانی پڑیں وہاں اُس نے بوڑھیوں کو اپنی مکروہ ہیبت ناکیوں کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

ایک اور بات اس سلسلے میں قابل ذکر ہے کہ اگرچہ اجنتا کی عورت کہیں کہیں چینی انداز حسن کی مالک نظر آتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس کے خد و خال ہندوستانی ہی ہیں اور انداز قد ہر لباس میں پکار اُٹھتا ہے کہ رنگ کی ملاحتیں، اعضا کے سڈول پن اور دل نواز اداؤں کے اس انوکھے امتزاج کو پدمنی کے سوا اور کسی نام سے پکارا نہیں جا سکتا۔

سکّوں سے متعلق معلومات

۱۔ بھارت میں پہلا روپیہ ۱۹۔ اگست ۱۷۵۷ء کو ایک ٹکسال میں ڈھالا گیا تھا جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے نواب سراج الدولہ کے ساتھ کلکتے میں قائم کیا تھا

۲۔ جدید قسم کی پہلی ٹکسال کا سنگِ بنیاد کلکتے میں ۱۸۲۴ء میں رکھا گیا تھا۔ یہ ٹکسال جہاں ۱۳ لاکھ روپے کی مالیت کی مشینری لگائی گئی تھی یکم اگست ۱۸۲۹ء کو چالو ہوئی۔ اس وقت اس ٹکسال میں روزانہ دو لاکھ چاندی کے سکے بنائے جا سکتے تھے۔

۳۔ بھارت ۱۹۱۴ء سے کئی دوسرے ملکوں مثلاً آسٹریلیا، بھوٹان، لنکا، مصر، پاکستان، سعودی عرب، بھارت کی پرتگیزی نوآبادیوں اور برطانوی مشرقی افریقہ وغیرہ کے لئے سکے تیار کرتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے سابق رجواڑوں کے سکے بھی بنائے۔

۴۔ اس وقت ملک میں کل تین ٹکسالیں ہیں جو بمبئی، حیدرآباد اور علی پور میں واقع ہیں۔

۵۔ جنگ کے دوران میں کلکتہ کی ٹکسال میں ۴۵۔۱۹۴۴ء میں کل ۱۴۰۸۲۷۰۰۰ سکے تیار کئے گئے۔ یہ قریب قریب عالمی ریکارڈ تھا۔

۶۔ "روپے کا لالچ ہی تمام بُرائیوں کی جڑ ہے۔" یہ الفاظ کلکتہ کی ٹکسال کے ایک شوکیس پر لکھے ہوئے ہیں۔ اس شوکیس میں جعلی سکّے برائے نمائش رکھے ہوئے ہیں۔

انار کے دو پتے

پہلا منظر

(متوسط درجے کے ایک گھر کا گول کمرہ ۔ وقت شام کی چائے کا ۔ گول کمرے میں دیور بھابی بیٹھے ہیں ۔ بھابی چندرا نئے زمانے کی ایک پڑھی لکھی خاتون ہے ۔ دیور روپ آج ہی ولایت سے تین سال پڑھنے کے بعد لوٹا ہے ۔ بھابی اور دیور سویرے سے باتیں کر رہے ہیں ۔ ولایت کی باتیں ، اپنے دیش کی باتیں ، اپنے گھر کی باتیں ۔ ابھی تک اُن کی باتیں ختم نہیں ہوتیں)

رُوپ ۔ (اُٹھتے ہوئے) اچھا بھابی ۔ چائے تمھاری تو ابھی تک آئی نہیں اور مجھے دیر ہو رہی ہے ۔

چندرا ۔ ارے بیٹھو تو ۔ چائے ابھی آجاتی ہے ۔ تمھارے بھائی صاحب بھی تو آنے والے ہیں (پکارتے ہوئے) مینا !

رُوپ ۔ (چونک کر) ہاں بھابی ! سنو یہ مینا تمھاری کتنی بڑی ہوگئی ہے ۔ گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی جب میں ولایت گیا ۔

چندرا ۔ لڑکیاں بیل کی طرح بڑھتی ہیں ۔

رُوپ ۔ سویرے آنگن میں بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی ۔ میں سمجھا تمھاری کوئی سہیلی ہے ۔ ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر میں نے نمستے کی ۔ وہ شرم سے جیسے دوہری ہوگئی ۔

چندرا ۔ لڑکی اچھی ہے ۔

رُوپ ۔ صرف اچھی ؟

چندرا ۔ تم تو تین سال ولایت رہ کر بھی ....

رُوپ ۔ ولایت میں بھابی ایسی لڑکیاں کہاں ۔ آنکھوں کی لاج کا جو حُسن ہوتا ہے مغرب میں وہ مجھے بہت کم دکھائی دیا ۔

چندرا ۔ مجھے تو جیسے جیسے یہ لڑکی بڑھ رہی ہے اس کی چنتا ہی کھائے جا رہی ہے ۔

رُوپ ۔ گھر کا کام کرنے کے لئے ایسی لڑکی کسی بھی قیمت پر مہنگی نہیں ۔

چندرا ۔ وہ تو ٹھیک ہے ۔ پر .....

رُوپ ۔ ایسی لڑکی گھر کی زینت ہوتی ہے ۔ گھر کی خوبصورتی ہوتی ہے ۔ جہاں بیٹھے اس جگہ سے خوشبو آنے لگتی ہے ۔ جہاں کھڑی ہو وہ جگہ اچھی لگنے لگتی ہے ۔

چندرا ۔ وہ تو ٹھیک ہے ۔ پر اُس کی ماں کے بارے میں لوگ پتہ نہیں کیا کیا کہانیاں اُڑاتے رہتے ہیں ۔

رُوپ ۔ کوئی پھول کو اس لئے حسین نہ کہے کیونکہ وہ کیچڑ میں سے پیدا ہُوا ہے ۔ کوئی موتی کو اس لئے ہاتھ نہ لگائے کیونکہ وہ کوڑے پر سے ملا ہے ۔

چندرا ۔ وہ تو میں بھی مانتی ہوں پر ......

رُوپ ۔ کوئی اس کی آنکھوں کو دیکھے ، کوئی اس کے بالوں کو دیکھے ۔ اس کا انگ انگ کومل ، اچھوتا ، ہاتھ لگنے سے جیسے مَیلا ہو ۔

چندرا ۔ حُسن غریبی میں ، ناداری میں اور بھی نکھرتا ہے ۔

رُوپ ۔ ابھی میرے جُوتے صاف کر رہی تھی ۔ کتنی دیر تک چِک کے پیچھے کھڑا میں اس کی چوڑیوں کی جھنکار سنتا رہا ۔ جھن ...... جھن ..... جیسے کوئی اپسرا آسمان سے اُتر رہی ہو ۔ ایک مدھر سنگیت ......

چندرا ۔ تُو تو شاعری کرنے لگا ۔ ویسے لڑکی گاتی بھی ہے اور بہت اچھا گاتی ہے ۔ سچ !

رُوپ ۔ کام کرتے کرتے گاتی رہتی ہے (کان لگا کر سنتے ہوئے) شاید اب بھی

گنگنا رہی ہے۔

(بھابی دیور دونوں کان لگا کر سنتے ہیں۔ کچھ دیر گنگنانے کے بعد باہر رسوئی سے گانے کی آواز آنے لگتی ہے)

مینا۔ (باہر سے) دو پتر اناراں دے
ساڈی گلی آ بیٹھے کبوتر یاراں دے[1]

چندرا۔ کتنا پیارا گاتی ہے!

روپ۔ ماہئے کے یہ بول مجھے بہت پسند ہیں۔ کبھی میں بھی ایسے ہی گایا کرتا تھا

چندرا۔ مجھے یاد ہے۔ جس دن میری ڈولی آئی تھی اس رات آنگن میں بیٹھ کر تم نے ماہیا گایا تھا۔

روپ۔ اور اس کے دوسرے دن ہی میں ولایت چلا گیا تھا۔

چندرا۔ تم بھی تو بہت اچھا گاتے تھے۔ تمہارے بھائی صاحب آجائیں تو آج تمہارا گانا سنا جائے گا۔

روپ۔ کہاں بھابی۔ اب تو گیت جیسے مر گئے ہیں میرے سینے میں۔ کوئی وقت تھا جب گیت پھوٹ پھوٹ کر نکلتے تھے میرے روئیں روئیں سے — اٹھتے بیٹھتے میں گنگناتا رہتا تھا۔

چندرا۔ (پکارتے ہوئے) مینا۔! کیا چائے نہیں لائے گی آج؟

روپ۔ ابھی تک گنگنا رہی ہے۔

چندرا۔ کہتے ہیں اس کی ماں اپنے وقت کی مشہور گانے والی تھی۔

روپ۔ سنو بھابی...... ابھی تک گنگنا رہی ہے۔

چندرا۔ ہاں۔ کہتے ہیں اس کی ماں ڈھولک کے ساتھ بڑے گیت گایا کرتی تھی۔

روپ۔ سچ؟

چندرا۔ چائے لئے آرہی ہے۔

روپ۔ (باہر دیکھتے ہوئے) کیسے آرہی ہے، چائے کے برتن اٹھائے ہوئے۔ سمٹی سی، لجاتی سی۔

چندرا۔ چائے لا رہی ہے۔

روپ۔ اور گنگنا رہی ہے (گنگناتے ہوئے) دو پتر اناراں دے ساڈی گلی آ بیٹھے کبوتر یاراں دے۔

---

[1] انار کے دو پتے ہماری گلی میں پریتم کے کبوتر آکر بیٹھ گئے ہیں۔

(اتنے میں مینا داخل ہوتی ہے۔ ہنستی کلی سی مینا۔ کمرے میں روپ کو گنگناتا دیکھ کر جیسے ایک دم ٹھٹک کر رہ جاتی ہے۔ چائے کے برتنوں کی ٹرے اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے جا گرتی ہے۔ چائے کے برتنوں کو اس طرح ٹوٹتے دیکھ کر کمرے میں بیٹھے چندرا اور روپ چونک پڑتے ہیں۔ پر مینا ایک لمحہ کے لئے ویسی کی ویسی نشے میں آنکھیں بند کئے کھڑی رہتی ہے۔ پھر بجلی کی چمک کی طرح اس کا چہرہ بشاشت ہو اٹھتا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحہ ٹوٹے ہوئے برتنوں کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ ایک چیخ میں بدل جاتی ہے اور وہ بھاگتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے)

(دوسرا منظر)

(چائے کے برتن ٹوٹنے کے شور کے ساتھ آرکسٹرا کی گونج سنائی دیتی ہے اور جیسے ہی مینا چیخ مار کر باہر جاتی ہے، آرکسٹرا اور اونچا ہو جاتا ہے۔

— اور پھر اس سنگیت میں سے ڈھولک کی آواز ابھرتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک بیاہ والے گھر کی چہل پہل۔ پھر اس شور میں سے روپ کے ماہیا گانے کی آواز سنائی دیتی ہے

دو پتر اناراں دے
ساڈی گلی آ بیٹھے کبوتر یاراں دے

یہ گانا گھر والے سن رہے ہیں۔ اڑوس پڑوس والے سن رہے ہیں۔ مہمان سن رہے ہیں۔ نوکر چاکر سن رہے ہیں

(ایک کمرے میں جہاں نوکر کھڑے ہیں)

سمترا۔ مینا یہ تو چھوٹے کو کیسے پیار سے پیار رہا ہے۔ تجھے ڈر نہیں لگتا اگر پیالہ ٹوٹ جائے تو۔

مینا۔ (سنبھل کر) ہاں

سمترا۔ اگر ایسے ہی تجھے چھوٹے سرکار کی ڈھولک کے ساتھ تال دینا ہے تو آگے چلی جا۔

مینا۔ سمترا تجھے پیالے کے ٹوٹنے کا ڈر ہے۔ میرے جیتے کے ٹیڑھے ہو جلنے کا نہیں۔

سمترا۔ تب ہی تو میں کہتی ہوں آگے چلی جا اور بھی تو کئی تال دے رہی ہیں۔

مینا۔ ہائے ہمارے چھوٹے سرکار کتنا پیار لگاتے ہیں!

سمترا۔ سنا ہے کل ولایت جا رہے ہیں۔

مینا۔ سمترا بہن! ولایت بھلا کدھر ہوتی ہے؟

سمترا۔ دُور۔ بہت دُور

مینا۔ جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ چاہے کوئی ساری عمر چلتا رہے۔

سمترا۔ نہیں کوئی چل پڑے تو کون سی منزل ہے جو طے نہیں ہو جاتی۔

مینا۔ سچ سمترا!

(اک دم مینا پھر چلا پیالے پر مارنے لگتی ہے)

سمترا۔ پھر وہی بات۔ اری کیوں پیالے کو توڑنے پر تلی ہوئی ہے؟

مینا۔ پیالہ کیا ٹوٹے گا۔

سمترا۔ اگر کسی نے یوں تجھے تال دیتے ہوئے دیکھا تو آ کر تجھے اُٹھا لے جائے گا۔

مینا۔ سچ سمترا

(ابھی تک تال دئے جا رہی ہے)

سمترا۔ تو نے ایسے کہا ہے جیسے کاش تجھ کو کوئی اُٹھا کر لے جائے۔

مینا۔ مجھے کون اُٹھائے گا؟

سمترا۔ تجھ پر تو اوپر سے کوئی باز جھپٹے گا اور اُٹھا کر لے جائے گا

(ہنس پڑتی ہے)

مینا۔ یہ کوئی ہنسنے کی بات نہیں سمترا۔ مجھے تو رونا آ رہا ہے۔ تمہارا مطلب ہے کوئی بارات نہیں آئے گی۔ کوئی ڈھول نہیں بجیں گے، کوئی مہندی نہیں رچے گی کوئی ڈولی نہیں نکلے گی۔

سمترا۔ بارات وہاں چڑھ کر جاتی ہے جہاں بارات کا استقبال کرنے والا کوئی ہو۔

مینا۔ اگر میرا جنم کسی غریب کے گھر میں ہوا ہے تو اس میں میرا دوش کیا ہے ایک بادل سے بوندیں ٹپکتی ہیں۔ کوئی پپیہے کی پیاس بجھاتی ہے۔ کوئی پھول پتوں پر موتی بن جاتی ہے اور کوئی پتھر سے ٹکرا کر چھنٹا جاتی ہے۔

سمترا۔ آج تو کیسی باتیں کر رہی ہے؟

مینا۔ (نرم ہو کر) ہاں مجھے پتہ نہیں کبھی کیا ہو جاتا ہے؟ آج شام میں اندر کے کمرے کو جھاڑ پونچھ رہی تھی۔ پلنگ پہ بچھی چادر کو دیکھ کر میرا جی چاہا میں اس پر سو جاؤں

(ابھی تک تال دے رہی ہے)

سمترا۔ اری باتوں باتوں میں تو پیالہ توڑ دے گی۔

مینا۔ تو کیا ہوا؟ آج ہمارے چھوٹے سرکار کی بھابی آئی ہے۔ آج میں نے ایک پیالہ توڑ دیا تو کیا۔ ڈولی پر سے تو لوگ کتنا کچھ وار کر پھینک دیتے ہیں۔

آواز۔ (دُور سے) مینا۔

مینا۔ آئی۔

(چلی جاتی ہے۔ مینا کے جانے پر ڈھولک کے ساتھ گانے کی آواز اونچی ہو جاتی ہے۔ اس میں سے پھر سمترا کی آواز اُبھرتی ہے)

سمترا۔ (اپنے آپ سے) یہ لڑکی۔ یہ لڑکی جیسے آنکھ سے ڈھلکا ہوا کوئی آنسو ہو۔ یہ لڑکی اس کے موتی کے دانوں جیسے دانت۔ یہ لڑکی۔ یہ تو ہمارے بیچ نہیں رہے گی۔

(ڈھولک کے ساتھ گانے کی آواز پھر اونچی ہو جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے یہ آوازیں مٹ جاتی ہیں)

تیسرا منظر

(کچھ دن بعد۔ مینا بیٹھی برتن صاف کر رہی ہے۔ ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہی ہے۔ مد پترا نار آئی رے.... وقت شام کا ہے۔ پرچھائیاں ڈھل رہی ہیں۔ رسوئی میں اور کوئی نہیں)

سمترا۔ (آتے ہوئے) اری تو کب تک اس طرح بیٹھی برتن صاف کرتی رہے گی۔

مینا۔ ہاں بہن آج کچھ دیر ہی ہو گئی ہے۔

سمترا۔ رات ہو رہی ہے اور تو نے ابھی تک چائے کے برتن صاف نہیں کئے

مینا۔ میں سوچتی ہوں سمترا! میں کب تک یہ چائے کے برتن صاف کرتی رہوں گی

سمترا۔ اس زندگی میں ترقی کی منزلیں بہت دُور ہوتی ہیں۔ اب تو برتن مانجھتی ہے بچے کو کھلاتی ہے۔ پھر تو بچے کو کھلائے گی جھاڑ پونچھ کرے گی۔ پھر تو جھاڑ پونچھ کرے گی چائے بنائے گی۔ پھر تجھے سبزی بھاجی بنانی آ جائے گی۔ پھر تو کلیا پلاؤ اور کتنا کچھ اور بنا لیا کرے گی۔ پھر تو ایک دن بہت بڑھیا کھانا پکائے گی اور کھانا کھانے والا کوئی تیری طرف لپکے

دیکھے گا جیسے سردیوں میں کوئی آگ کی طرف دیکھتا ہے یا گرمیوں میں برف کی چمک کسی کو اچھی لگتی ہے اور تو سمجھے گی تیرا جنم سپھل ہو گیا۔

مینا۔ سمترا! جب تو ایسی باتیں کرتی ہے۔ تیری باتیں سخت سننے ہوں تو ک میں لگتی ہوں یہ وہ کتنا کڑوا کڑوا ہوتا ہے۔

سمترا۔ سَو سَو بار دن میں اس کڑوے زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بھی ہمیں کچھ نہیں ہوتا۔ میری ماں مرنے سے پہلے جس جگہ پر تھوکتی تھی وہاں چھید ہو جاتے تھے۔ وہ مجھے گالیاں دیتی، دن رات کوستی رہتی، مجھے تب بھی کچھ نہ ہوا۔ میں بڑھتی گئی بڑھتی گئی۔ جوان ہوتی گئی جوان ہوتی گئی — اور پھر ایک دن اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی ماں کی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ میری ماں کی قمیض مجھے تنگ تنگ گھٹی گھٹی کھنچی کھنچی لگ رہی تھی۔ میرے قد کو اس نے دیکھا۔ میرے بت کو اس نے نہارا اور اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔

مینا۔ خوش قسمت ہو بہن۔ تم نے اپنی ماں کو تو دیکھا ہے مجھے اپنی ماں کی کوئی یاد ہی نہیں۔

سمترا۔ غریبی سب سے بڑا پاپ ہے۔ کیچڑوں پر پڑی مٹی دھول کہہ کر جھاڑ دی جاتی ہے۔ وہی مٹی کمہار کے ہاتھوں میں ایک نیا روپ لے کر نکھرتی ہے۔ جس بات کے لئے غریب کو سولی پر لٹکنا پڑتا ہے وہی بات امیر کا من بہلاوا کہہ کر ہنسی میں ٹال دی جاتی ہے۔

مینا۔ ہائے تو کیسی باتیں کرتی ہے سمترا! مجھے تو امیر اچھے لگتے ہیں۔

سمترا۔ تجھے تو ہری گھاس پر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ پھولوں کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ تجھے تو پنکھوں والے ٹھنڈے کمروں میں اسانا اچھا لگتا ہے۔ پتہ نہیں اور کتنی دیر تو پرائے اُترنے پہن پہن کر اپنے روپ کو جھٹلاتی رہے گی۔

مینا۔ مجھے تو اپنے آپ کو اس طرح فریب دینا بڑا اچھا لگتا ہے۔

سمترا۔ تو پھر تو اپنے آپ کو اس طرح فریب دیتی رہ۔ میں تو چلی۔

(جاتی ہے)

مینا۔ اری سمترا بہن۔ سُن تو گھر والوں کا کھانا آج باہر ہے۔ ٹھہر جا باتیں کریں گے۔

سمترا۔ (دور سے) نہیں۔ مجھے کام ہے۔

مینا۔ چلی گئی (برتنوں کو صاف کرتے ہوئے اپنے آپ سے) یہ سمترا کیسی باتیں کرتی ہے! اس پیالے میں ہمارے چھوٹے سرکار چائے پیا کرتے تھے اس پیالے میں اب بی بی چائے پیتی ہے۔ اس پیالے میں میں نے بھی کئی بار چائے پی ہے۔ کسی کو کوئی چیز اچھی لگتی ہے۔ کوئی مانگ لیتا ہے، کوئی چھین لیتا ہے کوئی چرا لیتا ہے۔

(برتن صاف کرتے کرتے پیالہ ایک دم کسی اور پیالے سے ٹکرا کر جھنجھنا اُٹھتا ہے۔ اور مینا اس آواز پر جیسے چونک پڑتی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھیں نشے میں جھوم جاتی ہیں۔ پھر اس کا چہرہ کھل اُٹھتا ہے اور وہ جان بوجھ کر پیالے کو ٹکرا کر وہی آواز پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ آواز کبھی سریلی نکلتی ہے کبھی نہیں پھر بے اختیار وہ گانے لگتی ہے۔

دو پیر اناراں دے
ساڈی گلی آ بیٹھے بکوتر یاراں دے

اس طرح گاتی ہوئی مینا پیالے سے پیالہ ٹکرا کر تال لے رہی ہے۔ تب ہی اچانک پیالہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پر مینا جیسے نشے میں ڈوب گئی ہو۔ اس کی آنکھیں مست ہو جاتی ہیں)

سمترا۔ (آتے ہوئے) اری تو نے وہی بات کی نہ

مینا۔ (چپ ہے)

سمترا۔ اری تو نے پیالہ توڑ کر ہی دم لیا نا؟

مینا۔ (ابھی تک چپ ہے)

سمترا۔ اری تجھے ہو کیا گیا ہے؟ کیسے آنکھیں بند کئے نشے میں چور سی بیٹھی ہوئی ہے۔

مینا۔ (مست سی ہو کر) سمترا!

سمترا۔ کیوں؟ تجھے توڑنے کے لئے ایک اور پیالہ دوں!

مینا۔ سمترا بہن

سمترا۔ میں یہ پوچھتی ہوں۔ تیرے یہ کیسے لچھن ہیں۔ اس دن باتیں کرتے کرتے تو نے چُنری کے پلو کو پھاڑ ڈالا تھا۔

مینا۔ اری سمترا۔ تو مجھے یوں شرمندہ نہ کر۔

سمترا۔ تجھے شرمندہ تو ہونا ہی ہے ایک دن۔ لوگ نوکر برتن صاف کرنے کے لئے رکھتے ہیں برتن توڑوانے کے لئے نہیں۔ میں نے تجھے تب بھی کہا تھا۔ میں تجھے ہمیشہ کہتی رہتی ہوں۔ پیالے سے بھلا تال دینا کیسا۔ پر تو مانتی ہی نہیں۔ میں تو بابا چلی۔ اگر ابھی کوئی آ گیا۔ ڈانٹ چاہے تجھے ملے گی ڈر سے جان میری نکل جائے گی۔

(جاتی ہے)

مینا۔ (پیالے کے ٹکڑوں کو چُنتے ہوئے) سچ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ پیالوں کو میں بجاتی گئی۔ بجاتی گئی۔ بجاتی گئی۔ پھر پیالہ ٹوٹ گیا۔ پیالہ ٹوٹ گیا۔ تو مجھے لگا جیسے ۔۔۔ مجھے کیسے لگا؟ پیالے کا یہ ٹوٹا ہوا ٹکڑا ایسے لگتا ہے جیسے انار کا پتا ہو۔ یہ دوسرا ٹکڑا بھی بالکل اسی جیسا ہے ۔۔۔ انار کے دو پتے

(گنگناتے ہوئے)

دو پتر اناراں دے
ساڈی گلی آ بیٹھے ....

(اور اس طرح گا رہی ہوتی ہے کہ اس کی آواز دھیمی پڑ جاتی ہے پھر کھو جاتی ہے)

(چوتھا منظر)

(کئی مہینوں کے بعد گول کمرے میں مینا جھاڑ پونچھ کر رہی ہے۔ چندرا ساتھ والے کمرے میں سلائی کی مشین چلا رہی ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

چندرا۔ (دُور سے) مینا تو ٹیلیفون سن لے۔ دیکھ کون ہے۔

مینا۔ (ٹیلیفون سنتے ہوئے) ہیلو!

آواز۔ کون بول رہا ہے؟

مینا۔ جی میں مینا بول رہی ہوں!

آواز۔ چندرا بی بی جی ہیں؟

مینا۔ بی بی جی گھر میں ہی ہیں۔

آواز۔ آپ کون بول رہی ہیں؟

مینا۔ میں کون۔ جی میں۔ میں بی بی جی کو بلاتی ہوں۔

(ٹیلیفون میز پر رکھ کر ساتھ والے کمرے میں جاتی ہے)

چندرا۔ (ٹیلیفون اُٹھا کر) ہیلو

آواز۔ چندرا بھابی۔ میں سہگل بول رہا ہوں۔

چندرا۔ کیا حال ہے؟ کب آئے تم بمبئی سے؟ جب سے رُوپ گیا ہے تم نے تو کبھی شکل ہی نہیں دکھائی۔

سہگل۔ بھابی! آج ہی آیا ہوں بمبئی سے۔ میں نے سوچا ٹیلیفون پر حاضری لگوا لوں۔ پر پہلے یہ بتاؤ کہ یہ لڑکی کون تھی جو ٹیلیفون سُن رہی تھی؟

چندرا۔ کیوں، تمھیں کیا مطلب ہے؟

سہگل۔ بڑی پیاری آواز تھی۔ میں نے سوچا۔ پتہ نہیں کون ہے۔

چندرا۔ ہاں لڑکی بہت اچھی ہے۔

سہگل۔ کیا خوبصورت بھی اتنی ہے جتنی آواز پیاری ہے؟

چندرا۔ تم فلموں والوں سے بھگوان بچائے۔

سہگل۔ میری نئی فلم میں ایک ۱۴-۱۵ برس کی راجکماری ہے جس کے لئے میں ایک چہرہ ڈھونڈ رہا ہوں۔

چندرا۔ سچ؟

سہگل۔ ہاں میں مذاق نہیں کر رہا۔

چندرا۔ تو پھر لڑکی حاضر ہے۔

سہگل۔ پر یہ ہے کون؟

چندرا۔ (ہنستے ہوئے) میری نوکرانی ہے۔ کہو پسند ہے؟

(پھر ہنستی ہے)

سہگل۔ کیا مطلب ہے تمھارا۔ کیا ایک نوکرانی راجکماری کا پارٹ نہیں کر سکتی۔

چندرا۔ کیوں نہیں کر سکتی؟ زندگی کا پارٹ کرنا آسان ہے پر ویسے ایک درجے سے دوسرے درجے تک چڑھنا ذرا کٹھن ہے۔

سہگل۔ اچھا۔ رُوپ کی کوئی چٹھی آئی؟

چندرا۔ ہاں آج سویرے ہی آئی ہے۔

سہگل۔ کیا لکھتا ہے؟

چندرا۔ میں خط لکھواتی ہوں (آواز دیتے ہوئے) مینا! میری سنگھار میز پر روپ کی چٹھی رکھی ہے۔ ذرا لانا تو

سہگل: اس لڑکی کی آواز ہی پیاری نہیں نام بھی پیارا ہے۔

(مینا چٹھی لاکر چندرا کو دیتی ہے اور پھر اسی کمرے کو جھاڑنے پونچھنے لگتی ہے)

چندرا۔ لے سن۔ یہ چٹھی اس نے پیرس سے لکھی ہے (چٹھی پڑھتے ہوئے) "میں آج سویرے ہی لندن سے پیرس آیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے کچھ زکام ہو رہا تھا۔ اب میری طبیعت ٹھیک ہے۔ یوں جوں میں مغرب کے لوگوں کو دیکھتا ہوں ان کا رہن سہن دیکھتا ہوں۔ مجھے اپنا وطن یاد آتا ہے۔ اپنا گھر یاد آتا ہے۔ وطن کی محبت کیا ہوتی ہے اس کا پتہ وطن سے باہر آ کر چلتا ہے۔ اپنے وطن کے لوگوں کی قدر، اپنے وطن کی تہذیب و تمدن کی بڑائی کا احساس باہر آ کر ہی ہوتا ہے۔ میں تو ماں بیٹے کے ایک ٹیپے پر ...... "

(کمرے کی صفائی کر رہی مینا کے ہاتھ سے کانچ کا پھولدان ایکدم چھوٹ جاتا ہے اور فرش پر گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے)

چندرا۔ ہیں۔ یہ کیا تو نے توڑا ہے مینا! (ٹیلیفون میں) معاف کرنا سہگل اس چڑیل نے میرا پھولدان توڑ ڈالا ہے۔ تم ادھر تو آ ہی رہے ہو۔ باقی چٹھی آکر پڑھ لینا۔ اچھا نمستے۔

(ٹیلیفون رکھ کر جاتی ہے)

سمترا۔ (باہر سے آتے ہوئے) یہ کیا ٹوٹا ہے۔ آواز باہر رسوئی تک گئی ہے۔

چندرا۔ اس لڑکی کے ہاتھوں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے جیسے طاقت ہی نہ ہو۔

سمترا۔ اتنا بھاری پھولدان تجھے کا ہے کو صاف کرنا تھا مینا؟

چندرا۔ قالین کا ستیاناس الگ ہو گیا ہے۔ میں کہتی ہوں تیرا دھیان کہاں اڑا رہتا ہے؟

سمترا۔ دھیان کہاں اٹے گا بے چاری کا۔ آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

چندرا۔ (نرم پڑتے ہوئے) تو پھر کیوں کام کر رہی ہے۔ جا کر آرام کرے۔ اور یہ پھولدان بھاری بھی تو کتنا ہے۔ اچھا ہوا اس سے جان چھوٹی۔ مجھے تو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔

سمترا۔ جا مینا۔ تو جا آرام کر۔ یہ ٹکڑے میں چن لیتی ہوں۔

(مینا اپنے خیالوں میں کھوئی باہر جاتی ہے)

چندرا۔ سمترا! ایک پیالہ چائے کا بنا کر اسے دے دینا۔

سمترا۔ بی بی جی اس بے چاری پر ناراض نہ ہوا کریں۔ آپ کے سوا اس کا کون ہے۔

چندرا۔ میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ میرے گھر کی تو یہ رونق ہے۔

سمترا۔ کل اسے کسی نے کچھ کہہ دیا تھا۔ ساری رات اس کی آنکھ نہیں لگی۔

چندرا۔ کیا کہہ دیا کسی نے اس کو۔

سمترا۔ پتہ نہیں لوگ کیا کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں۔

چندرا۔ ہاں (ٹالتے ہوئے) لوگوں کی باتوں کا کیا ہے۔

سمترا۔ لڑکی اچھی ہے۔

چندرا۔ سچا موتی ہے۔

سمترا۔ اچھا بی بی جی میں ان ٹکڑوں کو باہر پھینکتی ہوں اور دیکھوں مینا لیٹی بھی ہے کہ نہیں۔

(سمترا پھولدان کے ٹکڑے اٹھا کر باہر لے جاتی ہے)

چندرا۔ (اپنے آپ سے) کیسے گھبرا گئی تھی بے چاری۔ جیسے بیاہ لگا گئی ہو۔ خوف سے آنکھیں بند۔ ایک... بول بھی تو منہ سے نہیں نکلا۔ ہائے غریبی بھی کیا چیز ہے۔ ایسی لڑکی پر تو کوئی لاکھ پھولدان وار کر پھینک دے۔

(موٹر کا ہارن سن کر چندرا باہر جاتی ہے)

پانچواں منظر

(کئی مہینے اور گزر گئے ہیں۔ مینا رسوئی میں بالکل اکیلی ہے۔ اداس اور بے چین۔ کبھی دروازے میں کھڑی ہوتی ہے کبھی کھڑکی میں۔ پھر ایک پیالہ لے کر اسے دھیرے سے بجاتی ہے اور دوپٹہ اتار کر گنگنانے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک دو بار گنگنا کر چپ ہو جاتی ہے جیسے اسے تسکین نہ ہوئی ہو۔ پھر اٹھتی ہوئی، اکڑتی ہوئی اپنی چیزوں کے ایک پلہ کو مروڑتی ہوئی ایک شدید جذبے کے تحت میز پر رکھے پیالے کی طرف بڑھتی ہے اور اسے اٹھا کر

زمین پر پٹک دیتی ہے)

سمترا۔ (آتے ہوئے) مینا!

مینا۔ (چپ ہے آنکھیں بند ہیں جیسے نشے میں گم سم ہو)

سمترا۔ مینا تو نے یہ کیا کیا۔

مینا۔ (ابھی چپ ہے)

سمترا۔ (میں پوچھتی ہوں تجھے یہ ہو کیا گیا ہے؟ پہلے اکڑی اکڑی تو دروازے میں کھڑی رہی۔ پھر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ پھر دروازے میں پھر کھڑکی میں۔ مسل مسل کر یہ کیسے تو نے چنری کے پلو کو پھاڑ ڈالا ہے اور پھر پیالے کو تو نے کس طرح فرش پر پٹکا۔ کبھی کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ تجھے ہو کیا گیا ہے۔

مینا۔ (نشے میں) سمترا — !

سمترا۔ میں پوچھتی ہوں کوئی کب تک تیری ان حرکتوں پر پردہ ڈالے رکھے گا۔ اس دن تیرے ہاتھوں سے گلاس چھوٹ گیا۔ اگلے دن شیشی تیرے ہاتھوں سے پھسل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پلیٹ جو بلی کے نام لگ رہی ہے مجھے پتہ ہے وہ بھی تیرے ہی کرتوت ہیں۔ روشندان کے شیشے کو صاف کرتے ہوئے اس دن تو نے اپنے ہاتھوں کو لہولہان کر لیا۔ بی بی بے چاری نے افسوس میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا اور اپنے زخم کو دیکھ کر تجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ تجھے ہنسنا چاہیئے یا رونا چاہیئے۔

مینا ۔ سمترا! کل رات سپنے میں میں نے دیکھا۔ جھولا جھولتی ہوئی میں اوپر چڑھتی گئی۔ چڑھتی گئی اور بادلوں کے پیچھے جا کر چھپ گئی۔

سمترا۔ تیرا بس چلے تو تو تاروں میں جا بسے۔

مینا ۔ نہیں سمترا یہ دنیا بڑی میٹھی ہے۔

سمترا۔ (طنزاً) روشن دان کے شیشے صاف کرتے ہوئے انگلیاں چاہے لہولہان ہو جائیں — یہ دنیا تو بڑی میٹھی ہے۔

مینا ۔ ہاں یہ دنیا تب بھی میٹھی ہے۔

سمترا۔ کسی کے لئے ٹوسٹ گرم کرتے ہوئے چاہے ہمارے ہاتھوں پر چھالے پڑ جائیں۔ کپڑے کوئی میلے کرے دھو دھو کر ہم تھکے ہاریں۔ ہائے کئی کپڑوں سے کتنی بدبو آتی ہے۔ سویرے منہ اندھیرے چولہے میں ہر روز آگ جلانا۔ میں تو ہاتھ جوڑتی رہتی ہوں۔ اور جب آگ جل جاتی ہے تو لاکھ لاکھ شکر کرتی ہوں پرماتما کا۔ اور اسی طرح ایشور سے یہ چھوٹی چھوٹی مرادیں مانگتی میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں۔

مینا۔ تجھے پتہ ہے سمترا! ولایت سے ہمارے چھوٹے سرکار نے لکھا ہے کہ وہاں نوکر نہیں ہوتے۔ کوئی بڑا نواب یا رئیس ہی نوکر رکھتا ہے۔ باقی سب اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔

سمترا۔ اور یہ بھی تمہیں پتہ ہے کہ روپ واپس آ رہا ہے۔ ہوائی جہاز میں۔ کل وہ یہاں پہنچ جائے گا۔

مینا۔ سچ سمترا؟

سمترا۔ ہاں سویرے اس کا تار آیا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ تمہیں پتہ ہوگا۔

مینا۔ میں تو کتنی دیر سے کوٹھی میں گئی ہی نہیں۔

سمترا۔ تجھے برتن توڑنے سے فرصت ملے تو اور کوئی کام بھی سوجھے۔

(دونوں ہنس پڑتی ہیں)

مینا ۔ ہائے کیسی گھٹا چھائی ہے۔ شاید بارش ہوگی۔

چندرا ۔ (کوٹھی میں سے آواز دیتے ہوئے) سمترا!

سمترا ۔ جی آئی۔ (جاتی ہے)

مینا۔ (اپنے آپ سے) آج کیسی گھٹا چھا رہی ہے۔ امڈ گھمڈ کر جیسے بادل آ رہے ہیں۔ یہ تو برسیں گے

(کھڑکی سے آکاش کی طرف دیکھتی ہوئی گنگنانے لگتی ہے)

دو پیڑ اناراں دے .....

باہر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے جس کے ساتھ گول کمرے والے پہلے منظر کی موسیقی مل جاتی ہے۔

پہلا منظر

(جب سنگیت ختم ہوتا ہے تو منظر پھر گول کمرے کا ہے۔ ایک طرف ٹرے کے سب برتن ٹوٹے پڑے ہیں دوسری طرف چندرا اور روپ گھبرائے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ مینا بھاگ کر جا چکی ہے۔ روپ بیٹھا برتنوں کو سمیٹ رہا ہے۔ برتنوں کی آواز ——)

چندرا۔ روپ تم کیوں ٹوٹے ہوئے برتن اُٹھا رہے ہو۔ سمترا آکر سمیٹ لے گی۔
روپ ۔ کوئی بات نہیں بھابی۔
چندرا۔ اس چڑیل کو کیا ہو گیا ہے
روپ (ہنستے ہوئے) شاید نظر لگ گئی ہے۔
چندرا ۔ سارا قالین خراب کر دیا۔
روپ ۔ اندر پاؤں رکھتے ہی ایک نظر اس نے دیکھا اور پھر جیسے اس کے ہاتھوں
سے برتن پھسل گئے، اس کی آنکھیں جیسے مُند گئیں ۔ پھر اس کے گال
خوشی سے تمتما اُٹھے ۔ لمحہ بھر کے لئے۔ اور پھر ٹوٹے ہوئے برتنوں کو دیکھ
کر گھبراہٹ میں اس کی چیخ نکل گئی ۔
چندرا ۔ اور کیسے وہ بھاگ کر چلی گئی ہے ۔
روپ (کھڑکی کی طرف جاکر) دیکھوں بھلا گئی کدھر ہے ؟
چندرا جائے گی کہاں ۔ یہیں کہیں ہوگی ۔
روپ ۔ (کھڑکی کا پردہ اُٹھاکر باہر دیکھتے ہوئے) چنری آنگن میں گری پڑی ہے۔
چندرا ۔ دیکھوں ۔ بے چاری ڈر گئی ہے ، کتنی بھولی ہے ۔
روپ ۔ وہ تو نہیں سامنے لان کے کونے میں ۔
چندرا۔ کہاں ؟
روپ ۔ گلاب کی اوٹ میں ۔ آلوچوں کے پیڑ کے نیچے ۔
چندرا۔ ہاں ہاں وہی ہے ۔
روپ گا بھی رہی ہے شاید۔

چندرا۔ ہاں گا رہی ہے (گانا آہستہ آہستہ سے اونچا ہوتا ہے)
روپ ۔ ہاں گا رہی ہے ۔
چندرا۔ دیکھا تو نے کیسی الھڑ ہے ۔
روپ ۔ گا رہی ہے ۔ دو پتر اناراں دے (گانا اور اونچا ہو جاتا ہے)
چندرا۔ چڑیل۔
روپ دو پتر اناراں دے
ساڈی گلی آ بیٹھے کبوتر یاراں دے
چندرا۔ ماہیئے کے یہ بول تو نے اس دن گائے تھے جس دن میری ڈولی آئی تھی ۔
روپ ۔ کتنا پیارا گاتی ہے!
چندرا کتنی الھڑ ہے !
روپ ۔ جیسے کوئی منزل پر پہنچ جاتا ہے
چندرا ۔ کتنی بھولی ہے !
روپ (اپنے آپ سے) کئی لوگوں کی منزل کتنی پاس ہوتی ہے
چندرا۔ (اپنے آپ سے) پگلی ہے ۔
روپ ۔ (اپنے آپ سے) منزل جتنی پاس ہوتی ہے کئی بار اتنی ہی دُور نظر آتی ہے
چندرا۔ (اپنے آپ سے) چڑیل نہ ہو تو
روپ بھابی! یہ یہ کتنا پیارا گاتی ہے ۔
چندرا۔ تیرے بھائی صاحب جب آئیں گے میں کہوں گی روپ کو مینا کا گانا بہت پسند ہے
(مینا کا گانا اونچا ہو کر سارے کمرے کو بھر لیتا ہے)

کشمیر کے بے گھر اشخاص کی بحالی کے لئے اقدامات

وزارتِ بحالیات کی پالیسی کے مطابق جموں اور کشمیر کی حکومت اپنی ریاست کے کشمیری بے گھر اشخاص کو گرانٹس اور بحالی قرضے دے کر ان اشخاص کی بحالی سے متعلق پروگرام کو آگے لے جا رہی ہے ۔ چناں چہ ۱۹۵۵-۵۶ء کے دوران میں اس مقصد کے لئے ریاستی حکومت کو دس لاکھ ۴۳ ہزار روپے گرانٹ کے طور پر اور ۶۵ لاکھ ۶۳ ہزار روپیہ قرضے کی شکل میں دئے گئے تھے ۔

جموں میں بے گھر اشخاص کے لئے ایک بستی بسائی جا رہی ہے جس میں کل دو ہزار گھر تعمیر ہوں گے ان میں سے ۴۰۰ تیار ہو چکے ہیں اور باقی سال رواں میں تعمیر ہوں گے ۔ اودھم پور میں ۱۰۰، سندربنی میں ۹۵ نیز راجوری اور نوشہرہ میں ۵۰-۵۰ گھر تعمیر کرنے کے لئے جو ابتدائی انتظامات ضروری ہیں وہ کئے جا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ۴۰ لاکھ روپیہ ان اشخاص کی امداد کے لئے بھی منظور کئے گئے تھے جنھیں سرحدی حملوں کی وجہ سے نقصان پہنچا۔

فضا ابنِ فیضی

محرابِ غزل

صبح سامانیٔ رخسارِ نگاراں ہے غزل
کون کہتا ہے کہ اک "جنّتِ ویراں" ہے غزل

ہو کسی یارِ سمن بر کا سراپا جیسے
سیمِ پیشانی و لعلِ لبِ خنداں ہے غزل

تیری آواز کا رس، تیری اداؤں کا نشہ
تیرے لہجے کی نسیمِ طرب افشاں ہے غزل

تیرے جورِ کرم آمیز کا پندارِ جمیل
تیرے لطفِ ستم انگیز کا عنواں ہے غزل

کبھی سیرابِ محبت، کبھی واماندۂ شوق
ہے کبھی درد کبھی درد کا درماں ہے غزل

کبھی دُوری کی کشاکش، کبھی قربت کا پیام
آشنائے روشِ حُسنِ گریزاں ہے غزل

کبھی اِک محشرِ وارفتگیٔ اہلِ نشاط
اور کبھی انجمنِ سینہ فگاراں ہے غزل

کبھی لپٹی ہوئی "ھُو" میں دلِ صوفی کی خراش
کبھی رامشگریِ بادہ گساراں ہے غزل

عصرِ حاضر کے تقاضوں میں ہے پیچیدہ کبھی
کبھی وادیٔ قدامت میں پریشاں ہے غزل

کبھی اسرار و حکم اور کبھی سرمستیٔ عشق
کتنی مشکل ہے غزل کس قدر آساں ہے غزل

اُف رے یہ فکر کا ٹھہراؤ، یہ جذبات کی رَو
کبھی ساحل ہے غزل اور کبھی طوفاں ہے غزل

لاکھ پردوں میں بھی چھپ کر جو نمایاں ہی رہا
فکر و احساس کا وہ "شعلۂ عریاں" ہے غزل

بزمِ غالب میں ہے سرمایۂ علم و حکمت
لبِ مومن پہ "خموشی اثر افغاں" ہے غزل

موجِ پیمانۂ حافظ، تپشِ سینۂ میر
مستیٔ بادۂ خیّام کا عنواں ہے غزل

ہائے رے جلوہ گہِ فکر میں شوخیٔ ادا
شاہدِ فتنہ گر و عربدہ ساماں ہے غزل

یہ تراشی ہوئی ترکیبوں کا نکھرا ہوا حُسن
سروِ آراستۂ صحنِ گلستاں ہے غزل

استعارے کی ہے شوخی کہیں تشبیہ کا رنگ
کاروانِ سمن و سنبل و ریحاں ہے غزل

زلفِ الفاظ کے اُف رے یہ سنوارے ہوئے خم
اپنے نکھرے ہوئے انداز پہ نازاں ہے غزل

اللہ اللہ رے یہ سادگیٔ طرزِ بیاں
شوخیٔ فکر سے صد خلد بداماں ہے غزل

وہ روانی ہے کہ جیسے کوئی چلتی ہوئی موج
ہو بہو صورتِ فردوسِ خراماں ہے غزل

فکر و تمثیل و نظر، جذبہ و احساس و شعور   فن کے اقدارِ حسیں کا چمنستاں ہے غزل

حکمت و فلسفہ و عقل و جنوں کی چلمن   سوز و مستی و تصوف کا شبستاں ہے غزل

ہے ہر اک مصرعِ تر جلوۂ سیمائے بہار   شاعری ہے پہر کنعاں، مہِ کنعاں ہے غزل

ایک اک حرف ہے اوڑھے ہوئے خوشبو کی ردا   نکہتِ گیسوئے افکار پریشاں ہے غزل

معترف اس کی نزاکت کی ہے ہر صنفِ سخن   اپنی رعنائی کا فخر سے پشیماں ہے غزل

فکرِ شاعر کو عطا کرتی ہے جذبے کا خلوص   جذبہ و فکر کے اخلاص کا عرفاں ہے غزل

محملِ فکر و نظر، بت کدۂ شعر و ادب   لذتِ عیشِ تخیل کا شبستاں ہے غزل

فیض سے اس کے ہے سے ریز رگِ ابرِ قلم   فکر کی شوخیٔ بیدار کا عنواں ہے غزل

اک چہکتا سا نشہ، اک مہکتا سا خمار   رس میں ڈوبے ہوئے شعروں کا نمستاں ہے غزل

جو دھڑکتا ہے ان اشعار کے سینے میں وہ دل   جو ٹپکتا ہے قلم سے وہ گلستاں ہے غزل

ذہن اک پھول ہے اس پھول پہ شبنم کی طرح   گرمیٔ پرتوِ افکار سے لرزاں ہے غزل

وادیٔ فکر میں اک جوئے سبک رو کی طرح   سرخوش و رقص کناں و زمزمہ ساماں ہے غزل

دیکھ! اس نغمۂ سرشار کی گیرائی دیکھ!   لطفِ موسیقیٔ احساسِ فراواں ہے غزل

لبِ اظہار تک آتی ہے بڑی مشکل سے   قلبِ عشاق کی وہ حسرتِ پنہاں ہے غزل

تپشِ دل میں ہیں آلودہ حکایاتِ جنوں   شعلۂ آتشِ الفت کا نیستاں ہے غزل

قلبِ حوا کی کسک، پہلوئے آدم کا فشار   ماجرائے خلشِ سینۂ یزداں ہے غزل

روحِ کونین بلا واسطہ کرتی ہے خطاب   ملہمِ خلوتِ آگاہی و عرفاں ہے غزل

ساغرِ دیر و حرم کی نہیں پابند یہ مے   بہرۂ گبر نہ میراثِ مسلماں ہے غزل

شفقِ شام کا منکر نہیں یہ لو یہ سحر   کفر کی گود کا پالا ہوا ایماں ہے غزل

عقلِ زرخیز و نم آلود ہے جس سے وہ جنوں   جس سے دامن ہے عبارت وہ گریباں ہے غزل

سوزشِ تازہ کا گہوارہ ہے مسکن اس کا   پرتوِ جلوۂ صد مہرِ درخشاں ہے غزل

جو نہ ٹپکے کبھی آنکھوں سے وہ خونابۂ دل   جو نہ نکلے دلِ شاعر سے وہ ارماں ہے غزل

شاعری میں سے سبکدوش نہ ہوگی ہمہ عمر   سر یہ الفاظ و معانی کے جو احساں ہے غزل

فاش اب تک نہ ہوا مجھ پہ مگر اس کا مقام
غمِ جاناں ہے غزل یا غمِ دوراں ہے غزل

اثر لکھنوی

اُردو کی دو تازہ مطبوعات

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے ڈی لٹ نے حال میں دو کتابیں شائع کی ہیں جو موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں اور کئی حیثیتوں سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کرتی ہیں۔

پہلی کتاب "مرقع شعراء" ہے جس میں دس شاعروں کے باستثناء مرزا جانِ جاناں مظہر دہلوی جن کے صرف حالات مع سہ رنگی قلمی تصویر، نمونۂ کلام درج ہیں۔ کتاب کے مؤلف کا نام یا حالات کا پتہ نہیں چلتا مگر جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش لفظ میں فرمایا۔ وہ ہندو اور سکسینہ کائستھ تھے۔ یہ اجزاء کسی مبسوط کتاب کے اوراقِ پریشاں معلوم ہوتے ہیں۔ جن دس شاعروں کی تصویریں، حالات اور نمونۂ کلام موجود ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ رائے جسونت سنگھ پروانہ لکھنوی	۲۔ رائے ٹیکا رام تسلی لکھنوی
۳۔ جعفر علی حسرت دہلوی (استادِ جرأت)	۴۔ میر ضیاء الدین ضیا دہلوی
۵۔ مکند لال (فدائی بیگ) فدوی لاہوری	۶۔ دیوانی سنگھ (مرزا محمد حسن) قتیل فریدآبادی
۷۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی	۸۔ کرپا دیال سکسینہ عرف کنور سین مضطر لکھنوی
۹۔ مرزا جانِ جاناں مظہر دہلوی	۱۰۔ میر محمد تقی میر

کتاب کی اہمیت کی طرف حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے عالمانہ پیش لفظ میں توجہ دلائی ہے۔ میں اس پر اضافہ نہیں کر سکتا اور اُسی کے اقتباسات درج کئے دیتا ہوں۔

۱۔ اگر تذکرہ کے ان اوراق میں اور کچھ نہ ہوتا صرف میر تقی اور حضرت مرزا مظہر کی تصویریں ہوتیں جب بھی ان کی غیر معمولی قدر و قیمت کا ہمیں اعتراف کرنا پڑتا۔

۲۔ جنابِ موصوف نے کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا مظہر نے ۱۱۹۵ھ میں شہادت پائی حالانکہ اصل کتاب میں سالِ ہجری یکہزار و یکصد و پنج یعنی ۱۱۰۵ھ درج ہے۔ صحیح سنِ شہادت مولانا ہی کا تحریر کردہ ہے۔ اصل نسخے میں غالباً پنج سے قبل نود (۹۰) لکھنا رہ گیا ہے۔

۳۔ میر کی تصویر مولوی محمد حسین آزاد کے بیان کردہ حلیہ سے بالکل مختلف ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی توجیہ قرینِ قیاس ہے کہ لکھنؤ میں قیام کے بعد میر نے وہی وضع اختیار کر لی تھی جو لکھنؤ میں رائج تھی کیونکہ تصویر کے مستند ہونے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

تذکرے کی زبان جیسا اُس زمانے کا دستور تھا فارسی ہے۔

اس تذکرے کے علاوہ قتیل کا اردو کلام کہیں نہیں ملتا۔ خود مؤلف نے لکھا ہے کہ ریختے کے اشعار اُن کی (قتیل کی) بیاض سے باہر نہیں نکلے ہیں اور بڑی کوشش سے تھوڑے سے فراہم ہو سکے۔

ناظرین کی تفریحِ طبع کے لئے ان دسوں شاعروں کے تذکرے میں مؤلف نے اُن کے جو اشعار بطور نمونہ درج کئے ہیں ان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

۱۔ رائے جسونت سنگھ پروانہ لکھنوی

اے شمع کچھ خبر ہے کہ شب بزمِ ناز سے	تصویر تیری آنکھ میں پروانہ لے گیا
دیکھتے ہی اس کے چہرے پر بحالی آ گئی	زعفرانی رنگ جو تھا اس میں لالی آ گئی
جا ملا رندوں میں پھر پروانہ توبہ توڑ کر	جب گھٹا گردوں کے اوپر کالی کالی آ گئی

۲۔ رائے ٹیکا رام تسلی

ہائے اس کا نصیب کیا ہوگا	جس کا تو نے کہا کیا ہوگا
یوں تسلی سے تو نہیں ملتا	غیر نے کچھ سکھا دیا ہوگا
ہزار طرح سے سمجھے گئے جو واں سے تئیں	کوئی میرے تئیں سے باز آئے ہے
تجھ میں ہے نہ وہ پری میں ہے	تجھ میں جو آن بان ہے کافر

۳۔ جعفر علی حسرت

ہوا سے بال اُن زلفوں کے رخساروں پہ ہلتے ہیں
دلِ بیمار اب اُٹھ بیٹھ دونوں وقت ملتے ہیں

دوستوں کا دیکھنا اس دَور میں ہر دم کہاں
دم غنیمت ہے عزیزو تم کہاں اور ہم کہاں

کسے منظور تھا یوں تلخ کرنا زندگانی کو   ولے کیا کیجئے حسرت بلائے ناگہانی کو
کس کا ہے وہ جی جس پہ یہ بیداد کروگے   لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے
آشیاں ہی اُجڑ گیا اپنا   رہ کے اے باغباں کیا کیجئے
مفت مرتا ہے غم سے حسرت نام   ایک بیکس جوان، کیا کیجئے

۴۔ میر ضیا

میں نے کل پوچھا ضیا سے دل کو کیدھر کھو دیا
اس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

اب چلیں اپنی جستجو کے تئیں   ڈھونڈ کر اس کو تھک گئے ہیں ہم

دورِ خزاں میں یارب کیسی ہوا چلی ہے
گل ہو کے رہ گئے ہیں دیکھو چراغ کتنے

(ضیا کا یہ مطلع بہت مشہور ہے ؎
اک ہوک جگر میں اُٹھتی ہے کچھ درد سا دل میں ہوتا ہے
میں راتوں کو رویا کرتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے)

۵۔ فدوی لاہوری

کی آنکھ بند دیکھا تو موسم خزاں کا تھا   اک فرصتِ نگاہ میں جاتی رہی بہار
غافل گھڑی کی یاد سے دکھلا نہ ایک پل   آ آ کے قید میں بھی ستاتی رہی بہار

۶۔ مرزا تپش

اُس زلف کی کیا بات ہے آدھی اِدھر آدھی اُدھر
پھیلی یہ کالی رات ہے آدھی اِدھر آدھی اُدھر

زندہ کرو ہو مُردوں کو تم ایک آن میں   عیسیٰ کا معجزہ ہے تمھاری زبان میں
وے سب جو چل بسے ہیں اشارات پہ ترے   اُتریں گے پورے عشق کے تجھ امتحان میں
پکے کیسے جلے جلے ہیں ہم   وہ کہے ہے ابھی جلے ہیں ہم

(جلے جلے کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، جلے بلے چاہئیے۔ سند میں اسی کتاب سے ضیا کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

دل کے اب ڈھونڈنے سے کیا حاصل   جل گیا ہوگا بل گیا ہوگا

جلبلانا آج کل بھی مستعمل ہے۔ جھنجھلانا۔ غصّہ کرنا)۔ گل اتنے ہی اشعار تھے۔

۷۔ مصحفی

برہمن تقریر نہیں پیرو جواں کا   جوں غنچہ میں عقدہ ہوں پہ اپنی ہی زباں کا
بلبل خوش صفیر ہوں گلشنِ روزگار کا   کچھ میں نشید خواں نہیں زمزمۂ بہار کا

جو تو اے مصحفی راتوں کو اس شدت سے رووے گا
تو میری جان پھر کیونکر کوئی ہمسایہ سووے گا

(میر کا مطلع ہے اور لطف یہ ہے کہ مصحفی کی طرح مطلع میں تخلص بھی شامل ہے،
؎ جو اس شور سے میر روتا رہے گا   تو ہمسایہ کاہیکو سوتا رہے گا
بظاہر توارد ہوا ہے)۔

اسیر مر گئے لاکھوں قفس کدے کے قریب   کہا تھا آ کے کسی نے بہار آئی ہے

۸۔ مضطر لکھنوی

پھرتے ہی اس دشمنِ جاں کے خدائی پھر گئی
میرے نالوں کی زمانے میں دہائی مچ گئی

جو ہونی تھی ہوئی وہ بات ناصح   تری باتوں سے اب تو ڈر چکے ہم
مضطر مرا کیا کام کیا آہ رسا نے   دُنیا میں یہ جا کر مجھے بدنام کرائی
ملنے سے تو نہ ملنا ہی اچھا تھا آپ کا   چھریاں جگر میں مار چلے تم جبھی ملے

۹۔ مرزا مظہر

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے کی (سے) زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گُل اپنے باغباں اپنا

آتش ہجو شرارہ کھو کو مُلا کھو   مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو
خدا کے واسطے اُس کو نہ ٹوکو   یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

۱۰۔ میر

عیدِ آئندہ تک رہے گا گلا   ہو چکی عید تو گلے نہ ملا
(میں نے ایک تضمین کے ذریعے سے میر اور شیلے کو ملا دیا ہے :
" تو گلے نہ ملا "
چشمے دریا سے ہمکنار ہوئے   اور دریا ملے سمندر سے

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ملتے ہیں ایک دوسرے کے گلے
سسکیاں بھر رہا ہے ہر غنچہ گدگدا کر ابھی گئی ہے صبا
نہیں تنہا جہاں میں کوئی شے کہ خلاف اس کے وضعِ فطرت ہے

آہ تو مجھ سے کیوں نہیں ملتا
کچھ بتا تو سہی قصور مرا

مل گئے ہیں فلک سے کوہ بلند موج آغوشِ موج میں ہے بند
گل ہیں آپس میں محوِ سرگوشی دلبری ہے کبھی وفاکوشی
بھرے گود میں زمیں کو سے بحر ہے چاند سے حسیں کو سے
ہیچ لیکن ہے سب یہ چاہ یہ پیار مجھ سے ملتے ہیں جب ہے تجھ کو عار

" عیدِ آئندہ تک رہے گا گلا
ہو چکی عید تو گلے نہ ملا ")

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا
وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
بوئے گل اور رنگِ گل دونوں ہیں دل کش اے نسیم
لیک بقدر ایک دیک ، نگہ دیکھئے تو وفا نہیں
کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
ایک دیک ، چشمکِ پیالہ ہے ساقی بہارِ عمر
جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا
کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو ابکی خدا کے یہاں سے)

(۲)

دوسری کتاب " مثنویاتِ میر بخطِ میر " ہے - اس میں یہ چار مثنویاں ہیں :-
۱- مثنوی عشقیہ ۲- جنگ نامہ (نواب آصف الدولہ اور رہیلوں کی جنگ - یہ مثنوی میر کے مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہے) - ۳- مثنوی در بیانِ ہولی ۴- مثنوی در بیانِ بزم (نامکمل) -

پہلی مثنوی وہی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎
چمن سے عنایت کے بادام وار الٰہی دیاں دے مجھے مغز دار

مطبوعہ کلیات سے بعض اشعار میں خفیف سا اختلاف ہے - مثلاً مطبوعہ مثنوی میں یہ شعر اس طرح ہے ؎ اگر لوگ مارے گئے سر بسر ہوئی فتح اس کی ہے یہ طرفہ تر
قلمی بیاض میں ہوئی کی جگہ وے ہے اور یہی بہتر ہے - مطبوعہ شعر ہے ؎
کسو سے اگر ہو گئی لاگ سی درونی میں اس کی لگی آگ سی قلمی میں درونی کی جگہ " درونہ " ہے - عام لفظ درونی ہی ہے بمعنی اندر - درونہ یا درونا بھی مستعمل ہے مگر اس کے معنی اُلٹا پھوڑا یا سرطان ہیں - اسی طرح اور خفیف اختلافات ہیں - بیشتر مقامات پر قلمی نسخے کو ترجیح ہے جس سے اس کے اصل ہونے کی تصدیق ہوتی ہے - مثنوی کے خاتمہ پر جو عبارت ہے اس سے کوئی شک باقی نہیں رہتا -

" فقیر میر تمت تمام شد در منزلِ دریاباد روز دوشنبہ تاریخ سلخ بعداز دوپہر ۱۲۱۳ھ "

مثنوی جنگ نامہ سے جو غیر مطبوعہ ہے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ دریاباد اُس محلے کا نام تھا جس میں الماس علی خاں کی سرائے واقع ہے اور اب محلے کا نام عوام کی زبان پر میاں الماس کا امام باڑہ ہے (متصل سرائے معالی خاں) - کیونکہ اس مثنوی کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے :

" دریاباد در سرائے الماس علی خاں تمام گردید ۱۲۰۹ھ ہجری "

معلوم ہوتا ہے کہ اصل نسخے کے منتشر اوراق آگے پیچھے ہو گئے ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جو مثنوی ۱۲۱۳ھ میں ختم ہوئی وہ پہلے لکھی ہو اور جو ۱۲۰۹ھ میں تمام ہوئی وہ بعد کو درج کی جائے

اس مثنوی کے اختتام پر میر کی ایک غیر مطبوعہ غزل بھی ملتی ہے جو پوری کی پوری نقل کی جاتی ہے :-

رنج کی اس کے جو خبر گزرے رفتہ وارفتہ اس کا مر گزرے
ایک پل بھی نہ اس سے آنسو تھمے روتے روتے پہر پہر گزرے
جوئے خوں آنکھوں سے بہی شاید خون سے میرے وہ بھی در گزرے
مارے غیروں کو یا مرے عاشق کچھ نہ کچھ چاہیئے کر گزرے
رہِ جاناں سے ہے گزر مشکل جان ہی سے کوئی مگر گزرے
غنچہ ہو شرم سے اُن آنکھوں کی گلِ نرگس اگر نظر گزرے

(نظر بفتحِ اول و دوم منظم ہوا ہے صحیح بفتحِ اول و سکونِ دوم ہے - میر نے عام

تلفظ کا التباس کیا ہے۔ اس خاص موقع پر لطف اس سے دوبالا ہوگیا کہ نذر گزرد (یعنی صدقہ۔ نذر بفتحتین) کا پہلو بھی ردیف کی وجہ سے نکلتا ہے۔
الغرض دونوں کتابیں نایاب ہیں اور ان کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔

ان سے ہماری معلومات میں معقول اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں دونوں نسخوں کی کتابت اور طباعت اس قدر دیدہ زیب ہے کہ بس آدمی دیکھتا رہے بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اس شان کی کتابیں اس اہتمام سے آج تک شائع نہیں ہوئی تھیں۔

نغماتِ جوہر

(جوہر ٹونکی)

خوفِ دوزخ ہے نہ جنّت کی ہوس باقی ہے
میرے پیمانے میں روحِ گل و خس باقی ہے
فصلِ گل آئی ہے کس بے سروسامانی میں
آشیانہ ہے نہ باقی نہ قفس باقی ہے
کتنا گہرا تھا ترا رنگِ سیاست صیّاد
آج تک ذہن میں تصویرِ قفس باقی ہے
تو اگر چاہے تو لوٹ آئے گلستاں کی بہار
جوہر اب بھی تری فریاد میں رس باقی ہے

نظر سے پہلے تو سر جھکا ہے نظر ہے سجدے میں سر سے پہلے
قبولیت کا شرف نہ جانے کسے ملے تیرے در سے پہلے
اگر میسّر بھی حسن کو تھا تو خام تھا ذوقِ خود نمائی
حقیقتِ حسن کچھ نہیں تھی فسانۂ یک نظر سے پہلے
وہ حرفِ آخر کہ جس کی تصویر اشکِ غم پیش کر رہا تھا
مریضِ غم کی خموشیوں نے سنا دیا چشمِ تر سے پہلے
لگاؤ صیّاد سے ہے ایسا کہیں بھی بجلی گرے تڑپ کر
مجھے قفس کا خیال آتا ہے دفعتاً بال و پر سے پہلے

آج کل کا جنگِ آزادی نمبر

مئی ۱۸۵۷ء میں ہند میں آزادی کا ایک شعلہ لپکا تھا جسے سیاستِ افرنگ نے اپنے زعم میں بجھا دیا۔ مگر یہ آگ ہمارے سینوں میں دبی رہی اور آخر ۱۹۴۷ء میں آزادی کی وہ مشعل روشن ہوئی جو آج ساری دنیا کے امن پسندوں کے لئے شمعِ ہدایت ہے

آج کل اگست ۱۹۵۷ء کے خاص نمبر میں

جنگِ آزادی کے شہیدوں اور اُن کی جدّوجہد کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا

اس خاص نمبر میں حسبِ ذیل موضوعات پر مضامین ڈرامے، افسانے اور نظمیں ہوں گی۔

۱- ۱۸۵۷ء اور جنگِ آزادی سے متعلق ادب
۲- پچھلی صدی میں جذبۂ قومیت کو فروغ دینے والی سماجی، سیاسی تاریخی، اقتصادی اور ادبی تحریکیں
۳- ہند کی علاقائی زبانوں میں آزادی کا ادب

یہ آزادی نمبر ۱۲۰ صفحات پر مشتمل اور نادر تصویروں سے مزیّن ہوگا

(ادارہ)

اخلاق دہلوی

پنڈت کیفی

بابائے اردو علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کشمیری پنڈت تھے ان کا خاندان عہدِ فرخ سیر (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء) سے دہلی میں آباد ہے۔ اور دہلی کا معزز خاندان گنا جاتا ہے۔ علم و فضل اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔

پنڈت کیفی ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دیوالی کے دن دلّی میں پیدا ہوئے۔ دلّی ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ یہیں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس لئے نانا کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ جو ایک فاضل اور صاحبِ کمال بزرگ تھے۔

پنڈت جی کے والد بزرگوار کا نام پنڈت کنھیا لال تھا اور نابھہ میں پولس افسر تھے۔ کسی مقدمے کی تفتیش میں پٹیالی گئے اور وہیں مرگ باش ہو گئے۔ پنڈت جی کو اپنے والد کی جدائی کا بڑا قلق تھا۔ حتیٰ کہ ضعیفی کے عالم میں بھی جب وہ ذکر کرتے تھے تو گویا دل کے زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ وہ عہدِ جوانی میں اس مقام کو دیکھنے بھی گئے تھے۔

پنڈت جی کا بچپن دہلی بازار سیتا رام کے مشہور محلے لال دروازہ میں گزرا تھا جو اس وقت اہلِ کمال کا مجمع تھا۔ وہیں کے ایک مکتب میں اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ وہ مکان اب تک موجود ہے جس میں یہ مکتب تھا۔ بازار سیتا رام میں لبِ سڑک پنڈت پریم نرائن کی گلی کے سامنے ہے۔ پختہ اور نہایت شکستہ مکان ہے۔

ایک دن میں اور پنڈت جی وہاں سے گزرے تو مجھ سے کہا ٹھہرئیے بید سے اشارہ کر کے فرمایا۔ اندر دیکھئے۔ میں جھجکا مبادا کوئی مزاحم ہو مگر پنڈت جی کے اصرار پر جھانک کر اوچٹتی نظر سے دیکھ ہی لیا، کہنے لگے۔ "ہے نا داہنی جانب دالان" میں نے کہا "جی ہاں"۔ فرمایا، "یہ ہمارا مکتب ہے یہیں ہم بچپن میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ ایک مسلمان رئیس کا مکان تھا۔"

بات گئی گزری ہوئی، کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ واقعہ کبھی لکھنا بھی پڑے گا۔ مگر اب یہ تمنا ہے کہ اس مکان کو قومی ملک قرار دیا جائے اور اس پر کندہ ہو "کیفی کا مکتب" اور اسی میں کیفی لائبریری بھی ہو۔

ایک دن سہ پہر کے وقت جامع مسجد سے حوض قاضی (دہلی) کی طرف جا رہے تھے۔ بائیں پٹڑی پر تھے میں بھی ساتھ تھا۔ شاہ بولا کے بڑ کے پاس پہنچ کر ٹھیر گئے۔ مجھ سے کہا۔ اُدھر چلئے یعنی دائیں پٹڑی پر۔ اُدھر چلے۔ قبر[1] کے پاس سے مالی واڑے کو ایک گلی جاتی ہے۔ شاہ جی کا چھتہ اسے کہتے ہیں۔ چھتے میں جا کر رُک گئے اور ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اسے دیکھئے" اس کے دروازے پر لوہے کی سلاخوں کے کیواڑ تھے۔ میں نے کہا یہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف اس کا ایک بڑا دروازہ ہے۔ فرمایا "یہاں ورنیکلر مڈل اسکول تھا۔ ہم یہیں پڑھا کرتے تھے۔ مولوی سید احمد مصنفِ فرہنگ آصفیہ پڑھایا کرتے تھے۔ پڑھاتے کیا تھے، کاپیاں پروف پڑھتے رہتے تھے۔ ہم مانیٹر تھے، ہماری خوب چلتی تھی۔"

پھر فرمایا "وہ بھی تو عرب سرائے کے تھے آپ کے عزیز ہوں گے" میں نے عرض کیا۔ "جی ہاں! وہ میرے چچا ہوتے تھے۔ ان کی والدہ عرب سرائے کی تھیں۔ مجھے وہ خوب یاد ہیں۔ پستہ قامت، سفید ڈاڑھی، چندی چندی آنکھیں۔ سید حمید صاحب (امام جامع مسجد دہلی) ان ہی کے نواسے ہیں" میری یہ باتیں سن کر ایسے ہنسے جیسے دل کی کلی کھل گئی ہو۔

---

[1] اب قبر کی جگہ پیاؤ ہے۔

پھر کہنے لگے: "الغرض تو ہم نے پاس کر ہی لیا کسی نہ کسی طرح سینٹ اسٹیفنز کالج (کشمیری دروازہ دہلی) میں داخل بھی ہو گئے تھے۔ ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔ کیا کہیں اخلاق صاحب، ہوش سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ خیر! ہمیں ایک معقول اسامی مل گئی اور ہم جالندھر چلے گئے۔ کچھ دن وہاں رہے پھر کپور تھلہ چلے گئے۔ اور مہاراجا پرتاپ سنگھ کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے۔ پھر کشمیر لیجسلیٹو کونسل کے سیکرٹری ہو گئے اور مدتوں وہاں رہے۔"

لطیفہ

ایک دن پنڈت جی کرسی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ میں پشت کی طرف کرسی پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک دم منہ پھیر کر بولے "ہٹ جائیے" اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں بیٹھیے"۔ پھر بولے "ایک دن مہاراجہ ہری سنگھ (سابق مہاراجہ کشمیر) بھی اسی طرح آ کھڑے ہوئے تھے میں نے انھیں بھی بٹھا دیا تھا۔" میں نے عرض کیا "پنڈت جی وہ مہاراجہ تھے میں آپ کا خورد ہوں۔" کہنے لگے "خورد و بزرگ کی اس میں کوئی بات نہیں مجھے بار محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی گلا گھونٹنے کو کھڑا ہے۔"

بعد ازاں پنڈت جی کو اپنے لائق فرزند پیارے موہن کی جوان موت سے اتنا صدمہ ہوا کہ کمر ٹوٹ گئی اور خانہ نشینی اختیار کر لی، مگر علم و ادب کی خدمت میں لگے رہے اور ان کے بچوں کی پرورش کرتے رہے۔

پنڈت جی فضل و کمال میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ ایسے باکمال خال خال ہی ہوتے ہیں۔ انھیں اردو، ہندی، فارسی، انگریزی اور پنجابی زبان پر فاضلانہ عبور تھا۔ سنسکرت اور عربی میں بھی دخل تھا اور کام چلا لیا کرتے تھے۔ عربی صرف و نحو (ویاکرن) اور تجوید کی کتابیں ان کے مطالعہ کا جزو اور ان کی لائبریری کی زینت تھیں۔ حتیٰ کہ قرآن مجید بھی جزدان میں ملبوس ادب و احترام کے ساتھ ان کی الماری میں رہتا تھا۔ غرض کہ وہ ہفت زبان اور مستند لیاقت کے آدمی تھے۔ مگر ان کے مطالعے اور اُن کے کمالات کا تمام تر منافع اردو ہی کو ورثے میں ملا۔ جو ان کی مادری زبان تھی۔

شعر و شاعری سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ یہ ذوق انھیں اپنے ایک خاندانی بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیر دہلوی سے ورثے میں ملا تھا۔ پھر خواجہ حالی کی شاگردی بلکہ ان کے فیضِ صحبت نے اس ذوق کو اور بھی اُجاگر کر دیا تھا۔ پنڈت جی فرمایا کرتے تھے۔

"ہم نے خواجہ حالی سے شاعری تو بس ایسی ہی سیکھی تھی، البتہ ان کی صحبت سے ہمیں تنقید آ گئی۔" ایک دن کیفیہ کا مسودہ سامنے رکھا تھا۔ بہ سبیلِ تذکرہ فرمایا۔ "خواجہ حالی کی صحبت نے ہم سے یہ کتاب لکھوا دی۔" ایک دن کیفیہ کی طرف اشارہ کر کے کہا "ہم نے خواجہ حالی سے جو کچھ سیکھا وہ یہ ہے۔" غرضیکہ وہ خواجہ حالی کے بڑے مداح اور معترف تھے اور اکثر فیضِ صحبت کے ایسے واقعات سنایا کرتے تھے۔ جن کا علم خواجہ صاحب کے سوانح نگاروں کو بھی نہیں۔

بہر حال خواجہ حالی کی صحبت نے انھیں کندن بنا دیا تھا لیکن حق یہ ہے کہ مبداء فیاض نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ ایجاد و اختراع کی صلاحیت بھی ودیعت فرمائی تھی۔ جس کے پرتو نے ان کے ادب کو جگمگا رکھا ہے اور جو اردو کے لئے طرۂ افتخار ہے۔ انھوں نے کتنے ہی نئے لفظ اختراع کئے تھے، مثلاً الٹا نائٹ، تارید، سپاس، ادبی سمت جانی، ادبی نا دہی (ناداری)۔ دراصل وہ لسانیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور یہی ان کا ادبی شاہکار ہے۔ وہ کیفیہ کو زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ کہا کرتے تھے۔ کیفیہ کا موضوع بھی یہی ہے۔

نثر میں خیالات کو سلجھا کر ادا کرنے کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ الفاظ و محاورات برمحل ہوتے ہیں۔ زور اور روانی بھی خاطر خواہ ہے۔ البتہ ادبِ لطیف کی صنفِ نثر پر شکل نگاری کا بھی اطلاق ہوتا ہے جو اس کے شایانِ شان ہے۔ موضوعات کی شائستگی ان کا وصفِ خاص ہے۔ نثرِ اردو میں منشورات، کیفیہ، نہتارانا، مرادی واد اور ترجمۂ دریائے لطافت، ان کی یادگار ہیں۔

نظم میں خیالات نہ بلند ہیں اور نہ گہرے، نہ رنگین ہیں اور نہ فرسودہ و مبتذل بلکہ مفید و کار آمد ہیں اور شائستہ بھی، جدت و ندرت کا وصف خاص ہے۔ اسلوب کی پختگی اور محاورہ و روزمرہ میں ان کا کلام منفرد ہے۔ حتیٰ کہ جس کسی کو اسلوب پر عبور نہ ہو، وہ ادائے بیان سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ قدیم نظموں میں ثقیل الفاظ بھی ہے۔ نظم میں واردات، بھارت درپن، پریم ترنگی، جگ بیتی، غم خانۂ کیفی.... یادگارِ زمانہ ہیں۔

پنڈت کیفی کی تصنیفات پر تبصرہ ایک مستقل موضوع ہے۔ جو آئندہ کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پنڈت جی کی بعض کتابیں مثلاً کیفیہ، منشورات اور بھارت درپن ہندوستان و پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب رہ چکی ہیں اور اب بھی ہیں اور یہ مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔

پنڈت کیفی اوصاف و اطوار کے اعتبار سے جدید و قدیم تہذیب کے سنگم تھے۔ ان کے اوصافِ پسندیدہ کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کے جشنِ آزادی ۱۹۴۸ء کی تقریب پر کل پاکستان مشاعرۂ کراچی کی صدارت کیلئے ہندوستان سے پنڈت جی کو ہی بلایا گیا اور ناسازگار حالات کے باوجود انھوں نے وہاں جاکر صدارت کے فرائض انجام دیئے اور بڑی خوبی سے انجام دیئے جس کے فوٹو بھی اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔

پنڈت جی اردو کالج[1] دہلی کے بانیوں میں تھے اور خود بھی درس دیتے تھے۔ آخر دم تک کالج سے انھیں گہرا تعلق رہا۔ چناں چہ جون ۱۹۵۴ء کے فوٹو گروپ میں وہ صدر نشین ہیں۔

پنڈت جی پستہ قامت، خوش اندام اور دیدہ زیب آدمی تھے۔ سُرخ و سفید رنگ، پتلے پتلے ہونٹ، لمبی ناک، بڑے بڑے کان، بھرے ہوئے رخسار کشادہ پیشانی، سر پہ باریک اور ہلکے بال، آنکھیں البتہ چھوٹی تھیں اور چشمہ لگاتے تھے، عموماً سوٹ پہنتے اور ہیٹ لگاتے تھے۔ ہاتھ میں بید رکھتے اور بالکل یورپین معلوم ہوتے تھے، البتہ جب کسی مجلس میں جاتے تو شیروانی، فلٹ کیپ اور تنگ مہری کا پاجامہ پہنتے تھے، جاڑے میں جبہ بھی پہن لیا کرتے تھے۔

جملے ہلکے مختصر اور ٹھیر ٹھیر کر بولتے تھے۔ مگر اس طرح کہ دل میں اُترتے چلے جاتے تھے۔ شعر تحت اللفظ مگر خاص انداز سے پڑھتے تھے۔ مناسب محل وقفے سے کام لیتے۔ جس سے شعر میں جان پڑتی جاتی تھی یہی صورت مقالات پڑھنے کی تھی، البتہ جب تقریر کرتے تو شیر کی طرح گرجتے اور جتنا مجمع زیادہ ہوتا اُتنا ہی انشراحِ خاطر ہوتا اور مجمع پر چھا جاتے تھے۔

انجمن ترقی اردو ہند سے انھیں دیرینہ علاقہ تھا۔ مگر ۱۹۳۸ء میں جب انجمن کا مرکزی دفتر اورنگ آباد سے دلّی آگیا تو انجمن نے پنڈت جی کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں اور پنڈت جی دلّی میں رہنے لگے۔ ان کا کمرہ دفتر میں سب سے الگ تھا۔ ایک دفعہ جب بال بچے کسی تقریب سے لائل پور چلے گئے تھے اور ہری موہن (چھوٹا پوتا) ان کے پاس تھا تو پنڈت جی دفتر کے کمرے ہی میں رہنے لگے تھے۔ ایک دن گرمی کا موسم تھا مئی کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا میں جو پہنچا تو کمرے کے کیواڑ بند تھے۔ مگر وہ پیروں کی آہٹ سے پہچان گئے اور کہا "آجایئے" میں اندر گیا دیکھتا کیا ہوں کہ ہاتھ آٹے میں بھرے ہوئے ہیں، میں نے کہا "حضرت! یہ کیا؟" کہنے لگے "بھیوان (رسویا) صبح سے غائب ہے، ہری اب اسکول سے آتا ہوگا۔ دل نہیں مانا، اس کے لئے دو روٹیاں ڈال لیں، بھوکا ہوگا" یہ کام اور پنڈت جی کا مرتبہ میں حیران رہ گیا دراصل یہ بزرگانہ اور پدرانہ شفقت کا جذبہ تھا ورنہ

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

غالباً ۱۹۴۳ء تک وہ انجمن میں رہے اور علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے، انجمن کے پندرہ روزہ اخبار "ہماری زبان" کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے میں جیسے محققانہ اور ادبی مضامین ان کے قلم سے نکلے ایسے نہ کبھی پہلے نکلے تھے اور نہ اس کے بعد نکلے اور نہ آج تک پھر اسے یہ بات نصیب ہوئی۔

اس کے بعد پنڈت جی سخت علیل ہوگئے اور اپنے صاحب زادے سرنند موہن کے پاس لائل پور چلے گئے جو وہاں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ اور ۱۹۴۷ء تک وہیں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں تباہ و برباد ہوکر بمبئی پہنچے۔ جہاں اُن کے بڑے پوتے رام موہن جی ٹاٹا کمپنی میں کسی عہدے پر سرفراز تھے جو بعد میں امریکہ چلے گئے۔ پنڈت جی ان سے بہت ہی خوش تھے اور بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ اب وہ کہاں ہیں مجھے اس کا کچھ علم نہیں البتہ ہری موہن فوج میں کہیں کیپٹن ہیں۔

پنڈت جی بمبئی سے دلّی آگئے اور سرگباشی لالہ سری رام کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ کسی دن جامع مسجد آئے تو ملنے جلنے والوں سے مجھے بھی دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ میں زندہ ہوں اور یہیں ہوں۔ میرا ادھر گذر ہوا تو احباب نے بتایا۔ کہ پنڈت جی آئے تھے۔ فلاں جگہ مقیم ہیں۔ ملنے کے لئے کہہ گئے ہیں میں بہزار خرابی ملنے گیا۔ شیخ عبدالحق صاحب پراچہ میرے ساتھ تھے۔ پنڈت جی مجھے دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ کھڑے ہوکر ملے۔ گلے لگایا۔ سر پہ ہاتھ پھیرا۔ دیر تک باتیں کرتے رہے اور انسانیت سوز درندگی کو لعنت ملامت کرتے رہے۔ کہنے لگے "ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے دونوں ہاتھ سمجھتے تھے۔ دونوں ہی نے خوب لوٹا۔ جو کچھ یہاں تھا (ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں) وہ بھی لُٹا لاہور اور لائل پور میں بھی یار لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے" بیٹس بنس کے

---

[1] اردو کالج ۱۹۴۷ء سے قائم ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اردو امتحانات کی تیاری کرائی جاتی ہے، آج کل لال محل، حضرت نظام الدین اولیا نئی دہلی کی عمارت میں ہے۔

یہ باتیں کرتے رہے جیسے انھیں لٹنے کا کچھ رنج ہی نہیں۔

میرے حالات دریافت کئے۔ میں پہاڑ گنج (دہلی) میں رہتا تھا۔ تار تار میرا بھی لُٹ گیا تھا۔ گرمی کا آغاز تھا میں سرج کی گرم شیروانی پہنے ہوئے تھا ٹھنڈی شیروانی ابھی بنوائی نہیں تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ پنڈت جی کو یہ گرم شیروانی گراں گزر رہی ہے۔ جب میں رُخصت ہوا، تو بڑی تاکید سے کہا "پھر بھی آنا، ضرور آنا، جلدی آنا" میں نے وعدہ بھی کیا اور معذرت بھی، اس لئے کہ حالات کا تقاضا کچھ ایسا ہی تھا۔

الغرض کچھ دنوں بعد میں گیا تو کہنے لگے "خوب آئے" اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کہنے لگے "ایک بات ہم کہتے ہیں آپ مان لیں گے۔" میں نے کہا "کیوں نہیں"۔ اٹھے اور سوٹ کیس میں سے ایک ٹھنڈی شیروانی نکال کر لائے۔ نئی سلی ہوئی تھی اور فرم کا لیبل لگا ہوا تھا آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ آپ کو ہم دیتے ہیں۔" مجھے ایسا گمان بھی نہ تھا۔ میں ہچکچا سا رہ گیا۔ دل دھڑکنے لگا، ہاتھ کانپنے لگے، آنسو ڈبڈبا آئے، بول نہ سکا، جیسے کسی نے گلا دبا لیا ہو۔ میں نے نیم بے خودی کی حالت میں ہاتھ آگے بڑھا دیئے اور اسے لے کر سر پر رکھا۔ کہنے لگے "میاں کیا کرتے ہو، پہن کر دیکھو۔" میں نے ارشاد کی تعمیل کی، وہ میرے ٹھیک تھی، میرے ہی لئے سلوائی تھی۔ یہ واقعہ خود ایک حقیقت ہے تعریف و توصیف کا محتاج نہیں، وہ شیروانی میرے پاس آج تک ہے۔

سخت علالت کے باوجود پنڈت جی دلّی ہی میں مقیم رہے اور علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ لیکن وفات سے کچھ دن پہلے جب وہ نشست و برخاست سے بھی معذور تھے ان کے ایک عزیز انھیں غازی آباد لے گئے۔ جہاں وہ کچھ دن علیل رہنے کے بعد پہلی نومبر ۱۹۵۵ء کو منگل کے دن ۸۹ برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے، اور مخلوق کی راہ نمائی کے لئے علمی و ادبی خدمات یادگار چھوڑ گئے۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

خداوندِ عالم ان کی آتما کو شانتی بخشے اور سرگ میں انھیں بلند مرتبہ عنایت فرمائے۔ آمین۔

پنڈت کیفیؔ کا سانحۂ ارتحال اردو ادب و زبان کے لئے عظیم ترین حادثہ ہے۔ جس کی تلافی ممکن نہیں ان کی وفات سے دلّی کی تاریخ کا ایک روشن پہلو روپوش ہو گیا، گویا کہ ع

ان کے مرنے سے مر گئی دلّی

موصوف کی تمام عمر اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزری اور ایسے زمانے میں کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل گئے، مگر وہ اردو کے جائز حق سے دست بردار نہیں ہوئے اور مرتے دم تک اپنے اصول پر قائم رہے کردار کی یہ مضبوطی قابلِ تقلید ہے۔

حق یہ ہے کہ وہ ادیب تھے، شاعر تھے، زباں داں تھے اہلِ زبان تھے اور نفسیاتِ زبان کے ماہر تھے اور اس وصف میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا وہ منفرد اور یکتا تھے اسی طرح ان کی گراں قدر تصنیفات اور علمی موشگافیاں ہمیشہ اہلِ علم کی راہ نما رہیں گی اور منزلت پائیں گی

موصوف پرماتما اُن کی آتما کو شانتی بخشے، مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ مجھے اُن کی رحلت سے قلبی صدمہ پہنچا اور ایسا محسوس ہوا کہ اب دنیا میں میرا کوئی رہا ہی نہیں۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

نئے پیسے کے ڈاک کے ٹکٹ

یکم اپریل، ۱۹۵۷ء سے عشری سکوں میں ڈاک کے ٹکٹوں کا نیا سلسلہ جاری کر دیا گیا ہے۔ ٹکٹوں کے دو سلسلے جاری کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک عام استعمال کا اور دوسرا "سروس" کا ہے۔ عام سلسلے کی ٹکٹیں گیارہ اقسام کی ہیں۔ اگرچہ ان کا ڈیزائن یکساں ہے لیکن ہر قسم کے رنگ مختلف ہیں۔ سروس کی ٹکٹیں ۹۔ اقسام کی ہیں اور ان کا ڈیزائن ٹکٹ کے موجودہ سلسلوں جیسا ہے۔

ان ٹکٹوں میں نئے سکوں کی رقم مختصر طور پر ہندی اور انگریزی میں ظاہر کر دی گئی ہے۔

چیخوف

ترجمہ۔ ہنس راج رہبر

حادثہ

پیوتر پیترووچ ایک نام سنسکار کی دعوت سے دو بجے رات گھر لوٹا۔ وہ کرنل کی بیوہ اوانوف کا بھتیجا تھا اور اس کے ننھے دستانے گذشتہ سال چوری ہو گئے تھے۔ اس خیال سے کہ گھر کے دوسرے لوگوں کی آنکھ نہ کھل جائے وہ اپنی چیزیں برآمدے میں لے آیا۔ سانس روکے ہوئے اور دبے پاؤں وہ اپنے کمرے میں گیا اور بغیر موم بتی جلائے ہی سونے کی تیاری کرنے لگا۔

پیوتر پرہیزگاری کی زندگی بسر کر رہا تھا اس کے چہرے سے زہد اور تقدس نمایاں تھا۔ وہ مذہبی اور کریکٹر کو مضبوط بنانے والی کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھتا تھا۔ لیکن نام سنسکار کی پارٹی میں اس بات سے خوش ہو کر کہ اس نے زندگی کی پہلی منزل کامیابی سے طے کر لی ہے اس نے چار گلاس وُوڈکا اور ایک دہسکی نوش کی تھی جس کا ذائقہ تند اور ترش تھا۔ شراب سمندر کے پانی اور شہرت کی طرح جتنی پیؤ پیاس اتنی ہی زیادہ لگتی ہے، اور اب جب کہ وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا اسے مزید شراب پینے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ وشنکا نے الماری کے بائیں کونے میں وُوڈکا ضرور رکھی ہوئی ہے۔" اس نے سوچا، اگر میں ایک پیگ پی لوں تو اسے کچھ بھی پتہ نہیں چلے گا۔"

چند لمحے تذبذب کے گزرے آخر شبہات پر فتح پا کر وہ الماری کے قریب گیا۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر اس نے الماری کے بائیں کونے میں بوتل ٹٹولی اور ایک گلاس بھر کر اسے پھر اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے چھاتی پر کراس کا نشان بنایا اور غٹ سے پی گیا اور فوراً کچھ ایسا کرشمہ ہوا کہ وہ بم کی سی طاقت سے اچھل کر الماری کے قریب زمین پر اوندھے منہ جا گرا۔ پیوتر کی آنکھوں میں تارے ٹوٹنے لگے۔ سانس لینا دشوار ہو گیا اور اسے اپنے سارے جسم میں کچھ ایسی سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی، جیسے وہ جونکوں سے بھری ہوئی دلدل میں جا گرا ہو۔ اسے لگا جیسے اس نے وُوڈکا کے بجائے ڈائنامیٹ نگل لیا ہو، جو اس کے جسم، مکان اور تمام گلی کو اڑا رہا ہو اس کا سر اس کے بازو اور اس کی ٹانگیں ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں جانے کہاں اڑتی جا رہی ہیں۔

کوئی تین منٹ تک وہ چھاتی کے بل لیٹا رہا، بلنا تو در کنار سانس بھی مشکل سے چل رہی تھی۔ پھر وہ اٹھا اور سوچنے لگا "میں کہاں ہوں؟"

ہوش میں آنے کے بعد اسے جو چیز صاف صاف محسوس ہوئی وہ مٹی کے تیل کی بدبو تھی۔

"یا خدا!" اس نے خوف سے کانپتے ہوئے سوچا "میں نے وُوڈکا کے بجائے مٹی کا تیل پی لیا ہے!"

زہر پی لینے کے خیال سے اسے سردی سی محسوس ہوئی اور پھر بخار نے دبوچ لیا۔ یہ واقعی مٹی کا تیل تھا کیوں کہ سارے کمرے میں بدبو پھیلی ہوئی تھی، اس کے منہ میں جلن تھی، آنکھوں میں تارے ٹوٹ رہے تھے۔ سر چکرا رہا تھا اور پیٹ کھول رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ موت قریب ہے، اور محض تسلیوں سے اب کچھ نہ بنے گا اس لئے اپنے سب سے قریبی رشتے دار کو آخری الوداع کے لئے وہ وشنکا کی چارپائی کے قریب گیا بیوہ ہونے کے باعث اس نے اپنی سالی وشنکا کو جو ایک بوڑھی عورت تھی اپنے پاس رکھ لیا تھا اور وہی گھر کا سب انتظام کرتی تھی۔

"وشنکا!" اس نے سونے کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رُندھے گلے سے کہا۔ "پیاری وشنکا!"

تاریکی میں بڑبڑاہٹ اور پھر ایک کراہ سنائی دی۔

"وشنکا!"

"ایمہ! کیا بات ہے؟" ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ پیوتر پوتر پوچھ

کیا تم ہو؟ تمھیں آتے کتنی دیر ہوئی؟ وہاں کیا کچھ ہوا؟ بچے کا نام کیا رکھا گیا

اس کی دھرم ماتا کون تھی؟"

"دھرم ماتا نٹیلیا اور دھرم پتا پاویل اور نچ تھا..... میں..... میرا خیال

ہے، وشنکا، میں مر رہا ہوں اور اُن کی نسبت سے بچے کا نام اولمپیا رکھا گیا

..... میں..... میں نے ابھی مٹی کا تیل پی لیا ہے وشنکا!"

"پھر کیا ہوا! کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ انھوں نے تمھیں مٹی کا تیل پلا دیا؟"

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تمھیں بتائے بنا وُدکا پینی چاہی اور خدا

نے مجھے اُس کی سزا دی، بھول سے اندھیرے میں میں نے مٹی کا تیل پی لیا۔

...اب میں کیا کروں؟"

وشنکا کو جب یہ معلوم ہوا کہ الماری اس کی اجازت کے بغیر کھولی گئی ہے

تو اس کی آنکھوں کی رہی سہی نیند بھی اڑ گئی۔ اس نے فوراً موم بتی جلائی اور بستر

سے اُٹھ بیٹھی۔ وہ رات کا گاؤن پہنے ہوئے پتلی دُبلی کاغذ میں لپٹی ہوئی سی معلوم

ہوتی تھی۔ وہ ننگے پاؤں الماری کے قریب آئی۔

"بے وقوف، تمھیں یہ کس نے کہا؟" اس نے الماری کھولتے ہوئے ترش

لہجے میں کہا۔ "تمھارے لئے یہاں وُدکا رکھی تھی؟"

"میں..... میں نے وُدکا نہیں تیل پیا ہے۔ وشنکا!" پیوتر نے اپنی

پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم نے مٹی کا تیل چھوا ہی کیوں؟ تمھارا اس سے مطلب کیا تھا؟

کیا وہ تمھارے لئے یہاں رکھا تھا۔؟ کیا تم سمجھتے ہو تیل پر کچھ

بھی خرچ نہیں آتا؟ ایمہ! کیا تمھیں تیل کا بھاؤ معلوم ہے؟ معلوم ہے

کچھ تمھیں؟"

"پیاری وشنکا!" پیوتر نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے موت اور

زندگی کا سوال ہے اور تمھیں پیسوں کی پڑی ہے۔"

"پہلے تو نشے میں مدہوش آتے ہیں اور پھر الماری میں شرارت کرتے

ہیں" وشنکا نے الماری بند کرتے ہوئے غصے میں بھر کر کہا۔ "وحشی، وحشی

میں ایک بدقسمت عورت ہوں، مجھے دن رات ایک منٹ بھی چین نہیں

ملتا، ان کے لئے شہید ہو رہی ہوں، بھیڑیں، بچھو، زہریلے کیڑے تم مجھے جو

اذیت پہنچا رہے ہو خدا کرے دوسری دُنیا میں تمھیں بھی وہی اذیت برداشت

کرنا پڑے میں کل جا رہی ہوں، میں ایک پاک دامن عورت ہوں تمھیں ان

اُدھورے کپڑوں میں اپنے سامنے کھڑا نہیں دیکھ سکتی، جب معلوم ہے کہ

میں نے کپڑے نہیں پہن رکھے تم میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟"

اور وہ یونہی بک جھک کرتی رہی..... پیوتر کو معلوم تھا کہ جب

وشنکا غصے میں ہو تو اس پر التجاؤں، گذارشوں اور یہاں تک کہ توپ کے

چھوٹنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس نے مایوس سے ہاتھ ہلائے، کپڑے

پہنے اور ڈاکٹر کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ڈاکٹر صرف اس وقت جلدی

ملتا ہے جب اُس کی ضرورت نہ ہو۔ تین گلیاں دوڑنے کے بعد پانچ مرتبہ

ایک ڈاکٹر کا اور سات مرتبہ دوسرے کا دروازہ کھٹ کھٹا کر پیوتر آخر

ایک کیمسٹ کی دوکان پر پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کیمسٹ ہی مدد کر سکے۔

کافی انتظار کے بعد چھوٹے قد کا، گھنگریالے بالوں والا اور گاؤن پہنے ہوئے

ایک کیمسٹ باہر آیا، اس کا چہرہ اتنا سنجیدہ اور گمبھیر تھا کہ سچ مچ خوف آتا تھا

"کیا چاہیئے؟" اس نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں صرف یہودی قسم

کے اونچے اور عقل مند کیمسٹ بات کرتے ہیں۔

"خدا کے لئے..... میں آپ سے التجا کرتا ہوں....." پیوتر نے لمبے

لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے دوائی دو۔ میں نے غلطی سے مٹی کا تیل پی

لیا ہے۔ میں مر رہا ہوں۔"

"گھبراؤ نہیں۔ میں تم سے جو سوال پوچھوں اس کا جواب دو۔ تمھاری

اس گھبراہٹ کے باعث میری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ تم نے مٹی کا تیل

پی لیا ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں تیل۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔"

کیمسٹ سنجیدہ اور متین چہرہ بنائے ڈیسک کے قریب گیا ایک کتاب

نکالی اور اُسے پڑھنے لگا۔ چار پانچ ورق اُلٹنے کے بعد پہلے دایاں اور پھر

بایاں کندھا ہلا کر چہرے پر حقارت کے آثار نمایاں ہوئے اور ایک منٹ

سوچنے کے بعد دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ گھنٹے نے چار بجائے۔ جب دس

منٹ اوپر ہو گئے کیمسٹ ایک اور کتاب ہاتھ میں لئے باہر آیا اور اُسے پڑھنے

میں مصروف ہو گیا۔

"اِیہہ" اس نے کچھ پریشان ہو کر کہا: "قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ جب تم بیمار ہو تو کیمسٹ کے پاس آنے کے بجائے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیئے۔"

"لیکن میں تو ڈاکٹروں کے پاس ہو آیا ہوں کسی نے کچھ جواب ہی نہیں دیا۔"

"ہمنہ، ہم کیمسٹوں کو تو تم لوگ انسان ہی نہیں سمجھتے۔ رات کے چار بجے جب گھُٹّے اور بلیّاں تک آرام سے سو رہے ہیں تم ہماری نیند حرام کرتے ہو ... تم کوئی بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ تمھارے لئے تو ہم انسان ہی نہیں اور ہمارے جسم بےحس نہیں لوہے کے تار ہیں۔"

پیونز نے کیمسٹ کی بات سُن کر لمبی سانس چھوڑی اور گھر لوٹ آیا۔

"میری قسمت میں بس مرنا ہی لکھا ہے"۔ اس نے سوچا۔

اس کے منہ میں جلن اور مٹی کے تیل کا ذائقہ تھا، پیٹ کھول رہا تھا اور کانوں میں ہوں ہوں ہوں کی آواز آ رہی تھی، لحظہ بہ لحظہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ موت قریب آ رہی ہے اور دل کی حرکت بند ہو رہی ہے۔

گھر لوٹ کر اس نے لکھا "میری موت کے لئے کسی کو قصوروار نہ ٹھہرایا جائے"۔ تب اُس نے دُعا کی اور رضائی اوڑھ کر لیٹ گیا، اُسے نیند نہ آنی تھی اور نہ آئی، صبح تک موت کا انتظار کرتا رہا اور پڑے پڑے یہ سوچتا رہا کہ اس کی قبر پہ ہری ہری خوبصورت گھاس اُگے گی اور بس پرندے چہچہائیں گے ...

اور صبح وہ اپنے بستر میں بیٹھا مسکراتے ہوئے وشنکا سے کہہ رہا تھا "پیاری بہن، جو آدمی زہد اور تقدس سے زندگی بسر کرتا ہے اس پر زہر کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا، میری ہی مثال لے لو، موت قریب تھی، میرا دم نکلا جا رہا تھا اور میں درد کے مارے تڑپ رہا تھا، اب میرے منہ میں تھوڑی سی جلن اور خارش سی ہے ورنہ میں ٹھیک ہوں، خدا کا فضل ہے اور یہ سب کیوں ہوا؟ کیوں کہ میں تقدس اور زہد سے رہتا ہوں۔"

"نہیں تم اس لئے بچ گئے کہ یہ تیل ہی گھٹیا تھا" وشنکا نے گھر کے خرچ کی بات سوچتے اور خلا میں تاکتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ "دوکاندار مجھے تین آنے میں بڑھیا قسم کا تیل نہیں دے سکتا تھا۔ میں بدقسمت عورت ہوں، شہید ہو رہی ہوں، تم حیوان ہو نرے حیوان! خدا تمھیں دوسری دُنیا میں وہی اذیت دے جو میں ..."

وہ کوستی اور بڑبڑاتی رہی ...

اِطلاع

بال بھارتی

فی کاپی	۳۵ نئے پیسے
سالانہ چندہ	۴ روپے

بچّوں کا محبوب ہندی ماہنامہ

بال بھارتی کا جون ۱۹۵۷ء کا سال نامہ "**وگیان انک**" (سائنس نمبر) کی صورت میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اس میں سائنس کے بارے میں کئی دل کش مضامین ہوں گے۔ اور یہ نمبر باتصویر ہوگا۔

اس نمبر کی قیمت وہی ہوگی جو عام نمبروں کی ہوتی ہے۔



تمام بڑے کتب فروشوں سے حاصل کریں یا براہ راست لکھیں

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

ع۔م

کتابیں اور رسالے

فکر و فن

مصنف خلیل الرحمٰن اعظمی ۔ ناشر: آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۲۵۲ صفحات ۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد پوش، جلد عمدہ۔ قیمت تین روپے ۔

اعظمی کے دس تنقیدی مضمونوں کا یہ مجموعہ شائستہ تنقیدی ادب کا ایک نادر نمونہ ہے ۔ تمام مضمون شعری ادب سے متعلق ہیں غالب، ظفر، درد حسرت، داغ، مومن، جوش، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی کے فکر و فن کا مختلف پہلوؤں سے آپ نے جائزہ لیا ہے ۔ تنقید میں اخلاص اور بے باکی بڑی غنیمت چیز ہے ۔ ہمارے اس نوجوان فن کار کی تحریر ان دونوں خوبیوں کی حامل ہے ۔ تمام کے تمام مضمون تجربے مطالعے کا نتیجہ ہیں ۔ فن کار اگر شانِ آذری کا معترف نہ ہو تو بُت شکنی اس کے لئے لازم ہے ۔ ان مضامین میں اعظمی نے سنگ آمد و سخت آمد قسم کی ضربیں لگائی ہیں ۔ حسرت موہانی کی مقبولیت کے زمانے میں انھوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ وہ عظیم شاعر نہیں ایک اچھے شاعر ہیں ۔ انھیں ان کی شاعری میں ایک زندہ اور جیتی جاگتی شخصیت کا عکس نظر آیا اور یہی ان کے نزدیک حسرت کی شاعری کا اصل جوہر ہے ۔ بات پتے کی ہے لیکن کون ہے جو اسے بے جھجک کہہ دے ۔ یہ مضمون غالباً نگار میں چھپا تھا اور جہاں تک ہمیں یاد ہے خود مدیر نگار نے اعظمی کی بے باکی کو سراہا تھا ۔ ایک طویل مضمون میں اعظمی نے قدرے درشت اور طنز آمیز لہجے میں جوش کی شاعری کا جائزہ لیا ہے ۔ ان کا یہ قول برحق کہ جوش شاعر انقلاب نہیں لیکن ان کا یہ مشورہ کہ جوش کو اپنی تمام توجہ طنزیہ شاعری پر مرکوز کر دینا چاہیئے انصاف پر مبنی نہیں ۔ تکرار بیان، بوڑھا ذہنی پس منظر، اخلاص سے بری گھن گرج ایسے معائب سخن ہیں جن کے ہوتے ہوئے کوئی شاعر عظیم شاعر نہیں بن سکتا ۔ لیکن جوش نے جس قدر لکھا ہے اور اس میں جتنی گوناگونی اور بوقلمونی ہے اس کے پیش نظر اُسے ادب میں اُسے ایک خاص مقام حاصل رہے گا ۔ اعظمی صاحب کی یہ کتاب اہل علم کے لئے ایک بڑی سنجیدہ اور پُر مغز ادبی سوغات ہے ۔ خود مصنف کا ایک نقاد کی حیثیت سے تابناک مستقبل اس کتاب کو دیکھ کر نظر آئے گا ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود تنقید نگاری کو شعر و ادب کی بارگاہ میں شرف باریابی حاصل کرنے کا سب سے آسان اور سہل نسخہ قرار دے ۔

کاغذی پیرہن

مصنف خلیل الرحمٰن اعظمی ، ناشر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۔ طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ ۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات ۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ۔

خلیل اعظمی کا یہ مجموعۂ کلام ایک بیدار ذہن کی پیداوار ہے ۔ وہ خود اپنے کو "نئی نسل کا ایک بے پروا اور لاا بالی سا نوجوان" کہتا ہے ۔ لیکن محبت کے گہرے گھاؤ جو اُس کے کلام سے ظاہر ہیں، اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ بے پروا اور لاا بالی نہیں بلکہ ایک زخم خوردہ دل کا مالک ہے ۔ اس زخم کے تعین کی ضرورت کسے ہے البتہ اس کا کلام میں ہر ناکامیٔ محبت کی چھاپ نظر آتی ہے ایک پُر کیف المیہ ہے ۔

آخری رات

مت بجھا دلِ ناداں ۔ سوگوار شمعوں کو
اب بھی غم کے ماروں کی ۔ آدھی رات باقی ہے

میں نے اشک پوئے تھے ۔ جن فسردہ آنکھوں میں
اُن سے خون رِستا ہے ۔ اُن سے آگ بہتی ہے

بُرہ کی دیکھا میں وہ گھبرا کے کہہ اُٹھتا ہے

آج بہت ہی ڈر لگتا ہے اپنی اس تنہائی سے
شام کے ان ڈھلتے سایوں سے غم کی اس پہنائی سے
سرد ہواؤں کی آہٹ سے درد کی اس شہنائی سے
تو جو نہ ہوگی تو آئیں گے کتنے انجانے مہمان

سورج مکھی کے پھول کو دیکھ کر بھی شاعر اپنی افسردہ مزاجی نہیں چھوڑتا

میری طرح اس کے سینے میں رات کے گہرے زخم لگے ہیں
میری طرح یہ بھی روتا ہے چھپ چھپ کر تنہائی میں

زندگی بلکہ یہ کائنات بذاتِ خود ایک المیہ ہے۔ اس لئے وجودِ زندگی سے متاثر ہونے والوں کی ایک ہلکی سی کراہ بھی حقیقتِ حال کا آئینہ ہے۔ پھر بھی ہم یہ دعا ہیں کہ اس نوجوان فن کار کو جو بڑی اچھی اور قابل قدر صلاحیتوں کا مالک ہے یہ موقع بھی نصیب ہو کہ وہ اپنے ہفت رنگی فن کے تمام رنگوں کو اُجاگر کر سکے۔

ادبی رجحانات کا تجزیہ

مصنف راجندر ناتھ شیدا۔ ناشر آستانہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی قیمت فی جلد تین روپے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اوسط، ضخامت ۱۷۶ صفحے۔

راجندر ناتھ شیدا کے سات تنقیدی مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ شیدا لکیر کے فقیر نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مرعوب بھی نہیں ہوتے۔ اقبال کے اساسی نظریات' میں انھوں نے اقبال سے متعلق بڑی ذمہ داری اور بے باکی سے بحث کی ہے۔ انھوں نے اقبال کو سراسر آفاقی شاعر ماننے سے انکار کیا ہے اور یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ اقبال نے توحید رسالت کے نعرے لگا کر جس طرح جذباتی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے اُسے شیدا صاحب نے 'چھپانے' کی کوشش نہیں کی ورنہ آج کل عقیدت کے دھارے میں اندھا دھند بہنے والے اسی طرح کے اقدامات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پریم چند اور ترقی پسند نقاد ایک طویل مضمون ہے یہ آج کل ہی میں دو قسطوں میں دو عنوانوں سے چھپ چکا ہے۔ اس میں انھوں نے ترقی پسند نقادوں کے ذہنی انتشار کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے مضامین بھی فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں۔

بجمسہ

مجموعۂ نظم قتیل شفائی۔ ناشر نیا ادارہ لاہور۔ قیمت تین روپے۔

طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوش نہایت عمدہ۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور اردو کی حسین ترین مطبوعہ کتابوں میں سے ایک ہے۔ تقطیع ۸×۲۲ صفحات ۹۲

قتیل شفائی نوجوان شعراء میں بڑے مقبول و معروف شاعر ہیں۔ آپ کے کلام میں سوز و گداز کا عنصر بہت ہے۔ جدّتِ بیان بھی ہے اور جدّتِ فکر بھی۔ لہجے کا اسلوب وہی کلاسیکل، لیکن اس میں ہلکی سی چاشنی اپنے مخصوص انداز کی بھی ہے۔ قتیل کا ایک شعر سنیے۔

جانے تیری سکھیوں نے تجھ سے کیا کیا ہوگا
ہم تو ہوگئے رُسوا اپنے ہم نشینوں میں

اب اس میں 'سکھیوں' کے لفظ سے شاعر نے شعر کو ایک دل چسپ رومانی قصہ بنا دیا ہے۔ محاکات کی یہ رنگ آمیزی قتیل کا خاص جوہر ہے۔

کوہ سرین کی آغوشِ گل پوش میں نقرئی بادلوں نے بسیرا کیا
رات بھر لونڈیاں رقص کرتی رہیں بھیگی موسیقیوں نے سویرا کیا

یہ پیرا اسی محاکاتی رنگ آمیزی کی مثال ہے۔ نقرئی بادل اور بھیگی موسیقی یوں دیکھنے کو بے جوڑ ترکیبیں ہیں لیکن محلِ استعمال نے انھیں وہ معنویت عطا کی ہے جس پر ہزار پُرانی ترکیبیں قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ قتیل کا تصور شعر بڑا واضح ہے۔ وہ زندگی کی پنہائیوں کو الفاظ میں سمیٹتا ہے، دل کو عزم و ارادہ بخشتا ہے۔ یہ نہیں رونے دھونے میں اپنی شعری صلاحیتوں کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ مجموعۂ نظم پڑھنے کے قابل ہے اور ساتھ ہی دیکھنے کے قابل بھی۔

انگڑائی پہ انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو تم کیا جانو بات مری تنہائی کی

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں

نظمیں، غزلیں سبھی پُر تاثیر ہیں۔ مترنم بحریں، شیریں لہجہ، حلاوت سے مملو الفاظ مل جل کر ایک ایسا قندِ سخن بناتے ہیں جس کی لذت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

انٹرپریٹیشنز آف غالب Interpretations of Ghalib

(انگریزی) مصنف جے ایل کول پیش لفظ مولانا ابو الکلام آزاد پبلشرز آتمارام اینڈ سنز کشمیری گیٹ دہلی۔

غالب کے ۲۲۰ اشعار کا ترجمہ انگریزی اشعار میں پروفیسر کول نے

بڑی جانفشانی اور محنت سے کیا ہے۔ مصنف کے قول کے مطابق ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین ایسے غالب فہموں نے مصنف کے کام کو سراہا اور اس کام کو مکمل کرنے کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ابتدا میں مقدمہ ہے جس میں غالب کی زندگی کے مختصر حالات ہیں اور اس کے فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ترجمہ اچھا ہے۔ مولانا آزاد کے قول کے مطابق یہ بڑا مشکل کام تھا لیکن مترجم اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ اب اس قول کو قولِ فیصل نہ کہیں تو کیا کہیں۔

کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔ آخر میں فارسی رسم الخط میں بھی اشعار درج کر دئے گئے ہیں تاکہ ترجمے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

پریم چند Prem Chand

مصنف ہنس راج رہبر۔ رہبر کی یہ کتاب اُردو اور ہندی میں شائع ہو چکی ہے۔ اب اس کا انگریزی میں ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ پیش لفظ شری بنارسی داس چترویدی نے لکھا ہے۔ چترویدی جی پریم چند سے بہت قریب رہے ہیں اور ہندی کے ایک مخلص ادیب ہیں۔ پریم چند کی زندگی کے پیشِ نظر ان کے ادب کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ آتما رام اینڈ سنز پبلشرز کشمیری گیٹ دہلی۔ کتاب کی طباعت عمدہ اور جلد بہت اچھی ہے۔

تلسی داس

شری بے کرشن چودھری کمشنر ریوا ڈویژن ریوا (مدھیہ پردیش)

جہاں رموزِ سلطنت کے ماہر ہیں وہاں اسرارِ سخن کے جاننے اور پہچاننے والے بھی ہیں۔ انھیں انصرام کار کی مصروفیت میں بھی یہ وقت مل جاتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ادبی گلدستہ پیش کر دیں۔ یہ کتاب ان کے عمیق مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اُردو میں تلسی داس پر یہ ایک بڑی مفید کتاب ہے۔ اس سے قبل کالیداس اور بھرتری ہری پر کتابیں اُردو نثر میں چودھری صاحب کے قلم سے پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ تلسی داس کی شاعری اور تلسی داس کی علمی اور ادبی حیثیت پر ایک سیر حاصل محاکمہ اس کتاب میں ملے گا۔

قیمت ۴ر ملنے کا پتہ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروال کٹرہ روڈ۔ الہ آباد تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۹۲ صفحے۔ کتاب مجلد ہے۔ طباعت وغیرہ عمدہ۔

لمعۂ رواں

مہاتما بدھ کے حالات میں مثنوی۔ مصنف منشی جگت موہن لال رواں مرحوم رواں مرحوم اُردو کے بہت ہی سنجیدہ اور صاحبِ بصیرت شعراء میں سے تھے۔ آپ کی رباعیات، غزلیں اور نظمیں اہلِ ذوق سے داد لیتی رہی ہیں۔ یہ مثنوی ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے جناب سروش نے شائع کی ہے۔ حسنِ طباعت کے اعتبار سے کتاب نہایت ہی قابلِ قدر ہے لیکن حسنِ سخن کے اعتبار سے بھی اس کی مثال نہیں۔ اثر لکھنوی صاحب نے مقدمہ لکھا ہے اور دوعقی کا نجوری صاحب نے تقریظ۔ ایک تاریخی داستان کو بلا مبالغہ نظم کرنا اور اس میں شعریت کے عناصر داخل کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ان سب کے علاوہ معیاری ادب کا ایک نادر نمونہ پیش کرنا ہفت خواں طے کرنا تھا لیکن رواں مرحوم نے اسے بہ یک جست طے کیا ہے۔ یہ مثنوی اہلِ علم و ادب کے لئے ایک تحفہ اور دین و حکمت کے نکتہ شناسوں کے لئے ایک ارمغانِ عزیز ہے۔ بحر مثنویٔ مولانا روم کی ہے۔ حسنِ کلام کے لئے صرف دو شعر ہی کافی ہیں۔

اپنی انگشتِ حنائی سے شفق — پھیر اُلٹنے آئی اک رنگین ورق
دیدنی تھے ہاتھ رنگریزوں کے بھی — جیسے کل توسِ قزح مٹھی میں تھی

قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔ نامی پریس لکھنؤ سے چھپی ہے اور غالباً جناب سروش وکیل اناؤ سے مل سکتی ہے۔

موصولات

حیدرآباد کے بڑے لوگ۔ مصنف سید غلام پنجتن شمشاد۔ صفحات ۱۵۲ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد۔

سروجنی نائیڈو۔ مصنف ودیہ سن۔ صفحات ۱۰۶۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد

اُردو شاعری کی روایات۔ شارق میرٹھی۔ صفحات ۱۳۰ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ محمد مشتاق ایم اے بی ٹی پرنسپل ۵۶ کوٹلہ میرٹھ

مولانا شبلی۔ مصنف سید انصاری۔ صفحات ۲۰۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

آیاتِ نورانی۔ نعتوں کا مجموعہ از فضا کوثری۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ملنے کا پتہ محبوب بک ڈپو چاندنی چوک بنگلور قیمت بارہ آنے

چوکیدار
لالچی فقیر
ایک بادشاہ ایک قصاب

ناشر مکتبۂ اشاعت اردو کوٹری (حیدرآباد) پاکستان۔ مصنف محمود پرویز کاکوی۔ بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کے ہر مجموعے کی قیمت پانچ آنے ہے۔

خسرو کی پہیلیاں۔ مرتب شاہین ظفر علوی۔ صفحات ۵۶ $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

لاسش۔ (ڈرامہ) مصنف صابر۔ پیش کردہ حمیدا ختر، آفندی ناظم نشر واشاعت ینگ تھیٹرسٹس سرکل بمبئی۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ پونا سٹنڈ ایڈورٹائزرز ۸۹ محمد علی روڈ بمبئی ۳

جمالِ کربلا۔ مصنف جمال قریشی احمد آبادی۔ مجموعۂ کلام۔ قیمت ۸ر۔ ناشر حسینی انجمن سوداگر کی پول، جمال پور چکلہ احمد آباد۔ صفحات ۱۱۲۔ تقطیع $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ کتاب مجلد اور جلد پوشش کی حامل ہے۔

سالانہ رپورٹ ۵۶-۱۹۵۵ء و روئداد جلسہ سالانہ ادارۂ علم وادب علی گڑھ مع انتخاب مشاعرہ۔ مرتب محمد عمر خاں قمر چھتاروی۔ چھتاری کمپاؤنڈ رسل گنج۔ علی گڑھ۔

جمہوریت اور اقلیت۔ مصنف سید فیض بدرالدین طیب جی۔ ناشرین رائیٹرز امپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ۔ سرفیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی ۱۔ قیمت ۸۔ تقطیع $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ ضخامت ۸۰ صفحات۔ طباعت عمدہ۔

گلِ نفسیں۔ ابوظفر نازش رضوی کے فارسی کلام کا مجموعہ۔ ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ کتاب آرٹ پیپر پر بہت خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ دیباچہ مولانا سالک نے لکھا ہے۔ انھیں کے الفاظ میں اردو کے اس شاعر پر جو فارسی پر اپنی نوازشات کی بارش کرنے لگا ہے، ہزار رحمت ہو۔
"اگرچہ شعر ایشاں خالی از تسامحات فنی نباشد تاہم عواطف واحساسات ایشاں ہیچ شائبۂ ابتذال ندارد"

رسالے

ساقی۔ افسانہ نمبر۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔ مرتب شاہد احمد دہلوی معاون محمد حسن عسکری۔ اس شمارے میں دنیا بھر کے بہترین افسانوں کے تراجم شامل کئے گئے ہیں۔ یہ نمبر امید ہے بہت مقبول ہوگا۔ شاہد صاحب عزیز خاطر آشفتہ حال ہونے کے باوجود خود بڑے نازک خیال واقع ہوئے ہیں۔ انھیں جو بات بھی سوجھ گی کارآمد ہوگی۔

المجید۔ مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد کے میگزین کا سالانہ نمبر۔ سرپرست ریاض الدین صاحب پرنسپل۔ چیف ایڈیٹر سید واصف حسین صاحب۔ اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں کے لئے صفحات وقف کئے گئے ہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ اردو کو حصۂ وافر ملا ہے۔ مندرجات سب اچھے ہیں۔ ایک کالج کے میگزین کا ایسا سالنامہ شائع ہونا فالِ نیک ہے اور المجید کے لئے تو یہ ایک سالانہ اقدام ہے۔ اللہ اس روایات کو پائندگی عطا کرے۔

شبستان۔ مجاز نمبر۔ قیمت غیر مجلد عہ مجلد عـہ۔ مرتب شارب ردولوی ساحر لکھنوی۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۴۴ صفحات۔ مندرجات نہایت معقول ہیں۔

ماتم سخت

منسٹری نشر واشاعت حکومت ہند کے سکریٹری شری ایم لاڈ ۱۷۔ مارچ ۱۹۵۷ء کو بمبئی میں انتقال فرماگئے۔ مرحوم کی طبیعت کچھ مدت سے ناساز تھی۔

مرحوم سنسکرت، پالی اور مراٹھی کے عالم تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے مراٹھی میں سنت تکارام سے متعلق مفید لٹریچر کے خالق تھے۔ سنت تکارام کی زندگی کے حالات ان کے زیرِ تصنیف تھے۔ ان کی پیش از وقت وفات کی وجہ سے وہ تصنیف مکمل نہ ہو سکی مرحوم ایک ہمہ جہت انسان تھے۔ ادب، قانون، لسانیات، نظم ونسق غرضیکہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں وہ ایک ممتاز فرد تھے۔ اس قسم کے ذہین افراد بہت کم ملتے ہیں ان کی عمر صرف باون سال کی تھی ع

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

اردو زبان کے مسلم الثبوت استاد اور قادر الکلام شاعر حضرت مولانا طہر ہاپوڑی نے ۲۵۔ فروری ۱۹۵۷ء کو بمقام کراچی انتقال فرمایا۔ مرحوم امیر و داغ، جلال وتسلیم کے صحبت یافتہ تھے آپ کی قابلیت عالمانہ تھی اور تمام اصنافِ سخن پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۹۰ سال کی تھی۔ آپ کے شاگرد سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں

ناردرن ریلوے

پہاڑی مقامات پر جانے والوں کے لئے رعائتی ٹکٹ

جو لوگ موسم گرما میں میدانی علاقوں کی گرمی اور گرد و غبار سے بچنا چاہتے ہیں ان کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ پہاڑوں پر جا کر اپنی چھٹیاں گذاریں۔ کشمیر سے لے کر اوٹاکمنڈ تک اور آبو روڈ سے لے کر شیلانگ تک ملک میں مختلف قسم کے خوبصورت اور پُر فضا پہاڑی مقامات ہیں۔ جہاں جا کر ہر شخص اپنے ذرائع اور اپنے مزاج کے مطابق چھٹیاں گذار سکتا ہے۔

اس مرتبہ پھر ہندوستانی ریلیں یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے پہاڑوں پر جانے والوں کے لئے رعائتی ٹکٹ جاری ہیں۔

کرایہ .. .. .. واپسی ٹکٹ کے لئے۔ ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا نصف کرایہ۔

درجہ .. .. .. پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے اور نوکروں کے لئے ٹکٹ۔

مدت .. .. .. سفر شروع کرنے کی تاریخ سے لے کر تین ماہ تک یہ ٹکٹ کار آمد رہیں گے۔

یہ ٹکٹ ہندوستان کے ہر ریلوے اسٹیشن سے ان مقامات کے لئے جاری کئے جائیں گے:

شملہ، سولن، دھرم پور (پنجاب)، دہرہ دون، پٹھان کوٹ، کاٹھ گودام، اوٹاکمنڈ، کوڈائی کنال روڈ، آبو روڈ، کونور، دارجلنگ، کرسیانگ، شیلانگ، پیپریا اینڈ کوٹاگری اوٹ ایجنسی (میٹوپلی وام ریلوے اسٹیشن سے ریل سفر کے لئے ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا نصف کرایہ اور سڑک سے سفر کے لئے دونوں طرف کا پورا کرایہ)

نوٹ:-

۱۔ رعائتی ٹکٹ اُن تمام اسٹیشنوں سے جاری کئے جاتے ہیں جہاں سے مندرجہ بالا مقامات تک فاصلہ ۱۵۰ میل یا اُس سے زیادہ ہے۔

۲۔ (الف) جاتے وقت راستے میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ ایسے غیر معمولی حالات کے علاوہ جبکہ راستے میں ٹھہرنا ناگزیر ہو یا پہاڑ گر جانے کی وجہ سے راستہ بند ہو جائے۔ اگر کوئی مسافر جاتے وقت راستے میں ٹھہر جائے گا تو اُس سے اس حساب سے زائد کرایہ وصول کیا جائے گا۔

(i) ریل کے ذریعہ پورے فاصلے کے لئے دونوں طرف کے پورے کرایے اور ادا کردہ رعائتی کرایے کا فرق یعنی تمام پہاڑی مقامات کے لئے رعائتی واپسی ٹکٹوں کی صورت میں ایک طرف کے سفر کا نصف کرایہ۔

اور

(ii) مذکرہ بالا دفعہ کے تحت واجب رقم کے برابر زائد کرایہ جو کسی صورت میں فی ٹکٹ پانچ روپے سے زیادہ نہ ہوگا۔

(ب) اگر طے کردہ مسافت کا ایک طرف کا کرایہ اور اس پر واجب جرمانہ مذکرہ بالا دفعہ ۲ (الف) سے کم ہوگا تو کمتر کرایہ یعنی طے کردہ مسافت کا ایک طرف کا کرایہ بمع جرمانہ وصول کیا جائے گا۔

۳۔ واپسی سفر کے لئے اسی پہاڑی مقام سے ریزرویشن ہو سکتا ہے جہاں کا ٹکٹ لے کر آپ گئے ہوں۔

۴۔ یہ رعائتی ٹکٹ ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء تک جاری کئے جائیں گے۔

(شائع کردہ:- چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ ناردرن ریلوے)

آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

آج کل آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا کیا باعتبار فن و کیا بلحاظ تاریخ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبان اردو کے محسن ہیں

عبدالمجید سالک

آج کل ان رسالوں میں سے ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا (مسعود حسن رضوی)

آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیب مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں

(نیاز فتحپوری)

میں آج کل کو ہمیشہ بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابل قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

رسالہ آج کل علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگان علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ (فراق گورکھپوری)

آج کل کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نہایت پُرمغز اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔

(اثر لکھنوی)

آج کل اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلومات عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُرکیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے (آل احمد سرور)

آج کل نے کئی نئے لوگوں کو بے نقاب اور منظر عام پر لایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اکثر ایسے علمی تہذیبی فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسالوں میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے (احتشام حسین)

فی پرچہ آٹھ آنے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی	سالانہ چھ روپے

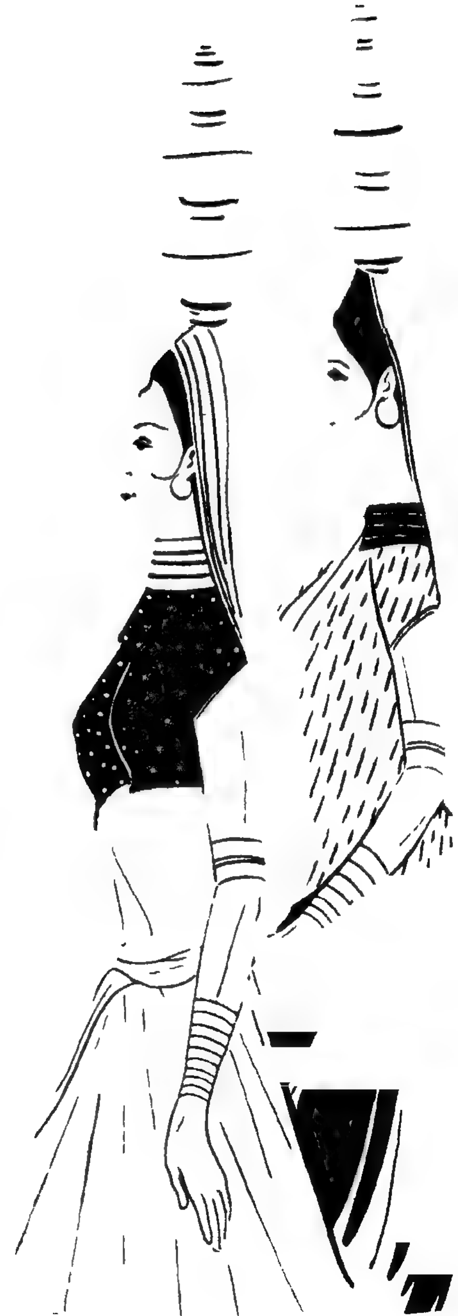
Edited and Published by the Director Publications Division and printed by the Production Officer, United Press Government of India Old Secretariat Delhi

Regd No D—509

آجکل

[illegible]
علی اصغر حکمت
احتشام حسین
سکندر علی وجد
جسونت سنگھ
ظہیر الدین مدنی
خواجہ احمد فاروقی





قیمت
۵۰ نئے پیسے



جون ۱۹۵۷ء
جیٹھ آشاڑھ ۱۸۷۹

آج کل
اہلِ نظر کی نظر میں

"آج کل آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا کیا باعتبار فن اور کیا بلحاظ تاریخ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبان اردو کے محسن ہیں"
عبدالمجید سالک

آج کل ان رسالوں میں سے ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا (مسعود حسن رضوی)

"آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اس فن پر خوب نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیب مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں
(نیاز فتحپوری)

میں آج کل کو ہمیشہ بہت دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابل قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔ (غلام السیدین)

رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ جس قدر پبلک کتب خانے ہیں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگان علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ (فراق گورکھپوری)

آج کل کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے اس کے بیشتر مضامین نہ صرف پُر مغز اور دل چسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھناؤنے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔
(اثر لکھنوی)

"آج کل اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلومات عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُرکیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے (آل احمد سرور)

آج کل نے نئے میں نے لوگوں کو بے تاب اور منتظر پایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔ (احتشام حسین)

فی پرچہ آٹھ آنے | بزنس مینیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی | سالانہ چھ روپے

ترتیب

جون ۱۹۵۷ء

جیشٹھ ۔ آشاڑھ سمت ۲۰۱۴

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

بال مکند عرشؔ ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبولِ عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی

محی الدین قادری زورؔ — حیدرآباد

گوپی ناتھ امنؔ — دہلی

خواجہ احمد فاروقی — دہلی

رحمان راہی — سری نگر

یو۔ ایس۔ موہن راؤ ۔ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

بال مکند عرشؔ ۔ ایڈیٹر شعبۂ اردو ۔ سیکرٹری

(مدیر مسئول)

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے | پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- ۰۔۵۰ روپیہ یا ۵۰ نئے پیسے | پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۵ ــ نمبر ۱۱

مرتبہ وشائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ ۔ دہلی

مُلاحظات

ماحصل

مسئلہ کشمیر جتنا دشوار ہے اتنا ہی آسان بھی ہے۔ دشواری صرف اتنی ہے کہ تین حقائق کو سمجھ لیا جائے۔ یعنی کشمیر پر پاکستان کا جارحانہ حملہ اور اس کے کچھ حصّوں پر بالجبر قبضہ۔ پچھلے دس برسوں کے سیاسی، معاشی اور فوجی تغیّرات اور فی زمانہ کشمیر کی ترقّی کی رفتار اور مقبوضہ کشمیر کی حالتِ زار۔

مسٹر گنّار یارنگ نے ۳۰ اپریل ۱۹۵۷ء کو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کے سامنے اپنے مشن کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں انھیں بنیادی باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ انھوں نے نہایت محتاط الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اس بات چیت کے دوران میں مجھے محسوس کرایا گیا کہ مسئلہ کشمیر بدلتے ہوئے سیاسی، معاشی اور فوجی عناصر سے گھرا ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مغربی اور جنوبی ایشیا میں طاقتوں کے آپسی تعلقات میں جو ردّ و بدل ہو رہا ہے اس پر لوگوں کو کتنی تشویش ہے۔

مسٹر یارنگ نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر عارضی نوعیت کے بین الاقوامی معاہدوں پر جلد عمل درآمد نہیں ہو پاتا تو ان پر عمل درآمد کرنا پیچیدہ اور مشکل ہوتا جاتا ہے کیونکہ وہ معاہدے جس صورتِ حال کے متعلق ہوتے ہیں وہی بدل جاتی ہے۔

مسٹر یارنگ نے فرمایا۔ ہند کو یہ شکایت ہے کہ سلامتی کونسل نے اس کی اس درخواست کا ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ پاکستان کو حملہ آور قرار دیا جائے۔ رائے طلبی کے مسئلے پر مسٹر یارنگ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہند کہتا ہے کہ پاکستان نے وہ شرطیں پوری نہیں کیں جن کے بعد ہی رائے طلبی کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ پاکستان کہتا ہے کہ وہ شرطیں پوری ہو گئیں۔ مسٹر یارنگ نے اس بارے میں ثالثی کی تجویز پیش کی جسے پاکستان نے کچھ ردّ و کد کے بعد منظور کر لیا۔ لیکن ہند نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کشمیر کی خود مختاری معرضِ بحث میں آ جائے گی اور پاکستان کو گویا ہند کے برابر کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

خلاصہ یہ کہ مسٹر یارنگ پاکستانی حملے کے بارے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہتے کہ یہ امر تو اقوامِ متحدہ کے سامنے پیش ہے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ حالات کے بدلنے سے وقتی معاہدوں میں بھی تبدیلی ضروری ہے ورنہ ان کی کوئی افادیت نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ انھیں احساس ہے کہ کم از کم ہندوستان مغربی ایشیا اور جنوبی ایشیا سیاسی، معاشی اور فوجی سرگرمیوں کو کتنی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ اب اقوامِ متحدہ اس معاملے میں کیا دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ ہمیں اب بھی یقین ہے کہ اگر اقوامِ متحدہ اب بھی پاکستانی حملے، بدلے ہوئے حالات اور موجودہ کشمیر کی رفتارِ ترقّی کی نوعیت سمجھ لے تو اس مسئلے کا حل بھی آسان ہو جائے گا۔

اردن

مغربی ایشیا کا ایک عرب ملک اردن آج کل بین الاقوامی رسّہ کشی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اردن کی آبادی بارہ لاکھ ہے جس کا تقریباً ایک تہائی سابق شرق اردن کی آبادی پر اور دو تہائی حصّہ سابق فلسطین کی آبادی اور اسرائیل کے مہاجر عربوں پر مشتمل ہے۔ جواں سال شاہ حسین کو پہلے انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ انھوں نے عرب دوستوں یعنی مصر، سعودی عرب اور شام کی مدد سے اس پیرِ تسمہ پا سے نجات پائی۔ لیکن برطانیہ اردن کو مالی امداد بھی دیتا تھا۔ اور اس کی کمی بھی عرب ملکوں نے پوری کی ہے۔ گو کہ اردن نے

بار بار اعلان کیا ہے کہ وہ آئزن ہاور منصوبے یا بغداد معاہدے میں شامل نہیں ہوگا، پھر بھی بین اقوامی حلقوں میں اس خبر سے کھلبلی مچی ہے کہ ایک طرف تو امریکہ اردن کو ایک کروڑ ڈالر کی امداد دے رہا ہے اور دوسری طرف امریکہ کا ایک زبردست بحری بیڑہ اردن کے ساحل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ ادھر مصر نے بھی اعلان کیا ہے کہ اردن کے معاملات میں امریکی مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔

نیٹو اور ایٹم

امریکی بحری بیڑہ ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح اور ۵۰ جہازوں اور ۲۵ ہزار جوانوں پر مشتمل ہے۔ جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا ہے اُسے طاقت کا نشہ چڑھ ہی جاتا ہے۔ آج کل دنیا کی کوئی بھی بڑی طاقت ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے بند کرنے کو تیار نہیں۔ روس سائبیریا میں تجربے کر رہا ہے، برطانیہ بحر الکاہل میں آتش بازی سے دل بہلانا چاہتا ہے۔ ایک فریق مغربی جرمنی سے کہتا ہے ایٹمی ہتھیار رکھے تو اچھا نہ ہوگا۔ دوسرا فریق کہتا ہے تمام نیٹو دیشوں کو ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح کیا جائے گا۔ نیٹو کونسل کے سیکرٹری جنرل لارڈ اسمے فرماتے ہیں کہ اگر کسی ملک نے ایٹمی ہتھیاروں کی پیش کش نامنظور کر دی تو بلاشبہ یہ انتہائی خطرناک بات ہوگی کیونکہ اس سے نیٹو کی ساری فوجی تنظیم ڈانواں ڈول ہو جائے گی۔ حوصلہ افزا امر یہ ہے کہ نہ صرف مغربی جرمنی بلکہ برطانیہ، امریکہ، فرانس، کینیڈا اور جاپان کے اعلیٰ ترین سائنس دانوں نے جن میں سے اکثر خود ایٹمی طاقت کے ارتقاء میں بڑا کام کر چکے ہیں ایسے زوردار احتجاج کیا ہے کہ اگر ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے بند نہ کئے گئے تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں اگر اُس جاپانی کی تعریف کرنا پڑے گی جو ساری دنیا میں گھوم گھوم کر سیاست دانوں سے اپیل کر رہا ہے کہ فضاؤں میں زہر نہ بکھیرا جائے تو اس انگریز کو کریکر کی بھی داد دینا پڑے گی جو اپنی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف کہ وہ ایٹمی ہتھیار کا مزید تجربہ کرے گی، احتجاج کرنے کے لئے خود اس مقام کے قریب جا کر جہاں اس تجربے کے مہلک اثرات رونما ہوں گے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا چاہتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے۔

اُردو ہندوستان کی زبانوں میں برابر کا درجہ رکھتی ہے لیکن سابقہ مقبولیت کے پیش نظر یہ دوسری زبانوں سے ممتاز رہی ہے۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو ہمیشہ اہل ملک کو تلقین کرتے رہے ہیں کہ اردو کی حفاظت کریں لیکن ملکی تقسیم کچھ ایسے اصولوں پر ہوئی کہ سخت قسم کا تعصب دماغوں میں بھر گیا۔ پنجاب نے اُردو کی گراں بہا خدمات کی ہیں۔ اسی صوبے میں گمراہ عوام اردو سے دُور بھاگنے لگے۔ اگر کوئی مناسب تدبیر ابتدا ہی میں ہو جاتی تو ہندی اور پنجابی کی جنگ لڑنے والے یہ عوام اردو سے اس قدر بے رُخی اختیار نہ کرتے۔ اسے ایک فال نیک کہئے کہ پنجاب یونی ورسٹی نے اُردو کو ایف اے، بی اے اور ایم اے کے امتحانات میں دیگر مضامین کے ساتھ برابر کا درجہ دے دیا ہے۔ حال ہی میں نئی ودھان سبھا کے پہلے اجلاس میں چیف منسٹر سری پرتاپ سنگھ کیروں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اُردو کی مناسب حفاظت کی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ ان باتوں کے خوش آیند نتائج نکلیں گے اور اہل پنجاب اُردو کی اسی طرح خدمت کریں گے جس طرح وہ پہلے کرتے آئے ہیں۔ اب بھی اُردو پنجاب میں اکثریت کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کی حفاظت سے ان سب کا بھلا ہوگا۔

اس شمارے کے لئے ایران کے سفیر کبیر جناب علی اصغر حکمت صاحب نے اپنا کلام عنایت فرمایا ہے جو دہلی اور ہندوستان دیگر کے مشہور شہروں کی تعریف میں ہے۔ ہم موصوف کے اس عطیے کے لئے شکر گذار ہیں۔

امریکہ کے سرکردہ ری پبلکن سینیٹر جوزف میکارتھی ۲ مئی کی شب کو انتقال فرما گئے۔ مرحوم کی عمر ابھی ۴۸ سال کی تھی۔ کمیونسٹ نظام اور اس سے متعلق ہر چیز اور ہر بات سے مرحوم کو نفرت تھی لیکن وہ اس کا اظہار بڑی مردانہ روی سے کرتے تھے۔ ان کے تصوراتِ ذہنی اور کردار میں ایک یک طرفہ شدت تھی۔ اعتدال سے انھیں سروکار نہیں تھا۔ اس کے باوجود اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں یہی کہنا چاہیئے ع

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی

اُردو ادب میں اِسّے

اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں سیاسی زبوں حالی نے شمالی ہند میں اردو ادب کے استقبال کے لئے سازگار حالات پیدا کر دیئے تھے۔ ولیؔ نے جب غزل کے پیمانے میں شراب معرفت پیش کی تو شمالی ہند کے پراگندہ خاطروں اور نجات کے طالبوں نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے اسے اٹھا لیا۔ دوسرے اردو زبان گھر کی لونڈی تو تھی ہی۔ اس نے غزل کے روپ میں خاص و عام کے لئے تفریحِ طبع کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ اردو کی مقبولیت کا تیسرا سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناصر علی، بیدلؔ وغیرہ اساتذۂ فن کے بعد فارسی میں ہر کس و ناکس کا چراغ جلنا ذرا دشوار تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نظم نے ذہن و فکر کو ایک حد تک تھکا بھی دیا تھا۔ ان حالات میں اردو غزل کی جدّت طرازی نے خاص و عام کے دل موہ لئے۔ اور اردو نظم کا بول بالا ہوا۔ غرض بڑی سرعت کے ساتھ اردو غزل نے قبول عام کا تمغہ حاصل کر لیا۔ چوں کہ شمالی ہند ایرانی تہذیب و تمدّن کا گہوارہ تھا۔ اور وہاں فارسی زبان و ادب کا چلن تھا۔ لہٰذا اردو غزل نے فارسی کے زیرِ اثر چولا بدلنا شروع کیا۔ اس صدی کے نصف اوّل میں اردو نظم اور خصوصاً غزل ہی مرکزِ توجہ رہی۔ لیکن ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ اردو نثر بھی میدان میں آ گئی اور یہ فارسی کے سانچے میں ڈھالی جانے لگی۔ اس طرز کے کارنامے منظرِ عام پر آنا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی نثر ڈھرّے پر بھی نہیں آئی تھی کہ انیسویں صدی کے آغاز میں اہلِ مغرب نے اس پر ڈورے ڈالے۔ اہلِ مغرب کا یہ اظہارِ محبت اردو کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو ادب کے لئے نیک شگون تھا۔ یہ وہ مرکز ہے جہاں فارسی طرز سے مختلف ڈھنگ پر اردو نثر کی تربیت ہونے لگی۔ اس زمانے سے اردو ادب دو قافلوں میں بٹ گیا۔ نظم کا قافلہ فارسی کی اور نثر کا قافلہ مغرب کی سرگردگی میں منزلیں طے کرنے لگا۔ کالج کے متعدد ادیبوں کی سعی و کوشش سے تقریباً پچاس نثری کارنامے منظرِ عام پر آ گئے۔ اس کا بیشتر حصّہ افسانوی ادب پر مشتمل ہے۔ مگر زبان و اندازِ بیان کے اعتبار سے یہ کارنامے اردو نثر کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۸۴۲ء میں کالج بند ہو گیا اور سلسلۂ تصانیف مسدود۔ لیکن اس کا رائج کردہ سادہ طرزِ نگارش قائم رہا۔ کالج کی یہ تحریک رنگ لائی۔ نثر کے بارے میں اس سے ایک ذہنی تصادم دو بڑے نثری کارناموں کی شکل میں رونما ہوا۔ انشاؔ اس زمانے کے جینیس تھے۔ انھوں نے رانی کیتکی کا ایک قصّہ نکھری ہندی میں لکھ کر ایک نئے طرزِ نگارش کا نمونہ پیش کیا۔ لیکن ایک تو یہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی دوسرے فارسی سے متاثر ذہنوں نے اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ میں مرزا رجب علی بیگ نے فسانۂ عجائب کی صورت میں دوسرا مشورہ پیش کیا۔ اگرچہ اس طرز کے دلدادہ ہر جگہ موجود تھے لیکن یہ طرز اہلِ لکھنؤ کے زیادہ پسندِ خاطر رہا خصوصاً بیگمات اودھ نے شاہی حلقوں میں اسے دت تک زندہ رکھا۔ چوں کہ دونوں مشوروں میں افراط و تفریط تھی اس لئے کالج کے فطری اندازِ بیان کے مقابلے میں کسی کی ایک نہ چلی بلکہ کالج کی تحریک کو تقویت مل گئی۔

فورٹ ولیم کالج ۱۸۲۵ء میں مدرسۂ غازی الدین میں حلول کر کے دلی کالج کے روپ میں پھر نمودار ہوا۔ اس وقت اس کی خدمت کی نوعیت مختلف تھی۔ فورٹ ولیم کالج کا مقصد کمپنی کے ملازموں اور نوواردوں کو اپنے سیاسی مقصد کے لئے

لہ اِسّے ESSAY کو اردو میں جوابِ مضمون یا مقالہ کہا جاتا ہے۔ لیکن ہم اس مضمون میں اس کے لئے لفظ "اِسّے" استعمال کریں گے اِسّے کی جمع کا صیغہ اسیز ہے۔

ہندوستانی زبان سے واقف کرانا تھا۔ اور دلّی کالج کا مقصد اس کے برعکس ہندوستانیوں کو انگریزی زبان و ادب سکھلا کر اپنا ہم خیال بنانا تھا۔ اس کالج میں ایک طرف اہلِ ہند سائنس کے کرشمے دیکھ کر متحیّر ہوئے اور دوسری طرف انگریزی زبان و ادب سے بھی متاثر ہوتے گئے۔ اسی تحیّر و تاثّر کی وجہ سے اہلِ ہند کے دلوں میں انگریزوں کے مذہب و معاشرت اور سیاست نے گھر کر لیا۔ اس کالج سے صدہا طلبا نے فیض پایا۔ ان میں ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے آگے چل کر اردو ادب کی پرورش و پرداخت میں نمایاں حصّہ لیا۔ انھیں روشن خیالوں میں سے بعض نے انگریزی ادب کے دو اصناف ناول اور مقالہ نگاری کو اردو میں روشناس کرایا۔ ان اصناف میں سے "اِسے" اور مقالہ نگاری آج ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

اِسے کی صنف فرانسیسی ذہن و فکر کی اُپج ہے جو انگریزی ادب میں اسی سے منتقل ہو کر آئی ہے۔ فرانسیسی ادب کا لفظ "اِسائی" ESSAI انگریزی میں "اِسے" ESSAY بن گیا۔ اس لفظ کے لغوی معنی "کوشش" ہیں۔ اسیز کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلی قسم میں تمام سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، سائنسی وغیرہ اسیز کو شامل کیا گیا ہے اور انھیں فارمل یعنی تکلّفی اور رسمی کا نام دیا ہے۔ اور دوسری قسم کے اسیز کو تمبیلیر یعنی ذاتی، اور شخصی کہا ہے۔ یہ اپنے خیال اور اسلوب کے اعتبار سے ادب پارے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے اسیز کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موضوع پر طول طویل مقالہ بھی لکھا جا سکتا ہے اور اسی موضوع پر پندرہ منٹ میں ختم ہونے والی ریڈیائی تقریر بھی۔ ہو سکتا ہے جو مربوط تو ہوتی ہے مگر مختصر اور نامکمل سی رہتی ہے۔

اُردو میں دونوں قسم کے اسیز موجود ہیں مگر ان کو نہ کوئی الگ نام دیا گیا ہے نہ ہی انگریزی لفظ اِسے نگاری اپنایا گیا اردو میں ہر ایک کو مقالہ کہا جاتا ہے۔ اردو میں مقالہ بہت وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ ایک معمولی مضمون سے لے کر ٹھوس علمی مضمون تک کو مقالہ کہا جاتا ہے۔ ہم اس موقع پر پہلی قسم کے اسیز کو مقالے ہی کہیں گے لیکن دوسری قسم کے مخصوص اور لطیف مضامین کے لئے لفظ اِسے اور اسیز استعمال کریں گے۔

اِسے نگار اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں حیات و ممات اور حادثاتِ کائنات سے متعلق شوخیٔ بیان کے ساتھ بعض اوقات صاف صاف اور بعض اوقات رمز و کنایہ میں کسی اخلاقی پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اگرچہ اِسے نگار فلسفیانہ انداز میں حیات کی کش مکش، زمانے کی ستم ظریفی، اخلاقی قدار وغیرہ جیسے مسائل کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ مگر اس کام کے لئے یہ ایسا اچھوتا انداز بیان اختیار کرتا ہے کہ ان کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کی سعی و کاوش کی ضرورت پڑتی ہے نہ فلسفے کی خشکی ذہن پہ بوجھ بنتی ہے۔ اِسے نگار اس موقع پر ایک عالم یا فلسفی کی حیثیت سے اپنے خیالات نہیں پیش کرتا بلکہ ایک روشن ضمیر اور رازدانِ سربستہ کے منکشف کی طرح پیش کرتا ہے۔ اِسے نگار کی کامیابی کا گُر اس میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ پند و نصیحت، درسِ اخلاق اور فلسفے کی گہرائی کو سبک بنانے کے لئے لطائف و ظرائف، طنز و مزاح اور لطافتِ زبان و بیان کو کام میں لیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اِسے نگار کے لئے از سمک تا سماں ہر شے موضوع کا کام دیتی ہے۔ اور وہ ذرّہ سے حقیر شے کی اہمیت اور حسن کو اُجاگر کر دیتا ہے۔ اسیز میں انسان کی عقل و خرد سے زیادہ جذبات سے تخاطب ہوتا ہے اور اس وجہ سے پڑھنے والے کے دل پر بات بیٹھ جاتی ہے۔ اِسے نگار سے یہ سب کچھ اضطراری طور پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی زبان اور اندازِ بیان اور جذبات و خیالات فطری ہوتے ہیں جو ہمیں بھی لے اڑتے ہیں اور ہم اِسے نگار کے ہم خیال ہو جاتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں اور مسرور ہوتے ہیں کیوں کہ یہ روحانی مسرّت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہی ان اسیز کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ اس تشریح کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس قسم کے ادب پارے کسی طرح "نظم" سے کم نہیں اور شاعرانہ ذہنیت و صلاحیت رکھنے والا ہی نثر میں شاعرانہ لچک پیدا کر سکتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صنف اپنی بے ربطیٔ بیان اور اچھوتے طرزِ ادا کے پیشِ نظر اردو غزل سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اِسے کے خمیر، مزاج اور تکنیک دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اِسے نگار عالم متبحر ہو یا نہ ہو منطق کے بحرِ رائق کا غوطہ زن ہو یا نہ ہو لیکن اس کے یہاں روشن ضمیری، قلب و نظر کی گہرائی اور دانش و بینش کی باریکی کا ہونا بہت ضروری بلکہ لازمی ہے اور یہ خواص تجربہ و مشاہدہ کی مدد سے پختگیٔ عمر کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ صرف جوانی کی ترنگ، رعنائیٔ خیال و تخیّل کی اڑان سے کام نہیں چلتا۔ ایسے مضامین کو انشائیہ اور ادبِ لطیف دمخصوص صنفِ اردو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اسیز کہلانے کے کسی طرح مستحق نہیں ہو سکتے۔ اب ہم اردو ادب میں اِسے نگاری کا ذرا غائر نظر سے مطالعہ کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اردو میں کس حد تک اس صنفِ لطیف کے تتبّع میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ہم یہاں اِسے نگاری پر قدرے مفصّل اظہارِ خیال کریں گے اور عام مقالہ نگاری پر سرسری نظر ڈالیں گے۔

اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۴۳ء کے آس پاس ہو چکا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت کا عہد ۱۸۴۳ء کے بعد سے شروع ہوا۔ دلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔ امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے متعلق بھی ہوا کرتا تھا۔ اس دور کی مقالہ نگاری کا اندازہ مقالوں کے عنوانات سے ہو جاتا ہے۔ دو چار عنوان ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۸۴۶ء کے امتحان میں حسب ذیل عنوان تجویز کیا گیا تھا:

"بالائی (شمالی) ہندوستان پر ریلوں کے جاری ہونے سے کیا اخلاقی اثر پڑے گا۔"

امتحان کے پرچوں میں مضمون نویسی کے علاوہ سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ۱۸۴۳-۴۴ء کے مقابلے کے لئے یہ موضوع تجویز کیا گیا تھا:

"اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادیٔ رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا۔"

اسی طرح ایک اور موضوع ملاحظہ فرمائیے۔

"مختلف آزاد پیشے اور مفید کاروبار جو ہندوستانی دیسی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک میں کامیابی کے بہترین طریقے خواہ ابتدائی تربیت کے لحاظ سے یا مابعد کی مساعی کے اعتبار سے۔"

۱۸۴۶ء کے سالانہ مقابلے کا عنوان بھی دیکھیے:

"شاہی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کون سی بہتر ہے اور اس کی فضیلت کی کیا وجہ ہے؟"

ان انگریزی اور اردو انعامی مقابلوں میں طلائی اور نقرئی تمغے دیئے جاتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے بھی اردو میں بہترین مقالے کے لئے ایک طلائی تمغہ عطا کیا تھا۔ ان مقابلوں میں انعام پانے والے طلبا میں ماسٹر رام چندر، موتی لال، نذیر احمد، محمد حسین، ذکاء اللہ، بھگوان داس، خواجہ ضیاء الدین خصوصیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بیشتر فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی کالج میں معلمی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ انھیں لوگوں کی مساعیٔ جمیلہ سے مقالہ نگاری نے رواج پایا۔ ماسٹر رام چندر نے فوائد الناظرین اور محبِ ہند ایسے دو رسالے بھی نکالے تھے۔ ان میں علمی ادبی بحثیں اور مقالے چھپتے تھے۔ مذکورہ رسالے کئی سال تک خدمت انجام دینے کے بعد ۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۱ء میں بند ہو گئے تھے۔ مقالہ نگاری کو رواج دینے میں "محب وطن" کو اولیت حاصل ہے اس کی بعض جلدوں سے چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۸۴۸ء کی جلد میں چھپنے والے مقالوں میں سے چند یہ ہیں:

ہوا، محنت، کرۂ زمین کی مقدار کا بیان، الماس، علم اخلاق، اقوالِ حکیم، سونا، موت، غرناطہ کا محل شاہی، فواروں کا قدرتی بیان، بھونچال کا بیان، سیارے، زلزلہ، مریخ کا بیان وغیرہ۔

۱۸۴۹ء کی جلد کے چند مقالے یہ ہیں:

حماقتِ زردشت، گالی لو، صفتِ الٰہی، حال کمپنی باغ کا وغیرہ۔

۱۸۵۰ء کی جلد کے چند مقالے یہ ہیں:۔

تصوف، حیوان کے کان کا بیان، احوال برق و صاعقہ، حال فردوسی کا، حرارت زمین، نصیحت، بلند نظری، جھوٹ وغیرہ۔

مذکورہ بالا عنوانات کے جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ اس دور میں تقریباً ہر قسم کے رسالے لکھے جاتے تھے (ممکن ہے ان میں سے بعض محض اقوال اور معلومات کی حیثیت رکھتے ہوں)

اس دور کی ادبی انجمنوں نے بھی مقالہ نگاری کو رواج دینے میں ہاتھ بٹایا ہے۔ ایسی ایک انجمن دہلی سوسائٹی کے نام سے ۱۸۶۵ء میں خدمت انجام دے رہی تھی۔ اس کے مدیر معاون ماسٹر پیارے لال تھے۔ انجمن میں تقریروں کے علاوہ اصلاحی مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔ خود ماسٹر پیارے لال بہت اچھے مقالہ نگار تھے۔ پنجاب کے رسالہ اتالیق میں اکثر ان کے مقالے چھپتے رہے ہیں۔ اس دور کے مقالوں کے عنوانات دیکھنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ذہنوں کو بدلنے کے لئے تصنیف و تالیف سے زیادہ مقالہ نگاری ہی مفید مطلب ثابت ہوئی۔ اس دور کی انشائیہ نگاری سے ہم لاعلم ہیں۔ گمان غالب ہے کہ انگریزی ادب کے زیر اثر انشائیے بھی ضرور لکھے جاتے ہوں گے۔

۱۸۵۷ء میں سیاسی انقلاب آیا۔ اس کے اسباب و علل کی تاریخ دفتر پارینہ ہو چکی ہے۔ یہ انقلاب باعثِ زحمت تو تھا مگر نوید رحمت بھی لایا۔ بنائے کہنہ ڈھ جانے پر تعمیرِ نو کی فکر لاحق ہوئی۔ اسے زنجیر غلامی سے تعبیر کرنا بجا سہی لیکن جنبشِ زنجیر بھی پہنانے جا نہیں۔ جب طلسم ٹوٹا اور تنزل حقیقت بن کر بھیانک صورت میں سامنے آیا تو ایک طرف مایوس تر ہو گئے اور

تقدیر کو رو بیٹھ کر بیٹھ گئے۔ مگر دوسری طرف بیدار مغز بیدار تر بھی ہو گئے۔ انسانیت کے پیکروں نے کمرِ ہمت کس لی اور علم و قلم لے کر میدانِ عمل میں جمع ہو گئے۔ ان بزرگوں کے لئے کام بہت بکھرا پڑا تھا۔ مگر آفریں ہے اُن کے حوصلوں کو کہ ہر شعبۂ زندگی میں یہ لوگ رواں دواں تھے۔ انھوں نے اپنی نیک نیتی اور جذبۂ خدمت الناس کے سبب ایک طرف عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں پہنچ کر علم و عمل کا چراغ روشن کیا اور دوسری طرف خواص کے عقل و خرد کی بلندیوں کو بھی جا لیا۔ ان کا بڑا کام سوتوں کو جگانا اور جاگتوں کو راہ بتانا تھا۔ اس کام کے لئے ان بزرگوں نے مقالہ نگاری کو آلۂ کار بنایا۔ مقالہ نگاری سامنے کی چیز تھی۔ دلی کالج نے پہلے ہی اس کی داغ بیل ڈال دی تھی اور واضح کر دیا تھا کہ ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے مقالہ نگاری مفیدِ مطلب ثابت ہوگی۔

اس دور میں سب سے پہلے بزرگ سرسید ہیں جنھوں نے اصلاح کی جدوجہد میں مقالہ نگاری کا سہارا لیا۔ اگرچہ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء کرکے مقالہ نگاری کا آغاز کیا مگر صحیح معنوں میں ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کے اجراء سے مقالہ نگاری کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا۔ ابھی سات سال ہی گزرے تھے کہ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نے جنم لیا۔ اس طرح سنجیدہ مقالہ نگاری کے ساتھ ساتھ طنزیہ اور مزاحیہ مقالوں کا بھی آغاز ہو گیا۔ ادبی نقطۂ نظر سے مقالہ نگاری کا یہ دوسرا دور تھا۔ اس دور کے تقریباً تمام علماء و فضلاء ادباء و شعراء نے اپنے اپنے میدان میں تصنیف و تالیف کے ساتھ مقالہ نگاری کے میدان میں بھی چکر لگایا ہے۔ اس دور کے بزرگوں کو سہولت کے لئے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے گروہ میں سرسید، محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، حالیؔ، ذکاء اللہ، شبلی، سید احمد وغیرہ ہیں اور آزاد، مہدی، ناصر علی، خواجہ ناصر نذیر فراق وغیرہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان بزرگوں کا کام بہت کٹھن تھا۔ ہر شعبۂ زندگی محتاجِ اصلاح تھا۔ اور پھر ذہنی انتشار و خلفشار کے اس دور میں غافل قوم کو بیدار کرنا اور ایک مرکز پر آنے کی دعوت دینا آسان کام نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس دور میں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ چوں کہ یہ لوگ عقل و خرد اور دانش و بینش کے جوہر سے آراستہ تھے اور اپنی اپنی جچی تلی رائے بھی رکھتے تھے لہٰذا سرسید کی قیادت کے باوجود سرسید کے بعض نظریوں سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ ان اختلافات کے تصادم سے خصوصاً مذہب و سیاست میں کئی شرارے مثلاً ترقیت و مغربیت، روایت و درایت، تسلیم و رضا اور بغاوت کی صورت میں روشن ہوئے اور یہ بھی مقالہ نگاری کے اہم موضوع قرار پائے۔ ان لوگوں کے علمی تبحر کی وجہ سے اس دور کے مقالوں میں عالمانہ شان اور گہرائی کے ساتھ تشریح و تفصیل بھی پائی جاتی ہے۔ زبان و اندازِ بیان کے اعتبار سے اس دور کی مشترک خصوصیت سلاست و سادگی ہے۔ بعضوں کی تحریریں سپاٹ اور بے رنگی کی حد تک سادہ ہیں لیکن خیال کے لحاظ سے ایسے مقالے وزن دار ضرور ہیں۔ رفتہ رفتہ جمالیاتی پہلو کی طرف بھی توجہ کی گئی جس کے سلسلے میں آزاد، شبلی، مہدی، ناصر علی وغیرہ خصوصیت رکھتے ہیں۔

جہاں تک اِسے نگاری کا تعلق ہے۔ اس دور میں ہر بزرگ نے ایک آدھ اِسے ضرور لکھا ہے۔ ان میں سرسید، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ اسیز انگریزی فارمل (شخصی) اسیز کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے لیکن اس قسم کے اسیز سے اردو اسیز انداز بیان اور اسپرٹ میں بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ ان بزرگوں کے اسیز نہایت مربوط، مرتب اور غور و تامل کا نتیجہ ہیں۔ حالات نے انھیں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا۔ لہٰذا پند و نصیحت ان کی فطرتِ ثانی بن چکی تھی۔ اسی لئے ان کے اسیز میں بھی خشک ناصحانہ انداز پایا جاتا ہے۔ تاہم اندازِ بیان کے بے ساختہ پن، لطائف، طنز، مزاح وغیرہ سے اپنے مقالوں کو اِسے کا موڈ دے دیا ہے، ان کے مقالوں اور اسیز کی یہی امتیازی خصوصیت ہے۔

سرسید نے مقالوں کے علاوہ اسیز بھی کافی تعداد میں یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں سے "تعصب"، "آزادیٔ رائے"، "غلامی" خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان میں اِسے کی روح ضرور پائی جاتی ہے مگر یہ مسرت سے زیادہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ مدلل اور سنجیدہ ہونے کی وجہ سے سید کے اسیز فلسفیانہ کے بجائے عالمانہ زیادہ ہیں۔ سرسید کا اِسے "بحث و تکرار" نہایت شگفتہ اور معیاری ہے۔ اس کا آغاز ہی ہمارے ذہن و فکر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اِسے "امید کی خوشی" سرسید کا بہترین اِسے ہے۔

ذکاء اللہ اس دور کے بہترین اِسے نگار ہیں۔ ذکاء اللہ کا ایک اِسے "کتب کا مطالعہ" بیکن کے ایک اِسے کا ترجمہ ہے جس کے لئے کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن ان کا اِسے "آگ" ان کی جدتِ طبع کا اعلیٰ

نمونہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکاء اللہ نے انگریزی ایسے نگاری کے تتبع کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگرچہ ایسے میں معلومات کا دفتر بھر دیا ہے لیکن اسلوب بیان کی شگفتگی نے عالمانہ سنجیدگی کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اس کے بعض جملے تو بہت ہی شگفتہ ہیں۔ مثلاً "آگ نامبارک اولاد ہے۔" یا "آگ ہماری دشمنِ جانسوز بھی ہے اور دوستِ دل افروز بھی۔" وغیرہ

مولانا حالی سرسید کے بہت وفادار اور دانش مند لفٹننٹ تھے۔ حالی نے کثرت سے مقالے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں دو ایک ایسیز بھی پائے جاتے ہیں۔ "زبان گویا" اور "جب زمانہ۔۔۔" قابلِ ذکر ہیں۔ زبان گویا میں ایسے کی اسپرٹ مکمل طور پر موجود ہے۔ اس "موجِ نرم خیز" میں تشریح یا استدلال کے بجائے تاثرات ہیں۔ اسی طرح محسن الملک کا ایسے "موجودہ تعلیم و تربیت کی تشبیہہ" اگرچہ تمثیلی رنگ میں ہے لیکن ایسے نگاری کی حدود میں آ جاتا ہے۔

اردو ایسے نگاری میں محمد حسین آزاد بالکل الگ مقام رکھتے ہیں۔ انھیں انگریزی ایسے نگاری سے شغف تھا۔ ایسے نگاری کے بارے میں آزاد نے نیرنگِ خیال کے دیباچے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:-

"زبانِ انگریزی میں نظم کا طور تو کچھ اور ہی ہے۔ مگر نثر میں بھی خیالی داستانیں یا اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعتِ خیال اور پروازِ فکر اور تازگیٔ مضامین اور طرزِ بیان کا انداز قابل دیکھنے کے ہے۔ میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنھیں (ایسے) جوابِ مضمون کہتے ہیں۔ ان میں انواع و اقسام کی غرضیں منظور ہیں۔ مگر بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی روشنی ابھی ہمارے دل و دماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض مضامین وہ ہیں جن میں انسان کے قوائے عقل یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انھیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا جاتا ہے اور ان کے معاملات اور ترقی تنزل کو سرگذشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شگفتگیٔ طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفتِ پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلقِ بد سے تنفر ہو یا کسی حصولِ مطلب کے رستے میں جو نشیب و فراز آتے ہیں ان سے واقف ہو۔"

آزاد نے مشرقی مذاق کے پیشِ نظر ایسے نگاری میں تمثیلی رنگ اختیار کیا ہے۔ انگریزی ایسے نگاری میں تمثیلی رنگ خصوصیت و اہمیت نہیں رکھتا۔ آزاد نے اپنے ان خیالی مضامین میں انشا پردازی کا کمال دکھلایا ہے۔ ان کے اسلوبِ بیان کی وجہ سے ایسیز میں لطافت و دلکشی پائی جاتی ہے۔ تمثیلوں کے ذریعے سے تاریخ، فلسفہ، اخلاق وغیرہ کے اہم پہلوؤں کو پیش کیا ہے

مولانا شبلی اس دور کے زبردست مقالہ نگار ہیں۔ ان کے مقالے آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں شاید ہی کوئی اہم شعبۂ زندگی اور علم و ادب کی کوئی شاخ ایسی ہوگی جس پر شبلی نے مقالہ نہ لکھا ہو۔ شبلی نے اپنے شگفتہ اسلوبِ بیان اور تنوعِ موضوعات سے مقالہ نگاری کو اس دور میں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ زبان کی لطافت و رنگینی اور نزاکتِ خیال نے نثر کا معیار بلند کر دیا۔ شبلی نے تقریباً ایک سو مقالے یادگار چھوڑے ہیں مگر ان میں ایک بھی ایسے نہیں پایا جاتا۔

شبلی عالمِ متبحر تھے، قلب و نظر بھی رکھتے تھے۔ ادبی ذوق و وجدان کے بھی مالک تھے۔ اگر ایسے نگاری کی طرف متوجہ ہوتے تو ان کے ایسیز اردو ادب میں خاصے کی چیز ہوتے۔ اس دور کے ایسے نگاروں میں مہدی حسن خصوصیت رکھتے ہیں۔ مہدی حسن کے ایسیز میں انگریزی ایسے کے تمام انداز پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مہدی حسن نے فیمیلیر ایسیز (مقالے) لکھے ہیں لیکن ان ادبی مقالوں کو اپنی شوخیٔ بیان اور ادا سے کا موڑ دے دیا ہے۔ یہ اتنے شگفتہ ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ میر ناصر علی اس دور کے آخری چراغ ہیں۔ ان کے مقالے "عرس، سالگرہ"، "خیال بہ مقابلہ زبان"، "زندگی بھی ایک معرکہ ہے"، "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"، "چرخِ شعبدہ باز" ہر حیثیت سے ایسیز کہلانے کے مستحق ہیں۔ زبان و اندازِ بیان کی شگفتگی اور بے ساختہ پن ان کے ایسیز کی نمایاں خصوصیت ہے۔

(باقی باقی)

لہ پروفیسر حامد حسن قادری

نوٹ:۔ مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر صاحبِ مضمون کی اجازت سے اس کے کچھ حصے جو انگریزی اور فرانسیسی مضمون نگاری سے متعلق تھے حذف کر دئے گئے ہیں۔ (ادارہ)

سکندر علی وجد

پیش کش

دیارِ حسن سے شعر و شباب لایا ہوں
نظر بلند و دلِ کامیاب لایا ہوں

بڑے جتن سے محبت بھری نگاہوں میں
حریمِ ناز کے رنگین خواب لایا ہوں

لبوں کے بادۂ نکہت فروش کا صدقہ
سخن میں جوہرِ قند و گلاب لایا ہوں

جنوں نواز حسینوں کی مست آنکھوں سے
تمام نشّۂ صہبائے ناب لایا ہوں

تصورات کی تاریک و سرد محفل میں
تجلیاتِ ہزار آفتاب لایا ہوں

خوشی سے نیند نہ اُڑ جائے اہلِ ساحل کی
نیا فسانۂ موج و حباب لایا ہوں

حریفِ نغمہ ہے اندازِ گفتگو میرا
ازل سے فطرتِ چنگ و رباب لایا ہوں

تخیلات کے پُر نور آسمانوں سے
حیات بخش و دُر افشاں سحاب لایا ہوں

نئی بہار مبارک ہو نونہالوں کو
چمن میں تہنیتِ انقلاب لایا ہوں

یہ پیش کش نہیں مجموعۂ پریشانی
ہر ایک چیز یہاں انتخاب لایا ہوں

شکایتِ ستمِ بے شمار ختم ہوئی
[illegible] بے حساب لایا ہوں

ہادی مصطفیٰ آبادی

تعاون

عمارت یہ اک باوقار و جمیل
یہ حسنِ تفکر کی روشن دلیل
نقوشِ فراست اُبھارے کھڑی ہے
یہ کیسے یہ کس کے سہارے کھڑی ہے ؟
یہ سُرخی یہ چونا یہ اینٹیں یہ پتھر
برابر برابر
مقرر مقرر
یہ اک دوسرے کو سنبھالے ہوئے ہیں رفاقت میں ایسے
کہ مفہوم کا وزن بانٹے ہوئے ہوں حروفِ معانی عبارت میں جیسے
یہ اجزاء بغل گیر جب ہو گئے
تو تعمیرِ نو کا سبب ہو گئے

یہ گُل جو مہکتا ہے اک شاخ پر
دہرے ابر پاروں میں رقصاں قمر
گلابی اندھیرے میں عریاں سحر)
اسے پیار کرتی ہے میری نظر
یہ ہے معتبر
اُن منازل کے باعث جہاں سے ہُوا رنگ و بو کا امیں
اگر رنگ پاروں میں قربت نہ ہوتی تو کون اس کی ہستی پہ کرتا یقیں
اسے "پھول" دنیا نے اس وقت مانا کہ سب پتّیاں جب گلے مل گئیں !

منظرِ دل نشیں
کس قدر ہے حسیں
ہم سمجھتے ہیں ! پھر بھی سمجھتے نہیں !

یہ انجم
ضیا بار انجم
ہیں محوِ تکلّم
ہمارے مجلّیٰ ضمیروں کو دیکھو بساطِ فلک پر چمن کھِل گیا
ہماری ہی موجودگی کا اثر ہے کہ سرکش اندھیروں کا دل ہِل گیا
بھٹکتے ہوئے راہگیروں کو اپنے مقامِ سفر کا نشاں مل گیا
ہمارے چمکنے کا اک راز ہے
"یہ سعیِ تعاون" کا اعجاز ہے
ملی روشنی ایک سے ایک کو
کسی کا مگر اتنا دل بھی تو ہو !

زمیں کے ستارے
یہ انسان سارے
جو اک دوسرے کے مددگار ہوں
مٹے بیم و زر کی یہ تیرگی
راحتیں زندگی سے نمودار ہوں

غلام احمد فرقت کاکوروی

دِلّی جا کر کیا دیکھا؟

ننّن صاحب، آپ نہیں مانتے تو سنئے۔ واللہ ننّن صاحب دِلّی کا سفر میرے لئے سفرِ آخرت سے کم پُر مصائب نہ تھا۔ کیا ہفت خواں میں ایسے مصائب پیش آئے ہوں گے جن سے رستے میں اس ناچیز کو دو چار ہونا پڑا۔ گاڑی اگرچہ ڈیڑھ بجے روانہ ہوتی تھی مگر میں نے بُوٹن صاحب کو بھیج کر ٹکٹ گیارہ ہی بجے منگوا لیا۔ کیا وجہ کہ صاحب نئی ولایت کا سفر ہے کیا عجب جو سارے ٹکٹ بُک ہو جائیں اور ہاؤس فل کی تختی لگ جائے۔ اس کے بعد بندے نے اقّن صاحب سے جو ٹیر خرید کیا تھا اس کی کابُک لی جس پر تمھاری بھاوج نے جلدی جلدی نئی ڈوری کی چھت لگائی تھی، دو چینی کی سفری پیالیاں اور ایک تولہ آبِ حیات لی۔ کیا وجہ کہ نہ جانے کس وقت نشہ پر پابندیاں لگ جائیں اور چھٹی بھان دوا کو میسر نہ آئیں۔ تمھاری بھاوج نے امام ضامن باندھا اور بچوں کو دور روکے پروردگارِ عالم کے سپرد کیا اور اسٹیشن کو روانگی اختیار کی۔ مگر جونہیں ڈیوڑھی سے نکلا کہ بلّی راستہ کاٹ گئی۔ واللہ دل دھک سے ہو گیا کہ دیکھئے کیا افتاد پڑتی ہے۔ اب سنئے گا کہ اسٹیشن پر جو پہنچتا ہوں تو وہاں گاڑی صاحبہ نزول اجلال فرما چکی تھیں اور انجن صاحب چاروں کھروں سے کھڑے تھے۔ اماں ابھی پندرہ برس پہلے جب پہلی بار ریل کی زیارت ہوئی تھی اس وقت کی گاڑیوں اور اب آزادی کے بعد والی گاڑیوں میں وہی فرق ہے جو یعنی کوٹھری اور دالان میں، یعنی یہ خیال فرمائیے ننّن صاحب کہ اب تو واللہ یہاں سے وہاں تک وہ آدم پا وہاں وہ دق ڈبے چلے گئے ہیں کہ انجن تک آپ بلا تکلف جا سکتے ہیں۔ اماں تیسرے درجے میں واللہ پنکھے اور پھر جس طرح اوّل و دوم درجے کے مسافروں کی نشستیں متعین ہو جاتی تھیں۔ اب چٹنی ٹکائیے اور پرسہ بھر زمین یہاں سے تحت الثریٰ تک لکھوا لیجئے۔ گاڑی میں قدم رکھا تھا کہ ناگاہ ایک جھپیا تک

آواز سنائی پڑی "بھوں"۔ قسم ہے جنابِ امیرؑ کی کہ اگر دونوں کانوں میں جھٹ انگلی نہ دے لوں تو دونوں کانوں کے پردے گئے تھے۔ میں نے بغل میں جو ایک صاحب بیٹھے تھے اُن سے کہا کہ ادے صاحب یہ کیا بدتمیزی ہے۔ آپ سے سچ عرض کرتا ہوں نہ ہوئی شاہی ورنہ ان بھوں بھوں کرنے والے صاحب کی بھلا یہ مجال تھی کہ اس طرح آبادی کے اندر یہ غیر مہذب آواز بلند کرتے فوراً نواب کو خبر ہوتے ہی صدر میں گولی لگوائی جاتی یا توپ کے مُنہ پر باندھ دئے جاتے۔ بعد میں دریافت کرنے پر معلوم پڑا کہ یہ وہی بے لگام کے ہاتھی انجن صاحب تھے جن کے سپرد مسافروں کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کا کام سپرد ہوا ہے۔ اماں ببر شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ میں نے دھیمے سُروں میں گفتگو شروع کر دی کہ اگر سُن پائیں گے تو کھڑے کھڑے چلتی گاڑی سے پھکوا دیں گے۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ایک صاحب سیاہ کفنی زیب تن کئے ڈبہ میں داخل ہوئے اور لگے مسافروں سے گٹ پٹ کرنے۔ میرے تئیں آ کر بھی انھوں نے گٹ پٹ گٹ پٹ شروع کی۔ میں ان کی لام میم کیا سمجھتا اس پر بغل کے ایک صاحب نے بتایا کہ یہ ٹکٹ بابو ہیں ٹکٹ مانگ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب ٹکٹ گلے گلے پانی تک لیجئے اور صاحبزادے نے جو ٹکٹ لا کر مجھے دیا تھا اُسے چلتے دم بندے نے ازراہِ احتیاط اپنے ازاربند میں باندھ لیا تھا اور گرہ دے لی تھی کہ گر نہ پڑے۔ اب جو انھوں نے مجھے ازاربند کھولتے دیکھا تو فرمانے لگے کہ "ول تم یہ کیا کر رہا ہے۔" میں نے عرض کی کہ "حضرت! ذرا توقف کیجئے گا یعنی کہ آپ ہی کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں" اور یہ کہہ کر میں نے وہی ٹکٹ ازاربند سے کھول کر حاضرِ خدمت کر دیا جو صاحبزادے بلند اقبال نے لا کر دیا تھا۔ واللہ ٹکٹ پاتے ہی میری صورت دیکھنے لگے اور تیور بدل کر بولے " ول یہ

تو ڈاک خانے کا ٹکٹ ہے۔ میں نے بہ کمالِ لجاجت عرض کی کہ "حضرت جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے۔" بولے "ہم آپ سے ریل کا ٹکٹ مانگتا ہے۔" میں نے عرض کی کہ "حضرت! ٹکٹ ٹکٹ سب برابر۔ کیا ریل اور کیا ڈاک۔ یہ بھی سرکاری وہ بھی سرکاری۔ قیمت میں ایک پائی کا بل نکل آئے تو بندہ "قابلِ گردن زدنی۔" وہ لگے بگڑنے۔ میں نے کہا "حضور ہی انصاف فرمائیں کہ صاحب اگر یہ دس روپے کا ٹکٹ لفافوں اور پارسلوں کو تابہ ولایت پہنچا سکتا ہے تو ہم جانداروں نے جو کہنا چاہیے کہ اشرف المخلوقات میں شمار ہیں کس کا باپ مارا ہے کہ ہم پر یہ عتاب وارد کیا جا رہا ہے۔ مگر جب میں نے ان کو اور جامے سے باہر ہوتے دیکھا تو یہ سوچ کر کہ حکم حاکم مرگِ مفاجات، دوسرا ٹکٹ خرید کرایا اور وہ دس روپے جو بنّن صاحب نے چلتے وقت یہ کہہ کر دئے تھے کہ اگر دلّی میں کوئی اچھا گھا گھرو دکھائی پڑ جائے تو لیتے آنا۔ کیونکہ جمنا پاری گھاگھر سنا ہے کہ ہمارے دیس کے گھاگھروں سے تن و توش اور قد و قامت میں ذرا نکلتے ہوتے ہیں اور اُن میں جلت پھرت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ واللہ مجبوراً جیبی تھیلی نگلنا پڑی اور دسوں کے دسوں روپے دوسرے ٹکٹ کے لئے سلوتر حوالے کر دئے۔ کیوں بھائی بنّن صاحب یہ تو تم کو بھی یاد ہو گا کہ فرنگیوں کے زمانے میں ڈاک خانہ اور ریل دونوں کے ٹکٹوں سے کیا ریل اور کیا ڈاک دونوں طرح کے سفر ہو تے تھے۔ مگر اب آزادی کی یہ نئی بدیا ہے یعنے کہ علاحدہ علاحدہ ٹکٹ خرید فرمائیے۔ اس کے بعد سیٹی ہوئی اور تعینؔ سے انجن صاحب نے اسٹیشن کو سلام داغا۔ شروع میں کچھ رنگین ہوئی۔ اس کے بعد صاحب انجن جوڑیوں کو لے کر اُڑنچھو ہوتا ہے تو اللہ دے اور بندہ لے۔ واللہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا ہرن کلیلیں بھر رہا ہے اور ہم مزے سے اس کی پیٹھ پر ڈٹے ہیں۔ گاڑی کیا تھی اڑن کھٹولا۔ سُنا ہے کہ جو آج کل ریلوں کے منتظم ہیں ان کو انجنوں کی بڑی شناخت ہے اور انھوں نے چھانٹ چھانٹ کر گاڑیوں میں امریکہ سے تین موٹے سانڈ کے سانڈ انجن منگوا کر جُتوا دئے ہیں۔ اب بنّن صاحب خیال فرمائیے کہ عالم بارغ کے آگے شرنار تھیوں کی رہائش کے لئے جو نئے کوارٹر حکومت نے بنوائے ہیں اور میلوں تک چلے گئے ہیں ان کی بتیاں دائیں بائیں جگمگ جگمگ کرتی ایسا معلوم پڑتی تھیں جیسے وہ گاڑی کا پیچھا کر رہی ہیں مگر کیا مجال جو انجن ان کو پیٹھ پر ہاتھ دھرنے دے۔ اس کے بعد جب لہلہاتے کھیتوں کے درمیان سے

گاڑی گذری تو واللہ بنّن صاحب ایسا محسوس ہوا کہ سارے مسافروں کو پرستان میں پریاں اڑائے لئے جا رہی ہیں۔ اماں انجن چھوٹے موٹے اسٹیشنوں کو تو دھیان ہی میں نہیں لاتا تھا۔ اسی درمیان میں بنّن صاحب ایک صاحب کی ذرا بد مذاقی ملاحظہ فرمائیے گا کہ مجھے جو بٹیر مونڈھ کرتے دیکھا تو اپنے صاحبزادے کے پوچھنے پر کہ ابا یہ آدمی کیا کر رہا ہے جواب کیا دیتے ہیں۔ "بیٹا! سرکس میں یہی لوگ چڑیوں کا تماشہ دکھاتے ہیں۔" واللہ یہ فقرہ سُن کر خون ہی تو کھول گیا دل میں آیا کہ شقی کی گردن ناپ دوں۔ پھر خیال آیا کہ بچّہ ساتھ ہے اس کا کیا ہو گا۔ میں بٹیر یعنے کہ مونڈھ کر ہی رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار میں سستی پیدا ہوئی اور ایک اسٹیشن پر پل بھر کو رکی۔ رُکی کیا انجن نے ذرا دم لیا اور پھر چل دی۔ اب اس پل بھر میں جو بھیڑ بھاڑ ہوئی ہے تو نہ جانے کہاں کہاں کی مخلوق ڈبے میں دَرّانہ وار گھس آئی۔ اماں اسی مارے تو آبادی کو دھڑا دھڑ بڑھانے کی سرکار روک تھام کر رہی ہے۔ تو حضور اس کے بعد سارے مسافر لپ سے لب منہ سے منہ اور سینے سے سینہ بھڑا کر کھڑے ہو گئے۔ واللہ ان میں بعض تو بھینگ اور گندھک کی مالش کئے پنڈے سے پنڈا بھڑائے کھڑے تھے۔ میں نے رومال ناک پر رکھا اور ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ادھر جو بٹیر پر نگاہ کرتا ہوں تو اس پہ ایک رنگ آ رہا ہے اور ایک جا رہا ہے غشی کی سی کیفیت طاری ہے۔ سچ ہے واللہ اشراف جنور کو بھلا کاہے کو کبھی اس تعفن کا سابقہ پڑا ہو گا۔ میں نے ایک ہاتھ سے منہ پر رومال رکھے رکھے دوسرے ہاتھ سے اُسے کان کی جھجھری کہ توت پیدا ہو۔ واللہ جھکی پاتے ہی اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ابھی میں نے اس کام سے فراغت کر کے ذرا کھڑکی سے پیٹھ لگائی ہی تھی کہ کسی شقی نے باہر سے کھڑکی میں ہاتھ ڈال بھرپور میرے چٹّے پکڑ ہی تو لئے اور اس اذیت میں بٹیر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا "ارے چھوڑ، موک ورنہ پیٹ کر ایسا ہاتھ پڑا ہو گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔" اس پر آواز آئی۔ "بابر کوئی پکڑ نہیں ہے اگلے اسٹیشن تک توقف فرمائیے ورنہ میں گر کر مر جاؤں گا۔" بٹیر جست کر کے ایک صاحب کے سر اقدس پر جا پہنچا۔ اب واللہ بنّن صاحب ذرا ملاحظہ فرمائیے گا پیچھے سے وہ صاحب لگام دئے ہیں اور ادھر بٹیر ہاتھ سے جا رہا ہے۔ واللہ ع

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔

میں نے پھر گردن کو پورے طور پر جو جھٹکا دیا تو آواز آئی۔ "واللہ مر

جاؤں گا۔" "واللہ" کا لفظ سن کر جو ذرا کنکھیوں سے دیکھتا ہوں تو ہماری ہی طرف کے ایک صاحب تھے جو میری طرف دیکھ کر فرما رہے تھے "واللہ آپ کے پیچھے کے سہارے لگ کھڑا ہوں۔ جان جانے کے سارے امکانات مہیا ہیں۔ اب آپ ہی جان بچا لیجئے۔ ہاتھ چھوٹا اور میں ٹرین کے نیچے آیا۔" میں نے گردن کڑی کی اور اعلان کر دیا کہ حضت مضبوطی سے پکڑا جوتے پکڑے رہئے کوئی فکر نہ کیجئے" پھر واللہ بتن صاحب، اگرچہ گاڑی کا ہر حصہ اس بندے کے حق میں پیغامِ موت تھا مگر قسم ہے پاک پروردگار کی جو پیشانی پہ پسینے کی نوبت تک آئی ہو۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب گاڑی ایک اسٹیشن پہ رکی اور وہ پیچھے چھوڑ کر جدا ہوئے تو میں نے بٹیر کی فکر کی جو مرے سامنے ایک صاحب کے سر پر بیٹھا تھا اور بھیڑ بھاڑ کے سبب اُن صاحب کو بھی محسوس نہ ہوا کہ سر پہ کیا شئے ہے۔ اب یہ خیال فرمایئے۔ جب میں نے اُن صاحب سے کہا کہ حضرت ذرا یونہی رُکے رہئے گا میں اپنا بٹیر پکڑ لوں۔ اور یہ کہہ کر جو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں تو وہ کچھ ایسا جھلایا بیٹھا تھا کہ اس نے اُن حضرت کے فرقِ مبارک پر ایک ایسی لات رسید کی کہ ان کا بھیجا ہل گیا۔ اس پر اُن صاحب نے اس بیدردی سے اس کو بھرپور دبوچ لیا کہ نازک جنور اُن کی گرفت برداشت نہ کر سکا۔ جب تک کہ میں ہاتھ بڑھاؤں اس نے میرے ہاتھ میں آتے آتے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ بتن صاحب واللہ اس کے مرنے کا منظر کیا بیان کروں مگر ضبط ہو تو ایسا کہ مرتے مرتے مر گیا مگر چوں تک نہ کی۔ حسرت اس کی رہ گئی کہ مرتے دم دو قطرے [illegible] کے بھی میسر نہ ہوئے۔

"مارا دیارِ غیر نے" "اس کو" "وطن سے دور" اس کے بعد عجیب کسمپرسی کا عالم تھا میرا بتن صاحب کہ صاحب اگر چلتی گاڑی پر سے اس کی میّت پھینکتا ہوں تو خون کا مقدمہ قائم ہوتا ہے۔ میں نے جھٹ کاپی کھول اس کی میّت کو اس میں رکھا اور باحسرت شکل لگا کر سامان پہ ڈال دیا۔ گردن کا بُرا حال تو تھا ہی اس پہ بٹیر کا غم۔ غرض کہ تکان اور غم کے ملے جلے خیالات میں مجھ پر کچھ ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ پھر جو آنکھ کھلی تو گاڑی ایک لق و دق اسٹیشن پر رکی کھڑی تھی اور کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں "گیارہ نمبر کے پلیٹ فارم سے جانے والی گاڑی اکیس بج کر بائیس منٹ پر پہنچتی ہے۔ اور دلّی سے لکھنؤ آنے والی گاڑی ۱۴ بج کر ۳۲ منٹ کو پلیٹ فارم نمبر ۴ سے روانہ ہوگی۔" گاڑی سے تمام مسافر اتر چکے تھے۔ میں جو پلیٹ فارم پہ اُتر کر دیکھتا ہوں تو واللہ میلوں تک پلیٹ فارم ہی پلیٹ فارم چلا گیا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر جو نگاہ کی تو ایک اسٹیشن میں سیکڑوں اسٹیشن نظر کے سامنے آ گئے۔ اوپر سے مسافروں کو ہدایات مل رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون صاحب ہیں جو یہ تکلیف فرما رہے ہیں مگر دور دور کوئی نظر نہ آیا۔ صاحب عجیب طلسمات کی جگہ تھی میں نے بستر بغل میں دابا اور دوسرے مسافر جدھر جا رہے تھے انھیں کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا کہ کہیں تو پھاٹک سے نکلیں ہی گے۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی بھانت بھانت کی ایسی بولیاں کانوں میں آنا شروع ہوئیں جو اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ اور بھئی بتن صاحب وہاں ایک سواری تو واللہ ایسی دکھائی پڑی کہ عجوبۂ روزگار تھی۔ صاحب اس پر چار سواریاں بیٹھی تھیں اور بیٹھتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ مجھے جو اشتیاق ہوا تو میں بھی اس پر ڈٹ لیا۔ اماں اگلے حصّے میں پہلے بھٹ بھٹ کے ساتھ ایک کپکپی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد صاحب جو وہ چلی ہے تو واللہ ہوا بھی پیچھے رہ گئی۔ گاڑی کیا ہے خشکی کا ہوائی جہاز۔ پلک جھپکاتے واللہ میلوں کا سفر طے کرتی ہے۔ ایک تو صاحب یہ چیز عجوبہ نظر آئی اور دوسرا صاحب وہ قطب مینار جس کے بارے میں سنا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کوئی قطب الدین ایبک صاحب بادشاہ گزرے ہیں۔ انھوں نے بنوایا تھا اور بہت بلند ہے۔ اماں ہم سمجھے تھے کہ زیادہ سے زیادہ عمارت حسین آباد والے گھنٹہ گھر سے انگل دو انگل نکلتا ہوگا مگر واللہ بتن صاحب۔ اب جو وہاں جا کر دیکھا تو وہ کسی انسان کی بنوائی عمارت معلوم ہی نہیں پڑتی۔ جن صاحب نے بھی اسے بنوایا ہوگا سب سے پہلے تو انھیں اجنّا کو تابع کرنا پڑا ہوگا کیا وجہ کہ صرف اجنّا ہی اتنے اونچے پر گارا اور مالہ پہنچا سکتے ہیں۔ کسی انسان کے بس کی تو بات نہیں۔ ہم نے تو ہزار ہزار آنکھ گڑو گڑو کر دیکھا ہمیں اس کی چوٹی تو دکھائی نہ پڑی۔ ہوگی کہیں بادلوں وادلوں میں چھپی ہوئی۔ اماں ہم تو کہتے ہیں اُدھر سے جو ہوائی جہاز کمبخت چھوٹے کہ اندھیرے آ جائے گذرتا ہوگا وہ تو پاش پاش ہی ہو جاتا ہوگا۔ سنا ہے کہ اس پر اگر کوئی پہنچ جائے تو دنیا بھر کی ولایتوں کے آدمی وہاں چلتے پھرتے دیکھ سکتا ہے۔ اور اگر دوربین ہو تو ماشاءاللہ منجھلے صاحب کے صاحبزادے جو ولایت گئے ہیں گویا کہ اُن کو بھی وہاں سے دیکھا جا سکتا ہے اور اگر ریڈیو لگا لیا جائے تو عجب نہیں جو اُن سے بات چیت بھی ہو جائے۔ بتن صاحب عمارتیں اگر دیکھنا ہوں تو بس دلّی کا ٹکٹ کٹا لیجئے اور رفتہ رفتہ کی عمارتیں

دیکھا ئے۔ بعض مکانات تو قسم آپ کے سرعزیز کی چودہ چودہ منزل اونچے ہیں ایک ایک مارکیٹ میں یقین جانو بتّن صاحب تمہارا دماغ چکرا جائے۔ جب سے آزادی ملی ہے اور ہندوستانی کاریگری کو اپنی طبیعت کی جولانی دکھانے کا موقع ملا ہے انھوں نے دلّی میں وہ عمارتیں بنائی ہیں کہ گویا کہ جادو کی لکڑی گھما دی ہے۔ تم نے حضرت گنج والی سڑک دیکھی ہے۔ اب یہ سمجھ لو کہ وہاں کی معمولی معمولی گلیوں کے سامنے تمہاری حضرت گنج والی سڑک برس ہا برس پانی بھرے۔ یہاں تارکول کی سڑکیں ہیں وہاں وارنش کی ہیں۔ اور یہ سب آزادی کے بعد۔ پھر شہر میں ہر آدمی کاروبار سے لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی واللہ۔ صبح سے شام تک دھیلی کے پیسے کما ہی لیتے ہیں۔ ایک مقام پر بتّن صاحب، ایسا دیکھنے میں آیا کہ قسم تمہارے سرعزیز کی یقین کہ آصف الدولہ کے امام باڑے والی بھول بھلیّاں اس کے سامنے مات۔ اس مقام کو بارہ کھنبا کہتے ہیں۔ مگر صاحب ہم نے وہاں کوئی کھنبا نہیں دیکھا۔ ہاں ہے تو ایک کشادہ جگہ جس مقام پر یہ ہے۔ مگر ہر طرف ایک ہی وضع قطع کی عمارتیں اور راستے میلوں تک چلے گئے ہیں بلکہ وہاں جاکر ایک روایت تو یہ بھی سننے میں آئی کہ اس مقام پر پہلے بارہ ستون تھے جن پر بارہ اجنّا مقیم تھے اور وہاں جاکر جو کوئی پھنس جاتا تھا نکلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ چناں چہ آزادی کے بعد سُنا ہے بہت سے گورے جو اس مقام کو دیکھنے آئے تھے اب تک پھنسے پڑے ہیں۔ رات دن سفر کرتے ہیں مگر پھر سویرے اپنے تئیں اُسی مقام پر پاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان کو آیۃ الکرسی نہیں آتی۔ مسلمان آیۃ الکرسی کے زور سے اس مقام سے نکل جاتے ہیں۔ اور غیر مسلمین جنتر منتر کے زور سے اس مقام کو پار کر لیتے ہیں مگر فرنگی حضرات چوں کہ ان دونوں سے نابلد ہیں اس لئے یہیں دکھائی پڑتے ہیں اور شہر میں کہیں نظر نہیں آتے۔ اچھا بتّن صاحب: اب بارہ کا عمل ہے اب بقیہ واقعاتِ دار الخلافتِ دہلی پھر بیان ہوں گے۔

'آج کل' جولائی ۱۹۵۷ء کے متوقع مضمون نگار

وصی احمد فانی بلگرامی	جمیل مظہری
روشن صدیقی	راز یزدانی
خلیل الرحمٰن اعظمی	دعا ڈبائیوی

رشید شاہجہانپوری

تم مجھ کو بہت یاد آتے ہو

جب شام و سحر کی رعنائی عرفان کی طالب ہوتی ہے
جب نظّاروں کی رنگینی نظّارے کی جاذب ہوتی ہے
جب جلوہ فروشی فطرت کی نظروں کی محاسب ہوتی ہے
اے منظرِ دل، مقصودِ نظر، تم مجھ کو بہت یاد آئے

جذبات کی محشر سامانی جب ہوش پہ غالب ہوتی ہے
جب دل کی اطاعت عقل کے مذہب میں بھی واجب ہوتی ہے
جب عشق و جوانی کے ہاتھوں ہر بات مناسب ہوتی ہے
اے ہوش و خرد کے غارت گر، تم مجھ کو بہت یاد آئے

جب فلسفیوں کی حدِّ نظر دنیائے کواکب ہوتی ہے
جب رات کی خاموشی دن کے ہنگاموں پہ غالب ہوتی ہے
جذباتِ پریشاں میں جس دم ترتیب مناسب ہوتی ہے
اے وجہِ سکونِ قلب و جگر، تم مجھ کو بہت یاد آتے ہو

جب شاہدِ فطرت کی رغبت گویائی کی جانب ہوتی ہے
جب عقل بہ صد پیمانِ ارادت دل کی مصاحب ہوتی ہے
جب سازِ نفس کی خاموشی مضراب کی طالب ہوتی ہے
اے جانِ تمنّا رہ رہ کر، تم مجھ کو بہت یاد آتے ہو

جب فکرِ سخن میں طبعِ رسا خلوت میں مراقب ہوتی ہے
جب فطرتِ شاعر ہستی کے جلووں سے مخاطب ہوتی ہے
جب شکر گزاری قدرت کی احساس پہ واجب ہوتی ہے
اسباب نہیں معلوم، مگر، تم مجھ کو بہت یاد آتے ہو

ریڈیو ساہتیہ سماروہ

آل انڈیا ریڈیو نے ۵ اپریل سے ۷ اپریل ۱۹۵۷ء تک اپنا سالانہ ساہتیہ سماروہ منایا۔ اس سال اس ادبی اجتماع کا خاص موضوع ہند کی چودہ بڑی زبانوں کے افسانوی ادب کا جائزہ تھا۔ ادیبوں نے اپنی کہانیاں اور جائزے سنائے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کیا۔ اردو وفد علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، احتشام حسین، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، روش صدیقی اور ساغر نظامی پر مشتمل تھا۔ ذیل میں اردو اور پنجابی کے افسانوی ادب کے جائزوں کے ترجمے درج کئے جاتے ہیں جنھیں احتشام حسین اور جسونت سنگھ نے پیش کیا۔

آج کا اُردو افسانہ

احتشام حسین

آج کے اردو افسانے کے بارے میں اس مختصر مضمون میں میں صرف انھیں افسانوں پر اظہارِ خیال کروں گا جو ہندوستان میں آزادی کے بعد لکھے گئے کیوں کہ حصولِ آزادی ہماری قوم کی زندگی میں ایک ایسا نقطۂ انقلاب تھا جس میں سماجی، اقتصادی اور ذہنی کش مکش مضمر تھی۔

افسانے کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں اگر وہ زندگی کی صورت، جدّ و جہد اور روانی کا مرقع نہ ہو۔ اردو کا مختصر افسانہ جو مسلسل تکمیلِ ہیئت کی جستجو میں مصروف رہا ہے، ان تمام چیزوں کی عکّاسی کرتا ہے جو انفرادی اور سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے نظام کی غمازی کرتی ہیں۔ کرشن چندر، علی عبّاس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، دیویندر ستیارتھی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عبّاس، اختر انصاری، بلونت سنگھ، سہیل عظیم آبادی، رہبر، رضیہ سجاد ظہیر، انور عظیم اور اشک ان سب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اور اپنے اپنے ادبی نظریات کے تحت ہندوستانی زندگی کو پیش کیا ہے اور اس کے دامن کو مالا مال کرنے میں اپنا حصّہ ادا کیا ہے۔ انھوں نے سماجی زندگی کے اس وسیع ڈھانچے کے پس منظر کے ساتھ جو آزادی کے بعد عالمِ وجود میں آیا ہے، اپنے انفرادی تجربات کو پیش کر کے وقت کی پکار کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔ اگرچہ یہ ڈھانچہ بالکل نیا ہے تاہم اس کی جڑیں گذشتہ ہزارہا برسوں میں ہیں۔

آزادی کے بعد جن بے شمار خصوصی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے چند یہ ہیں:۔ آزادی کی نوعیت کی تشخیص و تجزیہ، صدیوں کی غلامی کے بُرے اثرات سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد، مذہبی جنون، فسادات، لوگوں کی ہجرت اور اُن کی آبادکاری کا سوال، ثقافتی سہارے اور قومی توازن کی تلاش اور ایک ایسے فلسفۂ انسانیت کی تشکیل جو اس قدر مضبوط ہو کہ دنیا کے تمام امن پسند لوگوں میں اچھائی کو دیکھ سکے۔ نئے ڈھانچے میں قومی تعمیر کا عمل۔

یہ مسائل انفرادی تجربوں، خوابوں، ناامیدیوں اور ناکامیوں کے پہلو بہ پہلو رومانی یا حقیقت پسندانہ کہانیوں میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اردو مختصر افسانے میں پختگی پریم چند کے زمانے میں پیدا ہوئی انھوں نے ہمارے مصنفین کو عوامی زندگی کے واقعات و لمحات کو افسانوں میں پیش کرنا سکھایا۔ روایتی اور رومانی افسانہ نگاروں میں ان کی آواز زمانے کے مزاج سے مقابلتاً زیادہ مطابقت رکھتی تھی۔ مبنی بر مقصد تحریروں کا یہ رجحان بہت سے لکھنے والوں کے اندازِ فکر کا جزو بن گیا اور انھوں نے اپنی فن کارانہ صلاحیت سے اپنے پڑھنے والوں کی توجہ زندگی کی قیمتی اور قابلِ قدر چیزوں پر مبذول کی۔ اگرچہ ایسا کرتے وقت انھیں ان لوگوں کے عتاب کا شکار بننا پڑا جو ادب میں آدرش واد کے قائل ہیں۔

مثال کے طور پر کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس نے اپنی بہترین کہانیاں فرقہ وارانہ کشیدگی پر لکھیں جو کافی خون خرابے کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے مذہبی میل جول اور ہم آہنگی کا مصنوعی ڈھنگ

سے بے جا رکیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک فرقے کو قصوروار ٹھہرانے کی کوشش کی۔ یا پھر دونوں کو بری الذمہ قرار دے کر سارا الزام غیر ملکی طاقت پر ڈال دیا۔ اس قسم کی نکتہ چینی ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے جو ادب کو زندگی، اس کے حسن و جمال اور اس کے بھونڈے، بھیانک اور بدنما پہلوؤں سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔

لیکن یہ ایک اہم بات ہے کہ اردو کا مختصر افسانہ سنکیوں، خلل اعصاب کے مریضوں اور نقطۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے آدمیوں کا افسانہ نہیں ہے، یہ محض بے خبری اور لاشعوریت کے تاریک خلاؤں میں بھٹکنے کی کہانی نہیں ہے۔ اس نے کرداروں کی تخلیق کے واسطے علمِ نفسیات سے کام لیا ہے۔

آج علی عباس حسینی، بیدی، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، عصمت، احمد عباس، سہیل اور بلونت سنگھ وغیرہ ہمارے مقبول اور ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے افسانہ نگاروں نے بھی افسانے کے آرٹ اور تکنیک میں کافی اضافہ کیا ہے۔ ان سب کا نقطۂ نگاہ سماجی اور انسان دوستی پر مبنی ہے، حتیٰ کہ محبت اور جنسیات پر بھی سماجی بیداری کے احساس کے تحت لکھا گیا ہے۔ امارت پسندوں، کھوکھلے آدرش وادیوں، تنگ نظر ویش بھگتوں، سماج دشمن انفرادیت پسندوں اور رومانیت پسند لوگوں کی کردار نگاری ہمیشہ ایک تضحیک و حقارت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

متذکرہ بالا مصنفین ایک ہی سیاسی عقیدے کے حامی نہیں ہیں اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاسی تصورات سے بے نیاز ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سماجی انصاف، مساوات، جمہوریت، ترقی اور پُرامن زندگی کے آدرش ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سماجی برائیوں اور حکومتوں پر یکساں طور پر نکتہ چینی کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں سے بعض نے تو نہایت خوبی کے ساتھ مختلف تعمیری منصوبوں کی بھی تعریف کی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اردو کی کہانیاں پڑھے تو اسے ان میں بہت سے تھیم Theme ملیں گے۔

کچھ عرصے سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے افسانہ نگار اپنے مشاہدے اور عوام کے متعلق خود حاصل کی ہوئی تازہ ترین معلومات کی بہ نسبت تخیل اور کتابی علم پر زیادہ دارومدار رکھتے ہیں۔ دیہی زندگی سے متعلق چند کہانیوں کو چھوڑ کر زیادہ تر کہانیاں ایسی ہیں جو متوسط طبقے کے مسائل پر لکھی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں تہذیبی ہانیوں اور عام مرد اور عورتوں کی کردار نگاری اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں مشابہت کی کمی صاف نظر آتی ہے اور متوسط طبقے کی محبت، محرومی اور ناکامی وغیرہ کی کہانیاں تو محض ایک ہی چیز کو بار بار دہرانے کی مثال پیش کرتی ہیں۔

اس سے قبل کہ میں اس مختصر مقالے کو ختم کروں میں ان چند افسانوں کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ کرشن چندر کا "پانی کا درخت"، حسینی کا "میرا گاؤں" اور "نور و نار"۔ بیدی کی کہانی "لاجونتی"۔ خواجہ احمد عباس کا افسانہ "شکر اللہ کا"۔ عصمت کی کہانیاں "جڑیں" اور "چوتھی کا جوڑا"۔ حیات اللہ انصاری کی کہانی "شکر گزار آنکھیں"۔ رضیہ سجاد ظہیر کی کہانی "نیلی کٹھری"۔ یہ سب افسانے ایسے ہیں جنھوں نے میری ناقص رائے میں نہ صرف اردو ادب کو بلکہ ہندوستانی ادب کو بھی مالا مال کیا ہے۔

(انگریزی سے)

پنجابی ناول اور کہانی

خوشونت سنگھ

پانچ منٹ کے مختصر عرصے میں میں پنجابی ناول اور کہانی لکھنے والی صرف دو شخصیتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک شری نانک سنگھ ناولسٹ ہیں اور دوسرے شری کرتار سنگھ دُگّل جو مختصر کہانیاں لکھتے ہیں۔

شری نانک سنگھ پنجابی کے بہترین ناولسٹ ہیں اور ان کے بارے میں بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی ادب میں ان کے مقابلے کا ناولسٹ ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۴۰ کے قریب ہوگی اور ہر چھ مہینے کے بعد ان کی نئی تصنیف ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ پنجابی کے نامور شاعر بھائی ویر سنگھ کے بعد شری نانک سنگھ ہی پنجابی کے ایسے مصنف ہیں جن کی تصانیف وسیع پیمانے پر پڑھی جاتی ہیں۔ اس مختصر تبصرے میں ان کے صرف دو ناولوں "آدم خور" اور "بنجر" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں 'آدم خور' سب سے زیادہ مقبول ہے اور 'بنجر' میرے خیال میں ان کی تازہ ترین تصنیف ہے کیونکہ اسے شائع ہوئے ابھی چھ مہینے ہی ہوئے ہیں۔

ساہتیہ اکادمی کے زیرِ اہتمام 'آدم خور' کا ترجمہ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں کیا جا رہا ہے۔ اور توقع ہے کہ اگلے سال تک یہ کچھ زبانوں

میں شائع ہو جائے گا اور آپ اسے پڑھ سکیں گے۔ دوسرے ناول "بنجر" کو شاید آپ ابھی کچھ عرصے کے لئے نہ پڑھ سکیں لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ زبان اور اسٹائل کے لحاظ سے نانک سنگھ کا ایک ناول دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا۔ ان کے ناول کی دلچسپی کا مرکز ان کی کہانی ہوتی ہے نہ کہ الفاظ کا انتخاب یا سماجی اصلاح کا پیغام جو کہ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے اکثر ہم تک پہنچاتے ہیں۔

نانک سنگھ اور کرتار سنگھ دُگّل میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ مسٹر دُگّل بھی نانک سنگھ کی طرح بہت لکھتے ہیں لیکن زیادہ تعداد میں کتابیں لکھنے والے مصنفین کی طرح ان میں بھی بیان کے ضرورت سے زیادہ طویل ہونے اور معیار پر مقدار کے غالب آنے کی خامی پائی جاتی ہے۔ تاہم دانے کو بھوسے سے علیحدہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کرتار سنگھ دُگّل نے بعض نہایت اعلیٰ مختصر کہانیاں لکھی ہیں۔ اگرچہ وہ ناول اور نظمیں بھی لکھتے ہیں لیکن وہ اعلیٰ پایے کی نہیں ہیں۔ ان کی زبان آج کل کے نثر لکھنے والے دوسرے انشا پردازوں سے بہتر ہے۔ نانک سنگھ کی تحریر میں انگریزی الفاظ کا استعمال ان کے ناولوں کی خوبصورتی کو بگاڑ دیتا ہے لیکن کرتار سنگھ دُگّل کی زبان میں یہ خامی نہیں پائی جاتی۔ دُگّل کی طبیعت حسّاس ہے ان میں انسانی جذبات کا احساس پایا جاتا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی بعض تصانیف مثلاً "سوہر سار" اور "پپیل پتیاں" کا ترجمہ جلد ہی علاقائی زبانوں میں بھی شائع کیا جائے گا۔

اب میں کچھ تلخ الفاظ بھی استعمال کروں گا۔ اگر ہم پنجابی ناول اور کہانی کا مقابلہ بعض یورپی زبانوں یا بھارت کی بعض دوسری زبانوں کے ناولوں اور کہانیوں سے کریں تو پنجابی کا درجہ بہت پیچھے آتا ہے۔ پنجابی میں درحقیقت کوئی اوّل درجے کا ناول نویس یا افسانہ نویس پیدا نہیں ہوا اور آج کل کے پنجابی کے انشا پردازوں میں سے بھی کسی میں اس قسم کی صلاحیتیں نظر نہیں آ رہی ہیں۔ میرے خیال میں اس کے اسباب کو تلاش کرنا مشکل نہیں۔ پنجابی کے بہت کم انشا پرداز دوسرے ملکوں اور دوسری زبانوں کے ادب سے رابطہ قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ انھیں انشا پردازوں کی تصانیف اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جا رہی ہیں اور اس طرح نئی نسل کو انھیں تصانیف کی بنیاد پر تربیت دی جا رہی ہے۔ اس کا جواب شاید یہ ہوگا کہ ان کتابوں کی بجائے پنجابی میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجموں کو نصاب کے طور پر پڑھایا

جائے۔ میرے خیال میں پنجابی کے مشہور انشا پردازوں کو بہت آسانی سے کامیابی نصیب ہو گئی ہے۔ دوسرے درجے کی کئی کتابوں کو اس لئے اہمیت حاصل ہو گئی ہے کیوں کہ ان کے مقابلے میں کوئی بہتر کتاب نہیں۔ اس سے کامیابی کا معیار گر گیا ہے۔

تاہم صورتِ حال شاید اتنی تاریک نہیں جیسی کہ میں نے اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آج پنجابی میں ناول اور مختصر کہانیاں لکھنے والوں کی تعداد عرصہ دس سال پہلے کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ ہمارے رسالوں اور اخباروں کی تحریر کے معیار میں اصلاح ہو رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں توقع رکھنی چاہیئے کہ پنجابی ادب میں بھی کوئی ٹالسٹائی، سرت چندر چیٹرجی یا پریم چند پیدا ہوگا۔

(انگریزی سے)

علی اصغر حکمت

خاکِ دہلی

تاباں شدہ مل زخاکِ دہلی — و از اخترِ تابناک دہلی

چشمم بہ نثار می فشاند — دُر دانہ بہ خاکِ پاکِ دہلی

من مستِ ازاں مَیَم کہ پرورد — دہقانِ ازل زتاکِ دہلی

در چرخ مَلک برقص آمد — مُطرب چو نواخت راگِ دہلی

از آگرہ مگو و فتحِ پور سیکری — شاہانِ جہان ہلاکِ دہلی

از مسجد قطب و قلعۂ سُرخ — ہم ملکت و ہم ملاکِ دہلی

چوں آتش طور آبِ جمنا ست — جاں باد فدائے خاکِ دہلی

لیکن ز فراقِ دوست داراں — شُد سینہ ہزار چاکِ دہلی

بس تاج بباد رفتہ آنجا — گر رفت سری چہ باکِ دہلی

چوں ماہئی خستہ جان حکمت

صیدی شدہ در شباکِ دہلی

علی اصغر حکمت

سیرِ امصار

رنگون

اندر برماؤلی پر از خوں بنگر — این چہرۂ زرد و اشکِ گلگوں بنگر

رنگیں بنگر زخم ز خونِ نابۂ دل — سرگشتہ دلم اسیر رنگوں بنگر

لکھنؤ

یک نکتہ بیا ز بندہ بشنو — کاندر دو جہان ز کہنہ و نو

در چار جہت بہ ہفت اقلیم — بہتر نبوَد ز شہر لکھنؤ

بمبئی

از چہرہ یار سر زیبائی جوی — در شہر و دیار نقد دانائی جوی

بر رنجِ سفر دلا شکیبائی جوی — بس گنج ہنر بیا ز بمبئی جوی

کلکتہ

چوں تیر نگاہت بجگر منّتہ ندیدم — چوں ناوکِ مژگاں تو البتّہ ندیدم

دیدم بہ جہاں شہر بسی خرّم و آباد — شہری بدلارائیِ کلکتّہ ندیدم

زکی انور

رائفل

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہندو مسلم فسادات پورے طور پر ختم ہو چکے تھے۔ لیکن ہندو اور مسلمان دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خائف تھے۔ جیسے آپ کو بجلی کا کرنٹ لگ جائے آپ کی اُنگلی تار سے الگ ہو چکی ہو مگر اُنگلی سے لے کر مونڈھے تک بڑی کافی دیر تک جھنجھناتا ہے ہندو مسلم فسادات کی بجلی کی وہی جھن جھناہٹ باقی تھی۔

محلّے کے ہندو اور مسلمان دونوں ہی رات رات بھر جاگ کر پہرہ دیا کرتے مبادا کوئی ایک دوسرے پر آدھی رات میں حملہ نہ کر بیٹھے، اعتماد تو اعتماد وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ لوگوں کی آنکھوں کا پانی مر گیا تھا۔ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ کم سے کم رات کا بھروسہ تو بالکل نہیں تھا۔ ویسے دن کے وقت ہندو اور مسلمان لونڈے اکٹھے تاش کھیلا کرتے۔ اُس زمانے کی دشمنی بھی کچھ عجیب سی تھی، جیسے کسی نٹ کھٹ طالب علم نے اسکول کی دیوار پر چاقو سے زبردستی کوئی گالی کھود دی ہو ٹھیک اُسی طرح انسانوں کے صاف و شفاف دلوں پر زبردستی دشمنی کھود دی گئی تھی۔

پہرے دو دو گھنٹوں پر بدلا کرتے تھے۔ میں بھی پہرے میں شریک تھا۔ پہرے کے ہر گروپ میں تین یا چار جوان ہوا کرتے۔ جن کا کام یہ ہوتا کہ وہ پانچ سیل والے لمبے ٹارچ کی روشنی سے حدِ نظر تک یہ دیکھا کریں کہ کچھ گڑبڑ تو نہیں؟ میرے ساتھ میرے خاص رفیق متین صاحب کے علاوہ دو اور جوان تھے جن کے نام اب یاد نہیں۔ مجھے پہرے کا یہ کام بالکل وا ہیات اور غیر شاعرانہ جان پڑا اور پہلے ہی دن میں اور میرے ساتھی متین صاحب پاس کے ایک باغ میں چھپ کر کسی متوقع حملے کا پتا لگانے کے بہانے بھاگ گئے۔ لیکن جب ہم متواتر یوں ہی بھاگتے رہے تو بقیہ دونوں جوانوں کو شک ہو گیا اور اُنھوں نے ایک رات ہمیں آرام سے گدیلے بستر پر سوتے پکڑ لیا۔ بات بزرگوں اور بوڑھوں تک پہنچی، متین صاحب حد درجہ متین اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ ظاہر ہے اُن کو بے قصور گردانا گیا اور مجھے کچھ سخت سُست سُننا پڑا۔

بالکل اتفاق اور خدا کی مہربانی کہیے کہ انھیں دنوں میرے ایک خاص دوست حشمت صاحب پاکستان جانے لگے۔ گھر کے سارے لوازمات تو اُنھوں نے فروخت کر دیئے لیکن اپنا موٹا تازہ السیشین کتا، جس کا نام ٹائیگر تھا اُنھوں نے میرے حوالے کرتے ہوئے پُرنم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"انور بھائی۔ ٹائیگر کے خریدار تو سیکڑوں ہیں۔ مگر اس کی قیمت کون دے سکے گا؟ اس نے پانچ برسوں تک جس خلوص کے ساتھ میری خدمت کی ہے وہ خلوص اور وہ خدمت انمول ہے۔ میں اسے فروخت نہیں کروں گا۔ تم لے جاؤ مگر یاد رہے اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ دن بھر بندھا رکھنا اور رات کو کھول دینا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ میں نے اسے عدم تشدد کی تعلیم دی ہے۔ کسی بھی اجنبی پر یہ حملہ نہیں کر سکتا بس اُس کا دامن تھام لے گا اور شور مچائے گا، البتہ اُسے کاٹ کھانے کی دھمکی ضرور دیتا رہے گا۔"

ٹائیگر کو گھر لے آنے کے بعد، میں نے اپنے پہرے کے باقی دونوں ساتھیوں سے کہا کہ چلو خیر اب تم دونوں بھی ٹھکر کی نیند سو جانا۔ میرا ٹائیگر اکیلے پہرہ دے گا چناں چہ یہی ہوا۔ اپنے پہرے میں ہم چاروں سوتے رہے اور ایسا سوتے رہے کہ دو گھنٹے کے بعد پہرہ داروں کے جس گروپ کو جگانا تھا ہم اُسے جگا بھی نہ سکے۔

اور رفتہ رفتہ انسان پر بھروسہ نہ کرنے والے انسان نے ایک جانور پر بھروسہ کر کے پہرہ ہی ختم کر دیا۔ صرف ٹائیگر پہرہ دیا کرتا!

میں ٹائیگر کو بہت پیار کرتا۔ ٹائیگر میرے دل سے اتنا قریب ہو گیا تھا جتنا محترم دوست حشمت صاحب بھی نہیں ہو سکے تھے۔ جو اُس کے آقا تھے۔ ٹائیگر

بھی مجھ پر جیسے جان چھڑکتا تھا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی میں اُس سے گپ بھی کرتا اور وہ گوم گام ہوم ہام کیا کرتا۔ میرا جی چاہا کہ اسے اپنے افسانے بھی سُنایا کروں مگر وہ میں نہیں کر سکا۔

مہدی میاں، یعنی میرے چھوٹے بھائی کو ٹائیگر تو بہت پسند آیا ہی لیکن سب سے زیادہ انھیں ٹائیگر کی زنجیر ہاتھ میں تھامے شام کو سیر کی ہوا خوری پسند آئی، بات بھی تھی صاحبوں جیسی! چناں چہ جلد ہی مہدی میاں نے ایک موٹا تازہ خوبصورت سا کتّا پال لیا! تھا تو یوں ہی سا آوارہ کتّا، کسی اچھی نسل کا نہیں تھا، لیکن تن درست اور خوبصورت ہونے کے علاوہ بڑا تیز اور تُسکی تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر خواہ مخواہ بھونکتا ہوا دوڑ پڑتا۔ لیکن جب واپس آتا تو میرا خیال ہے یقیناً ٹائیگر کی ڈانٹ اُسے سُننا پڑتی اور وہ دم دبائے الگ جا کر بیٹھ جاتا۔

مہدی میاں کے اور چند ساتھیوں نے بھی کتّے پالے۔

اور ایک دن وکیل صاحب ایک مریل سا لاغر سیاہ کتّا اکلوتی اولاد کی طرح بغل میں دبائے لے آیا۔

جس طرح وکیل صاحب دراصل وکیل صاحب نہیں صرف اس کا نام وکیل ہے اُسی طرح ایسا جان پڑتا تھا کہ اُس کا کتّا بھی دراصل کتّا نہیں بلکہ کوئی اور جانور ہے صرف اُس کا نام کتّا ہے۔

وکیل میرا چچا زاد بھائی ہے، بڑا باتونی، بڑا ہنسوڑ، لیکن اُس کے اندر خلوص ضرور ہے۔ چناں چہ ایک بار چند لوگوں کے بہکانے پر وہ مجھ سے کسی حد تک بدظن ہو گیا تھا اور اُس نے مجھ سے ملنا جُلنا ترک کر دیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا اُس کے دل میں ان دنوں کُھد بُد سی مچی رہتی تھی اور مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ جب بہکانے والوں کی سازش بے نقاب ہو گی تو وہ مجھ سے آملے گا، لیکن اُس نے اتنا انتظار بھی نہیں کیا اور اُس سے بھی پہلے میرے پاس آیا اور تقریباً رو کر مجھ سے معافی مانگی اور کہنے لگا۔ "میں حرام زادوں کے بہکانے میں آگیا۔ خاندانی ترکے کی لڑائی الگ چیز ہے اور ہمارا خلوص بالکل الگ چیز۔ کیوں بھائی جان؟"
اُن دنوں چچا جان سے جائداد کے بٹوارے کی جنگ چل رہی تھی۔ میں نے کہا۔
"میں جانتا تھا کہ تم یہ بات ضرور سوچو گے۔"

مگر کتّے والا واقعہ اس واقعے سے بہت پہلے کا ہے۔ یہ واقعہ تو میں نے وکیل صاحب کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لئے بیان کیا۔

وکیل مجھ سے کافی چھوٹا ہے۔ لیکن ہم اُس کے نام کے ساتھ صاحب اس لئے لگاتے ہیں کہ عام طور پر وکیل کوئی چیز نہیں البتہ وکیل صاحب ایک بات بھی ہوئی! لیکن وکیل صاحب نے اپنے کتّے کا نام "رائفل" رکھا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور تب تو میری ہنسی بے ہنگم طریقے پر پیانو پر ہاتھ پھیر دینے کی آواز کی سی ہو گئی جب وکیل صاحب نے اپنے کتّے کے نام کی وضاحت کی۔ کہنے لگا۔

"بھائی صاحب! آپ کا ٹائیگر کتنا عظیم کتّا ہے، ہے نا؟ —— مہدی بھائی کا شیرا بھی کافی ضخیم ہے۔ معاف کیجیے گا میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کافی موٹا تازہ ہے۔ لیکن میں بتاؤں۔ وہ دونوں مل کر بھی کسی رائفل کو نہیں توڑ پھوڑ سکتے۔ مگر ایک رائفل چاہے تو ٹائیگر اور شیرا دونوں ہی آن کی آن میں چت ہو سکتے ہیں۔"

"یہ تم اپنے رائفل کی تعریف کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"نہ سہی، مگر آپ تو افسانہ نگار ہیں۔" وہ بولا "آپ ضرور مانتے ہوں گے کہ اکثر نام کا اثر اخلاق اور نفسیات پر پڑتا ہے۔"
"ہاں تم اُمید ضرور کر سکتے ہو کہ تمھارا رائفل ...."
وہ اتنی زور سے ہنسنے لگا کہ میری بات کا باقی حصّہ اُس کی ہنسی کے نیچے دب گیا۔ بے وقت بے تحاشہ ہنسی اُس کی عادت تھی۔
"رائفل" اُس نے زور سے پُکارا۔ اُس کا کتّا دُور پڑا اونگھ رہا تھا۔ اُس کے کان کی حرکت سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اُس نے آواز سُنی ضرور ہے۔ مگر اُس نے مڑ کر دیکھنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی۔
وکیل صاحب ذرا جھینپ کر بولا۔ "بالکل نیا نام ہے شاید ابھی وہ اس نام سے آشنا نہیں ہو سکا۔"

مجھے وکیل صاحب کی یہ دلیل ٹھیک ویسی معلوم ہوئی جیسے کوئی ماں اپنے گھر آئی ہوئی کسی اجنبی عورت کو اپنی اونگھتی ہوئی بیٹی کے بارے میں جلدی سے کہے آپ کو دیکھ کر شرما رہی ہے۔ جس طرح وہ ماں سوچتی ہے کہ دن کے وقت اونگھنا عیب ہے اور کیا عجب ہے یہ اجنبی عورت اپنے بیٹے کے لئے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آئی ہو۔

میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ ٹائیگر کی کوئی اولاد نہیں۔ اور اگر کوئی بیٹی ہوتی بھی کبھی تو وہ تمھارے رائفل سے ہرگز نہیں بیاہی جاتی۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ جب تک تمھارا رائفل مر چکے گا۔"

میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وکیل صاحب کو یہ بات کافی بُری

گئی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا اور اُس نے زور سے اپنے رانفل کو پکارا۔

اب کے اُس نے کافی دیر میں گردن موڑ کر دیکھا اور اس آواز کو بالکل ہی غیر اہم سمجھ کر بڑی بے اعتنائی سے نظریں ہٹالیں اور پھر اونگھنے لگا۔

وکیل صاحب گیا اور اُسے اٹھا کر میرے پاس لے آیا اور لا کر رکھ دیا۔ پھر اُس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ اٹھ کھڑا ہو مگر کتا بدستور اونگھتا رہا۔ اب کے وکیل صاحب نے کہا۔

"جانتے ہیں بھائی جان! جس طرح ٹائیگر کے آجانے سے ہم لوگوں کو اطمینان ہو گیا اور ہم نے پہرہ ختم کر دیا۔ ٹھیک اُسی طرح میرے رانفل کے آنے کے بعد کم بخت ٹائیگر اور شیرا ساری ذمہ داری رانفل کے سر تھوپ کر سکھ کی نیند سوتے ہیں، اور اسے ساری رات جاگنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اونگھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھئے تا کیسی نیند کی ماتی ہیں"

میں ہنس کر بولا۔ "ہاں، جب تو اس غریب کا اونگھنا درست ہے"۔ حالاں کہ کبھی بھی رات کے وقت رانفل کے بھونکنے کی آواز نہیں سُنی گئی تھی۔ مجھے تو شک تھا کہ اُسے بھونکنا آتا ہی نہیں۔

بھونکنا تو ایک طرف رہا۔ کتّے کی خاص صفت ہے مالک کو دیکھ کر دُم ہلانا مگر اُس نے کبھی وکیل صاحب کو دیکھ کر دم نہیں ہلائی۔ وہ بہت مختصر ہی چلتا پھرتا تھا۔ عموماً وکیل صاحب اُسے اٹھا کر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا شام کی ہوا خوری میں وہ وکیل صاحب کی بغل میں ہی ہوا کرتا اور سب سے دل چسپ بات تو یہ ہے کہ وکیل صاحب اُسے سڑک پر کبھی نہیں چھوڑتا مبادا رکشا یا بیل گاڑی اُسے کچل نہ دے۔ موٹر تو محلے میں شاذونادر ہی آیا کرتا ورنہ رانفل کب کا ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا! ایک بار تو ایسا ہوا کہ رانفل اتفاق سے سڑک پر سویا ہوا تھا اور ایک بیل گاڑی آرہی تھی۔ گاڑی بان نے جانے کتنی بار پکارا تب جا کے رانفل کی آنکھیں کھلیں۔ اور اُس نے مڑ کر دیکھا مگر پھر بڑی بے حسی، بلکہ بے اعتنائی سے سو گیا، اُسے اس بات کا بالکل خوف نہیں تھا کہ گاڑی کا ایک پہیہ بس اُس کے جسم پر چڑھنا ہی چاہتا ہے۔ مجبوراً گاڑی بان گاڑی سے اُترا اور اُس نے رانفل کو اٹھا کر الگ رکھا اور بیل گاڑی آگے بڑھائی۔

رانفل ہم سب کی دل چسپی کا ایک موضوع بن گیا تھا۔ رانفل تو کیا دراصل دل چسپی کا موضوع وکیل صاحب تھا۔ ہم رانفل کی بُرائیاں بیان کر کر کے اُسے چھیڑتے اور وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی دل چسپ تاویل پیش کرتا۔ چناں چہ بیل گاڑی والے واقعے کے سلسلے میں اُس نے بتایا کہ رانفل بڑا ہی خوددار اور شان دار کتّا ہے بیل گاڑی ہو چاہے کوئی اور خطرہ وہ اپنی خاندانی روایات بھولنا نہیں چاہتا جیسے غرض ہو اُسے ہٹا کر گاڑی لے جائے وہ خود کیوں الگ ہونے لگا۔

ایک دن میں نے کہا۔

"وکیل صاحب! ایک بات تھی ختم ہو گئی، رہی کچھ دنوں کی دل چسپی اب دفع بھی کرو اس مریل پلّے کو" ہم سب کو یقین تھا کہ اپنی ہنسوڑ طبیعت کے زیر اثر وہ کتّا وکیل صاحب اٹھا لایا ہے۔ اب کافی مذاق ہو چکا، الگ کر دے گا، مگر وکیل صاحب نے غالباً پوری سنجیدگی سے کہا۔

"رانفل خود چاہے تو چلا جائے، میں صبر کروں گا اور اُس کی مرضی کے خلاف اُسے نہ روکوں گا۔ لیکن یہ مجھ سے نہ ہوگا کہ اُسے کہیں پھینک آؤں"۔

پوری سنجیدگی سے کہی جانے کے باوجود وکیل صاحب کی اس بات کو بھی ہم سب نے مذاق ہی سمجھا۔ لیکن حیرت تو مجھے اُس دن ہوئی جب چچا جان نے ایک مریل کتّا بغل میں دبائے دیکھ کر وکیل صاحب کو کافی ڈانٹ پلائی اور حکم دیا کہ اُسے وہ کہیں پھینک آئے۔

وکیل صاحب کتا بغل میں دبائے بڑا بدحواس سا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "بھائی جان! اسے کونے میں پڑا رہنے دیجئے۔ ابّا جان نے بہت ڈانٹا ہے مجھے اور کہا ہے کہ ابھی میں اسے پھینک آؤں۔ مگر بھائی جان یہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا"۔

اُس نے میرا جواب سُنے بغیر کتّے کو کونے میں رکھ کر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور پھر چلا گیا۔

اب ہمیں وکیل صاحب کے بارے میں یقین ہو گیا کہ وہ محض ایک دلچسپی کا سامان بنا رہنے کے لئے اُس واہیات سے کتّے کی محبت کی اداکاری کر رہا ہے بہر حال اداکاری بہت پختہ تھی۔

ایک دن میں گھر کے بچّوں اور ٹائیگر کی تصویر لے رہا تھا تو وکیل صاحب اپنا کتّا بغل میں دبائے آیا اور بڑی التجا کے ساتھ بولا۔

"بھائی جان! ایک تصویر میرے رانفل کی بھی اتار دیجئے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا"

میں نے ہنس کر ڈانٹا "بدتمیزی مت کرو، فلم نہیں بچ رہی ہے"

"میں آپ کو ایک فلم کی قیمت دے دوں گا" اُس نے کہا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہی ہے" میں نے کہا "پھر کبھی"۔
"نہیں بھائی جان آج ہی۔" وہ جیسے گڑگڑایا۔ "دو دنوں سے رائفل نے کچھ نہیں کھایا ہے پتہ نہیں زندہ بھی بچے گا یا نہیں ایک تصویر اُتار دیجئے، بھائی جان!"

"اب بس بھی کرو وکیل صاحب" میں نے جھڑک دیا۔ "مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اسے محض اس لئے پالا ہے، کہ تم ساتھیوں میں دلچسپی کا ایک موضوع بنے رہو۔"

میں نے ساری فلم بچوں اور ٹائیگر پر ختم کر دی اور وکیل صاحب بہت اُداس سا، گردن جھکائے، بھاری بھاری قدم اٹھاتا چلا گیا۔

چند روز کے بعد ایک دن وہ آیا، اور اُس نے فلم کی ایک پوری ریل کا ڈبہ میری میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیجئے بھائی جان! میں فلم کی پوری ریل لے آیا۔ میں نے سوچا اپنا فونٹن پن بیچ دوں کچھ روز دوات قلم استعمال کر لوں گا مگر رائفل کی تصویر اُتروانا تو بہت ضروری ہے۔ میرا رائفل شاید بیمار ہے۔"

آخری جملہ کہتے کہتے اُس کے چہرے کا رنگ کچھ اس قسم کا ہو گیا کہ میں حزن و ملال کی اُس کی شاندار اداکاری پر عش عش کرنے لگا۔ وہ ذرا رُک کر بولا۔

"مختلف پوز کی تصویریں آپ اُتار دیجئے مہربانی کر کے، آپ ماہر ہیں نا۔"

میں ہنسا۔ "بھئی تمہارا رائفل آنکھیں بند کئے پڑے رہنے کے علاوہ اور کوئی دوسرا پوز تو نہیں دے سکتا۔ البتہ شاٹ دو تین لوں گا مبادا کوئی خراب ہو جائے تو دوسرا کام آ جائے۔"

وہ تیار ہو گیا۔ اور میں نے اُسی وقت فلم لوڈ کی اور رائفل کی تصویر لینے کے لئے باہر میدان میں آ گیا۔

ایک تصویر تو رائفل کے فطری پوز میں لی گئی یعنی وہ آنکھیں بند کئے پڑا تھا پھر وکیل صاحب نے کہا، کہ وہ اُسے زور سے پکارے گا۔ لامحالہ وہ آنکھیں کھولے گا اور میں جھٹ اسنیپ لے لوں، چناں چہ ایسا ہی ہوا، پھر وکیل صاحب نے اُس کی گردن ایک لکڑی پر اٹکا کے اٹھا دی اور تیسرا اسنیپ اُس طرح لیا گیا۔ چوتھی تصویر میں وکیل صاحب اُسے گود میں لئے کھڑا تھا۔ اور باقی چار اسنیپ کی فلم وکیل صاحب نے اس شرط پر میرے لئے چھوڑ دی کہ میں جلد سے جلد ساری تصویر اُتار کے فلم دھلوا دوں اور پرنٹ لا دوں اور یہ سب کے لئے وکیل صاحب ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا

میں نے منظور کر لیا، پھر میں ہنستے ہوئے بولا

"مگر بھئی یہ تصویریں تو کافی چھوٹی آئیں گی تم ایسے کرنا، رائفل کا جو پوز تمہیں زیادہ پسند آئے اُسے انلارج کرا لینا صرف پانچ روپے صرف ہوں گے۔"

وہ صرف ہنس کر رہ گیا۔ پھر اُس نے رائفل کو اٹھایا اور بارک کی طرف چلا گیا۔ جاتے جاتے بھی اُس نے تاکید کی کہ میں پرنٹ جلد ہی لے آؤں۔

چند روز کے بعد میں پرنٹ لے آیا رائفل کی ساری تصویریں بہت صاف اور شارپ تھیں۔ رائفل جیسے پرنٹ آنے ہی کا منتظر تھا۔ اِدھر تصویروں کی پرنٹ آئی وکیل صاحب نے اُس کے منہ کے پاس تصویریں لے جا کر زور زور سے پکار کر اُس کی آنکھیں کھلوا کر تصویریں دکھلائیں اور بس اُس کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد رائفل مر گیا۔

اور تب وکیل صاحب کے بارے میں یہ بات اور بھی صاف ہو گئی کہ وہ محض دلچسپی کا موضوع بنا رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اِدھر رائفل کا دم نکلا اُدھر وہ کوئی فلمی گانا گاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اُس کے پیارے رائفل کو مہتر کب اٹھا کر لے گیا اُسے اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

عید کے چار دن کے بعد ہمارے ہاں ایک میلہ لگتا ہے۔ دفتر سے واپس آ کر میرا جی چاہا کہ میلہ دیکھ آؤں۔ یتین صاحب کو خبر بھجوائی۔ معلوم ہوا کہ وہ میلے ہی گئے ہیں کچھ اور دوستوں کو تلاش کیا مگر سب کے سب میلہ جا چکے تھے۔ البتہ وکیل صاحب کے بارے میں پتہ لگا کہ وہ گھر پر ہی موجود ہے۔ کپڑے بدل کر میں وکیل صاحب کے ہاں پہنچا تو چچی جان نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں کچھ پڑھ رہا ہے۔

میں اُس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور میں نے کواڑ کی ایک شگاف سے جھانک کر دیکھا تو وکیل صاحب کچھ عجیب نظروں سے کوئی فوٹو دیکھ رہا تھا۔ وہ چارپائی ہی پر بیٹھا تھا اور تکئے پر کچھ اور چھوٹے چھوٹے فوٹو پڑے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یقیناً یہ لونڈا کچھ محبت وغیرہ کے چکر میں پھنس گیا ہے۔ حالاں کہ اُس کی عمر اُس وقت اٹھارہ سال سے زیادہ ہرگز نہ تھی مگر محبت کرنے والوں کی شکل اپنی محبوبہ کی تصویر دیکھ کر پُرانے آلو بخارا کی طرح جو سکڑ جاتی ہے وہ سکڑاہٹ وکیل صاحب کے چہرے پر ضرور موجود تھی۔

میں نے دستک دی، اور اُس نے بڑبڑا کر ساری تصویریں سمیٹ کر تکئے کے نیچے چھپا دیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہی مرض ہے جس کا مجھے اندیشہ ہوا تھا۔

اُس نے کہا۔

"آجاؤ بھائی۔"

میں اندر چلا گیا ـــــــ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اُف آپ ہیں بھائی جان " وہ بولا: "میں نے سمجھا نقیب بھائی ہیں۔ کیسے آئے ؟"

"مجھے جانتے ہو ؟" میں نے کہا: "تم گئے کیوں نہیں ؟"

"بس یوں ہی" اُس نے جلدی سے کہا: "اچھا ابھی میں کپڑے بدل کر آیا، بس پانچ منٹ۔"

وہ چلا گیا۔ میرے دل میں تکیے کے نیچے دبی ہوئی تصویریں دیکھنے کے لئے کُد بُد سی مچی ہوئی تھی۔ چناں چہ جب وہ کچھ دُور چلا گیا تو میں نے آہستہ سے تکیہ اٹھایا اور سب سے بڑی تصویر دیکھ کر جیسے میں چونک اٹھا۔

وہ تصویر، مائفل کے اُس پوز کی پرنٹ کی انلارج کی ہوئی تصویر تھی جس میں وہ اپنے فطری پوز میں تھا یعنی آنکھیں بند کئے ہوئے پڑا تھا۔

میرا سر چکرانے لگا۔ میں جیسے ایک حد تک بدحواس ہو گیا۔ اور اُسی بدحواسی میں مجھے وکیل صاحب کے واپس آنے کی خبر بھی نہیں ہو سکی۔ وکیل صاحب اندر آتے آتے بولا۔

"اوہ آپ تصویریں دیکھ رہے ہیں بھائی جان ـــــ عیدی کے کافی پیسے مل گئے تھے۔ میں نے سوچا چلو رائفل کی ایک تصویر انلارج کرا لوں۔ کیا خیال ہے آپ کا ؟ کیسا انلارج ہوا ــــــ بھائی جان یہ پوز مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے سوچا اسی کو انلارج ....."

میں نے شاید اُس کی طرف بڑی خشمگیں نظروں سے دیکھا تھا۔ کیوں کہ وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

میں دیر تک اُس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اور جب میں اُس کے چہرے پر کچھ بھی نہ پڑھ سکا تو میں نے ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

"وکیل صاحب! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ــــــــ یہ سب کچھ کیا ہے؟"

"میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا بھائی جان" وہ بولا۔ "لیکن کم سے کم میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب کچھ، ساتھیوں میں دلچسپی کا موضوع بنے رہنے کا جذبہ ہرگز نہیں کرا رہا ہے۔"

اس واقعے کو برسوں بیت گئے لیکن آج بھی جب کتوں کی بات نکلتی ہے تو وکیل صاحب خاموش ہو جاتا ہے!

۱۹۵۶ء کی بہترین فلمیں

"سینٹرل ایوارڈز کمیٹی فار فلمز" نے بنگالی فلم "کابلی والا" کو ۱۹۵۶ء کی بہترین فیچر فلم قرار دیا۔ اور اس کے لئے راشٹرپتی کے گولڈ میڈل کی سفارش کی۔ بمل رائے پروڈکشنز کی فلم "گوتم بدھ" کو بہترین معلوماتی فلم قرار دیا گیا، اور اس کے لئے راشٹرپتی کے گولڈ میڈل کی سفارش کی گئی۔ "بندھن" (ہندی) اور "تنالی رام کرشن" (تیلیگو) کے لئے آل انڈیا میرٹ سرٹیفکیٹ دینے کی سفارش کی گئی۔ کمیٹی نے ان میں سے موخر الذکر فلم کو تیلیگو میں بہترین فلم قرار دیا ہے اور اس کے لئے راشٹرپتی کے سلور میڈل کی سفارش بھی کی۔ توصیفی سرٹیفکیٹوں کے لئے ہندی، بنگالی، تیلیگو، تامل اور کنڑا کی بعض فلموں کا انتخاب بھی کیا گیا۔

"کابلی والا" ٹیگور کی ایک شہرۂ آفاق مختصر کہانی ہے۔ جس میں کلکتہ میں ایک افغانستانی باشندے کے قیام کے دوران میں اس کی پدری محبت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

ایک افغان کسان رحمت شیخ روپیہ کمانے کی غرض سے کلکتہ آتا ہے۔ لیکن اس کی روزمرّہ کی زندگی میں اسے اپنی چھوٹی سی بیٹی رابعہ کی یاد ستاتی ہے۔

روزمرہ کی پھیری میں اسے ایک بنگالی مصنف کی پانچ سالہ لڑکی منی ملتی ہے دونوں جلد ہی دوست بن جاتے ہیں۔ منی کی پیاری پیاری باتیں اس کے دل سے اپنی بیٹی کے غم کو محو کر دیتی ہیں۔

ایک دن ایسا ہوا کہ رحمت نے اپنے ہوٹل والے رحیم پر قاتلانہ حملہ کر دیا اور اس جرم کی پاداش میں رحمت شیخ کو آٹھ سال جیل کی سزا ہوئی۔

آٹھ سال گزر چکے تھے اور منی رحمت کو بھول گئی تھی۔ جیل سے رہائی پا کر رحمت منی کے گھر گیا۔ اتفاق سے اس دن منی کی شادی تھی اور منی کے باپ نے رحمت کی یہ درخواست ردّ کر دی کہ اسے منی سے ملنے دیا جائے۔ مایوس ہو کر پھیری والے نے فروٹ کا پیکٹ منی کے باپ کو دیا اور اسے منی کے پاس پہنچانے کی درخواست کی۔ منی کے باپ اس فروٹ کے پیکٹ کی قیمت ادا کرنی چاہی لیکن رحمت نے روتے ہوئے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "میں سودا بیچنے نہیں آیا ہوں" پھر اس نے اپنی جیب سے ایک میلا سا پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور کہا: "یہ آٹھ سال گزرے منی نے دیا تھا۔ منی کے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اس نے منی کو بلا بھیجا۔ منی کے باپ کو اس کی حالت پر بہت ترس آیا اور اس نے رحمت کو معتد بہ رقم دے دی تاکہ رحمت اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے واپس جا سکے۔ (منی کے باپ کو اپنی بیٹی کی شادی کی جو خوشی تھی وہ اس خیال سے اور بھی زیادہ ہو گئی کہ مدت کا بچھڑا ہوا باپ اپنی اکلوتی بچی سے ملنے جا رہا ہے۔)

ہادی القادری

کرن

(علامہ اقبال کی نظم "شعاعِ امید" تمثیلی انداز میں)

افراد

راوی ۱ } پس پردہ رہتے ہیں۔ صرف آوازیں سُنی جاتی ہیں۔ دو علٰحدہ علٰحدہ
راوی ۲ } آوازوں کے لئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی رہیں تو مناسب ہے۔

سورج۔ خوش رو۔ جیسے آفتاب۔ سفید جگمگاتا لباس پہنے سر پر کرنوں کا تاج رکھے ہوئے متبسم۔ کائنات کرنے والا۔

کرنیں۔ کم سے کم دو ہوں۔ لباس جھلا جھل کا ہو۔ سروں پر روشن کرنوں کے تاج ہوں۔ لباس کا رنگ مختلف ہو تاکہ دونوں کرنوں میں امتیاز ہو سکے اور ایک کو مشرقی اور دوسری کو مغربی سمجھا جا سکے۔ دو سے زیادہ کرنیں ہوں تو لباس مختلف قومیتوں کو ظاہر کرنے والے ہوں۔ مثلاً ہندی، چینی، افریقی، عرب اور یورپی وغیرہ۔

مشرقی کرن کو رقص میں خاصی مہارت ہو۔ باقی کے لئے صرف لگاؤ کافی ہے۔

مغربیے۔ مغرب میں تاریکی سے پریشان۔ تاریکی کو دور کرنے کے لئے "عجیب" ترکیب فرمانا چاہتے ہیں "پس پردہ رہتے ہیں۔ صرف آوازیں سُنی جاتی ہیں۔

ضروری سامان

۱۔ ہندوستان (غیر تقسیم شدہ) کا ایک کافی بڑا خاکہ۔ تقسیم شدہ علاقوں میں الگ الگ رنگ دئے جائیں۔ حدود پر خوب افشاں کاری کی جائے۔ تاکہ روشنی میں جھلمل جھلمل کرے۔

۲۔ اقبال اور کم سے کم ٹیگور، پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی کی تصویریں جنہیں خاکے میں صحیح مقاموں پر چسپاں کیا جائے۔ تصویروں کے حاشیوں پر بھی افشاں کاری کی جائے۔

۳۔ ایک "ترنگا" اتنا بڑا کہ اس میں ہندوستان کا خاکہ چھپ سکے۔ اور تصویروں کے لئے چھوٹے چھوٹے نقاب جو تصویر کے ہم رنگ ہوں۔

۴۔ سورج کے لئے تخت اور چمکدار مسند یا بہت عمدہ کُرسی۔

۵۔ برقی روشنی کے گھٹانے بڑھانے کا معقول انتظام۔

اسٹیج

درمیان میں تخت یا کرسی رکھی جائے۔ جس پر سورج جلوہ افروز ہو۔ پیچھے کے پردے پر ہندوستان کا خاکہ آویزاں کیا جائے۔ اس پر ترنگے کا پردہ ڈالا جائے۔ جب "کرن" ہندوستان کی طرف سورج کو متوجہ کرے تو ترنگا پردہ ایک طرف کھینچ لیا جائے۔ ایسے ہی تصویروں پر جو چھوٹے چھوٹے نقاب ہوں وہ اپنے وقت پر ہٹائے جا سکیں۔

تمہید

(پردہ اُٹھنے سے پہلے۔ راویوں کی زبان سے)

راوی ۱۔ شاعر اپنے دقیق مشاہدے، لطیف احساس اور بلند تخیل کی بنیاد پر جب کوئی تخلیق کرتا ہے تو اس میں کچھ ایسی حقیقتیں رچ جاتی ہیں کہ زمانہ کی گردشیں اس کے شعر کو دفترِ پارینہ نہیں بنا سکتیں۔ فن کے اندر سموئی ہوئی صداقت ہر آن نئی شان سے جلوہ دیتی رہتی ہے۔

راوی ۲۔ اقبال کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس جیسا تیز نظر اور بلند فکر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔

ع۱۔ اقبال نے برسوں پہلے ایک نظم تحریر کی تھی جو ضربِ کلیم میں اپنے انداز کی اکلوتی نظم ہے۔ اقبال کی نگاہِ دوررس نے اسی وقت وہ دیکھ لیا تھا جو آج ہم بلکہ ساری دنیا محسوس کر رہی ہے۔

ع۲۔ دنیا اپنی تمام ترقیوں کے ساتھ اسی راستے پر برابر آگے کی سمت ہی بڑھتی جا رہی ہے جو تباہی کا راستہ ہے۔ کروڑوں حسرتوں اور امنگوں کے باوجود زندگی کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔

م۱۔ ایسی حالت میں زندگی بخشنے والی طاقت اگر اس سعی لاحاصل سے دستکش ہو جائے تو کیا غلط ہوگا۔

م۲۔ اقبال نے اس نظم میں سورج کی زبان سے جو پیام دیا ہے وہ اسی شکستہ خاطر کو ظاہر کرتا ہے۔

ع۱۔ اقبال شاعرِ حیات ہے۔ اس ناساز ماحول میں بھی وہ مایوس نہیں۔ وہ اپنے وطن کی خاک سے کیسی کیسی امیدیں رکھتا ہے۔

ع۲۔ اقبال کو یقین تھا کہ ہندوستان خود روشن ہو کر ساری دنیا سے اندھیرے کو مٹا دے گا۔

ع۱۔ مشرقی کرن کی التجا میں اسی طرف اشارے ہیں۔

م۲۔ شاعر کا تخیل ہمارے ہر دل عزیز وزیر اعظم کی خارجہ پالیسی سے آج ایک ایسی حقیقت بن گیا ہے جسے اپنے اور پرائے سب ماننے پر مجبور ہیں۔

م۱۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی وہی نظم "شعاعِ امید" ہم آج "کرن" کے نام سے تمثیلی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

م۲۔ کرن ——— روشنی کا سرچشمہ ———

م۱۔ کرن ——— صبحِ نو کی نویدِ جاں فزا ———

ع۲۔ کرن ——— امید کا پیکرِ مجسم ———

م۱۔ کرن ——— تابناک مستقبل کی بشارت ———

م۲۔ ملاحظہ فرمائیے ———

ع۱۔ کرن ———

ع۲۔ کرن ———

(پردہ اٹھتا ہے)

(اندر کی طرف اسٹیج کے وسط میں تخت یا کرسی پر سورج بیٹھا ہوا ہے۔ سامنے کی طرف دونوں گوشوں میں کرنیں ایک انداز سے کھڑی ہیں۔ جیسے وہ رقص کرتے کرتے رکی ہیں یا رقص شروع کیا چاہتی ہیں۔

اسٹیج بقعۂ نور بنا ہوا ہے

سورج کبیدہ خاطری سے کبھی اِدھر کبھی اُدھر دیکھتا ہے۔ ہر منظر سے منہ موڑتے ہوئے ہاتھ جھٹکتا ہے۔ ایک دردناک کراہ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے جو ناگواری اور تکلیف ظاہر کرتی ہے)

راوی ۱ کیوں دیکھ رہا ہے یہ اِدھر اور اُدھر آج

(سورج فیصلہ کن انداز میں سوچنے لگتا ہے)

راوی ۲۔ کچھ فکر سی ہے، فیصلہ کرنا ہے مگر آج

(سورج گردن اُٹھاتا ہے اور کھڑا ہونے لگتا ہے)

راوی ۱۔ وہ دیتا ہے اپنی شعاعوں کو وہ پیغام

سورج۔ (وجہ بتاتے یا اصطلاحی طور پر دفع دخل کے انداز میں)

دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام

(کرنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام

("پہنائے فضا" پر دونوں ہاتھوں سے فضا کی طرف وسیع اشارہ کرتا ہے۔ اور "بے مہریِ ایام" پر ایک جھٹکے کے ساتھ دونوں ہاتھ نیچے گراتا ہے۔ جس سے ظلم اور اس پر ناگواری دونوں کی طرف اشارہ مقصود ہے)

(آواز میں کرب ہے) نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت

نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

("ریت کے ذروں" پر ایک ہاتھ سے زمین کی طرف اشارہ کرتا ہے اور "مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ" پر اشارے کرتا ہے۔ چمن

---

۱ تمثیلی ضرورت کے پیشِ نظر لفظی ترمیم کی گئی ہے۔

صبا کی سبک سیری بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور گل ولالہ پر اس کا تھپڑ تا بھی)
(حکم کے انداز میں) پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ۔
("تجلی کدۂ دل" پر انگلیوں کے سرے چھاتی پر بے اختیارانہ مارتا ہے)
(پورے جلال میں) چھوڑو چمنستان و بیابان و درد بام
("چمنستان و بیابان و درد بام" پر اشاروں میں ہاتھ کے جھٹکے صرف
انھیں علٰحدہ علٰحدہ متعین ہی نہیں کرتے ان سے بیزاری کا بھی
پتہ دیتے ہیں)

راوی[1]۔ آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں

راوی[2]۔ بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتے کو ہم آغوش

(کرنیں آہستہ آہستہ رقص کرتی ہوئی سورج کی طرف الٹے پاؤں
واپس ہونا شروع کرتی ہیں۔ مگر رکتی ہوئی۔ جیسے انھیں زبردستی
کھینچا جارہا ہے۔ سورج اپنی نشست پر آہستہ آہستہ بیٹھ جاتا ہے
دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کی طرف شعاعوں کو بلانے کے لئے
برابر اشارے کرتا ہے۔ کرنیں اس کی طرف جاتے ہوئے ذرا رکتی
ہیں۔ ایک جگہ رک کر دو تین چکر لیتی ہیں)

سورج۔ (نرمی سے) آؤ

(کرنیں پھر تھوڑا سا آگے بڑھ کر رکتی ہیں)

(پھر بھی سے) آجاؤ

(کرنیں کشاں کشاں سورج کے قدموں میں پہونچ جاتی ہیں۔
گھٹنوں کے بل گر کر گردن جھکا لیتی ہیں
کرنوں کے سورج کے پاس پہونچنے کے ساتھ ساتھ روشنی بھی
آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ صرف ایک ہلکی سی روشنی سورج کے
چہرے اور اس کے قدموں میں جھکی ہوئی کرنوں پر پڑتی رہتی ہے)

راوی[1] اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

مغربیے[1] (پس پردہ۔ گھبرائی ہوئی آواز میں) بجلی کو یہ کیا ہوا یہ کیا ہے۔
کیوں رک گئیں یہ میری مشینیں۔

[2] دوزخ سے بھی بڑھ گئی یہ ٹھنڈک
یہ میرا سگار بجھ گیا کیوں

[1] سرکردہ ہزار جوہری بم

[2] کوبالٹ زیادہ کارگر ہے

[1] اور [2] (دونوں ایک ساتھ) شاید یوں ہی دور ہوا نہ میرا

راوی[1]۔ مشرق نہیں گو لذت نظارہ سے محروم

(ذرا ٹھہر کر۔ اور وقفہ سے) لیکن صفت عالم لاہوت ہے خاموش

کرنیں (یک آواز۔ تعمیل حکم کے انداز میں۔ ہلکے ترنم سے)
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہر جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(خاموشی چھا جاتی ہے۔ سورج اپنے ہاتھ کرنوں کے سروں
پر رکھنے کے لئے جھکتا ہے۔ مشرقی کرن اپنے سر کو ادب اور
سلیقے کے ساتھ آہستگی سے ایک طرف کر لیتی ہے۔ سورج کی
طرف چہرہ اٹھاتی ہے۔ گھنگھرو چھنک اٹھتے ہیں)

راوی[1]۔ اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ . . . . . .

مشرقی کرن (نہایت عمدہ لے سے۔ مصرع مکمل کرتی ہے)
. . . . . . مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

("مشرق" پر ہاتھ سے طویل اشارہ کرتی ہے اور آہستہ آہستہ
کھڑی ہو جاتی ہے۔ گھنگھرو کی جھنکار بڑھتی جاتی ہے)
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب

("ہند" پر ہندوستان کے خاکے پر سے نقاب ہٹ جاتا ہے۔
اس کے چار جانب لگے ہوئے برقی قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔
کرن اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دوسرے مصرع میں بھی
بیداری اور خواب سے متعلق اشارے کرتی ہے)

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

---

[1] موقع کی مناسبت سے لفظی ترمیم کی گئی ہے

"خاور" پر پوری سمت کی طرف اور "یہی خاک" پر ہندوستان
کے جگمگاتے خاکے کی طرف وضاحتی اشارے کرتی ہے۔" اقبالؔ
پر انباں کی تصویر پر پڑا ہوا چھوٹا نقاب ہٹ جاتا ہے۔ اور
کرن سورج کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہے)

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

("غواصِ معانی" پر تصویروں سے نقاب ہٹ جاتے
ہیں۔ مشرق میں ٹیگور، دہلی اور الہ آباد کے درمیان
پنڈت نہرو اور گجرات کے علاقہ میں مہاتما گاندھی کی
تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔ کرن سورج کو ایک ایک
کی طرف متوجہ کرتی ہے)

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

(کرن۔ "ساز" "نغمہ" اور "حرارتِ دل" کی وضاحت
اشاروں سے کرتی ہے۔ "محفل کا وہی ساز" پر ہندوستان
کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ "بیگانۂ مضراب" پر بڑے
زور سے مضراب مارنے کے انداز سے ہاتھ جھٹکتی ہے پس پردہ
سنگیت کار اس اشارے کو تاروں کی جھنجھنا ہٹ سے ابھار
دیتا ہے)

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر
ہر شب کو سحر کر
ہر شب کو سحر کر

(موسیقی آہستہ آہستہ مدھم ہو جاتی ہے۔ مشرقی کرن ہاتھ جوڑ
کر اجازت چاہنے کے انداز میں سورج کے آگے جھکتی ہے۔
سورج کے چہرے پر مسکراہٹ چھا جاتی ہے)
سورج (اجازت دینے کے انداز میں ہاتھوں سے چلنے کا اشارہ کرتے
ہوئے) ہوں۔
(مشرقی کرن بے خودانہ انداز میں جھوم جاتی ہے۔ اور رقص
کرتی ہوئی پھر اپنی سمت روانہ ہوتی ہے۔ تھوڑی دور جا کر
پلٹ آتی ہے۔ اور مغربی کرن کو جو ابھی تک اسی طرح
بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتی ہے۔
دونوں سورج کی طرف متشکرانہ انداز میں جھکتی ہیں اور
رقص کرتی ہوئی دونوں سمتوں سے سامنے کی طرف بڑھتی
ہیں۔ جس طرف سے وہ دونوں گزرتی جاتی ہیں روشنی ہوتی
جاتی ہے۔ اسٹیج پھر جگمگا اُٹھتا ہے۔ سورج سامنے کی
طرف دیکھتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کرنیں رقص کئے جا رہی ہیں
جب کرنیں اسی نقطہ پر پہونچ جاتی ہیں جہاں پردہ اُٹھتے
وقت تھیں تو اسی انداز میں ٹھہر جاتی ہیں)
(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

بہترین پھلوں کی کاشت کے لئے انعامی مقابلے کی اسکیم

ملک میں عمدہ قسم کے پھلوں کی کاشت کی حوصلہ افزائی کے لئے اس سال سے آم، سیب، کیلے، مالٹے اور سنگترے کی کاشت کے لئے انعامی مقابلوں کا اہتمام کیا گیا ہے ان میں سے ہر پھل کے بہترین کاشت کار کو دو ہزار روپے نقد اور اُڈیان پنڈت کا سرٹیفکیٹ یا تمغہ بطور انعام دیئے جائیں گے۔ یہ مقابلے پہلے ریاستی سرکاروں کے تحت ریاستی سطح پر اور پھر بھارت کی زرعی تحقیقی کونسل کے ماتحت کل بھارتی سطح پر ہوں گے۔ فی الحال ہر سال صرف ایک قسم کے پھل کی کاشت کا مقابلہ ہوگا۔ اس سال ریاستی سطح پر آم کی کاشت کے مقابلے کا بندوبست کیا گیا ہے اور اس کا کل بھارت مقابلہ ۱۹۵۹ء میں ہوگا۔



وارث کرمانی



دونی چند شرما

ہمارے لکھنے والے



فضا ابن فیضی



راز یزدانی

نئی مرکزی کابینہ



مولانا ابوالکلام آزاد
وزیر تعلیم



پنڈت گووند ولبھ پنت
وزیر داخلہ



شری جواہرلال نہرو
وزیر اعظم

شری مرارجی ڈیسائی
وزیر تجارت وصنعت



شری جگ جیون رام
وزیر ریلوے





شری وی کے کرشنا مینن
وزیر دفاع

شری گلزاری لال نندا
وزیر محنت و پلاننگ



شری ٹی ٹی کرشنا چاری
وزیر خزانہ





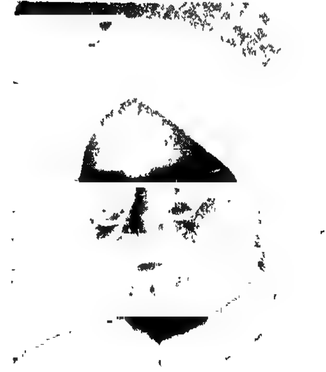
شری ایس کے پاٹل
وزیر آبپاشی و بجلی

شری کے سی ریڈی
وزیر تعمیرات و سپلائی



شری لال بہادر شاستری
وزیر مواصلات





شری اجیت پرساد جین
وزیر خوراک و زراعت

سردار سورن سنگھ
وزیر معدنیات و فولاد



شری ڈی پی کرمرکر



شری اشوک کمار سین



ڈاکٹر بی وی کیسکر



شری ستیہ نارائن سنہا



شری ایس کے ڈے



شری مہر چند کھنہ



شری کیشو دیو مالویہ



شری کے ایل شری مالی



شری نتیانند قانونگو



شری راج بہادر



شری ایم ایم شاہ



شری پنجاب راؤ دیش مکھ



شری بی این داتار



پروفیسر ہمایوں کبیر

اروندو گھوش

ترجمہ - ارشد صدیقی

ماتا کو پرنام

اے ماتا تجھ کو پرنام

تو چشموں سے مالا مال — بارغ ترے کرنوں کے جال
مست ہوا ٹھنڈک برسائے — ہری بھری کھیتی لہرائے

تیری شکتی بڑی مہان
آزادی تیرا شبھ نام
اے ماتا تجھ کو پرنام

چمکیلے سپنوں کی جیت — چشموں اور شاخوں کے گیت
تیرے پیڑوں کے پھل پھول — جیون من کے سکھ سنگیت
ہنستے میٹھے پیار کی چھاؤں — چوم لوں اے ماں تیرے پاؤں

اے شیریں اور نرم کلام
اے ماتا تجھ کو پرنام

کون یہ کہتا ہے اے ماں — تیری دھرتی ہے کمزور
ہاتھوں میں لے کر تلوار — جاگے جب پینتیس کروڑ
جب گرجے پینتیس کروڑ — لے کر تیرا نام مہان
دیش کے کونے کونے میں — گونج اٹھی ان کی للکار
کتنے شکتی شالی لوگ — بل اور بدھی سے بھرپور
کہتے ہیں تجھ کو بھگوان — تیرا ہے سب پر کلیان

ہمیں بچا اور دے سمان — ایک تجھی سے ہے فریاد
دشمن جس نے مار بھگائے — میدان اور سمندر پار
اور کیا خود کو آزاد — تو ہی عقل تو ہی قانون
تو ہی من جیون اور سانس — ہم کو تیرے پیار کی آس
تو من میں وہ بھاؤ جگائے — موت کو بھی جو مار بھگائے
تیرا ہی شکتی وردان — ہاتھ کو کرتا ہے بلوان

سندر، موہن، سکھ وشرام
اے ماتا تجھ کو پرنام

تو چشموں سے مالا مال — بارغ ترے کرنوں کے جال

اے رنگینی سے بھرپور

تو ساری قوموں کا میل — تیرے من میں موتی بیل
جیت بھری تیری مسکان — تو سب دیشوں کی پردھان
تیرے شکتی شالی ہاتھ — کرتے ہیں دھن کی بوچھار
اے ماتا تیرا وردان — کتنا سندر اور مہان

آزادی تیرا شبھ نام
اے ماتا تجھ کو پرنام

سلہ HYMN TO MOTHER

ست پرکاش سنگر

ادب اور زندگی

ادب اور زندگی کے مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے ہم کچھ سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ ادب کیا ہے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے پوچھنا پڑے گا۔ ادب کیا نہیں ہے؟ ایک ادبی شہ پارہ نہ تو ایک تاریخی مقالہ ہے، نہ ہی فلسفے سے متعلق کوئی مضمون۔ ادب، نسلِ انسانی کا ایک عظیم اور زبردست ورثہ ہے۔ زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ جو تجربات مختلف لوگوں نے اپنی زندگی میں حاصل کئے جن خیالات کو انھوں نے سوچا، جن جذبات کو محسوس کیا، انھیں زبان عطا کرنے کے بعد قلمبند کیا اور وہ ہماری ادبی وراثت بن گئے۔ ادب کا تعلق براہِ راست زندگی سے ہے۔ ادب زندگی ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جو ادب زندگی سے متعلق نہیں۔ اس میں جان نہیں ہو سکتی۔ وہ ادب کہلا ہی نہیں سکتا۔

دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے۔ لوگ کیوں لکھتے ہیں؟

اس لئے کہ وہ لکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ کوئل گاتی کیوں ہے؟ بلبل روتی کیوں ہے؟ پرندے چہچہاتے کیوں ہیں؟ اپنے خیالات کا اظہار کرنا کچھ لوگوں کے لئے بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ انھیں گرد و پیش کی زندگی سے اتنی دلچسپی ہو جاتی ہے کہ لوگوں کی عادات اور اُن کے کارناموں کو قلم بند کرنے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔ اصلیت کی اس دنیا کے واقعات کو تو ایک لیکھک کاغذ پر لاتا ہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تخیل ایک خیالی دنیا کی بھی تخلیق کرتا ہے اور اُس تخیل کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ ادب کیا ہے؟

میتھیو آرنلڈ کے قول کے بموجب ادب زندگی کی تنقید ہے۔ ادیب زندگی کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور ان مشاہدات کو قلم بند کرتا ہے۔ وہ زندگی کا مترجم ہے، عکاس ہے۔ وہ خلوص کا دعویدار اور سچائی کا علمبردار ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربات کو کاغذ پر لاتا ہے۔ لوگوں کے تجربات، ان کے تعلقات اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو قلمی جامہ پہناتا ہے۔ وہ زندگی کے مشاہدات کو اپنی شخصیت میں ڈھال کر، اپنی شخصیت کا آئینہ سماج کو پیش کرتا ہے، اور اس آئینہ میں سماج اپنی خود کی تصویر ملاحظہ فرماتا ہے۔ ادب زندگی کی تنقید ہی نہیں کرتا، اسے راستہ بھی دکھاتا ہے۔ وہ زندگی کو سنوارتا ہے، نکھارتا ہے اور اسے ایک خوبصورت سانچے میں ڈھالتا ہے۔

چوتھے سوال میں اعلےٰ ادب کی تعریف آتی ہے۔ اعلیٰ ادب کیا ہے؟

الف۔ اس میں دلچسپی کا عنصر ہو۔

جس ادبی تخلیق میں دلچسپی نہ ہوگی، اُسے کوئی کیسے پڑھ سکے گا؟ اعلےٰ افسانہ اور ناول کی سب سے پہلی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ وہ دلچسپ ہو۔ قاری اس میں لطف لے سکے، اس میں رس پا سکے۔

ب۔ لیکن ایک اعلیٰ ادبی تخلیق میں محض دلچسپی کا ہونا ناکافی ہے۔ اس میں فن کا وجود لابدی ہے۔ ناگزیر ہے۔ اس کے فقدان میں ادبیت کا فقدان ہے۔ ادب کی تخلیق کرنے میں ادیب کو گھنٹوں کاوش کرنی ہوتی ہے۔ خونِ جگر بہانا ہوتا ہے۔ ایک اعلیٰ کتاب پیدا کرنے کے لئے اُسے دل و دماغ کی ساری قوت صرف کرنی ہوتی ہے۔ اُس میں اُس کی ساری شخصیت سموئی ہوتی ہے۔ محنت کے بغیر فن کبھی اُبھر ہی نہیں سکتا، اور فن کے بغیر تخلیق مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

ج۔ اچھے ادب کی تیسری تعریف یہ ہے کہ وہ موثر ہو، زندگی کو بدل

سکے، اُسے سنوار سکے، راہِ راست پر لا سکے۔

دنیا کے فلسفی اور دانشور اس بات کو بار بار دُہرا رہے ہیں کہ موجودہ نظام میں خاطر خواہ تبدیلی لائے بغیر انسان ترقی کے راستے پر ہرگز گامزن نہیں ہو سکتا۔ اس کی بہبودی کا راز، نظام کے تبدّل ہی میں مخفی ہے۔ کچھ لوگ اس بات سے گھبرا اُٹھتے ہیں اور ایسا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو انقلاب پسند سمجھ کر، اُن سے مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے طالب علم اس سچائی سے کبھی منکر نہیں ہو سکتے کہ زندگی ہر دور اور ہر صدی میں بدلتی آئی ہے۔ اگر یہ امر واقعہ نہ ہوتا تو آج ہماری آنکھ سائنس کے معجزات کا کبھی نظارہ نہ کر سکتی ریل گاڑی اور موٹر کار، ریڈیو اور ہوائی جہاز کبھی وجود میں نہ آتے۔ ہر زمانے نے ایسے انسانوں کو پیدا کیا جنھوں نے حالات کی رفتار سے غیر مطمئن ہو کر جدید تفکرات اور نئی ایجادات کو جنم دیا۔ زمانے نے ہمیشہ انھیں مشکوک نظروں سے دیکھا اربابِ حکومت نے سدا ان پر مظالم ڈھائے۔ انھیں سُولی کے تختہ پر چڑھایا زندہ، آگ میں جلایا۔ انھیں زمین میں گاڑا گیا۔ دیواروں میں چنوایا گیا۔ کبھی انھیں زہر کا پیالہ پینا پڑا، کبھی گولی کا نشانہ ہونا پڑا، سماجی نظام میں انقلاب لانے والوں کو بھی زمانے نے کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ہمارے ملک میں ابھی سو سال قبل، خاوند کے انتقال پر، عورت کو زندہ ہی جلتی آگ میں دھکیل دیا جاتا تھا، خاوند کی لاش کے ساتھ جلنا، ایک مقدس فریضہ گردانا جاتا تھا۔ اکثر لوگ ستی کی رسم کو نظامِ قدرت کا لابدی اصول مانتے تھے اور اُس میں تبدیلی لانا اُس اصول کی خلاف ورزی گردانتے تھے۔ لیکن آج ستی کی رسم قانوناً جرم ہے۔ اسے جرم ٹھہرانے کے لئے سماج کے چند لوگوں کو سخت جدوجہد کرنی پڑی، نوکِ قلم و زبان سے اس پر شدید حملے کر کے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا پڑا اور اس کے بعد اہلِ حکومت کو ان سے مرعوب ہو کر اسے قانوناً جرم ٹھہرانا پڑا۔ آمریت اور جاگیرداری کو ختم کرنے کے لئے لوگوں کو کتنی قربانی دینی پڑی، سامراجیت اور سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے آج کتنی کوشش کی جا رہی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ دونوں قریب المرگ ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ سماج میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہا ہے۔ اگر ہم ٹھہراؤ کے اصول کو تسلیم کر لیتے تو آج اس منزل پر کبھی نہ پہنچ پاتے۔ ہمارے ملک میں چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر، اٹھارویں صدی تک باہر کے لوگ حملہ آوروں کی حیثیت سے آتے رہے، ہم نے ہمیشہ ان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کبھی ان کے نظامِ حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ ہم بار بار غلامی کی زنجیروں میں پھنسے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہم نے ہمیشہ اُن زنجیروں کو کاٹ کر پھینکا، ہم نے شکست کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور آخرکار اس جذبہ کے تحت اپنے انگریز حاکموں کے خلاف جنگ کا علم بلند کیا۔ ان کے ظلم و تشدد، ان کے جور و تعدّی کا مقابلہ کر کے انھیں یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہم نے ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ اُن کے نظامِ حکومت سے کبھی اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔ آج کی حکومت بھی موجودہ سماجی نظام سے مطمئن نہیں۔ اسی لئے اُس نے سوشلسٹ پیٹرن کا ریزولیوشن پاس کر کے نئے سماج کی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج دُنیا کے بیشتر ممالک میں، وہاں کے لوگ اور اربابِ حکومت یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ہمیں ایسے سماج کو بدلنا ہے جہاں ایک آدمی دس انسانوں کی محنت پر پلتا ہے۔ جہاں ایک سرمایہ دار کئی مزدوروں کا حصّہ خود ہڑپ کر جاتا ہے۔ جہاں ایک آدمی دن بھر کی محنت کے بعد بھی بھوکا مرتا ہے۔ جہاں ایک شخص شاندار محل میں اور دوسرا سڑک کے کنارے سوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس دَور میں لوگ مساوات کی بات سوچ رہے ہیں۔ اور خوش قسمتی سے ہمارے آئین میں اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایسے دَور کو وجود میں لانے کے لئے جہاں سب کو روٹی اور کپڑا، مکان اور تعلیم میسّر ہو۔ لکھنے اور بولنے کی آزادی ہو۔ ادیب کو اپنے قلم کو حرکت میں لانا ہوتا ہے دوسرے الفاظ میں سماجی انقلاب کو وجود میں لانے کے لئے ادب ایک زبردست ہتھیار ہے اور وہ تبھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ اگر اس میں اثر ہو۔

اس سے ایک اہم سوال کا خود بخود جواب مل گیا۔ گذشتہ صدی میں یورپ میں اس سوال پر خوب بحث چلی کہ آیا ادب، ادب کے لئے ہے یا زندگی کے لئے۔ اب یہ بحث ختم ہو چکی ہے۔ اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ محض زندگی کی ترجمانی ہی نہیں کرتا، اسے سنوارتا اور نکھارتا بھی ہے۔ وہی شخص سچّے معنوں میں ادیب کہلا سکتا ہے۔ جو زندگی کا بغور مشاہدہ کرتا ہے۔ سماج میں بسنے والے آدمیوں کی زندگی میں داخل ہو کر ان کے مسائل کو سمجھتا اور ان کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، ایک سچا ادیب سماج میں پھیلے ہوئے مظالم اور ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتا اونچ نیچ کے جذبے کو پسند نہیں کر سکتا۔ جھوٹ اور تنفر کو پنپتے دیکھ نہیں سکتا اسے ہر قسم کے تعصّب سے نفرت ہوتی ہے۔ چاہے وہ مذہبی تعصّب ہو یا

ملکی۔ وہ ہمیشہ غلامی کے خلاف جہاد کرے گا، چاہے عورتوں کی غلامی ہو یا ذہنی غلامی۔

تو یہ بات صاف ہو گئی کہ ادب زندگی کے قریب ہی میں رہ کر پل سکتا ہے۔ اور زندگی کی ترجمانی کرنا، اسے سنوارنا اور نکھارنا ہی اُس کا فریضہ ہے۔

آج کے ادیبوں کا ایک بڑا گروہ اس بات کے حق میں ہے کہ سچا ادب وہی ہے جو مزدور اور کسان سے متعلق ہو اور ان پر ڈھائے گئے مظالم کا تذکرہ کرے اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی سماج کی تشکیل تفریق کی بنیاد پر رہی اور اس میں ایک فریق دوسرے کے ہاتھوں پِستا رہا۔ آج بھی حالات زیادہ مُسدھر نہیں پائے ہیں اور جب تک ان میں مکمل انقلاب نہ آ جائے، ایک ادیب کے لئے چین سے بیٹھنا حرام ہے۔ لیکن ادیب کو ہمیشہ ایک رُخی پالیسی سے بچ کر ہی چلنا ہو گا اسے تو حقیقت کی ترجمانی کرنا ہے اور اس ترجمانی کے لئے اگر وہ کسی خاص سیاسی گروہ سے غیر متعلق ہو کر رہے تو ادب کے لئے بہتر ہے۔ ادیب چاہے کسان اور مزدور کے بارے میں لکھے یا سماج کے دوسرے پس ماندہ طبقات کے لئے اسے خلوص اور ایمانداری کا سہارا نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کسان اور مزدور کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی، اُسے نعرہ بازی سے بچنا چاہئے۔ کیوں کہ پراپگنڈہ اور نعرہ بازی ادب کے لئے مہلک ہیں۔ ادیب تو سماج میں پھیلی ہوئی گندگیوں پر سے پردہ اٹھاتا ہے اور لوگوں کو حقیقت کا نظارہ کراتا ہے۔ وہ تو اصلیت کا مصوّر ہے۔ گل و بلبل کے تذکرہ سے کہیں بڑھ کر، گرد و پیش کا ماحول اس کی توجہ کا مرکز ہے۔ جس ماحول میں ایک طرف گندی نالیاں اور گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ اور دوسری طرف خوش نما بنگلے دکھائی دیتے ہیں، ایک طرف مفلسی اور ناداری کا ننگا ناچ ہے۔ دوسری طرف مکمل عیش کا سامان ہے۔ ادیب ایسے ماحول پر سے پردہ اٹھا کر لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتا ہے۔ اس کام کو وہ نہایت چابک دستی اور فنّی طریق سے سرانجام دیتا ہے۔ جب فن کے سہارے وہ سماج کے گھناؤنے منظر کو پیش کرتا ہے تو اُس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ قلم تلوار سے زیادہ تیز ہو اٹھتا ہے۔

ادب کا سماج سے کتنا گہرا سمبندھ ہے۔ آج کا ادیب بھوت اور پریوں کی خیالی تخلیق نہیں کرتا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے سماج میں، قدم قدم پر بھوت اور پریاں بس رہی ہیں۔ اس کا جنّت اور جہنّم کا تخیّل، عرش کے دور دراز پردوں میں نہیں، اسی دنیا میں ہے۔ باریک سے باریک خورد بین اور طاقتور سے طاقتور دوربین جنّت اور جہنّم کا کھوج نکالنے میں ناکام رہی ہیں۔ لیکن ایک ادیب ان کا ہر روز اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے قلم سے دوسروں کو مشاہدہ کراتا ہے۔

کامیاب ادیب وہ نہیں جو محض حال ہی میں محو ہے اور ماضی کی ہر بات کو غیر ترقّی پسندانہ سمجھ کر نظر انداز کر دے جس سماج کو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، وہ ایکدم الہ دین کے چراغ کے بھوت کا پیدا کردہ نہیں اس کا جنم ماضی کی کوکھ سے ہوا ہے اور جس طرح دورِ حال کی ہر چیز اچھی نہیں ہو سکتی۔ ماضی کی سب باتیں بُری نہیں ہوتیں۔ ہم ماضی کی عظیم روایات کو ایک دم کاٹ کر نہیں پھینک سکتے۔ مذہب نے جہاں ایک طرف عوام کے لئے افیون کا کام کیا ہے وہ دوسری طرف عظیم انسانی کارناموں کا محرک بھی رہا ہے۔ جہاں اس نے بھائیوں کو آپس میں لڑا کر انسانی خون بہایا ہے وہاں محبّت اور اخوت کے جذبے کو بھی پھیلایا ہے۔ اسی طرح جہاں ماضی کے فنکاروں نے حسن و عشق کے تذکرے کئے ہیں۔ وہاں پسماندہ سماج کی تصویر بھی کھینچی ہے۔ ایک زمانہ آیا تھا جب ترقّی پسندی کے نام پر اُدبا کی فہرست سے ماضی کے عظیم فنکاروں کو نکال کر پھینک دیا گیا تھا لیکن اب وہ بات نہیں، والمیکی اور تلسی داس، بھرتری ہری اور کالی داس، رحیم اور سورداس رس خان اور کبیر داس، میرا اور غالب کو نظر انداز کرنا، اپنے آپ کو ایک عظیم وراثت سے محروم کرنا ہے، ان کی تحریریں اُس زمانے کی ترجمانی تو ہے ہی لیکن اُن کے ادب میں بے پناہ دوامی قدریں بھی ہیں۔ یہی بات یورپ کے پرانے ادیبوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں لیکن دوامی اقدار کیسے بدل سکتی ہیں؟

ایک بلند ادیب مخلص اور ایماندار ہوتا ہے۔ وہ سچائی سے کبھی منحرف نہیں ہوتا۔ وہ جو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے چاہے اس سے دوسروں کی ناراضی ہی کیوں نہ خریدنی پڑے۔ اور شاید اسی لئے وہ کسی سیاسی یا مذہبی گروہ میں اُلجھ کر نہیں رہ سکتا۔ اس کا نقطۂ نظر طبقاتی نہ رہ کر عوامی اور آفاقی بن جاتا ہے۔ اس کا زاویہ نگاہ بے حد وسیع اور اس کا دل سمندر کی طرح بے پناہ ہوتا ہے لیکن بلند ادیب بننے کے لئے اسے سخت کاوش کرنی پڑتی ہے۔ جن عظیم ادیبوں کی تخلیقات ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ اُن کی اپنی زندگی بھی مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے۔ ہمیشہ بلند شخصیت ہی عظیم ادیب کو جنم دیتی ہے۔ ایک بدکردار کبھی بھی اعلیٰ ادیب نہیں بن سکتا۔ بلند خیالات کھوکھلے ذہنوں میں نہیں سما سکتے، پاک جذبات تنگ دلوں میں نہیں پنپ سکتے۔ ایک بلند مرتبت ادیب جہاں ایک طرف زندگی کا بغور مطالعہ کرتا ہے وہاں ساتھ ساتھ بے حد کاوش بھی کرتا ہے۔ دراصل محنت ہی کا دوسرا نام جینیس ہے۔

عابد رضا بیدار

اصغر کا مطالعہ

اصغر کا کلام اور متفرق تحریریں

نشاطِ روح	۱۹۲۵ء	
سرودِ زندگی	۱۹۳۵ء	
نظم و نثر پر ایک نظر	رسالہ ہندستانی جولائی ۱۹۳۱ء	
اُردو شاعری کی ذہنی تاریخ	غیر مطبوعہ	
یادگارِ نسیم	۱۹۳۱ء	
موہنجوڈارو	پانچ ہزار برس کا قدیم تمدن	رسالہ ہندستانی اکتوبر ۱۹۳۱ء
مرثیہ گوئی کی تاریخ	رسالہ سہیل، علی گڑھ	
ایک گشتی چٹھی کے جواب میں	رسالہ سہیل، جنوری ۱۹۲۶ء	

رسالہ ہندستانی کے اداریے

ہندستانی میں بعض کتابوں پر تبصرے

مختلف ممالک مثلاً چین، فرانس وغیرہ پر بچوں کے لئے تحفوں کا سلسلہ

ادبی مرکز لاہور کے شائع کردہ بعض انتخاباتِ شعری

اصغر کے بارے میں (اب تک صرف اتنا کام ہوا ہے)

موضوع	مصنف	ماخذ
تبصرہ نشاطِ روح	مرزا احسان احمد	دسمبر ۱۹۲۵ء
مقدمہ نشاطِ روح	اقبال سہیل	"
اصغر	رگھو نندن پرشاد، مترجمہ ہادی حسن	سہیل، دسمبر ۱۹۲۶ء
نشاطِ روح پر تبصرہ	مولوی عبدالحق	اردو، اپریل ۱۹۲۶ء
دیباچہ سرودِ زندگی	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۹۳۵ء
مقدمہ سرودِ زندگی	سر تیج بہادر سپرو	۱۹۳۵ء
سرودِ زندگی	معین الدین احمد ندوی	معارف، اکتوبر ۱۹۳۵ء
سرودِ زندگی	آل احمد سرور	سہیل، جنوری ۱۹۳۶ء
سرودِ زندگی	خلیل الرب صدیقی	سہیل، جنوری ۱۹۳۶ء
اصغر	رشید احمد صدیقی	نیرنگِ خیال، سالنامہ ۱۹۳۶ء
اصغر	مقبول حسین احمد پوری	ہمایوں، اگست ۱۹۳۷ء
مرحوم اصغر گونڈوی	رشید احمد صدیقی	جامعہ، اگست ۱۹۴۰ء
حضرت اصغر کے ساتھ چند گھنٹے	حامد بلگرامی	انتخابِ اصغر، مرتبہ جمیل نقوی ۱۹۵۳ء
اصغر کی شعری تصاویر	سعید انصاری	" " "
اصغر کی غزل	شان الحق حقی	" " "
مقدمہ انتخابِ اصغر	جمیل نقوی	
حضرتِ اصغر کے بعض ادبی افادات	سراج الحق مچھلی شہری	اصغر، مرتبہ عبدالشکور ۱۹۴۶ء
اصغر کی شاعری میں روایاتِ حال و قال	اسعد اللہ کاظمی	" " "
اصغر کی مستوری شخصیت	طاہر حسن صدیقی	" " "
اصغر اور اس کا کلام	عبدالشکور	" " "
اصغر گونڈوی اور ان کا طرزِ فکر	مظہر عزیز	" " "

اصغر	خواجہ احمد فاروقی	(یہ اس سے پہلے دسمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہو چکا ہے)
اصغر اور اُس کے ناقدین	مرزا احسان احمد	"نیرنگِ خیال" اگست ۱۹۳۵
اصغر گونڈوی کی شخصیت اور شاعری	مظہر عزیز	'ساقی' دسمبر ۱۹۴۱ء
سرودِ زندگی	نیاز فتح پوری	'انتقادیات' جلد اوّل
اصغر گونڈوی اور جدید تنقید	ڈاکٹر مسعود حسین	'ماہِ نو' جون ۱۹۵۰ء
اصغر صاحب اور میں	جلیل احمد قدوائی	"تنقیدی دریچے" ۱۹۵۳ء
اصغر	راجندر ناتھ شیدا	"مطالعے اور جائزے"
اصغر	اثر لکھنوی	مجموعۂ مضامین اثر لکھنوی
اصغر	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
اصغر گونڈوی اور اُن کا کلام	سید اشتیاق رضا	۱۹۴۶ء غیر مطبوعہ مقالہ
اصغر کے بارے میں ایک خط	جگر مراد آبادی	۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء سید اشتیاق رضا کے مقالے میں حوالہ
یومِ اصغر پر خطبۂ صدارت	اقبال سہیل	دسمبر ۱۹۵۳ء غیر مطبوعہ میرے پاس محفوظ ہے۔
اصغر کی شاعری	سید رضی الدین	"نگار" مئی ۱۹۵۵ء

انتخابات

اصغر کے سو شعر	محمود علی خاں جامعی	
انتخاب کلامِ اصغر	حسرت موہانی ۱۹۳۰ء	
انتخاب	ڈاکٹر ذاکر حسین	'نیرنگِ خیال' ۱۹۳۶ء
انتخاب اصغر	جمیل نقوی ۔۔۔۔ ۱۹۵۳ء	

اصغر کی شاعری، اصغر کی نظر میں

—— "میری شاعری خواجہ میر درد کے معانی اور میرزا غالب کے

الفاظ کا مجموعہ ہے۔"[1]

—— "ایسی شخصیتیں جنھوں نے اپنی زبردست انفرادیت کا ثبوت دے کر کوئی مخصوص کارنمایاں کیا ہے وہ اکثر سوسائٹی کے افراد سے دُور دُور رہی ہیں۔"[2]

—— "نسوانیت کی کشش اور اُس کی قوتوں کا اثر مُسلّم، اور یہ بھی تسلیم کہ اس سے ہمارے بعض ...... جذبات کی سیرابی ہوتی ہے۔ اسی احتیاج کے باعث نسوانیت کی اس کشش کو ہم "حسن" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر کیا ہماری انسانیت چند خاص ...... جذبات تک محدود ہے اور کیا اُن کے علاوہ ہماری دوسری احتیاجاتِ زندگی نہیں ہیں؟ اگر آبشار کی آواز اور مغنّی کا نغمہ تو ہمیں بے خود بنا دیتا ہے لیکن شفق کی سُرخی اور مرغزار کی سبزی ہم میں کوئی کیفیت پیدا نہیں کرتی تو اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارا 'شامہ' تو صحیح ہے لیکن 'باصرہ' یں یقیناً نقص ہے۔"[3]

—— "جس نظم میں جذبات نہ شامل ہوں، اسے شعر کہنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ کیا یہ شعر شعر کہا جا سکتا ہے

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
عشق بے حد ہے خودی محدود ہے

یہ شعر ممکن ہے ہمارے ذہن کو کسی واقعہ یا صداقت تک پہنچاتا ہو مگر اس سے ہمارے جذبات و حسیات میں کوئی تموّج و تلاطم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہ ایک بلند صداقت ہو لیکن شعر نہیں ....

اس طرح پر مولانا حالی کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کی افادیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انھیں شعر کہنا یکسر شعر کی توہین ہوگی"[4]

---

[1] بحوالہ سراج الحق مچھلی شہری —— "اصغر" مرتبہ عبد الشکور
[2] 'اصغر' —— یادگارِ نسیم۔ مقدمہ
[3] اصغر "اردو شاعری کی ذہنی تاریخ" بحوالہ عبد الشکور
[4] اصغر "نظم و نثر پر ایک نظر" 'ہندستانی' جولائی ۱۹۳۱

مجھ کو نہیں ہے تابِ خلشہائے روزگار
سُنتا ہوں بڑے فخر سے افسانۂ ہستی
غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض
اصغر غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی
شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیئے
اصغر کو ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا

دل ہے نزاکتِ غمِ لیلیٰ لئے ہوئے
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی
ہم تو گلشن میں فقط رنگِ چمن دیکھا کئے
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں
مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی
اشعار میں سُنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

کچھ اصغر کی شاعری کے بارے میں

اصغر صوفی شاعر تھے، اُن کے کلام کا تقریباً آدھا حصہ خالص صوفیانہ رنگ میں ہے۔ باقی کا ایک حصہ وہ ہے جو گھوم پھر کر اسی نقطہ کے گرد سمٹ آتا ہے اور ایک چوتھائی کے قریب ایسا ہے جس میں انھوں نے اسی دُنیا کی زبان میں باتیں کی ہیں۔ اس حصہ میں تغزل بھی ہے اور تصوّف سے ہٹی ہوئی نازک خیالی بھی اس میں آسمانی باتوں کو چھوڑ کر ہماری اپنی باتیں بڑے دلآویز انداز میں کہی گئی ہیں۔ ایک فلسفہ پُرانا پڑ جاتا ہے۔ ایک روایت اپنے عہد کے بعد مشکل سے پنپتی ہے۔ ذہن بدلتے رہتے ہیں، فکر کی آماجگاہیں تبدیل ہوتی رہتی ہے، لیکن —— حکایتِ محبوب کا موضوع ہمیشہ نیا رہتا ہے اور اس حکایتِ محبوب کے ساتھ ساتھ غزل گو شاعر کے یہاں کچھ ایسے عنوانات آجاتے ہیں جو بدلتی ہوئی زندگی میں کبھی فرسودہ نہیں ہو پاتے۔ انسانی دل جینے کی تمنّا لئے ہوئے ہمیشہ دھڑکتا ہے۔ زندگی حسن اور سلیقہ چاہتی ہے اور ہر اچھے غزل گو کے یہاں یہ حسن اور سلیقہ ملتا ہے۔ اصغر کے ان اشعار میں حکایتِ زلفِ دراز کے ساتھ ساتھ زندگی کے پیرہن تار تار کو رفو کرنے کا سلیقہ بھی ملتا ہے اور حیاتِ انسانی کو حسین سے حسین تر بنانے کا عزم بھی۔

اصغر نے اس انداز پر جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی شعر دوسرے درجہ کا نہیں۔ ان میں سے کچھ تو بآسانی اردو کے شعری سرمایہ میں قابلِ قدر جگہ پاسکتے ہیں۔ میں جب ایسے شعر پڑھتا ہوں تو اصغر کا یہ مقطع بے ساختہ یاد آجاتا ہے۔

صنم خانے میں کیا دیکھا کہ جا کر کھو گیا اصغر
حرم میں کاش رہ جاتا تو ظالم شیخِ دیں ہوتا

تصوّف کے 'صنم خانے' کا یہ پجاری اگر خالص غزل کے 'حرم' میں رہ جاتا تو سب بلا تامل اسے 'شیخِ دیں' مان لیتے۔

فن پر شخصیت کا اثر دیکھنا ہو تو اصغر کو پڑھئے اس سے موزوں تر مثال مشکل سے ملے گی۔ وہ صوفی تھے، صوفی کا کوئی مجازی محبوب ہو یا نہ ہو اس کا احساسِ حسن بڑا شدید ہوتا ہے۔ وہ حسن کا عاشق ہوتا ہے اور کوئی اچھا سمجھے یا بُرا۔ اس کے تصوّرِ حسن میں لطافت اور پاکیزگی زیادہ ہوتی ہے جنسی تصوّر نہ ہونے کے برابر سمجھئے۔ اصغر کے یہاں حسن کا بڑا شدید احساس ہے اور انتہائی پاکیزہ تصوّر

پھر یہ ہر جُز میں کل کا جلوہ دیکھنے کا عادی فطرت کے حسن کا بھی ایسا ہی پجاری ہوتا ہے جیسے انسانی حُسن کا۔ قُدرتی مناظر اس کے لئے بلا کی کشش رکھتے ہیں:۔ نیلگوں آسمان، اس پر چمکتا چاند، ننھے مُنے تارے، اُن کی آنکھ مچولیاں، زمین پر پھیلا ہوا سبزہ، لالہ و گل کی نمود، بلبل کا نغمہ، کوئل کی کوک، پپیہے کی آواز۔ وہ ان سب سے بے تحاشا پیار کرتا ہے، وہ فطرت کی ہر چیز کا رازدار ہوتا ہے۔ کلی چٹکے تو کسی کا پیغام بن جائے، موجوں کی روانی میں محبوب کی ادائیں نظر آئیں، صبا کی مست خرامی سے یادِ یارِ مہرباں تازہ ہو جائے اور اس کی بھینی بھینی خوشبو 'بوئے زلفِ عنبریں' بن جائے، ایک حد تک ہر شاعر فطرت اور اُس کے مظاہر کو محبوب رکھتا ہے لیکن صوفی شاعر تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اور اردو غزل کی پوری تاریخ میں فطرت سے ایسا لگاؤ، قُدرتی حسن کا اتنا شدید احساس، اصغر کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گا۔

صوفیوں کی رواداری، جذبۂ مفاہمت اور وسیع النظری ضرب المثل ہے تصوّف آج کتنا ہی قابلِ مذمت سمجھا جاتا ہو، اپنے زمانے میں اس نے جتنا اہم رول ادا کیا اس کا اعتراف نہ کرنا تاریخی شعور کی کمی کا مظاہرہ کرنا ہے، یہ مذہب کے اندر رہ کر مذہبی کٹرپن محدودیت اور تقشّف کے خلاف ایک تحریکِ بغاوت تھی —— اپنے عہد کی عظیم ترین ترقّی پسند تحریک، جو انسانوں کو طبقوں میں نہیں بانٹتی تھی جو عربی اور عجمی، مشرقی اور مغربی، مُسلم اور غیر مُسلم کا امتیاز نہیں جانتی تھی، صرف انسان کو دیکھتی تھی، انسان دوستی کی تحریک یورپ میں تو بہت دیر سے شروع ہوئی، مغربی ایشیا میں تصوّف اور اس کے بعد بھگتی تحریک کی شکل میں، یہ تحریک یورپ سے کافی عرصہ پہلے ایک باقاعدہ روایت بن چکی تھی اور تھا

اور ویدوں کی سرزمین اس کا مرکز تھی، ایران اور ہندوستان، آریوں کے متمدن ملک، جو ہر بیرونی چیز کو جذب کرنا جانتے تھے، اس میں جذب ہوتا گیا — اشتراکی مصلح، مزدک کے ایران میں بسطامی کی روایت، توحید پرست ویدوں کے دیس، ہندوستان میں بابا لال کے شاگرد دارا شکوہ تک پہنچی۔ ابوسعید ابوالخیر سے لے کر کبیر اور نانک تک، سرمد اور میر درد تک اور پھر اصغر تک، تلسی، فیضی، ابوالفضل اور ——— اشوک کے بعد ہندوستان کے عظیم ترین حکمراں — اکبر سے لے کر مہاتما گاندھی تک، سب ایک ایسا سلسلہ ہے جو آریوں کی سرزمین پر آج تک نہیں ٹوٹا۔

آریوں کے دیس میں ہر کٹر، غیر لچکدار چیز یا تو ٹوٹ جاتی ہے یا اسے مڑنا پڑتا ہے۔ یہ یہاں کی خاصیت ہے، یہاں ہر کٹر چیز کو معتدل بننا پڑتا، زیادہ سے زیادہ انسانوں سے مفاہمت اور ہم آہنگی کی یہ لازمی قیمت تھی، بدھ مت اور بھاگتی تحریک، تصوف اور بھکتی تحریک، اکبر اور دارا شکوہ، حافظ اور سعدی کبیر اور نانک، بابا لال اور سرمد، بہاء اللہ اور سرسید۔ کسی کو الگ الگ معلوم ہوں، مجھے تو سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں۔

آریوں کی سرزمینِ ہند نے ادب کی ایک صنف 'غزل' کو جنم دیا اور اس کے ساتھ ایک خاص روایت کو بھی، جس نے انسان کو بحیثیت انسان کے دیکھا، جس نے صرف محبت سیکھی، جس نے صرف جمال پر نظر رکھی، اور جو حسنِ انسان اور کائنات کے عشق اور محبتِ انسان اور کائنات کی ہر ہر چیز سے بے پناہ محبت، کے گرد گھومتی رہی، جس نے مذہبی کٹرپن کا دل کھول کر مذاق اڑایا، جس نے فرقہ واری نفرت کو جی بھر کے برا بھلا کہا، اور اس طرح انسانوں کو انسانیت کی بنیاد پر ہم آہنگ ہونے میں مدد دی، فارسی غزلوں کے بہت سے اشعار[1]

اور پھر کبیر کے دوہوں اور نانک کے کلام میں، اور بھکتی تحریک کے تمام شاعروں میں، آپ کو یہی باتیں زیادہ نرم اور عوامی انداز میں ملیں گی، اردو غزل میں غالب سے پہلے، میر اور درد کے یہاں کہیں کہیں ہلکے ہلکے اشارے مل جاتے ہیں اور اصغر سے پہلے غالب کے یہاں انسان دوستی کی یہ روایت بھرپور انداز میں ملتی ہے اصغر کے بعد، فراق اور [illegible] لکھنوی کے یہاں یہ خصوصیت ملتی ہے، لیکن ان سب میں تصوف کی راہ سے یہ روایت صرف اصغر کے یہاں پہنچی اور اصغر نے اسے اپنا لیا۔ یہ شعر رسماً نہیں کہے گئے ہیں ان میں انسانیت کا دل دھڑک رہا ہے:-

دیر و حرم بھی منزلِ جاناں میں آئے تھے
پر شکر ہے کہ بڑھ گئے دامن بچا کے ہم

ہیچ حسنِ تعین سے ظاہر ہو کہ باطن ہو
یہ قیدِ نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے

غرض یہ ہے کسی عنواں تجھے کریں مائل
کرشمہ سازیٔ ہر رند و پارسا معلوم

صدہا تو لطفِ مے سے بھی محروم رہ گئے
یہ امتیازِ ساغر و مینا لئے ہوئے

حسنِ ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے
ملحدِ بے خبر بھی گم جلوۂ 'لاالہ' میں

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و بند نے جسے ایماں بنا دیا

ایسا کہ بتکدے کا جیسے راز ہو سپرد
اہلِ حرم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسمِ بلالی و طرزِ بولہبی

رندوں کو صرف نشۂ بیرنگ سے غرض
یہ شیشہ دیکھتے ہیں نہ پیالہ دیکھتے

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

مذاقِ سیر و نظر کو کچھ اور وسعت دے
کہ ذرے ذرے میں ہے اک جہانِ نامشہود

یہاں فسانۂ دیر و حرم نہیں اصغر
یہ میکدہ ہے یہاں بےخودی کا عالم ہے

یہ رندی کے پردے میں انسان دوستی کا جذبہ اور میکدے کی دنیا میں، انسانوں میں محض انسانیت کی بنیاد پر ملاپ، اہلِ حرم کی کاوشِ بے جا پہ طنز، رسمِ بلالی اور طرزِ بولہبی، دونوں کا یکساں احترام اور لطفِ مے کے لئے امتیازِ ساغر و مینا کو یکسر مٹا دینے کی صلائے عام، صوفیانہ شاعری کے سوا، آپ کو خال خال ہی ملے گی — اور مختلف مذاہب اور متضاد زاویہ ہائے نظر میں سازگاری کی یہ سعیٔ مشکور، بلاشبہ خود ہماری تہذیب کو، اتنی بڑی دین ہے کہ صوفی شاعر کے یہاں اس کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی وہ ہماری توجہ کا مرکز بنا رہتا، لیکن اس کے یہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

میں نے شروع میں اصغر کے ایک شعر کے حوالے سے، اس کے، غزل کے

---

[1]
در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں چرا ست
از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

ہمیں عشق بہ کونین دوستی کردم
تو خصم باش و زمانہ دوستی تماشا کن

مخور مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ کن
ساکنِ بتخانہ باش و مردم آزاری مکن

آں کہ میکرد مرا منع پرستیدنِ بت
در حرم رفتہ و طوفِ در و دیوار کرد

عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر
پروانہ چراغِ حرم و دیر ندارد

مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نرسد
کفر آوردم و در عشقِ تو ایماں کردم

موم کا شیخ دیں بنتے بنتے رہ جانے پر افسوس کا اظہار کیا تھا یہ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ اصغر نے اس قسم کی شاعری بھی کی ہے۔

ترکِ مدعا کر دے عینِ مدعا ہو جا　　شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خدا ہو جا

اور خود شاعر کی اپنی رائے کے مطابق یہ اور جو کچھ بھی ہو کم از کم شاعری سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں —— اور اس قسم کے اشعار 'نشاط' اور 'سرود' میں خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں، لیکن انھیں کے ساتھ فوراً ہمیں ایک بالکل الگ قسم کی شاعری سے واسطہ پڑتا ہے، حسین، سبک، ترشی ترشائی۔ غزل کی تمام اچھی روایتوں کی حامل شاعری جس میں جذبہ کی شدّت اور حسنِ بیان گھل مل گئے ہیں۔ اصغر کے اس رنگ کے شعروں کو ہمارے منتخب شعری ادب میں ایک امتیازی مقام دیا جاتا رہے گا۔ اس حیرت ناک تضاد کی تاویل آسانی سے نہیں کی جا سکتی، یہ کام تو اصغر کی زندگی ہی میں کوئی تجزیہ نفسی کا ماہر انجام دے سکتا تھا یہ شاید اس لئے ہو کہ اُن کی شاعری ہمیں 'افتادہ ای' کی عمر سے نکلنے کے بعد ہی ملی، یا شاید یہ اس پاکیزہ لیکن سرد زندگی ہی کا ایک المیہ ہو جو ہمیں اُن کی شاعری میں تضاد کی صورت میں نظر آتا ہے، اور یہ بھی نہیں تو خود اس ساٹھ ستر سالہ انسانی زندگی میں کچھ کم تضادات ہیں؟ قدم قدم پہ اونچ نیچ، ہر موڑ ایک بھیانک موڑ، ہر گندا ہوا کل موت کی اتھاہ وادیوں میں سو جانے والا اور ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تلافی، ہر آج، ذہنی سکون کے لئے مستقل تازیانہ اور ہر آنے والا کل انگنت امکانات کو چھپائے زندگی کے ہر راہی کا بے چینی سے منتظر یہ سب کچھ بڑی غیر معمولی نفسیاتی اکائیوں میں نفسی الجھن پیدا کر سکتا ہے اصغر تو ایک ایسی، بالکل معمولی اکائی تھے، یہی زندگی کا تضاد اُن کی شاعری کا تضاد بن گیا ہے۔ اور اس تضاد میں جب جب موقع ملا ہے۔ اس نے ایسے جھلملاتے ستارے تراشے ہیں کہ نگاہوں میں چکا چوند ہو جاتی ہے۔ اصغر کی شاعری کے اس حصہ میں 'حکایتِ محبوب' کا ہر پہلو آگیا ہے۔ "آرائشِ خم کاکل" سے "اندیشہ ہائے دور دراز" تک سب کچھ۔

یہ عشقیہ شاعری لیکن بالکل نئی قسم کی، پاکیزہ ترین جذبات و واردات کی حامل اور اس سے بھی زیادہ، پاکیزہ تر انداز میں کہی گئی، جذبات اور واردات کا پاکیزہ ہونا نئی نسل کے لئے ذرا سے دیر میں سمجھ میں آنے والی چیز، ہم لوگ عشقیہ شاعری کو سیدھی سادھی مجازی قسم کی جنسی شاعری سے الگ کر کے سوچ ہی نہیں سکتے عشقِ حقیقی، اور عشقِ مجازی پچھلی صدی کی لغت کا حصہ معلوم دیتے ہیں —— حالاں کہ بات ایسی نہیں، بات یہ ہے کہ نئی نسل کا نیا زمانہ بڑی بے چینی اور اضطراب کا زمانہ ہے۔ ہر دن ایک نئی تبدیلی کی نوید لاتا ہے۔ تبدیلیاں پہلے بھی ہوتی تھیں، اب تبدیلیوں کی جگہ انقلاب نے لے لی ہے۔ پہلے تبدیلیوں کو سال لگتے تھے اب انقلابوں کو دن لگتے ہیں۔ اور قومی و بین الاقوامی سطح پر یہ انقلاب اتنی جلدی جلدی گزر رہے ہیں کہ ہمارا ذہنی سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ انفرادی زندگی میں دُور دُور تک اطمینان و سکون کا پتہ نہیں۔ ہر نوجوان کو 'آج' کی فکر نے بوڑھا کر دیا ہے۔ کون جانے 'کل' اس کی زندگی میں آتا بھی ہے کہ نہیں۔ اور ان سب چیزوں نے مل کر ہمارے جمالی ذوق کی نزاکتِ احساس کو تقریباً ختم سا کر دیا ہے۔ نئی نسل نے دل کے جذبہ کو ذہن کی آنچ میں تپانا نہیں سیکھا ہے، نہ اتنی فرصت، نہ صبر، عاشقی صبر طلب ہے، اور اس کی تمنائیں بے تاب ہیں۔ اسی لئے اس قسم کے جذبات اور اس قسم کی شاعری کی قدر دانی اس کے بس کی نہیں۔

اس شاعری میں بہت دُور سے جلوۂ محبوب دیکھنے کا انداز ملتا ہے محبوب کو ساتھی بنا لینے کا جذبہ نہیں ملتا، رعنائی خیال ملتی ہے، ارادۂ گناہ کا، دُور تک پتہ نہیں، خود نگہداری، اور رُک رُک کر سنبھل سنبھل کر بات کہنے کی روش ملتی ہے۔ والہانہ سپردگی نہیں ملتی۔ لطافت ہے نور ہے حیات کی گرمی نہیں، حسن کے ساتھ عشق ملتا ہے محبوب کے ساتھ نہیں، ناقدوں کو اس کی شکایت ہوتی ہے۔ کہ یہ 'عرش' کی شاعری ہے اور ہمارے لئے بے کار، لیکن اس تنقید میں جلد بازی بھی ہے اور یک رخا پن بھی۔

عشق ہوس پوری کر لینے ہی کا نام نہیں، ناکام عشق، ترس ترس کر رہ جانے والا عشق، ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بننے کا انداز مجاز کی آلودگیوں کے بجائے مجاز کی رعنائی اور لطافت اور محبوب کے بجائے اس کے حسن کا ذرا فاصلے سے لطف اٹھانے کا انداز —— یہ ہے بڑا عشق اور اسی کے بل پر دنیا کے عظیم ترین کارنامے انجام پائے ہیں۔

اصغر نے اسی قسم کی شاعری میں مرصع کاری کی ہے۔ سبک رو تجزیاتی اسلوبِ بیان، اردو کے حسین ترین الفاظ کا استعمال، ایسے نازک اور خوبصورت الفاظ جو اردو کیا کسی بھی زبان کی شاعری میں کم شاعروں کو نصیب ہوتے ہونگے الفاظ کو الفاظ سے ٹکرا کر موسیقی کی جھنکار پیدا کرنے کی تکنیک —— اور ان سب پر چھایا ہوا گہرا اور باوقار ترنم، اگر میری اوپر کہی ہوئی باتوں میں اس قسم کی

شاعری کا جواز نہ نکل سکا ہو تو بھی یہ شعری خصوصیات ہی، پیناہو یا منوانے کیلئے کیا کم ہیں۔ آپ کو اس قسم کے دوسرے شعر دکھانے سے پہلے ایک شعر سُنا دوں جو ان سب اشعار پر روشنی بھی ڈالتا ہے اور اصغر کے نظریۂ عشق کی بالکل غیر شعوری طور سے، ترجمانی بھی کرتا ہے۔

چمن میں کس مزے سے چھیڑتی ہے آ کے پھولوں کو مگر بادِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اور اب دوسرے اشعار سُنیئے۔

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

اس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

بیدار ہوا منظر اس مستِ خرامی سے غنچوں کی کھلیں آنکھیں دامن کی ہوا آئی

کچھ تو اصغر مجھ میں ہے قائم ہے جس سے زندگی جان بھی کہتے ہیں جس کو اور اُن کی یاد بھی

کہاں خرد ہے کہاں ہے نظام کار اس کا یہ پوچھتی ہے تری نرگسِ خمار آلود

حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے

ہوا کو موجِ شراب کر دے فضا کو مستِ خراب کر دے
یہ زندگی کو شباب کر دے نظر تمھاری نظر نہیں ہے

بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے نہیں ہوا کبھی بے خود نہ ہوشیار ہوا

مری نگاہوں نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے جہاں جہاں سے تقاضائے چشمِ یار ہوا

کچھ اور عشق کا حاصل نہ عشق کا مقصود جز اینکہ لطفِ خلشہائے نالۂ بے سود

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود

وہ مستِ شاہدِ رعنا نگاہِ سحر طراز وہ جامِ نیم شبی نرگسِ خمار آلود

کچھ اس ادا سے مرا اس نے مدعا پوچھا چھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود

چھلوں میں جانِ حزیں کو نثار کر ڈالوں نہ دیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذنِ سجود

وہ سامنے ہیں نظامِ حواس برہم ہے نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

نہ اب وہ گریۂ خونیں نہ اب وہ رنگِ حیا نہ اب وہ زیست کی لذت کہ درد بھی کم ہے

اگر یہ اشعار سُننے کے بعد بھی اس طریقے کا احساسِ جمال اور ایسے اندازِ محبت کا جواز نہ نکل سکے تو جدید ذہن ارتفاع کا سہارا لے سکتا ہے۔ ——— اور پھر انسان اور کائنات کے حسن میں کھو جانے کے ساتھ ساتھ، اصغر نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو زندگی میں جد و جہد کرنے اور سلیقے سے جینے کا ولولہ اور حوصلہ بخشتے ہیں

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

یہ ذوقِ سیر یہ دیدارِ جلوۂ خورشید بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

تو در قیدِ جہاں پابستہ و صد شکوہ سنجیہا
من از ہر ذرہ سلطنے کردہ راہے کردہ ام پیدا

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے کسی حد تک اصغر کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین ہو سکتا ہے اس کے باوجود آخر میں عرض کر دوں، اصغر کی شاعری کا بڑا حصہ کسی خاص قدر و قیمت کا مالک نہیں اور جو حصہ کچھ قدر و قیمت رکھتا ہے اس کا تجزیہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے ——— تو صرف اتنے حصے کے بل پر اصغر بڑے شاعر تو کبھی بھی نہ بن سکیں گے تاہم ان کے ایسے اشعار اردو کے منتخب سرمایہ میں ضرور شمار کئے جاتے رہیں گے۔ لوگ ان کی صناعی، حسن کاری، مرصع کاری اور الفاظ کی تراش خراش کی ہمیشہ داد دیں گے، ان کے اندازِ بیان کے ایک چراغ سے سیکڑوں چراغ جلیں گے خود اسی دور میں فراق (بقول خود) اقبال سہیل، انجم فوقی، حبیب احمد صدیقی اور ساز میر دانی پر اصغر کے اسلوبِ ادا اور اندازِ بیان کا واضح اثر ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ بڑے شاعر تو کیا خود اپنے عہد کے بڑے غزل گو نہ بن سکیں گے فراق تو بڑی چیز ہے۔ فانی، اصغر کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اور بلکہ میں کہوں گا جگر اور حسرت بھی مجموعی کلام کا سہارا لے کر اصغر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ پھر بھی اردو شاعری کو اُن کی ایک مخصوص اسلوب کی دین ہمیشہ ذہنوں میں تازہ رہے گی اور بعض بعض شعر ہمیشہ گنگنائے جاتے رہیں گے۔

دُونی چند شرما

گیتوں کے یہ انمول بول

انگریزی کے شاعر ورڈزورتھ نے اپنی نظم "ڈیفوڈلز" میں کچھ پھولوں کا ذکر کیا ہے جنھیں اس نے کسی دل فریب مسحور کن قدرتی فضا میں بہارِ جانفزا دکھلاتے دیکھا تھا۔ پھولوں کا منظر اس قدر دل کش تھا کہ شاعر جب لمحاتِ فرصت اور تنہائی میں اس قدرتی حُسن کا تصوّر کرتا ہے تو اُسے اپنے ذہن کے پردے پر وہی طلسماتی پھول رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

لوک گیت وہ سدا بہار پھول ہیں جو انسانی دل کی کشتِ لالہ زار میں کھلتے ہیں اور بیتے لمحات کی داستانوں اور احساسات کے امانت دار بنے رہتے ہیں۔ بھولے بھالے دیہاتیوں کے لطیف احساسات اور جذبات لوک گیت کے بولوں کے روپ میں ورڈزورتھ کے پھولوں کی طرح کبھی کبھی ہمارے ذہن کی چادر پر نا چ اُٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی گیتوں کے بے ڈھب اور ناتراشیدہ دو بولوں میں ہی جذبات اور واقعات کا ایک ایسا جامع تاثر ہوتا ہے کہ چند الفاظ پوری حکایت اور دفترِ شکایت بن جاتے ہیں۔

ہمارے سماج کی اخلاقی قدریں اس قدر سخت ہیں کہ ایک مرد کے لئے سوائے اپنی بیوی کے دوسری عورت کا خیال کرنا ایک عظیم سماجی گناہ ہے۔ اس لئے جب ایک عاشق اپنی محبوبہ پر دست اندازی کے لئے آمادہ ہوتا ہے تو اُس مرد کو اپنے اس ارادے سے باز رہنے کے لئے عورت اس سے بہتر الفاظ میں نہیں ٹوک سکتی کہ میں بیگانی عورت ہوں اور تمھیں مجھ پر دست اندازی کا کوئی ادھیکار نہیں۔ ایک لوک گیت کے بول ہیں:

جب ہتھ مت لا گبھرو میں نار بیگانی او

اور اسی ایک بول میں سماجی اور اخلاقی قدروں، انسانی دھرم اور نسوانی نفسیات کے سب پہلو اپنے مفہوم کی ادائیگی اور منظر کشی کے لحاظ سے بالکل واضح ہیں اور ایسے ہی بولوں کی ان گنت تعداد بے شمار واقعات کی مصوّری کرتی ہے۔ جن واقعات میں عاشقوں کے وصل کی چاہ، قدرت کے خورد و برگ و گیاہ اور گردشِ مہر و ماہ سبھی معکوس ہوتے ہیں۔

اس مضمون میں راقم نے پہاڑی لوک گیتوں کے بہت سے بول درج کرکے مناسب تشریح کے ساتھ اُن کے مطالب کی وضاحت کرنے کی سعی کی ہے۔

گیتوں کے یہ جیسے جیسے بول ناگزیر طور پر ہمارے ذہن پر اپنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں اور ان کے کرداروں کے لئے ہمارے دل میں عزّت و توقیر، ربط و اُنس، ہمدردی اور دلچسپی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

ہمالیہ پربت کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا ہے:-

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

اور ایک لوک کوی کہتا ہے:

راتی دِنے کھڑا کھڑا رکھشا ہماری کردا جی
دوپہے دیاں برکھاں سنگے جھولی ہماری بھردا جی

"ہمالیہ پربت شب و روز ہماری رکھشا کرتا ہے اور سونے کی بارش میں ہمارا دامنِ مراد کو بھرتا ہے۔"

صبح کا نظارہ دیکھئے ؎

چڑیاں بیکھیو داں مائے پچھڑ پھڑ لائی

"اے ماں اب صبح ہوگئی ہے۔ چڑیوں اور پرندوں نے چہکنا اور پھڑپھڑکنا شروع کر دیا ہے۔"

سودا نے کہا ہے ؎

ورنہ ٹپک نظر سے گر پایا نہ جائے گا
جُوں اشک پھر زمیں سے اُٹھایا نہ جائے گا

اس گیت کی یہ سطر بھی سنیئے

جولاہے پھٹ گا سی بینک دل پھٹے جو کیہاں سینا

"اگر کپڑا پھٹ گیا تو اُسے تو پیوند لوں گا ۔ دل ہی پھٹ جائے تو کیسے سیا جائے"

آزادی کے بعد سے عوام میں بتدریج جاگرتی آ رہی ہے ۔ وہ نئے نئے تجربات کی روشنی میں مستفید ہو رہے ہیں ۔ عمدہ مویشی اور بہترین طریق کاشت ان کا نصب العین بن رہا ہے ؎

اُچے سے اُچیٹے بیل لیاؤنے
ڈونگے کھیتاں وچ ہل چلاؤنے
دُدھ والی دو دھاری گاں لینی
کٹا کٹ پھیرنی مدھانی بو

"ہم اونچے اونچے بیل لیں گے ۔ کھیتوں میں گہرا ہل چلائیں گے ۔ گائے ایسی خریدیں گے جو چار سیر دودھ دے ۔ پھر تو ہم مدھانی چلا کر دودھ بلوئیں گے ۔"

لوک گیتوں کا دامن ہنسی مذاق کے واقعات سے بھرا ہوا پایا جاتا ہے ۔ ایک جولاہا اپنے آپ کو راج کمار ظاہر کر کے ایک سادہ لوح عورت کو پھسلا کر اپنے گھر لے آتا ہے ۔ لیکن اس کے گھر پہنچ کر عورت پر ساری حقیقت عیاں ہوتی ہے اور وہ پراگندگی کی جو رہا ہوتی ہے ۔

مَیں بلے جولاہیا مر جے ۔ تیں میرا دین گوائیا
سیر بھر دانے لُبھائی دے ۔ گنگا جی دا رستہ بتائی دے

نئی بیاہتا لڑکی کو سسرال کے دیس سے نفرت ہے وہ کہتی ہے ؎

جل جائے سوہریاں دا دیس
روٹیاں پکواندے بھٹھیا چیاندے
جل جائے چُلہڑے دا بیسک

"آگ لگے سسرال کے دیس کو ۔ سسرال والے مجھ سے روٹیاں پکواتے ہیں اور ساگ تیار کرواتے ہیں ۔ چولہے کی گرمی سے ناک میں دم آ جاتا ہے ۔"

ساجن سے ملنے کی لگن جب دل میں لگی ہو اُس کی بے قراری کا کیا ٹھکانا اور ملاقات کے لئے پنگھٹ سے بہتر جگہ اور کون ہو سکتی ہے ؎

پُرنی نی او ڈُھکدی تندی او ٹنڈی   سسّی نی او بولدی پانئے ہو جانا اوے

عورت کو گھر کی لکشمی کہا گیا ہے ۔ سمجھدار عورت گمراہ خاوند کو درست راستے پر ڈال دیتی ہے ۔ ایک عورت کا خاوند تمباکو پر پیسے ضائع کرتا ہے ۔ عورت کو یہ بُری عادت بڑی ناگوار محسوس ہوتی ہے اور وہ خاوند سے تمباکو نوشی سے پرہیز کرنے کی پُر زور التجا کرتی ہے اور گاؤں کے تمباکو فروش بنئے کو جی بھر کر کوستی ہے ؎

جل جائے اس کراڑے دی ہٹی   جنے بوکھا دی میرے سوہرے دی کھٹی
جل جائے اس کراڑے دا جھنگا   جنے بوکائیا میرے بالو دا منگا
ڈرلا چھوڑی دیتی جھنڈی دیتی چلم تمباکو دی

"آگ لگے اس بنئے کی دوکان کو ۔ اس نے میرے سسر کی جائداد بھی ایسے ہی ہضم کر لی تھی ۔ آگ لگے اس کے گھر کو ۔ اس نے میرے ناک کے زیور (بالی) کا مونگا بھی فروخت کروا دیا ۔ اے پیارے تمباکو کا پینا چھوڑ دو ۔

فارسی کی ایک ضرب المثل ہے

لیلیٰ را با چشم مجنوں باید دید

سچ مچ لیلیٰ کا حسن مجنوں کی آنکھ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے ۔ یقین نہ آئے تو سنیئے ۔

پانوں تیرے ہتھ بڑے موٹے او   بنگڑیاں دے ہونی جاندے ٹوٹے او
لوک گلاندے پانو کالی او   میری جان تاں حلوے دی ڈلی او

"پانو کے ہاتھ بہت موٹے ہیں اتنے موٹے کہ کانچ کی چوڑیاں پہنتے وقت ٹوٹ جاتی ہیں ۔ لوگ کہتے ہیں پانو کالی رنگت کی ہے میری محبوب تو حلوے کی ڈلی ہے ۔"

ایسے ہی ایک گیت کا بول ہے ؎

لوک تاں گلاندے چڑیل ۔ چنبیلو تُو تاں ناگر بیل

"لوگ کہتے ہیں تمہاری شکل چڑیلوں جیسی ہے ۔ جھوٹ سفید جھوٹ میری چنبیلو تو پھولوں کی نازک بیل جیسی ہے ۔"

آوارہ گردی بھلے مانسوں کا شیوہ نہیں پھر بھلا بچوں والے باپ کو یہ شغل کب زیب دیتا ہے ؎

راتی پھرنے ہنڈنے نوں چھوڑی دے کاہنا
ہُن ہوئیا گھر باری رام

پریم کا راستہ بڑا کٹھن ہے ۔ مصیبتوں سے ڈرنے والا اس پر پگ نہیں دھر سکتا ۔

ادھاراں چمکے پتھر گیٹیاں - اوپلاں دا چھلکے پانی
ہنیطریاں تے ڈرنا - پریتی کہنیاں لانی

"پہاڑوں پر پتھر اور کنکر چمک رہے ہیں - پالم پور کی دھرتی پر پانی جھل مل کر رہا ہے - آندھیوں سے ڈر گئے تو پریم کیسے نبھ سکے گا -"

ساجن کا پیار سب پیاروں سے افضل ہے ؎

کھسم مرے کلیل کرے   سبھو مرے کیہاں جینا
چولا پھٹے ٹانکے لانے   امبر ٹٹے کیہاں سینا

"خاوند مر جائے گا - رو پیٹ کر صبر لیں گے - لیکن ساجن ہی مر جائے تو کیسے جئیں گے! لباس ٹوٹ جائے گا ٹانکے لگا کر سی لیں گے - اگر آکاش ہی ٹوٹ جائے تو اسے کیسے سیا جائے - یہ ناممکن ہے ایسے ہی ساجن کے بنا جینا حرام ہے -"

گدیوں کا دیس چنبہ کتنا حسین ہے ؎

گوری دا چت لگے چنبے دئیاں دھاراں
گھر گھر چکرو - گھر گھر بکرو
گھر گھر موج بہاراں - گھر گھر با نکیاں ناراں

"سندری کا من چنبے کی پہاڑیوں میں بہلتا ہے - جہاں ہر گھر میں اون کاتنے کی تکلیاں ہیں جہاں گھر گھر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہیں - جہاں ہر گھر میں جشنِ بہاراں ہے جہاں گھر گھر حسین عورتیں ہیں -"

لیکن جنھوں نے میدانوں کا رہنا سیکھ لیا ہو انھیں چنبے کا رہنا کب اتنا پسند آئے ؎

میں نہیں جاناں چنبے دیاں دھاراں
چنبے دیاں دھاراں پین پھوہاراں
میرا چولو بھجی جاندا سارا
او جی میں نہیں جاناں چنبے دئیاں دھاراں

"میں چنبے کی پہاڑیوں میں نہ جاؤں گی - وہاں ہلکی ہلکی پھوہار پڑتی ہے - اس سے میرا سارا اونی لباس بھیگ جائے گا - میں چنبے کی پہاڑیوں میں نہیں جاؤں گی -"

اردو کے شاعروں نے کمر کے کئی مضامین باندھے ہیں - ان شاعروں کے نزدیک محبوب کی کمر بہت پتلی ہوتی ہے اور بعض تو روایتی محبوب کو کمر کے بغیر ہی تصور کرنے لگ جاتے ہیں جیسے ؎

کہتے ہیں صنم تیرے بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف ہے کدھر ہے

لوک گیتوں کے ہاں بھی کمر کے مضامین کی کمی نہیں - لیکن لوک گیتوں میں کمر کی عدم موجودگی کا ذکر نہیں - البتہ کمر کی نزاکت اور انفرادیت کا تکرار ضرور ہے -

شوہی پیولی پیولی کرتی ہسکا نجھو بندی
لک مٹکائی کرتی چھوری لنگدی

"سرخ اور پیلے رنگ کی کرتی (جیکیٹ) سندری کی چھاتی پر بڑی شوبھا دیتی ہے - چھوکری ناز وادا سے کمر میں بل ڈالتی ہوئی سامنے سے گزرتی ہے"

پیا گئے پردیس نی اڑیئے تیلیاں تیلیاں انگلاں جی میریاں
مہین مہین کمر دا لپیٹ نی اڑیئے

"میرے پریتم پردیس گئے ہیں - میری انگلیاں نرم و نازک ہیں اور میری کمر تو بہت ہی باریک ہے -"

اور کبھی تو کمر کی نزاکت خوبصورت لہنگے کے وزن کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی ؎

یہ لہنگا پائی کنے میرا لک دکھدا

پھر جو نازک کمر لہنگے کا بوجھ نہ سہار سکے پانی کے بھاری گھڑوں کا بوجھ کیسے سہے - پربت کی پنہارن کے دکھ کی داستان سنیئے ؎

پانی کہیاں بھرنا نورپور سے دئیا گھاٹیا
کھڑیاں کواںیاں میرے لیس پینڈ یاں
پیڑ لگی جلیا بکھیا
چکیا گھڑو لومنی پر دھریا
ست بل پئی جاندے بکھیا

"نورپور کی گھاٹی میں پانی بھرنا بڑا کٹھن ہے - میری قسمت میں سخت چڑھائیاں ہیں سخت پہلو میں درد ہو جاتا ہے - سندری نے گھڑا پانی سے بھرا اور کنوئیں کی منڈیر پر رکھ دیا اور فقط اتنے میں ہی پہلو میں سات بل پڑ گئے -"

یہ بنسری کی مدھر تان کا کرشمہ ہے کہ ؎

نالے نالے جاندا چھورو بنسری بجاندا
جانی دلاں جو ترسا ندا

"گاؤں کا چھوکرا بنسری بجاتا ہوا جا رہا ہے اور جی چاہتا ہے بنسری کی پیاری

تاں ہمیشہ ہی سنتے رہیں۔"

دیہاتی گوری دوشیزہ کی جوانی کے بارے میں کوی کی بلند پروازی ملاحظہ ہو

کنکاں دی چڑھی لمی کانی او

دیکھ مٹی پاٹوں دی جوانی او

چٹا ہے جھلا کالا سہے ڈورا

"گندم کے پودے کی ڈنڈی خوب بڑھ نکلی ہے۔ یوں ہی پاٹوں کی جوانی پھوٹ نکلی ہے۔ اس نے سفید اونی لباس پہن رکھا ہے اور کمر میں لمبی کالی ڈوری لپیٹ رکھی ہے۔"

یہ رہی راست گو عاشق کی صاف گوئی ؎

چھنبے دنیا ہٹیا کیا کچھ بکدا ــــ اک بکدا لوٹا

اد میرا من کپٹی ــ او دل کھوٹا جانی

اک بکدی او جانی آری ــ لک پتلا تاں لہنگا بھاری ــ او جانی

"چھنبے کی دوکان میں کیا کچھ بکتا ہے۔ ایک تو وہاں لوٹا بکتا ہے۔ میرے من میں کپٹ ہے اور دل میں کثافت، اے میری جان۔ دوسرے وہاں یہ آری بکتی ہے۔ اے جانِ من! تمھاری کمر پتلی ہے اور لہنگا بھاری ہے۔"

جوانی کی نیند کے مزے کون نہیں جانتا ؎

تیرے متھے کوکوئے دی بندیا

چھوری میر میر سوندی بو ندیا

"اے چھوکری تمھارے ماتھے پہ سیندور کی بندی زیب دے رہی ہے اور تم مستِ خواب ہو۔"

"ابھیسارکا" ساجن سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہونے والی ہے لیکن چاند اور تارے اپنی روشنی میں اس کے راز کو افشا کر دیں گے۔ وہ چاند اور تاروں سے فقط ایک گھڑی بادلوں میں چھپ جانے کی التجا کرتی ہے اور اس پُر سوز التجا میں اس کی روح سمٹ کر آ جاتی ہے ؎

چندا بے چندا تیری چاندنی تارٹیا بے تیری لو

گوری تاں چلی چورنیا، اج دی گھڑی اک گھڑی بدلاں وچ ہو

"اے چاند تمھاری چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اے تارو تمھاری روشنی بھی تو موجود ہے۔ گوری چوری چھپے ساجن سے ملنے جا رہی ہے۔ بہر خدا فقط آج کی رات ایک گھڑی کے لئے اپنا منہ بادلوں میں چھپا لو۔"

عاشقوں کو بیسیوں تہمتیں اور سینکڑوں طعنے نہایت تحمل سے برداشت کرنا پڑتے ہیں

ہونناں دے باگے سب پھل پھلے میرے باگے پھلی مہندی

راجی رہیاں اڑیئے جگ جیئیاں دنیا اینہاں ہی کہندی

"اوروں کے باغوں میں سب پھول کھلے ہیں۔ میرے باغ میں صرف مہندی پر پھول آئے ہیں۔ اے مری جان جیتی رہو، مدام سلامت رہو۔ دنیا والے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔"

سسرال کا دیس گوری کو نہیں بھاتا تو وہ کہتی ہے ؎

ماپیاں دے دیس سانوں اول ٹھکانا

سوہریاں دے دیس سانوں کابل جانا

"میکے کا دیس ہمارا من پسند ٹھکانا ہے۔ اور سسرال کے دیس جانا تو یوں ناگوار گذرتا ہے جیسے کابل دیش کی مسافت درپیش ہو۔"

پریم بندھن سماج بندھنوں سے ہر طرح بالا ہیں ؎

اکی تاں پتلی دودھ چھت کھاندا

ہُن بکو پھیلا ہو جاتیں

"ہم ہم نوالہ ہم پیالہ رہے۔ اب ذات پات کی دریافت کیسی؟"

ساجن کے من کی خواہش اور اعتقاد دیکھئے ؎

میسا او تیرا گورے گھر سامنے

او بیلیوں گھر سامنے

رکھیاں نیناں دی پریتی ہو ڈولا

"اے حسینہ تیرا گھر میرے گھر کے سامنے ہے۔ میں تجھ سے یہی چاہتا ہوں کہ آنکھوں کی محبت کو برقرار رکھنا۔"

جس دل کو محبت کا روگ لگ جائے اس کا خدا حافظ ؎

بھلی ہوئی جان پہچان

اٹھیاں بہندیاں کی نکلاے ہوکے

بھل گئے گھراں دے دھندے تاں پورکے

"جان پہچان کا سودا مہنگا رہا۔ من کو روگ لگ گیا۔ اٹھتے بیٹھتے سرد آہیں نکلتی ہیں۔ گھریلو زندگی کے سارے دھندے بھول گئے۔"

معشوق کے قد و قامت اور حسن کی قدر و قیمت عاشق سے پوچھئے۔

ہرا رنگ تیرے بنگڑواں دا

اک لکھ جانی دا دینا

دو لکھ تیرے دندڑاں دا

"تمھاری کابُخ کی چوڑیاں سبز رنگ کی ہیں۔ تمھاری جان کی قیمت ایک لاکھ لیکن جیسے موتیوں کی لڑیوں کا مول اس سے بھی دو چند ہے۔"

کانگڑہ کے انسانی اور قدرتی حُسن کی منظر کشی یوں کی ہے ؎

ڈگی ڈگی ندیاں تاں سیلی سیلی دھاراں

چھیل چھبیل گبھرو تاں بانکیاں ناراں

"گہری گہری ندیوں اور سرسبز پہاڑیوں کی کانگڑے میں بُہتات ہے۔ مرد تو مند ہیں اور عورتیں حسین۔"

جو موت سے ڈرے وہ پریم کیسے کرے گا ؎

مرنے تے نی ڈرنا۔ بھلا پریتی کیہاں لانی

"موت سے ڈرنا فضول ہے۔ موت سے ڈر گئے تو عشق کی ذمہ داریاں کیسے نبھائیں گے۔"

میاں، بیوی سے رُوٹھ کر باہر صحن میں چارپائی ڈال کر سو گیا۔ بیوی نے لاکھ سمجھایا مگر یہ صاحب کُتّے کی روایتی دُم کی طرح ٹیڑھے ہی رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر کار وہ اپنے خاوند سے شاعرانہ تمسخر ہُما دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ کمرے کے کواڑ بند کرکے سو جاتی ہے اور صدقِ دل سے اِندر دیوتا کے مست ہاتھیوں سے یوں التجا کرتی ہے ؎

کالیئے کا لیئے بدلیئے پیچ کری برسیاں اَج کِنّی رات

موہلے جیڈی دھار پَوے بیٹے نیمو جیڈا ٹپاک

"اے کالی کالی گھٹا۔ بہر خدا آج کی رات ضرور برسنا اور خوب برسو۔ موٹے ڈنڈے جتنا بارش کا دھارا برسے اور لیموں جتنے بڑے بڑے اولے پڑیں (تاکہ میاں آنگن میں ہی بھیگی بلّی بنیں)"

جب لڑکی جوان ہوتی ہے اور شباب کے ارمان مچلنے لگتے ہیں تو وہ جھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ماں سے یوں مخاطب ہوتی ہے ؎

مائے نی ساڈیئے - نی ساڈے بابے نوں سمجھا

ہور کیہیاں گھر اپنے میں کیہہ بابل دیس

"اے ماں، میرے باپ کو سمجھا کہ میری ہم عمر لڑکیاں اپنے اپنے سسرال کے گھر پہنچ گئی ہیں۔ اور میں ہی کیوں ماں باپ کے دیس میں ہوں۔"

عاشق جب محبوبہ سے بد دل ہو جاتا ہے تو وہ بہر صورت اُسے ٹھکرا لینے کا اعلان کر دیتا ہے ؎

گڈی آئی او گرائیں گرائیں

سونے دی توں بن جا چھورئیے

اساں چھڈی دینی تو راجی ناہیں

"اب گاؤں گاؤں میں گاڑی پہنچ گئی ہے۔ چھوکری اب تم خواہ کُندن جیسی بن جاؤ اب تو تمھیں اپنی رضا سے ٹھکرا دیں گے۔"

فوجی سپاہی بارہ برس کے بعد ملازمت سے واپس آیا ہے۔ اس کی سج دھج کی نقاشی یوں کی ہے ؎

باریں برسیں آیا رنگروٹ اے

ہتھ چھتری پیریں بوٹ اے

"فوجی سپاہی بارہ برس کے بعد گھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھتری ہے اور پاؤں میں اس نے بوٹ پہن رکھے ہیں۔"

کلّو کے پُرانے دسہرے کی جھانکی دیکھئے ؎

کلّو دے چو کلنے میلہ ہے لگی لا - بجیا انگریجی باجا

بنی ٹھنی کی سب لوک جے آندے - پالکیا بہی کری راجا

"کلّو کے میدان میں میلہ ہو رہا ہے اور انگریزی باجہ بج رہا ہے۔ سب لوگ بن ٹھن کر آ رہے ہیں۔ راجہ صاحب پالکی میں بیٹھ کر آ رہے ہیں۔"

ہولیوں میں سرسوں پھولتی ہے ؎

پھُلی سرسوں او موٹیا پھُلی سرسوں

او موٹیا ہولیاں دے میلے جانا پرسوں

"سرسوں پھول گئی ہے۔ پرسوں ہولیوں کا میلہ ہے۔ ہم اسے دیکھیں گے۔"

جنھوں نے دل دے دیا ہو وہ کام میں دل لگانے کے لئے دوسرا دل کہاں سے لائیں ؎

کُنجاں جائی پنیاں پتنے

میرا دل نی لگدا کتنے

چرکھا ٹٹن سُٹ او دیورا

"کونج پرندے اڑان بھر کر دریا کے کنارے گذرگاہ پہ پہنچ گئے ہیں۔ میرا دل سوت کاتنے میں نہیں لگتا۔ اے دیور چرخہ توڑ کر پھینک دو۔"

بہن کے گھر بھائی آئے تو وہ اس کی راہ میں آنکھیں بچھا دیتی ہے ؎

گو بڑا تاں میرے سو ٹھی ٹھنگی
کون بی پیہ و ہیتا اج آ وُں گا

"صحن میں ڈنڈا ٹیکنے کی آواز آئی۔ جانے کون مہمان آ رہا ہے"

مہمان تو اس کا بھائی ہی نکلا۔ بہن سے پوچھنے لگا تمھاری نند کیسی ہے تمھاری ساس کیسی ہے۔ بہن بولی ؎

اگی دا پُلا ساس ہے میری
امبر دی بجلی نند ہے میری

"بس ایک نہ پوچھو بھائی۔ میری ساس گھاس کا جلتا ہُوا گٹھا ہے اور میری نند یوں ہے جیسے آسمان کی بجلی۔"

اولاد کی زیادتی سراسر دکھ کا کارن ہے۔ اتنی اولاد بھی کیا جس کی مناسب دیکھ بھال نہ ہو سکے۔ یوں کہتے ہیں ہمارے ایک دیہاتی شاعر ؎

کنجاں جاتی پُنیاں سکیت
اک کچھڑ دو آ بیٹ
تیجا کھیلے بالو ریت

"کونج پرندے اڑ کر سکیت پہنچ گئے۔ ایک بچہ پہلو میں پکڑ رکھا ہے۔ دوسرا پیٹ پہ لیا ہے اور تیسرے ننھے میاں ریت کے ڈھیر پہ رنگ رلیاں منا رہے ہیں"

شادی کا نام اسم با مسمّیٰ ہے۔ شادی ٹھہرا خوشی کا موقعہ۔ بڑے شاعروں نے دولہا میاں کے کئی سہرے لکھے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے کوی کا لکھا نمونہ سہرا بھی پڑھئے ؎

سر بنے نوں سہرا سجے بن دا
تیرے مکٹ نے بندرا بن موہیا

"دولہا میاں کے سر پر سہرا زیب دیتا ہے۔ تمھارے مکٹ نے سارا بندرا بن پریم سے بس میں کر لیا ہے"

(پہاڑی گیتوں میں دولہا کو کاہن اور کرشن وغیرہ ناموں سے مخاطب کیا جاتا ہے کیوں کہ گیت دلھن کی جانب سے تصوّر کئے جاتے ہیں)

شادی کی مبارک باد کا شور اُٹھا ؎

یہ گھوڑی میرے بیر دی ۔ بندرا بن تے آئی
مل لئی میرے باپ نے ۔ گوکل بجی بدھائی

"یہ گھوڑی میرے بھائی کی سواری کے لئے ہے۔ اسے میرے باپ نے بندرا بن سے مول لیا ہے۔ گوکل میں مبارک باد کا شور اُٹھا۔" (دولہا کو یہاں بھی کرشن مانا گیا ہے)

کانگڑے کے لوگ زیادہ تر فوج میں ملازمت کرتے ہیں۔ ایک لڑکی کی چھوٹی عمر میں ہی شادی ہو گئی۔ خاوند فوج میں ملازم تھا۔ وہ ایک مورکے میں کام آیا۔ بیوی نے جب ہوش سنبھالا تو اسے پتہ چلا کہ اس کی مانگ کا سیندور بکھر چکا ہے۔ کلیجہ پیٹ کے رہ گئی۔ وہ اپنے ماں باپ کو کوستی ہے جنھوں نے اس کی شادی بچپن میں کر دی تھی اور ساس سسر پہ لعنت بھیجتی ہے جنھوں نے روپے کی لالچ میں اس کے سہاگ کو قربان کر دیا تھا۔ مجبور اور دکھی دل کی آواز ہے ؎

صبر پیئے سسّو تا ہیں سوہریاں جو
دراماں دے کارن مارُیا ڈ دل میرا
صبر پیئے اماں با پلے توں
نکی مُہندی جنھاں بیاہی او

"لعنت ہو میرے ساس سسر پہ جنھوں نے روپوں کی خاطر میرے پتی کا بلیدان دے دیا۔ اور ماں باپ کو کیا کہوں جنھوں نے کم سنی میں میری شادی کر دی۔"

لوک گیتوں میں گرہستی پریم اور ہجر کے نالوں کی بڑی مؤثر عکاسی پائی جاتی ہے ؎

چاندی دے چھلیاں دی میں لوبھی نہیں ڈھولیے
اکھیاں آگے بس ہوویں مکھوں نہ بول سے

"اے ساجن میں چاندی کے زیوروں کی بھوکی نہیں۔ میری نظروں کے سامنے رہو خواہ کلام بھی نہ کرو۔"

ایسے ہی کہا ہے ؎

تیرے گھوڑے جو دیندی میں دانہ
پردیس نی جانا
میں کتنا تو لانا۔ گھر بیٹھے کھانا

پردیس دے معاملے.... ڈاڈڑے او ڈولا ڈاڈڑے

لیکن جو ساجن اتنی منّت سماجت کے بعد سنگ دل ہو کر سجنی کو اکیلا چھوڑ جائے

اس کے لئے یوں ہی دستِ بدعا ہو سکتی ہے ؎

تیرے جاندے دی نوکری ٹٹ جائے
روندیا نوں چھڈ کے گیا
چٹھی لکھی کیتے پاواں
جاندی واری دسی وی نہیں گیا

"ساجن کے جاتے ہی اس کی نوکری ختم ہو جائے۔ وہ جاتے وقت مجھے روتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب اُسے چٹھی لکھ کر اپنے من کی کیفیت کیسے بتلاؤں وہ جاتے وقت اپنا پتہ بھی نہیں دے گیا۔"

پریتم پردیس چلا تو سجنی کے من کی کیفیت یوں تھی ؎

نوکراں سرکاری جنے گھوڑے پیڑے
بے ڈول تسیں چلے پردیس ساڈے جگرے تھوڑے

"اے سرکاری نوکر! اے مسافر! میرا کلام تم ہی سے ہے۔ تم نے گھوڑے پر زین کس لی۔ سفر کی تیاری کر لی۔ لیکن میرا دل ہے کہ برابر ڈوب رہا ہے۔"

روزگار کے سلسلے میں مرد کو برسوں گھر سے دُور رہنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ عورتیں انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر رہ جاتی ہیں ؎

ہرئیے نی بھرئیے سبز کھجورے پتے جناں دے پیلے او
کنہدے جنھاں دے سدا مسافر ناداں دے کیا حیلے او

"اے ہرے بھرے کھجور کے درخت تیری پتیاں کیوں زردی پکڑ رہی ہیں (کہیں تم بھی تو میری طرح مجبوری میں نہیں؟) جن کے ساجن سدا مسافت میں رہیں اُن عورتوں کے من بہلاوے کا کیا سامان رہ جاتا ہے۔" کیونکہ ؎

تھوڑے پانی مچھلی بے ترا جیسے
اینہاں کری تڑپے پر نوکرادی نار
اُبھو بی نی آوندا لکھی کری بی نی بھیجدا
کیہاں کری کٹنی اوبال بدیس

"جس طرح مچھلی بنا پانی کے تڑپتی ہے اسی طرح پردیس گئے ملازم کی بیوی خاوند کے بغیر بے چین رہتی ہے۔ وہ نہ خود آتا ہے نہ ہی خیر و عافیت کا سندیسہ بھیجتا ہے۔ وائے میری بے لبی۔ کوئی بتلائے تو سہی۔ کم سنی کا زمانہ بیتے تو کیسے!"

جدائی کی گھڑیاں بڑی لمبی ہوتی ہیں۔ شبِ فرقت بڑی گراں گزرتی ہے۔ رات چھ مہینوں کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک گھڑی برسوں جتنی لمبی ہوتی ہے ؎

چھ مہیناں دی رات بہ ہیاں دی اک گھڑی
تو میری چنچل چھبی نار بسرے نا اک گھڑی

اگر پریمی کو پردیس میں ہی رہنا ہے تو وہ سندری کو اپنے پاس بلا لے۔

مجو بی نئی چل کچھ بہ میرے بانکو دُیا چاچو آ

"مجھے اپنے پاس بلا لو اے میرے ننھے کے باپ۔"

کئی بار جب آشا نراشا میں بدل جاتی ہے اور برہن برہ کی آگ میں جلتے جلتے تنگ آ جاتی ہے تو وہ یوں سوچتی ہے ؎

اک من آکھدا ندیا میں ڈُبی مراں
اک من آکھدا بالڑی ہے بدیس

"دل کہتا ہے۔ ایسے ناکارہ جیون کا ندی میں کُود کر خاتمہ کر دو۔ پھر من کی دوسری آواز کہتی ہے۔ ابھی بہت کم سن ہو۔ جیون میں دیکھا ہی کیا ہے اتنا ظلم نہ کر بیٹھنا۔"

اور اگر طویل انتظار کے بعد ساجن آ جائے تو سجنی کی مارے خوشی کے باچھیں کھل جاتی ہیں۔ وہ آنے والے ساجن کے سواگت کے لئے سنگار کرتی ہے۔

اُہدے تاں کارن مائے میں چرخہ بنایا
اُہدے تاں کارن مائے سیس گندائیا
نی میرا رام جانے

اور پھر سولہ سنگار کے بعد جب وہ سپنوں کی دُنیا میں کھو جاتی ہے۔ تو آئندہ کی بات رام ہی جانے!

معین الدین حسن کاکوروی

شاہ محمد کاظم کاکوروی

اٹھارھویں صدی کے ایک ہندی صوفی شاعر

اٹھارویں صدی کا ہندوستان ہے۔ ہر طرف نفاق اور افراتفری کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ مغلیہ خاندان کا زوال اپنے شباب پر پہنچ چکا ہے۔ اخلاقی اور روحانی قدریں رفتہ رفتہ قومی زندگی سے فنا ہو رہی ہیں۔ سات سمندر پار کی ایک اجنبی حکومت اپنی ڈپلومیسی کو کامیاب بنانے کے لئے جائز اور ناجائز ترکیبوں کا جال پھیلا کر رفتہ رفتہ اپنا اقتدار بڑھا رہی ہے۔ بکسر کی فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے۔ آخری بار دہلی کے تاجدار شاہ عالم، اودھ کے صوبہ دار شجاع الدولہ اور بنگالہ کے حاکم میر قاسم مل کر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ رات کی خاموش پنہائیوں میں شجاع الدولہ کے کیمپ میں ایک نوجوان، خوبرو اور خوب سیرت سپاہی کروٹیں بدل رہا ہے سلطنتوں کے عروج و زوال، تاراجیٔ گلستاں اور تباہ حالیٔ چمن کے مناظر نگاہ کے سامنے ہیں۔ دل دنیا کے جھنجٹوں سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ اسی رات دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ یہ ہیں حضرت شاہ کاظم کاکوروی۔

اس دور میں جب کہ روحانیت اور اخلاقیات کے درس فراموش ہو چکے تھے۔ بھگتی اور معرفت کے سوتے قریب قریب خشک ہو چکے تھے۔ اس عالم یاس و ناامیدی میں شاہ کاظم کاکوروی نے محبت کے نغموں اور انسانیت کے پیغام سے اودھ کی فضاؤں کو معمور کر دیا۔ شاہ کاظم نے تمام معقولی اور منقولی تعلیمات حاصل کرنے کے بعد برج بھاشا میں دوہے اور ٹھمریاں، چھند اور بھجن لکھنا شروع کئے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ "سانت رس" کے نام سے شرح کے ساتھ چند ماہ ہوئے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں آج کل کے ناظرین کو شاہ کاظم کے صوفیانہ اور موسیقی سے لبریز کلام سے روشناس کراتا ہے۔ ان کے کلام میں وحدت الوجود کے دقیق مسائل ہیں۔ ایک خالق کہ حسن مکمل بھی ہے اور نور مجسم بھی، اس سے محبت، حاصلِ زندگی اور مقصدِ حیات ہے خیر و شر حسن و قبح، رنج و غم، سب تصویرِ ہستی کے مختلف رُخ ہیں۔ جس طرح نغمہ کی لے میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ اسی طرح تمام انسانیت نغمۂ محبت کی گت پر رقصاں ہے۔ روح "حیاتِ ابدی" کائنات کی ہر شے میں جاری و ساری ہے نہ کوئی غیر ہے نہ اپنا، نہ کوئی یگانہ ہے نہ بیگانہ۔ اس دنیا میں روحیں، اپنے اصل سے علٰحدہ ہو کر بے چین ہیں۔ حسنِ ازل نے بروزِ ازل جھلک دکھا کر اپنے کو چھپا لیا، خود مسلسل "گریز" بن گیا۔ تاکہ عشق راہِ طلب میں گامزن ہو کر اُسے پا لے اور اس سے مل جائے۔ کبھی یہ حسنِ ازل جلوے دکھاتا ہے اور کبھی روپوش ہوتا ہے۔ کبھی تصور و خیال کی ذرا سی غفلت قیامت ڈھا جاتی ہے۔ اس نازک خیال کو کس نازک اور لطیف انداز، کس قدر شیریں الفاظ میں ادا کرتے ہیں

یہ نیندیا کاہے کو آئی موری بَیرن — جاگ پڑت روئی پچھتائی
رات آئے پیا بہت دنن ما — پھر گئے جب موہے سووت پائی
تُنک ٹھاڑھ ہو نیکے کہہ گئے یہ — یا کی نیند کب دیتھ اڑ جائی
دھن دھن رہی ہر سنیاں ڈھن ڈھن — کوئی دیکھے برہن کی سوائی
سووے سبزگن جاگے بیوگن — آنکھ لگی کبھوں آنکھ لگائی
نیکے بھاگ جو ہوت سکھی ہیرے — پیا آوت موہے لیت جگائی
میں بل جاؤں کاظم کے جاگ کے — جلی بھئی پیا گھر اُن کی سمائی

فراق کی ماری ہوئی کو تھوڑی دیر کے لئے نیند آ گئی، محبوب آ کر لوٹ گیا، کتنی دل کش تصویر کھنچی ہے۔ تیسرے شعر کا ٹکڑا بھی کس قدر لطیف ہے کہ اے

زتت زدہ۔ بھلا جدائی میں کوئی اس طرح غفلت کی نیند بھی سوتا ہے۔ وصال سے شادکام پیر پیسنا کر سوئے تو سمجھ میں بات آتی ہے لیکن ہجراں نصیبوں کا سونا تو واقعی کمال ہے۔ پانچویں شعر میں کہتے ہیں کہ یہ قسمت کی خوبی ہے اگر تقدیر بھی ہوتی تو میرے پیا مجھے خود جگا لیتے۔

"بابل" ایک خالص ہندوستانی گیت ہے۔ یہ اس وقت گایا جاتا ہے جب دلھن اپنے میکے سے سسرال جاتی ہے۔ نئی نویلی دلھن کے جذبات خالص دیہاتی ماحول کے رنگ میں رچے ہیں اور اُن معصوم اور غم آمیز اندیشوں کی عکاسی کر رہے ہیں جو عام طور پر دیہاتی معاشرت کا ایک رنگین رخ اور اس کی دھڑکتی زندگی کا نقشہ نگاہِ تخیل کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

آج جیئیں پردیس ہم بابل   ایسی پڑ گئیں اور کے پالے
ہائے چھوٹی یہ دہری ہم سے   ان پہچان کے بھئی حوالے
میاّ نہ چھانڈ سن موری میاّ   چلت اٹھت ہیں جی میں شعلے
پال کے کچھ دن ہم کا ماکہے   جو تیں اور ن کاں دیکھائے
کو نیپر کو آپ سنگ لاگے   ہم کا اکیلے دیت نکالے
ساس نند کے بول اب ہم سے   دیکھیں کیسے جانہ سنبھالے

پورے گیت میں سوز و گداز کی ایک فضا طاری ہے۔ آج وہ گھر چھوٹ رہا ہے۔ جس میں طفلی کی معصوم زندگی غمِ زمانہ سے آزاد بسر ہوئی تھی۔ اس سے پالا پڑا ہے جو بالکل اجنبی ہے۔ نہ معلوم کیسی بیتی ہے۔ ماں سے فریاد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ خدا کے لئے میری محبت دل سے بھلا نہ دینا۔ تری جدائی کے خیال سے دل میں شعلے اٹھ رہے ہیں۔ پھر شکایتاً کہتی ہے کہ اتنے دنوں لاڈ اور پیار سے پالا پوسا اور اب غیروں کے حوالے کر رہی ہے۔ دل ڈرا اور سہما ہوا ہے نہ معلوم ساس نندوں کی بولی ٹھولی ان کے طنز کیسے گوارا ہوں گے۔ سسرال کا کٹھن سابقہ دل میں ہزاروں وسوسے ہزاروں ڈر پیدا کئے ہے۔ مشرقی معاشرت کا دل کش پہلو کیسے نرم و نازک الفاظ اور سبک پیرائے میں ادا کیا ہے۔ نغمہ و موسیقی کی موج پنہاں پورے گیت میں رچ گئی ہے۔

دیہات میں "پنگھٹ" بھی رومانیت اور عشق کے راز و نیاز کا ایک مقامِ خاص ہے۔ جہاں "کام دیو" مصروفِ تیر افگنی رہتا ہے۔ جہاں دل کی دنیا میں محبت کا جادو جگایا جاتا ہے۔ جہاں حسن کی شانِ بے نیازی انداز سے جلوہ گر ہو کر عشق کے خرمنِ صبر کو خاکِ سیاہ کرتی رہتی ہے۔ جہاں پانی بھرنے جاتے ہوئے معصوم دلوں کی دنیا میں محبت کی آگ سلگائی جاتی ہے۔ ایک نازک اندام احساسات سے بھرپور دل لئے ہوئے پانی بھرنے جاتی ہے۔ سانولا سلونا "کرشن" من موہ لینے کے لئے آمادہ ہے۔ داستانِ طورو موسیٰ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حسن کی آن بان دیکھ کر ہوش و حواس رخصت ہو جاتے ہیں۔ اُسی کی زبان سے وارداتِ دل سنیئے۔

ایک دن جل بھر کے گھر چلی سر پر گاگر بھار
مورے چھت جھٹی گری سر گاگر ہوتے آنکھیں چار
کون آتر گھر دے پنہاری
دیکھت نیناں لال کے جی ما اٹھت بیوگ
دن دن گھٹت ہے مانس رہی چین چھین بانٹت روگ
بید نہ جانے پیر ہماری
ناری دیکھت مور سکھی ری بید کہا نہ روئے
برہ کی ماری کاں دیکھی کبھوں نیک نہ ہوئے
انہاں او کھد کا کرے بیچاری

دل محبت کی چوٹ سے گھائل ہو چکا ہے۔ اس روگ سے جسم کا نٹا ہو جاتا ہے۔ دل کی لگی کو کوئی حکیم یا وید دوا کے چھینٹوں سے نہیں بجھا سکتا۔ نبض دیکھ کر وہ کفِ افسوس مل کر کہتا ہے کہ محبت کے مارے ہوئے کا کوئی علاج نہیں۔ یہ روگ لاعلاج ہے۔ اس عالم میں پپیہا بولتا ہے۔ اس کے بول بھی کڑوے معلوم ہو رہے ہیں۔ کس دل کش انداز میں اس غمِ فراق کو ظاہر کیا ہے۔

پیا پیا بول پپیہا کاہے برہن مارت جاد
کا جرے میں کر رہی کچھ تپیش کرت گہا۔
منہ سے جھرت تہے چنگاری

"پی کہاں" کے بولوں کو چنگاری سے تشبیہ دینا وہ اعجازِ شاعری ہے کہ جس کی تعریف سے زبان قاصر، صرف وجدانِ صحیح اس نغمہ سرائی سے جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ یہ حسن و عشق کے وہ والہانہ ناز و نیاز ہیں کہ جن کو صرف صاحبِ دل سمجھ سکتے ہیں۔

"حسنِ ازل" کی جھلکیاں کائنات کے ذرّے ذرّے میں جان ڈال رہی ہیں۔ جس نے یہ حسنِ تمام دیکھ لیا۔ اس نے رازِ ہستی پا لیا۔ خالق کے شیدائی

کو مخلوق سے محبت ہو جاتی ہے۔ گوپیاں سری کرشن جی کی محبت میں باولی ہو رہی ہیں۔ اُن میں سے ایک کے جذبات کا حال سُنئے۔

ایک نوگرفتارِ محبت جو شاید کبھی محبت پر ہنستی تھی آج دل کی چوٹ سے آشنا ہو کر حیران و سراسیمہ، بے کل اور بے چین ہو کر ماری ماری پھر رہی ہے۔ وہ گوپی جو کبھی بہت پہلے محبت پر ہنسی جا چکی تھی طنزاً کہتی ہے کہ ہاں کل تک "تنے نواز" کی محبت پر مجھ پر ہنستی تھی آج کیسی گھبرائی پھر رہی ہے۔ ذرا اندازِ بیان کا حسن ملاحظہ ہو۔

کل تئیں ہم کو ہنست رہی

آج تنک مرلی دھن سُنتے   پھرت ہے مدھوبن ہی ہی
مرلی سن بھو چک بھئی بھوری   مرلی والے کو کو ان کہی
جب جانوں موہن کے دیکھیں   سُدھ بدھ نا بھولے تو بہی
ماکھن دودھ بھلائے گوالن   لاگے پکارسے دھی دھی
یہ موہن گوالن کے گھٹ ماں   کا ظلم دیکھیں رہی رہی

صرف مرلی کی آواز پر نادیدہ موہن کی محبت کا تو یہ عالم ہے اور اگر کہیں اس کا جمال ہوش رُبا دیکھ لے تو تیرے اوسان ایسے خطا ہوں کہ دودھ بیچ رہی ہو تو بدحواسی میں دھی دھی پکارنے لگے۔ اس محبت کی سراسیمگی کا کتنے دل کش پیرایہ میں اظہار کیا ہے۔ شریکِ محبت دوسرے کو مبتلائے محبت دیکھ کر مسرور ہوتا ہے اور اس گیت میں اسی مسرت کا اظہار ہے کہ وہ آفتِ دلِ عاشقاں جو ہماری آنکھوں کو خوں چکاں کر چکا ہے اب دوسروں کو بھی اپنی محبت سے تڑپا اور ستا رہا ہے۔

محاکات کی ایک دوسری دل کش مثال ملاحظہ ہو۔ دولھا، دولھن کے گھر آ رہا ہے۔ حسن و جمال کا پیکرِ مجسم بڑی قیمت ادا کرنے کے بعد ہاتھ آیا ہے کتنے شیریں الفاظ کتنے رچے ہوئے انداز میں یہ تصویر کھینچی ہے۔ رنگوں کی شوخی حرف حرف سے عیاں ہے اور موسیقی کی روح ان بولوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ یہ شہانا ہندی شاعری کے انمول موتیوں میں ہے۔ کہ دل کو سرور و کیف سے بھر دیتا ہے۔ کہتے ہیں۔

مہنگے مول آیا میرا بنڑا

ملا ملا کرت ہے، پیتاں پڑت ہے، کیسے نبولن آیا
رنگ رنگیلا، چھیل چھبیلا، بھلے سڈ مولن آیا
نیند کا ماتا رنگ مارا تا، ہولن ہولن آیا
مکھ موندروں اب کیسے کا ظلم، گھونگھٹ کھولن آیا

کیسا دولھا! جو کم سخن بھی ہے اور کرشمہ و ناز میں کامل بھی، جس میں محبوب جانستاں بننے کی ساری صلاحیتیں بہ حد کمال موجود، جو رنگ و رنگینی کا ایک پیکر اور شوخی و ناز کا ایک مجسمہ ہے جس کی مدھ بھری انکھڑیوں میں شباب کے لاکھوں فسانے مچل رہے ہیں۔

شام سندر دوارکا سدھار گئے ہیں۔ گوپیوں کا دل جدائی کی آگ سے جل رہا ہے۔ برسات کا کیف آور موسم آ پہنچا ہے پپیہے کے بول دل کو بے چین کر دیتے ہیں۔ ذرا مندرجہ ذیل گیت کا سوز و گداز ملاحظہ ہو۔ برسات کی راتیں اور جدائی کا عالم، فرقت و ہجر کے جذباتِ غم کو کس پُر ترنم انداز میں ادا کیا ہے ہر ہر شعر میں موسیقی کی روح تڑپ رہی ہے اور سُننے والے کے دل سے صبر و تمکین کی متاع لوٹے لے رہی ہے۔

اب کیوں بولے آئے پپیہا   پیو پیو رٹن لگا سے
جو نے دلیس بسے نند نندن   بہیں بولو جا سے
مور کوئل اڑ جائے دلیس سے   ہم کا کچھ نہ سہا سے
ایسے برتے برہن۔ تم سب مل   کاہے دیت جرا سے
جائے گھن برسو جہاں گھنشام ہیں   بنے رہو گھن چھا سے
نین ہمارے اُن کے بچھڑت   برسیں گھنے جھڑ لا سے
کون رہا جگ ماں پیا سنگ   بھاگ اس کو پا سے
پیا سے ملا رہے نت کاظم   من لیو سب سے اٹھا سے

فراق کے جذبات پُر ترنم الفاظ مناسب حال لَے میں ادا کئے ہیں۔ تمام موسم کا کیف و سرور محبت سے پاش پاش دل کے لئے بے معنی ہے۔ برسات کا موسم کتنا سہانا ہوتا ہے، کوئل کی پکار، مور کی جھنکار دل میں جذبات کا تلاطم برپا کر رہی ہیں۔ لیکن موسم کی یہ ساری کیفیت ہیچ ہے اگر محبوب کوسوں دُور ہے بادلوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ وہاں جھڑی لگاؤ، جہاں گھنشام براج رہے ہیں۔ یہاں تو پانی کی ایک ایک بوند دل کی لگی کو بھڑکا رہی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ بس محبوب تو اُسی کو مل سکتا ہے جس نے مایا موہ سے دل اٹھا لیا ہو۔ آخری شعر جذباتِ غم کو ایک بلند مقام عطا کر رہا ہے اور اپنے دامن میں روح کے سنوارنے کا سامان مہیّا کئے ہے۔ یہی وہ شاعری ہے جو ہمیں

مادیت کی پستی سے روحانیت کی بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔

سوہن محوِ خواب ہیں۔ ایک گوپی جگانے آئی ہے، ذرا دیکھئے اُس کے مچلتے ہوئے جذبات کا اظہار کس انداز میں کرتے ہیں۔

موہن پیارے دُئی کے سنوارے   جاگو اٹھو بَل جاؤں تمہارے
من بھاون ٹُک نکسو بھوَن سے   کتنے دَرس کا ٹھاڑے دوارے
بیگ کھلت نہیں نیند کے ماتے   رس بھرے نین بانکے متوارے
نیند کے بس ہوں آنکھیں لال کی   جو جگ بس کرے آنکھ پسارے
کی ہے بالک جانے نہیں نیہہ کی   کی جانے پیے رہت سنبھارے
چتر سجان جانے سب رس کی   تب ہی ہیں گو رس پہ پیارے
بیر بھئی ہم کا گھبراوت   نہیں جاگت گھبرائے ہمارے
جاگ اٹھے گرے لاگے کاظم کے   جب وہ موہن کہہ کے پکارے

کتنے دلکش انداز میں محوِ خواب محبوب کو جگانے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔ آنکھیں نیند کے خمار سے چُور ہیں اور آسانی سے کُھل نہیں رہی ہیں وہ آنکھیں جو نظر اٹھا دیں تو سارا عالم گرفتارِ محبت ہو جائے۔ پھر کم سنی کا ذکر آتا ہے کہ وہ محبت کی رسم و راہ کیا جانے۔ پھر شکوہ ہے کہ ہمارے پکارنے سے نہیں اٹھتا اور کاظم ہے کہ اِدھر انھوں نے آواز دی اور انھیں گلے لگا دیا یہ لطیف چھیڑ چھاڑ اور میٹھے میٹھے رسیلے بول ہندی زبان کا ایک بیش قیمت سرمایہ تھے دو سو برس تک یہ منظرِ عام پر نہ آسکے آج زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر سرورِ قلب و نظر بن رہے ہیں۔ روزمرّہ کی بول چال میں استعارے اور تشبیہوں کے پیراہن میں حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ یہ گوپ اور گوپیاں دراصل روحیں ہیں جو اصل سے ملنے کے لئے بے تاب ہیں جسنِ ازل نے شوقِ خود نمائی میں یہ کائنات کا ہنگامہ برپا کر دیا اور خود نگاہِ ظاہر سے چھپ گیا۔ اس زندگی کا پردا پڑا ہے۔ لیکن محبت اور جذبِ محبت وہ رہبرِ کامل ہے کہ حسنِ ازل سے ملا دیتا ہے۔ یہ وہ قوّت ہے جو سارے حجاباتِ ننگ و ناموس کو خاکستر کر کے انسان کو جلوہ گاہِ ناز میں باریاب کر دیتی ہے۔ یہ ناز و انداز کے کرشمے۔ یہ غفلت و تغافل کی ادائیں دراصل محبت کی آگ کے لئے پانی کے وہ ہلکے ہلکے چھینٹے ہیں جس سے آگ بھڑکتی ہے بجھتی نہیں بقول غالب۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

ان صوفیانِ صاف طینت نے دل کی آنکھیں روشن کیں، انھوں نے پیامِ محبت دیا۔ عام انسانیت سے محبت، مذہب و ملّت، ریت رسم سے بلند ہو کر انسان کو انسان سے محبت کرنے کا طریقہ سکھایا۔ وہ ایک سے لو لگا کر سارے عالم کو ایک سمجھتے ہیں۔ خیر و شر، سب ایک تصویر کے دو رُخ ہیں۔ وہ نفرت اور نفاق کے زہر کو محبت کے تریاق سے کاٹتے ہیں۔ وہ دلوں سے برائیوں کا کھوٹ دور کرتے ہیں، وعظ و تلقین سے نہیں بلکہ دلوں میں عشق کی لو لگا کر۔ وہ بظاہر دنیا سے دُور رہتے ہیں لیکن ہزاروں دلوں میں دردِ انسانیت پیدا کر کے اُن کو خدمتِ خلق کے قابل بنا دیتے ہیں انھیں برگزیدہ ہستیوں اور انسانیت سے محبت کرنے والوں میں حضرت شاہ کاظم کاکوروی بھی تھے جن کی فیضِ صحبت اور اثرِ تربیت سے لاکھوں نے مقصدِ حیات پایا۔ آپ کاکوری ضلع لکھنؤ کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے فضل و کمال کے باعث تمام ہندوستان میں مشہور تھا۔ آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت مخدوم نظام الدین کاکوری میں قیام پذیر ہوئے۔ حضرت شاہ کاظم کے والدِ محترم شاہ محمد کاشف ایک صاحبِ دل بزرگ تھے۔ حضرت شاہ کاظم ابتداء سے دنیا سے متنفر تھے۔ بکسر کی لڑائی سے بڑی عبرت ہوئی اور آپ نے ترکِ دنیا کا فیصلہ کر لیا۔ دمگڑھ ضلع الہ آباد میں شاہ باسط علی کے مُرید ہوئے اور پیرِ مرشد کے حکم سے کاکوری آکر تزکیۂ نفس اور تہذیبِ کردار کے کارِ اہم میں منہمک ہو گئے۔ نغمہ و شعر سے ابتداء سے ذوق تھا۔ پکے گانے کی دُھنوں میں بھجن، ٹھمریاں اور دہرلے بے ساختہ پُرلحن انداز سے گاتے تھے۔ ایک عالم آپ کی صوتِ دلآویز پر عاشق تھا۔ ہر شخص بلا امتیازِ مذہب و ملّت آپ کے پاس آتا تھا اور آپ اُسے اسی کے مسلک کے لحاظ سے خداشناسی کا راستہ بتاتے تھے۔ آپ کا ہندی کلام جس کے کچھ بند اوپر لکھے گئے۔ حقائق و معارف سے پُر ہے۔ اس میں کیفیاتِ ہجر و وصال بھی ہیں۔ اس میں اُن جذبات کا اظہار بھی ہے جو سالک پر دورانِ سلوک میں وارد ہوتے ہیں۔ اس میں بصیرت کے ہزار ہا سبق ہیں جن کو پڑھ کر دل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف بھجن کے پُرکیف روحانی نغمے ہیں تو دوسری طرف رنگین خیالات سے بھری ہوئی ٹھمریاں بھی ہیں۔ محاکاتِ جذبات بھی ہے اور محاکاتِ معاملات بھی، حسن و عشق کی لطیف نوک جھونک بھی ہے اور سوز و گداز کی تڑپ رکھنے والے فراقیہ چھند بھی۔ سارا کلام تازہ بتازہ نو بہ نو جذبات کا ایک

ایسا مرقعِ دلکش ہے جو شعر و شعریت سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے تسکین روح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

آخر میں چند بند مختلف موضاعات پر لکھے جاتے ہیں جن سے ان کے خیالات کی رفعت و پاکیزگی زبان کا لوچ اور شیرینی جو برج بھاشا کی خصوصیات میں ہیں نظر آئنگیں

کرشن جی نے دل چُرا لیا اس واقعہ کو ایک گوپی کی زبان سے سُنئے۔

جائیے کے ہم جمت پچھتانی   آگ لگی ہے بھرتے پانی
گھاٹ پہ ٹھاڑے رہے من موہن   چتوت ہی سدھ موہ بھلانی
لوگ کہت سب موکو باوری   موہن لکھ کتو رہت سیانی
جا کے لگے سوئی جانے کاظم
کا ہو کی پیر کتو کب جانی

محبوب کی بے رُخی کے برتاؤ پر شکوہ شکایت سُنئے۔

موکوں درس دیئے نہ کبہوں   جی مارے ترسائے
سب کاں بلائے بٹھائے نیرے   ہم رہے ٹھاڑے آس لگائے
اوروں سے پیا ہنس ہنس بولیں   ہم کا جب تک دیت رلائے
پڑے کہ بجیاں جبر جبر چھارے
داگ بھئے جی مار رسکائے

غرض پورا کلام حسنِ ادا کی لطافت سے معمور ہے۔ تخیل کی رعنائی عجیب رعنائی اور بانکپن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سوز و گداز کی کیفیات، ہجر و فراق کے تاثرات وصل و وصال کے مسرت آگیں جذبات، شیریں اور رسیلے بولوں کے سانچے میں ڈھل ڈھل کر سامعہ نواز ہو رہے ہیں۔ اگر ایک طرف ہولی اور بسنت کے مناظر کی عکس کشی نگاہِ تخیل کو حیران کئے ہے تو دوسری طرف واردات عشق زیور گوش ہیں۔ لفظ لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نغمہ زنِ الست نے ہنس کے رباب اُٹھا لیا ہے اور تمام عالم نغمہ و رقص سے معمور ہو گیا ہے۔

کرشن چند امید

ہندی رُباعیات

(۱)

اُتکرش[1] کا آدرش[2] بتا دیتا ہے   آلوک[3] کا پتھ جگ کو دکھا دیتا ہے
جیون کو جلا دیپ[4] شکھا[5] سم امید   یہ جل کے زمانے کو چمکا[6] دیتا ہے

[1] بلندی - اُتم ہونا [2] نصب العین، روشنی [3] روشنی
[4] دیپک کی لو [5] مانند [6] روشنی

(۲)

رجنی[1] میں اُرن[2] ہاس[3] چھپا ہوتا ہے   ہر شوک میں اُلّاس[4] چھپا ہوتا ہے
نیراشیہ[5] میں ہوتی ہے جھلک آشا کی   پت جھڑ[6] میں مدھوماس[7] چھپا ہوتا ہے

[1] رات [2] صبح کی لالی [3] تبسم، ہنسی [4] خوشی
[5] مایوسی [6] موسم خزاں [7] وسنت، بہار

(۳)

پریتم کی نظر تم[1] کو مٹا دیتی ہے   ودیت[2] کی چمک راہ دکھا دیتی ہے
انوراگ[3] میں تپنے سے نکھرتا ہے منج[4]   یہ آگ اہم[5] بجھا و جلا دیتی ہے

[1] اندھیرا۔ظلمت [2] بجلی [3] پریم
[4] آدمی [5] خودی

(۴)

جینے کا میں سامان کیا کرتا ہوں   ابھشاپ[1] کو وردان کیا کرتا ہوں
سنسار کی چنتاؤں سے پیچھا چھوٹے   دن رات میں مدھوپان[2] کیا کرتا ہوں

[1] شاپ
[2] بادہ نوشی۔

مارکس کے فلسفۂ معاشیات کا حالیہ جائزہ

حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو کے کلکتہ اسٹیشن سے ایک مباحثہ نشر کیا گیا۔ جس کا موضوع تھا "کیا مارکس کا فلسفۂ معاشیات تقویم پارینہ بنتا جا رہا ہے؟" اس میں جن مقرروں نے حصّہ لیا اُن کے خیالات درج ذیل ہیں:-

ڈاکٹر پی۔ سی۔ ٹامس صدر شعبۂ معاشیات، گوہاٹی یونیورسٹی۔

کال مارکس اپنے وقت کے سوشل فلاسفر، انقلابی راہنما اور ایک اثر آفریں شخصیت تھے وہ جدید سوشلزم کے خاص دھارے کا منبع و مآخذ تھے۔ انھوں نے ایک ایسے نظریے کی اشاعت کی جس نے متعدد ملکوں میں بہت سے لوگوں کے فکر و عمل کو متاثر کیا۔ چناں چہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کے فلسفۂ معاشیات کی قائل ہے۔

مارکس انیسویں صدی کے عظیم مفکروں میں سے تھے۔ ان کا دائرہ معلومات بہت وسیع اور قوتِ غور و فکر لامحدود تھی۔ اُنھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں کیپٹیل سب سے بڑی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اُنھوں نے اقتصادی نقطۂ نگاہ سے تاریخ کی تشریح کی۔

اس تشریح کو چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دورِ جدید میں سماجی ترقّی کا انحصار کیپٹیل یعنی سرمائے پر ہے اور اس انحصار کی بدولت سماج کا ڈھانچہ سرمایہ دارانہ ہو جاتا ہے۔

اس نظریے کا مطلب یہ تھا کہ محنت کش عوام جو کچھ پیدا کرتے ہیں اس کا محض ایک حصّہ اُجرت کی شکل میں پاتے ہیں۔ باقی کسی اور کے پاس جاتا ہے اور اس سلسلے کے یونہی جاری رہنے سے وہ محنت کش عوام سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتا ہے۔ کافی تکالیف و مصائب جھیلنے کے بعد مزدور میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک انقلاب لانے کا موجب بنتا ہے۔ وہ غاصب سے بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا جدید سوسائٹی کی تاریخ سرمایہ داروں اور پرولتاریوں کے دو طبقوں کے درمیان جدّوجہد کی داستان ہے اور ایک طبقاتی جدّوجہد کا ایک انقلاب کی صورت میں انجام پذیر ہونا ناگزیر ہے۔

اگرچہ جدّوجہد میں شروع میں فائدہ سرمایہ دار ہی کو پہنچتا ہے۔ تاہم اس کے نتائج دُور رس ہوتے ہیں۔ بڑے سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ داروں کو نگلتے رہتے ہیں۔ تاوقتیکہ جمع شدہ سرمایہ اور دولت کا وسیع ذخیرہ بڑی بڑی اجارہ داریوں کے کنٹرول میں نہ آ جائے۔ انقلاب آتا ہے اور پھر وہ لوگ جو اس وقت تک زیادتیوں کا شکار رہے ہوتے ہیں وہ زیادتی کرنے والوں پر زیادتی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لازمی انقلاب اور بالآخر سرمایہ داری کی تباہی کی پیشینگوئی کی بنا پر مارکسی نظریہ پُرانا نظر آنے لگے لیکن کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ اس دنیا میں سرمائے کی بے تحاشا ذخیرہ اندوزی کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر امیر لوگ زیادہ امیر اور غریب لوگ زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔

یہ چیز ایک مستقل طبقاتی کشمکش اور لازمی انقلاب کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ صرف اسی وجہ سے بہت سے ملکوں میں انقلاب آئے ہیں اور ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی بنا پر ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکیں کہ انقلاب کا دور ختم ہو چکا ہے اور آئندہ کوئی انقلاب نہیں آئے گا اگر ملکوں کی بیشتر تعداد ایسی ہے جہاں انقلاب نہیں آیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان میں سرے سے انقلاب کا کوئی امکان ہی نہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہاں قومی پیداوار کی زیادہ فراخدلانہ تقسیم کے ذریعے انقلاب کو روک دیا گیا ہے۔

اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا یہ اقدامات خواہ یہ سرمایہ جمع کرنے والوں نے خود کئے ہوں یا ان کی طرف سے حکومت نے کئے ہوں اس بات کی ضمانت نہیں ہیں کہ انقلابات پھر رونما نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر مارکسی نظریے کی سچائی ان انقلابات سے ثابت نہیں ہوتی جو ماضی میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں تو انقلاب کے عارضی طور پر رک دیئے جانے سے یہ نظریہ غلط بھی ثابت نہیں ہوتا۔ لہٰذا میری رائے میں ایسی کوئی وجہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مارکس کا فلسفۂ معاشیات پرانا ہوتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر سداشو مصرا، پروفیسر معاشیات، راون شاہ کالج کٹک

مارکس کے فلسفۂ معاشیات پر دوسری سب باتوں کو نظر انداز کر کے رائے زنی نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو ایک عام سوشل تھیوری کا محض ایک خاص پہلو ہے۔ اُنھوں نے تاریخ کا ایک نہایت اہم فلسفہ پیش کیا اور اُن کی معاشیات اسی فلسفے پر مبنی ہے۔

مارکس کا کہنا ہے کہ انسانی تاریخ سماج کے طبقوں کے درمیان مسلسل جدّوجہد کو ظاہر کرتی ہے اور ہر سماجی و اقتصادی نظام میں مختلف طبقوں کے درمیان ایک خاص رشتہ موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ رشتہ آقا اور غلام اور مالک اور مزدور کے درمیان موجود تھا۔ مارکس کے فلسفے کے مطابق تبدیلی کے واسطے قوت محرکہ معاشی پیداوار کا نظام فراہم کرتا ہے اور طبقاتی کشمکش اس تبدیلی کی رفتار کو تیز کرتی ہے۔ مارکس کے نظریۂ معاشیات میں سرمایہ دارانہ نظام میں طبقاتی جدّوجہد کی وضاحت کی گئی ہے۔

قدامت پسند ماہرینِ معاشیات نے ایک اقتصادی نظام میں ایک دوسرے کے تعاون کے ساتھ کام کرنے والے عناصر کے درمیان ہم آہنگی کا تجزیہ کیا اس کے برعکس مارکس نے دو طبقوں کے درمیان کشمکش پر زور دیا۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا جو مالک ہوتے ہیں مگر کام نہیں کرتے اور دوسرا ان لوگوں کا جو کام تو کرتے ہیں مگر حقِ ملکیت سے محروم رہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں اس کشمکش کا تجزیہ کرتے ہوئے مارکس نے یہ دکھایا کہ کسی چیز کی قیمت کا دارومدار اس محنت پر ہوتا ہے جو اسے تیار کرنے میں صرف کی جاتی ہے اور مالک مزدوروں کو صرف گذر بسر کرنے کے لائق معاوضہ ادا کر کے بچت کی رقم خود ہڑپ کر جاتا ہے۔ یہ نامناسب رویّہ ہی کشمکش کی جڑ ہے اور اس کے بعد اگلا دور وہ ہوتا ہے جس سے سرمایہ داری کے تختے کا الٹ جانا ایک ناگزیر سی بات بن جاتا ہے۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ محنت کے لحاظ سے قیمت کے تعیّن کا اصول نہ صرف بہت پرانا ہو گیا ہے بلکہ وہ کسی ٹھوس بنیاد پر مبنی بھی نہیں ہے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ ایک ایسا فلسفہ جو ایک غیر منطقی اصول پر مبنی ہے۔ کس طرح لوگوں کے دماغ پر اتنا اثر انداز ہو سکا۔ لیکن خیال رہے کہ مارکس کی "لیبر تھیوری آف ویلیو" کے غیر محکم ہونے کی وجہ سے ان کی سوشل تھیوری بھی غلط ثابت نہیں ہوتی۔

مارکس نے اپنا نظریہ مصائب اور غریبی کے اس ماحول میں قائم کیا تھا جو اُنھوں نے ۱۸۶۰ء کے بعد کے سالوں میں دیکھا تھا۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام اپنی تنگ شکل میں بجنسہٖ قائم رہتا تو شاید اس امر کا احساس بھی کیا جاتا کہ اس کا تختہ اُلٹ دیا جائے گا۔ مگر اس کے بعد کی طویل مدّت میں سماجی ڈھانچے میں کافی اصلاح کی جا چکی ہے اور کشمکش کے وجوہ کو ختم کیا جا چکا ہے۔

اب اُجرتیں ایسی نہیں ہیں کہ محض گذر بسر کے لئے ہی کافی ہوں۔ اس کے علاوہ دولت کی ذخیرہ اندوزی بھی کافی کم ہو گئی ہے۔ ایک فلاحی ریاست میں زندگی کی آسائشوں کے لئے وسیع پیمانے پر انتظام کیا جاتا ہے۔ پبلک سیکٹر کا دائرہ وسیع کر دیا جاتا ہے اور منصوبہ بند ترقی کے اقدامات کئے جاتے ہیں۔ اس تمام کارروائی سے مارکس کے فلسفۂ معاشیات اور سماجی تغیّر و تبدیلی کے فلسفوں کے بنیادی مفروضات ہی بدل جاتے ہیں۔

اگرچہ مارکس کی "لیبر تھیوری آف ویلیو" ایک مبہم اور غلط سی چیز تھی۔ تاہم سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں ان کے تجزیے نے علم معاشیات میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ مارکسی معاشیات اپنی خالص شکل میں فرسودہ ہو چکی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعد میں کئے گئے معاشی تجزیوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ معاشی پالیسی پر بھی مارکسزم کا گہرا اثر پڑا ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ این سین، پروفیسر معاشیات، کلکتہ یونیورسٹی

میرے خیال میں تقریر کا موضوع کسی قدر دلچسپ ہے۔ کیوں کہ اس سے ایسا نظر آتا ہے جیسے تاریخ میں کسی وقت مارکسی معاشیات حالات زمانہ کے مطابق تھی اور علم معاشیات کے ماہرین نے مارکس کے تجزیے کو قبول کر لیا تھا مگر سچ تو یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

مارکس کی تصنیف "ڈاس کیپٹل" کی اشاعت کے بعد کی نصف صدی میں ماہرینِ اقتصادیات کی ایک بہت بڑی تعداد نے مارکس کے فلسفۂ معاشیات کا خیر مقدم ایک حقارت آمیز خاموشی سے کیا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھار حواشی میں اس کا ذکر کر دیا جاتا تھا۔ یہ تو ابھی حال ہی کی بات ہے کہ ماہرینِ معاشیات ان کے معاشی تجزیے کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی سے نظر ڈالنے لگے ہیں۔

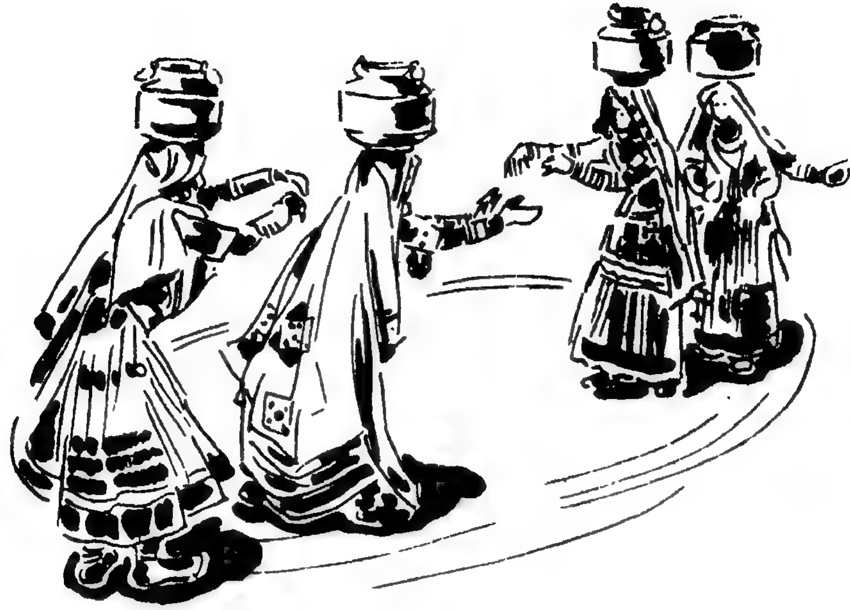
سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد کے سالوں میں جو عظیم سرد بازاری دیکھنے میں آئی اور وسیع پیمانے پر جس بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا، یہ اسی کی بدولت ہے کہ مارکس کے فلسفے میں دوبارہ دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جیسا کہ مارکس کا کہنا تھا کہ سرمایہ والوں کی دولت جمع کرنے کی خواہش کا لازمی نتیجہ اس شکل میں نکلے گا کہ منافع کی شرح گر جائے گی۔ کیا ہم کو واقعی منافع کی شرح گرتی دکھائی دے رہی ہے؟

دراصل مارکس کی تصانیف ایک ایسے زمانے میں لکھی گئیں جب کہ مغربی دنیا کے بیشتر ممالک میں تیز رفتار اقتصادی ترقی ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس عمل کو دیکھا اور ان عناصر کو چھانٹ کر الگ کرنے کی کوشش کی جو ایک مکمل اقتصادی نظام کی ترقی یا زوال کا باعث بنتے ہیں۔ اس تجزیے میں وہ بہت سی باتیں نظر انداز کر گئے۔ لہٰذا یہ تجزیہ بہت مبہم رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ اس سے قبل کہ وہ اپنی تصنیف کو مکمل کرتے اُن کا انتقال ہو گیا۔

بہرحال کوئی مارکس کا قائل ہو یا نہ ہو ایک ماہرِ اقتصادیات مارکسی فلسفے کو فرسودہ سمجھ کر بالائے طاق نہیں رکھ سکتا۔ خواہ اسے اس بات کا پختہ یقین ہی کیوں نہ ہو کہ وہ تمام عناصر جن کی بنا پر مارکس نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سرمایہ داری کا خاتمہ ناگزیر اور یقینی ہے۔ اس قدر بدل چکے ہیں کہ مارکس کی پیشین گوئی کی بنیاد ہی ختم ہو گئی ہے۔ پھر بھی معاشیات کے ماہروں کے لئے سرمایہ داری کے بارے میں مارکسی نظریے کا مطالعہ کافی مفید ثابت ہوگا۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)



تھیو، ڈبلو، لاتوش

بنجارے

اب سے چند مہینے پہلے جمہوریہ ہند کے صدر، ڈاکٹر راجندر پرساد نے جنوبی ہند میں اپنی سرکاری رہائش گاہ، نیلایم کے سبزہ زار پر کوئی چار سو مزدوروں اور کاریگروں کی دعوت کی تھی، اسے ایک یادگار واقعہ کہا جاسکتا ہے۔

نیلایم کوئی سو برس سے زیادہ عرصے تک حیدرآباد میں برطانوی ریذیڈنٹوں کی دیہاتی رہائش گاہ رہی ہے۔ راشٹرپتی نے جن مزدوروں اور کاریگروں کی دعوت کی تھی انھوں نے اس کوٹھی کی ترمیم و مرمت اور اندرونی آرائش اور سجاوٹ میں حصہ لیا تھا۔

یہ ایک سادہ سی عمارت ہے جو سکندرآباد سے چند میل شمال بولارم کی پرانی چھاؤنی میں سطح مرتفع پر ایک پارک کی طرح کے میدان میں واقع ہے۔

راشٹرپتی کے مہمانوں میں ایک خانہ بدوش قبیلے کے لوگ جو دلچسپ اور رنگین لباس میں ملبوس تھے خاص طور پر نمایاں تھے۔ انھیں کہیں بنجارا اور کہیں لمباڈا کہا جاتا ہے۔ انگریز انھیں جپسی کہتے تھے کیونکہ یہ یورپ کے خانہ بدوش جپسیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں اور انھیں کی طرح ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے ہیں اور رقص و نغمہ کے دلدادہ ہیں۔ اب تو یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ یورپ کے جپسی جو اپنے کو رومنی کہتے ہیں۔ ہندی الاصل ہیں۔ اور ان کی زبان ہندی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔

شوقِ آرائش

خواتینِ ہند میں بنجارہ عورتوں سے زیادہ رنگین و شاندار، اور چمک بھڑک والے کپڑے کوئی نہیں پہنتا۔ وہ لازمی طور پر سر سے پیر تک زیورات اور طرح طرح کے سامانِ آرائش سے لدی رہتی ہیں۔ کلائی سے کہنی تک

کڑے ہی کڑے ہوتے ہیں، گلے میں بے شمار نکلس پڑے ہوتے ہیں۔ پوپلے چھلے ہوتے ہیں۔ اور جب بنجارہ عورت چلتی ہے تو اس کی پازیب کی مترنم جھنکار اس کی آمد کا اعلان کرتی چلتی ہے۔ وہ ہمہ وقت سوتے جاگتے اتنا سامان زیبائش و آرائش پہنے رہتی ہے جس کا وزن کوئی پانچ سیر تو ضرور ہوگا۔ اس کے کپڑے تک نہایت بھاری ہوتے ہیں اور ان پر خوب بیل بوٹے کڑھے ہوتے ہیں۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب انگریز بڑھ بڑھ کر ہند کے مختلف حصوں پر قابض ہو رہے تھے تو اس پُرشور زمانے میں خانہ بدوش بنجاروں نے فوجی کمسریٹ کے فرائض انجام دیئے تھے ٹیپو سلطان اور نظام حیدرآباد کے علاوہ انگریز جنرل ڈیوک آف ولنگٹن نے بھی بنجاروں اور اُن کے بار بردار بیلوں کو سامان لانے لے جانے کے لئے استعمال کیا اور سرکاری کاغذات میں اُن کی قیمتی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس غیر یقینی زمانے میں بنجاروں نے بغیر کسی امتیاز و جنبہ داری کے دیسی سرداروں اور بدیشی موقع پرستوں دونوں ہی کو اپنی خدمات ارزاں کیں۔

ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنے مزدور پیشہ مہمانوں کی معیّت میں ایک پُرلطف گھنٹہ گزارا۔ اُنھوں نے بنجاروں میں خاص دلچسپی ظاہر کی بنجارہ عورتیں سلائی کڑھائی کے کام میں بہت مہارت رکھتی ہیں اور انھوں نے راشٹرپتی کی رہائش گاہ کو حسین و نفیس کڑھے ہوئے پردوں سے مزیّن کیا تھا۔ یہ اُن کی عمر میں پہلا موقع تھا کہ وہ اتنے معزز اور ممتاز لوگوں کی صحبت میں شامل ہوئے راشٹرپتی ان لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ انھیں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہوں۔

راشٹرپتی نے اپنے مہمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج مجھے اتنے مزدوروں کے درمیان ہونے سے بڑی خوشی ہے۔ زمانہ سابق میں لوگ آپ کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ وہ آپ کو ایسی تقریبوں میں شریک ہونے کی دعوت دیتے لیکن دنیا بدل چکی ہے۔ آج کل ذات پات، درجہ اور طبقہ، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کا فرق مٹتا جا رہا ہے اور اب آزاد ہندوستان کا ہر شہری مساوی حقوق کا مالک ہے۔ آپ نے اس مکان کو صدر جمہوریہ ہند کے شایانِ شان بنانے میں جس خوبی اور جذبۂ تعاون کے ساتھ کام کیا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں۔

اس کے بعد بنجاروں نے راشٹرپتی کو اپنے مخصوص لوک ناچوں سے محظوظ کیا۔

نیا طرزِ زندگی

غیر تقسیم شدہ ریاست حیدرآباد میں بنجاروں کی تعداد تقریباً چھ لاکھ تھی اور وہ کوئی چھ سو ٹانڈوں یا قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ آج کل بنجارے ترقی کی راہ پر قدم بڑھا رہے ہیں۔ اب اُن کا خود اپنا سیوا سنگھ ہے جو اُن کے مفاد کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس سیوا سنگھ کے لیڈروں نے راشٹرپتی کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ بنجاروں کو جو فی الحال پس ماندہ طبقوں کی فہرست میں شامل ہیں، پٹی درج قبیلوں کے زمرے میں داخل کیا جائے۔ اس سیوا سنگھ کے لیڈر شری راما راؤ راٹھور لوہیر کرنے آچاریہ ونوبا بھاوے کے حیدرآباد کے دورے میں اُن سے ملاقات کی تھی اور انھیں سیوا سنگھ کی سرگرمیوں سے مطلع کیا تھا۔

ونوبا جی نے سنگھ کی اصلاح و ترقّی کے پروگرام میں بڑی دلچسپی ظاہر کی اور شری لوہیر کو یقین دلایا کہ وہ اس سلسلے میں ہر قسم کی امداد و تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

بنجارے شروع میں مویشی پالتے تھے اور اب بھی اس کام کے ماہر ہیں ان کا فخر یہ دعویٰ ہے کہ وہ دو بھائیوں، موٹا اور مولا کی اولاد ہیں، جو کرشن جی کے گوالے تھے۔ بنجارے ۱۶۳۰ کے قریب مارواڑ سے دکن آئے اور اب وہ ملک کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ وہ غلے اور نمک کی تجارت بھی کرتے تھے جنھیں وہ اپنے بیلوں پر لاد کر ملک کے دور دراز حصوں تک پہنچاتے تھے۔ ریل جاری ہونے کے بعد انھیں مجبوراً اپنی خانہ بدوشی ترک کر کے بستیوں میں آباد ہونا پڑا۔

ملک میں غیر یقینی سیاسی حالات اور دیگر وجہوں کی بنا پر بنجاروں کو شک و شبہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی لئے وہ عرصہ دراز تک اپنی روایتی خانہ بدوشی ترک نہ کر پائے ۱۸۹۶ء میں انھیں ایک جرائم پیشہ قبیلہ قرار دے دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کی اقتصادی، سماجی اور تعلیمی حالت بہت پست ہو گئی تھی، لیکن ۱۹۵۲ء سے جب کہ جرائم پیشہ قبیلوں کا قانون منسوخ کر دیا گیا۔ بنجارے ہند کے معزز شہری ہو گئے ہیں اور وہ ہر ایک فرقے، قوم یا قبیلے کے برابر حقوق رکھتے ہیں۔

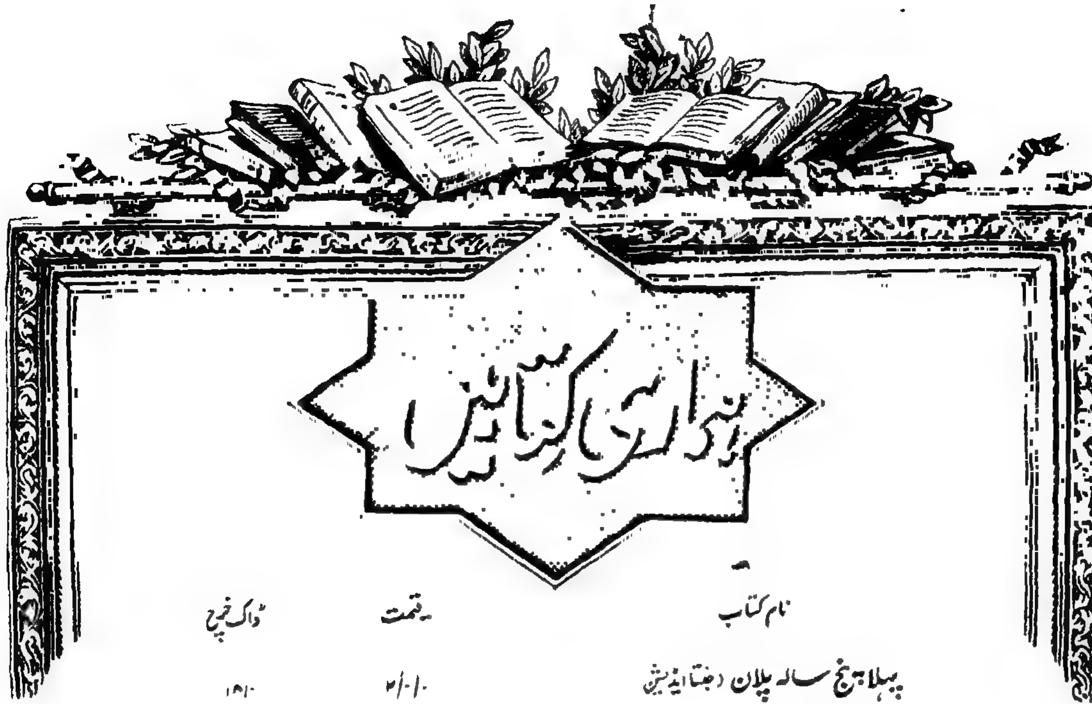
جب سے حکومت نے سماجی خدمات کا ایک الگ محکمہ قائم کر دیا ہے اور سماجی خدمات کے غیر سرکاری ادارے بھی ان کی مدد پر کمربستہ ہو گئے ہیں۔ بنجارے

روز بروز ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ بنجاروں کو تعلیم اور کھیتی باڑی اور مویشی پالنے کے بہتر طریقے سکھانے کی جو سہولتیں مہیا کی گئی ہیں اُن کا انھوں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ مہاراشٹر بنجارا سیوا سنگھ جو باسمت نگر ضلع پربھانی میں ہے (اب ضلع نئے بمبئی پردیش میں شامل ہے) کوئی دس برس سے بنجاروں کی مختلف طریقوں سے خدمت کر رہا ہے۔ اس نے تعلیمی کلچرل اور سماجی سدھار کا بہت نمایاں کام کیا ہے۔ اس کے زیرِ اہتمام تعلیم بالغاں کے ۱۲۵ اسکول اور چھ ہوسٹل قائم ہیں۔ اس نے سوا سو ٹانڈوں کے بنجاروں کو نشہ آور چیزوں کا استعمال ترک کر دینے پر آمادہ کر دیا ہے۔ مہاراشٹر بنجارا سیوا سنگھ کے زیرِ انتظام ایک بنجارا وِدیارتھی گرہ قائم ہے اور ایک قلمی رسالہ "بنجارہ سیوک" بھی شائع ہوتا ہے۔ اس سیوک سنگھ نے ابھی تک مختلف مرکزوں میں کوئی سو سے زیادہ جلسے کئے ہیں۔ حال ہی میں رامیشور ٹانڈہ کی خواتین کے ایک جلسے میں ایک نوجوان بنجارا لڑکی کماری رادھا جادو نے تقریر کی تھی۔

تہذیبی سرمایہ

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زراعت میں مویشیوں کی اب بھی بڑی اہمیت ہے۔ مویشیوں کی تربیت کے سلسلے میں بنجاروں کا پشتینی علم و تجربہ بہت ہی کارآمد ثابت ہوگا۔ حکومت ہند نے اجتماعی ترقی اور قومی توسیعی سروس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی جو پالیسی اختیار کی ہے اس سے بنجاروں کے لئے روزگار کی نئی اور مفید راہیں کھل گئی ہیں۔

ایک نہایت اہم مسئلہ جس کا حل تلاش کرنا ہے۔ یہ ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ جس سے بنجاروں کا معیارِ زندگی بھی بہتر ہو جائے اور دوسرے قبیلوں کی طرح، بنجاروں کے لباس، طور طریقوں اور رسم و رواج کی خصوصیات کو بھی برقرار رکھا جا سکے۔ اس مسئلے کی طرف سب سے پہلے مشہور ماہرِ علم الانسان، ڈاکٹر فان فیورر ہیمن ڈارف نے توجہ دلائی، جنھوں نے کئی قدیم قبیلوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ حکومت نے انھیں کی تجویزوں پر عمل کرتے ہوئے سماجی خدمات سے متعلق ایک الگ محکمہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو پس ماندہ دیہی آبادی اور حکام کے مابین تال میل قائم رکھتا ہے۔ اس محکمے کا خاص مقصد ابتدا سے یہی ہے کہ پس ماندہ اور ترقی یافتہ فرقوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اسے رفتہ رفتہ ختم کر دیا جائے۔ محکمے نے اب تک بہت قابلِ قدر کام کیا ہے۔ (بہ شکریہ مارچ آف انڈیا)



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پہلا پنج سالہ پلان (جنتا ایڈیشن)	۲/۰/۰	۱۸/۰
مستقبل کی تعمیر	۰/۱۴/۰	/۲/
آسان پنج سالہ پلان	/۸/۰	/۲/۰
سماجی بہبود	۰/۱۲/۰	۰/۲/
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان	/۴/۰	/۲/۰
آپ کا گاؤں اور پنج سالہ پلان	۱/۰	/۱/
پنج سالہ پلان - سوالات و جوابات	۴/۰	۰/۲/۰
دیہاتی صنعتیں	/۶/	۰/۲/۰

دس روپیہ یا اس سے زیادہ کے آرڈر پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا



قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509

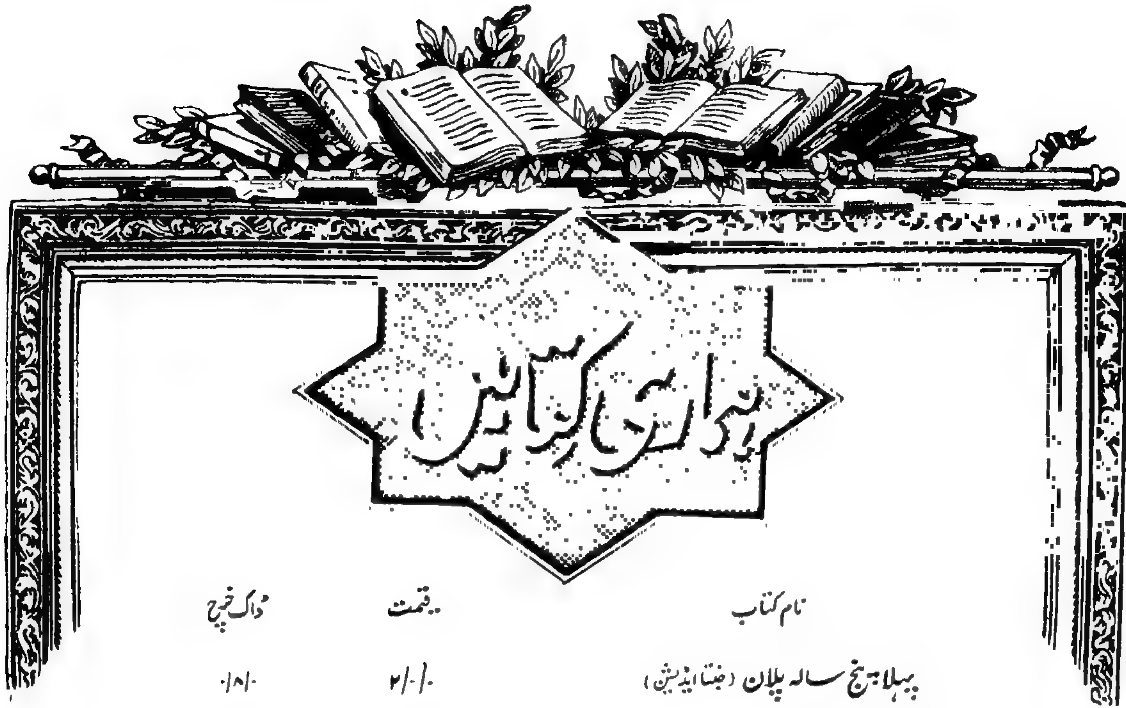
آجکل

اس شمارے میں لکھنے والے
[illegible]
[illegible]
جمیل مظہری
خلیل الرحمن اعظمی
عمران انصاری



جولائی ۱۹۵۷ء
شمارہ ۵ ساون شک سمبت ۱۸۷۹

قیمت
۵۰ نئے پیسے



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پہلا پنج سالہ پلان (جنتا ایڈیشن)	۲/-/-	-/۸/-
مستقبل کی تعمیر	-/۴/-	/۲/-
آسان پنج سالہ پلان	-/۸/-	-/۲/-
سماجی بہبود	-/۶/-	-/۲/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان	-/۴/-	-/۲/-
آپ کا گاؤں اور پنج سالہ پلان	-/۱/-	/۱/-
پنج سالہ پلان - سوالات و جوابات	/۴/-	-/۲/-
دیہاتی صنعتیں	-/۶/	-/۲/-

دس روپیہ یا اس سے زیادہ کے آرڈر پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔



قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق ـــــ عمل: آر، سارنگن

سالانہ چندہ: ـــــ ہندوستان میں: چھ روپے / پاکستان میں: چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے: ـــــ نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ ـــــ ہندوستان میں: آٹھ آنے / پاکستان میں: آٹھ آنے (پاک)

جولائی ۱۹۵۷ء
آشاڑھ۔ ساون شک سمت ۱۸۷۹

جلد ۱۵۔ نمبر ۱۲

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرشؔ ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

۱۰

مُلاحظات

ڈاکٹر راجندر پرساد بھاری اکثریت سے راشٹرپتی کے عہدے کے لئے دوبارہ منتخب کر لئے گئے۔ اور نائب صدر کے لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن بلا مقابلہ چُنے گئے۔ گذشتہ پانچ سال کے عرصہ میں ڈاکٹر راجندر پرساد کی صدارت میں ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے جو اقدامات کئے گئے وہ نہایت حوصلہ افزا اور خوش آیند ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ پانچ سال میں ترقی کی یہ رفتار نہ صرف قائم رہے گی بلکہ اس میں اور بھی اضافہ ہوگا اور ہم فلاحی ریاست اور سوشلسٹ سماج کی منزل کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے جائیں گے۔ ہمارا پہلا پنج سالہ منصوبہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اب ہم دوسرا منصوبہ شروع کر چکے ہیں جس کو پورا کرنے کی ہم سب کو لگن ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد نے نئی پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے ملک کی خوش حالی اور ترقی کے لئے حکومت کی کوششوں کا ذکر کیا اور کہا کہ قومی ذرائع کا سلیقہ مندی سے استعمال اور اُن کی توسیع اکیلے حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، عوام کو بھی ان کاموں میں حکومت سے تعاون کرنا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جمہوری طرزِ حکومت میں عوام سے حکومت کا گہرا واسطہ ہوتا ہے، بلکہ یوں کہئے کہ عوام ہی اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ حکومت کرتے ہیں اس لئے حکومت کو قدم قدم پر عوام کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کوئی بڑا تعمیری کام تو عوام کے امداد و تعاون کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔

آج پنج سالہ پلانوں کے ذریعہ ملک کے وسائل کو ترقی دے کر قومی دولت میں اضافہ کرنے اور خوش حالی کی منزل تک پہونچنے کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ہر شخص کو اپنے مقدور بھر تن من دھن سے حکومت کا ہاتھ بٹانا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ تعمیری کاموں میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی قدرے بوجھ بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔ مگر روشن مستقبل کی خاطر سب کچھ گوارا کیا جاتا ہے۔ حکومت نے دوسرے پنج سالہ پلان کی تکمیل کا بیڑا اُٹھایا ہے، ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے جو قدم بڑھ چکے ہیں وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتے اور ملک کو خوش حالی کی منزل تک پہونچا کر ہی دم لینا ہے۔

اسی مقصد کے لئے آج حکومت نئے ٹیکس لگانے پر مجبور ہے۔ اگر ہمیں ہندوستان کی ترقی کی خواہش ہے تو ہم سب کو یہ بوجھ اُٹھانا ہی پڑے گا۔ بقول پنڈت نہرو کوئی حکومت عوام پر زیادہ بوجھ ڈال کر خوش نہیں ہو سکتی لیکن حالات نے ہم کو یہ اقدامات کرنے پر مجبور کر دیا ہے تاکہ ہم دوسرے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل کر سکیں!

وزیرِ خزانہ نے ۳-ارب ۷۷ کروڑ ۸۹ لاکھ کے خسارے کا بجٹ پیش کیا ہے۔ ۳۲ کروڑ ۱۲ لاکھ خسارہ آمدنی کے کھاتے کا ہے۔ باقی سرمایہ کے کھاتے کا۔ نئے ٹیکس لگانے سے جو آمدنی ہوگی اس سے خزانے کو ۷۷ کروڑ ۸۰ لاکھ کی آمدنی ہوگی۔ اسی طرح آمدنی کے کھاتے میں ۳۲ کروڑ ۱۲ لاکھ کا جو خسارہ ہے وہ ۴۵ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کی بچت میں تبدیل ہو جائے گا، گویا مجموعہ خسارہ گھٹ کر ۲-ارب ۷۵ کروڑ رہ جائے گا جس کو ٹریزری بلوں میں توسیع کر کے پورا کیا جائے گا۔

اسی کے ساتھ ہی ملک کی ترقی کے لئے دنیا میں اور خاص کر ایشیا میں امن برقرار رہنا بہت ضروری ہے۔ آج ساری دنیا ہائیڈروجن بموں کے دھماکوں سے لرزہ براندام ہے اور جنگ کی تباہی سے بچنا چاہتی ہے۔ ہند شروع سے ہی دنیا کے امن و سلامتی کی حفاظت کے لئے کوشاں رہا ہے۔ اس کی پالیسی صلح جویانہ ہے اور "پنچ شیل" کے آفاقی اصولوں پر چل کر تمام قوموں کے ساتھ رواداری، ہمدردی اور بھائی چارے کے تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے۔ انسانیت کی بقاء کی خاطر وہ ایٹمی اور ہائیڈروجن بموں کے دھماکوں کی مخالفت میں بھی پیش پیش ہے۔ چناں چہ ہندوستانی پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر ایک تجویز منظور کرکے ایٹمی طاقت رکھنے والے ملکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ابھی ہائیڈروجن تجربات کم از کم اس وقت تک بند رکھیں جب تک اُن تجربات کو بالکل ختم کرنے کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو جاتا۔ آج اگرچہ ایٹمی دھماکوں سے دنیا کی فضا مکدّر ہو چکی ہے مگر اس اندھیرے میں بھی امید کی کرن دکھائی دیتی ہے۔ انسانیت کی بقاء کے لئے جو جد و جہد ہو رہی ہے وہ بارآور ہو کر رہے گی، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی ذہن اور اس کا طرزِ فکر ہی بدل جائے اور انسان فوجی قوت کے بجائے انسانی ہمدردی آزادی اور تعاون پر بھروسہ کرنے لگے۔ اسی راہ پر چل کر انسانیت مکمل تباہی سے بچ سکتی ہے۔

پچھلے دنوں جاپان کے وزیرِ اعظم مسٹر کیشی حکومت ہند کی دعوت پر دہلی تشریف لائے۔ جس جوش و خروش کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کیا گیا، وہ ہندوستان اور جاپان کے مابین دوستانہ تعلقات کا مظاہرہ تھا۔ دونوں ملکوں کے عوام جمہوریت اور آزادی کے بارے میں ہم خیال ہیں اور قیامِ امن کے لئے ان میں اشتراکِ عمل پایا جاتا ہے۔ جاپان ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے دوچار ہو چکا ہے اس لئے جاپانی عوام بھی ہائیڈروجن دھماکوں کو بند کرانے کے لئے آواز بلند کر رہے ہیں۔ جاپان کے وزیرِ اعظم کی آمد سے نہ صرف امنِ عالم کے بارے میں دونوں ملکوں کی ذہنی مطابقت کی توثیق ہوئی ہے بلکہ کلچرل اور معاشی معاملات میں اشتراکِ عمل کو تقویت پہونچی ہے۔ ہند و جاپان کے وزرائے اعظم نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں بڑی طاقتوں سے ایٹمی اور ہائیڈروجن بموں کے تجربات کو فوری طور پر بند کرنے کی اپیل کی اور یہ امید ظاہر کی کہ بڑی طاقتوں میں ان تجربات کے بند کرنے اور ایٹمی اسلحہ پر پابندی لگانے کے بارے میں سمجھوتہ ہو جائے گا۔

جاپان کے وزیرِ اعظم نے ہندوستان کے پنج سالہ منصوبے کی پوری امداد کرنے کا وعدہ کیا اور اسی کے ساتھ انھوں نے پہلے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل پر مسرت کا اظہار کیا۔

علمی دنیا میں یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سنی گئی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو بہار کا گورنر مقرر کیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کی ذات ایک مصنف، مفکر، معلم، ماہرِ تعلیم اور مدبّر کی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ذاکر صاحب ملک و قوم کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ترکِ موالات کے زمانے میں جب جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑی تو ذاکر صاحب یہاں آ گئے اور ۱۹۴۸ء تک اس ادارے کی خونِ دل سے آبیاری کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک نازک دور میں علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمہ داری سنبھالی۔ تقریباً آٹھ سال تک علی گڑھ یونیورسٹی کی ذہنی و انتظامی قیادت کی۔ ملک کے علمی، تعلیمی، لسانی اور تہذیبی مسائل حل کرنے میں ذاکر صاحب نے ہر حیثیت سے گراں قدر حصہ لیا۔ آپ ہی کی قیادت میں وردھا میں بنیادی تعلیم کی اسکیم تیار کی گئی، راجیہ سبھا، ساہتیہ اکادمی، انٹر یونیورسٹی بورڈ، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، مرکزی تعلیم مشاورتی کونسل، مرکزی ثانوی تعلیمی بورڈ، یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن اور دیگر اہم مجلسوں سے آپ کا کسی نہ کسی حیثیت میں تعلق رہا اور آپ نے اُن کا کام بڑی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ آپ یونیسکو کی انتظامی کمیٹی میں ہندوستان کے نمائندے ہیں اور ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

راز یزدانی

اصلاحِ زبانِ اُردو

اور

مصاحب منزل رام پور

نواب کلب علی خاں بہادر ۱۸۶۵ء سے ۱۸۸۷ء تک رام پور کے حکمران رہے۔ صبح سویرے ریاست کا کام کیا کرتے تھے اور سہ پہر کو اہلِ علم کی مجلس ہوتی تھی۔ جو علماء اور شعراء اس مجلس میں باریاب ہوا کرتے تھے ان کے لئے یہ ہدایت تھی کہ وہ روزانہ سہ پہر کو قلعہ معلّیٰ کی ایک مخصوص عمارت میں جمع ہو جایا کریں۔ یہ عمارت نوّاب حامد علی خاں بہادر کے زمانے میں ترمیم اور جدید تعمیر کے بعد "رنگ محل" کہلائی اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔ مگر نواب کلب علی خاں بہادر کے عہدِ دولت میں مصاحبوں کے جمع ہونے کی مناسبت سے "مصاحب منزل" کہلاتی تھی۔

باریاب ہونے والے علماء اور شعراء روزانہ مصاحب منزل میں جمع ہو جاتے اور جس جس کو نواب کلب علی خاں بہادر ہرکاروں کے ذریعے بُلاتے جاتے اور وہ حاضرِ دربار ہوتا جاتا۔ اسی مصاحب منزل کو ہسٹری آف اردو لٹریچر کے ترجمے صفحہ ۴۱۳ پر ان الفاظ میں تبلایا گیا ہے کہ:

"مقرب لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مکان مخصوص تھا جو مصاحب منزل کے نام سے مشہور تھا۔"

خم خانۂ جاوید۔ جلد اول صفحہ ۳۲۴ پر بھی نواب کلب علی خاں بہادر کے تذکرے میں مصاحب منزل کا ذکر موجود ہے اور سوانح عمری امیر مصنفہ ممتاز علی آہ کے صفحہ ۲۳۴ پر بھی مصاحب منزل کا ذکر ہے۔

سہ پہر کو نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں کیا ہوتا تھا اس کی تفصیل بھی تاریخ ادبِ اُردو سے معلوم ہوتی ہے:

"الفاظ کی صحت اور عدم صحت کے مناظرے آپ کے (نواب کلب علی خاں بہادر کے) سامنے آکر ہوتے تھے جن میں تحر، تسلیم، جلال، امیر اور منیر جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے، حصّہ لیتے تھے (صفحہ ۲۱۴)"

یہ تاریخ ادبِ اردو کے مصنف کی رائے ہے۔ معلوم نہیں کہ رام بابو سکسینہ نے اس موقع پر داغ کا نام کیوں نہیں لیا۔ حالانکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ داغ جلال وغیرہ سے زیادہ باریاب تھے۔ احسن مارہروی نے داغ کی سوانح عمری "جلوۂ داغ" میں داغ کے لطائف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں ایک دن "سانس" کی تذکیر و تانیث پر بحث ہو رہی تھی۔ ہر فریق اپنی اپنی دلیلیں پیش کر رہا تھا مگر داغ چپ بیٹھے تھے آخر کسی نے داغ سے کہا کہ آپ بھی کچھ کہیئے۔ داغ نے جواب دیا کہ جب سب کہہ چکیں گے تو میں "حرفِ آخر" کہوں گا۔ سب نے کہا کہ آپ حرفِ آخر ہی کہیئے۔ داغ بولے کہ مرد کا سانس ہو تو مذکر اور عورت کی سانس ہو تو مؤنث۔ اس لطیفے سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ اصلاحِ زبان کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے اور برابر کا حصہ ہی نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی حیثیت حاکمانہ تھی۔ بہرحال یہ طے ہے کہ نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں الفاظ کی تحقیق اور زبان کی اصلاح کا سلسلہ جاری تھا۔

قاعدہ ہے کہ کسی مخصوص سوسائٹی میں کوئی خاص بحث چھڑ جائے اور وہ بحث غیر مختتم ہو تو جب اور جہاں اس سوسائٹی کے کچھ افراد جمع ہوتے ہیں

اسی ہیمت پر گفتگو ہوتی ہے۔ دربار کی حاضری سے پہلے مصاحب منزل ان لوگوں کے روزانہ جمع ہونے کی جگہ تھی لہٰذا مصاحب منزل میں بھی اس قسم کے مباحث روزانہ پیش آتے رہتے تھے۔

مصاحب منزل اور نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں زبان کی ترمیم اور اصلاح کے لئے جو کوششیں ہوئیں ان کی ایک فہرست رضا لائبریری میں محفوظ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(الف) آن اور آن کے (آکے) اور آنے کے نہیں (یعنی نہیں آئیں گے) اور اس کی تمام امثال متروک قرار دی گئیں۔

آئیو اور جائیو اور اسی قسم کے تمام افعال متروک قرار دئے گئے۔

آوے اور جاوے اور اسی قسم کے تمام افعال متروک قرار دئے گئے۔

'الف' کا لفظ کے آخر میں گرانا (اردو کے الفاظ میں) نواب کلب علی خاں بہادر اور منیر کے نزدیک ترک کرنے کے قابل قرار دیا گیا اور عربی فارسی الفاظ کے آخر میں الف کا گرانا متفقہ طور پر متروک ہوا۔

اُٹھا (بغیر تشدید کے) اور اُٹّھا (تشدید کے ساتھ) اسی طرح لکھا اور لکّھا رکھا اور رکّھا اور اسی قبیل کے الفاظ دونوں صورتوں میں جائز۔

الف ندا ساقیا وغیرہ میں ناجائز

انکھڑیاں آنکھوں کے معنے میں متروک ہوا

اور کوہ کرنے بمعنی 'رُخ' متروک سمجھا اور بمعنی 'فارغ' جائز۔ جلال نے دونوں صورتوں میں جائز قرار دیا۔

انھوں کا استعمال۔ کو، کی، کا، سے، کے ساتھ متروک اور "نے" کے ساتھ اختیاری یعنی انھوں کو۔ انھوں کی وغیرہ متروک اور 'انھوں نے' اختیاری 'اخفائے نون' ایسے الفاظ میں بغیر اضافت کے نہیں چاہئے جو نون کے اعلان کے ساتھ زبانوں پر آتے ہیں۔ مثلاً جان، آسمان، قرآن، گریبان، زمین، مکین اور یقین وغیرہ لیکن اذاں اور افشاں وغیرہ میں اعلانِ نون ناجائز۔

ابدال یعنی ہمسایہ وغیرہ کا قافیہ دریا اور صحرا وغیرہ سے جائز

اوپر (پر کے معنے میں) قابلِ ترک بلکہ ناجائز

اس سوا (اس کے سوا کے معنے میں) متروک

اس طرح سے۔ کس طرح سے۔ جس طرح سے اور اسی قسم کے الفاظ میں "سے" متروک۔ اس طرح۔ کس طرح۔ جس طرح وغیرہ بغیر "سے" کے ہونا چاہیئے۔

اہل کا استعمال اور اطلاق مفرد پر مثلاً 'خدا بخش اہلِ مقدور ہے' متروک قرار دیا گیا۔ اس کی جگہ یوں بولنا چاہیئے کہ 'خدا بخش اہلِ مقدور' میں سے ہے۔ یعنی اہل کا اطلاق ایک گروہ اور ایک جماعت پر ہونا چاہیئے۔

اجابت۔ بمعنے قبول متروک قرار دیا گیا اور اس کی جگہ قبول درست قرار دیا گیا۔

اینڈیں ہیں آئیں ہیں۔ اینڈتے ہیں اور آتے ہیں اور اس قسم کے تمام افعال متروک قرار دئے گئے۔

اُدھچکے۔ چھاتیوں کے معنی میں متروک

اِن دنوں۔ آج کل کے معنے میں متروک۔

آوے گی یا آویں گے اور اس قسم کے تمام افعال متروک قرار دئے گئے۔

اُن نے۔ اس نے کے معنے میں متروک۔

آوتے اور اس قسم کے تمام افعال متروک

اس نے سمجھا۔ وہ سمجھا کے معنی میں اور اس کی تمام امثال متروک

اس پاس۔ مجھ پاس۔ تم پاس وغیرہ سب متروک

اجیالا متروک اوجالا صحیح

ارقام کی جگہ رقم لکھنا چاہیئے کیوں کہ ارقام کے معنے لکھنا کتبِ عربیہ میں کہیں نہیں۔

(ب) بسمل۔ ذبح کے معنی میں متروک قرار دیا گیا۔

بل بے۔ بل بے کے معنے میں متروک

بھانا۔ خوش آنا کے معنے میں اپنے تمام مشتقات کے ساتھ جلال نے متروک سمجھا اور دوں نے اسے تسلیم نہیں کیا۔

بتلانا اور اس قسم کے تمام افعال یعنی مصدر میں خواہ مخواہ "ل" زائد مثلاً سکھلانا بجائے سکھانا وغیرہ متروک قرار دئے گئے۔ لیکن جلال نے انھیں متروک نہیں سمجھا۔ (فی زمانہ اس قسم کے سب مصادر متروک ہی سمجھے جاتے ہیں۔ راقم)

بچھا۔ تشدید کے ساتھ اور بغیر تشدید کے دونوں صورتوں میں جائز

بال پن۔ بچپن کے معنے میں متروک قرار دیا گیا۔

بجارا۔ بے چارہ کی جگہ متروک

بے تاخی اور بے فضول جیسے الفاظ متروک

پرسش۔ غیر فصیح قرار دیا گیا۔ مثلاً تیری تو پرسش تیغ ستم کو گیا کھٹے۔ غیر فصیح

بات کرنی۔ جان دینی۔ راہ چلنی وغیرہ متروک۔ ان کی جگہ بات کرنا۔

جان دینا وغیرہ صحیح کیوں کہ اردو میں علامت مصدر "نا" ہے "نی"

نہیں ہے۔

پاہمدگر غلط اور متروک قرار دیا گیا۔

(پ) پہ۔ بجائے پر۔ خلاف فصاحت قرار دیا گیا لیکن جلال اور امیر استعمال

کرتے رہے۔ البتہ پرہ کو مگر کے معنی میں سب نے متروک مانا

پر۔ لیکن کے معنی میں متفقہ طور پر متروک۔ اسی طرح "دے" اور "پیک"

بھی۔

پینچے ہے اور اس کے تمام مشتقات متروک

پہسے اس طرف کے معنی میں متروک

پیار اور پیاس میں "ی" کا اظہار متروک۔

پنہانا غلط قرار دیا گیا پہنانا صحیح قرار پایا۔

پرستاں اخفائے نون کے ساتھ متروک

پاؤں۔ فعلن کے وزن پر متروک اور فاع کے وزن پر جائز

(ت) تب۔ متروک قرار دیا گیا۔

تئیں۔ متروک قرار دیا گیا۔

تلک۔ متروک قرار دیا گیا

تم ہی۔ تمہیں کی جگہ متروک قرار دیا گیا۔

تم سوا۔ متروک۔ تمہارے سوا جائز

تہاں۔ متروک

تجھ ودپر۔ متروک اس کی جگہ تیرے در پر

تس پر۔ متروک

تاکہ۔ جبکہ۔ جوکہ۔ بکاشش کہ وغیرہ اس قسم کے الفاظ میں "کہ" زائد

اور متروک۔

تڑپن کی جگہ تڑپ

تمہاری قسم اور ہماری قسم اور اسی قسم کے الفاظ کو تمہاری جان کی قسم۔

ہمارے سر کی قسم کی طرح استعمال کرنا چاہیئے۔

تمہاری خاطر۔ میری خاطر وغیرہ کی جگہ تمہارے واسطے ہمارے واسطے ہونا چاہیئے۔

تابعدار محکوم کے معنی میں غلط فقط تابع ہونا چاہیئے۔

تلاوش متروک۔ تلاش صحیح

(ٹ) ٹک۔ متروک

(ج) جانانہ اور جاناں کا استعمال بغیر مضاف الیہ کے متروک

جمع مخاطب پر۔ اے۔ او وغیرہ متروک مثلاً اے دوستاں یا او دوستان

جوں یعنے مانند متروک

جبر۔ شمر۔ صبر۔ بسکون دوئم صحیح اور بہ تحریک دوئم غلط جیسے

محب حسین کا سا دل رکھے شمر کا سا۔ یا

اک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے

جلسہ کو عربی سمجھنا غلط قرار دیا گیا

جاگیر کو فارسی سمجھنا غلط قرار دیا گیا

جنات۔ جن کی جمع غلط قرار دی گئی۔

جتے متروک جتنے کہنا چاہیئے۔

جیو جائے تھا اور اس قسم کے افعال مع مشتقات کے متروک

جا۔ جگہ کے معنے میں مختلف فیہ

جز۔ یعنے پارۂ شئے بغیر واؤ کے غیر فصیح

جیدہر۔ کیدہر۔ ایدہر وغیرہ (ی) کے ساتھ غلط۔ جدھر۔ کدھر۔ ادھر

وغیرہ صحیح۔

(چ) چکھا بغیر تشدید کے یعنی چکھا غلط

چھاتیوں کا استعمال پستان کے معنی میں غیر فصیح۔

چاہے ہے، جانے ہے، جھکے ہے وغیرہ اس قسم کے افعال سب متروک

چاہتا ہے۔ جانتا ہے وغیرہ لکھنا چاہیئے۔

چُغنا۔ تخفیف دوئم کے ساتھ طمانچہ کے معنے میں متروک

چوب دار کو فارسی سمجھنا غلط قرار دیا گیا۔

(ح) حور۔ جلال نے تجویز کیا کہ حور چونکہ عربی میں جمع کا صیغہ ہے اس لئے

حور کی جگہ عربی کا واحد حوراء استعمال کیا جائے لیکن متفقہ طور پر طے

نہیں ہوا اور اردو میں حور واحد سمجھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ "حور جمال"

اور "رشکِ حور" وغیرہ بھی صیغۂ واحد میں صحیح مانے گئے۔ مثلاً یہ کہنا کہ تو رشکِ حور ہے صحیح ہے۔ اردو میں حور کی جمع حوروں یا حوریں کو تسلیم کیا گیا۔

(خ) خطاب حرفِ ندا کے بغیر غیر فصیح

خون۔ مفرد اعلانِ نون کے ساتھ فصیح

خمر۔ بسکونِ حرفِ دوئم صحیح اور بفتح حرفِ دوئم یعنی خَمَر غلط

(د) دہر جہان اور دنیا کے معنے میں غیر فصیح

دلدار اور یار پر حرف "اس" یا "وہ" کا زیادہ کرنا متروک مثلاً "وہ یار" یا "اس دلدار" وغیرہ متروک

دیکھو۔ لیجیو وغیرہ (ی) کے ساتھ متروک۔ لیجو۔ دیکھو صحیح

دیکھے تھا وغیرہ متروک

دمادم رزنا متروک

دھرنا۔ رکھنا کے معنے میں متروک

"ذرا" ذال کے ساتھ کو۔ متروک

ذری بالکل متروک

(ر) رنجور۔ بیمار کے معنے میں غلط۔ رنجیدہ کے معنے میں صحیح

(س) سارا حرفِ شئے واحد کے لئے۔ جمع کے لئے سب

سجھوں۔ متروک

سدا۔ ہمیشہ کے معنے میں متروک

سو۔ متروک

سیکھے ہے۔ متروک

سمجھو۔ متروک

(ش) شتر کو کر وغیرہ کا قافیہ نہیں لانا چاہیئے۔

شامیانہ کو فارسی سمجھنا غلط ہے۔

(ص) صندقہ۔ صحیح ہے۔ اگر "دال" ساکن ہوگی تو اردو سمجھا جائے گا۔ ترکیب میں غلط ہوگا۔

صفائی کو عربی یا فارسی سمجھنا غلط ہے یعنی "جاروبِ صفائی" غلط

صف۔ بوریا۔ فرش یا قالین کے معنے میں فارسی سمجھنا غلط ہے۔

(ط) طیار۔ اڑنے والا کے معنے میں صحیح۔ فربہ کے معنے میں غلط

طرح دار کو۔ وضع دار کے معنے میں فارسی جاننا غلط۔ یعنی یار یہ طرح دار کہنا غلط۔

(ع) عطار۔ حرف عطر بیچنے والے کے معنے میں صحیح۔ دوا فروش کے معنے میں عربی نہیں سمجھنا چاہیئے غلط ہے۔

عرصہ۔ روزگار کے معنے میں فارسی عربی جاننا غلط ہے

(غ) غشی۔ بفتح اوّل وکسر دوئم غلط۔ بفتح اوّل وسکون دوئم صحیح۔

(ف) فضا یعنے زمینِ فراخ متروک

فی الواقعی غلط۔ فی الواقع ہونا چاہیئے

(ق) قلانچیں مارنا متروک۔ قلانچ مارنا صحیح اور اسی قسم کے مرکب افعال میں پہلا لفظ مفرد ہونا چاہیئے۔ جیسے ڈینگیں مارنا کی جگہ ڈینگ مارنا۔

قُرَن حرفِ دوئم متحرک غلط ہے۔ حرف دوئم ساکن صحیح ہے یعنی قَرْن

(ک) کنگنا بہ تشدید متروک صرف کنگنا صحیح۔

کون شکل۔ کون صورت۔ کون تدبیر وغیرہ سب متروک۔ ان کی "کون" کے بعد "سی" لانا ضروری مثلاً کون سی شکل وغیرہ

کہلانا اور اس قسم کے تمام مشتقات میں لام کا لانا ضروری قرار دیا گیا۔

کرے ہے، کہے ہے اور اس قسم کے تمام افعال اور اس کے تمام مشتقات متروک۔

کبھو۔ کسو متروک

کمائی۔ کمی کے معنے میں متروک

کوائف۔ کیفیت کی جمع کے طور پر غلط قرار دیا گیا۔

کسر۔ نقصان کے معنے میں جگر کا قافیہ نہیں ہے۔ نصر کا قافیہ ہے مگر بلا ترکیب جائز ہے۔

(گ) گر بجائے اگر جہاں تک ہو سکے اس سے بچنا چاہیئے۔

گلشن۔ گلزار اور چمن کے معنی میں قابلِ ترک قرار دیا گیا (۹ راز)

گرسنہ میں حرف سوئم پر سکون غلط بلکہ (س) پہ زبر ہونا چاہیئے

گرچہ۔ بجائے اگرچہ غیر فصیح ہے

ل لہو کا واو گرانا غلط قرار دیا گیا۔

لکھوٹا۔ پان کی سُرخی کے معنے میں غلط قرار دیا گیا۔

لمسانا۔ بہکانا کے معنے میں متروک۔

فعل - نام میں لکھنا غلط ہے جیسے سند رفعل غلط سند رلال چاہیئے -

لیق - صاحب لیاقت کے معنی میں غلط قرار دیا گیا - لائق ہونا چاہیئے - اسی طرح عقیل صاحب عقل کے معنے میں غلط قرار دیا گیا - عاقل ہونا چاہیئے -

(م) میں بی - نہیں کی جگہ استعمال نہیں کرنا چاہیئے -

موا - موی - سب متروک

مت - نفی کے لون کے معنی میں متروک

مطبیب کی جگہ طبیب ہونا چاہیئے -

منت - خوشامد کے معنے میں عربی فارسی نہیں - اسے اس معنے میں دوسرے لفظوں سے مرکب کرنا غلط ہے -

متلاشی - "تلاش کرنے والے (جوئیندہ) کے معنی میں غلط صرف تلاشی چاہیئے -

مشکور - شکر گزار کے معنے میں متروک

مہربانگی - مہربانی کے معنے میں متروک

(ن) حرف نفی فعل کے بعد نہیں لانا چاہیئے - جیسے کرونا - دیکھونا وغیرہ

نگر - شہر اور بستی کے معنے میں متروک

نکلا جائے ہے اور اسی قسم کے افعال متروک

نقاہت - کم زوری اور ناتوانی کے معنے میں عربی فارسی نہیں جاننا چاہیئے -

نشأۃ یا نشا بغیر ہمزہ کے غلط

(و) واں متروک

وصلت ترک

وے - جیسے آوے جاوے متروک

(ہ) ہم ہی متروک - ہمیں صحیح

ہے - مصرعہ کے آغاز میں لانے سے پرہیز لازم

ہوویں وغیرہ متروک

ہم خواب میں دیکھا - ایسے جملوں میں علامت فاعل کا حذف کرنا متروک "نے" ضرور ہونا چاہیئے -

ہوچی متروک ہوچکے صحیح

ہر کہیں غیر فصیح - ہر جگہ بہتر ہے

(ی) یاں متروک

یہ ہی متروک - یہی ہونا چاہیئے

یگانگت - قربت کے معنے میں متروک - یگانگی ہونا چاہیئے -

"تی" کا عربی فارسی الفاظ میں گرانا متروک -

رضا لائبریری میں ان متروکات کی قلمی فہرست کے علاوہ اس بات کا ایک دوسرا ثبوت کہ زبان کی یہ اصلاحیں رام پور کے اندر ہوئیں - یہ بھی ہے کہ نواب کلب علی خاں بہادر کے مطبوعہ دیوان کے "خاتمۃ الطبع"[۱] میں آغا غنی منیر ملیح نے ان متروکات میں سے بعض کا ذکر کیا ہے - چناں چہ وہ لکھتے ہیں :-

"ہاں یہ امر البتہ غور کے قابل ہے کہ مجھ ناداں نے اس شاعری کو اعجاز و کرامت کیوں تصور کیا - سنو - انصاف دوستو - ہر کسب و کمال کے لئے آزادی اگر واجب نہیں تو کالواجب ضرور ہے - خصوصاً فن شعر سا دشتی کہ ذرا سی لغزش میں اپنے مسلک پرستاروں کا آشنا نہیں رہتا - چہ جائے کہ سیکڑوں قیود سے مسلسل (بندھا ہوا) ہو کر آزادی سے زیادہ ترزام ہو - یہ اعجاز و کرامت نہیں تو کیا ہے - آن کر (آکر کے معنے میں) آن کے (آکے) آبرو - منادی بالف - انکھڑیاں - لفظ اور باشمام واو - اخفائے حرف نون بلا اضافت - اس سوا - اس طرح سے - لفظ اہل نسبت واحد - یل ہے - دکھلانا - بتلانا - پہ - تلک - دیجیو - دیجئے - کیجئے - سارا - حالت انفراد کے وا - کون بوزن لون - غیر ذی روح کی نسبت - موا - موی - شمشیر بیائے معروف - سر بفتح اول بلا ترکیب - واں - یاں اسمائے اشارہ - عربی و فارسی کے حرف آخر کا تقطیع سے اسقاط - اور اکثر اس سے زیادہ متروکات کے لازم کرنے پر نہ کہیں سے بندش سست .... (الخ)

یہ دیوان دستنبوئے خاقانی ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوا - یہ نواب کلب علی خاں بہادر کا دوسرا دیوان تھا - چوتھا دیوان "توقیع سخن" ہے جو ۱۲۹۶ھ میں اسی مطبع میں چھپا ہے - اس پر بھی منیر ملیح یعنی آغا غنی کا خاتمۃ الطبع ہے - اس کے صفحہ ۹۲ پر نواب کلب علی خاں بہادر کے اختیار کئے ہوئے دوسرے متروکات کے ساتھ یہ

---

[۱] خاتمۃ الطبع دیوان دوم نواب کلب علی خاں بہادر مطبوعہ تاج المطابع (مطبع سرکاری) رام پور صفحہ ۲۴۲ نام دیوان "دستنبوئے خاقانی"

اضافہ ہے کہ :-

الفِ آخر اردو کے لفظوں کا بھی ساقط نہیں ہو سکتا

ان متروکات کے رام پور میں جائز قرار دئے جانے کا ایک تیسرا ثبوت امیر مینائی کی تصنیف "انتخابِ یادگار" سے ملتا ہے۔ یہ کتاب دو طبقات پر تقسیم کی گئی ہے۔ طبقۂ اوّل میں ابتدائے ریاست سے نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد تک ہر والیٔ ریاست کے حالات تحریر کئے گئے ہیں اور دوسرے طبقے میں کتاب کے سنِ ترتیب ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء تک رام پور کے شعراء اور دربار کے متوسلین شعراء کے حالات لکھے گئے ہیں۔ انتخاب یادگار کے طبقۂ اوّل صفحہ ۴۰ پر نواب کلب علی خاں بہادر کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے متذکرہ بالا متروکات میں سے بعض کو گنا کر کہا گیا ہے کہ :-

ان قیدوں پر بے شک کلام ہے۔ یہ حضور ہی کا کام ہے

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ متروکات کی طویل فہرست کے منجملہ وہ متروکات جن کا دیوان اور انتخاب یادگار میں ذکر ہے نواب کلب علی خاں بہادر کے تجویز کردہ ہیں۔

یہ اس کام کا ایک خاکہ ہے جو مصاحب منزل رام پور اور نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں بیٹھنے والے شاعروں نے رام پور میں زبانِ اردو کی اصلاح کے لئے متفقہ طور پر کیا۔ اس فہرست کے ساتھ اگر ہم داغؔ کے اس ہدایت نامے کو ملالیں جو انھوں نے اپنے شاگردوں کے لئے نظم کیا ہے تو یہ فہرست مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ ہدایت نامہ یہ ہے :

چست بندش ہو نہ ہو سستی یہی خوبی ہے   وہ فصاحت سے گرا، شعر میں جو حرف دبا
عربی، فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں   حرفِ علت کا برا ان میں ہے گرنا۔ دبنا
الفِ وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں   لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے روا
جس میں جھول نہ ہو تھوڑی سی حشو ہے وہی   وہ کنایہ ہے جو تصریح سے بھی ہو اولیٰ
گرچہ تعقید بُری ہے مگر اچھی ہے کہیں   جو ہو بندش میں مناسب تو نہیں عیب ذرا
شعر میں حشو و زوائد بھی بُرے ہوتے ہیں   ایسی بھرتی کو سمجھتے نہیں شاعر اچھا
گر کسی شعر میں ایطائے جلی آتا ہے   وہ بڑا عیب ہے کہتے ہیں اُسے بے معنیٰ
استعارہ جو مزے کا ہو مزے کی تشبیہ   اس میں اک لطف ہے اس کہنے کا پھر کیا کہنا
اصطلاح اچھی مثل اچھی ہو بندش اچھی   روزمرّہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا
ہے اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو   ایک مصرعہ میں جو ہو چار جگہ بلکہ سوا
علت کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے   وہ بھی آئے متوالی تو نہایت ہے برا
لف و نشر آئے مرتب وہ بہت اچھا ہے   اور ہو غیر مرتب تو نہیں کچھ بے جا
شعر میں آئے جو ایہام کسی موقع پر   کیفیت اس میں بھی ہے وہ بھی نہایت اچھا
جو نہ مرغوبِ طبیعت ہو بُری ہے وہ ردیف   شعر بے لطف ہے۔ گر قافیہ ہو بے ڈھنگا
ایک مصرعہ میں ہو تو اور دگر مصرعے میں تم   یہ شتر گربہ ہے کہا میں نے اسے ترک کیا

اس قطعہ سے جو اصول استخراج ہوتے ہیں ان میں بہت سے [illegible] ہیں جو پہلے سے رائج پائے ہوئے تھے اور کچھ ایک نئے بھی ہیں۔ مثلاً "تعقید اور شتر گربہ" وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ داغ کا پندنامہ بجائے خود مبہم ہے اور ابہام یہ ہے کہ اس میں تشبیہ، استعارہ اور کنایہ وغیرہ کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن ان کی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ اور اس ابہام کی وجہ یہ ہے کہ یہ پندنامہ مبتدیوں کے لئے نہیں کہا گیا ہے بلکہ منتہیوں کے لئے کہا گیا ہے جن سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ ان تمام اصطلاحوں کی تعریف سے واقف ہوں گے اور انھیں بخوبی جانتے ہوں گے۔ لیکن داغ کا یہ کہنا کہ :-

یہ شتر گربہ ہوا۔ میں نے اسے ترک کیا

اور اس مصرعہ میں یہ الفاظ کہ۔ میں نے اسے ترک کیا۔ غیر مدعیانہ ہیں۔ کیونکہ نئی اصلاحیں (جن میں شتر گربہ بھی شامل ہے) رام پور کا کارنامہ ہیں اور مصاحب منزل اور نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار سے سندِ قبول پاکے باہر نکلے تو نظام ہوں کہ رسا، امیر ہوں کہ اسیر، مضطر ہوں کہ جلال، حیا ہوں کہ داغ کون نواب کلب علی خاں بہادر کے منظور کئے ہوئے متروکات اور اُن کی جائز قرار دی ہوئی اصلاحِ زبان کو نظر انداز کر سکتا تھا یا ان کے خلاف قدم اٹھا سکتا تھا۔ کس میں ہمت تھی کہ نواب سے وظیفہ بھی پاتا اور ان قواعد پر عمل بھی نہیں کرتا۔ بلکہ ان حالات میں اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تعمیلِ حکم میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر کے مقابلتاً التفات کا مستحق بننا چاہتا ہے یہی رام پور میں ہوا ہوگا۔ بات استادوں کے حلقے سے نکل کر شاگردوں تک پہنچی ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ یعنی متاخرین کے دَورِ آخر میں (جو داغ اور امیر و جلال وغیرہ کے تلامذہ پر مشتمل ہے) شاعروں کا کلام ان تمام عیوب سے پاک ہو گیا۔ لیکن -

" ہندوستان کی دُنیائے ادب کو یہ بات آج شاید پہلی بار معلوم ہو رہی ہے کہ متاخرین کے دَور میں اردو ادب جن

اصطلاحوں اور ترمیموں کو اپنے سینے سے لگائے نظر آتا ہے وہ درحقیقت رام پور کا کارنامہ ہے اور اردو ادب کو مصاحب منزل اور نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار کی بخشی ہوئی متاعِ عزیز ہے۔"

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کے بعد اردو زبان کی اصلاح کے لئے کوئی مرکزی کوشش آج تک نہیں ہوئی۔ گو حیدرآباد میں ترجمہ اور وضعِ اصطلاحات کا کام تھا۔ اور اس میں بھی زبان کو علوم و فنون کی اصطلاحوں کے سینکڑوں نئے نام دیئے گئے لیکن زبان کے قواعد، متروکات کی حدبندی اور محاوروں میں اضافے کا کام۔ یہی آخری کام تھا جو مصاحب منزل رام پور میں ہوا اور ہم آج تک اسی پر کاربند ہیں۔

اب آپ اسے دہلی کی زبان کہہ لیں یا لکھنؤ کی۔ کسی محاورے کے لئے داغ کے کلام سے سند لائیں یا امیر کے کلام سے۔ یہ تمام سندیں آپ کو بالواسطہ مصاحب منزل رام پور سے جاری کی ہوئی سندوں کے حاصل کرنے والوں سے ملیں گی۔

ہمارا جنگِ آزادی نمبر

آج کل اگست ۱۹۵۷ء کے خاص نمبر میں جنگِ آزادی کے شہیدوں اور ان کی جدوجہد کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا

اس خاص نمبر میں حسبِ ذیل موضوعات پر مضامین، ڈرامے، افسانے اور نظمیں ہوں گی

۱۔ ۱۸۵۷ء اور جنگِ آزادی سے متعلق ادب

۲۔ پچھلی صدی میں جذبۂ قومیت کو فروغ دینے والی سماجی، سیاسی، تاریخی، اقتصادی اور ادبی تحریکیں

۳۔ ہند کی علاقائی زبانوں میں آزادی کا ادب۔

چند مضمون نگار

پروفیسر محمد مجیب — قاضی عبدالودود — عبدالماجد دریابادی — ڈاکٹر محمد حسن — فراق گورکھپوری

نصیر الدین ہاشمی — ہارون خاں شروانی — آغا حیدر حسن مرزا — شیخ تصدق حسین — شمیم کرہانی — وغیرہ

یہ نمبر ۱۲۰ صفحات پر مشتمل اور نادر تصویروں اور سہ رنگے سرورق سے مزین ہوگا

قیمت ایک روپیہ

تجارتی امور کے لئے بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸ سے خط و کتابت کیجئے

جمیل مظہری

دو غزلیں

تیرے آنسو تیرے شاعر کی تمنّا نہ بنے
آ کے پلکوں پہ بھی شبنم ہوئے شعلہ نہ بنے

ان ستاروں کی اُجالے میں ضرورت کیا ہے
جو اندھیرے میں چراغِ رہِ فردا نہ بنے

یہ وہ قطرے ہیں جو دریا میں ہیں دریا سے الگ
یہ وہ قطرے ہیں جو دریا میں بھی دریا نہ بنے

یہ نظر اب تو خریدار اسی کی ہوگی
جو تجلّی کر تجلّی رہے پردا نہ بنے

اب جہاں بھی رہیں مٹ جائیں گے یہ داغِ سیاہ
ان کی شامت تھی کہ خالِ رُخِ لیلا نہ بنے

تم تو صحرا میں بھی ہوتے رہے قربانِ سراب
ہم تو موجوں کے بھی عاشق لبِ دریا نہ بنے

مظہریؔ وہ نفسِ سرد ہے موسم بے مذاق
اٹھ کے سینے سے جو طوفان کا جھونکا نہ بنے

شبِ فراق ہے کیسا ایک آنے والی رات
ہمارے عالمِ جذبات کی خیالی رات

بُنا کرے جو شعاعوں کے جال تیرے لئے
کہاں سے لاؤں تصوّر کی وہ جمالی رات

سوال یہ ہے کہ اب اور جا بنتی کیا ہے
میرے اندھیرے دنوں سے تیری اُجالی رات

درازیِ بنتِ شبستاں کی زُلف کا سایہ
کسی نے دن کے اُجالے میں بھی بُلالی رات

وہ بہکے بہکے خیالوں کا ابر دل پہ مرے
وہ اُودی اُودی گھٹائیں وہ کالی کالی رات

وہ اپنے دل کی سیاہی نہ چاند پہ تھوپیں
جنھیں پسند نہیں ہے یہاں اُجالی رات

اسی جہاں میں میسّر چراغ بھی ہیں جمیلؔ
ہوئی ہے میری سیہ بختیوں سے کالی رات

سید وصی احمد فانی بلگرامی

والیٔ بنگالہ سراج الدولہ

"تعارف :- سید وصی احمد فانی بلگرامی " ملک خطا کے شہزادے " کے مصنف کی حیثیت سے ملک ادب کے شہزادوں کی صف میں اپنی جگہ ایک عرصہ ہوا پیدا کر چکے ہیں۔ نگار اور دوسرے معیاری جرائد نے فانی کو محتاجِ تعارف نہیں رکھا ہے۔ موصوف ایک اچھوتے اسلوب اور ایک تحقیقی اور فنی طرزِ فکر ہی کے مالک نہیں بلکہ اردو ادب کو وہ چاشنی عطا کرتے ہیں جو عجیب موسیقیت اور رنگینی کی نغمگی رکھتی ہے۔ آپ کی تخلیقی قصص نے تاریخ کی تلخ حقیقتوں کو بھی آتنا دل چسپ اور دلآویز بنا دیا ہے کہ جی چاہتا ہے جی بھر کے پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے"۔

آپ کے قلم میں گہرائی اور گیرائی شاید اس وجہ سے بھی آگئی ہے کہ مقدمات کا فیصلہ کرنے والا کلکٹر پہلے ملزم کے بیانات سنتا ہے گواہی شہادت کراتا ہے، بحث اور مباحثہ کراتا ہے۔ اس کے بعد شواہد کے پیشِ نظر فیصلہ کرتا ہے۔ آپ بھی چونکہ اس عہدے پر فائض تھے، اس لئے آج کی صحبت میں، ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۵۳ھ کے دو مقدمات کا فیصلہ بھی ادبی چاشنی کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے۔

(سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)

اقبالِ سکندری ہو یا جلالِ اکبری، یہ بھی فانی وہ بھی فانی، دیکھیئو! کہیں فانی کا تم پر جادو نہ چل جائے، اے بھائی! اس عالمِ رنگ و بو کی سیر کیجیئو تو عبرت کی آنکھ سے! اے بھائی! تم کون ہو — کہاں سے آئے ہو؟ کس لئے آئے ہو؟ کہاں جاتے ہو؟ — بحرِ کائنات میں ایک موتی ہے — انمول تھا جو صدفِ افلاک میں بھی اٹھ نہیں سکتا — اور آتنا گراں قدر جس کا پلہ دونوں جہان سے بھاری۔ وہ موتی کون؟ — تم — ! تم کون؟ آدم —! آدم کون؟ مسجودِ ملائک!!

کیا خبر ہے کہ یہاں اس چڑیل دنیا کے پیچھے تم دیوانے ہو رہے ہو؟ اور وہاں جنت میں چشمِ غزالاں تمہاری راہ تک رہی ہے، اے بھائی! دین داری نام ہے سکونِ قلب کا — دنیا داری نام ہے دردِ سری کا —— اس درد کی دوا — ؟ ترکِ دنیا اور دنیا یعنی ہوا و ہوس! کیوں نہیں حرص و ہوس کو ایک شیشہ میں بند کر کے اس شیشہ کو کسی پتھر پر دے ٹپکو —!

اے بھائی! اگر دنیا تم کو بلاتی ہے تو پہلے اس مردار کی حقیقت سن لو، ہم وہی کہیں گے جو خود ہماری آنکھوں نے ہم سے کہا ہے، شنیدہ نہیں، دیدہ — یہ کہانی تم کو بتائے گی کہ دنیا واقعی دل لگانے کی جگہ نہیں ——

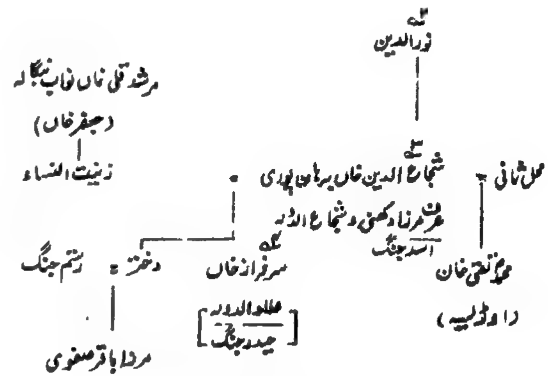
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے!

آمنہ کا لال سراج الدولہ ذبح کب ہوا؟ کس ہاتھ سے ہوا؟ کاشانۂ ہیبت جنگ پر بجلی کب گری؟ کس نے گرائی؟ بنگالہ کا دیوالہ کب نکلا؟ کس نے نکالا؟ ملک و ملت کی ناک کب کٹی؟ کس نے کاٹی؟ مرشد آباد و عظیم آباد کی شامت کب آئی — ؟ کس صیغیں میں آئی؟ طوق و سلاسل کس کے گلے میں لوہا کب دیا گیا؟ کس نے دیا — ؟ دورِ قمر در عقرب کب آیا — ؟

کس روپ میں آیا ؟ یہ پوچھنا ہو تو سید محمد جعفر خان سے پوچھ لو۔
[سید ۷۴، محمد ۹۲، جعفر ۳۵۳، خان ۶۵۱ — سید محمد جعفر خان
۱۱۷۰] اور یہ ۱۱۷۰ھ وہی سال ہے جس سے دورِ قمر در عقرب شروع ہوتا
ہے، ثبوت جاوید نامۂ اقبال سے لیجئے:

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد — ملتے از کارِ شاں اندر فساد
ملتے کو بند ہر ملت کشاد — ملک و دینش از مقامِ خود فتاد
می ندانی خطۂ ہندوستاں — آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز — درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت؟ — ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت!

دینِ او آئینِ او سوداگری است
عنتری اندر لباسِ حیدری است



تفصیل اس نسب نامہ کی ملاحظہ ہو:
نواب شجاع الدولہ اسد جنگ صوبہ دار بنگال و اڑیسہ نے ۱۱۵۱ھ میں
رحلت فرمائی تو نواب علاء الدولہ حیدر جنگ نے اپنے باپ کی جگہ لی، حسنِ سلوک
اور رعایا پروری میں بیٹا اپنے باپ کا نمونہ تھا۔ لوگوں کو اب معلوم ہوا کہ حیدر
بمعنی اسد اور حیدر جنگ بمعنی اسد جنگ ہیں، مگر ؎

بہرِ خویش از زمانۂ غدار
راحتِ جاوداں نمی خواہم
غالب

عظیم آباد [پٹنہ] میں حیدر جنگ کا نائب علی وردی خاں مہابت جنگ تھا
وہ اپنی فوج لے کر چپکے سے بنگالہ پہونچا، اس کی خبر لیکایک مرشد آباد پہونچی، تو
حیدر جنگ کو کمال حیرت ہوئی، دربار مرشد آباد میں علی وردی خاں کا بھائی
حاجی احمد حاضر تھا۔ یہ دونوں بھائی اسی دربار کے پروردہ تھے، حیدر جنگ نے
حاجی احمد سے پوچھا، کہ بھائی تمہارا کیوں آرہا ہے ؟ اور آرہا ہے تو فوج کیسی ؟
حاجی احمد نے کہا کہ: بھائی ہمارا شرفِ حضوری سے محروم ہے — اے آسمانِ جاہ!
وہ آیا ہے اور بے طلب آیا ہے تو صرف زمیں بوسی کے لئے، اے کعبۂ مقصود! اس
نے احرام باندھا ہے تو اسی حجِ اکبر کے لئے — قسم کلام اللہ کی! حکم ہو تو فدوی
جا کر اوس کو سلام کے لئے ابھی لے آئے!..

فسوں سازِ حاجی احمد ان باتوں میں طاق تھا، آنکھوں میں دھول ڈال
کر اجازت حاصل کرلی، حیدر جنگ سے رخصت ہو کر تیر کی طرح سیدھا اپنے بھائی
کے پاس پہونچا۔ اور ظاہر ہے کہ تیر جا کر کبھی واپس نہیں آتا۔! تب حیدر جنگ کی
آنکھ کھلی، کوچ و یورش کا حکم ہوا، ہندی اور عراقی فوجیں آگے بڑھیں، اور حیدر جنگ
مرشد آباد سے پالکی پر روانہ ہوئے، مگر کس طرح؟ جس طرح ایک جانِ جہاں اپنے
فدائیوں کے جھرمٹ میں!— پالکی گریہ پہنچی تو وہاں سے حیدر جنگ ایک جنگی ہاتھی
پر سوار ہوئے، ہاتھی کیا تھا ایک چلتا پھرتا پہاڑ تھا۔ دوپہر کو حیدر جنگ
مقامِ گریہ تالہ میں پہونچا، تو بعض مقربانِ درگاہ نے عرض کیا کہ مہابت جنگ یہاں
سے نزدیک ہے، — اور یہ قرابتِ عاشقاں، جنگ کے خاتمہ پر تمام ہوئی —!

علی وردی خاں کا نواسہ سراج الدولہ اس کا ولی عہد تھا، وہی جانشین
ہوا، یہ وہی جوان و دیوانہ اور ظلم کیش و بد اندیش اور کینہ جو و بد رو، اور سخت گو
و تند خو ہے جس نے اپنے گھر میں جھاڑو پھیرنے کے لئے موہن لال ایک منشی کو
سپید و سیاہ کا اختیار دے دیا۔ موہن لال کون ؟ صورت دیکھو تو سنگِ موسیٰ
اور سیرت دیکھو تو ہم سنگِ فرعون —! سراج الدولہ دیوانہ — موہن لال دیوانی!
دیوانہ کا دیوان ایسا ہی ہوتا ہے۔ "وزیرے چنیں شہر یارے چناں!" موہن لال
کے عروج نے لوگوں میں حسد کا مادہ پیدا کیا اور اوس کی فرعونیت نے آسمانی
بلاؤں کو نیوتہ دیا —!

سراج الدولہ نے پہلے انگریزوں سے بگاڑ کیا، کلکتہ پر فوج کشی کی —
اور تسلط قائم کر دیا — رئیس کلکتہ ناچار ایک کشتی پر جا بھاگا اور سراج الدولہ فتحیاب
واپس ہوا — پھر دیوانگی کی باتیں شروع کیں۔ محرم ۱۱۷۰ھ میں پورنیہ پر دھاوا

کیا۔ شوکت جنگ پسرِ صولت جنگ نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور اسی مقابلہ پر جان دے دی ! الغرض راجہ ڈ ایک کلکتہ سے بھاگ نکلا۔ تو دکن کے نصاریٰ اوس کی مدد کو دوڑے اور کلکتہ پر دھاوا کیا۔ حتیٰ کہ سراج الدولہ کے عامل کو کلکتہ سے بھاگنا پڑا۔ تب سراج الدولہ نے فوج کشی کی اور پھر کلکتہ کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزوں نے شب خون مارا اس وقت سراج الدولہ نے صلح مناسب سمجھی اور مرشد آباد واپس ہوا — !

انھیں دنوں میں سراج الدولہ کو سید محمد جعفر خاں سے سخت پرخاش ہوئی حکم دیا کہ تم ہمارے ملک سے چلے جاؤ۔ سید محمد جعفر خاں نے نمک حرامی سے ساز باز کیا، اور آج کل کرتے ملک نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ انگریزی فوج نے بڑھ کر پلاسی پر قبضہ کر لیا اب سراج الدولہ کو ان انگریزوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور مجبوراً سید محمد جعفر کی خوشامد شروع کی، بلانے کے لئے آدمی بھیجا۔ سید محمد جعفر خاں نے جواب دیا: کہ اب نوکری کو سلام ہے، اور اس لئے سلام کے لئے حاضر ہونے کی ضرورت نہیں رہی، اور حاضری نہ دی! لیکن اس جگہ ایک فقیر رہتا تھا، پڑا پہونچا ہوا فقیر۔ گلی گلی مشہور، نام داتا شاہ — سراج الدولہ نے کہلا بھیجا کہ آستانہ پر ایک فاقہ کش مر رہا ہے، عارف باللہ سے رہا نہ گیا مزاج پرسی کے لئے دوڑا آیا۔ فاقہ کش کو سلام کیا۔ دیکھ کر بہت متاثر ہوا، پھر اولٹے پاؤں واپس ہوا، کہتا گیا کہ "تحفۂ درویش" قبول ہو، کھچڑی ابھی آتی ہے [عرفان پناہ درحقیقت آگاہ نے ندی کی جوتی دیکھ کر سراج الدولہ کو پہچان لیا تھا] واپس جا کر کھچڑی ضرور پکائی، مگر کس طرح ؟ —

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند!

دریا کے اُس پار راج محل تھا، وہاں میر محمد جعفر کا بھائی میر محمد داؤد قلعہ کا فوجدار تھا، داتا نے داؤد کے پاس چپکے سے ایک قاصد بھیج دیا، اور کہلا بھیجا کہ: قسمت یوں جاگی ہے، جس صید کے پیچھے ایک دنیا سرگرداں ہے وہ صید اس وقت سو رہا ہے، اور کہاں کہ ہمارے جال میں! — آنا ہو تو جلدی آؤ — !!

بلائے ناگہانی عرف میر محمد داؤد آندھی اور بجلی کے پاؤں اوس پار سے اس پار پہونچا، یعنی راج محل سے پورال، سراج الدولہ خفتہ بخت اب دشمنوں کے نرغہ میں تھا۔ داتا کی دانائی اوس کو اب معلوم ہوئی، اب معلوم ہوا کہ ایک عارف باللہ کے بھیس میں بھی ابلیس ہو سکتا ہے! صیاد اپنے صید کو کشاں کشاں مرشد آباد لے گیا اور تاریخ نے پکار کر صدا دی —— صید کشتنی بود

کشتہ شد، خانۂ خالی را دیو گرفت، مسندِ بنگالہ را میر محمد جعفر گرفت — !

اے دل دیکھا تو نے ؟ خونِ ناحق کا رنگ لانا دیکھا تو نے ؟ علاء الدولہ حیدر جنگ بے گناہ تھا مگر جو شراب حیدر جنگ کو پلائی گئی، آخر وہی شراب ہیبت جنگ کو پینی پڑی، اوس کو میدان کا سندار میں۔ اس کو عبرت زدہ بار میں — اوس کو مرشد آباد میں — اس کو عظیم آباد میں — اوس کو ۱۱۵۳ھ میں — اس کو ۱۱۴۰ھ میں — !

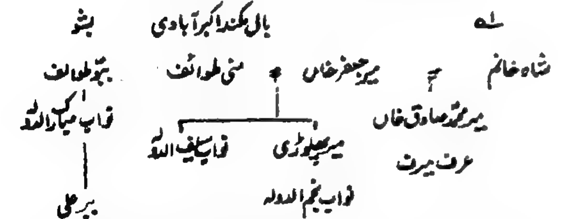
اے دل دیکھا تو نے ؟ کل جعفر خاں کا نواب علاء الدولہ ذبح ہوا تھا ہیبت جنگ کی چھری سے، آج ہیبت جنگ کا نواسہ سراج الدولہ ذبح ہوتا ہے جعفر خاں کی چھری سے! وہ ۱۱۵۳ھ میں / یہ ۱۱۷۰ھ میں — !

اے دل دیکھا تو نے — ؟ جعفر خاں کا انتقام لینے کے لئے کھڑا کون ہوتا ہے، ایک دوسرا جعفر خاں، یہی نقد سودا ہے، اس ہاتھ دے اوس ہاتھ لے! صاحبو! یہ اور چمن نہیں، عبرت کا چمن ہے، تماشہ دیدنی، گل چیدنی ہے۔ اے آنکھ والو! یہ فسانہ نہیں، عبرت نامہ ہے، جاوید نامہ ہے، جاوید نامہ ہے!

اے دل دیکھا تو نے — ؟

آمنہ کا لال سراج الدولہ ذبح کب ہوا ؟ کس ہاتھ سے ہوا ؟ کاشانۂ ہیبت جنگ پر بجلی کب گری ؟ کس نے گرائی ؟ بنگالہ کا دیوالہ کب نکلا ؟ کس نے نکالا ؟ یہ پوچھنا ہو تو سید محمد جعفر خاں ۱۱۷۰ یا عبرت ۷۴۲، ارباب ۲۰۶ بصر ۲۹۲ = ۱۱۷۰ — کی ہر سطر سے پوچھ لو — ! ہر سطر یہی جواب دے گی کہ ہم ۱۱۷۰ ہیں — !

حاشیہ (از سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)



(۱) بال مکند مر گیا تو اوس کی بیوہ نے اپنی بیٹی منی کو بشو کے سپرد کر دیا، بشو نے اپنی بیٹی ببو کے ساتھ منی کو بھی ناچ گانے کی تعلیم دی۔ چنانچہ سراج الدولہ

کی شادی میں متیٰ و ببو مرشد آباد ناچنے کے لئے آئیں۔ میر جعفر خاں نے ان دونوں کو روک لیا اور دونوں سے تعلق پیدا کیا (یا عقد کر لیا) ' ان دونوں کی اولادیں بعد میر جعفر کے مسند نشیں ہوئیں، یعنی نجم الدولہ اوّل، پھر سیف الدولہ بطن منی طوائف — پھر مبارک الدولہ بطن ببو طوائف!

(۲) نجم الدولہ کا نام میر پھلواڑی خود میر جعفر کا رکھا ہوا تھا، اس لئے کہ حمل کے زمانہ میں متی کو " پھلواڑی " کی بہت خواہش ہوتی تھی! (سیر المتاخرین)

(۲) از نسل علی یار گورنر شاہ طہماسپ

(۳) شجاع خاں عرف شجاع الدولہ اسد جنگ

(۴) سرفراز خاں عرف علاء الدولہ حیدر جنگ

(۵) حاجی احمد اور علی وردی کا نسب نامہ یہ ہے ۔

مرزا محمد خراسانی

حاجی احمد — محمد علی

حاجی احمد: نوازش محمد (شہامت جنگ) — سید احمد (صولت جنگ) — زین الدین احمد (ہیبت جنگ) — رابعہ

محمد علی: علی وردی خاں (مہابت جنگ) — مہرالنساء (گھسیٹی بی بی) — میمونہ — آمنہ — دو دختر

نفضل علی (متبنٰی) — شوکت جنگ — مرزا محمد (سراج الدولہ) — فضل علی (اکرام الدولہ) — مرزا مہدی

(۱) مرزا محمد خراسانی کی شادی قبیلہ افشار میں ہوئی تھی۔

(۲) وردی (ترکی معنی) عطیہ - علی وردی = عطیہ علیؑ یہی مہابت جنگ بھی ہے ۔

(۳) نوازش محمد کی شادی مہرالنسا عرف گھسیٹی بی بی دموتی جھیل کی بیگم و چھوٹی بیگم سے ہوئی تھی جو لاولد رہے۔ لیکن گھسیٹی بی بی نے اپنی ہمشیرہ آمنہ کے دوسرے لڑکے فضل قلی کو گود لے کر اپنی سونی گود کو روشن کیا۔ نوازش محمد شہامت جنگ نے ۱۳ ربیع الاول ۱۱۶۹ھ کو وفات پائی۔

(۴) زین الدین احمد کی شادی مہرالنساء عرف گھسیٹی بی بی کی ہمشیرہ سوم آمنہ سے ہوئی۔ زین الدین احمد ہیبت جنگ کی وفات ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔

(۵) سید احمد پسر دوئم حاجی احمد کی شادی میمونہ ہمشیرہ مہرالنساء عرف گھسیٹی بی بی سے ہوئی جن کے بطن سے محمد مہدی قلی خان بہادر شوکت جنگ ہوئے۔ میر تقی انھیں شوکت جنگ کے ملازم تھے، سید احمد صولت جنگ کی وفات ۲۵ - جمادی الاول ۱۱۶۹ھ کو ہوئی۔

(۶) رابعہ کی شادی عطا اللہ خاں سے ہوئی، جن سے دو لڑکیاں تولد ہوئیں۔

(۷) علی وردی خاں مہابت جنگ نے ۹ - رجب ۱۱۶۹ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

منصوبہ بندی میں عوام کی دلچسپی

" وکاس " اور " یوجنا " وغیرہ الفاظ اب ملک بھر میں انسانوں، عمارتوں، کارخانوں اور قاموں وغیرہ کے لئے یکساں طور پر استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ یہ چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے پنج سالہ منصوبے کی بدولت پیداوار وغیرہ کے جو نشانے پورے ہوئے ہیں وہ تو ہوئے ہی ہیں، اس کا نفسیاتی طور پر لوگوں پر گہرا اثر پڑا ہے۔

قلابہ ضلع میں پین کے مقام پر دیا سلائی کا ایک کارخانہ ہے جس کا نام " یوجنا " ہے۔ پونہ میں سائیکل کی دکانیں، ریستوران اور دیگر ادارے ہیں جن کے نام " پرگتی " (ترقی) " یوجنا " اور " وکاس " وغیرہ ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ اب تو آپ کو ایسے لڑکے لڑکیاں بھی نظر آئیں گے جن کے نام " وکاس " " یوجنا " " پرگتی " اور " کوٹینا " ہوں گے۔ حتیٰ کہ ایک خاندان منصوبہ بندی سے اتنی زیادہ دلچسپی رکھتا ہے کہ اس نے اپنے کنبے کے ہر رکن کا نام یوجنا اور منصوبہ بندی کے تعلق سے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ خاندان فیملی پلاننگ میں بھی یقین رکھتا ہے جو پنج سالہ منصوبے کا ایک اہم پہلو ہے۔

منصوبہ بندی سے متاثر عوام کے اس رنگ برنگ جتھے میں درزی، حجام، کسان، لوہار وغیرہ سبھی شامل ہیں اور شاید ڈاکٹر اور وکیل وغیرہ بھی آپ کو اس میں ملیں گے

خلیل الرحمٰن اعظمی

بھیرویں

پکّی نیند کے جھونکوں سے
اب مت کھیلو میری رانی !
بھورسمے کی نئی ہوائیں
پاؤں تمہارے چھوتی ہیں
آنگن کی سوندھی مٹی پر
آشاؤں کی سُندر سکھیاں
اپنے کنوارے ہاتھوں سے
نام تمہارا لکھتی ہیں
نیل گگن کے تھال پہ کوئی
پاؤں میں اپنے گھنگھرو باندھے
دھیرے دھیرے ناچ رہا ہے
دھرتی کروٹ سی لیتی ہے
کوئی نیا سُر جاگ رہا ہے
ہری بھری شہتوت کی ڈالی
امرت رس میں ڈوب چلی ہے
ہر کونپل انگڑائی لے کر
اپنی سیج پہ اُٹھ بیٹھی ہے
مان سرور میں اُٹھتے ہیں
میٹھے میٹھے ہلکورے سے

پیارے پیارے پھول کنول کے
اپنی پلکیں کھول رہے ہیں
کُسُم کی پیالی سے رہ رہ کر
اوس کی مدرا چھلک رہی ہے
جوہی کی کلیوں کا گھونگھٹ
آپ ہی آپ نہ جانے کیسے
رخساروں سے سرک گیا ہے
گودی کے کانوں کے بُندے
جانے کب سے بھیگ چلے ہیں
دیوتاؤں کی ہر ہر مورت
آنکھیں مل کر دیکھ رہی ہے
ساری فضائیں بول اٹھی ہیں
اک خوشبو سی پھیل رہی ہے
بھونرے پاگل ہو اُٹھے ہیں
پتّہ پتّہ ، بُوٹا بُوٹا
ذرّہ ذرّہ جاگ رہا ہے
اُٹھّو اُٹھّو میری رانی!
میری رانی جاگو جاگو
آج نیا سورج نکلے گا
آج نیا دن آئے گا

نواب توصیف

شہنشاہیت کا ایک چراغ

ماسٹروں کے خاص کمرے میں جہاں ماسٹر لڑکوں کی چوری سے سگریٹ وغیرہ پی سکتے ہیں۔ دیوار پر کسی دیوزاد مکڑی کی طرح چپکی ہوئی ایک بوڑھی گھڑی بھی تھی گیارہ بجے وہ چونکی اور آہستہ آہستہ گھنٹے بجانے لگی۔

اسکول کا بوڑھا چپراسی بھی چونکا اور ایک چھوٹا موٹا سا ڈنڈا لے کر روانہ ہو گیا۔ اس گھڑی کی آواز وہ جب سے سن رہا تھا جب سے نوکر ہوا تھا اور اس کے اس حکم پہ چپراسی کو سخت غصہ آتا تھا لیکن یہ ڈنڈا لئے وہ گھڑی کی طرف نہیں بلکہ بڑے گھنٹے کی طرف جا رہا تھا تاکہ اس بڑھاپے میں بھی وہ اس گھڑی کو بتا دے کہ گھنٹے ٹھوکنا کسے کہتے ہیں۔

مگر بوڑھے چپراسی کو آج ایک نیا تجربہ ہونے والا تھا۔ جیسے ہی وہ اس پیتل کی ٹکیا پر جو شاید اپنے دل میں خود کو سورج کا مقابل سمجھتی ہو اپنے ڈنڈے برسا رہا تھا۔ ایک مختصر سا آدمی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور اس کے ہونٹ ہلے جس سے چپراسی سمجھ گیا کہ وہ صاحب کچھ بولنے کی نیت رکھتے ہیں۔ لہذا اُس نے گھنٹہ اور زور سے بجایا تاکہ اُن کا ایک بھی لفظ اس کے کانوں میں خلل نہ ہو سکے۔ گھنٹہ بجانا اس کے نزدیک پوجا کی اہمیت رکھتا تھا جس سے فارغ ہونے کے بعد ہی وہ کوئی بات کر سکتا تھا۔ لہذا اُس نے بعد میں نووارد شخصیت سے سوال کیا:۔

"آپ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"میں نیا ہیڈ ماسٹر ہوں۔"

"تو آپ مجھ سے یہی پوچھ رہے تھے؟" چپراسی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"تم عجیب آدمی ہو۔"

"کیسا آدمی؟ حضور آپ نے کوئی اچھی بات کہی۔"

"میں تم سے کہہ رہا تھا گھنٹہ زور سے بجاؤ۔ کتنی دور جاتی ہے تمہارے گھنٹے کی آواز؟"

"معلوم نہیں سرکار۔ اگر میں یہ دیکھنے کے لئے گھنٹہ بجا کر بھاگوں تو کتنے ہی تیز دوڑوں دوڑنے سے پہلے ہی آواز ختم ہو جائے گی، کوئی اچھا گھنٹہ منگوائیے سرکار اپنے راج میں بھی آدا ج کا۔ مگر آپ کا راج کیسا؟ میں تو بھول ہی گیا۔ اصلی بڑے سرکار تو گھنٹی بجانے کے کمرے میں ہیں۔ آپ دوسرے کہاں سے آ گئے؟"

"ہم بھی وہی ہیں۔ وہ بھی وہی ہیں۔" ہیڈ ماسٹر نے سمجھایا۔

"اوں ہوں۔ جب کبھو دوسرا ہیڈ ماسٹر آتا ہے تو پہلے والے کو کھا جاتا ہے۔ آپ دو میر ایک جنگل میں کیسے؟"

"ہم دو دن کے بعد انھیں بھگا دیں گے تمھیں نہیں معلوم کہ وہ یہاں سے جا رہے ہیں؟"

"ابھی تو وہی آپ کو بھگا دیں گے۔ نہیں بابا دھوکے کی بات ہے۔"

لہذا یہ نئے ہیڈ ماسٹر جب اسکول کی اس شاخ میں چپراسی کا ملاحظہ کر رہے تھے اس وقت سڑک کی دوسری طرف اسکول کی خاص عمارت میں تمام طلبا، مدرسین، اور اصلی ہیڈ ماسٹر جمع ہو کر ہوا کو سلام کر رہے تھے۔ نووارد ہیڈ ماسٹر نے دراصل ابھی چارج نہیں لیا تھا اور اس وجہ سے "مجبوراً" چوری چوری اصلی ہیڈ ماسٹر کی غیبت میں ٹہلتے ٹہلتے جانچ کرنے آ گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اسکول کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہی بنیادی مقصد ہے۔ چارج لینے سے پہلے ہو یا بعد جتنا کام نپٹ جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔ جن افسروں نے اُن کے ہیڈ ماسٹر بننے کی سفارش اور بقول ایک شریر افسر "سازش"

کی تھی۔ انھیں بھی تو آخر بتلانا تھا کہ وہ واقعی ہیڈ ماسٹری کے اہل تھے۔

دومنٹ کے اندر خاص بلڈنگ سے تین کلاسیں روانہ ہوگئیں (کلاسیں یعنی ضرورت سے زیادہ لڑکے۔ ضرورت سے کم لڑکیاں۔ کتابیں۔ اور باتوں کی بھنبھناہٹ) اور اس چھوٹی بلڈنگ میں آ کر تین کمروں میں گھس کر ڈسکوں پر بے سبیل گئیں۔

نئے ہیڈ ماسٹر صاحب چپراسی کو چھوڑ کر ایک کمرے کی طرف تیزی سے بڑھے اور بغیر کچھ کہے سنے اندر پہنچ کر جیب سے ایک پوری چاک اسٹک نکال کر بلیک بورڈ پر نہایت اہتمام سے کچھ لکھنے لگے۔ لڑکوں نے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور لڑکیاں زور سے مسکرائیں۔ لڑکوں کو اُن کی ٹائی پر ہنسی آ رہی تھی جو ہوا میں اڑ کر اُن کے سیدھے مونڈھے پر سوار ہو گئی تھی۔ اُن کا کوٹ اس زمانے کا بنا ہوا تھا جب فیشن چھوٹے کوٹوں کا تھا۔ لہٰذا اُن کے کوٹ کی حد بھی قریب آدھے کولھوں تک تھی اور ہیڈ ماسٹر اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب فیشن پھر چھوٹے کوٹوں پر واپس آ جائے۔ اُن کی پتلون کے پائنچے نیچے زنانہ غرارے کی طرح چوڑے تھے گویا درزی نے غلطی سے نیچے کا حصّہ اوپر کر دیا ہو۔

ہیڈ ماسٹر لڑکوں کی ہنسی پر تیزی سے مڑے اور انھیں گھورنے لگے بلیک بورڈ پر انگریزی کے تین لفظ لکھے ہوئے تھے۔ وہ الفاظ بھی لڑکوں کو گھور رہے تھے

The New Headmaster دی نیو ہیڈ ماسٹر

ہیڈ ماسٹر کا اصول تھا کہ جتنی کم بات کی جائے اتنا ہی زیادہ اثر پڑتا ہے یہاں تک کہ انسان اگر گونگا ہوتا تو شاید اپنا مطلب زیادہ اچھی طرح ظاہر کر سکتا۔ نئے ہیڈ ماسٹر کے آنے کی خبر تو تھی سی لڑکے کچھ ڈر گئے اور اپنی کتابیں نکالنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر نے آواز کو کرخت بناتے ہوئے صرف تین لفظ کہے:۔

" یہ کون سی کلاس ؟ "

" دسویں۔" ایک لڑکے نے جو سب سے بہادر تھا ڈرتے ڈرتے کہا۔

" کون سا گھنٹہ ؟"

" انگلش " ۔ ایک لڑکے نے جو سب سے بزدل تھا ہمت کر کے کہا۔

" کتاب "

ایک لڑکی نے جو سب سے زیادہ شرمیلی تھی بڑھ کر اپنی کتاب ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں دے دی اور یکا یک گھبرا کر اپنی جگہ لے لی۔

" اس میں تم لوگوں کا کون سا لیسن چل رہا ہے ؟ "

" اس میں لیسن ویسن کچھ نہیں۔" ایک سب سے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے دوسرے لڑکے کی آڑ لے کر کہا۔

" لیسن نہیں تو کیا پیاز ہے ؟" ہیڈ ماسٹر گرجے۔

" جی نہیں۔ یہ ناول ہے۔ شروع سے آخر تک ایک ہی قصّہ ہے۔" ایک سامنے بیٹھے ہوئے شائستہ سے لڑکے نے کہا۔

" ایک قصّہ تو ہوتا ہی ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کا۔ شرم نہیں آتی لکھنے والوں کو بھی اور اسکول میں ناول چلانے والوں کو بھی۔ یہاں لڑکے بھی ہیں۔ لڑکیاں بھی ہیں۔ خیر۔ تم لوگ اس میں کس جگہ پہنچے ہو ؟ "

" ایک جنگل میں۔ ندی کے کنارے۔" ایک لڑکی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

" کیا ہوتا ہے وہاں ؟ " ہیڈ ماسٹر اسی لڑکی سے مخاطب ہوئے۔

" وہاں ولین ہیروئن کو دھوکا دے کر لے جاتا ہے اور وہ اس سے بچ کر ندی میں کود جاتی ہے۔"

" اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ کیا پھر ہیرو بچانے آ جاتے ہیں ؟ "

" جی نہیں۔ ہیرو تو وہاں پہلے سے ہی چھپے رہتے ہیں۔"

" اور وہ ہیروئن کو بچا لیتے ہیں ؟ "

" جی نہیں۔ انھیں تیرنا نہیں آتا۔ تو وہ انتظار کرتے ہیں کہ ولین ہی ہیروئن کو پانی سے باہر نکالے۔"

" اور یہ پرائے مال پر اپنا قبضہ جتا ئیں ؟ " ہیڈ ماسٹر کو کہانی کے ہیرو پر غصہ آ چکا تھا۔ اتنے میں کلاس روم کے دروازے پر کلاس ٹیچر آ کر ٹھٹکے۔

" آپ کی وہی جگہ ہے " ہیڈ ماسٹر یہاں سے بولے۔ جیسے آپ دیر سے آئے ہوئے لڑکوں کو دروازے پر روک دیتے ہیں ویسے ہی آج آپ بھی تجربہ کیجئے۔ کیسے ہوئی آپ کو دیر ؟ "

" دیر یوں ہوئی کہ آفس میں میں آپ ہی کے بارے میں کاغذات تیار کر رہا تھا۔" ماسٹر نے گپ ہانکی۔

" اچھا۔ اچھا۔ آئیے۔ آپ اپنی کلاس لیجئے۔" کہتے ہوئے ہیڈ ماسٹر خوش خوش باہر نکل گئے اور دوسرے کمرے کی طرف رجوع ہوئے۔

اس کمرے میں لڑکے خاموشی سے کچھ لکھ رہے تھے اور ماسٹر کرسی پر قریب قریب لیٹے ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر نہایت غصے میں کھانستے ہوئے اور دوسری طرف دیکھتے ہوئے داخل ہوئے گویا ماسٹر کو اس بے ادبی کے انداز

میں دیکھا ہی نہ ہو۔ مگر جب انھوں نے دوبارہ اس کی طرف نظر کی تو وہ ویسا ہی بیٹھا تھا بلکہ اُن کی طرف تلخی سے دیکھ رہا تھا۔

" کہئے کیا شکایت ہے آپ کو ؟ کیا آپ کا کوئی لڑکا یہاں پڑھتا ہے ؟ یا لڑکی پڑھتی ہے ؟"

" میری کسی بھی قسم کی اولاد یہاں نہیں پڑھتی، بلکہ میں یہاں لڑکوں کو بھی نہیں، ماسٹروں کو پڑھانے آیا ہوں۔ میں نیا ہیڈ ماسٹر یونہی بے تکلفی سے غیر سرکاری طریقے پر اسکول کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہوں۔" ہیڈ ماسٹر نے قانونی پکڑ سے بچتے ہوئے کہا۔

" مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر سڑک پر چلتا ہوا کوئی بھی ایرا غیرا اسکول کے ملاحظے کے لئے آجائے تو کیا میں بس سلام ہی بجالاؤں؟ کون ہیں آپ؟"

" میں ہیڈ ماسٹر۔"

" ہیڈ ماسٹر ؟ انھیں تو میں ان کے کمرے میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ آپ مہربانی کرکے جائیے ورنہ قانون —— "

ہیڈ ماسٹر اپنے تئیں "جواب جاہلاں باشد خموشی" کہتے ہوئے کمرے کے باہر چلے گئے۔ انھیں لڑکوں کی ہنسی سُنائی دی لیکن انھوں نے اس وقت ڈانٹنا مناسب نہ سمجھا۔

تیسرے کمرے میں ہیڈ ماسٹر نے زیادہ احتیاط برتی یعنی ماسٹر صاحب کو کلاس روم کے باہر ہی بُلا لیا اور اُن سے کہا :-

" دیکھئے میں وہ شخص ہوں جس کے ہاتھ میں دو ایک دن میں آپ سب کی قسمتیں ہوں گی۔ لہٰذا آپ میری قدر کریں گے یا دو دن کا فائدہ اٹھائیں گے جب تک میں نے چارج نہیں لیا ہے ؟ ابھی آپ کہہ دیجئے کہ ہم کچھ نہیں سننا چاہتے مگر دو دن بعد ؟ پھر تو سُننا پڑے گا۔"

" میں کچھ سمجھا نہیں۔" ماسٹر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

" میں آپ کا ہونے والا ہیڈ ماسٹر ہوں۔"

" بہت اچھا سر۔ یعنی آپ ہمارے ہونے والے سرپرست ہیں۔"

" میں ابھی سے وعدہ تو نہیں کر سکتا کہ میں آپ کا سرپرست بھی رہوں گا البتہ آپ کے سر پر رہنے والی چیز ضرور ہوں۔"

" چیز تو آپ بہت بڑی ہیں سر۔ ایسا کیجئے میری کلاس کا ملاحظہ کر ڈالئے۔ ڈاکٹری ملاحظہ تو ہو چکا۔ ہیڈ ماسٹری رہ گیا ہے۔ آیئے۔ دیکھو سب لڑکے اور لڑکیاں۔ کھڑے ہو جاؤ۔ بنچ پر نہیں۔ ویسے ہی۔ یہ اپنے۔ ابھی تو کچھ مہینے ہیں لیکن جیسے شادی کے بعد رشتہ ہو جاتا ہے ویسے ہی دو دن کے بعد چارج لینے پر اپنے ہیڈ ماسٹر ہو جائیں گے۔ ہاں۔ ہونے والے ہیڈ ماسٹر صاحب۔ ملاحظہ کیجئے۔ میرا نام سیتارام۔ یہ کلاس اس وقت حساب پڑھ رہی ہے۔"

" کیا نام آپ کا ؟ سیتارام ؟ دونوں نام آپ ہی کے ہیں ؟ خیر سوال یہ ہے کہ میں حساب کی کلاس کا ملاحظہ کرنا نہیں چاہتا۔ خصوصاً جب میں اس کے لئے تیار نہیں۔" ہیڈ ماسٹر نے اپنی قابلیت جتاتے ہوئے کہا۔

" تو میں آپ کی طرف سے ملاحظہ کروں ؟" ماسٹر نے معصومانہ انداز میں کہا۔

" شکریہ۔ آپ اپنی ذمہ داری خوب سمجھتے ہیں۔"

" ہاں تو سُنو بھئی کلاس۔" ماسٹر نے کلاس کو مخاطب کیا: "ان صاحب میں دو دن جوڑ دو تو یہ اپنے ہیڈ ماسٹر کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اور نہ جوڑو تو ؟"

" گنتو خیر یعنی صفر کے برابر۔" ایک چھوٹے سے لڑکے نے تیزی سے کہا۔

" بس۔ بس۔ میں سمجھ گیا۔ کلاس تیز ہے۔" کہتے ہوئے ہیڈ ماسٹر تیزی سے باہر کی طرف روانہ ہو گئے اور چوری کی ہیڈ ماسٹری کا پہلا دن پورا کرتے ہوئے سیدھے اپنے گھر پہنچ گئے اور اسی دن پانی پینے کی چھٹی میں جب ماسٹر اپنے خاص کمرے میں چائے سگریٹ وغیرہ پی رہے تھے اور ان میں غیر معمولی ہنسی چھڑی ہوئی تھی اس وقت نئے ہیڈ ماسٹر اپنے گھر اس دن کا تجربہ یاد کرکے ٹھنڈے پانی کی گھونٹیں لے رہے تھے۔

سنیچر اور اتوار گزر جانے پر پیر کے دن نئے ہیڈ ماسٹر اسکول کی خاص بلڈنگ میں جہاں اُن کا آفس بھی تھا ایک فاتح بادشاہ کی شان سے پہنچے جہاں گویا ان کی تمام رعایا جمع تھی۔ آتے ہی انھوں نے اپنی گھڑی دیکھی اور باآواز بلند سوال کیا :-

" کیا دیر ہے ؟ میری گھڑی میں وقت ہو گیا۔"

" لیکن اسکول بڑی گھڑی پر چلتا ہے۔" ایک ماسٹر نے آہستہ سے کہا تاکہ ہیڈ ماسٹر نہ سُن لیں۔ لیکن ماسٹر کا ڈر پورا ہوا۔

" بڑی گھڑی کیا معنی ؟" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "میری گھڑی جو میں دن میں دس وقت ریڈیو سے ملاتا ہوں صحیح ہوگی یا وہ بڑی دقیانوسی گھڑی جس نے ریڈیو کا نام بھی نہ سُنا ہوگا بلکہ ریڈیو کی ایجاد سے بھی پہلے بنی ہوگی ؟"

" لیکن اتنے اونچے مقام پر چڑھ کر اس کا وقت صحیح کون کرے گا ؟"

لیڈی ٹیچر نے کہا جو کہ لڑکیوں کے کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر لڑکوں کو پڑھانے آئی ہوئی تھیں۔

"جناب۔ اُس گھڑی کو چابی تو دی ہی جاتی ہوگی۔ پھر کوئی چڑھتا بھی ہوگا"۔ ہیڈ ماسٹر عقلمندانہ طریقے سے مسکرائے۔

"جی نہیں۔ آپ کو شاید نظر نہیں آیا۔ یہ بجلی سے چلتی ہے۔"

"بجلی بھی کہیں نظر آتی ہے۔ خیر۔ تو بجلی تیز کی جائے۔"

"لیکن اب تو بڑی گھڑی کے مطابق بھی وقت ہو گیا"۔ لیڈی ٹیچر نے اپنی نسوانی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈانٹتے ہوئے فیصلہ دے دیا۔

چناں چہ ہیڈ ماسٹر اپنے آفس میں پہنچے اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کو آہستہ سے چھو کر دیکھا۔ گھنٹی نے ٹن سے اُن کی اُنگلی کا جواب دیا اور الہ دین کے چراغ کی طرح ایک نئے چپراسی کو لا کر سامنے کھڑا کر دیا۔ ہیڈ ماسٹر چونکے اور اس سے پوچھنے لگے۔

"کیوں؟ کیا کام ہے؟"

"کیوں سرکار؟ کیا کام ہے"۔ چپراسی نے نقل کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں میں تو یونہی گھنٹی کی جانچ کر رہا تھا۔"

چپراسی کے جاتے ہی ہیڈ ماسٹر کو اُس کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے زور شور سے گھنٹی پر بالکل جل ترنگ شروع کر دی مگر چپراسی نہیں آیا۔

آخر کار انھیں کمرے کے باہر نکل کر کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے چپراسی کے پاس پہنچنا ہی پڑا۔

"بھئی اب ہم اصلی گھنٹی بجا رہے ہیں۔" انھوں نے چپراسی کو سمجھایا اور اسے اپنے کمرے میں لے آئے۔

"کیوں بھئی چپراسی۔ دسویں کلاس کے بازو کے کمرے میں کون سی کلاس لگتی ہے؟"

"گیارہویں صاحب"۔ چپراسی تیزی سے بولا گویا ایک ہی لفظ ہو۔

"اور اُس کی دوسری طرف؟"

"گیارہویں بی"۔

"گیارہویں صاحب اور گیارہویں بی۔ واہ بھئی کیا مذاق پیدا کیا ہے۔ اچھا جاؤ۔ گیارہویں صاحب کے ٹیچر کو بلا لاؤ۔"

چار منٹ میں گیارہویں اے کے ٹیچر ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوئے اور زور سے کہا۔

"گڈ مارننگ"۔

"گڈ مارننگ"۔ ہیڈ ماسٹر نے اور زور سے کہا: "آپ بہت تمیز دار ہیں جب ہی آپ کلاس میں کرسی پر لیٹے ہوئے رہتے ہیں۔ یہی کہنے میں نے آپ کو بلایا ہے"۔

"آپ یہاں بیٹھنے کی اجازت دیں گے؟" ٹیچر نے پوچھا۔

"ذرا ٹھہر کر۔"

"پھر بھی کتنی دیر میں؟"

"دو منٹ کے بعد۔"

ٹیچر نے اپنی گھڑی دیکھ لی۔

ہیڈ ماسٹر نے اپنی تیوری چڑھا لی۔

"میں آپ سے جتا دینا چاہتا ہوں کہ اسکول مذاق نہیں ہوتا"۔ ہیڈ ماسٹر نے سختی سے کہا: "یہاں طلبا دوسرے سبق بھی سیکھتے ہیں، مثلاً کرسی پر بیٹھنا اور آپ ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جو قابلِ لعنت و ملامت ——"

"میں آپ کی نکتہ چینی مسترد کرتا ہوں۔ دو منٹ ہو چکے اور اب میں کرسی پر بیٹھتا ہوں۔ میں ایک قانونی انسان ہوں اور میرا ہر کام کسی اصول کے تحت ہوتا ہے"۔

"اور ہاں" ہیڈ ماسٹر نے نہایت تلخی سے کہا: "آپ کی یہ اندھی قانونیت آپ کو نقصان پہنچائے گی۔ اس دن جو تم نے میرے ساتھ برتاؤ کیا ہے وہ مجھے یاد ہے جس کا تمھیں خمیازہ بھگتنا ہوگا۔"

"کیسے؟ اس دن میرے برتاؤ میں کوئی قانونی غلطی نہیں ہوئی۔ اگر میں آپ کو پہچانتا بھی تھا تو سرکاری طور پر مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ میں آپ کو پہچانوں اور بغیر چارج لئے آپ وہاں آ بھی نہیں سکتے تھے"۔

"وہی میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ بحث اور اختیار میں تھوڑا سا فرق ہے۔"

آپ کو شاید نہیں معلوم آج کل جمہوریت کے زمانے میں قیصری وزاری قریب قریب ختم ہو چکیں۔ آپ کا وجود ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ سڑک پر چلتے ہوئے ادنیٰ سے شخص کے ہاتھوں میں ہے اور قانونا کون ذمہ ہے یہ آپ کو جب پتہ چلے گا جب یہاں تعلیمات کے ڈائرکٹر ملاحظے کے لئے آئیں گے۔ دیکھئے

پھر کس کا زور چلتا ہے ۔ مجھے اب شاید آپ اجازت دیں گے کہ میں اپنی تقریر صحیح جگہ پر کروں ۔ یعنی کلاس میں ۔ گڈ مارننگ ۔"

" آپ میرے حکم سے اپنی کلاس میں پہنچ جائیں ۔" ہیڈ ماسٹر نے جاتے ہوئے ٹیچر پر اپنے الفاظ پھینکے گویا وہ انھیں کا حکم مان رہا ہو ۔ پھر کچھ دیر سناٹے میں بیٹھے رہنے کے بعد اُنھوں نے گھنٹی بجائی اور کمرے میں آتے ہوئے چپراسی سے کہا ۔

" آؤ ۔ اسٹول کے پاس آ کر کھڑے ہو جاؤ ۔ کیوں جی ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہمارے بارے میں کچھ باتیں ہوتی تھیں ؟ "

چپراسی خاموش ہو گیا ۔

" بتاؤ ۔ ہم ناراض نہیں ہوں گے ۔"

" سرکار سب کہتے تھے کہ آپ ایک تو نئے نئے بھرتی ہوئے ہیں پھر بھی آپ شروع میں جہاں گئے تھے وہاں ماسٹروں کی ترقی آپ نے مار دی ۔ چپراسیوں کو نکال دیا اور لڑکوں پر جرمانے کئے اور کوئی آپ کو پسند نہیں کرتا اور چپراسی تو آپ کی جان لینے پر تُلے رہتے ہیں ۔"

" اچھا ۔ تم جا سکتے ہو ۔" ہیڈ ماسٹر نے جلدی سے کہا اور خود پھر ایک سناٹے میں ڈوب گئے ۔ ان کی کارروائیوں کی خبر اُن کے آگے آگے چلنے لگی تھی کیا وہ واقعی ظالم تھے ؟ اور ظالم کی عمر کوتاہ ہوتی ہے ۔ کہیں ایسی گھڑی نہ آ گئی ہو کہ انھیں ہیڈ ماسٹری درکنار ، ماسٹری ہی مل کر رہ جائے ، بلکہ ماسٹری درکنار پنشن سے بھی ہاتھ دھونا پڑے ۔ یہ اسکول ذرا خطرناک قسم کا معلوم ہوتا تھا ۔ گیارویں اے کا ٹیچر بے حد قانونی آدمی معلوم ہوتا تھا ۔ انھیں اس کی تقریر کا خیال آ رہا تھا ۔" آپ کا وجود ہمارے ہاتھوں میں ہے ... ادنیٰ سے شخص کے ہاتھوں میں ہے ۔" یہ ایک تلخ حقیقت بھی تھی شہنشاہیت کے چہرے میں کہیں انھیں زارِ روس یا قیصرِ جرمنی یا فاروقِ مصر کی طرح اپنی چھوٹی سی سلطنت بھی نہ کھونا پڑے ۔ زمانہ ایسا تھا جس کا راز صرف ایک جھوٹ میں پنہاں تھا ۔ وہ یہ کہ بادشاہ اپنی رعایا سے کہہ دے کہ میں تمھارا محکوم اور تم حاکم ۔ بات وہی رہی صرف رعایا بہل جائے گی ۔ یہی شاید انھیں بھی کرنا پڑے ۔ انھیں ایک وقت یہ بتلا دینا پڑے گا کہ وہ جمہوریت پسند ہیں اور اُن کے نزدیک چپراسی کی عزت ہیڈ ماسٹر کے برابر ہے ۔

اسی وقت ہیڈ ماسٹر نے ماسٹروں کے نام ایک حکم صادر کیا :-

" چپراسی کا بھی اتنا ہی خیال کیا جائے جتنا کہ ہیڈ ماسٹر کا ۔"

اُنھوں نے کاغذ چپراسی کو تھمایا اور اس سے کہا کہ یہ چٹھی ماسٹروں کو جب دکھائی جائے جب وہ اپنے کمرے میں جمع ہوں اور وہ کیا کہتے ہیں ۔ چپراسی آ کر چپکے سے اطلاع دے ۔

چپراسی قریب ڈیڑھ بجے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں آیا ۔ مگر صاحب ٹہلتے ہوئے کمرے کے باہر نکل گئے تھے ۔ چپراسی نے آہستہ سے گھنٹی بجائی تھی کہ ہیڈ ماسٹر چپراسی سے بھی زیادہ تیز دوڑتے ہوئے کمرے میں آ گئے ۔

" معاف کریں گے سرکار ، گھنٹی چھوٹی نہیں تھی کہ بج گئی ۔"

" چھوٹی نہیں تو بجے گی کیسے ؟ خیر کیا کہا ماسٹروں نے ؟ خوش ہوئے ؟"

" ہاں سرکار بہت ہنس رہے تھے ۔ اور گیارویں اے والے کہہ رہے تھے یہ چٹھی الٹی لکھ گئی ۔ اس کو ایسا ہونا تھا ۔ ہیڈ ماسٹر کا اتنا ہی خیال رکھا جائے جتنا کہ چپراسی کا ۔"

" خیر یہ تو ایک ہی بات ہے ۔" ہیڈ ماسٹر نے دھیرے سے کہا ۔ میری چال پوری نہیں تو نصف یا چوتھائی حصہ ضرور کامیاب ہوئی ۔"

لیکن اس کے علاوہ ضرورت تھی کہ ڈی ۔ پی ۔ آئی کے ملاحظے کے پہلے پہلے ہی وہ مدرسوں میں ہر دل عزیز ہو جائیں اور اس کی ترکیب بھی گیارویں اے کے ٹیچر کی دھمکی میں موجود تھی " آپ کا وجود ہمارے ہاتھوں میں ہے ۔"

" واقعی " ہیڈ ماسٹر اپنے دل میں کہنے لگے ۔ ماسٹر ہی ہیڈ ماسٹر کی روح ہوتے ہیں ۔ بلکہ روحیں ہوتے ہیں ۔" اُنھوں نے اپنے آپ کو صحیح کہا " بلکہ روحیں ہوتی ہیں ۔" انھوں نے پھر اپنے آپ کو صحیح کیا " اگر وہ نہیں تو ہیڈ ماسٹر نہیں ۔ اگر اسی خیال پر ایک ڈرامہ لکھ لیا جائے تو کیسا رہے گا ؟ ایک وقت تو میں نے ایک ڈرامہ لکھ ہی ڈالا تھا ۔ جسے ایک ششماہی رسالے نے نہایت شوق سے ایک بحث کے نام سے چھاپا تھا اور کچھ پیسے کا بھی لین دین ہوا تھا ۔ شاید مجھے ہی کچھ پیسے ایڈیٹر کو دینے پڑتے تھے ۔ لیکن اگر آج کل کے ایڈیٹر ڈرامے کو بحث کہتے ہیں تو یہ ڈرامہ بغیر مکالمے کا رہے گا ۔" ہیڈ ماسٹر نے اپنے تئیں غصّہ سے کہا ۔

اسی دن سے ہیڈ ماسٹر نے ایک ڈرامہ لکھنا شروع کیا بغیر مکالمات کا ۔

" یہ کسی رسالے میں دے کر ضائع کرنے کے لئے نہیں ۔" اُنھوں نے اپنے تئیں کہا " بلکہ اسٹیج کرنے کے لئے ہے ۔ طلبا کی سوشل گیدرنگ کے بعد میں خود ماسٹروں کی گیدرنگ کا انتظام کروں گا جس کے تحت یہ ڈرامہ کھیلا جائے گا ۔" انھوں نے ڈرامائی انداز میں کہا ۔ تاکہ ٹیچروں پر یہ ثابت ہو جائے کہ اُن کے درمیان

ایک ڈرامسٹ، آرٹسٹ اور سیٹرلیٹ (طنزنگار) بھی موجود ہے اور وہ اس کے مداح ہو جائیں۔

اسٹوڈنٹس سوشل گیدرنگ کے قریب قریب ہیڈماسٹر نے ماسٹروں کی ایک میٹنگ کی اور اس میں کہا:-

"آپ لوگوں کے سامنے ایک ایسا ڈرامہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں قسم کھانے کو بھی ایک مکالمہ نہیں۔"

دسویں کے ٹیچر نے ظاہرہ نہایت دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھا اور ایک دم لیڈی ٹیچر کے پاس بڑھا دیا چونکہ اس میں اُن کا بھی پارٹ تھا۔

ڈرامہ —————— از قلم۔ جناب پکوڑی لال صنم

ایکٹ پہلا۔ سین پہلا۔ اسکول کا ایک کمرہ

(کمرے میں ایک شخص کرسی پر مجسمے کے انداز میں آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا ہے۔ پتھر کی طرح۔ گویا اس میں جان نہیں ہے)

[لیڈی ٹیچر داخل ہوتی ہے اور دیوار پر ایک بورڈ ٹانگتی ہے جس پر لکھا ہوا ہے "ہیڈ ماسٹر"]

(ایک ٹیچر داخل ہوتے ہیں اور گاتے ہیں)

جاگو جاگو۔ آنکھیں کھولو۔ زندہ ہو زندہ ہو۔

(مجسمہ آنکھیں کھولتا ہے لیکن ایک طرف ٹکٹکی لگی ہوئی ہے اور کوئی حرکت بھی نہیں کرتا)

[دوسرا ٹیچر داخل ہوتا ہے اور خاموش تقریر صرف حرکتوں کے ساتھ شروع کر دیتا ہے]

(مجسمے میں عقل آجاتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے لیکن اٹھ نہیں سکتا)

[لیڈی ٹیچر کھٹ کھٹ اس کی طرف بڑھتی ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگتی ہے]

(مجسمہ بھی ناچنے لگتا ہے اور لیڈی ٹیچر بورڈ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مجسمہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ ہیڈ ماسٹر ہے اور شان سے قدمیں رکھتا ہوا آگے آگے اور باقی سب پیچھے چلے جاتے ہیں۔)

سین دوسرا — ہیڈماسٹر کا آفس

(ہیڈ ماسٹر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور سامنے وہی دو ٹیچر اور لیڈی ٹیچر سر جھکائے کھڑے ہیں جن پر وہ بغیر آواز کے گرجتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ لیڈی ٹیچر یکایک بغاوت کرتی ہے۔ ہیڈ ماسٹر کا ہاتھ پکڑ کر بالجبر ناچنے لگتی ہے اور تھوڑی دیر آکر ہیڈ ماسٹر کا ہاتھ چھوڑ دیتی ہے۔ وہ گر جاتے ہیں مفلوج کی طرح۔)

[ایک ٹیچر غصّے کے ساتھ خاموش تقریر شروع کر دیتے ہیں اور ہیڈ ماسٹر پر سناٹا چھانا شروع ہوتا ہے جیسے کسی نے کلوروفارم سنگھا دیا ہو۔ حتیٰ کہ وہ بے حس ہو جاتے ہیں صرف آنکھیں کھلی ہوئی ہیں]

(دوسرا ماسٹر گاتا ہے۔)

مرجاؤ مرجاؤ۔ آنکھیں بند کرو۔ مرجا۔ مرجا۔ مرجاؤ)

(ہیڈ ماسٹر کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ لیڈی ٹیچر ہیڈ ماسٹر کا نام دیوار سے نکال کر ناظرین پہ پھینک دیتی ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

"مبارک باد" گیارویں اے کے ماسٹر بول اٹھے "آپ نے ایسا ڈرامہ لکھا جو آپ لکھ نہیں سکتے۔"

"کیا مطلب آپ کا؟" ہیڈ ماسٹر نے متفکر ہو کر پوچھا۔

"یعنی آپ سے اُمید ہی نہ تھی کہ آپ ایسی چیز لکھ سکیں۔ یہ مراد نہیں کہ آپ جیسے معزز عہدے کا انسان ادبی سرقے کا مرتکب ہو لیکن بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے۔"

"واقعی؟" ہیڈ ماسٹر نے مسکرا کر پوچھا "تو اب میرا یہ خیال ہے کہ یہ ادبی کوشش صرف صفحۂ کاغذ کی زینت ہی بن کر نہ رہ جائے۔"

"یہ تو ظلم ہو جائے گا۔" گیارویں بی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "صفحۂ کاغذ پر وہ زینت تو کیا صرف کیڑے مکوڑے کی صورت اور حیثیت رکھتا ہے۔"

"وہی تو میرا کہنا ہے۔" ہیڈ ماسٹر نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "کہ کہیں یہ صرف کیڑے مکوڑے ہی بن کر نہ رہ جائے بلکہ اسٹیج کا جامہ پہن کر۔"

"گائے اور ناچے۔ یہی مطلب ہے نہ آپ کا؟" گیارویں بی نے معصومانہ

انداز میں پوچھا۔
" جی ہاں! اور مجھے اُمید ہے کہ ہم سب کی مدد سے ادب کے اس ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے میں جان پڑ جائے گی"
" یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟ " گیارویں اے نہایت غصے سے کہنے لگے "کیا اس میں ابھی جان نہیں ؟ کیا یہ مُردہ ہے جو آپ ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس کو اسٹیج پہ لاکر زندہ کیا جائے ؟"
ہیڈ ماسٹر پر خاموشی چھا گئی۔ وہ سوچ رہے تھے وہ خود کیسے کہیں کہ ڈرامہ مُردہ ہے اور اسٹیج کا محتاج ہے۔ گیارویں اے کے ٹیچر نے اُن کے ڈرامے کی ترقی کے تمام امکانات کا گلا گھونٹ دیا تھا۔
" لیکن ڈرامے تو اداکاری کے لئے ہی لکھے جاتے ہیں۔" انھوں نے آخر کار سوچ کر کہا۔
" یہ کوئی ضروری نہیں۔ شیکسپیر تو پڑھا زیادہ جاتا ہے۔" دسویں کے ٹیچر نے کہا۔
" لیکن اس میں پڑھے جانے کا مصالحہ بہت ہے۔ یہاں تو صرف اداکاری کا مصالحہ ہے۔" لیڈی ٹیچر نے کہا۔
" جی ہاں۔ اس میں مکالمے تو ہیں ہی نہیں۔" ہیڈ ماسٹر نے عجلت سے کہا۔ "آپ نے اس بات کو خوب سمجھا مس کسم ملہاری۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ اس میں لیڈی ٹیچر کا پارٹ ادا کر سکیں گی ؟"
" لیکن مجھے ناچنا نہیں آتا۔" لیڈی ٹیچر نے شرماتے ہوئے کہا۔
دسویں بی ذرا رومانی قسم کے واقع ہوئے تھے۔ ان سے رہا نہ گیا اور جذبات میں آکر وہ کہہ اٹھے۔
" ناچ کیا نسوانی فطرت سے کوئی الگ چیز ہے ؟ عورت کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا تمام ایک لافانی ناچ ہے۔ کیا مچھلی کو بھی تیرنا سیکھنے کی ضرورت ہے ؟ جس طرح مچھلی کا وجود تیرنا ہی تیرنا ہے اسی طرح عورت کا وجود رقص ہی رقص ہے۔ عورت رقص کا وہ سورج ہے جو باہر سے روشنی کا محتاج نہیں بلکہ اپنی ہی روشنی سے لوگوں کے دلوں میں اجالا کئے ہوئے ہے۔"
" اور پھر ناچنا مجھے کب آتا ہے۔" ہیڈ ماسٹر نے لیڈی ٹیچر کو تسلی دیتے ہوئے کہا "ہم دونوں کو ہی تو ناچنا ہو گا اور وہ بھی نہایت شائستہ اور سنجیدہ طریقے سے"
" یعنی آپ دوبارہ ہیڈ ماسٹر بنیں گے ؟" گیارویں اے نے کہا "یہ تو بڑی خود غرضی ہے۔ دوسروں کو آپ ڈرامے میں بھی ہیڈ ماسٹر بننے کا موقع نہیں دیں گے ؟"
" موقع کیا معنی۔ میں تو ہیڈ ماسٹر ہوں ہی۔ اس میں بحث کی کوئی گنجائش ہے کیا ؟ البتہ میں آپ کو دوسرا پارٹ دیتا ہوں۔ کون سا لیں گے آپ ؟ تقریر کرنے والے کا یا گانے والے کا ؟"
" مجھے تو دونوں چیزیں نہیں آتیں۔" گیارویں اے نے گھبرا کر کہا۔
" لیکن تقریر کرنی ہی کہاں پڑتی ہے۔" لیڈی ٹیچر نے گیارویں اے کو سمجھایا "آپ کو خاموش تقریر کرنی ہے۔"
" تو منظور ہے۔" ماسٹر نے کہا۔
" خوب۔" ہیڈ ماسٹر نے کہا "اب کیا کوئی ایسا ہے جو گانا جانتا ہو ؟"
دسویں کے ٹیچر دل ہی دل میں گھبرانے لگے۔ انھیں کچھ کچھ گانا آتا تھا مگر وہ بہت دور میں تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ڈرامے کے ریہرسل وغیرہ آدھی آدھی راتوں کو ختم ہوتے ہیں اور اسکول شہر سے دور واقع تھا۔ وہاں راتوں کو جانا۔ ویران راستوں سے آنا۔ اس سے تو خیر وہ ڈر نہیں سکتے تھے۔ وہ کوئی بزدل تو تھے ہی نہیں۔ مگر اسکول خود جناتی مشہور تھا۔ جنات سے بھی وہ کوئی ڈرتے نہیں تھے۔ مگر خطرہ تو خطرہ ہی ہے۔ بڑے بڑے شیروں کو ایک سیسے کی گولی مار ڈالتی ہے اس کے باوجود ایک چیز انھیں ایثار پہ مجبور کر رہی تھی — مس کسم ملہاری — اس بیچاری نے اپنا نام کیوں دے دیا ہو گا۔ کہیں اس نازک وجود کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔
اتنے میں لیڈی ٹیچر نے خود ہی کہا "سیتا رام صاحب۔ آپ تو گا لیتے ہیں نا ؟ تال پہ اگر نہیں گا سکتے تو آپ کے ساتھ طبلہ رکھا ہی نہ جائے گا۔ صرف کوئی صاحب ستار جھنجھناتے رہیں گے، بس"
" اور تو کوئی چیز مجھے راضی نہیں کر سکتی تھی مس کسم۔" دسویں نے رومانی انداز میں کہا۔ "لیکن مجبوری یہ ہے کہ آپ کہہ رہی ہیں۔"
" شکریہ۔" مس کسم نے مذاق کرتے ہوئے کہا "میں اس خراج عقیدت کی ممنون ہوں۔"
" شکریہ مس کسم" ہیڈ ماسٹر نے کہا کہ آپ نے انھیں راضی کر لیا۔ اور شکریہ آپ سب کا جنھوں نے اس میٹنگ کو کامیاب بنایا۔"
" مبارک باد ہیڈ ماسٹر صاحب" گیارویں اے نے چیخ کر کہا۔

"بلکہ زندہ باد"

دوسرے دن ہیڈ ماسٹر کی فرمان نکلا اور بغرض ریہرسل دونوں ماسٹر اور لیڈی ٹیچر مع چوکیدار، ایک پیٹرومکس اور ہیڈ ماسٹر کے مستعدی کے ساتھ روزانہ رات کو اسکول میں جمع ہونے لگے۔

ایک رات دسویں کے ٹیچر جب اپنی سائیکل پر سوار آبادی کو چھوڑ اسکول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کی سائیکل کا لیمپ یکایک بُجھ گیا۔ جلتے ہوئے لیمپ میں ویسے کوئی خاص روشنی ہوتی بھی نہیں تھی۔ وہ تو صرف پولیس کے ڈر سے گویا ایک چمکدار چیز تھی لیکن اس کے اس پُراسرار طریقے پر بجھ جانے سے ماسٹر صاحب کچھ گھبرا گئے۔ انھوں نے آس پاس نظر دوڑائی شاید لیمپ کے بجھانے والا دکھائی دے کسی جھاڑ پر بیٹھا ہوا یا کہیں ہوا میں لٹکا ہوا۔ لیکن سوائے تاریکی کے کچھ دکھائی نہ دیا اور سوائے سنّاٹے کے کچھ سُنائی نہ دیا اور وہ اپنے تئیں کہنے لگے کہ آگ کا یہ ننھا سا دھڑکتا ہوا دل مجھے کتنی ہمت دیتا تھا یہ اُس کے بجھ جانے کے بعد ہی معلوم ہو رہا ہے۔ خیر اب اسکول بھی پاس آگیا ہے۔ وہاں تو سب ہوں گے ہی۔

اسکول کے گیٹ سے ماسٹر نے گردن لمبی کر کے اسکول کو اچھی طرح جانچا لیکن عجیب بات تھی کہ اتنی دیر ہونے پر بھی وہاں نہ دروازہ کھلا تھا، نہ روشنی تھی، نہ انسانی آوازیں، کیا روشنی کائنات سے ہی اڑی جا رہی تھی، نہ آسمان میں چاند، نہ سائیکل میں لیمپ، نہ اسکول میں پیٹرومکس، اب اسکول رات کے وقت کوئی انتظار کرنے کی جگہ تھی؟ "میں نے بھی خواہ مخواہ یہ ڈرامے کا دردِ سر مول لے لیا۔ بقول شاعر، "ہم درد مند کیا مر گیا"، اور یہ سب کرتوت ہیں مس کسم بلہاری کے، اور لُطف یہ کہ آپ بھی غائب، کم از کم وہ موجود ہوں تو جان دینے میں بھی مزہ آجائے، کیونکہ یہاں ہر قسم کے انس و جن کے موجود رہنے کا امکان ہے۔"

اتنے میں سرسر کی آواز آئی اور ماسٹر چونک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ اسکول کی طرف ایک رکشا آ رہا تھا۔

"مس کسم آ ہی پہنچیں" ماسٹر نے نہایت اطمینان سے اپنے تئیں کہا۔ "رومان بھی فطرت کا ایک کھلونا ہے جسے وہ عجیب عجیب موقعوں پر عجیب عجیب طریقوں سے کھیلتی ہے۔"

جیسے رکشا گیٹ کے قریب آیا ماسٹر نے رکشا کی طرف زور سے کہا:

گھبرانے کی کوئی بات نہیں مس کسم۔ میں آخر یہاں حاضر ہوں۔"

"آپ کس چیز سے گھبرا کر مجھے ہمت دلا رہے ہیں؟" لیڈی ٹیچر نے سوال کیا۔

"آپ یہ نہیں دیکھ رہی ہیں کہ اسکول ابھی تک خاموش، تاریک اور غیر آباد ہے؟"

"یعنی آج ریہرسل دیر سے شروع ہوگا، اور کیا؟" لیڈی ٹیچر نے اسکول کی دوسری طرف کی سڑک پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "لیجئے شاید ہیڈ ماسٹر بھی آ رہے ہیں۔ وہ دور۔"

ماسٹر یہ سُن بھی نہ پائے تھے کہ یکایک چونکے، اُن کے پاس ہی گیارہویں کے ٹیچر دھم سے سائیکل پر سے اُتر رہے تھے۔

"مسٹر سیتارام۔ کچھ سُنا تم نے؟ کیا کر رہے ہو یہاں؟ ہیڈ ماسٹر صاحب کا دل چلتے چلتے رُک گیا۔ اسی لئے آج کوئی نہیں آئے گا۔ سب کو میں نے یہ خبر پہنچا دی۔"

"کیا ہیڈ ماسٹر صاحب ختم ہو گئے؟" لیڈی ٹیچر نے پوچھا۔

"میں کہہ کیا رہا ہوں؟ دل رُک جائے اور انسان زندہ رہے؟" اور گیارہویں اسے تیزی سے واپس ہو گئے۔

"بھئی سُنو تو میں بھی آ رہا ہوں۔" دسویں نے کہا مگر گیارہویں اسے نہ رکے

"مس کسم آپ کا سائیکل رکشا چلانے والا نہایت تیز معلوم ہوتا ہے لہٰذا میں روانہ ہوتا ہوں۔" دسویں نے لیڈی ٹیچر سے اجازت لی اور گیارہویں اسے کا پیچھا کرتے ہوئے نکل گئے۔

لیڈی ٹیچر ہیڈ ماسٹر نما چیز سے جو دور سے آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی ڈر کر رکشا والے کو ڈانٹتی ہوئی تیزی سے نکل گئیں اور اسکول دوبارہ ایک تاریک سناٹے میں گھر گیا۔

کچھ منٹ کے اندر اسکول کے احاطے میں دوسری طرف سے بلاشک و شبہ پکوڑی لال ہیڈ ماسٹر داخل ہوئے "ابھی تک کوئی نہیں آیا۔" وہ زور زور سے بڑبڑانے لگے "خیر ایک چابی میرے پاس بھی ہے۔"

انھوں نے ریہرسل کا بڑا ہال کھولا اور اندھیرے میں ڈرامے کے پردے کے پاس ایک اسٹول پر قبضہ کیا۔ پیٹرومکس بھی اب آتا ہی ہوگا انھوں نے سوچا۔ یہیں انتظار کیا جائے تاکہ دوسروں پر ظاہر ہو جائے کہ ڈرامے میں

دل چسپی لینا کسے کہتے ہیں۔ گھر میں تو انھوں نے جتا ہی دیا تھا کہ ریہرسل یہی چلا یعنی پوری رات کے لئے بے فکر ہو جانا تھا۔ غرضیکہ وہ اپنے ہی پارٹ کا ریہرسل اس زور شور سے انجام دینے لگے کہ انھیں نہ وقت کا خیال رہا نہ یہ کہ وہ تنہا تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ چونکے اور کہنے لگے: "نامعقول لوگ! خیر ان کا ضمیر خود انھیں کاٹے گا۔ فی الحال ایک ہدایت کار کی حیثیت سے ذرا دوسرے پارٹ کی بھی مشق کر لوں۔"

ہیڈ ماسٹر اندھیرے میں بیک بینی و دو گوش پورا ڈرامہ اسٹیج کرنے لگے کبھی وہ کرسی پر پہنچ کر مجسمہ بن جاتے، کبھی خاموش تقریر فرماتے، کبھی گاتے اور کبھی لیڈی ٹیچر بنے ہوئے ناچنے لگتے۔ آخر کار جب ڈرامہ ختم ہونے پر آیا تو وہ بالکل تھک چکے تھے۔ اور جب خیالی مس کسم بلہاری نے انھیں جھٹکا دیتے ہوئے چھوڑ دیا تو وہ اسٹیج پر بچھے ہوئے کینوس پر گر کر خاموشی سے لیٹے رہے۔ وہی اُن کی اداکاری کا کمال تھا وہ سوچنے لگے جب کہ انھوں نے موت کی ایکٹنگ کرنی تھی ——
خاموش بے حس موت۔ ہمیشہ سونے والی موت، افسوس کہ انھیں دیکھنے والا کوئی موجود نہ تھا۔ لیکن عنقریب ہی سب آجائیں گے۔ بلکہ اس دوران میں اگر ہیڈ ماسٹر سو گئے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ماسٹر دیکھیں گے کہ ہیڈ ماسٹر اپنی اداکاری کو کمال پر پہنچانے میں کم از کم آدھا کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی نیند گویا اجل کی نیند تھی۔

ہیڈ ماسٹر نے آنکھیں بند کر لیں اور موت کی ایکٹنگ میں آدھے کامیاب ہو گئے یعنی انھیں نیند آگئی۔

دوسرے دن اسکول کا ٹورنامنٹ تھا۔ کھیلوں میں حصہ لینے والے لڑکے اور لڑکیاں، ٹیچر اور لیڈی ٹیچر نہایت صبح ہی چپراسی کو لئے ہوئے اسکول میں آپہنچے۔ پاس ہی سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ڈی۔ پی۔ آئی بھی اپنی میم صاحبہ کو ٹہلاتے ہوئے مجمع کو دیکھ کر اسکول کی طرف آنکلے۔ چپراسی کو بڑا ہال کھولنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ وہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا اور اندر سے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔

ڈی۔ پی۔ آئی اور اُن کی میم صاحبہ اور تمام ٹیچر اور کچھ بڑے لڑکے آہستہ آہستہ ہال میں داخل ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اسٹیج پر ابھی ابھی موت کی اداکاری میں مشغول تھے۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب کا خیال ہے کہ ماسٹر ہی اُن کی روح ہیں۔ اگر ماسٹر نہ ہوں تو ہیڈ ماسٹر کا وجود ہی نہیں۔ لہٰذا ہم لوگ اُن کے ڈرامے کے ریہرسل میں نہیں آئے تاکہ وہ ختم ہو جائیں۔" گیارہویں اسے نے کہا۔
ہیڈ ماسٹر کی آنکھ اس وقت کھلی جب ڈی۔ پی۔ آئی اپنی انگریزی ہوتی آواز میں کہہ رہے تھے۔
"ام سب سمجھا۔" لیکن گرد و غبار میں پیٹے ہوئے اور کینوس پر لیٹے ہوئے ہیڈ ماسٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا اور ہیڈ ماسٹر اپنی ہیڈ ماسٹری کی موت کی اداکاری میں واقعی کامیاب ہو گئے یعنی شہنشاہیت کے اس ننھے سے چراغ کو بھی ظالم جمہوریت نے بجھا دیا۔

قومی آمدنی

۱۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے آغاز پر بھارت کی قومی آمدنی ۹۱۱۰ کروڑ روپے تھی۔ مگر ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۱۰۸۰۰ کروڑ روپے ہوگئی۔ اس طرح اس عرصے میں قومی آمدنی میں ۱۸ فی صدی اضافہ ہوا۔

۲۔ اگر قیمتیں ساکن رہیں تو دوسرے منصوبے کے اختتام پر قومی آمدنی ۱۳۴۸۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہو جائے گی۔

۳۔ فی کس آمدنی ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۲۵۰ روپے سے بڑھ کر ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۲۸۱ روپے ہوگئی۔ اور ۶۱-۱۹۶۰ء میں یہ ۳۳۰ روپے ہو جائیگی۔

۴۔ کل قومی آمدنی میں زراعت اور متعلقہ پیشوں کا حصہ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۴۸ فی صدی سے گر کر ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۴۴ فی صدی ہو جائے گا۔ اس کے برعکس کانوں اور فیکٹریوں کا حصہ ۹ فی صدی سے بڑھ کر ۱۱ فی صدی ہو جائے گا۔

۵۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں سرمایہ کاری کے مجوزہ پروگرام کو پورا کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ گھریلو بچت کی مقدار بڑھائی جائے جس سے کہ اس وقت قومی آمدنی میں اس کا ۷ فی صدی کا جو حصہ ہے وہ ۶۱-۱۹۶۰ء تک دس فی صدی ہو جائے۔

سید فرید الوحیدی

دارالعلوم دیوبند

ہندوستان کے عوام جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شکست کھا گئے اور اپنی آخری جدوجہد میں ناکام ہوئے تو انگریزوں کو وسیع پیمانے پر اور علی الاعلان ہندوستانیوں کو کچلنے کا موقع ملا اور انھوں نے ہر ممکن طریقے سے ہندوستانی اقوام کے جذبۂ آزادی کو دبانا شروع کیا۔ حکومت نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ ملک کو فتح کر لینے سے زیادہ مشکل اور مضبوط کام اس فتح مندی کی بقا اور استحکام ہے۔ نیز اگر عوام کے دل و دماغ کو مسخر کر کے اس پر قبضہ نہ کر لیا گیا تو فتح و حکومت کو کسی بھی وقت یہ نشۂ حریت میں سرشار اور قوت و طاقت سے مجبور عوام شکست و غلامی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

چناں چہ ۱۸۵۷ء کے عزائم اور ولولوں کو ختم کرنے کے لئے اور قلوب و اذہان کا رُخ بدلنے کے لئے سب سے پہلے برٹش گورنمنٹ نے تعلیم اور طرزِ تعلیم کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور کافی غور و خوض کے بعد اپنے جاری کردہ نصاب و طرزِ تعلیم کے ذریعے عوام کی قوتِ فکر کو مفلوج کرنا شروع کیا۔ چناں چہ "لارڈ میکالے" نے کہا تھا۔

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی ہوں" (مدینہ ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء)

اس آخری کوشش کے بعد ہندوستانی عوام و خواص کے لئے جدوجہد آزادی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ اور وہ آزادی لانے اور آزادیٔ وطن کے لئے کوئی آواز نہ اٹھا سکتے تھے۔ مذاہب کا احترام، رواداری، علماء و بزرگوں سے محبت و عقیدت، اور وطن پرستی، یہ تمام خصوصیات ہندوستانی دماغوں اور اذہان کے امتیازات تھے۔ مفتوحہ اقوام میں ان جذبات کی موجودگی کو فاتح اقوام نے بڑے خطرہ کی نگاہ سے دیکھا۔ اور بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ جب تک یہ جذبات ہندوستانیوں میں موجود رہیں گے وہ وفادار اور فرماں بردار رعایا نہ بن سکیں گے۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ انھیں جذبات کو فنا کرنے کے لئے اور اسی قسم کے منصوبوں کے ماتحت انگریزی تعلیم اور مشنری کالج اور اسکولوں کی بنیاد رکھی گئی اور ان ذرائع سے وہ فکر اور طرزِ زندگی عام کیا گیا جس کا لازمی خاصہ، وفاداری لامذہبیت اور وطن دشمنی تھا۔ ان اسکولوں اور کالجوں کے اثرات بہت جلد تمام ہندوستان میں آگ کی طرح پھیلنے شروع ہو گئے، اور نوجوان دماغوں اور فکری قوتوں میں ان اثرات نے زہر کی طرح سرایت کرنا شروع کر دیا۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

"ہمارے اینگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو[1]"

اور اس طرح اس طریقۂ تعلیم اور طرزِ فکر سے متاثر ہو کر نوجوانوں نے خود اپنے ہی ملک کی غلامی کو مضبوط کرنے کے لئے انگریزی مشینری کے بہترین پرزوں کا کام دینا شروع کر دیا اور انگریز اپنی اسکیم کی اس کامیابی سے بہرہ اندوز و مطمئن ہونے لگے۔ چناں چہ اپنے کالجوں اور اسکولوں کے طلب کا ذکر کرتے ہوئے ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے:۔

"ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے[2]"

---

[1] [2] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مصنفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ ۲۰۲۔

ان حالات میں ہر صاحبِ عقل و ہوش بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں آزادی اور وطن پرستی کی بنیادوں پہ کام کرنے والے مدارسِ فکر Schools Of Thought کی کس قدر ضرورت تھی۔ آج جب کہ ہمارا ملک آزاد ہے اور ہم اپنے تعمیری منصوبوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ شاید یہ بات ہم آسانی سے قبول نہ کریں، مگر مستقبل قریب میں اگر دورِ غلامی اور جدوجہدِ آزادی کی صحیح تاریخ ہمارے سامنے آئی تو ہم یقین کرنے پر مجبور ہوں گے، کہ آزادی درحقیقت اُنہی مجذوبانہ عزائم کا ثمرہ ہے جن کی ابتداء ان خاموش اور ٹھوس کام کرنے والے اداروں نے غلامی کے بالکل ابتدائی دور میں کی تھی انھیں School of Thoughs میں ایک سب سے بڑا اور مؤثر مدرسۂ فکر دارالعلوم دیوبند ہے۔ جنگِ آزادی میں دارالعلوم نے جس قدر کام کئے ہیں اور ملک کی جو بیش قیمت اور عظیم الشان خدمتیں کی ہیں اُن کو ایک مورخ کا قلم کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ ہندوستان کے ہر صوبہ میں اس مکتبِ خیال کے نمائندے آزادیٔ وطن کے لئے اپنی جانوں کی بازی لگا کر سرگرمِ عمل رہے۔ اس موضوع کی تفصیلات کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے لئے مستقل عنوان، وقت اور صفحات کی ضرورت ہوگی۔ تاہم نہایت مجمل سا اندازہ کرنے کے لئے اس قدر اشارہ کافی ہوگا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمان، مولانا سید محمد میاں، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد علی مرحوم اور خان عبدالغفار خاں اُن لاتعداد ممتاز ناموں میں ہیں جو سیاسی اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ اور ذہنی اعتبار سے اس کی پیداوار ہیں اور جن میں مرنے والے وطن پر قربان ہوئے اور بقیہ حیات ملک کے لئے وقف ہیں۔ یہ شخصیتیں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ نہ صرف آج کا ہندوستان بلکہ آئندہ نسلیں بھی ان ناموں اور ان کے کاموں کو فراموش نہ کر سکیں گی۔

یوں تو دارالعلوم کا دائرۂ عمل ہندوستان کے چپے چپے پر پھیلا ہوا ہے مگر اس کا مرکز "دارالعلوم دیوبند" ہے۔ مغربی یوپی کے ضلع سہارن پور کا نامور ریلوے کی دہلی امرتسر لائن پر دلی سے کم و بیش نوے میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا قصبہ "دیوبند" شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں معلوم و معروف ہے۔ آج سے پورے ۸۹ برس پہلے ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا فضل الرحمان، حاجی سید عابد حسین اور مولانا ذوالفقار علی اور دوسرے متعدد بزرگوں نے ذکر کردہ حالات و ضروریات کے پیشِ نظر ایک چھوٹی سی مسجد میں اس درس گاہ کا آغاز کیا اور سب سے پہلا طالب علم بچہ "محمود" اس مکتب میں داخل کیا گیا۔ خلوص بے غرضی اور بے نفسی کی اس سے بہتر مثال مشکل سے ملے گی کہ مسجد کا یہ مکتب چند ہی سالوں کے بعد دارالعلوم بن گیا اور یہ سب سے پہلا طالب علم بچہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کہلایا۔

یوں تو ہمارے ہی ملک میں نمود و نمائش، شوکت و عظمت، اور تعداد طلباء اور اساتذہ کے اعتبار سے بہت سی یونیورسٹیاں دارالعلوم کے مقابلے میں سبقت کر جائیں گی۔ مگر آزادیٔ رائے، حقِ خود ارادیت اور حریتِ فکر کے علاوہ جو خصوصیت دارالعلوم کو دنیا کی تمام علمی درس گاہوں اور اداروں میں ممتاز کرتی ہے اور منفرد درجہ تک پہنچاتی ہے وہ اُس کی شانِ استغنا اور دولت و قوت سے بے نیازی ہے۔ جب یہ درس گاہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے کوتاہ تھی اور حکومت اور پرستارانِ حکومت کے نرغہ میں تھی۔ اُس وقت بھی اس کی گردن ہر قسم کے بارِ احسان سے سبکدوش اور اس کی فکر ہر قسم کے اثرات سے آزاد تھی۔ اور آج جب کہ یہ ایک کافی پھیلا ہوا کام ہے اس کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ سالانہ اخراجات پانچ لاکھ سے متجاوز ہیں۔ درس گاہ کسی اسٹیٹ، سلطنت اور کسی مملکت یا ٹرسٹ کی مرہونِ کرم نہیں ہے۔ نیز دماغ کے اعتبار سے ہر خارجی اثر سے آج بھی پوری طرح آزاد ہے۔ دارالعلوم کے بجٹ کی تکمیل کا سارا انحصار عام لوگوں کے قومی چندوں پر ہے جو ہندوستان کے ہر خطے کے علاوہ پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا، افریقہ، امریکہ اور انگلستان کے مختلف علاقوں سے دارالعلوم کو موصول ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں اتنا بڑا ادارہ مشکل سے ملے گا جو کسی اسٹیٹ یا گورنمنٹ امداد کے بغیر صرف عوامی امداد کے بل بوتے پر اپنے اخراجات پورے کرتا ہو۔ اپنی اس نوعیت کے اعتبار سے یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ دارالعلوم دنیا کی ایک ممتاز یونیورسٹی ہے۔ دوسری خصوصیت جس کے پیشِ نظر بلا تامل دارالعلوم کی انفرادیت و امتیاز کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے کہ ہر طالب علم کو مفت تعلیم، مفت قیام گاہ اور مفت کتابیں دی جاتی ہیں۔ نیز مجلسِ علمیہ کے معیار پر پورے اُترنے والے طلباء کیلئے لباس، طعام، روشنی، طبی امداد کا بالکل مفت بندوبست کیا جاتا ہے اور ایسے طلباء کی تعداد ہر سال آٹھ سو تک پہنچتی ہے۔ اس وقت اطرافِ ہندوستان کے علاوہ جاوا، افغانستان، تبت، نیپال، جنوبی افریقہ، برما، پاکستان اور انڈو چائنا کے چودہ سو طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ تمام تر مضامین جو یہاں پڑھائے

جارہے ہیں اُن کا محور "اسلامیات" ہے اور اسی سے متعلق زیادہ تر مضامین مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، عربی ادب، فلسفہ، منطق اور معانی و بیان کے لئے یہاں بہترین اساتذہ کا انتظام ہے۔ ان کے علاوہ طب یونانی اور فنِ خطاطی کے لئے بھی مکمل انتظامات ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک شعبہ دارالصنائع Technica School بھی قائم ہے جس میں سلائی، جلدسازی اور بعض دوسرے چھوٹے چھوٹے کام سکھائے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور جاذبِ نظر یہاں کا عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ ایک لاکھ کی تعداد میں مختلف علوم و فنون کی بیش قیمت اور نادر کتابوں سے مزین یہ کتب خانہ سیاحوں اور مہمانوں کو اپنے قلمی مخطوطات اور تاریخی نوادر کی جانب بڑی جاذبیت کے ساتھ مائل کرتا ہے۔ اور کتب خانہ کی عظمت اور اس کی یاد بہت عرصہ تک اُن کے دماغوں میں جاگزین رہتی ہے۔ مختصراً اتنا کافی ہے کہ یہ کتب خانہ ہندوستان کے معدودے چند عظیم الشان کتب خانوں میں سے ایک ہے۔

دارالعلوم کا انتظامی طریقِ کار موجودہ تعلیمی اداروں سے کافی حد تک مختلف ہے۔ مجلسِ شوریٰ جسے آج کی اصطلاح میں مجلسِ انتظامیہ کہنا چاہئے۔ اس کی تشکیل وہی ہے جو آج سے ۹۰ برس پہلے ابتداء میں کی گئی تھی۔ جب کسی ممبر کی جگہ خالی ہوتی ہے (جو موت یا استعفا سے ہو سکتی ہے) تو بقیہ ممبرانِ مجلس کسی میٹنگ میں متفقہ طور پر کسی شخصیت کا انتخاب کر لیتے ہیں اور اس طرح ممبران اگرچہ تبدیل ہوتے رہے مگر بنیادی تشکیل وہی رہی ہے جو ابتداء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ممبران کے انتخاب میں ابنائے قدیم (اولڈ بوائز) اور حلقہ ہمدرداں کی رائے کو کوئی دخل نہیں۔ انتظامی اعتبار سے دارالعلوم دو بنیادی شعبوں پر منقسم ہے۔ علمی رفتار کی نگرانی اس کی تنظیم طلباء کے تعلیمی، تہذیبی اور اخلاقی حالات کی دیکھ بھال، اساتذہ کی کارگزاری کا جائزہ، اس پر ترقی و نتائج کی ترتیب یہ تمام تعلیمی امور "شعبہ تعلیمات" کے تحت ہیں۔ جس کے حاکم اعلیٰ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ہیں۔ اس ذمہ داری کے علاوہ مولانا مدنی حدیث کے تین سبق پڑھاتے ہیں۔ جن پر مجموعی طور پر روزانہ چھ گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔

دارالعلوم کی تعمیرات، حسابات، تعلیمات کے شعبہ کے علاوہ دوسرے ملازمین کی کارگزاری کی نگرانی اور عام فروعیات پر نظر رکھنا شعبۂ اہتمام کا کام ہے۔ جس کے مہتمم اور حاکمِ اعلیٰ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ہیں۔ آپ کی شخصیت ملک کے تمام حصوں میں معروف و معلوم ہے۔ مولانا محمد طیب صاحب اپنی بے مثال طرزِ خطابت اور علمی حیثیت کی بنا پر مقبولِ عوام و خواص ہیں۔ دارالعلوم میں ذریعہ تعلیم عربی اور اردو ہی ہے لیکن اگر کوئی طالب علم امتحان میں اپنے جوابات اُردو میں لکھنا چاہے تو اُسے اجازت دی جاتی ہے۔ امتحانات تحریری و تقریری دونوں طریقوں سے ہوتے ہیں بیشتر حصہ تحریری ہوتا ہے مگر تعلیم کے ابتدائی دور میں دو سال تک امتحان تقریری ہوتے ہیں۔

نظامِ تعلیم درجات کے اعتبار سے منقسم نہیں ہے بلکہ پورے نصاب کو چند سالوں پر تقسیم کر کے ہر سال کے لئے کچھ کتابیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ امتحانات بھی مضمون کے نہیں بلکہ کتابوں کے اعتبار سے ہوتے ہیں اور ہر کتاب کے لئے علاحدہ علاحدہ پرچے ہوتے ہیں۔ چنانچہ طالب علم جن کتابوں میں ناکامیاب ہوتا ہے صرف انہی کتابوں میں اس کی ترقی رکتی ہے بقیہ کتابوں میں آگے ترقی ملتی رہتی ہے۔ بظاہر یہ بات بہت انوکھی معلوم ہوتی ہے مگر اس کی وجہ تعلیم اور مقاصدِ تعلیم کا وہ بنیادی اختلاف ہے جو دارالعلوم اور موجودہ تعلیمی اداروں میں پایا جاتا ہے۔ دارالعلوم میں صرف ایک ہی "سند" (ڈگری) دی جاتی ہے اور وہ اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک نصاب کی تمام کتابیں اور لازمی مضامین پورے نہ کر لئے جائیں بخلاف موجودہ انگریزی طریقِ تعلیم کے کہ یہاں ہر دو سال بعد ایک سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے چنانچہ اگر دارالعلوم میں کسی ایک کتاب میں فیل ہو جانے پر اس سال کی مقررہ تمام کتابوں میں اس کی ترقی روک دی جاتی ہے تو طریقِ تعلیم کے اعتبار سے اس کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔ مگر طالب علم کا کافی نقصان ہو جاتا ہے اگر موجودہ زمانے اور رواج عام کے مطابق نصاب کو درجات پر تقسیم کر دیا جائے تو اس تعلیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ کیونکہ "فاضل دارالعلوم" کی سند کا مفہوم یہ ہے کہ اس سند کا حامل "اسلامی علوم" کا فاضل ہے اور یہی معیار مقصود ہے۔ عالم یا فاضل کی کوئی سند اس سے کم معیار پر نہیں دی جا سکتی۔ اس معیار پر پہنچنے کے لئے تمام نصاب ضروری ہے جو آٹھ سالوں پر تقسیم کیا گیا ہے اسی نصاب اور مضامین کو پڑھنے کے بعد اس سلسلے کی سب سے پہلی اور آخری سند "فاضل" دی جاتی ہے۔ اس طرح دارالعلوم کے طرزِ تعلیم پر وہ تمام تنقیدیں جو وقتاً فوقتاً کی جاتی ہیں، مقصد اور نتائج سے لاعلمی پر مبنی ہیں۔ ہاں! اس بنیادی اور مقصدی سند کے علاوہ دارالعلوم کے مختلف شعبوں کے علاحدہ سرٹیفکیٹ ہیں جن کے ماتحت مکمل نصاب ہے مگر یہ سرٹیفکیٹ چند مخصوص مقاصد کے علاوہ عام حیثیت میں بے قیمت ہیں۔ امتحانات کے انتظام کے لئے ایک علاحدہ اور مستقل شعبہ ہے۔ یہ شعبہ اس سلسلہ میں مکمل اختیارات رکھتا ہے۔ اس کے ناظم اعلیٰ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی ہیں۔ علامہ موصوف دارالعلوم میں بحیثیت منطق اور فلسفہ کے استاد ہیں اور موخر الذکر فنون میں آپ کو ہندو پاک میں امتیازی شان حاصل ہے۔

جہاں تک عمارت کا تعلق ہے دارالعلوم کی عمارات عہدِ مغلیہ کی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں بحیثیت مجموعی عمارت ایک قلعہ نظر آتی ہے اور ایک ہی احاطہ میں تمام شعبہ جات درسگاہیں، دارالاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) اور دفاتر محصور ہیں۔ درحقیقت عمارتیں بہت مضبوط، خوش نما اور آرام دہ ہیں۔

شعروسخن

(دعاؔ ڈبائیوی)

اُن کی نگاہِ لطف بھی وجہِ خوشی نہیں — کیا اس کا اعتبار کبھی ہے کبھی نہیں

میں بھول جاؤں اُن کو یہ ممکن نہیں کبھی — دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں

یہ تمکنت تو دیکھئے تصویرِ یار کی — سُنتی ہے سب کی مُنہ سے مگر بولتی نہیں

کچھ بات ہے ضرور جو وہ خوش ہیں آج کل — ورنہ نصیب میں تو اپنی خوشی نہیں

دیوانگیٔ عشق بھی قسمت کی بات ہے — ہر ایک کو نصیب یہ دیوانگی نہیں

ناکامیٔ امید نے مُردہ بنا دیا — رنج و خوشی کا اب مجھے احساس ہی نہیں

دیوانہ تو ضرور ہے دیوانہ آپ کا — دیوانگی بصورتِ دیوانگی نہیں

میرے کلام میں نہ ہو تاثیر کیوں دعاؔ

یہ سرگزشتِ دل ہے فقط شاعری نہیں

(ابوالحامد نظامی)

کب تک خیالِ یار ہے دیکھیں تو ہمسفر — یہ غم کی دھوپ اور یہ حوادث کی رہگذر

مانا کہ دل نواز و محبت نواز ہے — لیکن وہ اک نگاہ بھی ہے غیر معتبر

جیسے رکا ہوا ہے وہیں کاروانِ زیست — کیا چیز تھا وہ لمحۂ یک فرصتِ نظر

غم مستقل یہاں نہ خوشی کو ثبات ہے — نظمِ جہاں ہنوز ہے کچھ غیر معتبر

محسوس کر رہا ہوں ترے عشق کے سوا — دل کے قریب اور بھی کتنے ہیں نیشتر

لطفِ نگاہ و عارض و گیسو بھلا چکے — ڈالی غمِ حیات پہ لے دے کے جب نظر

ہم کو خبر ہے آج یہ سب کو خبر کہاں — اک اور بھی سحر ہے پسِ پردۂ سحر

اب کاروانِ صبح نظاؔمی قریب ہے

روشن دکھائی دیتی ہے ظلمت کی رہگذر

(شاؔد عارفی)

خیالِ عرضِ دل تھا مگر یہ سوچتا رہا — ہزار بار کی گئی "گزارشوں" کا کیا رہا

قریب رہ کے بھی جو خار و گل میں فاصلہ رہا — تو پھر چمن کی زندگی سے کون فائدہ رہا

کسے خبر نہیں کہ ہے وہ بے تمیز رنگ میں — بڑا سوال تو نقاب اُٹھا کے دیکھنا رہا

تمھیں کو چاہتا ہوں میں تمھیں سے تمھیں شکایتیں — تمھیں پہ اعتماد ہے تمھیں پہ فیصلہ رہا

سکونِ دل جنھیں نصیب ہے اُنھیں سے پوچھئے — تڑپ اگر نہیں رہی تو زندگی میں کیا رہا

علاوہ ہوش سے اُدھر کی بات ہی کچھ اور ہے — بہت دنوں فریبِ آگہی میں مبتلا رہا

اسی روش پہ رونا ہوا ہے اس کا سامنا — وہ "حسنِ اتفاق" کب رہا جو بار بار رہا

وہ اصطلاحِ شاعری میں شاؔد کامیاب ہے

جو اُس گلی کا ہو رہا جو اُس کے در پہ جا رہا

(راجیندر بہادر موجؔ)

نہ آنکھوں میں آنسو نہ ہونٹوں پہ آہیں — محبت کو ملتی نہیں اب پناہیں

سرِ طورِ دل ایک بجلی سی چمکی — نہ معلوم کیا کہہ گئیں وہ نگاہیں

جہاں کارواں بھول جاتے ہیں رستہ — وہیں سے نکلتی ہیں منزل کی راہیں

جو ہے ذوقِ سجدہ تو پیدا بھی کر لے — نئے سر نئے دل، نئی سجدہ گاہیں

بہشتِ جنوں، کوہِ غم، باغِ حسرت — کوئی آکے دیکھے مری سیرگاہیں

ہوا موجؔ تو کیوں غریقِ محبت

کہیں اس سمندر کی ملتی ہیں تھاہیں

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

اُردو ادب میں اِسّے

(۲)

دوسرا دور سرسید کا دور ایسے کا تو پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل ہی میں تیسرے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرسیّد اور اُن کے رفقائے کار نے آیندہ کے لئے زمین تیار کر دی تھی۔ مگر چوں کہ اس وقت خوابِ غفلت کی گرانی سے قوم کی عقل و خرد ماؤف تھی اور دل کی دُنیا بے عملی نے حرارت پیدا نہیں کی تھی۔ اس لئے آنکھ کھلتے ہی جو آواز کانوں میں پڑی اس پر چل پڑے۔ سرسید کی تلقین "اتباعِ مغرب" اور حالی کا مشورہ "تو با زمانہ بساز" رنگ لایا تھا۔ جہاں تک مسلم قوم کا تعلق ہے۔ علی گڑھ کالج کا روشن خیال جوان اس بیداری کا پیٹنٹ تھا۔ اس کو دیکھ کر زمانے کے نبض شناسوں کو مایوسی ہوئی کہ قوم غفلت سے بیدار تو ہوئی مگر مغرب کے طلسم خانے میں پھنس کر رہ گئی۔ پیرانِ طریقت کی وفاکیشی نے قوم کو سیاست کے جھمیلوں سے بالکل آزاد کر دیا تھا لیکن سرسیّد اور علمائے دین کے اختلافات نے نئی پود کو مذہب سے بھی دُور کر دیا اور مذہب سے دور ہوئے تو ان کے لئے اخلاقی اقدار بھی مضحکہ خیز ٹھہریں۔ ان اختلافات اور مختلف نظریوں کے تصادم نے قوم میں بے راہ روی پیدا کر دی۔ ان حالات میں بیدار مغزوں کی نئی جماعت نے بکھرے ہوئے شیرازے کو منسلک اور صحیح اسپرٹ پیدا کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ شبلی نے اسلام اور اسلامی تاریخ و معاشرت و ادب کو صحیح طریقے پر پیش کر کے مغرب زدوں کو مشرق کے آفتابِ عالم تاب کی طرف متوجہ کیا۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کے ذریعے سیاست و مذہب کی عظمتوں کو اُجاگر کر کے اسلامی حریّت کا تصوّر پیش کیا۔ اس طرح چکبست اور اکبر، پنڈت برج موہن کیفی وغیرہ نے اپنی شاعری سے وطنیت و قومیت، مشرقی پاسِ وضع، اتحاد و اتفاق اور مذاہب کی اقدار کو پیش کیا۔ غرض اس دور کے بزرگوں کی کوششوں سے آزادی کا تصوّر جڑ پکڑنے لگا اور ملک کی ایکائی کے خیال کو تقویت ملی۔ ان کاوشوں کا نتیجہ جنگ کے بعد رونما ہوا۔ اور بقول سجاد انصاری "سرسیّد کی تلقینِ وفا وقار الملک کی تعلیم خودداری سے بدل گئی" اور "پیرِ وفا کی خانقاہ سے مجاہدینِ اسلام کا لشکر۔۔۔ نکلا"۔

مذکورہ بالا ذہنی انقلاب ادب کا ہی مرہونِ منت ہے اور ادب میں شاعری کے بعد مقالہ نگاری کو ہی سب سے زیادہ اعزاز حاصل ہے۔ اس ذہنی انقلاب سے زندگی اور ادب کے مختلف شعبے متاثر ہوئے۔ اس طرح مقالہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا کہ سینکڑوں مقالہ نگار میدان میں آ گئے۔ ان چند مقالہ نگاروں میں سے یہاں چند صاحبِ طرز مقالہ نگاروں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔ اس دور کے لکھنے والوں کو دو گروہوں میں اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروہ میں شرر، سجاد انصاری، حسن نظامی، پنڈت برج موہن کیفی، سید سلیمان ندوی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، اسلم جیراج پوری، وحید الدین سلیم، سر عبدالقادر، حبیب الرحمان شروانی، حافظ محمود شیرانی، چکبست، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظمت اللہ، مرزا عظیم بیگ، ملا رموزی، دیا نرائن نگم، احسن مارہروی، اختر جوناگڑھی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ علمی ادبی خدمات انجام دے کر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ دوسرے گروہ سے ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو، ابوالکلام آزاد، ہاشمی فریدآبادی، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری، عبدالمالک آروی، عبدالمجید سالک، عبدالسلام ندوی رشید احمد صدیقی وغیرہ تعلق رکھتے ہیں۔ اس گروہ کے بزرگ اردو ادب کے میدان میں آنے والوں کی رہبری کی گراں قدر خدمت اس وقت انجام دے رہے ہیں۔

اس دور میں تقریباً ہر شعبۂ ادب و زندگی کے متعلق مقالے لکھے گئے ہیں

جن میں تحقیقی، علمی، ادبی تنقیدی، مقالوں کی کثرت ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق، محمود شیرانی وحیدالدین سلیم، سید سلیمان ندوی، پنڈت کیفی نے ادبی مقالوں کے علاوہ تحقیقی اور لسانی مقالے لکھ کر مقالہ نگاری میں وسعت پیدا کر دی۔ مسعود حسین رضوی عبدالماجد، حبیب الرحمان، چکبست، عبدالمجید سالک، عبدالمالک آروی مرعبدالقادر، عبدالسلام ندوی وغیرہ اپنے تنقیدی مقالوں کے لئے خصوصیت رکھتے ہیں۔ چکبست نے اپنے سوانحی مقالوں سے بھی بڑا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے (ادب) تاریخی مقالے بھی لکھے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی اور مذہبی مقالے اردو میں مایۂ ناز سرمایہ ہیں۔ نیاز فتح پوری کے سیاسی، مذہبی، تاریخی، ادبی تنقیدی مقالے ناقابلِ فراموش اضافہ ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، پطرس، رشید احمد صدیقی وغیرہ نے مزاحیہ مقالوں کی شاخ کو تر و تازہ ہی نہیں رکھا بلکہ پہلے کے بہ نسبت اس کا معیار بلند کر دیا۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی ان میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ مذکورہ بالا مقالہ نگاروں میں سے ہر ایک صاحب طرز ہے۔ اور ان کے اسالیب بیان میں بھی الگ الگ رنگ پایا جاتا ہے مگر زبان کے اعتبار سے بہ استثنائے چند سلاست و سادگی مقالوں کی مشترک خصوصیت ہے۔ لیکن ہر ایک کا طرز شگفتہ اور دلآویز ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالوں میں دقیق رنگین زبان پائی جاتی ہے۔ اسی طرح نیاز صاحب کے مقالوں کی زبان سلیس رنگین ہے۔ دونوں مقالہ نگاروں کی طبیعتیں عربی کی طرف زیادہ مائل پائی جاتی ہیں۔ مگر کسی جگہ الفاظ کا بے جوڑ استعمال نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ دونوں حضرات زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور ادبی ذوق کے مالک ہیں۔

اس دَور کے ایسے نگاروں کے متعلق عرض کرنے سے پہلے نثر میں ایک نئی صنف "ادبِ لطیف" کے متعلق یہاں اظہارِ خیال بے جا نہ ہوگا۔ تاکہ ایسے نگاری اور ادبِ لطیف خلط ملط نہ ہو جائیں۔ اگرچہ ادبِ لطیف ایسے نگاری سے بہت مماثل ہے تاہم ادبِ لطیف کو کسی حالت میں ایسے نگاری نہیں کہہ سکتے۔ اس کی وضاحت کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ عام طور پر ایسے نگاری کو پہلے پہل ادبِ لطیف کہا جاتا تھا۔ آل احمد سرورؔ "منتشر خیال" کے دیباچے میں ادبِ لطیف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:-

"انگلستان میں پیٹر نے تلاش حسن کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اس کا جمالیاتی احساس اس کے طرز میں موجود ہے۔ اس کے نصب العین کی اہمیت نہیں رہی مگر اس کا طرز اپنی رنگینی و رعنائی کی وجہ سے یادگار ہے۔ یہ حسن پرستی ہمارے شعرا کے یہاں بہت عام تھی۔ چناں چہ "پیامِ یار" اور "فتنہ" نے اسے قیامت بنا دیا ادبِ لطیف دراصل اسی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ یہ رنگ ٹیگور کے ترجموں سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ شررؔ کے عاشقانہ و شاعرانہ مضامین اور سجاد حیدر کے خیالستان میں اس کا عکس ملتا ہے۔"

اس بیان کے بعد سرورؔ صاحب نے اصغر گونڈوی کا قول اس بارے میں نقل کیا ہے اور اس سے اختلاف بھی کیا ہے:-

"ادبِ لطیف کا اصلی مفہوم اس طرزِ انشاء سے ہے جو وسعتِ علم، احساسِ شعریت و حکیمانہ نزاکتِ خیال کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔"

ادبِ لطیف کے متعلق سجاد حیدر کی رائے ملاحظہ فرمایئے:-

"لائٹ لٹریچر کی چاشنی کے ذریعے سے آپ عمدہ اور اعلیٰ خیالات عوام میں رائج کر سکتے ہیں۔ ورنہ محض نصیحت اور خشک فلسفہ کا قدردانانِ علم کے سوا اور کوئی شنوا نہ ہوگا۔"

مولانا خلیقی دہلوی کے مجموعۂ مضامین "ادبستان" کے مقدمے میں اخترؔ شیرانی مرحوم نے ادبِ لطیف کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے۔

"اردو کے ادبِ لطیف کی بنیاد مرحوم مولانا شررؔ لکھنوی کے شاعرانہ مضامین سے ہوتی ہے۔"

اس مقدمے میں ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"کس قدر حیرت انگیز بات ہے۔ کہ اردو ادبِ لطیف کے دورِ جدید کی بنیاد ایک ایسی دُور افتادہ اور اجنبی زبان کے ادبی نقوش و آثار پر رکھی جاتی ہے جس سے ملک کو کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ درحالیکہ ہر لحاظ سے یہ فخر بنیادی طور پر انگریزی کے حصے میں آنا چاہئے تھا۔"

مذکورہ بالا بیانات سے پہلی بات یہ واضح ہوتی ہے کہ سرورؔ صاحب اور مرحوم اخترؔ ادبِ لطیف کو ایک جدید صنف خیال کرتے ہیں۔ جو ایسے نگاری سے مختلف ہے۔ مولانا اصغرؔ نے ادبِ لطیف کی جو تعریف بیان کی ہے وہ دراصل ایسے نگاری کی جامع تعریف ہے۔ سجاد حیدر نے بھی ایسے کا مفہوم بیان کیا ہے اور

اس کو ادبِ لطیف کہا ہے۔ دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ ادبِ لطیف کو سب سے پہلے اردو میں روشناس کرانے کا سہرا شرر کے سر ہے اور شرر کے انشائیوں کو ادبِ لطیف کا نام دیا گیا ہے۔

اس مقالے کے ابتدائی حصے میں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ انشائیہ نگاری انگریزی ادب سے اردو میں منتقل ہو کر آئی ہے اور شرر اس کے موجد نہیں ہیں، بلکہ اس کی ایک درمیانی کڑی ہیں۔ جنھوں نے اپنے زمانے میں اس صنف کو فروغ بخشا۔ شرر، سجاد، حیدر، جوش، وغیرہ کے انشائیوں کو ادبِ لطیف کا نام دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر جس قسم کا ادبِ لطیف ان ماہرینِ فن نے ادب کو دیا۔ اگر ایسا ادبِ لطیف پیدا ہوتا رہتا تو ایک بات تھی لیکن اسی دور میں ٹیگور کے ترجموں کی وجہ سے اردو میں ٹیگوریت داخل ہو گئی۔ یہ طرز خصوصاً نوجوانوں میں بہت مقبول ہوا۔ اور ہر کس و ناکس نے اس پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ چند ماہرینِ فن اس طرز کو خوب نباہ گئے۔ مگر عموماً ادبِ لطیف مصنوعی زبان و بیان کی وجہ سے اپنے محاسن کھو بیٹھا۔ اس طرح انشائیہ نگاری سے الگ ایک صنف بن گیا۔ اس ادبِ لطیف میں عبارت آرائی، اور لفظوں کی ٹھونس ٹھانس کے علاوہ عورت بھی اس کا جزو لاینفک بن گئی۔ ادب کی اس بگڑی ہوئی شکل کو دیکھ کر علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ "اس پر عورت سوار ہے"۔ ادبِ لطیف کی مصنوعیت نے لکھنے اور پڑھنے والے دونوں فریقوں کو آخر تھکا دیا اور اس طرح اس قسم کے ادب کا رواج کم ہو گیا۔

ادبِ لطیف کی تاریخ میں شرر کو اس کا امام اور سجاد حیدر، نیاز فتح پوری اور خلیق دہلوی کو اس قصرِ ادب کے ستون تصور کیا جاتا ہے۔ مگر ان چاروں حضرات کے کارنامے ادبِ لطیف (بحیثیت صنف) سے زیادہ انشائیہ نگاری سے قریب ہیں۔ ان لوگوں نے عموماً انگریزی کے طرز پر ماہرینِ فن کی طرح انشائیے لکھے ہیں ان کے علاوہ حجاب اسماعیل، چودھری افضل حق، گوردھن داس، ملک محمد باقر، نسیم رضوانی وغیرہ نے بھی اس صنف کو نوازا ہے۔ ان کے کارناموں میں زیادہ تر ادبِ لطیف ہے۔ مگر خال خال انشائیے کے طرز کے مضامین بھی ملتے ہیں۔

اس دور کے انشائیہ نگاروں میں شرر کا نام سرِ فہرست ہے۔ شرر کو انگریزی ادب سے استفادے کا موقع ملا تھا۔ اگلے وقتوں کے بزرگوں کے کارنامے بھی ان کے سامنے تھے۔ شرر نے علمی ادبی، تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں۔ مگر ان کے انشائیے اور مقالوں کے طرزِ ادا میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا عالمانہ و ناصحانہ انداز انشائیے میں بھی ملتا ہے مگر اسلوبِ بیان کے بے ساختہ پن اور شگفتگی نے انشائیے کی اسپرٹ قائم رکھی ہے۔ شرر کے انشائیے کے مطالعے سے اہم بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں اپنے تاثرات کو قلم برداشتہ لکھا ہے۔ شرر نے درسِ عبرت دینے کے لئے عموماً مناظرِ قدرت کا سہارا لیا ہے۔ شرر کے انشائیے "آدھی رات" "لالۂ خود رو" "پھول"، "باغِ نسیمِ سحر"، "ایک چھوٹے ذرّے کی سرگزشت"، "بزمِ قدرت"، اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں "آرزو"، "غریب کا جھونپڑا"، "ہم تم اور وہ" بھی ان کے قابلِ ذکر انشائیے ہیں۔ "نسیمِ سحر" میں خدا پرستوں پر لطیف طنز کیا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ جس خدائے کارساز کی عبادت کے لئے بے تاب رہتے ہیں، اس کے کرشموں کو دیکھنے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ ان کی عبادت ایک میکانی عمل ہے۔ اس انشائیے کا آغاز بہت پیارا ہے "لالۂ خود رو" میں فطرت کی کرشمہ سازیاں بیان کرنے کے علاوہ فلسفیانہ انداز میں درسِ اخلاق اور مقصدِ حیات بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح "آرزو"، "یاس"، "غریب کا جھونپڑا"، وغیرہ بھی حیاتِ انسانی پر لطیف تنقید ہے "ایک ذرّے کی سرگزشت" میں انوکھے انداز میں عمل کی تلقین کی گئی ہے۔ اس انشائیے میں تاریخ کے دفتر سمو دیئے گئے ہیں۔ مگر شرر نے اپنے شاعرانہ انداز سے اس میں بھاری پن پیدا نہیں ہونے دیا ہے۔ "ہم تم اور وہ" میں صوفیوں کے ہُو حق کے نعروں کی تشریح کی گئی ہے اور انانیت اور دوئی کو بھی خوش اسلوبی سے سمجھایا گیا ہے غرض شرر کے انشائیے اپنی خصوصیات کی وجہ سے بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔

حسن نظامی اردو کے صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ کئی تصانیف اور مضامین ان سے یادگار ہیں۔ ان کے مضامین کے ایک مجموعہ "سی پارۂ دل" میں ان کے بہترین انشائیے شامل ہیں۔ ان کے انشائیے کی فہرست طول طویل ہے۔ ان میں سے "مکھی"، "اُلّو"، "دیا سلائی"، "لیمپ"، "زلف کا ماجرا"، "لالٹین"، "اوس" وغیرہ نہایت شگفتہ اور بلند درجہ انشائیے ہیں۔ حسن نظامی نے حقیر موضوعات پر اعلیٰ درجے کے انشائیے لکھ کر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ایک انشائیہ نگار کے لئے کائنات کی ہر شے موضوع کا کام دے سکتی ہے اور موضوع اچھا یا بُرا نہیں ہوا کرتا، بلکہ موضوع کا برتنے والا اچھا اور بُرا بنا دیتا ہے۔ حسن نظامی نے علمِ اشیاء کے مقابلے میں مشاہدۂ اشیاء سے زیادہ کام لیا ہے۔ ان کے انشائیے میں ہلکا فلسفیانہ رنگ اور زبان و اندازِ بیان کی شگفتگی مزہ دے جاتی ہے۔ اگرچہ ان کے انشائیے بہت مختصر ہیں مگر انشائیہ نگاری کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

سلطان حیدر جوش بھی اس دور کے بہترین انشائیہ نگاروں میں اپنا

ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جوش سے بے شمار مضامین یادگار ہیں۔ جن میں سے گیارہ اسیز کا ایک مجموعہ "جوشِ فکر" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجموعہ میں طلسم ازدواج، مسٹر ابلیس، جنونِ ترقی، خانہ جنگی، لیڈر، انگریزی ادب کے اسیز سے درجے میں کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ "طلسمِ ازدواج" میں نہایت اہم اور عالم گیر مسئلۂ حیات پیش کیا گیا ہے۔ "مسٹر ابلیس" میں انسانی شیطنت کا پردہ شگفتہ انداز میں فاش کیا گیا ہے۔ "جنونِ ترقی" میں موجودہ سائنس کے خطروں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ طنز جوش کے اسیز کی نمایاں خصوصیت ہے مگر انھیں زبان پر قدرت حاصل تھی۔ ان کے بعض جملے تو بہت ہی شگفتہ اور چبھتے ہوتے ہیں۔ مثلاً "لیڈر" میں لکھتے ہیں: "علم الاعداد کی عینک سے صاف نظر آتا ہے کہ گذشتہ دس سال کی قلیل مدت نے لیڈر کی افزائش تعداد کے ساتھ وہی کام کیا جو موسم برسات حشرات الارض کے ساتھ کرتا ہے۔" یا امداد جنگ نے خطابات کے ساتھ کیا۔ جوش نے اپنے اِسے "خانہ جنگی" میں اتحاد کی تلقین کی ہے جو اس زمانے کا کم اہم مسئلہ نہیں تھا۔ "خواب و خیال" اور "عالم ارواح" بھی جوش کے اچھے اسیز ہیں۔ جوش کے اسیز بھی ان کے تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔ اندازِ بیان کا بے ساختہ پن اسیز کی نمایاں خصوصیت ہے۔ غرض جوش نے حیاتِ انسانی کے مسائل پر بہترین اسیز اردو ادب کو دیئے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم نے جس طرح ترکی ادب سے استفادہ کرکے اردو ادب کو مالامال کیا اسی طرح انگریزی اِسے نگاری کی صحیح اسپرٹ کو اردو اسیز میں قائم کیا۔ ان کا مجموعۂ مضامین "خیالستان" ہے۔ اس میں حضرتِ دل کی سوانح عمری، بھولی بسری یادیں، چاند کی کیفیت، سیلِ زمانہ، تاریخ، چڑیا چڑے کی کہانی نہایت شگفتہ اسیز ہیں۔ ادب لطیف سے متعلق ان کا خیال گذشتہ صفحوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اسی کے مطابق سجاد گہرے فلسفیانہ خیالات کو اِسے کے ذریعے آسانی سے ہم تک پہنچا دیتے ہیں۔ اِسے نگاری کی یہ ایک اہم خصوصیت ان کے اسیز کی جان ہے کہ سجاد اپنی کہتے کہتے اجتماعی مسائل کو بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی شخصیت کے آئینے میں زمانے کے سرد و گرم کو بھی پیش کیا ہے۔ طرزِ ادا کی شگفتگی ان کے اسیز کی مشترک خصوصیت ہے۔

نیاز صاحب بھی اس دور کے اِسے نگاروں کے عناصرِ خمسہ میں سے ہیں۔ نیاز صاحب کے مجموعے "نگارستان" میں ایک رقاصہ عورت، برسات، اپنے چاند، وغیرہ بلند درجہ اسیز ہیں۔ ان اسیز میں نیاز صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فلسفیانہ رنگ کی آمیزش کے ساتھ حیات و کائنات پر تنقید کی ہے۔ یہ اسلوبِ بیان کے بادشاہ ہیں۔ ان کے اسیز میں شعر کے کیف شراب کے سُکر اور شباب کی مستی کے ساتھ فلسفی کی نظر بھی ہے۔

مولانا خلیقی دہلوی بھی اس دور کے مخصوص اِسے نگار ہیں۔ ان کی ادبی کاوشیں "ادبستان" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ "ادبستان" اختر شیرانی کا مرتبہ ہے۔ اس پر شیرانی نے بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ادبستان میں بہت مختصر ادب پارے ہیں جن میں چند اِسے کہلانے کے بھی مستحق ہیں۔ خلیقی مرحوم کے ہاں ایک حد تک خیالات کا عمق پایا جاتا ہے۔ زبان و بیان صناعی کا نمونہ ہے۔ کیفِ قلم، میرا سفر، حریص رقص، ردۂ موت، معیاری اسیز میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

اِسے نگاری کی تاریخ میں سجاد انصاری کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سجاد نے اگرچہ بہت کم تعداد میں اسیز یادگار چھوڑے ہیں، لیکن یہ حقیقی معنوں میں اسیز ہیں۔ ادبا سے بلا تامل خاصے کی چیز کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اسیز "دولت عفت نسوانی، مسلمانانِ ہند، اور تحریکِ اصلاح مذہب و اخلاق" وغیرہ بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ سجاد کے ہاں بھی لطیف طنز اسیز کی جان ہے۔ ان کا طرزِ تحریر نہایت شگفتہ ہے۔ مولانا اصغر کی تعریف کے مطابق سجاد کے اسیز وسعتِ علم، احساسِ شعریت و حکیمانہ نزاکتِ خیال کا باہمی امتزاج ہے۔ سجاد کے اسیز مہدی حسن افادی کی یاد دلاتے ہیں۔ دونوں کے طرزِ فکر اور طرزِ ادا میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔

مقالہ نگاری کا موجودہ دور پچھلے ۲۵ - ۳۰ سال پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں ادب سے جدید طریقوں پر تنقیدِ حیات کا کام لیا گیا ہے۔ اب ادب نہ صوفیاء کے تصورات اور حیاتِ بعد الموت کی تشریح کے لئے مخصوص رہا۔ جس کا مفہوم ہمیشہ غلط سمجھا اور سمجھایا گیا۔ اور اس طرح کاہلوں نے زندگی کے خطروں سے راہِ فرار اختیار کی تو اس میں پناہ لی۔ اور نہ محلوں اور حویلیوں کی تکلفی طرزِ معاشرت کا ترجمان رہا جس سے عوام الناس کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچ سکا۔ ادب میں اس سے پہلے ہی مقصدیت آچکی تھی مگر موجودہ دور میں ادب اس افراط و تفریط سے نکل کر اور بھی اپنے اصلی مقام پر آیا اور صحیح خدمت انجام دینے لگا۔ اب ادب بلا تفریقِ مذہب و ملت اور بلا امتیازِ بلند و پست حیاتِ انسانی کی ترجمانی اور تنقید کے لئے مخصوص ہے۔ اس دور میں ادب مختلف روپ بھرتا نظر آتا ہے۔ کہیں اس کی شان معلم کی ہے تو کسی جگہ اس کا درجہ مبلغ کا ہے۔ کہیں یہ راہبر ہے۔

توکسی جگہ رہبری اور چارۂ رہبری، کہیں ساقی گری کرتا ہے تو کہیں محتسب کے فرائض انجام دیتا ہے۔

ادب کے مذکورہ بالا روپ مختلف اصناف میں پائے جاتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ مقالہ نگاری میں نظر سے گذرتے ہیں۔ اس دور انتشار اور رواروی میں جب کہ وقت قلیل اور کار جہاں دراز ہے اور زندگی معاشی نظام کے تابع ہے جس کی وجہ سے ناول کی جگہ مختصر افسانے، ڈرامے کی جگہ مختصر فیچر نے لی۔ اسی طرح مستقل تصانیف کے مقابلے میں مقالہ نگاری زندگی اور زمانے کے تقاضے پوری کر رہی ہے۔ چوں کہ آج ادب حیاتِ انسانی کی ترجمانی کر رہا ہے اس لئے ادب کی کسی بھی شاخ کا تجزیہ اور تشریح کرنے سے پہلے رفتارِ زمانہ کا مفصل جائزہ نہایت ضروری ہے۔ مگر ہم یہاں موجودہ دور کی چند منزلوں کی نشان دہی پر اکتفا کریں گے۔

یہ دور سیاسی، سماجی تحریکوں کا دور ہے۔ اگلے دور میں بڑی حد تک ذہنی و فکری تربیت نے جذبۂ آزادی کی حرارت سے دلوں کو گرما دیا تھا اور دورِ تذبذب کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی وطن کے جانباز صف آرا ہو گئے۔ ہندوستانیوں کے عزمِ راسخ کا عملی ثبوت کانگریس اور خلافت کی تحریک تھا۔ حکومت اس وقت تحریک کو تو دبا سکی لیکن جذبۂ حریت کو کسی طرح نہ دبا سکی۔ مہاتما جی کی قیادت میں مستقل اور سنجیدہ طریقے پر جنگ آزادی کا سلسلہ اس کے بعد پچیس سال جاری رہا۔ جس کے بعد ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۵ء اہم سنگِ میل ہیں۔ اس دوران میں جذبۂ آزادی صرف سیاست تک ہی محدود نہیں رہا۔ آزادی کے تصور نے جو حبِ وطن اور قومیت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اس نے زندگی اور ادب کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور اس کی سب سے بڑی مہم یہ تھی کہ ہر جگہ سے غیر ملکی عنصر کو کسی طرح نکالا جائے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری موجودہ دور کے اہم مسائل تھے اور ہیں۔ یہی ہماری مفلسی کے ذمہ دار تھے اور ہیں اور بڑی حد تک مفلسی ہی ہماری محرومیوں کی ذمہ دار ہے۔ ان مسائل نے کسان اور مزدور کو موضوعِ سخن بنا دیا۔ کسان اور مزدور کے ساتھ ان کے کئی مسائل بھی سامنے آئے ۱۹۳۵ء میں نئے آئین کے تحت ملک میں کانگریس وزارتیں برسرِ اقتدار آئیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین ایک دستورِ عمل لے کر میدان میں آئے اور ہر شعبۂ زندگی میں نئے وقت کا نعرہ بلند کیا۔ اس مکتبِ خیال کے لوگوں نے اہلِ ہند کی تمام کلفتوں کا واحد علاج اشتراکیت کو قرار دیا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم نے مفلسی غلامی اور بے بسی کے [illegible] رنگ دکھلائے کہ آزادیٔ ملک کا جذبہ پکا پھوڑا بن گیا۔ آخر ۱۹۴۷ء کا سال مژدۂ آزادی تو لایا مگر تقسیم کی وجہ ہنگامے بھی رونما ہوئے۔ ہنگاموں نے سیاسی، سماجی اخلاقی، اقتصادی مسائل پیش کر دیئے جو نہایت غور طلب تھے۔ بلکہ آج تک یہ سلجھائے نہیں سلجھے۔

ملک کے ان حالات نے جو چند در چند مسائل پیدا کر دیئے انھیں بڑے بڑے خانوں میں اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جاگیرداری اور کسان، سرمایہ داری اور مزدور، شہر اور شہری اور دیہات و دیہاتی، مذہب اور سائنس، تخصیص اور مساوات، انسانیت اور بربریت، اشتراکیت اور جمہوریت، رجعت پسندی اور انتہا پسندی، ندا اور اقتصادیات و معاشیات وغیرہ، غرض جس طرح ہجر و فراق کے پہلو سے سینکڑوں مضمون اور اسلوب نکل آتے ہیں، اسی طرح جذبۂ حریت اور انسان دوستی سے سینکڑوں مسائل نکل آئے۔ یہی تمام مسائل ہمارے ادب کے اہم موضوع بن گئے ہیں۔ ان سینکڑوں موضوعات نے ادب میں تو تنوع پیدا کر دیا لیکن متضاد نظریوں اور مختلف مسائل نے ایک ذہنی انتشار بھی پیدا کر دیا ہے۔ مختلف نعروں اور نظریوں سے مسائل کا منارۂ بابل بن گیا ہے۔ جہاں ہزار منہ ہزار باتیں ہیں۔ مختلف قسم کے نقوش ہمارے دل و دماغ پر مرتسم ہوتے چلے جاتے ہیں کہ کوئی ایک صاف ستھرا نقش ابھر نہیں آتا۔ سیاست معاشرت وغیرہ میں اسی وجہ سے ہم جتنی ایک ہونے کی کوشش کرتے ہیں اتنے ہی انیک ہوتے جاتے ہیں اور مختلف خانوں میں بٹتے جاتے ہیں۔ یہی حال ادب کا ہے۔ مقالہ نگاری میں یہی تنوع موضوعات کا بڑا سبب ہے۔ ان مقالات سے خاطر خواہ فائدہ پہنچا یا نہیں، یہ کہنا مشکل ہے لیکن آئندہ کے لئے منصوبہ تیار کرنے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک علمی، ادبی مسائل کا تعلق ہے اس شعبہ کو مقالہ نگاری سے یقینی فائدہ پہنچا ہے

اس دور میں مقالہ نگاروں کے اعداد و شمار پیش کرنا دشوار ہے۔ ابھی اگلے وقتوں کے بزرگ موجود ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنی کاوشوں کو علم و ادب اور تحقیق و تنقید تک محدود رکھا ہے۔ یوں کہ تحقیق و تنقید ان بزرگوں کا میدان ہے لہٰذا زبان و اندازِ بیان کی سلاست و سادگی اور بالغ نظری اور گہرائی ان کے مقالوں کی امتیازی شان ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب اس دور میں اپنے تحقیقی و تنقیدی مقالوں کی وجہ سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ تحقیق و تنقید اُن کا محبوب مشغلہ

ہے۔ اس میدان میں یہ بہت محنت ہیں۔ تحقیق و تنقید میں قاضی صاحب قیاس آرائی اور زود ذعایت کو گناہ سمجھتے ہیں۔ بابائے اردو کی طرح زبان نہایت سلیس سادہ استعمال کرتے ہیں اور انداز بیان کے اپیچ پیچ میں اپنے موضوع کو الجھنے نہیں دیتے۔

موجودہ دور کے دوسرے گروہ کے مقالہ نگاروں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہے اور علم و ادب اور حیات و کائنات کے ہر شعبہ کے متعلق ہزاروں مقالے ملتے ہیں۔ چوں کہ دورِ حاضرہ تنقید کا دور ہے۔ اس لئے انسانی فکر و نظر کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہے۔ لہٰذا ہر نوع کے مقالہ نگاروں میں واقعیت و حقیقت سے قریب تر رہنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تحقیق و تنقید کے نئے اصول اور نظریوں کو برسرِ عام لانے اور اس کی ماہیت اور اہمیت کو واضح کرنے میں مقالہ نگاری اس وقت بہت اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔ سوانحی و سماجی مقالے بھی نئے اصولوں اور نفسیاتی تجزیے کے پیشِ نظر لکھے جاتے ہیں۔ فن و ادب پر نہایت بصیرت افروز مقالے لکھے جاتے ہیں اس طرح اشتراکیت، مارکسزم ادب برائے زندگی کے نظریوں اور ان کی اقدار پر اہم مقالے اس دور کی مقالہ نگاری میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ علمی، تاریخی، مذہبی مقالے بھی کسی طرح کم نہیں پائے جاتے ان کے لئے بعض رسائل مثلاً "معارف" "الفرقان" "ترجمان القرآن" وغیرہ مخصوص ہیں اس طرح اقتصادیات و معاشیات سے متعلق بھی مقالوں کی کسی طرح قلت نہیں ہے۔ ان کے لئے بھی رسائل مثلاً "معاشیات" اس وقت مخصوص ہے۔ رسالہ جامعہ نے اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۳ء تک رسالہ جامعہ کی جلدوں میں جو مقالے چھپے ہیں وہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں چند عنوانات ملاحظہ فرمائیے:۔ کھاد، ہندوستان اور مزدور، ہندوستان اور کسان، انگلستان، بنک، قومیت کی تعمیر، بیانہ ن کی اہمیت، ہماری آبادی، ہمارا معاشرہ اور اس کا اثر معاش پر، دیہی مشورہ، دیہات کا مشترک نظام وغیرہ، غرض موجودہ دور تنوع موضوعات اور مقالات کی بہتات کے لحاظ سے گذشتہ ادوار پر فوقیت رکھتا ہے۔ اسالیب کی کثرت کی وجہ سے اسالیب بیان میں بھی کثرت پائی جاتی ہے۔ ان میں بعض نے سلیس و سادہ، بعض نے سلیس و رنگین اور بعضوں نے دقیق اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر اپنے پیش روؤں کے کسی نہ کسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے سلاست و سادگی کی طرف طبیعتیں زیادہ مائل نظر آتی ہیں۔ اس جگہ مختلف اسلوب پر مفصل اظہارِ خیال ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک ایسے نگاری کا تعلق ہے موجودہ دور میں نسبتاً اس کا فقدان ہے۔ اگرچہ فنی و جمالیاتی ذوق اور مشاہدہ کے شوق کے پیشِ نظر اس دور کو ایسے نگاری کے ارتقا کی اہم منزل ہونا چاہئے تھا۔ مگر معدودے چند اربابِ قلم ملتے ہیں جنھوں نے اس قسم کے ایسے لکھے ہیں۔ ان ایسے نگاروں میں سے فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، فلک پیما، مرزا ادیب، آغا بابر قابلِ ذکر ہیں۔ فکر کا ایسے "سنگ" یا "سر کا درد" ہر حیثیت سے معیاری ایسے ہے۔ اسی طرح کنہیا لال کپور کے ایسے "گھر یاد آیا" "برج بانو" وغیرہ بہترین ایسے ہیں۔ اس میں طنز و مزاح اس کی جان ہے۔ ہمایوں کی ۱۹۵۵-۵۶ء کی جلدوں میں چند شگفتہ ایسے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مشکور حسین کا "گذارہ کیسے ہو؟" اور اقبال سلہری کا "تیر مرغ" اچھے ایسے ہیں۔ مگر اس دور کے لکھنے والوں میں کنہیا لال کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ ان کے ایسے پر ایک مفصل مضمون درکار ہے۔

زرعی پیداوار میں اضافہ

۱۹۵۵-۵۶ء کے لئے سارے ملک کی زرعی پیداوار کے عارضی اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ چاول، گیہوں اور نقد روپے دلانے والی اکثر دیگر اجناس کی پیداوار سابقہ ریکارڈ سے بڑھ گئی ہے۔ مثلاً چاول کی پیداوار ۱۹۵۱-۵۲ء کی پیداوار سے ستر لاکھ ٹن بڑھ گئی ہے۔ گندم کی پیداوار جو پہلے منصوبے کے آغاز کے وقت اکسٹھ لاکھ ٹن تھی ۱۹۵۵-۵۶ء میں چھیاسی لاکھ ٹن تک پہنچ گئی ہے۔ روئی کی پیداوار ۳۱ ، ۴۳ لاکھ گانٹھ سے ۴۰ لاکھ گانٹھ ہو گئی ہے۔ پچھلے پانچ برس کے عرصے میں گنے کی پیداوار میں دو لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا ہے۔ مونگ پھلی کی پیداوار ۳۱ لاکھ ٹن سے ۴۱ لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔ تلہن کی پیداوار جوں کی توں اٹھارہ لاکھ ٹن رہی لیکن پٹ سن کی پیداوار میں ساڑھے چار لاکھ گانٹھ کی کمی ہوئی ہے۔

واجدہ تبسم

چڑھاوا

خالہ بی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ منہ کا رنگ فق ہو گیا تھا اور ہاتھ پیر مسلسل کانپے جا رہے تھے۔ پاس کھڑی ہوئی کریمن کو انھوں نے سر سے پاؤں تک دیکھا اور آہستہ سے مگر تیز لہجے میں پوچھا :

" تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا —— ؟ "

کریمن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور راز دارانہ لہجے میں بولی —— " اے بی بی میں جھوٹ کہوں تو میرے منہ میں کیڑے پڑیں۔ میں نے خود کمرہ جھاڑتے ہوئے پھولوں کے گچھے پھینکے ہیں —— اے بی بی میں تو روز ہی جھاڑتی ہوں۔ آگے بھی دو ایک بار پھولوں کی مرجھائی کملائی پتیاں دکھائی پڑیں۔ میں سمجھی یہی کوئی گجرہ وجرہ ڈال گیا ہوگا مگر کل تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے زہرہ بی بی کے سرہانے پھول دیکھے ہیں —— اور ہاں۔" اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا —— " بالوں میں تازہ گجرا بھی —— اب کیا بولوں مجھے بھی تو ایک دن مرنا ہے —— "

کریمن کی بات پہ یقین نہ کرنا گناہ سے کم نہ تھا۔ خالہ بی کے اپنے بچپن سے وہ ملازم تھی۔ اور اب خالہ بی کے پوتوں کے بچوں کو بھی کھلا رہی تھی۔ اور یوں بھی اُسے جھوٹ کہنے کی پڑی ہی کیا تھی۔ خالہ بی کا دل پھر چھالیہ کاٹنے میں نہ لگ سکا۔ اُن کا دل کہہ اُٹھا —— " ضرور زہرہ نے پھول توڑے ہوں گے۔ زندگی چلی گئی مگر زندگی کا مزہ نہ گیا۔"

منصور میاں مرے اس وقت زہرہ کی عمر ہی کوئی سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ ابھی دو مہینے ہوئے منصور میاں کی تیسری برسی ہوئی تھی اور زہرہ نے رو رو کر اپنا منہ سجا لیا تھا۔ بیس اکیس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے —— ؟ گڑیا جیسی تو لگتی۔ کسی بات کا ڈھنگ نہ تھا۔ ادھر پیام آیا کہ ماں باپ نے اُٹھا بھی دیا —— تین برس راج کیا۔ چوتھے سال بیوہ بھی ہو گئی۔ اب نصیبوں میں وہی پتھر لکھے تھے۔ جلا تین برس میں کیا سلیقہ قرینہ آ جاتا ؟ اور میاں کے مرنے کے بعد تو اور بھی زندگی سے اوب گئی۔ ! زندگی میں مزہ ہی کیا باقی رہ گیا تھا ؟ دو برس تو جوں توں سسرال میں کاٹے۔ ساس نندوں نے ہاتھ دھو دھو کر پیچھا اُٹھا لیا۔ وہ وہ منہ پھوڑ طعنے دیے کہ گدراز گداز جسم سہتے سہتے لکڑی کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔

اب چار چھ مہینے سے ماں کے گھر تھی۔ اپنے کمرے میں گم سم پڑی رہتی۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پہننے کا ٹھکانا۔ اور یوں شادی ہو کر بھی بے چاری کو کیا سکھ ملا۔ منصور میاں کی ایک شادی آگے بھی ہو چکی تھی۔ بڑے گھرانے کی بیٹی اُٹھائی تھی مال وہیز اتنا ملا کہ تمام عمر بیٹھ کر کھاتے تب بھی ختم نہ ہوتا۔ وہ تو مثل ہے ہی کہ جہاں چنے ہیں وہاں دانت نہیں اور جہاں دانت ہیں وہاں چنے نہیں۔ برس گذرا۔ دو برس گذر گئے۔ تین، پانچ اور پھر دس برس گذر گئے مگر دلہن کی گود ہری نہ ہوئی۔ لاکھوں ہی علاج معالجے کئے۔ تعویذ گنڈے کرائے مگر مراد بر آتی تھی نہ آئی۔ ساس نندیں پہلے تو چپ چپ رہیں پھر دبے الفاظ میں کہنا شروع کیا اور پھر کھلے بندوں کہنے لگیں۔

" اے میاں کیا یا تجھ کو مڑی پکڑ لائے —— اولاد ہی نہ ہوئی تو موئی یہ دولت کس کام کی —— ؟ "

" بس بھا میاں —— بہت دنوں راہ تک لی۔ اب کر ڈالو دوسری شادی —— "

منصور میاں پہلے تو ہاں ناں کر کر کے ٹالتے رہے۔ آخر کو مرد کی ذات تھے بہلاوے پھسلاوے میں آ ہی گئے اور ماں بہنوں نے جو مرضی دیکھی تو زہرہ کے باپ کو جھٹ پیام دے ڈالا۔ اب لاکھ سوکن بھی تھی مگر پیسے بھی تو بھرلوپہ

تھا۔ اور پیسہ تو تمام عیوب پر شامیانہ بن کر چھا جاتا ہے۔ دو ایک بیبیوں نے مُنہ چلایا بھی:

"اے بی سوکن پر دے کر زندہ درگور کرنا ہے کیا بیٹی کو — عمر تو دیکھو منصور میاں کی — چالیس سے بھی ڈھل رہی ہے —"

مگر دینے والوں نے ہی دھیان نہ دیا تو کون دیتا — پھر بڑے تاشے باجے بجے اور دھوم دھام سے زہرہ بیگم منصور میاں کے گھر راج رچنے چلی گئی۔

زہرہ کی اپنی کیا رائے تھی یہ پوچھنے کی نہ کسی کو ضرورت پیش آئی نہ اس کا سوال ہی اُٹھا۔ بھلا پوچھنا بھی کیا تھا — ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز موجود! آسائش کے لئے ہر نعمت میسر۔ پھر لڑکیوں سے پوچھتا بھی کون ہے — ماں باپ جو کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں۔ پال پوس کر جو بڑا کرتے ہیں تو محبت ہوتی ہی ہوگی۔ یہ نہیں کہ بوجھ اُٹھایا اور سر سے پھینک دیا۔

مگر بھئی۔ غیب کا حال خدا کو معلوم یا جس پر بیتے اس کے دل کو معلوم چار چھ مہینے بعد زہرہ سسرال سے لوٹی تو ایسی گویا مہینوں کی بیماری کاٹ کر اُٹھی ہو۔ رنگ پیلا پیلا جیسے بھرپور بہار میں ترائی کے پھول۔ قد تو پہلے ہی سرو کی ڈالی جیسا لچکتا لچکاتا تھا۔ اب تو بانس کی بانس معلوم ہوتی — بڑی بڑی آنکھیں جن میں مستی جھوما کرتی اب اپنے حلقے چھوڑ کر نکل پڑتیں۔ اور چلتی تو یوں ڈگ ڈگ ہو کر، گویا ابھی چلتے میں چکرا کر گر پڑے گی۔

کسی نے کچھ پوچھا بھی ضروری نہ سمجھا۔ بڑی بوڑھیوں نے سمجھ لیا دن چڑھ گئے ہوں گے تبھی تو یوں کمھلا کر رہ گئی ہے۔ مگر اس نے نہ تو کبھی اُبکائی ہی لی نہ جی متلانے کی شکایت ہی کی۔ سکھی سہیلیوں نے چھیڑا بھی تو یوں گُم سُم ٹھنڈی ٹھنڈی بیٹھی رہی گویا جان ہی نہ ہو بدن میں۔ کپڑے تو وہ جھبڑا جھبول پہنتی کہ شامیں سی چھوٹتیں۔ زیور اتنا کہ بدن جُھکا پڑتا — مگر سارا رس جیسے کسی نے چوس لیا تھا۔ لے دے کے اس کی ساری دلچسپی اپنے موتیا کے پودوں سے تھی جو اس نے اپنے کنوارپنے میں۔ بڑے چاؤ چونچلوں سے لگائے تھے سب سوتے ہی رہتے اور خود وہ صبح سویرے اُٹھ کر اُن کی دیکھ بھال کرتی۔ پودے ذرا بڑے ہوئے تو ان میں کلیاں آئیں کلیاں پھول بنیں مگر یہ پھول اُن کے سہرے میں گوندھے نصیب نہ ہوئے۔

منصور میاں کی دوسری شادی تھی۔ بس نکاح مقصود تھا۔ سہرے۔ اُن کی نوبت تو کاہے کو آتی — دھوم دھڑکا تو خوب ہوا مگر پھول نہ چڑھے۔ یہ رواج ہی تھا منصور میاں کے ہاں والوں کا کہ دوسرے چڑھاوے میں پھول نہ چڑھتے۔

ایک بہار گزری اور دوسری بہار آنے سے پہلے ہی پھر اسے سسرال جانا پڑا۔ موتیا کے پودے پھر مُرجھانے لگے۔ دو برس پیچھے لوٹی تو یوں کہ پہچاننا مشکل تھا۔ شادی سے پہلے ہی ایسی کون بھاری بھرکم تھی۔ ہاں بھرا بھرا گدرایا بدن ضرور تھا۔ کہاں وہ بھری بہار میں مہکتے پھول جیسا چہرہ اور کہاں کمرجھائی بیل جیسی ہو رہی تھی — جُھکی پڑ رہی تھی — ماں کو خوشی تھی کہ گود بھرے گی ساس کو کیسے کیسے ارمان تھے کہ پوتا کھلاؤں گی۔ بڑھتی فصل کو ایسا پالا مار گیا کہ ہُوا نہ وہ ہُوا۔ ادھر دیکھتے ہی دیکھتے منصور میاں کو ملی کا درد اُٹھا اور ایسے ختم ہو گئے گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ زہرہ تو ساکت ہی ہو کر رہ گئی — سکوت ٹوٹا تو اتنا روئی کہ بے ہوش ہو ہو گئی۔ اپنے شوہر سے کسے محبت نہیں ہوتی۔ اور پھر ایک ہندوستانی عورت کو — مگر منصور میاں کا لاولد مرجانا معمولی بات نہ تھی۔ کہنے والوں نے، جو منہ کے ذرا پھٹ پھٹے تھے، کہا بھی مگر دبے ڈرتے ہی۔ مگر اب کہنے سننے سے ہونا بھی کیا تھا۔ پیسے کے لالچ میں دو دو زندگیاں تباہ کیں۔ ماں بہنوں کو ہی اتنا خیال ہوتا۔ مگر سبھی کی آنکھیں اندھی تھیں تو راستہ بھی کون دکھاتا۔

زہرہ ابھی بھی کچی کلی تھی۔ موتیا کی کومل کلی۔ جو کسی کی سیج پر نہ کھلی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے آپ ہی آپ ٹوٹ کر گر پڑی۔

پروائی ہوا کے جھونکے چلتے۔ ساون کی رم جھم گھٹائیں چھاتیں — پاپی من دیاکل ہو ہو اُٹھتا — پھر بہار آ گئی۔ کلیاں تھیں کہ بھونروں کا مُنہ چوم چوم کر بے باکی سے جھومنے کھلنے لگیں۔ اور ادھر رات ہوتے ہوتے سارے آنگن میں بہار ہی بہار بکھر جاتی۔ خوشبوؤں سے، مہکار سے آنگن بھر جاتا۔ بڑے چاؤ سے، بڑی لگن سے زہرہ پودوں کے پاس جاتی مگر پھر لوٹ لوٹ آتی۔ بیوہ تھی — ہار سنگھار — چوٹی کنگھی بھلا کرتی بھی کیسے — ؟ آسمان نہ ٹوٹ پڑتا، زمین نہ نگل جاتی۔

اللہ جانے کیا ضبط تھا زہرہ کو۔ راتوں کے اندھیاروں میں اُٹھتی۔ موتیا کے پودوں کے پاس جاکر بیٹھ جاتی اور کچی کلیوں کو توڑ توڑ کر مسل دیتی۔ پھر آپ ہی آپ اس کی آنکھیں بھیگ اُٹھتیں اور بن برسات کے برسات شروع ہو جاتی۔ آنسوؤں نے رہا سہا رس کس بھی چوس لیا۔ پھر بھی کوئی سہارا تھا تو یہی

پھول — وہی کلیاں —!

جانے ایک دن کیا دل میں آئی کہ دامن بھر پھول سمیٹے اور کمرے میں لاکر بچھا دیئے۔ صبح کو جھاڑو دینے کرین آئی تو زہرہ کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ منہ سے تو کچھ بولی وولی نہیں، دوسرے دن پھر وہی ڈھنگ دیکھا۔ پھر تو معمول ہی ہو گیا۔ مگر ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ پھولوں کا گجرا زہرہ کے سیاہ ریشمی بالوں میں پڑا جھول رہا تھا اور کچی پکی کلیاں تکیے کے پاس۔ شریف گھرانوں کی بیوہ دامن بیبیاں ایسے اوچھپن کا ہے کو کرتی ہوں گی۔ اور پھر بی بی بھی کیسی کہ جوان اور ماورے سے بیوہ — برسوں سے نمک کھایا تھا۔ پیٹ میں اتنی بڑی بات کا ہے کو رکھتی اس نے بھلائی اسی میں سمجھی کہ خالہ بی سے کہہ دے۔ خالہ بی کا تو سنتے ہی رنگ فق ہو گیا۔ منہ پہ ہوائیاں اُڑ اُڑ گئیں۔ یقین نہ آتا تھا کہ زہرہ ایسا بھی قدم اُٹھا سکتی ہے — کہ کنواری بھی نہیں۔ بیوہ ہو کر بالوں میں گجرا گوندھے۔ پھولوں کا ہلکا ہلکا گجرا ابھی تازہ تازہ ہی تھا۔ کلیاں اپنے بدن کی مست خوشبو زہرہ کے بالوں میں چھپانے بھی نہ پائی تھیں کہ خالہ بی دندناتی ہوئی پہونچیں اور اس کے بالوں سے پھول کھسوٹ ڈالے۔

" بیوہ ہو کر سنگار کرتی ہے زہرہ بی — مر کیوں نہیں جاتی، ہماری ناک کٹنے سے پہلے۔ سننے والے سنیں گے تو کیا منہ پر تھوکیں گے کہ رانڈ مونڈ ہو کر بیسواؤں کی سی چھب دکھاتی ہے۔ یا مولا تو ہی خیر کرے تو کرے — "

شام کو چپ چپاتے میں خالہ بی نے سب سے کہہ دیا کہ زہرہ تو کھلے دیدوں ناک کٹانے پہ تُل گئی ہے۔

خالو میاں نے تلملی ہوئی رائے دی :

" صمد میاں پڑھے لکھے ہیں۔ پُرانی باتوں کو نہیں مانتے۔ اپنے بیٹے کے لئے زہرہ کو مانگ رہے تھے — "

خالہ بی نے پٹ پٹا کر ان کی طرف دیکھا — " میں کہوں تمھاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ کیا بیوہ کا نکاح کروگے — ؟ اور جو پورے زمانے میں تھڑی تھڑی ہوگی — تو — منہ اونچا کر سکوگے۔ بس آگا دیکھا نہ پیچھا — جو منہ میں آیا اُگلتے چلے گئے۔ "

خالو میاں نے ٹھنڈے دل سے کہا — " سوچو۔ غور کرو اور پھر بات پکی کرو۔ بیوہ کی شادی ایسی کوئی بُری بات نہیں۔ یہ ضرور بُری بات ہے کہ بیوہ اور وہ بھی جوان بیوہ۔ سنگھار پٹار کرے اور پھر گھر میں جوان لڑکیاں کھانا جانا بھی ہے — ہاں " اور خالو میاں معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو رہے۔

خالو میاں نے تو ایسے جی دل سے بھرپور بات کہی گویا کوئی بُرائی ہی نہ تھی اس میں — اور یوں سوچو تو کتنی بُری بات تھی یہ — بھلا شریف گھرانے کی بیٹیوں نے کبھی دو دو شوہر کئے ہوں گے۔ اب مردوں کی بات جانے دو۔ چار چار شادیاں وہ کریں — اس پر بھی چکلوں میں جائیں — تاک جھانک کریں — سب روا ہے۔ مرد ذات کو کیا کسی کے کہنے سننے کا ڈر۔ مگر ایسا بھی کہیں ہوا ہے کہ کھلی آنکھوں جیتی جاگتی مکھی نگل لیں۔

ماموؤں، پھوپھیوں، خالاؤں کی میٹنگ ہوئی اور طے ہوا کہ شادی کر دینا ہی اچھا ہے۔ آگے چل کر کوئی بُری بات ہوئی تو کہیں برادری میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے — شیطان بہکانے آتا ہے تو پوچھ کر نہیں آتا۔ بات صاف سیدھی تھی خالہ بی کی سمجھ میں بھی آ گئی اور صمد میاں کے گھر 'ہاں' میں جواب بھجوا دیا گیا۔

رزاق میاں بی۔ اے کر چکے تھے۔ اعلیٰ ملازمت پر فائز تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی خوبُو رکھتے تھے۔ خیالات بھی بڑے اونچے اور پاکیزہ تھے۔

" پُرانی باتوں کا توڑ توڑنے کے لئے صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا۔ عملی طور پر آپ خود آگے نہیں بڑھیں گے تو جاہلوں سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں — "

رزاق میاں کا یہی کہنا تھا۔ اور اپنے نزدیک تو وہ یوں نبھا رہے تھے کہ بیوہ سے شادی کر رہے تھے۔ وہ تو اپنے خیال میں بڑا ایثار کر رہے تھے۔ مگر سچ پوچھو تو بے چاری زہرہ سہاگن ہی کب ہوئی کہ بیوہ بھی ہو جاتی — ادھ کھلی پکی کلی تھی کہ بیاہ دی گئی۔ پھول بننا نصیب ہی کہاں ہوا — ؟ دنیا والے تو سمجھ رہے کہ بہار سر پہ کھیل رہی ہے مگر خزاں کا ایسا بھرپور تسلط تھا کہ جو بسرے بھی کلیاں نہ مہکیں۔

زہرہ نے جب سُنا کہ اس کی دوبارہ شادی ہو رہی ہے تو سناٹے میں آ گئی۔ پھر وہی دھوم دھڑکا ہوگی — پھر لیو ریڑھیں گے — پھر سجاؤ بناؤ ہوگا اور سب کچھ تو ملے گا ہی مگر وہ زندگی کہاں ملے گی — ؟

موتیا کے پھول ہوا کے ہلکے ہلکے ہلکوروں سے کانپ رہے تھے۔ زہرہ پتھر بنی بیٹھی تھی۔ دو چار پھول ہوا کے زور سے گملے میں گر پڑے اور نیچے پڑی

پتیوں سے لپٹ لپٹ گئے۔

"مجھے کبھی تو پھولوں کا لمس محسوس نہ ہوا۔" زہرہ نے کراہ کر پھولوں کو سنایا "اور مجھے تم سے محبت کتنی رہی۔؟"

سرسرسر — ہوا چلی — پھول جھکے — ہلکی ہلکی سی لپٹ آئی اور زہرہ خوشبوؤں میں نہا سی گئی۔

زہرہ کے جہیز کا سارا سامان تو منصور میاں کی ماں بہنوں نے رکھ لیا تھا۔ ماں باپ کے ٹھٹے سے بلانے پر زہرہ یوں ہی چلی آئی تھی۔ مانگنے کے لئے زبان تک نہ ہلائی — اور یوں بھی مانگنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہاں تو گھر بھرا پڑا تھا کس چیز کی کمی تھی۔ پیسہ تو یہاں یوں ٹپکتا جیسے درختوں سے ذرا سے ہلانے پر ڈھیروں بیر زمین پر آ پڑتے ہیں۔

لاکھ بیوہ کی شادی تھی تھی تو شادی ہی۔ پھر سے جوڑے چکے ہونے لگے ہر چیز تیار ہونے لگی۔ سب گویا یہ بھول ہی بیٹھے کہ یہ دوسری شادی ہے۔ سب کام یوں گرمجوشی سے ہو رہے تھے گویا پہلی برات ہے۔ خالو میاں کو صمد و میاں کی ایسی پشت پناہی ملی کہ ان کی آنکھوں کے پردے تو ہٹتے ہی ہٹے خالہ جی بھی ساری بدنامی و بدنامی بھول بھال گئیں۔ اور کیا لڑکی بُرائی کرنے تو نہیں جا رہے تھے۔ پھر ڈر کیا — دنیا والوں کا کیا ہے جو چاہے بکتے پھریں — خالو میاں بار بار جتاتے۔

"دیکھو بھئی جہیز ایسا ہو کہ کسی چیز کی کمی نہ رہ جائے — آگے ہی تو بے چاروں نے بیوہ بیٹی اُٹھائی ہے۔ کسی بات پر شکایت کا موقع نہ ملے انھیں۔ ہر ہر چیز کی گنتی گنتی۔ کوئی کمی نہ رہ جائے — زہرہ ان باتوں سے یوں بے تعلق رہی گویا یہ سب دھوم دھڑکے کسی اور کے لئے ہو رہے ہوں۔ مسکراہٹ تو سدا ہی سے رُوٹھ چکی تھی۔ اب تو آنسو بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ کدھر سے نصیبوں کو سیاہی پھر گئی تھی اللہ ہی جانے۔ کہیں سے بھی پتہ نہ چلتا کہ یہ بھی کوئی متنفس ہے

شادی کے دن تو دھوم دھڑکے میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی گھر کے ہر ہر کونے سے چیخ پکار اور شور شرابے کی دھم اور تیز آوازیں آ رہی تھیں بڑے کمرے میں جہیز کے بے حساب چمکیلے جوڑے سجائے گئے تھے۔ بھڑک دار کرنیں اچکاتے جوڑے کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ زیورات ایسے گویا زیورات کی دکان کھل گئی ہو — شعاعیں سی پڑ رہی تھیں — جگ مگ — جگ مگ چھم چھم — چھم چھم — اُجالا ہی اُجالا — دیکھنے والی آنکھیں سیر نہ ہوتیں۔ دولھا والوں کی طرف سے چڑھاوا آیا تو وہ بھی بھرپور۔ گھر میں بڑا اندھا سورج گھس پڑے تھے جیسے۔

چڑھاوے کی کشتیاں کھلیں تو سہرا ندارد۔ ٹھٹے میں کسی نے چلا کر پوچھا

"اے بی چڑھاوے میں پھولوں کا سہرا تو ہے ہی نہیں۔"

کسی نے ادھر سے جواب دیا — "وہ چونکہ بیوہ کی شادی تھی اس لئے سہرا نہیں چڑھے گا —" زہرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

بڑی ممانی جھلا کر بولیں — "اے بیوہ کی شادی ہوئی تو کیا غضب ہو گیا دولھن کے پاس سے پھولوں کی لپٹیں نہیں آئیں تو دولھن، دولھن نہیں لگتی — یہیں گھر ہی میں تو موتیا کے پیڑ سے لگے ہیں۔ ایک گجرا ہی گوندھ لاؤ۔"

ہر طرف چاؤں چاؤں ہونے لگی "اے تو بہ ہے۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔"

"اے نا بی۔ یہ بھی ممکن ہے۔"

"چلو بی۔ مت تو ماری نہیں گئی۔ بھلا چڑھاوے میں پھول چڑھیں گے۔"

زہرہ کا دل اس کے پہلو میں نہیں کہیں اور دھڑک رہا تھا۔ اسے اپنے آس پاس موتیا کے پھولوں کی جھاڑیں محسوس ہو رہی تھیں اور زہرہ اُن جھاڑیوں میں ایسی اُلجھی، ایسی اُلجھی کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

رات کے تین بجے جب بڑے دروازے سے زہرہ کا جنازہ نکلا تو جہیز کے کمرے میں روپہلی اور سنہری طشتوں میں چمکیلے کپڑے اور زیورات پڑے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے اور زہرہ کے بدن پر صرف موتیا کے بھکے پھکے پھول تھے — بکھے ہوئے گجرے تھے جو اس کے چڑھاوے میں نہیں آئے تھے

"آج کل" کا آئندہ شمارہ "جنگِ آزادی نمبر" ہوگا

عمران انصاری

برشگال

(بہار بند)

چمن چمن، دمن دمن، بہارِ سبزہ و یاسمن — طلوعِ صبح جلوہ زا، سکوتِ شام نغمہ زن
ہری بھری زمیں بسند ہے بھرا پڑا گگن — کلی کلی مگن مگن، گلی گلی ختن ختن!!
نفس نفس میں بس رہا ہے جیسے عطرِ شبِ دلہن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

قطار سارسوں کی کوہسار سے لگی ہوئی — کہ سبزہ زار پر سفید پانکھڑی ٹکی ہوئی
حنا کے عطر سے فضا میں رنگ و بو بسی ہوئی — حسینۂ چمن کوئی ہے دشت میں کھڑی ہوئی
حنائی پیرہن پہن کے دشت بن گیا چمن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

یہ زندگی کا کارواں کہاں سے آگیا کہاں — مہ و نجوم گرد گرد، آسماں دھواں دھواں
گھٹے ہوئے ہیں بادلوں کی موج موج بیکراں — برس پڑی ہیں ظلمتیں، خموش ہیں تجلیاں
ہجومِ ابر و باد پر ہے کس غضب کا بانکپن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن!

نکل رہے ہیں گُمیوں سے خشک گیسوؤں کے بل — اُٹھے ہوئے ہیں بانوؤں پہ جیسے بادلوں کے دل
دمک رہے ہیں سرخ آنچلوں میں روپ کے کنول — نہ حسن کا جواب ہے، نہ کوئی عشق کا بدل
خود ایک حسن بن گئی جبینِ حسن پر شکن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

خرد شکار بدلیاں، جنوں نواز ظلمتیں — یہ مشکبار آسماں، یہ برق ساز ظلمتیں
یہ کالی کالی دیویاں کہ دل گداز ظلمتیں — کھڑی ہیں میرے سامنے بصد نیاز ظلمتیں
نہ شیخ کی ہیں چشمکیں، نہ اختلافِ برہمن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن!

وہ جھولے آم پر پڑے کہ جھک پڑی ہیں ڈالیاں — وہ جھولتی سہیلیاں بجا رہی ہیں تالیاں
وہ جھونکے آسمان تک کہ ماتی ہیں پالیاں — وہ جھومتی ہیں جھمکیاں وہ ڈولتی ہیں بالیاں
شباب پر ہیں زمزمے، شباب خود ہے نغمہ زن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

کہیں برس رہا ہے رس کہیں برس رہا ہے ہن — کسی کو ہے کسی کا غم کسی کو ہے کسی کی دھن
کوئی بجا کے بانسری کسی کے گا رہا ہے گن — خلوص ہی خلوص ہے، کوئی نہ پاپ ہے نہ پن
یہ گوپیوں کا گھاٹ ہے، یہ کرشن کی ہے انجمن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

ہوئے عطر بیز و بو تند و تیز صف بہ صف — نظر نظر و رقص رقص عشوہ عشوہ دف بہ دف
قدم قدم ملے ہوئے تو رت نرت ہے کف بہ کف — دُھلا دُھلا لباس اور اُڑا اُڑا کلف کلف
دھنک دھنک سے آنچل اور چُنے چُنے سے پیرہن
کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

جنوں جنوں ہے پُرسکوں، حسن حسن پُرفسوں
نفس نفس میں دھیمے دھیمے بج رہا ہے ارغنوں
ادا ادا سے آشکار سازِ سوزِ اندروں
روش روش نزاکتِ خرامِ ناز کیا کہوں
نظر نظر سے گونجتی نوائے قیس و کوہکن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

یہ وقت ہی عجیب ہے کہ دورِ خوش نصیب ہے
بدل گئی ہیں منزلیں کہ دور بھی قریب ہے
ہر ایک بے لکھا پڑھا بھی شاعر و ادیب ہے
کہ سب امیرِ وقت ہیں نہ کوئی اب غریب ہے
کسی سے خاص دشمنی، نہ کوئی خاص حسنِ ظن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

کسان کے لہلہا رہے ہیں پھاوڑے کدالیاں
سنوارتے ہوئے جوار باجرے کی بالیاں
سجا رہی ہیں عورتیں اناج کی کنالیاں
منائی جائیں گی خوشی سے ہولیاں دوالیاں
عرق عرق سے تر بتر ہیں گاؤں گاؤں مرد و زن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

روش روش پہ چہچہے ہیں زندگی کا زور ہے
اذان دے رہے ہیں مرغ، محوِ رقص مور ہے
ہیں زاغ و زاغ باغ باغ بلبلوں کا شور ہے
شمیمِ صحنِ باغ ہے کہ پریم رس کی ڈور ہے
نسیمِ صبح میں بسی ہوئی ہے بوئے پیرہن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

اچھل رہے ہیں گائے بیل دوڑتی ہیں بکریاں
ابل پڑے ہیں جھیل تال مچھلیاں وماہیاں
پرند چہچہا رہے ہیں یا سمٹ گئی ہے کہکشاں
چرند سبزہ زار میں اڑا رہے ہیں کھیتیاں
مویشیوں کے ساتھ بھر رہے ہیں چوکڑی ہرن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

کڑھائیاں چڑھا رہی ہیں گوالیوں کی ٹولیاں
تلن بنا رہی ہیں یا منا رہی ہیں ہولیاں
کچوریوں سے پوریوں سے بھر رہی ہیں جھولیاں
مگر خوشی کے ساتھ بولتی ہیں غم کی بولیاں
نئی جبین، نئی چبھن، نئی کڑھن، نئی گھٹن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

کسی کا انتظار ہے انھیں یہ احتمال ہے
نہ جانے کس کی یاد ہے نہ جانے کس کا خیال ہے
نہ جانے کس کے واسطے یہ حسن یہ جمال ہے
نہ جانے کیوں نشاط میں بھی خواہشِ ملال ہے
پھنکے پھنکے دل و جگر، تھکا تھکا سا تن بدن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

بہار پر شباب ہے، شباب پر بہار ہے
شراب، شعر و نغمہ و نشاط کا خمار ہے
لطیف اضطراب ہے، حسین انتظار ہے
کہ بوئے گل کے ساتھ رنگِ رخ بھی لالہ زار ہے
نکھر رہا ہے مثلِ گل ہر ایک شوخ پُرفتن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

دکھا رہے ہیں شاعرانِ وقت نغمہ سازیاں
جمی ہوئی ہیں محفلوں میں شاعری کی بازیاں
بڑھی ہوئی ہیں من چلوں میں کیا جنوں طرازیاں
خوشی سے ہو رہی ہیں آج میری غم نوازیاں
کہیں عروج پر زباں، کہیں شباب پر ہے فن

کہ ہمکنار ہے ابھی بہار سے مرا وطن

پربھاکر ماچوے

ملیالی ادب

کیرالا کا ثقافتی پس منظر

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ کیرالا "کیر" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں ناریل۔ اس کا مطلب ہوا "کیرالا" یعنی "ناریل کا ملک"۔ مگر بعض دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ لفظ "چیرانال" یا "چیرا ناڈو" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چیرا خاندان کا ملک۔ اس علاقے کا ایک اور نام بھی ہے وہ ہے "ملائے ناڈو" (ملائے = پہاڑیاں، ناڈو = ملک) یعنی پہاڑی ملک۔ ملائے اور آلی (سمندر) سے مل کر یہ لفظ بنا اور اس لئے مغربی پہاڑیوں اور سمندر کے درمیان کی سرزمین ملایالی ملک کہلائی۔ اس علاقے پر پہلا شخص جو پہنچا وہ "پرشورام" تھا۔ پرانوں میں اس علاقے کو "بھارگو کشیتر" بھی کہا گیا ہے۔ ہندوستان بھر میں "پرشورام" کا ایک ہی مندر ہے اور وہ بھی جنوبی کیرالا میں واقع ہے۔

اس سرزمین میں آریوں اور برہمنوں کے داخل ہونے سے پہلے یہاں "ناگا" نسل کے لوگ حکومت کرتے تھے۔ ان کے یہاں ذات کی تقسیم نہ تھی بلکہ قدیم طرز کی اشتراکی سوسائٹی قائم تھی۔ جب برہمن یہاں پہنچے تو انھوں نے "انولوم" شادیاں اور نسلی برتری اور چار ورنوں کی پابندیاں رائج کر دیں۔ قبل تاریخ کے واقعات برہمنوں اور ناگاؤں کی لڑائیوں سے پُر ہیں۔ لفظ "ناگر" جو "ناگ" سے نکلا ہے سنسکرت کی طرح شہری کے معنی نہیں دیتا بلکہ اس کا مطلب ہے ناگ (یعنی سانپ) کو گردن میں ڈالنے والا۔ راس کماری کے راستے میں "ناگر کوئل" نام کا ایک گاؤں ہے اس میں شیوجی کا مندر بنا ہے۔ اس گاؤں کے ہر تیسرے آدمی کا نام "شیش" ہے۔ اس علاقے میں پرانے خیال کے لوگ واقعتاً سانپ کے رہنے کی جگہ کی پوجا کرتے ہیں۔ کیرالا کی عورتیں اپنے بالوں کا جوڑا بھی ناگ پھن کی شکل کا بناتی ہیں۔ یہ فیشن مصر تک پہنچا۔ کلوپیٹرا کے بالوں کی وضع بھی ایسی ہی تھی۔ لیکن بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ کیرالا کی "ایلاواس" (شودر) عورتوں کا جوڑا ایسا نہیں ہوتا وہ لمبی لمبی چوٹیاں باندھتی ہیں۔ "آسام میں "کاماکھیہ" مندر کے دروازے پر بھی ایسی ہی مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔ کیوں کہ وہاں بھی "ناگا قبیلہ" کے لوگ ہیں۔ سنسکرت میں "ناگا" کے معنی پہاڑی لوگ بھی آتے ہیں۔

کیرالا کا علاقہ بڑا خوبصورت ہے۔ جگہ جگہ نہریں بہتی ہیں اور وہاں حسین مناظر کی کمی نہیں۔ قدرت نے ہر قسم کی رعنائیاں بخشی ہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر "سکندا" یا "یاشن مکھم" (شیو کا بیٹا کارتیکیہ) ولّی نامی ایک پہاڑی لڑکی کے جنگل میں پھنس گیا تھا۔ یہاں ایک پہاڑ اس لڑکی کے نام سے موسوم ہے۔ اس علاقے میں اب تک مادرانہ نظام چلتا ہے۔ جس کو "ماروی میکتائے" کہتے ہیں۔ ملیالیوں کا اپنا سن بھی ہے جو "کولا ورشا" کہلاتا ہے۔ یہ سن ۸۲۵ عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔

زبان

دراوڑی خاندان کی زبانوں کا تاریخ وار سلسلہ قائم کرنا مشکل ہے "بیلاتلکم" نام کی ایک قدیم ملیالی گرامر میں اس زبان کو دراوڑی خاندان کی زبان بتایا گیا ہے ایک دوسری گرامر میں جس کا نام "کورتی نے تڈاڈی" ہے۔ منگلا چرن نے لکھا ہے:

سنسکرت ہم گری گلیتا
دراوڑوانی کا لندا جا ملیتا
کیرالا بھاشا گنگا
وہار تو مے ہرت سرسوتی سدا گنگا

(جس طرح جمنا پہاڑوں سے اتر کر گنگا میں جا ملتی ہے اسی طرح کیرالا کی زبان سنسکرت کی برفانی چوٹیوں سے پگھل کر آتی ہے اور ہمیشہ میرے دل کی "سرسوتی" کا سنگھار کرتی ہے)

ملیالی زبان میں ضمائر، اعضا، گھریلو اشیا، پالتو جانوروں، باہمی تعلقات اعداد، ترکیب نحوی، جنس، افعال اور گردان کے لئے بنیادی اسم نکرہ سنسکرت سے مختلف

ہیں۔ لیکن اگر آپ کوئی ادبی تحریر پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں سنسکرت کے ساٹھ فی صدی الفاظ شامل ہیں۔ پندرہ سال پہلے تک ملیالی ادیبوں کا یہی رویہ تھا۔ لیکن اب زیادہ سے زیادہ مقامی اور عام بول چال کے الفاظ استعمال کرنے کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ گنڈرٹ نے ملیالی زبان کو تامل کی چھوٹی بہن بتایا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر "تیلیا دھیکارم" جیسی قدیم ملیالی کتاب میں ملیالی الفاظ کیسے آئے کوئی نہ کوئی بنیادی ملیالی زبان ضرور رہی ہوگی جس پر چیرا خاندان کے عہد میں تامل کا اثر پڑا اور بعد کو برہمنوں نے اس کو سنسکرت الفاظ سے بھر دیا۔ شمالی مالابار کے لوک گیتوں سے بھی اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ لوک گیت حال ہی میں جینوٹ اچیوتا مینن نے جمع کئے ہیں۔ ڈاکٹر کے ایم جارج کے تحقیقی مقالہ "رام چرتیم" میں بھی اس بات کا ثبوت موجود ہے۔

ادبی سرمایہ

ملیالی ادب کی تاریخ کے چار دور ہیں:۔

۱۔ قدیم دَور۔ آٹھویں صدی تک

۲۔ دراوڑی اثرات کا دَور۔ چودھویں صدی تک۔

۳۔ سنسکرت اثرات کا دَور۔ سترھویں صدی تک۔

۴۔ دَورِ جدید۔

قدیم دَور کے ادب میں صرف لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی صورت میں کچھ چیزیں ملتی ہیں، کچھ طلسماتی بول جیسے منتر بھی موجود ہیں۔ "رام چرتیم" سب سے قدیم کتاب ہے جو کسی نامعلوم مصنف کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ کوئی چھٹی صدی میں لکھی گئی تھی۔ قدیم ادب کا محور "شیوا" اور "کشالا" کی کہانیاں ہیں۔ ایک دلچسپ کتاب "چمپو کاویاس" ہے۔ جس کا مطلب ہے مختلف قسم کی تحریریں جن میں نثر اور نظم دونوں شامل ہیں۔ مادھو پانیکر کی "بھاشا بھگود گیتا" نثر کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ چیروش شیری منبودری ایک ایسا شاعر گزرا ہے جس نے ودیاپتی اور سورداس کی طرح کرشن جی کے گن گائے۔

سنسکرت کے دَور میں درباری سرپرستی کی وجہ سے شاعری میں عروض پر بہت زور دیا گیا۔ زمورین بادشاہ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے اور شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دَور کی شاعری زوال کی حد تک پہنچ گئی۔ جب مغربی اثرات یہاں پہنچے تو ۱۵۷۷ء میں یعقوبی فرقہ کے ایک پادری نے ملیالم پریس قائم کیا اور کیتھولک مت آپر تھم پتھ :۔ پرشنوتارولی" نام کی کتاب چھاپی۔

ایلٹاچان اس دَور کا سب سے بڑا شاعر گزرا ہے۔ اس کی لکھی ہوئی "رامائن" تلسی داس کی رامائن کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے۔ انگریزی میں "ایلٹاچان" اور اس کے دور پر قابلِ قدر کام ہوا ہے۔ اس شاعر نے بودھوں یا عیسائیوں کے عدمِ تشدد کے فلسفہ سے اثر قبول کیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں دکھایا ہے کہ جب کبھی لکشمن کو غصہ آتا ہے تو رام رحم اور غیر انتقامی جذبہ کی خوبیاں بیان کر کے اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہیں۔ ایلٹاچان کا انتقال ۱۵۷۵ء میں ہوا۔

اس کے بعد کئی صدی تک "کتھاکلی" رقص ڈرامہ کی حیثیت سے بڑی کامیاب تصنیف سمجھی جاتی رہی۔ بہت سی رزمیہ داستانیں "کتھاکلی" رقص کی صورت میں پیش کی گئیں۔ اس زمانے میں یہ ڈرامے ۲۰ دن تک دکھائے جاتے تھے۔ راجہ سری رام ورما نے ایسے کئی "کتھاکلی" ڈرامے لکھے ہیں۔ مینن نمبیار نے رقص ڈرامہ لکھنے میں بڑا کمال حاصل کیا۔ نمبیار نے سماج پر طنز کرنے کے لئے مقبول عوام رقص ڈرامہ کا سہارا لیا اور اس طرح پرانی بوتلوں میں نئی شراب پیش کی۔ پرانے اور نئے دَور کے مابین عبوری زمانہ تاریکی کا دَور ہے کیوں کہ اٹھارویں اور ابتدائی اُنیسویں صدی کے ادب کے بارے میں ہمیں بہت کم معلوم ہے۔

دورِ جدید۔

اس دَور میں کیرالا ورما تمپورن (۱۹۱۴ء ۔ ۱۸۴۵ء) نے "ابھگیان شکنتلا" کا ترجمہ کیا۔ یہاں تک کہ راجہ سواتی تیرونال نے بھی نظمیں لکھیں۔ اُنیسویں صدی کا ادب اس قسم کے "سندیسکا ویاس" اور ایک خاص طرز کی شاعری سے بھرا پڑا ہے۔ سی۔ ایس سبرامینن نے ایک طویل نظم لکھنے کی بھی کوشش کی۔ غم و فراق کی اس شاعری میں نالاپتو نرائن مینن کی "کنو نیرانالی" اور کمارن اشان کی پرودام مشہور نظمیں ہیں۔ جن شعرائے ملیالی شاعری کو نیا مفہوم اور نیا اندازِ بیان دیا ان میں مہاکوی کمارن اشان کا نام سرِفہرست ہے اس شاعر کا تعلق دلت جاتی سے تھا اس کی نظم کی مشہور کتابیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ "وین پرود" (گرا ہوا پھول)

۲۔ نلنی

۳۔ چنتا وش تیائے ستیا (فکر مند سیتا)

۴۔ چنڈالا بھکشوکی

اس نے کالی داس کے "میگھ سندیش" اور شنکر آچاریہ کے "سوندریہ لہری" کا منظوم ترجمہ کیا۔ اشان نے اپنی نظم "لیلا" میں بیوہ کی بپتا بیان کی ہے "تلاوتھا"

میں ایک نیچ ذات کی لڑکی کا ذکر ہے۔ جو مونیوں کے ظلم سے تنگ آکر ایک برہمن کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ مہاتما بدھ کی زندگی کی ایک کہانی "چنڈالا بھکشوکی" کو رقص ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ فراجذبات کی فراوانی کا اندازہ لگائیے جب آنند کہتا ہے: "بہن تمھاری ذات پات نہیں پوچھتا۔ مجھے تو بس پانی چاہیئے"۔ کمارن آشان پہلا شاعر ہے۔ جس نے ملیالم میں جدید رومانی شاعری کی ابتدا کی اس دور کا دوسرا بڑا شاعر النور پرمیشورا آئر ہے۔ قدیم طرز میں اس کی مشہور نظم "اماکیرلم" ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہر زبان کی شاعری میں نئی زندگی اور اس کے تقاضوں کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اُردو میں حالی، ہندی میں میتھلی شرن گپت بنگالی میں نوین چندر سین، مراٹھی میں کیشو سوتا اور گجراتی میں نرمدا کی شاعری اس پیغام کی حامل ہے النور نے اپنی نظم "چترشالا" میں مس کیتھرائن میو کو جواب دیا ہے۔ اس طویل نظم میں ہندوستانی عورتوں کے شاندار ماضی کو اُبھارا گیا ہے۔

پہلے دَور کے جن تین شاعروں نے جدید ملیالی شاعری کی بنیاد ڈالی ان میں ولاتھول نرائن مینن کا نام ہمیشہ بڑے احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ یہ اسّی سالہ شاعر کبھی لکیر کا فقیر نہیں رہا۔ ان کے خیالات زمانے کے ساتھ بدلتے رہے۔ انھوں نے حال ہی میں چین اور ملایا کے بارے میں نظمیں لکھی ہیں ولاتھول نے "رگ وید" کا ملیالم میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ان کا زبردست شاہکار ہے اور اس پر ساہتیہ اکادمی کی طرف سے پندرہ ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔ ان کی نظموں کے انگریزی اور روسی میں ترجمے ہو گئے ہیں۔ ولاتھول نے مکمل "کتھا سرت ساگر" کا ترجمہ بھی کیا ہے اور اس کا نام "گرام لکشمی سوبھاگیم" رکھا ہے۔ "ساہتیہ منجری" کی سات جلدوں میں ولاتھول کا کلام مدون ہو چکا ہے۔ ان کی نظموں میں بڑی رنگا رنگی ہے جو دوسروں کے ہاں مشکل سے ملتی ہے۔ کبھی تو وہ باپو جی اور اُن کے چرخہ کے گن گاتے ہیں تو کبھی "پہاڑی چوہے (شیواجی) کے خط" کے بارے میں لکھتے ہیں اور کبھی "پوران" کی تشبیہوں کو جدید ترین موضوعات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ولاتھول ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر فنون لطیفہ کے بھی قدردان اور محافظ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے "کیرالا کلامنڈلم" کی بنیاد ڈالی جس میں کتھاکلی اور دوسری قسم کے رقص کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ان تین شاعروں کے علاوہ سردار کے ایم پانیکر اور جی شنکرا کروپ کے نام بھی ملیالی ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ سردار پانیکر نے عمر خیام کی رباعیات، میگھ دوت اور سوفوکلیس اور اِبسن کی تخلیقات کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور "چھترپتی شیواجی"، "کرشنا دیو رائے کا انصاف" اور "شیڈر نایٹیکا" "کرشیتر اوڈے گاندھاری" جیسے کئی منظوم ڈرامے لکھے ہیں۔ انھوں نے چین اور مصر میں اپنے قیام کے دوران "لبنان" اور "نہر سویز" پر الگ الگ دو طویل نظمیں لکھیں سردار پانیکر نے "کیرالا سمنام" اور "کلیان مل" جیسے تاریخی ناولوں کے علاوہ ادبی تنقید، سماجیات اور تاریخ پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ متذکرہ دونوں ناول ہندی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ سردار پانیکر نے اپنی خود نوشت سوانح حیات ملیالم میں لکھی ہے جس کا انگریزی ترجمہ ہونا باقی ہے ان کی انگریزی تحریریں محتاجِ تعارف نہیں۔

جی شنکرا کروپ عام طور سے "جی" کے نام سے مشہور ہیں اور انھیں کیرالا کا ٹیگور سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے جدید ملیالی شاعری میں اشاریت کی ابتدا کی۔ ان کا کلام "ساہتیہ کاستو بھام" کے نام سے تین جلدوں میں پہلے ہی چھپ چکا ہے ان کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نام "چین کنی (کلاٹ)" ہے اور تیسرے کا نام ہے "جھاتا ہری دیام"۔ وہ مہاراج کالج ارناکلم میں پروفیسر رہے۔ کیرالا اور اس کے باہر بھی ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے انھیں بنگالی خوب آتی ہے اور وہ آج کل ٹیگور کی ان نظموں کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں جو انھیں بہت پسند ہیں۔

ملیالم کے نثری ادب نے بھی کافی ترقی کی ہے۔ خاص کر مختصر افسانہ تو بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار تکازی شیو شنکر پلّے کی کتاب "راندی ننگا لی" (دو مٹھی چاول) نے ملیالی ادب میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ان کا جدید ترین ناول "چیمیان" (جھینگے) کی ایک ہزار جلدیں دو مہینے کے اندر اندر فروخت ہوئیں۔ دوسرے مقبول افسانہ نگاروں میں کیرور اور ب، کے، ٹی محمد بشیر شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کا موضوع اکثر چائے کے باغ میں کام کرنے والے محنت کش غریب ہوپلہ عورتیں اور سنگ دل سرمایہ دار ہوتے ہیں۔

ملیالم میں ڈرامہ نے بہت ترقی کی ہے۔ روائتی کتھا کلی اور اوٹم تھلال کے علاوہ سماجی ڈرامہ نے صحیح اور زندہ روایات کے ساتھ بڑی ترقی کی ہے۔ ایم پی چلیپّن نائر، گوپی ناتھ نائر، کینی کرا کمار پلّے اور ٹی محمد بشیر، مشہور ڈرامہ نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کے ڈراموں میں طنز و مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ اداکاری بھی اُونچے درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔ بنگالی ڈرامہ نگار ڈی ایل رائے کے تمام ڈراموں کا ملیالم میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

غرضیکہ ملیالی کے تخلیقی ادب میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ عوام کو اپنی زبان اور اپنے ادب سے بڑا لگاؤ ہے۔ ملیالم بولنے والوں کی

تعداد کوئی ڈیڑھ کروڑ ہے۔ ٹراونکور کوچین کے علاقے میں خواندگی تقریباً سو فی صدی ہے۔ بمبئی ۱۹۵۷ء میں ساہتیہ پریشد کی نمائش میں جو چارٹ رکھے گئے تھے اُن میں دکھایا گیا تھا کہ یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے یکم اپریل ۱۹۵۶ء کے ایک سال میں کل ۷۲۵ کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں ۲۲۰ ناول، ۱۰۹ افسانوں کے مجموعے، ۱۱۰ ڈرامے اور ۷۵ نظموں کی کتابیں شامل تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں لوگوں کو کتب بینی کا بڑا شوق ہے۔ کٹّایم میں مصنفوں کی ایک کوآپریٹو پبلشنگ آرگنائزیشن بھی کامیابی سے چل رہی ہے۔ ملیالم کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کی اشاعت بھی بہت زیادہ ہے۔ مثلاً ماترو بھومی کی اشاعت پچاس ہزار ہے۔

اس سرزمین نے بہترین سیاست داں، رقاص، کارٹونسٹ اور زبان و ادب کے عالم پیدا کئے ہیں اور آئندہ بھی اس علاقے کے لوگ اپنی مادی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

ڈیرہ دون میں نابینا افراد کی تعلیم کا مرکز

نابینا افراد کی سماجی بحالی انھیں مختلف پیشوں کی تربیت دینے اور ان کے لئے روزگار کے مناسب مواقع فراہم کرنے کا کام خصوصی توجہ کا محتاج ہے یہ لازمی امر ہے کہ جسمانی طور پر معذور افراد کو اقتصادی آزادی حاصل کرنے اور سماج کا مفید انگ بننے میں مدد دی جائے۔

بھارت کی پہلی قومی حکومت نے ۱۹۴۷ء میں عنان اقتدار سنبھالنے کے بعد جلد ہی اس سوال پر توجہ دی اور فیصلہ کیا کہ نابینا اشخاص کی تعلیم اتنا اہم اور نازک کام ہے کہ اس کا انحصار محض نجی خیرات پر نہیں ہونا چاہئے۔

چناں چہ مرکزی وزارت تعلیم نے ۱۹۵۰ء میں بینائی سے محروم بالغ اشخاص کے لئے ایک تربیتی مرکز کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے لئے ڈیرہ دون کے خوشنما شہر کا انتخاب کیا گیا اور مرکز کے واسطے وہاں ایک وسیع قطعہ اراضی حاصل کر لیا گیا۔

اس مرکز میں بینائی سے محروم بالغ مرد داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں ۱۵۰ آدمیوں کے قیام و تربیت کا انتظام ہے جس کے لئے کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ تربیت یافتگان کو اتفاقی اخراجات کے لئے جیب خرچ بھی دیا جاتا ہے۔

مرکز میں بنیادی طور پر پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے جس کا مقصد تربیت یافتگان کو منفعت بخش کام سکھانا ہے نابینا افراد کو بہت سی کاریگریوں مثلاً سوت کاتنے، کپڑا بننے، بید سے کرسیاں بننے، ٹوکریاں اور موم بتیاں وغیرہ بنانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ جو لوگ پہلے سے تعلیم یافتہ نہیں ہوتے انھیں تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ذریعہ تعلیم ہندی ہے اور یہاں ہندوستانی طرز کا بریل کوڈ استعمال کیا جاتا ہے جسے "بھارتی بریل" کہتے ہیں۔ تربیت کی مدت عام طور پر دو سال کی ہوتی ہے۔

سنگیت میں نابینا اشخاص کے لئے ایک خاص کشش ہوتی ہے چناں چہ جن لوگوں کو سنگیت سے دلچسپی ہوتی ہے انھیں موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اس امر کے پیش نظر کہ نابینا افراد کو بااجرت روزگار حاصل کرنے میں دقت پیش آتی ہے مرکز اس سوال پر خاص توجہ دیتا ہے اس نے ایک چھوٹی سی ورکشاپ قائم کی ہے جہاں فی الحال بیس دستکار کام کر رہے ہیں۔ دوسرے منصوبے کے دوران میں اس ورکشاپ کی مزید توسیع کی جائے گی تاکہ یہاں قریب قریب ایک سو آدمی کام کر سکیں۔

دوسرے منصوبے میں ۸ لاکھ روپے کی ایک رقم اس مرکز کو نابینا افراد کی تربیت کی ایک ماڈل انسٹی ٹیوشن بنانے کے لئے مخصوص کی گئی ہے اس میں کئی شعبے قائم کئے جائیں گے۔ مثلاً نابینا افراد کے لئے ایک ماڈل سکول، اساتذہ کی ٹریننگ کا ایک ڈیپارٹمنٹ، بالغ نابینوں کے لئے تربیتی مراکز، جدید ترین قسم کا ایک بریل پریس اور ایک بریل لائبریری، نابینا اشخاص کو روزگار دلانے والا ایک ادارہ قائم کرنے کے لئے دوسرے منصوبے میں علیحدہ رقم رکھی گئی ہے۔

علی یاور جنگ

بھارت کی خارجہ پالیسی

کسی ملک کی خارجہ اور داخلہ پالیسیاں ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں نہیں ہوتیں بڑا فرق ان کے دائرہ عمل میں ہوتا ہے ۔

اپنی نوعیت کے اعتبار سے خارجہ پالیسی کوئی غیر متغیر چیز نہیں ہے حکومتوں کا بدلنا، انقلابات کا آنا، لڑائیوں کا ہونا۔ تعلقات یا طاقت کے توازن میں تبدیلی کا رونما ہونا یا اہم واقعات کا ظہور پذیر ہونا مثلاً موجودہ دور میں ایٹمی قوت کی دریافت ۔ یہ سب چیزیں بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا باعث بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی رائے کا بھی اثر خارجہ پالیسی پر پڑتا ہے ۔ خارجہ پالیسی کے پیچھے کچھ آئیڈیلیں ہوتی ہیں۔ کچھ تمنائیں ہوتی ہیں جن کے محرک قومی روایات و نظریات ہوتے ہیں اور جن کا اثر ان تمام باتوں میں جو خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتی ہیں سب سے زیادہ ہوتا ہے ۔ یہ قومی روایات و نظریات تاریخ اور ایک قوم اور ایک ملک کے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور آدرشوں اور حقیقتوں کا امتزاج ہوتے ہیں۔

حصول آزادی سے چند ماہ قبل تک ہم کو کامن ویلتھ کے ملکوں کو چھوڑ کر باقی دُنیا کو صرف وائٹ ہال کے جھروکوں سے ہی دیکھنے کی اجازت تھی ۔ کئی صدیوں میں پہلی بار ۱۹۴۶ء میں ہم نے امور خارجہ کی عنان سنبھالی اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں ہم نے ایک وفد بھیجا جس نے اجلاس میں آزاد ہندوستان کے نام پر شمولیت کی ۔

اگرچہ ہمیں اس حیثیت سے آزاد اقوام کی برادری میں شامل ہوئے صرف دس برس ہی گزرے ہیں تاہم ہمیں کسی کو اس بات کا یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ایک بالکل نوعمر قوم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہمیں دوسروں کے بارے میں جن سے کہ ہم ایک طویل مدت تک الگ تھلگ رہے تھے جاننے اور ان کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کے طریقوں کی واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت رہی ہو شاید اب بھی ہو مگر اس کے باوجود ہماری جڑیں بہت پرانی اور گہری ہیں اور ہماری تاریخ اور ہمارے ماحول نے ایک ایسی روایت اور ایک ایسے نظریے کو جنم دیا ہے جو بالکل صاف ہے۔

اگرچہ بعض لوگوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ برطانوی راج کے ختم ہونے پر ہمارا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور ہمارے ملک میں گڑبڑ پیدا ہو جائے گی ۔ مگر دنیا نے دیکھا کہ آزادی ملنے کے بعد ہم نے ترقی کی اور ہماری خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے ہماری آزادی کی جدوجہد کی محرک ہماری انفرادی آزادی، سماجی انصاف اور سیاسی و اقتصادی امور میں غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش تھی۔

اس جدوجہد میں ہم نے ایک عظیم انسان سے یہ سیکھا کہ طاقت تو کمزوروں کا ہتھیار ہے اور جہاں طاقت ناکام رہتی ہے وہاں ایک متحد قوم کا پُرامن ارادہ اور استقلال ہی سلطنتوں کی بنیادیں ہلا سکتا ہے ۔ اسی عظیم انسان سے ہم نے بحیثیت ایک قوم کے یہ بھی سیکھا کہ ڈر اور خوف چونکہ ایک قوم کے ضمیر کو اپاہج بنا دیتا ہے۔ اس لئے ہم کو اسے ترک کر دینا چاہئے ۔ یہ ہیں وہ اصول جنہیں ہم نے اپنے سامنے رکھا ہے۔

ہماری جغرافیائی حالت اور ہمارے ملک کے ایسے وقت میں آزاد ہونے کے باعث جب دُنیا تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہی تھی ہمیں کسی حد تک مجبوراً خارجی معاملات میں اُلجھنا پڑا ۔ دنیا کے تمام لوگوں کی قدرتی خواہش ہے کہ دنیا میں امن اور سلامتی ہونی چاہئے اور یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہئے کہ تمام حکومتیں چھوٹی ہوں خواہ بڑی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ جنگ کے خوفناک حقائق کو آج سب جانتے ہیں اور جنگ کے نتائج سے بھی بخوبی آگاہ ہیں جس کے باعث مذکورہ بالا عزم کو مزید تقویت ملتی ہے۔ لیکن

امن کو فروغ دینے کے لئے جس طرزِ عمل اور طریقۂ کار کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اس کے بارے میں ہمارے اور چند دیگر لوگوں کے درمیان کافی اختلافِ رائے پایا جاتا ہے ہم نے بڑے زور سے پُرامن طرزِ عمل اور امن پسندانہ طریقۂ کار کی حمایت کی ہے۔ ہم نے غیر مبہم الفاظ میں فوجی طرزِ عمل اور فوجی معاہدوں، غیر ملکوں میں فوجیں رکھنے اور فوجی اڈے قائم کرنے کی زبردست مخالفت کی ہے خواہ یہ طریقے اختیار کرنے والا کوئی بھی ملک ہو۔

ہم یقین رکھتے ہیں کہ ایسے جنگی طریقے خواہ یہ خالص دفاعی نوعیت کے ہی ہوں۔ امن کے دفاع کو کمزور کرتے ہیں کشیدگی بڑھاتے ہیں اور فوجی دھمکیوں، اور جوابی فوجی خطروں کا ایک سلسلہ پیدا کر دیتے ہیں۔

ہم اپنے اس عقیدے کے زیرِ اثر اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو ہمیں دوسرے ملکوں کے ساتھ کسی ایسے معاہدے میں شامل نہ ہونا چاہئے جو ہمیں کچھ ملکوں کے ساتھ دوستی اور اُس کے ساتھ ہی دیگر ملکوں کے ساتھ دشمنی کا پابند بنانے والا ہو۔

کشمیر ہمارے اس پُرامن طرزِ عمل کی عمدہ مثال ہے جو ہم نے اپنے ایک ہمسایہ ملک کے ساتھ تعلقات میں تنازعہ کے لئے اختیار کیا ہے۔ جب کشمیر کے حکمران اور کشمیر کے لوگوں نے بار بار ہم سے اپیل کی کہ حملے کو روکا جائے تو ہم ان کی درخواست پر کشمیر کو اس حملے سے بچانے کے لئے گئے۔ اس کے فوراً ہی بعد ہم نے اقوامِ متحدہ سے اس حملے کو روکنے کے لئے کہا۔ ہم نے ہمیشہ ہی بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو پُرامن طور پر حل کرنے کا سجھاؤ دیا ہے اور کسی وقت بھی اشتعال انگیزی کے باوجود ہمارے ملک کے لوگوں یا حکومت نے جنگ کا نعرہ نہیں لگایا اور نہ ہی جنگ کا وطیرہ اختیار کیا ہے۔

اسی طرح افریقہ اور ایشیاء کی دیگر اقوام کی نوآبادیاتی راج کے خلاف جدوجہد کے بارے میں بھی ہم نے ہمیشہ پُرامن طریقوں پر زور دیا ہے جنوبی افریقہ میں نسلی منافرت رائج کرنے اور اُسے دائمی بنانے کے خلاف وہاں کے لوگوں نے جو مدافعت کی ہے اس کے بارے میں بھی ہم پُرامن طریق کار اختیار کرنے کے نظریے پر قائم رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی بہت زیادہ اثرانداز رہی ہے کہ آزاد بھارت کے لیڈر وہی لوگ ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی کی اُس جدوجہد کی رہنمائی کی تھی جس میں ایک عظیم سلطنت کی طاقت کے خلاف نہتے لوگ عدمِ تشدد کے اصول پر کاربند ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ہماری آزادی کی جنگ کا انحصار لازمی طور پر عوام کے عزمِ راسخ اور ترکِ خوف و تشدد پر رہا ہے ہماری یہ جنگ غیر ملکی حکومت کی غر منصفانہ لاپرواہی کے باعث ہم پر نازل ہونے والی بیماری، جہالت اور غربت کے خلاف تھی۔ اس جدوجہد کی خصوصیات نے ہماری قومی اور بین الاقوامی پالیسی دونوں پر اپنے نہ مٹنے والے اثرات چھوڑے ہیں۔

جب ہم آزاد قوموں کی برادری میں پہلے پہل شامل ہوئے تب ہم مادی دولت اور طاقت کے لحاظ سے کمزور اور نادار تھے لیکن نوعِ انسان کے مستقبل کے بارے میں اپنے اعتقاد کے لحاظ سے ہم مالدار اور طاقت ور تھے۔ جنگ کی ہولناک تباہی کے باعث دنیا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ تشدد اپنی انتہا پر تھا دنیا میں پہلی بار ایشیا کے لوگوں پر ایٹمی ہتھیار استعمال کئے گئے تھے۔ بے پناہ طاقت والے دو دیو ایک دوسرے کے بالمقابل معرکہ آرا تھے۔ اس وقت اقوام نے متحدہ اقوام کے چارٹر پر دستخط کئے نوعِ انسانی کو ڈھارس بندھی اور اس کی اُمیدیں چمک اٹھیں لیکن جنرل اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس میں سرد جنگ کے آغاز کا مظاہرہ ہوا۔ ہم نے اس صورتِ حال کو ختم کرنے میں مدد دینے کی پالیسی اختیار کی۔ ہم تمام ملکوں سے دوستی کے خواہاں رہے ہیں۔ ان ملکوں کے ساتھ بھی ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں جن کے نظام اور پالیسیوں سے ہم لازمی طور پر متفق نہیں ہیں ہم نے اپنے مقدور بھر امن کو قائم رکھنے اور فروغ دینے کی کوشش کی ہے ہماری پالیسی کا ایک لازمی جزو یہ رہا ہے کہ ہماری فوجیں امن کی اغراض کے سوائے کسی دوسرے مقصد کے لئے کسی دیگر ملک میں نہیں جائیں گی۔ ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ہم بنڈونگ کانفرنس میں شامل ہوئے۔ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ہم نے بہادرانہ جدوجہد کی تھی لیکن اس کے باوجود ہم نے ان کے ساتھ تعلقات کو قائم رکھا۔ ہم کامن ویلتھ میں شامل ہوئے۔

یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ دنیا کی سب قومیں ہمارے ساتھ اتفاق کریں جس طرح کہ وہ بھی یہ توقع نہیں رکھ سکتی ہیں کہ ہم ہمیشہ ہی ان کے طرزِ فکر و عمل سے اتفاق کریں گے جن پانچ اصولوں پر ہم نے اپنے بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد رکھی ہے ان پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور کچھ ملکوں نے ان کو غیر حقیقت پسندانہ بھی کہا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مخالف فلسفہ جس نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے دنیا میں امن کا باعث نہیں بن سکتا۔ اسلحہ کے زور سے امن قائم کرنے کا نظریہ آج کی دنیا کو ہرگز مطمئن نہیں کر سکتا ہے۔ کیوں کہ آج کی دنیا جنگ اور

١

اسلحہ کی دوڑ کی ہولناک تباہیوں کے امکانات سے دن بدن خبردار ہوتی جارہی ہے
ہماری پالیسی میں سب سے بڑا حقیقت پسندانہ عنصر ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ ہمیں سب سے پہلے خود طاقت ور ہونا چاہئے۔ فوجوں اور ایٹمی ہتھیاروں کی طاقت اگرچہ کافی اثر رکھتی ہے اور اسے فراموش بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن ہماری اصل طاقت اپنی ترقی، استحکام اور عزم کی طاقت ہے۔ ہم ساری دنیا کا بڑا احترام کرتے ہیں اور اپنے گردوپیش کے واقعات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہم نہ تو کسی کی کرم فرمائی کے منتظر ہیں اور نہ ہی کسی کی نکتہ چینی سے خوف کھاتے ہیں۔ ہمیں ساری دنیا کو پیش نظر رکھنا ہے اور اس کا احترام کرنا ہے۔ ہمیں یہ دعویٰ نہیں کہ ہم ہی نیکی، خوبی اور دانش مندی کے اجارہ دار ہیں۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ ہم کبھی بھی ان اصولوں کو فراموش نہیں کریں گے جن کے لئے ہم برابر جدوجہد کرتے رہے ہیں اور ہم کسی مصلحت کی خاطر اپنے ان اصولوں کو ہرگز قربان نہیں کریں گے۔

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ)

کتابوں کا قومی ٹرسٹ

بھارت سرکار نے کتابوں کا قومی ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین شری سی ڈی دیشمکھ اس ٹرسٹ سے متعلق ٹرسٹی بورڈ کے چیئرمین مقرر ہوئے ہیں۔ اس میں چیئرمین کے علاوہ پندرہ ممبر ہوں گے

یہ بورڈ اس لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ اچھے قسم کے ادب کی حوصلہ افزائی ہوسکے اور عمدہ کتابیں مناسب داموں پر لائبریریوں، تعلیمی اداروں اور عوام تک پہنچائی جاسکیں۔

یہ ٹرسٹ خاص طور سے درج ذیل قسم کی کتابیں شائع کرانے کا انتظام کرے گا۔

۱۔ بھارت کا کلاسیکی ادب
۲۔ معیاری کتابوں کو ایک بھارتی زبان سے دوسری بھارتی زبان میں منتقل کرنا
۳۔ بھارت کی نقاشی، فن سنگ تراشی اور آرٹ کے دیگر شاہکاروں کی دوبارہ اشاعت
۴۔ بھارتی مصنفین کی معیاری تصانیف۔
۵۔ تعلیم سائنس اور آرٹ اور دیگر علوم پر معیاری کتابیں
۶۔ زندہ مصنفین کی تصانیف

یہ ٹرسٹ ہندی اور بھارت کے آئین میں تسلیم شدہ دیگر زبانوں میں کتابیں شائع کرے گا۔ یہ غیرملکی زبانوں میں بھی کتابیں شائع کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ ٹرسٹ یونی ورسٹیوں اور تعلیمی سوسائٹیوں اور اداروں کے ذریعے سے منظور شدہ کتابوں کی اشاعت میں بھی مدد کرسکتا ہے۔ یہ سب کتابیں خاص طور سے وزارتِ اطلاعات و نشریات کے پبلیکیشنز ڈویژن کے ذریعے سے شائع کی جائیں گی

انہیں لائنوں پر علاقائی ٹرسٹ بھی قائم کئے جاسکتے ہیں تاکہ وہ قومی ٹرسٹ کے لئے مدد و معاون ثابت ہوسکیں۔ علاقائی ٹرسٹوں میں، ٹرسٹیوں سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔ نیز ان کی مالی اعانت خاص طور سے ریاستیں اور متعلقہ ریاستوں کے گروپ کرسکتے ہیں۔

شانتی بھوشن

کاپی رائٹ کا قانون

کاپی رائٹ ایک قسم کا سرمایہ ہے اور کاپی رائٹ کا قانون اس سرمایہ کا محافظ ہے مصنف اور کلاکار اپنی محنت اور دماغی قوت کے ذریعے یہ سرمایہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جائے تو مصنفوں اور کلاکاروں کو اپنے کام میں زیادہ محنت کرنے کے لئے کوئی وجہ ترغیب نہ رہ جائے۔ اس لئے کاپی رائٹ کے قانون کا خاص مقصد یہی ہے کہ انسانیت کے مفاد کے لئے جدید ترین اور بلند ترین تصانیف اور فنی تخلیقات کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس قانون میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے حقوق کی حفاظت کرنے میں دوسروں پر اتنی سخت پابندیاں نہ لگا دی جائیں کہ ادب، سائنس اور آرٹ وغیرہ کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔

کاپی رائٹ کے قانون کی پوری کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا تعلق کسی خاص ملک سے نہ ہو بلکہ جہاں تک ہو سکے دنیا کے تمام ملکوں پر حاوی ہو جس سے کاپی رائٹ کے حقوق کی حفاظت ایک ہی ملک میں نہیں بلکہ تمام ممالک میں ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے ۱۸۸۵ء میں دنیا کے کئی ملکوں کی ایک کانفرنس سوئٹزرلینڈ کی راجدھانی برن میں ہوئی تھی۔ جس میں ایک بین اقوامی کاپی رائٹ قانون بنایا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں برلن میں اسی قسم کی ایک دوسری کانفرنس ہوئی جس میں ترمیم شدہ برن کنونشن کا اجراء ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں روم کاپی رائٹ کنونشن بنایا گیا۔

ہندوستان کا کاپی رائٹ قانون بھی انھیں بین اقوامی قوانین کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ کاپی رائٹ کا حق ہر ایک طبع زاد ادبی تصنیف، ڈرامہ، موسیقی اور فنی تخلیق کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس تصنیف کی پہلی اشاعت ہندوستان یا کسی ایسے ملک میں ہوئی ہو جس کے ساتھ ہندوستان کا کاپی رائٹ سے متعلق سمجھوتہ ہو۔ یا جس کا مصنف تصنیف کے دوران ہندوستان یا کسی ایسے ہی ملک کا باشندہ رہا ہو۔

کسی تصنیف یا اس کے کسی حصے کو کسی بھی صورت میں شائع کرنے یا اس سے ماخوذ کرنے کے تمام حقوق صرف اس شخص کو حاصل ہیں جس کے پاس اس تصنیف کا کاپی رائٹ ہے۔ ساتھ ہی اس تصنیف کا کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا حق یا ڈرامے کو ناول یا ناول کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے کا حق بھی کاپی رائٹ کے مالک ہی کو حاصل ہے۔ اسی طرح کسی تصنیف کا ریکارڈ یا فلم بنانے کا حق بھی اس کو حاصل ہے

کاپی رائٹ کا مالک اپنے یہ حقوق کسی دوسرے کو بھی دے سکتا ہے اور اس کی وفات کے بعد یہ حقوق اس کی جائداد کے وارث کو پہونچتے ہیں۔ کسی علم سے متعلق کاپی رائٹ کا قانون کسی آدمی کو کلی حقوق نہیں دیتا۔ مگر یہ صورت علم کے کسی حصے کو طبع زاد تصنیف کی صورت میں پیش کرنے تک ہی محدود ہے۔ کسی دوسرے شخص کو اس طبع زاد تصنیف کی نقل کرنے کی اجازت نہیں لیکن اس علم کو کسی دوسری طبع زاد تصنیف کی صورت میں پیش کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ اگر کوئی آدمی کسی کی تصنیف سے استفادہ کرکے محنت شاقہ کے بعد ایک ایسی چیز لکھے جو نئی تصنیف کہلانے کے لائق ہو تو بھی اس تصنیف کے پہلے مصنف کے حقوق میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ جدت کئی قسم کی ہو سکتی ہے۔ موضوع کی جدت، مواد کی جدت، اسلوب کی جدت اور جذبات کی جدت مگر تھوڑا بہت ردّ و بدل کر دینے سے کوئی نئی تصنیف نہیں ہو جاتی۔ اس میں کسی قسم کی اس قدر جدت ضرور ہونا چاہیئے کہ یہ کہا جا سکے کہ مصنف نے اپنی محنت اور تخیل سے کام لے کر ایک نئی تصنیف پیش کی ہے۔ عام طور سے بڑے بڑے ناولوں کو کسی دوسری صورت میں مختصر

کرکے پیش کر دیا جاتا ہے لیکن ان چیزوں کو طبع زاد تصانیف نہیں کہا جا سکتا اور یہ بھی کاپی رائٹ کے واسطے میں آتی ہیں، درسی کتابوں، امتحانوں کے پرچوں اور تمام خطوط کا بھی کاپی رائٹ ہوتا ہے۔ ڈرامہ میں خاموش اداکاری بھی شامل ہے اور آرٹ میں مصوری، نقش نگاری، فوٹو گرافی اور بُت تراشی شامل ہیں۔

تبصرہ، تحقیق، تنقید وغیرہ کے لئے کسی تصنیف سے استفادہ کیا جائے تو اس پر کاپی رائٹ کے قانون کی رو سے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کسی درسی کتاب میں کسی ادبی تخلیق کے چھوٹے چھوٹے حصے مثال کے طور پر نقل کئے جائیں تو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا مگر اس پر دو پابندیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی مصنف کی تصانیف میں سے ناشر پانچ برس کے عرصے میں دو سے زیادہ حصوں کو شائع نہ کرے اور دوسرے یہ کہ شائع کرتے وقت یہ بھی لکھ دینا ضروری ہے کہ یہ ٹکڑے کون سی اصل کتاب سے نقل کئے گئے ہیں۔ اگر کوئی تقریر جلسۂ عام میں کی جائے تو اس تقریر کو کسی اخبار میں شائع کرنا بھی قابلِ اعتراض نہیں بشرطیکہ مقرر ہی اس کی ممانعت نہ کرے۔

کاپی رائٹ کے حقوق مصنف کی زندگی کے دوران اور اس کی وفات کے ۵۰ برس بعد تک برقرار رہتے ہیں۔ بعض تصانیف ایسی ہوتی ہیں جن کے ایک سے زیادہ مصنف ہوتے ہیں۔ ایسی تصانیف کے کاپی رائٹ کی میعاد ان میں سے سب سے پہلے مرنے والے مصنف کی وفات کے بعد ۵۰ برس تک برقرار رہتی ہے۔ لیکن اگر ۵۰ سال گزرنے پر بھی ان میں سے کوئی مصنف زندہ ہو تو کاپی رائٹ کی میعاد تب تک رہے گی جب تک ان سب کی وفات نہ ہو جائے حکومت کی طرف سے شائع کردہ کتابوں کے لئے حکومت کے کاپی رائٹ کی میعاد ان کی پہلی اشاعت سے شروع ہو کر ۵۰ برس تک رہتی ہے۔ اس میعاد کے گزر جانے پر یہ حقوق ختم ہو جاتے ہیں، اور تب کوئی بھی آزادی کے ساتھ ان تصانیف کو استعمال کر سکتا ہے۔ مصنف کی وفات کے ۲۵ برس بعد اگر کوئی دوسرا آدمی اس تصنیف کو شائع کرانا چاہے تو وہ کاپی رائٹ کے مالک کو اطلاع دے کر ہی ایسا کر سکتا ہے۔ مگر ایسی حالت میں ناشر کو کتاب پر دی ہوئی قیمت کا ۱۰ فی صدی حصہ کاپی رائٹ کے مالک کو دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ قانون میں یہ بھی بندوبست رکھا گیا ہے کہ کسی ادبی ڈرامائی اور موسیقی سے متعلق کتاب کے مصنف کی وفات کے بعد اگر کاپی رائٹ کا مالک کسی آدمی کو اس کتاب کے شائع کرنے کی اجازت نہ دے تو وہ آدمی عدالت کے ذریعے منظوری حاصل کر سکتا ہے اور اس کے لئے اسے عدالت کی طرف سے طے کردہ رقم ادا کرنی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں کاپی رائٹ والی تصنیف کے ترجمے سے متعلق حقوق کی میعاد صرف دس برس رکھی گئی ہے۔ جو اصل کتاب کی پہلی اشاعت کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں کئی زبانوں کا رواج ہے۔ جس کی وجہ سے ایک ہی تصنیف کے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہونے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہو سکتی اور اسی طرح مختلف زبانیں بولنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اصل مصنف کی اجازت سے ۱۰ برس کے پہلے بھی اس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔

ہر ایک تصنیف کے کاپی رائٹ کا حق پہلے اس کے مصنف ہی کو ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی تصویر یا فوٹو گراف اس کی قیمت دے کر بنایا جائے تو اس کے کاپی رائٹ کا حق قیمت ادا کرنے والے کو پہنچتا ہے۔ اس طرح اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کی ملازمت میں رہ کر کوئی کتاب لکھی ہو تو اس کے کاپی رائٹ کا حق اس دوسرے شخص ہی کو حاصل ہوگا۔

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کا کاپی رائٹ غصب کرے یا کوئی ایسا اقدام کرے جو کسی کے کاپی رائٹ کے خلاف ہو تو کاپی رائٹ کا مالک کئی قسم کی قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ اگر کسی کے کاپی رائٹ کو غصب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو تو وہ شخص اپنے حقوق غصب کرنے والے کے خلاف عدالت سے جائز طور پر حکم امتناعی جاری کرا سکتا ہے اور اگر کاپی رائٹ کے خلاف کوئی اقدام ہو چکا ہو تو وہ شخص عدالت کے ذریعے اس پر ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے۔ اسی طرح کاپی رائٹ قانون کے خلاف شائع ہونے والی تصانیف کی ہر ایک جلد کاپی رائٹ کے مالک کی ہی ملکیت مانی جاتی ہے چاہے وہ کسی بھی آدمی نے شائع کی ہو اور قانون میں اس بات کا بھی اہتمام ہے کہ ایسی تمام جلدیں کاپی رائٹ کے مالک کو دلا دی جائیں۔ ہاں اگر ناشر یہ ثابت کر دے کہ شائع کرتے وقت اس کو نہ تو اس بات کا علم تھا اور نہ ہی آسانی سے معلوم ہو سکتا تھا کہ شائع کردہ کتاب پر کس کا کاپی رائٹ ہے تو کاپی رائٹ کا مالک عدالت سے صرف ناشر کے خلاف حکم امتناعی جاری کرا سکتا ہے لیکن ہرجانے کا حقدار نہیں ہو سکتا۔

تعمیرات کے متعلق کاپی رائٹ کا قانون ایک قابلِ ذکر حیثیت رکھتا ہے۔ کتابوں وغیرہ کے معاملے میں تو کاپی رائٹ کا مالک اپنے مفاد کے خلاف کئے جانے والے اقدام کو عدالت کے مناسب حکم امتناعی کے ذریعے بیچ ہی میں رکوا سکتا ہے لیکن مکان کی تعمیر کے کام کو وہ اس طرح حکم امتناعی کے ذریعے نہیں رکوا سکتا

اور وہ اس طرح تعمیر شدہ مکان کو گروا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کتابوں وغیرہ کی طرح کاپی رائٹ قانون کے خلاف بنے ہوئے مکان کا مالک بھی نہیں ہو سکتا۔

کاپی رائٹ سے متعلق دعوے دائر کرنے کے لئے تین برس کی میعاد رکھی گئی ہے اور یہ میعاد اس دن سے شروع ہوتی ہے جب کاپی رائٹ کے خلاف اقدام کیا گیا ہو۔

بین اقوامی برن کاپی رائٹ کانفرنس اور روم کانفرنس میں دنیا کے تمام ممالک شریک نہیں تھے۔ اس لئے کچھ ملک ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ ہندوستان کا کاپی رائٹ سے متعلق کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ اس لئے ان ملکوں میں ایسی تصانیف شائع ہو سکتی ہیں جن پر کاپی رائٹ کا حق کسی آدمی کو ہندوستانی قانون کے مطابق حاصل ہو اس لئے اس قانون میں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ اگر کسی آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ کسی ایسی کتاب کی جلدیں دوسرے ملکوں سے ہندوستان میں لائی جا رہی ہیں جو اس کے کاپی رائٹ کے خلاف چھاپی گئی ہے تو وہ کسٹم کے حکام کو تحریری اطلاع دے کر ان کا ہندوستان میں آنا رکوا سکتا ہے۔

کاپی رائٹ کے حقوق کی حفاظت کے لئے قانون میں اس کے خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص دیدہ و دانستہ کسی کتاب کے کاپی رائٹ کے خلاف اس کی کوئی جلد بیچنے یا کرائے پر دینے کے لئے تیار کرے یا کسی ایسی کتاب کی جلد بیچے یا کرائے پر دے یا کاروبار کی خاطر اس کی نمائش کرے تو اس کی ہر ایک جلد کے لئے ۲۰ روپئے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے مگر ایک ہی مقدمہ میں سزا کی حد ۵۰۰ روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایسی جلدوں کے باہر سے ہندوستان میں لانے پر بھی اتنی ہی سزا دی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی تصنیف کے کاپی رائٹ کے خلاف اس کی جلدیں تیار کرنے کے لئے کوئی پلیٹ بنائے یا اپنے پاس رکھے یا ذاتی طور پر فائدہ اٹھانے کے لئے کسی ایسی تصنیف کی نمائش کرائے تو بھی اس پر ۵۰۰ روپے تک جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی مجرم کاپی رائٹ قانون کے تحت ایک بار سزا پانے کے بعد دوبارہ کاپی رائٹ کے قانون کی خلاف ورزی کرے تو اسے ایک ماہ تک کی قید کی سزا بھی دی جا سکتی ہے اور اس کے جرمانے کی حد بھی ۱۰۰۰ روپئے تک ہو سکتی ہے۔ سزا کے ساتھ ساتھ عدالت کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اس طرح چھاپی ہوئی جلدیں مجرم سے لے کر یا تو ضائع کروا دے یا کاپی رائٹ کے مالک کو دلوا دے۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

راؤ پریتم چند

کشمیر کی شاہ رگ
جواہر ٹنل

اگرچہ وادیٔ کشمیر چاروں طرف فلک پیما اور برف پوش پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ مگر یہ طبعی اور جغرافیائی رکاوٹیں علو العزم کشمیریوں کی نقل و حرکت کو اس چار دیواری کے اندر کبھی محدود نہیں رکھ سکیں۔ یہ آزادی پسند لوگ اپنی قدیم روایات کے مطابق ان پہاڑوں کو پھاند کر ہندوستان کے دیگر حصوں سے رشتے ناطے جوڑتے رہے ہیں۔ پیر پنجال کے دونوں طرف کے علاقوں میں آمد و رفت اور تجارت کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے چلا آیا ہے۔ جس کا ذکر کلہن پنڈت نے اپنی مستند تاریخ "راج ترنگنی" میں کیا ہے۔

سری رام چندر جی کے سوتیلے بھائی بھرت جی کا ننہال کشمیر میں تھا۔ جنگِ مہابھارت سے پہلے کشمیر کے ایک راجہ نے متھرا نگری پر حملہ کیا تھا۔ کشمیر شہنشاہ اشوک کی سلطنت کا ایک جزو تھا۔ سری نگر کا پرانا شہر اشوک اعظم نے ہی بسایا تھا۔ ایک زمانے میں شمالی ہندوستان کے کچھ علاقے بھی کشمیر کی سلطنت میں شامل تھے۔

پچھلے زمانے میں زیادہ تر آمد و رفت موسم گرما میں وادیٔ رمبیارہ سے ہوکر درۂ پیر پنجال کے راستے ہوتی تھی۔ یہ درہ کشمیر اور راجوری کی وادیوں کے درمیان سطح سمندر سے "تقریباً" گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے چھٹی صدی عیسوی میں مشہورِ "سفید ہن" فاتح مہرگل اسی راستے سے آیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے ایک سڑک بنوائی تھی جو اسی درہ سے ہوکر گذرتی تھی۔ اس پر گھوڑے، خچر اور ہاتھی چل سکتے تھے۔ اس شاہراہ پر مغلوں نے جابجا سرائیں اور محلات تعمیر کرائے تھے جن کے کھنڈر ابھی باقی ہیں۔ مغل شہنشاہ، اُن کی بیگمات درباری، اہل کار اور لشکر، اور دہلی اور لاہور کی طرف سے آنے والے کارواں اسی راستے سے موسم گرما میں کشمیر آیا جایا کرتے تھے۔ سکھوں نے بھی اسی راستہ سے کشمیر پر چڑھائی کی تھی۔ کشمیر کے شہرۂ آفاق پشمینہ کی شالوں اور دیگر دستکاریوں کی تجارت بھی اسی سے ہوتی تھی۔ سال و اسباب گھوڑوں، خچروں اور آدمیوں کی پیٹھ پر لاد کر لایا جاتا تھا۔

مگر موسم سرما میں یہ درّہ اور اس کے ارد گرد کے درے برف کے تودوں سے لد جاتے ہیں۔ اور تین چار ماہ آمد و رفت بند رہتی ہے۔

اسی سلسلۂ کوہ میں ایک اور درہ ہے جو درّۂ پیر پنجال سے تقریباً ڈیڑھ ہزار فٹ نیچا ہے اور جسے پیر بانہال کہتے ہیں۔ عہدِ ازمنہ کے بعد جب کشمیر اور جموں دونوں پہلے سکھوں اور پھر ڈوگروں کے زیر حکومت آئے تو زیادہ تر آمد و رفت اسی درے سے ہونے لگی۔ چناں چہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں انگریز، اور سیّاح۔ اور دربارِ کشمیر کے اہل کار اسی راستے سے کشمیر آتے جاتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں جموّں سے سری نگر تک ایک پختہ سڑک بنائی گئی جس پر گاڑیاں چل سکتی تھیں۔ مگر اس سڑک سے بھی کشمیر کی آمد و رفت ہر سال تین چار ماہ کے لئے بند ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ یہ درہ بانہال میں سے گزرتی تھی جو سطح سمندر سے نو ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے اور یہ درہ بھی موسم سرما میں بہت برف جمع ہو جانے کی وجہ سے ناقابلِ گذر ہو جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخیر میں برطانیہ اور روس کے سیاسی تعلقات کی کشیدگی کے پیشِ نظر پنجاب سے کشمیر تک ایک ایسی سڑک بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی جو سال بھر کھلی رہے اور جس پر گاڑیاں چل سکیں۔

چناں چہ اس پالیسی کے تحت راولپنڈی سے کوہالہ تک اور ایبٹ آباد سے مظفر آباد تک اور اس سے آگے دریائے جہلم کے بائیں کنارے کے ساتھ ایک پختہ سڑک بنائی گئی جس پر گاڑیاں چل سکتی تھیں۔ چوں کہ یہ سڑک سات ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر سے نہیں گذرتی تھی اس لئے عموماً سال

علی رہتی تھی اور کشمیر کی تجارت اور آمد و رفت کے لیۓ شاہراہ بن گئی تھی۔
مگر جب ۱۹۴۷ء میں برصغیرِ ہند کی تقسیم کے بعد ریاست کشمیر کا الحاق
ہندستان سے ہوا۔ اور ریاست کے ایک حصہ پر پاکستانی قبضہ ہو گیا تو یہ
راہ بند ہو گئی اور صرف سری نگر سے جموں جانے والی سڑک ہی سطحی آمد و رفت
کا باقی رہ گئی۔ موسم سرما میں برف باری کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیۓ یہ راستہ
بند ہو جاتا تھا۔

ان حالات میں معاشی ضروریات اور دفاعی مصلحتوں کے پیشِ نظر لازم
کہ وادیٔ کشمیر کی جنوبی سرحد پر سلسلہ کوہ پیر پنجال کو چیر کر ایسی نیچی سطح پر
سرنگ بنائی جائے جو موسم سرما میں بھی برف باری کی وجہ سے بند نہ ہو
اور پر سال بھر آمد و رفت جاری رہے۔

یہ خیال زمانۂ قدیم میں بھی کشمیر کے اربابِ بست و کشاد کے دل میں
وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر کے ایک اولو العزم حکمران نے
بانہال کے نیچے جہاں کہ سلسلہ کوہ سب سے نیچا اور پتلا ہے ایک سرنگ
کا تہیہ کیا تھا۔ مگر قضائے الٰہی سے اسے خواب میں تنبیہ ہوئی کہ اگر یہ
کھودی گئی تو اس میں سے اس قدر پانی بہہ نکلے گا کہ وادیٔ کشمیر غرقاب
ہو گی۔ چنانچہ اس خدشہ کے پیشِ نظر یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔

اس غرقابی کے خطرہ سے قطع نظر اگر یہ مہم شروع کر بھی دی جاتی تو اس کی
محال تھی۔ کیوں کہ تب تک سائنس نے کافی ترقی نہیں کی تھی۔ اور ایسی بڑی
کھدائی اور تعمیر کے لیۓ ضروری مشینیں اور آلات موجود نہ تھے۔

مگر اب سائنس کی ترقی اور بہتر آلات اور مشینوں کی ایجاد سے یہ کام
آسان ہو گیا۔ اور کشمیر کی معاشی ضروریات اور ملک کی دفاعی مصلحتوں کی بنا
بنانا ناگزیر ہو گیا۔

۱۹۵۲ء میں اس سرنگ کے جائزے کا کام شروع ہوا
ان کے مشورے سے درۂ بانہال کے نیچے کوہ پیر پنجال میں سطح سمندر
ہزار فٹ کی بلندی پر ایک سرنگ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جہاں
برف آسانی سے ہٹائی جا سکے۔

سال کے اندر نقشہ مکمل ہوا اور اس سرنگ کی تعمیر کا کام ایک تجربہ کار
سونپ دیا گیا۔ اگست ۱۹۵۵ء میں داغ بیل ڈالی گئی اور سرنگ کے
سے کھدائی کا کام شروع ہو گیا۔ یوں انسانی ہاتھ جدید ترین آلات

اور مشینوں کی مدد سے پہاڑ کے سینے کو برما کر راستہ بنانے میں لگ گئے۔ اس
کام پر چھ سو دیسی اور بدیسی ماہر، کاریگر اور مزدور تین باریوں میں روزانہ
آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں اور کام پورے سال گرمی سردی میں دن رات
مسلسل ہوتا رہتا ہے۔

ملبہ کو باہر نکالنے کے لیۓ ساتھ ہی ساتھ لوہے کی ٹرالی لائن بچھائی
جاتی ہے۔ کام کی رفتار کا انحصار چٹانوں کی طبعی حالت پر ہے۔ جہاں چٹانیں
سخت ہیں وہاں کھدائی اور کٹائی کا کام مشکل ہوتا ہے اور جن جگہوں پر چٹانیں
نرم ہیں وہاں سرنگ کی چھت اور دیواروں کو پہلے لکڑی کے موٹے موٹے شہتیروں
کے ڈھانچے بنا کر سنبھالا جاتا ہے اور بعد ازاں پتھر، چونا اور کنکریٹ کی ڈاٹیں
بنا کر سیمنٹ سے لپائی کرنی پڑتی ہے۔

اس سرنگ کی دو متوازی نالیاں ایک دوسرے سے ساٹھ فٹ کے
فاصلے پر ہوں گی۔ ان میں سے ایک نالی گاڑیوں کے آنے کے لیۓ ہوگی اور
دوسری جانے کے لیۓ۔ ایک نالی تو تیار بھی ہو گئی ہے اور ہلکی گاڑیوں کی آمد و
رفت کے لیۓ کھول دی گئی ہے، دوسری نالی بھی زائد از دو ہزار فٹ کھودی جا
چکی ہے۔ اُمید ہے کہ سرنگ کی دونوں نالیاں ۱۹۵۸ء تک مکمل ہو جائیں گی اور
ان پر اندازاً تین چار کروڑ روپیہ خرچ ہو گا۔

سرنگ کی لمبائی ۸۱۰۰ فٹ یعنی ڈیڑھ میل سے زیادہ ہے۔ نالی کی شکل
گھوڑے کے نعل جیسی ہے۔ اس کی چوڑائی ½۱۶ فٹ اور درمیان میں اونچائی
½۱۸ فٹ ہے۔ ان نالیوں میں سے تین ٹن تک وزن لے چلنے والی گاڑیاں
بخوبی گذر سکیں گی۔

گاڑیوں کے لیۓ سڑک کی چوڑائی ½۱۰ فٹ ہے۔ جس کے ایک جانب
۴ فٹ ایک انچ اور دوسری جانب ایک فٹ گیارہ انچ چوڑی پگڈنڈیاں ہیں۔
سڑک دونوں سروں سے سرنگ کے درمیان تک ایک ہزار فٹ میں تین فٹ
کی شرح سے چڑھتی ہے۔ اس سے جہاں اس میں موٹر گاڑیاں آسانی سے
چل سکتی ہیں وہاں سرنگ کے اندر سے نکلنے والے پانی کا نکاس بھی بخوبی
ہو جاتا ہے۔ سرنگ کے اندر جو پانی نکلتا ہے اس کو جمع کرنے کے لیۓ نالیاں
اور تالاب اور اسے خارج کرنے کے لیۓ بدرو بنائی گئی ہیں۔ اور بجلی سے
چلنے والے پمپ بھی لگائے گئے ہیں۔

بجلی مہیا کرنے کے لیۓ ایک مقامی پاور ہاؤس بنایا گیا ہے۔ بجلی کے

پنکھوں کی مدد سے ٹرنگ کے اندر سے گندی ہوا خارج کی جاتی ہے اور صاف ہوا ٹرنگ کے اندر داخل کی جاتی ہے جس کی رفتار تقریباً دس فٹ فی سیکنڈ ہے

روشنی کے لئے ٹرنگ کی چھت میں بجلی کے لیمپ لگائے گئے ہیں دروازوں کے پاس دس دس فٹ کے فاصلے پر اور اس کے آگے اسی اسی فٹ پر روشنی کا انتظام رکھا گیا ہے۔

آتش زدگی سے بچاؤ کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آگ بجھانے کے انجن اور دیگر سامان رکھا گیا ہے۔

ٹرنگ کی دونوں نالیاں مکمل ہو جانے پر ان میں سے ایک گھنٹہ میں کوئی آٹھ سو گاڑیاں گذر سکیں گی۔

ٹیلیفون اور دیگر آلات کے ذریعے گاڑیوں کی آمد و رفت اور دیگر معاملات مثلاً پانی کے نکاس، ہوا کی صفائی اور رفتار، بجلی کی روشنی، ٹریفک کے اشاروں آگ بجھانے اور پولیس کے کام کے متعلق رابطہ قائم رکھا جاتا ہے۔

اس ٹرنگ کو جمہوریۂ ہند کے ہردل عزیز وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو سے منسوب کرکے اس کا نام "جواہر ٹنل" رکھا گیا ہے۔ اس کی رسم افتتاح بتاریخ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء جمہوریہ ہند کے فاضل نائب صدر شری ایس۔ رادھا کرشنن کے ہاتھوں سے ادا ہوئی اس طرح گویا ایک دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

یہ ٹرنگ کشمیر کی ایک ایسی شاہ رگ ہے جس سے ملک کے جسم میں خون زیادہ سرعت سے دورہ کرکے اسے طاقت اور توانائی بخشے گا۔

دفاعی ضروریات کے لئے فوجی نقل و حرکت آسان تر ہو جائے گی اور عزیز کی بخوبی حفاظت اور امن و امان کی ضمانت ہوگی۔

اس ٹرنگ کے ذریعے کشمیر اور جمہوریہ ہند کے دیگر حصوں کے درمیان آمد و رفت اور رسل و رسائل کا سلسلہ سال بھر جاری رہ سکے گا۔ اس سے کلچرل تعلقات بھی بڑھیں گے، اور مقامی لوگوں کو مالی منفعت بھی ہوگی اور عام ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی

کشمیر اور جمہوریۂ ہند کے دیگر حصوں کے باشندوں کے میل ملاپ، قومی یگانگت اور یکجہتی کو بڑھاوا ملے گا۔ اور ان کے تعاون اور اشتراک سے کشمیر خوش حال اور طاقت ور ہو کر جمہوریۂ ہند کی مجموعی خوش حالی اور طاقت میں اضافہ کرے گا۔

کیا آپ جانتے ہیں

کہ

نئے ٹیکسوں کا آپ پر کیا اثر پڑا ہے۔؟

جب آپ چینی خریدیں تو یاد رکھیں کہ ایک پونڈ پر ۵ نئے پیسے اور ایک سیر پر ۱۰ نئے پیسے ٹیکس بڑھا ہے۔

گھانیوں اور چھوٹے کارخانوں میں تیار ہونے والا ونا سپتی تیل ٹیکس سے بری ہے۔ چنانچہ اس کی قیمت نہیں بڑھنا چاہیئے۔ بڑے کارخانوں میں تیار ہونے والے ونا سپتی تیل پر صرف ۲ نئے پیسے فی پونڈ کے حساب سے ٹیکس بڑھا ہے۔ پچھلے سال تیل کے تاجروں نے تیل کی قیمتیں ۱۰ سے ۱۵ نئے پیسے تک فی پونڈ بڑھائی تھیں۔ ٹیکس میں معمولی اضافہ تاجر اپنے اسی منافع سے آسانی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں۔

اگر آپ سیگرٹ پیتے ہیں تو خیال رکھئے کہ صرف ہندوستانی تنباکو سے تیار ہونے والی "چار مینار" اور "شاہ دکن" جیسی برانڈوں کے علاوہ کسی اور سیگرٹ کی زیادہ قیمت نہ دیجئے۔ ایسی دس سیگرٹوں کے پیکٹ پر ½ سے ۱ نئے پیسے تک کا اضافہ ہوا ہے۔ سو بڑیوں کے ایک بنڈل کی قیمت صرف ایک نیا پیسہ بڑھی ہے۔ حقے میں کام آنے والے تمباکو کی قیمت کسی صورت میں ۱۳ نئے پیسے فی پونڈ سے زیادہ نہیں بڑھنی چاہیئے۔

۴۰ تیلیوں کی ماچس کے لئے ۴ نئے پیسے اور ۶۰ تیلیوں کی ماچس کے لئے ۶ نئے پیسے سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔ اس میں مناسب نفع اور عائد ہوا ٹیکس دونوں شامل ہیں۔

لکھنے پڑھنے کے عام کاغذ (۲ پونڈ) کی قیمت ½ نیا پیسہ فی دستہ سے زیادہ کسی صورت میں نہیں بڑھنی چاہیئے۔

مناسب قیمتیں ہی دیجئے

اس میں آپ کا اور ملک کا فائدہ ہے

DA57/50

ناردرن ریلوے

پہاڑی مقامات پر جانے والوں کے لئے رعایتی ٹکٹ

جو لوگ موسم گرما میں میدانی علاقوں کی گرمی اور گرد و غبار سے بچنا چاہتے ہیں اُن کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ پہاڑوں پر جا کر اپنی چھٹیاں گزاریں کشمیر سے کراوٹا کمنڈ تک اور آبو روڈ سے لے کر شیلانگ تک ملک میں مختلف قسم کے خوبصورت اور پُرفضا پہاڑی مقامات ہیں، جہاں جا کر ہر شخص اپنے ذرائع اور اپنے مزاج کے مطابق چھٹیاں گزار سکتا ہے۔

۲۔ اس مرتبہ پھر ہندوستانی ریلیں یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء تک ٹکٹوں میں کافی رعایت دے رہی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(ا) پہاڑی مقامات کے لئے (سری نگر کشمیر کے علاوہ)

کرایہ ...... واپسی ٹکٹ کے لئے ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا نصف کرایہ

درجہ ...... پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے اور نوکروں کے لئے ٹکٹ

مدت ...... سفر شروع کرنے کی تاریخ سے لے کر تین ماہ تک یہ ٹکٹ کارآمد رہیں گے۔

یہ ٹکٹ اُن تمام اسٹیشنوں سے جاری کئے جاتے ہیں جہاں سے مندرجہ ذیل مقامات کا فاصلہ ۱۵۰ میل یا اس سے زیادہ ہے:—

شملہ، سولن، دھرم پور (پنجاب)، دہرہ دون، پٹھانکوٹ (کشمیر کے لئے)، کاٹھ گودام، اوٹا کمنڈ، کوڈائی کنال روڈ، آبو روڈ، کونور، دارجلنگ، کرسیانگ، شیلانگ، پیپیا اینڈ کو ماگری آؤٹ ایجنسی (میٹو پلی وام ریلوے ایجنسی سے ریل سفر کے لئے ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا نصف کرایہ اور سڑک سے سفر کے لئے دونوں طرف کا پورا کرایہ)

(ب) سری نگر کے لئے

پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے ریل اور سڑک اور ریل اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے لے کر ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء تک ناردرن ریلوے کے مندرجہ ذیل اسٹیشنوں سے سری نگر براستہ پٹھانکوٹ کے لئے جاری کئے جا رہے ہیں:

۱۔ الہ آباد ۲۔ انبالہ کینٹ ۳۔ بنارس کینٹ ۴۔ بریلی ۵۔ بیکانیر ۶۔ دہرہ دون ۷۔ دہلی ۸۔ فیروزپور کینٹ ۹۔ جودھپور ۱۰۔ کانپور سینٹرل ۱۱۔ لکھنؤ ۱۲۔ لدھیانہ ۱۳۔ مراد آباد ۱۴۔ سہارن پور ۱۵۔ شملہ

یہ ٹکٹ جاری ہونے کی تاریخ سے تین مہینے کے اندر اندر واپسی سفر کے لئے کارآمد ہوں گے۔

کرایہ: ریل اور سڑک کے واپسی ٹکٹ:

پہلا اور دوسرا درجہ — ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا ½ کرایہ بمعہ ۲۷ روپے سڑک سے سفر کا واپسی کرایہ

تیسرا درجہ — ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا نصف کرایہ بمعہ ۲۷ روپے سڑک سے سفر کا واپسی کرایہ

(تین سال سے اوپر اور بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے بھی سڑک کے سفر کا پورا واپسی کرایہ لیا جائے گا)

ریل اور ہوائی جہاز کے واپسی ٹکٹ:

پہلا اور دوسرا درجہ — ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا ½ کرایہ بمعہ ۷۶ روپے ہوائی جہاز کا واپسی کرایہ

تیسرا درجہ — ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا نصف کرایہ بمعہ ۷۶ روپے ہوائی جہاز کا واپسی کرایہ

(تین سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے ہوائی جہاز کا کرایہ ۸ روپے اور بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے ۳۸ روپیہ کرایہ ادا کرنا پڑے گا)

راستے میں ٹھہرنے اور سامان وغیرہ لے جانے کے بارے میں پوری تفصیلات متعلقہ اسٹیشن ماسٹر یا چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ (ریٹس) کشمیری گیٹ دہلی سے حاصل کریں۔

شائع کردہ:— چیف کمرشیل سپرنٹنڈنٹ نئی دہلی

آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

"آج کل، آج کل خوب نکل رہا ہے۔ خصوصاً موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ پاک و ہند کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا۔ کیا باعتبارِ فن اور کیا بلحاظ تاریخِ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اُردو کے محسن ہیں۔"
(عبدالمجید سالک)

"آج کل ان رسالوں میں سے ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حُسن یعنی کاغذ چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا"
(مسعود حسن رضوی)

"آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔"
(نیاز فتحپوری)

"میں آج کل کو ہمیشہ بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حُسن سے بھی عاری ہیں۔"
(غلام السیدین)

"رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے جس قدر پبلک کتب خانے ہیں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"
(فراق گورکھپوری)

"آج کل کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نہ صرف پُرمغز اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھٹیا اور بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے نظم کے حصے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔"
(اثر لکھنوی)

"آج کل اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں سے ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تنقیدیں اور تذکرے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں بلند پایہ نظموں اور پُرکیف غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔"
(آل احمد سرور)

"آج کل کے لئے میں نے لوگوں کو بیتاب اور منتظر پایا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں، اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔"
(احتشام حسین)

فی پرچہ آٹھ آنے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی	سالانہ چھ روپے

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—509